

# دشتِ آرزو

آفرین صغیر احمد



WWW.PAKSOCIETY.COM

DASHT-ARZOO

ماہنامہ آنچل ڈائجسٹ میں چھپنے والا، اقراء صغیر احمد کا مقبول ترین ناول

# دشت آرزو

پاک سوسائٹی

اقراء صغیر احمد

ڈاٹ کام

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون : 37352332, 37232336

## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	.....	دشت آرزو
مصنف	.....	اقراء مصفیر احمد
ناشر	.....	گل فرازا احمد (علم و عرفان پبلشرز، لاہور)
مطبع	.....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	.....	محمد زاہد ملک
کیوزنگ	.....	اہرارہ انیس احمد
سن اشاعت	.....	جنوری 2012
قیمت	.....	750/- روپے

..... ملنے کے سچے .....

فخرینہ علم و ادب	دیکم بک پورٹ
انکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور	اردو بازار، کراچی
کتاب گھر	اشرف بک اینجنسی
اقبال روڈ کیشی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ کیشی چوک، راولپنڈی

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متعلق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کیوزنگ، طہمت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صلحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

میرے عزیز از جان والدین کے نام.....  
 جن کی محبت و حوصلہ افزائی میرے قلم کی حقیقی روح ہے۔  
 جن کی ابدی جدائی دل کو تازیت مضطرب رکھے گی۔

پاک سوسائٹی  
 ڈاٹ کام

میر کی ساری زندگی محبتوں کی تلاش میں گزری۔ اس راہ گزر پر ہاتھ لہلہاں اور وجود پروریزہ۔ یہ دکھ میں سہہ سکتی تھی اگر بچی محبتیں اپنی عظمت کے مقام پر ملتیں۔ دکھ یہ نہیں کہ محبتیں نہ ملیں۔ غم یہ رہا کہ رشتوں نے مان کھودیا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کرسی کی بیک سے سرٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ شام ڈھلتے ہی پرندوں کی ڈار کی ڈار اپنے آشیانوں کی طرف محو پرواز تھی۔ سورج اپنی شعاعوں کو سینٹے تیزی سے مغرب کی سمت اپنے نشین کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ آفتاب پر پھلتی شام اور ابھرتی رات کا گلابی وسیاہ احتجاج اسے ہمیشہ کی طرح افسردہ و سوگوار کر دیتا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی و بے تابی وہ اپنی رگ و پے میں اترتی محسوس کرتی تھی۔ عجیب و بے معنی کیفیت جس کو وہ آج تک کوئی نام نہ دے پائی تھی۔ کچھ دیر قبل بڑے شوخ فضا بالکل بے سکون ہو چکی تھی اور یہ خاموشی اعلان کر رہی تھی کہ اس کے اسٹوڈنٹس جا چکے ہیں اور اب اسے بھی جانا ہوگا اور یہ سوچ اسے روز کی طرح جھنجھلاہٹ و بے زاری میں مبتلا کر دیتی تھی۔

شام کے ان آخری لمحوں میں جب ہر ذی روح کو گھر کی طلب بے تاب و بے چین کر ڈالتی تھی۔ ایسے میں وہ سوچتی تھی کوئی ایسی ترکیب، کوئی ایسی جادو کی چمڑی ہاتھ آجائے جس سے وہ وقت کو ایک ہندسے پر روک دے۔ جاہل کر دے کہ کبھی شام نہ آجائے۔ نہ شام آئے گی، نہ اسکول کی چمڑی ہوگی، نہ اسے گھر جانا ہوگا اور زندگی یوں ہی تمام ہو جائے گی۔

باہا! شاید میرا شجرہ نسب کسی نہ کسی طرح شیخ چلی سے ملتا ہے۔ ان موصوف کو بھی جانتے میں خواب دیکھنے کی عادت تھی، بالکل میری طرح۔ اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دی۔ ”کاش! سب ہماری سوچوں جیسا ہو جائے۔ کوئی خواہش، کوئی آرزو ہو تو پھر جنت کی آرزو کون کرے گا؟“

”کرن! کرن! کیا گھر چلنے کا موڈ نہیں ہے؟“ اس کی ساتھی ٹیچر عادلہ چادر اوڑھتی وہاں آ کر اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”گھر ہی چلنا ہے، ابھی چلیں گے“۔ وہ حشمتی سانس لیتی ہوئی گویا ہوئی۔

”وہاں یار! ابھی چلیں گے سے کیا مراد؟ عجیب ہوتم۔ چمڑی ہوتے ہی بچوں کے ساتھ ساتھ ہم ٹیچرز کو بھی جلد از جلد گھر جانے کی لگتی ہے مگر تم ایک ہو۔ روزانہ تمہیں یاد دلا نا پڑتا ہے کہ مس چمڑی ہو چکی ہے، مگر چلیں۔ واج مین کا سزلا کاند کرنے آ رہا ہے۔“

”او کے اچل رہی ہوں۔ لیکن تو نہ دو“۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑی ہوتی ہوئی بولی تو عادلہ نے اسے ناقدانہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”اوہ! بہت بہت شکر یہ اس سخاوت کا، تاحیات احسان مند رہوں گی۔ ہونہ! اب ایسا بھی کیا شوق تدریس کا کہ انسان گھر کا خیال ہی بھول جائے۔“

تمہاری امی، چھوٹے، بہن بھائی بڑی چاہت سے تمہاری راہ دیکھتے ہیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی محبت بھری گرم جوٹی سے تمہارا

استقبال ہوتا ہے۔ ایک بڑی بہن چاہت سے تمہارے کہے بنا تمہاری چادر تہہ کر کے رکھتی ہے۔ دوسری بہن پرس احتیاط سے ہنگ کرتی ہے۔ ایک بھائی پانی لے کر آتا ہے تو دوسرا تمہاری سینڈلیس اٹھا کر رکھتا ہے اور تمہاری امی نفاٹ چائے بنا کر لے آتی ہیں جس کے ہمراہ صبح ناشتے کے بیچے پاپے، باقر خانی یا ٹمکین سمو سے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تازہ آلو کے بنے سمو سے بھی ہوتے ہیں۔ یہ عام اور بے حیثیت چیزیں کتنی بڑی نعمت بن جاتی ہیں، جب تم سب ساتھ بیٹھ کر شیز کرتے ہو، کھاتے پیتے ہو اور میں مانتی ہوں کہ انسان کھانے کا بھوکا نہیں ہے۔ وہ محبت کا بھوکا ہے۔ چاہت کا یا سا ہے۔ وفا کا طلب گار ہے اور اپنی آخری پیدائش تک رہے گا۔ مجھے بھی انہی تائب قدروں کی تلاش ہے اور میں بھی گھر جانے کو بے قرار رہوں گی بشرطیکہ مجھے بھی وہی چاہت، محبت و اہمیت ملے جو مجھے میرے ہونے کا یقین دلائے۔ زندگی سے روشناس کرائے۔ وہ سوچتی رہی۔

”اوکاڈ! پھر رات بے چلی گئیں۔ جلدی چلو وادج میں آ رہا ہے۔“ وہ گم صم کھڑی کرن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کارپینڈور میں لے آئی تھی۔

”چل رہی ہوں۔ ہاتھ تو چھوڑو۔“

”تاکہ تم پھر کھلی آنکھوں سے سونے لگو۔ جاتی تو ہو کہ گھروالے میرے بنا شام کی چائے نہیں پیتے اور انہیں اتنا غار میں جتلا رکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی بے زاری و اداسی عروج پر پہنچ گئی، جب ماں کو حسب معمول جاہ نماز پر براہمان کسی وظیفے میں مشغول پایا۔ کوفت و جھنجھلاہٹ سے اس نے سینڈل اٹار کر پاؤں سے ہی پنگ کے نیچے اچھالی تھیں۔ پرس نخیل پر رکھا۔ چادر کا گولہ بنا کر دور اچھالا اور اس انداز سے دروازہ ہونٹی کہ پنگ کی ہر چول نے چیخ کر صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

ماں نے تنہی لگا ہوں سے اسے گھورا تھا۔ ان کے انداز میں خفگی و برہمی واضح تھی مگر اس پر مطلق اثر نہ تھا۔ وہ اسی طرح اکڑی منہ پھلائے پڑی رہی۔ وہ ان گھورتی نگاہوں اور کسی نہ کسی درد میں مجبور بننے والے لیوں کی عادی تھی کہ ان کا دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں یہی مصروف تھا۔ بارہ گھنٹے دیگر کاموں کے لیے وقف تھے اور بارہ گھنٹے ایسے ایسے وظیفوں و اذکار میں مشغول رہ کر خود کو تو بھول ہی گئی تھیں، ساتھ اس کی ہستی بھی فراموش کر بیٹھی تھیں اور یہیں سے اس کے اختلاقات شروع ہوئے تھے۔

”یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ سارا دن کوڑھ مفر اسٹوڈنٹس کے ساتھ مفر ماری کر کے آؤ۔ گھر آ کر کوئی ایک گلاس پانی، ایک کپ چائے پلانے والا نہیں ہوتا۔ تھک کر آؤ اور آ کر خود ہی چائے بنا کر پیو۔ ہونہہ! میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔“

☆.....☆.....☆

وقت شروع سے ہی چلا آ رہا تھا۔ اسے بچپن سے محرومیوں و تنگیوں کے سوا ملائی کیا تھا۔ ساتھ ماں کے سرد مہر و سخت رویے نے اسے از حد خوف زدہ و بے اعتماد کر ڈالا تھا۔ وہ ماموں کے بچوں سے خاموشی سے مار کھالیا کرتی تھی۔ ممانوں کی زبانیں اور نفرت و حقارت

برساتی لگا ہوں سے کبھی کبھی راتھی۔ اپنی ہم عمر کزنز کو خوب صورت کپڑوں اور شووز پہننے دیکھ کر اس کی بھی خواہش ابھرتی کہ وہ بھی ان کی طرح مہنگے و خوب صورت کپڑے پہن کر پریوں کی طرح لگے۔ ڈھیروں چاکلیٹس، جوہلیز، پاپ کارن وغیرہ خرید کر کھائے اور بھی بے شمار خواہشات تھیں جو اس کے ساتھ ہی جوان ہوئی تھیں۔

ماں کی بے اتفاقی کا ذکر ہر ذکر پر بھاری تھا۔ ہر طرف سے نظروں اور عزت نفس کو ہر لمحہ کھینچنے جانے پر وہ نئی کرن بن گئی تھی۔ ہٹ دھرم، بد تمیز، اپنی من مانی کرنے والی لڑکی کا یہ رویہ کسی طور بھی کسی کو نہ بھایا تھا اور سزا کے طور پر زندگی اس پر مزید تنگ کر دی گئی تھی مگر وہ بہادری سے میدان میں اُتری تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ مر جائے گی مگر ان کے آگے اب نہیں ہچکے گی، خواہ راہیں کتنی ہی خاردار و کٹھن ہو جائیں اور اس نے جو کہا، اس پر ثابت قدم تھی۔

”ہاں ہاں مر جا! زندہ رہ کر کون سے میرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈال رکھی ہے۔ ہر وقت کے رونے سے بہتر ہے، تین دن رو کر بیٹھ جاؤں گی“۔ دھینپے سے قاریغ ہوتے ہی نوشاپہ چلے گئے لہجے میں مخاطب ہوئی تھیں۔

”اتنی ہی آرزو ہے مجھے مرا ہوا دیکھنے کی تو پیدا ہوتے ہی گاؤں میں میرا۔ کیوں اتنے سال تک برداشت کیا“۔  
 ”کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ تو اتنی بد تمیز زبان دراز نکلتے گی تو تجھے جنم دینے سے قبل کوکھ میں ہی مار ڈالتی“۔ انہوں نے جاہ نماز تہہ کر سائیڈ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی بھی وقت ہے، گلا گھونٹ دیں میرا، یا زہر دے کر مار دیں“۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیزی سے جمع ہو رہا تھا لیکن زبان شیطانی اُگل رہی تھی۔

”آخر ہے نا اس گندے خاندان کا گندا خون تیری رگوں میں جس میں اخلاص و حرمت کی سرخی کے بجائے نیلا ہٹ بھرا زہر گھومتا ہے، وہی زہر ہمرے لفظوں سے نکلتا ہے۔ بد احساس باپ کی بد احساسی و بد لحاظ اولاد ہے تو۔ میرے دودھ کی پاکیزہ مٹھاس بھی اس زہر کو نہ مار سکی“۔  
 ”خیریت تو ہے نا، بڑی شدید بو آ رہی ہے، کچھ جل کر خاک ہونے کی“۔ حزرہ دروازہ ناک کرتا ہوا مسکین صورت بنا کر گویا ہوا۔  
 ”جسمیں کبھی تمیز نہیں آئے گی۔ کتنی عورتوں کی طرح لوگوں کی سن گن لیتے پھرا کر دو۔ اونٹ کی طرح تو تھنی اُٹھائے گھس آتے ہو مزے سے“۔

”اس کے باپ کا گھر ہے۔ جب چاہے آئے جائے تم کون ہوتی ہے اعتراض کرنے والی۔ اپنے باپ کے گھر جاؤ تو اعتراض کرنا سمجھیں“۔ ہمیشہ کی طرح اس خیال سے کہ کہیں بھالی بن نہ لیں یا وہ نہ اندامان جائے کے ڈر سے خود ہی چیخ کر بولیں۔ بچپن سے اب تک ان کے ساتھ یہی مسئلہ رہا کہ ان لوگوں کی خوشنودی اور محبت حاصل کرنے کے لیے وہ اسے اسی طرح دبانے کی کوشش کرتی آئی تھیں، بجائے اس کی طرف داری کرنے یا خیال کرنے کے، وہ ایسا ہی بے رحمانہ سلوک کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح رہنے سے ان دونوں کی اہمیت و حیثیت بڑھ جائے گی، وہ کبھی اس سہارے سے بے سہارا نہ ہو پائیں گی لیکن جب وقت اُلٹی چال چل رہا ہوا اور قسمت بھی

بے انتہائی کی چادر میں ملفوف ہو جائے تو سب کا دھیس، قربانیاں واستقامت دائرہ رائلٹ ہو جاتے ہیں۔

ان میں سے وہ ماسوائے حمزہ کے کسی کو اپنا نہ بنا سکیں اور ساتھ بیٹی سے بھی دور ہو گئی تھیں۔ جس دوری کو وہ ابھی تک نہ سمجھ پائی تھیں، نہ سیٹ پائی تھیں۔ عجیب الجھا، ٹوٹا، بکھرا سا رشتہ ان کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔

”اپنے باپ کے گھر تو میں ابھی چلی جاؤں لیکن آپ کی ناک میرا راستہ روک لیتی ہے۔“ باپ کے حوالے سے دیا گیا ہر طعنا سے بجز کتے الاؤ میں پھینک دیا کرتا تھا اور اس وقت حمزہ کے سامنے وہ بالکل برداشت نہ کر سکی۔ ادھر اس کی بچی و کڑوی بات نے نوشاہہ کو غصے سے کھولا دیا تھا۔ وہ اس کو مارنے کے ارادے سے جنونی انداز میں آگے بڑھی تھیں، اگر حمزہ درمیان میں نہ آ جاتا تو وہ اسے پیٹ ڈالتیں۔

”بزد بان، بد تمیز، بد تہذیب کس منہ سے باپ کے گھر جائے گی۔ بے غیرت! اس باپ کی حمایت لیتی ہے جس نے کبھی پلٹ کر یہ نہیں دیکھا کہ تو زندہ ہے یا مر گئی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے جس نے کبھی خبر نہیں لی۔ لوگ تیسوں، مسکینوں پر بھی عید، بقر عید پر شفقت کا ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ خیر خبر لے لیتے ہیں پر تیرا باپ تجھے تیسوں سے بھی بدتر سمجھتا ہے۔“ شدید اشتعال کے باعث ان کا سانس بُری طرح پھولنے لگا تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی بیٹھ گئی تھیں۔

”پھوپھو جان! اتنا غصہ کیوں کرتی ہیں۔ وہ بے وقوف ہے۔ آپ کو سمجھ داری سے کام لینا چاہیے۔“ کرن اٹھ کر باہر مہن میں چلی گئی تو حمزہ ان سے مخاطب ہوا۔

”مجھے خود پسند نہیں ہر وقت کی صحیح معرودہ ایسی حرکتیں کرتی ہے کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اللہ نے ایک بیٹی دی، وہ بھی ایسی نامراد و بد بخت کہ سوچتی ہوں اس سے بے اولاد ہوتی تو بھلی تھی۔“ وہ رونے لگی تھیں۔

”خطا دار وہ نہیں، آپ بھی ہیں پھوپھو۔ اس کو نہ باپ سے شفقت ملی اور نہ آپ نے اسے محبت دی۔ میں بچپن سے آپ کا بچی روید دیکھتا رہا ہوں۔ دوسرے لوگوں کی زیادتیوں کو تو وہ فراموش کرتی آئی تھی۔ آپ کی بے توجہی نے اسے یہ نیاروہ عطا کیا ہے۔ مسلسل گرتے پانی کی یونٹ پتھروں میں سوراخ کر ڈالتی ہے پھر وہ تو نرم و نازک حساس دل رکھنے والی لڑکی ہے۔“

”میں اس کی دشمن نہیں، ماں ہوں، جو چاہتی ہوں اس کے بھلے کے لیے لیکن وہ یہ سب کہاں سمجھتی ہے۔ اس باپ کی حمایت لیتی ہے جس نے کبھی پلٹ کر یہ جاننے کی کوشش نہیں کی وہ کس حال میں جی رہی ہے۔“

کافی دیر تک پھوپھو کو سمجھا بجا کر وہ کرن کو ڈھونڈتا ہوا اسٹور روم میں آ گیا اور گہری تاریکی ہونے کے باعث کسی چیز سے الجھ کر دھڑام سے گرا تھا۔ سر کسی سے بُری طرح ٹکرایا تھا۔

”آہ! اندھے ہو گئے ہو کیا؟“ کرن نے غصے سے کہتے ہوئے اٹھ کر بلب آن کرتے ہوئے کہا۔ وہ دائیں ہاتھ سے سر سہلائی جا رہی تھی۔ زرد و سیاہ احتجاج کے جارحیت کے سوٹ میں وہ متورم آنکھوں اور سرخ چہرے پر ڈنیا بھر کی سنجیدگی لیے اسے گھور رہی تھی جو زمین پر پڑے پڑے اسے دیکھ رہا تھا۔



”اب اٹھ بھی چکو۔ کیا فوت ہو گئے ہو پڑے پڑے۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اندھیرے میں بیٹھنے کی؟“ وہ اٹھتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی، آنکھیں بند کر کے آنے کی۔“

”ٹھیک کہتی ہیں بچھو کہ تم بد تمیز ہو چکی ہو۔“ وہ بیٹھتے ہوئے شکوہ کناں تھا۔

”ہاں، انہیں مجھ میں خامیوں اور برائیوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ سب تو اس گھر میں گونگے ہیں، میں ہی فقط زبان رکھتی

ہوں یہاں۔“

”او..... کم آن کرن! تم اعلیٰ تعلیم یافتہ، واقعی سمجھ دار ہونے کے باوجود ایسا بی بیوی سیز کرتی ہو تو بالکل جاہل اور گنوار لگتی ہو، حالانکہ

تمہیں ان کی ذہنی مگھلش کو، بے چارگی کو بہت اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ وہ شوہر کے سلامت ہونے کے باوجود بیوہ جیسی زندگی گزار رہی ہیں

اور پھر ری سکی کسر سگوں کی بے اہتنائی، غیریت بھرے رویے و سلوک نے پوری کر دی ہے اور تم نے اپنی بدحرائی و چرچے سے یں کا قاضی

یوجہ ڈال کر انہیں زندگی سے ہی بے زار کر ڈالا ہے۔“

”اگر وہ شوہر کے ہوتے ہوئے بیوہ جیسی زندگی گزار رہی ہیں تو میں بھی باپ کے ہوتے ہوئے یتیموں کی طرح دن گزار رہی

ہوں، پھر وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ دنیا میں لاکھوں ایسے لوگ ہیں جو ہماری طرح زندگی گزار رہے ہیں لیکن انہوں نے زندگی

سزا نہیں، راحت و آسودگی سے گزاری ہے اور گزار رہے ہیں۔ ممانے مجھے کبھی متاوانا پناہیت کا حساس نہیں دیا۔ ہمیشہ میرا حق دوسروں میں

ہانتی آئی ہیں، جتنی آؤ بھگت، غلامی، چالوسی، خدمت و ذلت انہوں نے اس گھر اور گھر والوں کے دلوں میں جگہ پانے کے لیے بھگتی ہے،

اگر سسرال میں کرتیں تو آج ان کے ساتھ میں بھی عزت و سرفروٹی سے رہ رہی ہوتی۔“

گھر والوں کا رویا سے پوشیدہ نہ تھا مگر پھر بھی کرن کے منہ سے سن کر اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی تھی، پھر سر جھٹک کر گویا ہوا۔

”کر لو جتنا ذلیل کرنا چاہو۔ مجھ جیسا بھی تمہیں کہاں ملے گا جاپنوں کی برائیاں منہ در منہ خاموشی سے بلا ٹھگی کے سن رہا ہوں۔“

”اگر جھوٹ بول رہی ہوں تو سزا کے لیے تیار ہوں۔“ وہ صاف گوئی سے گویا ہوئی۔

”ہات ساری سچائی کی ہے جیسی میں خاموش ہوں لیکن تمہیں بھی خود کو بدلنا ہوگا۔ ہم ہمیشہ دوسروں کے بدلنے کی توقع رکھتے

ہیں۔ خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔“

”میں نے خود کو حالات کے ساتھ بدلنا سیکھا ہے، جب ہی تو آج زندہ ہوں اور زندگی پانے کی جستجو میں مگن بھی ہوں، ورنہ ممانے

نے مجھے بہت پہلے مار دیا تھا۔“

”بچھو جان سے تمہارے تازہ ترین اختلافات کی وجہ کیا ہوئی ہے؟“ اس کا دل تو ہر دم کسی ہمدرد و خیر خواہ کا متلاشی رہتا تھا۔ حزن کو

مہربان پا کر اپنی خواہشات بتا دیں۔

”خواب میں ایسے سندر کی مانند ہیں جن کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا مگر جائز اور برحق خواہشیں اپنی منزل تلاش کر لیتی ہیں، بے غرضی و مروت صبر طلب ہوتی ہے۔“ ہمیشہ کی طرح حزرہ نے اسے انتظار، صبر اور کامیابی کی تسلی دینا شروع کر دی تھی۔

☆.....☆.....☆

”صدا کہاں جا رہے ہو؟“

”کیوں؟“ وہ اٹھی پر کی رنگ گھمانا ہوا سوالیہ انداز میں بولا۔

”میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔“ وہ شوئزر بیک لٹکائے تیز تیز قدموں سے اس کے قریب آئی۔

”جنم میں جا رہا ہوں، چلو گی؟“

”چلو تمہیں ایک اسٹاپ پیچھا ہوا کر آگے بڑھ جاؤں گی۔ جنت ہورخ سے آگے ہے۔“ اس نے بھی اسی مصمصیت سے جواب دیا۔

”جنت! ہونہ! تم جیسے لوگ تو جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکیں گے۔“ پیچھے آتی چھوٹی ممانی کی بیٹی زرقون طنزیہ لہجے میں بولی۔

”جنت پر بھی کیا تمہارے پیرئس نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے؟“

”دعائیں دو میرے پیرئس کو جن کی بدولت تم ماں بیٹی اس گھر میں عزت و سکون کی زندگی گزار رہی ہو، ورنہ فقیروں سے بدتر

حشر ہوتا تم لوگوں کا اور اس پرمنون ہونے کے بجائے تم انہیں غاصب بنا رہی ہو۔ نمک حرام ہوا ایک نمبر۔“ جتنی تحقیر زرقون کے لہجے میں تھی، اس سے کئی زیادہ آنکھوں میں تھی۔

”یہ سب تمہارے نمک کا ہی اثر ہے، جس طرح تمہارے خون میں کشش نہیں ہے، اسی طرح تمہارے نمک میں بھی تاثیر نہیں

ہے۔ تمہارا خون اور نمک دونوں ہی منافقت اور بے مروتی سے لبریز ہیں۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ ایک ایک لفظ اس نے جما جما کر ادا کیا تھا۔ سامنے کلف شدہ کپڑے کی طرح اکڑی اکڑی زرقون اس کے لفظوں اور بے سکون انداز پر تاگن کی طرح بل کھانے لگی تھی۔

”میرے خون کو اپنے خون کی طرح گندہ مت سمجھو نمک حرام، ذلیل باپ کی ذلیل اولاد! ہمارا کھاتی ہو اور ہم پر ہی خیراتی ہو۔“

”میرے باپ کو گالی دی تم نے۔ میں تمہارا منہ تو زردوں کی۔“ باپ کے نام پر وہ ویسے ہی احساس کسرتی کا شکار ہو جاتی تھی اور

اس وقت تو زرقون نے ادب و احترام کی تمام حدود کو اس کر ڈالی تھیں۔ وہ بھگری ہوئی اس کی جانب بڑھی۔ اسی دم ہکا بکا کھڑا صمدان کے درمیان ایسا تادہ ہو گیا۔

”یہ..... یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تم دونوں کا۔“ وہ یوکلایا۔ اسی دم گھر کے لوگ آگئے، جنہوں نے زرقون

اور کرن کو وہاں سے ہٹایا۔ بظاہر معاملہ رفع و دفع ہو گیا۔ وہ جو عادلہ کے ہاں جانے کی تیاری کر کے نکلی تھی، صمد کی منتوں کے باوجود نہ نکلی تھی،

جبکہ زرقون اس وقت اپنی کزن کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی اور صمد کو اس سے ہنس ہنس کر بات کرنا دیکھ کر وہ جوش رقابت میں

جتلا ہو گئی تھی۔ جب ہوش پر جوش غالب آجائے تو شعور سو جاتا ہے اور دل کی بات زبان پر رواں ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا جس کا اسے

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

قلعی افسوس نہ تھا۔ وہ ماں بیٹی ان کی نگاہوں میں راہ میں پڑے وہ بے جان وہ بے توجہ تھے جن کا کام صرف ٹھوکریں کھا کر بھی وہیں پڑے رہنا تھا، جن کو وہ بہت فراخ دلی و مستقل مزاجی سے ٹھوکر پر ٹھوکر لگاتے رہتے تھے۔

گھر کی دیگر خواتین اس موقع پر موجود نہ تھیں۔ زرقون نے رات واپسی پر ماں کو کرن کے بارے میں خوب بھڑکایا اور بیٹی کی طرح ماں کو بھی از حد تشویش تھی کہ جزوہ کی طرح صدمہ بھی کرن کی طرف منتقل ہونے لگا ہے جو خطرے کی بات تھی۔ راحیلہ نے دونوں چھوٹی دیوانوں کے صبح خوب کان بھرے۔ جب مرد گھر کے باہر کاموں پر چلے گئے تو انہوں نے حمد ہو کر صلاح مشورے کیے اور کرن کی اسکول آمد سے قبل ہی ہند کی طرف آگئی تھیں۔

ایک کمرے اور درمیانے آنگن والا یہ حساب جس قدر بے رونق و ویران نظر آتا تھا، ایک عرصہ قبل تمام رونقوں و مسرتوں کی کہکشاؤں میں سے چھوٹی تھیں۔ جب اس گھر کی بنیاد رکھنے والے عکراں موجود تھے جن کی نگاہوں میں نہ رشتوں کی تقسیم تھی، نہ محبتوں کی تفریق، جن کی سرسٹیں و چاہتیں سب کے لیے یکساں تھیں۔ ان کی موجودگی میں یہ ایک بڑا اور خوب صورت پورٹن تھا جو اب بڑی بھابھی راحیلہ کے دل کی طرح تنگ اور چھوٹا ہو گیا تھا۔ جب رشتوں میں قاسطے پڑ جائیں، دل احساسات سے خالی ہو جائیں تو گھر میں بھی جگہ تنگ پڑنے لگتی ہے۔ ساس سر کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد انہوں نے بچوں کا بہانہ بنا کر اس طرف کے تین کمرے اور ڈرائنگ روم اپنی طرف لے کر ایک کمرہ اور آنگن ان کی طرف چھوڑ کر دیوار بنا دی تھی۔

حسب معمول نو شاہ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر وظیفے میں مشغول تھیں۔ تینوں بھادجوں کو دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھکا تھا، پھر ان کے انداز و تیور انہیں کسی گڑبڑ کا احساس دلانے کے لیے کافی تھے۔ دیکھنے مکمل ہونے سے قبل وہ بول نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے اٹھ کر پلنگ پر موجود چادر کو درست کر کے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”اری، بو! چھوڑو ان چیزوں کو۔ اگر دنیا ان چٹوں اور وظیفوں سے کامیاب ہونے لگے تو ہر کوئی ہاتھ میں بیس بیس پکڑے اور جائے نماز بچھائے نظر آئے گا۔“ راحیلہ نے بیٹھنے ہی کاٹ وار گنگو کا آغاز کیا۔

”آج کا دور عمل کا دور ہے۔ جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے، یہ ہم نہیں کہتے ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں۔“ مچھلی ممانی نے بھی مٹھر میں حصہ جمایا۔

”کل کو اچھا کرتیں تو آج کو اچھا پاتیں۔ کیا دیا ہے تمہارے کاموں نے۔ کل بھی تم ہمارے در پر پڑی تھیں اور آج بھی پڑی ہو۔ یہ سب کرنے سے بہتر تھا، اپنی زبان کو سنبال کر یوتیس تو آج یہ دن دیکھنے نہ پڑتے ہم لوگوں کو۔“ چھوٹی ممانی رخسانہ بھی پوری تیاری سے میدان میں آئی تھیں۔

”تم خود تو اچھی بیوی بن سکیں نہ اچھی ہو۔ کم از کم بیٹی کو تو اچھی لڑکی بننے کی تربیت دے دیتیں۔ خود تمہاری زندگی جیسے تیسے گزر گئی اور گزر جائے گی لیکن اس بلا کا سوچو۔ اس کا کیا ہوگا جس کے آگے پوری زندگی پڑی ہے، جو بد تمیزی اور ڈھٹائی میں تو سب سے آگے

تھی ہی، اب تو ہاتھ بھی چلانے لگی ہے۔“

”آئے ہائے بڑی بھائی! یہ کب کی بات ہے؟“ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”کل شام جب زرقون بڑے بھائی کے ہاں جا رہی تھیں، بس کرن وہیں اڑ گئی کہ وہ صدمہ کے ساتھ کیوں جائے گی، حالانکہ

زرقون کی عادت تو سب کو معلوم ہے کہ وہ کس قدر مصحوم اور شرمیلی لڑکی ہے۔ بھلا اس دور میں کہاں ہوتی ہیں ایسی بے زبان لڑکیاں۔“

حسب عادت انہوں نے اپنی پیشوں کی شان میں قصیدہ گوئی شروع کر دی۔

”یہ صدمہ کا تذکرہ کیوں آیا؟“ آسیہ ممانی کے کان کھڑے ہوئے۔

”اس کی وجہ سے تو ہنگامہ کھڑا ہوا۔ زرقون جانے کے لیے نکلی تھی۔ صدمہ کی خواہش تھی کہ وہ زرقون کو چھوڑ کر آئے لیکن کرن سے یہ

برداشت نہیں ہوا اور اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔“ بڑی ممانی چھوٹی ممانی کے بگڑتے تیور دیکھ کر گزبڑا گئیں۔

”صبح تو تم بتا رہی تھیں کہ تم نے خود صدمہ سے کہا کہ زرقون تمہا جا رہی ہے تم چھوڑ آؤ اور اب کہہ رہی ہو کہ صدمہ نے خد بگڑی کہ وہ خود

چھوڑ آئے گا۔“ غصے میں وہ بھول گئیں کہ صبح یہ پلان بنا تھا کہ ہر بات سن کر یہ اٹکھا کرنا ہے جیسے وہ لاعلم ہیں۔

”بھائی! آپ بھول رہی ہیں صبح ہمارے درمیان کیا بات ہوئی تھی۔“ رخسانا ہنسی سے ان کے کان کی طرف منہ لے جا کر گویا ہوئی۔

”میں سب سمجھتی ہوں، جو تم کرنا چاہتی ہو لیکن اپنی یادداشت میں یہ بات بٹھا لو۔ اس گھر کی کوئی لڑکی میری بہو بننے کے قابل

نہیں ہے۔ تم خواہ کتنے میرے بیٹوں پر ڈورے ڈالنے یا مجھے پٹانے کی کوشش کرو۔ ہو گا وہی جو میں چاہوں گی۔“

”بھائی! عقل کے ناخن لو۔ ہم یہاں اس کا فیصلہ کرنے آئے تھے یا آپس میں لڑنے مرنے۔ یہ ماں بیٹی تو چاہتی یہی ہیں کہ ہم

آپس میں لڑ جھگڑ کر الگ ہو جائیں اور یہ پیش کریں۔“ ساجھی کی ہانڈی چودا ہے پر پھوٹ گئی تھی لیکن آسیہ بہت چالاک و سازشی ذہن کی

مالک تھیں۔ وہ شکار کو کند چھری سے ہلاک کر دینے والوں میں سے تھیں۔ ایسے لوگ کبھی معاف نہیں کرتے، سو وہ بھی جیٹھانی کو مزہ چکھانے

کا عہد دل میں کر کے بظاہر مصحوم و بے ضرر نظر آنے لگیں۔

”آپ بھی سوچتی سمجھتی نہیں، بس شروع ہو جاتی ہیں۔ بندے کو اتنا جذبہ بانی بھی نہیں ہونا چاہیے۔ راحیلہ پھر نام نظر آنے لگی تھیں۔“

”ہو جاتی ہے، عقل خراب ہے۔ ایک پریشانی ہو تو بندہ بروا داشت کر جائے۔ عام کاروبار کی طرف سے پریشان ہیں۔ حمزہ اور صدمہ

کی پڑھائی کا آخری سال چل رہا ہے۔ اس دور میں جس طرح ہم گھر چلا رہے ہیں، یہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا اللہ۔“

”ہاں بالکل درست کہہ رہی ہیں آپ۔ مہنگائی تو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ گھر کے مرد کس قدر محنت کرتے ہیں۔ اسی ہنٹے تو سنا ہے

کہ عام بھائی کو کاروبار میں لاکھوں کا قاعدہ ہوا ہے اور اسی خوش میں وہ آپ کے لیے گولڈ کی چوڑیاں بخوار ہے ہیں، ڈائمنڈ جڑوا کر۔ اب

کیا کریں اتنی مہنگائی میں بے چارے چوڑیاں ہی خواہ سکتے ہیں۔“

”پھر کیا کریں۔ پیٹ کا کھایا کون دیکھتا ہے۔ تن پر اعلیٰ کپڑے اور زیور ہوں تو عزت ملتی ہے، نام ہوتا ہے، پھر ہمارا تو اعلیٰ مقام

ہے سوسائٹی میں۔ دل مار کر یہ سب کرنا پڑتا ہے، ورنہ حالات تو ایسے نہیں ہیں۔ لوگوں کو نظر آتا ہے، لاکھوں کا قائد ہوا ہے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ افسران کو نذرانے دینے کے بعد پتہ کیا ہے۔“ ان کے درمیان چلنے والی چپقلش جاری ہو چکی تھی، جس سے وہ اپنا مشن بھول گئی تھیں۔ نوشاہہ تیزی سے اپنا وظیفہ مکمل کرنے میں مشغول تھیں۔

”میں نے سنا ہے آصف نے تمہارے نام سے ڈیفنس میں چھ کمروں والا پارٹمنٹ خریدا ہے، ایک کروڑ میں۔ اگلے ہفتے تمہاری ویڈیو ایسوسی ایٹس پر گفٹ کریں گے اور عامر نے کوئی شوروم خریدا ہے۔“ انہوں نے بھی ان ہی کے انداز میں مصیبت سے کہا۔

”بھابی! وہی بات آگئی کہ ہر جگہ ہاتھ چلانا ہوتا ہے۔ اس ہوشربا مہنگائی میں ایک کاروبار سے کہاں گزارا ہوتا ہے پھر بینش، مہوش کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کیا جائے گا۔ اس دور میں تو جتنا جینز رو اتنی ہی بیٹی کی قدر ہوتی ہے۔“

نوشاہہ اپنا وظیفہ مکمل کر کے ان کے قریب نہ آتی تھی تو نہ معلوم کب تک ان کی زر، زمین و دولت کی من پسند منگلو جاری رہتی۔ ان کو قریب دیکھ کر وہ ایک نکتہ اپنے حواسوں میں لوٹ آئی تھیں۔

”سنبھال کر رکھو اپنی لاڈلی کو۔ زبان تو چلتی ہی تھی اب ہاتھ بھی چلانے لگی۔ نہ معلوم کیا گل کھلائے گی۔ تمہاری کرنی کو بھگتے کے لیے ہم بھائی بھادوچ موجود ہیں مگر اس کو کون بھگتے گا؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں بیوی بھابی۔ کرن کے چلن اچھے نہیں ہیں۔ اس گھر میں اور بھی لڑکیاں ہیں جن کی کوئی آواز تک نہیں سنتا۔“

”رہنے دیں رخسانہ بھابی! بیٹنس کے آگے بین بجانے سے کیا قائدہ، جب اسے خود ہی پروا نہیں ہے۔ اس کو چھوٹ تو اس نے خود ہی دے رکھی ہے، ورنہ اس کی ہمت ہو سکتی ہے۔“ ان دونوں کی طرح آسیہ کی زبان بھی زہرا گل رہی تھی۔

”اللہ گواہ ہے کہ میں نے کبھی بھی کرن کی کسی بھی معاملے میں حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ہمیشہ اس کی مخالف رہی۔ دل شکنی اس خیال سے کی کہ کل کو وہ خود کو اس گھر کے لوگوں کے برابر سمجھ کر من مانی نہ کرے۔ حکمرانی کا خیال دل میں نہ لائے۔ یہ سوچ، یہ خوف مجھ پر اس قدر

حادی رہا کہ میں نے اسے وہ مقام، وہ محبت بھی نہ دی جو ماں ہونے کے ناتے مجھ پر لاگو ہے۔ جب عورت کی کوکھ آباد ہوتی ہے تو متا کے جمر نے اسی دم سے پہنے لگتے ہیں۔ محبت کی فصل تب ہی سے ہریالی پانے لگتی ہے اور مجھ کو بد نصیب کو دیکھو کہ اپنی متا کو اپنے ہاتھوں چکل کر

میں جس طرح زندہ ہوں، آپ ماں ہونے کے ناتے میری اس تڑپ کو سمجھ سکتی ہیں۔ اگر آپ بھی مجھے قصور وار سمجھتی ہیں تو جو سزا دینا چاہیں، مجھے منظور ہوگی۔“ وہ کسی مجرم کی طرح ان کے درمیان بیٹھی تھیں۔

”لو کر لو بات۔ یہاں تو کہانی ہی اُلٹی چلتی ہے۔ اتنا کچھ ہونے پر بھی ہمیں ہی ستایا جا رہا ہے کہ ہم قصور وار ہیں۔“ راحیلہ بختر آئینہ لہجے میں غصے سے گویا ہوئیں۔

”یہ نہیں پوچھا جا رہا کہ بات کیا ہوئی ہے اور اپنی ہانگے لگیں۔“

”پوچھتے ہیں وہ جو لاعلم ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔“

”پھر خود ہی انصاف سے فیصلہ کرو۔ کرن کو ایسا کرنا چاہیے تھا؟“

”آہ! مجھ جیسے لوگ جو اپنی بد نصیبی سے اپنوں کے حق پر آپڑے ہوں تو کہاں حق، انصاف و فیصلوں کی استطاعت رکھتے ہیں بلکہ میں آپ لوگوں سے معافی مانگتی ہوں کرن کی طرف سے، اس کی نادانیوں و بے وقوفیوں کی طرف سے جو نہ معلوم کس دن اپنی اوقات و حیثیت کا تعین کرے گی۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر گلو کیر لہجے میں گویا ہونئیں اور وہ تینوں اٹھ کھڑی ہونئیں۔

”تم تو بے مارے کی توپہ کر داتی ہو۔ ہمارا کام تھا تمہارے علم میں یہ سب لانا۔ کل کو دو بارہ ایسی بات ہوئی تو اس کے ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے۔“ وہ جس طرح آئی تھیں اسی طرح واپس چلی گئیں اور کرن جو بہت دیر سے کھڑی ان کی اندر سے آتی آوازیں سن رہی تھی، مزید ستون کی آڑ میں ہو گئی۔ کل ہونے والی بد مزگی سے ابھی تک اس کی طبیعت مکدر تھی اور اب اُن سے کوئی بحث کرنے کی طاقت وہ خود میں نہ پاتی تھی، سو خاموشی سے سب سختی رہی تھی اور ان کے جانے کے بعد کمرے میں چلی آئی۔ نوشاہہ کمرے میں نہیں تھیں۔

”یہ لو چائے پیو۔“ وہ ٹرے میں دو کپ چائے لے آئی تھیں۔

”سیرادل نہیں چاہ رہا۔“

”دل کی بھی خوب رہی۔ نہیں بنا کر دو تول چاہتا ہے۔ اب بیٹائی ہے تو دل نہیں چاہ رہا۔“ ماں کی ناراضگی کے خیال سے وہ کپ لے کر آہستہ آہستہ پینے لگی۔

”مما! اب آپ کو فیصلہ کرنا پڑے گا، کمرے کے گھر میں رہنے کا۔ یہاں زندگی اتنی تنگ کر دی گئی ہے کہ سانسوں پر بھی پہرہوں کا گماں ہوتا ہے۔“ اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔

”کمرے آسمان سے ہاتس کر رہے ہیں، پھر ہم اکیلی کس طرح فیروں کے درمیان رہیں گی۔“

”بجلی اور گیس کے چارجز جس قدر ہم سے وصول کیے جاتے ہیں، اسی رقم میں مزید رقم ملا کر ہم با آسانی کرایہ انورڈ کر سکتے ہیں، پھر تہا ایک فرد ہوتا ہے۔ ہم دو ہیں اور دو کیمے گا فیروں کے درمیان ہمیں وہ اپنائیت و محبت ملے گی جو انہوں میں نکلا ہو گئی ہے۔“

”دیکھتی ہوں۔ پہلے بڑے بھائی سے اجازت لی جانا ہوگی۔“

”ہم کو ان اُلجھنوں سے نکلنا ہوگا اور خود فیصلہ کرنا ہوگا۔ تینوں ماموں اپنی بیویوں کی لگا ہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان ہی کی زبان بولتے ہیں۔ ایسے میں ان سے کسی اچھی بات کی توقع رکھنا عبث ہے۔“ کرن چائے کے خالی کپ کچن کی طرف لے جاتی ہوئی بولی۔

نوشاہہ کے لیوں پر اضمحلال بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کرن اپنی کم عمری کے باعث اتنی گہرائی میں نہیں سوچ سکتی تھی جو سوچیں انہیں آکٹوپس کی طرح جکڑے ہوئے تھیں۔

بھائیوں کے احسان تلے جکڑی ہوئی عورت کس طرح اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتی ہے۔ یہ آج نہیں بہت عرصہ قبل سے ان کی بھی خواہش رہی تھی کہ وہ ان سے علیحدہ رہیں، خواہ ڈمکنا کرایہ ادا کرنا پڑے، وہاں انہوں کی دی ہوئی اذیت بھری زندگی نہ ہوگی اور سب سے

بڑی دولت یعنی سکون ہوگا جو ان ماں بیٹی کی زندگیوں سے روٹھ گیا تھا۔

وہ موقع کی تلاش میں رہیں کہ کبھی بھائی تنہا ملیں تو بات کریں۔ شاید وہ مان جائیں پھر کچھ دن بعد جب سب گھر والے کہیں شادی میں گئے ہوئے تھے۔ بڑے بھائی عامر انہیں تہمال گئے اور انہوں نے ڈرتے جھپکتے ہوئے اپنا مدعا بیان کر ڈالا تھا۔

”کیوں اس گھر میں کیا تکلیف ہے تمہیں۔ پورے گھر پر حکمرانی کرتی ہو۔ ایک عورت کو جو جو گھر گراہتی چلانے میں جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اس سے آزاد ہو۔ آرام و سکون سے رہتے رہتے کیا ہوتا ہے تمہیں، جو کرائے کے گھر کی بات کرتی ہو؟۔ عامر بھائی کے لہجے میں سخت ناپسندیدگی و بیزاری تھی۔

”بھائی جان! تینوں بھائیوں کا رویہ ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔ اب تو بچیاں بھی کسی لحاظ و مروت کی قائل نہیں رہیں۔ میرے ساتھ جو ہوتا آیا، میں برداشت کرنے کی عادی ہو گئی ہوں مگر کرن بیٹی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس میں برداشت و تحمل آئے گا۔ چند دن قبل معمولی سی بات پر کتنا ہنگامہ ہوا ہے۔ اسی.....“

”معلوم ہے مجھے۔ سب بتایا تھا تمہاری بھائی نے۔ تکمیل ڈال کر رکھو اسے۔ دوپے کیا کمانے لگی ہے، خود کو مشترک سمجھنے لگی ہے۔ سبھاؤ اسے اپنی حد میں رہے، ورنہ اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور تم بھی اپنی اتھقانہ حرکتوں کو چھوڑ دو۔ اس مہنگائی کے دور میں تم ہمارے درمیان رہ رہی ہو، شکر کرو آئندہ میں ایسی کوئی کجواس نہ سنوں۔“

دل اتنی بار ٹوٹا تھا کہ اب مزید ٹوٹنے کی گنجائش نہ رہی تھی مگر پھر بھی ایک دراز سی تھی جو ان کے دل سے نکل کر روح تک پھیلتی چلی گئی۔ اتنا کٹھور، اتنا سنگ دل، اتنا بداحساس ان کا ماں جا یہ تھا۔ ان کا اپنا خون، اپنا سگا بھائی، بھائی جو بہنوں کے تحفظ و خوشیوں کی خاطر جانیں لانے کا عزم رکھتے ہیں، پھر یہ کیسے بھائی تھے جن کی خود غرضی و بے مروتی کی انتہا تھی۔

☆.....☆.....☆

عادلہ کی بہن فری کی برتھ ڈی تھی۔

وہ چھٹی کے بعد اس کے گھر چلی آئی تھی۔ فری کے لیے گنٹ اس نے نکل ہی خرید لیا تھا۔ گولڈن گلر کی خوب صورت رسٹ و ایج تھی جو فری کی نازک سی کلائی پر فٹ رہی تھی۔ وہ یہ تحفہ پاکر بہت خوش تھی اور بار بار کرن کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

عادلہ کی امی نے شام کی چائے کے ساتھ چھوٹے، دہی بیڑوں اور پاپڑوں کا اہتمام کیا تھا اور رات کو آلو کی طاہری تیار کی تھی۔ کرن کے علاوہ کوئی اور مدعو نہ تھا اور حسب عادت کرن ان لوگوں کے ساتھ بہت خوش تھی۔ اسے یہاں بھرپور پذیرائی ملتی تھی۔ ہر کوئی محبت و احترام سے پیش آتا کہ اسے اپنے ہونے کا احساس ہونے لگتا۔ گھر کی کھٹی کھٹی فضا میں ہر دم بیزار و چڑچڑی نظر آنے والی کرن ان کے درمیان سچ چمکنے لگتی۔ اس کا یہ ہنسا، مسکراتا روپ اسے از حد جاذیبیت و دل کشی بخشتا تھا۔

رات عشاء کی نماز کے بعد نواشاہ نے حمزہ کو اسے عادلہ کے ہاں سے لینے بھیج دیا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ چلی آئی تھی۔



”بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ کیا بات ہے؟“ ڈرائیواگ کرتے ہوئے حزرہ نے اس کی جانب دیکھا۔ لائٹ پر پل لکھر ایئڈری والے سوٹ میں سادہ چہرے کے باوجود وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وحسی مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر اُجالا نکمیر دیا تھا۔

”عادلہ کے گھر آ کر واقعی مجھے خوشی ہوتی ہے۔ نوٹے فرش اور جھرتی دیواروں والے اس چھوٹے سے گھر میں خوشیوں کے خزانے بکھرے ہوتے ہیں، جو وہاں جاتا ہے، مالامال ہو جاتا ہے۔ ان چھوٹے گھروں میں رہنے والے لوگوں کے دل بڑے گھروں میں رہنے والوں کی طرح تنگ اور چھوٹے نہیں ہیں۔ بہت وسعت و کشادگی ہے ان کے دلوں میں۔“

”مائی گاڈ! تم نے پھر ملٹر کے تیر برسا نے شروع کر دیے۔ کبھی تو بخش دیا کرو۔“

”آسیہ ممانی کو معلوم ہے کہ تم مجھے پک کرنے آئے ہو؟“

”جی نہیں، مجھے پھوپھو جان نے کہا اور میں آ گیا۔“

”ممانی کو معلوم ہو گیا تو پھر ایک نیا ہنگامہ شروع ہو جائے گا اور میں اب کسی بھی قسم کے ہنگامے سے بچنا چاہتی ہوں۔“ اس کے لہجے میں نجی آواز آئی تھی۔

”اوکے! مجھے اپنے دوست کے پاس جانا ہے، کبائٹن اسٹڈی کے لیے۔ میں وہیں سے صبح یونیورسٹی نکل جاؤں گا۔ واپسی شام تک ہوگی۔ میں تمہیں ایک اسٹریٹ پہلے اتار دوں گا۔ آرام سے چلی جانا۔ نہ کوئی دیکھے گا، نہ مینشن ہوگی۔“ محتاط روی و ایثار پیشہ حزرہ کی فطرت ہی اتنی نیک تھی کہ وہ لبوں پر آیا پھڑ پھڑاتا جملہ بند کر گئی۔

انسان جب حالات کی نامہرمانیوں کے زیر سایہ چل رہا ہو تو ہر نئی بات بگڑ جاتی ہے۔ تمام تدبیر الٹ جاتی ہے۔ حزرہ اسے گھر سے کچھ فاصلے پر اتار کر چلا گیا تھا۔ اوپر لیمز پر کمرے عاصم باموں کا رکنہ پھان کے مگر کار سے اتر کر آنے والی لڑکی کو وہ اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ کوشی کے گیٹ میں داخل نہ ہو گئی، پھر وہ طوفانِ بلاخیز کی طرح نیچے آئے تھے۔

”خبردار! اپنے پنجس قدموں سے اس ویلین کو ناپاک مت کرنا۔“ وہ اس طرح گرج دار لہجے میں گویا ہوئے کہ وہ ٹھک کر وہیں رُک گئی اور ان کی بلند آواز سن کر گھر کے تمام لوگ بھی وہاں آگئے تھے جن میں نوشابہ بھی شامل تھیں۔

”اس سے قبل میں تمہاری آزار و تشدد کے متعلق سنتا تھا اور یقین نہیں کر پاتا تھا مگر آج تمہاری آوارگی و بد چلنی میں نے خود دیکھی ہے۔ کون تھا وہ، جو تمہیں چوروں کی طرح گھر سے دور اتار کر گیا ہے۔ ایسی حرکتیں وہی لوگ کرتے ہیں جو کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، جنہیں کسی کا ڈر ہوتا ہے۔“

”بھائی صاحب! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ وہ کوئی غیر نہیں.....“

”تم خاموش رہو۔“ غیض و غضب میں وہ اس قدر بے قابو ہو رہے تھے کہ انہوں نے زوردار تھپڑ نوشابہ کے چہرے پر مارنے ہوئے بات قطع کی۔

”یہ سب تمہاری ہی ڈھیل ہے جو اسے ہماری ناک، ہماری عزت مٹی میں ملاتے ہوئے رتی بھر خیال نہ آیا۔“

”دیکھ لی اپنی آنکھوں سے حقیقت! اب یقین آ گیا ہوگا۔ بات اب برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ یہ جوان بچوں کا گھر ہے۔ اس کی صحبت میں لڑکے بگڑ گئے تو کبھی نہ سدھر پائیں گے اور لڑکیاں تمام عمر گھر میں بیٹھی رہ جائیں گی۔ کوئی نہیں پوچھے گا، جس گھر میں ایسی لڑکی ہو، اس گھر میں شریف اور اچھے لوگ نہیں آتے۔ بس اب فیصلہ ہو کر رہے گا۔ یا تو یہ اس گھر میں رہیں گی یا ہم۔“ بڑی ممانی کی آج دلی مراد برآئی تھی، سوانہوں نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا تہیہ کیا۔

”بھابی! ہم کیوں اپنا گھر چھوڑیں۔ جانا تو ان قتنوں کو ہوگا۔“ آسیہ کرن کو ناگواریت سے دیکھتی ہوئی راحیلہ سے گویا ہوئیں۔

”نہیں آسیہ بھابی! راحیلہ بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں، اگر یہ یہاں رہیں تو ہم نہیں رہیں گے۔“ وہ سب اپنا اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ ان کے لہجوں میں کڑواہٹ، آنکھوں سے نفرت چمک رہی تھی۔ نوشاہہ بھائی کے طرز عمل اور چھڑے سے گم سم کھڑی تھیں۔ زخمی تو وہ پچھلے تیس سالوں سے لہو لہو ہوتی رہی تھیں لیکن اس وقت بیٹی پر ناز بیابہتان اور بھائی کے نفرت انگیز سلوک نے ایسا کاری زخم لگایا کہ وہ مفلوج کھڑی رہی گئی تھیں۔

”یہاں کھڑی کھڑی من کیا دیکھ رہی ہو۔ اس گندگی کی پوٹ کو لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہماری زندگی سے نکل جاؤ۔ آج سے تم ہمارے لیے مرتگیں اور ہم تمہارے لیے۔“ بڑے ماموں کی آواز ساکت و صامت کھڑی کرن کو حواسوں میں لے آئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر بھائی کے آگے گڑ گزرتی ہوئی ماں کو تمام کر بولی۔

”مما! اتنا کچھ سننے کے بعد بھی آپ اس جگہ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہیں۔ آپ کے رو برو آپ کی بیٹی پر بد چلنی و آوارگی کے الزامات لگائے گئے ہیں پھر بھی آپ ان کے پاؤں پکڑ کر رحم کی التجا کر رہی ہیں۔ تعجب ہے مما! از حد حلال۔ اب تو آنکھیں کھولے، پہچاننے مجھے، میں آپ کی بیٹی ہوں۔ وہ بد نصیب بیٹی جو باپ سے تو دور رہی مگر ماں کے قریب رہ کر بھی ماں کا قرب نہ پاسکی۔ ان خوبی رشتوں کی خاطر آپ نے اپنے خون کی پروا نہ کی تھی۔ آج دیکھ لیں کیا اچھا و اعلیٰ انجام ملا ہے، آپ کی چاکری کا۔“

”زبان بند کر ڈیل لڑکی! اس سے قبل کہ اس کے ناپاک خون سے میرے ہاتھ رنگ جائیں، دفع ہو جاؤ یہاں سے اور کبھی پلٹ کر یہاں کا رخ نہ کرنا۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا۔“ ان کے لہجے میں سختی و قطعیت تھی۔ لفظ جیسے قوت گویائی سے محروم ہو گئے تھے۔ وحشت و خاموشی بین کرنے لگی تھی۔ حاصم اندر چلے گئے تھے۔ وہ سب وہیں تھے۔ خاموش لب اور چٹکھماتی ہوئی آنکھیں ان ماں بیٹی پر مرکوز کیے ہوئے گویا وارننگ دے رہی ہوں کہ رشتہ ناسب ٹوٹ گیا، اب یہاں کچھ نہیں ہے۔ دل کے دروازے تو مدتوں قبل مقفل ہو چکے تھے۔ آج گھر کے دروازے بھی بند کیے جاتے ہیں۔

بعض اوقات ایک فیصلے کے لیے سالوں گزر جاتے ہیں اور فیصلہ نہیں ہو پاتا اور کبھی فیصلے کے لیے ایک ہل، ایک ساعت، ایک لمحہ کافی ہوتا ہے اور یہ لمحہ نوشاہہ کی زندگی میں در آیا تھا۔ انہوں نے مضبوطی سے کرن کا ہاتھ پکڑا تھا اور ایک الوداعی نگاہ اس گھر پر ڈالی تھی

جہاں انہوں نے شادی سے قبل حسین و عکرماتی سے بھرپور دن گزارے تھے، پھر وہی جنت دوزخ بن گئی۔ ان کا اقتدار چھین کر اسیری کی زندگی بھی اسی گھر میں ملی تھی۔ وہ یاد کرنا بھی چاہتی تو تکلیف دہ باتیں اچھی یادوں پر حاوی ہو جاتی تھیں۔ کانچ کا برتن ٹوٹ جائے تو افسوس ہوتا ہے۔ خون کا رشتہ ٹوٹنے پر ملال تک نہ تھا۔ بھابیوں، بھتیجیوں کے سر دویگانہ رویوں نے انہیں اتنا گھائل کیا کہ وہ کرن کا ہاتھ پکڑے پکڑے لڑکھڑاتے قدموں سے گیت عبور کر گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”قارگاڈ سیک اپنا موڈ تو درست کرؤ۔“

”تمہیں میرے موڈ سے کیا لینا ہے، جو تم نے چاہا وہ میں نے کیا۔ اب کیا پراہلم ہے؟“

”غبارے کی طرح منہ پھلا کر پارٹی میں جاتے ہوئے اچھے لگو گے؟“

”آئی ڈونٹ کیئر۔“ لاپرواہی و بے زاری اس کے چہرے پر وجیہ نقوش سے ظاہر تھی۔

”ہاں بھئی تمہیں کیئر ہونے بھی کیوں گئی۔ بہت ہیں تمہاری پروا کرنے والیاں۔ تمہارے زربخ روشن، وجود تابندہ کی اسیر۔“ اس

کے اعجاز میں قدرے شوخی و معنی خیزی تھی۔

”تمہاری اس بکواس سے مجھے المیہ ہونے لگی ہے۔“ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرن لیا تھا۔ یہ ایک لمحہ غفلت کا، اس

کے لیے بھاری ثابت ہوا۔ سڑک کر اس کرتی ہوئی دو خواتین اس کی کار سے ٹکرانی تھیں۔

”اوہ شٹ! وہ دونوں برق رفتاری سے کار سے نکل کر ان کی طرف بڑھے تھے جہاں نوجوان لڑکی اٹھ گئی جبکہ دوسری عمر رسیدہ

خاتون کا سر پونٹ سے ٹکرانے باعث زخمی ہو گیا تھا اور اس میں سے خون نکل رہا تھا۔ خون دیکھ کر لڑکی بے احتیاجی و خوف سے چیخنے چلانے لگی تھی۔

ان دونوں نے اسے سمجھا بجا کر خاموش کرایا تھا۔ کچھ وہ بھی خون دیکھ کر پریشان تھی۔ انہیں لعنت ملامت کرتی، ان کے ہمراہ ہاسپل چلی آئی

تھی جہاں اسے گرنے کے باعث معمولی خراشوں کے باعث ٹریٹمنٹ دے کر فارغ کر دیا گیا تھا، البتہ دوسری خاتون کی حالت سیریس تھی۔

ان کا خون بھی خاصا بہہ چکا تھا اور پی پی لیول بھی از حد بڑھا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش تھیں۔ شعبہ گبداشت میں انہیں ایڈمٹ کر دیا گیا تھا۔

”مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ ہم پارٹی میں نہیں پہنچ سکیں گے اور وہی ہوا اور ہوتا بھی کیوں نہیں، جب تمہارا تھوڑا سا جوتا ہے تو کچھ نہ

کچھ پراہلمز کری ایٹ ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اب قاریہ کو کیا جواب دوں گا۔ کس طرح اس کی ناراضگی دور کروں گا۔“ سعد انس سے مخاطب ہوا

تھا۔ وہ دونوں ہاسپل کے لان میں موجود تھے۔

”یہ تمہارا ہیڈک ہے۔ ویسے بھی وہ محترمہ اس قدر روٹھی ہیں کہ تم کو اب تک منانے اور ناراضگی دور کرنے کے ہزاروں طریقے

ازر ہو جانے چاہئیں۔“ انس نے شانے اچکا کر کہا۔

”ہاں جیسے تمہاری محترمہ تو روٹھنا جانتی ہی نہیں ہوں گی۔“

”مجھے تمہاری طرح غمخیزے برداشت کرنے کی عادت نہیں ہے اور نہ ہوگی۔“

”یہ دعوے قبل از وقت ہیں میری جان! شادی کے بعد پوچھوں گا۔“

”ڈیم اٹ! اندر چل کر دیکھو۔ ان خاتون کو ہوش آیا یا نہیں۔ ہم کب تک یہاں رہ سکتے ہیں۔ گھر پر گرنی کی نرس ڈیوٹی ٹائمنگ سے

ایک پل قانون نہیں نکلتی۔ اس کی ٹائمنگ ختم ہونے والی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہاں سے۔“ انس نے رست واضح دیکھتے ہوئے مگر مندی سے کہا۔

”چار جربلز کی کنٹیکٹ تم نے کر دی ہے۔ چلو چل کر معلوم کرتے ہیں۔ ان کے کسی فیملی ممبر سے کنٹیکٹ کر کے صورت حال بتا دیجے

ہیں، پھر ہم آزاد ہیں۔“ وہ دونوں اس لڑکی کے پاس چلے آئے جو آئی سی سے اٹیچڈ کارڈ اور میں رکھے صوفے پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

”ارے آپ رو کیوں رہی ہیں۔ پلیز خاموش ہو جائیں۔ آپ کی مدد کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں، وہ

کچھ دیر بعد ہوش میں آجائیں گی۔ آپ کہاں رہتی ہیں۔ کنٹیکٹ نمبر دیں، آپ کے گھر والے آجائیں تو آپ کو تسلی ہو جائے گی۔“ سعد

موبائل ہاتھ میں لے کر اس سے مخاطب ہوا مگر وہ ہنوز خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

”آپ اپنے گھر کا فون نمبر یا موبائل نمبر دیں۔ ہم انہیں انقارم کرنا چاہتے ہیں۔“

”ہمارا کوئی گھر نہیں ہے اور نہ ہی کوئی رشتہ دار ہے۔“ لڑکی کے ہنسنے لہجے میں ایسی آرزو کی وہ بے چارگی کی تڑپ تھی کہ سعد جیسا

نرم خوبند شدیدہ متاثر ہوا تھا جبکہ انس نے چونک کر کڑی و تنہیدی نگاہ اس کے ہنسنے چہرے پر ڈالی تھی۔

”سنسز! کوئی نہیں ہے آپ کا؟“ سعد کے لہجے میں جتنی ہمدردی و ترس تھا، انس کے چہرے پر اتنی ہی کوفت و ناپسندیدگی تھی۔

”نہیں کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔“ وہ شدتوں سے رو پڑی تھی۔

”پھر آپ زمین سے برآمد ہوئی ہیں یا آسمان سے نازل ہوئی ہیں۔“ اس کے سر و خشک اور مضحکہ اُڑاتے سوال نے اسے جھنجھوڑ

ڈالا تھا۔

”بلی ہیو یور سیلف یا! کیا کر رہے ہو۔ وہ اتنی ڈکھی ہے۔ تم کس طرح بات کر رہے ہو۔“ سعد اس کا مزاج جانتے ہوئے اس کو

بازو سے پکڑ کر دوڑا کر گیا ہوا۔

”عقل استعمال کرو۔ جب ان کا گھر اور رشتے دار نہیں ہیں تو وہ کہاں اور کس طرح رہیں۔ یہ اسٹوری بہت پرانی ہے۔ ان بے

سہارا اور بے گھر خواتین کو اب سب کچھ چاہیے ہوگا۔ آج سہارا اور گھر کل وہ آپ کی تمام حق حلال کی کمائی لوٹ کر ایسی قاصب ہوں گی کہ تم

سوچتے رہ جاؤ گے کہ انہیں زمین نکل گئی یا آسمان ہڑپ کر گیا۔“

”وہ ایسی نہیں ہیں یا! عقل سے ہی شریف و مظلوم نظر آ رہی ہیں۔“

”سب اداکاری ہے، ڈرامہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کار سے بھی جان بوجھ کر گرائی ہیں۔“

”ایکسکیوز می مسٹر! آپ اپنی بکواس بند کریں۔ ضروری نہیں ہر کوئی آپ کی گھٹیا سوچ کا عکس ہو۔ جو آپ سمجھتے ہیں، وہی ہو۔“ وہ

ان سے کچھ قاصلے پر بیٹھی اس وجہ سے صورت والے بددماغ و مفرد شخص کی بلند گفتگو با آسانی سن رہی تھی۔ اس سے اس کی فضول گفتگو برداشت نہ ہو سکی تو آٹھ کروہیں چلی آئی۔

”ابنی وے! مجھے چیپ آرگومینٹس سے چڑ ہے اور میں کسی لیڈی کے منہ لگتا پسند نہیں کرتا۔ میں جا رہا ہوں۔ گرنی کی نرس جا چکی ہوگی۔ تمہارا دل جب اس سوشل ورکنگ سے بھر جائے تو آ جانا۔ اوکے ہائے!“ وہ ہنک آمیز لہجے میں کہتا ہوں وہاں سے چلا گیا۔ سعد نے اس سے انس کے روپے کی معافی مانگی تھی۔ وہ اس سے کیا کہتی کہ نہ ان کے سر پر جھٹ رہی تھی، نہ قدموں کے نیچے زمین، وہ ماں بیٹی وہاں سے نکل آئی تھیں اور نہ نکلتیں تو دھکے مار کر نکالی جاتیں کہ خالوں کو کھلی اجازت مل چکی تھی۔ وہاں سے نکل کر اس نے سوچا تھا کہ جب تک کرائے کا گھر کا انتظام نہیں ہو جاتا تب تک وہ عادلہ کے ہاں رہ لیں گی۔ اسے یقین تھا کہ وہ فراخ دلی سے انہیں رہنے کی جگہ دیں گی لیکن جب تقدیر مذاق کرنے پر کمر بستہ ہو تو ہر تدبیر بدل جاتی ہے۔ وہاں دروازے پر پڑا ہوا بڑا سا تالا خود کو منہ چڑاتا محسوس ہوا۔ مکملے والوں سے معلوم ہوا کہ عادلہ کے ماموں کی ڈیوٹی کی خبر سن کر وہ لوگ کچھ دیر قبل بہاولپور روانہ ہوئے ہیں۔ یہ پہلا و آخری ٹھکانہ ملنے سے قبل ہی کم ہو گیا تھا۔

رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنی بے گھر، بے در بھنگ رہی تھیں۔ زندگی اس وقت ایسا بوجھ بن گئی تھی جس سے چھٹکارا پانے کے لیے موت انہیں بڑے سکون مل نظر آنے لگی تھی۔ ذہنی طور پر وہ اتنی ماؤف ہو گئی تھیں کہ انہیں محسوس نہ ہوا کہ وہ سڑک کے درمیان چل رہی ہیں اور اسی دم وہ سامنے سے آتی ہوئی کار سے ٹکرائی تھیں۔ نوشاہہ آگے ہونے کے باعث گھائل ہوئی تھیں۔ ان کی ذہنی حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ تھی۔ مزید خرابی ایک سیڈنٹ نے کر دی تھی۔

سعد کے غلوں کی تاثیر تھی یا وہ خود ہی ذہنی خلفشار و در بدری کے خوف میں جکڑ کر اس پر اعتماد کر بیٹھی تھی۔ کم و بیش تمام صورت حال اسے بتا بیٹھی تھی۔

سعد کو گویا اس دور کی بے ثباتی و بے حسی چھو کر نہ گزری تھی۔ وہ سچ سچ ان کی ڈھال بن گیا۔ نوشاہہ کو چند گھنٹے بعد ہوش آ گیا تھا۔ ان کا بی بی نارمل تھا۔ ڈاکٹرز نے احتیاطاً انہیں دو دن ایڈمٹ کرنے کی تلقین کی تھی۔ سعد نے پرائیویٹ روم انہیں لے دیا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ تقدیر ان پر اس طرح بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ اپنوں کے ٹھکرائے ہوئے کو غیر اس طرح اپنائیت و تحفظ دے سکتا ہے جس سے خون کا رشتہ تو درکنار جان کاری کا رشتہ بھی نہ تھا، جو چند گھنٹوں میں سگوں سے بڑھ کر ثابت ہوا تھا۔

”بی بی! اب سے بڑا رشتہ انسانیت کا ہوتا ہے، جب رب مہربان ہو جائے تو پتھروں میں جان ڈال دیتا ہے۔ اس کی قدرت ایسی ہی انوکھی و زبردست ہے۔“ سعد کے جانے کے بعد اپنے محسوسات اس نے ماں سے شیئر کیے تو وہ آہستگی سے بولیں۔

”اللہ اپنے بندے کو اس کے حوصلے سے زیادہ نہیں آزما تا۔ جہاں اس نے دیکھا، ہمارے حوصلے پست ہو رہے ہیں، برداشت کھو چکی ہو کر زمین بوس ہو چکی ہے، وہیں اس نے انسان کے روپ میں فرشتہ بھیج دیا۔“

”مما! آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ بڑی چاہ سے اس نے ماں کا ہاتھ جو متے ہوئے محبت

سے کہا اور نونشاہ نے بھی پہلی بار متا بھرے انداز میں اس کی پیشانی چومی تھی۔

از حد طمانیت و مسرت کا احساس اس کی رگ و پے میں دوڑتا ہوا اس کی روح تک کو شانت کر گیا تھا۔ وہ بے اختیار ان کے کلمے بازوؤں میں سما کر رونے لگی۔ سالوں کی دلوں پر جمی کبیدگی و غبار آنکھوں سے گرتے پاک و شفاف موتیوں سے وصل کر صاف ہو گیا تھا۔

”آج سے قبل مجھے آپ کے ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں خود کو تنہا، کمزور، بے سہارا سمجھتی تھی لیکن اب مجھے متا کا خزانہ مل گیا ہے۔ اب میں کسی سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔“

☆.....☆.....☆

”چھوٹے صاحب! نرس ملازمت چھوڑ کر چلی گئی ہے اور کہہ گئی ہے کہ اگر اسے چار گنا زیادہ رقم ملے تب بھی وہ یہ جاب نہیں کرے گی۔“ اس کے لیے پریشان کن خبر موجود تھی۔ وہ چند ٹاپے کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر گرنی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ان کے بیڈروم کی کھڑکیوں کے شیشوں سے اُبھرنے والی نائٹ بلب کی روشنی نے اسے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”گڈ مارننگ گرنی!“ وہ فریش ہو کر سیدھا ان کے کمرے میں پہنچا تھا۔

”ہوں، گڈ مارننگ! آج صبح ہی صبح شکل دکھا رہے ہو۔ یقیناً یہ سب اس چڑیل صورت نرس کے دفع ہو جانے کی وجہ سے ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی، وہ نموست جب تک یہاں منڈلاتی رہے گی، ہر خوشی، ہر سکھ مجھ سے دور ہی رہے گا۔“ جواباً انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے ہشاش بشاش لہجہ میں کہا۔ انس نے دائیں بائیں جھپکی اور کھنڈک کر انہیں بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ اس دوران ملازمتا شتے کی ٹرائل رکھ گئی تھی۔ وہ ٹینک پہننا انہیں ناشتا کرانے لگا۔ بہت سعادت مند بچی کی طرح انہوں نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے ناشتا کیا اور میڈیسن لی تھیں۔

”گرنی! ایسا کب تک چلتا رہے گا۔ آپ جانتی ہیں کتنی وقت سے گورنرس ملی تھی اور نفل ڈے ڈیوٹی دے رہی تھی۔ آپ نے اسے بھی بھگا دیا اور وہ دوبارہ آنے پر بھی راضی نہیں ہے۔ اس طرح.....“

”ارے وہ اب آئے تو کسی۔ سنڈی کی ٹانگیں تو ڈکڑکڑ گھلے میں نہ لٹکا دوں۔ حرام خور کو کب سے برداشت کر رہی تھی۔ ارے میرے گھر میں آ کر مجھ پر ہی حکمرانی کرنا چاہ رہی تھی۔“ انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”آپ کی کسی سے نہیں بنتی۔ کوئی زیادہ کھانے والی ہوتی ہے تو کوئی از حد سونے والی۔ کوئی گونگی ہوتی ہے تو کوئی خاموش رہنا نہیں جانتی۔ بتائیں اب ایسی ہستی میں کہاں ڈھونڈوں جو آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہو۔“ اس کا لہجہ دھیمہ اور احترام سے بڑھا تھا۔ کچھ کچھ شکایتی ہونے کے ساتھ ہنسنے لگی تھی۔

”بہولے آ میرے لیے۔ بس سارے دلہرے دور ہو جائیں گے۔“

”چند دن بعد اس کا ہاتھ بھی پکڑ کر آپ نے نکال دیا تو میں کیا کروں گا۔ چار سے زیادہ کی اجازت ہمارے مذہب میں نہیں

ہے۔ وہ شوخی سے گویا ہوا تو وہ بھی بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔

”نہیں میرے بچے! وہ تیری بیوی ہوگی۔ میری بہو، اس گھر کی ملکہ، تیرے حوالے سے وہ میری عزت کرے گی، مجھے چاہے گی۔ یہ پیسے کی خاطر کام کرنے والی عورتیں صرف پیسے سے پیار کرتی ہیں۔ ان کے کام میں وہ خلوص، انداز میں وہ اپنائیت ناپید ہوتی ہے جو اپنوں کے قرب سے ملا کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں تم باپ بیٹے ان عورتوں کو زیادہ سے زیادہ پیسہ اس لیے دیتے ہو کہ وہ میرا خیال رکھیں گی، میری خوشیوں کے لیے جتن کریں گی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ انہوں جیسا کوئی نہیں ہوتا ہے۔“ ان کے چہرے پر آرزوگی بھیل گئی تھی۔

”میں سمجھتا ہوں گریٹی اپھر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔ ہمیں اپنی ضرورتوں کے تحت مجبور یوں کی خاطر کپڑا مارتا کرتا پڑتا ہے۔“

”اچھا جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔ تمہاری شام کی فلائٹ ہے۔ شمو سے کہہ کر میں نے بیکنگ کروادی تھی۔ دیکھ لو جا کر ایک دفعہ، کوئی چیز تو نہیں رہ گئی۔“ اپنی طرف سے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے انہیں بروقت یاد آیا۔

”آپ کو اس طرح چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں پکا کو منع کر دیتا ہوں۔“

”ارے میری فکر مت کر، ٹو چلا جائے گا تو تیرا باپ آ جائے گا، میری نگرانی کے لیے۔ یہاں انسر پر انسر لگا ہے، ٹو فکر مت کر۔ ہاں وہ بدبو کے ڈھیر شمو سے کہہ دینا کہ جب بھی میرے پاس آئے تو نہا کر، کپڑے بدل کر اور کوئی خوشبو لگا کر آئے، ورنہ کمرے میں قدم نہ رکھنے دوں گی۔ کم بخت ماری کے پیسے میں ایسی بو ہے کہ دماغ چھیننے لگتا ہے۔“

”مجھے لگتا ہے شمو کے لیے بھی ایک ملازمہ رکھنی ہوگی۔“

”لو بھلا وہ کیوں؟“ ان کی حیرانگی قابل دید تھی۔

”آپ نہیں سمجھیں گی۔“ وہ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

ایئر پورٹ پر سدا سے سی آف کرنے آیا تھا۔ فلائٹ کسی فنی خرابی کے باعث ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ وہ دونوں ریٹائرمنٹ میں آگئے تھے۔ سینڈ ویج اور کافی پینے کے دوران سدا سے کرن اور نو شاپ کی کہانی سنا رہا تھا۔ اس کچھ کہہ نہیں رہا تھا مگر اس کے لیڈوں پر وحشی مسکراہٹ ہا آسانی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ سدا پر ہنس رہا ہے۔

”بلیوی یا رارنگلی وہ بہت مجبور و مظلوم ہیں۔ نہ معلوم کیا ہو گیا ہے ہمارے لوگوں کو، ذہنیوں کو، احساسات کو، تنزلی و بے حسی کے عروج پر ہی پہنچا ہوا ہے، آج کا انسان۔ خود غرضی، مادہ پرستی، بے اعتنائی و بے شافی کی کڑواہٹ نے محبت کی مشاس، مروت کی چاشنی و خلوص بھرے احساسات کو زہر آلود کر ڈالا ہے۔ نفسا نفسی نے بے سکونی و بدگمانی کو جنم دیا ہے۔“ سدا اس کے احساسات کو جانتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ٹو ایک ٹرسٹ کھول لے“ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے“ کے نام سے۔ رنگلی ایک ویک اینڈ کے اندر اندر ایسی مظلوم عورتوں کی قطاریں ہوں گی اور تم سب کی اسٹوری سن کر ان کے ساتھ آنسو بہاتے رہتا۔“

”قارگا ڈسک! تمہیں سمجھانا تو بھینس کے آگے بین بھانے کے مترادف ہے۔“

”اور تمہیں سمجھانا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ کسی ڈنجرس پریکٹیکل کے بعد ہی تم سوشل ورکنگ سے تائب ہو گے۔ قبل از وقت نہیں۔“ کافی پیتے ہوئے وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ سعد نے جواباً کچھ کہنے کے لیے لب واکنے تھے مگر پھر اس کی طرف دیکھ کر خشک انعام میں یولا۔

”کوئی پرابلم ہے؟ کیا وہ نرس ہائے ہائے کہہ گئی؟“

”ہاں۔“ اس کی آواز دہمی تھی۔

”گرینی کو اس سے کیا شکایت ہوئی؟“ سعد نے کافی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ سوتے میں خراٹے بہت لیتی تھی۔“

”بابا!۔۔۔۔۔ یہ گرینی بھی زبردست جو کس کرتی ہیں۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

”پچاگل کی فلائٹ سے یہاں پہنچ جائیں گے۔ دو گرینی کے معاملے میں کتنے کونٹریکٹس ہیں، تم بخوبی جانتے ہو پھر چند دنوں بعد ہماری معروضات مزید بڑھ جائیں گی اور تب تک نئی گورننس کا انتظام نہیں ہوا تو پراہلز بڑھ جائیں گی۔ ان چند دنوں میں تمہیں نئی اور بہترین گورننس کا انتظام کرنا ہے۔ گرینی کی جو اس تو تم جانتے ہی ہو۔“ اس نے وہی فرمائش کی جس کا اسے خوف تھا۔

”گرینی کے لیے گورننس! نہ بابا نہ۔ کوئی گستاخی گورننس سے ہوگی اور گرینی کا جو تا میرے سر پر ایسا پڑے گا کہ آنے والی خلیس سحلی پیدا ہوں گی۔“ سعد نے فوراً ہی کان پکڑتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”پلیز میری پراہلز کو سمجھو۔ میں بہت جلدی واپس آ جاؤں گا۔ دراصل پاپائز نرس اب سبیں سیٹل کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے کئی کام کرنے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری پرابلم حل کر دو گے۔“ سیاہ قمیڑی ٹیس سوٹ میں اس کی پر سنائی نمایاں تھی۔

”اوکے مگر اس شرط پر کہ گرینی کو معلوم نہ ہو کہ میں نے وہ مشکل کام کیا ہے، ورنہ صبح وشام جو کلاس لگے گی وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”اوکے! ایسا ہی ہوگا۔ مجھے اجازت دو۔ انا ڈنٹسٹ ہو رہی ہے۔ فلائٹ ریڈی ہے۔“ بڑی گرم جوشی سے وہ ایک دوسرے سے

گلے ملے تھے۔

☆.....☆.....☆

تقدیر مہربانی کی معمولی سی جھلک دکھا کر رہ گئی تھی۔ ان کے مصائب و مسائل میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ مگر اور جاب کا مسئلہ نہ پھاڑے لنگے کو تیار کھڑا تھا۔

اسکول کی جاب اس سے لے لی گئی تھی، وہاں بھی ممانیوں کی سازشیں کام آئی تھیں۔

دو دن بعد آج نو شاہ کو ہاسپٹل سے چھٹی مل گئی تھی۔ سعد ان دونوں میں باقاعدگی سے چکر لگاتا رہا اور اب بھی وہ ان کے چارج مینٹ کر کے آیا اور انہیں خاموش و خشک دیکھ کر کہنے لگا۔



”ایک در بند ہوتا ہے تو سوکل جاتے ہیں۔ رازق اور پالنے والا تو رب ہی ہے۔ میرے پاس ایک بہت اچھی جاب ہے۔ لوگ اچھے ہیں۔ ماحول بہترین ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہاں آپ کو رہائش بھی ملے گی، عزت و وقار کے ساتھ۔“

”کیا جاب ہے بھائی، جہاں اتنی سہولیات مل رہی ہیں؟“ کرن تجسس ہوئی۔

”ایک ممبر سیدہ خاتون ہیں۔ فالج کے ایک نے انہیں معذور کر ڈالا ہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ خاتون اس گھر میں کوئی ہے نہیں۔ ان کا بیٹا اور پوتا بزنس کے سلسلے میں زیادہ تر باہر رہتے ہیں۔ بیماری بلکہ لاچاری کی نوعیت اور تمہائی کے احساس نے انہیں از حد چڑچڑ اور بد مزاج بنا دیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ ان سے محبت و اپنائیت سے پیش آئیں گی تو وہ آپ کی گرویہ ہو جائیں گی۔ آپ کو چند دن نہایت سہر قفل سے گزارنے ہوں گے۔ یہ یقین میں آپ کو دلاتا ہوں کہ آپ کو سیلری منہ مانگی ملے گی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔“

سکل سے سوچ سوچ کر یہی فیصلہ کر سکا تھا، وہ کرن سے بات کرے گا پھر یہاں آ کر اسے کرن کی جاب چھوٹنے کا معلوم ہوا تو اس کی سوچ کو یقین مل گیا تھا۔ آج صبح مدر صاحب بھی نیویارک سے واپس آ چکے تھے۔

”پیسے کی بھوک ہمیں کبھی نہیں رہی۔ عزت و چاہ کے حوالے ضرور ہے ہیں۔ سروں پر چھت، بیروں تلے زمین، پیٹ میں روٹی، تن پر کپڑا مل رہا ہو تو زندگی بوجھ نہیں لگتی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ راضی ہیں۔ اودھ تھینکس گاڈ! میری بہت بڑی پرابلم حل ہوئی ہے، ورنہ کل سے میں بے حد پریشان تھا۔“

”بیٹا تمہارا قرض تو ہم کبھی نہیں اُتار سکتے، جو تم نے ہمارے ساتھ کیا وہ اپنے بھی نہیں کرتے۔ تم نے اس وقت ہمیں سہارا دیا جب ہمیں اپنوں نے ٹھکرا دیا تھا، پھر یہ ملازمت تو ہماری اشد ضرورت ہے۔ تمہارے دیگر احسانوں میں ایک اور احسان مندی ہے۔ بھلا اس دور میں کوئی اس قدر بے غرض و فریضہ صفت ہو سکتا ہے۔ ہم مرتے دم تک تمہارے احسان نہیں بھولیں گے۔“ نوشاہہ فرط جذبات سے رونے لگی تھیں، جبکہ کرن کی ہلکی سی نم ہونے لگی تھیں۔

”ارے ماں جی! آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں گناہ گار بندہ ہوں اور میں نے کوئی احسان نہیں کیا، البتہ اپنا قرض ضرور اُتار رہے اور وقت آپ کو بھی موقع دے گا۔ آپ بھی اسی طرح کسی کی مدد کر کے بری ہو جائیے گا۔“ وہ انہیں کار میں بٹھائے اُنس پیلس کی طرف روانہ ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ انہیں اپنے حالات زندگی بتاتا جا رہا تھا۔

”میرے بچپن میں ہی والدین کا سایہ میرے سر سے چھن گیا تھا۔ چچا چچی کے زیر سایہ میری تربیت اسی طرح سے ہوئی جس طرح عمو ماجھ جیسے یتیم و مسکین بچے کی ہوتی ہے۔ چچا کی بے نیازی، چچی کی نظرت و ظلم اور ان کے بچوں کی بے دام غلامی کرتے کرتے میرا اپنوں کے علاوہ انسانیت سے ہی اعتبار اٹھ گیا تھا۔ اگر مدر صاحب سے حادثاتی طور پر میری ملاقات نہیں ہوتی تو شاید میں آج آپ کی مدد کرنے کے بجائے اپنی عمرومیوں و زیادتیوں کا حساب لینے کے لیے انسانیت کا مجرم اور معاشرے کا ناسور بن چکا ہوتا۔ یہ مدر انکل کی مہربانی ہے جو میں آپ کے سامنے باعزت شخص بنا بیٹھا ہوں، ورنہ میرا انجام برا تھا۔ اس رات نہ میں چچا کی چھوٹی بیٹی کی فرمائش پر موہک

پھلیاں لینے لگا، نہ جلد بازی کے باعث ان کی کار سے نکرانا، نہ میری زندگی سدھرتی۔“

گزرے دنوں کی تلخ یادوں نے اس کے مسکراتے چہرے پر ایسا تھکا ہوا چھایا دیا تھا۔

”ایکسٹنٹ میں میری دائیں ٹانگ میں فریکچر ہو گیا تھا۔ دو ماہ تک میں بستر پر پڑا رہا تھا۔ اس دوران اطلاع کے باوجود بچا کے

گھر سے کوئی نہیں آیا تھا۔ ڈر صاحب خود گئے تو انہوں نے بر ملا کہہ دیا کہ وہ اپنے بچوں کو پالنے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ اس

لنگڑے کی تیار داری کرنے کا وقت ہے نہ پیر۔ اسے عیتم خانے میں بھجوادیں۔ ڈر صاحب پہلے ہی میرا سارا خرچ اٹھا رہے تھے۔ چچا

چچی کی دست برداری و لائق کے بعد انہوں نے میری پوری ذمہ داری اٹھائی۔ مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ بہترین ہاسٹل میں ایڈمٹ کروایا۔

آج دیکھ لیں، میرا اپنا گھر، اپنا کاروبار ہے۔“

”ہاں بیٹا! اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ بھی قسمت سے ملتے ہیں اور یہ کام تو بہت اچھا ہے، دینے سے دیا روشن کرنے والا۔“

نو شاہد مجھے سے بولیں۔

خوب صورت ٹانگڑے سے بنا بڑے بڑے لائزڈ کشادہ راہدار یوں والا انس بیس واقعی کسی بیس کی طرح حسین و منفرد تھا۔ اس کے

ششے جیسے فرش پر چلتے ہوئے اسے اپنا طیبہ اپنا آپ بہت کتر لگ رہا تھا۔ وہ بلاوجہ احساس کتری کا شکار ہو رہی تھی۔ لمبے قد اور اسماٹ جسم

کے مالک ڈر صاحب اپنی حیثیت و مرتبے کے لحاظ سے بالکل مختلف تھے۔ تکبر و بھڑکام کی ان میں معمولی سی رمت نہ تھی۔ وہ ان سے بہت

اخلاق سے ملے اور سہ کے کہنے پر ہی وہ اسے جا ب دینے پر راضی ہو گئے تھے۔

سردنٹ کوارٹرز میں سے انہیں بھی ایک کوارٹرز چکا تھا۔ دو کمرے، والان، واشپنڈ ہاتھ اور کچن پر محیط یہ صاف سترا کوارٹرز اس ایک

کمرے اور کچن پر مشتمل تھیں۔ زرد رنگ سے بہت کشادہ و آرام دہ تھا۔ سدا انہیں ڈیوٹی کے متعلق سمجھا کر باج چکا تھا۔

آج آرام کا دن تھا۔ کل سے اسے ڈیوٹی جو ائن کرنی تھی۔

”مما! سب خواب کی مانند لگ رہا ہے۔ اب ہم یہاں اپنی مرضی و سکون سے جنس لگے کوئی روک ٹوک، کوئی ڈر، کوئی خوف نہ ہوگا۔ آہ!

یہ حقیقت ہے تو کبھی نہ بدلے، مگر خواب ہے تو کبھی آنکھ نہ کھلے۔“ کرن سنگھ بیڈ پر بیٹھی ماں سے لپٹتی ہوئی سرت سے سرشار لہجے میں گویا ہوئی۔

”میں کہتی تھی نہ کہ اللہ کی مہربانی و رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ وہ جو کرتا ہے، ہمارے اچھے کے لیے کرتا ہے، جس کا پھل

بٹھا ہوتا ہے۔“ ان کا مرمیایا ہوا چہرہ کچھ شاداب ہوا تھا۔

”لیکن مجھے گرتی سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ وہ بہت سخت مزاج و چڑچڑی ہیں۔ سدا بھائی اور ڈر صاحب کی باتوں سے ایسا

ہی لگ رہا ہے۔ ما معلوم میں انہیں چنڈل کر پاؤں کی بھی یا نہیں۔“ کرن سنگھ اس کی زبان پر آگئی تھی۔

”ایسے نہیں سوچو۔ ان تھک محنت اور غلوں کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔ مشکوں سے کبھی بھی شکست مت تسلیم کرنا۔ آج نہیں تو کل

ضرور سرخرو ہو جاؤ گی۔“

ڈرتی جھجکتی بظاہر خود کو از حد سکون و اعتماد دکھا کر کرتی وہ مدثر صاحب کے ساتھ گرجی کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔  
گھر کے دیگر کمروں کی طرح یہ کمرہ بھی ویل ڈیکوریشن تھا۔ بیڈ پر دراز سفید لباس میں بلبوس شخصیت میں شاہانہ جاہ و جلال نمایاں  
تھا۔ مدثر صاحب نے اس کا تعارف کرایا۔ کرن نے آہستگی سے سلام کیا تھا، جبکہ وہ بڑی تنہیدی نگاہوں سے اسے جانچ رہی تھیں۔ وہ اعتماد  
کے دامن کو بے مشکل تھا سے کھڑی تھی۔

”اس نمشی چڑیا کو لایا ہے میرے لیے۔ جب وہ ہاتھی جیسی جسامت رکھنے والی مسندیاں نہ ٹھہر سکیں تو یہ پھینکی کیا کر سکے گی؟“  
ان کے جائزے کی رپورٹ تھی۔

”ہلیز اماں! کرن اتنی محبت سے آپ کے پاس آئی ہیں لیکن آپ کا رویہ بالکل اچھا نہیں ہے۔ ہلیز اسے اپنی خدمت کا موقع تو  
دیں۔“ مدثر ان کی ناگھوں کے قریب بیٹھ کر دھیرے دھیرے ناگھیں دہاتے ہوئے حسانت سے سمجھانے لگے۔

”تم باپ بیٹا آخر کب تک مجھ پر غیر عزتوں سے تجربات کرواتے رہو گے۔“ مجھے اس گھر میں گھر کی ملکہ چاہیے جو گھر کو گھر  
بتائے، وارث دے۔ ملازموں کی لائیں لگا دینے سے گھر سنور نہیں جاتا، گھر سنورنا ہے گھر والی سے۔ تو نے بہو کے مرنے کے بعد شادی  
نہیں کی مگر بیٹے کو تو سمجھا۔ وہ کب تک ذمہ داریوں سے بھاگتا رہے گا۔“ ان کی سخت بارعب آواز میں آنسوؤں کی نمی کھل گئی تھی۔ کچھ دیر قبل  
پتھر کی طرح سخت وہ بے چک نظر آنے والی گرجی موم کی طرح پگھل رہی تھیں۔ عجب شعلہ و شبنم جیسا روپ تھا ان کا۔ چند لمحوں کے لیے  
کمرے میں اُداسی پھیل گئی تھی۔

”اماں! یہ آپ کا کام ہے۔ اس معاملے میں میری پکڑ میں نہیں آتا وہ۔“ یہ ذمہ داری انہیں سوئپ کر وہ بری الذمہ ہو گئے تھے  
پھر اسے دواؤں اور غذا کا چارٹ سمجھا کر چلے گئے تھے۔ ان کے باہر نکلتے ہی وہ پھر ان کی کڑی نگاہوں کی زد میں تھی۔

”بیٹھ جایا تجھے انویٹیشن دینا ہو گا بیٹھے کے لیے۔“ وہ بوکھلا کر بیٹھ گئی۔

”اتنا ڈر کیوں رہی ہے۔ تجھے کھا نہیں جاؤں گی۔“ وہ نرمی سے گویا ہوئیں۔

”جوس..... جوس لاؤں آپ کے لیے؟“

”میں شخصدی چیزیں نہیں لیتی۔ ہاں کافی لے آؤ۔“ وہ سیدھی بچن کی طرف آگئی۔

بے حد خوب صورت امریکن طرز کے بچن میں گندگی و اتھری پھیلی ہوئی تھی۔ کاڈنٹر پر سبزیاں پھیلی ہوئی تھیں، جو فریج سے نکال  
کر تقریباً دوپہ کے کھانے کی تیاریوں کے سلسلے میں تھیں۔ قریب ہی بچن کے پلاسٹک بیگ سے خون کی دھاریں نکل کر کپڑوں کو خراب کرتی  
ہوئی نیچے ٹائزر پر گر رہی تھیں۔ سائیز میں لگے رسک میں گندے برتنوں کا ڈھیر تھا جو شاید کل سے نہیں دھلے تھے۔ برنز یونیٹوں پر رہے تھے۔  
بہر حال مالک کے اعتماد و پیسے کا فراخ دلی سے استعمال ہو رہا تھا۔ لمبے بھر کو اس کی نفاست پسند طبیعت متلا کر رہی گئی۔ جبراً اس نے کافی  
تلاش کر کے کافی بنائی۔ وہ کافی لے کر نکل رہی تھی، جب شو اور اس کی نوجوان بیٹی چندا ہاں آئیں اور اسے وہاں دیکھ کر حیرت مندی ہوئی ہوئی۔

”مجھے بتادیا ہوتا میں بنا دیتی“۔ وہ اس کے ہاتھ میں مگڑی ٹرے دیکھ کر بولی۔

”پہلے اپنا کام تو دے داری سے کرو“۔ وہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔ ایک گھنٹہ صاحب کو دے کر گرنی کے پاس آگئی جو اسے دیکھ کر استعجابیہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”اتنی جلدی کافی لے آئیں۔ کافی بتانی بھی آتی ہے یا نہیں؟“

”آپ پی کر دیکھیں۔“ اس نے انہیں نکلیوں کے سہارے بٹھا کر ساسر کی مدد سے کافی پلائی اور گرنی کے چہرے پر نری کے تاثرات نمودار ہوتے دیکھ کر وہ کچھ شانت ہوئی تھی۔

”بہت عرصے بعد مزے دار کافی پی ہے۔ لڑکی! تم نے کافی اچھی بنائی ہے۔“ یہ اس کے اور گرنی کے درمیان پہلی انٹرا سٹینڈنگ تھی جو چند دنوں میں بہت پائیدار ہوئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ گرنی نے ایک کافی گگ کے عوض اس کے اندر پوشیدہ اچھائیوں و بہترین صلاحیتوں کو کھوجا تھا یا اس کی تابعداری و خوش اخلاقی نے یکدم ہی انہیں اسیر کر ڈالا ہو، ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اس کے ہر دم چمکنا و مستعد رہنے کے باوجود انہوں نے اس کی بھی وہی درگت بنا لی تھی جو اس سے قبل آنے والیوں کی بنا چکی تھیں مگر اس کی ثابت قدمی و تحمل مزاجی نے رفتہ رفتہ انہیں اس کے وجود کا عادی بنا دیا تھا۔ اب انہوں نے بے جا فرمائشوں اور زنج کر دینے والی حرکات از حد کم کر دی تھیں۔ مگر اس کی کاوشوں سے بہت مطمئن تھے۔ ان کا رویہ بہت مشفقانہ تھا۔ ان کے اصرار پر نوشا بے نے گھر کے دیگر امور سنبھال لیے تھے جن میں سرفہرست اپنی نگرانی میں صفائی کروانا، کھانا بنوانا، لان کی تراش خراش اور ڈسٹنگ وغیرہ وغیرہ۔ باہر سے خوب صورت نظر آنے والا اس ٹیلیس اندر سے بھی اتنا ہی خوب صورت ہو گیا تھا۔ سعد بھی وقتاً فوقتاً آتا رہتا تھا۔ وہ دوسرے اپنے ساتھ اپنی مگلیتر فار یہ کو بھی لایا تھا۔ وہ اسی کی طرح پُر غلوں اور سادہ مزاج تھی۔ پہلی ملاقات میں کھل مٹی تھی اور دوسری ملاقات میں وہ کرن کی اچھی دوست بن گئی تھی۔

زندگی میں کچھ ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ سکون و طمانیت نے ان کے سراپوں میں اعتماد و شادابی لوانی شروع کر دی تھی۔ وہ دونوں جو کبھی ایک دوسرے کے وجود سے تنفر و بدظن رہتی تھیں، اب ایک جان دو قلب تھیں۔

☆.....☆.....☆

”گرنی! اگر نئی آنکھیں کھولیں۔ میں جانتی ہوں، آپ سو نہیں رہیں۔ پلیز یہ ٹیلیٹریس آپ کو لازمی لینی ہیں۔“ وہ جھکی ہوئی اس سے کہہ رہی تھی جو آنکھیں بند کیے خود کو سوتی ہوئی ظاہر کر رہی تھیں۔

”بھاگ جا لڑکی! دماغ مت چاٹ میرا۔ جا بھاگ جا۔“ وہ آنکھیں کھول کر سخت غصے سے گویا ہوئیں۔

”جی چلی جاؤں گی مگر پہلے آپ یہ دوائیں کھائیں۔“

”کیوں کھاؤں۔ تیرے باپ کی ملازمہ ہوں جو حیرا حکم مانوں۔“ ان کا موڈ آج پوری طرح سے بگڑا ہوا تھا۔ کرن کے بڑے ہوئے ہاتھوں کو انہوں نے نری طرح سے جھٹکا تھا۔

”ملازمتوں میں آپ کی ہوں۔ آپ جو چاہے میرے ساتھ سلوک کریں، مجھے منظور ہے مگر وہاں آپ کو ناٹم پر لے لی ہوں گی۔“ اس کی برواشت قابلِ داغ تھی۔

”تو لڑکی نہیں ہے، پھل بھری ہے۔ پیچھے لگ گئی ہے میرے۔ نہ معلوم کیا کر کے چھوڑے گی؟“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے سہارے سے اٹھ بیٹھی تھیں اور روانی تھی۔

”رات کو کھانے میں کیا لیس گی؟“ اس نے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”سوپ اور بریڈ لے لوں گی۔“ ان کا فصد شہد اہور ہاتھا۔

”او کے! اب آپ تھوڑی دیر ایکس سائز کریں گی۔ اس کے بعد آدھا گھنٹہ ریٹ کریں گی پھر میں آپ کو شام کی سیر کے لیے باہر لے کر چلوں گی۔“

”اچھا جو تیرا دل چاہے وہ کر۔“ باہر جانے کے نام پر وہ سرور ہو جایا کرتی تھیں۔ اب بھی آسانی سے مان گئی تھیں۔ کرن بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

”ہاں ہاں نکال لے رات۔ ان چند دنوں میں مجھے اپنا اتنا عادی بنا دیا ہے کہ میں تیرے بن خود کو ادھر رہتی ہوں۔“ روانی میں ان کے منہ سے نکل گیا۔

کرن کے اندر ان کے بے ساختہ اظہار سے سرشاری ہی دوڑ گئی تھی، حالانکہ وہ انہیں جھینپتے دیکھ کر بیگانہ بن گئی تھی۔ یہ خوشی اسے سرور کر رہی تھی کہ اس کی محنت، برواشت و صبر رائیگاں نہیں جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہی کئی وہ گزنی کی توقعات پر پوری اتر رہی تھی جو از حد مشکل ترین مراحل تھے۔

☆.....☆.....☆

رات کو انس واپس آ گیا تھا۔

گرینی اس وقت سوچتی تھیں۔ مڈ صاحب سے مل کر ان کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ مڈ صاحب بھی اسے پہلے کی نسبت خاصے مطمئن و بہتر نظر آئے۔ گرینی کی اور ان کی گفتگو و خیریت فون و ویٹ کے ذریعے معلوم ہوتی رہتی لیکن اسے ہاپ کو مطمئن دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ بزنس کی ضروری باتیں وہ کافی دیر تک کرتے رہے تھے۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ گرینی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر سے کسی لڑکی کی آواز آ رہی تھی جو انہیں اخبار پڑھ کر سن رہی تھی۔ وہ دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہو تو اس لڑکی کی اس کی طرف پشت تھی۔ اس نے چونک کر سر کو وہ پٹے سے ڈھانپا تھا۔ گرینی نے اسے دیکھتے ہوئے کرن کا ہاتھ جس میں اس نے اخبار پکڑا ہوا تھا، دور کرتے ہوئے کہا۔

”لڑکی اب جا! میرا بچا آ گیا ہے۔ مجھے کچھ گھنٹوں تک پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ کرن نے خاموشی سے اخبار رکھنے اور کمرے سے نکل آئی۔ گرینی کے دھوپ چھاؤں جیسے مزاج سے وہ واقف نہیں ہوتی تو اس وقت ان کا رکھائی ویگا گئی سے بے لہجہ سے بے

حد دکھ دیتا لیکن وہ عادی ہو چکی تھی۔

گرینی انس کو دیکھ کر حسب عادت کھل اٹھی تھی۔ وہ بھی انہیں پہلے سے بہتر و صحت مند دیکھ کر طمانیت محسوس کر رہا تھا۔

”چچائی گورننس کی بے حد تعریف کرتے رہے ہیں۔ وہاں تو مجھے یقین نہیں تھا مگر یہاں آپ کو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے کہ چچا کی تعریفیں غلط نہیں تھیں۔ آپ پہلے سے زیادہ ہیلڈی اینڈ کیوٹ ہو گئی ہیں۔ سعد کی سلیکشن ہم سے زیادہ بیٹ ہے۔“ وہ گرینی کی طرف دیکھتا ہوا گویا ہوا۔

”کیا سعد لے کر آیا ان ماں بیٹی کو؟“ ان کے انداز میں حیرانگی تھی۔

”جی۔“ ماں بیٹی کے نام پر وہ چونکا تھا۔

”میرے پاس تو اکثر آیا ہے لیکن اس نے ذکر نہیں کیا۔“

”اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ گرینی کو نہیں بتانا ہے۔ اگر گورننس سے کوئی مس ٹیک ہوئی تو جوتے میرے سر پر پڑیں گے۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوا لیکن اس کے اندر وہ دو نام برابر گردش کر رہے تھے جس سے اس کے ذہن میں ایک خاکہ ابھر رہا تھا اور اس کی چچائی کو جانچنے کے لیے اسے فوراً سعد سے ملنا تھا۔ گرینی اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ چکی تھیں۔ کسی اور موضوع پر وہ کچھ کہیں نہ کہیں مگر اس کی شادی کے موضوع پر وہ گفتگو بے تکان بول سکتی تھیں اور وہی ہوا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

”گرینی! میری آزادی آپ کو نہیں بھاری۔ ابھی ہم مل جل کر رہ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال ہے۔ آپس میں محبت ہے۔ آنے والی سے کہاں یہ سب برداشت ہوگا۔ وہ گھر میں قدم رکھتے ہی اپنی حاکمیت جتائے گی اور باقی لوگوں کو کھن میں پڑے ہال کی طرح نکال پھینکے گی۔ آج کل کی بہوئیں ایسی ہی ہوتی ہیں خود غرض، خود پسند، بد تمیز کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔“ اس نے انہیں خوف زدہ کرنے کی پوری کوشش کی۔

”ہماری لگرمٹ کر نہیں سمجھے ہمیں وہ، نہ کرے ہماری پروا، نہ خوش آئے ہمارے ساتھ محبت سے، پڑے رہیں گے ہم کھولنے سکوں کی طرح ایک طرف، لیکن تجھے تو سمجھے گی۔ تیری تنہائی مٹ جائے گی۔ ٹو محبت کرنا جان جائے گا۔ تیری زندگی بن جائے گی۔ ہماری پروا مت کر، وہ سستی گئی ہے، مگر جائے گی۔ ٹو جو خزاں رسیدہ پتے کی طرح اڑتا پھرتا ہے، بے چین، بے کل، بے رنگ اس طرح تجھے دیکھ کر ہمارا دم بھی نہ نکل سکے گا۔“ وہ روہانسی ہو گئی تھیں۔

”اوہ گرینی! ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔“ اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”سب سمجھتی ہوں میں، مجھے مت بنا۔ اس چڑیل کو ٹو بھول نہیں سکا ہے ابھی تک۔ ارے اس ہر جانی میں دکھائی کیا ہے۔ کیوں بھول نہیں پاتا تو اسے؟“

”گر مینی پلیز! اس ناپک پر بات مت کیا کیجئے۔“ وہ بے قراری سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر سوز و اضطراب چھا گیا تھا پھر وہ ہاں ٹھہرا نہیں تھا۔ ان سے اجازت لے کر نکل آیا تھا۔

”سردیوں کے بھی قاندے ہیں۔ سبزیاں بہت فریش اور زیادہ تعداد میں آتی ہیں۔ گاجر، مٹر، پیٹھی، مولیٰ بہت ہی لذیذ لگتی ہیں پھر کئی طرح کی حیرت انگیز ڈشز بن سکتی ہیں۔“ کرن مٹر چھلکوں سے لکڑی ہوئی ماں سے مخاطب تھی۔ وہ گر مینی کے موڈ سے سمجھ گئی تھی کہ وہ شام سے قبل اسے طلب کرنے والی نہیں ہیں۔ ان کا چہیتا پوتا آ گیا تھا جس کے ذکر و لکھ میں وہ ہر وقت مشغول رہتی ہیں۔ اسے رو برو پا کر گفتگو کا سلسلہ طویل ہوگا۔ اب وہ شام تک فارغ تھی۔ موسم اچھا تھا۔ سردی قدرے کم تھی۔ ہر سو پھیلی ہوئی سنہری دھوپ مہن کے عقبی حصے میں بھی در آئی تھی جہاں نائیلون کی چٹائی بچھائے نوشاہہ بیٹھی ہوئی تھیں۔

”گھر کا سامان ختم ہونے کو ہے۔ تمہیں آج فراغت ہے تو جا کر لے آؤ۔ میں ایک ہفتے سے جانے کا سوچ رہی ہوں مگر اس موسم میں میرے گھنٹے درد سے اکڑ جاتے ہیں۔ درد کے باعث میں خریداری نہ کر سکوں گی۔“ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ کرن سے گویا ہوئی تھیں۔

”ٹھیک ہے میں چلی جاتی ہوں۔ امی! میں سوچ رہی ہوں سعد بھائی اور قاریہ کے لیے کچھ کنفیس لے آؤں۔ وہ لوگ کئی بار سوٹ نہیں، کاسٹیکس گفٹ کر چکے ہیں۔ سعد بھائی کی اینورسری بھی قریب ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اتنا ٹیک بچہ ہے۔ اسی کی وجہ سے آج ہم یہ سکھ بھرے دن دیکھ رہے ہیں، ورنہ انہوں نے تو مرنے سے بدتر کر دیا تھا۔“ بیٹے دنوں کی یادیں کرب بن کر ان کی آنکھوں میں جھلکانے لگی تھیں۔

”نہیں لیا کریں امی ان لوگوں کا نام میرے سامنے۔ درد و زلت کا احساس رگوں میں ڈکھ بن کر دوڑنے لگتا ہے۔ کتنا گھٹیا اور کس قدر گھناؤنا الزام لگایا تھا۔ ممانیاں کہیں تو کوئی ملال نہ تھا لیکن ماموں کے انداز مجھے بھلائے نہیں بھولتے۔“ کرن کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے اعتماد کی کرچیاں تھیں۔ وہ دونوں اپنے اپنے آنسو ضبط کرنے کے چکر میں خاموش ہو گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”گر مینی کے لیے جو گورنرس تم نے اپائنٹ کی ہیں، وہ کون ہیں؟“ اسی شام وہ سعد کے ہاں پہنچ گیا تھا اور پہلا سوال یہی کیا تھا۔

”انسان ہیں اور کون ہیں۔“ جو ابا وہ ہنس کر گویا ہوا۔

”خود کو زیادہ اسمارٹ نہ سمجھا کرو۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”قاریہ تو یہی کہتی ہے کہ اس جہاں میں مجھ سا اسمارٹ کوئی نہیں ہے۔“

”سعد بی سیریس! میں ڈپریشن ہوں۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی محسوس کر کے سعد سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

”اس ڈپریشن کی وجہ؟“

”گھر میں جو نئے سروٹ آئے ہیں۔ آئی مین گرنی کے لیے جو گورنرس اپائنٹ ہوئی ہیں وہ انہی خاتون کی لڑکی ہے جو کار سے ٹکرائی تھیں؟“

”ہاں“۔ سعد نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیوں؟ تمہیں معلوم ہے مجھے اس قسم کے فراڈی لوگ بالکل پسند نہیں ہیں اور یہ بات تم بخوبی جانتے ہو کہ گرنی موہ نہیں کر سکتیں۔ ڈیڈی بزنس کے سلسلے میں زیادہ تر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ایسے میں وہ گھر کا صفایا کر جائیں جیسا کہ اس سے قبل متعدد بار ہو چکا ہے۔ تم سب کچھ جانتے ہو پھر کس طرح یہ غلطی کر بیٹھے ہو؟“ وہ استعجابیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں۔ اچھے اور برے لوگوں کی پہچان مجھے تم سے زیادہ ہے اور تمہارے گھر کی تمام پراہٹوں سے بھی واقف ہوں پھر میں کس طرح غلط لوگ رکھ سکتا ہوں۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ گرنی نے کسی گورنرس کو لمبی خوشی پورے تین ماہ برداشت کیا ہے اور انہیں اس سے کوئی معمولی سی بھی شکایت نہیں رہی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ دخل کرن کی محنت، برداشت و محنت کا رہا ہے، ورنہ تم جانتے ہو گرنی کو خوش رکھنا، ان کے کہنے پر عمل کرنا کوئی آسان نہیں ہے۔“ جواباً سعد نے جذباتی انداز میں تقریر کر ڈالی تھی۔

”تم نے خود غور کیا بلکہ بنا غور کیے ہی گرنی کی طبیعت و صحت بہتر نظر آ رہی ہوگی، پھر سب سے اسٹرونگ پوائنٹ یہ ہے کہ گرنی کی کیئرنگ وہی لڑکی تین ماہ سے ہے۔ کچھ کچھ کوالیٹی تو اس میں ہیں جو گرنی نے اس سے جان نہیں چھڑائی بلکہ وہ آئی کو بھی کافی پسند کرتی ہیں۔ اکثر انہیں اپنے پاس بلواتی ہیں۔“

”ہائی دے دے تم کچھ بھی کمٹس دو، میں مطمئن نہیں ہوں گا۔ تمہیں ہر لڑکی مظلوم و مجبور نظر آتی ہے اور ہر عورت تمہاری خالہ، بچھو، تائی ہوتی ہے۔ میں ایسی باتوں اور رشتوں پر یقین نہیں رکھتا ہوں۔“

”جس کو سانپ ڈس لے وہ رسی سے بھی خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ تمہارا حساب بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ایک کی محبت تمہیں اس صنف سے نفرت کروا گئی ہے اور یہ باشعور لوگوں کا انداز نہیں ہوتا۔“

”بات کو گھماؤ مت۔“ وہ مضطرب سا گویا ہوا۔

”اچھا یار، میں نے بہت سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر کرن اور آئی کو وہاں رکھا ہے۔ وہ اچھے گھرانے کی لڑکے نصیب سے مار کھائی ہوئی عورتیں ہیں۔ ان احسان فراموش اور بے ضمیر عورتوں کی طرح نہیں ہیں جنہوں نے نہ صرف چوریوں کیس بلکہ گرنی کو بھی بہت تکلیف پہنچائی تھی، مگر تم اب بھی مطمئن نہیں ہو تو پھر انکل سے بات کرو۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”چنا سے کیا بات کروں۔ وہ بھی تمہاری قبیل کے ہیں۔ کسی صورت نہیں مانیں گے۔ ان کی محبت میں وہ تم سے بھی کہیں آگے ہیں۔“

”میری مائتو تو کچھ عرصہ تم بھی انہیں دیکھو اور اگر وہ تمہاری توقعات پر پوری نہیں اترتیں تو تم جو فیصلہ کرو گے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا اور فریج سے بنانا ٹیک بنانے کے لیے کیلے اور دودھ نکالنے لگا۔

☆.....☆.....☆



”کرن! کرن! ادوائی گاڈ! یہ تم ہی ہونا کرن!“ وہ شاہنگ کر کے رکشے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جب اچانک مانوس آواز اس کے کانوں سے نکلنے لگی اور بے اختیار اس نے مڑ کر دیکھا۔ حزرہ تقریباً بھاگتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔

کرن کے چہرے پر بھی مسرت کے رنگ پھیل گئے تھے۔ اتنے عرصے بعد وہ اس طرح اس سے اچانک ہو جانے والی ملاقات پر حیران بھی تھی اور خوش بھی۔ وہ شاہنگ بیگز اور پرس سنبھالے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ ایک وہی تو تھا جو ظالم و جبر کے سیاہ ہولناک اندھیروں میں روشنی و زندگی کی کرن بن کر جگمگاتا تھا، زندہ رہنے، زندگی گزارنے کے درس دیتا تھا۔

”کرن! کتنی کیوٹ ہو گئی ہو تم۔ میں کتنی دیر سے تمہیں شاہنگ سینٹر کی میزھیوں سے اترتا دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ لگ تو یہ وہی رہی ہے مگر ایسی سرخ و سفید رنگت میری اس سڑیل حزانہ و چڑچڑی کرن کی نہیں تھی جو ہمیں چھوڑ کر ایسی لگی ہیں کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی کہاں چلی گئی تھیں؟ پھو جان کیسی ہیں؟ کہاں ہو تم لوگ؟ میں نے اور صبر نے ہر جگہ تلاش کیا ہے تمہیں اور پھو کو اور نا کام رہے ہیں۔“ مسرت و استعجاب کی کیفیت میں سرشار حزرہ نے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔

”تمہارے کسی بھی سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے حزرہ!“ لمبے کے ہزاروں جھسے میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”آئندہ کبھی ایسا اتفاق ہو تو مجھے مخاطب کرنے کی کوشش مت کرنا۔ بڑی مشکل سے زندگی سے آشنائی ہوئی ہے۔ آزادی کے مزے، مسرتوں کے رنگوں کو دیکھنا شروع کیا ہے۔ گو کہ یہ سب اتنا سہل نہیں ہے مگر انہوں کی بے انتہائی سے فیروں کی بے انتہائی بری نہیں لگتی۔“

”میں جانتا ہوں۔ مجھے رات کو ہی صبر نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اس وقت گھر میں ہی تھا مگر پاپا کے خوف سے نیچے نہیں آیا تھا۔ مجھے سکون نہیں ہے۔ اس رات سے آج تک ہر چہرے میں نہیں تمہیں کھو جتا ہوں۔ پھو کی یاد بے چین رکھتی ہے۔ میں ان کے رویوں کی تم سے معافی مانگتا ہوں۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ میں نے پاپا سے کہا تھا کہ تمہیں ڈراپ کر کے گیا تھا اور انہیں یقین بھی آ جاتا اگر آئی یہ نہ کہیں کہ میں تمہیں بچانے کے لیے جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ پاپا اس وقت اس قدر غصے میں تھے کہ انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا لیکن انہیں یقین کرنا پڑے گا، جب میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا تو انہیں یقین آ جائے گا۔ سچائی جب زور ہو تو ہزار جھوٹ بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔“

”حزرہ اوہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم ان کے لیے مر گئے ہیں اور نردے کسی لوٹ کر دنیا میں نہیں آتے۔ آئندہ کبھی نہ ملنا۔“ وہ کہتی ہوئی مضبوط قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ حزرہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ شدید ترین اذیت کے تاثرات اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔

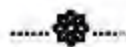
”کرن! کرن! پلیز ان کی سزا مجھے تو مت دو۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گویا ہوا۔

”مت آؤ میرے ساتھ۔“

”مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔“ بے حد خاص بات اس نے عام سے انداز میں کی تھی جو غصے و نفرت میں وہ محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

”پلیز! اب ہم بیٹنا چاہتے ہیں۔ ہمیں جینے دو۔ ماضی کے ہر پہلو، ہر ذرات کو ہم بھلا چکے ہیں۔ پلیز تم ہمیں خوش دیکھنا چاہتے ہو تو کبھی بھی ہمارے راستے میں مت آنا۔ اجنبی بن کر گزر جانا۔ ان رشتوں کا کیا فائدہ جو شتر بن کر لگتے ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ میری اور ماما کی زندگی میں کوئی شتر ہو۔“

وہ قریب سے گزرتے رکھنے کو ہاتھ دے کر اس کی جانب بڑھ گئی تھی۔ مزہ بے قرار اور نجیدہ لگا ہوں سے اسے اوجھل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ لگا ہوں سے جتنی دور ہو رہی تھی، دل سے اتنی قریب ہو رہی تھی۔ اتنی قریب..... اتنی قریب کے وہ اپنی سانسوں میں اس کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔



وہ رات اس کے لیے بے خوابی اپنے پروں میں سمیٹ لائی تھی۔

آج اچانک ایک عرصے بعد مزہ کا یوں مل جانا اسے خوش گوار تحیر زدگی میں مبتلا کر گیا تھا اور اس نے جانا کسی اپنے کا اس طرح اتفاقاً مل جانا کیسی انوکھی مسرت سے ہنسنے لگا کر دیتا ہے لیکن وہ مسرت، وہ تحیر آمیز شادمانی لہوں کی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ آگے بڑھی تھی اور اسی دم شعور کے دروا ہوئے تو سر خوشی پر رسوائی و ذلت کی ردا چھا گئی۔ خود پر اچھالے گئے قلاعت کے چھیننے صاف نظر آنے لگے اور وہ وہیں جامد ہو گئی۔ اپنا اپنا سامہان دیکھائی دینے والا مزہ ملی بھر میں اجنبی ولا تعلق نظر آنے لگا، دل پر چھائی شناخت زبان پر لفظوں کی صورت پہنے گی۔ دماغ پر جب جذبات کی حکمرانی ہو تو زبان کسی جلاو کے ہاتھ میں پکڑی کلوار کی طرح سٹاک کی سے چلنے لگتی ہے، بلا سوچے سمجھے جو بھی سامنے آتا ہے، بریدہ ہو جاتا ہے، خواہ وہ بے گناہ ہو یا گناہ گار، خطا کی ہو یا بے خطا، مگر بیخ نہیں پاتا، یہی مزہ کے ساتھ ہوا، وہ اتنی خوشی سے پُر جوش انداز میں اس کی جانب بڑھا تھا۔

پھر اس کے بے رحم دیکھا گئی بھرے طرز عمل و گفتگو سے کس قدر پریشان و حواس باختہ ششدر رہ گیا تھا۔ خوشی سے دمکتا چہرہ لمبے بھر میں بچھ گیا تھا، آواز میں آداسیاں اتر آئی تھیں اور آنکھوں کی طرح لہجہ بھی بیگم سا گیا تھا۔

”معاشرے میں پھیلی ذہنی پچیدگیوں میں ایک یہ پچیدگی بھی ہے کہ ہم جب تک اپنا قصہ کسی دوسرے فرد پر نکال نہ لیں تو بے سکون رہتے ہیں۔ اب وہ فرد متعلقہ ہو یا غیر متعلقہ، ہمیں اپنا بوجھ ہلکا کرنا ہوتا ہے، پھر تم تو اسی خاندان کے ایک فرد ہو جہاں میری ماں کو بے عزت کیا گیا، اس کی تربیت پر کچھ اچھالی گئی اور میرے کردار کو گالی دی گئی..... گالی کبھی برداشت نہیں ہوتی، اگر بالفرض بحال برداشت کر بھی لی جائے تو کوئی بھی عورت کردار پر گالی برداشت نہیں کرے گی، کیونکہ کردار کی مضبوطی ہی عورت کی سب سے معتبر دولت ہے، اگر کردار چلا جائے تو عورت، عورت نہیں گالی بن جاتی ہے۔“

وہ دائیں کروٹ کے بل لٹھی سوچوں کے جنگل میں بھٹک رہی تھی۔ کمرے میں نائٹ بلب کی نینگوں روشنی ہر سمت سکون آمیز سکوت پھیلائے ہوئے تھی۔ دوسرے بیڈ پر ٹوشا بے خبر سو رہی تھیں۔ یہاں آکر انہیں ان وظیفوں سے چمٹکارا مل گیا تھا جو بھائیوں کے گھر میں حالات کی بہتری کے لیے وہ کیا کرتی تھیں۔

”عزرا! ماما کہتی ہیں، میں بد لحاظ اور بے مروت ہوں۔ آنکھیں بدلنے میں لحوہ بھی صرف نہیں کرتی، مجھ میں برداشت بالکل مفر ہے اور مجھے اعتراف ہے ماما کا ایک لفظ غلط بھی نہیں ہوتا۔ میں ایسی ہی ہوں، نہ غلط کہتی ہوں اور نہ برداشت کرتی ہوں اور خصوصاً جہاں مجھے یا مجھ سے وابستہ کسی تعلق کو بلا وجہ، بلا تصور برا بھلا کہا جائے۔ مجھے سے قطعی برداشت نہیں ہوتا اور اس وقت تک مجھے سکون و قرار میسر نہیں آتا، جب تک جو اپنی کارروائی مکمل نہ کر لوں، یہ وقت کا تقاضا ہے جیسا کرو دیا بھرو، لیکن تم ایسے نہیں ہو، بہت اچھے، بے حد نائس انسان ہو جس پر آج زیادتی کر کے میرا ضمیر مجھے مزادے رہا ہے کہ میں بد لحاظ، بد تمیز، بے مروت و منہ پھٹ ہوں مگر میرے اندر کچھ مثبت سوچیں بھی ہیں جن میں سے ایک یہ ضمیر صاحب ہیں جن کا وجود نا دیدہ ہے مگر ہر وقت یہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ شام سے اب تک تمہاری مہربانیوں و احسانات کو اتنی مرتبہ یاد کر چکے ہیں کہ مجھے اپنی زیادتی کا احساس شدت سے ہونے لگا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا، یہ سب نادانستگی و جلد بازی میں ہوا یا گھروالوں کے ناروا سلوک کے شکار تم ہو گئے، غصے میں عقل پر پٹی بندھ جاتی ہے اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں ماما اس راہ پر اب لوٹ کر نہ جائیں، جس راہ پر کانٹے ہی کانٹے ہیں جو بدن کو ہی نہیں، روح کو بھی گھائل کر دیتے ہیں۔ ایک مدت تک میری ماں ان رستے زخموں کے سنگ رہی ہیں، اب دوبارہ ان زخموں سے کھرٹ پٹتے، میں نہیں دیکھ سکتی، میں تم سے خوش دلی سے ملتی اور یہاں آنے سے نہیں روک سکتی تھی اور تمہیں دیکھ کر ماما کے دل میں بھائیوں، بھادجوں کی دہنی ہوئی محبت از سر نو جاگ اُٹھتی اور وہ زیادہ دن خود پر جبر نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ سب کچھ بھلا کر ان کی طرف دوڑتیں جو انہیں دھتکار کر نازیبا الزام ان کی بیٹی پر لگا کر زندگی و موت کے تعلق توڑ چکے تھے۔ میری ماں کی وسعت قلبی و درگزر معاف کر دینے کی پرانی عادت ہے لیکن میں اپنی ماں سے متعا و طبیعت کی مالک ہوں۔ میرا ضمیر، انا و ضد سے اٹھا ہے اپنی انا کے خلاف مجھے کچھ گوارا نہیں ہوتا، بلا کی انا پرست ہوں، مجھے معاف کر دینا عزرا ڈیر! اپنے سلوک پر تم سے شرمندہ ہوں مگر سوچتی ہوں میرا وہ یہ درست تھا“۔ وہ تصور میں عزرا سے مخاطب تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ موسم بیزیتوں کا  
شہری دھوپ کرنوں کا  
گلاب کے مہکنے کا  
ہمیں کب راس آیا ہے  
ہماری زرد آنکھوں نے بخر خواب ہی دیکھے

کہ اپنی خواب ہستی میں  
عقاب آلو ہستی میں  
کوئی خوشبو نہ آجھل ہے  
کوئی جھونکا نہ بادل ہے!

”ایکسکے زمی۔ میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“ خوب صورت کمنک دار آواز اس کی سماعتوں سے نگرانی تو اس نے سرسری ہی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ بلیک جینز، ریڈ اینڈ بلیک بڑے بڑے پھولوں کے پرنٹ والے شادرت کمرے میں سرخی مائل گولڈن بالوں کی پونی میں جھونک چلائی، بائیں ہاتھ سے پرس شولڈر پر ڈالے وہ بہت بڑا انداز میں اس سے مخاطب تھی۔

”ییس..... شیور..... وائے ناٹ“۔ اس نے میگزین بند کر کے آگے کھسکایا اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جھینکس اے لوٹ“۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا سرخ پرس نیپیل پر رکھا اور چیز تھیسٹ کر بیٹھ گئی۔ انکچو نیلی، میں کسی اور کے ساتھ بھی شیئرز کر سکتی تھی لیکن اس پورے ہال میں مجھے آپ ہی بہت شریف و بے ضرر محسوس ہوئے اور میرے دل نے کہا کہ میں بیٹھیں بیٹھ جاؤ، یہاں تمام ٹیبلوریز روڈ ہیں۔“ وہ چہرے سے جتنی بولڈ نظر آ رہی تھی، انداز میں اس کے اتنا ہی بھولپن و مصومیت تھی۔ انس اس کے خصوصی ریمارکس پر بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔

”کتنا ایکسپریس ہے، آپ کو لوگوں کی آئیڈنٹیفٹی کا؟“

”جتنی میری لائف ہے۔“ سابقہ انداز میں جواب آیا تھا۔

”اوہ..... آپ نے پیدا ہوتے ہی لوگوں کو شناخت کرنا شروع کر دیا تھا کہ کون بد معاش ہے، کون شریف ہے؟“

”شاید..... آپ میرا مذاق آزار ہے ہیں؟ چہرے پر آئی لٹ کو وہ کان کے پیچھے کرتی ہوئی کنفیوزی گویا ہوئی تھی۔

”ارے نہیں..... میں تو ایسے ہی معلوم کر رہا تھا، آپ نے بات ہی ایسی کی جیسے بہت معمر ہوں، جس کے باعث چہرہ دیکھتے ہی

محسوس کر لیتی ہوں اچھائی و برائی کو، ویسے آپ کی عمر کیا ہوگی؟“ نہ معلوم کیا ہوا تھا اس لڑکی کا تروس زدہ چہرہ و اضطرابی حرکات و سکنات اسے گفتگو پر اکسارہے تھے۔

”اوہ سوری، میں بھول گیا تھا کہ کسی خاتون سے ان کی عمر پوچھنا سخت ترین گستاخی ہوتی ہے۔“ وہ دل کشی سے مسکراتا ہوا

مغذرت کرنے لگا تھا۔

”عمر کے معاملے میں اب خواتین سے زیادہ مرد حساس ہو گئے ہیں۔ عموماً شو بزنس سے تعلق رکھنے والے یا کسی اور وجہ سے پاپولر

ہونے والے مرد بھی صرف ہتھ ڈے ڈیٹ بتاتے ہیں، انٹرنیشنل، یہ اور تاریخ کپلیکس آپ کی جنریشن میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ صرف پلیئرز ہیں جن کی درست عمریں سب کو معلوم ہوتی ہیں۔“

”ادے رے..... آپ تو مائنڈ کر گئیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔“

”میں نے مائنڈ نہیں کیا، بتا رہی ہوں آپ کو، پہلے صرف عورتوں کو کہا جاتا تھا کہ عمر میں ڈنڈی مارتی ہیں، اب یہ مرد ڈنڈا مارنے لگے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”عورتوں مردوں کو شانہ بٹانہ چلانا چاہیے نا۔ اسی کی عملی تفسیر ہے۔“

”آپ کو تو اپنی قوم کا دفاع کرنا ہی ہے۔“

”آف کورس، کیا کھائیں گی آپ؟“ وینز کو قریب آتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... میں اپنی فرینڈز کا انتظار کر رہی ہوں، وہ آنے والی ہیں۔“ وہ رست و اچ دیکھتی ہوئی قطعی انداز میں بولی۔

”آپ نے مجھے اتنے سوٹ ٹائل دیئے ہیں، اب میری شرافت کا تقاضہ ہے کہ آپ کو اس طرح کیسے جانے دوں، لیمن جوس تو آپ کو چنا پڑے گا۔“ وینز کو دو گلاس لیمن جوس کا آرڈر دے کر وہ اس سے گویا ہوا تھا۔

”ٹھیکس گاڈ! میں بھی آپ نے نہ امانا ہے۔“ وہ کھل کر مسکرائی۔

”آپ نے مجھے متبر کر دیا ہے، اب میں اپنے فرینڈز کو فخر سے کہہ سکتا ہوں جو ہمیشہ کہتے ہیں انسی اتم بڑے کینے و بد معاش ہو۔“

”آپ کا نام انسی ہے؟“

”جی، انس مرشد خان۔“

”بہت پیارا نام ہے، میرا نام مثال خان ہے۔“ جو اب اس نے بھی متعارف کروایا۔

”اب میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ بہت پیارا نام ہے۔“ ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ مزید بڑھتا کہ سامنے سے آتی اپنی فرینڈز کو دیکھ کر وہ خوشی سے چپکتی ہوئی اٹھ گئی اور انس کو یا ٹرانس کی کیفیت میں بیٹھا دیکھا رہ گیا۔

ایک دم زور سے چھٹا کا ہوا تھا اس نے چونک کر ماضی سے حال میں چھلا لگائی تھی۔ سینئر نچل پر رکھا گلاس کالین پر گر کر ٹوٹا تھا جو شاید اس کے ہاتھ کی زد میں آ گیا تھا۔ اس نے وز دیدہ نگاہوں سے لائٹ بلو کالین پر بکھرے کالج کے گلوں کو دیکھا۔ ہونٹوں کو زور سے سمجھ لیا، گویا کالین پر کالج نہیں دل کے کلوے بکھرے ہوئے ہوں۔

☆.....☆.....☆

”چھوٹے صاحب! بیگم صاحبہ یا دفن ماری ہیں۔“ ملازمہ منگ دے کر اندر آ کر بولی۔

”اچھا..... آ رہا ہوں۔“

وہ اٹھ کر ہاتھ روہ کی طرف بڑھ گیا۔ گرینی لمبے بھر اس کے چہرے پر پریشانی محسوس کر لیتی اور پھر نتیجتاً ایک لمبا ہنجر اٹینڈ کرنے کی اس کی اس وقت قطعی استطاعت نہ تھی کہ جب ماضی کی گرفت اس پر حاوی ہوتی تو اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایسے میں وہ بند کرے

میں ہر شے کو فراموش کر دیتا تھا۔

تو تھو برش استعمال کرنے کے بعد ہاتھ لیا اور کپڑے بدل کر گرینی کے پاس چلا آیا جو خاصی ناراض دکھائی دے رہی تھیں۔

”جی گرینی! آپ نے یاد کیا ہے؟“ وہ چہرے پر ہنستا ہوا تھا، جواباً گرینی اسے گھور کر بولیں۔

”تم کون سا سابق ہو جو تمہیں یاد کروں گی۔“

”خیریت تو ہے نا، کوئی بات ہو گئی ہے؟“

”اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ انہوں نے ہوتے ہوئے میں ملازماؤں کے آسرے پر پڑی ہوں، وہ جیسا چاہیں سلوک کریں

میرے ساتھ، کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔“ گرینی تیز تیز کہہ رہی تھیں۔ اندر داخل ہوتی کرن کے قدم ان کے لہجے اور انس کی موجودگی کی باعث قدرے ست پڑ گئے تھے۔

”کسی سروٹ کی جرات نہیں ہو سکتی گرینی کہ آپ کی خدمت میں کوتاہی برتیں یا بدتمیزی کی جسارت کریں، اگر کسی نے ایسی

گستاخی کرنے کی کوشش کی بھی ہے تو مجھے بتائیں۔“

”میری خاطر کس کس سے اُلجھو گے، کس کس کو مزادو گے، پھر راہ میں پزار ہے تو ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے، اگر دیوار میں چن

جائے تو عمارت کہلاتا ہے۔ میری قدر و قیمت جب تم ہی نہیں جانتے تو یہ تو کر چا کر کیا جائیں گے۔“ ان کے لہجے میں آرزو کی چھانے لگی تھی۔

”یہ کیسے سمجھ لیا آپ نے، ہمارے دل میں آپ کی محبت و عزت نہیں ہے۔“ وہ ان کے نزدیک بیٹھتا ہوا اپنائیت سے گویا ہوا۔

”میری بات مان رہا ہے تو؟“

”گھر کا سکون اور میری محبت بلکہ خالص محبت آپ سے گوارا نہیں ہو رہی ہے گرینی۔“ اس نے نڈر دروازے پر کھڑی کرن کو

وہاں سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ٹو رٹی رنائی باتوں کو کیوں دلتا ہے، جب میں نے کہہ دیا، آنے والی جو سلوک کرے گی مجھے گوارا ہے، وہ سیاہ کرے، سفید

کرے، لڑے جھگڑے، چاہے کچھ بھی کرے، کم از کم گھر میں تو ہوگی۔“ گرینی اپنے اس پسندیدہ موضوع پر بلا تکان بول سکتی تھیں اور بول

رہی تھیں۔ وہ جتنا اس موضوع سے بھگتا تھا، وہ اتنا ہی اس کا ورد کرتی رہتی تھیں۔

”ہماری نیت کا شرم، سوچوں کا رد عمل ہی ہمیں بھگتنا ہوتا ہے، ہمارے اعمال ہماری بھکتی ہے، گلاب بوئیں گے تو گلاب اُگیں

گے، پیار بانٹیں گے، پیار پائیں گے۔ یہ دنیا عمل اور عمل، مزا و جزا کی میزان پر دھری ہے۔“

”گرینی! آپ کو مجھے کچھ ناٹم دینا ہے، تھوڑا وقت لگے گا۔“ وہ ان کا نحیف و زوار ہاتھ اپنے مضبوط و توانا ہاتھ میں لے کر عاجزی

سے گویا ہوا۔

”ناٹم..... ناٹم..... ناٹم..... نہ معلوم کب ختم ہوگا یہ ناٹم تیرا، پچھلے ایک سال سے یہی الاپے جا رہا ہے، جیسے کسی بچے کو لالی پوپ

دے کر بہلا دیا جاتا ہے، یہی تو میرے ساتھ کرتا ہے، لگتا ہے تیرا ”ختم“ ختم نہیں ہوگا اور میرا سانس ختم ہو جائے گا، میری زندگی ختم.....“

”گر بی! پلیز ایسی باتیں مت کریں۔“ وہ تڑپ اٹھا۔

”کیوں نہیں کروں، تو جانتا ہے، شوگر، ہارٹ ایفک اور یہ معذوری، ہر سمت سے بیماریوں میں جکڑی ہوئی ہوں، نہ معلوم کب ایسی رات آجائے جس کی صبح مجھ سے ہمیشہ کے لیے رونچی ہوئی ہو یا ایسی صبح آجائے جس کی کبھی رات نہ ہو، موت تو ایک حقیقت ہے نیے اور پھر مسلمان کبھی بھی موت سے نہیں گھبراتے کہ موت مومن کے لیے راحت ہے، نجات ہے۔“

”بے شک گر بی! میں نے کب اس سے انکار کیا ہے (کہ اب میری خواہش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ہرجائی دنیا کو چھوڑ دینے کی ہے) لیکن آپ ایسا نہ سوچا کریں۔“

”باہی! چائے پی لیں اور یہ بخش کھاؤ، بڑے مزے کے ہیں۔“ چندا چھوٹی ٹرے میں چائے کاگ اور بخش رکھے اس کے پاس لے آئی تھی جو اس کے اشارہ کرنے پر لاؤج میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

”میں ناشتہ کر کے آتی ہوں، تمہیں معلوم ہے۔“

”تو کیا ہوا باہی! ایک کپ چائے، ایک بخش سے موٹی تھوڑی ہو جاؤ گی۔ میں دس کھا جاؤں اور ڈکار بھی نہ ماروں۔“ وہ بے فکری سے ہنستی ہوئی بولی۔

”مت کھایا کرو اس قدر پھنکائی والی چیزیں، کبھی بخش کی طرح ہی پھول جاؤ گی۔ آج کل سلم ہونے کا کتنا کر بڑھ چلا رہا ہے جس کو دیکھو بلا ہونے کے لیے اٹنی سیدھی حرکتیں کرنا نظر آتا ہے، تم تو ابھی کافی اسماٹ ہو۔“ وہ اس کے بے حد اصرار پر چائے پیتے ہوئے بولی، اس کے صبح کرنے پر چندا کا رہٹ پر بیٹھ کر بخش کھاتے ہوئے بولی۔

”نہ باہی مجھے شوق نہیں ہے دلے ہونے کا، مونے تازے لوگ اچھے ہوتے ہیں اور لڑکیاں موٹی ہوں تو اچھی لگتی ہیں، کپڑے زیور پہنے بھی اچھے لگتے ہیں، سوکھی سڑی لڑکیاں ہوتی ہیں کوئی، شکل سے لگتی ہیں فاقے زدہ، سوکھے کی مریض، نگلیوں کی طرح۔“ وہ جتنی چیزی سے کھار ہی تھی، زبان بھی اتنی تیزی سے چل رہی تھی، گرین وپنک سوٹ میں اس کی گندی رنگت نمایاں تھی۔

”آہا..... کیا بات ہے۔ کاش تمہارے خیالات سے استفادہ کوئی حاصل کر سکے۔“

”اماں کہتی ہے اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ اپنی صحت سے بچانے جاتے ہیں، ویسے ہماری برداری میں ہمارا گھرانہ زیادہ عزت دار ہے۔“

”اچھا.....“

”ہماری طرح کھاتا پیتا کوئی نہیں ہے، ابا کی تو بہت ہی عزت ہے۔“

”تمہارا ابا تو پہلو انوں سے مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔“

”نہ باجی! ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔“ چندا اس کی بات کو نہیں سمجھی تھی، اسی دم اس کی ماں نے آواز دی تو وہ چلی گئی۔ کرن نے وال کھاک دیکھا، نام گزر رہا تھا اس وقت تک وہ گرینی کو ناشتہ اور میڈ بسن دے کر فارغ کر چکی ہوئی تھی اور آج سب کچھ تالیف ہو رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا انس کے آنے سے قبل وہ اس سے بہت مانوس ہو گئی تھیں۔ خاصی حد تک انحصار، اس کی ذات پر کرنے لگی تھیں۔ اکڑ پین اور بے زاری جوان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی، کبھی کبھی وہ سوڈان پر طاری ہوتا تھا مگر جب سے وہ آیا تھا، گرینی بدلتی جا رہی تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے پوتے کے ہمراہ گزاریں اور وہ ثقافت ان کی نگاہوں سے اوچھل ہو جائے اور ان کے اس رویے کے سبب وہ ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ ایک خرابی کئی خرابیوں کی جڑ بنتی ہے، ان کی ایک لاپرواہی میڈ بسن کی نائننگ کو خراب کر رہی تھی جوان کی صحت کے لیے سخت نقصان دہ تھی اور وہ اس بات کو ماننے کو تیار نہ تھیں۔

”اوہ..... یہاں ناشتہ چل رہا ہے، وہاں گرینی کا نہ صرف بریک فاسٹ بلکہ میڈ بسن کا شیڈول بھی آؤٹ ہو رہا ہے۔“ وہ اسی گھر میں غلطاں چائے پی رہی تھی کہ اس کی سخت آوازیں کر پوکھلا کر کھڑی ہوئی تھی جو بیک ڈور سے اس کی پشت پر آن کھڑا ہوا تھا۔

”س..... س..... س.....“

”مجھے کوئی آرمینس نہیں چاہیے، مجھے ڈیوٹی کے نام صرف ڈیوٹی چاہیے، آج فرسٹ اینڈ لاسٹ وارننگ ہے، تمہارے لیے نیکسٹ ہائم میں ایسی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔ مجھے ایسے غیر ذمے دار ملازموں کی ضرورت نہیں۔ جو اپنے پیٹ کی پروا کریں اور مالک بھوکا انتظار کرتا رہ جائے۔“ جتنی سختی و تندہی اس کے لہجے میں تھی، اس سے زیادہ کڑواہٹ و عنف اس کے لفظوں میں تھا، بے حد سختی دیکھا ہوں سے اس نے کرن کے ہاتھ میں پکڑے اور سینئر نیبل پر رکھی ٹرے میں بکھرے بخش کے ذرات کو دیکھا اور دھپ دھپ کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور وہ تو جیسے ذلت دے بے عزتی کے احساس سے گنگ کھڑی رہی گئی تھی۔ خوش ذائقہ چائے کا گھونٹ کڑوے سیال میں بدل گیا، رگوں میں گویا تیزاب کی جلن جھلسانے لگی۔

اس قدر اہانت، اس قدر ذلت، اس قدر سفاکی؟

لاؤنج کسی وائرے کی صورت میں گھومنے لگا، ہاتھ میں پکڑے گنگ میں باقی ماندہ چائے..... چائے نہیں خون تھا، خون اس کی عزت نفس کا، خون اس کی محنت و وقاداری کا جو وہ بڑی دیانت داری کے ساتھ ملازمت کی صورت میں ادا کرتی رہی تھی۔

اسے ان سے ہاتھ کرتے وقت کوئی شیڈول یاد نہ رہا تھا۔ اسے جب بڑی حقارت سے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تھا، تب بھی اسے کوئی نائننگ یاد نہ آئی تھی۔ کتنی آسانی سے، کیسی سفاکی سے وہ اسے غیر ذمے دار ہونے کا طعنہ دے گیا تھا۔

کیا غیر ذمے داری کی تھی اس نے؟ ایک طرح سے اس نے اسے تک حرام ہی کہا تھا۔ بے شک سارا وقت گرینی کی خدمت میں گزارنے کے باوجود کھانے کے اوقات وہ سروٹ کوارٹر جا کر کھا کر آتی تھی۔ پہلی بار آج چندا کے اصرار پر وہ چائے کے چند گھونٹ پینے کی گناہ گار ضرور ہوئی تھی جو ابھی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ سزا کے طور پر کیا کچھ نہ سننے کو مل گیا تھا۔



اس تک آہستگی سے ٹھیکل پر رکھا اور اپنے مشتعل حواسوں کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”بڑے گھر میں رہنے والے چھوٹے دل کے شخص، اگر مجھے کوئی دوسرا ٹھکانہ میسر ہوتا تو اسی پہل ملازمت تیرے منہ پر مار کر جا چکی ہوتی، کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا، بلاوجہ کسی کی عزت لٹس مجروح کرنے کا، یہاں جو کچھ بھی ملتا ہے، وہ نہ احسان ہوتا ہے اور نہ ٹمک، وہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔“ حسب عادت اس نے غائبانہ طور پر اسے کھری کھری سناٹی تھیں۔

پہلی بار عزت لٹس مجروح نہ ہوتی تھی۔

پہلی بار ذلت و توہین کا احساس نہ جاگتا تھا۔

یہ ارزانیات و بے مانگی کا احساس اس کے ساتھ سائے کی طرح رہا تھا اور حیرت اس امر کی تھی کہ وہ ابھی تک اس کی عادی نہ ہو سکی تھی۔

وہ اپنے نفس کے واویلوں کو نظر انداز کرتی، دماغ کی ہدایت پر مگرینی کے روم کی طرف بڑھ گئی کہ وقت، حالات اس کے تابع نہ تھے، وہ ان کی محکوم تھی۔

گرینی کا موڈ حد سے زیادہ آف تھا۔ وہ کسی ضدی و خود سرینے بچے کی طرح نخرے کر رہی تھیں۔ ناشہ سوخڑوں سے کیا تو ہزار نازا ٹھوسا کر میڈیسن لی تھیں اور اسے بے نقط سناٹی الگ، آج اس کا ستارہ گردش میں تھا۔

”بہت چپ چپ ہو کر! طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ اس کے سنے ہوئے چہرے، نم آنکھوں کو دیکھ کر نو شاہ بہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے گھر مندی سے گویا ہوئیں۔

”طبیعت نہیں، نصیب خراب ہیں ما!،“ وہ یاسیت کا شدید شکار تھی اس وقت۔

”کیا ہوا؟ کسی سے کوئی بات ہوئی ہے؟“ وہ پریشانی سے بولیں۔

”وہی ذلت بھری زندگی کا زرخ ایک عرصے بعد پھر دیکھا ہے میں نے، جس کو چند ماہ قبل میں چھوڑ آئی تھی، بطور تحقیر بے شک جنس بدل لیں مگر کاٹ نہیں بدل پاتے، ایک ایک لفظ بندے کو گھائل کر کے توڑنے، بسکتے پر مجبور کر دیتا ہے۔“

”کیوں پسیلیاں بچھواری ہو، صاف صاف بتاتی کیوں نہیں ہو، کیا ہوا ہے؟“ ان کی متا میں فطری بے قراری عود کر آئی تھی۔

اس نے انہیں وہ سب کچھ بتا دیا جو صبح سے اس کے ذہن و اعصاب پر جو جکوں کی طرح چپنے ہوئے تھے، وہ ہاوجود کوشش کے خود کو اس تکلف سے باز نہ رکھ سکی تھی۔

”کیا کریں؟ بات ہے تو اخلاقیات کے لہادے سے نقل ہوئی مگر پھر وہی بات آتی ہے، ہمارا ان سے کوئی قرہمی تعلق یا خون کا رشتہ نہیں ہے، ہمارا تعلق تو کرو مالک کا ہے۔ ہم خواہ کچھ بھی کر لیں، اپنے کو ان سے بڑھ کر نہیں پاسکتے، سمجھ رہی ہونا میری بات، مالک کی کسی بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنانا۔“

”انا اور عزت نفس! ان احساسات کا تو لگتا ہے، سودا کر بیٹھی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح زندگی کی گاڑی چلے گی۔ ہمارا جیون بھی کسی کٹھن پر خاردار سے کی مانند ہے جہاں کے ٹھیب و فراز، کٹھنیاں اس قدر پر بیچ ہیں کہ جہاں آسانوں و آزانٹوں کے اختتام کی کوئی منزل ہی نظر نہیں آتی، ہاں تھوڑا وقت کسی اچھے خواب کی مانند گزارا ضرور ہے۔ اب آنکھ کھلی ہے تو وہی حالات ہیں، چہرے بدل گئے ہیں، خدا و خال بدل گئے ہیں مگر طہر و خضر، حقارت و بے مائیگی نمایاں کرنے کے مظاہرے وہی ہیں۔“

اس پر پوری طرح سے یاسیت و بڑمردگی چھا گئی تھی، وجہ شاید یہ بھی تھی ماموں کے گھر میں وہ برابر کے جواب دے کر حساب بے باک کر دیا کرتی تھی۔ یہاں اس شخص نے اسے جس طرح بے بھاد کی سنائی تھی، مستزاد اس کا لہجہ و انداز سے بھلائے نہ بھول رہے تھے۔ قصور نہ ہوتے ہوئے بھی اسے سب سننا پڑا، پھر کوئی صفائی کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ بے شک وہ اپنے اور اس کے مرتبے کو پہچانتی تھی، سو بد تمیزی سے نہیں ادب سے ہی وہ اسے سمجھا سکتی تھی کہ وہ تو خود اس بات سے پریشان ہو رہی تھی مگر نبی کے ناشتے اور میزین کا نام آؤٹ ہو رہا تھا اور ان کے شدید مرض کے نوعیت کی باعث کسی بھی معاملے میں دیر نہیں ہونی چاہیے مگر وہ اپنی حیثیت کے قصین کے باعث صبر کر کے بیٹھی رہی تھی اور اس کو پوری انگٹھو کرنے کے بعد خیال آیا تو بڑی آسانی سے وہ اسے مورد الزام ٹھہرا کر بے عزت کر گیا تھا۔

”ٹھیب و فراز، دھوپ و چھاؤں ہی تو ہم کو زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرتی ہیں، جمود تو بیٹا موت ہے۔ متحرک رہنا ہی حیات ہے۔ جمود تو وہ ہمارے کوئی عزیز تو ہیں نہیں، جو شکایت کرنے پہنچ جائیں، قدموں کے نیچے زمین اور سروں کے اوپر چھت کی قیمت ہمیں اسی طرح چکانی پڑے گی، پھر جا بھی کہاں سکتے ہیں بھلا؟“ بیٹی کی بیگنی آنکھیں اور اتری شکل ان کے دل کو آری کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ وہ اپنے خون کے شاہانہ پن کو جانتی تھیں جس ماحول میں اور جس طرح کرن کو نا مساعد حالات میں ایک ایک ضرورت کی چیزوں کے لیے ترہنا اور جھڑکیاں و طینے سننے کو ملتے تھے، ایسے میں کوئی بھی دوسری بچی ہوتی تو وہ عزت نفس، وقار و انا بھول کر لوگوں کے اشارے پر چلنے والی بے حیثیت و بے سول لڑکی ہوتی، لیکن وہ سب بھگتنے کے باوجود الگ مزاج کی لڑکی تھی، کسی کا جھوٹا کھانے سے بہتر وہ بھوکے اسکول جانا پسند کرتی تھی، کسی کی اترن سے بہتر اسے اپنے گھسے پرانے کپڑے عزیز تھے، اپنے پھنے جوتوں میں وہ اس کو دفتر سے چلتی جیسے کوئی شہزادی بڑے مطمئن و تفاخر سے چل رہی ہو، فقیری زندگی گزارنے کے باوجود اس کے مزاج بچپن سے شاہانہ تھے، کسی سے نا جا تڑو نہایا، کسی سے سننا تو اسے گوارا ہی نہ تھا۔ بھایاں غصے میں کہتی تھیں۔

”سنجبال کر رکھا کرو اپنی ملکہ نور جہاں کو۔ ابھی بھی وقت ہے سنبھالو اسے، چھوڑ دے ایسی حرکتیں ورنہ اگلے گھر پہلے دن ہی چوٹی پکڑ کر نکال دی جائے گی، تمہیں تو تمہارے بھائی بھگت رہے ہیں، اسے کون برداشت کرے گا؟“

”اللہ نہ کرے جو میری قسمت میری بیٹی کی پر چھائیں نہیں۔“ وہ فوراً دل میں لڑ کر دعا مانگا کرتی تھیں۔

اب بھی اس کی نوابی طبیعت، شاہانہ مزاج پر اس کا رویہ کڑے برسا رہا تھا اور بچپن کی طرح اب بھی ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھی۔

”لا حول ولا ایسے انسان نما جانور سے میں رشتے داری کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ منہ بنا کر تجزی سے بولی تھی۔

”ارے آواز تو جیسی رکھنا کچھ، جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر، کچھ تو عقل کا استعمال کرنا سیکھ جاؤ۔“

”ساری احتیاطیں، ساری سمجھ داری ہمارے ہی کھاتے میں آتی ہے، آخر کیوں؟“

”بس چھوڑو فضول کی بحث، کھانا کھاؤ، پھر اندر سے بلاوا آئے گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔ اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

”تم نہیں کھاؤ گی تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔ یہ کوئی بات نہیں ہوئی کہ جہاں کوئی بات ہوئی، تم نے کھانے سے ناراضگی شروع کر دی۔“

”مما! میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”کھانے کا تعلق سعد سے ہوتا ہے، دل سے نہیں۔ کھانے بیٹھو گی تو بھوک لگے گی، ویسے بھی ان چھوٹی موٹی باتوں کو نظر انداز

کرنا سیکھو، ورنہ بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے اور سوچ لینا اس لٹکانے کے بعد ہمارے پاس کوئی اور در نہیں ہے۔ زندگی ہماری ایک جہد

مسلل ہے، پھر کیوں اس میں مزید رکاوٹیں بڑھانے کی سعی کر رہی ہو، سختی تھی بارہ سال بعد گھوڑے کے دن بھی بدل جاتے ہیں مگر بیس

سال بعد بھی ہمارا وقت نہ بدلا، شاید ہمارے مقدر میں اسی طرح رہنا لکھا ہے تو ہمیں اب بھی سنبھال لینا ہے، خود سے جو ہو رہا ہے، اچھا ہو

رہا ہے، کچھ کے رہنا ہے۔“

☆.....☆.....☆

”دشت تمہائی میں اے جان جہاں!

لرزاں ہیں تیری یادوں کے کنول، تیرے ہونٹوں کے سراب

دشت تمہائی میں.....“

”مائی فٹ، اسٹاپ اٹ۔“ اس نے جھنجھلا کر شیپ آف کیا تھا۔

”یہ سنو پمپر۔“ سعد نے دوسری کیسٹ پلے کرتے ہوئے کہا۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن!

ہیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے.....

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی.....“

”سعد..... سعد! تم ہاؤ نہیں آئے تو میں کار کسی درخت سے ٹکرا دوں گا۔ حد ہوتی ہے کسی کو زچ کرنے کی بھی۔“ حسب عادت وہ

بری طرح تڑپ اٹھا۔

”زچ تم کر رہے ہونا کہ میں؟ ہر وقت تمہو بڑا سو جائے رکھتے ہو، کوئی شرافت والی بات نہیں ہے۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر ایسا لگتا ہے،

گویا قبرستان سے اپنی محبوبہ دل نواز کو دفن کر آ رہے ہو، غم و الم کی تصویر بنے۔“

”شٹ اپ یا رابات تو اجھی کیا کرو اور یہ ادھی بوگی بوگی مثالیں دینے سے پرہیز کیا کرو۔“

”ہاں سب کچھ میں کروں، تمہیں تو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ اس بار وہ نئی طرح جل کر گویا ہوا تو اس نے بے ساختہ

مسکرا اٹھا۔

”تمہاری پرابلم کا کیا حال چال ہے؟ جب سے آیا ہوں ملاقات نہیں ہوئی ہے۔“ بہت خوب صورتی سے وہ اس کا موڈ پہنچ کر چکا تھا۔  
 ”پرابلم نہیں، خوشی کہو، شادمانی کہو، دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے وہ، اسے دیکھتے ہی قوس و قزح میں رنگ بھر جاتے ہیں، چاند کی چاندنی اس کے وجود سے ہے، پھولوں میں دل کشی، ستاروں میں تابندگی، اس کے دم سے ہے، تم کیا جانو وہ کیا ہے۔“

”مجھے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، تم جانتے ہو یہ کافی ہے۔“ وہ کارکلفٹن اسٹریٹ کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔  
 ”تم کہہ رہے تھے، کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ کیا بات ہے؟“ وہ ریٹورنٹ میں آگئے تھے۔ ویٹریسنڈو جڑ اور کافی سرو کر گیا تھا۔  
 ”کل قاریہ کے پپانے بلوایا تھا مجھے، وہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ سعد نے سینڈوچ کھاتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

”وہ چاہتے ہیں شادی کرنا: یومین سیکنڈ میرج؟“

”اوہ شٹ، مطلب وہ چاہتے ہیں، میں جلد از جلد قاریہ کو سز قاریہ سعد بنا کر گھر لے آؤں تاکہ اس سے چھوٹی بہنوں کا بھی نمبر آسکے۔“ وہ اس کی شوخی پر گھورتا ہوا وضاحتی انداز میں بولا۔

”پھر تمہیں کیا پرابلم ہے، تمہاری تو ولی مراد بر آ رہی ہے، کیا سوچ رہے ہو اور کیوں؟ میرے تو خیال میں تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے، کوئی تو طلب کے راستوں میں سرخروئی کی منزل کو حاصل کرے، ورنہ یہ ایسا دھبہ لا حاصل ہے جہاں عمریں تمام ہو جاتی ہیں اور ہاتھ صرف خرابوں کے، کچھا اور نہیں لگتا۔“ انس نے کافی سگ سے نکلتی بھاپ کو گھورتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”لگن جی ہو تو ہر شے حاصل ہو جاتی ہے جیسے تالی بجانے کے لیے دو ہاتھ درکار ہوتے ہیں، ایسے ہی طلب کی راہ پر چلنے کے لیے جذبے بھی کھوٹ سے پاک ہونے چاہئیں تو کامیابی کسی نہ کسی ضرورت قدم چوستی ہے۔“

”اچھا تو تم اب مجھے گائیڈ کرو گے“ سگ ہوتوں سے لگا تا وہ مسکرا کر بولا۔

”اوپن ہو، میری کیا مجال ہے جو شخص خود مس گائیڈ ہونا چاہے وہ کس طرح گائیڈ ہونا پسند کرے گا، اپنی وے، تم نے اب اپنی فوج پلاننگ کیا کی ہے؟“

”ہاں تمہارے فوج پلان کی ہو رہی ہے، مجھے بھول کر اپنی سوچ، قاریہ کے قادر کی بات مان لو اور اگلے ہفتے ہمارے لے کر پہنچ جاؤ۔“  
 ”میں تو یہی چاہتا ہوں، مگر وہ کہتے ہیں میرے بزرگوں سے ملیں گے، پھر شادی کی ڈیٹ فکس ہوگی۔“ کل سے وہ جس الجھن میں مبتلا تھا وہ اس کے لبوں پر جاری تھی جو انس بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔

”بہنی کو کھلی آزادی دیتے وقت ان قادر کی آنکھیں کیوں بند ہو جاتی ہیں۔ اب جب کہ ہر بات طے ہونے کے بعد انہیں کیوں تمہاری فیملی ٹرمز یاد آتے ہیں۔ اس سے قبل کہاں تھے وہ؟“ وہ بگڑے موڈ سے بولا۔

”میں نے آٹھی سے کہا تھا، وہ معذرت کرتے ہوئے گویا ہوئیں کہ انہوں نے یہ معاملہ ان سے اوجھل رکھا ہوا تھا۔ انہیں اب معلوم ہوا ہے تو وہ میرے خاندان و حسب و نسب سے مکمل آگاہی چاہتے ہیں اور مجھے قاریہ کے حصول کی خاطر انہیں مطمئن کرنا بھی پڑے گا، ورنہ.....“ وہ لکھت چپ ہو گیا۔

”ورنہ..... کیا ورنہ“ اس ننگ نخیل پر رکھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

”قاریہ کا حصول میرے لیے ناممکن ہے۔“ اس نے دھواں دھواں لہجے میں بتایا۔

”وہاٹ؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ کسی کے جذباتوں سے کھیلنا کوئی مذاق نہیں ہوتا یا راز یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”انگل بہت فخرور ہیں پہلی ملاقات میں ہی مجھے معلوم ہو گیا ہے، وہ اپنی تسلی کیے بغیر کسی صورت نہیں مانیں گے۔“

”شادی کے لیے اتنی فضولیات، ویسے بتا تعلق کے لڑکی کسی کے ساتھ گھومتی پھرے، جب انہیں اپنی عزت و خاندانی وقار کا خیال

نہیں آتا ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے یا راز اور میں ”کسی“ تھوڑی ہوں۔ قاریہ سے بچی محبت کرتا ہوں، ہمارے درمیان از حد مضبوط تعلق بن گیا

ہے۔“ اسے خود کو غیر کہلاتا اس کے منہ سے پسند نہ آیا تو رنجیدگی سے بولا۔

”ماہیڈنہ کرو، تم بلا کسی مستحضر رشتے کے ان کے لیے غیر ہی ہو، اب تم نے گپ ہانک رکھی ہے کہ وہ تمہاری فیاضی ہے، تم نے اسے

اس کی برتھ ڈے پر گولڈ رنگ پہنا دی اور سبھے تعلق استوار ہو گیا۔“

”آٹھی نے یہی کہا تھا کہ وہ رتہ رتہ انگل کو منالیں گی، ویسے میں رشتے کو پکا سمجھوں اور میں کیا کرتا، جو انہوں نے کہا وہ میں نے کیا۔“

”مجھے ان نام نہاد عزت داروں کی بات سمجھ میں نہیں آتی، جن سے بیٹیوں کی جوانیاں سنبھالی نہیں جاتیں، پھر پانی سر سے اونچا

ہو جائے تو ایسے لوگ دوسروں کی پکڑیاں اچھالنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔“ ان کے لہجے سے اندر کا درد محسوس ہو رہا تھا۔

دونوں کے درمیان گھمبیر خاموشی چھا گئی تھی۔ سوچوں کے گرداب میں پھنسے کافی پی رہے تھے، پھر کچھ وقف کے بعد انس بولا۔

”اب تم بتاؤ کیا چاہتے ہو، یہ کوئی قسمی استوری تو ہے نہیں جو تم کرائے پر ماں، باپ و دیگر عزیز واقارب اکٹھا کر کے لے جاؤ

گے۔ یہ ریکل لائف ہے، یہاں جتنے کریکٹرز ہوں گے، سب ریکل پر سٹائیز والے چاہئیں۔“

”میں تمام حقیقت انہیں بتا چکا ہوں، پھر بھی نہ معلوم وہ کیوں بھند ہیں۔“

”ان جیسے ہیرٹس کو ان ہی موقعوں پر اپنے فرائض کی ادائیگی کا احساس ہوتا ہے، ویسے یہ ہر معاملے سے لاتعلق رہتے ہیں۔ تم فکر

مت کرو، میں چلوں گا تمہارے ساتھ اور ان کی ہر تسلی کو مکمل کر دوں گا۔“ وہ اطمینان سے بولا تو سجد کا سر جمایا ہوا چہرہ ایک دم مکمل اٹھا اور وہ

ٹسکرا کر بولا۔

”ریٹیل، تم چلو گے نا؟ دراصل میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم میرے ساتھ چلو، کیونکہ تم مجھے اچھی طرح کنویں کر سکتے ہو وہاں پر۔“

”تم نے خود آفر کیوں نہیں کی؟“ اس نے سجد کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس..... مجھے ڈر تھا کہ..... تم انکار نہ کرو۔“

”یہی دوستی ہے؟ اتنا سمجھ پائے ہو مجھے؟“ اس کے بھاری لہجے میں خفگی تھی۔

”نہیں، نہیں ایسی بات نہیں ہے یا! محبت بڑی ظالم شے ہے جب ہوتی ہے تو بندے کو بڑا عجیب سا بنا دیتی ہے یہ، اس کا کرشمہ ہے جو میں بے یقین ہونے کے باوجود اس دوسرے کا شکار تھا کہ کسی وجہ سے تم نے انکار کر دیا تو میں اسے کھودوں گا اور میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔“

”او کے، او کے اگر میں تمہاری کیفیت سمجھ نہیں پا رہا ہوتا تو پھر میں دماغ درست کر دیتا۔“ وہ ویرن کوئل پے کرنے کے بعد اٹھتے ہوئے بولا، تو سجد کے لبوں پر بھی جان دار مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر دستک ہوئی تھی، بلو شاہ نے اندر سے آنے والے کا نام دریافت کیا تو جواہر نام کے بجائے خاموشی سننے کو ملی تھی۔

”کون ہے بھئی، جواب کیوں نہیں دیتے؟“ خامسے توقف سے وہ گویا ہوئیں۔

”پھپھو! میں ہوں حمزہ۔“

”حمزہ!“ چند لمبے اس نام کی گونج ان کے اندر پھیلتی رہی تھی، انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ گوگو کی کیفیت میں دروازے کو نکلے جا رہی تھیں جس کے دوسری جانب وہ کھڑا تھا جو ان کے سب سے قریب تھا، جس کی بے لوث محبت اور ہمدرد وجود نے

انہیں کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ ”کیا وہ سچ حمزہ ہے؟ اگر وہی ہے تو یہاں کیسے پہنچا؟ کس نے بتایا ادھر کا ٹھکانا؟“

”پھپھو! دروازہ کھولیں۔“ اس ہار حمزہ کی آواز نے انہیں دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا، فردوس کے شاپرڈ ہاتھوں میں پکڑے ایک عرصے بعد اسے سامنے دیکھا تھا جس کو صبح وشام دیکھنے کی عادی تھیں۔ دل کو نہ معلوم کیا ہوا کہ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکیں۔

”السلام علیکم، پھپھو جان! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“

وہ خود ہی اندر آ گیا تھا اور شاپرڈ چیز پر رکھتا ہوا بولا تو بلو شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے گوگو گیر لہجے میں کہا۔

”کتنے عرصے بعد دیکھ رہی ہوں تمہیں، آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا، دل میں کسی طمانیت پھیلی ہے، لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولیں۔

”یہاں ہینگ پر بیٹھا آرام سے، اور سناؤ گھر میں سب کیسے ہیں، بھائی، بھائی، بچے وغیرہ سب ٹھیک ہیں؟“ وہ بھی وہیں بیٹھ گئی تھیں۔

”جی سب ٹھیک ہیں۔“ گھر والوں کے ذکر پر وہ جھینپ گیا تھا۔ وہ بڑے لگاؤ سے ایک ایک کا پوچھ رہی تھیں، ان کے انداز میں

کوئی طنز یا نفرت نہ تھی۔ وہی محبت سے گوندھا شہد آگئیں لہجہ، وہ ویسے ہی تھیں بے قصور مار کھا کر بھی ڈعادینے والی، بے لکس، ممبر و شکر کا پیکر،

سراپائے ایثار و وفا، ورنہ وہ تو آتے ہوئے ڈرہا تھا کہ پھپھو کہیں دھکے دے کر نکال باہر نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کرتی بھی تو بے جا نہ تھا، جس تذلیل و گندے بہتان لگا کر ان کو اور کرن کو درد برد کیا گیا تھا، ایسے سلوک پر ان کا رد عمل بے جا نہ ہوتا، اس دن جو کچھ ہوا اس میں ہر اس قصور وار وہ بھی تھا۔ کیا ہو جاتا اگر وہ کچھ بہادری کا مظاہرہ کرتا، کرن کو گیٹ سے دور اتارنے کے بجائے گیٹ کے پاس ہی اتار جاتا تو ہرگز یہ نہیں ہوتا جو ہوا۔

”پھپھو میں بہت شرمندہ ہوں۔ اس دن جو کچھ ہوا بہت غلط، بہت بُرا ہوا۔ آپ کو وہ گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا، پاپا نے آپ کو گھر سے نکالا اور آپ نکل گئیں، ان کی آنکھوں پر تو سازشوں کے پردے پڑے ہوئے تھے، جن کے باعث نہ انہیں معلوم بہن کی بے بسی نظر آئی اور نہ ہی جوان بھانجی کی عزت، میں شام کو یونیورسٹی سے واپس آیا تو باہر ہی صحنے نے مجھے پوری تفصیل سنا ڈالی تھی اور میں اسی وقت اسے لے کر آپ کو اور کرن کو ڈھونڈنے نکل گیا تھا۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا آپ کو، ایڈمی ہوم تک کھنگال آئے تھے پھر کئی چکر کرن کی دوست عادلہ کی طرف لگائے ہر بار اس کے دروازے پر پڑا اتالا اور پریشانی میں جتلا کر گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپ لوگ ہیں کہاں۔ پہلی بار پاپا کے روبرو بھی ہوا، آپ کی سائیلی، پاپا نے کہا انہیں خود یقین نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ مٹی اور اسٹیز کی زبانی سب سن کر بھی یقین نہیں کرتے تھے، میں نے قسم کھا کر بتایا کہ وہ میں تھا کوئی اور نہیں جو کرن کو جلدی کی وجہ سے ڈراپ کر کے گیا تھا۔ پاپا کو یقین آ گیا تھا مگر ان کا کہنا آج تک یہی ہے کہ وہ غصے میں انہیں گھر سے جانے کا کہہ بھی بیٹھے تھے تو وہ گھر چھوڑ کر کیوں گئیں؟ جب اس گھر کے سوا کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں تھا تو کیوں دلہیز بھلا گئیں، اگر حق پر تھیں تو یہیں رہ کر اپنے جج کو ثابت کرتیں، کوئی آس، کسی سے کوئی امید تھی جس کے سہارے گھر چھوڑ کر گئی ہیں۔“

”امید، آس، ہی نہیں، یقین تھا کہ جس نے پیدا کیا ہے جو نقد میں بنانے والا ہے جس نے پانی کی تہوں میں کیڑوں کے گھروں بنائے ہیں، جس نے پتھروں میں بھی اپنی مخلوق کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری اٹھائی ہے، وہ بھلا ہم سے غافل کس طرح رہ سکتا ہے، پھر وہ خود فرماتا ہے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، وہ جیسا گمان رکھتا ہے مجھ سے، میں ویسا ہی لوازمات ہوں تو دیکھ لو، انہوں نے سر سے چھت چھین کر بے آسرا سمجھا تھا، بیروں تلے زمین کھینچ کر بے سہارا کیا تھا، آج اس مہربان ذات کی عنایت سے مجھے چھت بھی میسر ہے اور زمین بھی، بہت سکون سے زندگی گزار رہے ہیں، کرن کل بھی ملازمت کر رہی تھی اور آج بھی کر رہی ہے۔“ وہ آہستگی سے اسے بتا رہی تھیں۔

”مجھے معلوم ہے پھپھو گھروالوں کے بد صورت رویوں کے متعلق، لیکن پھر بھی کہوں گا آپ کو گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔“

”محسوس کرنا اور سہنا الگ الگ کیفیت ہیں بیٹا! پھر گھر تو چھوڑنا ہی تھا، خیر چھوڑو یہ بتاؤ، تمہیں یہاں کا پتہ کہاں سے ملا؟ کس نے بتایا؟ وہ اس تکلیف دہ موضوع کو چھیچھ کر تے ہوئے ہر اشتیاق لہجے میں بولیں۔

اس دوران وہ حنزہ کے منع کرنے کے باوجود شربت بنا چکی تھیں اور دو گلاس بھر بھر کر اسے پلا چکی تھیں، ان کے چہرے پر ایسی روشنی تھی جو کئی راتیں اماؤس کے سیاہ اندھیروں کے بعد چمکتی ہے۔

”آپ کو کرن نے نہیں بتایا، ایک ہفتہ قبل میری اس کی شاپنگ سینٹر کے باہر ملاقات ہوئی تھی اور اس نے حسب عادت میری طبیعت صاف کی تھی، حالانکہ اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ اگر پھر دوبارہ ملاقات ہو جائے تو بری لگی سے گزر جاؤں اور میں نے سوچا تھا کہ ایسا ہی کروں گا مگر..... نہ کر سکا، بہت احتیاط سے اس کے رکشے کا پیچھا کرتا ہوا میں یہ دیکھ چکا تھا، جب سے آج میں ہمت کر پایا ہوں یہاں آنے کی، کرن کا رویہ کچھ بھی سہی، مگر میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ اس نے جذباتی انداز میں ان کا ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”تم دل چھوٹا نہ کرو، میں کرن کو سمجھاؤں گی، پوچھوں گی اس نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔“ نوشاہہ کو کرن کی اس حرکت نے دکھ پہنچایا تھا۔

”میرے خیال میں ابھی آپ اس سے میرے آنے کا ذکر نہ کریں تو بہتر ہے۔“

”کیوں..... میں کس طرح چھپاؤں گی؟“ وہ تمحیر ہوئیں۔

”اس کا غصہ اتر جائے تو پھر بتائیے گا۔ ابھی نہیں۔“ وہ اس کی ضدی طبیعت سے واقف تھا کہ جو کبھی تھی وہ کر کے بھی دکھاتی تھی۔ اس کے مزاج شروع سے خطرناک ہوتے تھے، ایک عرصے بعد وہ ملی تھی اور اس بار وہ اسے پا کر کھونے کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔

☆.....☆.....☆

انس مڈرکسی آسیب کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا تھا، نہ معلوم اسے اس سے کیا بڑھ خاش تھی، ہر کام میں وہ عیب نکالتا تھا اور آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ گرینی کے کمرے میں سے اسے مشائی رکھی ہوئی مل گئی تھی۔ گرینی کا شوگر لیول آج کافی ہائی ہو رہا تھا، وہ خود بھی خاصی پریشان ہو رہی تھی کہ اتنی احتیاط دیکھ بھال کے باوجود شوگر کنٹرول کیوں نہیں ہو رہی تھی، حالانکہ وہ دو اور غذا نہیں نام پر دے رہی تھی۔ وہ یہ معاملہ کبھی نہیں پائی تھی کہ یہ بھی اس کے ہاتھ لگا تھا جس کی شخصیت بظاہر بہت بڑے وقار مہذب دکھائی دیتی تھی مگر مزاج اس کا شخصیت کے متضاد تھا، وہ لفظوں کی مار سے انسان کو بے حال کر دیا کرتا تھا۔

وہ کچن میں گرینی کے لیے دلیہ بنانے کے لیے کرلیوں کا جوس بنا رہی تھی، جب وہ ہاتھ میں مشائی کا ڈبہ پکڑے دندا تا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

”ایسی ڈیوٹی دیتی ہو تم ایہ تمہاری اپنی شنسی ہے؟“ اس نے اس کے قریب کاؤنٹر پر مشائی کا ڈبہ اچھالتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔ اس کے اس طرح اچھالنے سے ڈبے سے نکل کر گلاب جا میں ادھر ادھر بکھر گئی تھیں۔ شیرے کی چمکھیں اچھل کر اس کے چہرے پر آ گری تھیں۔

”یہ..... یہ کہاں سے ملا ہے سز۔“ وہ بوکھلا گئی تھی اور کچن میں دوپہ کے کھانے کی تیاری کرتی ہوئیں شو اور چندا بھی اس کے اعزاز سے سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھیں۔

”گرینی کی بیڈ کی دروازے سے ملا ہے، تمہیں معلوم ہے، کنڈیشن کتنی ویک چل رہی ہے۔ وہ پہلے ہی جیرالڈ لائف گزار رہی ہیں اور اپنی نااہلی سے کیا مزید چاہتی ہو تم، کسی اور پر اہلہ کی گنجائش ہے کیا؟“



”میری سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ کہاں سے آ گیا، میں نے سب جگہ چیکنگ کی تھی“۔ وہ ہکا بکا سی سمجھ نہیں پاری تھی، کس طرح اپنی صفائی پیش کرے۔

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں، کام کے ٹائم پر صرف کام مانتا ہوں، کوئی وضاحت، کوئی بہانہ، کوئی عذر نہیں مانتا“۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں سر۔ یہ صفائی وہاں نہیں تھی“۔

”وہاں نہیں تھی تو مجھے کیسے مل گئی؟“

”میڈم نے کہیں چھپا کر رکھی ہوگی، میرے کمرے سے نکلنے کے بعد وہاں رکھی ہوگی، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ میں چیک کر چکی ہوں، دو بارہ چیکنگ نہ کروں گی“۔ جو بات اس کی سمجھ میں آئی وہ کہہ بیٹھی تھی۔

”میں ایسے کسی پلان کو نہیں مانتا ہوں، تمہاری ڈیوٹی کی ٹائمنگ اب ڈے ٹائٹ رہے گی اور اگر اس دوران کوئی کوتاہی ہوئی تو میں کوئی رعایت نہ کروں گا ملازمت سے نکالنے میں“۔ وہ بھرے ہاتھوں کی طرح آیا، برسا، مگر جا اور چلا گیا۔ وہ پراگندہ ذہن کو مزید بوجھل محسوس کرنے لگی۔

”صاحب کی بات کا نہ امت مانو بیٹی! صاحب زبان کا جتنا کڑوا ہے، دل کا اتنا ہی بیٹھا اور نرم ہے“۔ اس کی بدحواس شکل دیکھ کر شمو تسلی رہتی بولی تو اس کے چہرے پر جیسی ہی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہم ملازم ہیں شمو! ہمیں مالک کی اچھائی و برائی سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہمیں صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے“۔ اس نے سنک میں لگے ٹل سے اپنے چہرے پر پانی ڈال ڈال کر شیرے کے چھیننے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”کہتی ہو درست بات، ویسے ایک بات پوچھوں، نہ تو نہیں مانو گی“۔ وہ چندا کو آنا گوندھنے کا کہہ کر خود قہر بھونٹتے ہوئے اس سے جھجک کر بولی۔

”ہوں، پوچھو“۔ وہ ولیہ باؤل میں ڈالنے کے بعد چکن کے چھوٹے چھوٹے ٹپسز کر کے اس میں ڈالتے ہوئے بولی۔ چکن اس نے کالی مرچ و نمک ڈال کر پہلے ہی بوائل کر لیا تھا۔ گریٹی طیبیٹا خاصی چٹوری واقع ہوئی تھیں۔ مریضوں والی غذا وہ بالکل نہیں کھاتی تھیں، اس لیے ایسی ہلکی پھلکی چیزیں اسے خود سے تیار کرنی پڑتی تھیں جن کو بھی وہ بے تحاشہ نخروں سے متاثر فرماتی تھیں۔

”تم اور تمہاری ماں کسی اچھی فیملی کی لگتی ہو، میرا مطلب ہے ہم لوگ جدی ہشتی مالکوں کی خدمت کرتے آ رہے ہیں، ہم لوگ اس ماحول، اس رہن سہن میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ یہاں کی زبان بھی ہماری زبان بن گئی ہے، جب کبھی چٹنیوں میں ہمیں گاؤں جانا پڑتا ہے تو اپنی برادری میں ہماری شان ہی الگ ہوتی ہے۔ ہمارے لوگ کہتے ہیں، شہر میں رہ کر بالکل شہری بن گئے ہو۔ اپنے لوگوں کی باتیں ایک طرف مگر جی ہر کوئی ہمیں دیکھ کر پہچان جاتا ہے کہ ہم ملازم ہیں مگر آپ لوگوں کو دیکھ کر محسوس نہیں ہوتا کہ آپ لوگ ملازم ہیں“۔

شمن نے اپنی بات سمجھانے کے لیے اپنی عقل کے مطابق ہی دلیل دی تھی۔

”فصل و صورت سے کچھ بھی نہیں ہوتا شمن۔ انسان کو چلانے والی شے کا نام نصیب ہے۔ اس کے آگے ہر صورت، ہر سیرت مات ہے۔“ وہ ٹرے میں دلیہ اور جوس رکھتی ہوئی بولی اور ٹرے اٹھا کر گرنی کے کمرے میں چلی آئی جو سو کر اٹھ چکی تھیں اور بڑے جارحانہ تیوروں سے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

”میرے کمرے کی تلاشیاں بھی ہوا کریں گی اب؟“ وہ کڑک کر بولیں۔

”کیوں..... کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“ وہ ٹرے ان کے نزدیک رکھتے ہوئے انجان بن کر گویا ہوئی۔ ساتھ اسپرن اٹھا کر ان کے گلے میں سیٹ کرنے لگی تھی۔

”ہوں، میرے کمرے میں کون آیا ابھی تب میں سو رہی تھی۔“ وہ گول مول انداز میں اس کے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے بولیں۔

”انس سر آئے تھے۔“ وہ پلیٹ میں دلیہ نکالتی ہوئی بولی۔

”ہاں، مجھے شبہ تھا، یہ اسی کی کارستانی ہو سکتی ہے۔ کہاں ہے بلا کراؤ، اسے میں پوچھتی ہوں اس سے اس گھر میں، میں مرضی سے کچھ کھانی بھی نہیں سکتی۔“

وہ ایک دم آگ بگول ہو گئی تھیں۔ اسپرن بھی انہوں نے نوج کر پھینک دیا تھا۔

”میڈم! میڈم پلیز آپ غصے نہ ہوں، میں انہیں بلاتی ہوں۔“ انہیں چیخنے چلاتے دیکھ کر وہ پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر کمرے سے باہر بھاگی تھی تاکہ کسی سے کہہ کر انس کو بلا سکے کہ اندر آتے انس سے کمراتے کمراتے بیٹی۔

”کیا پراہلم ہے؟“ وہ ایک سائینڈ میں ہوتا ہوا بولا۔

”وہ..... میڈیم کھانا نہیں کھا رہی ہیں۔ بہت غصے میں ہیں۔“

”شمن سے کہو میرا کھانا بیہوش لے آئے، گرنی کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔“ اس بار اس کا رویہ کچھ بہتر تھا۔ گرن نے شمن کو ہدایت دے دی تھی اور واپس کمرے میں آئی تو گرنی غصہ، جنون سب بھول بھال کر مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”موت تو برحق ہے بیٹا، پھر جب مرنا ہی ہے تو کھا کر مرو، کیوں ترس ترس کر مر جائے، میں ان ڈھکوسلوں کو نہیں مانتی ہوں۔“

”یہ سراسر خود کشی ہے۔ میں نہیں مانتا آپ کی من گھڑت تادیلوں کو۔“

”تو مانتا ہی کب ہے میری، جواب مانے گا۔“

”گرنی! پلیز یہ بچوں کی طرح بلی بیوی بڑ کرنا چھوڑیں آپ، آپ کی زندگی ہمارے لیے بہت معنی رکھتی ہے۔“ وہ از حد فکر مند تھا۔

”بس رہنے دے خوب جانتی ہوں، کتنی محبت کرتا ہے۔“

”محبت کسی فیشن یا دکھاوے کا نام نہیں ہے جو سب کو نظر آئے، یہ تو دل میں اتر جانے والی سانسوں کا نام ہے کہ جب تک

دھڑکنیں ہیں، زندگی ہے۔“

”بس یہ باتیں بنانے کے علاوہ آتا کیا ہے تجھے؟ کچھ میری بھی مرضی اس گھر میں چلے گی یا نہیں۔ بہو میری خواہش پر اس گھر میں نہیں آسکتی اور مشائی.....“

”پلیز..... پلیز گرینی! اس ناپک کو میں اب کلوزڈ کر دینا چاہتا ہوں۔“ وہ جھنجھلا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”اچھا..... اچھا زیادہ ہوشیار نہ بن، جب بھی شادی کی بات کرو، تجھے پٹنگے کیوں لگ جاتے ہیں، جائز بات کرتی ہوں ناجائز نہیں۔“ گرینی بھی اسی کے انداز میں بولیں تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”میڈم! کھانا.....“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نوکی رہے یا جائے، کیونکہ اس وقت وہ پرسنل گفتگو کر رہے تھے جس کے دوران اسے اپنا یہاں موجود رہنا بالکل مناسب نہ لگ رہا تھا، سو ہمت مجتمع کر کے بولی۔

”آپ جائیں، گرینی میرے ساتھ کھانا کھائیں گی۔“ وہ اس سے مخاطب ہوا تو کرن فوراً ہی کمرے سے نکل آئی تھی۔ شو فرمایا پکڑے چلی آ رہی تھی۔ وہ اپنے کوارٹر میں آ گئی۔ کرسی پر رکھے فرانس نے اس کی توجہ فوراً ہی اپنی طرف مبذول کرائی تھی، وہ شاپرڈ سے جھانکتے ہوئے سبب، کیٹ اور اسٹراہیری کے باکس دیکھ کر نو شائبہ کی طرف تڑپی تھی جو ابھی غبر کی نماز پڑھ کر اٹھ رہی تھیں۔

”مما! یہ کہاں سے آئے، کون لایا ہے؟“

”مزرہ لایا تھا۔“ انہوں نے جائے نماز تہ کرتے ہوئے جتنے اطمینان سے کہا تھا، وہ سن کر اتنی ہی حیران و پریشان ہوئی تھی۔

”مزرہ..... لایا تھا..... وہ کس طرح پہنچا یہاں پر۔ وہ یہاں کس طرح آ سکتا ہے؟ اسے یہاں کا ایڈریس کس نے دیا؟“

”اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔“

”حیران نہیں، پریشان ہو رہی ہوں، آج وہ پہنچ گیا ہے، کل دوسرے آئیں گے اور پرسوں وہ سازشی کھوپڑیاں پہنچ جائیں گی اور ہم یہاں سے بھی نکال دیئے جائیں گے۔“ وہ سخت مضطرب تھی۔

”کیوں فضول کے دوسوں کا شکار ہوتی ہو، ایسا کچھ نہیں ہوگا، پھر تم مزرہ کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ ایسا بچہ ہے؟ اس نے قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیا ہے، اپنی ماں کی نہیں، ہماری پروا کی ہے، کیوں بھولتی ہو اس کے احسانوں کو، کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے ہمارے لیے۔“

”یہ اچھا نہیں ہوا ہے ماما وہ یہاں پہنچ کیسے گیا ہے؟“ اس کا ذہن اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔

”جس دن وہ تمہیں بازار میں ملاتا تھا وہیں سے تمہارے رکشے کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا اور جگہ دیکھ گیا تھا۔ بہت ڈرتا، جھپکتا آیا تھا، کہہ رہا تھا کرن کو چاند چلے کہ میں آیا تھا، اسے تمہارے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ اس سے مارکیٹ میں تمہاری ملاقات ہوئی ہے۔ اس کی محبت دیکھ لو، پہنچ ہی گیا وہ یہاں پر۔“ نتیجے سے ملاقات ہونے پر وہ خاصی خوش و سرور دکھائی دے رہی تھیں۔

کرن غور سے ماں کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، جس کو محسوس کر کے وہ کہہ رہی تھیں۔

”کیا ہوا ایسا کیا دیکھ رہی ہو؟“

”حزہ سے مل کر تفتی خوش ہیں، ایسا کیوں ہے؟“

”اپنوں سے مل کر خوشی کس کو نہیں ہوتی، پھر حزہ میرا خون ہے، میرے بھائی کی اولاد۔“

”میں بھی تو کسی کا خون ہوں، کسی کی اولاد ہوں، میرے بھی تو اپنے ہوں گے، پھر انہیں خون کی کشش تڑپ میں جھٹا کیوں نہیں

کرتی؟ ایک بار بھی کوئی پکارتا نہیں آ کر کیوں؟“ اس کی ذہنی رو پھر بجکی تھی۔

”زبردستی کے بندھنوں میں کشش نہیں ہوتی اور محبت تو بالکل بھی نہیں۔ تمہارے باپ سے میری شادی ان کی مرضی کے خلاف

ہوئی اور حزیہ ستم یہ ہوا کہ ان کی خواہش کے بغیر ہی تم دنیا میں آ گئیں۔ ان سے تمہا میرا وجود ہی برداشت نہ ہوتا تھا، چہ جائیکہ ہم دو ہو گئے

تھے۔ تمہاری دادی کی خواہش تھی پوتے کی اور تمہاری پیدائش نے ان کی اُمیدوں کے چراغ ہی گل کر دیئے تھے۔ مجھے اپنی ناقدری و بے

دقتی گوارا تھی مگر میں تمہیں ان کی نفرتوں کا شکار بننے و یکنا برداشت نہ کر سکی اور گھر چھوڑ کر چلی گئی اور ان کی دلی مراد برآئی۔ وہاں سے پھر

کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس وقت امی، ہا زائدہ تھے، مگر کی حکمرانی میرے ہاتھ میں تھی، بھائی بھی جان چھڑکتے تھے، بھائیوں کی ہمت نہ

تھی آواز نکالنے کی۔ بہت اچھی زندگی گزار رہی تھی، پھر خاندان کے بزرگوں نے کہا کہ شادی شدہ بیٹیاں گھر بیٹھی بچتی نہیں ہیں۔ ان کا

اصل مقام سسرال ہے، امی، ابا، بھائیوں کو سب نے سمجھایا کہ معاملہ درست کر کے مجھے اور کرن کو گھر بھجوائیں کہ آج ماں باپ کی موجودگی

میں بھائی، بھائیوں برداشت کر رہی ہیں، ان کے بعد کوئی نہیں سمجھے گا، مجھے بھی بہت کچھ سمجھایا گیا، اونچ نیچ بتائی گئی اور مجھے بھی سمجھا آ گئی کہ

واقع آج میری بچی چند ماہ کی ہے، کل بڑی ہوگی تو ضرور اپنے باپ کا پوچھے گی، اپنے سے وابستہ رشتوں کا پوچھے گی تو کس طرح سمجھا پاؤں

گی؟ گھر میں جب اپنے ماموں کے بچوں کو باپ سے لا ڈاٹھواتے، دادا، دادی سے پیار سینٹے دیکھے گی تو احساس کتری کا شکار نہ ہوگی؟ ان

ہی سوچوں، انہی خیالات نے مجھے اس زندان میں دوبارہ جانے پر راضی کر لیا، جہاں سے میں ہمیشہ کے لیے نکل آئی تھی مگر ان لوگوں کے

سینوں میں دھڑکنے والے دلوں میں گداز ہے نہ محبت، انہوں نے ہمیں اپنانے سے انکار کر دیا اور تمہارے باپ نے صاف کہہ دیا کہ اس گھر

میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اگر وہ آنا چاہیں تو خود ہی آئیں، یہاں سے کوئی نہیں جائے گا انہیں لینے۔ انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

”بس پھر کیا تھا، ماں باپ تو ہوتے ہی اولاد کے لیے محبت و ایثار کے پیکر، ان دنوں بھائیوں کی محبتوں کو ابھی بھائیوں کی جگہ و

حسد کی دیمک نہ لگی تھی، وہ میری محبتوں میں پوری طرح سرشار فیصلہ سنا بیٹھے کہ ہماری بہن ہم پر بوجھ نہیں ہے، ساری عمر ہم ان دونوں کو سر

آنکھوں پر رکھ سکتے ہیں۔ ہماری بہن اور بھانجی اسی صورت میں یہاں سے جائیں گی، جب وہ خود آ کر عزت و احترام کے ساتھ لے کر

جائیں۔ انہیں کیا غرض پڑی تھی جو وہ زبردستی کے بندھن کو بھاتے، نہ وہ آئے اور نہ ہی مجھے اجازت ملی گھر سے قدم باہر نکالنے کی، وقت

گزر رہا چلا گیا، تم دو سال کی ہوئیں تو اماں کے بعد با بھی ساتھ چھوڑ گئے، مگر کی حکمرانی از خود ہی بھائیوں کے ہاتھوں میں آ گئی، بھائی اپنے

پرنس میں اتنے مصروف ہوئے کہ رفتہ رفتہ تقریباً بھول ہی گئے کہ اس گھر میں اپنی جس بہن و بھانجی کو اتنے فخر و مان سے رکھا تھا، ان کا کیا

حال ہے، پھر تمام صورت حال سے تم واقف ہو، آج میں نے تمہیں وہ حقیقت بتادی ہے جس کو سننے کو تم ہمیشہ سے متنی رہی ہو۔

آج بلا ارادہ ہی وہ اسے سب کچھ بتا چکی تھیں جو وہ شعور کے آتے ہی بڑی شدت سے جاننے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اب حقیقت جان کر جو دکھ و تکلیف اس کے چہرے سے عیاں ہوئی تھی، اسی تکلیف، اسی بے وقعتی کے احساس سے بچانے کی سعی وہ کرتی رہی تھیں، لیکن حقیقت پھر حقیقت ہوتی ہے جو کبھی نہ کبھی آشکارا ہونا ہوتی ہے۔

”اپ سیٹ ہو گئی ہو۔“ انہوں نے اس کے زرد پڑتے چہرے، بھرانے والی آنکھیں دیکھ کر ملامت سے کہا۔

”میں اسی لیے تم سے یہ حقیقت چھپاتی آئی تھی کہ شاید تم برداشت نہ کر سکو۔ اپنی ذات کی نفی، اپنے وجود کا ناپسندیدہ ہونا کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے بھرانے لہجے میں کہا اور وہ جواباً کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

☆.....☆.....☆

اپریل کی وہ رات بے حد خوشگوار اور روشن تھی۔

بہار کا موسم تھا۔ اُن نکت پھول لان میں مہک رہے تھے۔ ہوا خشکی تھی اور پورے چاند کی دل سس چاندنی ہر نوبت پھیلی روشنی پھیلا رہی تھی اور اس کے اندر یادوں کی رم جھم پھووار پڑنے لگی۔

یہی مہینہ تھا، بہار کے اوائل دن ہی تھے جب وہ سر اپا بہار میں کر اس کی زندگی میں آئی تھی اور بڑے کروفر سے اس دل کی سلطنت پر حکمرانی کرنے لگی تھی۔ منال خان سے دوسری ملاقات بھی ایسی ہی اتفاق تھی۔

وہ ان دنوں بزنس میٹنگ کے لیے اسلام آباد آیا ہوا تھا، جب وہ اسے فیصل مسجد کے باہر آئس کریم کھاتی ہوئی ملی، پھر نہ معلوم کیا ہوا، وہ از خود کسی اُن دیکھی ملاقات کے زیر اثر اس کی جانب کھنچا چلا گیا۔

”ہیلو، کیسی ہیں منال خان؟“

”ارے آپ..... اُس مرشد خان۔ آئم فائن، آپ یہاں کیسے؟“ وہ جو کچھ جھجکتا ہوا اس خوف سے کہ وہ نہ معلوم کس رد عمل کا اظہار کرے، پھپھانے یا نہ پھپھانے تو بے عزتی نہ کر ڈالے مگر خلاف توقع وہ بڑے پُر تپاک انداز میں اس کی جانب بڑھی اور اپنا سفید خنجر وٹی ہاتھ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی تو اس نے بڑھ کر اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کا نازک ہاتھ تمام کر دھیرے سے دبا کر چھوڑ دیا تھا۔

”بزنس کے سلسلے میں آیا ہوں۔“

”میں یہاں اسپرنگ انجوائے کرنے آئی ہوں۔“

”اپنے شہر میں بہار نہیں آئی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہوں، آئی تو ہے پہلے تھری پرسنٹ پالوشن کی نذر ہو کر دن پرسنٹ مل جایا کرتی تھی، اب جگہ جگہ ترقیاتی کاموں سے پیدا شدہ گڑھوں اور دھول، مٹی، کوڑا کرکٹ کی نذر ہو کر وہ بھی مٹ گئی ہے۔ پورے سال خزاں کا موسم ہی کراچی میں چھایا رہتا ہے۔“

وہ آکس کریم ختم کر کے رومال سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی بولی۔

”اتنی محبت ہے آپ کو بہار سے۔“

”خوب صورت چیزوں سے سب کو محبت ہوتی ہے۔“

”لوگ کہتے ہیں خوب صورتی یا بد صورتی ہمارے اندر ہوتی ہے جو ہمارے اندر کے موسم کے تحت ہمیں نظر آتی ہے۔“

”لوگوں کو چھوڑو، آپ اپنی بات کریں، لوگوں کو تو عادت ہوتی ہے کچھ نہ کچھ کہنے کی۔ لوگوں کی باتوں میں نہ آیا کریں، آپ کا

دل کیا کہتا ہے، وہ سنا کریں۔“ وہ شرارتی انداز میں گویا تھی۔ میرون اور بلیک خوب صورت کڑھائی والے سوٹ میں، سلی بالوں کو شانوں پر

بکھرائے وہ پہلے دن سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے شوٹلر بیگ کھول کر دو چھوٹے کے پیکٹ نکالے، ایک کار پیر ہٹا کر منہ میں

رکھا اور دوسرا انس کی طرف بڑھایا تھا۔

”تو تھینکس۔ مجھے پسند نہیں ہے۔“ اس نے معذرت کی تھی۔

”اوہ..... خاصے بد ذوق آدمی ہیں آپ۔“ وہ دوسری بیل کا بھی رپر پھینک کر بیل منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”اوہ سوری.....“

آپ نے مائینڈ تو نہیں کیا؟“ اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا تو گھبرا کر بولی۔

”ارے نہیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مائنڈ کر کے اپنی انرجی ویسٹ کرنے کا عادی نہیں ہوں میں۔“

”دیر کی گڈ..... کول مائنڈ ہیں آپ۔“

”ساری باتیں یہاں کھڑے کھڑے ہی کریں گی؟“ وہ اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے گویا ہوا۔

”کھڑے کھڑے کیوں بیٹھ جائیں۔“ آرام سے جواب آیا تھا۔

”یہاں نہیں..... کسی اچھی سی جگہ پر جہاں کافی مل سکے۔“

”انس کی تجویز پر اس کے دل کش چہرے پر سوچوں کی پرچھائیاں پھیل گئی تھیں جیسے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پار ہی ہو۔“

”پاسبل نہیں ہے تو ہم یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے، دراصل میں اپنی فیملی کے ساتھ یہاں نہیں آئی ہوں، اپنے قادر کے کزن کے ہاں آئی ہوں، یہ لوگ بہت

نیر و مائنڈ ہیں۔ یہ لوگ کسی سے ریلیشن نہیں رکھتے، صرف اپنے لوگوں میں خوش ہیں، اگر میں آپ کے ساتھ چلی گئی تو گزب ہو جائے گی۔ وہ

اندر گئے ہیں، بس باہر آتے ہی ہوں گے، ایسا کریں آپ مجھے اپنا کنٹیکٹ نمبر دے دیں، موقع دیکھتے ہی میں آپ سے کنٹیکٹ کر لوں گی۔“

وہ بے چین نظروں سے مرکزی گیٹ کی جانب دیکھتی ہوئی بولی۔ انس نے کوٹ کی جیب سے اپنا ونڈینگ کارڈ نکال کر اس کی

جانب بڑھایا جس کو بڑی احتیاط سے اس نے اپنے بیگ میں رکھا اور اسے ہائے ہائے کہتی آگے بڑھ گئی۔



جب دل دنیا کی رنگینیوں سے لاتعلقی ہو جائے۔ حقیقتوں کے چہرے بے لباس ہو جائیں، زندگی بہاروں کے سبز پتوں پر انہوں سے بے نیاز ہو کر خزاؤں کی عریانیت اپنالے تو فقط وقت گزرتا ہے، دن اور رات کے سانچوں میں دخل کر، جہاں پھر خوشیوں کے اُجالے کبھی نہیں پھیلتے، صرف اور صرف غموں کے سائے اور دکھوں کے اندھیرے میں ہر سمت پر، ہر شے پر اپنے دبیز وجود محیط کر دیتے ہیں۔ ایسے گھور اندھیروں میں جب آس کے دیے، امید کے چراغ، آرزوؤں کے جگنو اپنی روشنی کو بیٹھیں تو خیالات کی زمین پر تصورات کے رنگ ابھرنے لگتے ہیں اور دل کی دنیا میں محبت کے عکس مجسم ہو کر ماضی کی متحرک تصویروں میں دخل جاتے ہیں، پھر چھڑانے سے بھی دامن نہیں چھوڑتے تنہائی میں آپ کے رشتے بن جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔

منال سے ملاقات سے قبل وہ ہنگاموں کا شیدائی تھا۔

پینک، پارٹیز اور ہلاٹھا، زندگی کی تمام خوب صورتیاں و شوخیاں اس کے وجود سے ہم آہنگ تھیں، لمبے لمبے سے زندگی کا دس کشید کرنا اُسے بخوبی آتا تھا۔ ایک وہ وقت تھا جب وہ محمود کو بے جان وجود گردانتا تھا اور اب اس وقت وہ کوئی تحریک، کوئی ہلچل اپنے اندر نہ پاتا تھا، باسوائے اس کے کہ تنہائی موقع پاتے ہی ماضی کی مووی چپکے سے ری وائسڈ کر دیتی تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان خیالات میں کھو جاتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”دیکھی تم نے بڑی بھابی چلتے ہازیاں؟ کیسی چالاکی سے ان کی بیٹی کا پتا بھی صاف کیا اور ان کے پورشن پر عاصبانہ قبضہ بھی جما کر بیٹھ گئیں۔“ آسہ جو کافی دنوں سے راحیلہ بھابی کی طرف سے دل میں بھرنے والا غبار لیے بیٹھی تھیں، ان کے گھر سے نکلتے ہی وہ دل کی بجز اس رخسانہ کے سامنے ٹکا لے لگیں۔ رخسانہ بالوں میں برش کر رہی تھیں، ان کے انداز پر سیدھی ہوشی نہیں۔

”ہاں بھئی، کیا کریں بڑی بہو جو ہیں اس گھر کی۔ اماں بی کو مرتے وقت گلے کی اتنی ٹکرنہ تھی جتنی اس گھر کی چابیوں کی تھی۔ چابیوں کا کچھ بھابی کو حصا تے ہی وہ سکون سے ہمیشہ کے لیے سو گئی تھیں۔ خود تو سکون سے سو گئیں بڑی بی اور ہماری ناتواں جانوں پر اس نئے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں۔“

”ہات تو تم سو فیصد درست کہہ رہی ہو، بڑی بھابی کی مکاریوں نے میرا دل خراب کر ڈالا ہے۔ اماں بی کے بعد گھر کی سربراہ بن بیٹھی ہیں مگر سربراہی صرف اپنی ذات اور فیملی کی لالچ و بہبود تک ہی محدود ہے۔ بڑے ایسے ہوتے ہیں بھلا؟ ان ماں، بیٹی کو یہاں سے نکلوانے کے لیے ان کے ساتھ ہم نے برابر ساتھ دیا۔ کیا کیا جتن نہ کیے، ہزاروں جھوٹ بولے، بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا اور بھی نہ معلوم کیا کیا ان کی پڑھائی گئی ٹیوٹوں میں پڑ کر کیا، وہ تو نکل گئیں، سو چا تھا وہ پورشن مین گیٹ سے ملحقہ ہے اس کو گیٹ روم بنا دیں گے، کوئی نہ کوئی مہمان دور و نزدیک سے آکر قیام پزیر ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے مہمانوں کے لیے بالکل درست رہے گا وہ پورشن، جوان بچیوں کا

گھر ہے، احتیاط ہی بہترین شے ثابت ہوتی ہے اس دور میں، مگر بھابی بیگم نے تو صاف جواب دے دیا کہ وہ پورشن ان کے پورشن سے ملتی ہے اور انہیں سخت ضرورت ہے مزید کروں گی۔ وہ اسے گیٹ روم نہیں بنا سکتی، پھر دیکھ لو اسی بننے میں انہوں نے وہ حصہ تڑوا کر از سر نو تعمیر کروایا، کتنا کشادہ اور خوب صورت پورشن ہو گیا ہے ان کا۔“

”پیسہ بھی تو دل سے لگایا ہے۔ دیواروں پر امپورٹڈ ٹائلز، موزائیک کے فرش، امریکن کچن کا تمام سامان امپورٹڈ ہے، ہاتھ روحوں میں سرائیکس ٹائلز کا استعمال ہوا ہے، ہر شے میچنگ کی اور امپورٹڈ ہے پھر کیوں نہ ان کا پورشن لشکارے مارے گا؟ امپورٹڈ چیزیں تو نکاست و خوب صورتی میں سب میں نمایاں ہوتی ہیں، ہماری لوکل چیزوں کی طرح تھوڑی آج استعمال کی، بل ہاتھ میں آگئی۔“

”ویسے تو بڑی بھابی کا ایک روپیہ خرچ کرتے ہوئے دم لگتا ہے، اب کیسے لاکھوں نکال کر دیئے ہوں گے۔ اول نمبر کچنوں کیسے چوس ہیں۔“

”وہ مثال ہے نا، اندھا بننے اپنی اپنی ریوزھیاں، تو وہی مثال ان کی ہے اپنی پر خرچ کرتے وقت تو وہ حاتم طائی کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔ پیسہ نہ ہونے کا مسئلہ تو ہم ساتھ ہوں، تب اُلتا ہے۔“ آسیہ را حیلہ سے از حد متنفر و ماسد نظر آ رہی تھیں۔

”دراصل بات یہ نہیں ہے جن کو صرف لینے کی عادت پڑ چکی ہو، وہ پھر وصول کرنا جانتے ہیں۔ بڑی بھابی کو اول روز سے ہی کل مختار بنایا گیا، تمام سیاہ و سفید نہیں سوئپ دیا گیا، ہر ماں کی طرح ان کی جان بھی بیٹی میں تھی جو بڑی بھابی نے بہت جلد جان لیا اور بہت جلد انہوں نے ماں کی دکتی رگ، لوشا بہ کو بہت اہمیت و محبت دینی شروع کی جو بتدریج بڑھتی چلی گئی اور ان کی حسب توقع ماں بی کے ساتھ ساتھ با بھی ان کے گرد ویدہ ہو گئے۔ حاتم بھائی تو پہلے ہی ان کی مٹھی میں تھے۔ بہن بھائیوں اور ماں باپ سے بیوی کی محبت نے انہیں ان کا بے دام غلام بنا ڈالا۔“

”ہاں۔ پھر ساس، سر کے مرتے ہی وہ اپنی اصلیت پر آگئیں اور ان ماں بیٹی کو دودھ میں پڑی کسی کی طرح نکال پھینکا۔“ آسیہ منہ بنا کر گویا ہوئیں پھر اچانک ہی وہ چونک کر آگے کوچکی تھیں۔

ارے رخسانہ! تمہارے بال تو آگے سے سفید ہو رہے ہیں، بالکل قلمی اشاکل میں۔“ وہ ہنس کر گویا ہوئیں، رخسانہ جو اس معاملے میں خاصی حساس تھیں غیر ارادی طور پر دایاں ہاتھ پیشانی کے اوپری حصے پر رکھ کر کھسکا کر بولیں۔

”یہ سب نزلے کی کارستانیوں ہیں، ورنہ میری تو ایسی عمر نہیں ہے جو بال سفید ہوں۔“

”خیر ماشاء اللہ۔ عمر تو ٹھیک ہی ہے۔ اب تم نہ مانو تو یہ تمہاری مرضی، لیکن یہ بال پول کھول رہے ہیں۔ تم ڈائی کیوں نہیں کر لیتیں؟“ کچھ لمبے قلم وہ را حیلہ کی برائیاں کر کے دل ٹھنڈا کر رہی تھیں۔ اب رخسانہ کا چہرہ دیکھ کر اپنے مزاج کو تسکین پہنچا رہی تھیں جبکہ مارے فحالت و غصے سے ان کی بری حالت تھی۔

”گولڈن کلر ڈائی کروانا ساتھ ریڈ کلر کی لیر زڈ لوالیانا، اچھی لگوگی پھر ڈائی میں یہ کلر بہت ان ہیں۔ میں نے بھی چند دن قلم کروا لیے ہیں۔“ وہ اپنے چمکتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے مشورہ دینے لگیں۔



”نہ بابا! مجھے ایسے فیشن نہیں چاہئیں، جسے دیکھ کر لوگ کہا نہیں، بوزھی گھوڑی لال لکام، فیشن ہمیشہ عمر کے حساب سے ہی سوٹ کرتا ہے۔“ رخسانہ نے ایک ہی جملے میں حساب برابر کر دیا تھا۔ وہ بہانہ بنا کر اٹھ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

داغ دل ہم کو یاد آنے لگے

لوگ اپنے دیے جلانے لگے

کچھ نہ پا کر بھی مطمئن ہیں ہم

عشق میں ہاتھ کیا خزانے لگے

گرینی کے کمرے میں داخل ہوتا انس ٹھنک کر رک گیا تھا۔ وہ گرینی کے بیڈ کے نزدیک چیز پر بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں شاید کوئی کتاب تھی، اپنی جانب اس کی پشت ہونے کے باعث وہ کتاب نہ دیکھ سکا تھا۔

خود فریبی ہی خود فریبی ہے

پاس کے ڈھول بھی سہانے لگے

داغ دل ہم کو یاد آنے لگے

وایسی کے لیے اس کے اٹھتے قدم وہیں تھم سے گئے تھے۔ اے سی کی کولنگ سے ٹھنڈے کمرے کی ہر سکون فضا میں اس کی دھبے لہجے میں اُبھرتی آواز میں ایک اسرار تھا، ایک سحر، ایک دل کی گہرائیوں میں اتر کر روم روم کو شانت کر دینے والی، مست و بخود کر دینے والی پُرکشش آواز تھی۔

اب تو ہوتا ہے ہر قدم پر گماں

ہم یہ کیسا قدم اٹھانے لگے

ایک پل میں وہاں سے ہم اٹھے

بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

آواز تھی کہ زنجیر، لفظ تھے کہ حال زار، وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

اپنی قسمت سے بے مفرس کو

تیر پراز کے بھی نشانے لگے

شام کا وقت ہو گیا باقی

بستیوں سے پیام آنے لگے

”جاؤ، مجھے خیر آنے لگی ہے۔“ گرینی کی خمار آلود آواز نے اس طلمساقی ماحول کا طلسم توڑا تھا۔ وہ بھی چونک کر حواسوں میں لوٹا تھا، پھر جس طرح بے آواز قدموں سے آیا تھا، واپس لوٹ گیا تھا۔

”شب بخیر میڈم!“ وہ نائنٹ بلب بند کر کے دروازہ لاک کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ پچھلے دنوں کی نسبت آج گرینی کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اس کا دن بھی اچھا گزرا تھا، پھر آج ایک دفعہ بھی اس کی منہ بھینٹاؤں سے نہیں ہوئی تھی جو سخت وطنیہ ہاتھ سنانا سے اپنی ڈیوٹی بنا چکا تھا۔

”شکر ہے تم آگئیں، میں ابھی تمہیں دیکھنے! اور آہی رہی تھی کہ نہ معلوم کیا ہو گیا جو تم ابھی تک نہیں آئی ہو۔“ نوشاہی سے دیکھ کر طمانیت بھرا سانس لیتی ہوئی پٹنگ پر بیٹھ گئی تھیں۔

”میڈم کے مزاج کی طرح پسند و ناپسند بھی بدلتی رہتی ہے۔ پچھلے ماہ سے پرانے فلمی گیت سی ڈی پلیئر پر سننے کی وجہ سے گرینی آج کہنے لگیں لو بھلا اب بڑھاپے میں، میں یہ سننی اچھی لگوں گی، میرا لال دوپٹہ مل کا، ہوا میں اڑتا جائے، جھکا گراہے بریلی کے بازار میں۔ کہنے لگیں، کسی وقت میں یہ گانے خود گاتی تھی۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں بڑی دھوم مچتی تھیں۔“

”سچ سچ دھوم مچ جاتی ہوگی۔ آواز تو ابھی بھی بہت اچھی ہے ان کی۔“

”آج سے انہیں ادب و شاعری کا ذوق چڑھا ہے، کھانے کے بعد سے اب تک غزلیں اور اشعار سنانا کر میرا سر گھوم چکا ہے۔“

وہ تھکے تھکے انداز میں اپنے بستر پر دراز ہوتی ہوئی بولی۔

”مجھے احساس ہے تمہاری محنت کا، میں تو چاہتی ہوں وہاں اگر کچھ تمہارا ہاتھ بناؤں، تاکہ تمہیں کچھ آرام مل سکے۔“ نوشاہی بٹنی کی تھکی تھکی صورت پر متا بھری نظر ڈالتی ہوئی بولیں۔

”مگر تم نے وہاں آنے سے منع کر رکھا ہے، اس خیال سے رک جاتی ہوں۔“

”نہیں ماما! جہاں عزت نفس مجروح ہونے کا خدشہ ہو وہاں قدم نہ رکھنا ہی دانش مندی ہے۔ بڑے سر کی بات کچھ اور ہے۔ یہ انس صاحب تو بہت بد تمیز و بد لحاظ انسان ہیں۔ ذرا سی دیر میں بے عزت کر دیتے ہیں۔ بہت گھمنڈ ہے انہیں اپنی دولت اور جائیداد پر، کسی کو کچھ اپنے آگے گروا تے ہی نہیں ہیں۔“

”سو جاؤ میں دعا گو ہوں، کبھی نہ کبھی تو ہمیں اطمینان و سرخروئی حاصل ہوگی۔“

”شاید جب دل ان احساسات سے دست بردار ہو چکا ہوگا۔ طلب کی کوٹلیں کھلنے سے قبل ہی نواز نیدیگی کی موت مر چکی ہیں۔ جب تک خواہشوں کے کنول بھی مرجھا کر اپنے وجود کو بیٹھے ہوں گے۔“

☆.....☆.....☆

سردیوں کی اداس شامیں سرد راتیں اللوداع کہہ کر رخصت ہو چکی تھیں۔ موسم گرما اپنے تمام جاہ و جلال و تپش کے ہمراہ وارو ہو چکا تھا۔

آج بھی گرمی زوروں پر تھی۔

سورج کی زرد شعاعیں ہر سمت آگ سی دکھائی تھیں۔

وہ آفس کے ٹائم سے قبل اٹھ گیا تھا کہ آج اسے سہ کے ساتھ اس کے سرراں جانا تھا۔ قاریہ کے والد نے انہیں بلایا تھا۔

”کیا یوریت ہے یا رامیری کچھ میں نہیں آ رہا ہے، کیوں اس قدر خود کو ہلکان کر رہے ہو۔ قاریہ کے قادر سے ملتا ہے، ملاقات

کرتی ہے، کوئی ہمارا تے لے کر نہیں جا رہے ہو۔“

وہ جو گزشتہ دو گھنٹے سے سہ کو ڈرینگ روم کے سامنے بیٹھا مختلف کریمیز اور اسپرے استعمال کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تیاری

مکمل ہوتے نہ دیکھ کر چڑ کر بولا۔

”وہ مجھے پہلی بار دیکھیں گے اور تم تو جانتے ہی ہو گے کہ پہلی نظری آخری نظر ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں ان کے رویہ و رویا پنڈم

واسارٹ بن کر جاؤں، انہیں یقین ہو جائے کہ یہی وہ ماہ کامل ہے جو ان کی بیٹی کے سیاہ راتوں جیسے نصیب کو جگمگا سکتا ہے۔ اسے خوشیاں

دے سکتا ہے۔“

”امیروں کی بیٹیوں کے نصیب کبھی سیاہ راتوں جیسے نہیں ہوتے۔ باپ کی دولت انہیں ہمیشہ روشن رکھتی ہے، البتہ تم جیسے ماہ

کامل رات و دن ان کے آس پاس رہتے ہیں۔“ وہ فریج سے آکس کریم کی ڈش نکالا ہوا بولا۔

”وہ نقلی چاند ہوتے ہوں گے۔ میری طرح ریشل مون نہیں۔“ سہ بھلا اس کی باتوں کو سنجیدگی سے کب لینے والا تھا۔

”آکس کریم بہت ٹیسی ہے۔ کون سا فلیور ہے یہ؟“ اس نے تو صحنی لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”کھویا فلیور ہے تم نے کبھی اتنی ٹیسی آکس کریم کھائی نہ ہوگی۔“

”ہاں فرسٹ ٹائم میں نے ٹیسٹ کیا ہے۔ لا جواب ہے۔ ڈش تو گھر کی لگ رہی ہے۔ کون سی اسٹونپی سے لائے ہو؟“ وہ بڑی

رغبت سے کھاتے ہوئے بولا۔

”ایسے اعلیٰ ذائقے کسی بھی اسٹونپی سے نہیں ملے، میری جان! یہ محبت کا فلیور ہے جو بے لوث و بے ریا جذبوں سے بنائی گئی

ہے۔ پرسوں میں تمہارے پاس گیا، تم ملے نہیں۔ گرنی کے پاس تنہا جانے کی میری استطاعت کہاں، میں نوشاپہ آٹنی کے پاس چلا گیا،

وہاں باتوں باتوں میں قلفی کا ذکر نکل گیا، میں نے کہا وہ قلفی کھانے کو بڑا دل کرتا ہے جو دو دو اور کھوئے سے بنی ہوتی تھی۔ اس وقت تو آٹنی

خاموش رہی تھیں، مگر کل کرن آفس میں مجھے یہ ڈش پکڑا گئی۔“ وہ خود پر اسپرے کرتا ہوا بولا۔

”ہری اپ۔ وہاں لیٹ پنچے تو تمہارا سارا امپریشن دھرا رہ جائے گا۔“ اس کا موڈ خواہ خواہ ہی آف ہو گیا۔ خالی پیالی اور پیچ اس

نے جھکے سے رکھی تھی۔ دل کی حزیہ لینے کی خواہش کو بھی دبا گیا۔

”بس۔ بس آئم ریڈی یا ریا یہ بتاؤ کیسا لگ رہا ہوں؟“ بالوں میں برش کر کے وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

”ویری ڈینٹ اینڈ ویری افریکینو“۔ وہ اسے ستا کٹی نگاہوں سے دیکھتا ہوا مطمئن انداز میں گویا ہوا۔

”بندل آف ٹھینکس۔ پہلے یہ بتاؤ کوئی کی تو نہیں رہی گئی؟“

”ہوں، رہ تو گئی ہے۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا

”رہ گئی ہے؟ کیا کیا جلدی بتاؤ۔“ وہ مضطرب ہوا تھا۔

”جھومر، نیک، عروسی لباس کی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اوہ شٹ، میری جان پر بننا ہوئی ہے اور تمہیں مستی سوجھ رہی ہے۔“

”اتنا خوف و بے اعتمادی کس لیے، فار یہ کے فادر سے ملاقات کرنے جا رہے ہو یا عزرائیل سے؟“

”لا حول و لا قوۃ، شکل تو تمہاری اچھی ہے مگر باتیں اچھی نہیں کرتے تم۔“

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے، جب وہ وہاں پہنچے۔

فار یہ کے والد سنیہ کرم داد جیولرز تھے۔ اپنے حلقہٴ احباب میں خاصے ممتاز تھے۔ ان دونوں سے بڑے پُر تپاک انداز میں ملے۔

ان کی بیگم نائلہ بھی از حد شفقت و محبت سے پیش آئی تھیں۔ کولڈ ڈرنکس کے دوران ان کے درمیان تعارف و دیگر سرسری باتوں کا مرحلہ ملے

ہوتا رہا، وہ سعد کو پسند کر چکے تھے کہ سعد بزنس مین ہونے کے علاوہ شخصیت کے لحاظ سے بھی مکمل و خوب رو تھا۔

پھر انس مرشد کے ساتھ اس کی دوستی و ویرینہ مراسم نے بھی انہیں مطمئن کر ڈالا تھا اور وہ جو چاہتے تھے، اس کے خاندان، حسب و نسب

کے بارے میں مکمل معلومات تو اس کی ہڈی و قاروہ اعتماد و شخصیت نے تمام دوسرے دور کر دیے تھے۔ انہوں نے زبردستی ڈنر کے لیے روک لیا تھا۔

کھانا بے حد پُر تکلف تھا۔ خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ فار یہ سے ملاقات تکمیل پر ہی ہوئی تھی۔ پنک لباس، پنک دوپٹے میں سخی

سمٹائی سی فار یہ نے سلام کے علاوہ کوئی اور بات نہ کی تھی۔

سعد بھی کرم داد کی بارعب شخصیت کے رعب میں آچکا تھا۔ اس نے بھی نگاہ اٹھا کر فار یہ کی طرف نہ دیکھا تھا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا تھا۔ انس نے اصل موضوع کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے اُمید ہے اٹکل! آپ سعد سے مطمئن ہو گئے ہوں گے۔“

”ہاں بیٹا! میں نے معلومات تو پہلے ہی کروالی تھیں۔ ان سے مل کر دل کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ دراصل فیصلے کرنے والا تو اوپر بیٹھا

ہے، وہی جوڑے بناتا ہے۔ اس کے حکم سے ہی رشتے، تعلق و وجود میں آتے ہیں۔ یہ رشتہ بھی اس کے حکم سے ہے تو باپ ہونے کے ناتے

فار میٹھی پوری کرنی تھیں، سو کر لیں۔“ وہ سر جھکائے بیٹھے سعد کی جانب ششخاند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔ سعد کے چہرے پر

ایک طمانیت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

دوسرے کمرے میں کھڑکی سے کان لگائے فار یہ بھی خوشی سے مکمل اٹھی تھیں۔

”پھر آپ ڈیٹ کب فکسڈ کر رہے ہیں شادی کی؟“ انس ذمے دار اور محبت کرنے والے دوست کا پورا حق ادا کر رہا تھا۔  
 ”ٹیکسٹ منٹھ کی کوئی ڈیٹ فکسڈ کر دیں گے، دراصل اس کے لیے آپ کو مجھے کچھ ٹائم دینا ہوگا۔ مجھے اپنے بہنوں بھائیوں سے  
 مشورہ کرنا ہوگا۔ شادی کے معاملات خاصے نازک ہوتے ہیں۔ سب کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ میری قاریہ سے چھوٹی دونوں بیٹیاں بھی  
 گھر نہیں ہیں۔“

”او کے ٹیکسٹ منٹھ فکسڈ ہو چکا ہے۔ ڈیٹ آپ بنا دیجئے گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا تو کرم واد بھی مصافحہ کرتے ہوئے اٹھ  
 کھڑے ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆

”تمہاری ماں نے یہاں آنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، ایسی کیا مصروفیات پال لی ہیں انہوں نے، جو گھڑی دو گھڑی کسی کی دل جوئی  
 کرنے کے لیے بھی نہیں ہیں ان کے پاس۔“ گرینی، کرن سے مخاطب تھیں جو ان کا کرہ صاف کر رہی تھی۔ دو اڈس کے کیمین، کتابوں کے  
 شیلف ترتیب دے رہی تھی۔

”ان کی ایسی کوئی مصروفیت نہیں ہیں اور وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔“ وہ شیلف میں کتابیں لگاتے ہوئی بولی۔  
 ”ایسی کوئی مصروفیت پاؤں کی زنجیر بھی نہیں۔ کوارٹر کا فاصلہ بھی یہاں سے چند قدم کا ہے، پھر کیا وجہ ہے جو انہیں یہاں آنے  
 سے روکتی ہے؟“

”میں نے منع کر رکھا ہے میڈم!“

”تم نے؟ کیوں ایسی کیا بات ہو گئی؟“ گرینی سخت حجب تھیں۔ کرن چند لمبے تو خاموش رہی پھر ان کی گھورتی نگاہوں کا احساس  
 ہوا تو آہستگی سے گویا ہوئی۔

”انس سر کی وجہ سے۔“ اندر داخل ہوتا انس اپنے نام پر وہیں رُک گیا تھا۔

”کیوں اس نے کیا کیا؟“

”معلوم نہیں، مجھے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں مگر کہے بغیر آپ کی بات کا جواب نہیں مل سکتا۔ انس سراسر روز سے ہی مجھے اور ما  
 کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں ہم ایسی عورتیں ہیں جو لوگوں کو اعتماد میں لے کر ان کے گھروں کا منہ پھاڑتی ہیں۔ عرف عام میں ہم  
 خراب کردار کی عورتیں ہیں۔“

”وہاں کھڑی کھڑی کیا کہہ رہی ہو، یہاں بیٹھ کر بات کرو۔“ گرینی کو اس کے سادہ و بے چارگی بھرے انداز پر بے حد ترس آیا تھا۔  
 ”انس سے کب ملی تھیں؟ ایسا کیا ہوا جو وہ ایسا سمجھنے لگا؟“ ان کی کھوجتی نگاہیں اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگیں اور  
 ماموں، ممانوں کے سلوک، مگر سے الزام لگا کر نکالے جانا، راتے میں انس کی کار سے ٹکرانا اور ہاسپٹل میں انس کی تلخ کلامی، سحر کی

مہربانیاں، اس کے توسط سے یہاں آنا۔ سب مختصر اہماتی چلی گئی۔ گرینی ٹھوٹ سے سن رہی تھی۔ سحر کی شادی کے بارے میں بتانے کے لیے آنے والا انس بھی دروازے کی اوٹ میں پردے کے پیچھے دم بخود مستاپلا گیا۔

”مجھے معلوم نہیں تھا میڈم! یہ ان کا گھر ہے ورنہ میں کسی قیمت پر یہاں جاب نہیں کرتی۔ تیل و جھنڈے مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے۔ پیار سے کوئی مانتے تو میں جان بھی دے دوں۔ دھونس و زیادتی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے۔“ آنکھوں میں موجزن پانی کو چٹکیں جھپک جھپک کر روکنے کی کوشش کرتی کرن انہیں بہت مختلف لگ رہی تھی۔

”یہ بات نہیں ہے بیٹا! میرا انس تو بہت رحم دل و مہنی واقع ہوا ہے۔ ماں تو اس کی بچپن میں مر گئی۔ تعلیم کے سلسلے میں زیادہ تر ملک سے باہر رہا۔ عورتوں کے کئی روپ دیکھے اس نے اور سب کے سب خود غرض و مفاد پرست۔“ اپنے ذکر پر وہ چپ چاپ وہاں سے نکل گیا تھا۔

”اس کی ساتھی لڑکیاں پیسے کی پھار نہیں لگیں۔ یہاں آیا تو میری دیکھ بھال کے لیے رکھی جانے والی عورتوں نے یہی رنگ ڈھنگ اپنائے ہوتے تھے، بلکہ کتنیوں نے تو رفتہ رفتہ گھر کا مضافا ہی کر کے رکھ دیا تھا۔ بس جب سے وہ کچھ زیادہ ہی اجنبیوں پر اعتماد کرنے سے گریز کرتا ہے۔“

جواباً وہ خاموش رہی تھی۔

”مڈل کلاس بیوی سے اور بیٹے سے اس قدر محبت تھی کہ میرے ہزار بار کہنے کے باوجود اس نے شادی نہ کی۔ بہانہ بھی تھا کہ سوتیلی ماں سوتیلی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو سوتیلی ماں کے چنگل میں نہیں چھیننے دے گا۔ اس نے جو کہا، کر کے دکھایا۔ بیٹے کا تو بہانہ تھا وہ بیوی کی یادوں سے خود کو آزاد نہ کر پایا تھا۔ پھر وقت گزر گیا مگر اپنی ساری دل کشی و بہاریں سیٹ کر کسی بیوہ کی طرح اجڑا ہوا بے رنگ، بے روپ، باپ تو اپنی تاریک زندگی کے ساتھ سمجھو نہ کر چکا تھا۔ بیٹا بھی چند مہینوں کی محبت کا ایسا روگ لگا بیٹھا کہ اسے عورت ذات سے چڑ ہو گئی۔ بیٹے کا صدمہ میں جمیل گئی تھی مگر پوتے کی اجڑی زندگی مجھے نیم مردہ کر گئی۔ انہی دنوں مجھے پہلا فالج کا ایک ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد دوسرا اور پھر میں خود کو سنبھال نہ سکی اور معذور ہو کر پڑ گئی۔“ ان کے کزور و ناتواں لہجے میں گزورے دنوں کی محرومیاں و دکھ بول رہے تھے۔

”اپنی ماں کو ضرور بھیجتا۔ اس سے بات کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔“

☆.....☆.....☆

”تم نے آخر وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ آخر ضرورت کیا آن پڑی تھی تمہیں نہان کھولنے کی۔ انہوں نے اپنے پوتے سے کچھ کہا اور اگر انہیں بات ناگوار گزری تو جانتی ہونے لگے کیا نکلے گا؟“ کرن نے خوشی خوشی ماں کو گرہنی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ اندیشوں میں گھر کر بیٹیں۔

”مما! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ان کا موڈ بہت اچھا تھا آج، جب ان کا موڈ اچھا ہو تو سمجھو بچت ہی بچت ہے۔“ وہ خاصی سرور تھی۔

دل سے بوجھ ہٹ جانے پر۔

”خیر اٹھی خیر کرے۔ مجھے تو ذرا ہی لگا رہتا ہے۔ فی الحال تیار رہتا۔ شام میں سعد آیا تھا وہ شادی کی شاپنگ کرنا چاہ رہا ہے، کچھ مدد کرو اس کی۔“

مما اودہ قاریہ کی پسند کی شاپنگ کریں۔ کیوں ہمیں لے جانا چاہتے ہیں۔“ وہ پنگ کی چادر تھیل کرتے ہوئے بولی۔  
”قاریہ کی پسند تو ساری زندگی چلے گی۔ اب تمام چیزیں میری بہن کی پسند کی ہونی چاہئیں۔“ سعد اندر داخل ہوتا ہوا نوشاہ کو سلام کر کے اس سے گویا ہوا۔

”اوہ سعد بھائی ابا لکل بلی کی چال چلتے ہوئے آئے ہیں جو ذرا بھی آہٹ نہیں اُبھری۔“ وہ پنگ پر بیٹھتے سعد سے ہنس کر بولی۔  
”اب تو نہ معلوم کون کون سی چالیں اپنی پڑیں گی، شادی جو کر رہے ہیں۔“ جواباً سعد بھی ہنس کر بولا۔  
”شادی کر رہے ہیں سعد بھائی! یا کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔“  
”شادی بھی سیاست سے کم نہیں ہے۔“

”مکمل زندگی کی شروعات کی طرف بڑھ رہے ہو بیٹا! بہتر یہی ہے اپنے دل و دماغ کو فضولیات سے پاک کر دینا۔ شادی محض دو صنفوں کو ایک رشتے میں باندھے کا نام نہیں ہے، یہ دو خاندانوں کو یکجا کرنے کا نام ہے۔ ایک نئی نسل کو اعلیٰ و بہترین پر وان چڑھانے کا نام ہے، اس بندھن میں بہت راحتیں ہیں تو تکلیفیں بھی کم نہیں ہیں، جیسے پھولوں کے سنگ کاٹنے ہوتے ہیں۔ اسی طرح خوشیوں کے ساتھ پریشانیاں ہوتی ہیں۔ کانٹوں سے اُلھے بغیر پھولوں کا حصول تو ہمارے لیے ممکن ہے، مگر زندگی کے غیب و فراز میں ہمارا سابقہ سب سے پڑتا ہے جن کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہی جیت کی نشانی ہے۔“

”بہتر ہے آئی! جن کی رہنمائی بزرگ کرتے ہیں وہ خوش نصیب ہوتے ہیں اور میں بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جو آپ جیسی ہستی میری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔“ سعد کے لہجے میں مومنیت تھی۔

”تمہاری محبت ہے یہ، جو ایسا سمجھتے ہو، ورنہ میں کس قابل ہوں۔“ نوشاہ اس کے غلوں کے آگے شرمندہ ہو جایا کرتی تھیں۔  
”ہیرے کو اپنی قیمت کا اندازہ کب ہوتا ہے۔ ایٹمی ویز میں ذرا گرینی اور انس سے مل کر آ رہا ہوں، اتنے میں آپ دونوں تیار ہو جائیں۔“ وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

”میں نہیں جا سکوں گی۔ حرم ہو گیا مجھے ہزار کی شکل دیکھے ہوئے۔ اب اگر شاپنگ کرنا چاہوں تو نہ کر سکوں گی۔ تم کرن کو لے جاؤ بلکہ کرن صحیح کہہ رہی ہے کہ قاریہ بیٹی کو لے لو۔ وہ اپنی پسند کی چیزیں خرید لے گی، آخر کار اسے ہی استعمال کرنا ہے۔“  
”اس کے والدہ اجازت نہیں دیں گے پھر میں بھی چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان ایک حد ابھی سے قائم ہو جائے تو بہتر ہے۔“ ان کے انداز میں سنجیدگی تھی۔

”کیا مقصد..... قاریہ سے اپنی پسند سے شادی کر رہے ہو۔“ اس کے انداز نے نوشاہ کے ساتھ ساتھ کرن کو بھی چونکا دیا تھا۔

”بالکل..... لیکن میں چاہتا ہوں میاں بیوی کے درمیان محبت کے علاوہ احترام کا رشتہ بھی ہو، جب عورت یہ چاہتی ہے کہ شوہر اس کے والدین، بہن، بھائی اور دیگر عزیز واقارب کی عزت کرے تو اسے بھی جو ابابھی سب کرنا چاہیے مگر جہاں مرد اس کی راہ پر چلنے لگتا ہے تو وہ اس کے رشتے داروں کو ٹھوکروں میں اُڑا دیتی ہے۔ یہ عورت کی بہادری نہیں، مرد کی کمزوری ہوتی ہے جو ایسا کرنے دیتا ہے۔“ سعد کے لہجے میں بچپن کے دکھ بول رہے تھے۔ آنکھوں میں ماضی پانی بن کر چپکنے لگا تھا۔

”بچا چچی سے محبت میں بھی ایک حد قائم رکھتے تو انہیں جرات نہ ہوتی، مجھے اس طرح بے گمرو بے نام کرنے کی۔ آج بھری ہڈی برداری کے ہوتے ہوئے بھی میں تنہا ہوں، اگر انس کی فیملی اور آپ لوگوں کا ساتھ نہ ہوتا تو میں نہ معلوم کیا کرتا، اور کہاں ہوتا؟“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

جب سے فار یہ کے والد نے اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا تھا، جب سے وہ عجب سی بے گلی و بے چینی اپنے اندر پانے لگا تھا اور اب شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں اسے امی، ابو کی یادیں بڑی تر پانے لگی تھیں۔

”خوشی کے موقع پر کیوں اُداس ہوتے ہو۔ خوشی خوشی تیاریاں کرو۔“ نوشابہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں تو اس نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پانا چاہتا تھا۔

گرینی اس کی شادی کا سن کر بڑی خوش ہوئی تھیں، خاصی دیر اس کی ہونے والی بیوی کے بارے میں پوچھتی رہی تھیں۔

”مجھ سے ملانے اسے ضرور لانا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی تمہاری شادی کا سن کر۔ شادی اس عمر میں ہو جائے تو کامیاب رہتی ہے، ہر کام وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔“

”میں سیدھا آپ کے پاس ہی لے کر آؤں گا اسے، آپ کی دعاؤں کے بغیر نئی زندگی کی ابتداء کس طرح کر سکتا ہوں بھلا۔“

گرینی کے اچھے اور خوشگوار موڈ نے اسے خوب حوصلہ بخشتا تھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں تم نے تو بروقت فیصلہ کر لیا اب اس کو ڈھ مفرگھاڑ کو بھی سمجھاؤ کہ وقت گزر رہا ہے اور گزرتا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ تمہیں دعائیں میں نے دے دیں۔ شاید اسے دعائیں دینے کے لیے میں موجود بھی نہ ہوں۔“ انہوں نے سعد کے برابر بیٹھنے انس کی طرف اشارہ کیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”پلیز..... پلیز گرینی! آپ کیوں اس قسم کی باتیں کرتی ہیں؟“

”تجھے مجھ سے بھی شکوہ رہتا ہے، میں اس قسم کی باتیں کیوں کرتی ہوں، کبھی اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ کہ میں کیا بنا رہتی ہوں۔“

حسب عادت ان کی غصیلی طبیعت بیدار ہو چکی تھی۔

”یہ موقع ان باتوں کا نہیں ہے۔ آپ ان کی خوشیاں تو ملیا میٹ نہ کریں۔“



”میں کیوں ملیا میٹ کرنے لگی اس کی خوشی، تیری طرح یہ بھی مجھے عزیز ہے۔“

کچھ دیر قبل خوشگوار ماحول ایک دم بوجھل ہو گیا۔ شومرانی میں چائے اور دیگر لوازمات لے آئی تو موضوع ایک دم ہی بدل گیا تھا، مگر سعد نے محسوس کیا تھا گرنی کے چہرے پر محکمہ آمیز یا سیت چھا گئی ہے۔

”گرنی کی خواہش تمہیں جلد از جلد پوری کر دینی چاہیے انس!“ وہ باہر آئے تو سعد نے اس سے کہا تھا۔

”اب تم بھی مجھے ٹیز کرو گے۔“ اس کے انداز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”اب فضول قنوطیت دفع کرو۔ گرنی کی حالت پر رحم کھاؤ۔ شادی کر لو کہ یہ نہ صرف گرنی، بلکہ مڈرائٹل کی بھی دیرینہ آرزو ہے، پھر اس گھر کو ایک عورت کی، اس گھر کی اصل مالکن کی اشد ضرورت ہے۔“

”تم اپنی لگ کر دو، یہاں کی مت سوچو، ادھر سب درست ہے۔“

”حقیقت سے فراد کب تک کرتے رہو گے انس!“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوا تو وہ ڈھیلے انداز میں آنکھیں موند کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”فرار حاصل کرنا تو میں زندگی کی سانسوں سے چاہ رہا ہوں۔“

”بزدلوں کی طرح باتیں مت کرو، پھر تمہاری اور مثال کی محبت کو ایسے.....“

”پلیز..... میں اس کا نام اپنے ذہن کی سلیٹ سے مٹا چکا ہوں۔“

”مگر دل کی سلیٹ سے نہ مٹا سکے؟“

”نہیں۔ جن سے ہم محبت کرتے ہیں، انہیں بھلا نہیں سکتے اور جن سے نفرت کرتے ہیں وہ تو بالکل ناقابل فراموش ہوتے ہیں۔“ اس نے ایزی ہو کر بیٹھے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”یہ نفرت کا کون سا روپ ہے جس کی خاطر تم نے خود کو تنہائیوں میں مقید کر لیا ہے۔ اپنی خواہشیں، آرزوئیں، مفون کی ہی تمہیں، ساتھ گھر والوں کی تنہاؤں کے پھول بھی خاکستر کر ڈالے ہیں، یہ تم کس سے انتقام لے رہے ہو.....؟ خود سے یا اس سے..... جو تمہیں بھلا کر زندگی کے مزے لوٹ رہی ہے۔ اسے ملال تک نہیں ہے اور تم روگ لگا بیٹھے ہو پھر کہتے ہو نفرت کرتے ہو اس سے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہ صرف اس سے بلکہ دنیا کی ہر لڑکی سے نفرت ہو گئی ہے۔ بھولی صورت، مصوم اداؤں والی یہ صنف نازک نامن سے زیادہ زہریلی، لومڑی سے زیادہ عیار ہوتی ہے۔ انسان پھانسی کے پھندے سے بچ سکتا ہے مگر عورت کے بچائے جال سے بچنا ناممکن ہے..... ناممکن۔“

اس کے وجہ چہرے پر بیٹے وقت کے سائے سرنی بن کر چھا گئے تھے، آنکھوں میں انکارے سے دھکنے لگے تھے۔

”سب ایک جیسی نہیں ہوتیں میرے پار!“ سعد کے لہجے میں اس کا ڈکھا تھا۔

”شاید، لیکن دل کو یقین آئے تب بات ہے۔“

”آجائے گا یقین بھی۔ ہو جائے گا پیار بھی۔ بس اب میرے بعد تمہارا نمبر ہے۔“

”ہوں، پہلے اپنی تو ہو جانے دو۔“ وہ مسکرایا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مئی اکون آیا تھا؟“ حمزہ یونیورسٹی سے آیا تو نیپل پر رکھے برتن اور ماں کے پاس بیٹھی بچیوں کو دیکھ کر حیرانگی سے گویا ہوا تھا۔

”و.....و.....کو.....کوئی بھی نہیں۔“ حمزہ کی آمد بالکل غیر متوقع تھی جو ان کو ٹی ٹی وی طرح بولکھائی تھی۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو

بولکھائے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں ایک دوسرے میں اُلجھی یہ سوال کر رہی تھیں۔

”کیا بتائیں؟ کیا جواب دیں؟ یہ غلط موقع پر آ گیا۔ نوشاہہ کا چچا، کرن کا خیر خواہ، اگر اسے اصل معاملے کی بھنگ بھی پڑ گئی تو نہ

معلوم کیا کر بیٹھے گا۔“

”آپ کی معنی خیز خاموشی اور ساتھ مل بیٹھنے کا انداز بتا رہا ہے کہ پھر کسی کے خلاف سازش تیار کی جا رہی ہے۔ بہتانوں کی گندگی

بچھ کی جا رہی ہے۔ جموٹ کے اہلہ سیاست کے نت نئے واؤ کیلے جا رہے ہیں۔“ ان کے ہوائیاں اُڑتے چروں نے اس کے اندر

خطرے کی گھنٹی بجادی تھی پھر نیپل پر رکھی اسی کراکری اور ان میں عمدہ قسم کے لوازمات نے ظاہر کر دیا تھا کہ آنے والی شخصیت بہت مستحضر اور

معاشی طور پر بے حد اعلیٰ استحکام کی حامل ہے۔

”حمزہ اشرف کو دیکھو۔ یہ ماں اور بچیوں سے بات کرنے کا طریقہ ہے؟ پھر ہم نے ایسا کیا کر دیا جو تم ابھی تک وہ بھولے نہیں جو

صحیح تھا پھر ہم کون سی ایسی گری ہوئی عورتیں ہیں جن پر تمہیں یقین نہیں ہے۔“ راحیلہ غصے سے بولیں۔

”ہم ساتھ ساتھ تو سدا سے رہتے آئے ہیں۔ تمہیں آج محسوس ہوا؟“

”معاف کیجئے گا مئی حضور! اور آٹھیز آپ بھی زندگی کے تمام سال ہم اس گھر میں آپ لوگوں کے درمیان گزارتے آئے ہیں،

آپ لوگوں کے تمام چروں سے واقفیت ازیر ہو چکی ہے۔ کون کس کے لیے کیا جذبات رکھتا ہے، اس سے آپ لوگ بھی واقف ہیں، جس

قدرتزدیک آپ بیٹھی ہیں، آپ کے دلوں میں فاصلے لامحدود وسعت تک ہیں، دکھاوے و حسد کی زندگی جی رہی ہیں آپ۔ جب تک پچھو

اس گھر میں تھیں، تب برائے نام ہی کسی آپ لوگوں میں محبت و خلوص تو تھا۔ اب تو محض دھوکہ ہی دھوکہ، دشمنی ہی دشمنی ہے۔ پچھو تھیں تو

صرف ایک دیوار تھی جو انہیں ایک طرف دھکیل کر کھینچ دی گئی تھی۔ آج دیواریں ہی دیواریں ہیں۔ گھروں کے درمیان، دلوں کے درمیان،

جذبوں کے درمیان اور محبتوں کے درمیان۔“ وہ بولا تو بولتا ہی چلا گیا اور وہ سختی ہوئیں ایک دوسرے سے نگاہیں چماری تھیں۔ اس کا ایک

ایک لفظ سچ تھا۔ پہلے نوشاہہ کو یہاں کی آسانسوں سے بے دخل کرنے کے لیے انہوں نے اپنے اور اس کے درمیان دیوار کھڑی کر دانی تھی،

پھر کچن علیحدہ کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ وہ ماں بیٹی بوجھ بنا دی گئی تھیں۔ اب مکافات عمل کچھ یوں ہی شروع ہوا تھا۔ راحیلہ کے نوشاہہ کے حصے پر

قبضہ اور تعمیر نے ان کے درمیان شدید چپقلش ڈال دی تھی۔ پہلے تو معاملہ اندر ہی اندر سلگتا رہا پھر بات نکلی تو زبردست جھگڑے کے بعد ان تینوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر کے پورشنز علیحدہ علیحدہ کر دیئے گئے تھے۔ کچر بھی الگ الگ، کھانا پینا بھی علیحدہ ہو گیا تھا۔

”عزیز بیٹا! ہم تو جاہل ہیں۔ اچھے نمے کی تمیز نہیں رکھتے مگر تم اپنے علم پر کیا عمل کر رہے ہو، بڑوں سے بات کرنے کا یہ طریقہ کار بہت غلط اور نامناسب ہے میرے بچے۔“ آسیدہ بات سنبھالتے ہوئے بولی۔

”ارے میرے لال کو کیا پتا کیا کہہ رہا ہے، یہ تو جادو کے زبردانہ ہے۔ اس جادو گر نے کہا ہے جو خود تو دفعتاً ہو گئی مگر اسے ہاندھ گئی۔“  
راحیلہ نے تڑپ کر فوراً بیٹے کی حمایت لی۔

”اوہ گاڈ! نہ معلوم کیا چاہتے ہیں آپ لوگ۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود ابھی بھی کوئی کسراقی ہے۔“ وہ فصیحے میں سب بھول بھال کر نکل گیا۔

”شکر ہے بھائی۔ ورنہ میں تو ڈری گئی تھی، ابھی سب معلوم ہو جائے گا عزیزہ کو اور ہماری کہانی ختم ہو جائے گی۔“ راحیلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تو رخسانہ اور آسیدہ بھی مطمئن ہو کر بیٹھ گئیں۔

”بھائی! جلدی بتائیں یہ سب ہوا کیسے؟ مجھے جیسے ہی آسیدہ بھائی نے بتایا کہ برہان آئے تھے، نوشابہ اور کرن کو لینے میں تو آپا سے مددرت کرتی ہوئی سیدھی پہلی آئی یہاں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ عزیزہ چلے آئے۔ آف تو بہ آخر ایسا کیا ہوا جو میں بائیس سال بعد بیوی و بیٹی کی محبت میں خراماں خراماں چلے آئے۔ ہاں کڑھی میں یہ اہال کیو عمر؟“

”اہال تو آنا ہی تھا۔ وہ جدی ہشتی زمین دار لوگ ہیں جس طرح ان کی زمین کے ایک انچ ٹکڑے پر کوئی قبضہ نہیں کر سکتا، اسی طرح اپنے خون کو بھی کسی کی گرفت میں نہیں دیکھ سکتے۔ نوشابہ سے تو انہیں ابھی بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ کرن کی وجہ سے آئے تھے۔“

”آپ نے کیا کہا؟“

”وہ..... وہ کچھ کہا ہے کہ وہ خواب میں بھی انہیں دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔“ راحیلہ اور آسیدہ پوری بات بتانے کے بعد ہنسنے ہوئے بولیں۔

”مگر انہیں اصلیت معلوم ہو گئی تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ وہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہیں جو بلا تحقیق کے یقین کر کے بیٹھ جائیں گے۔“  
”آدمی معمولی ہوا غیر معمولی، اہم ہوا یا عام بات جب مردانہ غیرت کی آجاتی ہے تو عقولوں پر ان کے پروے پڑ جاتے ہیں۔

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے، پھر اس کی آنکھوں میں مزادینے کا جذبہ ہوتا ہے، مارنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ جب میں نے روتے ہوئے انہیں بتایا کہ وہ ہماری عزت مٹی میں ملا کر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہیں تو پوچھو نہیں اس وقت کس قدر غضب ناک ان کا چہرہ ہو گیا تھا، گویا خون چھلک پڑا ہو۔“

”ان کی بد چلنی و آوارگی کے ایسے ایسے قصے سنائے ہیں کہ اگر وہ کسی سے تصدیق بھی کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں گے۔“

”بھابی! انہیں یقین تو آ گیا تھا؟ کہیں بات لوز ہوئی تو سمجھ لیجئے گا، ہم تینوں بھی خوب بے عزت کر کے یہاں سے ہمیشہ کے لیے نکالے جائیں گے۔ ابھی ان بھائیوں کی آنکھوں پر ہماری باتوں کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ کبھی کھل گئی تو پھر مجھے قیامت نظر آنے لگتی ہے۔“ زخسان کان پکڑتے ہوئے بولی۔

”ارے تم فکری مت کرو۔ بڑی بھابی کی اداکاری اور ڈائیاگ ڈلیوری اتنی زبردست ہے کہ بے گناہ از خود ہی اپنے گناہ قبول کر لے۔“ آسیہ راحیلہ کی جانب دیکھتے ہوئے سناٹھی لہجے میں بولی۔

☆.....☆.....☆

سعد کی بری کی تمام تیاریاں لو شاپہ اور کرن نے کی تھیں۔ سعد نے سکے بیٹے کی طرح ہر موقع پر ان کا بھرپور خیال رکھا تھا تو انہوں نے بھی اس کی دل جوئی و دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

ڈر صاحب آگئے تھے اور ان کی خواہش پر ہی سعد کی شادی کی تمام تقریبات انس پبلس میں ہی اریج کی گئی تھیں۔ پوری کوشی بھتہ نور بنی ہوئی تھی۔ ڈر صاحب کے علاوہ گرینی کے چہرے پر بھی کئی خوشیوں کے رنگ تھے۔ انہوں نے اوپر پورشن میں اس کے لیے بیڈروم ڈیکوریٹ کروایا تھا۔ رخصتی کے بعد ولہن سبیں آئی تھی اور ویسے کے دوسرے دن ہنی مومن نور پر شمالی علاقہ جات کی جانب عازم سفر ہو جاتے جس کا تمام انتظام اس کی طرف سے گنٹ کے طور پر تھا۔

وہاں سے واپسی پر سعد کو اجازت ہوتی اپنے گھر جانے کی۔ تمام پروگرام گرینی کی ہدایت پر ترتیب دیا گیا تھا۔

”بیٹی! ایک کپل جائے تو تھکن اتر جائے گی۔“ فائل چیک کرتے ہوئے انس نے ایک نگاہ باپ کی طرف دیکھا جو وہاں سے گزرتی کرن سے مخاطب ہوئے تھے۔ کرن ”جی اچھا“ کہتی ہوئی فوراً وہاں سے چلی گئی تھی۔

”کیا ہوا؟ آپ کے چہرے پر کچھ ناگوار تاثر نظر آ رہے ہیں۔“ وہ بیٹے کی نگاہ پچھان کر مخاطب ہوئے۔

”ڈیڈی! مالک اور ملازم کے درمیان ایک حد ایک فاصلہ رہے تو بہتر ہوتا ہے، ورنہ اعتماد و اعتبار کا خون ہوتے دیر نہیں لگتی۔“

اس کا وہیما لہجہ بے حد مہذبانہ و شائستہ تھا۔

”مائی ڈائیرن الگوکوں کو پرکھنا سیکو، دولت کے انبار پر انسانی قدروں، غلوں کے پندار کو چکنا چور کرنے والے بڑی دشمنی کرتے

ہیں اپنے آپ سے، دولت و طاقت آپ کو بڑائی عطا نہیں کرتی ہے، محبت و عزت آپ کا غلخانہ طرز عمل آپ کو دیتا ہے، اگر کوئی محنت کر کے اپنا پیٹ پالہ ہے تو وہ ہم سے کم تر و حقہ نہیں ہو گیا، کیونکہ محنت تو ہم سب کرتے ہیں، بس ذرائع مختلف ہیں۔“ ان کا لہجہ شیریں و ناصحانہ تھا۔

”سوری ڈیڈی! میرا یہ مقصد نہ تھا۔“ وہ حقیقتاً شرمندہ ہو گیا تھا۔

”زندگی کے روشن پہلو چھوڑ کر جب انسان تاریک پہلوؤں کو ڈیست کا جزو بنا لیتا ہے تو کچھ ایسی ہی بے زاری و بے اعتمادی ہر

شے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بطور باپ نہیں بلکہ ایک فریڈ کے، میری ایڈوائز بھی ہے کہ زندگی اس طرح سے گزاریں جس طرح ڈر خان

کے بیٹے کو سوٹ کرتی ہے۔“

”جو حکم ڈیڈی! میں آپ کی دستخط کا منتظر رہتا ہوں۔“

”ہماری ڈعاؤں کے حصار تو آپ کے گرد ہی تو قائم ہیں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے بیٹے سے لگا یا تھا۔

☆.....☆.....☆

سعد کی ہارات کی تیاریاں شروع پر تھیں۔

گرینی کی رات سے اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ دو واؤں کے زیر اثر سو رہی تھیں، گزشتہ دنوں سعد کی مایوں اور رسم حنا کے ہنگاموں کے باعث انس پبلس میں خاصا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ گرینی وکیل چیئر کے سہارے ہر کام میں پیش پیش رہی تھیں۔ نونشا بہ سعد کی طرف سے تو مکمل ذمے داری نبھاتی تھیں، مزید بوجھ مدثر صاحب نے گمر کی تمام ذمے داریاں بھی انہیں سونپ کر ڈال دیا تھا۔

شادی کے باعث ملازموں کی تعداد بھی بڑھادی گئی تھی، پھر بھی سب کی دیکھ بھال، بری کے سامان کی پیننگ اور حفاظت بہت ذمے داری کے کام تھے جو ان ماں بیٹیوں نے احسن طریقے سے نبھائے تھے۔

آف وہاٹ شیر دانی، وہاٹ ہنگ پانچا سے اور آف وہاٹ خوب صورت کھنے میں سعد دو لہا بن کر خوب سچ رہا تھا۔

بارات کا استقبال شان دار طریقے سے کیا گیا تھا۔ شہر کے مہنگے میرج لان میں انتظام تھا۔ ذرق برق لمبوسات کی سرسراہٹیں، خوشبوئیں، تہتہ، خوشیاں ہر سمت بکھری ہوئی تھیں۔ نکاح ہوا تو مبارک ہادی صدائیں پھیلنے لگیں۔ طویل مدت بعد آج نونشا بہ ڈھنگ سے تیار ہوئی تھیں۔ پرل مہلون کی ساڑھی پر ڈارک پرل اینڈ بلیک ہارک ستاروں اور موتیوں کے دیدہ زیب فینسی کام والی ساڑھی میں ہم رنگ میچنگ جیولری اور لپ اسٹک، بالوں میں جوڑا ہاندھے وہ بہت سو پرلگ رہی تھیں۔ کرن نے سٹک کا ٹک پانچا کر دیا تھا۔ کئی ستائشی تھا۔ سٹلنی ستاروں سے سما اس کا سوٹ جھلجھل کر رہا تھا، میچنگ نازک سی جیولری لائٹ میک اپ میں اس کا سویا حسن دکھ اٹھا تھا۔ کئی ستائشی نکا جس اس کے چہرے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

”مما! کافی ٹائم ہو گیا ہے۔ میں ایک نظر میڈم کو دیکھ کر آؤں۔“ دلہن کو نکاح کے بعد اسٹیج پر بٹھایا جا رہا تھا۔ سوڈین بن رہی تھیں۔ گرین عروسی جوڑے میں کئی سنوری فاریہ دوستوں اور کزنز کے جھرمٹ میں خراماں خراماں اسٹیج کی جانب بڑھ رہی تھی، اچانک کرن کو خیال آیا تو ماں سے مخاطب ہوئی۔

”شمو اور چندا ان کا دھیان رکھ رہی ہوں گی، پھر بھی تم ایک دفعہ دیکھ آؤ تو اچھا ہی ہوگا۔ ابھی تو بہت وقت لگے گا یہاں پر۔“

وہ ڈرامائی طور کے ہمراہ آگئی تھیں، گرینی سکون سے سو رہی تھیں۔ شمو اور چندا آرام سے وہیں براجمان تھیں، اسے دیکھ کر چندا بولی۔

”قسم سے بائی! آج تو آپ آفت لگ رہی ہو، پہچانی ہی نہیں جا رہی ہو۔“ وہ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے بولی۔

”چپ بے وقوف، جو دل میں آتا ہے، وہ منہ پھاڑ کر کہہ دیتی ہے۔“

”لو ماں! کیا کسی کی تعریف کرنا جرم ہے؟“۔

”تیری سوئی غسل میں ایسی باتیں نہیں آئیں گی، جب کسی کی تعریف کرتے ہیں تو پہلے ماشاء اللہ کہتے ہیں۔“

”لو آگئی میری غسل میں بات، تم کہہ رہی تھیں آئے گی نہیں۔“ وہ منہ پھلا کر بولی تو کرن بے اختیار نرس پڑی تھی۔

”شہو! اس کو مت ڈانٹا کرو، سمجھ تو جاتی ہے پھر اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جو تم ڈانٹ رہی ہو۔“ وہ شہو کو ضروری ہدایات دے

کر باہر نکلی تو کارڈ اور کونازہ گلاب کی خوشبوؤں سے مہکتا ہوا پایا۔

”یہ مہک کہاں سے آ رہی ہے؟ کتنی زبردست ہے۔“

”انس صاحب لائے ہیں کسی کمرہ سجانے والے کو، لایا تھا نوکریاں بھر بھر کر پھولوں کی، سعد صاحب کا کمرہ سجانے کے واسطے دو

آدی تھے، کمرہ سجا کر گئے ہیں کچھ دیر ہوئی۔“ چندا نے اطلاع دی تھی۔

”اچھا تم دروازہ اندر سے بند کر لو، میں ڈرائیور کے ساتھ جا رہی ہوں۔“

وہ کارڈ سے باہر نکل کر ٹائز برآمدہ میور کر کے باہر آئی تھی تو ڈرائیور کا رسمیت وہاں سے غائب تھا، وہاں انس کی کارکنز تھی۔

”کس کو دیکھ رہی ہیں آپ؟“ انس اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا تھا، اسے ادھر ادھر مراسمہ دیکھ کر استفسار کر بیٹھا۔

”جی..... وہ ڈرائیور کو دیکھ رہی ہوں۔“ اسے اچانک دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی تھی۔ لائٹ بلوکٹ سوٹ میں اس کی شان دار پرستائی

نمایاں تھی۔

”آپ کو وہاں شادی میں ہونا چاہیے تھا، یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ جیب سے کارکی چابی نکالتا ہوا گویا ہوا۔

”میں وہیں سے آئی ہوں۔“

”آپ وہیں سے آئی ہیں..... لیکن کیوں؟“ وہ ڈرائیور کو ڈور کھولتے ہوئے چونک کر رُکا اور اس کی جانب استفسار کیا ہوا

سے دیکھتا ہوا گویا ہوا۔

”میڈم کو کچھ میڈ۔ سنز دینی تھی۔ وہ دینے آئی تھی مگر وہ سو رہی ہیں، شہو کو سمجھا کر آگئی ہوں۔ میڈم کے جاگنے کے بعد وہ دے

دے گی۔“ وہ گھبرائی ہو کھلائی اس کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ اس نے بے ارادہ نگاہیں اٹھائی تھیں اور ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔

”وہی انداز، وہی نقوش، معمولی سے تشبیہ کے ساتھ بھلا اس قدر مشابہت و یکسانیت بھی چہروں میں ہو سکتی ہے؟“ اس نے گہرا

سانس لے کر دروازہ کھولا، پھر اس سے مخاطب ہوا جو اس کے اس طرح دیکھنے سے پریشان ہو گئی تھی۔

”ڈرائیور کو میں نے کام سے بھیجا ہوا ہے۔ آپ آجائیں میں وہیں جا رہا ہوں۔“ اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا تو وہ

خاموشی سے آکر بیٹھ گئی۔

”آپ تقریب چھوڑ کر گری کی خاطر آئیں۔ آپ کے اس غلوں نے میری تمام سابقہ غلط فہمیاں و بدگمانیاں زائل کر دی ہیں۔“

دراصل میں یہی چاہتا تھا کہ کوئی ایسا ہو جو اپنی ڈیوٹی محض ڈیوٹی نہیں، محبت سمجھ کر انجام دے، کیونکہ ملازمت و محبت دو الگ جذبوں کے نام ہیں۔ ملازمت کا تعلق ضرورت سے اور محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور یہ بہت پاورفل جذبہ ہے۔ وہ کارڈ رائیڈ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں ایک سکیج ذکر کرتا ہوں آپ سے اپنے تمام ایل سینرز بے ہیروز کی“

”آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سرا“ وہ اس کے معذرتی انداز پر خود کنفیوڈ ہو گئی تھی۔

میرج لان تک ان کے درمیان پھر کوئی بات نہ ہوئی تھی، اس نے کار پارکنگ لائٹ میں کھڑی کی تو وہ اپنا پرس اور وہ پینہ درست کرتی ہوئی اندر بڑھ گئی، جبکہ انس کا رلا کڈ کر کے پلانا تو گویا آگے بڑھنے کی سکت نہ رہی تھی۔

بلیک جھلملاتی ساڑھی، بغیر آستینوں کے مختصر بلاؤز میں اس کے شاداب جسم کی رعنائیاں عروج پر تھیں۔ سیاہ تراشیدہ بال شانوں پر چہرہ دے رہے تھے۔ مہارت سے کیے گئے میک اپ نے اس کے بے باک حسن کو مزید دو آسندہ کر ڈالا تھا۔ بلیک ڈائمنڈز کی جیولری کی جگہ ہٹ اس کے سرخ عارضوں اور براؤن آنکھوں میں کوئدری تھی۔

”ہیلو انس! ہاؤ آر یو؟“ وہ مست ہوا کے جھونکے کے مانند اس کی جانب بڑھی۔

”قائمن“ اس کے چہرے پر یکخت تازہ بخیل گیا تھا۔

”تم یہاں کیسے؟“ وہ مسرت سے کھلی پڑی تھی۔

”جیسے آپ ہیں۔“ وہ کہتا ہوا سرعت سے آگے بڑھا تھا کہ اس نے آگے بڑھ کے اس کا بازو پکڑ لیا، پھر جذباتی لہجے میں استفسار کرنے لگی۔

”اتنی بے گامگی، اتنی سرد مہری، ابھی تک نہیں بھول پائے، ان باتوں کو؟“

”ایسی باتیں کبھی بھلائی نہیں جاسکتی ہیں، جن میں جسم کے ساتھ روح بھی گھائل کر دی گئی ہو۔“ وہ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہناتا آگے بڑھا تھا۔

”ماما!“ پانچ سالہ بے حد کیوٹ سا سرخ و سفید رنگت و پھولے پھولے گالوں والا بچہ اندر سے آکر منال کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔

”انس! یہ میرا بیٹا ہے۔“ جو اب انس نے کوئی جواب نہ دیا تھا اور تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ سدا سے ڈھونڈنا باہری آ رہا تھا۔

”ایسے اہم موقع پر مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے ہو، جانتے ہو مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے اور تمہیں کوئی فکر نہیں ہے۔“ بولتے بولتے اس کی نگاہ انس کے چہرے پر پڑی۔

”ارے کیا ہوا؟ یہ تمہارا رنگ اتنا زرد کیوں ہو رہا ہے اور اتنا پینہ کیوں آ رہا ہے؟“

”کچھ..... نہیں..... ہوا تھوڑا سا پانی پلو او“۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھتا ہوا بولا، وہاں سے گزرتے دیر سے پانی منگوا کر اسے دیا، پانی پی کر اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تھی۔

”کیا ہوا یا ر؟ ایسا کیا ہوا، جس نے تمہیں اتنی تکلیف پہنچائی ہے؟“

”پانچ سال میں جو زخم بھرے تھے، یکفخت ہی تازہ ہوئے تو یہ حال ہونا ہی تھا۔ منال یہاں موجود ہے اپنے بیٹے کے ہمراہ“۔ وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔

”اوہ..... یار العنت بھیج ایسی غبیٹ عورت پر، کیوں دل پر لیتا ہے۔“

”وہاں سب پوچھ رہے ہیں اور آپ دونوں یہاں پر کیا کر رہے ہیں“۔ ڈر صاحب وہاں آ کر گویا ہوئے۔

”ڈیر! سجد کے بیڈروم کا فائل فلاورڈیکورٹ کپلیٹ کروا کر آ رہا ہوں۔ وہی سجد کو بریف کر رہا تھا“۔ انہیں سامنے دیکھ کر دونوں نے خود کو سنبھالا تھا۔

”اوکے۔ وہاں پلیس کچھ سلامی وغیرہ کی رہیں ہیں، اس کے بعد ڈنر کا آرگنٹمنٹ ہے، میں ٹرائی کروں گا رخصتی جلدی کرنے کی“۔ وہ ان کے ساتھ آگے بڑھ گئے تھے۔

”جو تپا چھپائی کی رسم ہو رہی ہے، آپ بتائیں کتنی رقم مناسب رہے گی۔ بچیاں خوش ہو جائیں اتنی رقم تو ہونی چاہیے“۔ ڈر صاحب نوشابہ سے مخاطب ہوئے تھے اور قبل اس کے نوشابہ کوئی جواب دے پاتیں، لائٹ براؤن تھری پیس سوٹ میں لمبوس، منہ میں سگار دہائے اپنی جانب جا رہا نائماز میں بڑھتے شخص کو دیکھ کر وہ کہنے لگے۔

چہرے سے جھلکتی رنگت۔

مزاج سے چھٹی جارحیت۔

آنکھوں سے جھلکتی نفرت۔

کچھ بھی نہ بدلا تھا، ماسوائے کنپٹیوں کے ہوئے سفید بالوں کے، وہ آکر ان کے مقابل کھڑے ہو گئے تھے، کینہ تو زندگیوں سے ڈر صاحب کو گھورتے ہوئے۔

”بر..... ہا..... ن!“ نوشابہ کہنے کی کیفیت سے نکل کر یقین کی زمین پر پاؤں رکھ چکی تھیں۔ ان کے درمیان سالوں کی طویل مسافت رہی تھی۔ اتنی مدت بھی ان کے مزاج کو بدل نہ پائی تھی۔

”ہاں میں، چونکہ گئی ناں، تم سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اس طرح رکتے ہاتھ پکڑوں گا تمہیں رنگ دیاں مٹاتے ہوئے“۔ وہ قہر آلود لہجے میں بولے۔

”یہ..... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ نوشابہ کو لگا، زمین ان کے قدموں سے سرک گئی ہے۔ آسمان ٹوٹ کر سر پر آگرا ہے۔



”مسٹر برہان لغاری ایشٹ یور ماؤتھ۔“ مڈر صاحب بھی اس پھوٹیشن کو سمجھ نہ پائے تھے اور جب بات ان کی سمجھ میں آئی تو وہ غصے سے دھاڑے تھے۔

”جینو مت، چلانا مجھے بھی آتا ہے اور تم سے زیادہ بلند آواز میں چیخ سکتا ہوں، لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میرے عزیز فرینڈ کی بیٹی کی شادی میں کوئی پر ایلم کری ایٹ ہو اور.....“

”آپ میری بات تو سنیں برہان! خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں ہے مڈر صاحب کی میں بھائیوں کی طرح عزت کرتی ہوں۔“  
نو شاہد روتے ہوئے ان کے قدموں میں بیٹھ گئی تھیں۔

”تم بھی عورتوں کے پاس ایسے بھائیوں کی کمی نہیں ہوتی جو دن میں شرافت کا خطاب لگا کر دھوکہ دیتے ہیں اور رات کی تاریکیوں میں.....“

”اپنی زبان کو لگام دو لغاری اور نہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“ مڈر صاحب کی حیمیت برداشت نہ کر سکی، اتنی تدرلیل وہ بری طرح بھرا رہے تھے۔

کرن جو ماں کو دیکھنے کی خاطر اس طرف آئی تھی، یہ سب دیکھ کر ٹھنک کر زک مٹی تھی۔ وہ چہرہ اس کے سامنے تھا جس کو دیکھنے کی حسرت زندگی کی اولین تمنا بن گئی تھی، وہ وہ جو اس کے سامنے تھا جس کا شفقت بھرا ہنس پانے کو وہ بے گل رہتی تھی۔ آج وہ سامنے تھے جن کو سامنے دیکھنے کی وہ دعائیں کرتی آئی تھی لیکن یہ انداز کیسا تھا ان کا؟ یہ روپ کون سا تھا ان کا؟ جس نے اس کے قدم زمین سے جوڑ دیے تھے۔ اسے پتھر کا بنا دیا تھا۔

”ڈیڑی، ڈیڑی، ایلینز..... کول ڈاؤن سنبالیس خود کو اندر لوگ بھرے ہوئے ہیں۔ تماشا بن جائے گا۔“ انس کسی گوشے سے برآمد ہوا تھا اور باپ کو بازوؤں سے پکڑ کر اندر لان کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ یہ بیرونی حصا اس وقت سنسان تھا، کیونکہ اندر دلچسپ رسموں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ سوا اس وجہ سے لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول ہونے کے باعث ان کی طرف کوئی متوجہ نہ ہو سکا تھا، کوئی اس طرف نہ آیا تھا۔

”میری بیٹی نے تمہارے بیٹے کو زک پہنچائی تھی، اس کا بدلہ ہے نایہ..... تو یاد رکھ لینا، آج سے میرا انتقام کا آغاز ہوتا ہے مڈر خان ایسا بدلہ لوں گا کہ تمہاری آنے والی نسلیں میرے نام سے کانپیں گی۔“ ان کا لہجہ بے حد خوف ناک تھا۔

”اپنی رذیل ذہنیت اور غلط فہمی کو دور کرو گے تو ساری حقیقت تمہیں سمجھ آ جائے گی اور اس عورت کی پاکیزگی و پاک دامنی کی میں قسم کھا سکتا ہوں۔“

”مجھے نہ تم پر اعتبار ہے نہ اس عورت پر اور نہ تمہاری قسموں پر۔ شاید میں اعتبار کر بھی لیتا، اگر میں اس کی اور اس کی بیٹی کی آوارگی اور بد چلنی کی داستاںیں اس کے انہوں کے منہ سے نہ سن لیتا۔ ایک عرصے بعد میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا تھا اور میں انہیں لینے اس کے باپ

کے گھر گیا، وہاں جا کر معلوم ہوا یہ اور اس کی بیٹی ان کے چہروں پر کالک مل کر اپنے آشناؤں کے ساتھ بھاگ چکی ہیں۔  
 ”آہ.....“ بڑا شدید وار تھا نچر پیچھے سے ہی حسب عادت گھونپا گیا تھا۔

ہاتھ وہی تھے جنہیں اپنائیت کا دعویٰ تھا، ضرب بڑی کاری پڑی تھی۔ تکلیف کا احساس ہر شے پر محیط ہوتا چلا گیا۔ کچھ دیر قبل جگہ جگہ ماحول تاریکی میں بدلنے لگا تھا، جس ایک دم اتنا بڑھا کر نوشاہ کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔  
 ”اسکی عورت سے میں کوئی تعلق رکھتا نہیں چاہتا، جو کام مجھے آج سے بہت سال قبل کرونا چاہیے تھا، وہ آج کر رہا ہوں۔ نوشاہ بیگم! میں بھانگی ہوش و حواس، تمہاری بد کرداری کو مد نظر رکھتے ہوئے تمہیں.....

طلاق دیتا ہوں۔

طلاق دیتا ہوں۔

طلاق دیتا ہوں۔

تین لفظوں کا یہ تعلق جو دو لوگوں کو ایک رشتے سے جوڑ دیتا ہے اور تین لفظ ہی اسے توڑنے میں بھی کافی ہوتے ہیں۔ بڑا احتیاط رشتہ ہے، یہ کبھی پہاڑ سے زیادہ مضبوط تو کبھی دھماکے سے بھی کچا۔ محبت، اعتماد اور اتہار اس رشتے کی اساس ہیں جہاں یہ جذبے ناپید ہوتے ہیں وہاں شک کے یہ ناگ اسی طرح ڈستے ہیں۔ نوشاہ کہنے ہوئے سمیر کی طرح زمین بوس ہوئی تھیں۔  
 ”مما“ کرن کی وحشت زدہ چیخ ماحول میں گونج اٹھی تھی۔



وہ بھاگ کر ماں کی طرف بڑھی تھی۔ اس سے پہلے انس اُن تک پہنچ چکا تھا۔ انہیں ہوش میں لانے کی ہر تدبیر ناکام ثابت ہوئی تھی۔ انس نے اُنہیں اٹھا کر بیک سیٹ پر لٹایا۔ کرن نے وہاں سے جاتے ہوئے باپ کی پشت پر چلتی ہوئی نگاہ ڈالی تھی، اس لمحے برہان لغاری نے بھی غیر ارادی طور پر جاتے ہوئے سڑک اس کی جانب دیکھا تھا۔  
 باپ بیٹی کی نگاہیں ٹکرائی تھیں۔

باپ کی نگاہوں میں اشتعال، برہمی و بد اعتمادی کی سُرخی تھی تو کرن کی دھواں دھواں ہوتی نم نگاہوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو کینہ توڑنگا ہوں سے دیکھتے رہے تھے، پھر برہان لغاری تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئے تو وہ کار کی طرف بڑھ آئی تھی۔  
 ”پریشان مت ہوں، اللہ بہتر کرے گا۔“ مڈر صاحب جو اچانک پیدا ہونے والی صورت حال سے شدید آپ سیٹ تھے، کرن کی جانب دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولے تو وہ سر جھکا کر رہ گئی تھی۔

”ڈیڑی! یہاں سب کچھ آپ کو سنبھالنا ہے۔ سعد کو ذرا بھی محسوس نہ ہو۔“ انس باپ کی جانب دیکھتے ہوئے آہستگی سے مخاطب ہوا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔ اس نے کار اشارت کر دی تھی۔ کرن نوشاہ کا سر گود میں رکھنے ان کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر قبل یہ چہرہ کتنا ہشاش بشاش، مچی خوشیوں سے جھلکا رہا تھا، پہلی بار اس نے انہیں اتنے اچھے انداز میں دیکھا تھا۔ کتنی باوقار و خوب صورت لگ رہی تھیں وہ۔ بار بار ان کی جانب نگاہ اٹھ رہی تھی۔ کئی بار اس نے انہیں آج کے دن نگاہوں کے ذریعے دل میں اُتارا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ آنے والے لمحات اس کے لیے کیسے کشن و ناکاہل برداشت درد لیے چلے آ رہے ہیں۔ بے اختیار آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہ رہے تھے۔

واقعہ اتنا بڑا تھا کہ سوچنے بگھنے کی صلاحیتیں ایک دم ہی مفلوج ہو گئی تھیں۔ تین دن تک وہ آئی سی یو میں موت و زیت کی حالت میں رہی تھیں۔ چوتھے دن موت نے زیت کو شکست دے دی تھی۔ وہ جو ساری زندگی صبر و خاموشی سے گزارتی آئی تھیں، اسی خاموشی سے دُنیا سے چلی گئیں۔ تین روز قبل جس گھر میں شادی کے شادایا نے بج رہے تھے، اس گھر میں اب موت کی بوچھل و خاموش ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی سے زیادہ ناقابل اعتبار و ناپائیدار کوئی شے نہیں ہوتی، انسان کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے، تصورات میں گم رہتا ہے، خواہشوں کے تاج محل بنا تا ہے، آرزوؤں کے شیش محل تیار کرتا ہے، تمناؤں کے دیپ جلاتا ہے، موت کی حقیقت کو فراموش کیے زندگی کے جھوٹے پہلاؤں میں بھٹکتا ہوا موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے، ہمیشہ ہمیش کے لیے۔

نوشابہ کو دفن ہوئے چوتھوں دن تھا، مڈر صاحب نے نوشابہ کی ڈیڈ باڈی ہاسپتال سے وصول کرتے وقت کرن سے سوال کیا تھا کہ ڈیڈ باڈی گھر لے کر جائیں یا وہ اپنے ماموں کے ہاں جانا پسند کرے گی۔ جو اب اس نے ماموں کے گھر جانے سے انکار کر دیا تھا اور پھر مڈر صاحب نے ان کی ڈیڈ باڈی اپنے گھر سے ہی اٹھوائی تھی۔ ان کے توسط سے خاصے طے والے آگے تھے جو سوئم تک رہے تھے۔ انہوں نے نوشابہ کو اپنی کزن کے طور پر ہی محارف کرایا تھا۔ کرن کی حالت از حد دگرگوں تھی۔

اس کے ہونٹ مضبوطی سے بند تھے، بولنا جیسے وہ بھول ہی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں برستی راتیں، خلوتِ قاریغ بیٹھے یا نماز و تلاوت قرآن پاک میں مصروف ہو۔ کوارٹر میں تالا لگ چکا تھا۔ گریٹی نے اس کے لیے ایک بیڈ اپنے کمرے میں لگوا لیا تھا تاکہ تنہائی محسوس نہ کرے۔

”لڑکی! اس طرح خاموش رہنے سے کیا ہوگا، کیوں تو نے اپنے ہونٹ ہی لیے ہیں، بھلا اس طرح بھی ہوتا ہے۔ موت تو اسی طرح اچانک آنے والی شے ہے۔ بندے کو معلوم نہیں ہوتا مگر وہاں تو اس کا پورا نام نچیل لکھا ہوا ہے، وہاں نام ختم ہوتا ہے اور یہاں بلاوا آجاتا ہے تو جانا پڑتا ہے۔ موت کا ڈاکو تو ہر ذی روح کو چمکتا ہے، اس سے مفر کسی کو حاصل نہیں ہے۔“

”کیا کیوں میڈم! اور کیسے کہوں؟ مگی کے ساتھ میں بھی مر گئی ہوں۔“ اس کی دہمی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

”غلط بات ہے، مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔“

”آپ نہیں سمجھ سکتیں میڈم! جو ہمارے ساتھ ہوا ہے۔“ وہ شدت سے رو پڑی۔

”مجھتی ہوں، انس نے مجھے سب بتا دیا ہے۔“

”نہیں سمجھ سکتیں آپ، میں بچپنوں کے جس الاؤ میں جل رہی ہوں، وہ تکلیف صرف میں محسوس کر رہی ہوں یا وہ محسوس کرے گا جو میرے جیسے حالات سے گزرا ہو۔“

”یہاں آؤ، میرے پاس آکر بیٹھو۔“ گرنی کے اندر ایک دم متا جاگ اٹھی تھی۔ وہ بیڈ پر اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔  
 ”ہاں، جو تمہارے دل میں ہے، جو تم سوچ رہی ہو، جس بات کا تمہیں چھتاوا ہے، جو یاد تمہیں تکلیف دے رہی ہے، سب مجھ کو بتاؤ، کچھ بھی مت چھپانا، تمہارے دل پر جو بوجھ ہے، وہ سب اتار بیٹھو، مجھے بتاؤ۔ ان لمحوں میں تم مجھے اپنی ماں ہی سمجھ لو۔“ گرنی نے اسے رونے دیا، کافی دیر بعد وہ خاموش ہوئی تو انہوں نے انٹرکام پر شہسو سے پانی کا کہا، وہ پانی لے آئی تو چائے کا آرڈر دے دیا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا ابھی تک کہ می مجھے چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ اتنی جلدی، اتنا اچانک وہ سب ہوا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا ابھی کی جدائی کا۔“

گرنی کی شفقت نے اسے کھل کر رونے کا موقع دیا تھا۔ وہ جو گزشتہ دنوں کی کٹھن کا شکار تھی، طبیعت، ہلکی پھلکی محسوس کرنے لگی تھی۔  
 ”اللہ تمہیں صبر دے (آمین)۔“ گرنی دعا گو ہوئیں۔

”میری می نے بہت نکالیف اٹھائیں، بے حد ڈکھ جھیلے۔ انہوں نے ہاتھوں بچنے والی ہر ذلت، اذیت کو اپنا مقدر سمجھ کر برداشت کرتی رہیں، اس امید پر کہ کبھی تو اس شخص کو اپنی ذمہ داریوں کا خیال ہوگا، کبھی تو انہیں خیال آئے گا کہ ان کے نام سے وابستہ وہ بہتیاں بھی اس دنیا میں موجود ہیں، سویا ہوا خمیر کبھی نہ کبھی تو بیدار ہوگا اور جس دن وہ بیدار ہوگا وہی دن ہمارا یوم نجات ہوگا۔“ اُنڈ آنے والے آنسوؤں نے اس کی آواز بھاری کر دی۔

”میری ماں بہت خود دار، صابر اور نیک تھیں، اپنی ذات کے لیے وہ کسی سے لڑنا نہیں جانتی تھیں۔ لوگوں کی زیادتی و ظلم کے جواب میں اُن کے پاس واحد ہتھیار خاموشی ہوتی تھی۔ اب بھی وہ اسی خاموشی سے چلی گئیں۔“

”بہت اچھی عورت تھی تمہاری ماں، بے حد نیک اور ملن سار۔“ اسی دم شہسو وازہ کھول کر اندر آئی اور بولی۔  
 ”باہر کوئی ملنے آئے ہیں آپ سے۔“ وہ کرن سے مخاطب ہوئی تھی۔

”کون؟“ وہ بے دھیانی سے بولی تھی پھر اک دم ذہن میں جھماکا ہوا کہ یہاں تو ایک ہی آسکتا ہے اور کوئی نہیں۔

☆.....☆.....☆

”کرن..... کرن! وہ چوکیدار کیا کہہ رہا ہے؟ پچھو کہاں ہیں؟ گیٹ پر تالا کیوں لگا ہوا ہے؟“ اس کی آواز، اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ گیٹ پر چوکیدار نے اسے جو خبر دی تھی اس نے اسے بدحواس کر ڈالا تھا۔ وہ چوکیدار سے کوئی بات کیے بنا بھاگتا ہوا کورڈر کی طرف گیا تھا، وہاں دروازے پر پڑے تالے نے اس کے حواسوں کو مزید منتشر کر دیا تھا۔ اس نے چوکیدار سے کرن کے متعلق پوچھا تو اس نے ملازمہ سے کرن کو بلانے کو کہا تھا۔ کرن کے آنے تک وہ بے کل سا ڈھانچا مانتا رہا تھا۔

”اللہ کرے یہ بات جھوٹ ہو، جو میرے کانوں نے سنا ہے، وہ غلط ہو۔ پھپھو، میری پیار پھپھو اس طرح کیسے جا سکتی ہیں۔“ وہ سوچ رہا تھا لیکن جس طرح سوچا ہوا پورا نہیں ہوتا ایسے ہی ہر دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ وائٹ برٹن لہاس، اُلٹھے بکھرے بال، شدت گریہ سے سُرخ و سُوجی ہوئی آنکھیں، برنج و اَلَم کی تصویر بنا سہا پاپا، صبح صبح کر کہہ رہا تھا جو اُس نے سنا ہے، وہ دُورست ہے۔

”کرن ایولونا، خاموش کیوں ہو؟ کیا ہوا تھا؟ کیسے ہوا یہ سب؟ اتنا بڑا سانحہ گزر گیا اور تم نے ہمیں اطلاع تک نہیں دی۔ پھپھو کے آخری دیدار سے بھی مرحوم رکھا، کیوں کیا تم نے ایسے، کیوں کیا؟“ وہ جو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا، اس وقت بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

”تم اتنی کٹھور و سنگ دل ہو گی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اپنوں کے ہوتے ہوئے پھپھو غیروں کے کامدھوں کے سہارے سطر آخرت پر روانہ ہوئیں۔ تم ضدی، خود سر تھیں، حالات کو دیکھتے ہوئے میں تمہیں ان رویوں میں حق بجانب سمجھتا تھا لیکن اب جو تم نے کیا ہے اس سے ثابت ہو گیا کہ تم بے حس، بے رحم لڑکی ہو۔ انا پرست و خود پسند لڑکی۔“ روتے روتے وہ چپٹا تھا۔

”تم نے اتنا بڑا اَلَم کیا ہے، اتنی بڑی زیادتی کی ہے کہ میں آئندہ خواب میں بھی تمہاری صورت تو کیا پر چھائیں دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ میں نے تمہارے حوالے سے کتنے خواب دیکھے تھے، ایک اچھی دکامیاب زندگی گزارنے کے، دنیا بھر کی خوشیوں سے تمہارا دامن بھرنے کے، اُن خوابوں میں محض ہمارے ہی وجود نہ تھے بلکہ پھپھو جان کے وجود کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ہمارے ہر سکھ، ہر راحت، ہر خوشی کی ابتدا اُن کے وجود سے تھی، میرے خواب آکھ کھلنے سے قبل ہی ٹوٹ گئے تھے۔ میری مسافیتیں ہمیشہ کے لیے منزل کھو بیٹھی ہیں۔ تم میری زندگی کی اولین خواہش تھی، آخری آرزو تھیں، جو اُب ہمیشہ کے لیے میرے لیے کتب بن جائے گی۔ بہت بُرا کیا ہے تم نے، ناقابل معافی جرم ہے تمہارا۔“ وہ کرن کو نظرت سے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اوپر بیس پر کھڑا اُنس کیلے ہال ٹاول سے رگڑتا وہاں آیا تھا، لان میں کھڑے اجنبی لوجوان کو دیکھ کر رُک گیا، پھر کرن آگئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو نے غیر ارادی طور پر اُسے زکے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خاموش کھڑا وہاں بن رہا تھا۔

”اگر کہہ چکے ہوتے پلے جاؤ یہاں سے اور کبھی پلٹ کر مت آنا، جو تعلق درد کے ہوں اُنہیں تو زور دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ میں اپنی ماں کے قاتلوں سے کوئی واسطہ رکھنا بھی نہیں چاہتی ہوں۔“ اس کی بیٹھی آنکھوں و شطلے اُٹھتے ہونوں و زور چہرے پر ایسی کوئی بات ضرور تھی جو مزہ ہزار ہافصے و اشتعال کے باوجود چونک اُٹھا تھا، پھر اس کے آخری جملے نے اسے بے چین کر ڈالا تھا۔

”ہمیں ہمارے حق سے محروم رکھنے کے باوجود تمہاری یہ بد نظمی و نظرت شتم نہیں ہوئی۔ کیا چاہتی ہو تم آخر؟ اب کیا رہ گیا ہے؟“ وہ صبح اُٹھا۔

”میری ماں جن سانپوں کو ڈودھ پلاتی رہی، انہوں نے ہی اسے ڈس لیا۔ میری ماں کو مار کر مجھ سے حساب مانگنے آئے ہوا اور کیوں نہیں مانگو گے، خون تو اُن کا ہی ہو، جو مارتے ہیں اور رو نے بھی نہیں دیتے، چھپ کر وار کرتے ہیں پھر نشانہ بھی خطا نہیں ہونے دیتے۔“ وہ بھی بھرا اُٹھی تھی۔ اندر سے شو چند تیز آوازیں سن کر باہر نکل آئی تھی۔

نیرس پر سے اُس اندر چلا گیا تھا، چند لمحوں بعد وہ نیچے آ رہا تھا۔

”میری ماں کا خون اپنی آستیں میں، اپنے چہرے پر دیکھو“۔ وہ کہہ کر اندر چلی گئی، پیچھے شمواد چندا بھی چلی گئی تھیں۔ حمزہ کو گلو کی حالت میں کھڑا اسے اندر جاتا دیکھ رہا تھا۔

اس کا چار حانہ انداز، ہم لہجہ سے ذہنی خلیجان میں جتلا کر چکے تھے۔ کرن سے اکثر اس کی کھٹ پٹ ہو جاتی تھی، وہ منہ پھٹ و صاف گوسدا کی تھی، وہ بات بغیر کسی لپٹی مقابل کے منہ در منہ کہا کرتی تھی۔ اب بھی اُس کا انداز وہی تھا لیکن لہجہ بالکل مختلف تھا۔

”السلام علیکم، آئم اُس مدثر۔ آپ مجھے کچھ وقت دیں گے؟“ حمزہ جو اسی کیفیت میں کھڑا تھا، اندر سے آتے و جیہہ و اسارٹ مخلص کو دیکھ کر ڈگ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

لینڈ کروزر ڈور سے آتی دیکھ کر چوکیداروں نے مستعدی سے وہ بھاری بھر کم گیٹ کھول دیا تھا۔ اندر کا سر سبز و شاداب مٹھر ٹکا ہوں کو تراٹ بنشے کے لیے کافی تھا۔ وسیع و عریض لانز کے سبزے، تناور درختوں، پھلوں و پھولوں کے درمیان ایسا وہ سنگ مرمر کی خوب صورت عمارت پر جدید دور کے تاج محل کا گمان ہو رہا تھا۔ لینڈ کروزر روانی سے چلتی ہوئی گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی اور کچھ قاصلے پر ڈک گئی تھی۔ گاڑی زکتے ہی وہ ملازم نہ معلوم کس کونے سے برآمد ہوا اور جھٹ آگے بڑھ کر دروازہ بے آواز انداز میں کھولا تھا۔

”سلام مالک ا“ اُس نے گاڑی سے نکلنے پر ہان لغاری کو متودہانہ انداز میں سلام کیا تھا۔ ڈارک قرمی بیس سوٹ میں ملیوس برہان لغاری کے چہرے پر بلا کی رعونت و خنکی تھی۔ وہ گردن اُکڑائے حاکمانہ انداز میں آگے بڑھتے چلے گئے۔

ملازم کے سلام کا جواب دینا تو درکنار، انہوں نے ایک نگاہ اس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہ کیا جو بریف کیس اُٹھائے ظلامانہ انداز میں پیچھے آ رہا تھا۔ کوریڈور، لاؤنج عبور کرتے ہوئے کئی ملازم و ملازمتیں تھیں جنہوں نے انہیں ایسے ہی جھک جھک کر بے حد مودہانہ انداز میں سلام کیا تھا اور وہ اسی کوریڈور سے آگے بڑھتے رہے تھے۔ ملازم بریف کیس لے کر آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ ایک کمرے میں آگئے جہاں ایک معمر خاتون نماز کی چوکی پر بیٹھی تلاوت قرآن پاک میں مصروف تھیں۔ سفید سوٹ میں اُن کے سرخ و سپید چہرے کا جاہ و جلال نمایاں تھا۔ برہان لغاری نے محبت بھری نگاہ اُن کے چہرے پر ڈالی، پھر مودہانہ انداز میں اُن کے قریب بیٹھ گئے تھے۔

کمرے کی خشکی و خاموش فضا میں تلاوت کی جیسی آواز گونج رہی تھی۔ برہان کی آمد بھی اُن کے انتہاک کو جز بڑ نہ کر سکی تھی۔ بہت اطمینان سے انہوں نے سپارہ کھل کیا تھا۔ قرآن چوم کر جزدان میں لپیٹ کر ریک میں دکھاتا پھر چہرے پر ہاتھ پھیرتی ہوئیں وہ اُن کی طرف متوجہ ہوئیں اور مسکراتے ہوئے اُن پر پھونک مارنے لگی تھیں۔

”السلام علیکم والدہ حضور!“ ماں کو فارغ دیکھ کر انہوں نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، سدا خوش رہو“۔ انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”والدہ حضور! سے آپ نے بلوایا ہے نا؟“

”نہیں۔“

”نہیں، کیوں؟“

”تمہارے لیے ایک خبر ہے۔“

”کیا خبر ہے؟“

”نو شاپہ مرچکی ہے۔“

”یہ بہت اچھی خبر ہے، اگر وہ نہ مرنے تو میں اسے مار دیتا۔“ برہان کے لہجے میں ڈھی بھیلے جیسی غراہٹ تھی۔

”تمہارے والد کو کتنا سمجھایا تھا کہ غیر برادری کی لڑکی مت لاؤ، رشتے داری ہم پلہ، برابر حیثیت والوں سے جوڑنی چاہیے، مگر وہ

نہیں مانے، لے آئے بے حیثیت خاندان کی ادنیٰ لڑکی اور آتے ہی دکھادی اس نے اپنی اوقات۔ ایک سال بھی وہ تک نہ کی تھی۔“

”وہ وقت گزر گیا، ہم نے بھی اُس کی من مانی کی پوری پوری سزا دی تھی بلکہ وہ اس قابل نہ تھی کہ اتنے سال ہمارے نام کے

ساتھ عیاشیاں کرتی۔ ہمیں بہت پہلے اس کی ناک چوٹی کاٹ کر نکال پھینکنا چاہیے تھا۔“ نو شاپہ کے ذکر پر وہ اشتعال کا شکار تھے۔

”چھوڑو اس ذکر کو، وہ مرچکی، جس کم جہاں پاک۔ تم نے اسے طلاق دے دی تھی، بہت اچھا کیا۔ ہم تو پہلے کہہ رہے تھے جان

چھڑاؤ اس سے، خیر اب مسئلہ رہ جاتا ہے کرن کا۔ اس نے تربیت ایک غلط عورت کی گود میں پائی ہے تو اسے وہی تربیت ملی ہے جو دی گئی

تھی۔ ہمارے درمیان رہے گی تو بدل جائے گی وہ، اسے یہاں بلواؤ، وہ ہمارا خون ہے اور ہم اپنی زمینیں اور اولاد کسی دان نہیں کرتے۔ کل

رات کی تاریکی سے قبل ہم اسے یہاں اپنے زور و روکینا چاہتے ہیں۔“ اُن کی بارعب آواز میں جھکم پید ہو گیا تھا۔ اسی دم پردے کے پیچھے

سے منال اندر آئی تھی۔

”اوہ ڈیڈی! آپ آگئے، دو دن کا کہہ کر گئے تھے، پورا ہفتہ لگا دیا آپ نے۔“ وہ مسکراتی ہوئی باپ کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

”مشینری میں نے جاتے ہی خرید لی تھی، موسم کی خرابی کے باعث فلائٹ نہیں مل رہی تھی۔“ وہ اس سے خوش گوار انداز میں

مقابہ تھے۔

”اوکے، یہ کس کو گھرانے کی ہاتھیں ہو رہی ہیں؟“

کرن! آپ کی جو میسر سسز، اب سہمہ رہے گی۔“

”سسز! اس ناٹ فنی، میری کوئی بہن نہیں ہے۔“ وہ سخت کبیڈگی سے گویا ہوئی تھی۔

”تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا، اس حقیقت کو تمہیں تسلیم کرنا ہوگا۔“ والدہ حضور سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

”فضول میں، ڈیڈی کی تمام دولت و جائیداد کی میں مالک ہوں۔ میرے علاوہ اس میں کوئی شیئر نہیں کر سکتا۔“

”منال! عہدِ ادب کے دائرے سے باہر مت نکلو۔ والدہ حضور سے بات کرتے ہوئے آپ کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ بچپن سے آج تک ہم نے ان کی ہر بات مانی ہے اور آخری سانس تک مانیں گے۔ آئندہ ایسی بدتمیزی ہم بالکل برداشت نہیں کریں گے۔ سواری کرو دادی حضور سے“۔ منال کا تیز لہجہ باغیاں شاندار زبان کو نہ بھایا تو وہ تنہی لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے۔

”سواری گریڈ مدراسواری ڈیڑی ا مجھے فضا گیا تھا“۔

”اچھا اچھا، ٹھیک ہے جاؤ اب میں عصر کی اذان تک آرام کرنا چاہتی ہوں“۔ وہ چوکی سے اٹھ کر ملحقہ کمرے میں آرام کرنے چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

سننے ہیں اپنے ہی تھے مگر نونے والے

اچھا ہوا میں نے یہ تماشہ نہیں دیکھا

یہ شہر صداقت بھی حجب شہر ہے شہنم

میں نے یہاں ایک شخص بھی سچا نہیں دیکھا

انس نے اسے سعد کی شادی میں زور دینا ہونے والے اس واقعے کی تفصیل بتا دی تھی اور وہ دم بخود سا بیخوارہ گیا تھا۔

”میں اپنی ماں کے قاتلوں سے کوئی واسطہ رکھنا بھی نہیں چاہتی ہوں۔ میری ماں جن سانچوں کو ڈوہہ پلائی رہی، اُن ہی سانچوں نے اسے ڈس لیا“۔ کرن کی بھگی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے وہ کارڈ رائیڈ کر کے گھر آیا تھا اور بے جان قدموں سے اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔ سب گھر والے شادی کی تقریب اینڈ کرنے گئے ہوئے تھے، لہذا گھر میں گہری خاموشی کا راج تھا۔ وہ جوتے اتارے بغیر بیڈ پر اوندھ حالت گیا۔ اس کی رگ رگ میں انگارے سلگ رہے تھے۔ دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا اور دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔

آج اُس پر ایک قیامت گزری تھی، پے در پے ڈکھوں کا شکار ہوا تھا وہ۔ جان سے بڑھ کر چاہنے والی پھپھو کی ابدی جدائی اس کے لیے زبردست شاک تھا۔ اُس دن تو وہ اُن کو ہنستا مسکراتا چھوڑ کر آیا تھا۔ جب وہ وہاں ہی کے لیے اٹھا تھا تو وہ بڑے پیار سے اُسے دوبارہ آنے کی تاکید کرتی رہی تھیں، اس بات سے بے خبر کہ پھر ملنا مقدر میں کہاں تھا۔

”پھپھو..... پھپھو کہاں ڈھونڈوں آپ کو؟ اتنی ڈور چلی گئیں، میں کتنا غلط تھا۔ نہ معلوم کیوں آپ کی موت کی خبر مجھے حواسوں سے بیگانہ کر گئی تھی، یہ احساس ہر شے پر حاوی تھا کہ میں آپ کو اب کبھی نہ ڈھونڈ پاؤں گا، دُنیا کے جھیلوں میں گن لاکھوں، کروڑوں لوگوں کے چہروں میں کبھی مجھے آپ کا چہرہ نظر نہ آئے گا اور میں کیسے جی پاؤں گا؟“ یکنخت ہی وہ اٹھ کر بیٹھا تھا اور شدت سے رونے لگا تھا۔

”میں نے کبھی کرن کو اُس کی زبانی پر بھی کچھ نہیں کہا، اس کا قصہ اس کی کڑوی باتیں، اس کی ہرزادی جیسے کبھی ناگوار نہ گزری



تھی لیکن اس نے جو آپ کے آخری دیدار سے محروم رکھ کر عمر بھر کا زخم دیا ہے، شاید اس زخم کے بھرنے تک میں اسے معاف نہ کر سکوں اور مگر میں رہنے والے پتھر دل لوگوں کو تو کبھی بھی معاف نہیں کروں گا۔“ وہ بکی اُچھال کر جنوبی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا اور وارڈروب سے اپنے کپڑے اور اہم ڈاکومنٹس نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔

دوسرے دن سنڈے تھا۔

رات سب شادی ہال سے لیٹ آئے تھے پھر چھٹی کی وجہ سے سب ہی سو کر دیر سے اُٹھے تھے۔ چھٹی والے دن ناشتہ تینوں بھائی، بیوی، بچوں کے ہمراہ لاگ رووم میں کرتے تھے جس کے لیے وہ تینوں دیورانیوں، جھٹانیاں مل کر خاصا اہتمام کرتی تھیں۔ ابھی وسیع دسترخوان انواع واقسام کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا، دسترخوان کے گرد سب بیٹھ گئے تھے آسہ چائے تھرماں میں بھر کر لائیں تو کمرے میں مزہ کی غیر موجودگی پر صدمہ کو اسے بلانے بھیجا تھا۔

”وہ کہہ رہے ہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔“ صدمہ کا انداز پریشان کن تھا جو وہاں تو کسی نے محسوس نہیں کیا مگر آسہ کی زیرک نگاہوں سے صدمہ کی گوگو کیفیت چھپ نہ سکی تھی۔

”آپ لوگ شروع کریں میں بلا کر لاتی ہوں۔ کھانے پینے کے معاملے میں صدمہ سے لاپرواہ ہے، ذرا اپنی صحت کا خیال نہیں ہے اسے۔“ وہ کبھی ہوئی وہاں سے گئیں تو رخسانہ اور راحیلہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ناشتے کے لوازمات شروع کیے تھے۔

”تم دن بدن تیز رفتہ تیز بھولتے جا رہے ہو، تمہیں معلوم ہے بختے میں ایک دن تمہارے پایا اور چچا سب کے ساتھ ناشتہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی پوری فیملی ان کے ساتھ ہو۔“ وہ آتے ہی برسی تھیں، پیچھے صدمہ بھی چلا آیا تھا۔ مزہ کی حالت نے اُسے بے چین کر دیا تھا۔

”مگر تم ہرگز رتے دن کے ساتھ ہم سے دور ہوتے جا رہے ہو، گویا ہمارا اور تمہارا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ من مانی کی عادت اچھی نہیں ہوتی ہے۔ کسی اور کی نہیں اپنی پھپھو کی ناکام زندگی سے سبق سیکھو، اس کی بھی من مانی کرنے کی عادت.....“

”فارگا ڈیک ماما اب تو ان کا بیچا چھوڑ دیں، قبر کی تاریک گہرائیوں میں پہنچانے کے باوجود آپ لوگوں کو چین نہیں آیا۔“ وہ جو خاموش کھڑا تھا آسہ کو لوشابہ کے خلاف اشارت لیتے ہوئے دیکھ کر چلایا تھا۔

”بھیا! کیا کہہ رہے ہو؟ پھپھو کے لیے ایسے لفظ استعمال کر رہے ہو.....“ صدمہ کی سماعتوں پر گویا بجلی سی گری تھی، وہ ایک حسرت میں اس کے قریب آیا، جبکہ آسہ بھی بکا بکا کھڑی اس کے لفظوں کو سمجھنے کے چکر میں اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

بکھرے بال، سُرخ بے خواب آنکھیں، بڑھی شیواور پُٹھن لباس.....

”پھپھو ہمیں چھوڑ گئیں صدمہ ہم سے اتنی دور چلی گئیں کہ کبھی ہم انہیں دھوٹ ہی نہ پائیں گے۔“ وہ صدمہ سے سینے سے لگا کر رو

پڑا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، تمہیں کیا معلوم وہ کہاں ہے؟ تمہیں کس نے بتایا وہ مر گئی؟“ آبیہ دھیسے و مضطرب آئیز لہجے میں استفسار کر رہی تھیں۔

”یہ کس طرح ہوا بھائی! مجھے یقین نہیں آ رہا، پسپو ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔“

صمد کو بھی مہربان و شفیق پسپو کی جدائی کا گہرا صدمہ ہوا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تو کیا بکواس کر رہا ہے حمزہ؟“ وہ بُری طرح سراپتنگی کا شکار ہو کر گویا ہوئی تھیں۔ ادھر یہاں سے جاتی آوازوں نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ پہلے رخسانہ، پھر راحیلہ اندر داخل ہوئی تھیں، پیچھے اُن کے ذر قون اور مہرون تھیں۔

”خدا یا خیر! کیا ہوا بڑی بھائی، یہ کیا ہو رہا ہے؟“ وہاں کے منظر نے انہیں بدحواس کر دیا تھا۔ وہ گھبرا کر بولی تھیں۔

”یہ حمزہ... کہہ رہا ہے... نوشابہ... مر... گئی...“

”اوہ! کب، کس طرح...؟“ راحیلہ بوکھلا کر بولیں جب کہ ذر قون فوراً یہ خبر پاپ اور چچاؤں کو سنانے کے لیے دوڑی تھی اور پھر آن واحد میں حمزہ کا بیڈروم گھر کے تمام لوگوں سے بھر گیا تھا۔ اس وقت ان کے چہروں سے بے یقینی و تجسس جھلک رہا تھا۔ نگاہیں دگرگوں حالت والے حمزہ پر جمی تھیں۔

”کیا انقدر ناق ہے یہ، کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ عامم کڑے انداز میں حمزہ کو گھورتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔

”وہ مگر چھوڑ کر چلی گئی تھیں، اپنا کوئی پتہ، ٹھکانہ نہیں بتایا تھا پھر آپ کو الہام ہوا ہے یا کوئی خواب میں بتا کر گیا ہے۔“ بھٹکے چچا آصف جو بھوک کے کچے تھے، صبح ہی ایسی بات وہ بھی لوازمات سے بھرے دسترخوان کو چھوڑ کر اُٹھنے پر سخت بد مزاجی کا شکار ہو کر بولے۔

”نہیں، یہ معلوم کرنے کا طریقہ مناسب نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں حمزہ جینا! ایسی بات بغیر کسی ثبوت یا یقین کے نہیں کہہ سکتا۔ نوشی سے اس کی محبت کی انتہا سے سب ہی واقف ہیں۔“ چھوٹے چچا جو دونوں بڑے بھائیوں سے مزاج مختلف رکھتے تھے، بے حد صلح جو ڈی فہم تھے۔ حمزہ کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا تھے۔

”آپ نوشی سے ملتے رہتے تھے؟ آپ اس کے ٹھکانے سے واقف تھے؟ کیسے ہوا یہ سب؟ وہ بہت حوصلہ مند اور صابر تھی، بڑے بڑے طوفانوں کا تنہا مقابلہ کرنے والی۔ ہر ظلم و جبر کو خاموشی سے سنبھالنے والی، ایسی کیا زک پہنچی اسے جو وہ دنیا ہی چھوڑ گئی۔ یقیناً کوئی بڑی تکلیف، کوئی ایسی اذیت جو وہ برداشت نہ کر سکی، کیا ہوا ہے حمزہ! مجھے بتاؤ۔“

”یہ مجھ سے زیادہ اچھی طرح سے ان خواتین کو معلوم ہے، ان سے پوچھئے۔“ وہ ان تینوں کے سفید پڑے چہروں کو ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا گویا ہوا تو اپنی جانب سب کی نگاہوں کا رخ دیکھ کر اس بُری طرح بوکھلائی کہ سچ از خود ہی ان کے منہ سے نکلنے لگا۔

”یہ سب بڑی بھائی اور آبیہ بھائی نے کیا ہے، میرا کوئی قصور نہیں ہے، میں تو اس دن گھر میں نہیں تھی جس دن برہان لغاری نوشابہ اور کرن کو لینے آئے تھے۔“ راجیہ نے عامر کی خشکیوں لگا ہی خود پر محسوس کر کے تیزی سے کہا تھا۔

”کیا..... برہان بخاری یہاں آئے تھے؟ کرن اور نوشاہہ کو لینے مگر کب؟ اور ہمیں کیوں ان کی آمد سے بے خبر رکھا گیا؟“ عامم بے یقینی سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے گرجے تھے۔

”وو..... وو..... وو آسیر! تم کہو نا“۔ رخسانہ جو اُن میں سب سے زیادہ حاضر دماغ، چالاک و فتنہ پرور تھیں، اس وقت اُن کی مکاریوں و چال بازیوں نے بالکل ساتھ چھوڑ کر انہیں بے دست و پا کر دیا تھا۔ دوسروں کو مزے سے فساد و فتنے کا درس دینے والی کو کوئی راہ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔

”میں کیا کہوں، آپ نے کچھ کہنے کے قابل چھوڑا ہی کہاں ہے۔ یہ آپ کا کیا دھرا ہے، میں تو ڈر کے مارے آپ کی باتوں میں آگئی کہ حکمرانی گھر میں آپ کی چلتی ہے، اگر ساتھ نہ دیا تو وہی مثال ہو جائے گی کہ دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیڑ۔“ راحیلہ کو آنسو بہاتے دیکھ کر وہ بھی رونے لگی تھیں۔ آنسو بہانے میں انہیں دشواری کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا تھا کہ جو کہا تھا اس کا پول اس طرح اُن کے سامنے ہی کھل جائے گا جن سے وہ چھپاتی رہی تھیں، کس کس طرح لگائی بھائی سے انہوں نے ان بھائیوں کے دل سے بہن و بھانجی کی محبت نکال چکی تھی، اب وہی بازی جسے وہ جیت بچھ رہی تھیں، شکست بن کر اُن پر اُلٹی تھی تو خود کو بچانے کے لیے وہ ایک دوسرے پر ہی الزام توپ رہی تھیں۔

”اوہ، تم دونوں تو بڑی ڈودھ کی ڈھلی ہو، مجھ پر الزام لگا کر بکھتی ہو ج جاؤ گی۔ ہرگز میں ایسا نہیں ہونے دوں گی“۔ رخسانہ غصے سے چیخی تھیں۔ اسی لمحے عامم صاحب نے آگے بڑھ کر پے در پے تپشروں سے اُن کا چہرہ لال کر دیا تھا۔ عامر اور آصف نے مشکل سے انہیں چکڑ کر ڈور کیا تھا۔

”بھائی جان! خود کو سنبھالے، یہ وقت ان ناخبر عورتوں سے غصے کا نہیں ہے، پہلے پوری تفصیل معلوم کریں، ان کا فیصلہ بعد میں ہوگا“۔ آصف اپنی بیوی راحیلہ پر قہر آلود نگاہ ڈال کر گویا ہوئے۔

مزہ نے ان سے پہلی ملاقات پھر کل کرن اور پھر اُس سے ہونے والی تمام گفتگو حرف بہ حرف دہرا دی تھی۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا تھا۔

تینوں بھائیوں کے چہروں پر رنج و اَلَم کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ انہیں آج اپنی ایک ایک لفظی، ایک ایک کوتاہی کا احساس ہو رہا تھا۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن جو چھوٹی ہونے کے ناتے، تینوں کی بے حد لاڈلی تھی، آنکھ کا تار تھی، شادی سے قبل وہی مرکز نگاہ تھی، مگر میں داخل ہونے کے بعد اُن کی نگاہوں کا محور وہی ہوتی تھی۔

عامم اس کے لیے چالکیٹ اور فروٹ لانا نہیں بھولتے تھے تو آصف کا روز کا معمول تقاریر کو کھانے کے بعد اسے آکس کریم کھلانے لے کر جانا اور عامر اُس کے لیے رنگ برنگے ربین، اسٹوری بکس اور گلر خٹسلو پابندی سے لاتا تھا اور وہ بھی اُن پر جان چڑھتی تھی، عامم کو چائے پینے کی عادت تھی، ہر بار وہ بغیر کہے اسٹرونگ چائے کا گ بڑی محبت سے اُنہیں تھماتی تھی۔

آصف کو ڈر بیگ کا بڑا شوق تھا، اُن کے تمام کپڑے وہی پریس کرتی تھی۔ عامر کی بکھری ہوئی چیزوں و پھیلے ہوئے کمرے کو

سنوار نے کاہنہ صرف وہی جانتی تھی۔ بے حد مستعدی و چستی، پھرتی اس میں موجود تھی۔ اُن تینوں کے ساتھ ساتھ وہ اماں ابا اور گھر کا خیال بڑی نفاست سے رکھتی تھی۔ اس کی شادی پر تینوں بھائیوں کی آنکھیں نم تھیں۔

شادی کے بعد برہان کارویہ اور ساس کی بے جا تنقید و جھگڑوں نے انہیں پریشان کر ڈالا۔ وہ تینوں ہی نوشاہ کو وہاں چھوڑنے پر راضی نہ تھے مگر ابا کا داؤد، خاندان والوں کی مداخلت پر وہ بمشکل نوشاہ کو وہاں چھوڑنے پر راضی ہوئے تھے کہ کرن کی پیدائش پر جب زندگی ان لوگوں نے ان پر بالکل ہی تنگ کر دی تو عام خود جا کر اسے لے آئے تھے اور کہہ آئے تھے کہ اگر برہان کو بیٹی اور بیوی کے حقوق کی پاسداری کا احساس ہو جائے تو اسے آکر لے جائیں، اب نوشاہ باخود یہاں نہیں آئے گی۔ وہ بین و بھانجی کو گھر لے آئے تھے، بہت مان و پیار سے رکھا تھا۔

پھر نہ معلوم کیا ہوا۔

کیسا وقت بد لاقا جو ان کی نگاہیں، احساسات و جذبات بھی بدل گئے تھے۔ کاروباری مصروفیات از حد بڑھتی چلی گئیں، تینوں بھائیوں نے بچوں اور بیویوں کی ناز برداریوں میں سب کچھ فراموش کر ڈالا تھا۔

”وہ بچپن سے میری ہر بات پر عمل کرتی تھی، دیکھو مرتے مرتے بھی اسی تابعداری کا مظاہرہ کر کے گئی ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ ہمارے لیے مر گئی، ہم اُس کے لیے۔ کبھی شکل مت دکھانا تو اُس نے وہی کیا۔ آخری دیدار سے ہمیں محروم رکھا، ہمارا کاندھا تک لینا گوارا نہ کیا۔“ عام بے ساختہ رو پڑے تھے۔ عامر اور آصف ان کے بازوؤں سے لپٹ گئے تھے۔

”ہمارے گلشن میں محبت و چاہت کے پھول کھلتے تھے، پنجھی خوشیوں کے گیت گاتے تھے، ہر سو یگانگت و مروت کی خوشبوئیں مہکتی تھیں..... نظرتوں و بے گانگی کے بھول ان حاسد عورتوں نے بوئے اور اس قدر صفائی و مہارت سے جو ہماری آنکھوں میں، ہمارے دلوں میں بیوست ہو گئے اور ہم محسوس بھی نہ کر سکے۔“ جانے والی جا چکی تھی، جس محبت و اپنائیت کو وہ ترستی چلی گئی وہ اب اُس کے جانے کے بعد بیدار ہوئی بھی تو بے مصرف تھی۔ کل جن اپنوں نے اُس بد نصیب عورت کو خون کے آنسو ڈالا یا تھا، آج وہ اُسے یاد کر کے رو رہے تھے۔

لیکن پانی کی بیاس تشنگی بروقت ضرورت پوری نہ ہو تو بے مصرف ہے۔ وہ محبت و خلوص کے چند قطرہوں کو ترستی بیاسی چلی گئی تھی، اب اُن کا ہر انسوس، ہر آہ بے کار تھی۔

☆.....☆.....☆

سدا اور قاریا سے لینے آئے تھے۔

کھانے کے بعد وہ مڈ صاحب کی معیت میں لیونگ روم میں بیٹھے تھے، اُس بھی موجود تھا۔ گریٹی اپنی وہیل چیئر پر وہاں تھیں۔ مڈ صاحب کارویہ اقل روز سے ہی اُس کے ساتھ بہت مشفقانہ و نرم رہا تھا، اس واقعے کے بعد وہ بہت زیادہ اُس کا خیال رکھنے لگے تھے۔ اُن ہی کے اصرار پر وہ یہاں رہ رہی تھی۔ سروٹ کو ارڈر پر تالا لگا دیا گیا تھا۔

”گر بی انوشاہ آئی نے مجھے بیٹا بنایا تھا، میں جو رشتوں کے معاملے میں بالکل تلاش تھا، اُن جیسی فرشتہ صفت عورت کو میں نے دل و جان سے ماں کے درجے پر فائز کیا تھا، وہ میری توقعات سے بڑھ کر باسروت و بے خلوص ثابت ہوئی تھیں۔“ سعد جیسے اعزاز میں کہہ رہا تھا اور ماں کے ذکر پر کرن ہونٹ بھیج کر آنسو ضبط کر رہی تھی۔

”اُن کے بھائی ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا ہے کرن کی ذمہ داری بھانا، میں اسے گمراہے جانا چاہتا ہوں۔“  
 ”کرن کو یہاں کیا تکلیف ہے، یہ یہاں رہ سکتی ہے۔“ گر بی پولیس۔

”گستاخی معاف گر بی! دراصل بات یہ ہے کرن یہاں جا ب کرتی ہے، میں بہت پہلے انہیں یہاں سے لے جانا چاہتا تھا مگر جب مسئلہ تقان کی خودداری اور میرا اتھا ہونا، اب فار یہ گمراہے ہے، کوئی اپنی گری ہوئی سوچوں پر عمل بڑھانہ ہو سکے گا۔ میں اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔

”تم کچھ دنوں کے لیے اسے لے جا سکتے ہو۔“ اس کی کھلی وضاحت کے باوجود گر بی سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔  
 سعد نے اُلجھن آمیز نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھا تھا، جو اب اُس نے اس اعزاز میں شانے اُچکائے تھے، گویا کہہ رہا ہو، ”میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

”سعد بیٹے! ماما کی کرن سے محبت اپنی جگہ مگر اصل فیصلہ کرن کو کرنا ہے، یہ باشعور ہے، فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کو اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار ہے۔“ مڈر صاحب نے گمبیر ماحول میں گفتگو سے کہا تھا۔  
 ”کرن! اکل کی بات درست ہے، فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔“ فار یہ نے کہا۔

”رشتوں کے جو کروہ چہرے میں نے دیکھے ہیں اگر آپ سب لوگوں کی بے غرض اور بے لوث مہربانیاں ہم پر وارد نہ ہوتیں تو انسانیت پر سے ہی میرا یقین محض ہو چکا ہوتا، سعد بھائی نے اُس وقت سہارا نہ دیا ہوتا تو نہ معلوم ہمارے ساتھ کیا ہوتا، پھر یہاں کے لوگوں کی مہربانیوں کو بھی میں بھلا نہیں سکتی۔ سعد بھائی! میں آپ کے جذبوں اور خلوص کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ کو رشتوں کا مان رکھنا آتا ہے، مجھے فخر ہے ایسے بھائی کو پانے پر، مگر میں گر بی کی خدمت سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ مجھے ماں کی خدمت کا موقع نمل سکا، وہ حسرت میں گر بی کی خدمت کر کے پوری کروں گی۔“

اُس نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا تھا جس کے لہجے کی صداقت نے اُسے متاثر کیا تھا۔ گر بی کے لیے اُس کی خدمت و توجہ کو وہ پہلے فراڈ اور ڈرامہ سمجھتا تھا، پھر آہستہ آہستہ اُس کے سامنے آ گیا تھا اور اب جبکہ وہ گر بی جیسی پل پل موڈ بدلتی پیار و پابج کے وجود سے جان چھڑانے کا بہترین موقع ضائع کر رہی تھی تو یاس کی اعلیٰ تربیت و بہترین حسن سلوک کی اعلیٰ نشانی تھی۔

سعد اور فار یہ چلے گئے تھے۔ وہ گر بی کی چیز دھکیلتی ہوئی کمرے میں لے آئی اور بیڈ پر لیٹنے میں اُن کی مدد کرنے لگی۔ اُن کے بیڈ پر لیٹنے کے بعد وہ وہیل چیئر اسٹوروم میں رکھ کر نکل رہی تھی، جب اس نے شو کو اپنی جانب آتے دیکھا تھا۔

”بڑے صاحبِ بلا رہے ہیں۔“ اس نے اطلاع دی تھی، وہ ان کے روم کی طرف چلی آئی تھی۔ دروازے پر ناک کر کے اندر چلی گئی تھی۔

”آئیں کرن! یہاں بیٹھیں۔“ وہ صوفے پر بیٹھے تھے اور دوسرے صوفے کی طرف اشارہ کر کے مخاطب ہوئے تھے۔ وہ بیٹھتی تھی، ایک طرف منگول صوفے پر اس بھی بیٹھا ہوا تھا اور دونوں باپ بیٹے کے چہروں پر غیر معمولی سنجیدگی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

”آپ نے مجھے بلایا ہے سہرا“ اس نے ٹنگ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپ کے فادر کی کال آئی تھی، وہ آپ کو یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں۔“ مڈر بلا کسی تمہید کے گویا ہوئے تھے۔

”آپ نے کیا کہا؟“ اس کے اندر سلگتی آگ باپ کے نام سے بھڑک اٹھی تھی، جو باپ کی پہلی نفرت بھری نگاہوں نے لگائی تھی۔

”کال میرے سیکرٹری کے پاس آئی تھی، انہوں نے میج بھٹک کو بے کیا ہے، وہ چند لمحوں بعد کال بیک کریں گے، آپ جو فیصلہ کریں، بتا دیجئے گا۔ آپ اپنا فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں، کسی بھی قسم کا دباؤ اور لحاظ و احسان مندی کا آپ خیال نہیں کریں گی، کیونکہ آپ آزاد ہیں، بہت سوچ کر فیصلے کیجئے گا، کیونکہ برہان لغاری کی بیٹی کی حیثیت سے اب آپ یہاں ہیں۔“

”میں ایسے آدمی کو باپ کا درجہ نہیں دے سکتی جس نے میں، بائیس سال بیٹی کی پروا نہ کی، اپنی ماں کا فیصلہ میں اللہ پر چھوڑ چکی ہوں، پہلی ملاقات میں ہی جس شخص نے اس کی خوشیوں کے گلستان میں آگ لگا دی ہو، پیار، محبت، مان و فخر کی جگہ الزام و بہتان کے ٹنڈروں سے زخم زخم کر دیا ہو، ایسے شقی القلب، عالم و بے حس شخص کو میں باپ ہی نہیں مانتی تو ان کے ساتھ جانے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتی، نہیں جاؤں گی۔“ اس کا فیصلہ اٹل تھا، لہجے میں پتھری سی سختی اور چہرے پر غم تھا۔

”آپ کے نہ ماننے سے اس شخص کی حیثیت بدل نہیں جائے گی، آپ کے برعکس سرٹیفکیٹ پر یہ حیثیت فادر ان کا نام ہوگا، ہمارے کلچر میں بیٹے باپ کے نام سے آئینڈنی فائی کیے جاتے ہیں، ان کو لے گئی سپورٹ حاصل ہوگی، اگر وہ آپ کو ساتھ لے جانا چاہیں تو..... بہت سوچ کر فیصلہ کریں۔“ انہوں نے سمجھایا تھا۔

”میں ان کے ساتھ کسی قیمت پر نہیں جاؤں گی، وہ باپ نہیں میری ماں کے قاتل ہیں۔ ان کے نام سے ماسوائے محرومیوں، ذلت و کمپرسی کی زندگی کے علاوہ کیا ملا ہے۔ آخر میں انہوں نے مجھے میری جنت سے ہی محروم کر دیا۔“ وہ ضبط کرنے کے باوجود رو پڑی تھی۔

”میں اس چہرے کو دیکھنا نہیں چاہتی جس چہرے پر میری ماں کا خون نظر آئے گا۔“

”آپ روئیں مت، خود کو تہمت سمجھیں۔ اگر آپ وہاں جانا نہیں چاہتیں تو یہاں سے کوئی آپ کو مجبور نہیں کرے گا۔“ مڈر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوئے۔

”ڈیری! آپ برہان لغاری کے چیلنج کو قبول گئے ہیں، آپ بخوبی جانتے ہیں، وہ خود کو ”بگ مین“ اٹھانے کرنے کے لیے کس حد تک جا سکتے ہیں۔“

”میں یہاں نہیں رہوں گی، کہیں اور چلی جاؤں گی۔ میری وجہ سے آپ کسی پرالیم میں پڑیں، میں گوارا نہیں کر سکتی گی۔“ وہ کھڑی ہو کر بولی۔

”آپ بیٹیں رہیں گی، کچھ نہیں ہوگا، خوب اچھی طرح نمٹنا جانتا ہوں ایسے لوگوں سے۔ پہلے میں نے شکست کھائی تھی تو صرف آپ کی وجہ سے، آپ کی محبت اور جذبات کی وجہ سے، ورنہ تمہارا باپ نہ جب کزور تھا، نہ آج کزور ہے۔“

قلیل اس کے کہ ان میں مزید گفتگو ہوتی، موبائل فون سے آئی آپ نے انہیں خاموش کر دیا تھا، وہ دونوں باپ بیٹے کمرے سے نکل گئے۔ اُس نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھالیا تھا۔

”ذرا نیو رکازئی لے کر آ رہا ہے فوراً آ جاؤ، میں نہیں چاہتا میرے دشمن کے ہاں تم ایک لمحہ بھی مزید گزارو۔“ دوسری جانب سے بھاری اور محکم بھری آواز سنائی دی۔

”آپ کون ہوتے ہیں مجھے یہ حکم دینے والے اور یہ کیسے سوچ لیا کہ آپ بلائیں گے اور میں آ جاؤں گی؟“ وہ نفرت بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

”وہاٹ..... دماغ ڈرست ہے تمہارا..... کس سے بات کر رہی ہو، معلوم نہیں ہے تمہیں؟“ دوسری جانب سے پوری طاقت سے چیخ کر کہا گیا تھا۔ آواز میں ایسی دھمک تھی کہ اُسے اپنی سماعتوں میں سنساٹ دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔

”بہت اچھی طرح معلوم ہے۔“ وہ ذرا مرعوب نہ ہوئی تھی۔

”ہوں..... جانتا ہوں ناگن کا ڈوڈھ پیا ہے تم نے، زہری آگلوگی۔“

”میری ماں کے ڈوڈھ میں شہد تھا، یہ کڑواہٹ آپ کے خون کے زہر کی ہے۔“

”ہوں..... ہوں، بہت زبان دراز ہو، بہت گھمنڈی، اُس عورت کی طرح جس کو ہم اپنے جوتوں کی خاک سے زیادہ کم تر سمجھتے تھے۔“

”خود کو سب سے اعلیٰ دارفج سمجھنے والے، ایک دن منہ کے بل گرے خاک چائے نظر آتے ہیں۔ آپ کے بھی وہ دن دور نہیں ہیں۔“

”یا..... س..... خاموش، میرے دشمنوں میں رہ کر دشمنوں کی ہی زبان بولوگی۔ قصور تمہارا بھی نہیں ہے۔“ اس طرف جیسے خود کو

سنبا لایا گیا تھا۔ آگ اُٹھتا لہجہ ایک دم ہی پھواری برسانے لگا تھا۔

”نہ معلوم فحسے میں کیا کیا کہہ گیا ہوں، سو رہی۔ میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے ترس رہا ہوں۔ پہلے اس عورت نے پہرے

لگائے تھے، اب میرے دشمنوں میں پھنس کر تم اپنے باپ سے بدظن ہو رہی ہو۔“ اُن کے لہجے میں حیرت انگیز نرمی و محبت آگئی تھی، اگر وہ ان کے اصل چہرے سے آگاہ نہ ہوتی تو لمحہ بھر یہاں نہ ڈکٹی مگر اب اُسے اُن سے کراہت آ رہی تھی۔

”باپ ہونے کے ناتے میں تمہاری فیلتگو سمجھ رہا ہوں اور نہ چاہتے ہوئے بھی صرف ایک دن دے رہا ہوں آپ کو وہاں

گزارنے کا، اُن لوگوں سے ہوشیار رہنا، بہت خطرناک ہیں وہ، میری وجہ سے تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”شکر یہ انعام کرنے کا“۔ اُس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”کل شام ڈرائیور آئے گا، سیدھی چلی آنا“۔ رابطہ ختم ہو چکا تھا۔

”اُس نے سوبائیکل ٹیکسلی پر رکھا، کمرے سے باہر نکل آئی۔ مڈر صاحب اور اُس اپنے بیڈروومز میں جا چکے تھے۔ وہ گرنی کے

کمرے میں آئی۔ نیلگوں ڈم لائٹ میں گرنی بے خبر سو رہی تھیں، وہ والپس باہر آ گئی۔

”اُس صاحب نے چائے مانگی تھی، میں نے دو کپ بنا لیے ہیں“۔ شو چائے کاگ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

”شکر یہ شو بہت خیال رکھتی ہو میرا“۔ وہگ لے کر سی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

جب سے اُن پر انکشاف ہوا تھا کہ کرن بڑے باپ کی بیٹی ہے، وہ دونوں ماں بیٹی اور دوسرے ملازم اُس کی مالکوں کی طرح

عزت کرنے لگے۔ وہ سب اُن تکلیف دہ باتوں سے ناواقف تھے جو اُن کے درمیان ہوئی تھیں۔ شو اور چندا اُس کا بہت خیال رکھنے لگی

تھیں۔ شو اکثر ملازموں سے یہ جملے ذہرائی نظر آتی تھی۔

”میں تو پہلے کبھی تھی، وہ اونچے گھرانے کی لگتی ہیں، وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ کوئی مجبوری انہیں لے کر یہاں آئی تھی، وہ ہم میں

سے لگتی نہیں۔“

چندا ماں کی ہاں میں ہاں ملائی نخرے۔

”وہ..... ایک بات کہنی ہے آپ سے“۔ شو بچی انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔

”ہاں..... کہو کیا بات ہے؟“ کرن چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔

”موقع تو نہیں ہے، دل بھی نہیں مانتا مگر وہ لوگ نہیں مان رہے۔“

”کون لوگ؟ تم کس کی بات کر رہی ہو؟“ کرن اس کی گفتگو پر ابھی تھی۔

”چندا کے سسرال والے، وہ کہتے ہیں شگن کریں گے، انگوٹھی پہنائیں گے، میں نے منع کر دیا کہ ہمارے مالکوں کے غم میں ہم

خوشیاں مناتے اچھے نہیں لگیں گے۔ پر وہ کہتے ہیں اسی بننے کے اندر اندر منگنی نہ کی تو وہ اپنے بیٹے کا رشتہ کہیں اور ڈال دیں گے۔ انہیں

لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور سچ کہتے ہیں اس دور میں اچھے نہ کہاں ہر کسی کو ملتے ہیں، لڑکیاں انتظار میں عمر گنوا رہی ہیں۔“

”تم کیوں منع کر رہی ہو اُن کو، لڑکا تمہارے معیار پر پورا اترتا ہے ہے بلاؤ اُن لوگوں کو، کیوں منع کر رہی ہو؟“

”یہاں ڈکھ.....“

”خوشی اور ڈکھ، زندگی اور موت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کوئی کسی کے لیے نہیں رکتا۔ تم بلاؤ اُن لوگوں کو، ہمیں خوشی ہوگی۔“ شو کے

چہرے پر اطمینان جما کھینے لگا تھا۔

”لڑکا کیا کام کرتا ہے؟ کچھ پڑھا لکھا ہے؟“ کرن نے چائے پی کر کھالی کر کے ٹیکسلی پر رکھتے ہوئے پوچھا۔



”ہاں جی، غلط لکھ لیتا ہے، اخبار پڑھ لیتا ہے۔ دودھ، دہی کی دکان ہے اُن کی، لوگ بھی تھوڑے ہیں، ہنڈیاں اپنے گھر کی ہو گئیں، دیور، جینٹھ کوئی ہے نہیں، صرف ساس سر ہیں، ہمیشہ کرے گی اکلوتی بہو بین کر چندا“۔ شمو کے سانولے چہرے پر پھیلتی ممتا کی چمک۔ اُس کے اندر برقی بین کر لہرائی تھی اور ہوک اٹھی تھی، وہ اس ممتا سے محروم ہو چکی ہے۔ ماں کی قدر وہ جانتے ہیں جو اس نایاب رشتے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انسانی رشتے ہوں یا بے جان چیزیں، وہ ہماری دسترس میں ہوں تو اپنی قدر و منزلت کھوٹا دیتی ہیں اور جب وہ کھو جاتی ہیں، پھٹ جاتی ہیں تو ہمیں اپنی بے پروائی اور بے حسی پر غصہ آتا ہے، ملال ہوتا ہے اور ہم سوچتے ہیں کاش کسی طرح وہ ہمیں واپس مل جائیں تو کبھی ہم انہیں لگا ہوں سے اُدھل نہ ہونے دیں، لیکن ایسا کب ہوا ہے کہ جانے والے پلٹ کر آگئے ہوں، کھونے والے لٹ گئے ہوں.....

ماں کی یاد و روین کر دل میں جاگی تھی۔

دل کا درد آنسو میں کراٹھوں میں ابھرنے لگا تھا۔ شمو کیا کہہ رہی تھی؟ اُسے کچھ سنائی نہ دے ہاتھ، ماضی کی قلم لگا ہوں میں چلنے لگی تھی۔

وہ شمو کو وہیں چھوڑ کر باہر لاؤنج میں نکل آئی تھی اور یوگن ویلیا کے ستون سے ٹیک لگا کر گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

اُس نے کون سا ماں کو شکہ دیا تھا، بچپن سے جلاتی آئی تھی۔ باپ کو کھوجنے کے جنون میں وہ ماں کو قصور وار ٹھہراتی رہی تھی، یہاں

آنے کے بعد اُن میں ڈوری ختم ہوئی تھی، محبت بڑھی تھی۔ ماں اپنی ممتا کے خزانے شروع سے ہی اُس پر بھجاؤ کر رہی تھی، اُن کی قدر اُسے

یہاں آ کر ہوئی تھی، ابھی وہ جی بھر کر ممتا کے خزانے سمیٹ بھی نہ پائی تھی کہ اُن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پھٹنا پڑا تھا۔ اُس کی بے چین

لگا ہیں ہر سست اُن کو ڈھونڈتی تھیں اور کہیں ڈور سے صدا اُبھرتی تھی۔

زندگی سے ہار مانی اور لہجہ میں کھو گئے

خاک کا نکیہ بنایا اور سکوں سے سو گئے

ایک بھگی آئی اور سامان و نیالت گیا

دیکھتے دیکھتے ہی برسوں کا ساتھ ٹھٹ گیا

کس قدر تم کو پکارا، کس قدر آواز دی

تم مگر خاموش تھے، میری ہی بس آواز تھی

ایسا لگتا ہے جیسے ساتھ رہے ہی نہ تھے

اس طرح زخمت ہوئے جیسے کہ جانتے ہی نہ تھے

کوئی سرگوشی، کوئی آواز آتی ہی نہیں

کیا ہماری بھی کوئی آواز جاتی ہی نہیں

☆.....☆.....☆

منال، برہان لغاری کی بیٹی تھی جو ان کی پہلی بیوی سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کی پہلی شادی نو میرج تھی۔ منال کی پیدائش سے قبل برہان اور فائقہ میں بے حد محبت اور رابطہ راسخینڈنگ تھی، وہ ایک جاں دو قالب تھے۔ برہان لغاری نے اپنی تمام وفائیں ان کے لیے وقف کر دی تھیں۔ دل و جان سے چاہا تھا منال کی پیدائش کے بعد ان میں آہستہ آہستہ ہونے والے ٹھنڈے واخلاقات نے شدت اختیار کر لی تھی۔ فائقہ کے بعد وہ کسی عورت کو اس کا اصل مقام نہ دے سکے تھے۔ بے شمار عورتیں ان کی زندگی میں آئیں جو لہجوں کی ساتھی بنیں، زیت کی ساتھی نہ بن پائی تھیں۔ وہ ایسے کسی ساتھی کے تمنائی بھی نہ رہے تھے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ عیش و عشرت میں گم ہو کر وہ اپنے بعد دولت و جائیداد، خاندانی حسب و نسب کو زندہ رکھنے والے وارث کی ضرورت کو بھول چکے تھے مگر ان کے والد ہارون لغاری اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے لگے تھے اور ان کی کوششوں سے نوشاہہ دوسری بیوی بن کر ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھیں۔ برہان لغاری نے انہیں دل سے قبول نہ کیا تھا، اگر ہارون لغاری عاق کرنے کی دھمکی ان کو نہ دیتے تو وہ کبھی بھی اس زنجیر کو بھروں میں نہ باندھتے، وہ کئی کئی، پھول پھول منڈلانے والے لہنورے بن چکے تھے۔ ایک ڈال پر قناعت کیونکر ممکن ہوتی۔

نوشاہہ کے نو خیز حسن و شاداب کے پیکر نے انہیں کچھ عرصے کے لیے سحر زدہ ضرور کیا تھا مگر ساری حیات کے لیے اسیر نہ کر پایا تھا۔ چند ماہ نوشاہہ کے ساتھ گزار کر وہ برنس کے سلسلے میں بیرون ملک گئے، واپسی میں کئی دوستیاں ساتھ لگا کر لائے تھے۔ نوشاہہ کے ساتھ گزرے دنوں کا شمار بھاپ بن کر اڑ چکا تھا۔ وہ ان کے لیے پُرکشش نہ رہی تھیں۔ ان کی بے گانگی و سرد مہری بڑھتی ہی گئی، پھر ایک جگہ رہتے ہوئے انہوں نے لائقیتی اختیار کر لی تھی اور ایسا کرنے میں ان کی ماں کی سازش تھی۔ ساس، بہو کی ازلی چپقلش نے غریبوں کی جھونپڑی سے امیروں کے گھلوں تک رسائی حاصل کر رکھی ہے، کسی نہ کسی دو عورتوں کے درمیان یہ نفرت و بغض کی دیوار حائل رکھتی ہے، یہاں بھی برہان لغاری کی والدہ رقیہ بیگم کو یہ بات ہضم نہ ہو رہی تھی کہ ان کی بہو ان کی ہم پلہ، ہم جوڑ نہیں ہے۔ وہ اپنے سے کم امیر و کم حیثیت بہو کو قبول نہ کر پائیں اور انہوں نے برہان کے فضول کان بھرنے شروع کر دیے تھے۔ ہارون لغاری نے بیٹے کے بگڑے چال چلن دیکھ کر اپنے سے کم حیثیت لوگوں میں سے بہولانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ ایسے گھرانے کی لڑکیاں ہر حال میں ایڈجسٹ ہو جاتی ہیں۔ سب جان کر بھی اپنی اور خاندان کی عزت کی خاطر خاموشی سے گزارا کرتی ہیں۔ ان کی مصلحت کامیاب ثابت بھی ہوئی تھی، کرن کی پیدائش سے قبل ان کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کے بعد رقیہ کو من مانی کرنے کا پورا پورا موقع مل گیا تھا۔

کرن کی پیدائش پر جو ایک آس و امید کی ڈور بندھی تھی، پوتا ہونے کی وہ ٹوٹ گئی تو ان ماں بیٹی کا وجود ٹھوکروں میں آ گیا تھا، جو وہ چاہتی تھیں وہی ہوا۔ نوشاہہ کرن کو لے کر چلی گئیں۔ انہوں نے کبھی انہیں واپس لانے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی۔

منال نے اس خوب صورت و وسیع و عریض حویلی میں شروع سے اپنی حکومت دیکھی تھی۔ یہاں کی ہر شے پر اس کی اجارہ داری تھی۔ ملازم ہاتھ باندھے اس کے آگے پیچھے رہتے تھے، وہ جو چاہتی وہی کرتی تھی۔ برہان لغاری اس سے کوئی باز پرس کرتے نہ تھے، رقیہ بیگم بھی اس کی گستاخانہ بدگمانی فطرت کے باعث زیادہ فری نہیں تھیں۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

اس احساس سے وہ ہر وقت مرشار رہتی تھی کہ اپنے باپ کی وسیع جائیداد کی وہ اکلوتی وارث ہے، اس کے سوا کوئی شراکت دار نہ تھا اور جب یہ احساس یقین کی منزلوں سے گزر کر مستحکم ہو گیا تو اچانک ہی اُس کی ملکیت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے اُس کو لایا جا رہا تھا جس کے وجود کو وہ بھول چکی تھی۔ کل سے آج تک وہ کانٹوں پر چلتی رہی تھی۔ کسی پل، کسی لمحے سکون نہیں ملا تھا۔ باپ کے تیور وہ دیکھ چکی تھی، وادی سے کوئی بات شیئر نہ کرنا وہ اپنی توہین سمجھتی تھی۔ کوئی فریڈا اتنی کلون نہ تھی جس سے اتنی اہم بات ڈسکس کی جاتی۔ اس کے پاس فقط ایک سہارا تھا قفقہ کا، جو اُس سے دُور رہ کر بھی ہمیشہ نزدیک رہی تھیں، لیکن کل سے وہ بھی فون ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔

وہ ابھی اسی سوچ میں گم تھی کہ کس طرح ماما سے رابطہ کرے کہ ایسے حالات میں وہی گائیڈ کر سکتی تھیں۔ فون کی تیل ہوئی تھی، اسکرین پر چمکتے نمبرز دیکھ اُس نے پھرتی سے فون اٹھایا تھا۔

”ہیلو ماما کہاں ہیں آپ؟ میں کل سے ریگ کر رہی ہوں آپ کو اور آپ مل ہی نہیں رہی ہیں، کتنی پریشان ہوں، آپ مل نہیں کر سکتی ہیں۔“

”ریلیکس..... ریلیکس مائی بے بی! پہلے میری بات سنو، میں سٹوڈے کو مائنسٹر چلی گئی تھی، آج واپس آئی ہوں۔ میج ریکارڈ میں آپ کے نمبرز دیکھ کر میں نے ڈائریکٹ کال کی ہے۔“

ماما کی بڑے اعتماداً وازن کر اُس کے کشیدہ اعصاب بڑے سکون ہونے لگے تھے۔

”ہوں، اب بتاؤ، کیا ہوا ہے ایسا جس نے آپ کو اتنا ڈسٹرب کیا کہ آپ نے کل سے اب تک فونٹی سے زائد کالز کی ہیں؟“

”ماما! پاپا نے اپنی سکیڈوائف کو ڈائریس دے دی ہے۔“

”ڈیٹی طور پر وہ اُسے بہت پہلے چھوڑ چکا تھا۔“ اُن کی مسکراتی آواز ابھری۔

”آپ کو حیرت نہیں ہوئی ماما؟“

”یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے، مجھے معلوم تھا یہی ہوگا۔ وہ جو ایک شخص ہے برہان لغاری نام کا، اُس کی رگ رگ سے میں واقف

ہوں۔“

”وہ کرن کو یہاں لار ہے ہیں، کرن مائی اسٹیپ سسٹر۔ میں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا وہ میری جائیداد میں پارٹنر نہیں بن سکتی تو

پہلی بار پاپا نے بھی مجھے اگنور کیا اور گریڈ مارنے بھی ڈانٹا۔ مجھے فوراً ہی اُن سے ایکسکیوژ کرنا پڑا تھا۔“

”یہ کیا اسٹوڈنٹ حرکت کی ہے تم نے ضرورت کیا پڑ گئی تھی تمہیں ایسی چیپ حرکت کرنے کی۔“ اُس کے لہجے میں ناگواری دور آئی تھی۔

”آپ ہی تو کہتی ہیں ماما! یہ سب میرا ہے، پھر کیوں شیئر کر رہی ہیں مجھے۔“ قافقہ کا سخت لہجہ اُسے بالکل نہ بھنایا تھا، وہ غصے میں بولی۔

”میری باتوں کو مائنڈ مت کیا کرو، جو کہتی ہوں تمہارے بھلے کو کہتی ہوں۔ کانٹا اتج سے گائیڈ کر رہی ہوں، میری ہی گائیڈنٹس

کی وجہ سے آپ پر اپنی کی مالک ہو، ورنہ اُس اولڈ وومن نے کیا کیا حرکتیں نہ کی تھیں۔ تمہرا اسٹیپ مددگار اُس کے ذریعے اسٹیپ برادر کو

لانے کی، ایسا ہوتا تو کس کے پاس جاتی پراپٹی اور آپ کو کیا ملتا؟“ فائقہ نے حسب عادت اُس کی طبیعت صاف کر کے رکھ دی تھی۔

”سوری ماما! میں کل سے بے حد تنیس ہوں اسی وجہ سے.....“

”اُس اوکے، اگر کامیاب زندگی گزارنے کی خواہاں ہو تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا اپنے دل کی بات، اپنے پرستار بھی کسی کے آگے مت کہنا، اپنے کب غیر بن جائیں، دوست کس لئے دشمن ہو جائیں، کچھ پتا نہیں ہوتا ہے۔ اپنے دل کی بات اُن کے سامنے کہہ کر تم نے سب سے بڑی بے وقوفی کی ہے۔“

”سوسوری ماما میں گلٹی ٹل کر رہی ہوں، اب کرنا کیا ہے یہ بتائیں؟“

”وہ آجائے تو اپنا روپیہ بگ سٹز جیسا ہی رکھنا۔ کرن کے ساتھ کسی کو بھی محسوس نہ ہو کہ آپ اُس کے آنے پر خوش نہیں ہیں۔ آئندہ کا پروگرام اُس کے آنے کے بعد ہی ہم طے کریں گے۔ اوکے، گڈ نائٹ“۔ ریسیور رکھتے ہوئے وہ مطمئن تھی، ساری ٹینشن غائب ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

حزہ نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جس نے ساوہ دم بخود رہ گیا۔ رات بھر اُسے فیصلہ کرنے اور فیصلے پر عمل درآمد کرنے کے لیے کافی تھی۔ نفس و حساس طبیعت رکھنے والے، محبتوں و رشتوں کے تقدس کی پاسداری کرنے والے حزہ کے لیے یہ ایسی کاری ضرب تھی جس سے وہ گھائل ہو گیا تھا۔ گھر میں تاؤ و ٹینشن پہلے ہی تھی، مزید پریشانی حزہ کے فیصلے نے بڑھادی تھی۔

”تم اس طرح کیسے جا سکتے ہو، میں تمہیں کبھی اجازت نہیں دوں گی حزہ!“ رخسانہ ٹوپ اٹھی تھیں۔

”اگر آپ مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہیں تو آپ کو اجازت دینی ہوگی، ورنہ میں یہاں رہا تو خودکشی کر لوں گا یا پاگل ہو جاؤں گا۔“ اُس کے انداز میں جنون تھا۔

”بیٹا! کوئی اس طرح بھی جاتا ہے، ابھی آپ زیر تعلیم ہو، کہاں جاؤ گے، پھر بھابی، بھائی، ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔“ راحیلہ نے سمجھانے کی سعی کی۔

”میں نہیں مان سکتا، کسی طرح یقین نہیں کر سکتا کہ اس گھر میں رہنے والے لوگوں کو رشتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ ان ماہوں سے بھگ چکے ہیں، رشتوں کی توہین، اپنائیت کا خون جس بے جگری سے یہاں بہایا جاتا ہے، ایسا تھائی بھی نہیں کرتے ہیں۔ یہ گھر نہیں ہے، مثل ہے، یہاں کی گھنٹاؤنی اور بدبودار فضا میں رہا تو حواس کھو بیٹھوں گا۔“ وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر سسکتے لگا تھا۔ بیٹے کی حالت نے رخسانہ کو پہلے ہی بے چین کر رکھا تھا، پھر شوہر کا بدلا بدلا رویہ، طعنے و گالیاں اُن کی زندگی ایک دم ہی بدل گئی۔

کل تک وہ جنت کی باسی تھیں، آج لکھت ہی جہنم میں گر گئی تھیں۔ اب حزہ کی ضد نے انہیں زندہ درگور کر ڈالا تھا۔ سب نے ہی سمجھایا تھا اُسے مگر وہ نہیں مانتا تھا۔ اُس نے کبھی ضد نہ کی تھی، اب کی تو پوری کر کے ہی چھوڑی تھی۔

عام صاحب گم صم ہو کر رہ گئے تھے۔

انہوں نے اسے روکنے کی ایک مرتبہ بھی کوشش نہ کی تھی۔

”آپ کیوں خاموش ہیں، روکیں اسے یہ جا رہا ہے، میری نہیں مان رہا“۔ وہ روتے ہوئے اُن سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”جانے دو اُسے تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو، جب کوئی اپنا جان سے بیجا جدا ہوتا ہے تو دل کی دنیا کس طرح اندھیر ہوتی ہے“۔

انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

”تم نے خود کے لیے فیصلہ کر لیا اور جا رہے ہو، میرے لیے کچھ سوچا ہوتا مجھے اس جہنم میں چھوڑ کر جا رہے ہو“۔ صمد اسے میں

اُس سے مخاطب ہوا تھا۔

”میرے جانے کے بعد گھر جنت بن جائے گا، لیکن خاصا وقت لگے گا۔ دراصل جن لوگوں کو تو اتر سے خوشیاں، آسائشیں و

دولت مل جاتی ہے، وہ پھر صلہ رحمی، مروت و غلوں، لحاظ و محبت کے جذبوں سے عاری ہو کر ان سظلی عادات کا شکار ہو جاتے ہیں جن کا

ہمارے گھر والے ہوتے ہیں، انہیں غم و دکھ نہیں ملے تھے، اس لیے یہ حاکم بے در بن جیسے تھے، اب سب ٹھیک ہو جائے گا، گھر کے مردوں

کو عقل آ چکی ہے“۔

”بڑا بنگامہ ہوا تھا وہ پہر گھر میں، پیا گھر میں ماما کو رکھنے پر راضی نہ تھے، بڑے اور بھیلے پاپا کا بھی یہی فیصلہ تھا۔ ماما اور دونوں

آئینے نے بڑی منت و سماجت کے بعد انہیں منایا ہے، اُن کی ویلیوز ہانکل ڈاؤن ہو گئی ہیں۔ مجھے ایسا ہانکل اچھا نہیں لگ رہا ہے“۔ صمد نے

اُسوں سے کہا۔

”نی الحال میرے جذبات بالکل صفر ہیں“۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”کہاں جا رہے ہو اور کب لوٹ کر آؤ گے؟“

”کہاں جا رہا ہوں یہ خیر خود مجھے بھی ڈھنگ سے نہیں، کب آؤں گا؟ جب رشتوں کا اعتبار آ جائے گا“۔

”مجھ سے بھی چھپا رہے ہو؟“ صمد خفگی سے بولا۔

”ہانکل نہیں، ایک تم ہی تو ہو جس نے تعلق کا مان دیا ہے“۔

”کرن سے نہیں ملو گے؟“ کاری رفتار تیز کرتے ہوئے صمد نے سوال کیا۔

”نہیں“۔ خاصے توقف کے بعد جواب ملا تھا۔

”کیوں؟ اُس ڈکھ کی گھڑی میں اُسے تنہا چھوڑنا محبت نہیں ہے“۔

”وہ بہت ہٹ دھرم و ضدی ہے، جان سے گزر جائے گی اپنی انا نہیں توڑے گی، غلطی کسی صورت قبول نہیں کرے گی۔ میں ہمیشہ

اُس کی ماننا آیا ہوں، کیا جانا اگر وہ کال کر کے مجھے مطلع کر دیتی۔ میرا نمبر تھا اُس کے پاس، جو وہ کہتی میں کرتا، وہ گھر والوں کے سلوک کا

جواب دینا چاہتی تھی، میں کبھی اُس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا کرو مجھے نہ سمجھ سکی اور میں اُس کو اب سمجھنا چاہتا بھی نہیں۔“

”وقتی غصہ ہے یہ اترے گا تو چھتاؤ گے، پھر غیروں کے پاس اُسے چھوڑ دینا کہاں کی دانش مندی ہے یا ر! حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے ہیں، پھپھو کی موت نے اُن کے دل بدل دیئے ہیں۔ تم، بڑے چاچا، پاپا اٹکل کو کرن کا ایئر لیس متادو تو اچھا ہے وہ اُسے مگر لے آئیں گے۔“

”تمہارے خیال میں وہ آجائے گی؟“

”آف کورس، وہ اتنی بڑی نہیں ہوئی ہے کہ اپنے ماموں کی کوئی بات نہ مانے یا اُن کے ساتھ نہ آئے، وہ دل کی بجز اس نکالنے کے بعد آجائے گی۔“

”میں، ہرگز نہیں۔ تم اُسے ابھی سمجھ ہی نہیں سکے ہو، وہ کسی قیمت پر نہیں آئے گی، اسی وجہ سے میں نے کسی کو مانگنے کے باوجود وہاں کا ایئر لیس نہیں دیا تھا، ویسے بھی وہ وہاں ایئر جسٹ ہو چکی ہے، بہت اچھے لوگ ہیں، بہت زیادہ اُس کی کیئر کرتے ہیں، جس محبت و تحفظ کی توقع وہ اپنوں سے کرتی تھی وہ اسے غیروں سے مل رہی ہے، وہ خوش ہے، میرے دل کو یہی اطمینان ہے۔“

☆.....☆.....☆

ڈر صاحب کو اس نے حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تھا، جواباً وہ اُسے دعا میں دے کر آگے بڑھ گئے تھے۔ وہ گہری سانس لیتی لان کے اُس گوشے میں بیٹھ گئی تھی جہاں موہیے کے پودوں کی بہتات تھی۔ سبز چوں کے درمیان کھلے کنواری نما سفید سفید پھولوں سے نکلنے والی پاکیزہ خوشبو جسم و روح کو معطر کر رہی تھی، وہ ماربل کی بیج پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

اوائل راتوں کا پُر شباب ماہتاب اپنی تابانیاں بکھیر رہا تھا۔ مہکتی ہو اسی تھی۔ آج اُس کی یہاں پر آخری رات تھی، پھر نہ معلوم زندگی یہاں آنے کا موقع دے یا نہ دے، اس لیے وہ آج کی رات جاگ کر گزارنا چاہتی ہے تاکہ یہاں کی یادیں اُس کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ یہ گھر اس کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا، یہاں آکر اس نے ماں کی محبت کو محسوس کیا تھا، اس کی ممتا کی قدر چائی تھی، اس کی مجبوری سمجھ سکی تھی۔ اس گھر میں اُسے زندگی گزارنے کے اصول ملے تھے، یہیں سے اُس نے زندگی کو زندگی سمجھا تھا، ماں کے سگ خوب صورت یادگار دن گزارے تھے۔

”کیا میں اس گھر کو چھوڑ سکوں گی؟ اس گھر میں جہاں میری ماں کی یادیں بہتی ہیں، ماما کا وہ لمس کہیں اور کیونکر پاؤں گی؟“ اس نے گہری سانس لی تھی۔

”برہان لغاری جس کو باپ ماننے کو دل نہیں مانتا مگر ماں کی حرمت کی خاطر مجھے اُس کے حق کو ماننا ہے، وہ خطرناک ہے، جو شخص لمبے پھریں گرت کی طرح رنگ بدلے اُس پر اعتبار کس طرح کیا جاسکتا ہے اور میں اعتبار کروں گی بھی نہیں، جس اذیت اور ذلت سے بائیس سال ہمیں ہمکنار کیا گیا تھا، اب وہی میں اُسے لوہا نے جاری ہوں اور میں کامیاب رہوں گی۔ مجھے کامیاب رہنا ہے، خواہ اس کے

لے مجھے جان کی بازی ہی لگانی کیوں نہ پڑے۔“

”کیا سوچا جا رہے ہے، نیند نہیں آرہی آپ کو؟ اوہ میں بھول گیا، آج آپ کو نیند کہاں آئے گی، کل آپ کو آپ کے قادر کے ہاں جو جانا ہے۔“ انس باہر سے آیا تو اُسے وہاں دیکھ کر چلا آیا تھا۔

”آپ سے مجھے ایسے گھٹیا مذاق کی توقع نہیں تھی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”اوہ کے، آپ مائنڈ کر گئیں، ویری سوری امیں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ انس کچھ بولکلا کر گویا ہوا تھا۔

”تمام اسٹوری آپ کے سامنے ہے، پھر بھی آپ ایسی باتیں کریں گے تو میں ہرٹ نہ ہوں گی؟“ اس کے اشارے پر وہ بیٹھ گئی تھی۔

”جی تو سمجھانا چاہ رہا ہوں، کیوں ہرٹ ہو رہی ہیں آپ، اپنوں کے پاس جا رہی ہیں تو گزری ناگوار باتوں کو ذہن سے نکال جائیں تو اچھا ہوگا۔“

”یہ مت بھولیں وہ میری ماں کے قاتل بھی ہیں، ہائیکس سال اپنے نام کا پھندا لگا کر انہوں نے میری ماں کو اذیت ناک زندگی دی اور پھر محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے میری ماں کے گلے سے وہ پھندا کھینچ لیا، مار دیا انہیں۔“

”پھر کس لیے جا رہی ہیں؟“ وہ متحجب ہوا۔

”اُن سے انتقام لینے، بدترسوت مارنے۔“ وہ سخت مشتعل تھی۔

”وہ آپ کی دسترس سے بہت دُور کی شے ہیں، جا رہی ہیں تو سب بھول کر جائیں، ورنہ مت جائیں، اس طرح آپ خود کو نقصان پہنچائیں گی۔“

”انہیں مار کر ہی مروں گی، خون اُن کا ہی ہوں۔“

”گرینی کو بتایا ہے جانے کا؟“ اس نے بات بدلی تھی۔

”نہیں..... مجھے جانے نہیں دیں گی۔“

”ہاں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، اگر آپ کے کزن حزرہ آجائیں تو انہیں کیا بتایا جائے کہ آپ کہاں ہیں۔“

”وہ نہیں آئے گا۔“ حزرہ کے نام پر اس کی آنکھیں بھینکنے لگی تھیں۔

”آپ کو کیسے معلوم؟ ملاقات ہوئی ہے اُن سے؟“ انس کو اس سے ہات کرنا اچھا لگ رہا تھا، وہ نہ جانے کس جذبے کے تحت

گفتگو کو طول دے رہا تھا۔

”نہیں، لیکن میں جانتی ہوں وہ پلٹ کر نہیں آئے گا۔“

”آپ کے اور اُن کے درمیان کافی اسٹینڈنگ رہی ہے شاید؟“

”جی بالکل۔“



”سدا اور قاریہ بھابی سے نہیں ملو گی؟“ اُس کے لہجے میں اضطراب سٹ آیا تھا۔

”میں کسی ایسے رشتے سے نہیں ملوں گی جو میرے پاؤں کی زنجیر بن جائے۔ کچھ پانے کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے اور میں ان نایاب اور قیمتی رشتوں کی قربانی دے رہی ہوں اور نہیں چاہتی کہ ان میں سے کسی کا سامنا ہو اور میں اپنا مشن بھول جاؤں۔“ وہ مضطربانہ لہجے میں بولی تھی۔ اُن کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔

وہ گردن جھکا کر بار بار اُٹھانے والے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی سعی کر رہی تھی۔

وہ بغور اُس چہرے کو دیکھ رہا تھا جس میں ایک اور چہرہ نظر آ رہا تھا۔

سدا کی شادی والے دن جب وہ گریٹی کو دیکھنے آئی تھی اور وہ سدا کے کمرے میں پھول ڈیکوریٹ کروانے آیا تھا، ڈرائیور اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے حکم پر ڈیکوریٹرز کو چھوڑنے چلا گیا تھا۔

وہ جانے کے لیے پارکنگ لٹ میں آیا تو اُس پریشان سا ٹھہرتا پایا تھا اور جب پہلی بار اُس نے اسے غور سے دیکھا تھا تو دیکھتا رہ گیا تھا۔

دو مختلف اجسام، دو مختلف خاندانوں و علاقوں سے تعلق رکھنے والے ہم شکل کس طرح ہو سکتے ہیں، وہ مثال کی کاپی تھی، معمولی سی تبدیلی کے ساتھ۔ پھر اس حیرانگی میں اُسے زیادہ وقت گزارنا نہ پڑا تھا، بہت جلد اُس کا تجسس، تجسس نہ رہا تھا۔

بڑا دردناک، رقت انگیز ڈراپ سین ہوا تھا۔

”عزیز سے آپ کی انڈر اسٹینڈنگ تھی یا نو انڈر اسٹینڈنگ تھی۔“ بالآخر وہ دل کی بات زبان پر لے آیا تھا۔ وہ بڑی طرح چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

”آپ..... آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ بہت خاص بات اس نے عام سے لہجے میں کی تھی۔ وہ بڑی طرح گھبرا گئی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں نے ایسی کوئی خوف ناک بات نہیں کی جو آپ اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں۔“ اس کے انداز پر وہ ہنس ہنسا ہوا تھا۔

”یہ کس طرح ممکن ہے؟“ وہ سخت سراپسنگی کا شکار تھی۔

”یہ ناممکن کو ممکن بنانے کا دور ہے، پھر شادی کرنا ناممکن نہیں ہے۔“

”سوری، اپنی ماں کی اجزی زندگی اور باپ کا سفاک روپ دیکھ کر میں نے کبھی بھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“



”یہ جواب بلکہ احساس بالکل بچکانہ ہے۔ نصیب سب کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ کسی کی ناکام زندگی ہر ایک زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ کسی کو پانی میں ڈوبتے دیکھیں گی تو کیا پانی چھینا چھوڑ دیں گی؟ کسی کو بلندی سے گرتا دیکھیں گی تو بلندی پر چڑھتا چھوڑ دیں گی؟“

وہ بہت بڑا اعتماد لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”میری ماں کی زندگی میرے لیے مشکل راہ ہے۔ اس کی روشنی میں ہی مجھے اب ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے۔“ وہ اس کی طرف

سے رخ پھیرتے ہوئے بولی۔

”وائے ناٹ، میں آپ کے اس خیال سے متعلق ہوں۔ آپ ہاشور ہیں۔ بہت ذہین و فطین بھی۔ ایسی خوبیاں خواتین میں بہت

نایاب ہیں، میرا فیصلہ کوئی لکھوں کے زیر اثر نہیں ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے آپ کو پر پوز کیا ہے۔ آپ پر کوئی زبردستی نہیں ہے لیکن پھر

بھی میں کبھی نا امید نہیں ہوں گا۔“ وہ چند لمحوں کے بعد ہنس کر ہنس کر پھر چلا گیا۔

وہ کم صم ہی کھڑی رہ گئی۔

انس کا پر پوز کرنا بالکل غیر متوقع بات تھی۔ بھلا اس نے کب ایسا چاہا، کون سی ادا، کون سی بات اس حد تک اسے اس کی طرف

راغب کر گئی؟ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ پورے صدقات نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں وحیات منجمد کر دی تھیں۔

ماں کی موت، باپ سے ملن، دونوں تعلق اسے عزیز از جان رہے تھے۔ وہ شعور کی آگہی کے بعد سے باپ کی محبت اور انہیں

دیکھنے، ان کے قریب رہنے کی خواہش مند رہی تھی۔ باپ کے ذکر پر ماں کا بگڑنا مزاج اور گھر میں موجود ممانتوں اور کزنز کے طعنے اسے

مشغول کر دیتے تھے، پھر وہ بلا سوچے سمجھے ان سے لڑنے لگتی۔ ماں سے اکٹرا رہنے والی آن بن کا سبب وہی ہستی تھی۔

باپ..... اس کے لیے ایک ایسے آن دیکھے سے جزیرے کی مانند تھا، جہاں پر محبتوں کی فضا تھی۔ سکون و چین کی زمین پر آسودگی

و طمانیت کے بادل سایہ لگن تھے، جس کا تصور کرتے ہی اس کے رگ و پے میں عجیب سی خوشی دوڑنے لگتی اور اس کا دل چاہتا کہ کسی طرح وہ

اس جہنم سے نکل کر اس جنت میں پہنچ جائے جہاں چاہتوں و مسرتوں کی رم جم ہر سو برکتی تھی۔ طویل و صبر آزما انتظار کے بعد وہ اپنی جنت

سے ملی تھی۔ ایک قیامت کے بعد وہ جنت، وہ جنت نہ تھی، جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔

وہ کسی طوفان کی صورت میں سامنے آئے تھے اور اس کے خوابوں کا ”جہنم“ آرزوؤں کے مرفزار، تصورات کے شیش محل آن واحد میں

کرچی کرچی کر گئے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود بھی خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ انس کے پر پوزل نے اسے وہی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ

گرینیا کے بتانے کی وجہ سے اس کے ماضی سے واقف تھی تو یہاں رہنے کے باعث اس کے حال سے بھی خاصی حد تک آگہی حاصل کر چکی تھی۔

وہ اسے سخت مزاج، مغرور اور انتہا پسند شخص کے روپ میں ملا تھا۔ اس نے دیکھا تھا وہ ”نظرت و محبت“ دونوں جذبوں میں انتہا پسند تھا۔

جن سے وہ محبت کرتا تھا، ان کی ایک آہ پر اپنا آپ برباد کر دینے والا اور جو اس کے ناپسندیدہ ہوں ان کو اپنے رویے سے خوار کر

دینے والا۔ پھر نہ معلوم کون سا لمحہ اس کی گرفت میں آیا جو وہ اس سے سیدھے منہ بات نہ کرنے والا، جیون ساتھی بنانے کی خواہش کر بیٹھا تھا۔

☆.....☆.....☆

نفاست و خوب صورتی سے بچے کرے میں وہ والدہ حضور کے قریب صوفے پر سر جھکائے موہ بانہ انداز میں بیٹھے تھے۔ قریب ہی دوسرے سنگل صوفے پر منال بیٹھی تھی۔ گو کہ اس کا انداز باپ کی طرح از حد موہ بانہ نہ تھا۔ باپ کی ناراضگی کے خوف سے وہ احتراماً بیٹھی تھی اور بہت اطمینان سے گاہے بگاہے اِدھر اُدھر دیکھ لیتی تھی۔ خصوصاً کرے کی وسطی دیوار میں آویزاں قد آدم گلاس ڈور سے نظر آتا باہر لان کا دل کش منظر سرسبز درختوں و پودوں کے درمیان بے تحاشہ حسین پھولوں کی سنگت میں لگا فوارہ سحر انگیزی کا مظہر تھا۔ وہ بار بار اس طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہوں..... جیسی مائی، ویسی جانی! دکھادی نا اس نے ماں جیسی فطرت۔ نہیں دی تمہاری بات کو کوئی اہمیت۔ اپنی ماں کی طرح، سچ کہہ گئے تھے اچھے لوگ، بیٹی ماں کا ٹکس ہوتی ہے۔ ماں کی ہی فطرت پاتی ہے۔“  
والدہ حضور کی آوازان کی شخصیت کی طرح ہی ہارعب و سخت تھی۔  
”آپ پریشان نہ ہوں والدہ حضور! میں آج لے آؤں گا اسے۔“  
”اس کی مرضی کے مطابق لاؤ گے، اپنی مرضی سے نہیں۔“ ان کا انداز ٹھکھا تھا۔  
”میں سمجھانیں آپ کی بات۔“ انہوں نے ماں کی طرف دیکھا۔

”تمہاری ناگہی نے ہی یہ دن دکھایا ہے جو پہلے دو عورتیں تمہاری بے عقلی سے قائمہ اُٹھاتی رہیں اور اب ان کی اولادیں اپنی من مانی کر رہی ہیں۔“ وہ تنقیدانہ نگاہوں سے سامنے بیٹھی منال کو گھور کر بولیں۔ جس کا غیر مہذبانہ انداز نشست و گستاخانہ انداز بصارت انہیں ہمیشہ سے ناگوار کرتا تھا۔ وہ ہر ایک سے حاکمانہ رویہ روارکنے کی عادی تھیں اور برہان جیسا بے حد ادب و آداب والا انداز دیکھنے کی عادی تھیں۔ منال کی لاپرواہی، گستاخی، بے نیازی و بے گامگی انہیں بختر کر چکی تھی، اس کی ذات سے۔ مگر برہان سے کبھی شکایت نہ کر سکیں کسا اپنی ذات کی لٹی انہیں کبھی گوارا نہ تھی۔ سو بہت خاموشی سے ان کے درمیان یہ سرد جنگ چل رہی تھی، جس سے برہان قطعی بے خبر تھے۔  
”وادی ماں! پلیز میری ماما کا نام مت لیں، ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اس گھر سے۔“ منال تڑخ کر گویا ہوئی تھی۔  
”تمہاری صورت میں تعلق موجود ہے۔“ وہ بھی ترکی بہ ترکی گویا ہوئیں۔

”بات میری ہو رہی ہے تو میرا تعلق باپ سے وابستہ ہے۔ میری ماں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ باپ کے چہرے کے گہڑتے زاویے اس کے لہجے کو دہیما کر گئے مگر وہ اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

”وہ کم ذات و کم نسل ہمارے خاندان سے تعلق جوڑنے کے لائق بھی نہ تھی۔ اپنے بیٹے کے پیار اور متا کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم نے اسے اس اعلیٰ و برتر خاندان میں جگہ دی۔ اپنے گھر کی حکمرانی اسے سونپ دی اور اس نے کیا ثابت کیا۔ یہی کہ کچھ کا پتھر چل کی دیوار میں نصب نہیں ہو سکتا۔ اس کی اصل جگہ وہی کچھڑ کی گندگی ہی ہوتی ہے جہاں وہ دوبارہ جا کر گر گئی۔“ والدہ حضور کے لہجے میں کراہت، نفرت و حقارت اس نے باپ کی آنکھوں میں بھی اُمنڈتی دیکھی تو پھر ککڑی ہو گئی۔

”زبان سنبھال کر بات کریں دادی ماں! میں اپنی ماما کے خلاف کچھ نہیں.....“

”شٹ اپ..... لہجہ درست کرو اپنا“۔ برہان ایک دم چیخنے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ انہیں اشتعال میں دیکھ کر ہونٹ کاٹنے

لگی تھی۔

”چلاؤ مت برہان! ملازم متوجہ ہوں گے۔ اس گھر کی آواز کسی دیواروں سے باہر نہیں نکلی ہے۔“ منال غصے ورنج سے کانپ رہی تھی۔ اس کا تعلق تیز تھا۔ آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔ وہ غصہ و جنون ضبط کرنے کی کوشش میں ہونٹ کاٹ رہی تھی جبکہ والدہ حضور اس کی حالت کی بہ نسبت بالکل بے سکون و بے فکر نظر آ رہی تھیں۔ ان کے لمبوں پر چڑانے والی وہی مسکراہٹ تھی۔

”یہ آپ سے بدتمیزی کرے، میں کس طرح برداشت کر سکتا ہوں؟“ وہ منال پر قہر آلود لٹکاہیں ڈال کر گویا ہوئے۔

”چائے پر تھوکنے والا خود اپنا چہرہ گندہ کرتا ہے۔ ہم اتنے کم طرف نہیں جو ایسی فضول وغیرا ہم باتوں کو اپنی توہین سمجھیں۔ منال ہم سے کتنی ہی کبیروہ خاطر و خطر ہو مگر ہمیں تمہاری بیٹی تمہارا خون ہونے کی وجہ سے اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں ہے۔“ وہ بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”ہونہہ مکار و منافق بڑھیا! ان ہی حرکات و جارحیت پسندی کے باعث دونوں مرتبہ بیٹے کا گھر بیٹے نہ دیا۔“ وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی تھی۔

”یہ سب آپ کا بڑا پین اور محبت ہے والدہ حضور!“ وہ ممنونیت سے گویا ہوئے اور ساتھ ہی بیٹی کو معافی مانگنے کا اشارہ بھی کیا۔

”سوری دادی ماں! مجھے غصہ آ گیا تھا۔“ وہ ہاول نخواستہ معافی مانگ رہی تھی۔

”میں نے برا نہیں مانا مگر میری فصاحت پر عمل کرو تو غصہ بھول جاؤ۔ ہر برے اور بگڑے کام کی اساس یہی غصہ ہوتا ہے، جس نے غصہ پر قابو پالیا سمجھو اس نے کامیاب زندگی کا راز پالیا اور تم تو ایسے بھی شادی شدہ بچی ہو۔“

”جی بہتر، ہم بات کر رہے تھے کرن کی آمد کی۔ وہ بات تو وہ ہیں رہ گئی اور ہم نہ جانے کس طرف نکل گئے، بلاوجہ کی بدحرکی بھیل گئی۔“ موضوع کو اپنی طرف گھومتے دیکھ کر سمجھداری سے خود کو بچا لگی تھی۔

”اس کا ارادہ شام تک آنے کا ہے مگر تم ابھی بلاؤ اسے۔ اس گھر میں عورتوں کی مرضی نہیں چلا کرتی۔“ وہ اپنے مخصوص حکمیہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”جی بہتر۔ میں ابھی لینے جا رہا ہوں۔“ وہ فوراً کھڑے ہو گئے تھے۔

”تم..... تم کیوں جاؤ گے؟ ڈرائیور مر گیا ہے کیا؟“

”میں..... وہ پہلی مرتباً آنے کی گھر میں تو.....“ وہ جھل سے ہو گئے۔

”تو کیا ہوا؟ اس کی ماں کو تم لینے نہیں گئے تھے۔ اس کی بی بی خواہش تھی کہ تم لینے جاؤ تو وہ آئے، پھر اب اس کی بیٹی کو کیوں لینے

جاؤ گے۔ اس مری ہوئی کی روح کو خوش کرنے کے لیے۔" منال انہیں دیکھتی رہ گئی۔ کسی ظالم دے ضمیر عورت تھیں کہ زندہ و مردہ سب سے انتقام لینے کی عادی تھیں۔

بے حد اثر و رسوخ، سماجی و سیاسی سمجھ بوجھ و بصیرت رکھنے والے برہان لغاری ماں کے سامنے کسی کم عقل و نا سمجھ بچے کی طرح رہتے تھے۔ تمام تیزی و طراری، خود اعتمادی ماں کے سامنے ہوا ہو جاتی تھی۔ وہ بچپن سے باپ سے زیادہ ماں کے رعب و دبدبے میں رہے تھے۔ والدان کے بے حد نرم مزاج، خوش اخلاق و انسان دوست تھے۔ بچوں کے ساتھ وہ بالکل بچہ بن جایا کرتے تھے۔ ماں کی سخت خود پسند و بارعب شخصیت نے ان کے سامنے کبھی ان کو خود اعتمادی نہ بخشی تھی۔ وہ ہر فیصلے میں ان پر مسلط رہی تھیں۔ وہ شرمندہ شرمندہ اٹھے اور اپنے ذاتی ڈرامیہ کو حکم دینے لگے۔

☆.....☆.....☆

جب انسان محبت میں دھوکا کھاتا ہے تو ہر رشتے سے اعتماد و اعتبار کھو بیٹھتا ہے۔ یہ احساسات وقتی طور پر بہت شدت سے حاوی ہوتے ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، ہر احساس اپنی اصلی شکل میں آ جاتا ہے۔ آج میں خوش ہوں کہ آپ کے احساسات کی نوعیت اپنی حالت میں واپس آ گئی لیکن ایک جگہ دل میں کچھ گروی رہ گئی ہے۔ مڈر صاحب اس کی جانب دیکھتے بہم لہجے میں گویا ہوئے۔ "اس گروہ کو کھول دیجئے ڈیڈی۔ میں نے ہمیشہ آپ کو ایک ایک بات سے باخبر رکھا ہے۔ ہر پراہم آپ سے ڈسکس کی ہے۔ ہر راز آپ سے شیئر کیا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ رات کرن سے بات کرنے کے بعد صبح ناشتے پر وہ انہیں پتا چکا تھا۔

"مجھے آپ کے اس دوستانہ رویے سے ہمیشہ خوشی ملی ہے۔ ہماری انڈر اسٹینڈنگ مثالی ہے مگر بات یہاں ایک زندہ وجود کی آتی ہے جس سے میں بیٹی کی طرح محبت کرتا ہوں۔ اس کی تابع داری و سعادت مندی نے میرے دل میں ایک نرم و گداز جذبہ پیدا کر دیا ہے جو ایک باپ صرف اپنی بیٹی کے لیے ہی محسوس کرتا ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کو یہ اجازت نہیں دوں گا کہ کرن آپ کے انتقام کی جینٹ چڑھے اور میں خود کو معاف نہ کر سکوں۔" ان کا لہجہ سچا دکھاتا تھا۔ انس کو ان کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔

"بیٹی کی محبت پر چند ماہ کی فرماں برداری حاوی ہو گئی ڈیڈی؟"

"مجھتیں لالچ و غرض سے پاک ہوں تو ایسا ہی تعلق مربوط کرتی ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن ڈیڈی آپ میری خواہش پر شک کے کاٹنے پھیلانا کبھی تکلیف میں جھلا کر رہے ہیں۔ یہ آپ نے کس طرح سوچ لیا کہ میں کسی بے تصور سے انتقام لوں گا؟"

"کرن، منال کی سوتیلی بہن ہے۔ برہان لغاری کی اصل بیٹی، کیا یہ حقیقت کافی نہیں ہے، میرے شک کو تقویت دینے کے لیے۔"

"آپ اس تکلیف و حقیقت کو کیوں بھول رہے ہیں جو ان رشتوں کے انکشاف کی وجہ بنی۔ کرن اپنی مدد کی ڈیجھ کی وجہ بھول

سکتی ہے؟ برہان جیسا ڈپلویٹک، تنگ ذہن شخص کرن کے لیے ایسا ہی محبت کرنے والا باپ بن سکتا ہے جیسے باپ ہوتے ہیں؟"

”کچھ کہا نہیں جاسکتا یقین کے ساتھ۔ وہ ہل ہل موڈ بدلنے والا شخص ہے۔ اپنی عقل و سمجھ سے زیادہ لالچی و خوشامدی لوگوں کی باتوں پر یقین کرنے والا۔“

”مجھے آپ کے حکم کا انتظار ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”اس کا رشتہ مانگنے ہمیں برہان لغاری کے پاس جانا پڑے گا۔ اس کا جواب کیا ہوگا۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ بیٹے کی جانب دیکھتے ہوئے رسائیت سے سمجھانے لگے تھے۔ ”جس آگ کے شعلے بڑی مشکلوں سے سرد ہوئے ہیں۔ انہیں پھر سے ہوامت دو۔ اسی میں بہتری وامن ہے۔“

”ڈیڑی! اب شکست ہمارا مقدر نہیں بن سکتی۔“

”یہ جنگ میں لڑنا ہی نہیں چاہتا تو شکست و فتح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

وہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔ انس نے خاموشی سے انہیں جاتے دیکھا تھا، پھر ایڑی ہو کر نیم دراز ہوا اور سوچوں کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے۔ باپ کے گریز و اہتمام کی وجہ وہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ برہان لغاری کی شراکتیں اور بدتماشیاں ان جیسا شریف و صلح جو شخص کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے قدم پیچھے ہٹانا ہی سوچنا ہی سمجھا تھا لیکن اس بار وہ پوری طرح تہیہ کر چکا تھا ان سے ٹکرانے کا۔

☆.....☆.....☆

جب سے گریٹی نے سنا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ انہیں چپ لگ گئی تھی، نہ وہ کوئی فرمائش کر رہی تھیں، نہ ضد۔ بالکل خاموشی سے کام کر رہی تھیں۔ ان کی خاموشی نے اسے وحشت زدہ کر دیا تھا۔ ایسی وحشت، ایسی بے چینی وہ اس وقت بھی محسوس نہ کرتی تھی، جب وہ بات بے بات اس کو کھری کھری سناتی تھیں۔ نخرے و ضدیں کر کے زنج کر ڈالتی تھیں۔ ان کی فرمائشوں کے نت نئے انداز بھی اسے اتنا پریشان نہ کرتے تھے جتنا اس وقت ان کی خاموشی کر رہی تھی۔

”تم آج چلی جاؤ گی۔ شمو کو سمجھا جانا، وہ صفائی کا خاص خیال رکھے بس۔“ وہ انہیں ناشتہ کروا کر فارغ ہوئی تو وہ گویا ہوئیں۔

”میں اسے سمجھا چکی ہوں..... کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ بالآخر ہمت کر کے اس نے پوچھ لیا۔

”جاؤ..... میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”میڈم پلیز! میری مجبوری سمجھیں۔“ وہ ان کی طرف جھکی تھی۔

”میں تم سے ناراض کیوں ہوں گی۔ تمہارا ہنسا میری قسمت میں لکھا ہے۔ اس میں تمہارا کیا دوش؟ جہاں رہو خوش رہو۔ میری دعا ہے تمہارے لیے۔“ انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، تاکہ وہ وہاں مچلتا ٹمکین پانی دیکھ نہ پائے۔ رات سے اس کا دل بھی بھر بھر آ رہا تھا۔ کئی مرتبہ وہ رو جھکی تھی۔ گریٹی کے کمرے سے نکل کر وہ اپنے کوارٹر میں آ گئی۔

دلہیز پار کرتے ہی ماں کی یاد، ماں کی خوشبو، ہرست پھیلی محسوس ہوئی۔ اس کی قربت کا لمس، لہجے کی مٹھاس از سر نو بیدار ہو گئی تھی

اور وہ خالی خالی لگا ہوں سے ان درود یوار کو بکنے لگی تھی جو کل تک ماں کی موجودگی میں سکون و آسودگی، نجات و عافیت کا مسکن لگتے تھے اور اب خاص و حصول میں آنے کسی ویرانے کا منظر پیش کر رہے تھے۔

”ہاں ماما! ہمارے ستارے آپس میں کبھی ملے ہی نہیں۔ ہمیشہ گردش کے دائروں میں متحرک رہے اور پھر ابدی جدائی کے دہیز امیروں میں کھو گئے۔“ وہ رو پڑی۔

”بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔“ شموکی آمد پر اس نے آنکھیں رگڑ ڈالی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل آئی۔ دل تھا کہ پانی پانی ہو جا رہا تھا۔

”یہ ذکی الدین صاحب آپ کو لینے آئے ہیں۔“ وہ اندر داخل ہوئی تو مدثر صاحب صوفے پر بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کر کے گویا ہوئے۔

”آداب مس! مجھے برہان صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ کسی اہم میٹنگ کی وجہ سے نہیں آسکے ہیں۔۔۔۔۔“ وہ اسے دیکھ کر تھکھا کھڑا ہوا اور وضاحتی لہجے میں گویا ہوا۔

”لیکن مجھے شام کو جانا تھا۔“

”سر کا حکم ہے، آپ ابھی میرے ساتھ چلیں گی۔“ ذکی الدین کا لہجہ نرم مگر قلعیت و خود اعتمادی سے بھر پور تھا۔ وہ گندی رنگت، عام نقوش و کرسٹ چہرے والا شخص برہان الدین کا ہم عمر تھا۔

”ابھی میں نے ان کی ویلینز پر قدم رکھا بھی نہیں اور احکامات لاگو ہو گئے؟“

”سرنے اس میں آپ کی بہتری دیکھی ہوگی بس۔“ ذکی الدین اس کے گزرتے تھوڑے کچھ کر سانسیت سے گویا ہوا۔

”سٹرکی گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ ابھی روانہ ہوں گی تو رات تک وہاں پہنچیں گی۔ پھر جب جانا ہی ہے تو صبح و شام کا کیا انتظار کرنا۔“ مدثر نے کہا۔

”چلیں مس! باہر ڈرائیو ر گاڑی لیے کھڑا ہے۔ سر کا آرڈر ہے یہاں سے آپ کوئی سامان لے کر نہیں جائیں گی۔“ ذکی الدین، مدثر اور برہان کے درمیان کشیدہ و خراب تعلقات کو جانتا تھا۔ وہ برہان الدین لغاری کا بے حد خاص ملازم، بلکہ دست راست تھا۔ اس نے اپنی وفاداری کا ثبوت یہاں آکر پوری طرح دیا تھا۔ مدثر صاحب سے اس نے رسمی علیک ملیک بھی نہ کی تھی۔ چونکہ دار سے گیٹ کے باہر سے ہی اپنا مدعا کھلوایا تھا۔

یہ مدثر صاحب کی خوش اخلاقی و اعلیٰ طرفی تھی جو وہ اسے لیوگ روم تک لائے۔ اس کی خاطر تو وضع کرنا چاہی مگر اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے ہر انداز سے تکلف، اجتناب و گریز عیاں تھا۔

کرن نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سامان وہ پہلے ہی چھدا اور شمو میں ہانٹ چکی تھی، پھر سامان تھائی کتنا، چند سوٹ، کپڑے، کچھ

روزمرہ استعمال کے برتن اور دو بستر یا چند چھوٹی موٹی ضروری اشیاء تھیں۔

”جب ضرورت محسوس ہو پکار لینا، اپنے قریب ہی پائیں گی۔“ مدثر نے جاتے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا تھا۔ وہ سہلائی ہوئی چلی گئی۔ اشکوں کی دیر تہہ تھی جو آنکھوں تلے چھائے جا رہی تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔

اپنے باپ کے گھر میں وہ پہلی بار خشک آنکھوں، بلند حوصلوں و مضبوط اعصاب کے ساتھ داخل ہونا چاہتی تھی۔ بہادر و غرور بن کر۔ چند اور شہمنے اسے روتے ہوئے رخصت کیا تھا اور گیٹ تک آئی تھیں۔ گری بی سو رہی تھیں، پھر بھی اس کی ہمت نہ ہو سکی انہیں الوداعی نگاہوں سے دیکھنے کی بھی کہ کچھ ایسی ہی محبت ان سے ہو چکی تھی۔

انس سے نکلنے سے گھراؤ ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

”تم نے میرے پر پوزل کا جواب تسلی بخش یا امید افزا نہیں دیا تھا مگر دنیا امید پر قائم ہے اور میں بھی ہر روز تمہارے جواب، تمہاری ”ہاں“ کا منتظر ہوں گا۔“ اس کے تمسیر لہجے میں نہ معلوم کیا تھا کہ پہلی بار اس نے دل کی دھڑکن کو عجیب سا پایا اور بنا کچھ کہے آگے بڑھ گئی تھی۔ گاڑی سبک رفتاری سے رواں دواں تھی۔

باوردی ڈرائیور سووہاں نامہ از میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر ڈک ال دین بیٹھے تھے۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھی بلائینڈر گلاس ڈور سے باہر کے بھاگتے دوڑتے مناظر بے درحیالی سے دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال، لگا چٹکن آلود لباس، نیند سے بے نیاز سرخ آنکھیں، بیمار چہرے و اضطرابی کیفیت رکھنے والا وہ وجود مزہ کا تھا۔ وہ گھر سے نکل کر سیدھا ایئر پورٹ گیا تھا، وہاں فلائٹ کئی گھنٹے لیٹ روانگی کی اناؤنسٹ ہوئی تو وہ باہر نکل آیا تھا۔ صدمہ اس کے لاؤنج میں جانے کے بعد جا چکا تھا۔ وہ وہیں ٹی شاپ میں آکر بیٹھ گیا۔ ویٹر کو اس نے چائے اور سینڈوچز کا آرڈر دیا تھا اور خود کرسی کی بیک سے سرٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ پے در پے لگنے والے اعصابی و ذہنی شدید ترین جھکوں کو سہہ نہیں پایا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی تمام حیات سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔

انسوس ورائسوس..... جنون ورجنون..... اضطراب در اضطراب.....

بے سکونی کے در سچے وا ہو گئے تھے۔ وہ بہت بڑے ظلمان میں جتلا ہو گیا تھا۔ ویٹر کی سووہاں آواز پر اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور سیدھا اٹھ بیٹھا تھا۔ چائے کی مہک، خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیے گئے سینڈوچز نے اسے احساس دلایا کہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے بھوکا ہے اور جب بھوک کا احساس غالب آجائے تو ہر جذبہ، ہر احساس حکم سیری تک دور نہیں ٹھوہو جاتے ہیں۔

بھوک مٹی تو کچھ قرار ملا، جسم و جاں میں نئے انداز سے توانائیاں بیدار ہوئیں۔ شل دماغ و یوجمل اعصاب میں شوریدہ سری جاگی تھی اور گزرا ہوا پہل پہل اسے یاد آنے لگا۔



وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ وہ یہ کیا کر آیا ہے؟ گھر والوں کے ساتھ اس کا رویہ حق بجانب تھا مگر کرن کے ساتھ وہ بہت زیادتی کر بیٹھا ہے۔ اس احساس نے اسے اتنا مضطرب و پریشان کر ڈالا تھا کہ وہ واپس ایئر پورٹ جانے کے بجائے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں کمرہ بک کروا چکا تھا۔ کل تک وہ کرن سے اتنا بدظن و متنفر ہو چکا تھا کہ اس کی صورت دیکھنا تو دور کنار اس کی آواز تک سننے کا روادار نہ تھا۔

اب آنکھوں سے نمسے و جنون کی تاریکی چھٹی تو صورت حال کا ادراک ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ پرندہ بن کر اڑ کر وہاں پہنچ جائے، جہاں وہ لڑکی رہتی ہے جس سے وہ کبھی ناراض ہوئی نہیں سکتا۔ خواہ وہ کتنی ہی ظالم، کٹھور، سنگ دل اور بے مروت کیوں نہ ہو۔ وہ اس کی ہر جھانڈی و وفا سے نبھاتا آیا تھا، پھر کس طرح اس سے منہ موڑ سکتا تھا، جبکہ اسے اب وہ کسی صورت تنہا نہیں چھوڑ سکتا ہے۔ ذہنی تکلیف، اعصابی توڑ پھوڑ اور صدیوں نے اسے یک لخت ہی پیار کر ڈالا۔ ایک دن، ایک رات وہ بخار کی کیفیت میں مدہوش پڑا رہا تھا۔

دوسرے دن بھی خود میں ہمت نہ پا کر مجبوراً اسے صدمہ کو مہائل کرنا پڑا۔ حسب توقع صدمہ اس کی کال پر فوراً آدھڑا آیا تھا اور اسے اسی شہر میں اپنے روبرو دیکھ کر اسے خوشی و حیرانگی کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ مزہ نے ہمیشہ کی طرح اسکا پانی سوچوں و خیالات سے آگاہ کر دیا تھا۔

”سکیٹنگ کلاس ہوٹل تم نے کیوں چھوڑ کیا؟“ ساری باتوں کے جواب میں صدمہ کا سوال اسے بے چھین سا کر گیا تھا۔

”مجھے یقین تھا، گھر والے اس طرح میری رواجی کو مصیبت برداشت کر گئے ہیں مگر اتنی آسانی سے فراموش نہ کر سکیں گے اور میری تلاش شہر کے اندر اور باہر فینس ہوٹل میں ہوگی۔ ایسے ہوٹل کا تو انہیں خیال بھی نہیں آئے گا۔“ وہ صدمہ کے چہرے کی جانب کھوجتی نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”خواہ مخواہ ایم پی اے کی ڈگری حاصل کی ہے تم نے۔ تمہیں تو سیکرٹ سرورسز کے لیے پاپائی کرنا چاہیے تھا۔“

”مشورے کا شکر یہ لیکن اب وہ بات بتاؤ جس کو تم چھپانے کی سعی کر رہے ہو۔ میں نے تم سے کہا کہ کرن کے پاس چلنا ہے، اسے متا کر لانا ہے اور تم نے کوئی رسپانس ہی نہیں دیا، جس کا مطلب ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔“ صدمہ نے افسردہ نگاہوں سے بھائی کے بے چھین و مضطرب چہرے کو دیکھا تو اپنے دل کو بند ہونے محسوس کیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”صدمہ! فارگا ڈسک۔ تمہاری یہ خاموشی میرا دماغ بلاست کر دے گی۔ پلیز..... جو بھی بات ہے، بتا دو۔“

”میں کل گیا تھا وہاں.....“ صدمہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کرن وہاں نہیں ہے۔ اس کے قاعدہ سے وہاں سے لے گئے ہیں۔“

”و..... ہا..... ٹ ا“ یہ کس طرح ممکن ہے؟ وہ سراسیمگی کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا مگر ڈر صاحب نے وہاں کا کنٹیکٹ نمبر دیا تھا، وہاں آپریٹر نے بات کی۔ پہلے تو وہ معذرت کرتا رہا، پھر راضی ہوا تو برہان بخاری سے رابطہ کر دیا تھا۔“ وہ لہو بھر تو قف کے بعد گویا ہوا۔

”پہلی بار میں نے پتروں کو بولتے سنا..... اوگاڈا! کیسا پتھر یا اسٹنڈلخ لہجہ تھا۔ رعونت و نخوت سے بھرپور۔ میرے تعارف کے جواب میں گویا ہوئے۔ کرن سے کسی کا اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے بھول کر بھی یاد نہ کیا جائے۔ اگر دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ زندگی سے

ہاتھ دھو بیٹھے گا۔“ ان کا لہجہ ان کا انداز بتا رہا تھا، وہ جو کہتے ہیں وہ کر دکھاتے بھی ہیں ان جیٹوں سے مخالف سمت چلنا ہی بہتر ہے۔“

”وہ اتنا ہی طاقتور اور ریخس آدمی ہے تو بیوی دینی کو کیوں اس قدر کسمپرسی دے رہی کی حالت میں چھوڑا تھا؟ ساری زندگی بیٹی کی یاد نہیں جاگی، پھر اب کس حساب میں رعب جمار ہے ہیں۔“ حزرہ کا غم و غصے سے برا حال ہونے لگا۔

”جو لوگ جائز طریقوں سے دولت کماتے ہیں، ان کے دل کشادہ و گلاز ہوتے ہیں اور جو کالا دھن بناتے ہیں وہ اسی طرح سیاہ دل، بے ضمیر و بے حس ہو جاتے ہیں پھر انہیں اپنے قول و فعل کے تضاد کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ اپنا محاسبہ کرنا پسند کرتے ہیں، جو چاہیں جس طرح چاہیں اپنے ہر سلوک کو جائز سمجھتے ہیں۔“ صمد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں کرن سے ملوں گا اور دیکھتا ہوں کہ کون روکتا ہے مجھے، اس سے ملنے سے۔“

”کول ڈاؤن۔ کول ڈاؤن۔ اپنی کنڈیشن دیکھو۔ پہلے ہی اتنا تیز بخار ہو رہا ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے تو کچھ کرتے ہیں۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوا۔ ٹھیک ہوں میں۔ ہم ابھی چلیں گے۔“ وہ واٹس روم کی طرف بڑھتا ہوا قلمی انداز میں گویا ہوا۔

”ایسی بھی کیا جلد بازی ہے یا راکرن کو وہاں ایڈجسٹ ہونے دو۔“

”وہ وہاں گئی ہے لیکن میں جانتا ہوں، وہ بہت بے صبری و جلدی باز لڑکی ہے۔ بے حد متعصب حراج بھی۔ بدلہ لینے اور جواب دینے میں دیر کرنے والی نہیں۔“

”کیا بخار تمہارے دماغ پر اثر انداز ہونے لگا ہے جو، بھئی بھئی باتیں کرنے لگے ہو۔“

”میں بہک نہیں رہا یا راکرن۔ دماغ خراب ہوا ہے میرا۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”تم بخوبی جانتے ہو، کرن کو اپنے ڈیڈ سے ملنے، ان کے ساتھ رہنے کی کتنی خواہش تھی، جو اب پوری ہوئی ہے تو وہ خوش نہ سہی، مطمئن تو ہوگی۔“

”نہیں..... جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد وہ ایسی کسی خواہش کی آرزو مند نہ رہی ہوگی۔ وہ وہاں گئی ہے تو نیک ارادوں سے نہیں گئی

ہوگی..... وہ کیا کر گزرنے کی نیت سے وہاں گئی ہے۔ یہ میں نہیں جانتا مگر یہ میرا دل گواہی دے رہا ہے، وہ کچھ کر گزرنے میں اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرے گی۔ ایسی ہی ضدی وہٹ و ہٹ دھرم ہے وہ۔“

حزرہ کے چہرے سے نلگروا اضطراب جھلک رہا تھا جس سے واقف ہو کے صمد بھی شکر ہو گیا تھا۔

”اسے کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا۔ کبھی نہیں.....“

”ڈونٹ وری۔ چلو تم تیار ہو۔ پہلے ہم ہسپتال چلیں گے، تاکہ تمہیں کچھ فریڈنٹ مل سکے، کیوں کہ بخار بہت زیادہ ہے۔ اس کے

بعد ہم چلتے ہیں۔“

☆.....☆.....☆

گازی عقیم الشان گیٹ کے آگے پہنچی ہی تھی کہ وہ آٹو ٹیک انماز میں کھلتا چلا گیا اور گازی آگے بڑھ کر چند منٹ کا قافلہ طے کر کے ٹوک گئی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ دروازہ کھولنے کے لیے لاک کاٹن پیش کرتی، ذکی الدین پھرتی سے اپنی سیٹ سے اتر کر اس طرف آگئے اور گیٹ کھول کر موڈ پانا انماز میں گویا ہوئے۔

”پلیز کم بے بی!“ اور وہ خاموشی سے باہر نکل آئی تھی۔

ذکی الدین کی رہنمائی میں وہ خوب صورت روش پر دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ دل میں عجیب سا جوار بھانا اٹھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کبھی اس جگہ سے اس کی ماں بھی گزری تھی۔ جگہ یہی تھی۔ مقام یہی تھا لیکن متیں جدا جدا تھیں۔ وہ اندر کی جانب بڑھ رہی تھی اور وہ باہر کی سمت جا رہی تھی۔

راستہ یہی تھا..... منزل جدا تھی.....

وہ اسے گود میں بھر کر بھی خود کو تنہا محسوس کر رہی تھیں۔ وہ تنہا ہو کر انہیں اپنے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ چند سیز حیاں عبور کر کے وہ اوپر آئی تو سامنے گولڈن فریم میں آویزاں پینٹ گلاس والے خوب صورت گیٹ کو بند دیکھ کر وہ ٹوک گئی۔ ذکی الدین نے کچھ حیرانگی سے آگے بڑھ کر دل کی شکل کا گولڈن پینڈل پکڑ کر گیٹ کھولنا چاہا تو اسے اندر سے لاک ڈیکھ کر ان کے چہرے پر حیرانگی کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی عموماً آئی۔

”کیا بات ہے؟ یہاں آنے والوں کو دیکھ اس انماز میں کیا جاتا ہے؟“ کرن بند گیٹ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے طنزیہ لہجے میں بولی۔

”نہیں بے بی! میں پہلی مرتبہ دن کی روشنی میں اسے بند دیکھ رہا ہوں۔“

”اچھا..... اس کا مطلب سمجھیں گے آپ..... یا آپ سمجھ چکے ہیں؟“

”مطلب..... میں سمجھا نہیں۔“ وہ ہکا بکا کرن کا بدلا ہوا موڈ دیکھ کر گویا ہوا۔

”اس گھر کے ہی نہیں، دل کے دروازے بھی میرے لیے بند ہیں۔ یہ مطلب ہوا اس سلوک کا ذکی الدین صاحب! انسان کی اس سے بڑی تذلیل کیا ہوگی کہ گھر بلا کر دروازے بند کر دیئے جائیں۔ سمجھ رہے ہیں ناں آپ؟“

”جی..... جی..... نہیں..... نہیں..... پتا نہیں۔“ وہ بری طرح شیشا کر رہ گیا۔

اسی دم ایک ملازمہ عقیمی سمت سے آ کر گویا ہوئی۔

”مالکن کا حکم ہے کہ مہمان کو اس گیٹ سے اندر لے کر آئیں۔“ وہ ذکی الدین سے مخاطب ہوئی۔ اس کی نگاہیں کرن پر مرکوز تھیں۔

”چلیں بے بی! ہم کو بیک سائیڈ سے اندر جانا ہوگا۔“

”بیک سائیڈ، وہاں سے کس کی آمدورفت ہوتی ہے؟“ وہ براہ راست ملازمہ سے مخاطب ہوئی۔ ذکی الدین کو بولنے کا موقع

نہیں دیا۔

”ہم تمام ملازمین کا راستہ وہی ہے۔ مزارعوں کی بیویاں، بیٹیاں، ماں، دھوین اور وہ.....“ اسی لمحے اس کی نگاہ ذکی الدین کے چہرے پر پڑی تو وہ چپ ہو گئی۔

”جاؤ۔ چلیں بے بی!“ ملازمہ سے کہہ کر وہ کرن سے مخاطب ہوا۔

”وہاں سے اندر جاؤں گی میں؟ جہاں سے وہ لوگ جاتے ہیں جو یہاں بسنے والے فرعونوں کے لیے بے حیثیت و کٹر و جبر کھتے ہیں، جن کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر و منزلت نہیں، کوئی عزت و وقار نہیں۔ زمین پر چٹکنے والے کیزوں اور ان لوگوں میں یہ لوگ کوئی فرق نہیں دیکھتے ہیں۔ میں وہاں سے جاؤں گی؟“ وہ پوری قوت سے چیلنی تھی۔

”آپ..... آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“ وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔

”تم نے حق نمک ادا کر دیا۔ نمک حلالی کا ثبوت دے دیا۔ اب چلے جاؤ۔ تمہاری رہنمائی کی مجھے مزید ضرورت نہیں ہے اور میں یہاں مہمان نہیں ہوں۔ برہان لغاری کی بیٹی ہوں اور ان کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اس جگہ پر، اس کی ہر شے پر میرا پورا پورا حق ہے، اگر اس حوالے سے کسی کو کوئی غلط فہمی ہے تو وہ بھول جائے۔“ وہ چیخ مچی کر کہہ رہی تھی۔

ذکی الدین براہِ پستانتا تھا۔ وہ نہ رک سکتا تھا اور نہ جاسکتا تھا۔ کرن وہیں رکھی کہیں کی کرسیوں میں سے ایک پر بڑے مطمئنانہ سے بیٹھ گئی تھی۔ وہ یہاں پہلی بار آئی تھی لیکن اس کے انداز سے کوئی اجنبیت یا گھبراہٹ ظاہر نہ ہو رہی تھی جو پہلی بار کسی نئی جگہ پر آنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔

”ذکی الدین صاحب! آپ جائیں۔“ اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر کرن بولی۔

”آپ کو اس طرح چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں؟“

”یہ میرا گھر ہے۔ آپ کو میری نگرانی پر کس نے مامور کیا ہے؟“

”نو بے بی! میرا مقصد یہ نہیں ہے۔“

”او کے بے بی! گڈ بائے۔“ وہ الجھا الجھا، اس کے اصرار پر وہاں سے نکل آیا تھا۔ گیٹ سے باہر اس کی کارکنزی تھی۔ اس میں بیٹھ کر اس نے برہان لغاری کو کال کی جو پہلی بیل پر ریسپونڈ گئی تھی۔ اس نے تمام صورت حال من و عن انہیں سنا کر مشورہ مانگا تھا۔

”تمہارا کام ختم ہو گیا ہے ذکی! تم جاؤ۔ ہم آ رہے ہیں، راستے میں ہیں۔“ موبائل آف کرتے ہوئے ذکی الدین کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی تھی۔ وہ کار لے کر چلا گیا۔

ذکی الدین کے جانے کے بعد وہ ڈھیلے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ غصے تو وہیں کے احساس سے اس کے اندر شعلے بھڑک رہے تھے۔ اسے معلوم تھا، اس کا استقبال شان دار طریقے سے نہیں کیا جائے گا لیکن اس طریقے سے کیا جائے گا کہ داخلی دروازے بند کر کے وہ دروازہ کھولا جائے گا جو اسے تیسرے درجے کے لوگوں کی صف میں لاکھڑا کر دے گا جو اسے کسی طور پر بھی گوارا نہ تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ جب تک برہان لغاری نہیں آئیں گے، وہ یہیں بیٹھے گی۔ دونوں اطراف میں بنائے لائز بہت سرسبز و شاداب تھے۔ مکی وغیر مکی پھولوں کی مسور کن مہک ہوا کے جھونکوں کو محسوس کر رہی تھی۔ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر سورج اپنی الوداعی شعاعیں نکھیر رہا تھا جو ہر سو پھیل کر ایک اداس کر دینے والا تاثر پھیلا رہی تھیں۔

دورانق پر بادلوں کے ٹکڑے تیز رہے تھے۔ پرندوں کی قطاریں تھی جو ترتیب سے ایک دوسرے کے پیچھے چو پرواز تھے۔ وہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھلتی شام کی تمام اداسیاں اسے اپنے وجود کے اندر سموتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے سر جھٹک کر آنکھوں میں آتی نمی سے چھٹکارا پایا۔ وہ طے کر کے آئی تھی کہ یہاں ایک آنسو نہیں بہائے گی۔

ملازما میں کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں آ جا رہی تھیں۔ وہ دور دور سے چور نظروں سے اس کی جانب دیکھیں اور اس کی نگاہ اٹھتے ہی سر جھٹکا کر آگے بڑھ جاتیں۔ اس طرف آنے کی کسی ملازمہ کو اجازت نہ تھی۔ یہ وہ سمجھ چکی تھی۔

ایک دم ہی ملازمن میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ سب تیزی سے الٹ ہونے لگے تھے۔ ان کی نگاہوں کے تعاقب میں اس نے دیکھا تو گیٹ سے پکارا اندر داخل ہو رہی تھی، اس کی نگاہیں سرعت سے اس جانب متوجہ ہوئیں۔

گازنی رکتے ہی ایک ملازم پھرتی سے آگے بڑھا اور بہت آہستگی سے دروازہ کھول کر سائیڈ میں سر جھٹکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر بڑی شان و بدم ہے سے اس نے اس شخص کو باہر نکلنے دیکھا تھا جس کو دیکھنے کی آرزو میں ایک جیون گزارا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں اس کی سرخ و سپید رنگت و بارعب شخصیت نمایاں تھی۔ انہوں نے چہرہ گھما کر ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی، پھر ملازم سے کچھ کہہ کر بڑے کدفتر سے آگے بڑھ گئے تھے۔

”صاحب بلار ہے ہیں آپ کو“۔ ملازم نے آکر اطلاع دی تو وہ طویل سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ برہان لغاری اوپر پہنچے تو گیٹ واقفا۔ اسی لمحے کرن بھی ان کے نزدیک پہنچ چکی تھی، اس نے سلام کیا۔ سر کی جنبش سے جواب دیا گیا۔ وہ اسے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ بھی پیچھے پیچھے چل دی۔

چھت کے وسط میں آویزاں خوب صورت قانونس سے دو وصیائی روشنیاں نکل کر ہر شے کو منور کر رہی تھیں۔ بالکل الف لیلوی ماحول تھا۔

حسین و جمیل خوب صورت..... خواب ناک تصوراتی، کینوں کی دولت و ثروت کا منہ بولنا ثبوت۔ کئی کمرے، لاؤنج، رواداریاں عبور کرتے وہ ایک کمرے کے آگے ٹوک گئے تھے۔ دروازہ ناک کرنے پر ایک ملازمہ باہر نکلی تھی۔

”مالکن کا حکم ہے، وہ ابھی آرام کر رہی ہیں، کسی سے نہیں ملیں گی“۔ موڈ باندا انداز میں وہ برہان لغاری کو سلام کرنے کے بعد گویا ہوئی۔ وہ بنا کچھ کہے واپس مڑے تو اسے بھی ان کی تقلید کرنی پڑی تھی۔

”مائی کیڈ!“ برہان لغاری نے آواز لگائی تو نہ معلوم کس گوشے سے بومل کے جن کی طرح ایک ادھیڑ عمر عورت فوراً حاضر ہوئی تھی۔ ”حکم سائیں حکم!“ وہ گردن جھٹکا کر ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”بی بی کو کمرہ دکھاؤ۔“ وہ حکم دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

”مجھے یہاں بلانے کا مقصد کیا ہے؟“ وہ سیکڑے کو نظر انداز کرتی تیزی سے ان کے مقابل آگئی تھی۔

”کون سا مقصد؟“ وہ اس کی جانب دیکھے بنا سخت انداز میں بولے۔

”دروازے بند کر کے میری تذلیل و اہانت کرنے کا، یہاں آنے والوں کا استقبال اسی طرح ہوتا ہے؟“ اس کے انداز میں بے

خونی تھی۔

”ہر جگہ کے اصول طے شدہ ہوتے ہیں اور یہی بات آنے والوں کی تو ان کی تو قیصر..... تو شخصیت اور ویلیوز کی بیک پر کی جاتی ہے۔“

وہ گویا بھرپور مظاہر کر دار و عزت کے حوالے سے اس کے منہ پر مار کر جا چکے تھے اور وہ بت بنی ان کے دور ہوتے وجود کو دیکھتی

رہی..... ساری زندگی کر دار و حرمت و چلن بنانے کی تک دو دو میں جس عورت نے گزارا ہی تھی۔ بد کرداری و بد چلتی کے الزام نے جس کی جان

لی تھی۔ مرکز بھی اس کی روح کو بے سکون اب اس طرح کیا جاتا تھا۔

مائی سیکڑے نہایت احترام سے اسے ایک کمرے میں لے آئی تھی۔ اعلیٰ فرنیچر، بہترین پردوں، اہورنڈ وال ٹوال کارپٹ سے

ڈیکوریشن اس کے اندر کی تھی کو فروغ کر سکتا تھا۔ وہ بے جان انداز میں سونے پر بیٹھ گئی تھی۔ خواہشیں وہ خوش رنگ و گل نرخ تھلیاں ہیں

کہ جن کے حصول کی خاطر ہم پیچھے بھاگ بھاگ کر پاؤں نکال کر لیتے ہیں۔ انگلیاں لہولہان اور جسم نیم مردہ ہو جاتے ہیں۔ جب نامرادی و

نامیدی کی کسک سوز حیات بن جاتی ہے، جن کے بغیر رہنے کی عادت ہو جائے تو پھر وہی خواہشات ان تھلیوں کی طرح ہاتھوں میں آتی ہیں

جن کے رنگ کھو گئے ہیں..... جن کے ہڈ ٹوٹ گئے ہیں..... جن کے وجود کا کھانچا بکھر گئے ہیں.....

بے کشش و بے مصرف چیزوں کا حصول بے معنی ہوتا ہے۔ شدید بھوک میں روٹی کا حصول وقت کی اولین و شدید ضرورت ہوتی

ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد ہر طلب اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے۔

وہ باپ سے ملنا چاہتی تھی..... دوھیال سے ملنا چاہتی تھی..... اس گھر میں رہنا چاہتی تھی، جہاں اب موجود تھی۔ خواہشیں پوری

ہوئی تھیں، امیدیں نہ آئی تھیں..... لیکن مردہ تھلیوں کی طرح.....

آنکھوں سے پھر ٹھکس سمندر موجزن ہونے لگا تھا۔

ماں کی یاد رگوں میں خون کی روانی کی طرح گردش کرنے لگی تھی۔ وہ طویل سانس لے کر سیدھی ہوئی تو مائی سیکڑے کو جنوز اسی

پوزیشن میں کھڑا دیکھ کر حیرانگی سے ہوئی۔

”تم آگئی نہیں؟“

”بی بی صاحبہ کا حکم ہوگا تو جاؤں گی۔“ وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے، گردن جھکانے لگا مانتا انداز میں بولی۔

”جاؤ۔“

”جو حکم بی بی صاحبہ! وہ آہستگی سے چلی گئی۔ کرن نے اٹھ کر دروازہ لاکھڑا کیا۔ سینڈل اتار کر سائیڈ میں رکھے اور سامنے بیڑی کی طرف بڑھ گئی۔ برادری اور گولڈن شیڈز کا خوب صورت بیڑا کور بے شکن تھا اور روم بیچنگ سے خوب صورت لگ رہا تھا۔

اسے سی کی وجہ سے پہلے ہی کمرے میں خاصی شگفتگی تھی۔ وہ بالوں سے کچھ نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر دروازہ ہو گئی۔ اچھے جذبات لے کر وہ یہاں داخل نہیں ہوئی تھی۔ کبیر کی وہ نظری اس کے اندر شدت سے موجود تھی، مگر جس اہانت آمیز انداز میں اس کا استقبال کیا گیا تھا۔ اس کی اسے اُمید نہ تھی کہ گھبرا کر ذلیل کرنا بے ضمیروں و کم ظرفوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ ان کی ایسی صفات سے وہ پہلے ہی واقف ہو چکی تھی۔ یہاں آ کر مہر تصدیق حبت ہو گئی تھی اور ساتھ ہی اس کے اندر بیانات و نظریات کی کبھی نہ بچنے والی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

پورے دن وہ صدمہ کو ساتھ لے کر برہان لغاری کی جستجو میں رہا اور اس کی رہائش گاہ ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ حالانکہ برہان لغاری کوئی ایسا شخص نہ تھا، جس کو تلاش کرنے میں دشواری یا ناکامی ہو۔ وہ اعلیٰ طبقات میں باحیثیت مقام رکھتا تھا، با اثر و بھرپور شخصیت کا مالک تھا لیکن..... اسے کون جتنے سے معلوم ہوا وہ اپنے چہرے کو کئی نقابوں میں چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی پر سنائی مضبوط مگر کچھ نہ اسرار بھی تھی۔ برنس ورلڈ میں وہ تنگ تھا۔ ظاہر و خفیہ کئی کاروبار کا وہ مالک تھا۔

اس کی کئی رہائش گاہوں پر وہ کرن کو تلاش کر چکا تھا۔ وہ اسے کہیں نہیں ملی تھی۔ چالاک اور ٹریڈ چوکی داروں سے وہ بڑے محتاط اور دانش مندانہ انداز میں معلوم کرتا رہا تھا۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ کوئی خالی ہے۔ نہ مظلوم صاحب کے گھر والے کدھر ہیں اور ان کی باتوں کی تصدیق خاموش و دیران نظر آنے والی جگہوں سے ہو جاتی تھی۔ وہاں سے ناکام ہو کر اس نے ڈائریکٹ برہان لغاری سے ملنے کی کوشش کی مگر وہاں بھی اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی تو بد دل ہو کر واپس ہو گیا تھا۔

”صبر سے کام لو یا اپنی طبیعت دیکھو۔ سارے دن کی خواری نے تمہاری حالت بگاڑ دی ہے۔“ صبر اس کا سرخ چہرہ اور اُداس آنکھیں دیکھ کر بولا۔

”مجھے ڈر ہے وہ اتنی خود کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔“ وہ نڈھال حال سائیڈ پر لیتا ہوا کمر مندی سے بولا۔

”تم جتنا کرن کو بھیننے کا دعویٰ کرتے ہو، اتنا ہی میں بھی کرتا ہوں۔ وہ ایسی اتنی ہرگز نہیں ہے جتنا تم سمجھتے ہو۔ لڑنے بھڑنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ یہ تم جانتے ہو۔ اس کے غصے کے آگے بڑے بڑے لوگ نہیں ٹھہر سکتے۔ پھر یہ نوزائیدہ تعلقات کیا اہمیت رکھتے ہیں؟“ صبر ہنستے ہوئے بولا۔

”وہ ٹوٹ چکی ہے۔ اس میں پہلے جیسی بات کہاں رہی ہوگی؟“

”تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے کہ تم دل سے سوچتے ہو اور میں دماغ سے۔ دل کے معاملے میں تو ویسے بھی کون ہوش مند رہا ہے جو تم رہو گے۔“

”میری چاہت کی کلیاں تو بین کھلے ہی مرجھا گئی ہیں، جہاں کل گلستان تھا، وہاں آج صحراؤں کی دھول اڑتی ہے۔ بے ارمانوں کی راکھ اڑتی ہے۔“

”اوہ..... گاؤ دیکھو بھائی! میں ویسے بھی خاصا بد دل و بے زار ہو گیا ہوں، ان جذباتی و غم زدہ مکالموں سے۔ گھر میں می پچھتاؤں و دکھوں کی تصویر نظر آتی ہیں تو ڈیڑی دکھ و غم کا چہلا پھرتا وجود۔ ان سے گھبرا کر ہا ہر آیا تو تم..... سوگوار محبت کا حزار بنے بیٹھے ہو، جو ہونا تھا ہو گیا، جو ہونے والا ہے اسے روکنے پر نہ تم قادر ہو اور نہ میں، پھر کیوں اندیشوں و دوسوسوں میں مبتلا ہو کر پریشان ہوں۔“ صمد نے اس بار خاصے چڑ کر غصے سے کہا۔

”اچھا فضول ٹرٹرمٹ کرو۔ روم سروس پر کھانے کا آرڈر دو۔ میں اسٹے میں کپڑے صینج کر کے آتا ہوں۔ خالی پیٹ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔“ حزرہ اٹیچڈ ہاتھ کی جانب جاتا ہوا گویا ہوا۔

”کھانے سے پیٹ بھر جائے گا مگر خالی ”دماغ“ کس سے بھر دے۔“ صمد نے شوشی سے کہا، جواہا حزرہ کی جانب سے کشن سمجھ کر مارا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو مام!“ منال نے ریسیور کان سے لگا کر چپکتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاؤ آر یو سوٹ گرل!“ خاصی چپکتی ہوئی آواز آ رہی ہے میری چڑیا کی۔ یقیناً کوئی گڈ نیوز ہے۔“ جواہا وہ بھی شوشی سے بولیں۔  
”ہوں۔ ہے تو گڈ نیوز، مگر مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس طرح بتا کے سمجھ جاتی ہیں؟“ منال ماں کی ایسی باتوں پر ہمیشہ حیران ہو جاتی تھی کہ وہ کہہ بھی نہ پاتی اور ادھر سے وہی بات کی جاتی جوا سے حیرانگی میں جھلا کر دیتی تھی۔

”سمجھ دار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے میری جان۔“

”آئم نوٹ ایگری ماما! آپ کے پاس کوئی بچک ہے۔“

”برین سے بڑھ کر بھی کوئی بچک ہو سکتا ہے سوئی؟“

”آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔“ وہ اُلجھتے ہوئے بولی۔

”پہلے بہت سمجھ دار تھیں، اب لگتا ہے اپنے قادر کی طرح چند دن سمجھ ہوتی جا رہی ہو۔ بات بات پر بچوں کی طرح سوالات کرنے بیٹھ جاتی ہو۔“

”اوہ..... سوری ماما! کچھ نکلی میں آج کل بہت اپ سیٹ ہوں۔ شاید اس وجہ سے ایسا رویہ کر رہی ہوں۔“ وہ کونٹس ہو گئی۔

”ابھی کہہ رہی تھیں کہ گڈ نیوز ہے۔ اب کہہ رہی ہے کوئی ٹینشن ہے۔ کیا سمجھوں میں، کیوں اتنی پریشا ناز ہو۔“

”آپ ٹینس مت ہوں۔ چلیں پہلے میں آپ کو گڈ نیوز سناتی ہوں۔ ڈیڑی کی سیکنڈ ڈائرا آج آ گئی ہے اور گریڈ مدر نے کلوز ڈور سے



اسے ویٹم کہا ہے۔“

کرن کے ذکر پر اس کے چہرے پر چھائی پریشانی ٹھکڑا ہٹ میں بدل گئی تھی۔

”وہ بہت ڈپلومیٹک وومن ہیں۔ پہلے ڈیڑھ کو پریشر انڈیا کیا کہ وہ اسے کل کے بجائے آج بلوائیں۔ پھر اس کے آنے سے قبل انہیں نہ معلوم کس کام سے فیکٹری روانہ کر دیا اور پھر اس کی آمد سے پانچ منٹ قبل تمام ڈورز کھلوا کر وہاں آئے اور نوکروں کو بھی حکم دے دیا کہ کوئی اس سے بات نہیں کرے گا۔“

”ہوں..... آپ کی دادی کے دماغ میں شیطان حکمرانی کرتا ہے۔ لوگوں کو کس طرح زچ کیا جاتا ہے؟ کس طرح ستایا جاتا ہے؟ یہ انہیں بخوبی علم ہوتا ہے۔ ہاں پھر آگے سناؤ کیا ہوا؟“ فائقہ بھی ہنستے ہوئی بولیں۔

”وہ آئی اور دروازہ بند ملا۔ بے چاری کی حالت اس وقت دیکھنے والی تھی۔ وہ سوچ رہی ہوگی اتنے اصرار سے بلوایا گیا ہے تو پردوں کو ل بھی دی آئی پی ملے گا یہاں تو ہندو دروازوں نے ویٹم کہا تھا۔ وہ ہکا بکارہ گئی تھی۔“

”آپ کہاں سے دیکھ رہی تھیں؟“

”اپنے کمرے کی کھڑکی سے۔ ڈیٹا سے اندر لے کر آئے پھر بھی گریڈ مرنے اس سے ملنے سے منع کر دیا کہ وہ آرام کرنے کے بعد ملاقات کریں گی۔“

”تھیں گس گا! آپ کے لیے راستہ کلیئر ہے، ورنہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ مکار بڑھیا اس لڑکی کے ساتھ مل کر کوئی اور ٹیم کھیلنا شروع کر دے۔ اپنی دے، کس وجہ سے اتنی ڈسٹرب ہو، جلدی سے بتاؤ۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے جس کے لیے تیاری کرنی ہے۔“ ان کے لہجے میں عجلت درآئی تھی۔

”میں سرور شاہ سے ڈائریوس لینا چاہتی ہوں۔“

”کیوں.....؟“ ان کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

”میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

”ہوں..... پھر انس مڈر کی محبت نے بے چین کیا ہے؟“ ان کے سنجیدہ لہجے میں معنی خیزی درآئی تھی، جبکہ اس کی آنکھوں میں چراغ سے جل اٹھے تھے۔ چہرے پر رنگ در آئے تھے۔

”میں ماما ڈیڈ کے کہنے پر میں نے وہ سب کر تو دیا مگر میرے دل میں آج تک اس کی محبت کی آگ بجڑ رہی ہے، جس نے اتنے عرصے بعد بھی مجھے اس سے دور نہیں ہونے دیا۔“ اس کے دھیمے لہجے میں ٹھنکی تھی۔ قبل اس کے کہ بات مزید آگے بڑھتی، دروازے پر باہر سے ہونے والی دستک نے اسے ریسیور رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو باہر ملازمہ تھی جو کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ اسے ابھی آنے کا کہہ کر وہ ڈیریٹک ٹیبل کی جانب آئی تھی۔ قہری سائیڈ ڈمرز میں اس کا کس نمایاں تھا۔

وہاٹ اینڈ بلوکاشن کے دیدہ زیب سوٹ میں اس کا ملوٹی حسن اپنی رعنائیاں نکھیر رہا تھا۔ میچنگ ڈائمنڈ جیولری کی دیک اس کی آنکھوں سے مشابہ تھی۔ شانوں پر بکھرے اخروئی بالوں سے خوشبوئیں پھیل رہی تھیں۔ وہ خوش تھی۔ گزرتے وقت نے اس پر اپنے کوئی اثرات مرتب نہیں کیے تھے بلکہ اسے پہلے سے زیادہ نکھار عطا کیا تھا۔

ہرز اوپے سے اپنا جائزہ لینے کے بعد وہ مطمئن ہو گئی۔ ہیئر برش بالوں میں بھرنے کے بعد شاگ پٹک لپ اسٹک ہونٹوں پر لگانے کے بعد وہ پرفیوم اسپرے کر کے کمرے سے نکل آئی اور ڈائمنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

فانوسوں کی دوو حیار و شنیدوں میں منور ڈائمنگ ہال میں وسیع و عریض ڈائمنگ نچل کے گرد ڈیڈ اور گرینڈ مر پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ برہان لغاری بنی کو دیکھ کر شفقت سے مسکرائے تھے۔ والدہ حضور کے سپاٹ و سنجیدہ چہرہ پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ وہ کلف شدہ کپڑے کی طرح اکڑی بیٹھی تھیں۔

”بڑی مزے دار خوشبوئیں آ رہی ہیں۔“ وہ ان کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”تمام ڈشز آپ کی پسند کی ہیں۔“ برہان نے کہا۔

”پھر تو مزہ آ جائے گا..... بھی وہ کہاں ہیں ہماری سویٹ اینڈ لائل سسر۔ ہماری تو ملاقات ہی نہیں ہوئی ان سے۔“

”آ رہی ہیں، ابھی ملاقات کر لیجئے گا۔“

”گرینڈ مر بڑی خاموش ہیں۔ کیا ہماری سسر کی آمدنا گوار گزری ہے آپ کو؟“ وہ بڑی مصومیت سے ان سے مخاطب ہوئی۔

”والدہ حضور کے اصرار پر ہی ہم اسے یہاں لائے ہیں پھر نا گوار کی کہی؟“

”جو ہم نے چاہا وہی اس گھر میں ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ یہ نا پسندیدگی و نا گواری جیسے الفاظ ہمارے اختیارات کی ڈسٹری

میں نہیں ہیں۔ ہم حکم دینا اور حکم منوانا جانتے ہیں۔ ایسے لفظوں، ایسے جذبوں کی ہمارے یہاں گنجائش نہیں ہے۔“ حسب توقع ان کی باوقار و سپاٹ دار آواز نے بے چلک انداز میں اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔

برہان لغاری اثبات میں سر ہلا ہلا کر ان کی باتوں کی تائید کر رہے تھے، جبکہ ان کا انداز سے ہمیشہ کی طرح جلا گیا تھا۔

”سرور شاہ کا فون آیا تھا۔“ وہ ایک نگاہ منال پر ڈالتے ہوئے برہان لغاری سے مخاطب ہوئیں جو ماں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر

سیدھے ہونٹیں تھیں۔

”وہ شکایت کر رہے تھے کہ گزشتہ چھ ماہ سے منال نے ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھا ہے، نہ ملنے کو تیار ہے اور نہ فون اٹینڈ کرنے

کو۔ بچہ بھی ماں سے ملنے کو بے چین ہو رہا ہے۔“

”وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ نہیں ہوں میں اس کی ماں۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”یہ تمہیں اسی وقت سوچنا چاہیے تھا جب تم اس کی ماں بننے کو تیار ہوئی۔“ وہ سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

”غلطی تھی وہ میری۔ اب میں اس غلطی کو دہرائی نہیں چاہتی۔“

”اگر کوئی پرائیلم ہے تو بتائیں۔ سرور شاہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے جس کو اس طرح نظر انداز کیا جائے، پھر اس سے ہمارے پرنس ٹرمز ہیں جو بہت مضبوط ہیں۔“ برہان لغاری ننگرانہ انداز میں بیٹی سے مخاطب تھے۔

”ڈیڑ! ہم اس میٹز کو پھر کبھی ڈسکس کریں تو بہتر نہ ہوگا؟..... لعل سسٹرز سے پہلی بار مل رہی ہوں۔ ایسے میں ہمارے ذاتی معاملات منکشف ہو جائیں تو ہماری پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے ہم رات کو یہ ٹاپک ڈسکس کریں گے۔“

”ڈیڑ! یہ رات تو ہو گئی ہے۔ آپ کس رات کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ مسکرائی تو برہان بھی دھیرے سے مسکرا دیے تھے۔ ان کی نگاہیں رسٹ واپس پر تھیں۔ مائی سیکرٹ کو کرن کو بلانے کے دس منٹ ہو چکے تھے اور وہ ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔

پندرہ منٹ بعد واپس آئی بھی تو تنہا تھی۔

”بلی بلی صاحبہ کو بھوک نہیں ہے۔ وہ کھانا نہیں کھائیں گی۔“ وہ آکر اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی۔  
یہ انکار ایک تھپڑ تھا۔

جوان ماں بیٹے کے منہ پر بھر پور طریقے سے شبت ہوا تھا۔ لمبے بھر کو والدہ حضور کے چہرے پر سرخی نمودار ہو کر عائب ہو گئی۔

برہان لغاری غم و غصے کے باعث ساکت رہ گئے تھے کہ ایسا کب ہوا تھا یہاں اور کون اتنا دلیر تھا کہ ان کے حکم سے رُڈ گردانی کی ہمت کر سکے۔ ان کے بلاوے کو سرے سے اہمیت ہی نہ دے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھے۔

”بیٹھ جاؤ برہان!“ والدہ حضور ان کا ارادہ بھانپ کر بولیں۔

”اس کی یہ ہمت! ہماری چہمت تلے رہ کر ہماری حکم برداری کرے۔“

”ہم کوئی تماشہ نہیں چاہتے۔ بیٹھ جاؤ۔“

”اس کی گستاخی کی سزا فوراً دی گئی تو وہ مزید نڈر ہو جائے گی۔“ طوہاؤ کہہ ماں کے حکم پر بیٹھتے ہوئے وہ آتھیں لہجے میں بولے۔

”جہاں وہ جیون گزار کر آئی ہے، وہاں ایسی خاندانی و نجیب الطرفین تربیت کہاں ہوتی ہے۔ گھٹیا خاندان کے کٹر لوگ بھلا ہمارے مرتبے تک کہاں پہنچ سکتے ہیں، جہاں وہ رہی وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”نہیں والدہ حضور! میں اس گستاخی کی سزا سے ضرور روں گا۔“

”کچھ میں پتھر پھینکو گے تو جھینٹوں سے خود کو بھی نہ بچا پاؤ گے۔ وہ بد تمیز اور گستاخ ہی نہیں، ضدی و سرکش بھی ہے۔ اس کا مزاج

اس کی اس ایک ادا نے ہی بتا دیا ہے۔“

”بڑے بڑے سرکش واژیل جانور یہاں سدھر جاتے ہیں۔ وہ کیا شے ہے؟“ برہان لغاری کے لہجے سے شعلے نکل رہے تھے۔  
 ”اس کے لیے ایک تکیل ہی کافی ہے، جس کا انتظام میں نے قبل از وقت کر رکھا ہے۔“ والدہ حضور کے لہجے میں بڑا سراہت  
 جھلک آئی تھی۔ برہان لغاری نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا تھا۔

”کامران مرزا کی بڑی خواہش ہے ہمارے خاندان سے اپنے تعلقات مربوط کرنے کی تو میں نے سوچا ہم کیوں پیچھے نہیں۔ دیکھے  
 بھائے خاندانی لوگ ہیں۔ کرن کو ہم ان کے کلوٹے صاحب زادے عمران کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کر کے کیوں نہ سرخرو ہو جائیں؟“  
 ”گر بیٹہ مدراوہ عمران.....“ خاموش بیٹھی منال نے کچھ بولنا چاہا تو انہوں نے بارعب آواز میں اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔  
 ”جب دو بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹوں کو خاموش بیٹھنا چاہیے۔“ ان کا انداز ایسا ہی ہوتا تھا، جلتی پر تیل چھڑکنے والا اور  
 منال جو سراپا شعلہ تھی، ان کے اس انداز پر شعلہ جوالہ بن جاتی تھی مگر بہت ساری مصلحتوں کے تحت اپنے غصے و جنون، نفرت و عداوت کو ظاہر  
 نہیں ہونے دیتی تھی۔

☆.....☆.....☆

مائی سیکڑ کو واپس کر کے ان تمام دیکھتے انگاروں پر گویا شبنم کرنے لگی تھی جو اس دلہیز کو صبور کرتے ہی اس کے اندر دھک اٹھے تھے۔  
 ایک کیف و سرور کی کیفیت تھی جو رگ و پے میں دوڑتی اس کے ایک ایک گوشات کرنے لگی تھی۔ خاصے عرصے بعد اس کے لبوں پر آسودہ  
 مسکراہٹ اُبھری تھی۔ اس نے بیڈ پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر گلے میں ڈالا اور ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔ واٹس ٹیسن کے اوپر آویزاں آئینے میں  
 اس نے اپنا چہرہ مدت بعد غور سے دیکھا تھا۔  
 سفید رنگت میں زردیاں کھلی تھیں۔

ڈارک براؤن دراز پلکوں والی آنکھیں بچھے دیکھنے کی مانند تھیں۔ ڈراک براؤں دراز بالوں کی پھوٹی سے بال بے ترتیبی سے نکل  
 رہے تھے۔ اتنا بے روزق چہرہ و پڑھر دو جو داس کا اس وقت بھی نہ تھا جب وہ ماموؤں کے ہاں رات دن کی حج حج میں مبتلا رہتی تھی۔  
 عادل اس کی واحد دوست تھی، وہی اسے احساس دلانے کی سعی میں رہتی کہ وہ بے حد حسین ہے، اگر ہر وقت چڑچڑے پن و غصے  
 سے باہر نکلے تو شاداب رنگ و روپ مزید نکھر جائے۔

مگر اس نے کبھی خود پر توجہ نہ دی تھی۔ بننا سنورنا، آرائش و زیبائش جیسے جذبات سے وہ کوسوں دور رہی تھی پھر..... نہ معلوم کیوں  
 اس لمحے اپنی مانند پڑتی رنگت و کشش کھوتے حسن کا خیال در آیا تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ بال بنانے لگی۔ اسی اثناء میں دروازہ ٹاک کرتی منال اندر داخل ہوئی، اسے دیکھ کر کرن کھڑی ہو گئی۔  
 ”جسمیں تو ہم سے ملنے کا شوق نہیں ہے مگر ہم تم سے ملے بنا نہیں رہ سکتے۔“ وہ بڑے کروفر سے صوفے میں بیٹھتی ہوئی بے تکلفانہ  
 انداز میں گویا ہوئی۔

”آپ منال ہیں؟“ کرن اس کی جانب متوجہ ہو کر نارمل انداز میں بولی۔

”بس..... ہم منال ہیں۔ شکر ہے تم نے ہمارے نام کے ساتھ وہ باجی، آپا، آپا جیسے بیک درڈور ڈنڈنیں لگائے جو ہمیں پسند نہیں ہیں۔“

”باجی، آپا، آپا، آپا یہ محض لفظ نہیں، ایسے جذبے ہیں جن کی گہرائی دل کی زمین کی جڑوں تک رسائی رکھتی ہے۔ محبت کے تعلقات مربوط ہوتے ہیں۔ آپ نہیں سمجھ سکتیں ان فیلنگز کو۔“

”آف کورس۔ یہ منڈل کلاس کی فیلنگز ہوتی ہیں۔ ہماری کلاس کا مقصد تمہاری کلاس سے ملج نہیں ہوتا۔“ اس کے انداز سے نخوت و برتری کا کلی احساس آ جا کر ہو رہا تھا۔ وہ اس کی جانب حقیرانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی بھی طور اس سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ان کے لیے اس کے دل میں کوئی نرمی پہلے ہی نہ تھی۔ اب ان کے رویوں نے اسے بالکل ہی بے نیاز کر دیا تھا کہ وہ ان سے مردانہ بھی اخلاق برتنے کو تیار نہ تھی۔

”ڈیڈ تیار ہے تھے، تم نے انس مدر کے ہاں جا ب کی ہے۔ کیسا پایا ان لوگوں کو..... آئی مین کیسے لوگ ہیں وہ؟“ وہ کرن کی جانب بٹور دیکھتی ہوئی بولی۔

”یہ مجھ سے زیادہ آپ بہتر جانتی ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔



کرن کے پُر اعتماد انداز میں ایسی اُن دیکھی جہن تھی جس نے منال کو سرتا پا بے یقین کر کے رکھ دیا تھا، چند لمبے وہ کچھ کہہ نہ سکی تھی۔ چند لمبے ان کے درمیان سکوت رہا تھا پھر منال نے کہا۔

”تمہارا ان کا ہر وقت کا ساتھ رہا ہے، مجھ سے فریڈ شپ اتنی کلوز ڈنڈری کہ میں ان کو بخوبی جان سکتی۔“

”میں نے وہاں ملازمت کی ہے اور اپنے کام سے کام رکھا ہے۔ ملازم اور مالک میں جو فرق ہوتا ہے، جو فاصلہ ہوتا ہے، اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔“

”تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔“ منال بے وجہ بھڑک اُٹھی تھی۔

”مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”تمہارے اور ان کے درمیان مالک اور ملازم کا رشتہ ہوتا تو وہ تمہیں یہاں بھیجے پر اتنے معترض کیوں ہوئے؟ پھر جو تمہارے وہاں شٹ باٹ تھے، وہ کسی ملازم کے نہیں ہوتے۔ تم ان کے ساتھ بیٹھ رہی ہو، کھا رہی ہو، رہ رہی ہو، ہر شے پر مالکوں کی طرح حکمرانی کر رہی ہو، پھر یہاں بھیجے پر شانس راضی تھا اور نہ اس کا باپ! پھر تم کہتی ہو تم وہاں ملازمت کر رہی تھیں۔“

کرن نے مسکراتی نگاہوں سے اس کے خوب صورت چہرے کے بگلے زاویوں کو دیکھا، کچھ لمبے قیل بے تھاشا حسین نظر آنے والا کا چہرہ شدید غصے و خنجر کے باعث بگڑ کر رہ گیا تھا۔

”میں جو بھی کر رہی تھی، میرا ذاتی معاملہ تھا مگر آپ کی جاسوسی اور اب تفتیشی انداز کو میں کیا معنی دوں؟“ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

”میرے جوتے کے برابر بھی تمہاری حیثیت نہیں ہے، میں تمہاری جاسوسی کیوں کروں گی؟“

”پھر ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟“

”تمہیں، تمہاری اوقات یا دولائے رکھنے کے لیے، اس محل میں آ کر خود کو یہاں کی حق دار مت سمجھنے لگنا۔ یہ سب میرا ہے، تمام دولت و جائیداد کی میں بلا شرکت غیرے مالک ہوں۔“ کرن کا اعتماد سے دہکا رہا تھا۔

”اس پر گفتگو ہم پھر کبھی کریں گے، فی الوقت میں آرام کرنا چاہتی ہوں اور جب میں آرام کرتی ہوں تو کسی کی موجودگی برداشت نہیں کرتی۔“ دوسرے معنی میں وہ اسے وہاں سے جانے کا کہہ رہی تھی۔

کرن کے اس انداز پر لمبے بھر کو اس کا چہرہ بے تماشا سرخ ہوا تھا۔ تنگ پیشانی پر بے شمار سلوٹس ابھرائی تھیں۔ آنکھیں شعلے سے اگلنے لگی تھیں، اس نے سلتکتی لٹا ہوں سے کرن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”او کے ہی پوا گین۔“ اور تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئی۔

کرن نے اس کے قدموں کی دھمک بند دروازے کے پار دور تک سنی تھی۔

وہ کیا جانا چاہتی تھی؟

اس کی لٹا ہوں میں کیا کھوج تھی؟

اس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا، وہ وہاں بھی بن بلائی گئی تھی، مجبوری کی چابک برداشت کرنے ہوئے محبت، اجنبیت، انیت و لاتعلقیہ کے نئے انداز دیکھے تھے، وہاں بھی اور یہاں آ کر جس انداز میں پذیرائی ہوئی تھی وہ انداز بھی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا تھا۔ ہرمزاج، ہر انداز، ہر طبیعت سے واقف ہونے کے باوجود وہ آج تک کسی ایک انسان کو بھی کھل طور پر سمجھ نہ پائی تھی۔

انسان..... رب کائنات کی بہترین تخلیق، جس کو اس نے اشرف المخلوقات کا اعلیٰ و مستبرجہ دیا۔ اس کی اصلاح و ہدایت کے لیے بے حد ذرائع مختلف انداز و صورتوں میں پیدا کیے اور اپنی محبتوں کی، محتاجوں کی، رستوں کی نوازشیں بے بہا کر دیں۔ انسان ازل کا ناشکرا، شکر کے کلمات سے ناواقف ہے۔ اس نے یہی دیکھا تھا شکر و صبر، برداشت و تحمل، رواداری و انکساری کے وہ جذبات جو انسان کو ایک دوسرے کی محبت سے مرشار کرنے کا باعث تھے، مفقود ہو چکے تھے۔ ایک سے خدو خال اجسام رکھنے والے لوگ بالکل مختلف تھے۔ کسی ایسی وحیدہ، کبھی نہ سمجھ آنے والی مشینری کی طرح۔ اس نے طویل سانس لے کر پشت کی جانب نظر آنے والی کھڑکی کو کھولا چاہا تو کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ کھڑکی کے شفاف شیشے سے نظر آنے والا لان کا حصہ بزرے سے ڈھکا ہوا تھا۔ سرو کے درخت شان سے سر بلند کھڑے تھے۔ ہمارے اندر سکون، طمانیت، مرشاری و بے فکری کی حکمرانی ہو تو صحرا بھی گلستان نظر آتا ہے، برائی میں بھی اچھائی کے پہلو نکل آتے ہیں اور جب احساسات کی دنیا میں تسلسل سے پریشانیاں، ٹنگرات، مصائب کا سلسلہ دراز ہی رہے تو خوب صورتی یا بد صورتی کوئی کشش نہیں

رکھتی۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔

وہ تقدیر کے لیے تجھ مشق تھی جو مسائل و مصائب کا ہر تیرا اس پر آزمائی آئی تھی۔ اب نئے انداز میں وہ اس کے نکلنے پر تھی۔  
یکے بعد دیگرے وہ تینوں ستوں میں آویزاں کھڑکیوں کے شیشے چیک کرتی گئی۔ تمام ہی لاکھڑے تھے۔ وہ بے جان انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”یہ کمرہ ہے یا قید خانہ اور مجھے اس طرح قید کرنے کا مقصد؟“ وہ بڑبڑاتی تھی۔ اسی دم دروازے پر دستک ہوئی تھی، اس نے دوپٹہ درست کر کے اس طرف دیکھا تو برہان لغاری اندر آ رہے تھے۔ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

انہوں نے بے آواز دروازہ بند کیا پھر درشت لہجے میں گویا ہوئے۔

”اس عورت نے تمہیں میسرز، ایٹنی کیٹس نہیں سکھائے؟“

”مجھے بھوک نہیں تھی، میں نے منع کر دیا۔ اس میں میسرز کی کیا بات ہے؟“

”اعلیٰ اخلاق، اعلیٰ تربیت بڑوں کی تنظیم و عزت ہماری روایات کا سب سے بلند درجہ رہا ہے۔ بچپن سے آج تک ہم نے والدہ حضور کی حکم حدودی نہیں کی اور کرنا تو ایک طرف کبھی سوچا بھی نہیں۔ ان کی ہر پکار پر ہم رات ہو یا دن دوڑے چلے جاتے ہیں کہ ان کی دعاؤں کے طفیل، ان کے قدموں کی برکت سے آج برہان لغاری کو ایک دنیا جانتی ہے، مانتی ہے، ان کے آگے تمہارے باپ کی جرأت نہیں ہوتی نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی اور تم نے..... تم نے انکار کر دیا ان کے ساتھ کھانا کھانے سے۔“ وہ بھرے ہاتھوں کی طرح برس رہے تھے، گرج رہے تھے۔ کرن ان کی شیطانی آنکھوں کی تپش اپنے چہرے پر بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

”آپ بلاوجہ اتنے سیریس ہو رہے ہیں، میں نے کوئی بد تمیزی یا گستاخی نہیں کی ہے۔“ وہ ان کے گرجنے، برسنے سے ذرا مرعوب نہ ہوئی تھی۔

”بد تمیزی، گستاخی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے تمہیں سکھایا یہی گیا ہے بلکہ اب تو میرے دشمنوں نے اس سے بھی زیادہ زہر بھرا ہوگا، تا کہ میرا تماشہ دیکھ سکیں۔ مگر ایسا کبھی بھی ممکن نہیں ہوگا، میرے دشمن یہ حسرت لیے قبروں میں دفن ہو جائیں گے۔ برہان لغاری نے کبھی شکست نہیں کھائی۔ برہان لغاری فاتح ہے، وہ جیتنے کے لیے پیدا ہوا ہے، بڑے بڑے سوہا یہ حسرت دلوں میں لیے چلے گئے ہیں۔“  
غرور تکبر، رجوت بن کر ان کے چہرے پر چھا گئے تھے، بلند قامت و بھرپور شخصیت کے مالک برہان لغاری کرن کو اس وقت بہت کوتاہ قامت و کم ترگ رہے تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو سچ بتا دو، کیا پلان کیا ہے تم نے مڈ اور انس کے ساتھ مل کر۔ سیدھی طرح بتا دو گی تو تمہارے لیے بہتر ہے ورنہ بے حد طریقے آتے ہیں مجھے حقیقت جاننے کے، سچ اگھوانے کے۔“ ان کا انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔ وہ بخورمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
کمرے میں داخل ہوتے وقت وہ قہر و غضب کی زعمہ تصویر تھے۔ کچھ دیر قبل اپنی بڑائی و دانائی بیان کرتے وقت تکبر و خنجر کی زعمہ

مثال تھے تو اب سفاکی و بے ضمیری ان کے روپ میں مجسم تھی۔ ہل ہل روپ بدلنے والا یہ شخص سب کچھ ہو سکتا تھا مگر باپ نہیں۔

”مجھے جواب چاہیے، اس طرح خاموشی سے کام نہیں چلے گا۔“

”کاش! پیدا ہوتے ہی میں مرگئی ہوتی یا میری پیدائش سے قبل آپ۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو.....؟“ وہ دھماکتے ہوئے چند قدم آگے آئے۔

”آپ نہ کبھی اچھے شوہر ثابت ہوئے، نہ اچھے باپ اور آج آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ اچھے انسان بھی نہیں ہیں، بلکہ آپ کو میں انسان ہی نہیں سمجھتی۔“ اس کے ایک ایک لفظ سے نفرت، از حد نفرت فک رہی تھی۔ برہان لغاری کو اس کا انداز برداشت کی حدوں سے آزاد کر چکا تھا۔ انہوں نے سخت اشتعال میں آگے بڑھ کر کئی تھپڑ اس کے رخساروں پر دیئے اور چیخنے ہوئے کہا۔

”تم نے بھی ثابت کر دیا کہ تم اسی کتیا کی بیٹی ہو جس کو دھکے مار کر اس گھر سے نکالا گیا تھا، جس نے کتیا کی طرح ہی لوگوں کے نکوے چاٹ کر، ان کے بچے کھچے پھینکے گئے ٹکڑوں پر زندگی گزارنی اور مرتے دم تک اس گھر میں آنے کے لیے ترستی رہی مگر..... تمہیں میں وہ سزا دوں گا اس زبان درازی اور بدتمیزی کی کہ مرتے دم تک سکون و آرام کو ترسوگی۔“ شدید غصے میں وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ ”جھکی ماں ویسی بیٹی، والدہ حضور درست کہتی تھیں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

اس کے اندر دو رنگ مہیب سناٹا پھیلنا چلا گیا تھا۔ قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ رخسار ایسے دھک رہے تھے کہ ان کی تپش سے روح تک تجلی جا رہی تھی۔ یہاں آنے سے قبل اسے یقین تھا کہ اس کی پڑ بھرائی پھولوں سے نہیں کی جائے گی مگر اتنی جلد کاتوں سے سواکت ہوگا، اس کی بھی اُمید نہیں تھی۔

”یہ عزت افزائی و توقیر ابتدا ہی ہے، کرن برہان لغاری صاحبہ اس گھر میں آنے کے لیے، اس باپ کو پانے کے لیے تم نے اپنی فرشتوں جیسی سا برہان کا ہل ہل دل گھائل کیا تھا، زلایا تھا، بڑپایا تھا۔ یہ ”عزاز“ اسی کرنی کا پھل ہے۔ ابتدا ہے ابھی انتہا نامعلوم کیا ہوگی؟ میں نے ماں کا بہت مہر سمیٹا، زندگی کا ایک حصہ انہوں نے میری وجہ سے نہایت اذیت میں گزارا۔ میں اپنے حال کو روٹی رہی، ان کے کرب کو جاننے کی کوشش نہ کی، جس میں وہ مبتلا رہی تھیں۔ مجھے یقین ہے میری ماں نے کبھی مجھے بددعا نہیں دی ہوگی، کوئی ماں دے ہی نہیں سکتی اور میری ماں جیسی کبھی بھی نہیں..... مگر وقت ہر لمحے کا حساب رکھتا ہے، جو ہم کرتے ہیں وہ ہمیں خاص وقت پر واپس کر دیتا ہے، مجھے بھی میرا کیا ہوا لوٹایا جانے لگا ہے اور میری صورت میں برہان لغاری کو بھی اس کے کیے کا بدلہ ملنا شروع ہو چکا ہے۔“ اس نے خشک آنکھوں کو گڑتے ہوئے نئے عزم سے سوچا۔

☆.....☆.....☆

بخارا اس کا اتر گیا تھا۔ سر کے درد سے مکمل چھوٹکارا نہیں ملا تھا۔ تین دن بخارا اور سردرد کے باعث وہ بستر سے اٹھ نہ سکا تھا۔

آج اس نے طبیعت میں خاصی بہتری و جستی محسوس کی تھی۔ اٹھ کر پہلے اس نے ہاتھ لیا، پھر روم سروں سے تاشہ منگوا کر ناشہ



کیا۔ صمد دوروز سے نہیں آ رہا تھا اور یہ غیر معمولی بات تھی جو اس کی طرف سے اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے بھیل پر رکھا سو بائبل اٹھایا اور چیک کیا۔ اس کی طرف سے نہ میسج تھا اور نہ ہی کوئی کال کی گئی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”صمد کسی پراہلم میں ہے، ورنہ اس طرح قانع نہیں رہ سکتا۔“ اس نے کسی جذبے کے تحت بے اختیار اس کا نمبر پیش کر ڈالا تھا۔ دوسری جانب مسلسل بتل جا رہی تھی اور دوروز سیونٹس کر رہا تھا۔ اس کے اندر عجیب سی بے چینی بھیل رہی تھی۔ وہ اٹھ کر سلائیڈنگ ڈور کھولا ہوا باہر جھانکنے لگا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھوکے نے اس کا استقبال کیا تھا، بے ساختہ اس کی ٹکاپیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ گہرے سیاہ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ خواب ناک سا اندھیرا ہر سو پھیلا ہوا رات کا سماں پیدا کر رہا تھا، حالانکہ ابھی دن کا آغاز ہوئے چند گھنٹے ہوئے تھے۔ گہرے سائے سورج کو ڈھانپ دیا تھا۔ بارش کا موسم دل کا موسم ہوتا ہے جو اپنے اندر بہت ساری کیفیات لے کر آتا ہے، پھر اپنے ساتھ کسی کے دل اور کسی کی آنکھوں کو برسائے جاتا ہے اور ہر سو مل قتل کر دیتا ہے۔

اس کے اندر ماحول کی تمام تھکن و جس سرایت کرنے لگی۔ بے کل وہ پہلے ہی تھا، اب مضطرب بھی ہونے لگا، اس نے دھواں دھواں ہوتی براؤن آنکھیں نیچے سڑک پر بھاگتے دوڑتے ٹریفک پر لگا دیں۔

گازٹیوں کی بے پتہ آوازوں نے ماحول کے سکوت میں عجیب ارتعاش ڈالا تھا۔ آسمان سے شفاف موتیوں کی لڑیاں گرتی شروع ہو گئی تھیں۔ جزہ نے سڑک سے لگا ہٹا کر نیچے لان پر ڈالی تھی جہاں لوگوں کی بڑی تعداد برسات کو اٹھانے کرنے جمع ہو گئی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر سلائیڈنگ کھینچ دی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیڑ پر بیٹھا گیا۔ ذہن کی اسکرین پر جیسے لحوں کے کچھ ٹکس لہرانے لگے تھے۔

”اوہ گاڈ! یہ بارش پھر آگئی؟“ کرن نے ناگواری سے لان میں دم جم برستے پانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسکول سے آ کر سوئی تو ابھی اٹھی تھی۔

”پھر آگئی.....؟ پھر آگئی سے کیا مراد..... کب آئی تھی؟“ صمد نے حیرانگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سب وہاں جمع تھے۔

”ابھی پچھلے سال ہی تو اور کب۔“ وہ اسے گھور کر بولی۔

”ابھی..... یعنی..... پچھلے سال!..... ایسے کہہ رہی ہو جیسے پچھلے گھنٹے کی بات ہو، معلوم بھی ہے ایک سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں۔“

”تمہارا میٹھ تو ہمیشہ سے کمزور رہا ہے مگر اتنا کمزور نہ تھا۔“ کرن اس کی جانب دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں گویا ہوئی۔

”تمہاری یادداشت شروع سے دیک رہی ہے تو تمہیں کس طرح یاد ہوگا۔“

”ارے بابا بس کرو، معمولی سی بات کو جھنڈا بنا لیتے ہو، موسم تم لوگوں پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔“ جزہ نے ان کے بدلتے

تیار دیکھ کر مداحلت کرنی ضروری سمجھی اور اس کی مداحلت کا آراء ثابت ہوئی تھی۔ وہ ٹرائل میں رکھے موسم کے پکوان پر جت گئی تھی۔ کرن نے ایک سموسہ پلیٹ میں رکھا، اس پر ڈھیر سارا کچپ ڈال کر کھایا اور اپنا گ چائے سے بھر کر وہاں سے ہٹ آئی تھی کہ جب تک وہاں رہتی ان کی خون خوارنگا ہوں وزبانوں کی زد میں رہتی۔ وہاں سے ہٹ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ نوشاہہ، بھادجوں کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔ وہ آدھا کپ چائے پی چکی تھی، جب حزرہ وہاں چلا آیا تھا۔

”وہاں سب بارش انجوائے کر رہے ہیں اور تم اس بند کمرے میں بیٹھی ہو۔“

”مجھے بارش اچھی نہیں لگتی۔“

”واٹ..... تم بالکل احمق بلکہ غیر رومانٹک لڑکی ہو۔ بارش بھی بھلا کسی کے لیے ناپسندیدہ رہی ہے۔“ وہ جھنجھلایا تھا۔

”تم خود رومانٹک ہو سکی کافی ہے۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”کافی نہیں ہے، اس کے لیے تمہیں بھی رومانٹک ہونا پڑے گا۔“ اس کا لہجہ از خود دھیمہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں غماز چھانے لگا تھا۔

”مجھے کسی پاگل کتے نے نہیں کاٹا ہے جو رومانس رومانس چلاتی پھردوں۔“ اس تک خالی کر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

”ان کو پاگل کتا کا فتا ہے جو رومانس کرتے ہیں؟“

”ہاں..... مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“

”اوہ گاڈ! اب کیا میں یہ دعا کروں کہ تمہیں پاگل کتا کاٹ جائے۔“ وہ آہستگی سے بڑبڑایا۔ وہ سن نہ سکی۔

”آج کل بڑی رومانس کی ٹکر لگ گئی ہے، کیا کسی لڑکی سے محبت و جت ہو گئی ہے؟“ وہ چارپائی کی چادر درست کرتے ہوئے

شوخی سے بولی۔

”ہوں۔ ہوتی گئی ہے۔“

”کیا..... سچ؟“

”ہاں، بالکل سچ۔“

”کون ہے وہ؟“ وہ مارے تجسس کے نیچے پرکھ چڑھاتے ہوئے زک مٹی۔

”بے ایک لڑکی پاگل پاگل سی۔“

”کہاں رہتی ہے؟“

”میرے دل میں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟ تم مجھے اُلٹا بنا رہے ہو۔“

”بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ وہ ہنس پڑا تھا

”اچھا یہ عشق کا بھوت تمہارے سر سے نہ اتر دیا تو میرا نام بدل دینا، میں ابھی جا کر بڑی آئی کو بتاتی ہوں کہ ان کے صاحب زادے کسی پاگل لڑکی کے عشق میں خود بھی پاگل ہو گئے ہیں۔“ وہ بکیہ رکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

”او فوہ! میں مذاق کر رہا تھا اور تم سیریس ہو گئی ہو۔“ وہ اٹھ کر اس کے راتے میں حائل ہو گیا، تاکہ وہ میٹک نہ پہنچ سکے۔

”بزدل! ابھی تک ڈرتے ہو بچوں کی طرح۔“ وہ چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”میرا ڈرنا ہی اس لڑکی کے حق میں بہتر ہے، کیونکہ وہ لڑکی شاید کبھی نہیں سمجھے گی، مگر می فوراً سمجھ جائیں گی اور پھر کیا کچھ نہ ہوگا۔“

”کیا سوچ رہے ہو؟“ کرن اسے خاموش دیکھ کر گویا ہوئی۔

”یہی کہ تمہیں بارش پسند کیوں نہیں ہے؟“ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ بارش بُری ہے بلکہ بارش کے بعد جو پریشانیاں ہوتی ہیں، وہ قبل از وقت ہی بے سزہ بلکہ خوف زدہ کر دیتی ہیں۔ سب سے پہلا اور سب سے بڑا مسئلہ الیکٹریک سپلائی ہے، معمولی سی پھوار پڑنا شروع ہوتی اور بجلی گھنٹوں کے حساب سے قاب، پھر بارش کا پانی جو جگہ جگہ کچھ زور لگے گی میں تبدیل ہو کر کراہت و پریشانی کا باعث بنتا ہے۔“

”یہ صرف تمہارے ساتھ ہی نہیں، سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ واقعی طور پر ملنے والی خوشیوں پر، بعد میں آنے والی تکلیفوں کو کیوں

فوقیت دیتی ہو۔ جو ہوگا سب کے ساتھ ہوگا، پھر کیوں آج کی خوشی پر کل کا سوگ طاری کر رہی ہو۔“ وہ اس بار زنج لہجے میں گویا ہوا تھا جو اب

وہ گردن ہلا کر بولی۔

”نہیں کر سکتی میں اس طرح کیونکہ جانتی ہوں خوشی کی عمر کم اور غم کی عمر طویل ہوتی ہے، جو اندھیروں کے ہاسی ہوں انہیں اُجالے

کہاں راس آتے ہیں۔“

بادل زور سے گر جا اور اس کی خوبیت ٹوٹ گئی۔ اس نے بغور اپنی شرت کے دامن کو دیکھا جہاں نامعلوم کس لمحے آنکھوں سے

نکلنے والے موتی گر کر جذب ہو رہے تھے۔

وہ اس لمحے برسات کے نئے لمس سے آشنا ہوا تھا، دل میں درد چگاتی کسی یاد کا موسم ہے یہ۔ اضطراب در اضطراب کا موسم ہے

یہ..... باہر بارش موسلا دھار شروع ہو چکی تھی۔

اندر برسنے والی برسات کی کوئی آواز نہ تھی، رفتار دگنی تھی، وہاں صرف احساس تھا، بے چینی کا، اُداسی کا۔

☆.....☆.....☆

برہان لغاری سیدھے اپنے کمرے میں چلے آئے تھے۔ موڈ ان کا ابھی تک بے حد آف تھا۔ پہلی بار انہیں کسی نے آئینہ دکھایا تھا

جو وہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔ جو اب ان کا ہاتھ اٹھ گیا تھا جس کا انہیں قطعاً ملال نہ تھا۔ ملال کا تعلق دل میں آباد محبت سے ہوتا ہے اور ان

کے دل میں اس کے لیے محبت کی ایک نمٹی سی کوئیل تک نہ چھوٹ سکی تھی۔

”بذبان عورت کی بد زبان بنی۔“ وہ غصے سے بڑبڑائے اور ذہن میں کرن کے کہے گئے جملے گونج رہے تھے۔  
 ”کاش! پیدا ہوتے ہی میں مرگئی ہوتی یا میری پیدائش سے قبل آپ۔“  
 وحشت از سر نو بڑھی تھی۔

”آپ کبھی سنا ہے شوہر ثابت ہوئے نہ اچھے باپ..... اور آج آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ اچھے انسان بھی نہیں ہیں بلکہ میں آپ کو انسان ہی نہیں سمجھتی۔“

آنکھوں میں عجیب سی درنگی اُبھر آئی تھی۔ قبل اس کے کہ ان کی وحشت و جنون کسی سنگین و ناقابلِ تلافی غصے کا باعث بنتی والدہ حضور کی طرف سے بلاوے کا بیٹام ان کے اشتعال و وحشت کو کچھ فرو کرنے میں معاون ثابت ہوا۔ وہ وہاں چلے آئے تھے۔

”آؤ بیٹو۔“ وہ ان کے چہرے کا بغور جائزہ لیتی ہوئی بولیں۔ وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے انہوں نے اپنے چہرے کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی مگر والدہ حضور جدوجہد زیرک نگاہ تھیں، بلا کی معاملہ فہم و حالات شناس، اب تو صورت حال سے آگاہ ہونے کے باعث وہ خود بھی اندر سے بے کل و مضطرب تھیں۔

”گئے تھے تم اس کے پاس؟“ انہوں نے اپنے لہجے کو کنزور نہیں ہونے دیا۔ ”تمہیں نہیں جانا چاہیے تھا، جو لوگ اپنی عزت کا خیال نہ رکھتے ہوں وہ دوسروں کی عزت کرنا کیا جائیں گے۔“

”والدہ حضور! ہم عزت کرتے ہیں تو کروانا بھی جانتے ہیں۔ وہ خود کو کچھ بھی سمجھتی ہو مگر ہم سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی اوقات اسے بتا کر رہیں گے۔“ وہ ہر عزم انداز میں گویا ہوئے۔ ”بڑا زہر بھرا ہوا ہے اس ناگن کی اولاد میں۔ میں چاہوں تو لمبے بھر میں اس کا سر پھیل ڈالوں مگر یہ سزا کافی نہیں ہے اس کے لیے، اس کو میں ایسی سزا دوں گا کہ وہ سسک سسک کر مرے گی۔“ ان کا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ وہ ان کی طرف متقی خیر انداز میں دیکھنے لگیں۔

”زندہ دفن کروں گا اسے، آسان موت نہیں دوں گا۔“

”زندہ دفن کر دیا مردہ، تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کا سسکا تم دیکھ تو نہ سکو گے۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوئی تھیں۔

”میں اسے زمین پر دیکھنے کو تیار نہیں ہوں۔“

”بچوں جیسی ہاتھیں مت کرو برہان! وہ تمہارے دشمنوں کی پناہ حاصل کر چکی ہے، تمہاری ایسی کوئی جذباتی لغزش برسوں کے بتائے گئے اصولوں کو سمار کر سکتی ہے، ورنہ جہاں بے شمار خاموش قبریں بنتی آئی ہیں اس جگہ اس ایک قبر کا اضافہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔“

وہ سنجیدگی سے گویا تھیں۔ ”ہمیں یہ افسوس تاحیات رہے گا تمہاری زندگی میں دو عورتیں آئیں اور گھر ایک بھی نہ بسا سکی۔“

برہان کے چہرے کے عضلات درست ہو چکے تھے۔

”آپ کا سایہ سر پر سلامت رہے، مجھے کسی اور کی ضرورت بھی نہیں ہے، اب آپ حکم کریں، اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

یہ طے ہے، میں اسے زیادہ دن اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ میری سوچوں سے بڑھ کر بد تمیز اور خود سر ہے، اس کے سامنے گیا تو شوٹ کر دوں گا۔“

”کامران مرزا سے بات ہوئی ہے میری، انہوں نے اس رشتے کو دل و جان سے منظور کیا ہے۔ کل رات کو کھانے پر بلوایا ہے، ان دونوں باپ بیٹے کو۔ کل ہی سب معاملات طے کر لیے جائیں تو اگلے ہفتے کے کسی بھی دن نکاح و رخصتی رکھ دیں گے اور تم اپنا شیڈول دیکھ لو پھر اسی حساب سے کام کریں گے۔“ وہ پوری منصوبہ بندی کر کے بتیھی ہوئی تھیں۔

”میرا شیڈول آپ سیٹ نہیں ہوگا، پھر اگلے ہفتے ہی وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ میرے خیال میں پھر ڈے کو ہم فائل کر دیتے ہیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے جتنی جلد ممکن ہو سکے اس بلا سے جان چھڑا لیں ہم۔“ وہ نخوت بھرے انداز میں بولی تھیں۔

”سرور شاہ آئے ہیں ابھی چند لمبے قتل تم سے ملاقات نہیں ہوئی؟“

”نہیں، کہاں ہیں؟“ داماد کے ذکر پر ایکسائیٹ ہو اٹھے تھے وہ۔

”منال کے کمرے میں بھیج دیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو بھی بات ہے وہ خود ہی سلجھا لیں تو بہتر ہے۔ ہماری موجودگی مسئلے

کو الجھا بھی سکتی ہے۔ لہذا سوچ کر میں نے ان کے درمیان موجود ہتا درست نہیں خیال کیا۔“

”میرا جانا بھی ان کے درمیان درست نہیں ہوگا۔“

”ہاں..... ان کے مسئلے ان کو ہی نمٹانے دو تو بہتر ہے۔“

☆.....☆.....☆

منال، کرن سے شے کے بعد ایک اُن جانے، اُن دیکھے احساس سے دوچار ہو گئی تھی۔ اُس مڈرہ جس سے وہ دل گلی کی خاطر راضی ہوئی تھی۔ مقصد اس سے تعلقات بڑھا کر وہ تمام معلومات حاصل کرنی تھیں جو ڈیڑی کو مطلوب تھیں، جن کو وہ بہت ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود حاصل نہ کر پار ہے تھے اور اسے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اسے استعمال کیا تھا۔ خوب صورت شخصیت و ذہین آنکھوں والا اُنس اس کی محبت کے جال میں پھنس کر، محبت کے جذبے میں ڈوب کر اتنا بے وقوف بن گیا کہ بلا سوچے کبھی بزنس کی سیکرٹ انظار میں اسے بتاتا گیا۔ مطلوب حاصل ہونے پر وہ ڈیڑی کے کہنے پر اس سے آفٹل چھڑا کر سرور شاہ کی طرف بڑھ گئی تھی جو ان دنوں بزنس ورلڈ میں خاصی شہرت پا رہا تھا۔ وہ عمر میں اُنس سے ڈگنا تھا، گندی رنگت و عام ہی شخصیت کا مالک، سرور شاہ کسی طور پر اُنس مڈرہ کا مقابلہ نہ تھا مگر ان دنوں وہ حسن کے زعم میں جلتا تھی، چاند کی چاندنی، پھولوں کی دلکشی میں اسے اپنا حسن دکھائی دیتا تھا۔ ہر منہ سے وہ اپنے حسن کے قصیدے سننے کی تمنا ہی رہا کرتی تھی۔ ستائشی نگاہوں و داد دیتے لہجوں کی عادی تھی۔ اُنس کو چھوڑنے کا سبب اس کی خاموشی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا مگر اس نے کبھی ایسے جملے اس کی شان میں نہیں کہے جو وہ سننے کی عادی تھی۔ اس نے کبھی اس کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی تو نہایت احترام کے ساتھ، وہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا، از حد پسند کرتا تھا اور شادی کا بھی خواہش مند تھا مگر اس کا انداز بہت محتاط و

احترام والا ہوتا تھا جو اس جیسی آزاد خیال و بے باک فطرت لڑکی سمجھ نہ پائی تھی۔ اس نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں لیس کی اجارہ داری تھی، عریانیٹ، بے ہودگی، لائف اسٹائل بن چکے تھے۔ عزت، احترام، توقیر و تکریم جیسے مقدس لفظوں و جذبوں سے نا آشنا لیس پرست و بے ضمیر لوگ، پھر کچھ ڈیڑی کی برین واشنگ کا بھی زیادہ گہرا اثر تھا کہ وہ بہت آسانی سے لیس کی پاکیزہ محبت کو خاطر میں نہ لا کر سرد شاہ کی بن گئی تھی۔ بے شک سرد شاہ، لیس کی طرح ہنڈم نہ تھا، نہ اس کی طرح لوگ کیئرنگ، نہ پر سٹائلی میں اس سے بیچ کرنا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ..... وہ ہر خوبی رکھتا تھا جس کی وہ توقع رکھتی تھی۔

شادی کے ایک سال تک وہ اس کے سنگ پوری دنیا گھومتی رہی تھی پھر شادی کی پہلی سالگرہ کے بعد وہ اس شمار کے غبار سے نکلنے لگی تھی جس میں کم ہو کر وہ خود کو بھی فراموش کر چکی تھی۔ سرد شاہ کی بے خود کردینے والی نگاہیں بزنس فائلز میں کم ہونے لگیں۔ ہر دم اس کے حسن و روپ کی شان میں قصیدہ گو رہنے والی زبان، اب اسے احساس ڈے داری و گھر داری کا درس دینے لگی تھیں۔ فقط ایک سال کے عرصے میں اس کی نگاہوں پر چڑھی غفلت و سرور کی میک آتری تو اس کی آنکھیں حقیقت دیکھنے کے قابل ہوئیں اور اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھی ہے۔ چاند کو چھوڑ کر اندھیروں سے دامن بھر لیا ہے، پھولوں کے گمان میں کانٹوں سے اُلجھ بیٹھی ہے، ہرگز رتے دن کے ساتھ یہ احساس حاوی ہوتا گیا، دن تو اس کے کچھ بہتر اس کے سنگ جیسے تیسے گزر جاتے مگر قربت کے لمحوں میں وہ اپنا دم گھنٹتا ہوا محسوس کرتی، پھر یوں ہونے لگا اس کی سرد مہری رفتہ رفتہ بڑھتی بے گامگی سرد شاہ کو متشکر کرنے لگی۔ وہ سمجھے ان کی بزنس کی بے تحاشا مصروفیات نے منال کو ان سے بدگن کر دیا ہے، اس کی خوشی کی خاطر وہ کاروباری مصروفیت پس پشت ڈال کر ورلڈ ٹور کا پروگرام سیٹ کر بیٹھے۔ منال جو پوری طرح ٹھکرائی ہوئی محبت کے ڈکھ و پچھتاوے میں کم ہو چکی تھی، اس نے الکار کر دیا۔ وہ ان لمحوں کی قربت برداشت نہ کر پار ہی تھی، جو بیس گھنٹوں کے ساتھ میں تو شاید مری جاتی۔ سرد شاہ ہر کوشش کر کے ہار گئے۔ اسے نہ جانا تھا، نہ وہ گئی۔ اب وہ ان کے بندھن سے آزاد ہونا چاہتی تھی مگر می نے سختی سے ڈانٹا تھا کہ وہ ایسی حماقت نہ کرے۔ پہلے ان کی تمام پراپرٹی اپنے نام کروائے جس میں وہ فلفلی پرسنٹ کی مالک تھی۔ باقی سرد شاہ کے بیٹے کے نام تھی۔ نیب، سرد شاہ کی پہلی بیوی کا بیٹا تھا جو بیٹے کی پیدائش کے بعد مر گئی تھی۔ بیوی کے مرنے کے پانچ سال تک سرد شاہ کسی بھی عورت کی طرف متوجہ نہ ہو سکا تھا پھر ایک پارٹی میں اس کی ملاقات برہان لغاری نے منال سے کروائی تھی، یکے بعد دیگرے ہونے والی کئی ملاقاتوں میں انہیں منال میں وہ خوبیاں نظر آئیں جو وہ اپنی شریک حیات میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے پر پوز کرنے سے قبل وہ برہان لغاری اور منال کو بیٹے کے ہارے میں بتا چکے تھے۔ برہان لغاری کو بزنس میں ان کی بیک چاہیے تھی، منال بھی ان کی دولت کی چکا چوند، جادو بھری باتوں کے سحر میں سحر ہو چکی تھی۔

نیب ہاسٹل میں رہتا تھا، چیشوں میں بھی مگر کم ہی آتا تھا، سو اس کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ویسے بھی وہ عام بچوں کے مقابلے میں بہت کم گو اور سیدھا مصوم بچہ تھا۔ سرد شاہ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا، ویسے بھی وسیع تر بزنس کی بے تحاشا مصروفیت میں انہیں ملک میں کم سے کم ٹھہرنے کا موقع ملتا تھا۔ اس دوران منال کا موڈ بھی کچھ بہتر ہو جاتا تھا۔ ان جیسے چار کرنے والے

فحش کے لیے بھی بہت تھا۔

وہ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

منال کے چہرے پر برہمی، غلگی و سرد مہری کی ادبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی، جبکہ سرد و شاہ کے والہانہ پن میں وہی گرم جوشی و لگاؤ تھی جو ایک ٹوٹ کر چاہنے والے شوہر کے انداز و لگاؤ میں ہوتی ہے۔

”آپ کو اندازہ نہیں اس بات کا، آپ کی ناراضگی نے میرا کیا حال کیا ہے۔ چھ ماہ، چھ صدیاں بن گئی ہیں میرے لیے۔ تمام بزنس پینڈنگ کر آیا ہوں۔ نیب بھی بے حد مس کر رہا ہے آپ کو“۔

کمرے کے بوجھل سکوت میں خاصی دیر بعد ان کی آواز اُبھری تھی۔

”نیب کیوں مس کر رہا ہے مجھے؟ میں اس کی نگلی ماں نہیں ہوں“۔ اس کے لہجے میں طنز و تمسخر موجود تھا۔

”ماں، ماں ہوتی ہے۔ سوتیلی، نگلی نہیں ہوتی ہے۔ نیب نے ماں کے روپ میں صرف آپ کو دیکھا ہے، اس کی ماں صرف آپ ہیں“۔

”اچھا، یہ آپ بھی سمجھتے ہیں؟“ وہ ایک انداز سے مسکرائی۔

”یقیناً، کیوں نہیں“۔

”پھر تمام پراپرٹی میرے نام کیجئے“۔

”منال! چھ ماہ قبل بھی یہی ضد ہمارے درمیان تھی، کا باعث بنی تھی اور میں نہیں چاہتا پھر یہنا پک اوپن ہو“۔ وہ بھیدگی سے بولے۔

”یہنا پک اوپن رہے گا، اس وقت تک جب تک پراپرٹی مجھے ٹرانسفر نہیں ہو جاتی۔ یہ ففٹی ففٹی کا احساس مجھے کبھی بھی ایک اچھی

ماں نہیں بننے دے گا سردو! آپ سمجھنے کی کوشش کریں، اگر نیب کی اپنی ماں ہوتی تو تب بھی آپ ایسا کرتے؟ اسے بتاتے کہ.....“

”پلیز، پلیز..... منال! سمجھنے کی کوشش کرو“۔

”میں سمجھ گئی ہوں، لیکن آپ بھی سمجھیں، جو میں سمجھنا چاہتی ہوں“۔

”اوکے..... اوکے! موڈ ٹھیک کرو اپنا“۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”گھر چلو، نیب سے زیادہ میں مس کر رہا ہوں تمہیں۔ کتنا

عرصہ ہو گیا ہے ساتھ وقت گزارے ہوئے ہمیں“۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

”میں نے تمام پراپرٹی آپ کو ٹرانسفر کر دی ہے“۔ انہوں نے دھماکہ کیا۔

”رہی..... یہ فائل تو نہیں ہے“۔ وہ سرت سے اچھل پڑی تھی۔

”نو ڈاؤٹ۔ میں نے ذمگی میں کبھی فائل گیم نہیں کھلیا، کسی کے ساتھ بھی نہیں، پھر اپنی ”لائف“ کے ساتھ کیسے فائل کر سکتا

ہوں“۔ وہ چاہت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے جو ایک دم خوشی سے کھل اُٹھی تھی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے

قریب بیٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں ان کے گلے میں ڈال کر مسکرا کر بولی۔

”بہت زبردست سر پرانز دیا ہے آپ نے مجھے، ڈاکو منٹس کہاں ہیں؟“  
”وکیل کے پاس، چند روز میں مل جائیں گے۔“

☆.....☆.....☆

رات کا دوسرا پہر تھا جب بے آواز دروازہ کھلتی ہوئی مائی سیکنا سردا مل ہوئی تھی۔  
”تم اس وقت کیوں آئی ہو؟“ باپ کی یہ خاص ملازما سے زبردگی۔

”مشش..... بی بی صاحبہ! جنہیں مت۔“ وہ بدحواں ہو کر آگے بڑھی تھی۔ ”میں آپ کی مدد کو آئی ہوں۔“ وہ اسے غصے سے چپختے دیکھ کر آہنگل سے بولی۔

”مدد کو؟ ہونہ، غلامی کی بیڑی! وقاداری کا طوق پہن کر تم کس قسم کی مدد کرو گی، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں بے عینگی و تحقیر تھا۔

”مجھے نہیں معلوم آپ کو یقین کس طرح آئے گا، مگر میں سوہنے رب سائیں کی قسم کھا کر کہتی ہوں، میں آپ کو دھوکہ نہیں دوں گی۔“ مائی سیکنا کے لہجے میں سچائی تھی۔ آواز میں کسی گہرے ڈکھ کی لرزش تھی۔ سر جھکائے، ہاتھ بانہ سے مجبور دے بس نظر آنے والی عورت سے یہ مضبوط و پراعتقاد لہجے میں بات کرنے والی عورت بالکل مختلف تھی، گوانماز اس کا اب بھی ایسا ہی سودا بانہ تھا مگر چہرے پر کسی عزم کی سرخی و آنکھوں میں آتی نمی کسی ملال کا حصہ تھی جس نے اسے بہت مختلف بنا دیا تھا۔  
”میں قسموں پر یقین نہیں رکھتی۔“

”اللہ پر تو رکھتی ہیں۔“

”میں تم پر اتنا ہار کیوں کروں، پھر تم کیوں میری مدد کرنا چاہتی ہو؟“ سیکنا کے سوال نے اسے لاجواب کر دیا تھا مگر وہ ہارنا نہیں جانتی تھی۔  
”اس سوال کے پیچھے ایک داستان ہے جو میں آپ کو ضرور سناؤں گی وقت آنے پر۔ پہلے ضرورت ہے آپ کو یقین کرنے اور سمجھنے کی، اس طرح شاید میں آپ کو بچاؤں۔“ وہ دھجے سے بولی۔

”جو کہنا ہے سیدھے طریقے سے کہو، مجھے اجتناب سمجھنا۔ تم جیسے سرچڑھے ملازموں کی مکاریوں، ہیرا پھیریوں سے واقف ہوں میں کہ کس طرح ڈبل گیم کھیلتے ہو، اگر مجھ سے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو مزہ چکھا دوں گی۔“

”ہاں مجھے منظور ہے جو چور کی سزا وہ میری جوار گردنا کروں۔“

”کہو کس مقصد سے آئی ہو؟“ وہ سیکنا کی طرف سے اُلجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

”بی بی صاحبہ! میں ملازمہ ہوں، کم ذات و کمی زمین پر ریگنے والے کیڑے کوڑے ہم سے زیادہ حیثیت رکھتے ہیں۔ میں اپنی اوقات کو بچھانتی ہوں، مالکوں کے معاملے میں دخل دینے کی ہمت تو خواب میں بھی نہیں کر سکتی۔“ وہ کچھ بتانا چاہ رہی تھی، کس بات بے



باخبر کرنا چاہ رہی تھی مگر اپنی حیثیت اور پھر کرن کے کڑے تیور بد اعتمادی ظاہر کرتا سخت رویا سے وہ بات کہنے کی جرأت نہ دے رہے تھے جس کی خاطر وہ چھپ کر اس وقت یہاں آئی تھی اور کچھ کہہ نہ پائی تو بے ساختہ رو پڑی۔

”ارے یہ کیا.....“ کرن کے لیے یہ صورت حال غیر متوقع تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر بیڈ پر بٹھانا چاہا تو وہ فوراً اس کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”ہمارا گھانا مالکوں کے قدموں میں ہے بی بی صاحبہ۔“

”زیادہ باتیں مت کرو، اوپر بیٹھ جاؤ۔“ کرن کے انداز میں نرمی درآئی تھی۔

”نہیں بی بی صاحبہ! قدموں کی خاک سر پر نہیں ڈالی جاتی، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ اوپر بیٹھنے کے نام پر وہ یوں بدکی جیسے برقی تاروں کو چھولیا ہو۔

”جلدی کہو، کیا کہنا چاہتی ہو، مجھے تمہارے رویے سے اُلجھن ہونے لگی ہے۔“

”بڑے صاحب اور بڑی مالکن آپ کی شادی کرنا چاہتے ہیں عمران مرزا کے ساتھ۔ آپ ان سے شادی مت کیجئے گا۔“ اس کے دیکھے لہجے نے زور دار دہکا کہ کیا تھا۔ وہ ایک تک اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

”عمران مرزا جیسے آدمی نہیں ہیں، بہت خراب ہیں وہ۔ کئی شادیاں کر چکے ہیں وہ، ان کی تین بیویاں بڑا سراسر طریقے سے مریجی ہیں۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ اسے چارٹو اندھیرا پھیلتا دکھائی دیا۔

”سچ کہہ رہی ہو، وہ کل کھانے پر آ رہے ہیں۔ آپ کو میری بات کا یقین تب آئے گا، اتوار کو آپ کی شادی ہوگی، مالکن سب ملے کر چکی ہیں۔“

”تم..... کس طرح یہ سب جان سکتی ہو؟“ ذوہ سخت متحوش تھی۔

”سب سے پرانی اور وفادار نوکرانی ہوں، اس لیے مجھ سے کوئی پردہ نہیں ہوتا ہے۔“

”پھر یہی سوال تمہیں مشکوک کرتا ہے کہ ایسا کیوں کر رہی ہو۔ اس سے تمہاری کیا غرض پوشیدہ ہے۔ اگر تم کوئی سازش نہیں کر رہیں تو مجھ سے کسی بڑے انعام و اکرام کی توقع رکھتی ہو تو سن لو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“

”نہیں بی بی صاحبہ! آپ کو ابھی بھی میری نیت پر شک ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے آپ کو سب بتایا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہا اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو میں زندہ دفن کر دی جاؤں گی۔“

”اچھا تم جاؤ، جو ہو گا دیکھا جائے گا، بے لگ رہو مجھے جب تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی، تمہیں کہوں گی۔“ اس کے اندر نگہرات کا سلاطم برپا ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دو دن مزید گزرنے کے باوجود صدمہ نہیں آیا اور نہ ہی اس نے رابطہ کیا تو وہ بری طرح سے پریشان ہو گیا تھا لیکن بدگمانی و بدظنی اس حد تک اس کے اندر سرایت کر چکی تھی کہ وہ ایسی پریشان کن صورت حال کے باوجود گھر والوں سے رابطہ کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ اسی پریشانی کے احساس کو مٹانے کے لیے وہ ہوٹل سے نکل آیا تھا۔ بارش ایک دن برس کر ڈک گئی تھی۔

موسم ابھی بھی ابر آلود تھا، ہادل کبھی گہرے سیاہ ہو جاتے، کبھی ہلکی بوند باندی وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھی۔ جون جولائی کی بوکھلا دینے والی گرمی کی جگہ خشک و خوش گواریت نے لے لی تھی۔ موسم آج کا بھی سہانا تھا، کاراں کے پاس تھی نہیں، وہ ہوٹل سے نکل کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ پریشانی و اضطراب اس پر کسی نحوست کی طرح چھا گیا تھا۔ کرن کی طرف سے پہلے ہی اندیشوں و دوسوسوں کا شکار بنا ہوا تھا، نئی اقدار نے ڈال دی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کس طرح ان تک رسائی حاصل کرے۔ اسی ادھیڑ میں نامعلوم وہ کس لیے فٹ پاتھ سے اتر کر مرزا کے درمیان چلنے لگا تھا۔ پیچھے سے آنے والی کار کے ہارن نے اسے اپنی فطرتی احساس دلا دیا تھا۔

”آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ مردانہ آواز پر اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ڈرائیورنگ ڈور سے جھانکنے والے چہرے کو وہ ایک بار دیکھ کر کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ بے اختیار سلام کر کے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

”نہیں شکریہ۔ میں ایسے ہی واک کے لیے نکلتا تھا۔“

”آ جاؤ یا ر! میرا بھی آج لاگ ڈرائیونگ کا موڈ ہے۔ اکیلے میں لاگ ڈرائیونگ کہاں مزہ دیتی ہے۔“ انس کا انداز اتنا بے تکلف و دوستانہ تھا کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ مضامنی علاقے میں کار ڈرائیور کرتے ہوئے عام سی گفتگو کر رہے تھے۔ انس نے کار ایک درمیانے درجے کے بنے ہوئے ہوٹل کے آگے روک دی تھی اور اترتے ہوئے بولا۔

”ہوٹل تو عام ہے مگر چائے یہاں کی بہت خاص ہوتی ہے۔ میں عموماً یہاں آتا رہتا ہوں، کئی دفعہ ڈیلی کو بھی لایا ہوں، انہیں بھی پسند آتی ہے یہاں کی چائے۔ جیتنا تمہیں بھی پسند آئے گی۔“ وہ اسے لے کر اندر آ گیا تھا جہاں گول میزوں کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، جگہ کشادہ اور صاف ستھری تھی، جس طرف وہ بیٹھے تھے وہاں لکڑی کے پتوں والی کرسی تھی، جس میں جا بجا لوہے کی سلاخیں گھری ہوئی تھیں۔ باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

اس نے چائے اور میٹری کا آرڈر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے کرسی کے پار دیکھ رہا تھا۔ باجرے کے کھیت مست ہوا سے جموم رہے تھے۔ ان کے سبز پتوں پر رنگ برنگی چیزوں کے غول اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف تھے، ان کی ہاریک آوازیں ہر سکوت ماحول میں سریلا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

”مزہ کوئی پریشانی ہے؟“ انس چائے کا آرڈر دینے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا تو اسے بڑی محویت سے کرسی سے باہر دیکھنا پایا تھا۔ کچھ سینڈیک وہ اس کی توجہ نوٹ نہیں کر سکا تو انس کہا اٹھا۔

”نہ..... نہیں۔ مجھے بھلا کیا پرابلم ہو سکتی ہے۔“ انس کی گھبر تشویش زدہ آواز سن کر وہ سیدھا بیٹھتا ہوا مسکرا کر بولا۔

”او کے۔ کہتے ہوتو مان لیتا ہوں مگر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا۔“ بلا کی صاف گوئی تھی جو اسے کسی کی یاد از سر نو چکا گئی۔

”مگر میں آج کل بہت پریشان ہوں۔“ چائے والا چائے اور چٹری کی پلٹ رکھ گیا تو کپ میں چائے انڈیل کر ایک کپ اس کو سرکار اور دوسرا اپنے پاس رکھتا ہوا وہ منجیدگی سے گویا ہوا۔

”خیریت تو ہے نا۔ کرن سے رابطہ ہوا؟“ اس کے اندر کے دسو سے نے بھر پور انگڑائی لی تھی۔

”تم تو بہت پریشان ہو گئے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر بھی میں کرن کے بارے میں جانتا چاہتا ہوں۔“ وہ خود کو سنبھال نہیں پایا۔

”میں ان سے کوئی رابطہ نہیں کر سکا ہوں۔ برہان لغاری اور ہمارے درمیان جاری بزنس وار سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ میں اسی کوشش میں ہوں کسی طرح کرن سے بات کروں، اپنے سوال کا جواب چاہیے مجھے ان سے۔“ وہ چٹری ان کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کیا سوال کیا تھا تم نے اس سے؟“ اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔

”میں اسے لائٹ پائز بنا چاہتا ہوں۔“ چٹری اسے اپنے حلق میں بھنستی ہوئی محسوس ہوئی، گرم گرم چائے کا گھونٹ منہ چلا گیا۔

”اس نے کیا جواب دیا؟“ حمزہ کو اپنی ساتھیوں کی محسوس ہوئی۔

”وہ شادی کرنا نہیں چاہتی، اپنی مدد کی ناکام میرڈ لائف نے اسے ہرٹ کیا ہے۔ وہ سمجھتی ہے تمام میرڈ لائف ایسی ہوتی ہیں جو اچھا خیال نہیں ہے۔“ اس چائے پیتے ہوئے کرن کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ بلو جینز وائٹ شرٹ میں اس کی دل کش پرسنٹی نمایاں تھی۔ سرخ و سپید رنگت پر گہرے کلر کی آنکھیں ذہانت سے بھر پور تھیں۔ دولت و جاہت دونوں اسے فراخ دلی سے عطا کی گئی تھیں۔ مستزاد اس کی بڑے خلوص، ہامروت و باوقار عادت نے اسے مکمل شخصیت عطا کی تھی۔ ایسا شخص بر لڑکی کا آئیڈیل ہوتا ہے۔ وہ خود خواہش مند تھا کرن کو اپنانے کے لیے، اس سے بڑھ کر کرن کی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس نے دھواں دھواں دل کو چھکی دی۔

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ مجھے مستزاد کریں گی یا قبول؟“ وہ حمزہ کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس صورت حال کو حمزہ کو فیس کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا، اس کے باوجود وہ حوصلہ بکڑے ہوئے تھا۔

”میں اسے اتنا نہیں سمجھتا ہوں جتنا آپ توقع کر رہے ہیں۔ ہمارے درمیان دوستی کا تعلق زیادہ رہا ہے۔ میری سوچ کے برعکس ہی کرتی رہی ہے وہ۔“ چائے ختم کرتے ہوئے اس نے خود کو لائق سا پیش کیا تھا۔ دل کی فریاد پر اس نے شعور کی صدا کو ترجیح دی تھی۔

دل کا کیا اعتبار، یہ ہمیشہ اپنے حق میں دلائل دیتا ہے۔ پاگل جو ظہر۔ اس کی راہ پر جو چلا ہے کب منزل تک پہنچا ہے۔ اس کی ترغیب بھگانے والی ہے۔ وہ بھنگ چکا تھا، ان راستوں کا راہی بن گیا جن کی بھول بھلیوں میں عمر بیت جاتی ہے۔ اجل لبیک کہہ دیتی ہے۔ حیات فنا ہو جاتی ہے، یوں ہی بے نام و بے مراد۔

”کرن کو آپ سے بہتر کوئی اور شریک حیات نہیں مل سکتا۔“

”تم سے بڑھ کر پیار دے سکتا ہوں میں اسے؟“ دل میں مچلتے سوال کو بالآخر اس نے زبان دے دی تھی۔ اُس کا لہجہ دھیما تھا لیکن حزرہ کو لگا اس ساتھیوں دھماکے سے لرزاٹھی ہوں۔ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا جو بغور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”جو تم سمجھ رہے ہو، کرن سے شادی کے خواہش مند تو تم بھی ہو۔“

”ہوں نہیں تھا کبھی، بلکہ میری حماقت تھی وہ جو میں نے ایسا سوچا تھا لیکن اب میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں ہے اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ شادی دو جسموں کے ملاپ کا نام نہیں ہے، یہ دو قلب، دو حراج، دو ذہنوں کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیاں دو حصوں میں بٹ جاتی ہیں، شادی کے بعد رات شوہر کے لیے ہوتی ہے تو دن سرالیوں کے لیے۔ دونوں سے تعلقات بڑی محنت، صبر و تحمل، خوش مزاجی سے نبھانے پڑتے ہیں۔ دونوں میں سے ایک طرف بھی توجہ کم ہوئی تو شامت آ جاتی ہے اس کی۔ پھر کرن یہ سب کبھی بھی نہیں کرتی کیوں کہ کپہر و ماژدہاں کیا جاتا ہے جہاں دل کا معاملہ ہوتا ہے۔ من چاہے ساتھی کا معاملہ ہوتا ہے۔ محبت کی تاثیر ہی تو سمجھوتے کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ یک طرفہ چاہتیں صرف بھلانے کے لیے ہوتی ہیں اور میں بھول چکا ہوں۔“ وہ اس سے نگاہ چرا کر گویا ہوا۔ اُس نے نگاہ جھکا لی تھی۔ وہ جانتا تھا کرن اس سے محبت نہیں کرتی ہے۔ اب تصدیق ہو گئی تھی۔

”اوکے، فلک کینئر۔ میں کچھ دن انتظار کرتا ہوں، شاید وہ رابطہ کریں، ورنہ پھر مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔“ وہ اُٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

☆.....☆.....☆

صبح اس کے کمرے میں برہان اللہاری خود آ کر اسے ساتھ لے کر گئے تھے۔ موڈ ان کاراٹ سے زیادہ خراب تھا۔ وہ خاموشی سے اُٹھ گئی تھی۔ ناشتے کی نچل لو اذات سے بڑھتی۔

سامنے ہی آسانی رنگ کے شلوار سوٹ پر آسانی کلر کی ریشم کی کڑھائی والی بھاری بھر کم چادر سر اور شانوں پر اچھی طرح لپیٹے چہرے پر بڑا کروفر لیے طمطراق سے وہ عمر رسیدہ عورت بیٹھی تھی جس کے چہرے پر دوڑتی سرخی میں اس کی ماں کی تکتا آرزوؤں و ناکام ازدواجی زندگی کا لبو شامل تھا۔ اس کی سسکتی، ہلکتی محرومیوں و اذیتوں سے گھائل خواہشوں، حسرتوں کا لبو بھی اس سرخی کا حصہ تھا۔

”سلام کرو، یہ داوی حضور ہیں تمہاری۔“ برہان اللہاری اس کی دلی کیفیت سے بے خبر تھکا نہ لہجے میں گویا ہوئے۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں سلام کیا اور ہاپ کی تھلید میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”وعلیکم السلام۔ رات تو ہم تمہارا انتقاری کرتے رہ گئے کھانے پر تم نہیں آئیں۔ ہم نے سوچا اپنی داوی سے ملنے ضرور آؤ گی مگر ایسا بھی ہوتا ہے، ہم سے دور رکھی گئی ہو، یقیناً دل بھی محبت سے نا آشنا ہوگا۔ خیر ناشتہ شروع کرو، ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

بڑی سادگی سے وہ اپنا مدعا بیان کر کے ناشتے کی طرف راغب ہو چکی تھی۔ چار ملازما نین از حد چابک دستی سے ان کو ناشتہ کروانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ مائی سیکند والدہ حضور کی سائیز پر خدمت انجام دے رہی تھی۔ بوائل اٹھے، ہاف فرائی، نقل فرائی،

آلیٹ، پراٹھے، فرائی قیسم، بکھن، جلیبوز، سلاٹس اور بھی نامعلوم کن کن اشیاء سے میز بھری پڑی تھی۔ اس نے ہاف ایک، ایک سلاٹس اور ایک کپ چائے لی تھی جب کہ وہ یہ دیکھ کر حیران تھی کہ دادی حضور وہاں موجود تمام چیزوں سے پوری طرح انصاف کر رہی ہیں۔ وہ خاصی خوش خوراک ہونے کے باوجود اسٹ تھیں۔ برہان لغاری بھی ماں کی طرح ہر شے سے انصاف کر رہے تھے۔

اپنا ناشتہ ختم کرنے کے باوجود اسے خاصی دیر بیٹھنا پڑا تھا۔ اس دوران اس کی نگاہ بے اختیار مائی سیکینہ کی طرف اٹھ رہی تھی جو کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔

”رات کھانے پر ہم نے تمہارے سرالیوں کو بلوایا ہے۔ تیار ہو جانا، کپڑے اور دیگر سامان منال کی وارڈروپ سے لے لینا۔ وہ کل اپنے گھر چلی گئی ہے۔“ ناشتہ کرنے کے بعد وہ کرن سے حکمانہ انداز میں مخاطب ہوئی تھیں۔

”سرالی؟ کل شام کو میں آئی ہوں، اتنی جلد میرے سرالی کہاں سے آ گئے؟“ وہ بلا جھجک ان سے مخاطب ہوئی تھی۔ انہوں نے آنکھیں اٹھا کر پہلے بیٹے کی طرف دیکھا جو جوس پیتے پیتے کرن کو تنبیہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے، پھر اس سے مخاطب ہوئیں۔

”کل شام کو تم یہاں آئی ہو، دُنیا میں آئے تو تمہیں کئی برس گزر گئے۔ ہمارے حساب سے تمہاری عمر بہت ہو گئی ہے، کیونکہ ہمارے ہاں بچے پیدا ہونے سے قبل ہی رشتے میں باندھ دیا جاتا ہے اور سولہواں برس لگتے ہی شادی کر دی جاتی ہے۔ یہ ہمارے خانہ دانی اصول ہیں۔“ ان کے انداز میں شاہانہ پن و غرور تھا۔

”آپ کے خاندان میں یہ اصول نہیں ہیں کہ رشتہ کرنے سے قبل لڑکی کی مرضی بھی معلوم کی جائے؟“ وہ ہاپ کی گھورتی نظروں کی پردانہ کرتے ہوئے ان سے مخاطب تھی۔

”نہیں۔“ وہ غصے سے گویا ہوئیں۔

”اس کا حکم ہمارا مذہب دیتا ہے، شریعت دیتی ہے۔“

”خاموش رہو، تمہیں شرم نہیں آ رہی ایسی نازیبا گفتگو کرتے ہوئے؟“ برہان لغاری جوں کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے دھاڑے اور ساتھ ہی موجود ملازماؤں کو جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ چاروں برق رفتاری سے گئی تھیں۔

”میں نے کوئی نازیبا بات نہیں کہی۔“ وہ رتی بھر مرعوب نہ تھی ان سے۔

”خاموش رہو، تمہارے وعظ کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔ کیا صحیح ہے، کیا غلط، یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”میں نے منع تو نہیں کیا لیکن میں کسی کی اُترن استعمال کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ صرف اور صرف اپنی چیز بھاتی ہے مجھے۔“

”ٹھیک ہے۔ شاپنگ کر کے آ جانا، شو فر لے جائے گا۔“ برہان لغاری ماں کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں چاہتے تھے جس سے ان کی سبکی یا حکم عدولی کا پہلو نکلے، سو بہت آرام سے وہ کریڈٹ کارڈ اس کی طرف اُچھالتے ہوئے گویا ہوئے۔

”تباہ نہیں جاؤ گی، سیکڑ ہوگی تمہارے ساتھ“۔ یہ والدہ حضور کا حکم تھا۔ وہ سر ہلا کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ دونوں ماں بیٹے دیکھتے رہ گئے تھے۔

”آہ..... ہا! نہیں ہے میرے بیٹے کے نصیب میں اولاد کا سکھ۔ منال سے کبھی نہ کبھی اچھی ہونے کی توقع تھی اور اس سے تو بالکل ہی نہیں ہے۔ ماں کی طرح ہی اکڑو بدبہ ہے۔ کسی کو اپنے آگے گردانا وہ بھی نہیں جانتی تھی“۔ کرن کے جانے کے بعد دکھ بھرے لہجے میں بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔

”ہم نے بھی اس کی اوقات پر ہی اسے رکھا تھا“۔ وہ درعزت سے بولے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد برہان لغاری چلے گئے۔ وہ اپنے کمرے میں آگئیں۔ پیچھے پیچھے سیکڑ بھی چلی آئی تھی۔

”کان کھول کر سن لے، بی بی کے ساتھ بازار جانا ہے، اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے، اگر وہاں وہ کسی سے ملے، کسی سے فون پر بات کرے تو نظر رکھنا ہے اور آ کر مجھے ایک ایک بات بتانی ہے۔ اگر ذرا بھی چوک ہوئی تو تیری کھال میں بھس بھرا کر چورا ہے پر لٹکا دوں گی“۔ ان کے لہجے میں سفاکی و درندگی تھی۔

مائی سیکڑ کے ہاتھ تو پہلے ہی جڑے ہوئے تھے، جھکی گردن زور زور سے ہلا کر کہنے لگی بڑی عاجزی دکھاتے ہوئے۔

”بڑی مالکن! آپ کو کبھی شکایت ملی ہے، جو آپ ملے گی“۔

”جانتی ہوں، تب ہی تجھے ساتھ بھیج رہی ہوں“۔ ان کے انداز میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔

مائی سیکڑ کی رات کی باتوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کس قسم کے لوگ تھے جو اس سے خونی رشتے رکھنے کے باوجود اس سے کس جرم کا انتقام لے رہے

تھے؟ خونی رشتے رکھنے کے باوجود اس کے دشمن ثابت ہو رہے تھے۔ اس کی ذات کا، زندگی کا خون کرنے کے ورپے تھے۔

”اتنی آسانی سے میں ان کی خواہشوں کو پورا نہیں ہونے دوں گی، جو جنم میری ماں کے لیے تیار کیا تھا، ویسا میرے لیے بھی تیار

کیا جا رہا ہے مگر میں ان کی حیات بھی ایسی دکھتی ہوئی آگ کی طرح ہا دوں گی کہ مرنے کے بعد بھی ان کے چہروں سے سیاہی نہ اتر پائے

گی“۔ اس نے ایک اہم وحشی فیصلہ کرتے ہوئے سوچا اور شوپنگ پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے سیکڑ! دیکھتی ہوں تم اپنے وعدوں میں، دعوؤں میں کس حد تک پوری اترتی ہو“۔ کرے سے

نکلنے سے قبل وہ اس سے بولی۔

”یہ آپ کو آزمانے کے بعد ہی پتہ چلے گا بی بی جی“۔ وہ شو فر کے ہمراہ گاڑی میں روانہ ہو چکی تھی۔ مائی سیکڑ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی

تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر تنہا بیٹھی تھی، جو فیصلہ اس نے تنہا کیا تھا اس فیصلے نے اس کے اندر طوفان برپا کر رکھا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا اپنے

پچاؤ کے لیے، آج ہی کرنا تھا، پھر کیا معلوم تھا؟

وقت طے نہ ملے۔

نصیب موقع فراہم کرے، نہ کرے۔

نصیب سے شاکہ وہ اوّل روز سے ہی تھی مگر اُمید کا دامن ابھی چھوٹا نہ تھا۔ گاڑی ایک جھککے سے رُکی تھی۔ ڈرائیور نے دیکھا، ہائز بچھڑا ہوا گیا تھا۔

”بی بی صاحبہ! ایکسٹراناز لگانے میں کچھ دیر لگے گی۔“ شو فراس سے موڈ باندا انداز میں گویا ہوا۔

”اچھا۔“ ڈیلش بورڈ کے اوپر شاید وہ ڈرائیور کا ہی میل فون رکھا ہوا تھا، اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اسے لگا نصیب کو اس پر ترس آ گیا ہے۔ اسی چیز کی تو اسے تلاش تھی۔ برہان لغاری سے اس نے کتنی کوشش کی تھی مگر نہ کام رہی تھی، اب کامیابی ہاتھ آئی تو وہ اسے گنوانے کی حشاشی نہ تھی۔

”کیزن اچھے واٹس روم جانا ہے، سامنے ہوٹل میں پوچھو کہ وہاں واٹس روم ہے۔“ وہ سامنے بنے ہوٹل کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

”وہاں واٹس روم ہو گا بی بی، پر آپ کے قابل نہیں۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”مجھے جانا ہے تم معلوم کر کے آؤ۔“ وہ سخت لہجے میں بولی تو کیزن گاڑی سے اتر گئی۔ اسے اترتے دیکھ کر اس نے سرعت سے آگے بڑھ کر موبائل اپنے قبضے میں کیا۔ کیزن کو باہر دیکھ کر شو فراس کی طرف آیا، تاکہ اس کے اترنے کی وجہ معلوم کر سکے۔ کیزن کے بتانے پر وہ تیزی سے ہائر کے نٹ ٹائٹ کر کے اس کے ساتھ ہوٹل کی طرف بڑھ گیا تاکہ اپنی نگرانی میں واٹس روم صاف کروا سکے۔

دووں اطراف کھیتوں کا سلسلہ تھا، سامنے وہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جہاں ڈرائیور اور کیزن جا رہے تھے۔ ان کے کچھ آگے بڑھتے ہی کرن نے تیزی سے نمبر پش کیے۔ تیسری تہل پر کال ریسیو ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس کے موبائل پر مسلسل تہل ہو رہی تھی۔ حمزہ نے ریسیو کیا تو دوسری طرف کوئی لڑکی تھی۔

”ہیلو..... پلیز ٹائم کیا ہوا ہے؟“ بہت معصومیت سے پوچھا گیا تھا۔ وہ جو صمد کا فون سمجھ رہا تھا، یہ آوازیں کر ڈھن اُلجھ سا گیا۔ اس نے رست و اوج میں دیکھ کر ٹائم بتا دیا۔

”او فوہ..... کل بھی یہی ٹائم ہو رہا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوا۔

”کوئی نیا ٹائم بتائیں۔“ دوسری طرف سے شریر انداز میں اصرار ہوا۔

”ایٹ ریٹ! شرم نہیں آتی کسی کا ٹائم ویٹ کرتے ہوئے۔“ اس نے ہنسنے لگا، اسی دم سلام کی آوازیں کر پلٹا تھا۔

صدا اندر آ رہا تھا۔

صدمہ کو دیکھ کر اس کی مسرت سے وہی حالت ہوئی جو پیاس سے لب دم شخص کی بے اختیار پانی کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ وہ اس سے لپٹ گیا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے تم؟ نہ کال، نہ میسج؟ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“ دل پر اتنے بوجھ آ کرے تھے کہ وہ اپنی جذباتیت پر قابو نہ رکھ سکا تھا اور آنسو چھٹکنے لگے تھے۔ صدمہ حیرانگی و تاسف سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

وہ چوٹ سے نقلی جسامت، سرخ و سپید رنگت، مضبوط و توانا جسم و اعصاب رکھنے والا مرد بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ صدمہ کا داغ مثل ہونے لگا۔ اس نے اسے ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔ آنسوؤں سے وہ واقف ہی نہیں تھا اور اب.....

”کچھ تو کہو، کیا ہوا ہے؟ کہاں تھے؟“ اسے بھی اپنی جذباتیت کا احساس ہوا تو وہ چہرہ صاف کرتا ہوا گویا ہوا۔

”میں سہیں تھا، مگر کے جھگڑوں نے مہلت نہیں دی جو رابطہ کرتا۔“ وہ تھکا تھکا سا اس کے بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا۔

”جھگڑے کرنا اور پھر مل بیٹھنا اس گھر کی عورتوں کا طریقہ خاص رہا ہے۔ اس میں نئی بات کیا تھی جو تم سدھ بدھ بھول گئے۔“ حزرہ کا لہجہ بے زاری سے مہر پر تھا۔

”نئی بات کیا، نئی نئی حرکتیں ہونے لگی ہیں مگر میں۔ سکون و چین تو گویا کھو چکا ہے، دونوں بچیاں می کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ادھر می ان کی شکلیں دیکھتا تو درکنار آواز تک سننے کی روادار نہیں ہیں۔ تینوں ایک دوسرے پر الزامات کی بارش کرتی رہتی ہیں۔ مگر مگر نہیں میدان جنگ بن گیا تھا جس کا صلہ پاپا نے یہ نکالا کہ تینوں بھائیوں کو علیحدہ علیحدہ رہائش رکھنی چاہیے، تاکہ آپس میں روابط کو استحکام نصیب ہو، ورنہ ٹوٹ تو گئے ہیں اگر کھر گئے تو سمٹ نہ پائیں گے۔ دونوں چچا مان کر نہیں دے رہے تھے، ہار ہار پاپا کے سمجھانے یا ہر دم بڑھنے والی بی بی نے انہیں فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا، بس اسی بھاگ دوڑ میں، ہمیں آنکھیں سکا۔ سیل فون میرا کھو گیا ہے، نامعلوم کہاں رکھ کر بھول گیا ہوں۔ اب نیا لوں گا۔“

”تھیکس گاڈ اور نہ میں تو ڈری گیا تھا۔“

”تمہارا کیا ارادہ ہے؟ یہ جوگ کب تک برقرار رہے گا؟“ وہ حزرہ کی طرف دیکھتا ہوا سنجیدگی سے گویا ہوا تھا۔

”جوگ، یہ جوگ کیا ہوتا ہے؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”اسی رویے کا نام ہے جو تم نے اپنا رکھا ہے۔ پہلے کے لوگ عشق کی ناکامی کا درد لے کر گھر، گھر والوں سے دور، صحراؤں، ویرانوں میں نکل جایا کرتے تھے۔ دنیا دو نیا داری سے ہر تعلق ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر۔ یہی حال تمہارا ہے، فرق ہے تو حالات وقت کا۔“

”کیا فرق؟“ صدمہ کی بات سے لطف لیتے ہوئے استفسار کیا۔

”پہلے لوگ اتنے آرام پسند، سمجھ دار نہیں تھے تمہاری طرح۔ صحراؤں کی خاک چھاننے، جنگلوں میں بیٹھنے اور ویرانوں میں بے خود ہونے کے بجائے تمہاری طرح فحاش سے جوگ بتاتے۔“ اس نے مفصل جواب دیا۔



”جائے کیسے؟“ وہ انٹرکام کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”ہوں..... نکلی اور پوچھ پوچھ۔“

”جائے کے ساتھ کچھ اور لوگ؟“

”جو دل چاہے منگواؤ۔“ حمزہ نے آرزو سے دیا تھا، صد تکیوں کے سہارے نیم دروازہ ہو کر حمزہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”ان چند دنوں میں کتنے بدل گئے ہوتے۔ تمہاری شخصیت بری طرح کھلی جا رہی ہے تمہاری اپنی بے حسی سے، کبھی سوچا تھا تم اس

طرح سب کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤ گے۔ چند سال محبت کے پیچھے برسوں کی محبتوں کو چھوڑ بیٹھو گے، یہ کیسی محبت ہے تمہاری جس نے تم کو اتنا خود غرض و غیر ذمے دار بنا دیا ہے کہ تمہیں اب کسی کی پروا ہی نہیں ہے۔ یہ کیسی محبت ہے جو سب سے نفرت پیدا کر گئی ہے۔“

”غلط بیانی سے کام مت لو تم سب جانتے ہو اس کے باوجود اس طرح کہہ رہے ہو۔“ صد کی بات پر وہ تڑپ کر یولا۔

”میں صحیح کہہ رہا ہوں، ایک کرن کی خاطر تم نے سب کو چھوڑا ہے۔“

”غلط، بالکل غلط۔ نو شاپہ پیمپو کی موت میرے لیے سب سے بڑا صدمہ ہے۔ ان کے ساتھ کی گئی زیادتیوں نے مجھے سب سے بدظن کیا ہے، ورنہ نگہ والوں کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا میں۔“

”دروازہ تاک کیا گیا تھا، حمزہ نے کھولا تو سامنے وینٹر کے بجائے کسی دوسری ہستی کو دیکھ کر اسے شدید حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔“

☆.....☆.....☆

انس، حمزہ سے ملنے کے بعد مطمئن ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں جو ایک خیال تھا کہ حمزہ کرن سے محبت کرتا ہے اور اس کے حصول

کا ارادہ بھی رکھتا ہوگا لیکن اس کے اعزاز سے غلط ثابت ہوئے تھے۔ حمزہ نے بہت فراخ دلی سے ہر بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس کے حوصلے و ظرف نے انس کے دل میں اس کی عزت و توقیر وہ چند کر دی تھی۔

تب سے اب تک وہ سوچوں کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ کس طرح کرن تک پہنچے۔ حسب توقع برہان لغاری کی طرف سے وہ

پابندیاں سامنے تھیں جس کی توقع وہ قبل از وقت کر چکے تھے۔

”کرن میری محبت نہیں ہے، نہ ہی کسی اور لڑکی سے میں اب محبت کر سکتا ہوں۔ دل کا گھر تو فقط ایک ہا رہی ہوتا ہے یا اجڑتا ہے

اور میرا دل اجڑ چکا ہے پھر بھلا جلتے ہوئے چراغ کب جلتے ہیں؟ مستعار لی گئی روشنی دل کی سیاہ راہوں پر کب ساتھ چھوڑ جائے، کوئی بھروسہ نہیں ہے۔“

”پھر کرن کا حصول کیا معنی رکھتا ہے؟ کیوں اسے پانے کو بے قرار ہو رہے ہو؟“ سوچوں کے گرداب میں ضمیر کی صدائے

احتجاج بلند ہوئی تھی۔

انسان سب سے جھوٹ بول سکتا ہے، غلط بیانی سے کام لے سکتا ہے مگر خود سے کبھی خود کو نہیں چھپا سکتا، جھوٹ نہیں بول سکتا، جتنا سچ وہ خود سے بولتا ہے اتنا کسی اور سے کبھی نہیں بول سکتا۔ کرن میری خواہش نہیں ہے، پر میری خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ ضرور بنے گی جس طرح چلنے کڑھنے، روتے بلکے، تڑپتے سکتے ہیں نے وقت گزارا ہے۔۔۔۔ گزار رہا ہوں، اسی طرح وہ بھی لمحہ و ہشتوں واڈتوں میں مقید ہو کر گزارے گی۔

وہ قائل حسن و دل رُبا و انہیں جلوؤں کی مالک۔ جو کبھی رگ جاں و حاصل زیت تھی۔ محبت کا شمار اس کی مدہوش نگاہوں سے ہی چڑھا تھا۔ پہلی بار دل نے انوکھے انداز میں دھڑکننا سیکھا تھا، وہ محبت کی مسانتوں کو ابھی پوری طرح طے کر بھی نہ پایا تھا کہ معلوم ہوا وہ ہستی بسنے سے قبل ہی اجڑ گئی۔

منال نے بہت بلندی سے نیچے پھینکا تھا، وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جس کی طرف سے پہل ہوئی تھی، جس نے از خود اسے راغب کیا، جو خود ہاتھ تمام کر اس کے آگے بڑھی تھی، مین منزل کے قریب لاکر تہا چھوڑ جائے گی، از حد معصوم و دل کش نظر آنے والی وہ کاٹھی سی لڑکی اتنی سفاک، بے رحم و بے احساس نکلے گی۔ ماضی کے کئی مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے تھے۔

پہلے آنکھیں بند کر کے وہ ان مناظر سے ایک سردخوشی، ایک تسکین حاصل کرتا تھا۔ اندر، باہر کیفیت و سرور کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ سوچتا تھا، یہ کیفیت دور نہ ہو۔ اب یہ یادیں سانپ اور بچھو کی طرح ڈسے لگی تھیں۔ وہ فوراً آنکھیں کھول لیا کرتا، اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولی تھیں مگر یہ کیا.....؟

وہ سامنے تھی۔

نہ معلوم بصارت کا دھوکہ یا دماغ کا کوئی فریب۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”ہیلو! کاش آج خدا سے کچھ اور بھی مانگ لیا ہوتا تو وہ بھی مل جاتا۔“ زرد ٹراڈ زرد، سرخ زرد پر عینڈ سلویس شرٹ میں گہری سرخ لپ اسٹک سے ہونٹوں کو دکھائے وہ سامنے کھڑی تھی حقیقت بن کر۔

”خدا سے مانگنے کی آرزو وہ لوگ کرتے ہیں جو خدا پر یقین کرتے ہیں، آپ جیسے لوگ تو پر اپنی کوئی سب کچھ سمجھتے ہیں، پھر آج یہ آرزو کیسے جاگ اٹھی؟“

ایک نگاہ اسے دیکھ کر وہ نظریں جھکا چکا تھا۔ وہ بغیر دعوت کے کرسی تھمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کی تیز نظریں اس کے دیدار سے سیراب ہونے لگی تھیں۔

”اوہ، کیا آپ ہمیں مسلمان نہیں سمجھتے؟“ اس نے ہاتھ سے شانوں پر بکھرے بال سمیٹتے ہوئے شوشی سے پوچھا۔

”میں کسی پر کفر کا دعویٰ کر کے گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”یہاں جم کب سے آرہے ہو۔“

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“

”بزنس کے علاوہ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“ وہ جو عشق کی آگ میں جل کر راکھ ہو چکی تھی اس کی جدائی اسے مارے ڈال رہی تھی۔ گوہر مقصود سامنے دیکھ کر وہ دیوانوں کی طرح چلی آئی تھی جبکہ وہ بے گانہ بنا بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے خوشی، دکھ، حیرت یا نفرت کسی بھی جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

سپاٹ اعزاز

سرورویہ

کند چھری سے گویا ذبح کر دیتے ہیں، بڑے قائل اعزاز ہوتے ہیں یہ۔

”انس آپ ناراض ہیں؟“ وہ اس کی کج ادائی برداشت نہ کر پائی۔

”کیوں؟“ اس کا اعزاز سپاٹ تھا۔

”ایسے مت بنو جیسے جانتے نہیں ہو۔“ آنسو اس کی آنکھوں میں آگئے۔

”اب ویسے بننے کا فائدہ بھی کیا ہے؟“

”بزنس مین ہو، نفع نقصان کی ہی بات کر سکتے ہو۔ دل کے معاملوں میں بزنس اسکیل نہیں آتا ہے۔“ وہ نزاکت سے ٹشو پپر سے آنکھیں صاف کرتی بولی۔

”ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔“

”میں اس تعلق کو پھر جوڑنا چاہتی ہوں، جو میں نے ہی توڑا تھا۔“ وہ آہستگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

انس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ بھی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ گہری گہری استحقاق بھری نگاہوں سے لمبے بھر کو دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ منال کے سرخ ہونٹوں پر جان دار مسکراہٹ ابھری تھی۔

”میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، صرف اور صرف تمہارے ساتھ، تمہاری بن کر۔“ وہ گویا بے خودی کی لہر میں بہ رہی تھی۔

انس اس کی بات پر شاکڈ و جامد سا بیشارہ گیا تھا۔ اسی وقت اس کے پرسنل سیل کی ٹیون آن ہوئی تھی۔



اس نے سبل اسکرین پر اجنبی نمبر دیکھ کر حجب انداز میں کال ریسیو کی تھی۔ دوسری جانب سے جس نے اسے مخاطب کیا وہ لمبے بھر کو اسے چونکا گیا تھا۔ بے اختیار اس کی نگاہیں سامنے بیٹھی منال پر اٹھی تھیں جو بڑی وارفتگی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس کی دل فریب مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی جبکہ وہ اچھتی نگاہوں سے اس پر ڈال کرتی رہی جس سے کال پر متوجہ ہو گیا تھا۔

”کتنا نام لگے گا آپ کو وہاں تک پہنچنے میں؟“ وہ رست واضح دیکھتا ہوا دوسری جانب سے جواب سننے لگا تھا۔

”اُس اوکے۔ ایک گھنٹے بعد میں آپ کو وہاں پر ملوں گا۔“ سبل آف کر کے اس نے کوٹ کی جیب میں رکھا، اس کے تھکنس میں بے ریبڑی لپٹل پیدا ہو گئی تھی۔ رگ و پے میں تیزی سے گردش کرتے خون میں پیدا ہونے والے تجسس و الجھن کے تاثرات کو چہرے سے ہویہ ہونے سے بمشکل روک سکا تھا۔

”کسی فریڈ کی کال تھی؟“ منال نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہوں۔“ وہ بھی جواباً مسکرا کر اثبات میں سر ہلا سکا تھا کہ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ کس کا فون تھا اور کیوں تھا تو یہاں وہ اس اطمینان و سکون سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ ایک ہنگامہ قبل از وقت شروع ہو جاتا۔

”کوئی ایمر جنسی کال تھی؟ خاصے ڈسٹرب سے ہو گئے ہو۔“

”ارے..... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو خواہ خواہ وہم ہوا ہے۔“

”مجھے وہم ہوا ہے، وہم ہو بھی نہیں سکتا، جس شخص کو ہم اپنی زریست سے بڑھ کر چاہیں، اس کے جذبات، احساسات، کیفیات بھلا ہماری آنکھوں سے، ہمارے احساسات سے کس طرح سے مخفی رہ سکتی ہیں اور تم تم تو میرے دل میں دھڑکن کی طرح بٹتے ہو اور جب دھڑکنیں بے ترتیب ہوں تو دل بڈامن کیسے رہ سکتا ہے۔“

اس کے ایک ایک لفظ میں دہکتے جذبوں کی حکایتیں پنہاں تھیں، مدت بعد اسے گویا مقصود ہاتھ لگا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی، اس اتفاقہ ملاقات کا کوئی لمحہ رائیگاں جائے۔ اُس کی سادہ مزاجی و احتیاط پسندی سے واقف تھی۔ اسے معلوم تھا پانچ سال قبل وہ جتنا کم گو، شرمیلا، سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا وہی خصوصیات اس میں اب بھی موجود ہیں۔

اس کے مزاج میں سرنور فرق نہیں آیا تھا۔

وہی انداز تھا، وہی شخصیت، وہی بے نیازی و متانت وہی وقار، وہی وجاہت۔

جس پر مرٹنے کو دل چاہتا تھا، وہ مرٹتی تھی۔

”اتنا دعویٰ ہے مجھے سمجھنے کا؟“ وہ کچھ جبک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس انداز میں گویا ہوا کہ منال کی دھڑکنوں میں دل فریب اشتعال سا پیدا ہو گیا۔

اُس کا بھاری لہجہ، مخمور نگاہوں کا قاتل انداز، اسے خوشی سے نہال کر گیا، وہ سوچ رہی تھی اسے منانے کے لیے، اپنی سچی محبت کا

یقین دلانے کے لیے، نہ معلوم کتنے جتن کرنے پڑیں گے، کتنی مسافت طے کرنی پڑے گی، پھر نہ معلوم منزل تک پہنچ پائے گی یا نہیں.....؟ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

قسمت نے ہمیشہ کی طرح اس کے آگے سرنگوں کیا تھا۔

”بس۔۔۔ وہ ادائے دل رہائی سے اٹھلائی تھی۔

”کیا لوگی؟“ وہ گویا لاجواب ہو کر بولا۔

”اس وقت تو صرف تمہاری دید سے میرا ب ہونا چاہتی ہوں۔“

”خامسی دیدہ دور ہوگئی ہو، بٹ آخ سوری، مجھے ابھی جانا ہوگا، کوئی میرے انتظار میں ہے۔“ وہ رست و اوج پر نگاہ ڈال کر فوراً عجلت میں کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ اس کی تھلید میں مثال بھی کھڑی ہوگئی تھی اور اس کے اس جھلے کے ایک لفظ ”کوئی“ نے اس کے چہرے کی رنگت آزادی تھی۔

”تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے جس سے تم ملنے جا رہے ہو؟“

اُس نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی کیفیت اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”گرل فرینڈ کبھی پہلے بنائی تھی اور شاپ ارادہ ہے۔“

”اوہ..... سوری میں بس۔۔۔ وہ ختم ہی ہوگئی۔

”یہ دعویٰ ہے مجھے مجھ سے زیادہ جاننے کا؟“

”میں نے کہا نہ باہا اسوری۔ ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی، دراصل تم جس تیزی سے اُٹھ رہے ہو، یہ انداز کسی اسپیکل پرسن کے لیے ہوتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے وہ اسپیکل پرسن میل ہوگا، فی میل نہیں۔“ اس نے بس کراہتی لفظوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں، تم سے چھڑ کر کس طرح لائف لیت ہوئی، اس کا لمحہ لمحہ میں تم سے شیئر کرنا چاہتی ہوں، مجھے احساس ہے میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی تھی، بے حد دل دکھایا تھا، جس کی بڑی سزا بھگتی ہے، زندگی کا ہر پہل مجھ سے میری ناگہمی کا تادان لے کر گزرا ہے۔“ وہ اس کے سگ چل رہی تھی پورٹیکو کی جانب، جہاں اس کی کار پارک تھی۔

”مجھ میں طاقت نہیں رہی مزید اسٹرگل کرنے کی، اب زندگی میں تمہارے ساتھ، تمہاری ہانہوں میں گزارنا چاہتی ہوں، تاکہ خود کو زندہ محسوس کر سکوں۔“ اس کی غم آواز مکروفریب سے مبرا سچائی دلگن سے لبریز تھی۔

”او کے، اب مجھے اجازت دو۔“ وہ اپنی کار کے قریب کھڑا ہو کر بولا۔

”میری بے قرار یوں کا یہ جواب ہے؟“ وہ سخت دل برداشتہ ہو کر گویا ہوئی۔

”محبت اتنی کمزور نہیں ہوتی جس کو لفظوں کے سہاروں کی ضرورت پڑے، یہ اپنا آپ خود منواتی ہے۔ لفظوں کا سہارا اس کی حرمت کو داغ دار کر دیتا ہے۔“

”ہاں..... شاید میرے حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے ہیں، میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”میں بھی تم سے دو بارہ ملنے کا خواہش مند ہوں۔“ وہ کوٹ کی جیب سے والٹ نکال کر اس میں سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے

پکڑاتے ہوئے گویا ہوا۔

پھر رکی الوداعی کلمات کے بعد انس کار لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ منال اس وقت تک اس کی کار کو دیکھتی رہی، جب تک وہ

نکاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ پھر اس نے مٹی میں دبے کارڈ کو اس طرح خوشی سے چومنا، گویا پتہ اٹھیم کی دولت کا راز پالیا ہو۔ خوشی سے اس کا

ایک ایک کھل اٹھا تھا۔

☆.....☆.....☆

السلام علیکم بر خوردار! اندر آئیں یا باہر سے ہی واپس لوٹ جائیں؟“ وہ جو خلاف توقع باپ کو سامنے دیکھ کر ششدر سا کھڑا رہ گیا

تھا۔ استعجاب، بے یقینی، حیرانگی ایک سرخوشی کے ہلکے سے جذبے نے اسے لگ کر ڈالا تھا۔ عام صاحب کی بڑی شفقت و کچھ کچھ کھنگلی جھلکتی

آواز نے اسے جھنجھوڑا تھا۔

”پاپا!“ وہ بے ساختہ ان کے سینے سے لپٹ کر آبدیدہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے بھی بڑی محبت سے اسے سینے سے لگا کر بھینچا تھا۔

آنکھوں میں ان کے بھی نمی دہا آئی تھی، جس کو ضبط کرنے کی انہوں نے سعی بھی نہ کی۔

مزہ انہیں ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا تھا۔ صدمہ گو گو کی کیفیت میں بیٹھا تھا۔

”پاپا! آپ یہاں؟“ صدمہ سکتے کی کیفیت سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

”بر خوردار! اکتی دلوں سے مجھے شہر تھا کہ آپ ایک مقررہ وقت پر گھر سے غائب رہنے لگے ہو، میں نے آپ کی غیر موجودگی میں

آپ کے تمام فریڈز سے کال کر کے آپ کی وہاں موجودگی کا معلوم کیا وہاں سے نفی میں جواب ملتا رہا اور میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے، اپنے

گمان کو یقین میں بدلنے کے لیے میں دوسرے آپ کے پیچھے آیا مگر دونوں مرتبہ میں آپ کی کار کو فالو نہ کر سکا مگر آج تقدیر نے مجھے کامیاب

کر ہی دیا۔“ وہ احتیاط بھرے انداز میں بات کر رہے تھے۔ ویز چائے اور دیگر لوازمات کی ٹرائی لے آیا تھا۔

چائے بے حد خاموشی کے دوران پی گئی تھی۔ عام صاحب کسی سوچ کی عمیق گہرائی میں گم تھے۔

صدمہ ترجمی لگا ہوں سے کبھی عام صاحب کی جانب دیکھتا تو کبھی مزہ کی جانب، مزہ نظریں جھکائے چائے پی رہا تھا۔ اس کے

انداز میں سپاٹ پن ظاہر تھا۔ تین نفوس کی موجودگی کے باوجود کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔

مزہ اپنی جذباتی کیفیت کو سنجال چکا تھا جو چاک باپ کو دیکھ کر اس پر طاری ہوئی تھی، اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اُبھر آئی تھی۔

”آپ کی یہ طویل خاموشی ظاہر کر رہی ہے کہ آپ کی ناراضگی میں ابھی تک سر نہ فرق نہیں آیا ہے۔“

”ناراضگی کیسی پاپا! ابھی تک میں خود کو سمجھ نہیں پایا ہوں، ایسا لگتا ہے میں نے جو کچھ کیا وہ فضول و بے معنی ہے۔ زندگی کا مقصد،

مشغول کا تعین کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہوگا؟“

”سب ہوگا بیٹا! اور اچھا ہوگا، بس بعض اوقات ہم جو فیصلے نہیں کر پاتے ہیں تو تقدیر ہمارے فیصلے کرتی ہے۔“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ناصحانہ انداز میں سمجھا رہے تھے۔

”گھر چلو بیٹا! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اس طرح گھر چھوڑ دینا نادانی نہیں ہے۔ ہمارا آج ہمیشہ ہمارے کل پر بھاری رہتا ہے۔ وقت خود کو دہراتا ہے۔ کل میں اپنے آپ میں گمن ہو کر اپنے فرائض، اپنے حقوق کی ادائیگی اور شے فراموش کر چکا تھا تو دیکھو آج مجھے گزرے ہوئے کل نے شرمندگی، ملال و تاسف کے سوا کچھ نہ دیا۔ اب میں سوچتا ہوں کاش! کوئی معجزہ ہو جائے اور میں اس وقت کو دوبارہ حاصل کر لوں، جب مجھ سے کوتاہیاں ہوئی تھیں لیکن اب معجزے کہاں۔ ہم ٹیکسوں سے، رخصتوں سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ اپنے اعمالوں کے سبب، ہر سزا سے کڑی سزا، خمیر کی سزا ہوتی ہے، جس سے آپ کو مرتے دم تک رہائی ممکن نہیں ہوتی ہے۔ سو میں بخوشی یہ سزا پار ہا ہوں لیکن نہیں چاہتا کہ یہ سلسلہ دراز ہو، کل میں نادانی میں گھر سے اور رشتے سے غافل رہا، آج تم جذبات میں یہ غلطی کر رہے ہو۔ وقت گزر جانے پر احساس بیدار ہو گا تو اس وقت تک کافی دیر ہو چکی ہوگی۔ تو وقت گزر جانے سے بھر ہے، اپنے کل کو ہم آج سنوار دیں، نہ پھیلائیں کدورتیں و نادانی کے یہ سلسلے جو اس طرح قائم ہوتے ہیں۔“ باپ کی کمر و آواز، پشیمانی و دکھ میں لرزاں ایک ایک لفظ اس کے تاریک درپچوں کو روشنی فراہم کر رہا تھا، وہ بھی تو ان سے چند دن دور رہ کر جان گیا تھا، اپنوں سے دور رہ کر زندگی، زندگی نہیں رہتی، سزا بن جاتی ہے، پھر مکافات عمل تو ازل سے چلا آ رہا ہے۔“

”پاپا تمہارے پاس بڑی امید لے کر آئے ہیں، کیا انہیں مایوس لوناؤ گے؟“ اسے سوچوں میں غلطیاں دیکھ کر صبر کو کہتا پڑا۔

”پاپا نے صحیح کہا ہے، مکافات عمل کا سلسلہ دراز نہیں ہونا چاہیے اور یہ بھی درست ہے کہ جذبات میں اٹھائے گئے قدم کبھی کامیاب راستوں پر گامزن نہیں ہوتے ہیں، میں گھر تل رہا ہوں۔“

☆.....☆.....☆

وہ فیصلے جن کو کرنے میں بعض اوقات وقت ملتی تھی، بندرت کی طرح نکل جاتا ہے کبھی لہر بھر میں بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک فیصلہ وقت نے اس سے کر دیا تھا۔ وہ خود کو تقدیر کے سمندر کی لہروں کے سپرد کر چکی تھی کہ وہ اسے غرق کرتی ہیں یا کنارے پر چھوڑ جاتی ہیں۔

موہاگل سے انس مدثر کا نمبر ڈیلیٹ کر کے اس نے واپس دیں رکھ دیا، جہاں سے اٹھایا تھا، چند لمحوں بعد ڈرائیور کے ہمراہ مائی کیڑا آتی ہوئی نظر آئی، پھر قریب آ کر بولی۔

”چلیں بی بی صاحب! میں وہاں صفائی کروا کر آئی ہوں۔“

”اب ضرورت نہیں ہے، واپس چلو۔“ اس کے حکم پر انداز پر وہ خاموشی سے ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا کہہ کر بیٹھ گئی۔

گاڑی سبک رفتاری سے رواں دواں تھی۔

طارق روڈ شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لائٹ میں گاڑی رُک گئی تھی۔ وہ مائی سیکینڈ کو ساتھ لے کر آگے بڑھ گئی، یونیک سے اس نے چند سوئس جلدی جلدی خریدے تھے، وہیں سے ہی سینٹر لڑ بھی مل گئی تھیں، جیولری اس نے لی نہیں تھی۔ پندرہ منٹ میں وہ اپنی شاپنگ مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ دو سوئس مائی سیکینڈ کو بھی دلوا چکی تھی، جس نے نہ نہ کرنے کے بعد وصول کر لیے تھے۔

”مجھے اپنی ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔ میں ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی، تب تک تم اپنے لیے کچھ خریداری کر لو، پھر سامنے والے ریسٹورینٹ میں بیٹھ جانا، میں وہیں آ جاؤں گی۔“ وہ شاپنگ سینٹر کے دوسرے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے مائی سیکینڈ سے مخاطب ہوئی تھی۔

”ہلی بی صاحبہ! ڈرامیٹر، صاحبہ اور مالکن کا خاص چہرہ ہے، بہت حیرت دماغ، تیز نظر ہے، کوشش کیجئے گا اسے شک نہ ہونے پائے۔“ بہت نڈر رو بے خوف نظر آنے والی مائی سیکینڈ اس وقت کچھ ہراساں و فکر مند دکھائی دی۔

”بے فکر ہو، ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا، میں جلد واپس آؤں گی، گھبرانا مت۔“ کرن اسے دلا سہارے کر بیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ خریداری کرنے والوں کا اچھا خاصا ہجوم وہاں کھرا ہوا تھا۔

وہ نیچے آئی تو انس سامنے ہی نظر آ گیا۔ وہ سٹلاشی مگر محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدم جبک کر رُک گئے۔ دل میں عجیب سا سلاطم برپا ہو گیا۔ خوشگوار موسم کے باوجود لمبے بھر میں پسینے سے شرابور ہوئی تھی۔ وہ سامنے تھا۔

جس کو کسی اس کی پرچھائی سے بھی چڑھتی اور آج..... وہ اس کی پرچھائی بننے جا رہی تھی، وہ اس سے زیادہ دور نہ تھا۔

پُر وقار شخصیت.....  
خوب صورت گرے جاکھیں جن کی گہری شفاف تہ میں سوز پنہاں رہتا تھا۔  
دل کش نقوش.....

چہرے پر بلا کی سنجیدگی نے جسے بُرے وقار جاو بیت بخشی تھی۔

”تھینکس گاڈ! آپ آگئیں، ورنہ میں پریشان ہو گیا تھا۔“ انس کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ تیزی سے اس کی طرف آتا ہوا بولا۔  
”مسافت کافی طویل تھی، اس لیے دیر ہو گئی۔“

”منزل پر پہنچنے کے بعد مسافروں کی طوالت سرخوشی عطا کرتی ہے، تمہکان نہیں۔ لیکن آپ مجھے خاصی پڑ مردہ و ابھی دکھائی دے رہی ہیں، کیا بات ہے آپ اپنے فیصلے سے خوش نہیں ہیں؟“ وہ اس کے ساتھ کار میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ کار اشارٹ کرتا ہوا سنجیدگی سے گویا ہوا۔  
”کیا اس طرح ایسے کام ہوتے ہیں؟ کیا مجھے ایسا کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو سکتی ہے؟ جس طرح ہم یہ کر رہے ہیں؟ یہ کسی محبت یا دلی وابستگی کا جنون نہیں ہے، یہاں صرف انتقامی جذباتوں کے تحت سب ہو رہا ہے۔“



”کیا انتقامی جذبوں پر زندگی داؤ پر لگائی جاتی ہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا آہستگی سے گویا ہوا، بلیک کلر کی بڑی چادر جس پر سرخ دھاگے سے لڑھائی کی گئی تھی وہ اس نے اس طرح اوڑھی ہوئی تھی کہ اس کے سراپے کے ساتھ وہ اس کے چہرے کو بھی آدھا چھپائے تھی۔

”ہاں کچھ جذبے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ ان میں ایک جذبہ انتقام بھی ہے۔ مجھے اپنے باپ سے انتقام لینا ہے اور آپ کو منال سے۔“ وہ جتنی آہستگی سے بولی تھی، ردعمل اتنا ہی ہا آواز ہوا تھا۔ اس کی ہاتھیں غور سے سنتے ہوئے انس کو آخری لفظ پر حیرانگی کا اتنا زبردست شاک لگا تھا کہ وہ بمشکل کار کو درخت سے نکرانے سے بچا سکا تھا۔ کارنٹ ہاتھ سے نکر کر ڈک گئی تھی۔ نتیجتاً زوردار آواز پیدا ہوئی تھی۔ پیچھے آنے والی گاڑیاں ان کی خیریت پوچھ کر گزر رہی تھیں۔

”آر پورانت؟“ وہ خود کو سنبھالتا ہوا اس سے مخاطب ہوا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا مگر دل اس کا نئی طرح دھڑک رہا تھا۔ ”جھینکس گاڈ ایچٹ ہو گئی۔ سڑک پر اتنا ٹریفک نہ تھا۔“ وہ کار دو بارہ اشارت کرتے ہوئے بولا۔ کچھ دیر قبل پُر اعتماد و مطمئن نظر آنے والا انس ڈسٹرب دکھائی دے رہا تھا، کرن کو اس نے عام لڑکی سمجھا تھا جو اپنے ماحول و حالات کی چٹکی میں بس کر بد مزاج و بد نماں تھی اس کی نگاہ میں مگر اس نے وہ سچائی بیان کر دی تھی جس کا اعتراف وہ ڈیڑے سے بھی نہ کر سکا تھا۔

”یہ آپ نے ابھی کیا کہا کہ میں منال کا انتقام آپ سے لوں گا؟“

”میں نے جو سوچا، وہ کہہ دیا۔ آپ کے دل میں کیا ہے، اس سے میں لاعلم ہوں، لیکن حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ آپ نے کسی ولی جذبے کے تحت پھر سے مراسم مضبوط کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ کرن کی آواز وہی وسپاٹ سی تھی جس سے کوئی جذبہ، کوئی اُمتگ ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ اس نے ایک بار بھی گردن اٹھا کر انس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔

البتہ وہ گاہے بگاہے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس پر نگاہ ڈال رہا تھا۔ چادر کی اوٹ سے کبھی ستواں تاک نظر آتی، کبھی صبیح رخسار پر لڑاں سیاہ دراز پلوں کی جھالریں نظر آتی تھیں۔

”مجھے افسوس ہے خود پر کہ ہر دفعہ آپ کے بارے میں اندازے لگانے میں ناکام ثابت ہوتا ہوں اور ہر بار آپ میری توقع سے بڑھ کر ثابت ہوتی ہیں۔ اب بھی ایسا ہی ہوا ہے مگر کچھ اندازے دسوچ آپ کی بھی درست نہیں ہیں۔“

”میں نے کہا نا میری محض قیاس آرائی ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

پھر ان کے درمیان کوئی لنگھو نہیں ہوئی تھی۔

وہ سجد کے فلیٹ پر چلے آئے تھے۔ سجد اور فاریہ نے والہانہ استقبال کیا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہاں قاضی صاحب اور گواہان کے طور پر انس کے قریبی دراز دان دوست موجود تھے۔ بہت سادگی سے ان کا نکاح ہو گیا تھا۔

کمرے میں مبارک سلامت کا شور گونج اُٹھا تھا۔ انس کے دوست مبارک باد دے رہے تھے۔ بغل گیر ہو رہے تھے۔

اس کی چہرے پر خلاف توقع بے حد خوشی و شادمانی تھی۔

وہ قاریہ کے ساتھ اس کے بیڈروم میں آگئی تھی۔ اس وقت اس کے ذہن میں سنا تھا۔ ہر سوچ، ہر لفظ، ہر احساس گویا مفلوج ہو گئے تھے۔ ایک دل تھا، جو بھر بھر کر آ رہا تھا اور وہ بے آواز روئے جا رہی تھی۔

قاریہ جو اس کے حالات اور جذباتی کیفیت سے آگاہ تھی، خاموشی سے اٹھ کر اس کے پاس سے چلی گئی تھی تاکہ وہ تنہائی میں اپنے دل کا یوجھ ہلکا کر کے فریش ہو جائے اور ہوا بھی ایسا ہی وہ کچھ دیر بعد اندر آئی تو وہ منہ ہاتھ ہاتھ دھو کر بیٹھی ہال بنا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اور ناک شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں، قاریہ نے زانی گھسیٹی ہوئی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”آج دونوں ملازماؤں کو میں نے چھٹی دے دی تھی، اس تقریب کی وجہ سے۔ دراصل حالات ایسے ہیں کہ یہ کام بہت راز داری سے کرنا پڑا ہے، وہاں بھی گریٹی کو معلوم ہے مڈ ٹرانگل یوشن میں ہیں مگر دونوں نے تمہیں بہت دعاؤں سے نوازا ہے، بہت خوش ہیں دونوں اس تعلق پر“۔ قاریہ نے لوازمات کے لیے پلیٹ سیدھی رکھتی ہوئی بتا رہی تھی۔

”میں صرف چائے پیوں گی“۔ وہ ہال بنا کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

”صرف چائے سے کیا ہوگا؟“

”کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا“۔

”دل کو سمجھاؤ، اتنا بڑا شینڈلیا ہے تم نے اسے نبھانے کے لیے، بہت سارے معاملے نمٹانے کی ضرورت پڑے گی۔ اس طرح نہ کھانے سے تم خود سے لڑنا پڑے گی۔ زبردستی کھاؤ“۔ قاریہ کے انداز میں از حد اپنائیت و خلوص تھا۔

”پلیز! ابھی نہیں، اب مجھے دل نہیں چاہتا ہے۔ ایک گھنٹہ ہونے والا ہے۔ مجھے دیر ہوگئی تو مسئلہ ہو جائے گا اور میں نہیں چاہتی قہقہے از وقت کچھ گڑبڑ ہو“۔

”ہاں، ہاں ان تمام نزاکتوں کا مجھے احساس ہے، یہاں سے ایک شارٹ کٹ طارق روڈ تک دس منٹ میں پہنچا دے گا، وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو جائیں پھر میں کہتی ہوں“۔ قاریہ اس کے لیے چائے لے آئی تھی۔

دو خواتین کی موجودگی کے باوجود کمرے میں خاموشی میٹھی تھی۔

قاریہ اس نئے بندھن کے حوالے سے اس سے کوئی لطفی سی چھیڑ چھاڑ کا سوچتی پھر پمپوشن اور کرن کی سنجیدہ و کچھ رنجیدہ سی صورت دیکھ کر ملال سا اس کے اندر اترنے لگا تھا۔

کیا شادی اس طرح ہوتی ہے؟

نئے بندھن اس طرح بانہ باندھے جاتے ہیں، جیسے چوری کی گئی ہو۔

وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

کبھی کبھی لمحوں میں تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں۔

جس طرح وہ آتے وقت کرن برہان لغاری تھی.....

اور اب واپسی پر..... وہ اس کے سنگ اس کی منکوحہ کی حیثیت سے بیٹھی تھی۔

منشوں کا رو بدل.....

لمحوں کا میر پھر۔

اسے کرن برہان لغاری سے کرن انس مدثر بنا گیا تھا۔

”کچھ کہیں گی نہیں..... کیا محسوس ہو رہا ہے مجھ سے وابستہ ہو کر؟“ کارڈ رائیڈ کرتے ہوئے وہ کرن سے بڑے ترمک میں گویا ہوا تھا۔

”اندیشوں اور وسوسوں کی چابک مجھ پر برسے گی ہے۔ سوچنے بھننے کی حس مفلوج ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا، میرا یہ انتہائی

قدم مثبت ثابت ہو سکے گا یا نہیں؟ جس طرح میں نے سوچا ہے وہ ہوگا یا نہیں؟ تقدیر میرے ساتھ یا دوری کرے گی یا غمخاری؟“

”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”جی..... اب کیا ہوگا؟“ بے ساختہ وہ کہہ اٹھی تھی۔

”وہی جو منظور خدا ہوگا۔“ انس مسکراتا ہوا بولا۔ ”اب آپ بالکل ریلیکس رہیں، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، جو فیصلے ہم کر نہیں پاتے وہ

وقت کر دیتا ہے۔ وقت نے بھی ہمارا فیصلہ کر دیا ہے، میرے حوالے سے، میرے ماضی کے حوالے سے اور آنے والے مستقبل کے حوالے

سے آپ جن شکوک و شبہات میں جھلا ہیں ان کی تلافی..... سوری اس بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ میں

نے صدق دل سے آپ کا ہاتھ تھاما ہے۔“ اس نے دائیں ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال کر بائیں ہاتھ سے اس کا مخرومی ہاتھ تھام کر ہونٹوں

سے لگا تھا۔

اس کی یہ حرکت بالکل غیر متوقع تھی۔

ایک لمحہ اس کا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر مس ہوا تھا وہ مرتا پائے احساس سے جھنجھا کر رہ گئی تھی۔

رگ و پے میں برقی سی دوڑ اٹھی تھی۔

فہم و ادراک کے نا آشنا محسوسات سے دوچار ہوئی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں اتھل پھٹھل تھیں اور وہ ایسی منتشر ہوئیں کہ جن کی صدا

انس کی سماعتوں میں بھی گونج اٹھی تھی۔

اس نے دھیمے سے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”لیک ایٹ ایزی، اب کوئی شرارت نہیں ہوگی۔“ کرن کو سننے دیکھ کر وہ بولا اور پھر راستہ بے حد خاموشی سے گزرا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کھانے پر ایسی کوئی خاص گہما گہمی دیکھنے میں نہیں آئی جو عموماً بیٹی کے سرالیوں کی آمد پر ہوتی ہے، سب حسب معمول تھا البتہ منال چلی آئی تھی اور اس کی آمد والدہ حضور کو سخت ناگوار گزری جس کا اظہار وہ کیے بنا رہ نہ سکیں۔

”طویل عرصے بعد کل تو تم گئی تھیں، یہ آج یہاں آنے کی کیا سوجھی؟“ وہ برہمی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

”اس بات سے کیا مطلب ہے آپ کا گریڈ درجہ میں اپنے گھر آئی ہوں، اپنے گھر آنے کے لیے بھی مجھے اب تک بڑے بڑے“

”؟“ حسب عادت وہ برہمی طرح سلگ کر گویا ہوئی تھی۔

وہاں اس وقت ان دونوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔

”شادی کے بعد لڑکی اپنے گھر میں ہی بچتی ہے۔ یہ روز روز مت اٹھا کر سیکے آجانے والی لڑکیاں کبھی بھی گھر نہیں بسا پاتی ہیں۔ شکر کرو سردر میاں اچھے آدمی ہیں جو تم جیسی لڑکی کو بھجارے ہیں اور اپنی ماں جیسی زندگی گزارنا نہیں چاہتیں تو اس کی سیوا کرو۔“

”بس بہت ہو گئی۔“ وہ کسی ناگن کی طرح پھنکاری تھی۔ ”میری ماما کو آپ نے یہاں رہنے نہیں دیا، اب آپ سے اتنی دور ہیں وہ، اس کے باوجود آپ انہیں بھولتی نہیں ہیں۔ بہت خراب، بہت کڑھٹ ہیں آپ..... لیکن جو آپ سوچ رہی ہیں کہ میں بھی اپنی ماما کی طرح آپ کو یہاں کھرائی کے لیے چھوڑ جاؤں گی تو یہ آپ کی بھول ہے، یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گی، ماما کی طرح مصوم و کزور نہیں ہوں میں کہ آپ مجھے یہاں سے نکال سکیں۔“ وہ غصے سے بے قابو تھی۔

”مصوم و کزور۔“ از حد اہانت آمیز و حقیر بھری مسکراہٹ والدہ حضور کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی۔

”بدر کردار بد چلن تھی۔“

”گریڈ درجہ، اسٹاپ اٹ۔“ وہ ہندی طرح چینی تھی۔

”چینو اور چینو، تا کہ سب ملازمین کو بھی معلوم ہو جائے کہ تمہاری ماں ایک دو ٹکے کے انجینئر کے ساتھ بھاگ گئی تھی، یہ تھی تمہاری ماں کی اوقات۔ گندگی کے کیڑوں کو صفائی کب بھاتی ہے۔ انہیں چین گندگی میں ڈکیاں لگاتے ہوئے ہی آتا ہے۔“ ان کے لہجے میں نفرت و اہانت تھی۔

”میں آپ کی بکواس سننے نہیں آئی ہوں یہاں پر اور آپ کیا سمجھتی ہیں جو آپ کہیں گی اس پر میں یقین کر لوں گی۔“ اس کی آواز میں وہ طنز و اعتماد موجود نہ تھا۔

”یقین نہ بھی آئے تو کوئی ٹکڑی بات نہیں ہے۔ ابھی برہان آرہا ہے اس سے معلوم کر لیا، وہ اچھی طرح سے بتائے گا کہ کس طرح اس نے تمہاری ”مصوم و کزور“ ماں کو اپنے عاشق کے ساتھ عشق کرتے ہوئے بچا اور دکھ دے کر یہاں سے نکالا تھا، سب یاد ہے۔“

والدہ حضور کا انداز ایسا تھا گویا کوئی دلچسپ قصہ سنا رہی ہوں۔

”جاری ہوں میں، مگر یاد رکھیں سکون سے آپ کو میں جیسے نہیں دوں گی۔“ وہ غصے سے پھر پلٹتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ والدہ

حضور کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ کامران مرزا اور عمران مرزا کی آمد سے قبل منال یہاں سے چلی جائے، ورنہ ان کے بنے بنائے کھیل کو بگاڑ سکتی تھی کیونکہ وہ بلا سوچے سمجھے بولنے کی عادی تھی۔ سوا سے بھگانے کے لیے انہوں نے اس کی ڈھکتی رگ پر پاؤں رکھ دیا تھا اور نتیجتاً کامیابی ان کے دامن میں تھی۔

خلاف توقع کرن شاہنگ کر کے جلدی آگئی تھی اور اس کی اتنی جلد واپسی پر انہیں بے حد حیرت ہو رہی تھی۔ شاہنگ تو لڑکیوں کا کریز ہوتی ہے، کم سے کم روپوں میں بھی وہ زیادہ سے زیادہ خریداری کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ معمولی سی شاہنگ میں بھی گھنٹوں لگ جاتے ہیں، یہاں نہ وقت کا معاملہ تھا اور نہ شاہنگ پر اٹھنے والے روپوں کی کمی کا مسئلہ تھا، اس کے باوجود کرن کا بہت جلد لوٹ آنا انہیں بے چین سا کر گیا تھا۔

ان کے ذہن میں کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی مگر اس کی پکار وہ سننے کے باوجود سمجھنے میں ناکام رہی تھیں مگر بے چینی و بے کلی انہیں مضطرب کر چکی تھی، مانی سیکنڈ سے وہ پوچھ چکی تھیں، وہ کئی بار بتا چکی تھی کہ کرن اس کے ساتھ تھی، نہ وہ کسی سے ملی نہ کوئی ملنے آیا۔ ڈرائیور نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ کرن جس راستے سے گئی تھی، اسی راستے سے واپس آئی ہے، وہ مکمل گھمرائی کر رہا تھا۔ وہ دونوں ہی قابل اتہار ملازمین تھے جو ان سے جھوٹ نہیں کہہ سکتے تھے مگر پھر بھی ایک کک سی رو رہ کر اٹھتی تھی۔

برہان لغاری آج جلد ہی آگئے تھے۔

وہ کرن کو تیار ہونے کا حکم دینے کے ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کرنا نہیں بھولے تھے کہ آنے والے مہمانوں کے سامنے اس کا رویہ بہترین ہونا چاہیے۔ وہ کسی بھی قسم کی بدتمیزی و بداخلاقی کا ٹونٹا نہیں لیں گے، جو اباؤہ سعادت منڈی کی طرح سر ہلاتی رہی تھی۔ اس کی سعادت منڈی و فرما تیرواری دیکھ کر برہان لغاری نے نغوت سے سوچا کہ ایک ہی تھپڑ نے اس کے تمام کس بل نکال دیئے ہیں۔ کامران مرزا وقت کے پابند تھے۔

مقررہ وقت پر وہ لغاری ہاؤس میں اپنے بیٹے عمران مرزا کے ساتھ موجود تھے۔ برہان لغاری اور والدہ حضور نے ان کا استقبال پُر تپاک طریقے سے کیا تھا۔ ان کی پہلی تواضع کولڈ ڈرنکس سے کی گئی تھی۔

کامران مرزا نے وہاں کلف دار شلواری کے ہمراہ سیاہ خوب صورت کڑھائی والی شیروانی پہن رکھی تھی۔ سر پر وہاں ہی کلف دار گلہ نما پگڑی تھی۔ ان کی شخصیت بھاری بھر کم و ہارعب تھی۔ انگلیوں میں قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔

ان کے برابر براجمان، عمران مرزا چہرے کے نقوش و خدو خال سے باپ کی خاصی مشابہت رکھتے تھے، وہ گہرے قہری نہیں سوٹ میں لمبوس تھے۔ عمران کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے کی صاف رنگت میں عجیب سی خشونت تھی، چھوٹی چھوٹی براؤن آنکھوں میں سفاکی تھی۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت ڈراما بھی متاثر کن نہ تھی، وہ خاصے مہذب و شائستہ انداز میں گفتگو میں حصہ لے رہا تھا، ساتھ ساتھ اس کی ستلائی لگا ہیں اور گردن کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔

”ہماری بیٹی رانی کہاں ہیں جن سے ہمارے گھر میں اُجالا ہوگا، وہ ابھی تک ہماری نگاہوں سے اوجھل کیوں ہیں۔“ کامران مرزا بیٹے کی بے چینی بھانپ کر اکساری سے گویا ہوئے تھے۔

”کھانا تیار ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر آپ کی کرن سے ملاقات ہو جائے گی۔“ والدہ حضور قریب کھڑی مائی سیکینڈ کو اشارے سے کرن کو بلا کر لانے کا کہہ کر ان سے مخاطب ہو کر اٹھ گئی تھیں۔

ان کی تقلید میں برہان لغاری کے ساتھ ان باپ بیٹے کو بھی اُٹھنا پڑا تھا۔ ان کے سنگ وہ کھانے کے کمرے میں آگئے تھے جہاں میز اشتہا انگیز کھانوں اور فرؤٹس سے سجی ہوئی تھی۔

کرن اپنے کمرے میں سو گئی تھی۔ کل رات سے آج شام تک ایک طویل سفر اس نے طے کیا تھا، فیصلے تک پہنچنے کے لیے اور اب وہ بالکل بے سکون تھی۔ کسی سبک روی سے بہتی ندی کی طرح۔ مائی سیکینڈ آئی تو وہ تیار ہو چکی تھی۔

”پلیس بی بی صاحب! بلاوا آ گیا ہے۔“ وہ اندر آ کر بولی۔

”آگے قصائی صاحبان؟ سنو..... تم سے پوچھو کچھ تو خوب ہوئی ہوگی؟“

”ہاں جی! مگر میں بھی بتانے والی تھوڑی تھی، ڈرائیور کو بھی بلوایا گیا۔ اس اُنکو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ آرام سے بولا، سب ٹھیک رہا۔“

”پھر بھی اس سب کے باوجود تمہاری مالکن بے یقینی و تشویش میں جھلا دکھائی دیتی ہیں۔“ کرن دوپٹا اوڑھتے ہوئے گویا تھی۔

”یہ تو جی، بڑے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ کمزور اور چھوٹے لوگوں کی باتوں پر بے اطمینانی دے یقینی ظاہر کرنے کی وہ ہم جیسے

لوگوں پر اعتبار نہ بھی کرنا چاہیں تو کرنا ہی پڑتا ہے، لیکن مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے مجھ پر اعتبار کیا ہے۔“ فرط دسرت سے مائی سیکینڈ کی آواز گھویر ہو گئی تھی۔

”اعتبار تو میں اپنی پرجمائی پر بھی کرنے کی عادی نہیں ہوں مائی سیکینڈ! جب مجھ جیسے لوگ تختہ یا تختہ کو تقدیر مان لیتے ہیں تو پھر

انہیں کسی کے اعتبار یا بے اعتباری کی فکر دامن گیر نہیں رہتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر سوچا، پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”میں تمہاری بے حد ممنون ہوں۔“

الہیلٹی خوشبو کا مسطر جھونکا ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا۔ وہ سلام کرتی اندر داخل ہوئی تھی۔ عمران مرزا احتراماً کھڑا ہوا تھا۔ اس کی

نگاہیں کرن کے چہرے اور سر اُپے کا گہرائی سے جائزہ لے رہی تھیں۔ مردانہ و بلیو کٹر اسٹ سوٹ میں ہلکی جیولری و سادہ چہرے کے باوجود اس کے حسن میں ایک بے کشش جاذبیت تھی۔

عمران مرزا کے چہرے پر پھیلتے پسندیدگی کے رنگ کامران مرزا کی جہاندیدہ نگاہوں سے چھپے نہ رہ سکے تھے۔ انہوں نے

با آواز بلند اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور اٹھ کر اس کے سر پر سے کچھ لال ٹوٹ وار کر قریب کھڑی ملازمہ کو تھمائے تھے۔

”ماشاء اللہ، ہمیں ایسے چراغ کی ضرورت تھی۔ اپنے اندھیرے گھر کی روشنیوں کے لیے۔“ انہوں نے سامنے بیٹھی کرن کو

دیکھتے ہوئے کہا۔ کرن سپاٹ چہرے کو جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے انداز میں محسوس کیے جانے والا بیگانہ پن تھا جو ان چاروں نے محسوس کیا۔ والدہ حضور نے خوشگئیں لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھا مگر وہ دانستہ لگا ہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

”کھانا شروع کریں، کرن ڈشز سرو کریں۔“ برہان لغاری پہلے مہمانوں اور پھر کرن سے مخاطب ہوئے۔ ان کے انداز میں جو تپش و خشکی تھی، وہ کرن نے بخوبی نوٹ کی تھی اور معاملہ تو وہ بھی بگاڑنا نہیں چاہتی تھی، سو خاموشی سے کھانا سرو کرنے لگی۔ کھانے کے دوران گفتگو برائے نام ہی ہوئی تھی۔ یہ بات اس نے نوٹ کی کہ اس کے وہ نام نہاد سسرالی پوری طرح سے اس کے باپ اور دادی سے مرعوب تھے۔ حیثیت میں، خاندان میں اور عزت و وقار کسی میں بھی وہ ان کے ہم پلہ نہ تھے۔ عمران مرزا کی بھی ذرا جرات نہ ہو سکی تھی کہ وہ اس رشتے کے حوالے سے برملا اپنی پسندیدگی کا اظہار کر سکتا۔ بس چہرہ کی طرح وہ اس پر لگا ہیں مرکز ذکر تار ہاتھا۔

کھانے کے بعد وہ ٹھہرے نہیں تھے۔ بڑے خوش خوش واپس ہوئے تھے۔ کرن کو بھی اس کے کمرے میں جانے کا حکم مل چکا تھا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔ مائی سیکر کو حکم ملا تھا کہ وہ مٹھائی اور فرٹس کے ٹوکڑے ملازموں اور غریبوں میں تقسیم کر دے جو کامران مرزا خوب صورت پیکنگ کروا کر لائے تھے۔

برہان لغاری والدہ حضور کے کمرے میں آگئے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی و خاموشی نے انہیں متوجہ کر

ڈالا تھا۔

”کیا بات ہے برہان! خوش نظر نہیں آرہے ہو۔“

”میں خوش نہیں ہوں۔“ وہ صاف گوئی سے بولے۔

”کیوں؟ کیا وجہ ہے؟“

”وجہ میں خود کچھ نہیں پا رہا ہوں۔“ وہ ٹکڑے ٹکڑے پر بیٹھے ہوئے بولے۔

”ہمارے فیصلے سے مطمئن نہیں ہو شاید؟“

”یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا، آپ کے فیصلوں پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔ یہ کیفیت کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔“ وہ

ماں کی دل جوئی کی خاطر جبراً مسکراتے ہوئے بولے۔

”ہوں..... کچھ کیفیت ہماری بھی ایسی ہی ہے، دراصل تمہاری بیویوں کی طرح بیٹیوں کے فیصلوں نے ہمیں بے چینی میں مبتلا

کیا ہے۔ یہ ان کے وجود کی محسوس ہی ہے جو ہمیں بے چین رکھتی ہے۔ آج آئی تھی منال، میں نے سمجھایا کہ کل تو تم گئی تھی پھر آج یہاں آنے کی کیا تنگ بنتی ہے۔ تم گھر والی ہو اب گھر سنبھال لو یوں بھاگ بھاگ کر میکے آنے والی لڑکیاں کبھی گھر نہیں بسا سکتی ہیں، مگر وہ برا مان گئی اور..... خیر چھوڑو وہ غصے میں تھی اور غصے میں معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔“ بے حد صفائی سے وہ خود کو بچا کر تمام الزام منال پر ڈال چکی تھیں۔ انہیں معلوم تھا منال باپ سے ضرور شکایت کرے گی۔ اس سے پہلے ہی وہ سیاست کھیل گئی تھی۔

”اس نے گستاخی کی آپ سے؟ اس کی یہ مجال؟“ وہ غصے سے بھر گئے۔

”چھوڑ دینا، بچی ہے وہ۔“ ان کا انداز ایسا تھا، گویا سخت صدمے کے باوجود وہ فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے منال کی سائیڈ

لے رہی ہوں۔

شوخی قسمت اس وقت منال کی کال آگئی۔ وہ بری طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ گریٹنڈر نے اسے گھر آنے سے منع کر دیا ہے۔

”ٹھیک کیا ہے والدہ حضور نے۔ آخر آپ کو پراہلم کیا ہے؟“ وہ برہم تو پہلے ہی تھے۔ اس وقت منال کی کال نے جلتی پر تیل کا

کام کیا تھا، سو وہ بہت سخت لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

”مجھ کو پراہلم کیا ہے، ڈیڑی یہ آپ کس انداز میں بات کر رہے ہیں۔“ اس کے آنسوؤں میں حیرت بھی شامل ہو گئی تھی۔

”اس انداز میں جس انداز میں آپ سے کرنی چاہیے۔“

”ارے..... دکھاؤ مجھے، منال بیٹی! اس وقت تمہارا باپ بہت غصے میں ہے، بعد میں بات کرنا، میں سب سنبھال لوں گی۔“ برہان

لغاری سے موبائل لے کر وہ بڑے پیار بھرے انداز میں گویا ہوئی تھیں۔ بظاہر بے حد لاڈ بھرے لہجے میں یہ فہمائش موجود تھی کہ وہ لیٹ ہو چکی

ہے۔ وہ اپنی راہ ہمیشہ کی طرح کلیئر کر چکی تھیں۔ اس کی چلنے والی نہیں ہے۔ دوسری جانب وہ سمجھ چکی تھی، خاموشی سے اس نے موبائل آف کر

دیا تھا۔ برہان لغاری عقیدت مند لگا ہوں سے ماں کو دیکھ رہے تھے، کتنی عظیم و صابر معاف کر دینے والی حوصلہ مند عورت تھیں۔

☆.....☆.....☆

میری زندگی میں بس ایک کتاب ہے ایک چراغ.....

ایک خواب ہے اور تم ہوا

یہ کتاب اور خواب کی جو منزلیں ہیں میں چاہتا تھا تمہارے ساتھ بسر کروں

یہی کل اثاثہ زندگی ہے اسی کو زاد سفر کروں

کسی اور سمت نظر کروں تو میری دعا میں اثر نہ ہو

میرے دل جا خوش خبر پہ بجز تمہارے کبھی کسی کا گزرنہ ہو

مگر اس طرح کہ تمہیں بھی اس کی خبر نہ ہو

اس احتیاط میں ساری عمر گزر گئی

وہ جو آرزو تھی، جس میں کتاب و خواب کے ساتھ تم بھی شریک ہو

وہیں مر گئی

اس کلکشن نے کئی سوال اٹھائے ہیں



وہ سوال جن کا جواب میری کتاب میں ہے نہ خیال میں  
میرے دل کے جاؤ خوش خبر کے رفتی!  
تم ہی بتاؤ پھر کہ یہ کاروبار حیات کس کے حساب میں!  
میری زندگی میں بس ایک کتاب ہے ایک چراغ  
ایک خواب ہے اور تم ہو.....  
وہ گھر آچکا تھا۔

چند دن ہی وہ گھر سے دور رہا تھا اور شاید اپنے آپ سے بھی۔ کتنی تہذیبی آگئی تھی گھر میں، گھر کے ماحول میں، یہ جگہ جہاں کے  
درو دیوار ہر وقت سازشوں و نفسا نفسی، حسد و بے مروتی کی کشافت سے دھند آلود رہا کرتے تھے، آج ویران و خاموشی کی کہر میں ڈوبے  
تھے۔ اسے یہاں آکر اپنا دم بری طرح گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”عزیز آتے ہی کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے ہو بیٹا، باہر نکلو، میں نے تمہاری خالواؤں کو فون کر دیا ہے، وہ آنے والی ہوں گی۔ مجھ سے  
زیادہ تمہاری یاد میں تڑپتی ہیں، اسی لیے میں نے انہیں فون کر کے بتا دیا ہے کہ تم واپس آ گئے ہو“۔ راحیلہ بیگم اسے دیکھ کر خوشی سے سرشار تھیں۔  
کئی لمحوں تک وہ اسے سینے سے لگائے رہی تھیں۔ رورور کر اپنے طرز عمل کی معافی مانگی تھی۔ ان کے لہجے میں پشیمانی تھی، بندامت و بچپن کا تھا۔  
بے شک وہ ان سے ناراض و بدگمان تھا مگر ان کے جزے ہاتھ و پتے آنسو اس سے برداشت نہ ہو سکے۔ وہ جیسی بھی تھیں، اس کی  
ماں تھیں، اس کی جنت، وہ ان کے سینے سے لگ گیا تھا۔

عزیز اور عام صاحب کے چہروں پر آسودگی بھری بشارت پھیل گئی تھی۔ ان سے کچھ دیر گفتگو کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا آیا  
تھا۔ تنہائی پاتے ہی یادیں دبے پاؤں چلی آئی تھیں۔  
راحیلہ بیگم کو وہ خاموشی سے دیکھے گیا تو وہ رنجیدگی سے گویا ہوئیں۔  
”تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔“

”یہ بات نہیں ہے می! اور اصل میں ابھی کچھ دن کسی سے ملنا نہیں چاہتا ہوں۔“

”یہ اچھا نہیں کر رہے ہو انہوں سے ملنے کے لیے بھی تمہارا دل نہیں چاہ رہا، حالانکہ وہ بے چین ہیں تمہیں دیکھنے کو ملنے کو۔“  
”اس میں کوئی شک نہیں ہے، مگر میں ابھی تنہائی چاہتا ہوں۔“ اس کا لہجہ نرم و احترام سے پڑھا مگر ایک ہٹ دھرمی بھی تھی جو  
راحیلہ نے بخوبی نوٹ کی تھی اور برداشت کر گئی تھیں۔

پہلے جیسا ماحول ہوتا تو وہ اس کو خوب سناتیں اور اپنی سزا کر چھوڑتیں مگر اب حالات بدل گئے تھے، حکمرانی کرنے کے باوجود وہ  
اختیار کھو بیٹھی تھیں جو کچھ عرصہ قبل انہیں حاصل تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں انہیں کوئی بہانہ کر کے آنے سے روک دیتی ہوں۔ تم آرام کرو۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلی گئیں تو وہ بوجھل دل لیے کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے وہ پورشن تھا جو کبھی کرن اور نوشابہ کے تصرف میں رہتا تھا۔ جس کا ادھا حصہ اب اسٹڈی روم بن گیا تھا۔ باقی خوبصورت لان کی صورت میں سرسبز ہو رہا تھا، ماضی اس کی آنکھوں میں پھر دھواں دھواں ہونے لگا۔

”میرا دل چاہتا ہے ہمارے حصے میں چھوٹا سا لان بن جائے جہاں گلاب اور موتیا کے پھولوں کی خوبصورتی ہو، رات کی رانی کی خوشبو سانسوں کو مہکائے، شام کو ہم چائے یہاں بٹھیں اور صبح سویرے ہری ہری گھاس پر جب میں ننگے پاؤں چلوں تو گھاس کی نمی پھولوں کی دلا آویز مہک میری روح کو بھی سرشار کر دے اور میں.....“

”بس..... بس شیخ چلی کی کچھ لگتی! خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آ، شکر کر سر چھپانے کو یہ صحت نصیب ہے، اگر یہ بھی نہ رہی تو پھر کہاں جائیں گے۔“ کپڑے رسیدوں پر ڈالتی نوشابہ کرن کو ڈپٹ کو بولیں۔

”مجھے تمہاری یہ بات ہی بری لگتی ہے ذرا کوئی خواہش ظاہر کی تمہیں شیخ چلی، حاتم اور قارون کا خزانہ یاد آنے لگتا ہے۔ ماموں جان کے پاس قارون جیسا خزانہ بے شک نہ ہو گا مگر وہ اس دور کے قارونوں سے بچنے نہیں ہیں، بہت دولت رکھتے ہیں ان سے کہہ کر میرے لیے لان بخوادو۔“ وہ کسی ترنگ میں تھی۔

”ان سے کیسے کہہ دوں بھلا مان کا بیسی احسان کم ہے جو تمہوں نے یہاں شہر نے کی اجازت دی ہوئی ہے۔“ وہ برہمی سے بولیں۔

”تو کون سا احسان کیا ہے ہم پر، سب بھائی ایسا کرتے ہیں۔“

”آخر ہے نا احسان فراموش باپ کی بیٹی، خون تو اسی کا ہو جو خود لاکھوں میں کھیلتا ہے بیوی، بیٹی کے لیے اس سے غریب کوئی نہیں۔“

”تمہیں آتا کیا ہے سوائے ان کی برائی کے۔“ وہ تن تن کرتی آگے بڑھی وہ جو وہیں رگ گیا تھا اس کو اچانک وہاں آتے دیکھ کر گڑبڑا گیا تھا۔

”اچھا..... اب چھپ چھپ کر ہماری باتیں بھی سننے لگے ہو۔“ وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ کر پر رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”نن..... نہ..... نہیں..... میں..... وہ.....“ حسب عادت وہ اس کے کڑے تیوروں سے گھبرا گیا تھا۔

”بس، خاموش رہو میرے سامنے یہ اداکاری کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ارے حزرہ بیٹا! یہاں کیوں کھڑے ہو اندر آؤ۔ اس لڑکی کی باتوں کی پرواہ مت کیا کرو، یہ تو ہواؤں سے لڑنے والی ہے۔“ اسی لیے نوشابہ کپڑے سکھا کر پلٹیں تو اسے دیکھ کر محبت سے بولیں۔

”ہاں، ہاں ایرے غیرے کے خوب لاڈ اٹھائے جاتے ہیں۔ میں ہی ایک بوجھ ہوں، بری ہوں اس گھر میں۔“ وہ بڑبڑانے لگی تھی۔

”پھوپھو! مت کہا کریں اسے کچھ۔“ حزرہ کو اس کی روٹی صورت کب گوارا تھی سو نوشابہ سے بولا۔

”مئی! ان چالباز لوگوں کو تم نہیں سمجھ سکتیں، ابھی ہم یہاں رہ رہے ہیں، اس لیے یہاں کچھ نہیں ہو گا، کل اگر ہم چلے گئے تو دیکھنا

کتنا شامدار پورشن بنے گا یہ ہمارا حصہ جو کھنڈر ہو رہا ہے۔“ جو اب انوشاہ سے سخت ستانے لگی تھیں اور وہ انہیں خاموش کرنے کی سعی۔  
کتنا درست کہا تھا اس وقت کرن نے جو پورشن ان کی موجودگی میں اس خوبصورت کوشمی کا بد صورت حصہ لگا کر تھا وہی اب سب  
سے جدید و خوبصورت پورشن تھا۔

پھولوں سے مہکتا، بزرے سے دملکتا، سرسبز و حسین لان لگا ہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ وہ نہیں تھی۔ اس کی خواہشوں کی تکمیل موجود تھی۔  
بعض دعائیں مستجاب ہونے میں اتنی دیر لگاتی ہیں کہ ماتھے والا اس دنیا کے میلے میں کھو جاتا ہے کبھی نہ ملنے کے لیے۔

☆.....☆.....☆

موڈ اس کا پہلے ہی آف تھا مزید برہان لٹاری کی ڈانٹ اور رادی کی سیاست نے اسے سخت ڈپریشن کر ڈالا تھا۔

اسی لئے سرور شاہ بڑی جھلت میں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ بریف کیس رکھ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئے، وہ بیڈ پر نیم دراز  
خاموشی سے دیکھ رہی تھی، پھر اتنا کام پر ملازمہ کو چائے لانے کا کہہ کر سیدھی اٹھ بیٹھی۔ سرور شاہ تو لے سے منہ صاف کرتے باہر آ گئے تھے۔  
”ہیلو ڈارلنگ! کیا بات ہے بڑی خاموش ہو۔“ وہ تو لے صوفے کی طرف اچھال کر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولے۔  
”طبیعت کچھ ست ہے آج۔“

”اوہ! یہ تو کسی گڈ نیوز کی اوپننگ لگ رہی ہے، چلو کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے وقت لے لیتے ہیں۔“ انہوں نے بڑی محبت سے  
اس کو بازو کے جھلتے میں لے کر معنی خیزی سے کہا۔

”واٹ یو مین؟ میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس کیوں جاؤں۔“ وہ کسمسا کر ان کی گرفت سے نکلی تھی۔ ان کی قربت کا نشہ تو بہت عرصہ  
قبل اس کے ذہن نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جبراً انہیں جمیل رہی تھی اور اب جبکہ انس سے دو بارہ تجربہ تعلقات ہو چکے تھے تو وہ  
جبراً بھی ان کی قربت برداشت نہیں کر پار ہی تھی۔

اس وقت بھی وہ جس خضر بھرے انداز سے ان کی گرفت سے نکل کر دوڑ ہوئی تھی، وہ سرور شاہ کی مردانہ ناکو مجروح کر گیا۔ چند ٹاپے  
کے لیے ٹھکرا میز ٹکٹیں ان کی پیشانی پر طلوع ہوئی تھیں۔ نگاہوں میں ناگواریت تھی مگر اس پر نگاہ ڈالتے ہی وہ موسم کی طرح کھلنے لگے تھے۔  
ڈارک بلوریشی کھلے گلے اور بغیر آستینوں کی شرٹ میں اس کے کامل حسن کی چاندنی پوری طرح جھلک رہی تھی۔  
ان کی نگاہیں پلٹنا بھول گئیں۔

تمام غصے و ناگواریت پر یہ احساس غالب آ گیا کہ وہ اس عمر میں بھی اتنی کم سن و حسین لڑکی کے شریک حیات ہیں جو ان سے عمر  
میں آدھی ہے، مستزاد، اس پر اپہراؤں جیسی خوب صورتی کی مالک لڑکی اور یہی ہوتا آ رہا تھا وہ اس کی کج ادائیگی و بے رنجی کا سختی سے نوٹس لینا  
چاہتے تو ان کا دماغ اس کے ہوشربا حسن کے شعلوں سے مفلوج ہو جاتا اور وہ بجائے اسے اس کی بد تمیزیوں و زبایدگیوں کا احساس دلانے  
کے اس کی دل ربائی کی قصیدہ گوئی میں مصروف ہو جاتے تھے۔

”نیب نے ہاسٹل جانے سے قبل فرمائش کی تھی کہ وہ چھوٹے بے بی کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور یہ میری خواہش بھی ہے، آپ کے وجود سے زندگی پانے والا ہمارا بچہ کتنا گڈ لگ، کتنا کیوٹ ہو گا وہ بچہ جو آپ کی طرح بیوٹی فل اور میری طرح صحت مند ہوگا۔“ وہ نئے سرے سے اس کے حسن کی نیا نیا پاشیوں میں گم ہو چکے تھے۔

”خوابوں سے باہر نکل آئیے، ویسے بھی جاگتے میں خواب دیکھنے والے اسٹوڈنٹ ہوتے ہیں۔“ وہ شانے اُچکاتی ہوئی بیڈ سے نیچے اتر گئی تھی۔

ملازمہ چائے لے آئی تو سرور شاہ خاموش ہو گئے وہ چائے سرد کر کے گئی تو وہ پھر سے اسی لہجے میں گویا ہوئے۔

”بھئی خواب تو ہم نے دیکھ لیا ہے، دیکھتے ہیں آپ تعبیر کب دیتی ہیں۔“ وہ ہنس کر کہتے ہوئے چائے کے سپ لینے لگے۔

”کبھی بھی نہیں، اسٹوڈنٹ مین! تمہارے بچے پیدا کرنے سے بہتر ہے، میں خود کوشی کر لوں۔“ منال نے نخوت سے سوچا۔

”کہیں جانے کا پروگرام ہے آپ کا؟“ وہ اسے بار بار رستہ واضح دیکھتے دیکھ کر استفسار کرنے لگی۔

”ہاں..... آصف برادرز نے ایک پارٹی اریج کی ہے، وہ اپنی کوئی نیا پراڈکٹ مارکیٹ میں انٹروڈیوس کرانا چاہتے ہیں، اسی

سلسلے میں اریج منٹ ہوئی ہے۔“ وہ چائے کے آخری گھونٹ بھر رہے تھے۔

”پھر تو پارٹی زبردست ہوگی۔ میں بھی چلوں گی۔“ اس کی نگاہوں میں ایک ایسی ہی پچھلے ہنسنے ہونے والی پائی گھوم گئی جہاں اس

کے حسن کو سراہنے والے پروانوں کی طرح اس کے گرد گھوم رہے تھے۔ کوئی نگاہوں سے داد حسن دے رہا تھا۔

حسن کی تعریف ہر عورت کی کمزوری ہے۔

پھر ایسی عورت جو ہر خاص و عام سے یہی تعریف و توصیف وصول کرنے کی منتھی رہتی ہو پھر بھلا وہ ایسی جگہوں سے دور کیوں رہتا

چاہے گی جہاں بڑے بے باک و آزاں عازم میں پذیرائی ملتی ہو۔

”سوری ڈارنگ! میں آپ کو وہاں لے کر نہیں جاسکتا ہوں۔“

”وائے؟“ وہ سخت حیران ہوئی۔

”مجھے پسند نہیں ہے کوئی آپ کو بری نگاہ سے دیکھے اور وہاں ایک سے بڑھ کر ایک بد نگاہ بلکہ بدنیت ہے۔ ایسے لوگوں کو میں

انسان نہیں سمجھتا جو عورت کا احترام نہیں کرنا جانتے۔“

”اتنے کامیاب بزنس مین اور بہت لارج سوسائٹی سے اٹیچ ہونے کے باوجود آپ کی سوچ خواہ مخواہ فردوں جیسی ہے۔ ہم جس

سرکل میں موو کرتے ہیں، وہاں ایسی سوچ رکھنے والے سائیکس کہلاتے ہیں پھر کوئی دیکھتا ہے تو دیکھے، ہمیں کیا فرق پڑتا ہے، وہاں اور بھی

جیسات ہوتی ہیں، میں نے کسی کو بھی کئی روز نہیں دیکھا، بلکہ ان کے سپیڈ از خود سب سے ملواتے ہیں۔ کسی پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا ہے

اور ایک آپ اس قدر نیر و ماکنڈ ڈبن رہے ہیں کہ مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔“

منال نے اس کا حتمی موڈ دیکھ کر بے زور دلائل دیے تھے۔

”آپ کچھ بھی کہیں مجھے، میں مانتی نہیں کروں گا، مگر آپ کو ایسی پارٹیوں میں نہیں لے کر جاؤں گا جہاں غیرت مجروح ہوتی ہو، میں جانتا ہوں میرے پاس دولت، عزت، شہرت ہے، لوگ مجھے جانتے ہیں، بہت پیسہ، بے حد جائیداد ہونے کے باوجود میں اندر سے وہی غیرت مند روایتی مرد ہوں، جو اپنی عزت کی طرف اٹھنے والی پہلی لگا ہوں کو کاٹ پھینکنے کی جرأت رکھتا ہو، اس معاملے میں نہیں بے حد مطمئن ہوں بلکہ تلاش سمجھیں تو زیادہ بہتر ہوگا اور جن بیگمات اور ان کے شوہروں کی آپ مثالیں دے رہی ہیں، وہ سب بے وقافی کے مرتکب ہیں۔ کہیں بیویاں شوہروں کو بے وقوف بنا کر پرانے ریلیشنز کو از سر نو جوائن کرتی ہیں تو کہیں شوہر ایک واساٹ بیویوں کے سہارے پرنس میٹرز مضبوط کرتے ہیں۔ ٹینڈرز کے کرائے جاتے ہیں تو کہیں بینک سے لونز کیسے کرائے جاتے ہیں۔ پرنس کی پارٹیوں میں بھی پرنس ہی ہوتا ہے۔ اسٹاکس انداز میں اور میں نہیں چاہتا ایسی کوئی بے وقافی کی ہوا بھی آپ کے قریب سے بھی گزرے۔“

☆.....☆.....☆

انس، کرن کو شاپنگ سینٹر چھوڑنے کے بعد واپس سہ کے ہاں آ گیا تھا۔ سہ نے فاریہ کو کافی بنانے کے لیے کہا تھا، وہ پہلے ہی کچن میں برتن دھونے میں مصروف تھی۔ صفائی اس نے اور سہ نے مل کر کی تھی۔ برتن چھوڑ کر اس نے پہلے دودھ ساں سین میں ڈال کر برن پر رکھا تھا، پھر کافی پھینسنے لگی تھی۔

گھر میں بے معنی خاموشی چھائی ہوئی تھی، دو دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے بالکل خاموش تھے۔

”کتنی خواہش تھی تمہاری شادی کی اور اس طرح آغاز ہوا ہے جیسے کسی جرم کی ابتدا ہو رہی ہو۔“ سہ گہری سانس لے کر خاموشی کو توڑتا ہوا گویا ہوا۔

”واہ..... کیا جملہ استعمال کیا ہے، میرا نکاح اور جرم کی ابتدا!“ وہ ہنستا ہوا بولا تو اسے خود اپنی کھوکھلی ہنسی کا احساس ہوا۔

”ہنس مت۔“

”کیوں؟“

”اس سے تیرے اندر کا مجید صاف ظاہر ہوتا ہے۔“

”شادی کے بعد لوگ سنا ہے زن مرید بن جاتے ہیں مگر تو نجوی بن گیا ہے جس طرح نجوی ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کر قسمت کا حال بتاتے ہیں، اسی طرح میری ہنسی سے تو میرے دل کا حال جان رہا ہے، ان جھوٹے ذہنی نجومیوں کی طرح تیرا دعویٰ بھی جھوٹا ہے۔“

”معلوم ہے مجھے تو اپنی غلطی مانتا کب ہے مگر یہ جو تو نے کیا ہے اسے ہر حال میں تجھے بھانا ہوگا، کیونکہ یہ معاملہ کسی اور کا نہیں، میری بہن کا ہے جو مجھے تجھ سے بڑھ کر عزیز ہے۔“ سہ بخیر ہوا تھا۔

”اگر ایسا کچھ کرنا ہوتا تو میں ایسا کیوں کرتا، تمہیں اس کی اتنی فکر ہے جس سے رشتہ بنائے کچھ عرصہ گزرا ہے اور مجھ پر اتنی بے

اعتادی جس کے ساتھ کاسفر سالوں پر محیط ہے، اتنی بے اعتباری کی وجہ آخر کیا ہے؟“ انس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔  
 ”وجہ یہی سالوں کی دوستی ہے۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”اتنی پرانی دوستی مجھے انظارم کرتی ہے کہ تم صدق جذبوں سے کرن کو اپنا نہیں پائے ہو، تمہاری یادوں سے منال نکل نہ پائی ہے اور کرن کو وہ پیار وہ احساس شاید کبھی نہ دے پاؤ جو ایک بیوی کو اپنے شوہر کی جانب سے ملتا ہے اور یہ عورت کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی و ناانصافی ہے جو سب کچھ چھوڑ کر آپ کی بن جاتی ہے اور بدلے میں آپ اسے کیا دیں گے۔“  
 ”جو اس کے نصیب میں ہوگا، اسے مل جائے گا۔ تم فکر مند مت ہو۔“

فار یہ کافی لے آئی تو وہ خاموش ہو گئے۔ وہ کافی دونوں کو دے کر واپس چلی گئی تھی۔

”گر نی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کرن نے جس انداز میں ان کی کیئرنگ کی ہے وہ اسی کیئرنگ کی عادی ہو گئی ہیں۔ ملازمین شمو اور چندا بہت دل و جان سے ان کی خدمت کرتی ہیں۔ خیال رکھتی ہیں مگر پھر بھی وہ کرن کو بے حد مس کرتی ہیں، پاپا بھی اسے بے حد پسند کرتے ہیں۔ ادھر تم بھی اس کے شیدائی ہوو لوگوں کو گرویدہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، پھر بھلا میں کتنے عرصے تک اس کی چشم کرم کی زد سے بچ سکوں گا۔ کبھی نہ کبھی میں ویسا ہی بن جاؤں گا جیسا تم یا وہ دیکھنا پسند کرے گی۔“ اس نے سادگی سے اعتراف کر لیا تھا اپنے احساسات کا۔“ سعد کی سنجیدگی برقرار رہی تھی۔

”جب تم منال کو بھلا نہیں پائے تو تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کرن کی زندگی برباد کرنے کا، کیوں دی ہے تم نے یہ بھیک اپنے نام کی اسے۔“

”اس وقت ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں اور پہلے میں نے اسے پر پوز کیا، وہ نہیں مانی تھی۔ آج اس نے خود آفر کی جسے میں رد نہیں کر سکا اور کیا کرتا میں، منع کر دیتا اسے۔“

سعد کی سنجیدگی اسے تپا گئی تھی۔

”پلیز کول ڈاؤن، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”سب سمجھتا ہوں میں، تمہیں مجھ سے زیادہ اس سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ میری تمہاری نظروں میں کوئی ویلیو نہیں ہے۔“ وہ پوری طرح غصے کی زد میں تھا۔

”تم اس قدر چڑھ کر کیوں رہے ہو، میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔“ سعد اس بار مسکرا کر گویا ہوا۔

”سب سمجھتا ہوں میں تمہاری مکاریاں، بہن کے بھائی بنے اور دوست کی فکری نہیں ہے، پہلے ہر بات تم سے شیر کیا کرتا تھا، اب ایسا نہیں ہو پائے گا۔“

”کیوں اب ایسا کیوں نہیں ہو پائے گا؟“ سعد متعجب ہوا۔

”پہلے تم دوست تھے اور اب سالے بن گئے ہو۔“ بات کے اختتام پر دونوں بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

”بڑی بن رہی ہے سالے بہنوئی میں۔“ فاریہ مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی اور ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بھابی! آپ بھی اس کا ساتھ دے رہی ہیں۔“ انس کافی گامگ منہ سے لگاتے ہوئے بولا۔

”آف کورس، بیوی میری ہے، میرا ہی ساتھ دے گی۔“

”انس بھائی! اب آپ کو بے حد ارٹ رہنا ہوگا۔ نہ معلوم کس دن وہ لوگ کرن کی شادی کریں، کیونکہ وہ لوگ بہت ہوشیار ہیں،

کسی طرح انہیں شک ہو گیا تو انتظار نہیں کریں گے۔“ فاریہ نے سنجیدگی سے مسئلے کی طرف متوجہ کیا تھا۔

”میں ارٹ ہوں، مجھے احساس ہے معاملے کی سنگینی کا، پھر پاپا بھی پوری طرح اپنے دوستوں کے ذریعے معاملے پر نگاہ رکھے

ہوئے ہیں، اگر اللہ نے چاہا تو کوئی گزیر نہیں ہوگی۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا وہ باپ ہے یا تعالیٰ؟ اتنے عرصے بعد نبی سے ملنے کے باوجود بھی محبت بیدار نہ ہوئی۔ حد ہوتی ہے

بے حسی کی پھر وہ دادی کیسی ہیں جن کے دل میں ڈرا بھی خوف خدا نہیں ہے جان بوجہ کہ اس کا برا چاہ رہی ہیں۔“

”جن کو حکمرانی کے مزے پڑ جاتے ہیں، ایسے لوگ کسی کی بھی پروا نہیں کرتے انہیں فکر ہوتی ہے تو صرف اپنی حکمرانی کی۔“

”آپ لوگ دعاؤں میں یاد رکھئے گا، درحقیقت ان دنوں دعاؤں کی اشد ضرورت ہے مجھے۔“ وہ جاتے ہوئے گویا ہوا۔

وہاں سے وہ سیدھا جام چلا آیا تھا۔ سوئمنگ کے دوران بھی اس کی نظریں متلاشی رہی تھیں کسی وجہ کی۔ سوئمنگ کے بعد ڈریس پہنچ

کر کے وہ اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھا تو جانا بچھانا خوشبو کا جھونکا اس سے ٹکرایا۔ اس کے لبوں پر بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”گڈ ایٹنگ، مجھے معلوم تھا تم یہیں ملو گے۔“ سلک گولڈن بارڈوالی سرخ ساڑھی میں سرخ لپ اسٹک سے ہونٹوں کو دکھائے، گولڈ کی

جیوری بے تماشہ خوشبوؤں میں بسی، اخروٹی ٹکڑیوں کو پشت پر بکھرائے وہ اس کے سامنے تھی، جس کے آنے کی امید اسے تھی، وہ آگئی تھی۔

”مجھے معلوم تھا آپ یہیں ملیں گے۔“ وہ گولڈن پرس نیکل پر رکھ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”اتنا یقین تھا میرے ملنے پر۔“ وہ اہل جوس چیتا ہوا بولا۔

”آف کورس، یقین سے بھی زیادہ یقین تھا۔“ وہ اٹھلائی تھی۔

”وہ آپ کے میاؤں صاحب کیسے ہیں؟“

”میاؤں!“ وہ ہنسی۔

”گڈ جوک۔ سرور شاہ کبھی بھی میری پسند نہیں رہا۔ وہ ڈیڈی کی وجہ سے مجھے اس سے میرج کرنی پڑی تھی، ورنہ وہ کہاں میرے

قابل تھا۔ ایک دم اسٹوپڈ اور گھٹیا شخص۔“ اس کے دل کی بات لبوں پر آ رہی تھی۔ انس اطمینان بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ایسے مت کہو، مجھ سے بڑھ کر وہ تمہاری چوائس تھا۔“

”میں نے کہا نہ ان دنوں ڈیڈی کو بزنس میں بہت لاس ہوا تھا، قرض داروں نے زندگی حرام کر رکھی تھی۔ بینک الگ ہر شے نیلام کرنے کی سعی میں لگے ہوئے تھے۔ ایسے میں اپنی عزت و سواکھ بچانے کے لیے ڈیڈی کو میں نظر نہیں آئی اور انہوں نے اس بڑھے کھوسٹ سے میری شادی کر کے نہ صرف اپنی ساکھ و عزت بچائی بلکہ بزنس بھی بچالیا، جب تو میں بھی ڈیڈی کی باتوں میں سب کچھ بھول چکی تھی اور اس وجہ سے سرور شاہ سے شادی کر بیٹھی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا تم کو میں کبھی بھول نہ سکی ہوں اور نہ بھول سکتی ہوں، تم تو میرے خون میں رواں ہو، میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں مگر اب تم سے جدائی موت ہوگی۔“ وہ آج گھر سے تہیہ کر کے آئی تھی، ہر صورت میں اس کو منوا کر چھوڑے گی۔

”سوچو سمجھ لو، میرے پاس دولت تو بے حساب ہے مگر تم سے شادی کرنے کی وجہ سے پاپا کچھ نہ دیں گے۔“

”نہ دیں، میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آج رات کو ہی سرور شاہ مجھ کو تمام پر اپرٹی کے کاغذات دے دے گا جو وہ میرے نام کر چکا ہے۔ ہم کو ملنے سے اب کون روک سکتا ہے۔ آج ڈاکوٹینس میں گے، جلد ہی میں ڈاکوٹینس لے لوں گی اس سے، پھر وہ ساری دولت ہماری ہوگی، ہم یہ ملک چھوڑ دیں گے، باہر کسی اچھے کنٹری میں رہیں گے، وہاں ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے گا۔“ وہ بیٹھی بیٹھی خوابوں کی دنیا میں کھینچے ہوئے یہ بھی فراموش کر گئی کہ کہاں بیٹھی ہے ارد گرد سے بے خبر اس کی حسین آنکھوں میں آنے والے خوش رنگ لہجوں کی جھللاہٹ تھی۔

”بولونا، خاموش کیوں ہو، میرا ساتھ دو گے نا؟“ دوسرا ہل پر بہت بھاری گزرا، جب بھر پور تھپڑ اس کے رخسار کو دھکا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

لغاری ہاؤس میں تزئین و آرائش کا کام از سر نو شروع ہوا تھا۔ کرن کی شادی تین دن بعد ہو رہی تھی۔ دکھاوے کے لیے ہی سہی۔ والدہ حضور تیاریاں کر رہی تھیں۔

زیورات کی ان کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ انہی میں سے چند سیٹ انہوں نے کرن کے لیے منتخب کیے جو دیکھنے میں بڑی بھاری بناوٹ کے تھے مگر وزن پھولوں کی طرح رکھتے تھے۔

کپڑے انہوں نے سلوانے دیئے تھے، ٹیلر یہیں آ کر ٹاپ لے گیا تھا۔ کامران مرزا نے کہلویا تھا کہ وہ کرن کو اپنے ہمراہ شاپنگ کروانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہر چیز اپنی پسند کی خریدے مگر ان کی اس خواہش کے جواب میں والدہ حضور نے کہلویا تھا کہ وہ خاندانی لوگ ہیں اور ان کے خاندان میں لڑکیاں شادی سے قبل اپنے سرالیوں کے ساتھ گھومتی پھرتی نہیں ہیں جو لانا ہے ہمارے خاندانی وقار کو مد نظر رکھتے ہوئے خود خرید لائیں۔ جواباً کامران مرزا بھگتے دوڑتے معذرت کرنے آئے اور خوب ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگیں۔ عجیب لوگ تھے۔



کرن کو شادی تک باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ برہان لغاری کرے میں آئے تو وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

”مجھے اچانک بزنس کے سلسلے میں باہر جانا پڑ رہا ہے، اس امیر جنسی کی وجہ سے تمہاری شادی پرسوں کے بجائے آج ہو رہی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص سخت و بارعب انداز میں گویا ہوئے تھے۔



اس کی ساتھوں میں دھماکے کوچ اٹھے تھے۔ دل اس بُری طرح دھڑکا کہ وہ لمبے بھر میں پسینے میں شرابور ہو گئی۔

”خود کو ذہنی طور پر تیار رکھو۔ کامران مرزا سامان لے کر پہنچ رہے ہیں۔ میں نے شہر کی ماہر پیوٹیشن کو بلوا لیا ہے، وہ پہنچنے والی ہوگی۔“ وہ اس کو اطلاع کے ساتھ ساتھ حکم بھی دیتے جا رہے تھے۔

”پیوٹیشن۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی، برہان لغاری نے تعجب خیز انداز میں اس کی جانب دیکھا مگر خاموش رہے۔

”آپ کے یہاں مردوں کا بھی میک اپ کرنے کا رواج ہے؟“

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”یہ بکواس نہیں ہے۔ شادی!..... شادی! کیا رٹ لگا رکھی ہے آپ نے۔ ایک ہفتہ بھی مکمل میں آپ کے سگ گزار نہیں پائی ہوں پھر آپ بوجھ کی طرح مجھے سر سے اتار بیٹھتے کو کیوں تیار ہیں جیسے کئی سالوں سے مجھے برداشت کرتے آ رہے ہوں۔ ایک ناقابل برداشت بوجھ بن گئی ہوں، جیسے لوگ مردے کو دفنانے کی جلدی کرتے ہیں، اسی طرح آپ مجھے زندہ دفن کرنے کی تیاریوں میں مگن ہیں۔ آخر کیوں کر رہے ہیں آپ یہ سب؟“ وہ بڑا احتجاج انداز میں کہہ رہی تھی۔

”ہم تمہارے باپ ہیں اور ہمیں اختیار حاصل ہے اپنی ذمہ داری اور فرائض کی ادا تکلی سے عہد و پیمانے کا۔“

”باپ..... باپ آپ خود کو کہلاتے ہیں کبھی اس تین حرفی جملے کے اصل مفہوم سے واقفیت ہوئی ہے آپ کو؟ اس سے قبل کبھی

آپ کو یاد نہیں آیا کہ آپ کی کوئی بیٹی بھی ہے جو آپ پر اتنے ہی حقوق رکھتی ہے جتنے آپ اس وقت مجھ پر جتا رہے ہیں۔“

”وہ کھولنا کی! یہ ہم جانتے ہیں کہ زبان درازی اور بدتمیزی میں تم اپنی ماں کی طرح ہو اور اس لیے.....“

”میری ماں سے اب آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے، لہذا آپ ان کا ذکر مت کیا کریں۔“

”آل رائنٹ۔ کبھی تو تم ٹھیک ہو، اس کا نام ہماری زبان پر آئے گا بھی نہیں۔ رہا سوال تمہاری اس طرح شادی کا تو جواب اس کا یہ

ہے کہ اول تو تمہاری سنگت شروع دن سے ایسی عورت کے ساتھ رہی جو اپنے بھائیوں کے چہروں پر رسوائی کی سیاہی تھی تو تم کس طرح ہمارے لیے یا کسی بھی مرد کے لیے مستحکم ہو سکتی ہو؟ دو تم نے اس شخص اور اس کے بیٹے کے ساتھ مراسم رکھ کر خود کو بائبل ہی ناقابل قبول بنا لیا ہے۔“

لشکوں کے گھاؤ چہرے کے تاثرات سب سے سخت کبیدیگی اور نفرت عیاں تھی، جو اسے ان سے ہر بار پہلے سے زیادہ متکبر اور دور

کر دیتی تھی اسی نفرت اور تذلیل کے احساس نے اسے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

الزام و التزام

تحقیق و تذلل

منقر و بکبر

سلسلہ در سلسلہ چلتا جا رہا تھا۔

اس کی ماں نے اس ہرجائی و محبت ناشناس مرد کی خاطر اپنی زندگی کسی قیدی کی مانند گزار لی تھی۔ اس نے انہیں کبھی اچھے یا گہرے رنگ کے کپڑوں میں نہ دیکھا تھا، وہ ہمیشہ ہلکے رنگوں، مٹے پرنٹ والے کپڑوں کی عادی تھیں۔ زیور کے نام پر ان کے کانوں میں ہالیاں رہتی تھیں اور ناک میں لوہے جو ہارے یہاں سہانوں کی نشانی کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ سادگی، صبر و قناعت ان کا زیور تھی۔ کم گوئی، سنگھار و آرائش تھی۔

جس آدمی نے انہیں کبھی سمجھا نہیں مرتے دم تک وہ اسی سے وابستہ رہی تھیں۔ اس وفا اور ریاضت کا یہ انجام تھا۔

”اپنی ماں کی موت اور ان بہتان تراشیوں کا حساب تمہیں دینا ہوگا برہان لغاری صاحب“۔

اس کے اندر شرارے پھونکنے لگے تھے۔ برہان لغاری اپنی بات کہہ کر جا چکے تھے، وہ جو غصے و جذبات کی لہر میں بہ گئی تھی، فوراً ہی احساس کے ساحل پر اسے آنا پڑا کہ جو کچھ کرنا تھا ابھی اور اسی وقت کرنا تھا۔ وقت کی لگا میں ہاتھ سے چھوٹ گئیں تو کامیابی کا گھوڑا ہمیشہ کے لیے ہاتھوں سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔

مائی سیکنہ جو اس کی راز دار و وہم درو تھی اب موقع تھا اسے پوری طرح راز داری میں لینے کا اور اس نے یہی کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ صرف ایک تھپڑ نہیں تھا، ایسے ہی جان دار اور جارحانہ تھپڑوں نے اس کی آنکھوں سے اندھیرے کی وہیز چادر تان دی تھی۔ ساری جگہ ایک دائرے میں گول گول گھومتی نظر آ رہی تھی۔

”بے غیرت! ہرجائی! بد چلن عورت! میں تجھے آسمان میں چمکنا ستارہ سمجھا تھا اور تو..... آخ تھو! شدید نفرت و کراہت سے سرور شاہ نے تھو کا تھا، ان کی آواز پر منال کی بند ہوتی آنکھیں ایسے جھکے سے کھلیں گویا تار انگلی میں اس نے چار سو چالیس دولت کے تار کو چھو لیا ہو۔

”اور تو زمین پر پڑے سنگریزے سے زیادہ معمولی و کمتر نکلی۔ تجھے میں نے دل میں بٹھایا مگر تو قدموں میں بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہے۔

جس کو کبھی پھولوں کی تھپڑی سے بھی نہیں چھوا گیا تھا۔ سرور کے سخت غصے و اشتعال کے مارے گئے تھپڑوں نے دردِ اذیت سے پہلی بار درد شناس کروایا تھا۔ پھر یہ احساس کہ سرور شاہ نے اسے انس مڈر کے ساتھ بیٹھے اٹھارہ عشق کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ احساسات کی یورش کے بعد دیگرے وارد ہو رہی تھی اور وحشتیں اس کی رگ و پے میں اترتی جا رہی تھیں، استغراب و اضطراب کے سمندر میں تہہ در تہہ

وہ کم ہوتی جا رہی تھی، گہرائی میں اترتی جا رہی تھی۔

”سر..... اور..... آپ..... غلط تھی..... کا شکار ہو رہے ہیں۔“

”سب آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود، کانوں سے سننے کے باوجود بھی میں غلط تھی کا شکار ہوں، ناہنجار عورت۔“

کبھی کا یا پلٹی تھی یہ۔ کل تک اس کی اداؤں پر غار ہونے والا شخص، جو اس کی بے اتفاقی و بے توجہی پر بھی سو جان سے ندامت ہوتا تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ کی خاطر لاکھوں روپے لحوں میں نچھاور کرنے کو تیار رہتا تھا۔ جس کی نگاہوں میں ہر لمحہ پیار و چاہت کی وارفتگی چمکتی رہتی تھی، جس نے اسے پھولوں سے زیادہ عنایت اور کلیوں سے زیادہ نزاکت سے رکھا تھا۔ اسی نے آج لحوں میں عرش سے فرش پر لا پٹا تھا۔ جن آنکھوں میں ولولہ انگیز چاہت کے دیئے روشن رہتے تھے ان ہی آنکھوں میں اب قبر و غضب، نفرت و دکھارت کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔

”مجھے اپنے بیٹے کے مستقبل کا خیال نہ ہوتا تو میں تجھے شوٹ کر دیتا، جا تجھے اپنے بیٹے کے پیار کی بجیک کے طور پر زندہ رکھا ہے۔ اب بھی میرے سامنے آنے کی کوشش مت کرنا، گیٹ لاسٹ۔“ اس نے منال کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکے سے دور کیا تھا۔

”سرور! سرور! پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کرو سرور۔“

منال تجزی سے سرور شاہ کے پیچھے دوڑی تھی مگر وہ ہوا کی مانند چلنا کار کی سمت بڑھ گیا تھا اور وہ پکارتی رہ گئی تھی۔

لیکن اسے اس مدرسہ کا خیال آیا تو اس نے بیٹگی ہوئی نگاہیں چاروں سمت دوڑادی تھیں۔ وہ کہیں نہیں تھا، نہ معلوم کس وقت وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ کیا اس کو اس طرح مجھ کو چھوڑ کر جانا چاہیے تھا۔ اس کے اندر سے صدا اُبھری۔

”ہاں۔ اچھا ہوا وہ چلا گیا، ورنہ نہ معلوم کیا ہو جاتا؟ مجھے وہ اس طرح سرور سے مار کھاتے دیکھ کر برداشت کر سکتا تھا..... نہیں ہرگز نہیں۔ یہ سب کس طرح سے ہو گیا؟ سرور تو پارٹی میں گئے تھے پھر یہاں کیوں آئے؟ کیا انہیں کسی نے انفارمیشن دی مگر کس نے؟“

سوالات اس کے ذہن کو جنموڑے لگے اور وہ پکارتے سر کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

راحیلہ کی دونوں چھوٹی بیٹیاں ماڑہ اور ساحرہ چند دن گزارنے ان کے پاس آئی تھیں۔ ساتھ ماڑہ کی بیٹی مہوش بھی تھی۔ راحیلہ بہنوں اور بھانجی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ بڑی گرم جوشی سے ان کی آؤ بھگت کی اور ملازمہ کورات کا کھانا تیار کرنے کا حکم دے کر ان کے ساتھ گپ شپ کرنے لاؤنج میں براجمان ہوئی تھیں۔

یلو کالین پر بلو اور پنک کنٹراسٹ میں خوب صورت کڑھائی والے فلور کیشنز پر وہ تینوں بڑے آرام دہ انداز میں نیم دراز تھیں، جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر ماڑہ، صوفے پر مہوش بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی۔

”شکر ہے آپا! اللہ نے یہ دن دکھائے کہ ہم اس طرح سکون سے بیٹھ کر بے فکری سے گفتگو کرنے کے لیے آزاد ہوئے، ورنہ اس

سے قبل وہ تمہاری دیورائیاں اور ان کی اولادیں ادھر ادھر چپکلیوں کی طرح چپک کر باتیں سنتی تھیں۔" ساحر نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔  
 "پھر چند ایس لڑائی میں طعنے دیتی تھیں۔" مارہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"بڑی شاطر، بڑی احسان فراموش نکلیں، نو شاہہ اور اس کی بیٹی کرن کو ہر طریقے سے زنج کرتی تھیں۔ کسی موقع پر مجھ سے پیچھے نہیں تھیں مگر جب وقت پڑا تو اس نے طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیں، مارے حیرت و صدمے کے میں سمجھ نہیں پاری تھی کہ کیا کروں؟"  
 راحیلہ کو وہ وقت بھولنا نہ تھا جب زندگی میں پہلی بار عام صاحب نے ان پر سب کے سامنے ہاتھ اٹھایا تھا اور رخسانہ اور آسیہ صاف ان پر الزام لگا کر بری الذمہ ہو گئی تھیں، حالانکہ بخشتا تو ان کو عابد اور عامر نے ہرگز نہیں تھا مگر راحیلہ کی بری طرح سبکی ہوئی تھی۔  
 شوہر کی خنکی و غصہ، بیٹے کی ناراضگی و جدائی، انہیں وقتی طور پر بے حد بدحواس کر گئی تھی، پھر آسیہ اور رخسانہ کے دھوکے و فریب نے انہیں بیمار کر ڈالا تھا مگر وہ بھی کوئی سادہ و عام عورت نہ تھیں، بدلہ لینے میں وہ نامن کی فطرت کی حامل تھیں اور ان کو یہاں سے نکال کر وہ بدلہ لے چکی تھیں اور ان تمام حوالہ کے پیچھے زور دار معرکے ہوئے تھے۔

اب عام صاحب ان سے سمجھوتہ کر چکے تھے گو پہلے جس محبت و اعتماد ان کے انداز میں نہ تھا، ان کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ مگر میں سکرانی کر رہی تھیں جو کئی اور کچھ احساسِ عداوت حزرہ کا مگر تھوڑے دینے کی وجہ بنا تھا، وہ بھی یکھت پانی کے پبلے کی مانند گم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی پرانی جون میں لوٹ آئی تھیں۔

"آپا دیورائیاں تھیں وہ کوئی بہنیں نہیں جو بڑے وقت میں ساتھ دیتیں تمہارے تو سب کا نئے نکل گئے عیش ہو گئے رنج کر۔"  
 "سب سے بڑا کاٹنا تو وہ ماں بیٹی تھیں، اصل خطرہ مجھے انہی سے محسوس ہوتا تھا۔ حزرہ نے اپنی پیسوں کے آگے کب اہمیت دی ہمیں جب بھی دیکھا اسے پیسوں کی غلامی کرتے یا کرن کے آگے پیچھے بھرتے دیکھا۔ ہمارے پاس تو وہ ازراہ مروت گھڑی دو گھڑی نکلتا تھا۔ سب سے زیادہ عزیز تھیں وہ ماں بیٹی اسے، بلکہ ماں سے زیادہ بیٹی عزیز از جان تھی۔"

اپنی ماں کے منہ سے حزرہ اور کرن کے متعلق گفتگو نے صوفے پر دراز مہوش کو چونکا کر دیا تھا، ویسے بھی وہ میگزین کے بہانے ان کے درمیان موجود تھی۔ نگاہیں میگزین پر اور سامعین ان کی طرف تھیں۔

"تب ہی تو میں نے ذرا زور ڈالا تھا عام پر، جو وہ اس سے بری طرح بدعین و متغیر ہوئے کہ ان ماں بیٹی کو نکال باہر کیا۔ اب اسے میری خوش قسمتی کہو یا ان کی بد نصیبی جو وہ پلٹ کر آئی نہیں۔ اس عمل نے میرے تمام جھوٹ و کجواں کو بچ ثابت کر دیا، ورنہ عام کب میری مانتے اگر حزرہ باپ سے کہہ دیتا کہ وہ کرن سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ بڑی خوشی سے یہ رشتہ کرتے۔ کئی بار مجھ سے کہہ چکے تھے، کرن کو حزرہ کی دلہن بناؤں گا، وہ ہماری بہو بنے گی۔ بس تب ہی سے میں نے ان کو یہاں سے نکالنے کی پلاننگ ٹائٹ کر دی تھی اور کیوں نہ کرتی، میرا دل تو شروع سے مہوش پر فدا ہے، میری بہن کی بیٹی کا حق ہے اس گھر میں راج کرنے کا۔"

انہوں نے پیار بھری نگاہیں مہوش پر ڈالتے ہوئے کہا جو شرمیں انداز میں ان کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔

”ہم بہنوں میں سب سے کچھ دار اور ذہین آپا تم ہی رہی اور خوش قسمت بھی۔ اگر نوشاہہ نہیں مرنی تو کرن کو بہتو بھانا ہی پڑتا، پھر اس کے مرنے پر کفن دفن، سوگم، چالیسواں ہر کام پر خرچہ لگ کر ناپڑتا، ہر طریقے سے بچت ہوگئی تمہاری۔“

مازہ داد دینے والے انداز میں راحیلہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔“

وہ تینوں باتوں میں گمن لابی سے گزرتے مزہ کو دیکھ نہ سکی تھیں جو ماں کی باتیں سن کر جان چکا تھا کہ جو لوگ خود کو بدلنے کی سعی نہیں کرتے، ہدایت طلب نہیں کرتے، ان کو اللہ تعالیٰ بھی نہیں بدلتا، نہ ہدایت دیتا ہے جو لوگ حسد کی زمین میں بغض کے بیج بوتے ہیں وہ پھر تاحیات دکھوں و مصیبتوں کی فصل کاٹتے ہیں۔ اس کی ماں بھی ایک ایسی ہی بے ہدایت و بد اعمال عورت تھی۔ وہ بے آواز واپس پلٹ گیا تھا۔ ماں کی جانب سے معلوم ہونے والی باتوں نے اس کا دل ان کی جانب سے سخت کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نکس خوشبو ہوں نکھرنے سے نہ روکے کوئی  
اور نکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی  
کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کر جہائی میں  
میرے چہرے پر تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی  
جس طرح خواب ہو گئے میرے ریڑھ ریڑھ  
اس طرح سے نہ ٹوٹ کر نکھرے کوئی  
میں اس دن سے ہراساں ہوں کہ حکم طے  
خنگ پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی  
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں  
اب کس امید پر دروازے سے جھانکے کوئی  
کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ نہیں  
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں، آئے کوئی

دل میں برسر پیکار اضطراب و کشمکش کو وہ دور نہ کر پائی تھی، وہ بڑا دل نشین و حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ سرد شاہ، جس کی بھیا نک تعمیر بن کر وارد ہوا، لحوں میں نخلستان کو ریگستان میں تبدیل کر گیا تھا۔

منال نے جس دولت و جائیداد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے سے ذمہ عموالے شخص سے شادی کی تھی۔ جموئی محبت جتائی تھی،

قربت برداشت کی تھی، یہ سب کرنے کے بعد وہ کسی طرح بھی اس پر اپنی سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ وہ ماں کی طرح ہی لالچی و ہرجائی فطرت کی مالک تھی۔ عورت جب لکس کو مارتی ہے، طرف دھولے سے کام لیتی ہے تو پھولوں کی طرح پاکیزہ و پہاڑوں کی طرح بلند ہوتی ہے اور اگر لکس پرستی، کم ظرفی کو مقصد حیات بنا لیتی ہے تو پھر کسی کے لیے قابل قبول معجزہ نہیں رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے مفاد، اپنی اغراض سے دلچسپی ہوتی ہے، وہ بھی ایسی ہی تھی۔ معمولی سی بے احتیاطی سے ہاتھ آنے والی دولت کم ہونے کو تھی مگر وہ کس طرح ہاتھ آئی دولت کھودتی، یہ ممکن نہ تھا۔

اس نے چہرے پر ندامت و مصومیت کا نقاب ڈالا، آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات لیے وہ سرور شاہ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ بیڈروم میں تھی۔ منال دبے قدموں آگے بڑھ آئی۔ وہ ایزی چیئر پر بیٹھے تھے۔ چہرے پر متاع حیات لٹ جانے کا سوز پھیلا ہوا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے غم تھیں، بال مٹیوں میں جکڑے از حد دل گرفتہ حالت میں براجمان تھے۔ اگر منال میں وقار ہوتی، اپنے منصب کا پاس ہوتا تو وہ اپنی گمراہ کن خواہشوں و سستی آرزوؤں کو ٹھوکر مار کر اس شخص کی رفاقت کو ہی اپنے لیے سب سے بڑی دولت سمجھتی کہ سچی و انمول محبت سے بڑھ کر کوئی دولت ہو ہی نہیں سکتی، لیکن وہ دولت پرست و لکس پرست عورت تھی، اس لیے نہ اس کو اپنی حرکتوں پر پشیمانی کا احساس غالب ہوا اور نہ ہی اس کے اندر احساسات موم ہوئے، بلکہ کڑی کی مانند کڑو فریب کے جالے تیزی سے پھیلا رہی تھی۔

”سرور! پلیز مجھے معاف کر دیں۔ مجھے نہ معلوم کیا ہو گیا تھا۔ میں آپ کے بغیر زندہ کیسے رہ سکتی ہوں۔“ وہ چیئر کی بیک پر کھڑی اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”عورت ایک ہار نظروں سے گر جائے تو کبھی نہیں اُٹھ سکتی۔ بہت غلوں اور مکمل دیانت داری کے ساتھ میں نے تمہیں شریک حیات بنایا تھا اور شادی سے قبل اپنے متعلق سب کچھ بتا ڈالا تھا۔ تم سے قبل گلشنہ پہلی عورت، پہلی بیوی میری زندگی میں شامل ہوئی، اس کے انتقال کے بعد کئی سال تک میں گلشنہ کی محبت کے سحر سے آزاد نہ ہو سکا، پھر تمہیں دیکھا تو مجھے ادراک ہوا زندہ رہنے کے لیے، زندہ لوگوں کی رفاقت ہی سکون دیتی ہے، ہر ملاقات کے بعد مجھے تمہارا قرب، تمہاری چاہ کی آرزو بے کل کرنے لگی تو میں نے جانا گلشنہ کے سحر سے آزاد ہو کر میں تمہاری محبت میں ڈوب چکا ہوں۔ محبت تو اندھی ہوتی ہے۔ آنکھوں کے باوجود، کانوں کے باوجود محذور ہو جاتی ہے۔ تمہارے حصول کے لیے مجھے کروڑوں کا خسارہ برداشت کرنا پڑا تھا مگر پھر بھی میں خوش تھا کہ میری بنا دی گئی ہو تم میری ہو گئی ہو۔“

”میں اب بھی آپ کی ہوں۔ صرف آپ کی۔ وہ میری بھول تھی۔“ منال نے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر ان کے سینے سے لگنا چاہا تھا لیکن انہوں نے اسے اس طرح جھٹکا، گویا کسی گندگی کو جھٹک رہے ہوں۔ منال ان کے نظرت و گریز بھرے انداز سے دم بخور ہو گئی تھی۔

”میں بات کو زیادہ طویل دینا نہیں چاہتا۔ بس اب ہماری راہیں جدا جدا ہیں۔ اب کوئی عورت میری زندگی میں نہیں آئے گی۔ کسی پر اعتبار و بھروسہ نہیں کر سکوں گا۔ چلی جاؤں یہاں سے طلاق کے کاغذات تمہیں مل جائیں گے۔“ سرور شاہ نے اس کی جانب سے رخ پھیر لیا تھا۔

”سرور..... سرور اقرار گاڈ سیک اتنے اسٹون نہ بنیں۔ میری بات سنیں۔“ اس کو محسوس ہوا جیسے قدموں تلے زمین کھسکنے لگی ہو جس دولت و جائیداد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے پانچ سال اس کے سنگ گزارے تھے، یوں آنا قانا ہاتھوں سے نکل جائے گی؟ طلاق تو وہ بھی لینا چاہتی تھی مگر اس طرح خالی ہاتھ نہیں، بلکہ سب سمیٹنے کے بعد، اب اسے لگ رہا تھا کتنی سنگین غلطی کر بیٹھی تھی، اس سے چند لمحوں کی ملاقات کتنی مہنگی پڑی تھی، اتنی پاورفل پر اپنی ہاتھ سے نکلنے کا مال اس کے اندر رائے میرا بن کر اترنے لگا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

”یہ آسو غورتوں کے پرانے ہتھیار ہیں جو مجھ جیسے بندے پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اپنے بچے کی خاطر میں بے غیرت بن گیا ہوں، ورنہ تم زندہ نہ ہوتیں۔ بہت بڑا فریب دیا ہے مجھے ناقابل فراموش ڈکھ۔“ سرور شاہ ڈکھ و ضبط کی کٹھن گھڑیوں سے گزرتا بے حد دل گرفتہ و افسردہ تھا۔

”مجھے معاف کر دیں سرور پلیز۔“

”میں تمہیں معاف کر چکا ہوں، پلیز اب چلی جاؤ کبھی نہ آنے کے لیے۔“

”اتنے سنگ دل نہ بنیں سرور! جس نے آپ کو میرے خلاف بھڑکایا ہے، اس کا نام بتائیں میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔“

”اس مڈر ہے نام اس کا جو بروقت تمہاری ہر جانی فطرت سے آگاہ نہ کرتا تو نہ معلوم کب تک تم مجھے آؤ بنائے رکھتی۔“ سرور شاہ اور بھی اس کی ہر جانی صفات بیان کر رہے تھے مگر وہ یہاں تھی کہاں۔ وہ سکتے کی کیفیت میں کھڑی رہ گئی تھی۔ ساعتوں میں یہی نام گونج رہا تھا۔

”اس مڈر ہے نام اس کا۔“

”اس مڈر ہے نام اس کا۔“

”اس مڈر۔“

”اس مڈر۔“

دیواروں، دروازوں، کھڑکیوں، پردوں، فرنیچر، ہر شے سے، ہر سمت سے، ہر گوشے سے یہی نام گونجنے لگا تھا۔

مارے صدے و حیرت کے اسے اپنی رگیں پھینتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سراتنی تیزی سے چکرایا کہ ہر شے میں گردش نظر آئی۔ اس نے سہارے کے لیے سرور شاہ کا بازو تھامنا چاہا، وہ اسے تھامنے کے بجائے کمرے سے نکل گئے اور وہ کٹے ہوئے ہتیر کی مانند زمین پر پوس ہو گئی۔ پیشانی ماربل اسٹون کے میگزین ریک سے ٹکرا کر لبو لہان ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

زندگی کی بساط پر جیت و شکست کے مہرے بدلتے رہتے ہیں۔ وقت یکساں کہاں رہا ہے۔ بے حساب رنگ و بے شمار روپ ہیں اس کے۔ ہر رنگ پہلے سے جدا، ہر روپ دوسرے سے مختلف ہے، موسموں کی تبدیلی، وقت کا تغیر انسانی زندگی پر لہو اول سے حاوی رہا ہے۔ بدلتے موسم اور ڈھلا وقت ہمارے دامن میں کچھ سوچاتیں ڈال جاتا ہے۔

بہت سی خوشیاں

بہت سے دکھ

بہت سے راتیں

بہت سے کرب

ہر موقع، ہر قدم و دلیت ہوتے ہیں جو کبھی کامرانی و نصرت سے سرفراز کرتے ہیں تو کبھی ناکامی و نامرادی سے بدظن و بد مزہ۔ یہی زندگی کا چلن ہے گرنا، گر کر سنبھلنا، سنبھل کر اٹھنا، اٹھ کر چلنا اور پھر بغیر ٹھوکر کھائے مضبوط قدموں سے چلتے رہنا اور منزل پالینا۔

آج میں بہت خوش ہوں اور خوش کیوں نہ ہوں کہ چھ سال کی سخت بے چینی اور کڑی ریاضت کے بعد میرے برسوں سے دیکھتے رگ و جاں کو خشک و سکون کی دولت میسر ہوئی ہے۔ آج اس حسن کی ملکہ کو آئینے میں اس کا اصل چہرہ دکھایا ہے جو بے حد کریمہ و بد صورت ہے اسے اپنے حسن پر ناز تھا، خوب صورتی پر زعم، وہ مغرور اور مفاد پرست عورت بھول گئی تھی، مرد خوب صورت و جود کے ساتھ خوب صورت کردار کا شیدائی ہوتا ہے، خواہ وہ خود اخلاق و کردار کی تمام حدود پار کر چکا ہو مگر خود اپنے لیے وہ شبنم کی طرح پاکیزہ، پھولوں کی طرح معصوم عورت کی چاہ رکھتا ہے۔ خوب صورت عورت کا بد صورت کردار کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوتا، البتہ بد صورت عورت کا خوب صورت کردار اسے مستحور و چاہنے کے قابل بنا دیتا ہے۔

انس مدثر کے چہرے پر طویل عمر سے بعد بڑے سکون، دل آویز مسکراہٹ پھیلی تھی۔ دور یو الونگ جینز پر جمولتے ہوئے منال سے تصور میں مخاطب تھا۔ وہ بے حد سیدھا سادا اپنی دنیا میں تھن، اپنی سوچوں میں گم رہنے والا بے حد وجیہ و ہنڈم نوجوان تھا۔ اسے اپنی وجاہت و دولت کے احساس نے بھی عشق و عاشقی یا فلٹری جیسی لٹویات سے دور رکھا تھا۔

جیل کی مانند خاموش رواں دواں زندگی میں لچل و اضطراب کا پہلا پتھر منال نے ہی پھینکا تھا اور پھر اس کی جانب سے متواتر عیش قدمی ہوتی رہی تھی۔ پارکوں، ریسٹورنٹ، ساحل سمندر، راستوں میں وہ کسی چھلاوے کی طرح نازل ہو جاتی تھی۔ اس کے حسن کی سحر طرازیوں اور مصومیت و بھولپن کی ادائیں اسے سچ بچ دیوانہ بنا گئیں۔ چند ملاقاتوں میں اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ پائے گا۔ وہ لڑکی اسے اپنی زندگی، اپنی روح، اپنی جان لگنے لگی تھی جس کا حصول اس نے اسی طرح چاہا جس طرح شریف و عزت دار گھرانے کے لوگ چاہتے ہیں۔ منال نے جب اس سے اپنے پروپوزل کی بات سنی تو خوب ہنسی۔

”اس میں اتنا ہنسنے کی بات کیا ہے؟ میں نے جو ک نہیں کیا۔ ڈیڑی میرا رشتہ لے کر آئیں گے تمہارے پاپا کے پاس اور تم بجائے خوش ہونے کے پاگلوں کی طرح ہنسنے جا رہی ہو۔“

وہ جو اپنی بات کے جواب میں اس کا شرمانا بچکھاتا چہرہ دیکھنے کا خواہش مند ہو کر آیا تھا، اسے بے باکی سے ہنسا دیکھ کر خاصے بگڑے موڈ سے گویا ہوا تھا۔



”تمہارے ڈیڑھی کو کس آنسو کے پٹھے نے تجو بڑی پرو پوزل لانے کی؟“

”شٹ یور ماؤتھ..... میں نے کہا ہے۔“ وہ فحش و فجالت سے بولا۔

”اوہ موسوری۔ میری زبان پھسل گئی تھی مگر تم نے کیوں کہا؟“

وہ اس کا بگڑا موڈ اور بپھرے تیور دیکھ کر سنجیدگی سے بولی۔

”یہ کیوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ وہ بھنا کر بولا۔

”اوہ کم آن یا راکھ کیوں اتنے سیریس ہو رہے ہو؟“

”تم میری بات سن کر فیس رہی ہو۔ یہ مذاق مت کرو منال۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔“

منال کا روکھا دلا پرواہ انداز اس کے اندر ایک متوحش کرنے والی اضطرابی کیفیت کو اجاگر کر رہا تھا جس کے باعث وہ بے حد فحش و

مرد بار ہونے کے باوجود جھٹلارہا تھا۔ فیسے ہو رہا تھا۔

”یہ مذاق نہیں تو کیا ہے جو تم شادی کی بات لے کر بندھے گئے ہو۔ ہماری دوستی میں شادی کہاں سے آگئی؟ پھر میں نے کب کہا،

میں تم سے شادی کر رہی ہوں؟“ وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

”سنا..... ل! پو آ رہو کنگ؟“ وہ شا کڈ رہ گیا۔

”مائی فٹ جوک۔“

بے حسی و بے رحمی کی سب سے اونچی مندر پر وہ اس وقت براجمان نظر آئی تھی۔ اس ایک نیک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں

زور کا چھٹکا ہوا۔ کرچیاں روح میں بیست ہو گئیں۔ اپنی ذات، اپنی انا، اپنا وقار، عزت نفس اور اس کو چاہنے کا مان سب ریزہ ریزہ ہو کر

ہواؤں میں معلق نظر آیا تھا۔ یہ ایک لہو، یہ ایک ساعت صدیوں پر محیط تھی۔ اس کی دنیا میں جہاں وہ بادی پھیل گئی تھی۔

”مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس قدر تیر و مانڈ ڈھو تو میں کبھی بھی تم سے دوستی نہ کرتی، تم نے ہماری دوستی کو غلط رنگ دیا ہے۔“

”نہیں وہ محض دوستی نہ تھی۔ دوستی اور چاہت دو الگ جذبوں کے نام ہیں۔ تمہاری آنکھوں میں جگمگاتے محبت کے دیپ، ہونٹوں

پر کھلے چاہت کے کنول اور چہرے پر بکھری قوس قزح کے رنگوں کی دھنک میں ہمارے پیار کی جھللا ہٹ تھی۔ نہ معلوم کیا ہو گیا ہے تمہیں

جو اس طرح کشور پن کا مظاہرہ کر کے میرے جذبوں کا خون کرنے پر آمادہ ہو۔“

اس نے آگے بڑھ کر امید بھرے لہجے میں کہا، اسے ابھی یقین نہیں آیا تھا تو نے بکھرے دل کو ابھی بھی دلا سونے میں مشغول

تھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ اس کی محبت و بے تابیوں کا امتحان لے رہی ہے۔

”ہاؤ..... سو سیڈانس مدثر! مجھے معلوم ہوتا تم اتنے دل پھینک ہو تو کبھی بھی تم سے دوستی نہ کرتی۔ میری صرف تم سے ہی فریڈ شپ

نہیں ہے۔ بے حساب فریڈز ہیں اب خود سوچا اگر اسی طرح سب مجھے پرو پوز کرنے لگیں، میری محبت، میری چاہت کا جواز بنا کر تو سوچو

میں کس کس سے شادی کروں گی؟“

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ کر اس سٹمپر بھرے انداز میں مسکرائی کہ انس کی تمام توقعات و خوش فہمیاں اسی لمحے بوسیدہ دیکھ زدہ عمارت کی مانند وحشی چلی گئی تھیں۔

”تم نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ زمین آسمان کی طرف لوٹ جائے۔ آسمان زمین پر آسائے، میں تب بھی یقین نہیں کروں گا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو۔ یہ ناممکن ہے۔“

اس نے ہاتھ میں پکڑا رنگ بکس دور اچھالا تھا، پوری طاقت سے اچھالے گئے بکس سے ہیرے جڑی طلائی انگلی نکل کر دور مری تھی۔ اس کی وحشت زدہ بلند آواز سن کر اندر ہال میں ہلکا گلا کرتے اس کے دوست باہر کی سمت لپکے تھے۔

”لڑکی ہونے کے باوجود تم میں ناگن سے زیادہ زہر ہے۔ تمہارے ایک ہی وار نے میری تمام خوشیوں و چاہتوں کو ڈس لیا ہے۔ کیوں آئی تھیں میرے پیچھے؟ کیوں مجھے اس راستے کا مسافر بنایا جس کی کوئی منزل نہ تھی۔“

دونوں ہاتھوں سے اپنے بال مٹھی میں جکڑے وہ چیخ رہا تھا، رورہا تھا، وہ ہوش و خرد سے بیگانہ لمحے بھر میں ہوا تھا۔ منال اسے آپے سے باہر دیکھ کر خاموشی سے وہاں سے نکل گئی۔ جاتے سے اس کے ہونٹوں پر دل کش و طمانیت آمیز مسکراہٹ تھی، وہ چلی گئی تھی۔ اپنے پیچھے تباہیاں و دکھوں کی برسات چھوڑ گئی۔

پارٹی میں آئے اس کے تمام دوست اس کے گرد جمع تھے، سب کے سامنے وہ تماشہ بن گیا تھا۔ غیر متوقع چوٹ کھا کر کچھ اتنا بدحواس ہوا تھا کہ پھر ایک طویل عرصے ہوش و خرد کے حصار سے دور رہا تھا۔ وہ ہر کام بہت ایمان داری و لگن سے کرنے کا عادی تھا۔ محبت بھی اس نے پوری ایمان داری و جذبوں کی شدت سے کی تھی۔ منال سے قلی کوئی لڑکی اس کی زندگی میں نہ آئی تھی۔ وہی لڑکی تھی جس کے لیے چاہتوں کی تمام تر شدت سے دور دل و اکیا تھا۔ روکیے جانے کا فہم ہر فہم سے بڑھ کر بھاری اور ہر ذمہ سے بڑھ کر کاری ہوتا ہے، جو عزت

نس و خرد داری کو چھلٹی چھلٹی کر دیتا ہے۔ اسے ڈکھ پر ڈکھ ملا تھا۔ اول عشق میں فریب۔ دوئم ٹھکرایا جانا، روکیا جانا۔

کھرے و سچے جذبوں کا اتنی بے دردی سے استحصال وہ برداشت نہ کر پایا۔ اسے نفرت ہو گئی صعب مخالف کے وجود سے۔ لڑکیوں کی طرف دیکھتا تو درکنار وہ ان کی پرچھائیوں سے بھی نفرت کرنے لگا اور یہ نفرت انتہا کی حدود کو اس وقت پہنچ گئی جب معلوم ہوا

کہ منال نے کس مکاری سے اس کی محبت اور چاہت کو اپنے مفاد میں بری طرح استعمال کیا۔ اس کے آفس کے لاکرز سے کئی اہم دستاویزات غائب تھیں، جو اس سے قطع تعلق کے بعد معلوم ہوا تو انس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ چند ماہ میں ہی ان کا بزنس تنزلی کا شکار ہونے لگا اور

لغاری انڈسٹریز کی مارکیٹ بلندی سے بلندی تر ہوتی چلی گئی۔

اگر دٹر صاحب کی ذہانت اور سماجی حیثیت نہ ہوتی تو وہ منہ کے بل ایسے گرتے کہ پھر کبھی کاروباری دنیا میں ان کی جگہ نہ ہوتی، وہ بہت کٹھن وقت تھا ان کے لیے۔ ایک طرف بنیادین دنیا بھلائے کھرے میں پڑا رہتا، دوسری طرف کاروباری حلقوں میں ان کی

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

دیوالیہ ہوتی حالت پر چہ میگوئیاں۔ ایک انتشار تھا جو سوکھے پتوں کی مانند ہر سو پھیلا نظر آنے لگا تھا، ایسے میں اگر مڈ صاحب کے کچھ دوست ساتھ نہ دیتے تو وہ کبھی اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ کروڑوں کی ماروالی محبت از حد مہنگی تھی۔

وقت ایک عمدہ مہم ہے۔ یہ بڑے سے بڑے گھاؤ کو بڑی ہنرمندی سے بھرتا ہے۔ چند سالوں میں وہ بھی اپنی دنیا میں لوٹ آیا تھا مگر بہت بدلا بدلا، پہلے سے بالکل مختلف، انس کچھ اور نرم خو انس ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ اب ایک بیزار، بد مزاج، کم گو اور بات بات پر مشتعل ہونے والا انس مڈ تھا وہ۔ سچیدگی اور خاموشی اس کا پیرا بن بن گئی تھی جس سے کبھی بھی وہ آزاد نہ ہوتا تھا۔ لب مسکراہٹ سے نا آشنائی اختیار کر بیٹھے تھے۔ مگر نئی اور مڈ صاحب کے سامنے اس کا رویہ کچھ بہتر ہوتا تھا، ان کا ادب، احترام و محبت پہلے سے بڑھ کر تھی۔

منال سے سہ کی شادی والے دن ملاقات ہوئی تھی۔ کئی سال بعد اسے پھر اپنے روبرو دیکھ کر اس کے اندر عجیب سا اضطراب جاگا تھا، ایک پھل، ایک بے چینی جو لمحے بھر میں اسے نڈھال کر گئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں جو کبھی اسے دیکھ کر خوشگواریت کے احساس سے دھڑکنے لگی تھیں، وہ یک دم ہی استدلال پذیر ہوئیں۔ آنکھوں نے بیگانگی کے رنگ چڑھائے نفرت و حقارت خون کی طرح رگوں میں رواں ہونے لگی تھی۔ وہ شدت پسند تھا۔ محبت بھی انتہا پسندی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اب نفرت کی تھی تو..... نفرت کی انتہا تمام شدتوں سے سوتھی۔

اپنے لیے محبت و چاہت کی دیوالیہ اس نے منال کی آنکھوں میں اسی لمحے میں جانچ لی تھی جو پھر اتفاقاً ہونے والی ملاقاتوں میں ظاہر بھی ہو گئی تھی اور وہ سوچ چکا تھا۔ اس کا قرض واپس کرنے کو اور آج وہ سرخرو ہو گیا تھا اسے اس کے انجام تک پہنچانے میں، صرف ایک کال سرد شاہ کو کرنا پڑی تھی کہ وہ جم سے آ کر اپنی جینتی و محبوب بیوی کی وفا کو دیکھ لے۔ وہ مسکرا ہوا تھا۔ گنگنار ہا تھا۔

لوگ کہتے ہیں، عورت کا انتقام ناگن سے بڑھ کر ہوتا ہے اور مرد کا انتقام ہر انتقام سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ قدرت نے اسے موقع دیا تھا اور اس نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا، ابھی اس کے انتقام کی پہلی حد ختم ہوئی تھی، دوسری اور آخری حد باقی تھی جو منال کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوگی۔

”صاحب! باہر ایک عورت آئی ہے اس نے یہ خط دیا ہے۔“

شمور وازہ ناک کرتی اندر آئی اور اسے ایک تہہ شدہ کاغذ پکڑا کر باہر نکل گئی۔ انس نے کاغذ دیکھا تو تحریر دیکھ کر چونک اٹھا۔

☆.....☆.....☆

حزہ بہت دیر سے ٹی وی لاؤنج میں تنہا بیٹھا تھا صوفے پر نیم دراز بٹھا ہر اس کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں لیکن دل تھا کہ عجیب کسلندی و یو جو کا شکار تھا، بے نام اداسی تھی جس نے اس کے سارے وجود کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ تعلیم سے تو فارغ ہو چکا تھا۔ پاپا کے اصرار پر ان کے ساتھ بزنس میں دلچسپی سرسری طور پر لینا شروع کر دی تھی اور باقاعدگی سے دن کا بیشتر وقت وہاں گزارنے لگا تھا۔ صد کی آج کل نائٹس تھیں جب سے اس کا ہاؤس جاب شروع ہوا تھا، وہ گھر میں کم کم رہا ہوا تھا۔ آج بھی اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی، صبح سات بجے گھر آ کر وہ سوچ چکا تھا۔ اب اس کی صبح عصر کے بعد ہی ہوتی تھی۔

”گنتی اداسی ہے۔“ وہ ٹی وی کا سوچ آف کرتا ہوا بڑا بڑا پھر کھڑکی سے جھانک کر لان کا وہ حصہ دیکھنے لگا جو کبھی اس کے دل کا مسکن تھا۔

بہت آساں ہے کسی سے چھڑکے رہنا  
کہنے والے یا کٹر کہہ دیتے ہیں  
ہم اپنے قدم کہاں جمانیں بنا اس کے  
چھڑکے اس سے اداسیوں میں رہتے ہیں  
”کیا ہوا ہے؟ کیوں اتنے غصے میں لال ٹرائٹ ہو رہی ہو؟“

جزرہ اسے دلچسپ مچھا لگا ہوں سے دیکھتا ہوا گیا ہوا، سفید اور فیروزہ کی کاشن کے سوٹ میں اس کا سرخ چہرہ اور تھکے نقوش بے حد خوب صورت لگ رہے تھے۔

”میں غصے میں لال ٹرائٹ ہوتی ہوں۔ تمہاری ماما کی طرح ہری مرج نہیں۔“

”الٹی خیر۔ ماما سے کوئی بات ہوئی ہے؟“

”کوئی بات سے کیا مراد؟ تمہاری ماما نے تو ہر بات کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ کوئی بات کوئی کام ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔“

”یار امانا تو سہمی کیا ہوا ہے؟“

”جا کر اپنی ماں سے پوچھو کہ کیا ہوا ہے؟“ وہ پاؤں تلخ کر بولی۔

”بابا بابا..... اس وقت تو قسم سے تم بالکل بیوی والے اسٹائل میں بات کر رہی ہو۔“ وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

”کیا کہا تم نے بیوی؟ اور وہ بھی تمہاری۔ منہ دھور کھو، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔“ کرن چیخ کر بولی۔

”کیوں نہیں ہو سکتا ایسا؟ تم..... تم میری بیوی ہو گی۔“

دل کی بات اس کے لبوں پر آگئی تھی وہ جا چھٹی لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خواہش بیاں کر رہا تھا کہ کرن کے غصے و

منہ پھٹ انداز نے اسے کبھی یہ جرأت نہ بخشی تھی جو وہ اپنے دل کی کیفیت عیاں کرتا۔

”ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کبھی نہیں۔“ وہ اٹل انداز میں گویا تھی۔

”مگر کیوں؟ یہ تو بتاؤ۔ کیا خرابی ہے مجھ میں؟“

اسے اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی کتنا کٹھن ہوتا ہے اپنی پسندیدہ ہستی کے منہ سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار

سنتا۔ دل گویا تھک کی ڈلی بن گیا تھا۔

”بہت ساری خرابیاں ہیں۔ اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔“

”پھر بھی اہم خرابی کون سی ہے؟“ وہ جان پہ لب تھا۔

”تم اس گھر کے بیٹے ہو جو میرے لیے جہنم کدہ ہے، جس دن بھی میں اس گھر سے چلی گئی تو پھر کبھی پلٹ کر نہیں آؤں گی۔ کبھی بھی نہیں آؤں گی۔“

وہ ہوا کے مست جھونکے کی طرح گزر گئی اور اس کا دل ہمیشہ کے لیے تنگ کا سمندر بن گیا۔ اس کی یادوں کی لہریں سرکشی پر اتر آئیں۔ سمندر اس کی آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔

دل میں تیری یاد کے نشتر اتر گئے

کتنے ستارے آنکھوں سے ٹوٹ کر نکھر گئے

آ جاؤ کہ تر سے ہے یہ نظر

دیکھا نہیں تمہیں بہت دن گزر گئے

اس طرف بڑھتے قدموں کی آہٹیں سن کر اس نے تم آنکھیں دونوں ہاتھوں سے دگڑی تھیں۔ اسی وقت راحیلہ اندر آ گئی تھیں۔

”کیا سوچتے رہتے ہو بیٹا؟ تمہیں اس طرح تنہا اور اُداس دیکھ کر میرا دل ہولنا ہے۔ ہنسا بولا کر۔ کیوں اتنے گم مگم ہو گئے ہو۔

کوئی فکر ہے؟ کوئی پریشانی ہے؟ آخر ایسا کیا مسئلہ ہے جس نے تمہیں گوشہ نشین بنا دیا ہے؟“

وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے متاثر ہرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”ایسی کوئی پریشانی مجھے نہیں ہے جو میرے لیے مسائل پیدا کرے۔ آپ مت سوچا کریں میرے متعلق، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ

زری سے بولا تھا۔

”لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ میں کیوں نہ سوچوں..... ماں ہوں۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے۔“

”انکار صرف زبان سے نہیں ہوتا ہے اور بھی طریقے ہیں دوسرے کو اس کی اوقات بتانے کے۔“ ان کے لہجے میں شکایت درآئی تھی۔

”آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں، ورنہ میں ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا ہوں جس سے آپ کی دل ٹھنی ہو۔“

وہ ماں کے قریب ہو کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پریشان لہجے میں بولا۔

”تم مجھ سے دور ہو گئے ہو، گھر سے دور ہو گئے ہو اور اپنی خالواؤں سے بھی دور ہو گئے ہو۔ دیکھو جزوہ! میں سب برداشت کر سکتی

ہوں مگر اپنی بہنوں اور اس کے بچوں سے تمہارا روکھا اور بیگانگی بھرا انداز کبھی بھی برداشت نہ کر سکوں گی۔ یکے میں میرا ہے ہی کون، دو

بہنوں اور ان کے میاں و بچوں کے علاوہ بھائی کوئی ہمارا تھا بھی نہیں جو ماں باپ کے بعد ہمیں سمجھتا۔“

کل رات تک جزوہ گھر نہیں آیا تھا، وہ بہت انتظار کر کے گئی تھیں۔ بس جب ہی سے وہ بھری بیٹھی تھیں کہ کسی طور وہ ملے اور وہ

اسے بتائیں۔ اس بات سے بے خبر تھیں وہ کہ حزرہ خالادوں سے ملنے کے ارادے سے کرے کی طرف بڑھا تھا اور اندر سے ان سب کی فضول گفتگو سن کر وہاپس پلٹ گیا تھا۔

”میں پھر یہی کہوں گا آپ غلط فہمی کا شکار ہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے تو آج ماٹروہ کے ہاں کھانے پر چلو۔ وہ بے حد اصرار سے بلا کر گئی تھی۔ مہوش بھی بار بار تمہارا پوچھتی رہی تھی۔ ماشاء اللہ بہت پیاری ہو گئی ہے اور بڑی سکھ اور سلیقے مند بھی۔ کل سارا دن میں نے آرام کیا بلکہ اس نے کروایا۔ بہت ترس کھا رہی تھی مجھ پر کہ میں تمہا گھر کا کام سمیٹتی ہوں، سارا کام کیا کل اس نے۔“

”کیوں کل کوئی ملازم نہیں آیا تھا، سب نے چھٹی کی تھی؟“

”ارے ملازموں کی بھی خوب کہی تم نے میاں، اگر ملازم گھر والوں کی طرح کام کریں تو بات ہی کیا ہے۔ کام کم ٹخرے زیادہ کرتے ہیں۔“

”میرے خیال میں ہمارے ملازم بے حد نیک اور وفادار ہیں۔ کام بھی تمام دیانت داری سے کرتے ہیں، چٹھیاں بھی نہیں کرتے ہیں، آپ کو صرف دیکھنا ہوتا ہے۔“

”ارے بابا! تم تو اپنے باپ کی طرح بحث کرنے بیٹھ گئے ہو، کل تم نے مہوش کا کام دیکھا نہیں ہے، اس لیے بڑھ بڑھ کر بول رہے ہو، خیر آج رات دیکھنا، کھانا تمام وہ ہی بنائے گی۔“

وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بول رہی تھیں۔ ان کی خوشی کی خاطر حزرہ نے جبراً ہی بھری تھی کہ وہ کیسی بھی تھیں، بہر حال ماں تھیں۔

☆.....☆.....☆

رنگ و بو کا طوفان تھا جو ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔ اعلیٰ لمبوسات و مہنگے کلونڈو پر فیوز میں مہنگے لوگوں کے خوش باش چہروں پر آسودہ مسکراہٹوں کی طمانیت تھی، وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے، باوردی و میٹرز مختلف مشروبات مہمانوں کو سرو کرتے پھر رہے تھے۔

بات آچکی تھی۔ بلو تھری جیس سوٹ میں عمران مرزا بہت خوش و سرور نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے روایتی دلہاؤں کی طرح کوئی اہتمام نہ کیا تھا سب میں نمایاں نظر آنے کے لیے۔ ان کے گلے میں پڑا وہ سرخ گلابوں کا موٹا ہار تھا۔ کامران مرزا بھی آج بڑے تک مک سے تیار و عجب و بد بے سے آئے تھے۔

”سکینہ کہاں مر گئی ہے، نظری نہیں آ رہی ہے، اتنے اہم کام پڑے ہیں یہاں پر اور وہ بنا اجازت لیے غیر حاضر ہے۔ جا بلا کر لا اسے، بہت چربی چڑھ گئی ہے اس تک حرام کو، ابھی ہاتھوں سے کھال کھینچوں گی تو پتا چلے گا اسے۔“ والدہ حضور ملازمہ سے مخاطب ہوئیں۔

”مالکن! میں ابھی وہیں سے آ رہی ہوں، اس کے گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ پاس پڑوس سب سے معلوم کر لیا وہ نہ معلوم کب اور کہاں گئی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم، میں بھی ہر جگہ ڈھونڈ آئی ہوں۔“

”ہیں..... کیا بک رہی ہے تو وہ کہاں جا سکتی ہے؟“ والدہ حضور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

”وہ اکیلی ذات کہاں جا سکتی ہے۔ کوئی بے نہیں جس کے پاس جائے وہ۔“

”مالگن! میں نے خود اس کے دروازے پر تالا لگا دیکھا ہے۔“

حاجرہ مالگن کے بگڑے تیور دیکھ کر خوف سے سفید پڑ رہی تھی۔

”والدہ حضور! نکاح کی تیاریاں ہو رہی ہیں آپ باہر تشریف لے چلیں، تمام مہمان آپکے ہیں۔“

برہان لغاری دروازہ ناک کرتے ہوئے اندر آ کر ان سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے طائرانہ نگاہ نیچے کی جانب ڈالی۔ سفید

کاشن کے گلف شدہ سوٹ میں ان کی بارعب شخصیت نمایاں تھی۔

”قاضی کو بلوایا؟“

وہ حاجرہ کے ہاتھ سے لے کر سیاہ ویلوٹ کی سونے کی تاروں سے پینڈورک کی گئی چادر اوڑھتے ہوئے استفسار کرنے لگیں۔

”جی ڈرائیور کو بھیجا ہے۔“

”ایک حیرت انگیز خبر سنی تم نے؟“

وہ حاجرہ کو جانے کا اشارہ کر کے کچھ فکر مند لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”نہیں، کیا خبر ہے؟“ ماں کے انداز پر وہ بھی چونکا ہوئے تھے۔

”مائی سیکینز عاقب ہے گھر سے، بلکہ اپنے گھر سے بھی.....“

”مائی سیکینز؟ کہاں گئی ہے وہ؟“

”یہ تو معلوم نہیں ہے کہاں گئی ہے۔“

”کوئی بات نہیں، وہ چلی گئی تو ہمارے پاس ملازموں کی کمی نہیں ہے۔“

”نہیں برہان! مجھے دوسرے گھر رہے ہیں، اس کا اس طرح چھپ کر، بنا کہنے جانا اچھا لگن نہیں ہے کوئی ایسی بات ہے ضرور

جس کی وجہ سے وہ گئی ہے۔ کچھ کرو، اسے ڈھونڈ دو ورنہ..... کچھ ہو جائے گا۔“

اندیشوں و سوسوں نے ان پر یلغار کر دی تھی اور وہ ایک چالاک فطرت عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ ایک دنیا گزاری تھی انہوں نے

وقت کی بدلتی کروٹ ان کی زیرگ نگاہ سے بچ نہ پاتی تھی۔ سیکینز کی آن تھک خدمت اور دن رات کی جی حضوری نے انہیں اس پر کھل، اعتماد و

بھروسہ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس پر گہری نگاہ نہ رکھ سکیں اور اب انہیں لگ رہا تھا، بہت بڑا نقصان کر بیٹھی ہیں، وہ ناقابل تلافی نقصان۔

”والدہ حضور! کبھی پریشان ہوتی ہیں۔ دفع کریں اسے کی کمینوں کی ذات ایسی ہی ہوتی ہے، دھوکہ باز۔“

ان کی وحشت و گھر سے بے خبر برہان لغاری کہہ رہے تھے، وہ لالہ ابالی ولا پرواہ سوچ کے حامل تھے۔ ان کی سوچ میں پچھل و دانش



مندى کا فقدان ہمیشہ رہا تھا۔

”وہ کمی ذات اپنا کمینہ پن ضرور دکھائے گی۔ ہم بھول گئے تھے عمران مرزا کی وجہ سے اس کی بیٹی کنویں میں کود کر مری تھی اور وہ بد ذات اس کا انتقام لینے کے لیے کچھ کر نہ بیٹھی ہو؟“

برسوں پہلے کے کچھ مناظر ان کی آنکھوں میں لہرانے لگے تو وہ گھبرا کر برہان لغاری سے مخاطب ہوئی تھیں، جنہوں نے ماں کو تسلی اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ مائی سیکنہ کو تلاش کر کے لائیں، کہیں سے بھی اور ان کو لے کر باہر مہمانوں کی طرف بڑھ گئے۔

بیوٹیشن کے ماہر ہاتھوں نے اس کے خُسن کی ضیا پاشیوں کو منور کر دیا تھا۔ آف وہائٹ اینڈ میرون گلرز کے کمی نیشن نے تنگ پانچامسا اور قمیص کو جاذب نگاہ بنا ڈالا تھا۔ جبواری میں اس نے صرف ایک سیٹ پہنا تھا۔ بندیا، کنگن، گلو بند، جمومر، چوڑیاں، انگوٹھیاں اور ستھ اس سیٹ کی میچنگ کی تھیں۔ یہ سیٹ برہان لغاری خود لائے تھے۔ نہ معلوم کس جذبے کے تحت وہ اس نے پہنا تھا اور سوٹ بھی یہیں کا تھا۔ تمام چیزیں اس نے از خود یہیں کی استمال کی تھیں۔

تیار کر کے بیوٹیشن نے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے تلابے ملا دیئے تھے۔ بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ خود کو آئینے میں دیکھے مگر وہ راضی نہ ہوئی کہ دل کے اندر تو افراتفری پھیلی ہوئی تھی، جو وہ کر چکی تھی، جو ہونے جا رہا تھا اور جو ہونے والا تھا، وہ سب بہت سنگین و خطرناک تھا جس جگہ خوشیوں و مسرتوں کے شادیا نے بج رہے تھے، وہاں اب جہاں وہ بادی کی خاک نین کرنے والی تھی۔

”اوہ ویری انٹرسٹنگ۔ اس دور میں بھی آپ جیسی گرل ہے، میں نے فرسٹ ٹائم اپنی لائف میں کسی برائینڈل کو شرماتے دیکھا ہے، ورنہ ہمارے پاس لڑکیاں شادی سے قبل ہی چکر لگا کر شروع کر دیتی ہیں، بیوٹی ٹریٹ منٹ کے لیے۔ ایک آپ ہیں اپنے بکس کو دیکھتے ہوئے شرم رہی ہیں۔ بہت لگی ہیں آپ کے شوہر۔“

بیوٹیشن اس کی حالت سے بے خبر تو صلی لہجے میں کہہ رہی تھی، کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی تھی۔ اب وہ کمرے میں تنہا رہ گئی تھی۔ کیا کرے اور کیا نہ کرے کی سوچوں میں ابھی وہ کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ نیچے وسیع و عریض لان میں بہاریں محو رقص تھیں۔ رنگین لباس و رنگین چہرے، نقرئی تہقبے و بھاری بے ہنگم ہنسی سب گنڈتھے، یہ کام ایک دم طے پا گیا تھا مگر لوگوں کی کثیر تعداد کی موجودگی حیرت کا باعث تھی۔ برہان لغاری کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا۔

سب پر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں لان کے وسط میں بنے اسٹیج پر رکے صوفوں میں سے درمیانی صوفے پر براہمان عمران مرزا پر پڑی تھیں اور دوسرے ہی پلہ ہونٹوں پر در آنے والی معنی خیز مسکراہٹ کو وہ نہ روک سکی تھی۔ ابھی وہ مسکرائی تھی کہ دروازے کی سمت آتے قدموں کی آوازوں پر وہ کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھ پر بیٹھ گئی۔ دروازہ کھلا تھا اور اندر دو ملازما خیم داخل ہوئی تھیں پھر بھاری قدموں کی چاپ اُبھری اور برہان لغاری اندر داخل ہوئے تھے۔

”بی بی کو نیچے لے کر چلو۔“

وہ اس کی جانب سے پشت کر کے ان دونوں ملازماؤں سے مخاطب ہوئے جو ان سے پہلے آئی تھیں۔ کرن سختی کہ شاید اس سے ان کے پتھر دل میں کچھ گداز پیدا ہو جائے اور وہ پداری جذبے سے مرفوب ہو کر دستِ شفقت اس کے سر پر رکھ دیں مگر..... وہ چٹان تھے کسی غیر کی طرح لائقِ دانجان۔ اسے اپنے طرزِ عمل پر فخر محسوس ہونے لگا۔ یہ کہہ کر ٹھہرے نہیں تھے، اس سے مخاطب ہوئے بنا آگے بڑھ گئے۔ ایک نگاہ اس پر ڈالنا انہوں نے گوارا نہیں کیا تھا۔

کرن ملازماؤں کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگی۔ اوپر کا پورشن میجر کرنے کے بعد وہ نیچے آئی، راہ داریوں سے نکل کر باہر آئی تو برہان لغاری کھڑے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کو کہا اور گویا ہوئے۔

”باہر لوگ مجھ سے پوچھ رہے ہیں تم میری بیٹی تھیں تو کہاں تھیں، اتنا عرصہ کہاں غائب رہیں؟ تمہاری ماں کون ہے اور کہاں ہے؟ بہت گلٹی ٹیل کر رہا ہوں میں لوگوں کے سامنے۔ میں نے کہہ دیا تم اتنے عرصے سے امریکہ میں تھیں۔ وہیں پیدا ہوئیں اور پرورش پائی۔ تمہاری ماں بھی وہیں کی رہنے والی تھیں اور وہ کینسر میں مر گئیں۔ یہی بہتر تھا سب کو بتانا۔ اگر لوگ پوچھیں تو یہی بتانا۔“

بہت تندہ بہت ناگوار لہجہ تھا۔ ان کے لہجے میں ندامت و بچتا دے کی معمولی سی رمت نہ تھی۔ یہاں سے وہ اسے ساتھ لے کر مہمانوں میں آگئے۔ پہلے والدہ حضور کے پاس لائے تھے۔ انہوں نے سلام کے جواب کے ساتھ دعاؤں سے نوازا تھا۔ پھر وہ مہمانوں کی طرف بڑھے تھے۔ مہمانوں کی نگاہوں میں کرن کے لیے سانس تھی، اشتیاق و تجسس تھا اور قیل اس کے کہ وہ ان میں گھرتی، کچھ لوگ ذکی الدین کے ساتھ اس طرف آتے دکھائی دیئے۔ ذکی الدین، برہان لغاری کا دستِ راست و قابلِ بھروسہ آدمی تھا، یہ سب کو معلوم تھا۔ اس وقت ان ہارعب پر سنائی و دراز قد والے بندوں کے ہمراہ آتے ہوئے ذکی الدین کے چہرے پر پھیلی وحشت و بدحواشی صاف نظر آ رہی تھی جس کو دیکھ کر نہ صرف برہان لغاری ٹھنک گئے تھے بلکہ ان کا دل بھی نرمی طرح دھڑکنے لگا تھا۔

”سر پلیز! آپ ادھر چل کر میری بات سنیں۔“

ذکی الدین قریب آ کر اس انداز میں بولے کہ ان کی آواز بمشکل نکل پاری تھی۔

”وہاں بیٹھو۔ ہم آتے ہیں ابھی۔“

وہ کرن کو صوفے کی طرف اشارہ کر کے ذکی الدین کے ساتھ اندر چلے گئے۔

برہان لغاری کے بٹے ہی ملازماں اپنے جلو میں اسے ڈالنے کے لیے بنائے گئے اسٹیج کی طرف لے آئی تھیں۔ وہ کانپتے وجود کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت بہادر و سرکش تھی مگر اس وقت اس پر اپنی صنف کی کمزوری غالب آ رہی تھی۔

”یہ ایک شل فورمز کے لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

مہمانوں میں سے کسی کی تعجب خیز آواز سنائی دی تھی۔

”لغاری صاحب کی سوز سز بہت پادوقل ہیں، انوائٹڈ ہوں گے۔“ دوسری آواز تازہ تھی۔

”کچھ گڑبگڑ رہی ہے۔ یہ لوگ ایکشن میں لگ رہے ہیں۔“

چند لمحوں بعد تمام مہمانوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔

اندر لاؤنج میں برہان لغاری غصے کی حدود کو چھوتے ہوئے سامنے ٹیبل پر پڑے نکاح نامے کو گھورتے ہوئے مسلسل نقلی میں گردن ہلا رہے تھے۔

”میں نہیں مان سکتا۔ یہ جھوٹ ہے، فراڈ کیا جا رہا ہے میرے ساتھ۔ میری بیٹی کی شادی آج ہو رہی ہے اس نے کورٹ میرج

نہیں کی۔ جھوٹ ہے، یہ سب بکواس ہے میرے خلاف میرے دشمنوں کی سازش ہے، جس کو میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“

بہت ضبط کے باوجود ان کی آواز لاؤنج کی حدود سے باہر نکلنے لگی تھی۔

”پلیز ٹیک اٹ ایزی برہان! سنبھالو خود کو۔ یہ بہت حساس معاملہ ہے۔ غصے اور جذبات سے بات نہیں بنے گی۔“

ان کے دیرینہ دوست سجاد منصور جو آئی جی کے عہدے پر فائز تھے، ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”تم..... تم بھی مجھے ایزی رہنے کا کہہ رہے ہو۔ جانتے ہو اس کہنے نے کیا گیم کھیلا ہے میرے ساتھ..... میری جس بیٹی کی

بارت میرے گھر اتر چکی ہے اس بیٹی کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اس کی بہو ہے۔ اپنی مرضی و خوشی سے وہ چند دن قبل اس کے بد معاش بیٹے

سے نکاح کر چکی ہے؟ وہ میری عزت سے کھیل رہا ہے۔ میری ساکھ مٹی میں ملا رہا ہے اور تم کہتے ہو میں آرام سے رہوں۔“

ان کا اشتعال جنون میں بدل رہا تھا۔ مدثر اور انس نے بہت بڑی ضرب لگائی تھی۔

”یہ جھوٹ ہے، فراڈ ہے، جعل سازی ہے، میں شوٹ کروں گا ان کو، ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

انہوں نے ٹیبل سے اٹھا کر نکاح نامے کے کلاے کلاے کرتے ہوئے کہا۔

”میری بات سنو۔ تماشہ مت بناؤ خود کو۔“

”میں تماشہ بنانے والوں کو جب تک قبروں میں نہیں پہنچا دوں گا، جب تک سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔ اس نکاح نامے پر جو ڈیٹ

درج ہے، اس ڈیٹ کو کرن میرے گھر میں موجود تھی۔ وہ کہیں نہیں گئی ہے۔“

”یہ سب کیا ہو رہا ہے، ہماری خوشی میں خفیہ پولیس کا کیا کام ہے؟ باہر سب طرف چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ پولیس درجنبر نے

ہماری کوٹھی کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔“

والدہ حضور اندر آتے ہوئے سخت لہجے میں گویا تھیں۔ سجاد منصور نے مختصر اتمام صورت حال انہیں بتائی تو وہ اس طرح ڈھیلے انداز

میں بیٹھی رہ گئیں جیسے غبارے سے یک دم گیس نکل گئی ہو۔

”نکاح ہوا ہے اور اسی ڈیٹ کو ہوا ہے تمہاری بیٹی نے بہ رضا و رغبت یہ نکاح کیا ہے۔ یہاں آنے سے قبل میں نے مکمل دہر سلخ

سے تحقیق کی ہے اور ایک پروف بھی ہے میرے پاس۔“ سجاد منصور گویا تھے۔

”کیسا پروف؟“

”تمہاری گھریلو ملازمہ مائی سیکنڈ نے گواہی دی ہے۔“

مائی سیکنڈ کا نام ان ماں بیٹے کی ساتوں میں کسی ہم کی طرح بلاست ہوا تھا۔

”ٹمک حرام، آستین کا سانپ۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کچھ گزبہ ہونے والی ہے۔ دیکھو کٹ گئی ہماری ناک، بل گئی مٹی میں

عزت و آن، جس شمع کو برسوں سے سنبھالا تھا، لمبے بھر میں زمین یوں ہو گئی۔“

”میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اسے۔“

سخت وحشت و جنون میں وہ ریوا لورا لانے کے لیے بیڈروم کی طرف بڑھے تھے، اس وقت ان کی حالت دیوانوں کی مانند تھی،

بال بکھر گئے تھے، منہ سے کف جاری تھا۔

ان کا ذہن انہیں شکست فاش سے دو چار کر چکا تھا۔ وہ کس طرح یہ سب برداشت کرتے۔ اتنا حوصلہ، اتنا تحمل ان کی سرشت میں

نہ تھا۔ سجاد منصور کے علاوہ اور بھی حکومتی اعلیٰ عہدوں سے تعلق رکھنے والے افسران وہاں موجود تھے، جو صورت حال کو کنٹرول میں رکھنے کی

سستی میں مصروف تھے۔

دراصل مائی سیکنڈ کے ہاتھوں سے ملنے والے تحریری پیغام کو پڑھتے ہی انس نے مڈر صاحب سے بات کی اور ان سے مشورے

کے بعد نکاح نامے کی ڈپٹی کیٹ اور اورینٹل کالج کا جیڑ اور مووی لے کر آئی جی سجاد منصور کے پاس پہنچا تھا، جو صورت حال جان کر سخت فکر مند

حواس باختہ ہو گئے تھے۔ وہ برہان لغاری سے دیرینہ تعلقات رکھتے تھے تو مڈر صاحب سے بھی گہرے مراسم تھے۔ دونوں اشخاص کی

کاروباری سادھ اور معاشی و سماجی حیثیت سے بھی وہ پوری طرح واقف تھے کہ دونوں ہی اعلیٰ و بلند مقام رکھتے تھے۔ بہت پھرتی اور توجہ سے

انہوں نے حالات کا جائزہ لیا تھا اور کہیں بھی کوئی سقم یا محمول محسوس نہ کیا تھا۔

انہوں نے انس کو عمارت سے دور رکھا تھا، وہ یہاں سے چند میل دور اعلیٰ افسران و اسپیشل ایجنسی والوں کی تحویل میں اپنی منگودہ کا

انتظار کر رہا تھا۔ حفاظتی تدابیر کے تحت یہ حکمت عملی اپنائی گئی تھی ورنہ انس بھرتا تھا یہاں ساتھ آنے کے لیے۔ پھر جو کچھ ہوا ان کی توقع سے

بڑھ کر سب کچھ ہوا تھا۔ بہت مشکل سے برہان لغاری کو انہوں نے قابو کیا تھا جو کسی بھی طرح کرن کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ والدہ

حضور نے انہیں بے قابو دیکھا تو بڑھ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ رکھتے ہی گویا وہ بھر پوری مٹی کی طرح ڈھلے گئے۔

”یہ کیا ہوا والدہ حضور! ہم سے کیا خطا ہوئی جو اتنی بڑی ذلت و رسوائی ہمارا مقدر ٹھہری ہے۔“ وہ بے دم سے نیچے قالین پر بیٹھ

گئے تھے۔

”خطا تو ہوئی ہے ہم سے، جو اس کم ذات کو عزت دینا چاہی تھی اور اس نے وہی کیا جو اس کی فطرت تھی۔ تاگن کی اولاد تاگن ہی

ہوتی ہے جن ہاتھوں سے دودھ پیتی ہے ان کو ہی ڈستی ہیں۔“

بہت بڑی چوٹ پڑی تھی ان کے چند انٹرس پر، لہجے کی ساری گھن گرج مٹ گئی تھی۔

”اجازت ہے انس مڈر کوان کی منکو سوچنے کی؟“

سجاد منصور نے آہستگی سے مدعا بیان کیا تھا۔

”نہیں، وہ زندہ اس گھر سے نہیں جاسکتی ہے، یہ ممکن نہیں ہے۔“

”جذبات کو خود پر حاوی مت کرو برہان۔ یہ کیس چیف مشترک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ مڈر کی ریلیشنز بہت اعلیٰ پیمانے پر ہیں، اگر

تم نے کوئی جذباتی حماقت کی تو معاملہ اوپر تک پہنچ جائے گا پھر جو کچھ ہوگا وہ ہمارے اختیار سے باہر ہوگا۔“ سجاد منصور نے رسائی سے سمجھایا۔

”جو ہوگا دیکھا جائے کم از کم میں اس کو زندہ اس گھر کی دہلیز عبور نہیں کرنے دوں گا۔“ وہ ہار کر بھی ہلکتا ماننے کو تیار نہ تھے۔

”میں سمجھ رہا ہوں، اس وقت جو تم پر گزر رہی ہے۔“

”تم سمجھ ہی تو نہیں رہے، اگر میری حالت کا اندازہ نہیں ہوتا تو تم کہتے اس ذلت کو زندہ زمین میں دفن کر دوں، جس نے ہماری

برسوں کی عزت پر خاک اڑائی ہے۔“ وہ اس لمحے ان سے بھی کبیدہ نظر آئے۔

”سجاد ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا۔ یہ جوش کا نہیں، ہوش کا موقع ہے۔ ہماری بے عزتی اور سوائی اس وقت جو ہوئی سو ہوئی، لوگ کب

تک یاد رکھیں گے، اگر معاملہ بگڑ کر کورٹ تک پہنچ گیا تو بہت بُرا ہوگا۔ عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کو اس گھر سے نکال باہر کرو۔ ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ لو۔ ہمیں اس سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔ کبھی بھی کسی صورت میں نہیں۔“

ان کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔

کرن کی رخصتی لیڈی پولیس کی حفاظت میں ہوئی تھی۔ کامران مرزا اور عمران مرزا سے مذکورہ معلوم کیا گیا تھا کہ وہ وہاں سے چلے گئے

تھے۔ کچھ مہمان موجود تھے جو اس عجیب و حیران کن صورت حال پر تبصرے کر رہے تھے۔ ان کی آوازیں سرگوشیوں میں ڈھلی ہوئی تھیں۔

”میں پاپا سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

گیٹ کی سمت بڑھنے سے قبل وہ رکتے ہوئے ہمراہ چلتے سجاد منصور سے گویا ہوئی۔

”وہ آپ سے بات نہیں کریں گے۔“

”مجھے بات کرنی ہے۔“

وہ سنجیدہ اور مضبوط انداز میں گویا ہوئی۔ سجاد منصور نے کچھ فاصلے پر رُخ پھیرے کھڑے برہان لغاری سے اس کی گفتگو کرانے

کی خواہش بیان کی تو انہوں نے منع کر دیا اور ان کے منہ سے کرن کے لیے مغفلات کا سیلاب اُٹ پڑا تھا۔ شدید غصے و بے عزتی کے احساس

نے ان کے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔

”میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی ہوں۔ میں نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی، کوئی ظلم نہیں کیا ہے بلکہ آپ کو وہی لوٹایا جو آپ نے

مجھے دیا۔ بچپن سے میں ایسی ذلت، رسوائی و بے عزتی سستی آرہی ہوں جس کا احساس آج آپ کو بھی ہوا ہے۔ میں جارہی ہوں اور نہیں جانتی کہ آگے میرا کیا مستقبل ہوگا۔ آپ کے دشمن کب تک میرے ہمدرد دوست رہ سکتے ہیں مگر بے حس و سنگ دل باپ سے دشمن بہتر ہیں۔

آنسو خود بنو دی اس کی آنکھوں میں بھرنے لگے تھے۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ زُکی نہیں تھی، گیٹ کی سمت بڑھ گئی تھی۔

”یار کپٹین! خاصا ناظم گزر گیا ہے، ذرا کال تو کرنا کہ معلوم ہو کہ خالم ساج کی دیواریں رات سے نہیں یا ابھی حائل ہیں تاکہ کچھ کارروائی کی جائے۔“

کپٹین کاٹھن ہوا میں اُچھالتے ہوئے وہ کپٹین ریاض سے بولا۔

”یہ عالم شوق کا دیکھنا جائے۔ صبر کرو میری جان صبر۔ بہت بڑا پنگالیا ہے تم نے۔ بچت اسی میں ہے کہ صبر کرو۔ بے قرار یوں کو ہونا دو کہ یہ وہ چنگاریاں ہیں جو دامن پر لگیں تو داغ چھوڑ جائیں گی۔“

”داغ تو ہم نے لگا دیا ہے ایسا بد نما و بھدا کے دنیا کا مجھے سے مزید کواشک پاؤ ڈر بھی وہ داغ مٹانے پائے گا۔“ طویل عرصے بعد وہ اپنی پرانی ترنگ میں آیا تھا۔

خج کی خوشی

جیت کا نشہ

اسے شوخ بنا رہا تھا۔ کھلکھلانے پر مجبور کر رہا تھا۔

”شرم کرو کچھ۔ کیسے بھی ہیں اب وہ تمہارے قادر ان لاء ہیں۔ داغ لگانے کے بجائے تمہیں ان کے پاؤں دھو دھو کر پینے چاہئیں۔“

کپٹین ریاض سے حال ہی میں اس کی دوستی ہوئی تھی اور وہ اس کی مکمل ہسٹری سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نیک نیتی سے مشورہ دے رہا تھا۔

”یہ کام تم کر سکتے ہو میں نہیں۔ باقی داوے تم نے کتنی مرتبہ اپنے سر کے پاؤں دھو دھو کر پیئے ہیں؟“

”میں اس سعادت سے محروم رہا یا۔ میری شادی سے قبل ہی وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔“ ریاض ہنس کر بولا۔

”اوہ ہوا حسرت ان فنچوں پر ہے جو بن کلمے مر جھا گئے۔“ انس نے کہا اور دونوں ہنس پڑے تھے۔

”اور تم خود اپنے لیے حسرت کا سامان پیدا کر رہے ہو۔ کلمے ہوئے فنچوں کو مر جھانے کا۔ دراصل انسان کی فطرت رسی ہے کہ جو شے اسے حاصل ہوتی ہے اس کی وہ قدر نہیں کرتا اور جس سے وہ محروم ہو چکا ہوتا ہے اس کی چاہ میں زندگی کو روگ بنا لیتا ہے۔“

کپٹین ریاض کہہ رہا تھا اور وہ ذہنی طور پر یہاں سے غائب تھا۔ اس کے تصور کی اسکرین پر برہان لغاری کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

اکڑی ہوئی گردن اور رعنت بھرے لہجے والے برہان لغاری کی ممکنہ حالت کا سوچ کر وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شاطر دماغ و عیار سوچوں

والے شخص نے اس کے ہاتھوں ایسی ذک اٹھائی تھی کہ اسے یقین تھا کہ آخری دم تک وہ اپنی نکست ورنیٹ پر نامور رہے گا۔

”کیا خیالوں میں بھی بھابی کے پاس پہنچ گئے ہو؟ حد ہے یا رانسی بے تابی و بے قراری بھی کیا“۔

ریاض اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتا ہوا بولا۔

”تم کیا سمجھو گے میرا حال“۔ وہ مسکرا کر ڈومٹی لہجے میں گویا ہوا۔

”سب سمجھتا ہوں اور بخوبی سمجھتا ہوں۔ چلو خوش ہو جاؤ انتظار کی گمزیاں بیتنے والی ہیں۔ آپ کی بیگم کی رخصتی ہوگئی ہے۔ وہ پہنچنے

والی ہیں“۔

ریاض نے وہاں سے موصول ہونے والی تازہ انفارمیشن پہنچائی توجیت کی خوشی سے وہ مجھوم اٹھا تھا۔

برہان اغاری کو آج اس نے وہ سبق دیا تھا جو وہ تاحیات نہیں بھول سکتا تھا۔ بہت بڑے کاروباری نقصانات وہ انہیں پہنچاتا رہا تھا

اور اس نے ایک ہی جھٹکے سے تمام حساب کلیئر کر دیئے تھے۔ وہ کہانی جس کا آغاز محبت کی شبنم و چاہتوں کے منگنے پھولوں سے ہوا تھا۔ اسے

انجام نفرت کے کاٹنوں اور انتقام کے تہس نہس کر دینے والے لشعلوں نے دیا تھا۔

محبت والہت، انا و انتقام کی جنگ بن گئی تھی۔

ان کے ارد گرد کھڑے چونکا نو جوان الرٹ ہو گئے تھے۔ خود کشی میں ریاض بھی سنجیدہ ہو چکا تھا، کچھ دیر بعد کئی گاڑیاں یکے بعد

دیگرے وہاں آ کر رُکی تھیں۔ سب سے آگے پرانی بیٹھ کار سے آئی جی سجاد منصور نکلے تھے جنہیں دیکھ کر اسٹیشن سرورز کے نوجوانوں نے

سیلوٹ کیا تھا۔ کیپٹن ریاض بھی مسدوب کھڑا تھا۔

”تھینکس سر اس وکٹری میں بہت مورل سپورٹ رہی ہے آپ کی“۔ انس ان سے ہاتھ ملاتا ہوا سنجیدگی سے کہا اٹھا۔

”میں نے تم پر کوئی احسان کیا ہے نہ برہان کی کوئی ہیلپ کی ہے۔ میں نے اپنی ڈیوٹی ادا کی ہے لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا ہے بہت

خطرناک ہے۔ اس کی جہاں بہت دور تک پھیل سکتی ہے۔ یہاں چھانپیں ہوا ہے۔ یہ سب کرنے سے قبل تم میرے پاس آ جاؤ تو میں سب سنبھال

لیتا“۔ اسی لمحے ایک کار تیزی سے ان کے قریب آ کر رُکی تھی۔ اگر بروقت وہ انس کو دوسری طرف نہ کر دیتے تو وہ پوری طرح اس کی زد میں تھا۔



خانے میں ایک دم بریک لگانے کی تیز آوازیں دور دور تک گونجی تھیں۔ فورسز نے برق رفتاری سے پوزیشنیں سنبھالی تھیں۔

کیپٹن ریاض، انس کے سامنے ایستادہ ہو گیا تھا۔ کرن بھی گھبرا کر کار سے نکلے تھی اور اسی لمحے اُس طوفانی رفتار سے آنے والی کار کا دروازہ

کھول کر منال باہر نکلے تھی۔ وہ جتنی تیزی سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلے تھی، کرن پر پہلی نگاہ اُس کی پڑی تھی۔ بنی، سنوری عروسی لباس میں

کرن کو دیکھ کر وہ ساکت و جامد رہ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں استعجاب و راستعجاب اُتر آیا، جبکہ اس کو دیکھ کر کرن کے چہرے پر پہلی سراسیمگی و

گھبراہٹ احتمال پر آ گئی تھی۔

منال کی استغیاب نگاہوں میں خون خواری اتر آئی۔ اُسے دیر نہ لگی سب سمجھنے میں۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ یہاں سے گزرتے ہوئے اُس کو دیکھ کر رُک گئی تھی۔ صورت حال کا ادراک اُسے متوحش کر گیا تھا۔ شعلوں میں وہ پہلے ہی گھری ہوئی تھی۔ ”میں تجھے مار دوں گی، میں تجھے مار دوں گی۔“ وہ آگے بڑھی مگر سجاد منصور کی مداخلت کے باعث اُس تک نہ پہنچ سکی۔ وہ خوب چیخ رہی تھی، گالیاں بگ رہی تھی۔ اُس آگے بڑھا اور کرن کے گرد بازو ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

”انکل! مجھے چھوڑ دیں، میں مار دوں گی اس کو، اس نے مجھے برباد کر دیا، تباہ کر دیا۔“ پریشان زلفیں، پیشانی پر ہندسی پٹی، تلخے لباس میں خون کے جا بجا دھبے، زرد چہرہ و آنکھوں میں نقاہت و وحشت محو قہقہے تھی۔ اُس کی حالت ابتر اور ذہنی توازن دورست نظر نہیں آ رہا تھا۔ سجاد منصور اُس کو سمجھانے کی سعی کر رہے تھے اور وہ اُن کی باتوں پر توجہ دینے بغیر چیخ رہی تھی۔

”میں کیوں تمہیں برباد کروں گا؟ تم سے میری کیا دشمنی ہے؟ نہ معلوم تم کس غلطی کا شکار ہو گئی ہو۔“ اُس ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے آگے بڑھا تھا۔ اُس نے خاموش کھڑی کرن کا ہاتھ بڑے استحقاق بھرے انداز میں پکڑا اور شعلہ بنی منال سے مخاطب ہوا۔

سجاد منصور کی گرفت سے نکلنے کی سعی میں وہ خون خوار انداز میں کچھ مزید تازہ الفاظ سے نوازنا چاہتی تھی کہ ایک دم اس کی برواشت جواب دے گئی اور وہ سخت لہجے میں بولا۔

”بکواس بند کرو اپنی، کس حق کی بنا پر تم اتنی اڑ رہی ہو؟“

”محبت کی ہے تم نے مجھ سے اور شادی کا وعدہ۔“

”جھوٹا ہانکل بکواس، ایک شادی شدہ عورت سے محبت اور شادی کا وعدہ!..... یہ سب باتیں میرے نہیں تمہارے کریکٹر لیس ہونے کا ثبوت ہیں کہ تم کتنی باکردار عورت اور وقار دار بیوی ہو جو ایک غیر مرد کی ہمدردی کو محبت سمجھ کر نہ صرف خوش فہمی میں مبتلا ہو بلکہ اپنے بے بسائے گھر کو ہی توڑ ڈالنے کے سنے دیکھنے شروع کر دیئے۔“

”یہ سب کرنے کے لیے تم نے مجھے اُکسایا، میرے قدم پیچھے تو راستہ دکھانے والے تم بنے، اگر میں نے اپنے گھر کو توڑا تو ترفیب دینے والے تم تھے، میری میرڈلائف میں آگ تم نے لگائی، مجھے حد سے گزر جانے پر تم نے مجبور کیا اور پھر بے حد چالاکی و مکاری سے میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والے بھی تم ہو، میں تمہیں معاف نہیں کروں گی، جو کھیل تم نے میرے ساتھ کھیلا ہے اس کا انجام بہت ہیسا تک ہوگا۔“ اُس کی آواز میں پنہاں وحشتیں ماحول میں گونج اُٹھی تھیں۔ اُس کی سرخ وحشت بھری نگاہیں کرن کے وجود پر مرکوز تھیں جو سانس لیتے جیسے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ گم مہم، خاموش، بے حس و حرکت۔

”پر وہ نہیں، میری زندگی کے تمام رنگ تم نے اپنی کج روی سے بے رنگ کر دیئے تھے، آج مجھے زندگی، زندگی محسوس ہو رہی ہے اب میں مکمل ہوا ہوں، مجھے مکمل رہنا ہے اپنی مرضی، اپنی خواہش سے، جیون سنوارنا ہے۔ شاہراہ حیات پر اپنی من پسند شریک حیات کا ہاتھ تمام کر زندگی گزارنا ہے۔ مجھے ایک وقار دار و وفا پرست بیوی کی ضرورت تھی، تاکہ میرے بے چین و ٹھکرائے ہوئے دل کو دشت و دشت، صحرا



صرا، مگر بھٹکانہ پڑے۔ ایک بے وقا عورت کا زخم، ایک وفا پرست و ایثار پرست عورت ہی بھر سکتی ہے۔ میرا گھر آباد ہو گیا ہے اور دل بھی۔ کرن ایک ایسی ماں کی بیٹی ہے جنہوں نے تمام عمر حیا و وفا کی پاسداری میں گزاری اور جس وقت اُن پر الزام لگایا گیا بے وقائی کا، بے حیائی کا، اُسے لمحے انہوں نے زندگی کو ٹھوکر ماری اور موت کی آغوش میں چلی گئیں۔

ایک عورت کی وفا

ایک عورت کی حیا

ایک عورت کی توقیر

اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ساری عمر کا تقدس و پاک بازی انہوں نے لمحوں میں ثابت کر دی اور ہمیشہ کے لیے سُرخ رو ہو گئیں۔ ایسی عظیم ماں کی بیٹی سے وفا کی اُمید کی جاسکتی ہے تم سے نہیں۔ تم دولت پرست اور نفس پرست ہو تم سراپا ہوس و طمع ہو، تمہیں جہاں خانہ بننا منظور نہیں، کیونکہ تم تو شیخ محفل ہو، اپنے سُخن کے شعلوں سے بیک وقت کئی پروانوں کو جل کر مرتے ہوئے دیکھ کر راحت محسوس ہوتی ہے۔ تم بس اپنے سُخن کے قہیدے پڑھنے والوں کی گرویدہ رہیں، تم شروع سے مکار اور خود غرض تھیں۔ جال ڈال کر شکار پھسانا پھر شکار کی تڑپ کا حزرہ لوٹ کر اُسے گھائل کر کے چھوڑ دینا تمہارا پرانا مشغلہ ہے۔" اُس مڈر کے لہجے میں کچھ ایسی تڑپ و جا زبیت تھی کہ سب دم بخود سن رہے تھے۔ اُس کی بھاری آواز خاموشی کی چادر کو چیرتی ہوئی ہر سمت پھیل چکی تھی۔

"تمہیں اپنی مدح سرائی پسند ہے، اپنی تعریف سے تم کبھی پور نہیں ہوتی ہو، کیا سمجھتی ہو تم خود کو؟ آسمان سے اُتری کوئی حور؟ ایشی دیوں کی اپسرا؟ بہت اہم ہستی ہو تم؟ آج پہلی اور آخری بار یہ سمجھ لو، عورت اپنے کردار اور اخلاق سے بنتی ہے اور تم میں یہ خوبیاں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، تم سے ہر دور رشتہ استوار کیا جاسکتا ہے جس کی حد میں اخلاقیات کے دائروں سے باہر کی سمت بہہ نکلے۔"

"شپ اپ۔ شٹ اپ یو!" مارے غصے و جنون کے اُس کی آنکھیں اُملی پڑی تھیں۔ شدت سے چیخنے سے آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ چہرہ سُرخ انگار بن گیا، باجھوں سے کف بہ نکلا تھا۔ وہ ہذیانی انداز میں اب سجاد منصور کو ہی کوچ کھسوٹ رہی تھی جو اُسے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے، اس وقت وہ بالکل قابو سے باہر تھی اور مکمل طور پر حواس سے بیگانہ۔ پے در پے صد مات نے اُس کے حواس ختم کر دیئے تھے۔

"کم آن یارا اسبجا لو خود کو، بھابی کو لے کر فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ کب وہ بگ ڈیل آ جائے اور معاملہ ہاتھوں سے نکل جائے، بھروسہ نہیں ہے، تم جتنی جلد ہو سکتے یہاں سے ہلکا اس شہر سے اس ملک سے نکل جاؤ، چند سالوں میں معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو لوٹ آنا۔" کپٹین ریاض اُس کے نزدیک آ کر سنجیدہ و مگر منہ لہجے میں گویا ہوا۔

"یہ دوستی ہے تمہاری، مجھے بزدلی کا سبق پڑھا رہے ہو۔" اُس اُس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ کرن کو وہ کار میں بٹھا چکا تھا۔

"تم مجھے عزیز ہو خود سے بڑھ کر اور نہیں چاہتا کہ تمہیں معمولی سی بھی خراش آئے، دراصل حالات کا تقاضہ یہی ہے۔ ہاگ

خطرناک ہوتا ہے اور اگر زخمی ہو جائے تو اپنا بدلہ ہر ممکن طریقے سے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ تم نے برہان لغاری کو سرعام گھائل کیا ہے۔ اُس کی عزت، اُس کی شان و شوکت، نام و خانمانی شجرے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ وہ ہزاروں ناگوں سے بھی زیادہ خطرناک بن چکا ہے۔ وطن چھوڑ دینا، بزدلی نہیں، دانش مندی ہے۔ دیکھو زخم ابھی تازہ تازہ ہیں تو درد و تکلیف بھی حد سے سوا ہوگی، جیسے جیسے زخم بھرتے جائیں گے، درد و تڑپ میں کمی آتی جائے گی اور رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے، زخم بھر جائیں گے، درد و رنج ہو جائے گا، بس صرف ہاتی بچیں گے تو نشان اور نشان صرف یاد دلاتے ہیں، درد نہیں دیتے، پھر بھولی بسری یادوں سے کون قیامت برپا کرتا ہے۔“ کینٹن ریاض نے اُسے تمام اونچے اونچے سے آگاہ کر دیا تھا۔

”تمہاری محبت کا بے حد شکر یہ مگر یاد رکھنا تمہی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا، اوکے اجازت دو، سجاد اکل کا بھی میری جانب سے شکر یہ ادا کر دینا۔“

کینٹن ریاض سے ہاتھ ملاتے ہوئے اُس نے سرسری لگا ہوں سے اُس طرف دیکھا تھا جہاں سجاد منصور وائل کاروں کی مدد سے منال کو کار میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح اُن پر حملے کر رہی تھی۔ اُس کی کھٹی کھٹی آوازیں، نوپنے، کانٹے کا انداز چہرے سے برستی و شست ثابت کر رہی تھی، وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اُس نے فوراً آنکھوں پر ڈارک گلاسز لگا لیے تھے اور کار کی طرف بڑھ گیا جہاں کرن فرٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے گردن خاصی جھکا رکھی تھی۔ منال کی طرف اُس سے دیکھنا نہ جاسکتا تھا۔

اس نے ہنسا کچھ کہے کار اشارت کر دی تھی اور اُن کے پیچھے دوسری گاڑیاں بھی پرنیکشن کے خیال سے روانہ ہوئی تھیں جنہوں نے اس طرح گاڑیاں رکھی تھیں کہ آگے پیچھے وہ گاڑیاں تھیں اور درمیان میں اُن کی کار یہ سب احتیاطی تدابیر کے تحت کیا گیا تھا۔ اُن کو منزل مقصود پر پہنچا کر گاڑیاں واپس چلی گئی تھیں۔

”کرن! ہمیں یہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد لکھنا ہوگا، جو کچھ ہوا اور جو اب ہو سکتا ہے اس حقیقت کا ادراک آپ کو مجھ سے زیادہ ہوگا، آپ سمجھ رہی ہیں نا جو میں کہنا چاہ رہا ہوں؟“ کار ایک شان دار، بلند و بالا عمارت کے قسمت میں کھڑی تھی۔ اُس ونڈ اسکرین پر نگاہ جمائے نرم لہجے میں اُس سے مخاطب تھا۔

ایک گھنٹے قبل منال سے بات کرتے وقت جو درشتی، تلخی و بربریت اُس کے چہرے اور لہجے میں تھی وہ مفقود ہو چکی تھی۔ اُس کا چہرہ اب ساٹھا تھا، ہر قسم کے جذبات سے عاری و بے نیاز۔ گلاسز اتار کر وہ رکھ چکا تھا۔ اس وقت اُس کے چہرہ پر سب میں نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں۔ سرخ سرخ انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی مضطرب آنکھیں، جن میں شاید جھوٹی دفری محبت کا خون سرخی بن چکا تھا۔ جو اب کرن کی کھٹی کھٹی سسکیوں کی آواز نے اُسے چونکا ڈالا تھا۔

”کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہیں؟“ وہ اُس کی طرف دیکھتا ہوا پریشانی سے گویا ہوا مگر کرن نے کوئی جواب نہ دیا، وہ اسی طرح چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے بے آواز رو رہی تھی۔

”پلیز..... پلیز رو نہیں۔“ اس کی سمجھ نہیں آیا کس طرح اُسے تسلی دی، خاموش کروائے جو اس پر گزر رہی تھی اس کا مکمل تو نہیں مگر کچھ احساس اسے بھی تھا۔ لڑکی کا اس طرح سب کو چھوڑ آنا وہ بھی اُس وقت جب بارات گھر میں موجود ہو کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بے شک وہ عروسیوں و نارسائیوں میں پل کر جوان ہوئی تھی باپ کے خالمانہ، مختصر اندہ سلوک نے اسے عظیم مزاج و سر پھری بنا ڈالا تھا، لیکن بے غلوس محبت، بے لوث چاہت اور خیال کرنے و اپنا بگھنے کا احساس اُسے ملتا تو وہ جہاں جذبیوں کو ترسی ہوئی تھی، اُس کی حیات کو جب یہ جاوداں کرنے والے جذبے ملتے تو وہ سب فراموش ہو جاتا، خواہ پیاس صدیوں کی ہو چند بوند امرت کے اس کو سیراب کرنے کو کافی ہوتے ہیں۔ پیار کی ایک نظر نظرت کے بارو کو فنا کر ڈالتی ہے۔ محبت چنانوں سے مضبوط، زمین سے وسیع تر ہے مگر باپ کے ہاں اس کی تشنگی حد سے سوا ہو گئی تھی۔ محبت شفقت کے خاکستر گلستان میں غنرت، عقارت و سفاکی کے کانٹوں سے اُسے لہو لہان ہونا پڑا۔ قدم قدم ذلت و تذلیل کے طوق اس کے گلے میں ڈالے گئے تھے۔ اُس کی ماں کے اور اُس کے کردار میں نشتر زنی کی گئی تھی اور آخر میں اُس کی باپ کی عمر کے آدمی کے پلے اُسے اس لیے باندھا جا رہا تھا تا کہ کل کو وہ جانیدا میں سے اپنا حق نہ مانگ بیٹھے۔ عمران مرزا جو از حد عیاش طبع و بد فطرت شخص تھا۔ جس کی کئی بیویاں اُس کی اذیت پسندی کا شکار ہو کر مر چکی تھیں۔ شراب و شباب کی محفلوں کا وہ شیدائی تھا، نہ معلوم کتنی لڑکیوں، عورتوں کی زندگیاں وہ تباہ کر چکا تھا۔ یہاں لغاری اُس کی پوری بشری سے واقف تھے۔ اس کے باوجود وہ کرن کے ساتھ اس کی شادی پر تیار تھے۔ ان حالات نے اُس کے اندر ایسا غم و غصہ بھرا کہ وہ انہیں مزادینے کے لیے اس ناپسندیدہ و انتہائی اقدام کو انجام دینے سے نہ ہچکچاتی تھی۔ اب غصہ ٹھنڈا ہوا۔

حفل لہکانے پر آئی، شہور نے جاگ کر انگڑائی لی تو اُسے محسوس ہوا جو کچھ وہ کرائی ہے، وہ مناسب تھا یا نہیں؟

”لیک اٹ ایزی، جو ہوتا تھا وہ چکا شاید..... یہ اسی طرح ہونا تھا، چھتاوے ملال، ڈکھ ورنج، سر تیس وراثتیں یہ موسموں کی طرح بدلتی رہتی ہیں۔ آپ پہلے مر طے میں ہی بہت ہار چکی ہیں تو آگے کے کٹھن مراحل کس طرح عبور کریں گی؟“ اُس نے دائیں ہاتھ سے اُس کا جھکا ہوا چہرہ اوپر کیا اور اُس کے اندر بجلیاں سی گونڈ گئیں۔

یہ وہی چہرہ تھا

وہی خدو خال

وہی قاتل نقوش و جا زبیت کا سحر انگیز انداز

وہ منال سے ملتی تھی، مگر اتنی زیادہ مماثلت نظر نہ آتی تھی مگر اس وقت اُس کا ہر نقوش مکمل طور پر منال کا عکس چرائے ہوئے تھا۔

اُس نے جب بھی اُسے دیکھا، سادہ لباس و میک اپ اور جیولری کے بغیر اب تو وہ بنا ڈنگھار کے ہتھیاروں سے عروسی جج و جج سے حشر بردار کرتی لہو لہو منال لگ رہی تھی۔

اُس نے ایک نگاہ ڈالی تھی

پھر جھکا نہیں سکا تھا۔

کرن نے اُس کی نگاہیں اپنے چہرے پر محسوس کیں تو رونا بھول کر گھبرانے لگی، اس کی جھکی ہوئی نگاہیں مزید جبک گئی تھیں۔  
 ”مجھے تمہارا ساتھ چاہیے، جیون کے اندھیرے تمہاری وفا کی روشنی سے منور ہوں گے تو میں ادھر رہتا ہوں۔“  
 ”گا۔۔۔ وہ اُسے شرماتے دیکھ کر سیدھا ہویٹھا تھا اور اُس کا مخروڑی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھیرے سے دباتے ہوئے بولا۔

☆.....☆.....☆

حزہ راحیلہ بیگم کے ساتھ ماڑہ آئی کے ہاں آگیا تھا جہاں اُن کا استقبال بڑا تھاکا طریقے سے کیا گیا۔ حزہ انہیں سلام کر کے  
 صوفے پر بیٹھ گیا۔ راحیلہ اور ماڑہ درمیانی صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

”عاصم اور صہ نہیں آئے؟“ وہ پرہلی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے پوچھیں۔

”صہ تو آج کل اسپتال کا ہی بن کر رہ گیا ہے۔ ڈے نائٹ ڈیوٹی لگ رہی ہے اُس کی راتوں کو تو سمجھو وہ گھر میں ہوتا ہی نہیں،  
 دن ہوتا ہے تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر نماز کے اوقات میں جانتا ہے، کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں ہوتا۔ بس سونا، سونا اور اپنے وقت پر تیار  
 ہو کر چلا جاتا ہے۔ میں اُس کی صورت ڈھنگ سے دیکھنے کو ترس گئی اور عاصم کے موڈ کو تو تم جانتی ہو اگر ایک بار کسی کام کو مان کر دیں تو پھر  
 ہاں نہیں کرتے۔ بعد میں آنے کا کہہ رہے تھے۔“

”چھوڑیں باجی! کوئی بات نہیں اُن کا اپنا گھر ہے جب چاہے آئیں، مگر کے دروازے اُن کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ حزہ  
 نے اپنی خالدہ کے لیے نائم نکالا، یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔“ وہ حزہ کی جانب دیکھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

حزہ کی طبیعت مکدر ہو کر رہ گئی، وہ اس محبت اور خصوصی عنایات کے پس منظر سے واقف نہ ہوتا تو محبت و اپنائیت کے ان  
 مظاہروں کو خوش نصیبی سمجھتا مگر اُن کی محبتوں میں پنہاں غرض، اپنائیت میں پوشیدہ مفاد نے اُسے ہزارا کر ڈالا تھا جس کو چھپائے وہ خاموشی  
 سے اُن کی گفتگو سن رہا تھا، بغیر کسی اچھے جذبے کے۔

”سچ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے اور مجھ سے زیادہ مبہوش خوش ہے۔ رات سے ہی کھانے کا منہج ترتیب دے چکی تھی۔ آج سارا دن  
 ہو گیا اُسے کچن میں کام کرتے ہوئے، کہہ رہی تھی تمام ڈشز اپنے ہاتھ سے بناؤں گی۔“ وہ بیٹی کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، ماشاء اللہ ماڑہ! مبہوش تمہاری اکلوتی بیٹی ہے مگر سعادت مندی و سکھراپے میں اس کو ہزاروں لڑکیوں پر سبقت  
 حاصل ہے بھلا آج کل کی لڑکیوں کو کہاں چولہے ہانڈی سے رغبت ہے۔“

”اکلوتی بیٹی کی تربیت بہت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے اور میں نے مبہوش کی تربیت میں کوئی کمی، کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔“ نہ معلوم  
 کب تک مبہوش نامہ نشر ہوتا کہ ملازمدار نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو سب سے پہلے حزہ کھڑا ہوا تھا۔

کھانے کی میز بہت خوب صورتی سے آراستہ کی گئی تھی۔ تازہ پھولوں کی دل کش سجاوٹ نے آنکھوں پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ کھانا  
 پُر تکلف و مزے دار تھا۔

”جگ جگ، بہت عرصے بعد اتنا مزے دار کھانا کھایا ہے، تمہارے ہاتھوں میں اپنی ماں سے زیادہ ڈانٹ ہے۔ دلوں پر راج کرو گی۔“ راحیل نے مہوش کی پیشانی چومتے ہوئے بیک سے پیک شدہ گنٹ نکالا اور اسکی جانب اشارہ کرنے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”یہ تمہارا گنٹ ہے۔“

”جھینکس خالہ جانی! آپ اتنی تعریفیں کر رہی ہیں مگر مزہ نے کوئی ایک لفظ تعریف کا نہیں کہا ہے۔“ وہ گنٹ پکڑتے ہوئے دور کھڑے مزہ کی جانب دیکھتے ہوئے شکایتی انداز میں بولی۔

”اہل پائی اور فروٹ کسٹرز بہت ٹیٹی تھے۔“ اُسے اخلاقا کا بولنا پڑا۔ اُس کے سپاٹ انداز پر مہوش بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”آپ تعریف تو ایسے کر رہے ہیں جیسے کوئی گن پوائنٹ پر آپ کو مجبور کر رہا ہو۔“ وہ سمجھ دار تھی، اُس کا انداز بھانپ گئی تھی۔

”ارے..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ جھینپ گیا۔

”مہوش! مزہ کو اپنا کپیوٹر دکھاؤ، پچہ تھا بور ہو رہا ہے۔“ وہ حقیقتاً اُن کی سنگت میں سخت بوریت محسوس کر رہا تھا، مہوش کے کہنے پر اٹھ کر اُس کے ساتھ اوپر چلا آیا تھا۔

”مہوش! میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ وہ ٹیبل پر رکھی کرسیوں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتا ہوا استفسار کرنے لگا۔

”کیوں نہیں، آپ کو اجازت کی ضرورت کیوں پیش آئی مزہ! کیا آپ ہمیں اپنا نہیں سمجھتے ہیں؟“ اپنے روم کی جانب بڑھتی ہوئی مہوش ٹوک کر حیرانگی سے گویا ہوئی۔

”بات بیگانگی واپنائیت کی نہیں ہے اخلاق کی ہے۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”اوکے، کیا آپ میرے روم میں نہیں چلیں گے..... آئی مین کپیوٹر دیکھنے۔ ممانے کہا ہے۔“ مزہ کی از حد سنجیدگی نے اُس جیسی بولڈ کونفیڈنٹ لڑکی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

”نہیں۔ مجھے یہاں اچھا محسوس ہو رہا ہے۔“

”اوکے، ایڈیوٹس، میں ابھی کولڈ کانی لے کر آتی ہوں۔“ وہ کچھ جھنجھلائی ہوئی سی نیچے چلی آئی اور دبے قدموں سے ممانے کے بیڈ روم میں گھس کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی کہ کہاں کوئی کمی رہ گئی جو مزہ کو اُس کی طرف ایک نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہ ہوا۔

ریڈ ٹراؤزر پر اسکاٹی بلو اور ریڈ ستاروں، موتیوں کا دیدہ زیب کام تھا جس کے گہرے کنس سے اس کی سفید گداڑ چنڈ لیاں کسی حد تک نظر آرہی تھیں۔ شارٹ شرٹ ریڈ اور اسکاٹی بلیو کلر میں تھی، اُس پر بھی ویسے ہی کڑھائی بہار دکھارہی تھی جس کی استخوانوں کے کنس بھی پورے بازو عریاں کر رہے تھے۔ کانوں میں ناپس جھلملا رہے تھے، گلے میں تصویر نما چوڑا سا میکس اس کی گردن کی خوب صورتی بڑھا رہا تھا۔ گولڈن کرنی ہال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور چہرے کا میک اپ بھی جوں کا توں تھا، کوئی کمی اُسے نظر نہ آئی تھی۔

پھر بھی وہ ایک نظر کی مستحق نہ ٹھہری تھی۔ اس کی امیدوں پر اوس کرنے لگی۔ مزہ جیسے وجیہ اور شان دار شخص کے لیے اُس نے

بڑے دل فریب سہانے خواب دیکھ ڈالے تھے جن سے دست برداری کسی طرح بھی منظور نہ تھی۔ امید کی بھتی شمعوں کو اُس نے از سر نو آگ دکھائی۔ ڈریٹنگ نچل پر رکھی لپ اسٹک سے ہونٹوں کو مزید گہرا کر کے وہ باہر نکل گئی تھی۔ مہوش کے جاتے ہی حمزہ نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

موسم بدل رہا تھا، سردی کی آمد آتی تھی، گرمی رخصت ہو رہی تھی، دن میں سورج تپش پھیلاتا تو رات میں ہوائیں شہنشاہ بچھانے لگتی تھیں۔ اس وقت بھی ہوا میں ہلکی خشکی تھی جو جسم کو عجیب سی طمانیت بخش رہی تھی۔ ٹیس کی ریٹنگ کے ساتھ رکھے گلوں میں رات کی رانی کے پھول بے شمار کھلے ہوئے مسکور کن خوشبو پھیلا رہے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ اُس کے وسط میں پورا چاند جگمگا رہا تھا۔ اُس کے ارد گرد بھی تاروں کی بساط میں ستارے چمک رہے تھے۔

بڑا تازہ مہوش سماں تھا۔

آدھی رات، پورا چاند، رات کی رانی اور مہکی مہکی فضا میں اُس کے اندر سنانے کو بچنے لگے تھے۔ دل دو ماغ پر چھایا وہ عکس چاندنی کے ظہار میں ڈھلنے لگا تھا۔

”مجھے معاف کر دو، معاف کرو مجھے، کیوں چلی آتی ہو تم میری بے بسی کا تماشہ دیکھنے؟ میری تپ، میری بے قراری سب میرے لیے ہیں، میرا روگ ہے، المیہ ہے میری زندگی کا، جو صرف میری میراث ہے، میری پر اپنی ہے، جب میری زندگی سے نکل گئی ہو تو میری روح سے بھی نکل جاؤ، میرے دل سے بھی نکل جاؤ، میرے خوابوں سے، میرے خیالوں سے، میری سوچوں سے، میرے تصور سے، میری دھڑکنوں سے، میری لگا ہوں سے نکل جاؤ..... نکل جاؤ، مجھے جینے دو، مجھے مرنے دو۔“

کتلی ظالم ہو تم!

کتلی سفاک ہو تم!

نہ جینے دیتی ہو نہ مرنے

نہ اپناتی ہو، نہ ٹھکراتی ہو، نہ آتی ہو، نہ یادوں سے جاتی ہو، کیا کروں میں؟ کہاں جاؤں میں؟ تم نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا۔“ چاند کی گولائی میں کرن کی صورت پوری طرح اتر آئی اور اُس کی روح میں گھائل تار بڑی طرح سے جھنجھلا اٹھے اور چیخ اٹھا۔

”حمزہ حمزہ کیا ہوا؟“ مہوش اُسے بڑ بڑاتے دیکھ کر تیزی سے اوپر آ کر مخاطب ہوئی۔

مہوش کی آواز اُسے حواسوں میں لے آئی تو اُس نے چونک کر دیکھا چاند صاف تھا، گویا اُس میں کوئی عکس نمایاں نہ ہوا تھا۔ یہ سب تو اس کا تصور تھا جو کبھی چاند میں، پودوں میں، پھولوں میں، برتنوں میں تو کبھی پانی پیتے ہوئے گلاس میں مجسم ہو جایا کرتا تھا۔ پھر سب کچھ فراموش ہو جاتا، بس پردہ چلا جاتا بالکل اسی طرح۔

”اوہ..... سو..... سو، شاید میں سو گیا تھا۔ مجھے عادت ہے نیند میں باتیں کرنے کی۔“ وہ کھڑا ہوتا ہوا خجالت آمیز لہجے میں بولا۔

”یہ خیند میں باتیں کرنے والی عادت تو بڑی انٹرنٹنگ ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی کوئی پرائیویسی نہیں رہتی جو کچھ وہ دن بھر کرتے ہیں، وہی رات بھر خیند میں دہراتے ہیں۔ رینلی آپ کی دائف کے تو مزے ہوں گے۔ اس سے چھپا کر آپ کوئی انفیئر چلائیں گے بھی تو وہ سب جان لے گی۔“ مہوش ہنسنے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں تم سے عمر میں کافی بڑا ہوں، پلیز مجھے نام سے نہیں پکارا کرو۔ میرے نام کے ساتھ بھائی لگایا کرو۔ مزہ بھائی، چھوٹی بینٹس، بڑے بھائیوں کو نام سے پکارتی اچھی نہیں لگتی ہیں۔“ اس کی چھیڑ چھاڑ کو نظر انداز کر کے وہ نرمی سے گویا ہوا۔

”مزہ..... بھائی!“ وہ پھر زور سے ہنسی تھی۔ ”کیا آپ کو معلوم نہیں ہے ہمارے بڑے ہمارے لیے کیا پلان کیے بیٹھے ہیں۔ وہ کیا خواہش کا ارادے رکھتے ہیں؟“

”ضروری نہیں بڑوں کے ارادوں کی زنجیریں ہم باندھنے پر مجبور ہوں، کچھ فیصلے سب کے ارادوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں از خود ہی ترشی و ناگواریت درآئی تھی۔

”میں نہیں سمجھی؟“ وہ ہکا بکارہ گئی اس کی صاف گوئی پر۔

”تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ وہ اُسے حیران و پریشان چھوڑ کر نیچے آ گیا اور پھر راحیلہ کو لے کر گھر روانہ ہو گیا تھا۔

اُس کے اندر عجیب سی کھلبلی مچ گئی تھی اور احساسات اُن دیکھی آج چھلکانے لگے تھے، کچھ ہونے کا احساس اُجاگر ہوا تھا مگر ادراک کے دروازے مقفل تھے، آگہی شعور تک پہنچنے نہ پاری تھی، بس بے چینی تھی، بے کئی تھی جو اُسے متوحش کیے ہوئے تھی۔

جب تجھے دیکھنا چاہوں

تجھے جب سوچنا چاہوں

شام کے گلابی آئینل میں

رنگوں کو تسخیر کروں

لمحے پلکوں سے زنجیر کروں

تصویر میں تیری تصویر کروں

کچھ لمحے تیری یادوں

تیری باتوں کی خوشبو سے

خود کو مہکتا

اور پھر!

آگ میں سلگتا محسوس کروں۔

☆.....☆.....☆

انس کی باتوں نے اُسے خاصا حوصلہ بخشنا تھا، ڈھارس بندھائی تھی، وہ اُس کے ساتھ اُس اپارٹمنٹ میں چلی آئی جو اسی عمارت میں سکیٹیڈ فلور پر تھا، انس اس کی توقع سے بڑھ کر ثابت ہوا تھا۔

ڈیرنگ روم میں اُس کے سائز کے کئی سوٹ ہنگ تھے، شوئر ایک میں سینڈلزمو جو تھیں، اس نے جلدی جلدی زیورات سے خود کو آزاد کیا، ڈریس پہنچ کیا، سینڈل کے بدلے ایک آرام دہ چپل کا انتخاب کیا، پھر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی، خوب رگڑ رگڑ کر منہ ہاتھ دھوئے اور بالوں میں برش کر کے باہر آگئی، سامنے انس بیٹھا تھا۔ سینئر نیپل پر کافی اور دیگر لوازمات سجائے اُس کے بڑھتے قدم رک گئے، فطری حیاتی جو آڑے آئی تھی۔

”آؤ نہ وہاں کیوں رک گئیں، دراصل آج سارے دن سے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا اور یقیناً آپ نے بھی کھانے کو اس وقت طبیعت چاہ نہیں رہی ہے، اس لیے میں نے چیز سینڈل ہی بنا لیے ہیں، لیکن بخشش بھی ہیں اور پائن اپل ایک بھی۔ کم فاسٹ، کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ اُس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی بچے کو بہلا کر کھانے پر راضی کر رہا ہو، وہ جھجکتی ہوئی آکر صوفے پر بیٹھ گئی، اس نے بے حد اصرار سے ہر چیز کھلائی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد اُن کا سفر دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ اس بار اُس نے کار ڈرو سٹی لٹی تھی۔ اپارٹمنٹ میں بھی زیادہ دیر نہ لگائی تھی۔ وہ تمام احتیاطی تدابیر کے تحت کام کر رہا تھا۔

وہ جانتا تھا، برہان لغاری کے رابطے کم وسیع نہیں ہیں۔ انڈور سوخ، دولت کے لالچ یا دھونس و دھمکی سے وہ ان تک رسائی ضرور حاصل کرے گا۔ بڑوں کے ذہن کھوجنے کی نادانی وہ ہرگز نہیں کرے گا، اس کام کے لیے وہ ان اہل کاروں کو استعمال کرے گا جن سے کسی نہ کسی طرح اسے معلومات فراہم ہو جائیں گی اور پھر وہ مذاہب بن کر ٹوٹ پڑے گا جس میں سب سے زیادہ خطرہ کرن کی جان کو تھا اور وہ کسی طرح بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کرن کو معمولی سی بھی رک پھینچے۔

”ہماری زندگی کی شروعات بھی کس انداز میں ہوئی ہیں، شاید ہی کسی کی شادی اس طرح ہوئی ہوگی کہ پہلے ہی سرطلے پر سفر در سفر پیش آرہے ہیں۔“ کارڈ رائیو کرتے ہوئے اُس نے گنگو کا آغاز کیا۔ اُن کی گاڑی تیزی سے رات کی سیاہی میں گم تھی۔

”مجھے یقین ہے ہمارا سفر درست راستے پر گامزن ہوا ہے۔ منزل بھی ہمیں جلد ہی مل جائے گی۔ میں جانتا ہوں آپ کے دل میں میرے لیے خاصی بدگمانی و بے اعتمادی ہوگی اور میرے خیال میں اگر آپ یہ سوچتی ہیں تو غلط بھی نہیں ہے۔ میری کتاب حیات کے ورق آپ کی نگاہوں سے اوچھل رہے نہ پوشیدہ۔ روز روشن کی طرح سب کچھ آپ پر منکشف ہے اور کون لڑکی ہوگی جو اپنے شریک سفر کے متعلق ایسا کچھ برداشت کرے جو کسی لڑکی کے ساتھ وابستہ ہو۔“ وہ بہت فاسٹ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اُس سے گنگو بھی کرتا جا رہا تھا، نہ معلوم خود کو بہلا رہا تھا یا اُس کو تسلیم دینے کی کوشش۔

”آپ کیوں شرمندہ ہو رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں صدق دل سے کہتی ہوں، مجھے آپ کے ماضی سے کوئی سروکار



نہیں ہے۔ نہ آج اور نہ آئندہ۔ آپ مجھ سے اپنے ماضی کے بارے میں کوئی لفظ نہیں کہیں گے۔ مجھے فخر ہے آپ پر اور اپنی قسمت پر کہ مہربان ہوئی تو میرا آئینہ کم پڑنے لگا ہے۔“ انس کو بے حد شرمسار اور نچیدہ دیکھ کر اُسے شرو حیا کے گھونٹ کو سر کا کر کہنا ہی پڑا تھا۔

”میں آپ کے متعلق سب جانتی ہوں، آپ کے روز و شب میرے ظلم میں تھے۔ آپ کی مصروفیت، مزاج، کردار سب سے میں واقف تھی مگر میری کتاب ماضی کے کسی ورق سے آپ کو آگاہی نہ تھی، نہ آپ نے کبھی جاننے کی جستجو کی اور مجھ پر اور میری ماں پر یقین کر بیٹھے۔ عورت کے لیے اس سے بڑا اعزاز کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ اُسے پاک ہانزی و وفا داری کی سند دے کر معتبر کیا جائے، آپ نے میری ماں کے کردار و وفا کی تعریف کر کے میرے دل سے وہ تمام دوسو سے دائیہ زائل کر دیئے ہیں جو کل تک میرے اندر موجود تھے۔ عورت کی اصل میراث عزت پانا ہے جو مجھے دے کر آپ نے سرخرو کر دیا ہے۔ میری آپ سے بھی التجا ہے کہ کبھی بھی اس اعزاز میں کمی نہ کیجئے گا۔“ اُس کی آواز میں آنسو قاب آ گئے۔

”آپ کی عزت میں کرتا ہوں اور آخری سانس تک کرتا ہوں گا۔“ وہ مسکرا کر نہ عزم لہجے میں بولا۔

”مگر جی کیسی ہیں؟ بہت مس کیا ہے میں نے انہیں۔“

”بے حد کمزور ہو گئی ہیں آپ کے جانے کے بعد تو بالکل ہی خاموش رہنے لگی ہیں۔ غصہ چڑچڑاپن سب بھول گئی ہیں۔“

”میں اُن کی خدمت کرنا چاہتی ہوں، بالکل ماما کی طرح انیسیت ہو گئی ہے مجھے ان سے۔“ ماں کا نام اُس کے لبوں سے نکلا اور بھر ضبط کے بندھن کمزور پڑنے لگے۔ ماں اکائات کا حسین ترین تھمہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ماں نور ہے، روشنی ہے، سکون ہے، قرار ہے، اُس کی مسکراہٹ میں اللہ کا نور دکھائی دیتا ہے۔ اُس کی دعاؤں میں جنت کے چمنستانوں کی خوشبو مچکتی ہے وہ ہے تو سب کچھ ہے، ورنہ پھر بھی سب کچھ ہوتا ہے، دنیا جی رہتی ہے اس کی روانی میں کی نہیں آتی، اس کے میلے جمیلے ایسے ہی خود فریبی میں جتلا رکھتے ہیں، فرق صرف اُن کو پڑتا ہے جن کی دنیا و چاہتوں کے چمن بہاروں سے یکدم خزاؤں میں بدل جاتے ہیں پھر کبھی نہ بدلنے کے لیے۔ ماں کی جدائی دل میں پھانس کی طرح چھو جاتی ہے، جس کی ککک ہمدردی کی صورت بے قرار و متعطل رکھتی ہے۔ کار میں ایک دم خاموشی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں غرق تھے۔

کرن ماضی کے جھولے میں گول گول چکر لگا رہی تھی تو وہ سوچ رہا تھا گرنی کو کس طرح اس ملک سے باہر جانے پر راضی کرے، اسی بیٹے ان کو نیویارک روانہ ہونا تھا۔

ڈر صاحب کا اصرار تھا کہ اُسے کچھ عرصے ملک سے باہر گزارنا ہے، کچھ بزنس کے معاملات بھی ایسے تھے اور کچھ فٹنس حالات کے باعث بھی انہیں یہی طریقہ کار سو مند محسوس ہوا تھا۔ سال کے بارہ مہینوں میں سے دس مہینے ملک سے باہر گزارنے کے عادی انس کو یہ فیصلہ قطعی پور نہ لگا تھا۔ اُس نے بے حد خاموشی سے نیویارک جانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

اُس کے تمام کاغذات ریڈی رہتے تھے۔ کرن اور مائی سیکنڈ کے کاغذات نئے سرے سے بنے تھے۔ اُن کی بھی تمام کارروائی

کمل ہو چکی تھی۔ محض ویران چند دنوں میں ملنے والا تھا۔ گرینی کسی صورت راضی نہ ہو کر رہی تھی۔ انہیں اپنے وطن کی مٹی سے بے حد پیار تھا، وہ اسے چھوڑ کر جانے کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کے بار بار اصرار پر چڑ کر بولیں۔

”جبہیں کیا معلوم یہ ملک، یہ زمین، یہ مٹی کس طرح خاص ہوئی ہے، تم ناشکرے و ناقدرے لوگ کہاں قدر کرو گے اس ملک کی، تم نے کھو کر نہیں پایا ہے اسے، جبہیں سب بنا بنا یا مل گیا تو تم کو احساس کیسے ہوگا کہ یہ ملک کس طرح کن قربانیوں کے بعد حاصل ہوا، اس کی حقیقت ہمارے دلوں سے پوچھو، کس طرح آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم اس پاک سرزمین کو چھو سکے تھے اور آج تم کہتے ہو میں اس زمین کو چھوڑ کر غیروں کے آسرے پر چلوں جو مسلمانوں سے بغض رکھتے ہیں، حسد کرتے ہیں، رات و دن جن کا کام صرف مسلمانوں کے گرد سازشوں، نظرتوں کا دائرہ سخت سے سخت کرنے کا ہے، نہ بابائے، مجھے اپنی مٹی سے ہدائی برداشت نہیں، زندگی کی ڈور ویسے بھی کزور سے کزور پڑتی جا رہی ہے۔ کب ٹوٹ جائے، کوئی بھروسہ نہیں، اپنے وطن میں مردوں گی، کاندھادینے والے اپنے لوگ تو ہوں گے۔“ گرینی کی اپنی محبت تھی، اپنی منطلق تھی جس سے دور ہونے کو وہ ذرہ بھر تیار نہ تھیں جیسے، جیسے اُن کی صحت گر رہی تھی وہ یا تو خاموش رہتیں یا ماضی کو دہراتے ہوئے اُن لوگوں کو یاد کرنے لگتیں جو ہزارے میں شہید ہوئے تھے، اُن کے خاندان کے کافی لوگوں نے جانیں قربان کی تھیں۔

”مائی سیکینہ کہاں ہے؟ اُس کو تو میں بھول ہی گئی تھی۔“ اُس کے ذہن میں مائی سیکینہ کا خیال آیا تو وہ چومک کر بولی۔

”ابھی ہم وہاں ہی جا رہے ہیں۔“

”کتنی دیر کا سفر ہے؟“

”تھک گئی ہیں؟“

”نہیں۔“ اُس کے انکار میں مسکھن نمایاں تھی جو اُس کے احساسات سے مخفی نہ رہ سکی تھی۔

”سفر طویل ہے آپ سو جائیں، تین سے چار گھنٹے لگ سکتے ہیں۔“

”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ مرد دیا بولی، اُس مسکرا کر رہ گیا، لیکن وہ زیادہ دیر خود پر قابو نہ پاسکی تھی اور سو گئی تھی، جسٹانی مسکھن

سے بڑھ کر ذہنی مسکھن انسان پر حاوی ہو تو وہ بے حال و نیم مردہ کر دیتی ہے۔ وہ مسلسل ذہنی خلفشار میں مبتلا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

لغاری ہاؤس میں صبح کا سورج عام صبحوں کی طرح طلوع ہوا تھا۔ ملازما میں مستعدی سے ناشتے کی تیاریوں میں مصروف تھیں مگر عام دنوں کے مقابلے میں آج ان کے چہروں کی تروتازگی غائب تھی اور خوف کی زردی اُن کے چہروں پر چکنے لگی تھی، ٹھکر کے نقل ان کے منہ پر لگ گئے تھے۔ کل رات جو کچھ ہوا تھا، اُس کے حقیقی اثرات اُن کے مالکوں پر جو پڑے سو پڑے مالکوں سے زیادہ پریشان کن صورت حال ان کے لیے تھی، وہ سوچ کر دہشت زدہ تھے کہ اب اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ کیونکہ یہ بات تو سب پر ہی عیاں ہو چکی تھی کہ ان کے ساتھ تعاون کرنے والی مائی سیکینہ تھی۔ مائی سیکینہ..... اس حویلی کی سب سے پرانی اور سب سے قابل اعتبار ملازمہ جس پر اس گھر کے

تمام حکمران آنکھیں بند کر کے یقین کرتے تھے۔ مائی سیکنہ کی نمک حرامی و بد دلخامی نے یہاں کے مالکوں پر جو ستم کیا سو کیا مگر ساتھ میں یہاں کے ملازموں کو بھی وہ زندہ و زور گور کر گئی تھی۔ عزت و ذہنی کے لائق پہلے ہی وہ سمجھے نہیں جاتے تھے، اب تو وہ قدموں کی خاک سے بدتر تھے۔

برہان لغاری کل رات سے ایک لمحے کے لیے بھی سکون سے نہ رہ سکے تھے۔ پہلی بار وہ گلست سے دو چار ہوئے تھے اور اس طرح کہ سنبھل نہیں پارہے تھے۔ صد مات بھی تو پے در پے تھے۔ ایک بیٹی نے اپنی پسند سے گھر بسا لیا تھا تو دوسری نے بے وقوفی سے سب کچھ گنوا دیا تھا اور اب ہوش و خرد سے بیگانہ ہاسٹل میں پڑی تھی۔ ان صد موموں و حقیر و بے عزتی سے آشنا کرنے والا صرف ایک شخص تھا۔

انس مدثر۔

جس کی رگوں میں خون کے بجائے زہر دوڑتا تھا، جس نے اُن کی عزت اور وقار کی دھجیاں سرعام بکھیر دی تھیں، وہ جو ان کو کمر اٹھا کر چلا کرتے تھے، آنکھیں اٹھانے کے قابل نہیں نہیں چھوڑا تھا۔

”برہان!“ والدہ حضور کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر کرسی سے اٹھے تھے۔

”آپ..... آپ نے کیوں زحمت کی والدہ حضور؟“ وہ آگے بڑھے تھے اور بے حد ادب و احترام سے اُن کا ہاتھ تمام کر بیٹھ کر بیٹھا تھا۔

”روز تم ہمارے کمرے میں آتے ہو، آج ہم آگئے، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیوں رنج کرتے ہو، جو ہوا سو ہوا، ہمیں پروا نہیں ہے۔ بدذات ماں کی بدذات بیٹی نے اپنی اوقات دکھا دی ناں آخر..... سانپ کو کتنا بھی دودھ پلاؤ، وہ ایک نہ ایک دن موقع دیکھ کر ڈس لیتا ہے۔ اُس فطرت میں ڈسنا ہے اور وہ ڈس گئی۔ لے گئی انتقام“۔

”وہ کہیں نہیں جاسکتے دونوں، ایک دفعہ فریب دیا جاتا ہے بار بار نہیں۔ میں نے اُسے بے ضرر و بے وقوف سمجھا تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر ایسی پلاننگ کر رہی ہے“۔ اُن کے لہجے میں آگ ہی آگ تھی۔

”مگر کو آگ، مگر کے چراغ سے ہی لگی ہے۔ وہ نمک حرام، وقار فروش مائی سیکنہ، اُس کا ساتھ نہ دیتی تو وہ تو کیا اس کی روح بھی یہاں سے باہر نہ جاسکتی تھی، پھر سب سے زیادہ لا پرواہی اُس ڈرائیور نے کی جو انہیں چھوڑ کر باہر بیٹھ گیا، بیڑی کے سونے لگانے اور وہ نکاح کرائی، شاپنگ کے بہانے ہمارے منہ پر سیاہی ملنے کے لیے“۔ آج والدہ حضور بھی تمام متانت و بردباری، تحمل و موقع پرستی بھول کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔ برہان لغاری بھو اتھے۔

”میرے خاص آدمی شہر کے ہر گلی، چوراہے پر پھیل گئے ہیں، ایئر پورٹ اور تمام بس اسٹاپس پر بھی نگرانی ہو رہی ہے، وہ کہیں نہیں جائیں گے، چھپنے کے لیے جو ہے قابل بھی نڈل سکے گا۔ کہاں جائیں گے؟ کب تک چھپیں گے؟ کب تک بھاگیں گے؟ موت سے بھی کوئی چھپ سکا ہے؟“۔ برہان لغاری سراپا قہر و غضب بھرے ہوئے تھے۔

”ڈرائیور کے تو ہاتھ پاؤں تڑوا کر پھینکوا چکا ہوں، بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں رہا وہ، اُس کی لا پرواہی و غفلت کے باعث ہمیں یہ دن دیکھنے پڑے ہیں“۔

”کیسے کی اپنے ہاتھوں سے چڑی اتاروں گی اور ایسا عبرت ناک انجام کروں گی کہ کسی ملازم کی آئینہ ایسی نمک حرامی کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔“ سفاک پن میں وہ بیٹے سے بھی بہت آگے تھیں۔  
دروازہ ناک ہوا تھا۔

اجازت ملنے پر برہان لغاری کا دست راست ذکی الدین احمد آئے تھے۔ سلام کرنے کے بعد ہاتھ میں پکڑے چکٹ سے سامان نکال کر سینئر نیبل پر رکھتے ہوئے سودا ہانا انداز میں گویا ہوئے۔

”سرا یہ لباس اور زیورات اپارٹمنٹ سے برآمد ہوئے ہیں۔ اُن کا نام و نشان نہیں ہے، کار بھی پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہے لیکن..... سرا! وہ کتنی بھی چالاکی دکھائیں، سچ نہیں سکتے۔“ برہان لغاری نے چپ چاپ رپورٹ سنی تھی۔ اُن کی نگاہیں کرن کے عروسی سوٹ و زیورات پر مرکوز تھیں۔

کچھ دیر اُسے گھومنے کے بعد وہ آگے بڑھے اور شدید اشتعال میں وہ سب اُٹھا کر نیچے کار پٹ پر پھینکا تھا اور دونوں پاؤں سے وہ سب نرمی طرح روندنے لگے۔  
گویا وہ کپڑے نہ ہوں، کرن ہو۔

والدہ حضور کے اشارے پر ذکی الدین کمرے سے چلے گئے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد وہ جنون کی کیفیت میں جھلا برہان لغاری سے مخاطب ہوئیں۔

”قابو کرو اپنے جذبات، سنبھالو خود کو، نلکے نلکے کے نوکروں کے سامنے ایسا کرنے سے ہماری عزت میں فرق آتا ہے، کمزوری عیاں ہوتی ہے جس سے یہ کم ذات موقع پر قائمہ اُٹھاتے ہیں۔“ اُن کی آواز میں حکم و سرزنش تھی، وہ عمر رسیدہ تھیں مگر نہ اُن کے اعصاب کمزور ہوئے تھے، نہ جوصلے کمزور پڑے تھے۔ واقعی طور پر بے شک پہلی شکست نے اُن کے جواسوں کو منتشر کر دیا تھا مگر اب ملازم کے سامنے برہان لغاری کی جذباتیت نے اُن کی اتنا ظاہر پرستی کی اُن بان کو چھوڑ ڈالا۔

”والدہ حضور! میرے دل کی کیفیت سے آپ ناواقف ہیں میرے.....“

”کون ایسی بد بخت ماں ہوگی جو اولاد کے ڈکھ سے اس کی دلی کیفیت سے باخبر نہ ہوگی، یا پھر تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ہم تم سے الگ ہیں؟ تمہارے ڈکھ سے ناواقف ہیں؟ جو کچھ ہوا اس سے ہمیں صدمہ و دکھ نہیں ملا ہے؟“ وہ اُن کی بات قطع کر کے غصے سے بولیں۔  
”نہیں..... نہیں والدہ حضور! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔“ ماں کے غصیلے تیروں نے انہیں گڑبڑا کر رکھ دیا۔

”بہر حال جو ہوا سو ہوا، ہمیں اپنے گھر میں اُس کا سوگ نہیں چاہیے، کسی بھی طرح سے اُن تینوں کو ہمارے سامنے حاضر کرو، یہ جو تم لوگوں کو موٹی موٹی رقیں کھلاتے ہو، وہ حرام کا مال نہیں ہوتا ہے، جس کو کھا کر وہ ڈکار بھی نہ لیں، کہو اُن سے ہماری مجرم پکڑ کر دیں، اب بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھیں گے۔ اُن کی ناک کے نیچے سب ہو گیا، وہ تماشا دیکھتے رہے اور وہ سجاد حضور پورے شہر کا باپ بنا بیٹھا ہے،

بڑی تم سے دوستی کا دم بھرتا ہے، بہت محبت جتا تا ہے، کیا کیا اُس نے؟..... اگر وہ چاہتا تو وہ اُن کو گولی مار کر کہیں دفن کر سکتا تھا، اپنے مطلب کے لیے بھی تو وہ بے گناہوں کو مار کر اٹکاؤنٹر کا نام لگا دیتے ہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے کچھ قانونی پیچیدگیاں بھی ہوتی ہیں پھر آپ کو معلوم ہے وہ کوئی معمولی حیثیت کا حامل یا چور ڈاکو نہیں ہے۔“  
 ”ارے بس بس رہنے دو، جب ان لوگوں کو اپنا کام کرنا ہوتا ہے تو بڑے بڑے لوگوں کو نہیں چھوڑتے ہیں۔“ والدہ حضور کسی طرح اُن جواز و دلائل سے اتفاق کرنے والی نہ تھیں۔

”آپ بے فکر ہیں، ہمارے دشمن ہم سے بچ کر نہیں جاسکتے، ہم اپنا بدلہ اپنے ہاتھوں سے لیں گے۔“ برہان لغاری کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

”کامران مرزا کو بھی کتنی بے عزتی سہنی پڑی ہے۔ اس کے باوجود وہ خاموشی سے بیٹے اور مہمانوں کو لے کر لوٹ گیا، اگر اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنی آسانی و خاموشی سے نہیں جاتا۔“

”خود سے کم حیثیت و کم مرتبہ لوگوں سے تعلق استوار کرنے سے یہی تو فائدہ ہوتا ہے، ورنہ ہوتے کوئی ذی حیثیت وہ ہم پلہ لوگ تو یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے، سخت دشمنی ہو جاتی۔“

اُسی وقت ملازمہ نے ناشتہ لگنے کی اطلاع دی تو انہوں نے برہان لغاری کو بھی ساتھ چلنے کو کہا جس پر انہوں نے معذرت کر لی تھی۔  
 ”رزق سے انتقام کیوں لے رہے ہو، نر ا طریقہ ہے یہ۔“ والدہ حضور تینبی لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”میری بھوک دیکھاں مرچکی ہے۔“

”مرنا تو ہمارے دشمنوں کو ہوگا اور انہیں مارنے کے لیے بے حد طاقت و قوت کی ضرورت ہے جو خالی پیٹ حاصل نہیں ہوتی ہے، ایسے تم ایک چوہا مارنے کی طاقت بھی نہیں رکھو گے، اُن شیطانوں کو مارنے کے لیے بہت طاقت کی ضرورت ہے، بے حد قوت کی۔“ ان کے پاس اب مزید اٹکار کی گنجائش نہ تھی۔

بھوک پیاس، نیند و آرام جیسے احساسات اُن کے ذہن کے گوشوں سے دور ہو چکے تھے، اُن پر صرف انتقام کا جنون طاری تھا، ماں کی دل جوئی کے لیے وہ اُن کے ساتھ چل پڑے تھے۔

ہلکا ہلکا ناشتہ کر کے وہ باہر نکل آئے تھے۔ سامنے سے ہی ذکی الدین تقریباً بھاگنے کے انداز میں دوڑے چلے آ رہے تھے، اُن کے چہرے پر مسرت آمیز تاثرات تھے۔

”وہاٹ از دانخوز؟“ اُن کے قریب آنے پر وہ گویا ہوئے۔

”گڈنوز سر!“ وہ اطمینان سے گویا ہوئے۔

☆.....☆.....☆

حزہ نے مڑ کر دیکھا، صبر اندر آ رہا تھا۔

کئی دنوں کے بعد آج وہ فریش دکھائی دیا تھا، ورنہ پچھلے کچھ ہفتوں سے وہ گھر سے ہاسپٹل، ہاسپٹل سے گھر کے چکروں میں سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا، وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب بیٹھا تو حزہ بھی متوجہ ہو گیا۔

”کیسی گزر رہی ہے؟“ صبر شوخ ہوا تھا۔

”جس طرح گزرنی چاہیے۔“

”اس طرح نہیں۔“

”اس طرح یا اُس طرح زندگی کا کام گزرنے کا ہے، گزر جائے گی۔“ کرن کے تصورات کے حصار سے وہ کبھی نکل نہیں پایا تھا۔ کیسا عشق تھا جو آگ بن گیا تھا، کبھی نہ بجھنے والی سرد آگ جو اُسے اندر ہی اندر جلا رہی تھی، تڑپا رہی تھی، جس کو جتنا بھی بجھانے کی سعی کرتا وہ اتنی ہی بھڑکتی جا رہی تھی، پھیلی جا رہی تھی، جلاتی جا رہی تھی۔

”وقت گزر جانے کا نام ہے، کرن کی کوئی خبر ملی؟“

”نہیں۔ کس سے ملتی وہ ساری کشتیاں جلا کر گئی تھی، تخت یا تختہ حاصل کرنے والے ایسے ہی جنونی کام کرتے ہیں۔“

”اُس کے مزاج میں سدا سے ایسے ہی فیصلے کرنے کا جنون رہا ہے۔“

”جنون بھی تو کمپلیکس کی ایک برانچ ہے جن کو حق بھیک کی صورت میں ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں، اُن لوگوں ہی سائیکس پیدا ہوتی ہے۔“

”نی الحال تو تم مجھے سائیکس کیس محسوس ہو رہے ہو، کتنی مرتبہ کہا ہے میرے بھائی! گاڑی ہمیشہ توازن سے چلتی ہے، یکطرفہ محبت کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتی ہے، بلکہ سچے عاشقوں کے بارے میں تو سنا ہے نا، کیا ہوا ہے اُن کا انجام، اُن کی محبتیں دو طرفہ دو لولہ انگیز تھیں، بڑی شدت و بڑی قوت والی تھیں مگر انجام کیا ان کا؟ لیلیٰ مجھوں، شیریں فرہاد، کسی بیٹوں، سوئی میمنوال اور کبھی نہ معلوم کتنے عثمان ہیں کہ جن کی محبت کی صداقت کی گواہی جنگوں، پہاڑوں اور دریاؤں نے بھی دی پھر کیوں نہ مل پائے وہ لوگ، کیوں ملن نصیب نہ ہوا انہیں، کیا اُن کی محبت جموئی تھی؟ کیا اُن کے جذبے کو کھلے تھے؟ کیا اُن کی تڑپ بے اثر و معنی تھی جو کوئی کسی کا نہ ہو سکا؟“

دن بدن اُس کی گرتی صحت زندگی سے بے رشتی اور لاپرواہی سب کے لیے تشویش ناک تھی وہ اور عاصم صاحب اُس کی طرف سے بے حد فکر مند تھے۔ پریشان تو راجیلہ خاتون بھی تھیں مگر انہوں نے اس پریشانی کا حل اپنی سوچ و خواہش کے مطابق نکالا۔

اُن کے خیال میں اس عمر کی ایسی کیفیات کا تذکرہ شادی کی صورت میں ہو سکتا ہے، جب اُس پر گھر و گھر والی کی ذمہ داری، پیار و رفاقت کا احساس لاگو ہوگا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اسی لیے پوری طرح سے وہ اپنی بھانجی مہوش کو بہو بنانے کی تیاریاں شروع کر چکی تھیں جس میں ماہرہ کے علاوہ سحرش کی بھی خواہش شامل تھی۔

”میرے بھائی! اُن کی محبت جموئی تھی، نہ جذبے کو، یہ سب نصیب کا چکر ہوتا ہے جس کا ساتھ جس کے مقدر میں ہوتا

ہے، وہی ملتا ہے کرن تمہارا نصیب نہ تھی، تم اُس کے مقدر نہ بن سکتے تھے کہ کاتب تقدیر کا کلمہ کچھ اور ہی تحریر کر چکا تھا۔ سب بھول جاؤ اور نئی زندگی کا آغاز کرو، بہت بڑی دنیا ہے اور بے شمار لڑکیاں ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور تمہارے بخت کا حصہ ہوگی اور پھر تم جیسے بندے کو جو بے حد لائق فائق ہے، اس طرح سرینڈر نہیں کرنا چاہیے۔“

”کہاں رہا لائق، کبھی یہ زندگی کیسی قابل ہو جاتی ہے..... سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر وار پر وار کرتی ہے اور نیم جان کر دیتی ہے۔“ اس دفعہ وہ بولا تو شدت جذبات سے اُس کی آواز کانپ رہی تھی، آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلسلاہٹ، ڈٹوٹے بکھرے لہجے کی کپکپاہٹ نے صدر کو گھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اُس نے بغور مزہ کی طرف دیکھا۔

اُس کے اندر زور دار چمکانا ہوا حزرہ کا عکس نظر آ رہا تھا۔ ان چند ہفتوں میں وہ ہاؤس جاب کے سلسلے میں مگر سے تقریباً غافل ہی رہا تھا۔ آتے جاتے پہلو ہائے تنگ ملاقات رہی تھی، اب حزرہ کی پڑ مردود مضمحل صورت و بے جان انداز بتا رہا تھا کچھ ہوا ہے۔

کوئی ناقابل برداشت حقیقت

کوئی حقیقی رنگوں سے بگی کہانی

کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوا تھا

”حزرہ! کیا ہوا ہے؟“ وہ اُس کے قریب بیٹھ گیا بالکل نزدیک۔

”جو ہونا تھا۔“ وہ لگا ہیں چرا کر بولا۔

”پلیز سپیلیاں نہ بناؤ، جو ہوا ہے وہ بتاؤ۔“

”کچھ سچائیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو زبان سے بتانے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی ہے، کچھ سکتے ہوتو میری حالت دیکھ کر سمجھ جاؤ، تقدیر کی ستم طریقوں و قسمت کی تنگ دستیوں کی زد میں میری ذات متعبد ہو کر رہ گئی ہے جو خواب میں نے دیکھے تھے اُن کی تعبیر کسی اور کے حصے میں آئی، کیوں ہوتا ہے جب تعبیر ہماری نہیں تو ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ ایسے راتے کیوں بنائے گئے ہیں جن پر چل کر ہمیں صرف بھٹکانا ہوتا ہے منزل تو کسی اور کے لیے بنائی جاتی ہے ہم جیسے کے نصیب میں صرف سوز و کرب ہوتا ہے، ہجر و فراق ہوتا ہے، عمر وہاں تار سائیاں ہوتی ہیں جو دل و روح کو ٹھکا کر ڈالتی ہیں۔“

چنانوں جیسا مضبوط نظر آنے والا وہ شخص بچوں کی طرح رو پڑا۔ صدر نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

اُس کی جذباتی کیفیت و دلی حالت کا اُسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اُس پر کیا بیت رہی ہوگی، کچھ دن پہلے ہی تو اُس نے بتایا تھا اُس سے ملاقات کے بارے میں اور کرن سے اس کی شادی کرنے کی خواہش کے بارے میں سب بتایا تھا تب ہی وہ بے حد ٹینس رہا تھا، اب اس کی اتر حالت بتا رہی تھی، وہ محبت میں مکمل طور پر کلکت کھا چکا تھا، ابھی تک وہ کسی مجزے کے انتظار میں خوش گمان تھا، اپنے جذباتوں کی شدتوں کے یقین میں گم تھا لیکن شاید اب سب چراغ بجھ چکے تھے، آرزوئیں خاک نشین ہو چکی تھیں۔

”کرن نے اُس سے شادی کر لی؟“ صمد نے آہستگی سے کہا۔  
 ”ہاں“۔ حزرہ کی آواز کراہنما تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح کا ذب کا سرمئی اُجالا دھیرے دھیرے کائنات پر دروازہ ہورہا تھا۔ موسم سرد تھا، ہوا میں خشکی رہتی ہوئی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا، دور مشرقی آفتاب پر ہلکی سرخی پھیل رہی تھی خاموش ماحول میں پرندوں کی چہچہائیں سکون آمیز تھیں۔ وہ نہ معلوم کب تک سوئی رہی تھی، بند آنکھوں کو کھولنا ہی چاہا تو محسوس ہوا بہت قریب کوئی اس کے چہرے پر جھکا ہوا ہے، اُس کی گرم سانسوں کی مہک سے اُسے اپنا چہرہ تہتا محسوس ہوا، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اُس کو قدرے خود پر جھکا دیکھ کر وہ یو کھلا کر سیدھی ہونٹھی تھی اور سرعت سے شانوں سے ڈھلکا ہوا روپہ دست کیا، وہ اُسے بیدار کر کے اپنی سیٹ پر سیدھا بیٹھا گیا۔

”گھبرائیے نہیں، نہ میری نیت بُری ہے نہ ارادہ خراب، کئی دفعہ آپ کو پکارا آپ نے جواب نہ دیا تو مجبوراً مجھے آپ کی سانسوں کی آمدورفت کا جائزہ لینا پڑا“۔ اُس کے لیوں پر شروع مسکراہٹ تھی جواباً کرن نے کچھ نہیں کہا، صرف سٹ کر رہ گئی۔

کار تجزی سے مضافات کی جانب دوڑ رہی تھی۔

کچے کچے راستے تھے، ایک طرف سبز کھیتوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا، درمیان میں سڑک تھی اور سڑک کے دوسری طرف میدانی علاقہ تھا جہاں دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی، البتہ اُس کے سرے پر کچے مکانات و جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سرمئی صبح کا اُجالا سنہری روشنی میں بدل جا رہا تھا۔ نیم اندھیرے کو روشنی نکلنے لگی تھی۔ مشرقی آفتاب سے سورج کی روپیلی روشنی شعاعوں کی صورت میں نمودار ہونے لگی تھی۔

گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی، منظر بدل رہے تھے، راستہ طے ہورہا تھا، سورج مشرق کے گھونٹے سے باہر نکل آیا تھا۔

”بھوک لگ رہی ہوگی؟“ لحو بھر کونکا ہیں اُس پر ڈال کر پوچھا گیا۔

”نہیں“۔ وہ آہستگی سے بولی۔

”اونہوں، فلفلی بیانی نہیں چلے گی“۔

”میں سچ کہ رہی ہوں“۔

”کیوں؟“ اُس کے لہجے میں سنجیدگی درآئی تھی۔

”میں..... کبھی نہیں“۔ وہ اُلجھ کر بولی۔

”یہی پوچھ رہا ہوں، بھوک کیوں نہیں لگ رہی ہے۔ تمام اہم ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت شکم سیری ہے۔ کیا کچھ نہیں ہوتا اس بھوک و پیٹ کے چکر میں، لوگ ناجائز کام کرتے ہیں، حرام کو حرام نہیں سمجھتے، چوری، ڈاکے، قتل اور بھی نہ معلوم کیا کیا کر گزرتے



ہیں، اسی بھوک کے چکر میں اور کہہ رہی ہیں کبھی نہیں۔“ اُس نے اسے اس طرح سمجھایا جیسے کسی کوڑھ مغز شاگرد کو لائق فائق اُستاد سمجھاتے ہوں، کرن بے ساختہ مسکرائی تھی اُس کے انداز پر۔

”آپ میری بات کو سمجھے نہیں ہیں، دراصل مجھے صبح بیدار ہوتے ہی ناشتے کی عادت نہیں ہے۔ بہت دیر سے ناشتہ کرنے کی عادی ہوں۔“

”اوہ..... آپ کی صبح بھی ہوگی اور میں ابھی تک رات میں ہی سڑ کر رہا ہوں۔“ وہ دھیرے سے ہنستا ہوا گویا ہوا۔

وہ جو اب ناخاموش رہی تھی نہ معلوم کیا وجہ تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اُس کے اندر عجیب اضطراب و وحشت متحرک ہونے لگی تھی اسے لگ رہا تھا۔

اُس کو اپنے انتقام میں شامل کر کے اُس نے اچھا نہیں کیا۔ اپنی جنگ تنہا لڑنی چاہیے تھی، برہان لغاری کی وحشت و بربریت کا تنہا ہی شکار ہوتی، مرجاتی تو کون بیسٹا تھا رونے والا، یاد کرنے والا، لیکن اُس کے پیچھے تو ایک خاندان ہے۔ بے حد پیار کرنے والی دادی، جان سے بڑھ کر چاہنے والے باپ اور بے حد دوست و اقارب..... اللہ نہ کرے انہیں کچھ ہو گیا تو کئی جانوں پر بین جائے گی۔

”میں نے آپ کے کزن حمزہ کو انظارم کر دیا تھا کہ ہم نے شادی کر لی ہے۔“ اُس کو یک دم ہی یاد آیا تو وہ گویا ہوا۔

حمزہ! بہت عرصے بعد کسی اپنے کا نام سنا تھا، اُس کے اندر دور تک اس نام کی بازگشت گونجتی چلی گئی۔

پڑھا کو، سنجیدگی و خلوص کا پیکر اس کے قدم قدم پر کام آنے والا، اُس کی خاطر سب سے لڑ مرنے والا حمزہ، نفرتوں و عداوتوں کی ایسی کبر چھائی تھی کہ جس میں پیار و محبت، مروت و ایثار کے سانچے میں ڈھلے حمزہ کا وجود ہی گم ہو گیا تھا۔

”بہت خوش تھا وہ، بے حد گند و شزدی ہیں۔ ہم ملیں گے ضرور اُس سے، بہت ناکس اینڈ لوگک پر سن ہے وہ۔“ اُس کہہ رہا تھا۔

”ہاں..... میں نے بہت زیادتیاں کی ہیں اُس کے ساتھ، حالانکہ وہ ان پتھر دل لوگوں سے بالکل الگ ہے، بالکل منفرد۔ اب وقت اُلٹی چال چل رہا ہے، کل قریبیں محبتوں کو جلا بخشتی تھیں، پیار کے بندھنوں کو اٹوٹ کرتی تھیں، آج قاصدے قریبوں کو جلا بخشتے ہیں، جدائیاں پیار کی فصلوں کی آبیاری کرتی ہیں جو ہم سے قریب ہوتے ہیں، وہ اُس وقت تک قابل توجہ، قابل محبت نہیں ہوتے جب تک دور نہ ملے جائیں۔ یہ وقت کا چلن ہے اُسے بھی آج حمزہ کی محبت کا احساس ہوا تھا۔

”کرن!“ اُس کی گھمبیر آواز میں مکمل سنجیدگی درآئی تھی۔

”جی۔“ وہ اُس کے مزاج کے موسموں سے قطعی نا آشنا تھی مگر اس لیے جس انداز میں اُسے پکارا تھا وہ اُس کا دل دھڑکا گیا تھا۔

”آپ اس رشتے سے خوش ہیں؟ آئی مین سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سب جانتی ہیں میرے متعلق، منال کے متعلق اور کل رات جو کچھ ہوا، سب سے آپ باخبر ہیں۔ کیا میں آپ سے بھرپور رفاقت کی توقع رکھ سکتا ہوں؟ یہ جاننے کے باوجود کہ اُس کا اسپینڈ پہلے ایک لڑکی سے محبت کی پینگیس بڑھا تا رہا ہے، وہ بیوی اُس شخص کو وہ عزت، وہ محبت و احترام دے گی جو اُس کا حق ہے؟“ گاڑی روک کر

اُس کے دل میں نہ جانے کیا سائی کہ وہ اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر جذباتی لہجے میں گویا ہوا۔

کرن نے اُس کی جانب دیکھا، اس کے چہرے پر اُمید و بیم کے جکتو جل بچھ رہے تھے۔ ہاتھوں کی حرارت میں وفا کا لمس تھا۔ اُس کی نرم جھلملاتی سرسٹی سٹل پر صرف عکس تھا، اس کا اپنا عکس صاف و شفاف عکس گو دل کے فریم میں آویزاں زندہ تصویر، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ نکلتے اُس کی نظر باہر کی سمت اُٹھی تھی اور خوف و دہشت سے اس کی چیخ نکل گئی۔



کرن کی چیخ نے اُس کو یو کھلا ڈالا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں باہر کی سمت دیکھا اور لگنوں کا جال اس کی کشادہ پیشانی پر پھیلتا چلا گیا تھا۔ ”ڈونٹ وری۔ یہ لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔“ ان سے کچھ فاصلے پر ایک جیب ان کی سمت بھاگی چلی آ رہی تھی، جیب میں سواری لوگوں کے پاس اسلحہ دور سے ہی نمایاں ہو رہا تھا۔

اُس ایک نظر پیچھے دیکھ کر کرن سے مخاطب ہوا جو خوف و فکر سے کانپ اُٹھی تھی اور تیزی سے کار اشارت کر دی تھی۔ کار اشارت ہوتے ہی پیچھے سے گولی چلائی گئی تھی، پیچھے کی باڈی پر گولی لگی تھی، اس کے بعد بھر پور فائرنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔

کرن کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکلنے لگی تھی، اُس نل اسپینڈ میں کار بھگا رہا تھا۔ پیچھے آنے والی جیب سے برابر گولیاں برسائی جا رہی تھیں، جو فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث پوری طرح سے آگے تو نہ آ رہی تھیں مگر کار کی بیک باڈی ان سے پوری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

وہ ماحول جو ابھی سکون و آسودگی کی خشکی فضا میں خاموش تھا فائرنگ کی بمباری سے گونج اُٹھا تھا۔

”ڈرو مت، کچھ نہیں ہوگا۔“ کرن کو از حد خوف زدہ دیکھ کر اُس تلی آ میز لہجے میں گویا ہوا، اس کا لہجہ بے خوف و بے فکر تھا۔

”میں اپنے لیے فکر مند نہیں ہوں، نہ ہی میں موت سے ڈرتی ہوں، مجھے ڈر ہے آپ کے لیے، مجھے لگ رہا ہے صرف آپ کی رب ذوالجلال آپ کی حفاظت کرے، آپ کو کچھ نہ ہو۔“ پاکیزہ جذبوں سے گندھا لہجہ، شفاف آنسوؤں سے دھلا چہرہ اُس مدثر کے اندر نئے احساس جگا گیا۔ سچی رفاقت کا خالص صداقت کا۔

اسے فخر محسوس ہوا، اطمینان قلب میسر آیا کہ بے شک یہ بندھن غیر جذباتی و جلد بازی میں باندھا گیا مگر کسی نیکی یا دعا کے عوض وہ ایک ایسے رفیق سفر کو اپنا بیٹا تھا کہ جو اس کی حقیقی خوشیوں کی ضامن تھی۔ کیسی عجیب بات تھی۔

باپ ایک تھا

خون ایک تھا

مگر تادم دونوں کی ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ و جدا تھی۔

ایک کی فطرت ہر جاتی، خود غرضی و مطلب پرستی سے لبریز تھی، دوسری ایثار و وفا، مروت و محبت کے خمیر سے بنی تھی۔ کیسے دور و گ

ہیں ایک خون کے..... یا شاید یہ دو ماؤں کی تربیت کی شکل، دو مختلف کوکھ کا اثر ہے۔

بہر حال جو کچھ بھی تھا وہ مطمئن تھا کہ اس نے درست راہ منتخب کی۔ جیب سے فائرنگ برابر ہو رہی تھی۔

اُس نے جان بوجھ کر کار کو کچے راستے پر دوڑانا شروع کر دیا تھا۔ سامنے سے بھینسوں کا غول آ رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح

ان بھینسوں کے درمیان سے کار نکال لے اور یہی ہوا۔ بہت تیزی سے بھینسوں کی طرف کار لے آیا اور ان کے درمیان سے کار نکالنے لگا تھا۔

پچھے آنے والی جیب سے فائرنگ بند ہو گئی، کیونکہ گولیاں لازماً بھینسوں کو لگتیں جس سے نیا بنگامہ کھڑا ہونے کا خطرہ تھا۔ اُس

پھرتی سے کار نکال کر آگے بڑھ گیا۔ جیب بہت پیچھے رو گئی تھی۔

”تھمبیکس گاڈ!“ دوسرے راستے پر جاتے ہوئے کرن نے پھولی سانسوں سے کہا۔ اُس کے لبوں پر وحشی مسکراہٹ درآئی تھی۔

”ابھی بھی ہم خطرے کی رینج سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ وہ لوگ کسی بھی اس طرف آسکتے ہیں۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

”اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟“

”آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟“

”کیوں ڈروں؟ یہ بتائیں گی آپ؟“

”وہ اتنے سارے لوگ ہیں اور وہ بھی تمام اسلحہ سے لیس۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہم کس طرح لڑیں گے ان سے، ہمارے

پاس ہے کیا؟“

”محبت۔“ اس کے لہجے میں خوشبو کھیرتی شوٹی درآئی۔

”پلیز، یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“ وہ جھنجھلائی۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“

”یہ محبت کا وقت بھی نہیں ہے۔“ جھنجھلاہٹ و گھبراہٹ میں بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا پھر اُس کے بلند تھقبے نے اسے سر

جھکانے پر مجبور کر دیا۔ حیا سے وہ سرخ ہو گئی تھی۔

”محبت، غصہ، جھگڑا سب کا نام نیل بنانا پڑے گا۔ چلو اچھا ہے بنا لیتے ہیں۔ ہفتہ میں سات دن ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک

دن غصے کا، ایک دن جھگڑے کا اور باقی پانچ دن محبت کے ہوں گے..... ادا کے..... رائٹ۔“ وہ جھک کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

”میرا..... میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔“ وہ شپٹا گئی۔

”میرا بھی ارادہ دو دن غصے و جھگڑے میں گزارنے کا نہیں ہے، پورا ہفتہ عیار و محبت میں گزارنے کا ہے، انڈرا سٹینڈ۔“

☆.....☆.....☆

اس طرح کا جیون میں حادثہ نہیں ملتا  
 تم تک پہنچنے کا واسطہ نہیں ملتا  
 آرزو تو ملتی ہے جستجو نہیں ملتی  
 منزلیں تو ملتی ہیں راستہ نہیں ملتا  
 روح کی زمیوں پر اک عجب عالم ہے  
 دور اور تمنا میں فاصلہ نہیں ملتا  
 سوگوار لوگوں کی، بے قرار لوگوں کی  
 زندگی میں کوئی بھی ضابطہ نہیں ملتا  
 اس طرح بھی ہو جاتا ہے خراب موسم میں  
 دور کے مسافر سے رابطہ نہیں ملتا

”بیٹے بڑے ہو جائیں تو ماں کے دل کا سکون اور باپ کا سہارا جتنے ہیں پھر سب ماؤں کی طرح میرے دل میں بھی ارمان ہے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا، بھولانے کا، بیٹی اللہ نے کوئی دی نہیں جو دل کا قرار بنتی، اب تو یہی آرزو ہے کہ بہو کے روپ میں ہی بیٹی کے ارمان پورے کروں اور گہی بات یہ ہے کہ مجھ سے اب گھر داری نہیں ہوتی ہے۔ مدت ہو گئی اس بوجھ کو کاغذوں پر اٹھائے، اب برواشت نہیں ہوتا ہے، سب سنبھالنا۔“ ناشتے کی میز پر وہ چاروں موجود تھے۔ راحیلہ بیگم نے عام صاحب کا خوشگوار موڈ دیکھ کر اپنے دل کی بات کہہ دی تھی جو کئی بار پہلے بھی وہ بے انداز میں کہہ چکی تھیں۔

”ارے بھئی! نوکروں کی تعداد اس گھر میں اہل خانہ سے زیادہ ہے۔ ایک گلاس پانی کے لیے بھی ملازموں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، یہ آپ زیادتی کر رہی ہیں کسی ناویدہ بوجھ کی شکایت کر کے۔“

”آپ کو کب میری پروا رہی ہے جواب ہوگی۔“ وہ روٹھے انداز میں گویا ہوئیں تو عام صاحب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔  
 ”کام وام کا کیا ہے وہ تو سب ہی کر لیتے ہیں، اصل محنت تو ذمے داری نبھانا ہے، احسن و عمدہ طریقے سے یہ وہ کام ہے جو لاکھوں ملازمین بھی نہیں کر سکتے ہیں۔“ وہ اپنی بات پر اٹل تھیں۔

”چلیں آپ کی خوشی کے لیے مان ہی لیتے ہیں مگر آپ کی وہ دونوں خواہشیں بہو کے روپ میں بیٹی پالنے اور گھر کی ذمے داریاں نبھانے کی آرزوئیں محض آرزوئیں ہی رہیں گی۔“  
 ”کیوں؟“ وہ حیرانگی سے استفسار کر بیٹھی تھیں۔

”بیگم! وہ وقت ہوا ہوئے جب لوگ وضع داری و قرابت داری کے لحاظ و مروت میں اپنی بیٹیوں کو تقنین کیا کرتے تھے، وقت

رخصتی کہ بیٹی جس گھر میں تمہاری ڈولی جا رہی ہے وہاں سے جنازے کی صورت میں باہر لٹکانا اور لڑکیاں بھی کرتی تھیں۔ ساس، سسر کی خدمت و ادب والدین سے بڑھ کر کرتی تھیں۔ سسرال کے تمام لوگوں کو میٹھے سے بڑھ کر عزیز رکھتی تھیں۔ اس دور میں جو عائشہ فیلی سسٹر ہوتے تھے، کئی کئی خاندان مشترکہ طور پر ساتھ رہتے تھے، کبھی کوئی نفرت و عداوت نہ پائی جاتی تھی کسی میں، بڑے چھوٹوں سے محبت و اخلاق سے پیش آتے تھے تو چھوٹے بھی بڑوں کی عزت و توقیر میں کوئی کمی نہ کرتے تھے۔“

چائے کے چھوٹے چھوٹے سب لیتے ہوئے عام صاحب اس زمانے میں گم ہو گئے تھے جو ان کے بچپن کا دور تھا جہاں بچی و خالص محبتوں اور یکا گت کی بہاریں ہر نونہیلی رہتی تھیں۔

راحیلہ موضوع کا رخ بدلتے دیکھ کر شپٹانے لگی تھیں۔ انہوں نے اپنی خواہش کے اظہار کے لیے وہ موضوع چھیڑا تھا مگر جواب انہیں بچھڑانے پر مجبور کر چکا تھا۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عام صاحب ان کی کھجلی کو تابییاں اور زیادتیاں دہرانے لگیں گے، جن کا اختتام بہن کی موت اور بھانجی کی جانب سے ملی بدگمانی و نفرت پر ہوگا۔

”بلاشبہ اس وقت کی عورتوں میں کچھ بوجھ، ذہانت و فراست اور سب سے اہم مذہبی ہم آہنگی و رواداری کی کثرت حد سے سوا تھی۔ آج کی عورت کی طرح اتنی تعلیم یافتہ و آزاد نہ تھیں..... مگر بغیر ذمہ داری و سند کے وہ آج کی عورت سے زیادہ باشعور، باتیزورشتوں کے تقدس کو منظم کرتیں، اخلاقی قدروں کو پائیداری اور عروت و رواداری کو فروغ دینے میں اس دور کی عورت کا اہم رول تھا۔ وہ عورت جو خواہ بیٹی، ماں، بہن، بیوی یا کسی بھی رشتے سے وابستہ تھی اور ہر رشتے میں اس نے بہت ساری خوب صورتیاں، مسرتیں و مردتیں، امن و محبت کو فروغ دیا تھا۔“ عام صاحب حسب توقع شروع ہو چکے تھے اور راحیلہ خاموش بیٹھی ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہی تھیں۔

”شاید اسی وجہ سے خاندان و برادری وجود میں آئی ہوگی اور شاید اسی وجہ سے پہلے آپس میں اتنی محبتیں و اپنائیتیں تھیں۔ لوگوں میں تیرا میرا نہ تھا، اسی لیے اتنی پریشائیاں، آفتیں و بیماریاں بھی نہ تھیں جو اس دور میں آئے دن وارد ہوتی ہیں۔“ مزہ نے بھی خاموشی توڑی تھی۔

”یقیناً مائی سن! ایسا ہی تھا بالکل ایسا تھا، جس گھر کی عورتیں اچھی ہوتی ہیں، سمجھو وہ گھر دنیا میں ہی جنت ہوتا ہے۔“

”چیا! آپ کا مطلب ہے اس دور کی تعلیم یافتہ عورت گزشتہ دور کی جاہل عورت کے مقابل میں جاہلیت کا فکار ہے؟“ صمد نے کہا۔

”میری مراد سب عورتوں سے نہیں ہے، بلکہ ان عورتوں کے متعلق کہہ رہا ہوں جن پر علم کی روشنی سرنوا اثر انداز نہیں ہوتی ہے، جن کے عمل سے، اخلاق سے، گفتگو و کردار سے ظاہر ہوتا ہے، اندر باہر اندر میرا ہی اندر میرا ہے، نہ دنیا بھانے کا چلن ظاہر ہوتا ہے اور نہ دین نکھارنے و آخرت سنوارنے کا، ان کی زبان سے، مزاج سے، انداز سے اندر میرا جھلکتا ہے، جہالت کا اندر میرا۔ پھر ایسی بڑی بڑی ڈگریوں کا کیا فائدہ جو آپ کو اخلاق، عروت و رواداری کا درس نہ سکھائیں۔ علم، شعور دیتا ہے، آگہی بخشتا ہے، دین و دنیا کو بہت اچھی طرح سمجھنے و عمل کرنے کی فہم و فراست عطا کرتا ہے، جو علم حاصل کر کے بھی ان خصوصیات سے بے بہرہ ہیں، وہ جہالت سے بھی کئی قدم آگے ہیں، پھر ہم اس دور کی عورتوں کو جاہل نہیں کہیں گے، بلکہ ناخواندہ کہیں گے کہ علم کے ساگر سے بہر مند نہ ہونے کے باوجود وہ اسلامی قدروں کو منظم و جاویداں رکھے ہوئے تھیں۔“

عام صاحب نے کپ سا سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ جہالت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی نگاہیں بار بار راحیلہ کی جانب اٹھتی رہی تھیں اور وہی نہیں حزرہ اور صدیقی بخوبی نوٹ کر رہے تھے، وہ کس کو ستا رہے ہیں۔

”خیر..... اب پرانی عورتیں سب کی سب ہی کوئی دودھ کی دھلی اور نیک بیبیاں نہ تھیں، ان کی پلٹر بازیوں اور چالاکیوں کی ہزاروں داستانیں میں بھی سنا سکتی ہوں آپ کو“۔ ہالہ خزان کے صبر کا پیمانہ لہجہ ہو گیا۔ وہ تپ کر گیا ہوئی تھیں۔

”یہ اپنی اپنی نیچر ہوتی ہے، ہم اچھائی کے حامل ہیں، محبت و بھائی چارے کا پرچار کرنے والے ہیں، اسی لیے بہترین لوگوں کو یاد رکھتے اور ان کے نقش قدم پر عمل پیرا ہونے کی سعی کرتے ہیں اور آپ سے بھی یہی استدعا ہے، براہ کرم اچھے و نیک لوگوں کے متعلق جانیں اور ان سا بننے کی کوشش کریں، اگر آپ نے اپنے اندر علم کی معمولی سی رمق بھی ابھرنے دی ہوتی تو وہ کچھ نہ ہوتا جو مجھے آخری سانس تک بے چین و پشیمان رکھے گا“۔ اپنی بات ختم کر کے وہ اٹھ گئے تھے۔ ان کی تھلید بیٹوں نے بھی کی تھی۔

☆.....☆.....☆

برہان لغاری کی اسی روز کا رستورن رفقار سے انٹر پورٹ کے خوب صورت و شگفتہ راستوں پر دوڑ رہی تھی، ان کے چہرے پر سنجیدگی پوری طرح حاوی تھی، وہ ہنس کلف شدہ شلوار قمیض میں ان کی قد آور شخصیت کے علاوہ چہرے پر چھائی سرخی ان کی وجاہت کو اجاگر کر رہی تھی۔ آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے ان کے اندر کے خفاشاہد و بھان کے علاوہ بے فونشی کارا ز بھی قاش کر رہے تھے۔ ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی فائقہ جو کچھ دیر قبل امریکہ سے آئی تھیں، اچھتی نگاہوں سے ان کا جائزہ لے رہی تھیں جو اپنی سوچوں میں ان سے لائق تھے۔

”مجھے منال سے یہ امید نہ تھی، نہ معلوم کیا ہو گیا تھا اسے جو وہ ایسی اسٹوڈنٹ حرکت کر بیٹھی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے سر پرانے دوں گی مگر یہاں آ کر آپ سے معلوم ہوا کہ وہ کیا حرکت کر بیٹھی ہے“۔

فائقہ بہت عرصہ قبل اپنے دوسرے سینیٹر صمدانی سے ڈائورس لے چکی تھیں۔ صمدانی سے شادی کرنے کی وجہ دولت و شہرت ہرگز نہ تھی کہ وہ خود ان کی فرم کا منیجر تھا، خواہر و جائیداد، دولت و حیثیت وہ سب میں پیچھے تھا۔ فائقہ جیسی طرح دار عورت کا دل اس پر آنا وہ تھی اس کی بے حد پُرکشش و وجہہ پر سنائی دنیاوی جائیداد و دولت سے وہ جتنا غربت کا شکار تھا، مردانہ وجاہت و خوب صورتی کی دولت سے اتنا ہی مالا مال تھا۔ ان کی حسن پرست طبیعت برہان لغاری سے بے وفائی کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ فطرتاً وہ ہر جانی فطرت رکھتی تھیں، وہ حسن کی شمع تھیں۔

اپنے گرد ہمہ وقت پروانوں کا بھوم و یکینے کی عادی تھیں۔ صمدانی جو پہلے ہی غربت و مفلسی کی زندگی کو چھوڑ کر عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی جستجو میں مگن تھا، فائقہ کی جانب سے ملنے والی حوصلہ افزائی اور آفرز کو فوراً ہی قبول کر بیٹھا تھا۔

وہ ایسا ہی چاہتا تھا۔

راتوں رات امیر بن جانے کی خواہش اسے بے کل رکھتی تھی۔ اس کے نصیب جاگ گئے، سونے کی چڑیا از خود اس کی گرفت میں آ گئی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی اس نے ان کے حسن کی تصدیق کوئی کچھ اس طرح کی کہ فائقہ کو لگا، اس کے حسن کا قدر دان تو صرف وہی ہے

اور پھر بہت جلد وہ مثال کو بھی نظر انداز کر کے صمدانی کے ساتھ ملک چھوڑ گئی تھی۔ دولت اس کے پاس پہلے ہی بہت تھی، پھر جاتے وقت وہ برہان لغاری کی تمام نقد رقم اور دوسری قیمتی اشیاء سمیٹ کر لے گئی تھی۔ ان دنوں مثال مری کونونٹ میں زیر تعلیم تھی۔

صمدانی کے ساتھ دو سال کی رفاقت رہی تھی، بہت جلد وہ ایک دوسرے سے اکٹا گئے تھے۔ صمدانی کی وجاہت وہاں کی عورتوں میں بھی خوب رنگ جم رہی تھی۔ گوری میسوں کی بدولت وہ شہزادوں کی طرح زندگی گزارنے لگا تھا۔ فائقہ کے سہارے کی اسباب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صمدانی کے بعد فائقہ کی زندگی میں کئی مرد آئے مگر اس نے پھر شادی کسی سے نہ کی تھی۔ تعلقات سب سے رکھے تھے۔

پھول، جوانی، بہار، بہت کم عمر لے کر آتے ہیں۔ تھلیوں کی طرح یادوں کے رنگ چھوڑ کر اڑ جانے والی فائقہ کی بہاریں بھی خزاں برد ہوئیں تو انہیں محسوس ہوا کہ انہوں نے کیا کھویا، کیا پایا ہے۔ کچھ سوچ کر انہوں نے مثال سے کبھی رابطہ منقطع نہ کیا تھا۔ اول تو انہیں برہان لغاری کے متعلق تمام تر معلومات ملتی رہتی تھیں، پھر وہ اس حقیقت سے واقف بھی تھیں کہ جلد یا بدیر انہیں واپس سہیں آنا ہے۔ آج وہ آگئیں اور پہلا رابطہ انہوں نے برہان لغاری سے ہی کیا تھا کہ وہ آ کر اسے پک کریں۔ وہ اچانک آ کر مثال کو سر پر اتار ڈ کر تا چاہتی ہیں۔ برہان لغاری نہ معلوم کس جذبے کے تحت انہیں رسیو کرنے چلے آئے تھے اور مختصر اتمام صورت حال سے انہیں آگاہ کر کے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

”سکیڑے طور پر آپ کے لیے روہر یز روڈ ہے، آپ جا کر آرام کریں“۔ فائینا اشارہ ہوئی کی پارکنگ لائٹ میں کار روک کر وہ گویا ہوئے۔

”میں ہوئی میں رہوں گی؟“

”جی“۔ وہ ناراضگی سے گویا ہوئے تھے۔

”لیکن میں ہوئی میں رہنا نہیں چاہتی ہوں۔“

”پھر جہاں آپ کا دل چاہے رہیں مگر میرا نام ویٹ مت کریں۔“

”میں..... میں مثال سے ملنا چاہتی ہوں، اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ اس کے سوا ہے کون میرا“۔ وہ روہانسی ہو گئی تھیں۔

مثال کی ذہنی حالت بے حد نامرل ہے، وہ نیندا اور میڈیسن کے زیر اثر سو رہی ہے۔ اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔

”کیا میں اپنی بے بی سے نہیں ملوں گی؟ اس کی خاطر تو آئی ہوں۔“

”پلیز..... ہات کھوٹل میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا، وہ تمہیں ہاسپٹل ڈراپ کر دے گا۔ مثال کل تک خاصی امپر وہ ہو جائے گی۔“

ڈاکٹر زکا کہتا ہے.....“

”برہان! مجھے معلوم ہے آپ کے دل میں میرے لیے جگہ نہیں ہے مگر..... کیا گھر میں بھی جگہ نہیں ہے؟ کوئی رشتہ نہ سہی مگر کیا یہ

تعلق کافی نہیں ہے کہ میں مثال کی ماں ہوں، یہ سب اسی کا ہے، تمام پر اپنی اسی کی ہے تو میرا حق اس گھر کے ایک کمرے پر بھی نہیں

ہے؟“ وہ دانستہ کبر رہی تھیں۔

”میں پہلے ہی ڈسٹرب ہوں اور مزید کسی بحث کو افرورڈ نہیں کر سکتا۔ پراپرٹی میری ہے جب تک میں ہوں، اس کے متعلق کسی کو نگر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے، مگر کے دورانے بھی ان کے لیے واہوتے ہیں جن کے لیے دل کے دروازے کھلے ہوں، پھر جن دروازوں کو تم خود ہی بند کر گئی تھیں، انہیں میں نہیں کھول سکتا ہوں۔“ وہ دو ٹوک کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ فائنل مشنڈر کھڑی رہ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے..... بندہ خود اپنی ہی کھوج میں..... اتنی دور نکل جاتا ہے..... جہاں سے اس کا واپس آنا..... ناممکن ہی ہوتا ہے۔

وہ سارا دن سفر میں گزارتا تھا، کبھی کسی ہوٹل سے چائے ہسٹ وغیرہ لے کر کھائے تھے، یہ اندرون سندھ کا علاقہ تھا، جہاں زیادہ تر کھیتی باڑی ہو رہی تھی یا جنگلات کے چھوٹے بڑے حصے پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ دور جا کر سامنے لال اینٹوں سے بنے مکانات نظر آنے لگے تھے۔ انس پہلے نظر آنے والے مکان کے آگے بنے احاطے میں کار لے آیا تھا۔

احاطے کے اطراف میں سوکھی گھاس کے اتنے بڑے بڑے گھراس ترتیب سے رکھے گئے تھے کہ باآسانی انہوں نے دیواروں کی صورت اختیار کر لی تھی، وہاں کھڑی کار باہر سے دیکھی نہ جاسکتی تھی، یہ دیکھ کر کرن مطمئن ہوئی۔ انس کار سے نکلا تو وہ بھی اس کے اشارے پر نکل آئی تھی۔ احاطے کے وسط میں چند کمروں پر مشتمل وہ گھر تھا جس کا سبز ٹکڑا لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ انس نے آگے بڑھ کر دروازے پر تین بار دستک دی اور اسی وقت دروازہ اس طرح کھلا گیا دنگوں کا خطرہ ہو۔

”سلام صاحب اسلام بی بی صاحب! اندر سے خوشی سے مسکراتی مائی سیکنڈ برآمدی ہوئی تھی۔ مائی سیکنڈ کو دیکھ کر کرن کو بھی خوشی ہوئی تھی۔ بڑی محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی خیریت دریافت کرتی اندر کمرے میں چلی آئی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، صاحب نے میرا بہت خیال رکھا ہے، بڑی عزت دی ہے۔ آپ کو صاحب کے ساتھ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔“

”یہ سب تمہاری بدولت ہوا ہے مائی، ورنہ نہ معلوم کیا ہوتا؟“ وہ پنگ پر بیٹھے ہوئے آہستگی سے گویا ہوئی۔

”خالہ سیکنڈ! کچھ پیٹ پوجا کا بھی بندوبست ہے یا نہیں؟ کل سے ہم بھوکے ہیں۔“ انس دوسرے پنگ پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھے ہوئے بولا تو سیکنڈ فوراً ہی کھانا لانے چلی گئی تھی۔

”ہم یہاں محفوظ ہیں؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے، وہ لوگ یہاں نہ پہنچ جائیں۔“ تہائی پاتے ہی کرن نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”موت سے ڈر لگتا ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”آپ کو نہیں لگتا؟“



”تم ساتھ ہو جب اپنے  
دنیا کو دکھادیں گے.....  
ہم موت کو جینے کے  
اعزاز سکھادیں گے“  
وہ شوشی سے گنگنایا تھا۔

”میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں“۔ اس کے شوخ انداز نے اسے بوکھلا ڈالا تھا، وہ یہاں سے باہر نکل آئی تھی۔

سکینہ نے کھانا بہت مزے دار بنایا تھا، پھر بھوک بھی شدید تھی۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا گیا تھا۔ وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو سکینہ کافی لے آئی تھی اور کھانے کے برتن دوسرے برتنوں پر آسنے پر آسنے بیٹھے سوچوں میں گم تھے۔ باہر سے ہینڈ پمپ چلانے کی آواز آرہی تھی، برتن دھونے کے لیے سکینہ ہالٹی پانی سے بھر رہی تھی۔ وہ دونوں پلنگوں پر آسنے پر آسنے بیٹھے سوچوں میں گم تھے۔ اس خاموشی کو کرن نے توڑا تھا۔

”یہ کس کا گھر ہے، صرف مائی سکینہ کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”سکینہ خالد کی کسی عزیز و کا ہے، ان کے کہنے پر ہی میں انہیں یہاں لایا تھا۔ وہ خود کو یہاں پر محفوظ سمجھتی ہیں اور میرا بھی خیال ہے، یہ محفوظ ترین جگہ ہے۔“

انس اٹھ کر واک کرنے چلا گیا۔ وہ سکینہ کے پاس چلی آئی جو برتن دھونے کے بعد کچن صاف کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر محبت سے مسکرائی تھی۔

”بی بی صاحب! آپ اندر چلیں باہر بہت سردی ہے۔“

”مجھے اچھا لگ رہا ہے، یہ ٹھنڈا ٹھنڈا ماحول بہت سکون ہے یہاں۔“

”میں کرسی لا دیتی ہوں۔“ وہ جھاڑو چھوڑ کر گویا ہوئی تھی۔

”نہیں..... نہیں کھانا کھایا ہے میں کچھ دیر ٹہلوں گی تم اپنا کام کرو میں اپنا کام کرتی ہوں۔ کچھ باتیں بھی کرتے جائیں گے۔“

اس نے سکینہ کو منع کر دیا اور خود آگے کی طرف بڑھ گئی تاکہ وہ بے تکلفی سے اپنا کام کر سکے اور ہوا بھی جی اُس کے آگے بڑھتے ہی وہ تیزی سے کام کرنے لگی۔ مگن خاصا وسیع تھا۔

سرخ اینٹوں سے دیواریں تعمیر تھیں اور سرخ ہی اینٹوں سے فرش ترتیب دیا گیا تھا۔ مگن کے کونے میں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا جس

کے چاروں طرف چھوٹی اینٹوں سے اتنا احاطہ بنایا گیا تھا کہ برتن اور کپڑے وہاں بیٹھ کر با آسانی دھوئے جاسکیں۔ دائیں طرف لوہے کے

اسٹینڈ پر تین منگے رکھے ہوئے تھے، جن کے اوپر ہاتھ سے بنائے گئے موتیا کے پھولوں کے ہار ڈالے گئے تھے۔ موتیا کے پھولوں سے پھوٹی

دل آویز مہک جسم و جاں کو معطر و سرشار کر رہی تھی۔ وہ ٹہلنے لگی تھی، ہوا میں خاصی خشکی تھی مگر اسے یہ سرد فضا خاموشی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ

سوچتا نہیں چاہ رہی تھی لیکن سوچوں پر بھی بھلا کوئی پابندی لگا سکا ہے۔

یہ سانسوں کی طرح ہمارے اندر موجود رہتی ہیں ہر دم، ہر پہل اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں، ہم چاہنے کے باوجود ان سے فرار حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ سوچیں وہ آسیب ہیں جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔

”جو کچھ ہوا نہ معلوم اچھا تھا یا بُرا؟ نہ معلوم مجھے اس طرح کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟ یا شاید وہ سب اسی طرح ہونا تھا؟ کیا دنیا میں کہیں ایسا بھی ہوا ہوگا جو میں نے کیا ہے۔ ایک بیٹی نے، لیکن ایسا بھی نہیں ہوا ہوگا جو ایک شوہر نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا، ایک باپ نے بیٹی کے ساتھ کیا، ہماری کرنی کا پھل ہمیں مل کر رہتا ہے۔ گلاب بوئیں گے، گلاب پائیں گے، خار بوئیں گے خار کاٹیں گے، یہ صدیوں سے ہوتا رہا ہے، ہر عمل کا رد عمل.....“

اس نے گہری سانس لی، آرزو کی اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

”میں سوچ رہی تھی برہان لغاری سے انتقام لے کر میرے اندر کی وحشت اور ادا سیوں کو قرار مل جائے گا۔ اس شخص کو ذک پہنچا کر میں بھرپور انداز میں جی اٹھوں گی، مگر اب بھی وہی انجانا بوئیں پن میری رگ و پے میں سرایت ہے۔ مہما انتقامی جذبے کے خلاف تھیں۔ معافی و درگزر ان کا شعار رہا تھا۔ وہ ہر ایک کو معاف کرتی آئی تھیں، کبھی کسی سے کوئی شکایت شکوہ نہ کیا تھا۔ میں نے ہمیشہ ان کے چہرے پر ایک ملوٹی سکون دیکھا تھا۔

کبھی بھی میری طرح وہ مضرب و بے چین نہ رہی تھیں، شاید اس لیے کہ صبر و شکران کا مزاج، محمود درگزران کا ہتھیار بن چکا تھا اور میں جو سدا کی ناشکری، بے صبری، ہتھم مزاج ہوں، بہت کم ظرف و کم حوصلہ ہوں (جو میرے خون کی عطا ہے) مجھے ان ہی صفات نے ہمیشہ بے سکون و بے قرار رکھا ہے، کہنے کو کتنے مختصر و بے ضرر سے لفظ ہیں یہ.....

بے سکون، بے قرار، بے چین،

مگر جن کا ان سے واسطہ پڑتا ہے وہی جانتا ہے کہ کیا گزرتی ہے جب لفظ مجسم کیفیات بن کر انسان کو گرفت میں لیتے ہیں۔“

”اوں..... ہوں، کیا سوچا جا رہا ہے؟“ اُس جو اندر داخل ہوا تو سامنے اسے سوچوں میں گم پا کر وہیں کھڑا ہو گیا تھا، وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ اس کی آمد کو محسوس نہ کر سکی تھی۔ بالآخر چند منٹ کے بعد اسے ہی کرن کو مخاطب کرنا پڑا تھا۔

”وہ..... کچھ نہیں! بس ایسے ہی میں نے سوچا گاؤں کی تازہ آب و ہوا سے لطف اندوز ہوں۔“ اس کے اچانک پکارنے پر وہ شہنا گئی تھی۔ وہ اس سے کچھ قاصلے پر کھڑا سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے محسوس ہو رہا ہے آپ ڈسٹرب ہیں۔“

”ڈسٹرب..... نہیں تو۔“

”مجھ سے چھپائیں گی؟“ وہ سینے پر بازو لپیٹے اس کے مقابل آگیا تھا اس کی گہری سرنئی آنکھیں اسے کھوج رہی تھیں۔ کرن کو

اس کے دیکھنے کے انداز سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے جھجکتے ہوئے زرخ موڑ لیا تھا۔  
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اوں ہوں، جو جی بولتے ہیں وہ چہرے نہیں چھپاتے، رو برو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔“  
 اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا زرخ اپنی جانب کرتے ہوئے وہ بولا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی۔ قدموں کی آہٹ پر انس پچھے ہٹ گیا۔

”میں نے بستر لگا دیا ہے کوئی کام ہوتا مجھے آواز دے دیجئے گا۔ میں سامنے والے کمرے میں ہوں۔“ سیکنڈ ہاں آ کر بولی۔  
 ”تم یہاں کس کے ساتھ رہ رہی تھیں؟ وہ کہاں ہے؟“ سیکنڈ کی آمد اسے اس وقت بہت اچھی لگی تھی۔ انس کی قربت نے اسے پزل کر ڈالا تھا۔

”یہ میری آستانی کا گھر ہے، وہ ساتھ کے گاؤں گئی ہیں۔ کل تک واپس آئیں گی۔ مالکوں سے بچنے کے لیے مجھے یہی جگہ اچھی محسوس ہوئی۔“

”مائی سیکنڈ! تمہیں اپنے مالکوں کو اس طرح چھوڑ کر آنے کے بعد کوئی بچھتاوا تو نہیں ہوتا ہے؟“ کرن اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔  
 ”بچھتاوا ہوتا ہے، مالکوں کو چھوڑ کر آنے کا نہیں بلکہ ان ملازماؤں اور ملازمین کو چھوڑ کر آنے کا جو میرے بعد بالکل بے قیمت ہو گئے ہوں گے۔ مالکوں کے لیے ہم غریبوں کی عزت، عزت نہیں ہوتی، جان، جان نہیں ہوتی، ہم ان کے لیے کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور وہ اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”میں تنگ حرام نہیں ہوں، احسان فراموش بھی نہیں ہوں۔ میرا خاندان برسوں سے مالکوں کے ہاپ دادا کے زمانے سے خدمت کرتا آ رہا ہے کسی نے بھی ایسا نہیں کیا جو مجھے کرنا پڑا۔“  
 وہ باقاعدہ رو پڑی تھی۔

”افسوس مت کرو سیکنڈ! اچھے کام خوشی بخشتے ہیں، بچھتاوا نہیں، ہمارے اندر بھی ایک جج براجمان ہے جو نہ بک سکتا ہے اور نہ جک سکتا ہے۔ اس کے فیصلے ہر فرض و لالچ سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ سچے و کھرے فیصلے کرنے میں اپنا خانی نہیں رکھتا، وہ ضمیر ہے جو آپ کے ہر عمل پر کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ اچھے اور برے کا فیصلہ بھی بروقت صادر کرتا ہے۔“

کرن نے اسے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”میں بچھتا نہیں رہی بی بی صاحبہ، مجھے فکر وہاں کام کرنے والوں کی ہے۔ میرے کیے کی سزا نہیں ملے گی۔“ وہ سر پر اوڑھی چادر سے چہرہ صاف کرتے ہوئے آرزوگی سے گویا تھی۔

”سردی بڑھ رہی ہے۔“ انس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تو مائی سیکنڈ اپنے کمرے کی طرف شب بخیر کہتی ہوئی بڑھ گئی۔ انس

کے پیچھے وہ بھی اس کمرے میں آگئی تھی جہاں سیکڑ پتلونوں پر بستر بچھا گئی تھی۔ شاید وہ روٹی کے گدے تھے جن پر گلابی چادریں بچھی تھیں۔ ان پر میرون اور زرد دھڑکے ریشمی دھاگوں سے دیدہ زیب کڑھائی کی گئی تھی۔ غلافوں پر بھی ایسی کڑھائی تھی۔ پتنگ کی پانکھی پر موٹا سا پھول دار لحاف رکھا ہوا تھا۔ دوسرے پتنگ پر بھی ایسا ہی لحاف دیکھ کر موجود تھا۔

”ارے..... اندر آؤ، وہاں کیوں رک گئیں؟“ انس جو بے فکری سے پتنگ پر دراز ہو چکا تھا، خالی پتنگ دیکھ کر پیچھے مڑ کر کرن سے مخاطب ہوا جو تہذیب کے عالم میں کھڑی اٹھلیاں مردوزری تھی۔

”میں..... یہاں..... مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔“

چند قدم آگے بڑھ کر وہ رک گئی تھی۔

”یہاں نیند کیوں نہیں آئے گی؟“ وہ بیٹھتے ہوئے استعجاباً انداز میں گویا ہوا پھر اس کے بھٹکے چہرے، سرخ عارضوں پر لڑاں سیاہ پتلون کا اس کے اندر احساس جاگا، اس کا گریز، اس کی جھجک، اس کی حیا کنی اور اک بیدار کر گئی تھی۔

”میں مائی سیکڑ کے کمرے میں سو جاتی ہوں۔“ اس پر جو نئے احساسات وارد ہوئے، ان کی یورش سے وہ گھبرا گئی تھی۔

”وہاں کیوں؟ اس کے شرمائے، بوکھلائے، گھبرائے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے مصوم انداز میں کہہ رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ نئے رشتے کے احساس نے اس کے اندر ایک نشاط آمیز لگدگی ہی پیدا کر دی تھی۔ مستزاد اس پر کرن کے سسے سنائے روپ نے اسے شوخی عطا کی تھی۔

”یہاں کیوں نہیں؟“ وہ دوبارہ گویا ہوا۔ اسی انداز میں۔

کرن اس کی لٹا ہون کے بدلے رنگ، گھمبیر لہجے کی شوخی سے وہیں کھڑی رہ گئی، نہ آگے بڑھ سکی، نہ پیچھے ہٹ سکی۔ دل تھا کہ دھڑکتا ہی چلا گیا تھا۔

سائیس ریشمی دھاگوں کی طرح اُلجھنے لگی تھیں۔

رگ روپے میں عجیب سی سنناہٹ دوڑنے لگی تھی، وہ اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے پا رہی تھی۔

عجیب حالت تھی!

عجیب بے بسی!

”میں اس قدر ناقابل اعتبار ہوں کہ میرے مقابلے میں ملازمہ کو ترجیح دی جائے۔ مجھ سے کیا خوف ہے آپ کو؟“ سوال در سوال کا سلسلہ جاری تھا اور اس کی جانب سے جواب نہ دارو۔ وہ کھڑی رہتی تھی، ساکت و صامت کسی جیسے کی مانند۔

انس اٹھ کر آہٹگی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کے نزدیک آ کر رک گیا۔ کمرے میں جیسی روشنی تھی جس میں اس کا سی گرین سوٹ میں لمبوس وجود از حد بے کشش و بھرپور لگ رہا تھا۔ اس پر سے نگاہ ہٹانا مشکل لگ رہا تھا۔ بڑے حوصلے سے وہ اس مشکل سے نکلا تھا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بے حد بے ضرر سا بندہ ہوں، آپ کی خودداری، انا و عزت مجھے اپنی جان سے بڑھ

کر عزیز ہے۔ بے شک آپ کوئی غیر واجبی نہیں ہیں، میری شریک حیات ہیں، رب العزت کو گواہ بنا کر آپ کو اپنایا ہے، مجھ سے آپ کبھی فریب نہیں پائیں گی، کوئی شکایت نہ ہوگی، لیکن آپ کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا کہ جب تک دل سچی رفاقت کا طالب نہ بن جائے، جذلوں میں بے کھوٹ شدتیں در آئیں اور صرف آنکھوں میں ہی نہیں، دل و دماغ پر بھی آپ کا عکس، آپ کی عکرائی ہو، بالکل سچائی و دیانت داری سے ہم نئی زندگی کی ابتدا کریں گے، مجھے یقین ہے ایسا وقت آنے میں بہت تھوڑا عرصہ لگے گا، بہت تھوڑا وقت۔“

اس کا لہجہ شفیق و انداز دوستانہ تھا۔

کرن کی جان میں جان آئی۔ وہ گہری گہری سانس لیتی ہوئی، اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔ انس نے اسٹینڈ پر رکھے کولر سے گلاس بھر کر پانی پیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

”کیا بات ہے کوئی پرابلم؟“ اسے اس طرح پیشادیکھ کر وہ فکر مندی سے گویا ہوا۔

”مجھے حالات نے خوف زدہ کر رکھا ہے، آگے نہ معلوم کیا ہوگا؟“

اب دوسری پریشانیاں نمودار آئی تھیں۔

”کچھ نہیں ہوگا، جو کہ جتے ہیں وہ برستے نہیں۔ پھر ہم یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں، دو دن بعد۔ تب تک خود کو سنبھالو، خیال رکھو اپنا، اد کے گڈ ٹائم۔“ دھیمے لہجے میں سمجھا کر وہ کروٹ بدل کر سونے کی تیاری کر رہا تھا۔

کرن کو بھی نیند تو شدید آ رہی تھی، اس کے کروٹ بدلتے ہی وہ بے آواز انداز میں لیٹی اور لحاف اپنے اوپر اچھی طرح ڈال کر مطمئن ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

تیرے غم کا ہے وہ ساتھی.....

میرے بخت کا ستارہ.....

تیری آرزو نے لوٹا.....

تیری جستجو نے مارا.....

میں بساط زندگی پہ.....

غم آرزو کی بازی.....

کبھی ان کی شہ پہ جیتا.....

کبھی دل کی شہ پہ ہارا.....!

منال ہوش کی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ پچھلے دو دن وہ بالکل ہوش و حواس سے بیگانہ رہی تھی۔ حواس باختگی میں وہ انس مدثر کو

مخالفات کتنی چیتنی چلاتی رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے ذہنی سکون کی ادویات و انجکشنز دے کر سلائے رکھا تھا۔

وہ ذہنی طور پر خاصی ریلیکس ہو گئی تھی۔ دو دن قبل جو اس کی کنڈیشن تھی اس کے برعکس وہ بالکل خاموش لہٹی ہوئی تھی۔ بے حس و حرکت سیدھی لہٹی وہ چھت کو گھور رہی تھی۔ چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ آنکھوں میں دیرانی۔ گویا زندگی کے دیئے بجھے ہوں، خواہشوں کے کنول عارضوں پر مر جھا گئے۔ وہ جو بے حد خوش لباس و طرح دار تھی، ننوت سے جس کی پیشانی ممکن آلود رہتی تھی، مگر لباس پر کبھی ممکن نہ در آئی تھی۔ آج پیشانی ممکن سے پاک، ہندامت عرق سے تر تھی، لباس نہ ممکن تھا، وہ ہاری ہوئی بازی کی تصویر تھی، سانس لیتی، رنج و ملال میں ڈوبی ایک شکستہ لڑکی۔

فاقہ نے اسے دیکھا اور ان کی متاثر پ کر رہ گئی۔

”منال..... میری جان! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ انہوں نے بڑی شدت سے اسے سینے سے لگایا اور پیشانی چوم کر گویا ہوئیں۔

”مما! حالت بنائی نہیں جاتی، حالت بنا دی جاتی ہے جو میری اس حالت کا ذمہ دار ہے، آپ اس سے معلوم کر سکتی ہیں؟ اس نے کیوں میرے ساتھ ایسا کیا؟ کیوں مجھے دھوکہ دیا؟“ اس کی آواز میں دکھ کے ساگر اٹھ پڑے تھے۔ لہجے کا وہ مطلق مزاج کا وہ جلال مفقود تھا۔ بہت بڑی شکست کھائی تھی اس نے اپنے جذبوں سے، اپنی محبت سے، ان دکھوں کا کوئی مداوا ممکن نہ تھا۔

”مجھے جاہ کر دیا اس نے، برباد کر دیا، میں کیا کروں؟“ وہ بے آواز رونے لگی۔

”دفع کر داسے، وہ اس قابل تھا ہی نہیں کہ ہم اس سے کوئی بھی واسطہ رکھتے۔ بہت عرصہ قبل تم اسے اس کی اوقات بتا چکی تھیں، پھر نہ معلوم کیا ہوا ہے تمہیں؟ جو تم اس سے اٹیچڈ ہوئیں۔“ فاقہ نشوونما سے اس کی آنکھیں صاف کرتی ہوئی گویا ہوئیں۔

”اوقات تو اس نے مجھے بتا دی ہے کہ کچھ بھی نہ لگا اور میں بلندی سے پستی میں گر گئی ہوں۔“

”بار بار نام مت لو اس کا۔“ وہ جھنجھلا گئی تھیں۔

”سوری ممما!“

”میں اتنی دور سے آئی ہوں، میری کوئی پروا نہیں ہے تمہیں۔ تم اس کی خاطر میری بھی پروا نہیں کر رہی ہو۔ میں جو اتنی دور سے تمہاری خاطر تمہارے پاس آئی ہوں۔“

”کاش! آپ یہاں سے جاتیں نہیں اور اگر جانا اتنا ہی ضروری تھا تو اس طرح نہیں جاتیں جس کا التزام آج تک مجھے گالیوں، طعنوں کی صورت میں سنا پڑتا ہے۔ گریڈ مڈر مجھے ہمیشہ سے آپ کے حوالے سے تیز کرتی آئی ہیں، مگر اس نے بھی مجھے آپ کے حوالے سے تیز کیا، اس کی آنکھوں کی نفرت، اس کے لہجے کی نفرت، مجھے مارنے کے لیے بہت کافی تھی کہ اس نے مجھے مرنے بھی نہ دیا۔“

اس کی نگاہوں میں اس وقت کی ویڈیو چل رہی تھی۔ جب وہ اتھاٹا اس اور کرن سے ملی تھی۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک لفظ اس کے اندر عضو بن کر جم گیا تھا۔

”اس نے میرے سامنے ان محبت لٹائی نگاہوں سے کرن کی جانب دیکھا جس طرح کبھی وہ میرے جانب دیکھتا تھا اور بڑی محبت سے اس نے کرن کی کمر کے گرد بازو حائل کر کے تھاما تھا اور..... اور یہی لمحہ میری، میرے جسم سے نکلتی روح کو واپس کھینچ لایا تھا۔ میں شاکڈ رہ گئی، وہ نہ معلوم کیا ہو گیا، جو نہ ہونا چاہیے تھا۔ بے تکلفی و دوستی کے باوجود اس نے کبھی مجھے انگلی سے بھی چھوا نہ تھا، میرے نہ چاہنے کے باوجود بے حد فاصلہ رکھا تھا۔“

کہتے کہتے اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔

”وہ کرن سے شادی کر چکا ہے اور دونوں فرار ہیں۔“

”یہ آفر تو پہلے اس نے مجھے کی تھی، وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اب..... کرن مائی اسٹیپ سسٹر، جو کل تک نہ جانے کہاں تھی اور نہ معلوم کیا کریئر ہے اس کا، وہ اس پر مر مٹا ہے۔ وہ کہتا ہے وہ ایک پاک باز، شریف و باوقار عورت کی بیٹی ہے۔ ایسی عورت کی بیٹی سے شادی کر کے وہ خوش ہے۔“

”منال! مائی چائلڈ کول ڈاؤن، سب بھول جاؤ، جو ہوا وہ سب فراموش کرنے کے لیے ہے۔“ قاتقہ نے اسے بھرپور سے لگا لیا۔ اپنے بارے میں ملنے والے ریمارکس نے انہیں ہلکی سی شرمندگی میں مبتلا کیا تھا کہ ان کی حرکات منال کے لیے کوفت بنی تھیں۔

”میں نہیں بھول سکتی، اس نے میرے سامنے اسے چھوا، خود سے قریب کیا، اوہ مائی گاڈ! میں کیسے بھول پاؤں گی یہ سب؟“ اس نے دیہانگی میں اپنے بال نوچنے شروع کر دیئے تھے۔

”اسٹاپ! اسٹاپ! اسٹاپ! ہوش میں آؤ، کیا پاگل پن ہے یہ، اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تاکہ تم خود کو نقصان پہنچاؤ، کرن سے شادی کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم سوچ سوچ کر ہی خود کو اذیت دیتی رہو، تکلیف میں مبتلا رہو۔“

بڑی دقتوں سے وہ منال کو ریلیکس کر سکی تھیں۔

”مما! میں اس کے قریب کسی کو نہیں دیکھ سکتی، کسی کو بھی۔“

”وہ پھر رو پڑی تھی، عجیب حالت تھی اس کی کہ کسی پل جھکن نہ تھا۔“

”تم بھی تو کسی کے قریب رہی ہو، سرد شاہ کے سنگ تم نے بھی تو وقت گزارا ہے، میرا ڈائف تم گزار چکی ہو۔“

”جو دوسرا سرد شاہ کا ضرور ہا ماما مگر چہرہ اُنس کا ہی میری نگاہوں میں رہتا تھا۔ فرق چہرے سے پڑتا ہے، جسم سے نہیں۔“

ڈاکٹر اور نرس کے کمرے میں آنے کے باعث وہ خاموش ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

راحیلہ بیگم ہزار ہا کوشش کے باوجود اپنی خواہش منوانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ عاصم صاحب کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھے۔

حزہ موجود ہوتے ہوئے غیر موجودگی کا احساس دلانے رکھتا تھا۔ اس کی حالت سے وہ بخوبی واقف تھیں کہ شادی سے بے زاری و لاتعلقی کا

سبب کیا ہے۔ کرن میں اس کی دلچسپی و وارفتگی وہ بہت عرصے پہلے محسوس کر چکی تھیں، یہی وجہ تھی کہ وہ ان ماں بیٹی کو یہاں سے نکالنے کے ورپے رہتی تھیں، بہت مہارت و چالاکی سے انہوں نے بساط بچھائی تھی اور جیت گئی تھیں۔

وہ ماں بیٹی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا چکی تھیں مگر کچھ جیت ایسی بھی ہوتی ہے جس کو جیت کر بھی شکست و نا آسودگی کا احساس رہتا ہے، وہ بھی اسی کیفیت کا شکار تھیں۔ تند اور اس کی بیٹی کو دور کرنے کے چکر میں وہ بیٹے کو بھی خود سے دور کر چکی تھیں، کھو چکی تھیں۔ وہ ان کے قریب بیٹھتا، لنگھو کرتا، خیال رکھتا، مگر محسوس ہوتا وہ اس کی ولی و ابھنگی اور اس کی محبت کو کھو بیٹھی ہیں جو پہلے تھی۔ اب محسوس ہوتا وہ فرض بھار رہا ہے، اس کی محبت و خیال مصنوعی پھولوں کی طرح جذبوں کی مہک سے خالی ہوتے تھے۔

بہت سوچ و بچار کے بعد انہوں نے یہ حل نکالا کہ اس کی شادی مہوش سے کروادی جائے تو وہ کرن کو بھول جائے گا اور کرن کی یاد اس کے دل سے نکلے گی تو از خود ان کی طرف لوٹ آئے گا۔ وہ جتنی جلدی یہ سب چاہ رہی تھیں اتنی یہاں خاموشی تھی۔ صبر ہاسٹل سے آیا تو وہ اس کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔

”تم ہی سمجھاؤ، مزہ کو، کیوں زندگی خراب کر رہا ہے، کب کرے گا شادی، یہی عمر ہوتی ہے شادی کی، میں اب تھک گئی ہوں۔ مزید طاقت نہیں ہے مجھ میں گھر داری کی، مگر میں بہو آئے، میرا بوجھ کم ہوگا، مجھے آرام ملے گا۔“

”مما! اچانے آپ کو سمجھایا تھا، اس دور کی بہو بیٹی ثابت نہیں ہوتی ہے۔ پہلے لڑکیوں کو نصیحت کی جاتی تھی جس گھر کی دلہن بڑی ولی میں پار کی ہے وہاں سے جنازے کی صورت میں باہر نکلتا اور اس دور میں تو بہنیں سسرال والوں کے جنازے نکال دیتی ہیں۔“ صبر ہنس کر گویا ہوا۔

”اولاد کے من میں بھی ماپ کی ہی زبان بول رہی ہے۔ ہونہ، میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے بیٹوں کی نظر میں، نہ شوہر کی نظر میں۔“

اس بار وہ سچ دل کر گئی کا شکار ہو گئیں۔

”مما! ممانیشن کیوں لیتی ہیں آپ۔“ وہ ماں کے قریب بیٹھ کر محبت سے گویا ہوا۔

”وہ بیٹی پریشانی میں تم لوگ خود جتا کرتے ہو، تم لوگوں کو میری پروا نہیں ہے۔ میں کیا کہتی ہوں، کیا چاہتی ہوں، کیا سوچتی ہوں، تم لوگ جان بوجھ کر مجھے اور میری خواہشوں کو نظر انداز کرتے ہو، جیسے میں کچھ سمجھتی نہیں ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے آپ مہوش اور مزہ کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔“

”ہاں تو کیا غلط چاہتی ہوں؟ کیا برائی ہے مہوش میں؟“ وہ غصے سے ہاتھ لہرا کر گویا ہوئیں۔

”وہ خوب صورت نہیں ہے؟ خاندانی نہیں ہے؟ کوئی عیب ہے؟“

”مما! میرے خیال میں آپ جانتی ہیں مزہ کیا چاہتا تھا۔“ صبر نے ماں کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں..... ہاں میں جانتی ہوں مگر اب کیا فائدہ کرن یہاں سے جا چکی ہے، نوشاہہ بھی اس دنیا میں نہیں، پھر کیوں وہ دیوانہ بن رہا ہے، خود کو روگ لگا رہا ہے۔“ ان کا لہجہ ملامت سے عاری تھا۔



”آپ پہلے سے سب جانتی ہیں ماما، پھر کیوں آپ نے وہ سب کیا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کے اور حمزہ کے درمیان دیوار بن گیا ہے، بلاشبہ وہ آپ کی بے حد عزت کرتا ہے، احترام کرتا ہے مگر آپ کے اور اس کے درمیان وہ جھگ و تکلف کا خلا پیدا ہو گیا ہے جو مجھے ڈر ہے آگے جا کر اندھی کمائی میں تہدیل نہ ہو جائے۔“ بہت سنجیدگی سے وہ اپنی فیملنگو بیان کر رہا تھا۔

”اس سے بھی بڑھ کر مجھوں دیکھے ہیں میں نے، یہ سب بے زاری و بے نیازی شادی سے پہلے ہوتی ہے، بعد میں سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ مجھے ڈرانے کے بجائے حمزہ کو راضی کرنے کی کوشش کرو، مہوش سے شادی کرنے کے لیے، ایک بار مہوش دلہن بن کر اس گھر میں آ جائے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ راحیلہ سے رسائیت سے سمجھانے لگی تھیں۔

”ارے بھائی! تم ماما کی بات کیوں نہیں مان لیتے، وہ زیادہ ڈسٹرنس کا شکار رہنے لگی ہیں۔ تمہاری لاپرواہی و بے نیازی سے۔“

صدر راحیلہ بیگم کے پاس سے اٹھ کر باہر نکلا تو حمزہ اسے کسی کام سے باہر جاتا ہوا مل گیا تو وہ اس کے ساتھ آ گیا تھا۔

”ماما کا کام ہی پراہمز کری ایٹ کرنا ہے۔“ وہ کار گیٹ سے نکلا ہوا سنجیدگی سے بولا تھا۔

”ہلیز، اپنے خول سے باہر نکل آؤ۔ ماما پہلے سے بہت پہنچ ہو گئی ہیں، پرانی کوئی بات ان میں نہیں ہے۔“

”وہ میری ماں ہیں میرے لیے از حد قابل احترام و معتبر ہستی ہیں۔ میں ان کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کر سکتا ہوں مگر جس طرح کابی بیوئیر ان کا پھوسا اور کرن کے ساتھ رہا پھر جس طرح انہیں اس گھر سے نکالا، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس قدر گھٹیا اور ذلیل

الزام کرن پر لگایا کہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا اس سبکی کو، جو اس نے محسوس کی، صابر و بے قصور پھوسو کے چہرے پر پڑنے والے تھپڑ کا نشان تاحیات میری روح پر شہت رہے گا۔ اس درد کو میں کبھی نہ بھول پاؤں گا جو ان کا آخری دیدار نہ ہونے پر میرے دل میں موجود رہے گا۔ میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔“ اس کا لہجہ دھواں دھواں سا تھا۔

”بہت ایسوشل ہو رہے ہو یار! میرا خیال ہے تم مہوش سے شادی کر لو، زندگی میں تیا پہنچ آئے گا تو اچھا ہوگا۔“

”مہوش سے شادی..... اس اسپاٹل، ماما کو بہت پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا میں کرن میں انٹرنل ہوں، بس وہیں سے ماما نے میری

ماں نہیں پھوسو کی تند بن کر سوچنا شروع کیا اور ان کی راہوں میں کانٹے پھیلانے تب ہی شروع کر دیے، اگر وہ میری ماں بن کر سوچتیں تو کرن انہیں اچھی لگتی، جیسے مہوش لگتی ہے مگر انہوں نے کچھ سوچا تو یہی کہ کسی نہ کسی طرح ان دونوں کو کسی ایسے الزام کے تحت یہاں سے نکالا جائے کہ پھر کبھی ان کی واپسی ممکن ہی نہ ہو اور.....“ اس نے طویل سانس لی۔ ”ایسا ہی ہوا انہوں نے ماما کی پلاننگ ٹیل نہ ہونے دی اور اب ماما چاہتی ہیں میں ان کے خواہوں کو تعبیر دوں، اپنی حسرتوں کی قبر پر ان کی خواہشوں کی بیج سجاؤں، تو یہ ممکن نہیں ہے، مہوش کی خاطر کرن در بدر ہوئی تھی، کرن نہیں تو مہوش بھی نہیں۔“

”تم خود کو.....“ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ مضبوط ہو گئے تھے۔

”یہ کسی احقانہ مزاج ہے۔“

”کوئی اور بات کرو، آج دل بہت اُداس ہے۔“

”تم پر تو اُداسیوں کا موسم چھا گیا ہے۔ میری حالت پر رحم کھاؤ۔ میں نے ابھی ڈھنگ سے بہاریں بھی انجانے نہیں کی ہیں۔ مجھے اپنی اُداسیوں سے بچاؤ جو تم نے خود پر طاری کی ہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

☆.....☆.....☆

صبح وہ ناشتہ کر کے روانہ ہو گئے تھے۔

دو دن بعد انہیں امریکہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔

لیکن کوہ سبھا کر آئے تھے کہ اسے کس وقت ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔ احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ اسے ساتھ لے جا رہے تھے۔ اسے ان کے جانے کے ایک ہفتے بعد وہاں پہنچنا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“ لہلہاتے کھیتوں کے درمیان پتلی سڑک پر کارڈرائیو کرتے انس نے کرن سے پوچھا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں تھکان درآئی تھی۔

”میرے ساتھ امریکہ جانے پر خوش تو ہیں؟ کبھی پلاننگ کی تھی اپنے ملک سے باہر جانے کی؟“

”آپ کے ساتھ جا رہی ہوں، میرے لیے یہی اطمینان کافی ہے۔ اچھے اور برے کی ٹینگو میں ابھی نہیں کر پار ہی ہوں۔“

”آئی نو، آئی نو۔“ انس کا انداز اس کے ساتھ بے حدود ستانہ ہوتا تھا، کچھ کچھ بے تکلفی کے ہمراہ۔

”لیکن مجھے کبھی بھی ایسے لوگ پسند نہیں رہے جو اپنے وطن پر دوسرے غیر وطن کو ترجیح دیتے ہیں۔ وطن کی محبت میں ہم سب کچھ برداشت کرتے ہیں۔“ اس کے انداز پر انس مسکرا کر بولا۔

”میں ایسا ہرگز نہیں کرتا، زیادہ تر میں ملک سے باہر رہتا ہوں، مگر ہر جگہ اپنے وطن کی یاد آتی ہے، نہ مجھے کبھی یہاں کے موسم سے الرجی ہوئی نہ ماحول سے تھکن، صرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنی مٹی اپنی ہوتی ہے، اپنی مٹی کی خوشبو آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔“

”آپ کی تربیت میں زیادہ حصہ گرنی کارہا ہے اور گرنی کتنی وطن پرست ہیں، میں بخوبی جانتی ہوں۔“

”میرے متعلق کتنا جانتی ہیں؟“ اس نے کرن کی جانب دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں کہا۔

”بالکل بھی نہیں۔“ کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوئی تھی۔

”اچھا..... پھر کب سے جانا شروع کریں گی؟“

اس کا گھبرایا، شرمایا انداز اسے از حد شوٹی کرنے پر مجبور کرتا تھا، اس بار بھی اس کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھ کر وہ کوشش کے باوجود اس پر سے لگا ہیں ہٹانہ پار ہاتا تھا۔

”مجھے میری بات کا جواب نہیں ملا ہے“۔ اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

”یہ کوئی سوال نہیں ہے“۔ وہ آہستگی سے بولی۔

”سوال نہیں ہے تو درخواست سمجھ لیجئے، اتنا فریاد جو دل چاہے سمجھ جائیے“۔ اس کے سرخی مائل ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”گر مینی ہمارے ساتھ ہوں گی نا؟“ کرن اسے پٹری سے اترتے دیکھ کر موضوع بدلنے ہوئے گویا ہوئی۔

”ہوں، سعد نے بڑی محنت سے راضی کیا ہے انہیں ساتھ چلنے پر، ورنہ وہ کسی طور مان کر نہ دے رہی تھیں۔ ہم وہیں چل رہے

ہیں“۔ وہ بھی سنجیدگی اختیار کر گیا تھا۔ باقی راستہ بالکی پھلکی گفتگو میں گزرا تھا۔ حسب توقع سعد اور فاریہ نے بڑی گرم جوشی اور دلہانہ پن

سے ان کا استقبال کیا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی اسے گر مینی سے مل کر ہوئی تھی۔ ان کے اعزاز میں محبت و خلوص کی چاشنی موجود تھی۔ سب

سے پہلے انہوں نے کرن کو سینے سے لگا کر پیشانی چوم کر دعاؤں سے نوازا تھا۔

”گر مینی! آپ نے فوراً ہی پارٹی بدل لی، مابدولت کی اب کوئی عزت نہیں رہی ہے، جو آپ نے میرے بجائے ان کو سینے سے

لگایا ہے“۔

کرن کے بعد گر مینی اس سے ملیں تو وہ ہلکے کر بیٹھا تھا۔

”اب میری بہو کے بعد تمہارا نمبر آئے گا۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے کہ اس نے مجھے یہ دن دیکھنے تو نصیب کیے، ورنہ مجھے

لگتا تھا کہ میں یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی مر جاؤں گی“۔ وہ خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے گویا ہوئیں، ان کے چہرے پر سکون و قرار درآ یا تھا۔

”سنجالیس بہو کو میں تو چلا“۔ وہ رست و اچ دیکھا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ گر مینی سے نقل سعد کہہ اٹھا۔

”سائیٹ میں کچھ بزنس کے کام سے جا رہا ہوں“۔

”اس طرح تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے، کام اتنا ضروری ہے تو مجھے بتاؤ میں کراتا ہوں مگر تمہیں جانے نہیں دوں گا“۔

”تمہارا کیا مقصد ہے میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤں یہاں پر؟“ وہ زہری طرح سے چڑ گیا تھا۔

”ارے کوئی سمجھائے تو سمجھ جانا چاہیے۔ ایک تو تمہارے بھلے کو کہہ رہا ہے وہ، اوپر سے تم اسی کو آنکھیں دکھا رہے ہو، بھلائی تو

وقت ہی نہیں رہا ہے“۔ گر مینی نے پوری طرح اس کی خیر لے ڈالی تھی۔

”سوری گر مینی! میرا مطلب ہے میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے“۔

”کیوں سارے دشمنوں کو تم نے نکھی بنا کر دیواروں سے چپکا دیا ہے یا تمہیں سلیمانی ٹوپی مل گئی ہے جس کو پہن کر تم کسی کو نظر نہیں

آؤ گے؟“

”کچھ ایسا ہی سمجھ لیجئے“۔

”سیدھی طرح بتاتا ہے یا ماروں دو جھانپڑ؟“

”گرینی! میری نئی لوہیلی ڈلہن کے آگے تو میری عزت خراب نہ کریں، تھوڑا تو بھرم قائم رہنے دیں۔“ وہ ایسی مسکین صورت بنا کر بولا کہ وہ سب بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

”تیری بیوی کیا تیرے بچوں کے سامنے بھی تیرا یہی رویہ رہا تو جو تے لگاؤں گی۔“ گرینی کرن کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں، جس نے چہرہ جھکا لیا تھا، اسی دم قاریہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ سب ڈانٹنگ روم کی جانب بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

ایک محبت میں نے کی ہے  
روشن آنکھیں اُچلے آنسو  
تیرے پیار کو دان کیے ہیں  
چاہت کے احساس تمہارے نام کیے ہیں  
نیندیں دی ہیں  
خواب بٹے ہیں  
رسوائی کو نام کیا ہے  
اپنی ذات پہ داغ لیے ہیں  
سچے جذبوں والی محبت  
تیری ذات پہ صدقے کی ہے  
رات رات بھر جاگ کر کتنی  
غم آنکھوں سے دعائیں کی ہیں  
ایک محبت میں نے کی ہے.....!  
ایک محبت تم نے کی ہے.....!  
ایسی ٹھوس اور ایسی بے حس  
جس پر دل کا ہر آنسو  
پانی کی طرح بہ جائے  
میرے اندر رھنے چلیں

اور اس کی اتا پر آٹھ نئے  
 بچرہ بچے، پھر آگئیں  
 یہ جذبوں کی دولت دی ہے  
 ایک محبت تم نے کی ہے.....!  
 انس.....!  
 انس.....!  
 انس.....!

دیواروں پر فرنیچر پر لائٹ پنک کارپٹ پر ہر جگہ سیاہ و نیلی لکھائی سے انس نام جگمگا رہا تھا۔

فائدہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو حیرت و تاسف سے چکرائیں۔ منال ہاسٹل سے ڈسچارج ہوئی تو برہان لغاری منال کو گھر لے آئے تھے۔ فائدہ جو پہلے ہی ہوٹل میں رہائش رکھنا نہیں چاہ رہی تھیں، منال کے ہمراہ خود بھی چلی آئی تھیں۔ اس بار برہان لغاری انہیں منع نہ کر سکے تھے، البتہ والدہ حضور کو اس کی آمد بے حد ناگوار مزی تھی، ان کے ہی حکم پر فائدہ کو گیسٹ روم میں ٹھہرایا گیا تھا۔ منال کو اسی کا کمرہ دیا گیا تھا۔

رات میں وہ کھانا کھا کر سوئیں تو دن چڑھے تک سوئی رہی تھیں۔ اب سے کچھ دیر قبل ملازم نے کھانا گلنے کی اطلاع دی تو وہ بیدار ہوئی تھیں۔ ہاتھ لینے کے بعد تیار ہو کر وہ منال کے پاس آئی تھیں کہ معلوم کر سکیں کہ اس کی طبیعت کیسی ہے، اس نے ناشتہ کیا یا نہیں۔ یہاں آ کر تو ان کے ہاتھ بیروں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

انس کا نام رنگ برنگی سیاہیوں میں درود دیوار، فرنیچر پر نمایاں تھا، قالین پر جا بجا مار کر زور پوٹھل زبکھرے ہوئے تھے۔ بکھرے بال و شکن آلود لباس میں ملبوس منال بھیل کی شفاف سلح پر تیزی سے نام لکھنے میں مصروف تھی۔

اُلجھے بال.....!

بے ترتیب حلیہ

وہ تڑپ کر رہ گئیں۔

”منال! یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ کیا ہے؟“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے رنجیدگی سے استفسار کرنے لگیں، مگر منال نے کوئی توجہ نہ دی۔

”منال!..... مائی بے بی! یہ کیا ہو رہا ہے؟“ انہوں نے اس کا جھکا ہوا سر دائیں ہاتھ سے اوپر کرتے ہوئے کہا۔

”مما!! چھا لگ رہا ہے نا؟“ وہ ناموں پر نگاہ دوڑاتی ہوئی خوشی سے سرشار لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”کیا ہے یہ؟“

”میرادل“

”پلیز سنبالا خود کو، یہ بے وقوفی ہے، امتحانہ پن ہے۔“

”یہ میرادل ہے، میری زندگی ہے، آپ سمجھ نہیں رہی ہیں ماما۔“

”میں کہتی ہوں، ہوش میں رہو، برہان کس قدر فرسٹ ہو رہے ہیں اس شخص کی وجہ سے اور آپ! اسی وقت نکلوا اس کمرے سے برہان آگے تو مسئلہ ہو جائے گا۔ کسی ملازم سے کہہ کر خاموشی سے کمرہ صاف کروادوں گی۔“ انہوں نے زبردستی اسے کھڑا کیا تھا۔

”نہیں۔“ وہ ان سے ہاتھ چھڑا کر دوڑ ہوئی، خفگی بھرے انداز میں۔

”میں کبھی بھی اس کمرے سے نہیں نکلوں گی۔“

”وہاٹ؟ کیا کہہ رہی ہو۔“ فائدہ کو اس کی دماغی حالت پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔

”میں اس کمرے سے کبھی بھی نہیں نکلوں گی تاکہ آپ کمرہ واش نہ کروا سکیں۔“ وہ اس وقت فہم و شعور کی حد سے نکلی ہوئی تھی۔

”ایسا کیا ہے اس مرد میں، جس کی خاطر تم نے یہ حالت بنالی ہے۔“ ان کے لہجے میں غصہ و نفرت جھلکنے لگا تھا۔

”وہ بہت سویٹ ہے، بہت کیئرنگ، بہت لونگ۔“

”شٹ اپ، شیم ان یومثال اس نے تمہیں ان حالوں تک پہنچایا تمہارے قادر کی انسلٹ کی، پورا سوشل مرکل ڈاؤن کر دیا، اس کے باوجود تم اس کے گیت گارہی ہو۔“ وہ غصے میں پوتی چلی گئیں۔

”چنانچہ اس کا بھی کبھی ایسا ہی حال کروایا تھا۔ اس کے آفس کے لاکر سے میں نے ہی اپورٹنٹ ڈاکومنٹس چوری کر کے

دیئے تھے۔ آج پچا جو ہائی اسٹینڈرڈ کے بزنسنگ بے بیٹھے ہیں، ہائی سوسائٹی میں موو کرتے ہیں، سب میری وجہ سے اور انس کی وجہ سے

ہے، نہ وہ مجھ پر اتنا اعتبار کرتا، نہ مجھے موقع فراہم ہوتا، نہ یہ سب حاصل ہوتا جس کو حاصل کر کے وہ اکتا رہے ہیں۔“ اس کا انداز کھرا تھا۔

”جو اس مت کرو، تمہارا باپ، خاندانی ریٹس ہے۔“

”جس طرح خاندانی ریٹس اپنی عیاشیوں و بدکاریوں میں دولت لٹا دیتے ہیں، بیٹا بھی لٹا چکے تھے، مزید دولت کے حصول کے

لیے ہی انہوں نے انس کو بکرا بتایا تھا میرے لیے۔“ اس کی اونچی آواز اندر داخل ہوتے ہوئے برہان لغاری کے کانوں میں پہنچ رہی تھی، وہ

وہیں رُک کر ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ شدید ترین توہین و اشتعال سے ان کی حالت بُری تھی۔

”میں تو سمجھی تھی تم پاگل ہو گئی ہو مگر نہیں، تم خود تو ٹھیک ہو مگر ہمیں پاگل کر دو گی۔“ وہ بیڑا تاتی ہوئی چلتی تھیں اور پردے کے قریب

کھڑے برہان لغاری کو دیکھ کر کھڑکی کی کھڑکی رہ گئیں۔



سرخ چہرہ، ہورنگ آنکھیں اور آنکھوں سے نکلتی تہر و غضب کی بجلیاں فاقہ کچھ نہ بول سکیں، منال نے انہیں دیکھا، بہت لاپرواہ انداز میں۔

”یہ پاگل پن کی انتہا ہے اسٹوڈنٹ، جس خبیثت کی میں شکل دیکھنے کا روادار نہیں ہوں، اس کا نام تم میرے گھر میں لکھ رہی ہو۔ ان کے لہجے سے چنگاریاں ہی پھوٹ رہی تھیں۔

”وہ میرا ہے، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی ہوں۔“

”بکواس بند کرو ایڈیٹ۔“

”یہ بکواس نہیں میرے دل کی صدا ہے، اس میرا ہے، صرف میرا.....“

منال حواسوں سے بیگانہ بے ربط ہوتی چلی گئی اور برہان لغاری کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے سخت جنونی کیفیت میں منال کے رخساروں پر یکے بعد دیگرے کئی تھپڑ لگائے تھے۔

”خدا کے لیے برہان! بس کریں۔“ فاقہ نے ان کے ہاتھ پکڑے ہوئے بھرائے لہجے میں کہا۔

”تم، درمیان میں مت آؤ، یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔“ وہ ان سے ہاتھ چمڑا کر چمکھائے، جبکہ منال چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”ریلیکس پلیز ریلیکس، منال ابھی ایب نارمل ہے، اسے نارمل ہونے کے لیے کچھ وقت چاہیے، ایب نارمل کنڈیشن میں یہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔“ فاقہ کے لہجے میں کھلمکھی نرمی و گداز پن تھا کہ برہان لغاری کو اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ میں کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

”میں بھی بے حد آپ سیٹ ہوں، بہت پریشاں آؤ، یہ ذلیل مجھے گلست پہ گلست دیتا جا رہا ہے، میری ہر بازی مات ہو رہی ہے، میں چاہنے کے باوجود اس کا کچھ نہیں کر پا رہا ہوں۔“ وہ کپٹھیاں سہلاتے پریشانی سے کہہ رہے تھے۔

”آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں، آپ تنہا نہیں ہیں، میں ہوں آپ کے ساتھ، ہمارے درمیان میر ڈریبلین شپ نہ سہی مگر فرینڈ شپ تو ہو سکتی ہے۔“ انہیں نرم دیکھ کر وہ دل کی خواہش لیبوں پر لے آئی تھیں۔

”ایک کلوز فرینڈ کی طرح آپ اپنے تمام دکھ، سارے پرالمز، مجھ سے شیئر کریں اور خود ریلیکس ہو جائیں، میں آپ کے تمام دکھ پکوں سے چن لوں گی۔“ وہ برہان لغاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوئی تھیں۔

منال اندر کمرے میں رو رہی تھی، وہ انہیں باہر لاؤنج میں لے آئی تھیں۔

”تھینکس۔“ وہ ممنون لگا ہوں سے فاقہ کی جانب دیکھتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گئے تھے۔

فاقہ نے سرعت سے آگے بڑھ کر ان کے بالوں میں آہستہ آہستہ اٹھایاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ برہان نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ چند لمحوں بعد ان کو سکون و راحت کا احساس ہونے لگا، گویا فاقہ کی انگلیوں میں ایسا جادو تھا جو ان کے اندر طمانیت بھر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”حزہ! آپ یہاں ہیں۔ میں نے ہر جگہ دیکھ لیا آپ کو اور آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔“ مہوش اس سے آکر مخاطب ہوئی جو اپنی سوچوں میں گم لاہریری روم میں بیٹھا تھا۔

حزہ نے ایک نگاہ اس پر ڈالی، کسی جذبے، کسی احساس سے عاری نگاہ۔

”میں تم سے کیوں چھپوں گا؟ میں نے کیا چوری کی ہے؟“ وہ دھیسے سے مسکرا کر گویا ہوا تھا۔

”آپ کو نہیں معلوم؟“ وہ کہنیوں کے بل نخیل پر بیٹھی اور جھک کر اس کے چہرے کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جذباتی

لہجے میں بولی۔

”میری نیند، میرا صحت اور..... میرا دل چوری کیا ہے آپ نے اور.....“

”اسناپ اٹ.....“ حزہ ہاتھ سے اسے پرے دھکیلتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک دم ہی اس کی کیفیت بدل گئی تھی۔ لمبے بھر قلم نرم

خوشنق نظر آنے والا حزہ یکنخت ہی تند خو مشتعل دکھائی دینے لگا تھا، وہ ہکا بکار ہو گئی۔

”مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے؟“ پہلی بار اسے غصے میں دیکھا تو وہ کانپ اٹھی۔

”میں نے تمہیں پہلے بھی تنبیہ کی تھی اور اب آخری بار کر رہا ہوں کہ مجھ سے کبھی بھی ایسی خواہشات کی امید مت رکھنا جو گلاب

نہیں انگارے بن جائیں۔ ایسی آگ بن جائیں جو نہ صرف جسم و جاں، بلکہ روح کو بھی خاکستر کر دے۔“ حزہ کا لہجہ بے حد تند اور کڑوا تھا۔

”اس آگ میں پہلے ہی جل رہی ہوں، آپ کی بے زحمتی و بے نیازی کی آگ سے بڑھ کر کبھی کوئی تپش ہوگی بھلا۔“ اپنی چاہت

کی ایسی تسک پر مہوش دھیرے دھیرے سک اٹھی تھی۔

”تم سے کس نے کہا، اس شعلوں بھری راہ پر چلو، جس کی کوئی منزل نہیں۔“

”میرے دل نے۔“ وہ آہستگی سے سکی۔

”بیوقوفی، پاگل پن، جو دل کے کہنے پر چلتا ہے، وہ ہوش و خرد سے عاری ہوتا ہے مہوش! ابھی بھی دیر نہیں ہوئی تم چند قدم اس راہ

پر چلی ہو جو تمہارے لیے نہیں ہے، بہتر ہے واپس پلٹ جاؤ، اسی میں عافیت و نجات ہے۔ اس راہ پر جو چلا ہے وہ چلتا ہی رہا ہے پھر بھی

منزل نہیں ملی۔“

مہوش کے آنسو اور چہرے پر چھائی بدحواسی اس کا دل موم کر گئی تھی، وہ اسے سمجھاتے ہوئے نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”میں مجبور ہوں، بے بس ہوں، اس معاملے میں جتنا پیچھے بننا چاہتی ہوں، اتنا ہی خود کو بے بس والا چار پاتی ہوں۔ میں آپ

سے کچھ نہیں مانگتی، کچھ نہیں چاہتی سوائے اس کے..... کہ آپ مجھے اپنی زندگی میں شامل کر لیں، اپنا نام دے دیں، میں کچھ نہیں مانگوں گی،

میرے لیے صرف یہی حقیقت کافی ہوگی کہ آپ میرے ہیں۔“ پیار کی آنچ سے سلگتا ہوا اس کا لہجہ اڑتی رگت و بکھرتے حواس پتہ دے

رہے تھے کہ وہ عشق کی وادی کی باسی بن چکی ہے۔



”مہوش! تم اچھی لڑکی ہو، تمہیں پانے والا اپنے نصیب پر رشک کرے گا، دُنیا بھر کی راحتیں دوسرے تمہیں نصیب ہوں گے، مجھے بھول جاؤ، میں وہ چراغ ہوں جو نہ اپنی راہ روشن کر سکتا ہے، نہ کسی اور کو روشنی دے سکتا ہے، مجھے بھول جاؤ۔“ وہ کہہ کر زکائیں، سیدھا چلا گیا۔ راحیلہ بیگم جو کھڑکی سے سب دیکھ رہی تھیں، جزوہ کے بے چلک انداز مہوش کی بے قرار یوں کو دیکھ کر مضطرب ہو گئی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا، خواہ کچھ بھی ہو وہ اب جزوہ کی شادی کروا کر ہی دم لیں گی، جزوہ نے بہت من مانی کر لی۔

☆.....☆.....☆

ڈوہتے سورج کی بنفشی شعاعیں ہر نوسونہ تکبیر رہی تھیں۔ ماحول پر سکوت طاری تھا، ہوا کی سرسراہٹوں میں برف کی سی نمی تھی۔ والدہ حضور کے کمرے میں بیٹرا آن تھا۔

برہان لغاری اس کے رُوبرو بیٹھے تھے، درمیانی میز پر کالج کی قمیص پھیلے ہوئے تھی۔ والدہ حضور کی خواہش پر ملازمہ گرین ٹی کچھ لمبے لمبے سرو کر کے گئی تھی۔

دبلیٹ کے گرنے کے سوت میں سیاہ گرم چادر اوڑھے وہ خاصی خفا خفا بیٹھی تھیں، سرخ و سفید رنگت پر غصے کی سرخی نمایاں تھی۔ ”والدہ حضور! پلیز غصہ مت کریں، بی بی پہلے ہی ہائی لیول پر ہے آپ کا مزید ٹینشن خطرناک ہوگی۔“ برہان لغاری نے اپنی بات پھر دہرائی تھی، وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ان کا موڈ بہتر کرنے کی سعی میں لگے تھے مگر وہ جنوز غصے میں تھیں۔

”ہونہ، بڑی بڑی باتیں کرتے تھے، ان بد بختوں کو زندہ درگور کرنے کی، پھانسی پر چڑھانے کی اور کیا کیا؟ صبر کر کے بیٹھ گئے ہو، اتنی جلد بھول گئے، اپنی ذلت، اپنی شکست، کس طرح ہماری رسوائی ہوئی، جگ ہنسائی ہوئی، جن لوگوں کو کل تک ہماری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ تھی، وہ آج ہم پر نگھائیاں اٹھاتے ہیں، ہنستے ہیں، مسخکھ اڑاتے ہیں۔“ وہ اس وقت سخت غصے و جلال میں تھیں۔

”والدہ حضور! آپ کا غصہ، آپ کی ناراضگی بجا ہے جو جذبات آپ کے ہیں وہی میرے بھی ہیں جو آپ محسوس کر رہی ہیں وہ سب مجھے بھی لگتا ہو رہا ہے۔“ برہان لغاری بے حد تحمل و اپنائیت سے ان سے مخاطب تھے، والدہ حضور ان کی بات قطع کر کے گویا ہوئیں۔ ”پھر کیا وجہ ہے جو اتنے دن گزرنے کے باوجود ہم اپنے مجرموں کو اپنے سامنے نہیں دیکھ رہے ہیں، ایسا کبھی پہلے نہیں ہوا۔“

”پہلے ہمارے دشمن اتنے طاقتور و اثرورسوخ والے نہیں تھے۔ والدہ حضور، اب بات برابری کی ہے، بلکہ اس وقت وہ باپ اور بیٹا ہم سے بہت اسٹرونگ، پوزیشن میں ہیں، میں سرینڈر کر چکا ہوں۔“ برہان لغاری کا دھیمالوجہ شکست خوردگی و مایوسی سے بڑھا۔

”کیا کیا..... کیا کہا کہ رہے ہو؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کو اس طرح معاف کر دیں؟ ہمارے ہاں ایسا کبھی ہوا ہے جو اب ہوگا، مگر عام بھری محفل میں ہماری عزت سے کیلا گیا اور تم کہہ رہے ہو کہ ہائٹلے تم نے شکست قبول کر لی۔“ وہ جاہ و جلال سے کانپ اٹھی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر آواز سے گونج رہے تھے۔

”والدہ حضور! جن وقتوں کا آپ حوالہ دے رہی ہیں، وہ گزر چکے ہیں۔ ہر دور کے تقاضے الگ ہوتے ہیں۔ اہمیت جدا ہوتی ہے۔ گزرتا وقت اپنے ساتھ اپنے سنگ و وہ تمام چیزیں بھی لے جاتا ہے جو اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ ماضی کی باتیں، ماضی ہی بن



اسے امید نہیں تھی کہ حالات اتنی تیزی سے موافق ہو جائیں گے۔ مڈر صاحب ملک سے باہر تھے مگر انہوں نے اس دوری کو محسوس ہونے نہیں دیا، ان کا رابطہ مسلسل اعلیٰ حکام سے رہا تھا اور بالآخر وہ ان کے لیے سیکورٹی حاصل کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ فون پر انس اور کرن کو انہوں نے گنڈ و شزدی تھیں اور ساتھ میں یہ نوید بھی کہ ان کے نیویارک آنے پر ان کے اعزاز میں ایک شان دار پارٹی کا انتظام وہ کر چکے ہیں۔

فار یہ اور سعد بھی ان کی روانگی تک ان کے ساتھ رہنے آئے تھے۔ فار یہ ماں بننے والی تھی، ولادت قریب تھی، اس لیے گرینی بزرگ کی حیثیت سے ساتھ تھیں اور بے حد خیال رکھ رہی تھیں فار یہ کا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آئی تو گرینی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر خاصی دیر تک تختیدی لگا ہوں سے دیکھتی رہی تھیں۔ کمرے میں انس موجود تھا۔

وہ گرینی کی لگا ہوں سے بے خبر اپنے موبائل میں نمبرز انٹر کرنے میں مگن تھا، کرن ان کی لگا ہوں کی زبان تو نہ کچھ پارسی تھی مگر اسے اپنے اندر بے چینی و گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ وہ بلاوجہ کارڈز پر رکھے ڈیکوریشن پیسوز سر نو ترتیب دینے لگی تھی مگر گرینی کی لگا ہوں کی تپش اسے کنفیوز کرنے لگی تھی۔

”بہو! ادھر آؤ“۔ ان کی بارعب آواز میں نہ معلوم کیا تھا کہ وہ تو فوراً ہی ان کی جانب بڑھی تھی موبائل میں مصروف انس نے بھی چونک کر پہلے کرن پھر گرینی کی طرف دیکھا تھا۔

”جی“۔ کرن کے خشک ہونٹوں سے بے شکل لگا تھا۔

”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ ننڈیوں، نہ کپڑے ہیں ڈھنگ کے اور یہ ہاتھ.....“ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے جو بالکل سادہ تھے۔ ”کیوں خالی ہیں؟“ ان کا انداز فرض شناس انسر کی طرح تفتیشی تھا۔ کرن کو وہ وہی گرینی لگی جو ملازمت کے شروع دنوں میں لگا کرتی تھیں۔ سخت مزاج، بارعب و فخرور۔

وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی، جبکہ انس موبائل جیب میں رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کے انداز میں کافی دلچسپی تھی۔ ”چنڈیاں سہاگ کی علامت ہوتی ہیں اور تم سہاگن ہوتے ہوئے بھی کنواریوں کی طرح حلیہ بنائے گھوم رہی ہو، کتنی بُری بات ہے۔“ اس کے ہوائیاں اڑتے چہرے پر ان کو ترس آ گیا اور وہ نرم انداز میں گویا ہوئیں، ان کا انداز نرم دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور چہرے پر وہی مسکراہٹ اُبھری۔ اس مسکراہٹ میں کچھ ایسا بے چارگی و بھولین تھا کہ انس ہنس پڑا تھا۔

”شرم کرو کچھ، نئی نوپلی ڈبلن کس طے میں گھوم رہی ہے، تمہیں نظر نہیں پر آ رہا؟ اتنی دولت و روپیہ کس کام کا؟“ وہ اب انس کو گھور رہی تھی جو توپوں کا رخ اپنی جانب دیکھ کر ہنسا بھول گیا تھا۔

”میں نے کب منع کیا گرینی! یہ جب کہیں میں شاپنگ کرانے کو تیار ہوں۔“

”یہ کیوں کہے؟ تم کو خود خیال رکھنا چاہیے۔“

”او کے، او کے، آپ کو آئندہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ وہ کہتا ہوا سرعت سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

”آپ کو تو معلوم ہے جو کچھ بھی ہوا کس طرح اور کیسے ہوا ہے۔ اس اعزاز میں مربوط ہونے والے تعلق جگہ بنانے میں وقت لیتے

ہیں، میں ابھی یہ سب قبول نہیں کر پائی ہوں تو ان کو نہ معلوم کتنا وقت لگے۔“ گرنی کی ڈھارس بندھوانے اور ہمت دینے پر کرن نے کہا۔

”ہمارے ساتھ جو ہوتا ہے، وہ رب کی مرضی و حکم سے ہوتا ہے۔ انسان اس بے جان کٹھنکی کی طرح ہے جس کی ڈور اس کے

مالک کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ڈور ہلاتا ہے اور ہم حرکت کرتے ہیں۔ ہمارا کھانا، پینا، سونا، جاگنا، مرنا، جینا، سب اس پروردگار کے ہاتھ میں

ہے۔ ہم اس کے محتاج ہیں، وہ ہم پر قادر ہے جو وہ چاہتا ہے ہوتا ہی ہے اور اس نے تمہارا اور انس کا بیج اسی طرح تحریر کیا تو وہ ایسا ہی

ہوا، کیوں فضول سوچ کر خود کو بلکان کر رہی ہو۔ رہا سوال انس کا، شاید تم سوچ رہی ہو کہ اس نے تمہیں دل سے قبول نہیں کیا، محض ان لوگوں

سے انتقام لینے کے لیے تمہیں اپنایا ہے تو بیٹا، یہ خیال دل سے نکال دو، کبھی بھول کر بھی ایسا مت سوچنا، کیونکہ میں جانتی ہوں، اس کے

مزاج کو، اس کی طبیعت کو، اس کے دل کو۔“ کرن ان کے قریب سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

”اس کا ماضی تم سے پوشیدہ نہیں ہے، اب جو کچھ ہوا اس سے بھی تم اچھی طرح واقف ہو، بے شک محبت وہ طاقت ہے جو چہروں

میں بھی پھول کھلا دیتی ہے۔ سبزہ آگاتی ہے، بنجر زمین کو سیراب کر دیتی ہے، مگر جب محبت نفرت میں بدل جائے تو آگ و جہنم بن جاتی

ہے، بربادی بن جاتی ہے، تم تو خود ایک گواہ ہو، انس نے جو کچھ کیا وہ نفرت کا ہی اختتام ہے اور مرد کی محبت سے زیادہ شدید جذبہ نفرت

ہے۔“ وہ بے حد سمانیت سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

”انس میرا بچہ بہت ڈبکی، بہت تباہ ہے، اسے بہت سارا پیار دینا، دیکھنا وہ جتنا باہر سے قصور، سنجیدہ دولا پروا دکھائی دیتا ہے، اندر

سے وہ بالکل اُلٹ ہے، بہت چاہے گا تمہیں، بے حد پیار دے گا، بس کبھی تم اسے تباہ نہیں کرنا، تمہاری کا احساس نہ دینا۔“ اسی دم فاریہ

کمرے میں داخل ہوئی تھی، ساتھ ملازمہ تھی جس نے کئی مہینوں کے جیولری بکس پکڑے ہوئے تھے۔ فاریہ نے ایک جیولری بکس ملازمہ سے

لے کر گرنی کی طرف بڑھا دیا تھا۔ باقی ملازمہ اس کے اشارے پر دوسرے کمرے کی طرف لے گئی تھی۔ لائٹ پنک ڈھیلے ڈھالے سوٹ

میں فاریہ کے چہرے پر مسکان اور پھیلا ہوا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہ سنگن ہیں میری طرف سے تمہاری رُومنائی کا تحفہ۔“ جگجگ کرتے طلائی سنگن اور چوڑیاں انہوں نے اس کی سونے کلائیوں میں

ڈالیں تو وہ جھک کر سناٹھا سکی تھی۔ ایک کے بعد ایک چوڑی و سنگن سے اس کی گوری کلائیوں تک اٹھی تھیں۔ گرنی نے اس کی پیشانی چوم کر

دعائیں دی تھیں۔

☆.....☆.....☆

مہوش نے حمزہ کے انکار کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا تھا اور بیمار پڑ گئی تھی۔ صبح کی بروقت ٹریٹمنٹ سے اس کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی تھی مگر اس کی سانسز ہوتی صحت کی وجہ سے راحیلہ بہت فکر مند تھیں۔ سحرش اپنے اسپینڈ کے ساتھ پنجاب عزیزوں کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مہوش کو خود روک لیا تھا کہ وہ گھر میں رہے گی تو کسی نہ کسی طرح حمزہ کو اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس طرح ان دونوں بہنوں کا خواب بھی حقیقت بن جائے گا اور وہ حمزہ کے ذہن سے کرن کی محبت کو نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گی مگر.....

ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ حمزہ کا رویہ اور کل کی جانے والی گفتگو سے وہ سمجھ گئی تھیں جو وہ چاہ رہی ہیں وہ بہت مشکل ہے۔ رات بھر وہ سوچتی رہی تھیں۔ اب ایسا کیا کیا جائے جس کے باعث مہوش حمزہ کی بیوی بن کر اس گھر میں آ جائے۔ بے حد سوچ بچار کے بعد بھی وہ کوئی حل تلاش نہ کر پائی تھیں اور نتیجتاً ان کا موڈ بری طرح آف تھا۔ وہ مہوش کے لیے سوپ بنا کر لائیں تو دیکھا وہ خاموشی سے رو رہی تھی۔

”مہوش بیٹا! کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا سحرش دیکھے گی تمہیں تو مجھ سے بدگمان ہوگی کہ میں نے تمہارا دھیان نہیں رکھا۔“ وہ سوپ مائیکرو ویو میں گرم کر کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”آپ پریشان مت ہوں آنٹی، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ تیزی سے اپنے آنسو دھونے سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

”کیسے پریشان نہ ہوں، ابھی تم میری ذمے داری ہو۔“ انہوں نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا تو ان کے سینے سے لگ کر وہ پھر رو پڑی تھی۔

”میں جانتی ہوں تمہارا درد، کل تمہاری اور حمزہ کی سب باتیں سن چکی ہوں، جو تمہاری خواہش ہے وہ میری بھی آرزو ہے، میں نے بہت عرصہ قبل سے تمہیں حمزہ کی ذمہ داری کے روپ میں دیکھنا شروع کر دیا تھا مگر اس کو وہ ناگن ایسا ڈس کر گئی ہے کہ وہ اس کے زہر سے چھٹکارا نہیں پا رہا ہے۔ کرن کی خاطر وہ ہر خوشی، ہر سکھ تیاگ بیٹھا ہے۔“

”وہ ایسا کیوں ہے پھر دل، بے حس و بے نیاز، جو اسے چھوڑ کر چلی گئی اس کی یاد میں گم رہتا ہے جو اسے چاہتی ہے جو اس کی بننا چاہتی ہے، اس کی اسے پروا بھی نہیں ہے۔“ وہ ان سے علیحدہ ہوتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

”کیا کروں میں خود اتنی پریشان ہو گئی ہوں۔“

”میں اس سے پھر بات کروں گی، شاید مان جائے۔“ اک آس پھر جاگی۔

”تمہارے لیے لڑکوں کی کمی نہیں ہے، کیوں خود کو اتنا کمزور ثابت کر رہی ہو، بے شک حمزہ میرا بیٹا ہے مگر میں یہ نہیں چاہوں گی کہ تم محبت کی بجائے انگوٹھ سے محبت اعزاز کی طرح حاصل کی جاتی ہے، بجائے کی طرح ہرگز نہیں بیٹا۔“ مہوش کی دیوانگی انہیں حمزہ سے بدظن کر رہی تھی۔

”جہاں محبت ہوتی ہے وہاں وضع داری و عزت لیس کا پتہ نہیں ہوتا۔ وہ مجھے ٹھکرانے ایک بار نہیں بار بار، مگر اپنالے۔“ اس کی حالت دیکھ کر راحیلہ بیگم تڑپ اٹھی تھیں اور سیدھی حمزہ کے کمرے میں آئی تھیں۔

”تم کب تک مجھ سے انتقام لیتے رہو گے، اس وقت کا جواب ہمارے درمیان نہیں رہا ہے۔“ وہ آتے ہی بلا تمہید بولی تھیں۔  
”کیا کہہ رہی ہیں می آپ؟“ اس کا انداز حیران کن تھا۔

”وہی جو سمجھ رہے ہو، ایک کرن نہیں ملی، اس کا بدلہ تم سب سے لے رہے ہو، خصوصاً مجھ سے اور مہوش سے، وہ تمہاری محبت میں کتنا تڑپ رہی ہے، تمہیں احساس تک نہیں ہے۔“

”آپ کو مہوش کی تڑپ نظر آگئی، کبھی میرا خیال نہیں آیا؟“  
”میں جانتی تھی کرن میری بہو بنی تو میں بیٹے سے ہاتھ دھولوں گی اور دیکھو کتنا صحیح فیصلہ تھا میرا، وہ تمہاری زندگی میں نہیں آئی،

جب تم میری پروا نہیں کرتے اگر وہ سچ سچ تمہاری بیوی بن جاتی تو تم چٹیا پکڑ کر مجھے گھر سے باہر نکال دیتے۔“ وہ غصے میں چیخ رہی تھیں۔  
”بدگمانی کی بھی انتہا ہوتی ہے می آپ کو میں ایسا بے حسیت لگتا ہوں اور نہ کرن ایسی تھی۔“

”ہاں..... ہاں میں جانتی ہوں، وہ کیسی تھی، میرا منہ نہ کھلواؤ تو بہتر ہے۔“  
”اوکے، اب کیا چاہتی ہیں آپ؟“ وہ طویل سانس لے کر بولا۔

”تمہیں مہوش سے شادی کرنی ہوگی۔“  
”اسپا سمل، مہوش کو میں پسند نہیں کرتا۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”تمہیں مہوش سے شادی کرنی ہوگی۔ یہ میرا حکم ہے۔“  
”آل رائٹ، میں شادی کر لوں گا، مگر پھر کبھی زندگی بھر آپ لوگ مجھ سے کچھ نہ پائیں گے، کر لیں آپ اپنی مرضی، پھر میری مرضی ہوگی،

مہوش کو صرف میرا نام ملے گا، میرا سایہ بھی نہ پاسکے گی وہ، میرے دل کی دنیا آپ نے از خود اجاڑی ہے اور جو بستیاں اُجڑ جاتی ہیں وہ بسا نہیں کرتی ہیں پھر۔“ سالوں کا غبار جو دل میں حشر برپا کیے رکھتا تھا، آج راحیلہ کی ہٹ دھرمی کے باعث بہ نکلا تھا۔ وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔  
راحیلہ گم صدم کھڑی رہی گئی تھیں۔

حزہ نے لہجہ پست اور آواز نرم رکھی تھی مگر پھر بھی انہیں لگا، سر عام وہ بے عزت ہو گئی ہوں، اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی وہ یہ سمجھتی تھیں کہ حزہ ان کی چال نہیں سمجھ سکا ہے، اب معلوم ہوا تھا وہ ان کی ذہنیت سے پوری طرح واقف تھا۔

”دیکھا آپ نے؟ کیا انعام مل رہا ہے آپ کی بہن اور بھانجی کو رکھنے کا، میری اولاد مجھے قصور وار ٹھہرا رہی ہے، وہ لڑکی اس گھر میں نہیں آئی جب ایسی فضا ہے اگر آ جاتی تو کیا ہوتا؟“ وہ عام صاحب کو دیکھ کر روتے ہوئے بولیں جوان کی آواز سن کر آگئے تھے۔

”کرن اس گھر میں آ جاتی تو گھر، گھر بن جاتا، تم نے ماں کا نہیں ڈائن کا حق ادا کیا ہے۔ بیٹے کے معاملے میں مائیں بیٹوں کے دل آباد کرتی ہیں، تم اس کا دل ہی کھا گئیں، اب بھی سکون نہیں ہے، بیٹے کو تو باغی کر دیا اور کیا چاہتی ہو؟“ عام صاحب نے کھری کھری سنائی تھیں۔ اندر مہوش، باہر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”منال! مائی بے بی! ڈیڑی آئیں تو ان سے بہت اچھی طرح بات کرنی ہے، بالکل ریٹیکس ہو کر، تاکہ وہ اچھا ٹیل کریں۔“

”مجھے بات نہیں کرنی ان سے۔“ وہ ماں کا ہاتھ جھٹک کر دوڑ ہوئی۔

”کیوں؟“ وہ حیرانگی سے گویا ہوئیں۔

”انہوں نے مجھے مارا، برا بھلا کہا، مجھے بات نہیں کرنی ان سے۔“

”غلطی آپ کی تھی تب ہی۔“

”آپ ڈیڑی کی اتنی سائیڈ کیوں لے رہی ہیں؟“ وہ تیوری چڑھا کر فائقہ سے مخاطب ہوئی تو چند لمحوں کے لیے وہ گڑبڑا گئیں۔

”آپ ان سے ڈائریس لے چکی ہیں، کوئی ریٹیلین شپ نہیں ہے آپ کا ان کے ساتھ، پھر آپ کیوں ایکسائیٹڈ ہو رہی ہیں۔“

”آئی نو، میرا ڈائریس ہو چکا ہے اور برہان کے ساتھ میرا کوئی ریٹیلین شپ نہیں ہے مگر تمہارا تو ہے نا، تمہارے قادر ہیں، تمہاری کیئر

کرتے ہیں، نو کرتے ہیں تم سے، تو یہی ریٹیلین کافی نہیں ہے۔“ بہت سوچنے کے بعد ان سے یہی جواب بن پڑا تھا۔

”سوری ماما، یہ پاکستان ہے یہاں وہ سب نہیں جو کینیڈا کا گلج ہے یہاں آپ کو.....“

”شٹ اپ، شٹ اپ، یورو ماؤتھ، تم حد سے بڑھ رہی ہو۔“ انہیں شدید غصہ آ گیا۔ وہ غرائی تھیں۔

”تم مجھے کنٹریس کرو گی، یہ پاکستان ہے یا کینیڈا، یہاں کے گلجرز کی تم انٹاریشن دو گی؟“

”آف کورس ماما! وہ شانے اچکا کر لاپرواہی سے بولی۔

”شٹ اپ، رکھو اپنی نظار میسٹرا اپنے پاس۔“

”آپ اتنی ڈس ہارٹ کیوں نہیں کر رہی ہیں، میں نے کامن بات کی ہے۔“ منال نے بالوں میں تیز تیز برش چلاتے ہوئے کہا۔

”تم ابھی ٹھیک نہیں ہو، تمہارا رویہ نا مناسب ہے، تمہیں الیکٹرک شاکنڈ کی ضرورت ہے، تاکہ تمہارا مائنڈ اوپن ہو اور تمہیں بات

کرنے کا سلیس آئے۔“

”آپ کے اعزاز سے لگ رہا ہے الیکٹرک شاکنڈ کی مجھے نہیں، آپ کو ضرورت ہے۔“ وہ منہ نیچا کر کے بولی۔

”منال..... منال! کیا ہو گیا ہے تمہیں، یہ کس اعزاز میں اپنی ماں سے بات کر رہی ہو؟ میں اس لیے آئی ہوں کیا؟“ انہوں نے

آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تمام کر دہانے لہجے میں کہا۔

”میں تو ویسے ہی ہوں، مجھے آپ بدلی بدلی لگ رہی ہیں۔“ وہ فائقہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”کیسی بدلی بدلی لگ رہی ہوں میری جان۔“ چند لمحوں کے بعد ان کے برساتے لہجے میں یکلخت شہد گھل گیا تھا۔

”بہت بدلی ہوئی، آپ کو میری فکر نہیں ہے، آپ میرے لیے نہیں سوچتی ہیں، آپ کو میری پروا نہیں ہے، یہ تمام فیملنگو آپ ڈیڑی

کے لیے رکھتی ہیں، مجھے لگتا ہے آپ یہاں آئی بھی ڈیڑی کی خاطر ہی ہیں۔“ وہ کہتی چلی گئی۔

”اوہ..... پورگرل! ابھی کچھ دیر پہلے کہہ رہی تھیں میرا برہان سے کوئی ریلیشن نہیں ہے۔ اب کہہ رہی ہو، میں اس کی خاطر آئی ہوں۔“ وہ اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر مسکرا کر بولیں۔

”تم ریٹ کر دینا، ڈسٹریکشن کا شمار ہوگئی ہو۔“

”آپ کا مقصد ہے میں پاگل ہوگئی ہوں؟“ وہ غصے سے بولی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا ڈیر۔“

”سب جانتی ہوں میں، عقل مجھے اب آ رہی ہے۔“

”عقل آ رہی ہے تو اسے پوز کرنا بھی سیکھو، بلاوجہ کیوں فضول اندیشوں میں مبتلا ہو رہی ہو۔“

”مجھے انس سے ملنا ہے، میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“ یک دم ہی اسے کوئی خیال آیا تو وہ چونک کر بولیں۔

”کیوں ملنا ہے، تمہارا کوئی تعلق ہے اس سے۔“ وہ سرد لہجے میں گویا ہوئیں۔

”ڈیڑی سے کیوں لیتی ہیں، ان سے کوئی تعلق ہے آپ کا؟“ منال نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”اسے تمہاری ضرورت نہیں ہے، وہ تم سے نہیں ملنا چاہتا۔“ اس کی خود سری وضد دیکھ کر وہ بلامرت بولیں۔

”نہیں جھوٹ ہے۔“

”وہ تمہاری اسٹیپ سسٹر کرن سے شادی کر چکا ہے۔“

”نہیں..... نہیں..... نہیں، وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا تھا میں اس کی ڈلہن ہوں گی۔“ رفتہ رفتہ اس پر وہی

سائیکس کیفیت طاری ہونے لگی تھی، انس کے نام پر وہ گھاس پرندے کی طرح تڑپنے لگتی تھی۔ قائد نے بہلا پھسلا کر اسے میڈیسن کھلائی

تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس پر کیبل ڈال کر وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی تھیں۔ کھڑکی کے شیشے سے خوب صورت لان کا

نظارہ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ باہر دیکھ رہی تھیں اور ذہن آئندہ کے لائحہ عمل کے تانے بانے بننے میں سرگرداں تھا۔

☆.....☆.....☆

انس بیڈ پر لیٹا میگزین پڑھنے میں محو تھا کہ اس کی سماعت میں کچھ نامانوس آوازیں گونجی تھی۔

ایک بار، دو بار، تین بار۔

دقتے دقتے سے وہ جیسی چمن چمن کی آواز خاصی دل کشش تھی۔ نہ معلوم کیا کشش تھی اس آواز میں، کیا امید کہ از خود ہی اس کی

سماعت اس آواز پر لگ گئی تھی جو ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھی۔ کبھی چمن چمن قریب آجاتی تو کبھی دور چلی جاتی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میگزین سائیڈ پر رکھا اور سلپہر پہنے بنا کھڑکی کے پردے سے آہستگی سے باہر دیکھا اور مہوٹ رہ گیا۔

میرون جھلملاتی ساڑھی، میرون جیولری، پشت پر پھیلا براؤن بالوں کا آبشار، میک آپ سے دمکتا حسین چہرہ، جہاں گھبراہٹ



پریشانی کی کیفیت نے خُسن کو انوکھی جلا بخشی تھی۔

اس کا حسن نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا اور دیکھا رہ گیا تھا۔ وہ پریشانی سے ٹہل رہی تھی۔ ادھر آتی، ادھر جاتی، اضطراب سے اُلگھیاں مروڑتی اور اس حرکت سے خاموش ماحول میں چمن چمن کی مدھر آواز گونج رہی تھی، جو اس کے ہاتھوں میں موجود چیزوں و سنگتوں کی تھی۔ اس کے اندر جذبات کی طغیانی تلامح پر پاپا کرنے لگی۔ وہ کرن تھی۔

وہی کرن جس کی زندگی اس نے ایک عرصہ مشکل بنا ڈالی تھی۔ اس کی تذبذب و تھیک میں وہ حد سے بڑھ جایا کرتا تھا مگر اب وقت کروت بدل چکا تھا، اس کی بیگانگی بے نیازی محبت میں بدل چکی تھی۔ وہ آہستگی سے پردہ ہٹا کر دروازے سے باہر نکل آیا تھا۔ کرن اچانک اسے سامنے دیکھ کر گھبرا کر زک مٹی۔ وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ کرن کے چہرے پر گھبراہٹ، اضطراب و حیا کے دل کش رنگ تھے۔ اس کی آنکھوں میں وارفتگی، پسندیدگی و سرتوں کی چمک تھی، وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے نہ شوق انداز میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے وجہ چہرے پر آسودہ مسکراہٹ تھی۔ ایک ایسی طمانیت بھری مسکراہٹ!

جو دل کے چمن کی آرزوؤں کے تمام گلاب کھل جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ کئی خاموش لمحے اسی طرح گزر گئے۔

”ویری ٹائس، بہت کیوٹ لگ رہی ہو“۔ وہ اس کے بالکل قریب آ کر بوجھل لہجے میں گویا ہوا۔

”وہ..... وہ گرینی اور قاریہ بھابی نے..... زبردستی ہی“۔ اس کی بڑھت لگا ہوں کی پیش سے اس کے عارضوں پر سرفی پھیل گئی تھی۔ ان ساعتوں میں اسے اس سے اتنی حیا آئی کہ وہ پھر بول نہ سکی اور زرخ موڑ کر اس کی جانب سے کھڑی ہو گئی۔

”تھینکس گاڈ! آپ کو نہ سہی، انہیں تو مجھ پر ترس آیا“۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھامتے ہوئے سرگوشی کی اور کمرے میں لے آیا تھا۔

”کل ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، یہ ہمارا فی مون چیریڈ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں، اپنی نئی زندگی کی ابتدا ہمیں سے ہو، اپنے ملک سے، اپنے گھر سے“۔ وہ کرن کا ہاتھ تھامے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”ہماری نئی زندگی کی شروعات میں کوئی جھوٹ، کوئی مبالغہ آرائی کی رتق نہیں ہوگی، اپنے ماضی کا جھپٹل میں ہمیشہ کے لیے کلوڑ کر رہا ہوں، جو بھی ہوا وہ یاد رکھنے کے قابل نہیں ہے، فراموش کرنے کے لیے ہے اور میں فراموش کر چکا ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک میری تمام محبتوں کی حق دار صرف تمہاری ذات رہے گی، میری وقائیں فقط تمہارے لیے ہیں“۔ اس نے کرن کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے صداقت بھرے لہجے میں کہا۔

☆.....☆.....☆

سردی میں شدید اضافہ ہو گیا تھا۔

آسمان پر سیاہ بادلوں کی فوج تیار تھی، کسی بھی وقت برسنے کو، خشکی بڑھ گئی تھی، سرد ہوا انہیں پھولوں کی خوشبو لیے ہر سو محسوس رہی تھیں۔ فائنڈ گرم شال اور دستی باہر نکل آئی تھیں اور باہر نکلنے سے قبل وہ منال کو نیندا اور داد بیانا بھولی تھیں۔

وہ آکر باہر برآمدے کی چھت کے آگے بے شیز کے نیچے رکھی چیئرز میں سے ایک پر بیٹھ گئی تھیں۔ ماحول میں رچی بسی اداس خاموشی، انہیں بڑی کیف آور لگی جو ان کے برسوں کے خوابیدہ جذباتوں کو بیدار کر رہی تھی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور دیواروں و ستونوں سے لپٹی بیلوں سے گرے سرخ، جامنی، نیلے، پیلے پھولوں کو لان کی سبز گھاس پر دو دو دو تک بکھیر گیا تھا۔ ان کے اندر بھی ماضی کی ایسی ہی ہوا انہیں جھوم کر یادوں کے پھولوں کو بکھیرنے لگی تھیں۔

ماضی کی کتاب جب کھل جائے تو یادوں کے اور اوراق از خود بکھرنے لگتے ہیں جنہیں سمیٹے سمیٹے آپ خود بکھرنے لگتے ہیں، کھو جاتے ہیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی بیک سے سر ٹکا لیا تھا۔ وہ بیٹے دنوں کی گرفت میں پوری طرح جکڑی ہوئی تھیں۔

ان کی برہان لغاری سے ٹو میرج تھی۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران وہ ایک دوسرے کے پیار میں اس طرح جکڑے کہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی شادی کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔ شادی کے ابتدائی ایام بہت خوب صورت و یادگار گزرے تھے پھر رفتہ رفتہ برہان بزنس اور دوسری ایکٹوٹیز میں مصروف ہوئے اور انہیں گھر میں موجود ساس سے واسطہ پڑا تو معلوم ہوا پھول کے سنگ کا ٹٹا بھی ہے جو بہت مختلف اور خطرناک ہے۔ برہان اور ان کے والد فیضان لغاری نے انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیا کبھی کہ وہ ان کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں مگر خود کو اس طرح مین ٹین کیا تھا کہ ان کی اصلیت معلوم نہ ہو سکی، برہان کو بھی جب معلوم ہوئی تب وہ بہت دور اس کی چاہت میں جا چکے تھے۔ پھر محبت کا جادو جب سرچڑھ کر پلٹا ہے تو کہاں حسب نسب، امیری غریبی کی تفریق رہتی ہے، وہ اسے اپنا کر بھول گئے مگر ان کی ماں اس فرق کو جو ان کی نگاہوں میں عیب تھا، کبھی نہ بھولی تھیں۔

شادی کے چھ ماہ بعد ہی ان میں آپس میں ٹھن گئی تھی، وجہ وہی تھی ساس، بہو کی ازلی جنگ، ساس کا خیال تھا، بہو اس سے ان کے بیٹے کو چھین رہی ہے، بہو کی سوچ تھی اس کے خاوند پر صرف اس کا حق ہے۔ دونوں کے درمیان رسہ کشی جاری تھی، برہان کی بھنورا صفت نظرت آفس میں نئی اپائنٹ ہوئی، کمپیوٹر آپریٹر کی رتھین اداؤں پر سمجھ گئی تھی۔ وہ ڈبل ٹیم کھیلنے لگے، مگر میں جاٹا رہا پروانے کی مانند بیوی کے ارد گرد منڈلاتے رہے، آفس میں ان کی دنیا اس آپریٹر تک محدود ہوتی تھی۔

مرد کے بدلتے تیور عورت کی نگاہوں سے زیادہ عرصہ اوچھل نہیں رہتے، فائنڈ کی نگاہوں میں بھی سب آ گیا تھا۔ شروع میں ان میں بہت چمپلش رہی تھی۔ برہان نے کچھ عرصہ خود پر جبراً پابندیاں لگائی تھیں مگر کب تک وہ صرف ایک کے رہتے پھر اس دوران والدہ حضور نے بھی ان کے کان بھرنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ پہلے ہی خود پر لگائی گئی پابندی سے بیزار ہو گئے تھے، مزید موقع ماں کی باتوں نے فراہم کیا اور وہ فائنڈ سے دور ہوتے گئے تھے۔

فائدہ جو دولت مند بننے کے خواب آنکھوں میں سجا کر وہاں آئی تھیں، بہت جلد تعبیر ملنے پر وہ سب سے لاپرواہ ہو کر برہان کے نقش قدم پر چلنے لگی تھیں۔ برہان کے افسر ذکی انہیں کوئی ٹینشن اب نہ ہوتی تھی کہ وہ برہان سے بھی زیادہ کامیاب طریقے سے اپنے من پسند دوستوں کے ساتھ وقت گزارتی تھیں اور برہان کو کبھی شک نہ ہوتا تھا، اسی طرح وقت گزرتا رہا، ساس سے تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے گئے، وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھیں مگر ندان کی ڈگر بدلتی تھی نہ برہان راہ راست پر آئے تھے۔ اسی دوران وہ سب کچھ ہو گیا جس کی انہیں کبھی امید نہ تھی، وہ اس آفس ورکر کی وجاہت و انداز پر اس طرح مرثی تھیں کہ پھر انہیں نہ اپنی عزت کا خیال رہا، نہ برہان کی، وہ مثال کا خیال بھی نہ کر سکی تھیں کہ اس پران کی اس حرکت کا کیا اثر ہوگا، وہ اس کی محبت کے ایسے جنون میں مبتلا ہوئی تھیں۔

محبت اور اس کا جنون!

پانی کے اس پیلے کی طرح ہے جو جتنی شدت سے ابل کر ادا پر آتا ہے اور نیچے قابغ ہونے میں اسے لمحہ بھی نہیں لگتا اور سب ختم ہو جاتا ہے۔

جو رشتے ناجائزہ جذبیوں کی زمین پر تعمیر کیے جاتے ہیں، وہ کبھی بھی پائیدار و پختہ ثابت نہیں ہوتے ہیں، ہوس کی آگ بجھتے ہی سب راکھ ہو جاتے ہیں اور اس راکھ کی سیاہی و بد صورتی آپ کے دامن پر، آپ کے آنچل پر، آپ کے کردار پر ہمیشہ کے لیے چسپاں ہو جاتی ہے جو آپ سے وابستہ لوگوں کے لیے بھی آگشت نمائی و رسوائی ثابت ہوتی ہے۔

معاذ اللہ احساس ہوا ان کے پیچھے کوئی آکر کھڑا ہوا ہے۔ انہوں نے گردن موڑ کر دیکھا، برہان لغاری کھڑے تھے۔

”آرزو رات؟“ وہ ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر استفسار کرنے لگے۔

”نہیں..... آتم قائم“۔ اپنے شانے پر ہاتھ رکھے ان کے ہاتھ نے ان کے اندر ایک مانوس سا کھوپا کھوپا احساس جگایا، انہوں نے برہان لغاری کی طرف دیکھا جن کی سرخ ڈوروں والی بے خواب آنکھوں میں بھی کچھ ایسا ہی احساس کر دینے لے رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے تھے۔ شاید گزرے دنوں کی اچھی یادیں انہیں اپنے سحر میں جکڑنے لگی تھیں۔

”کیوں چلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر؟ کیا میں اتنا بُرا تھا؟“ وہ دوسری چیز پر ان کے زور دینے سے روکنا چاہتا تھا۔

”وہ راستہ مجھے آپ نے ہی دکھایا تھا“۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”ہمارے معاشرے میں مردوں کے لیے یہ سب قابل معافی ہوتا ہے پھر وہ ہسپنڈ جوائف کوئل کھلٹ اہل لائف دے رہا

ہو، ہر قسم کی آزادی و خود مختاری فراہم کر رہا ہو، اگر وہ کچھ افسر زمیں انوالو ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“

”یہی سوچ غلط ہے برہان! مردوں کی، وہ سوچتے ہیں ہم نے خوب صورت گھر دیا ہے، ہر طرح کا آرام دیا ہے، آزادی دی ہے عورت کو اور محبت بھی، مگر اصل بات یہ ہے روپیہ، دولت، آزادی، عیش و آرام اور خوب صورت گھر عورت کی خواہشوں میں شامل ضرور ہیں لیکن سب سے پہلی اور آخری خواہش ہر عورت کی یہی ہوتی ہے کہ جو اس کا خاوند ہے جس کی خاطر وہ اپنے تمام گئے رشتوں کو چھوڑ کر آئی

ہے، وہ صرف اور صرف اس کا ہو، یہ خواہش یہ آرزو ہر عورت کی ہے، خواہ وہ گاؤں کی ہو یا شہر کی، ویسٹ کی ہو یا ایسٹ کی، ہر طبقے کی عورت ایسی ہی خواہش مند ہوتی ہے۔ بنگلے، کاریں، دولت و عیش و آرام یہ سب اس وقت خاک بن جاتا ہے، جب بیوی کو مطمئن ہو اس کا خاوند فلاں عورت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ وہ لہجہ انکشاف ایک آگ ہوتا ہے، ایسی آگ جو پل بھر میں ہر شے کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے، تباہ کر دیتی ہے، آپ اس درد کو، اس اذیت کو نہیں سمجھ سکتے، جو مرد کی بے وفائی اور جانی ہین سے عورت کو ملتی ہے۔“ فائقہ کی آواز بھرا گئی تھی۔

”مرد چھٹی تو قہ عورت سے رکھتا ہے کہ وہ اس کی وقاداری، پاک بازی پر ذرا میل نہ آنے دے تو مرد کو بھی اتنا ہی پاک باز، باوقادو با کردار ہونا چاہیے، ورنہ کچھ عورتیں میری طرح خود کو تباہ کر لیتی ہیں اور جو ختم حراج نہیں ہوتی ہیں وہ اندر سے کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ مرتے دم تک ان کے اندر شادابی و طمانیت نہیں اُبھرتی، آرام وہ زندگی وہی ہوتی ہے جس میں بیوی کو یہ فخر و یقین ہوتا ہے کہ اس کا خاوند صرف اس کا ہے، عورت روٹی بانٹ کر کھا سکتی ہے، مگر مرد کا ہونا ہرگز برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ جو مرد یہ سوچتے ہیں کہ عورت کو بڑے قہیش زندگی دے کر وہ ہر ناجائز و گمراہ کن حرکات کے مرتکب ہونے کے حق دار ہیں تو وہ جان لیں، انہوں نے اپنے آشیانے بکھیرنے کا انتظام کر لیا ہے، عدم یقین کا ایک جموں کا ان کے آشیانے کا سٹکا سٹکا بکھیر دے گا، خشک کی ایک چنگاری سب کچھ راکھ بنا ڈالے گی، اسی طرح جس طرح ساحل پر بنے ریت کے گھر و عودوں کو صرف ایک لہر مٹا ڈالتی ہے۔“ ملازمہ کافی لے آئی تھی اور انہیں سرو کر کے چلی گئی تھی۔

”بلیک کافی..... آپ کو یاد ہے ابھی تک کہ مجھے بلیک کافی پسند ہے وہ بھی ایسے سرد موسم میں۔“ وہ خوشگوار حیرت سے بولیں۔

”میں بھول ہی گیا ہوں“ دھگ دھونوں سے لگتے ہوئے گویا ہوئے۔ ان کے درمیان خاموشی در آئی تھی، سرد موسم میں رات کی رانی کی بھگی بھگی مہک احساسات کو فرحت آمیز احساس بخش رہی تھی۔

ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ دیر قبل دیکھنے والے اب نگاہیں چرا ہے تھے، قدرے توقف کے بعد فائقہ نے کہا۔

”منال بہت آپ سیٹ ہو گئی ہے مجھے ڈر ہے کہ.....“

”میرے سامنے نامت لو اس کا۔“ وہ فائقہ کی بات قطع کر کے غصے سے بولے، ان کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی۔

”پلیز کول ڈاؤن، اگر ہم بھی ایسا ہی بی ہو تیر کریں گے تو کون کیڑ کرے گا اس کی، وہ از حد ڈسٹرب ہے۔“

”زیادہ پریشان کرتی ہے تو میٹل ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر دو، ایسی کریزی لڑکیوں کا کبھی ایڈ ہے۔“

”برہان ایسا آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ شی از ریکل یور ڈاٹر۔“

”ڈاٹر! گوٹو ہیل، اس سے بہتر تھا میں بے اولاد رہتا۔“

”پلیز، آپ کہہ دو مانز کریں، اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے، میں نے ہاسپٹل میں ڈاکٹر سے بات کی ہے، وہ کہہ رہے ہیں

میں جلد از جلد منال کی شادی کر دینی چاہیے، اس کی لائف چھینج ہوگی تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ مجھے بھی یہ یاد دہانز پسند آئی ہے۔“

”شادی..... ابھی کیسے کر سکتے ہیں، اس کی طلاق کو عرصہ کتنا ہوا ہے۔“

”ابھی نہیں، اس کا بیڑہ کمپلیٹ ہونے میں تین چار ماہ کا عرصہ لگے گا، جب تک ہم کسی ایسے لڑکے کو دیکھ لیں گے جو منال کو ایسے چاہے جس طرح ہم چاہیں۔“ انہی نرم دیکھ کر وہ کہہ رہی تھیں۔

”جو چاہو کرو، مگر مجھ سے امید مت رکھنا، کسی بھی قسم کی سپورٹ کی، علاوہ اخراجات کے، میں تمہارے کسی بھی کام میں شریک نہ ہوں گا۔ میرا ذکر بھی نہیں آنا چاہیے۔“ وہ یکھت بھڑک گئے تھے۔

”آل رائیٹ۔ آپ ڈپریشن مت ہوں، مجھے آپ کی پرمیشن درکار تھی، سب کام میں کر لوں گی۔“ برہان لغاری کو دیکھ کر وہ بھی اٹھ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

حزہ رات گئے تک گھر لوٹا تھا۔ می سے نہ چاہنے کے باوجود آج وہ سب کہنا پڑا تھا جو وہ کہنا نہیں چاہتا تھا، مگر ان کا کرن کو اڑام دینا، برا کہنا اسے قطعی نہیں بھایا تھا۔ کرن سے محبت اور نہ پانے کا ڈکھا سے گھائل کر چکا تھا، وہ ذہن اسے لولہ ٹھیس دیتے رہتے تھے، پھر ایسے میں اس کے متعلق کوئی ایسی گفتگو کر جائے تو ان دنوں سے لہور سننے لگتا تھا۔ بے کلی واڈیت دو چند ہو جاتی تھی، وہ کسی گھائل پرغے کی طرح ترپنے لگتا تھا۔ کئی کئی سڑکوں پر رش ڈرائیوگ کرنے کے بعد وہ گھر لوٹ آیا تھا، رات گہری ہو چکی تھی۔

چونکہ دار نے گیٹ کھولا، وہ کار پارکنگ لائٹ میں کھڑی کر کے آگے بڑھ گیا۔ اندر صرف لابی کی لائٹ آن تھی اور سب جگہ اندھیرا تھا۔ گھر والے سوچے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا جہاں اندر قدم رکھتے ہی وہ حیران رہ گیا تھا۔ کمرے میں لیپ روشن تھا اور عام صاحب اس کے بیڈ پر گھل اڈھے تکیوں کے سہارے نیم دراز کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔

”پاپا! آپ! انہریت تو ہے نا؟“ استہباب و پریشانی اس کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔

”باپ بیٹے کے روم میں آئے تو کوئی پریشانی والی بات ہوتی ہے؟“ وہ کتاب ٹھیل پر رکھ کر چشمہ ٹیک کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”کوئی خاص بات تو ضرور ہوتی ہے۔“ وہ جوڑے اُتارتا ہوا بولا۔

”تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کتنی اجنبی، کتنی نامانوس لگ رہی ہے تم نے مسکراتا کیوں چھوڑ دیا ہے؟“

”میرا اختیار ہوتا ہی نا ہی چھوڑ دوں۔“ اس نے جلی سے سوچا۔

”مجھے بہت پہلے بتا دیجے کرن کے متعلق تو وہ سب نہ ہوتا جو ہوا ہے۔ کرن کو تمہاری ذہن بنانے کی تمنا تو میری بھی تھی۔“ وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ طلال و تاسف ان کے انداز سے عیاں تھا۔

”وہ میرے نصیب میں نہیں تھی۔“ نہ معلوم وہ خود کو بہلار ہا تھا یا ان کو، عام صاحب اس کے چہرے کی جانب دیکھتے رہ گئے۔

”یہ نصیب و تقدیر کی باتیں بعد کی ہوتی ہیں۔“

”پاپا! اب یہ گفتگو لا حاصل و بے معنی ہے، اگر ہم اس ٹاپک پر بات کریں جس پر بات کرنے کے لیے آپ یہاں موجود ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

عام صاحب نے شفقت بھرے انداز میں بیٹے کی جانب دیکھا جس کا پھول کی طرح شاداب نظر آنے والا چہرہ کلا کر رہ گیا تھا۔ خوب صورت براؤن آنکھوں کی شفاف سطح میں اداسی و ہجر، ڈکھ کے رنگ ثبت تھے۔ وہ دل موسوں کر رہ گئے، بیٹے کی اس حالت کے مجرم وہ خود کو گردانے لگے تھے۔

”اتنی سوری ہو رہی ہے، ہارش برسنے کو تیار ہے اور تم صرف سوٹ میں ملیں ہو، سوئیٹر، جیکٹ کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس، اتنی لاپرواہی ٹھیک نہیں بیٹا، اب کسی مزید ڈکھ جھیلنے کی قوت نہیں ہے، ہمت لو ہماری ہمت کا امتحان، ہم پہلے ہی شکست خوردہ ہیں۔“

”پلیز پاپا اس نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”آتم سوری، میرا ارادہ آپ کی دل شکنی کا نہ تھا، میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں، چلیں بتائیں وہ جو آپ کہنے آئے تھے۔“ عام صاحب کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھ کر بڑھلا اٹھا تھا۔ ان کا دل بہلانے کی خاطر اس نے اپنے مزاج میں کٹنگنی پیدا کی اور ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔

”میں چاہتا ہوں، بزنس میں میری بیک بنو، اب مجھ سے تنہا۔ بوجھ نہیں اٹھایا جائے گا۔“ وہ نڈھال انداز میں کہہ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے پاپا! آپ ٹینشن نہ لیں، میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتماد کو ختم نہ پہنچاؤں۔“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔

”ایک التجا اور ہے اگر تم مانو تو۔“

”آپ حکم دیں پاپا۔“ باپ کے انداز پر وہ تڑپ اٹھا تھا۔

”شادی کر لو۔“ عام صاحب اس کی جانب دیکھتے ہوئے امید آمیز لہجے میں بولے۔ حنزہ کے چہرے پر تارکی سی چھا کر معدوم ہوئی تھی۔

”یہ میری خواہش ہے، شدید تر آرزو بھی۔ وقت تنزی سے گزر رہا ہے۔ ہرگز رتالحمہ زندگی کی نقدی گراتا جا رہا ہے، پھر حیات تو ہواؤں کے دوش پر رکھے اس چراغ کی مانند ہے، نہ مظلوم کب اور کس لمحے ہوا کا کوئی زور آدھ جھونکا چراغ حیات کو گل کر دے، پھر انسان صرف یاد بن جاتا ہے، خواب بن جاتا ہے۔“

”پلیز، آپ ایسی باتیں نہ کریں، ابھی آپ کو جینا ہے لمبی عمر۔“

”زندگی کی طرح موت بھی حقیقت ہے بیٹا۔ پیدا ہوئے ہیں تو مریں گے بھی، آئے ہیں تو جانا بھی پڑے گا۔ رب ذوالجلال سے بھی دعائیں ہیں مرنے سے قبل قبر کی آخرت کی تیاری کروادے اور یہاں جو فرمائش و ذمے داریاں ہیں ان سے عہدہ برد کروادے تو.....“

”آپ جو کہیں گے، میں کروں گا..... مگر پلیز ایسی باتیں نہ کریں، جو مجھے بے سکون کر ڈالیں۔“

☆.....☆.....☆

آج ان کی روانگی تھی۔

کرن کی آنکھیں بار بار چمک جاتی تھی، فاریہ آتے جاتے اس کو چھیڑ رہی تھی۔ بھنگی آنکھوں سے وہ جینپ کر مسکرانے لگی تھی۔ دھوپ و چھاؤں کا مزاج ہو رہا تھا اس پر، گرینی جو گہری لگا ہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں، اس کے بار بار چمک جانے والے آنسوؤں سے مخلی نہ رہ سکے تھے۔ ان کے دل میں عجیب سی بے چینی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے اسے اپنے قریب بٹھا کر پوچھا۔

”انس نے کچھ کہا ہے؟ کیا تم خوش نہیں ہو؟“ ان کی جہانمیدہ نگاہیں ٹینک کے پیچھے سے اسے کھوج رہی تھیں، کھنگال رہی تھیں، دل ان کا دوسو سو واٹسوں کا شکار تھا، مبادا انس نے ابھی تک منال کی محبت کو دل سے نہ بھلایا ہو، کرن کو وہ جگہ نہ دی ہو، جو اس کے دل میں منال کے لیے تھی اور بھی ایسے بے مقصد خیال انہیں متوحش کر رہے تھے۔

حالانکہ صبح انس کو خوش و مطمئن دیکھ کر وہ بڑے سکون ہو گئی تھیں، اب بھی سینک رووم سے اس کے دوستوں کے ساتھ گونجے قبوتوں سے وہ اس کی آسودگی و خوش ہونے کا اندازہ لگا رہی تھیں اور شکر ادا کر رہی تھیں کہ اسے نئی زندگی کی خوشیاں ملیں تو آگئیں مگر کرن کے آنسو انہیں گھر مند کر گئے تھے۔ اس لیے وہ تنہائی میں بٹھا کر اس سے دریافت کر رہی تھیں۔

”نہیں..... انہوں نے کچھ نہیں کہا“۔ ان کے استفسار پر گھبرا کر بولی۔

”سچ کہہ رہی ہو؟“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”جی..... بالکل سچ“۔

”شکر ہے رب کا، ورنہ تمہارے آنسو دیکھ کر میں ڈر گئی تھی“۔ انہوں نے اس کے انداز سے سچائی پالی تھی، ان کے چہرے پر اطمینان کا رنگ پھیل گیا۔

”بہو! جن کو اپنے بڑوں کا سایہ ملا ہوتا ہے وہاں لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں کہ بڑوں کی دعاؤں کا حصار انہیں ہر بُری بلا دانا گمانی آلتوں سے بچاتا ہے۔ اب میں ہی تمہاری بڑی ہوں اور میری دعائیں ہمیشہ اپنے بچوں کے گروہوں کی، میری تمنا پوری ہو گئی۔ انس کے لیے میں جیسی ہوی چاہتی تھی، اللہ نے ایسی ہی عطا کی ہے، تمہاری خوبیوں کی، تمہاری قابلیت کی، میں خود محترف ہوں، اس گھر کو کھوئی ہوئی روشنی ملی ہے“۔ گرینی کی اپنائیت و اعتماد اس نقلی کو سیراب کرنے لگا جو آج ماں کی یاد کی صورت میں بار بار آنکھوں سے چمک رہی تھی۔

”میں چاہتی ہوں میرے گھر کی اس روشنی میں اضافہ ہوتا ہے، میرے گھر کا ہر ذرہ آفتاب بن جائے۔ میری نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھنا، خاوند کی محبت بڑی انمول ہوتی ہے جو عورت اس کی قدر کرتی ہے وہی پھلتی پھولتی ہے، میں چاہتی ہوں تمہیں کوئی ڈکھ نہ ملے، تم خوش رہو، عورت کی خوشی سے ہی تو گھر جنت بنتا ہے، اس کے لیے تمہیں انس کی ہاں میں ہاں ملانا ہوگی، اس کی ماننا ہوگی، میں جانتی ہوں انس عام بچوں سے مختلف مزاج کا ہے وہ بچپن سے آج تک کبھی اعتدال کی راہ پر نہیں چلا ہے، اس کے ہر انداز میں شدت پسندی کا رجحان ہوتا ہے۔ منال سے محبت کی تو اپنی ذات فراموش کر بیٹھا تھا اور جب نفرت کی تو تم نے دیکھا کتنی شدت، کتنی جارحیت تھی کیونکہ نفرت و محبت

ایک سکے کے دو پہلو ہیں، دو رخ ہیں، میں چاہتی ہوں تم پر صرف اور صرف اس سکے کا ایک رخ استعمال ہو محبت اور صرف محبت کا۔  
 ”بہت شکر یہ گریٹی، آپ نے جو مجھے پھر پورا پنائیت وانیت دی ہے اس احساس نے مجھے از حد تقویت و ملانیت دی ہے۔ آپ نے جو مجھے سمجھایا، میری زندگی ان ہی سنہری باتوں پر عمل پیرا ہو کر گزرے گی۔ یہاں سے جا کر مجھے بڑی شدت سے انتظار رہے گا، آپ کی آمد کا، جلد آئیے گا۔“ وہ عقیدت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”انشاء اللہ، ساتھ خیریت کے اللہ فاریہ کو خوشی دیکھنا نصیب کرنے۔“

گریٹی کے پاس سے وہ قاریہ کے پاس آگئی جو اپنی مگرانی میں کچن میں ملازماؤں سے کام کر رہی تھی۔ ان کی رات کی فلائٹ تھی، گریٹی نے اس کے دوستوں اور کچھ خاص جاننے والوں کو ڈنر پر بلوایا تھا، کھانا باہر سے بنوایا تھا اب بھی ملنے جلنے والوں کی آمد کے باعث کچن میں کچھ نہ کچھ بن رہا تھا جس کی مگرانی قاریہ نے سنبھالی تھی، تاکہ مہمانوں کی تواضع بہترین طریقے سے ہو سکے۔

”ارے..... ارے ذلہن صاحبہ! آپ کہاں خرماں خرماں کچن میں چلی آ رہی ہیں۔ آپ کا یہاں داخلہ ممنوع ہے۔“ قاریہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کچن کے گیٹ سے ہی باہر لے آئی تھی۔

”کیوں بھابی! وہ حیرانگی سے گویا تھی۔“

”ابھی آپ جتنی ذلہن ہیں اس لیے۔“ وہ شوشی سے بولی تو وہ جھینپ گئی۔

”آپ آرام کریں میں دیکھ لوں گی۔“

”اب تو آرام ہی کرتا ہے، آؤ کچھ دیر بیٹھو پھر تیار ہوتا ہے۔“

”میرے تو خیال میں یہ لباس برا تو نہیں۔“ وہ گرے پلکے کے فینسی سوٹ پر نگاہ ڈال کر دریافت کرنے لگی جو آج زیب تن کیا تھا۔

”ہاں، برا تو نہیں ہے مگر ڈنر پارٹی کے حوالے سے مناسب نہیں ہے۔“

”کیا کافی تعداد میں مہمانوں کو انوائٹ کیا گیا ہے؟“

”ہاں، دو ماہل یہ ڈنر پارٹی ایک دعوت دلیمر ہے جو گریٹی کی خواہش پر ایشیا کی گئی ہے۔ لسٹ میں کم سے کم کے باوجود خاص نام ہیں۔“

ایک گھنٹے تک وہ بیٹھی باتیں کرتی رہیں پھر قاریہ کے کہنے پر وہ اپنے روم میں چلی آئی تھی، تاکہ کچھ دیر آرام کر سکے۔

اسے لینے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس جلا آیا تھا، وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ریڈیکس یارا آرام کرو ابھی پارٹی نشانی ہے پھر ایک طویل سطرور پیش ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

بلوچینز، ریڈیٹرٹ میں اس کے چہرے پر سرشاری تھی، سرسستی تھی، کسی بھی اعزاز سے، کسی فصل سے محسوس نہ ہو رہا تھا کہ وہ محبت کی

بازی ہارا ہوا ہے، اس کی محبت وہ نہیں کوئی اور تھی، جس کو کھو کر وہ خود کو بھی کھو بیٹھا تھا اپنے یقین و اعتماد کو بھی حواسوں میں لوٹا تو سود سمیت مثال کو

سب کچھ واپس کر دیا تھا، اس کی محبت جنونی تھی تو نغرت کی کوئی حد نہیں تھی، ان کی چاہت کی ندی، جس طرح چڑھی تھی، اسی طرح اترتی تھی۔



”ایسے چوری سے کیوں دیکھ رہی ہو، آپ کا اپنا ہوں، بلا تھک دیکھئے، بانی داوے لگ کیسا رہا ہوں؟ ہوں بتاؤ نہ؟“ وہ عین اس کے سامنے بیٹھ کر شوشی سے کہہ رہا تھا، اس کی نگاہیں وارفتگی شوق سے اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لمبوس سے بھونکی دل آویز مہک سانسوں کی گرمی انگارے بن کر اس کی نس نس میں اتر گئی تھی، چہرے پر تمام جسم کا خون سمٹ آیا تھا۔

”ہوں، بتاؤ ناں کیسا لگ رہا ہوں؟ یہ فاول ہے کل تمام رات میں نے آپ کی مدح سرائی میں گزار دی اور ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ ایک لفظ تعریف کے بھی لائق نہیں ہیں۔“ وہ مصنوعی ناراضگی سے گویا ہوا، انداز میں شرارت پنہاں تھی۔ کرن اس کی شرارت نہ سمجھ سکی تھی اور بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ چند گھنٹے قبل ہی تو گرینی نے نصیحت کی تھی کہ انس کی چاہت ہمیشہ پانے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملانی ہوگی، وہ جو کہے اس سے انکار نہ ہوگا، اسے نہیں معلوم تھا یہ اقرار اور اصرار کے مراحل اتنی جلد شروع ہو جائیں گے اور اس کی پہلی فرمائش بھی اتنی بے باک ہوگی۔

کرن نے آہستگی سے اس کی طرف دیکھا، وہ جو ابھی جذیوں کے دینار لٹا رہا تھا، پل بھر میں اس سے اجنبی بناؤ رخ پھیرے بیٹھا تھا۔ ”محبت اور نفرت ایک سکے کے دو پہلو ہیں، دو رخ ہیں میں چاہتی ہوں تم پر صرف اور صرف اس سکے کا ایک رخ استعمال ہو محبت اور صرف محبت کا۔“ گرینی کی نصیحتیں اس کی سماعت میں گونجنے لگی تھیں۔

”وہ اعتدال سے ناواقف شدت پسند ہے، اس کی محبت بھی شدید تر ہوتی ہے تو نفرت شدید ترین۔“ وہ ناراض بیٹھا تھا وہ کس طرح اسے منائے؟ کیونکر اس کی خفگی دور کرے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ رونے لگی۔

”ارے..... رو کیوں رہی ہو؟ کیا ہوا؟“ وہ جو اسے ستانے کے لیے رخ موڑے بیٹھا تھا۔ یک دم اس کی رونے کی آواز سن کر بوکھلا کر پلٹا۔

”آٹم سوری..... سوری مجھے نہیں آتی“ وہ گھنٹوں میں چہرہ چھپائے رندھی آواز میں بولی۔  
”کیا نہیں آتی؟“

”تعریف کرنا..... بلکہ مردوں کی تعریف کرنا۔“ جو اب انس بے اختیار ہنس پڑا تھا اور جھک کر اس کا چہرہ دائیں ہاتھ سے اوپر کر کے گویا ہوا۔

”میری تعریف اس سے بڑھ کر کیا ہوگی جان من! کہ سب دیکھ کر بھی تم نے مجھے قبول کیا، میرا ساتھ گوارا کیا، تمہاری محبت کا، تمہاری عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے، میں مذاق کر رہا تھا۔“

وہ اس کے چہرے پر بکھرے آنسو صاف کرتا کہہ رہا تھا۔ کرن کے اندر ایک نشاٹ انگیز کیفیت سراپت کرتی گئی۔

☆.....☆.....☆

صدمے کمرے میں قدم رکھے اور ٹھنک کر رُک گیا۔

بے ترتیب بال!

زرور گت!

بکھرا حلیہ.....!

وہ حمزہ تھا جو بے تحاشہ رور رہا ہے، قریب ہی اس کا موبائل پڑا تھا۔

”حمزہ حمزہ کیا ہوا، ایسے کیوں رور رہے ہو؟“ وہ جست میں اس کے قریب پہنچا اور جھنجھوڑ کر بولا۔

”بے نام مسافروں کا سفر رائیگاں جاتا ہے، سو میرا سفر بھی رائیگاں ہو گیا۔“

وہ ہچکے لہجے میں بولا آنسو مسلسل بہ رہے تھے۔

”کس کی کال آئی تھی جس نے تمہاری یہ حالت بنا دی ہے۔“

”کسی کی نہیں۔“ وہ موبائل کوٹ کی جیب میں ڈال کر گویا ہوا۔ صدمہ کے خیال سے وہ اپنی کنڈیشن پر قابو پا چکا تھا، ورنہ دل تو یہی

کہہ رہا تھا کہ فوری بند ہو جائے۔

”اب مجھ سے بھی پردہ ہوگا؟“ وہ خفا ہوا۔

”پردہ داری کیسی جو بات تھی میں نے بتا دی۔“

”پھر یہ کس کی یاد میں رور رہے تھے؟“ وہ سمجھ گیا تھا، کال کس کی ہوگی۔

”بس ایسے ہی باہر بادل برسے تو میرا دل بھی برسے لگا۔“

”تمہارا دل بادلوں کا ساتھ دے رہا ہے یا بادل تم پر رور رہا ہے؟“

”پلیزی لیوی الوں۔“ صدمہ کے سوالوں نے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

”تمہا تو گئے ہو اور کتنا تمہارا ہنا چاہو گے، آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ تم نے ہم سب کو بھی وہی

پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تم خوش رہو گے تو ہم بھی خوش رہیں گے۔“ صدمہ خاصے غصے سے گویا ہوا تھا۔

”میں نے کسی کو نہیں کہا کہ پریشان ہوں۔“

”انہوں سے کہا نہیں جاتا، وہ آپ کے احساسات کے ساتھ از خود وابستہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہر موڈ کی انہیں خبر ہوتی ہے۔“

”اوکے، میں سمجھتا ہوں، تم جاؤ تمہیں مٹی بلاری تھیں۔“ اس نے بہانے سے صدمہ کو وہاں سے ٹالا اور خود بھاگ کر کار نکالنے چلا

گیا۔ موسم سخت سردی کی لپیٹ میں تھا۔ بارش برس کر کچھ گھٹنے نقل رُک گئی تھی جس کے باعث سردی میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا تھا۔

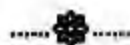
ہر سو جمل نقل کا سماں تھا، ہواؤں میں بریلی ٹھنڈک تھی مگر اسے اس وقت سردی گرمی کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ اندر کی آگ

کے سامنے باہر کی برف پگھل رہی تھی، وہ دیوانوں کی طرح کار چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ انٹرپورٹ کے راستے اور سبزہ بارش میں دخل کر کھڑے گئے تھے، وہ تیزی سے کار چلاتا انٹرپورٹ کے پارکنگ ایریا میں کار کھڑی کر کے باہر نکلا تو اسی وقت جہاز اڑا تھا۔

”کرن! تم مجھ سے آخری ملاقات بھی نہ کر کے گئیں۔ میں تو فوراً ہی چلا آیا ہوں، پھر بھی تم نہ ڈک سکیں، مجھ سے محبت نہ کی تھی مگر ترس ہی کھا لیتیں۔“ حزرہ وہیں جنگلا پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

رحم اُلفت یہ اجازت نہیں دیتی ہے ورنہ

ہم بھی تم کو ایسا بھولیں کہ سدایا دکرو



”حزرہ.....!“ اُسے لگا کوئی دور سے اسے پکار رہا ہو۔ اس نے توجہ نہ دی، ماہر دیکھنے کی تمنا لیے وہ دن گزار رہا تھا، اب جب وہ جا رہی تھی یہ شہر یہ ملک اور اُسے چھوڑ کر تو دید کی بیاسی لگا ہوں کو سیرابی کی چاہ تھی، وہ پکڑ لینا چاہتا تھا ان لمحوں کو، جکڑ لینا چاہتا تھا ان ساتوں کو، جن میں اُس کا مطلوب سامنے ہوتا اور وہ اسے تکتا رہتا، تکتا رہتا تھا۔ وصال کی بہار یک لخت ہی بھجر کی خزاں میں بدل گئی تھی۔ کتنا تیز دوڑا تھا وہ.....

لیکن وقت کی دوڑ سے کوئی جیت سکا ہے؟

”حزرہ! حزرہ!“ پھر اس کی ساتوں میں وہی آوازیں گونجی تھیں۔

”مت پکارو مجھے، مت فریب دو، مت مجھے بھٹکاؤ کہ اب مجھے بھٹکانا ہی ہے، بھاگتے لمحوں کو نہ پکڑ سکا مگر ماضی تو میری دسترس میں ہے۔“ اس لیے اس کی پشت پر ہلکی سی دھپ لگی تھی۔

ایک ماٹوس خوشبودرگ دپے میں دوڑ کر حواسوں کو معطر کر گئی تھی۔ ساتھ ہی تانائوس بھٹکا رہی۔ عجیب سریلی چوڑیوں کی جھنکار.....

”حزرہ!“ یک لخت ہی برقی لہرائی تھی، وہ شاکڈرہ گیا۔ نہ معلوم خوشی کا احساس تھا یا حیرت، وہ اس حقیقت کا ادراک جو وہ دل

دستی کے جنوں میں بھول بیٹھا تھا۔

پھولی سانسوں اور منتشر حواسوں سمیت وہ اس کے سینے سے لپٹی۔ پرہل لکر کی ساڑھی جس کے بارڈر گولڈن تھے۔ گولڈن ہی

ہینڈی ورک تھا۔ ساتھ اس نے میچنگ کی گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ قیمتی جیولری اور خوب صورت میک آپ نے اس کی شخصیت بدل کر رکھ دی

تھی۔ سادگی میں نظر آنے والا اس کا حسن بدلی میں چھپے چاند کی مانند تھا۔ اب سچ سنو کر وہ چودھویں کا چاند نظر آ رہی تھی۔ ناک میں دہکتی

ڈائنڈ لومک، ہاتھوں میں چمکتی طلائی چوڑیاں، خوشی سے دھکتا چہرہ، پُر اعتماد و طمانیت اور آسودگی جھلکانا شاداب، یہ خواب تھا یا حقیقت۔

وہ پلکیں بنا چھپکائے اسے دیکھتا رہا۔

”حزرہ! تم ابھی تک گھاٹڑے کے گھاٹڑی ہو، میں پکار رہی ہوں تمہیں اور تم کو ہوش ہی نہیں ہے، ابھی بھی خیالوں کی دنیا کے ہاسی

ہو۔“ وہ خواب نہیں حقیقت تھی، کرن اس کے سامنے تھے، قریب تھی۔ نئی سنواری، نئے روپ، نئے ڈھنگ سے اس کی دید کی بیاسی نظریں

بتا میرا بے ہوئے چمکتی چلی گئی تھیں۔ دل ایک نئے درد سے آشنا ہوا تھا۔

اس کا یہ روپ، اس کی ساج و سج

اس کے لیے نہ تھی، وہ کسی اور کی امانت بن چکی تھی اور اس کے لیے شجر ممنوعہ جس حقیقت کو بھول کر یہاں دیوانوں کی طرح پہنچا تھا، دل کی جو کیفیت کی تھی، جذبوں کا جو رنگ تھا ان سب پر برف گرنے لگی تھی۔

”کرن ایہ تم ہو؟“ وہ ہونٹوں پر زبردستی مسکان بکھیرتے ہوئے گویا ہوا۔

”ہاں..... دیکھو کیسی لگ رہی ہوں؟“ سرت اس کے انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”بہت اچھی۔ بہت پیاری۔“ خشک لبوں سے بمشکل لفظ نکلے۔

”تم، اسی طرح مجھے دیکھنا چاہتے تھے؟“

”ساتھ تمہیں اپنا کر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔“ اندر کوئی کراہا تھا۔

”سچ بتاؤ نا..... کیسی لگ رہی ہوں؟“

”بہت پرانی، بہت اجنبی، کسی کھوئی ہوئی قیمتی چیز کی مانند، جس کے متعلق یقین ہو جائے وہ اب کبھی نہیں ملے گی۔“ وہ سوچ کی عمیق گہرائی میں گم تھا۔

”ارے۔ کیا ہوا حمزہ! تم میری کسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو، کیا ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟“ وہ اسے خاموش اور گم سم کھڑا دیکھ کر پریشان سے گویا ہوئی۔

”نہیں..... میں تم سے کیوں خفا ہوں گا، دراصل میں سمجھا شاید لیٹ ہو گیا ہوں۔ تم جا چکی ہو، اب تمہیں سامنے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔“ اس دوران انس بھی آگیا تھا۔ دونوں بھل کیر ہوئے، اس کے انداز میں گرم جوشی تھی۔

”گلائیم لیٹ ہو گئی ہے اور شاید اسی لیے دیر ہوئی ہے کہ ہم مل سکیں، ورنہ بے حد افسوس ہوتا ہمیں نہ ملنے کا۔“

”میں رات سے تمہارے موبائل پر ٹرائی کر رہی ہوں، ہر بار تمہارا سیل آف ملا ہے، میں تو آس ہی چھوڑ چٹھی تھی تم سے ملاقات کی، یہ بائی چانس کال مل گئی تھی۔“

”میں اکثر بھول جاتا ہوں سیل آف کر کے۔“

”تم بالکل نہیں بدلے، اسی طرح بھولنے کی پیاری میں ابھی تک جھلا ہوں۔ اسی طرح سوچوں کے جنگل میں سرگرداں رہتے ہو تم، بالکل نہیں بدلے بالکل نہیں۔“ وہ ہنسی تھی، ایسی ہنسی جو طمانیت کے آسمان میں سرتوں کی کھکشاں جگمگاتی ہے، اس کا چہرہ بھی کھکشاں تھا۔

”انس! آپ کو معلوم ہے میں نے حمزہ سے بہت لڑائی کی ہے بلکہ..... لڑائیاں، ماما ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتی تھیں اور مجھے خصر آتا تھا کہ وہ میری ماما ہونے کے باوجود اس کی حمایت کیوں لیتی ہیں۔ یہ جب بھی اسی طرح خاموشی سے مسکراتا رہتا تھا یا پھر مجھے سمجھانے بیٹھ

جاتا تھا۔“ کرن انس کا بازو تھامے ہنستی ہوئی بتا رہی تھی اور بھی نہ معلوم کیا کچھ کہہ رہی تھی، مگر وہ کہاں سن رہا تھا۔ اس کی نگاہیں انس کا بازو بے حد اچھائیٹ و محبت سے پکڑے کرن کے ہاتھ پر تھیں، اس کی آنکھوں میں ڈھنڈا ترنے لگی۔ ہر شے اس نئی میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

دل ڈکھتا ہے تو بھرا آتی تھیں آنکھیں

کچھ روز ہوئے ہم آنسوؤں سے اُلجھے ہوئے ہیں

کیا کریں، کس سے شکایت اور کیسے شکوے

اک میرے سوا سب لوگ یہاں سلجھے ہوئے ہیں

اس کی آنکھیں بھرا آتی تھیں۔ اسی دم انا ڈنسمٹ ہوئی تھی۔ انس نے اس سے مصافحہ کیا تھا۔ کرن اس کے قریب چلی آئی تھی۔

”میں نے تمہیں بے حد تنگ کیا ہے، بہت ستایا ہے، مجھے معاف کر دینا۔“ اس لمحے وہ جذباتی ہو گئی، اسے اپنے آنسوؤں پر

اختیار نہ رہا۔

”اسٹوپڈ ایسا کچھ نہیں کیا تم نے، جس کی معافی مانگ رہی ہو۔“

”تم ماما کی طرح اعلیٰ ظرف و مفاہمت پسند ہو، اس لیے سب کو معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو، ہر زیادتی بھلانے کی صلاحیت

رکھتے ہو جزوہ! اپنے قریب رہیں تو ان کی اچھائیاں، نیکیاں اور بھی بے حد عمدہ صفات ہم سے اوجھل رہتی ہیں، جب ہم دور ہوں تو معلوم ہوتا

ہے، کوئی ہمارے لیے کیا تھا اور ہم اس کے کتنے عادی ہیں۔“

وہ کہہ رہی تھی۔

آنسو بہ رہے تھے۔ انس خاموش کھڑا تھا، جزوہ رو رو دھکا۔

”تم سے دور ہوا تو محسوس ہوا، تم مجھے از حد عزیز ہو۔ ایک بھائی کی طرح، اچھے دوست کی طرح۔ بہت اعلیٰ بہت نفیس انسان ہو

جزوہ تم، بہت یاد آؤ گے مجھے۔“ وہ بڑھ کر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

جزوہ تہہ در تہہ برف میں دفن ہونے لگا۔

رگوں میں دوڑتا خون

سینے میں دھڑکنی دل

آنکھوں میں پھلنے آنسو

برف بن رہے تھے۔

انا ڈنسمٹ بار بار ہو رہی تھی، وہ بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا تھا۔ کرن خود ہی الگ ہوئی تھی۔ آگے لاؤنج میں گرینی، قاریہ اور سحر

موجود تھے۔

”مجھے تمہاری دعائیں چاہئیں حمزہ! ایک دوست کی دعا، ایک اپنی ماما کے لاڈلے کی دعا، اپنے پیارے ایسے بھائی کی دعا جس نے مجھے بھائیوں سے بڑھ کر چاہا۔“

حمزہ کے پاؤں کے نیچے زمین رہی تھی، نہ سر پر آسمان، نہ ارد گرد بے تحاشہ لوگوں کا جھوم۔ وہ ہواؤں میں مطلق تھا۔ کرن کے بار بار پکارنے پر اس نے خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو محبت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بڑی پاکیزہ۔ بڑی عقیدت بھری مسکراہٹ تھی کرن کی۔ وہ خود سے لگا ہیں چرانے لگا۔ اسے اپنی سوچ پر اپنی چاہ پر اپنی آرزو پر شرم آنے لگی۔

”میری تمام دعائیں تمہارے ساتھ ہیں کرن! جہاں رہو خوش رہو۔“ حمزہ نے کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، پھر جیکٹ کی جیب سے ایک فینیل کا جیولری بکس نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میری طرف سے یہ گفٹ ہے، اسے سنبھال کر رکھنا۔ اپنے خاندان کی سات نسلوں سے ہر آنے والی بڑی بہو کو یہ لاکٹ گفٹ ہوتا رہا ہے مگر..... اب میں نے اس کی تاریخ بدل دی ہے جی کو دے کر۔“ جدائی سدا بوجھل رہی ہے۔ رکی ٹیک ٹیک کے بعد وہ دونوں چلے گئے تھے۔

کتاب ذیست کا اہم ترین باب بند ہو گیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں، سنسناتے دماغ و منتشر ہوتے حواسوں کے ہمراہ وہاں سے نکلا تھا۔

☆.....☆.....☆

والدہ حضور کی زیرک نگاہوں سے برہان لغاری اور قاعدہ کی دن بدن بڑھتی بے تکلفی معنی نہ رہ سکی تھی۔ چند دن تو وہ انتظار کرتی رہیں، حالات معمول پر آنے کے لیے جوان کی توقع کے برعکس بتدریج بگڑ رہے تھے۔

پہلا دو چکان کے لیے برہان لغاری کی بے نیازی یا مصروفیت تھی جس میں کھوکھوہ ان کی ذات کو بھی فراموش کر چکے تھے اور ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا جو وہ ان سے لاپرواہ ہوئے تھے۔

والدہ حضور کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھی، جس انقلاب کو برپا ہونے سے برسوں قبل وہ روک چکی تھیں۔ اسی کی آہٹیں انہیں پھر سنائی دے رہی تھیں، لمحہ بہ لمحہ اپنے اقتدار کی مسند کی طرف بڑھتی ہوئیں۔

”والدہ حضور! آپ نے یاد کیا ہے؟“ برہان لغاری اندر آ کر ان سے مخاطب ہوئے جو ٹکرات کے بحر میں غوطہ زن تھیں۔ ان کی آواز سن کر انہوں نے اپنے سفید پلکوں والی جہانم دیدہ نگاہیں ان کے چہرے پر ڈالیں۔

بڑی گہری نگاہیں تھیں، کھوجنے والی، تجسس والی۔

برہان لغاری چند لمبے ماں کی نگاہوں سے پریشان ہوئے مگر جلد ہی سنبھل گئے اور ان کے اشارہ کرنے پر صوفے پر بیٹھ گئے۔

”آج کل اتنے معروف رہنے لگے ہو کہ ماں کی یاد نہیں آتی، ہم نے سوچا ہم ہی یاد کریں، بلکہ یاد دلائیں کہ برہان لغاری کی

ماں زندہ ہے ابھی۔“ اُن کا خندا لہجہ عجیب سی آج دے رہا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے والدہ حضور؟ بس آج کل کچھ مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔“ انہوں نے لہجے میں بٹاشت بھری۔

”اچھا.....“ وہ سخت طنزیہ انداز میں گویا ہوئیں۔ ”اب ہم سے بھی بڑھ کر مصروفیات ہوں گی؟“

”ایسا ہرگز نہیں ہے۔“ وہ زری طرح گھبرا کر گویا ہوئے۔

”ایسا ہی ہے تمہاری نظروں میں ہماری عزت نہیں رہی۔“ وہ زہریٹھ انداز میں گویا ہوئیں، برہان اٹھ کر اُن کے قریب آگئے۔

”ہم ایسی گستاخی نہیں کر سکتے والدہ حضور! لیکن ہمارے کسی رویے سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو تو معافی چاہتا ہوں، وراصل آپ تو

جاتی ہیں، میں کن پریشانوں و مصائب کا شکار ہوں، اس وجہ سے کسی کوتاہی کا شکار ہو گیا ہوں تو معافی کا خواستگار ہوں والدہ حضور۔“

”ہمیں لفظوں سے مت بہلاؤ برہان! آج کل تمہاری کیا مصروفیات ہیں، یہ ہم بخوبی جانتے ہیں۔“ وہ ان کی جانب دیکھتی

ہوئیں جتانے والے انداز میں بولیں۔ برہان نے گڑبڑا کر لگا ہیں جو کالی تھیں۔

”جو لگا ہیں چرا تے ہیں، وہ کچھ ایسا لفظ کر رہے ہوتے ہیں کس اُن کو خود بھی اپنی فطرتی کا احساس ہوتا ہے مگر پھر بھی درست سمت پر

نہیں چلتے ہیں۔ تم آگ سے کھیل رہے ہو برہان..... اس کھیل کا انجام جابھی ہے۔“

”میں..... سمجھا نہیں ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں.....“

”کبھی نہیں یا سمجھنا نہیں چاہتے؟“ ان کا انداز بہت ٹیٹھا تھا۔

برہان لغاری اُن کے آگے صرف سر جھکا کر بیٹھنے کے اور کچھ نہ کر سکے کہ وہ ان کی ذومعنی گفتگو کو بخوبی سمجھ رہے تھے مگر اس امر سے

خود کو باز رکھنے یا والدہ حضور کے سامنے اعتراف یا انکار کی جسارت خود میں نہ پارہے تھے۔

”مگر کوئی لٹیروں سے بچانا چاہتے ہو تو چور و روزا سے مت کھولو، ایک بار آزمائے ہوئے کو بار بار کیا آزمانا، جن کی سرشت میں وفا

نہیں ہوتی وہ وفا کرتے ہیں صرف دعا۔“ ان کا لہجہ ہنوز بے لچک تھا۔

”فائدہ پہلے سے بالکل بدل گئی ہے والدہ حضور۔ حالات نے اسے توڑ پھوڑ کرنی عورت بنا دیا ہے، پہلے جیسی کوئی بات نہیں ہے

اس میں۔“

والدہ حضور کی طرح بات کو ہیر پھیر کرنے کی وہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ سیدھے طریقے سے وہ فائدہ کا نام لے بیٹھے جس کو سن

کر والدہ حضور کے عضلات کھنچ گئے تھے اور آنکھوں میں برہمی نظر آنے لگی تھی۔

”یہ بہت بڑی فطرتی ہے تمہاری وہ کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی ہے۔“

”اتنا عمر گزر جانے کے بعد بھی آپ کا دل اُس کی طرف سے صاف نہ ہو سکا۔ اُسے معاف کر دیں والدہ حضور وہ.....“

”خاموش!“ وہ غصے سے بولتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھیں۔ ”اس بدکار عورت کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”وہ منال کی ماں ہے۔“ اُن کی آواز کمزور تھی۔

”مگر تمہاری بیوی نہیں ہے، یہ کان کھول کر سن لو اور مناب بن سکتی ہے ہم جس کو تھوک دیتے ہیں اس کو چاٹنے نہیں ہیں۔“

”میں منال کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں، بہت دباؤ ہے مجھ پر۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کس طرح وہ لڑکی نارمل ہوگی۔ کل رات بھی اس نے کلائی کی رگ چھری سے کاٹ لی تھی۔ اگر بروقت فائدہ سے اسپتال نہ لے جاتی تو اسے جانی نقصان پہنچ سکتا تھا۔“

”ہونہر جیسی ماں ویسی بیٹی۔“ اُن کے لہجہ میں شدید نفرت تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر صاحب نے جس والہانہ گرم جوشی و محبت سے ان کا استقبال کیا تھا، وہ پیار و محبت اُسے سرشار کر گئی۔ اس حوالے سے ملی عزت معتبر بنا گئی۔ وہ جو سدا سے نصیب و مقدر کی بے نیازی سے شکوہ کناں رہی تھیں، ان دنوں خود کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھ رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے شان دار ویسے کی پارٹی اریج کی تھی جس میں نیویارک کے اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والے معززین نے شرکت کی تھی۔ خواتین نے مشرقی انداز میں بنی ڈلہن کی بے حد تعریف کی تھی۔

اُس خود بھی تھری ٹیس سوٹ میں بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں بھی بے ساختہ ڈلہن بنی کرن کی جانب اُٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے فخر سے کرن کو سب سے ملوار ہے تھے۔ وطن سے دور اس ویس میں بھی ان کا حلقہ دوستی بے حد وسیع تھا۔

ویسے کے بعد کئی دنوں تک اُن کی دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔

”کرن! مبارک ہو۔“ اُس خوشی سے چمکتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

”کس بات کی؟“ وہ جو ہال بائندھ رہی تھی، ہال چھوڑ کر بولی۔

”سعد جزواں بچوں کا باپ بن گیا ہے۔“

”تھینکس گاڈ! فار یہ بھابی کیسی ہیں، اُن کی بہت فکر تھی مجھے۔“

”وہ ٹھیک ہیں، چائٹڈ بھی ٹھیک ہیں اور تم کال کر کے معلوم کر لینا۔“ اس نے آگے بڑھ کر اس کے ہال بگاڑے۔

”مگر تمی ہمارے پاس آ جائیں گی اب؟“ اس کی قربت میں نزوس ہونے لگی۔

”ہاں..... آ تو جائیں گی، مگر ان کی ایک شرط ہے۔“ وہ اُس کی جانب دیکھتے ہوئے مسکراہٹ لیبوں میں دبا کر گویا ہوا۔

”شرط! کیسی شرط؟“

”تم بھی فار یہ بھابی جیسا سر پر اتزو دینے کا وعدہ کر دو۔.....“

وہ اُس کی آنکھوں میں جمائتا شرارت سے گویا ہوا تو وہ شرم سے سرخ پڑ گئی اور فوراً رخ موڑ لیا تھا۔

”اُوںہوں، چیلنج نہیں چلے گی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دینا ہوگا۔“ اُس نے شانوں سے تمام کراسا اپنی طرف کیا۔



”میں ابھی آتی ہوں کچن میں سے“۔ وہ جڑ بڑ ہوئی۔

”یہ فرار ہے میرے سوال کا جواب نہیں ہے“۔

”پلیز مجھے جانے دیں، سالن چل جائے گا“۔ وہ منت بھرے انداز میں بولی تو انس نے یہ کہتے ہوئے اسے چھوڑا۔

”جاؤ، کیا یاد کرو گی، کس تلی سے بندھن بندھا ہے“۔

انس آفس چلا گیا تھا۔

مدثر صاحب بزنس ٹور پر کل آسٹریلیا روانہ ہوئے تھے، کرن گھر میں تھا تھا۔ یہاں پاکستان کی طرح ملازموں کی کثرت نہ تھی۔

جزوقتی طور پر وہ ٹیکرو ملازما نہیں تھیں، جوڈسٹنٹ اور واشنگ کر کے چلی جایا کرتی تھیں۔ کچن کا کام انس اور مدثر صاحب کے کاموں کی ذمہ

داری اس نے خود اپنے ذمہ لی تھی جو بہت معمولی تھی۔ اس پر بھی مدثر صاحب راضی نہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا، اُن کی بہو عکرائی کے لیے ہے، وہ

گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگائے، وہ اُس کے آرام کے لیے بے شمار ملازم افورڈ کر سکتے ہیں، پھر کئی کوششوں کے بعد وہ انہیں راضی کرنے

میں کامیاب ہوئی تھی۔ ملازماؤں کے جانے کے بعد اُس نے تمام گیٹ لاکڈ کیے تھے اور آ کر اپنے بیڈروم میں آرام سے بیٹھ کر کراچی کال

ملانے والی تھی کہ موبائل پر کال آگئی تھی۔ وہ چونک اٹھی تھی، اسکرین پر نمبر نہ پہچانی تھی۔

”ہیلو! وہ سچیدگی سے بولی۔

”السلام علیکم، کرن! میں محمد یول رہا ہوں“۔

”محمد.....! اوہ کتنے عرصے بعد تمہاری آواز سن رہی ہوں، رنلی کتنا اچھا قبل ہو رہا ہے۔ باڈا میزنگ سر پر اٹھ“۔ محمد کی آواز سن کر

اُسے حقیقتاً بے حد مسرت ہوئی تھی۔ محمد کو بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اُس نے کرن کو شادی کی مبارک باد دی، اسی سلسلے میں خاصی گفتگو ہوئی ان کی۔

”محمد! حزرہ کیسا ہے؟ اُسے کیا ہو گیا ہے، وہ ایئر پورٹ آیا تھا مجھے ہی آف کرنے، وہاں میں نے نئے حزرہ کو دیکھا، بہت ٹوٹا،

بکھرا، الجھا الجھا، اپنے آپ سے بے خبر، وہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ اب ایسا لگتا ہے کوئی ٹریجڈی ہوئی ہے، اُس کے ساتھ تم ہٹاؤ کیا ہوا ہے؟“

”سچ سنو گی؟“ لمبے بھر کو محمد کی آواز کانپنی تھی۔

”آف کورس“۔

”اس کی ٹریجڈی تم ہو کرن“۔ وہ دھمکے سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔

”یہ معلوم کب تم اس کے قریب اس قدر آئیں کہ دل پر عکرائی کرنے لگیں“۔

”شٹ آپ صبر! تمہیں معلوم ہے کیا کب رہے ہوا!“ ایک پلہ میں پورا کرہ گردش کرنے لگا۔

”مجھے بے حد افسوس سے یہ سب کہنا پڑ رہا ہے، اگر حالات نارمل ہوتے تو میں کبھی بھی یہ راز تم پر ظاہر نہ کرتا کہ ظاہر کرنے کا کوئی

قائدہ ہی نہ تھا، مگر مجبوری یہ آگئی ہے، مگی بی بی پٹی شوٹ کر جانے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ حمزہ اپنی ضد نہیں چھوڑ رہا ہے۔  
”کیسی ضد؟“

”وہ پاکستان سے باہر جا رہا ہے ہمیشہ کے لیے، کہاں جا رہا ہے، یہ مجھے بھی نہیں بتا رہا، اسی وجہ سے مگی ہاسپتال آئے ہیں مگر وہ گویا پتھر کا بن گیا ہے۔ اُس پر مگی کی کنڈیشن، مگر کی ٹینشن، کسی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔“ صمد کے لہجے سے از حد پریشانی و فکرمگن چمک رہا تھا اور اسے اس انکشاف نے بے جان سا کر ڈالا تھا۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر اُن جیتے ہوئے تمام مناظر کی فلم چل رہی تھی۔ صمد نہ معلوم کیا کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی ساتھیوں میں ہواؤں کی سرسراہٹیں تھیں۔ آنکھوں سے آنکھوں کا میل رواں تھا۔

”کرن..... کرن! آ رہا رات؟“ اُس کی مسلسل خاموشی نے صمد کو فکرمند کر ڈالا تھا، وہ گھبرا کر بولا۔

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ کوشش کے باوجود وہ اپنی لرزتی ہوئی آواز پر قابو نہ پاسکی تھی۔

”میں نے بہت سوچا کہ کس طرح اُسے روکا جاسکے، بالآخر میرے ذہن میں تمہارا ہی نام آیا اور میں نے کال کی، پلیز کرن اگر کوئی اُسے اس فیصلے سے روک سکتا ہے تو وہ تم ہو، وہ اپنی زندگی جاہ کمرے گا، نہ کبھی گھر بسائے گا، نہ گھر آئے گا اور اُس کے جانے کے بعد گھر کہاں رہے گا، زندہ مردوں کا قبرستان بن جائے گا۔“ شدت جذبات سے وہ رو پڑا تھا۔

”رودُست صمد! مجھے اس درد کا احساس ہے جس سے تم گزر رہے ہو۔ اپنوں سے چھڑنے کی اذیت تازیت محسوس ہوتی ہے، تم فکرمند کرو، میں سمجھاؤں گی حمزہ کو، وہ میری بات مان جائے گا، میں نے اسے ہمیشہ سے اچھا دوست، اچھا بھائی مانا ہے، نہ معلوم کس طرح اور کیوں وہ ان رشتوں کو بھول کر فضولیات سوچنے لگا اور اس حد تک چلا گیا۔“

”جھینکس اسے لوٹ کرن! مجھے یقین تھا تم ہی یہ پرابلم سولو کر سکتی ہو، لیکن تم سے میری ایک ریکوریٹ ہے حمزہ کو میری ان باتوں کے متعلق علم نہ ہو، ورنہ وہ.....“

”میں سمجھتی ہوں، تمہاری کال کا بھی ذکر نہیں کروں گی مگر تم بھی ایک بات یاد رکھنا، آج کے بعد ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ نئے رشتوں کی استقامت کے لیے یہ قربانی ضروری ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کرن! آہ..... پلیز ماما اور آستیز کو معاف کرو، تمہارا تم پر الزام لگا کر وہ شرمندگی میں گرفتار ہیں۔“

”بھول جاؤ گزری باتوں کو، میں نے سب کو معاف کیا۔“ اس نے سیل آف کر کے بیڈ پر بیٹھ دیا تھا۔ اُس کے اندر آہوں کا طوفان شدت پکڑ رہا تھا۔ دل کی دنیا پر سوگ کی پُند ہول خاموشیاں چمانے لگی تھیں۔ ابھی چند لمحوں قبل موت ہو گئی تھی۔

موت!

اُس کی پاکیزہ محبت کی۔

روشن اعتماد کی۔

بے مثال دوستی کی۔

مزہ جس کی دوستی پر اُسے فخر تھا، وہ بدل گیا تھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو گیا تھا۔ وہ روز ہی تھی ماں کے بعد دوسرا بڑا اصرار مزہ کی دوستی کی موت کا تھا۔ آنسو بہلا تھمنے والے کہاں تھے۔

☆.....☆.....☆

”اٹھ گئیں جانو! طبیعت کیسی ہے؟“ فائقہ نے اس کے بالوں میں ہاتھ بھرتے ہوئے پیار سے کہا۔

”میں سوئی کب تھی؟“ اس کی آواز گہری اداسی میں ڈوبی تھی۔

”سوئی! تم چہرے پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی تھی، میں بھی سو گئی ہو۔“

”میں کہاں سوتی ہوں، سو بھی کیسے سکتی ہوں، میری نیندیں وہ چرا کر لے گیا ہے، میرا سکون، میرا چین میرا سب کچھ۔“ وہ کھوئے

کھوئے انداز میں بولی۔ فائقہ نے ذہنی انداز میں اُس کی طرف دیکھا پھر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گویا ہونٹیں۔

”اس منحوس شخص کو بھول کیوں نہیں جاتی ہو، وہ کرن کے ساتھ میٹھ کر رہا ہے اور تم اُس کی یاد میں خود کو بھلائے بیٹھی ہو، اگر کل

میں وقت پر کمرے میں نہ پہنچ جاتی تو۔“

”موت اتنی آسانی سے نہیں آتی۔“

”چپ، کتنی بُری باتیں کرنے لگی ہو، کچھ احساس ہے۔“

”آپ بھی تو اتنی بُری باتیں کر رہی ہیں، خود آپ کو احساس ہے؟“

”میں نے کیا بُری بات کی ہے سوئیٹ ہارٹ!“ انہوں نے پیار سے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

”آپ میرے سامنے میرے محبوب کے متعلق بتا رہی ہیں کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ میٹھ کر رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر بُری بات اور

کیا ہوگی۔

”خیالوں کی دنیا سے نکل آؤ بیٹا، خیال اور یادیں صرف دکھ دیتی ہیں۔ وہ یاد رکھنے کے قابل نہیں ہے، اُسے بھول جاؤ۔“

”بھولنا ہی نہیں آتا مجھے، کیا آپ ڈیڑی کو بھول گئیں؟“ اُس نے فائقہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ..... یہ بھی کوئی سوال ہے؟“ وہ بُری طرح چل ہوئیں۔

”بتائیں آپ بھولی ہیں ڈیڑی کو؟“ وہاں کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ میرے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے واپس آئی ہیں۔“

”منال! میری محبت پر شک کر رہی ہو۔“ اُن کا لہجہ پست تھا۔

”نہیں ماما! حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ خیر جو ہوا سو ہوا، مرد کبھی گھانے کا سودا نہیں کرتے، نقصان ہمیشہ عورت کے نصیب میں

آیا ہے، آپ کے جانے کے بعد بھی ڈیڑی کی زندگی میں عورتوں کی کمی نہ تھی۔ اب آپ کو پا کر شاید وہ سب کو بھول جائیں۔ مردوں کی

فطرت ایسی ہوتی ہے۔ ایک کو پا کر دوسری کو فراموش کر دیتے ہیں۔“

”جو تم نے کہا وہ صحیح ہے پھر تم انس کو کیوں نہیں بھولتیں۔ وہ بھی تو مرد ہے اور مردوں والی ہی فطرت رکھتا ہے۔ وہ تمہیں بھول گیا تم اسے بھول جاؤ اور اپنی زندگی کے بارے میں سوچو۔“ فاقدا ہنگلی سے اعتراف کرتے ہوئے اُسے سبھانے لگیں۔

”وہ مرد بے عام مردوں سے بالکل مختلف، ایک ایسا مرد جو وجود کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ اُس نے شادی کرن سے کی مگر دل میں اُس کے میں ہی آباد ہوں، اُس کے ساتھ کرن نہیں منال ہوتی ہے، میرا چہرہ ہوتا ہے۔“ اُس کے انداز میں اعتماد یقین کی مضبوطی تھی۔

”جھینکس گاڈ اتم نے اس حقیقت کو تو قبول کیا۔“ انہوں نے مسرت سے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”ڈیڑی نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی ہے۔“

”اب کریں گے بات، آپ واپس اپنی دنیا میں پلٹ آؤ، سب ٹھیک ہو جائے گا، میں اور برہان آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”آپ کا مجھے معلوم ہے مگر ڈیڑی کا یقین نہیں کہ انہیں اب میری خوشی سے بھی خوشی مل سکتی ہے وہ کتنے خود پسند ہیں، مجھے معلوم ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو اب ریٹ کرو، ڈاکٹر کے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔“ وہ اُس کے سر کے نیچے سگریڈ کرتے ہوئے پولیس۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”آپ کے برابر والے روم میں ایک پینٹ سے فرینڈشپ ہو گئی ہے، اچھا ٹائم پاس ہوتا ہے وہاں، بڑے مزے کی باتیں کرتی ہے وہ۔“

”مئی آپ کب سے فرینڈشپ کرنے لگی ہیں۔“ اُس کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

”کبھی ایسا ٹائم بھی آ جاتا ہے۔“

”ایسا کیا ہے اُن لیڈی میں؟“

”اس میں تو کچھ نہیں ہے، شکل سے ہی چار سو بیس عورت لگتی ہے۔ ہاں اُس کا ایک بیٹا ہے۔ بے حد سمارٹ اینڈ ڈھنگ پر ساتھی ہے اُس کی۔ میں چاہ رہی ہوں کسی طرح وہ لڑکا میرے قابو میں آ جائے تو مسئلہ حل ہو جائے۔“

”اُس لڑکے سے کیا کام ہے؟“

”آپ کا اور اس کا پھل بہت زبردست ہوگا۔“

”مئی آپ کو معلوم ہے، آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ خفگی سے بولی۔

”ہاں اچھی طرح معلوم ہے اور تم بھی سن لو برہان کسی طور پر آپ کو گھر میں رکھنے کو تیار نہیں ہیں اور اُن سے زیادہ وہ خزانہ بڑھیا نہیں چاہ رہی، ویسے بھی اُس لڑکے کو دیکھو گی تو انس کو بھول جاؤ گی۔ انس سے وجہ پوچھو اور پینڈسم ہے وہ۔“ منال خاموش رہی تھی۔

”اُس کی ماں کو ششے میں اتار رہی ہوں، ماں قابو میں آ گئی تو سمجھو بیٹا تو از خود ہی منھی میں آ جائے گا۔“

وہ خوب صورت پھولوں کا بو کے اور فروٹ کی ٹوکری اٹھا کر روم سے نکل گئی تھیں۔ منال کے چہرے پر مجروح سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

”کیا کوئی اس ستم گر، جنائش اور مفرد شخص کی طرح پنڈسم، اسمارٹ، کیئرنگ، لوئنگ، چارمنگ ہو سکتا ہے؟“ آنکھیں بند کر کے وہ پھر سوچوں و تصورات کے حسین و ہر فریب جنگل میں کھو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

بے حد کبر آلود شام تھی۔

تا حد نگاہ سرخی و حسد کی دیہیز چادر پھیلی نظر آ رہی تھی۔ حزرہ ہاتھ میں پکڑے کافی سگ پر ٹکا ہیں، جمائے بیٹھاگ کی اوپری سطح سے نکلنے دھوئیں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں دھوئیں پر مرکوز تھیں اور ذہن میں کرن کی باتیں گونج رہی تھیں۔ کچھ لمبے قفل ہی تو فون کیا تھا اس نے اور کیسی خواہش کی تھی جس نے اس پر ایک دباؤ، ایک بوجھ لا دیا تھا۔

کیسی آرزو تھی انہونی!

کیسی تمنا تھی جان ہوا!

وہ شادی کر کے اپنی دنیا بسالے اور ماں باپ کی خدمت کر کے آخرت سنوارے، یہی اس کی خواہش تھی یہی تمنا اور اہمیت تھی۔

وہ رو رہی تھی۔

بے تماشہ، بے ربط۔

اس کا ہر آنسو اپنے دل پر گرا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اقرار نہ کر سکا تو انکار بھی نہ کر سکا اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ہی منوا گئی، اپنی قسم دے کر۔ اس کی قسم جو جان سے بڑھ کر عزیز ہے جس کی خاطر وہ سولی پر لٹک سکتا ہے، سانس لینا چھوڑ سکتا ہے، یہ جہاں چھوڑ سکتا ہے مگر..... قسم نہیں توڑ سکتا۔

”میرے بھائی یہ کافی کام ہے، کوئی جاوٹی چراغ نہیں جس کو تم اتنے غور سے دیکھ رہے ہو، گویا اس میں سے ابھی کوئی جن برآمد ہوگا اور ہاتھ ہاتھ ہاتھ کر کہے گا، کیا حکم ہے میرے آقا“۔ صہانہ آ کر اس سے مخاطب ہو، جس کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ ابھری۔

”ویسے آپس کی بات ہے، اگر قسمت سے کوئی جن مل جائے تو کیا خواہش بتاؤ گے؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”خواہش..... اب کیا خواہش ہے کچھ نہیں۔“

”کچھ تو یار! وہ کیا شعر ہے۔“

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم لگے

بہت لگے میرے رماں مگر پھر بھی کم لگے

”نہیں..... نہ مجھے کوئی جن چاہئے نہ کوئی خواہش“۔ وہ کافی کاگ ہوئوں سے لگا کر سپاٹ انداز میں گویا ہوا تھا۔ اُس کے انداز پر صدا سے دیکھا رہ گیا۔

”کیا دیکھ رہے ہو اس طرح سے؟“

”تم کب اپنے جوگ کو ٹھوکر مارو گے، ایک تمہاری وجہ سے سب کس قدر ڈسٹرب ہیں، تمہیں احساس ہی نہیں پایا افسردہ رہنے لگے ہیں۔ می ہاسٹلا تڑ ہیں۔ چچاؤں کی فیملیز کس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ تمہیں کسی سے کوئی غرض، کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک ناکام محبت کا انتقام تم کس کس سے لو گے؟ ہر جنون کی، ہر نفرت کی کوئی حد ہوتی ہے، تم نے سب کو چھوڑ دیا ہے، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی دشمنی کر لی، کیا محبت اتنی خود غرض و بے حس بنا دیتی ہے؟“

”کبھی نہ کبھی تمہیں بھی کسی سے محبت ہوگی پھر تمہیں خود ہی ان سوالوں کا جواب مل جائے گا، ہر سوال پایا کی افسردگی کا تو ضمیر کی سزا ہر سزا سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ وہ اپنے کل پر پشیمان ہیں، می ہاسٹل میری وجہ سے نہیں اپنی لاڈلی چیٹی، بہنوں کی مفاد پرستی، بے حس کی باعث مٹی ہیں۔ صدمہ بہنوں کی وجہ سے انہیں پہنچا جن بہنوں کی خاطر وہ سسرال والوں کو دشمن سمجھتی رہیں، وہ آج اُن کی دشمن ہیں۔ محض اس لیے کہ ان کی بیٹی می کی بہنو بن سکی، یہ ہے سگے رشتوں کی حقیقت اور چچاؤں کی فیملیز اپنا کیا بھگت رہی ہیں۔ اُن کے لڑکے ٹری صحبتوں میں پڑ گئے، بیٹیوں نے کورٹ میر جرز کر لیں یا اپنی من مانی کرتے ہیں، اُن کی عزت نہیں کرتے۔ اُنہیں نہیں سمجھتے تو یہ سب ان کے اپنے اعمال ہیں جو سیاہی بن کر ان کی عزتوں پر چھا گئے ہیں اور میں ماسوائے افسوس کے اور کچھ بھی کیا سکتا ہوں، تم ہر بار مجھے کیوں ٹیز کرتے ہو گویا جو کچھ ہو رہا ہے اُس کا ذمہ دار میں ہوں“۔ وہ خاصی نکلنے سے گویا ہوا تھا۔

”تم میں اب سچ سننے کا حوصلہ بھی نہیں رہا ہے، ذرا بات تمہارے موڈ کے خلاف ہوئی اور تم نے اسی طرح بد مزاجی اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ دکھانا شروع کیا“۔ جوا با صبر بھی اسی انداز میں بولا تھا۔

”صدا امت ڈسٹرب کرو، میں پہلے ہی آپ سیٹ ہوں“۔ وہ چیٹانی ہاتھ سے رگڑتے ہوئے پریشان لہجے میں بولا۔

”کیا ہوا؟“ صدمہ کے لہجے میں یک دم ہمدردی دینا رو رہا تھا۔

”کرن کی کال آئی تھی کچھ دیر قبل“۔

”اچھا خیریت سے تو ہے وہ؟“ صدمہ دانستہ لگا ہیں چرا کر گویا ہوا۔

”ہاں“۔ حزرہ نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

”اُس کو معلوم ہے میں اُس کی کوئی خواہش رو نہیں کر سکتا، اگر کرنا چاہوں تو جب بھی نہیں، اُس کا انداز سدا سے ایسا ہی ہوتا ہے کہ میں ”نہ“ کر ہی نہیں سکتا۔ کاش وہ ایسی فرمائش کرنے کے بجائے میری جان مانگ لیتی اور میں خوشی خوشی اپنی زندگی اُس پر نچھاور کر دیتا، پھر خواہش کی بھی تو ایسی جس کی اب میری زندگی میں ضرورت نہیں ہے“۔

”کیا کہا کرن نے؟“ کون سی خواہش پوری کروانا چاہتی ہے؟“  
 ”وہ چاہتی ہے میں شادی کر لوں۔“ حنزہ نے تیزی سے پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔  
 ”جب تمہیں نہیں کرنی تو چھوڑ دو، کیوں نہیں ہو رہے ہو۔“  
 ”اُس نے مجھے اپنی قسم دی ہے۔“

”تو پھر..... کیا ارادہ ہے؟“ صمد کے دل میں اُس کی اضطرابی کیفیت دروہن کرتے گئی۔ اس دور میں تو محبت اپنی سچائی، اپنی خوب صورتی کھوجی ہے، محض ٹائم پاسنگ ہابی بن چکی ہے۔ اُس کے بھائی نے کیسی عجمی و کمری صدیوں پرانی محبت کی ہے جس کا حاصل دروہدائی ہے صرف۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ میں یہاں سے جا رہا تھا ہمیشہ کے لیے کہ اب یہاں رہوں یا کہیں اور سب جگہ میرے لیے اجنبی ویران ہے۔ یہاں رہتا تو می مجھے ہر وقت شادی کرنے پر راضی کرتی رہتیں اور جو کام میں کرنا نہیں چاہتا، اُس کے لیے کیسے راضی ہو جاتا۔ شادی ایک مقدس رشتہ ہے جو وفا اور خوشیوں سے قبول کیا جاتا ہے کوئی لوہے کی زنجیر نہیں جو جبراً گلے میں ڈال کر بے بسی کے کھونٹے سے باندھ دو۔“

”پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟“ صمد اُسے شدید ذہنی تکلیف سے نکالنا چاہتا تھا۔

”فیصلہ ہو گیا مجھے وہی کرنا ہے جو وہ کہے گی، میں اُس کی مرضی کے خلاف نہیں سوچ سکتا ہوں، کسی اُن دیکھی ڈور سے بندھا ہوں اُس ڈور کی کاٹھا اتنی مضبوط ہے کہ کھولنا بھی چاہوں تو نہیں کھول سکتا، کاٹنا چاہوں بھی تو نہیں کاٹ سکتا۔“ اُنسو بے آواز اُس کی آنکھوں سے پھسل رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

فائدہ برہان لغاری کی دوست و گھر پر عکمرانی کے ارادے سے آئی تھی۔ اُن کی یہ خواہش تب سے تھی جب وہ اس گھر میں ڈیہن بن کر آئی تھیں مگر حیز و طراری سیاسی ذہن رکھنے والی ساس کے سامنے اُن کی دال نہ گل سکی تھی۔ شوہر کے دل پر عکمرانی کرنے کے باوجود وہ اُن کے نکل نما گھر پر عکمرانی نہ کر سکی تھیں اور پھر اپنی نازیبا حرکتوں کے باعث اس گھر سے بالکل نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھیں، تب وہ محدود ذہن و کمزور سوچ رکھنے والی عورت تھیں اور اب گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر، طرح طرح کے لوگوں سے مل کر بہت کچھ سیکھ چکی تھیں، چالاک و مکاری، فہم و فراست میں وہ والدہ حضور سے چار قدم آگے تھیں۔ وہ نول پروف پلاننگ لے کر پاکستان آئی تھیں، پہلا مرحلہ اُن کا برہان لغاری تک رسائی تھی جو نظریہ سے انہیں پہلے مرحلے میں ہی مل گئی اور انہوں نے ایک لمبے عرصے کے بعد اپنا کام کیا اور وہ جوان کی آواز تک سننے کے رد و ادارہ نہ تھے، اُن کی قربت میں ایسے موم بن گئے کہ جن کو اپنی مرضی سے وہ شہیہ دے سکتی تھیں اور انہوں نے دے دیا تھا۔

دوسرا مرحلہ والدہ حضور کی گمرانی اور اُن کے اور برہان کے درمیان ہونے والی گفتگو جانا تھا، ایسے کاموں کے لیے ملازموں سے

بڑھ کر جاسوس کون ہو سکتا ہے۔ لالچ سے یاد دہشکی سے ملازم ایسے کام کر دیتے ہیں اور انہیں بھی بھری نام کی ملازمت مل گئی جو ہر بات انہیں بتا دیا کرتی تھی۔ کل ہونے والی گفتگو بھی انہیں معلوم ہو چکی تھی جسے سن کر وہ ڈھی ناگن کی کیفیت کا شکار تھیں دو دن سے از خود برہان لغاری سے نہ ملی تھیں اور نہ ہی کوئی کال اسٹینڈ کی تھی۔

ان دو دنوں میں برہان لغاری نے سینکڑوں ہار کالز کی تھیں۔ کئی بار کال لے کر آئے۔ اُن سے ملنے مگر وہ سامنے نہ آئیں، وہ اُن کی بے قرار یوں کو بڑھاری تھیں، اُن کی برداشت کو کمزور کر رہی تھیں تاکہ جلد سے جلد اپنا مقصد حاصل کریں۔ بڑھاپے کا مشق جوانی کے مشق سے زیادہ باؤلا کر دینے والا ہوتا ہے۔ تیسرے دن صبح سویرے وہ ان کے سامنے تھے، مگر گوں حالات میں۔

”کیا غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟ کیوں اتنا تڑپا رہی ہو؟“

”میرے اور آپ کے راستے الگ ہیں برہان! ہمارا ساتھ چلنا فضول ہے۔“ وہ ایک ادا سے بھرپور انگڑائی لیتی ہوئی بولیں۔

”میں مثال کو لے کر واپس جا رہی ہوں۔“

”وہاٹ! کیوں..... کیوں جا رہی ہو؟“ وہ قریب آ کر استفسار کرنے لگے۔

”مجھے جانا ہی ہوگا، بھلا کس کے لیے رکوں گی یہاں؟ کون ہے میرا یہاں؟“ انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ..... یہ کیا بات ہوئی؟ میں ہوں یہاں، میرے لیے رکو۔“

”کس رشتے سے؟ کس حیثیت سے؟“ وہ اُن کی طرف دیکھ کر بولیں اور برہان کچھ کہہ نہ سکے۔ شش و پنج میں مبتلا ہو گئے۔

”خاموش کیوں ہیں..... جواب دیں! اپنی نام کی باتوں میں آ کر آپ پہلے ہی مجھ سے تعلق توڑ چکے ہیں پھر کس تعلق سے روک

رہے ہیں۔“

”نونا ہوا تعلق جڑ بھی سکتا ہے۔“ ان کا لہجہ جذباتی تھا۔

”پھر توڑنے کے لیے؟“ کا نقد طرہ یہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

”ایسے مت کہو فائدہ اب یہ تعلق مر کر ہی ٹوٹے گا۔“

”اس عمر میں..... یہ سب سوٹ کرے گا؟“ وہ پینٹرے بدل رہی تھیں۔

”محبت سدا جوان رہتی ہے اس کی عمر کبھی نہیں ڈھلتی۔“

”نہیں برہان! میں تم پر کنفیڈنس نہیں کرتی، مانیٹراٹ۔ کل بھی تم ایک ایسے بچے کی مانند تھے جو ماں کی انگلی پکڑ کر چلنے کا عادی

ہو، ماں کی آنکھوں سے دیکھنے کا، ماں کے کانوں سے سننے کا اور ماں کے ہی ذہن سے فیصلے کرنے کا عادی ہو، تم میں اتنے سال گزارنے

کے باوجود پھینچ نہیں آیا۔“

”والدہ حضور میری جنت ہیں، اُن کی حکم عدولی میں نہیں کر سکتا مگر.....“



”ٹھیک ہے پھر کیوں روک رہے ہو؟“ ان کا موڈ بڑی طرح بگڑا۔

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”میں بھی تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی برہان! لیکن نہیں چاہتی کہ پہلے کی طرح ہم مل کر ٹھنڈے جاؤ اور ہماری محبت.....“

”اب ایسا نہیں ہوگا ڈارلنگ! آئی پر اس پر۔“ وہ ان کی بے باک قربت میں ٹھنڈے لگے تھے۔ فائدہ کو اس کی تعجبی کا احساس ہوا

تھا اور وہ ابھی ان کی تعجبی حد سے بڑھا چاہا چاہتی تھیں تاکہ وہ اس لمحہ پر پہنچ جائیں جو وہ اپنا مضبوط ترین مقصد حاصل کرنے کی تک دوو میں لگی

ہوئی ہیں۔ وہ حاصل ہو جائے اور وہ اصل حکمران بن جائیں جو ان کا بڑا خواب تھا۔

”پلیز برہان! وہ ان کی گرفت سے پکھنی پھلی کی طرح نکلی تھیں۔“

”دور کیوں جا رہی ہو، فاصلے اجنبیت کا پتہ دیتے ہیں۔“ وہ تڑپ کر بولے۔

”ہاں..... ابھی ہم اجنبی ہیں۔“ وہ ایک ادا سے مسکرائیں۔

”یہ کیا مذاق ہے۔“ وہ سخت بے زار ہوئے۔

”سمندر سامنے ہو تو تعجبی مزید بڑھ جاتی ہے۔ میری تکتہ آرزوؤں کو کچھ تو قرار دو۔“ ان کے انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

”اوہ گاڈ! تم شاعری کرنے لگے۔“

”ہوں..... عشق اور شاعری کا چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔ اچھا عاشق اچھا شاعر ہوتا ہے اور ناکام عاشق بہترین شاعر۔“

”او کے..... میں جا رہی ہوں۔ مجھے تیار ہو کر اسپتال جانا ہے، منال ویٹ کر رہی ہوگی۔“ وہ ایک دم غلٹ میں آگے بڑھی تھی

اور برہان لغاری کے رومانٹک موڈ پر یقینت ختمی در آئی تھی۔

”آپ کتنے کشور ہیں، نساء سے ملنے آئے نہ سیل پر طبیعت پوچھی۔ وہ بہت مس کرتی ہے آپ کو۔“ بیارو محبت کی فضا میں احتیاط اور

آئی تھی۔

”مجھے پروا نہیں۔“

”پلیز..... ایسے نہ کہیں وہ ان میچور ہے۔“

”میچورٹی اُس میں کب آئے گی؟ تماشا بنا کر دکھ دیا ہے میرا۔“

”آجائے گی، آپ ڈپریشن نہ ہوں۔“ وہ ڈک گئی تھیں۔

”منال کو آپ ابھی تک معاف نہ کر سکے ہیں مگر ان کو بھول گئے جو اصل فساد کی جڑ ہیں۔ وہ آپ کو براہِ دکر کے پیش کر رہے ہیں

اور آپ۔“

”کس نے کہا، میں بھول گیا ہوں ان کو اور اپنی برہادی کو یا ان کو معاف کر چکا ہوں۔“ ان کے انداز میں سخت برہمی در آئی تھی۔

”پھر اتنے ہفتے گزر جانے کے باوجود آپ کی خاموشی کیا معنی رکھتی ہے؟“

”یہ وہ خاموشی نہیں ہے ڈیڑھ جو سب کچھ فراموش کر کے چھاتی ہے بلکہ یہ وہ خاموشی ہے جو ہر بڑے طوفان کے آنے سے پہلے چھاتی ہے۔“ اُن کے چہرے پر سرد مسکراہٹ در آئی، بڑا سراہت تھی۔

”میں بھی نیکی چاہتی ہوں، انہیں معاف نہ کیا جائے۔“

☆.....☆.....☆

اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، تاجہ نگاہ برف ہی برف پھیلی ہوئی تھی۔ خاصے فاصلوں پر بنے کاٹھ برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ درخت جن کی عریاں شاخیں چھتری نما گولائی میں پھیلی ہوئی تھیں جو موسم بہار میں پھولوں، چوں، پھولوں سے لدھے جھکے کھڑے ہوتے ہوں گے۔ اس وقت اُن عریاں درختوں پر برف گری ہوئی تھی اور محسوس ہو رہا تھا۔ ہزاروں ٹیوب لائٹس اُن پر روشن ہیں۔ رات سے برف وقفے وقفے سے گری رہی تھی۔

روم میں بیٹران تھا، مگر اُسے لگ رہا تھا، باہر گرتی برف کی خشک اُس کے اندر اتر رہی ہے۔ اس کے اندر سرد برقیلا پھیلتا جا رہا ہو، وہ کھڑکی کے شیشے سے چہرہ نکالنے خالی نگاہوں سے باہر برف کو دیکھ رہی تھی۔ جب سے صمد کا فون آیا تھا۔

اُس کے اندر نامعلوم اُداسی پھیل گئی تھی جو اُسے بے گل کیے ہوئے تھی۔ اُنس بیڈ پر بے خبر سو رہا تھا۔ نیند اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ یقیناً گم ہو گیا تھا۔ لامحدود سوچوں کا ایک جہاں اُس میں آباد ہو چکا تھا۔

حزہ کا اور اس کا ساتھ بہت گہرا تھا۔ یقیناً سے جوانی تک وہ اُس کے ہم قدم رہی تھی، قاریغ وقت وہ تمام اُن کے ساتھ گزرتا تھا جس میں زیادہ تر وہ لڑائی جھگڑتی رہتی اور وہ اس کی ہر کڑوی بات پر مسکراتا رہتا۔ ماما کو سمجھاتا رہتا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اُس کے انداز میں کوئی ایسی بات سامنے نہ آئی تھی جس سے محسوس کیا جاتا کہ وہ اس حد تک جا چکا ہے۔

”اُس وقت تم سنجیدگی سے اپنے دل کا راز مجھ پر عیاں کر دیتے تو میں بہت آسانی سے تمہیں سمجھا سکتی تھی کہ جو خواب تم دیکھ رہے ہو، اُس کی تعبیر تمہیں کبھی نہیں مل سکتی۔ یہ ناممکن کبھی ممکن نہیں بن سکتا تھا۔ ممانی جان کا رویہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ و نفرت سے لہریز تھا۔ اُن کی ہمد پر ہی دونوں ممانوں اور اُن کے بچوں نے بھی ہم ماں، بیٹی سے نفرت کرنا سیکھی تھی۔ ہمارے حصے میں جتنی بھی نفرتیں، ہتھارتیں و تذلیل آئی وہ سب بڑی ممانی کے طفیل آئیں، انہوں نے کبھی مجھے انسان ہی نہ سمجھا تو اتنا قریبی و نازک رشتہ کس طرح قائم کرتیں اور سچ تو یہ ہے۔“

اُس نے گہری سانس لی۔

”میں ایسا ہونے نہیں دیتی، حزہ! میں نے تمہیں ایک دوست اور کزن کی حیثیت سے سمجھا ہے، میرے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں، نہ ہوتا شاید اس لیے کہ میرے نصیب میں اُنس کی محبت تھی، اُنس کی چاہت تھی، میں اُنس کے ساتھ خوش ہوں۔ اس کا اور میرا تعلق ڈرامائی انداز سے جزا۔ ہمارا رشتہ پہلے ایک کپڑا تھا۔ اپنے نازک کو اچھو کرنے کے لیے ہمارا دشمن ایک تھا، برہان لغاری..... جو باپ تو

بن گیا مگر اپنے اندر باپ جیسی شفقت و محبت نہ پیدا کر سکا، مگر ہمیں ملانے کا سہرا اس کے سر پر ہے۔ مجھے نصیب سے بہت شکوہ رہا تھا لیکن نصیب نے میرا بندھن اس سے جوڑ کر میرے تمام شکوے و محرومیوں کا ازالہ کر ڈالا ہے۔

دنیا کی تمام آسائشات میرے قدموں میں ڈھیر ہیں۔ تمام خوشیاں میرے آنچل میں بندھی ہیں۔ میں آج خود کو دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی سمجھتی ہوں۔ مجھے وہ سب ملا جس کا ارمان نے کروگ دنیا سے چلے جاتے ہیں لیکن کچھ دن قبل صمد کی کال نے جس راز کا انکشاف کیا، اس نے مجھے مضطرب کر ڈالا ہے۔ میرا دل روتا ہے، حزنہ کی حالت پر۔ میں ڈکھی ہوں اس احساس سے بھی کہ حزنہ جیسے شخص و ہمدرد شخص کو ہم نے ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ اب میں کبھی اس سے مل نہیں پاؤں گی۔ کبھی نگاہ نہ ملا پاؤں گی، میرے دل میں آباد ایک دوست، ایک خیر خواہ کا تصور مٹ چکا ہے اور اس نئے تصور کے لیے کوئی متجسس نہیں ہے، پھر بھی میں نے حزنہ کو اپنی قسم دے کر کہا کہ وہ شادی کرے اور ماں باپ کی خدمت کرے۔ اس طرح وہ اُن کے درمیان رہ سکتا ہے۔ مجھے صمد کے وعدے کا بھی پاس رکھنا ہے اور حزنہ کی محبت کا بھی، جس کو اس نے چھپایا۔ مجھ سے اور میں اپنے اور اس رشتے کے تقدس کی خاطر اس کو پوشیدہ ہی رکھوں گی بلکہ اب اس سے رابطہ ہی نہیں رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حزنہ جلد شادی کر کے وہیں رہے گا، آخر میں نے بہت بڑی قسم دی ہے کہ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میری مری ہوئی صورت دیکھے گا۔

”کیا سوچا جا رہا ہے اتنی گہرائی سے؟“ وہ سوچوں میں اتنی گم تھی کہ اس کے بیدار ہونے کو ٹھہرا ہی نہ کر سکی۔

”آپ کب جاگے، میں محسوس ہی نہ کر سکی۔“ وہ مسکراتی ہوئی بیڈ کے قریب پڑی چیز پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”کیا بات ہے کرن امیں محسوس کر رہا ہوں پچھلے کچھ دنوں سے آپ سیٹ ہو۔ کوئی پرابلم ہے تو مجھ سے شیئر کریں، میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان صرف میاں بیوی کا ہی نہیں، دوستی کا بھی رشتہ ہو کہ ہم ایک دوسرے سے اپنی پرابلمز شیئر کر سکیں۔ بلا کسی جھجک و خوف کے۔“ وہ بیڈ پر کروٹ سے لیٹا، اُس سے مخاطب تھا۔ کرن خود کسی مضبوط و پائیدار سہارے کی تلاش میں تھی۔ فوراً ہی اس کو وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

”تھینکس کرن! تم نے مجھ پر اعتماد کر کے مجھے مستحضر کر دیا ہے۔ آج فخر ہے مجھے اپنے انتخاب، اپنی چوائس پر، ایک بات بتاؤں تمہیں؟“ اس کا انداز اصرار لیے ہوئے تھے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

”جی۔“

”مجھے یہ سب پہلے سے معلوم ہے۔“ وہ ہنس مکھ انداز میں بولا۔

”آپ..... آپ کو کس طرح معلوم ہوا۔“

”تمہاری ماما کی ڈتھ کی خبر جب حزنہ کو ہوئی تو وہ سخت جذباتی ہو گیا تھا۔ اس وقت غصے میں وہ سب اس کے منہ سے نکل گیا جو دل میں تھا، لیکن اس وقت تم بھی دکھ و صدمے کی اس کڑی آزمائش سے گزر رہی تھیں کہ حزنہ کی طرح تم بھی اُن باتوں کو سوچنے سمجھنے سے

قاصر رہی تھیں۔ دونوں ہی سوچنے و بچھنے کی صلاحیتوں سے محروم تھے۔ میں ادپر ٹیرس پر کھڑا سب سن رہا تھا۔

”آپ نے پھر بھی مجھ سے شادی“۔ وہ کسی خیال سے ہم کر بول اٹھی۔

”کیونکہ میں جانتا تھا مزہ کا جذبہ، اُس کی محبت یکطرفہ ہے اور یکطرفہ محبت پائیدار نہیں ہوتی، تم اُس سے شادی نہیں کرتیں، اُس گھر

میں بہو بن کر نہیں جاتیں جس گھر کے دروازے تم پر بند ہو چکے تھے۔“ اُنس نے کشادہ ولی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کرن بے اختیار رو نے لگی تھی۔

”ارے یہ آنسو کیوں؟ کیا ہوا؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ بہت فراخ دل ہیں، بہت اچھے، اگر آپ کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو طعنے مار مار کر زندگی جہنم بنا ڈالتا۔ ہمارے معاشرے

میں یہی ہوتا ہے، قصور وار لڑکی ہو یا نہیں ہو، ذلت و خواری اُسی کے حصے میں آتی ہے۔“

”میں ایسے مردوں کو مرد نہیں سمجھتا جو عزتوں کی خطا معاف نہیں کرتے۔ خود خواہ کتنی غفلت میں گر جائیں پھر تم تو بالکل بے قصور

و بے خطا ہو بلکہ بہت اعلیٰ ظرف و درگزر کی صفات رکھنے والی، جو مجھ جیسے شخص کے ساتھ ایسی خوشی زندگی گزار رہی ہو جس کا ماضی گرد آلود

ہے۔“ اُنس کے لہجے میں اس کے لیے حقیقی ستائش تھی۔

”ہلیز، مجھے شرمندہ مت کریں۔“ وہ کھل اٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

فاقہ بیگم کی سحر انگیز شخصیت، دل آویز آوازوں کی بجلیاں اور بے فریب چالیں رنگ لے آئی تھیں۔ ایک ہفتے کے داؤد بیچ میں ہی

برہان لغاری حوصلہ ہار بیٹھے تھے اور اُن کی ڈیماٹ پوری کر کے اُن سے کورٹ میرج کر چکے تھے۔

فاقہ کو دو بارہ پا کر وہ بے حد مسرور تھے۔

ابھی انہوں نے اپنی شادی کو پوشیدہ رکھا تھا۔ دو دن انہوں نے اپنے پرائیویٹ ہٹ میں اُن کے سنگ گزارے تھے، پھر دونوں

ہی اجنبیوں کی طرح الگ ہو گئے تھے۔ فاقہ اسپتال چلی آئی تھیں۔

”بہت کیوٹ لگ رہی ہیں ماما! مبارک ہو۔“ سیاہ و گلابی چنڈر دک کی ساڑھی میں میچنگ جیولری و لائٹ میک آپ میں وہ حسین

لگ رہی تھیں۔

”جھینکس مائی ڈیرا“ انہوں نے اس کا رخسار چومتے ہوئے کہا۔

”ڈیڈی خوش ہیں آپ کو پا کر؟“ منال دلچسپی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”آف کورس ڈارلنگ۔“ وہ مسرت سے کھلکھلائی تھیں۔

”کیا گفٹ کیا ڈیڈی نے؟“

”ہوں..... سب بتا دوں؟“

”میں صرف گفٹ دکھا دیں۔“

”ڈائمنڈ کا جیولری سیٹ ہے، میں احتیاطاً لاکر میں رکھا آئی ہوں، مگر چلو گی تو دکھاؤں گی۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”گر بیڑہ رکھا کیا حال ہوگا جب انہیں یہ خوش خبری ملے گی؟“

”نہرا حال ہوگا بلکہ بڑھیا کے بُرے دن شروع ہونے والے ہیں۔ ایک ایک بات کا حساب نہ لیا تو فائدہ نام نہیں میرا، بہت

حکمرانی کر لی بڑھیا نے۔ اب ہمارا دور آیا ہے۔“ فائدہ غرور سے گردن اٹھا کر بول رہی تھیں۔

”میں آپ کے ساتھ ہوں می اچھے بھی بہت تنگ کیا ہے اس اولڈ وومن نے، آپ کے حوالے سے ایسے ایسے طعنے دیتی تھیں،

میرا ہاں رہنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ڈیڑی بھی اُن کا ساتھ دیتے تھے۔“

”لگتے کرو، سارا حساب لیا جائے گا۔“ وہ اُکڑ کر بولیں۔

”یہاں سے ڈسپارچ کب ہوں گی۔ میرا دل گھبرا گیا ہے یہاں سے۔“ منال ہاتھ میں ہندھی ڈریسنگ دیکھتے ہوئے بولی۔

”پہلے طبیعت تو ٹھیک ہونے دو، پھر یہاں کیا پریشانی ہے تمہیں، بالکل گھر جیسی آسانیاں میسر ہیں، یہ ہسپتال ہوتے ہوئے بھی

انوار منٹ ہسپتال کی طرح نہیں ہے، پھر فوٹیشن بہت کوالیٹیٹیز ہیں۔ ایک ماہ میں ہی میسٹ ٹرینٹ کی ہے آپ کی فوٹیکھی اور میٹیکھی بھی۔

میں بہت بُرا امید ہوں۔“

”میں جلد یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“

”او کے میں ڈاکٹر سے پریشن لوں گی۔ ابھی ڈاکٹر کے آنے میں تاہم ہے۔ میں اتنے میں آپ کی ممکنہ ساس سے گپ شپ کر

کے آتی ہوں۔“

”مما! آپ اس قدر بُرا امید کیوں ہیں؟“ اس دفعہ وہ غصے کی بجائے ہنس کر دریافت کر رہی تھی اور یہ شہوت تھا اس بات کا کہ وہ

تیزی سے اس ڈپریشن سے نکل رہی ہے جس میں میٹیکھی طور پر ڈسٹرب ہو گئی تھی۔

”اُن کی بیماری دراصل سبکی ہے کہ اُن کا بیٹا شادی کے لیے راضی نہیں ہو رہا اور وہ چاہتی ہیں جلد از جلد اُن کے گھر میں بہو

آ جائے۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں اُن سے کی ہیں، وہ بنا دیکھے ہی آپ پر فریفتہ ہو گئی ہیں۔ بہت چاہتی ہیں تم سے ملنا۔ بہت آرزو ہے

آپ کو دیکھنے کی۔“ وہ ہنسی تھی۔

”میں آپ کی ذہنی حالت سے مطمئن نہیں تھی۔ اس لیے کئی بہانے بنا کر تانتی رہی ہوں، مگر آج آپ کو دیکھ کر مطمئن ہو گئی ہوں۔

بہت جلدی لوگوں کی بیگم حاسم سے۔“ وہ فروٹ کی ٹوکری اور تازہ پھولوں کا بکس اُٹھا کر روم سے نکل گئیں۔ منال اُن کی کوششوں پر مسکرا

اُٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

سعدہ، فاریہ، اُس کے جڑواں بچے، مائی سیکنڈ، گرینی اور مدثر صاحب ایئر پورٹ جانے کے لیے تیار تھے۔ مدثر صاحب دو دن قبل انہیں لینے کے لیے نیویارک سے آئے تھے۔ گرینی کی وہی خدمتگی وہ کسی طرح اپنا وطن چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھیں۔ اُن کا کہنا تھا میں ان شہیدوں کی روحوں کو کیا جواب دوں گی جو اس وطن کی خاطر شہید ہوئے، اس مٹی کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔

سعدہ اور فاریہ انہیں راضی کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ سوانہیں آنا پڑا آنا تو اُنں چاہتا تھا مگر احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مدثر صاحب خود آئے تھے اور وہاں سے اُس اور کرن یہاں سے ان سب نے مل کر اُن پر دھاؤ ڈالا تو وہ بے دلی سے راضی ہوئی تھیں۔

للا میٹ میں ابھی کئی گھنٹے تھے۔ فاریہ اور سعدہ کسی عزیز سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ مائی سیکنڈ سعدہ کے بچوں کو دوسرے کمرے میں سلارہی تھی۔ مدثر صاحب گرینی کے پاس بیٹھے کرن کی باتیں کر رہے تھے۔

”امی جان! کرن نے ان چند ہفتوں میں ہی اتنی خدمت کی ہے، اتنا یاد دیا ہے، بیٹی کی چاہ پوری ہو گئی ہے، بہت خیال رکھتی ہے۔“

”بہت نیک اور فرمانبردار بچی ہے، مجھے اُس سے یہی امید تھی۔ اُس کا تاؤ وہ کیسا ہے، کرن کے ساتھ اس کا رویہ نیک تو ہے؟“

”یہ آپ نے اُس سے نہیں معلوم کیا؟“ وہ مسکرائے۔

”کیا تھا معلوم، بلکہ دونوں سے کیا تھا، لہجوں سے دونوں ہی خوش نظر پر ہے تھے، مگر پھر بھی کبھی کبھی مجھے اُن کی طرف سے فکر ہوتی ہے کہ نہ معلوم وہ کب بدل جائے؟ کب وہ کرن سے اکتا جائے۔“

”ارے نہیں امی جان! آپ فکر مت کیا کریں، اُنس منال کو بھول چکا ہے۔ کرن جیسی ہادفا، سمجھ دار، سکھراور حسین بیوی پا کر وہ اسے کیوں یاد رکھے گا اور ایک بات قدرت کی یہ بھی ہے کہ کرن بیٹی منال سے اس قدر مشابہ ہے کہ شاید ہی بھولے بھٹکے اسے منال کا خیال بھی آتا تو اب نہ آئے گا۔“ اُن کے انداز میں طمانیت تھی بے حد۔

”ہاں یہ تو ہے عجیب بات ہے۔ باپ ایک ہے مگر دو ماؤں سے جنم لینے والی دونوں لڑکیاں چہرے، قد کاٹھ ایک جیسے رکھتی ہیں۔“

”ماؤں کی تربیت اُن کے مزاج اور کردار میں آگئی ہے۔ ایک ہیرا تو ایک پتھر۔“

”شکر ہے اللہ، ہمارے نصیب میں ہیرا آ گیا ہے۔“

”ہاں۔ اس کے لیے جتنا شکر کیا جائے کم ہے۔“ اسی طرح باتیں کرتے کرتے ایئر پورٹ جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ سعدہ اور فاریہ آپکے تھے۔ وہ سب گاڑی میں بیٹھ کر ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

گرینی پہلی بار اپنی مٹی سے جدا ہو رہی تھیں۔ اُن پر رقت طاری تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ سب بھی اداس و اندر وہ ہو گئے تھے۔ مائی سیکنڈ بھی چپکے چپکے اپنے آنسو چادر کے پلو سے پونچھ رہی تھی۔ اس کی حالت بھی گرینی جیسی تھی۔ جتنا ضبط کر رہی تھی، آنسو اتنے ہی بے قابو ہو رہے تھے۔

رات خاصی سرد تھی۔

ہلکی ہلکی ٹمبر نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک خاصا کم تھا، البتہ ہیوی لوڈ ٹرک اور ٹرالرز بہت تھے۔ سحر کے دونوں بچے سو رہے تھے۔ ایک فاریہ کی گود میں اور دوسرا مائی سیکینڈ کی گود میں تھا۔ سب خاموش تھے۔ عجیب بڑے ہول خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فاریہ کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ اُس نے متوحش ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ گاڑی پل سے گزر رہی تھی۔ ٹریفک زیادہ نہ تھی۔ فرنٹ سیٹ پر سحر بیٹھا تھا۔ ڈرائیور گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا۔ پچھلی سیٹوں میں وہ اور مائی سیکینڈ بیٹھی تھیں اور سامنے کی سیٹ پر مدثر صاحب اور گرینی، وہ ماں بیٹے فنودگی کا شکار ہو گئے تھے۔ اُس نے برابر میں بیٹھی مائی سیکینڈ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بھی کچھ بے چینی واضطراب کی کیفیت ہو رہی تھی اور پھر قبل اس کے کہ وہ کچھ سمجھتے پہنچے آنے والے مال بردار ٹرک نے ایک دم ہی اسپینڈ پکڑی تھی اور پوری رفتار سے گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔

فضا میں یکلفت ہونے والے دھماکے کی زوردار آواز میں انسانی چیخیں دب کر رہ گئی تھیں۔

ٹکرائی شدیدی تھی کہ گاڑی بے قابو ہو کر پھٹنے سے ٹکرائی اور ٹوٹی ریٹنگ سمیت نیچے گرتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

”سزیرہ بان! آپ کیا روز روز کچھ نہ کچھ اٹھائے چلی آتی ہیں۔ آپ کی آمد ہی میرے لیے ہر لمحے سے بڑھ کر ہے۔“ راحیلہ بیگم نے فائنڈ گودیکہ کر کہا، جو پھول اور ڈرائی فرانس کے ٹیکس لے کر آئی تھیں۔

”کیوں شرمندہ کر رہی ہیں سزیرہ، یہ کوئی گلکس نہیں ہیں۔ میری محبت ہے جو میں منال کے لیے لاتی ہوں، وہ آپ کے لیے بھی لاتی ہوں، منال کی طرح عزیز ہو گئی ہیں آپ مجھے۔“ محبت بھرے لہجے میں کہتی ہوئی وہ جینز پر بیٹھ گئیں۔

”آپ کے اخلاق نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا ہے سزیرہ، سوچتی ہوں ڈسپارچ ہو کر گھر جاؤں گی تو کس قدر یاد آئیں گی آپ! یہاں آپ کی محبت کی وجہ سے وقت بہت اچھا گزرتا ہے، ورنہ میں اتنے دن کہاں رہ سکتی تھی۔“

”آج میری بیٹی کی جمی ہو جائے گی۔“

”اچھا..... تو پھر میں بھی یہاں نہیں رہوں گی، بھلا آپ کے بغیر یہاں دل کہاں لگے گا، میں آج ہی ڈسپارچ ہوں گی۔“

”ڈاکٹر کیسے جمی دیں گے آپ کو، ابھی آپ زیر علاج ہیں۔“ وہ حیران تھیں۔

”نہیں بل جائے گی جمی، میرا دوسرا چھوٹا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ اُس کی وجہ سے مل جائے گی اور طبیعت تو میری ٹھیک ہے۔ میں از خود گھر والوں کو پریشان کرنے کے لیے یہاں رہ رہی تھی۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوئیں۔

”میں سمجھی نہیں آپ کی بات، میں نے آپ کے دونوں بیٹوں اور سہیل کو دیکھا ہے۔ مجھے تو وہ تینوں ہی بہت سلجھے ہوئے لگتے تھے، بلکہ آپ کا بیٹا مزہ تو بے حد پسند آیا مجھے سنجیدہ، کم گو، پُر وقار اور اسارٹ۔“

”مزہ کی وجہ سے ہی میں یہاں ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ فاقہ بیگم نے اپنی گھبراہٹ و تجسس کو بمشکل کنٹرول کر کے پوچھا۔

راحیلہ بھی سنبھل گئیں۔ حقیقت بتاتے بتاتے مہالذہ آرائی کی راہ اپنائی۔

”وہ شادی کے لیے راضی نہیں ہوتا اور میں چاہتی ہوں گھر میں جلد از جلد بہو آ جائے، تاکہ میرے سونے گھر میں رونق ہو مگر وہ اتنا کہنے کے باوجود نہیں مانا تو میں نے سوچا کوئی ڈرامہ کرنا چاہیے۔ ایسا جس سے گھر کی ذمہ داریاں ان پر آئیں تو انہیں میری بات ماننے ہی بنے گی۔ ابھی اس ڈرامے کی پہلی قسط ہے۔ حمزہ کے اقرار تک یہ ڈرامہ جاری رہے گا اور اصل بات تو ہے مجھے اداکاری جھوٹی نہیں کرنی پڑتی۔ دو دن بھی دو انعام پر نہ لوں تو میری طبیعت خود بخود ہی بگڑ جاتی ہے۔“ راحیلہ اپنی پلاننگ پر خوش تھیں اور فاقہ یہ سوچ کر ہول رہی تھی، وہ ہینڈ سٹاک جس کو وہ منال کے لیے پسند کر چکی ہیں، اگر کسی اور لڑکی میں انٹریٹڈ ہو تو ان کی ساری محنت ضائع ہو جائے گی اور پھر مشکل ہی سے کوئی ایسا پر سٹالٹی والا لاکا ملے گا۔

”حمزہ کیا کسی لڑکی میں انٹریٹڈ ہے؟“ انہوں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”ارے نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میرا حمزہ بے حد شرمیلا ہے۔ آج کل کے نوجوانوں سے بالکل مختلف۔ وہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھ کر نہیں دیکھتا، پسند کیا خاک کرے گا۔“ انہوں نے بلاوجہ دستوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ گڈ! آپ کا بیٹا بھی میری بیٹی کی طرح نیچر رکھتا ہے۔“

”آپ نے ابھی تک اپنی بیٹی سے نہیں ملوایا۔“

”وہ ڈریس چھینچ کر رہی ہے، ٹھہریں میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ وہ کہہ کر منال کے پاس آگئیں جو کپڑے بدلنے کے بعد بالوں میں برش کر رہی تھی۔

”خوب صورت لگ رہی ہو۔“ میردن سوٹ میں بڑا سارا دوپٹا اوڑھے منال کو دیکھ کر وہ پولیس اور اُس کے رخسار چوم لیے۔

”مئی اڈو پٹہ بہت بڑا ہے مجھ سے کنٹرول نہیں ہوتا۔“

”تھوڑی دیر کی بات ہے پھر پھینک دینا، مسز عام کو اپرٹس کرنا ہے۔“

”نہ معلوم کیا بات ہے ماما مجھے اس جوک میں انٹریٹڈ ہونے لگا ہے، ورنہ آپ جانتی ہیں مجھے ایسے گیٹ آپ انس کوڑھانے کے لیے کرنے پڑتے تھے۔“ ہال شانوں پر چھوڑ کر وہ اُداسی سے بولی۔

”پلیز..... اُس کا نام مت لو۔“ وہ اُسے دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولیں۔

”اُس کا نام میرے دل پر لکھا ہے، کیسے نہ لوں۔“

”منال! منال!“ وہ اُسے دیکھتے ہوئے صرف نام کی تکرار کیے جا رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں۔ منال انس کو بھول چکی ہے۔ ٹھیک ہو چکی ہے۔ اس طرح اُس کا نام لینا اور جملے کہنا انہیں متوحش کر چکا تھا۔



”نو پراہلم ما! میں نارمل ہوں، پاگل نہیں ہوں، جو سب آپ کر رہی ہیں۔ اب میں اگر آپ کا ساتھ دے رہی ہوں تو صرف دل بہلانے کے لیے۔“

”اوہ مائی چاہیلڈ! میں تو ڈر رہی گئی تھی۔“ وہ سکون کا سانس لیتی ہوئی اُس کا ہاتھ پکڑ کر راحیلہ کے کمرے میں لے آئیں۔  
منال نے انہیں سلام کیا تو وہ جواب دیئے بغیر اُسے دیکھے گئی تھی۔

وہی آواز

وہی چہرہ

وہی انداز

وہ چکرا کر رہ گئیں، معمولی سے فرق کے ساتھ کرن سامنے کھڑی تھی۔

”ہیلو سز حاسم! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ فائدہ آگے بڑھیں۔

”ہاں..... ہاں ہاں ٹھیک ہوں، آؤ آؤ بیٹی! بہت ارمان تھا مجھے آپ سے ملنے کا۔“ راحیلہ نے بڑی محبت سے اُس کی پیشانی چومی تھی۔

”اوہ گاڈ! میں تو ڈر رہی گئی تھی آپ کو سا کڈ دیکھ کر۔“

”میں معذرت چاہتی ہوں، دراصل میری دوست کی بیٹی ہو بہو منال کی ہم شکل تھی۔ اس کی ڈھچھ ہو چکی ہے، اس لیے میں چونگی تھی۔ گھر والے دیکھیں گے تو وہ بھی حیران ہوں گے۔“ اُن کی نگاہیں منال کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور انہیں اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہو رہا تھا۔

”اوہ ویری سیڈ، اب اجازت دیجئے ہم جائیں گے۔“

”اتنی جلدی، کچھ دیر بیٹھیں، کچھ باتیں وغیرہ ہوں۔“

”آپ تو جانتی ہیں منال کے ڈیڈی برنس کے سلسلے میں زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتے ہیں۔ ہم دونوں ماں بیٹی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے، بہت احتیاط سے رہنا پڑتا ہے۔ ہم دونوں کو مرد گھر میں ہوتو بے فکری رہتی ہے، ورنہ بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔“

”یہ سب عزت دار لوگوں کی احتیاط پسندی و عقل مندی ہوتی ہے، ورنہ آج کل کون اتنی گہرائی سے سوچتا ہے، آپ کے شوہر باہر ہیں تو پھر آپ دونوں کو ساتھ کیوں نہیں رکھتے، ایسے کب تک رہیں گی آپ؟“

”اتنی دولت و آسائشات نے ہماری وضع داری اور اُن کو نہیں بدلا، لوگ ہمیں قدامت پسند کہتے ہیں مگر ہمارے ہاں ابھی ہر دولت سے بڑھ کر عزت کو عزیز رکھا جاتا ہے۔ ویسٹرن کنٹریز کا ماحول تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ جب تک منال جوان نہ ہوئی تھیں تو ہم

دونوں برہان کے ساتھ ہوتے تھے۔“ فائدہ بردست ایکننگ کر رہی تھی۔ ایک شریف و ڈری بھی عورت ہونے کی۔

”برہان کا کہنا بھی ہے منال کی شادی جب تک کسی اچھے لوگوں میں نہیں ہو جاتی۔ مجھے یہاں رہنا ہوگا۔ منال کی شادی کے بعد ہم ملک سے باہر ہیں گے۔“

”سچ کہا بہن! اچھے اور شریف خاندانی لوگوں کو دولت بگاڑ نہیں سکتی۔ یہ نو دولتوں کی اوقات ہوتی ہے۔ دولت پاتے ہی ماور پور آزاد ہو جاتے ہیں، پھر کہاں کی شرافت اور کہاں کی وضع داری۔“ ان جانے میں وہ قاعدہ کی ڈکھتی رگ چھیڑ گئیں۔ منال نے مسکراتی نگاہوں سے ماں کی جانب دیکھا جو کڑ بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”میں بہت جلدی آؤں گی، آپ کے گھر۔“ وہ گرم جوشی سے منال کو لپٹاتے ہوئے معنی خیز انداز میں گویا ہوئیں۔

”میری آنکھیں آج سے ہی آپ کی آمد کی منتظر رہیں گی۔“ قاعدان سے گلے ملتے ہوئے پولیس اور بڑی جدوجہد کے بعد آنسو بھی آنکھوں سے چمکا دیئے۔ راحیلہ نے سچ سچ روتے ہوئے انہیں رخصت کیا۔

”کیا ڈر نفل ایکٹنگ کی ہے تم نے۔“ میزبیوں کی جانب بڑھتے ہوئے منال کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بولی۔ اسی لمحے حزرہ برابر والی میزبیوں سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اُس کی نگاہ بے ارادہ اٹھی تھی اور وہ بنا ٹکلیں چمکائے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ خیال تھا یا حقیقت؟

نگاہوں کا دھوکہ تھا یا تصور کا فریب؟

وہ کرن تھی؟

لیکن نہیں اس کے ہنسنے چہرے پر رخساروں میں پڑنے والے ڈھلوا کر کے نہیں تھے، مگر اس ایک فرق سے کیا ہوتا ہے، وہ ہو بہو ہی تھی۔

”ہائے بے چاری ماؤں کو بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولیں۔ حزرہ کی نگاہوں سے بے خبر وہ آرام آرام سے ایک ایک میز می اتر رہی تھیں۔

”ریمائنڈ یو ماما! میرے ہاتھ ”پیلے“ ہونے کے بعد ”کالے“ بھی ہو چکے ہیں۔“

”جسٹ شٹ آپ، یاد رکھو تم اب ایک پیچلر گرل ہو پیچلر۔“ انہوں نے اسے ڈپٹے ہوئے سمجھایا، اسی لمحے انہیں گراؤنڈ فلور پر دیکھ کر حزرہ آنکھوں پر ڈارک گلاسز لگا کر ان کے قریب چلا آیا۔

”ایکسکیو زی۔“ اُس کی آواز پر وہ دونوں ٹھنک کر رُکی تھیں۔



”ارے حمزہ بیٹا!“ فائدہ اے اچانک سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔

”یہ میری بیٹی ہے منال اور منال! یہ حمزہ ہیں آپ کی راحیلہ آئی کے بیٹے۔“ انہوں نے جھٹ پٹ تعارف کروایا۔

”ہیلو۔“ حمزہ کی منظر پر نگاہیں ڈرا کر گلاسز کے پیچھے سے اس کے چہرے کو کھوج رہی تھیں جہاں المیزان و اعتماد کا جہاد آباد تھا۔

”ٹائٹل ٹیٹل یوٹو حمزہ!“ منال نے اس کی طرف دیکھا، بلو جنز پر پل شرٹ پر سیاہ لیدر کی جیکٹ میں اس کی پرسنائی نمایاں تھی۔

”آپ کی ماما کو ایڈریس دیا ہے، اُن کو لے کر ہمارے ہاں ضرور آئیے گا۔“

”او کے میں کوشش کروں گا۔“ اُس کی نگاہیں پلٹ آئی تھیں۔

”کوشش نہیں وعدہ کریں۔“ وہ بڑا صراحتاً لہجے میں بولیں۔

”او کے چلیں پھر وعدہ۔“ وہ وعدہ لے کر خوشی خوشی وہاں سے چلی گئیں۔ حمزہ کے پیچھے آتا صد بھی اسپتال کی کینٹین کے قریب

رُک گیا۔ اس نے بھی حیرانگی سے منال کو دیکھا اور نگاہوں سے اوچھل ہونے تک دیکھا رہا تھا، پھر تیزی سے میز میاں بھلا گنا راحیلہ کے پاس آیا جہاں حمزہ بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔

”حیرت ناک! میں تو بہت حیرت زدہ ہو گیا یارا“ وہ کہتا ہوا حمزہ کے برابر بیٹھا تھا۔

”کیا دیکھ لیا ایسا بیٹا؟“ راحیلہ بیگم کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ دراصل وہ اوپر سے حمزہ اور صد کے تاثرات دیکھ چکی تھیں۔

”مئی اکرن کے فیس والی لڑکی فائدہ آئی کے ساتھ جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے کرن ہی ہو، ایسا موویز میں دیکھتے

رہتے ہیں مگر اصل زندگی میں پہلی بار دیکھ کر مجھے بے حد حیرانگی ہو رہی ہے۔“

”فلموں اور ڈراموں میں کہانیاں حقیقی زندگیوں سے ہی لی جاتی ہیں تم نے جس کو دیکھا وہ منال تھی، فائدہ کی بیٹی۔“ راحیلہ ترجمی

نگاہوں سے حمزہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

حمزہ کے چہرے پر تذبذب کے گہرے سائے تھے۔

”مئی اکرن ایسا تو نہیں کرن کے فائدہ نے دو شادیاں کر رکھی ہوں اور یہ اُن کی ہی بیٹی ہو۔“ صد کی بات پر حمزہ نے بھی اُن کی

طرف دیکھا۔

”ارے نہیں، نہیں، ایسی بات نہیں ہے، پہلے مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اُن کا پورا بیک گراؤنڈ

معلوم کر لیا ہے۔ فائدہ کی فیملی بہت اچھی ہے۔ بے حد عزت دار و شریف لوگ ہیں۔ مختصر فیملی ہے برہان صاحب تو اکثر ہی ملک سے باہر

رہتے ہیں۔“

”برہان؟“ حمزہ نے زیر لب دہرایا پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”مہی! آپ فلائنگی کا شکار ہو رہی ہیں۔ کرن کے قادر کا نام برہان لٹاری ہے اور یقیناً ان کا ان سے ہی تعلق ہے۔“ برہان کا نام آتے ہی حمزہ کے چہرے پر سختی چھانے لگی۔

”نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے، میں نے اچھی طرح معلوم کیا ہے۔“

”اتفاق کیسے ہو سکتا ہے مہی؟“ صمد نے کہا۔

”کیسے نہیں ہو سکتا، ایک نام کے کئی لوگ ہوتے ہیں۔“

”لیکن مختلف لڑکیوں کے ایک سے چہرے اور قادر ایک نہیں ہوتے، یہاں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔“ حمزہ مطمئن نہ تھا۔

”اگر ایسی بات ہے تو ان سے مل کر دیکھ لیں گے، ایک بار اور، ورنہ ایسی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ایک نام کے کئی مرد و خواتین

ہوتی ہیں اور ایسے ہی چہرے ایک دوسرے سے اسنے ملتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور ان میں سے اکثر لوگ ایک دوسرے سے لا تعلق ہوتے ہیں۔“ راحیلہ بیگم پوری تفصیل سے اسے سمجھانے کی سعی کر رہی تھیں۔

”حمزہ! مہی کی بات درست ہے، اکثر مجھے بھی ایسے پیشہ نگارے ہیں۔“

”مگر مہی! آپ کیوں اتنی سائینڈ لے رہی ہیں ان کی؟“ حمزہ کے بعد وہ راحیلہ بیگم سے شوخی سے مخاطب ہوا۔

”اس لیے کہ میں نے سوچ لیا ہے مثال کو اپنی بہو بنانے کا۔“ وہ حمزہ کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”مہی! یہ کس طرح ممکن ہے۔“ وہ اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھا۔

”سب ممکن ہے بیٹا، اگر تم مان جاؤ تو۔“ وہ اس کے قریب آ کر روہانے لہجے میں بولیں۔

”آج میں اعتراف کرتی ہوں، میری خود غرضی اور زیادتی کی وجہ سے تم دل کی خوشیوں سے محروم ہو گئے۔ سچ کہتے ہیں تمہارے

پاپا میں ماں ہوتے ہوئے بھی ماں کا حق ادا نہ کر سکی۔ نہ معلوم کس طرح میری متا پر خود غرضی و مفاد پرستی نے قبضہ جمائے رکھا تھا۔“

”مہی! روئیں نہیں شاید قسمت کو ایسا ہی منظور تھا۔“

”میرے دل میں بے قراری ہے، مبوش کی خاطر میں نے ایسا کیا، اب میں خود غرضی سے نکل آئی ہوں۔ اپنے اور پرانے کے

فرق کو پہچان چکی ہوں۔ قاعدہ بہت اچھی عورت ہے۔ ٹن سارا اور بے غرض محبت کرنے والی ایسی تھیں ماں کی بیٹی بھی ایسی ہی ہوگی،

پھر..... اس کی صورت میں ہمیں کرن مل جائے گی۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

نرس کے آنے کے باعث ان کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

کرن اور انس دکھ سے بڑھ چکے تھے۔

حادثے کی خبر سنتے ہی انس وہاں سے پہلی فلائٹ سے پاکستان آ گیا تھا۔ حادثے میں مڈر صاحب، گرینی، مائی سیکینڈ اور سحر



”تم تباہ نہیں یار! میں ہوں تمہارے ساتھ، کرن ہے ہم سب ایک ہیں ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے، ایک رہیں گے، ساتھ رہیں گے، اب تمہیں میرا بازو بننا ہوگا، میرا سہارا بننا ہوگا، اتنا پھیلا ہوا برنس میں اکیلا نہیں سنبھال سکتا۔“ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے سک رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ولا سدا یا۔ ہمت بندھائی۔

”سدا مجھے ایک خیال بار بار تنگ کر رہا ہے۔“

”کیا خیال؟“

”یہ واقعہ برہان لغاری کی انتظامی کارروائی تو نہیں ہے جس کو حادثے کی شکل دی جا رہی ہے۔“ وہ بڑے سوچے انداز میں بولا۔  
”مجھے بھی یہی خیال آیا تھا مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس ایکسیڈنٹ کی انویسٹی گیشن کرنے والے انسپکٹر سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے، اس کا کہنا ہے اس ٹرک کا ڈرائیور نشتے میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اُس کی غفلت اور لا پرواہی کے باعث حادثہ ہوا ہے۔ ٹرک کا ڈرائیور جیل میں ہے۔“ سدا نے تفصیل بتائی۔

”اچھا..... نہ معلوم کیوں میرا دل کچھ اور کہتا ہے۔“

”میں تمہاری حالت کچھ دیکھ رہی ہوں، تم پر جو گزر رہی ہے۔“

”ہم اسی ہفتے واپس چلیں گے، میرا دل نہیں لگتا یہاں پر، عجیب محسوس ہو رہا ہے، یہاں پر طبیعت کمزور ہو کر رہ گئی ہے۔“

☆.....☆.....☆

”ڈرائنگ! اس طرح کب تک ہم چھپ چھپ کر وقت گزارتے رہیں گے، کئی ماہ ہو گئے ہمیں اس طرح ملتے ہوئے۔“ قانقد ڈرائر سے بال ڈرائی کرتے ہوئے خفگی سے بولیں۔

”مجھے کوئی پر اہم محسوس نہیں ہوتی ہے بلکہ وقت آرام وہ لگتا ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور ہڈنسا روناٹک ماحول پھر سے بیس سال پیچھے لے جاتا ہے، جب عمر کی بہار شباب پر تھی۔“ قانقد کے ساتھ گزرنے وقت کا شمار ابھی تک اس کی آنکھوں میں چھایا تھا۔  
”میں اب ایسا نہیں چاہتی ہوں۔“ ان کا موڈ سنجیدہ تھا۔

”اوہ کم آن یار! اس بحث میں الجھ رہی ہو اور مجھے بھی الجھانے لگی ہو۔ میں یہاں رہنیکس ہونے آتا ہوں، ہر ٹینشن، ڈپریشن بھلا کر کچھ وقت سکون سے گزارنے آتا ہوں۔ یہاں بھی وہی سرکل رہا تو خاک ہوگی انجمائے منٹ۔“ وہ ٹائٹ گاؤن کے اسٹریپس ہانڈ سے اٹھ کھڑے ہوئے مگر قانقد کے موڈ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ وہ اس آف موڈ کے ساتھ پرل اور اورنج کمبی نیشن کی ساڑھی کی قانقد درست کرنے میں مگن رہی تھی۔

برہان نے اُن کی خاموشی کو نوٹ کیا، پھر کچھ کہے بنا اٹیچڈ ہاتھ کی طرف بڑھ گئے۔ اُن کی تیاری تک دونوں کے درمیان خاموشی محیط رہی تھی۔ قانقد نے سادہ جُوڑا بنایا۔ جیولری پہنی اور میک آپ کر کے پرفیوم اسپرے کیا اور پرس سنبھال کر بیٹھ گئیں۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

”اتنی ناراضگی کی کیا بات ہے جانم! ہم ایک ہو گئے، یہ سب سے اچھی بات نہیں ہے۔“ پہل انہیں ہی کرنی پڑی، وہ اُن کے قریب بیٹھ کر خوشگوار موڈ میں گویا ہوئے تھے۔

”آپ کو لگتا ہوگا میں آپ کی بیوی ہوں مگر مجھے نہیں لگتا۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے شاید مجھ پر؟“ وہ فہم کر بولے۔

”کال گرل۔“ وہ نہایت کڑوے لہجے میں کہہ بیٹھیں۔

”وہاٹ؟ دماغ درست ہے۔“

”پھر میرے ساتھ یہاں وقت گزارنے کا کیا مطلب؟ بیوی کے ساتھ اس طرح وقت گزارا جاتا ہے؟ یہ ٹائم پاسنگ ایک کال گرل کے ساتھ تو سوٹ کرتی ہے برہان لٹاری صاحب! مگر ایک بیوی کے ساتھ نہیں۔“

”اوہ ہو کیپ کوائٹ۔ میں یہاں پھولوں بھری باتیں کرنے آتا ہوں، تمہاری اور اپنی باتیں، ایسی باتیں جن میں ڈوب کر ہم

محبت کی گہرائیوں میں خیرتے ہیں۔ ذنیاد ما فیہا سے بیگانہ ہو کر اور تم نے ایسی باتیں کر کے تمام انجوائے منٹ بھلا ڈالی ہے۔“

”آپ کب تک ہر مسئلے سے آنکھیں چراتے رہیں گے۔ اس طرح مسائل حل نہیں ہوتے۔ یہ ہمارے حل کرنے سے ہی ختم ہوں گے۔“ وہ کچھ نرمی سے گویا ہوئیں۔

”او کے متاڈ کیا چاہتی ہو، میں کب پیچھے ہٹا ہوں۔“

”میں نے منال کی معافی کر دی ہے۔“

”یہ تم مجھے بتا چکی ہو، کتنی بار بتاؤ گی۔“ وہ بے زاری سے بولے۔

”معافی تو اُن لوگوں نے بے حد سادگی سے کی ہے۔ لڑکے کی ماں منال کو ائیر رنگ پہنا گئی تھیں، پچاس ہزار ہاتھ میں پکڑائے تھے، پھل، فروٹ بھی بہت لائے تھے۔“

”اُن باتوں سے میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔“ اُن کے انداز میں سرد مہری در آئی تھی۔

”آپ باپ ہیں اُس کے، اتنی لائق اچھی نہیں ہوتی ہے۔ میں تمہا اس کے فیوچر کی خاطر اتنی کوشش کر رہی ہوں اور آپ کو کوئی

فکر نہیں ہے۔“ وہ جل کر بولیں مگر برہان خاموش ہی رہے تھے۔

”کتنے جھوٹ بولنے پڑے ہیں اُن لوگوں سے۔“

”دفع کرو اُن لوگوں کو.....“

”لوگ اچھے ہیں اور لڑکا تو بے حد قابل اور خوب صورت ہے، پہلے تو منال مان ہی نہیں رہی تھی۔ حزرہ کو دیکھا تو راضی ہوئی ہے مگر

یہ معلوم کیوں حزرہ مجھے کچھ مطمئن نظر نہیں آتا۔ اُس نے مجھ سے آپ کی تصویریں دیکھنے کو مانگیں وہ تو میں نے انہیں گلشن والے پتے کا



ایڈریس دیا تھا، تاکہ آپ کی والدہ حضور کوئی کام نہ دکھایاں۔ میری یہ سمجھ داری کافی کام آئی، وہاں ملازم بھی تمام نئے ہیں اور اہمزم میں ہم دونوں کی مہنی مومن کی تصاویر تھیں۔ وہ دیکھ کر حزرہ مطمئن ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا وہ ایسا بی بیو کیوں کر رہا تھا ویسے تو سب نارمل ہے، کوئی پراہلم نہیں ہے۔ اس کے قادر بھی خوش ہیں۔“

”ہوگا اس کا کوئی مسئلہ آپ پریشان نہ ہوں۔“

”وہ لوگ شادی بہت جلد کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”پھر؟“ وہ اس گفتگو سے مسلسل بے زار ہو رہے تھے۔

”میں چاہتی ہوں آپ اپنے ہاتھوں سے.....“

”ہرگز نہیں، میں نے پہلے بھی کہا تھا تم سے اور اب بھی کہہ رہا ہوں، مجھ سے ایسی اُمید مت رکھنا۔“ وہ روکے انداز میں بولے۔

”ایسا بھی کہیں ہوتا ہے برہان، باپ کے ہوتے ہوئے بیٹی بنا باپ کی دعاؤں کے رخصت ہو؟“

”ایسا نہیں ہوتا تو اب ہوگا جو ان لڑکیوں نے کیا، ایسا بھی کہیں ہوتا ہے؟ بتاؤ مجھے، ہر بات کا الزام تم مجھے دیتی ہو۔ ان دونوں

نے مجھے لوگوں کے سامنے جانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ آج میں لوگوں سے بھاگتا ہوں، چھپتا ہوں، ہر ایک کی آنکھوں میں مجھے ایک ہنسی و

خسوف محسوس ہوتا ہے۔“ وہ زیر طیش انداز میں بول رہے تھے، فائدہ جو کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھیں، خاموشی سے اٹھ کر ناشتے کی نچل کی طرف

بڑھ گئیں جہاں لگ لگائے لوازمات سجا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ سب کتنی جلدی ہو گیا جو کبھی لگتا تھا کہ صدیاں گزر جائیں مگر ایسا نہیں ہوا گویا کسی طلسماتی عمل کے ذریعے وہ اس گھٹن منزل کی

سیر حیاں چڑھتا چلا گیا تھا، پھر سیرمی چڑھتا کون سا مشکل ہوتا ہے۔ فقط قدم آگے بڑھانے کی ہمت ہونی چاہیے۔ فقط پہلی سیرمی پر قدم

پڑنے چاہئیں۔ باقی سیر حیاں آپ کے قدموں کو از خود کھینچتی اوپر جائیں گی۔ ماضی بہت دور رہ گیا تھا۔ اتنا کہ پیچھے گردن گھما کر دیکھتا تو

ماضی کے صحرا میں یادوں کے گبولے ذہن کی اسکرین پر ڈکھ و حسرت کی ریت بکھیر دیا کرتے تھے۔ وقت بہت تیزی سے گزرا تھا۔ عمر کئی

سڑھیاں پھلانگ کر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ آج وہ خاصی مدت بعد خود کو آئینے میں دیکھ رہا تھا تو استعجاب و حیرانگی سے شخصے کے پار کھڑے

اُس شخص کو دیکھا جس کی آنکھیں کبھی بے حد روشن و خوب صورت ہوا کرتی تھیں۔ آج اُن کی آنکھوں پر دو پیریشوں والی ٹینک تھی۔ ٹینک شیو

چہرے پر داڑھی تھی جس کے بالوں سے ہلکی ہلکی سفیدی چھلکتی تھی۔

اُس کے وجود پر، اُن کی آنکھوں پر، اُس چہرے پر اُداسی تھی، مستحضر کر دینے والی خاموش اداسی۔

یہ شخص کون ہے؟

جوانی کو الوداع کہہ کر

بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوتا ہو کسی خوب صورت مگر شکست عمارت کا روپ لیے ہوئے جو کسی پل زمین بوس ہونے کو تیار ہو۔  
کون ہے یہ شخص!

کچھ جانا کچھ اُن جانا سا.....

کون ہے یہ؟

”حزرو..... جزوہ“ منال پکارتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”حزرو..... تو میں حزرو ہوں، گزرے وقت کی گم نام ساعتوں میں اپنی شناخت، اپنا نام بھی بھول بیٹھا ہوں۔“ اس نے بار بار پکارنے پر مڑ کر دیکھا، شوخ رنگوں کی سازھی، جیز میک آپ اور ڈائمنڈ جیولری میں اس کا حسن ڈائمنڈ کی طرح ہی لٹکارے مار رہا تھا۔ وقت گم گشت نے اس پر کوئی خاص اثر نہ چھوڑا تھا۔ علاوہ ازیں جسم کچھ فریبی کی جانب مائل تھا اور یہ معمولی سا موٹا پام بھی اس کے حسن کی رعنائی میں اضافہ کر رہا تھا۔ اُس کی بولڈ نہیں بڑھا رہا تھا۔

”ہونہہ، شادی کو دس سال گزر گئے ہیں مگر آپ کی یہ خیالوں میں گم رہنے کی عادت بجائے ختم ہونے کے بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مجھے کنفیوز کر کے رکھ دیا ہے آپ کی اس عادت نے۔“ وہ پرمنگ ہوئے بالوں کو سیٹ کرتے ہوئے حزرو سے چپکے لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔  
”کیا کام ہے؟“ اُس کا ہر لہجہ ہر جذبات و احساس سے مبرا سا پٹ تھا۔

”کوئین میرے ساتھ جا رہا ہے، پرنس اپنے کمرے میں ہے، اس کا جانے کا موڈ نہیں ہے۔ عجیب سر بھرا بد تمیز بچہ ہے، میرے ساتھ کسی گید رنگ میں جانا پسند نہیں ہے اسے، وہ مجھے لائیک ہی نہیں کرتا۔“  
”بچوں کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”یہ کام آپ کرتے ہیں بہت ہے۔ مجھ سے ایسی امید رکھنا ہی فضول ہے، کوئین بھی بچہ ہے اس کا ہی بھائی ہے مگر اس نے کبھی ایسی چپ حرکتیں نہیں کیں۔“  
”کوئین، پرنس سے تین سال بڑا ہے۔ کچھ عرصے بعد کوآپرٹ کرنے لگے گا۔“

”تیس سال بعد بھی نہیں کرے گا۔ وہ آپ کی کاپی ہے، اوکے میں جا رہی ہوں۔ واپسی میں دیر ہوگی۔“ وہ کھٹ کھٹ میٹھل بجاتی وہاں سے چلی گئی۔ حزرو نے گہری سانس لے کر صوفے کی بیک سے سر نکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد انہیں ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے صوفے پر اسے بیٹھے دیکھ کر اس کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اُبھر آئی۔ انہوں نے دونوں بازو وا کر دیئے۔ وہ جو خاموش بیٹھا تھا باپ کی سمت دیکھ رہا تھا۔ تیزی سے اُٹھ کر ان کے بازوؤں میں سما گیا اور پیار سے باپ کا رخسار چومے گا۔  
”چپ چپ آ کر کیوں بیٹھ گئے تھے۔“ حزرو نے متاع حیات کی طرح اسے سمیٹا ہوا تھا۔ اُس کی اداس آنکھوں میں سرخوشی تھی

اس نام۔

”بابا! میں نے ڈسٹرب کر دیا آپ کو؟ میں آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش بیٹھ گیا تھا۔“ اس نے مصومیت سے جواب دیا۔

”بابا پرس کے آنے سے خوش ہوتے ہیں، ڈسٹرب تھوڑی۔“

”بابا! آپ مجھے پرس نہ کہا کریں۔“ اس کے انداز میں خفگی در آئی۔

”کیوں؟ میرا بیٹا تو ہے ہی پرس۔“

”مجھے یہ نام پسند نہیں بابا! یہ ماما کا دیا ہوا نام ہے، آپ مجھے میرے نام سے پکارا کریں، مائی سویٹ نیم ڈوالنون۔“ وہ جوش سے بولا۔

”او کے ڈوالنون بیٹا! مگر ماما کا دیا نام بھی اچھا ہے اور ماما بھی اچھی ہیں۔“ موقع پا کر انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ماما اچھی نہیں ہیں بابا۔“ وہ منہ بھلا کر گویا ہوا۔

”تمہری بات، اچھے بچے ماما کو ایسے نہیں بولتے۔“

”ماما ایسی تو نہیں ہوتی ہیں جیسی ماما ہیں؟“

”اچھا..... پھر ماما کیسی ہوتی ہیں؟“

”مگر بیٹا ماما جیسی، بابا ہم گریڈ ماما کے پاس کب چلیں گے؟“

”چلیں گے۔“ اس نے بہلا دیا۔

”ابھی چلیں گے بابا، مجھے ہنزہ، خضریٰ اور معیز سے ملانا ہے۔ صنوبر آئی بہت اچھی کوکنگ کرتی ہیں، گریڈ ماما سے اسٹوری بھی

ملتی ہے۔“ حزرہ نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

ڈوالنون جس کو منال پیار سے پرس کہتی تھی اور وہ اسی نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اس میں خصوصیات بھی ایسی تھیں، خوب صورت،

ذہن و فطین، کم گو اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والا خاصی حد تک خود سر و مغرور۔

ماں کی سوشل ایکٹیویٹیز و ماڈرن ازم سے اسے سخت ترین چڑھتی۔

باپ کی نرہ وقار، سنجیدہ دسرا پاپا اخلاق و مروت شخصیت کا وہ دیوانہ تھا۔

وہ عام بچوں سے مختلف اور بالکل جدا گانہ مزاج کا حامل بچہ تھا جس کی صرف اپنے باپ، دادی اور چچا کی فیملی سے دوستی تھی۔

☆.....☆.....☆

پورے کمرے میں کھلونے کھمرے ہوئے تھے۔

کرن دوپٹہ سنبالے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

”حورین! کم آن مائی بے بی! کم آن سویٹ ڈول!“ کرن نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھاما جو کھانا کھانے کے بجائے ادھر ادھر

بھاگ رہی تھی۔

”آسکلی بنائی ہے، جھکن اسٹیک ہے، میری بیٹی کو پسند ہے۔“

”ہاں..... نہیں کہانی۔“ وہ اس سے خود کو چھڑاتے ہوئے غصے سے چینی۔

”کیوں نہیں کہانی، میں نے آپ کے لیے بنائی ہے۔“

”پاپا کے ہاتھ سے کہانی ہے۔“ وہ منہ بہ منہ کر بولی۔

”میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی اپنی بیٹی کو۔“ کرن نے چکارا۔

”نہیں پاپا کے ہاتھ سے کھاؤں گی۔“ وہ ضد سے مچلنے لگی۔

”ابھی ایک تھپڑ لگاؤں گی، ساری ضد بھاگ جائے گی، پاپا کی بیٹی۔“

”ہاں بھئی ہے تو یہ پاپا کی بیٹی، آپ کیوں جھلس ہوتی ہیں۔“ اسی دم ہاتھ روم سے انس نکل آیا اور روتی ہوئی حورین کو گود میں اٹھا

کر پیار کرتے ہوئے کرن سے بولا۔

”یہ اچھی بات نہیں ہے، آپ بہت بگاڑ رہے ہیں اس کو۔“

”انکو تو بیٹی ہے ہماری، سارے ارمان اس سے ہی نکلیں گے۔“ وہ اسے گود میں لے کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ انس کی گود میں

آ کر وہ بالکل چپ ہو گئی اور باپ کے گلے میں بازو ڈال کر بیٹھ گئی۔

”کھانے پینے کی یہ بالکل پروا نہیں کرتی ہے کہ کب سے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہوں مگر یہ نہیں مانتی۔“ کرن کے لہجے

میں غصہ و جھنجھلاہٹ تھی۔

”بیڈ گرل نہیں ہے میری بیٹی۔ لے کر آؤ کھانا ابھی کہانی ہے۔“

”پاپا! مجھے بھوک نہیں۔“ وہ گود سے اتر کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ناشتے میں بھی اس نے صرف بوا کھا لیا تھا اور کچھ نہیں۔“

”او کے او کے، اب ہم شرط لگاتے ہیں جو پہلے اپنا کھانا ختم کرے گا اسے بہت ساری آئس کریم اور چاکلیٹس ملیں گے۔“ انس

اٹھتے ہوئے بولا۔

”ایک ٹیڈی بیئر بھی پاپا؟“ حسب توقع وہ خوش ہو کر چبکی

”ہرگز نہیں، پہلے ہی آپ کے ٹوائز سے کمرہ بھرا ہوا ہے۔“

”یار! تم ہمارے درمیان میں مت بولا کرو۔“

”آپ جلدی سے ریڈی ہوں، میں ہریہ اور ایرج سے شرط جیت کر آتی ہوں۔“ باپ کی آفر پر وہ خوشی خوشی روم سے نکل گئی تھی۔

”یہ بات بات پر آپ کی اس طرح حورین کو شرط کی عادت ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بات بات پر شرط لگاتی ہے اور جیتنے کے لیے

ہر مشکل سے مشکل کام کر بیٹھتی ہے۔" حورین کے جانے کے بعد وہ فگر مند لہجے میں انس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"بلاوجہ ڈرنے اور فگر مند ہونے کی عادت تمہاری ابھی تک نہیں گئی جاناں!" انس نے اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر قریب

کرتے ہوئے کہا۔

"حورین لڑکی ہے، لڑکیوں کی تربیت اتنی آزادی سے نہیں کی جاتی ہے۔ سعد بھائی کی ایریج بھی اسی کی ہم عمر ہے مگر اتنی نازک و

فرمانبردار ہے کہ میرا دل چاہتا ہے حورین بھی ایسی ہوتی، مصوم، شرمیلی، ڈر پوک سی اگر کبھی ہوا بھی زور سے چل جائے تو ایریج فار یہ بھابھی سے چپکی رہتی ہے۔"

"واہ سبحان اللہ! کیا خیالات ہیں آپ کے"۔ انس بے اختیار قبہ لگا بیٹھا۔

"بسنے کی بات نہیں ہے حورین کو آپ نے بے حد بگاڑا ہوا ہے، لڑکیوں کی کیئرنگ بچپن سے اچھی کرنی چاہیے۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر سیریس مت ہوا کرو یار! میری زندگی میں تم لوگوں کے علاوہ ہے کون۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی تو

ہماری اندھیری زندگی کے چراغ ہیں، تم میری زندگی ہو تو حورین وہ چڑیا ہے جس میں میری جان ہے۔ اس کی یہ معمولی سی، بے ضروری خواہشیں مجھے بے انتہا مسرتیں دیتی ہیں۔ تم! مجھے برا بھلا کہہ ڈالا کرو مگر حورین کو ایک لفظ نہ کہا کرو۔ وہ میری بیٹی ہے انس، شرکی بیٹی، میں اسے بہت بہادر، بہت مضبوط بنانا چاہتا ہوں، لڑکیوں کی طرح کزور، بزدل اور ڈر پوک نہیں۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں"۔ انس کی آنکھوں میں گزرے دنوں کی پرچھائیاں لرزتی دیکھ کر کرن نے ہنس کر کہا اور اس کے

سننے پر سر دکھلایا۔

☆.....☆.....☆

چھوٹے سے ٹھنڈے زرد کمرے میں زرد بلب کی روشنی میں ہر شے پیاری لگ رہی تھی۔ درود یار پر جیسے حسرت و یاس کی سسکیاں

اُبھر رہی تھیں۔ اُس کوٹھری نما کمرے کے کارنر پر ایک جھلنگ سے پنک پر وہ پیار و لافز جھریوں زرد چہروں والی وہ معذور بے بس عورت پڑی

اپنی دن بدن بڑھتی کھوتی آنکھوں میں درود گرب کے آنسو لیے بار بار بند دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ لب بیاس سے خشک ہو گئے تھے۔ زبان اکڑی گئی تھی۔

بھوک کی شدت سے معدہ اندر کی سمت دھنستا چلا جا رہا تھا۔ اُن کی نگاہوں میں اپنا دروازہ چھب دکھلاتا رہتا تھا، وہ دور جس میں

شہنشاہ تھیں۔ سنگ دل، جاہر و عالم فطرت رکھنے والی پتھر دل عورت، ایک ایسی عورت جو صرف اور صرف اپنا چاہ میں جھلتی تھی، خود مری کے

گھوڑے پر سوار کئی بے گناہ، بے خطا، مجبور و مظلوم لوگوں کو بے دردی سے روندتی رہی تھیں، ظلم ڈھاتے، من مانی کرتے وہ یہ بھول گئی تھیں کہ

ہر رات کا سویرا ہوتا ہے۔ ظلم بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ انہوں نے بہت ہوشیاری سے اس ٹرک ڈرائیور کو لاکھوں روپیہ دے کر خریدا تھا۔ مانی

کی نہ اور انس کے باپ اور وادی کو ہلاک کر دینے کی سازش کی تھی جو کامیاب ہوئی تھی۔ یہ بات برہان الغاری کو بھی بعد میں معلوم ہوئی تھی۔

وہ دشمن کو کسی طور معاف کرنے کی عادی نہ تھیں اور آج فوج کے شدید ایک کی وجہ سے معذور ہو کر بستری تھیں بلکہ مٹی کا ڈمیر تھیں۔ وہ اپنے پتھر جیسے جسم کے ساتھ صرف زبان کو حرکت دے سکتی تھیں۔ ہر وقت مہنگے ملبوسات اور بہترین عطریات استعمال کرنے والی والدہ حضور گندگی و بدبو کے حصار میں پڑی رہتی تھیں۔ ملازمہ دن میں صرف ایک بار اُن کو تلاعت سے پاک کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ جتنی چلاتی رہتی تھیں مگر کوئی نہیں سنتا تھا اُن کی فریاد۔ فائقہ نے ان کا کمرہ ہانسی کمروں سے الگ کر رکھا تھا تاکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے دور رہیں۔

بے حد رعب و دہدب، جلال و مہمراق رکھنے والی والدہ حضور کو اب معلوم ہو رہا تھا کہ بے بسی و مجبوری کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے سے چھوٹے کو انسان نہیں سمجھا تھا۔ اُن کے ظلم و جبر کی عمر طویل تھی مگر ظالم کی عمر کتنی ہی طویل ہو، ایک نیا ایک دن اسے ختم ہوتا ہے اور جب وہ ختم ہے تو نشانِ عبرت ثبت کر جاتا ہے۔

قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔

وقت ایک مقررہ حد تک انسان کو ڈھیل دیتا ہے۔

اُس کی پکڑ بڑی عجیب، بڑی دردناک ہوتی ہے۔

پھر بھی لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے۔ وقت ہمارے پاس ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں تادمِ آخر ہماری گرفت اس پر یونہی رہے گی۔ فائقہ پورے ہتھیاروں سے نہیں ہو کر برہان لغاری کی زندگی میں از سر نو داخل ہوئی تھیں۔ یہ تجزیہ کر کے کہ کسی طور پر کسی محاذ پر پستی اختیار نہیں کرنی ہے، ہر مقام پر، ہر محاذ پر فتح یاب ہونا ہے اور وہ کامیاب تھیں۔

برہان لغاری کو پوری طرح اپنی منگی میں بند کر کے وہ اُن کے سامنے آئی تھیں۔ انہیں دوبارہ اپنے گھر میں بحیثیت بھودیکہ کر پہلا ذہنی جھٹکا لگا، پھر کیے دیگرے لگنے والے لہجوں نے انہیں بے دم کر ڈالا تھا۔

برہان لغاری جیسا فرما تیر وار بیٹا بدل جائے گا، انہیں یقین نہ تھا۔ بیٹا چھینا، پھر ہر اختیار اُن کی منگی سے روکتے کی مانند چھلتا چلا گیا تھا۔ فائقہ نے ان کی سیاست سے ہی انہیں شکست دی تھی اور ان کا ساتھ دیا مثال نے جو کسی دور میں اُن کے زہرِ حجاب رہی تھی۔

مکانات عمل شروع ہو چکا تھا۔ فائقہ گھر پر، دولت پر حکمرانی کرنے لگی تھیں۔ پرانے ملازموں کی طرح تمام سامان و رسم و رواج کو بھی وہاں سے نکال پھینکا گیا تھا۔ اب وہاں ہر شے اپورنڈ تھی۔ ملازمین نئے اور ان کے حکم کے تابع تھے۔ آئے دن مکسڈ گیڈرنگز اور کاک ٹیل پارٹیز کا رواج تھا۔ فائقہ ساڈھی کا پلو جلاتی مسکراتی اندر داخل ہوئی تھیں مگر کمرے میں بسی بساندے نے انہیں ناک پر رو مال رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ہیلو والدہ حضور! کسی ہیں آپ؟“ ان کی آنکھوں میں تسخیر تھا اور لہجے میں طنز۔

”پانی پلاوے، کھانا کھاؤں گی۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر گھٹکیا تھیں۔

”اوہ۔ آپ نے پانی نہیں پیا، کھانا نہیں کھایا؟“

”یہ نہیں دیتی مجھے، ترساتی ہے، بھوکا کھتی ہے مجھے۔“ وہ ملازم کی جانب اشارہ کر کے گویا ہوئیں جو قافلہ کے پیچھے چلی آئی تھی۔  
”کیوں مہرو! ایسا کیوں کرتی ہو؟“ اُن کے انداز میں طنز تھا۔

”بیگم صاحب! نام سے دیتی ہوں، ورنہ بار بار بستر خراب کرتی ہیں۔“

”خود سارا دن کھاتی ہے مجھے ایک دفعہ دیتی ہے مردار املی ہوئی ہے تو بھی اس سے! اس ڈائن سے جس نے آتے ہی میرا سب کچھ چھین لیا۔ میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا، میرا بربان مجھ سے چھین لیا۔“ آخر میں وہ اسی طرح چیخنے چلانے لگی تھیں۔

”پورے جسم کی طاقت بڑھیا کی زبان میں آگئی ہے۔“

”تجھے میری بددعا لگے گی تو نے میرا بیٹا چھینا ہے۔“ وہ زور زور سے رونے لگیں۔

”چپ کر بڑھیا! کبھی تو نے چھینا تھا، جب میں تو نہیں روئی تھی۔“

”ایک بار بربان کو میرے پاس لے آ، میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں، آخری بار دیکھنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے التجا کی۔

”فرصت نہیں ہے ان کے پاس۔“ بد بو اور کھٹن کے باعث وہ مزید وہاں ٹھہرنے نہ سکی تھی اور باہر نکل آئی تھی۔

پیچھے سے ان کی آواز التجاؤں میں ڈھل کر باہر آ رہی تھی۔ وہ رو رہی تھیں، وہ گڑگڑا رہی تھیں، فریاد کر رہی تھیں، روئی و پانی کے لیے،

بربان کے لیے، اس قید سے رہائی کے لیے جہاں سے انہوں نے تازہ ہوا، کھلا آسمان نہ دیکھا تھا مگر وہ ہر دفعہ کی طرح مسکراتی ہوئی نکل گئیں۔

والدہ حضور کی سسکیاں درد و یوار سے پٹ کر رونے لگیں۔

یہ انجام تھا اس خود پرست و جاہر عورت کا، جو کل تمام رشتوں و ناتوں کو اپنی غرض و مفاد کے لیے استعمال کرتی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم کہاں جا رہے ہو؟“ صہاس کے کمرے میں آ کر پریشانی سے گویا ہوا تھا۔ ایک عرصے بعد پھر اس نے

مذہب کے چہرے پر پرانی وحشت و بے کلمی کو رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

”اب..... اب بھی پوچھ رہے ہو؟ میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں؟“ مہز نے سخت کبیدہ و برہم نکاہیں اس کی جانب ڈالتے ہوئے کہا۔

”اتنا بڑا فراڈ ہوا میرے ساتھ، ناقابل فراموش دھوکہ..... میری ہستی، میرا وقار اور میری عزت سب راکھ ہو گئی۔ لحوں کے اندر

وہ ایک شخص جس کی پرچھائی سے بھی مجھے سخت ترین نفرت ہے وہ..... وہ مثال کا باپ ہے۔ پچھو کی حسرتوں و دکھوں کا ذمہ دار کرن کی

خوشیوں کا قاتل میں کس طرح.....“ لفظ اس کے لبوں میں پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”پلیز سنبھالو خود کو، اس طرح ڈپریشن ہونا تمہارے بہتر نہیں ہے۔“

”مجھے اکیلا چھوڑ دو، مجھے اپنی کوتاہیوں پر دل کھول کر رونے دو، شاید پشیمانی کے آنسو میرے قلب کو سکون بخشیں، ورنہ جو جاہلی

پھیلی ہے جس طرح آگ بھڑک رہی ہے وہ سب کچھ خاکستر کر دے گی۔“

”دھوکہ تو دیا گیا ہے اس اعزاز سے کہ اعتماد و اعتبار کسی آئینے کی مانند کڑھی کڑھی ہو کر نکھر گیا ہے، کس قدر عزت دار و قابل اعتماد سمجھا تھا مگر فائدہ برہان کو، کتنی اپنائیت و مصومیت تھی۔ اُن کے اعزاز میں از حد خاکساری، وضع داری نے ہمارے دلوں کو تسخیر کر ڈالا تھا۔ آنکھوں کے آگے پردے ڈال دیئے تھے۔ سوچنے بھیننے کی تمام صلاحیتیں گویا مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔“

صدمے ہر ممکن طریقے سے اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی تھی مگر مزہ تو پھر جیسے احساسات رکھنے والا بن چکا تھا۔

”مئی نے ہمیشہ جلد بازی و اپنی عقل کے مطابق فیصلے کیے اور ان فیصلوں نے ہمیشہ مثبت کے بجائے منفی پہلو ظاہر کیے ہیں اور مثال بھابی سے تمہاری شادی کا فیصلہ بھی انہوں نے جس جگت میں کیا اس کا انجام سامنے ہے۔ وہ اپنے کسے پر نادم تو تھیں مگر اب بچھاؤں و عداوتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ انہوں نے کوشش کی تھی اختیار کر لی ہے۔ ان کی آنکھیں خشک نہیں رہیں بہت اثر لیا ہے انہوں نے اس انکشاف کا۔“

”مجھے مئی سے کوئی ٹک نہیں ہے، پہلے جو کچھ کیا وہ کیا مگر ان کی نیت میں کوئی تور نہیں تھا۔ انہوں نے یہ سوچ کر جلدی کی تھی کہ کرن نہیں ملی تو مثال کو رب نے میرے لیے بھیج دیا ہے، اپنی زیادتیوں کی سزا انہیں اسی صورت میں نظر آئی تھی پھر برادر! اُس نے گہری ذمہ دہری سانس لے کر توقف کے بعد کہا۔

”جب میں بھی کچھ توجی بہلاؤں میں آگیا تھا یا کرن کی قسم نے مجھے بھی اتنا جلد باز و بے قرار کر دیا تھا کہ میں نے سرسری سی جھان پھنگ کی تھی اور مطمئن ہو گیا کہ وہ حقیقتاً کسی اور دوسرے شخص کی بیٹی ہے اور اس کی ماں نے تصویریں بھی ان کی اس دور کی دکھائی تھیں، جب اُن کی شخصیت بالکل مختلف و بے ضرری تھی۔“

”تقدیر سے نہ کوئی جیت سکا ہے نہ جیت سکے گا، جو کچھ بھی ہو جس طرح بھی ہو اس کو تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر برداشت کر لو بچوں کی خاطر، اگر تم نے کوئی انتہائی قدم اٹھایا تو بچوں کا لیوچہ براءت نہ ہے گا۔“

”میں بچوں کی خاطر ہی مثال کو ڈانٹا ہوں نہیں و سہا مگر اس کے ساتھ بھی نہیں رہوں گا۔“ مزہ کے اعزاز میں حد و وجہ کہا بہت تھی۔

”کیا مقصد ہوا اس بات کا؟“

”میں جا رہا ہوں، کہاں، یہ نہیں معلوم، بچے اور مثال یہیں رہیں گے یا وہ اپنی ماں کے پاس رہے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”مزہ اتنے میل فٹ مت بنو۔ کسی اور کا نہیں تو ذوالنون کا سوچو، وہ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی ہے تمہاری، روح ہے، پھر تم

کس طرح اُس کے بغیر رہ سکتے ہو بلکہ کونین کے بغیر کیا رہ پاؤ گے؟ گو کہ جانتا ہوں کونین بے فکری و لاابالی، کھلندری طبیعت کا مالک ہے، اس لیے تم اس کی طرف سے بے فکر بھی رہتے ہو مگر ذوالنون کا کیا ہوگا؟ وہ بھابی سے ذرا بھی اٹیچڈ نہیں ہے، تمہارے بغیر وہ نہیں رہ پائے گا۔“ صدمے نے اس کی کمزوری یاد دلانے کی سعی کی مگر اس وقت وہ محبت و مردت سے عاری ایک پتھر شخص تھا جس پر کوئی جذبہ، کوئی محبت، کوئی کمزوری غالب نہ آ سکتی تھی۔ صدمہ دل گرفتہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔



”بابا! بابا! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ حمزہ نے مڑ کر دیکھا، وہ نہ معلوم کب سے اٹیچڈ ہاتھ کے پردے کے پیچھے کھڑا تمام گفتگو

سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور سرخی آنکھوں میں آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

یہ آنکھیں!

یہ چہرہ!

ان کے اندر بر چھیاں ہی چلنے لگیں اور رگیں جھنکنے لگیں۔

”مما! انس کی کاپی دیکھی آپ نے؟“ اندر داخل ہوتا ہوا ٹھنک کر رہ گیا۔

”کوئین کی دفعہ میں اُس کے خیال سے باہر تھی۔ حمزہ کی پر سنائی نے بے خود کر ڈالا تھا، مگر حمزہ جیسا غیر رو مانگ، مرد جذبات رکھنے والا مرد زیادہ مر سے مجھے اپنی ذات کا اسیر نہ کر سکتا تھا۔ شاید وہ مجھے شدتوں سے اپنی ذات کے حصار میں رکھتا تو میں پھر سے انس کی محبت میں گرفت نہ آتی۔ پرنس کی پیدائش سے قبل فرسٹ منچ سے ہی مجھ پر، پھر اس بے درد بے قدر کی یادیں حاوی ہونے لگیں۔ میرے دن و رات اس کے تصور سے آباد تھے اور دیکھتے کتنا زبردست کس آیا ہے پرنس کے فیس پر۔ انس جیسے ہی اس کے نقوش ہیں۔ رنگت ہے اور آنکھیں تو سیم انس جیسی ہیں۔ سرخی، روشن اور جمیل کی طرح گہری و خوب صورت۔“ اُس نے مسرت سے کھلکھلاتے ہوئے اس کی آنکھیں چومی تھیں اور پرنس منہ بنا کر دوڑ بھاگ گیا تھا۔

”اوہ الٹک، ممما! انس کی طرح ہی پراؤنڈ و بڈ ماغ بھی ہے۔“ وہ ہنسی۔

”کچھ عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔ ایک دفعہ تو اس ناہنجار کے پیچھے گھر بھوک بیٹھی ہو، اب پھر یہی ارادہ لگ رہا ہے تمہارا، ان باتوں کو خوابوں میں بھی یاد نہیں کرتے، اگر حمزہ کو معلوم ہو گیا تو.....“

”کچھ نہیں ہوگا، اُس شخص میں ایسی کو اٹھیر نہیں ہیں جو وہ کوئی ایساری ایکٹ کر سکے۔ وہ خاموش دنیا کا باسی ہے۔“

مثال کے قہقہے ان کے اندر ابھی تک گونج رہے تھے۔ اپنی حسرت، اپنی عزت، اعتماد و یقین کو پارہ پارہ کرتے قہقہے۔ اس کی آنکھوں میں لہو اترنے لگا۔ آنکھوں کی خندک، دل کی دھڑکن کی مانند بیٹا کہیں گم ہو گیا۔ اب ان کے سامنے ان کی شریک حیات کی محبتوں و جنون خیزیوں کا جیتا جاگتا ثبوت کھڑا تھا۔

سرخی آنکھیں

وجہ چہرہ

ان کے ذہن کی اسکرین پر پختے بھر سے ایک تصویر جم کر رہ گئی تھی۔ مڈرائس، انس مڈر کی تصویر، کتنی شباب، کتنی مہمات تھی ان چہروں میں۔ گویا تمام نقوش چرا کر آویزاں کر دیئے گئے ہوں۔

بیٹا وہ ان کا تھا اور شبیہ کسی اور کی، خیالات کی مصوری کا نادر نمونہ، ایک عورت کی پراگندہ، ذہنی و ہر جاتی پن کی مثال۔

”یا.....! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ جو نظریں اس کے لیے محبت و شفقت کی چاشنی سے لبریز رہتی تھیں۔ ان میں وہ کئی دلوں سے عجیب تپش دیکھا گئی دیکھ رہا تھا اور سمجھ نہیں پارہا تھا انہیں کیا ہو گیا ہے اور اس لمحے بھی انہیں خاموش دگھورتے پا کر وہ ڈرتے ڈرتے بولا تھا۔

”کچھ نہیں۔ آپ چھپ کر ہماری باتیں سن رہے تھے؟“ مزہ کا انداز سرد تھا۔

”نو ہا ہا!“ مزہ کو غصے میں دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا تھا۔

”پھر وہاں کیا کر رہے تھے؟“ مزہ اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھا۔

”میں وہاں اپنی بال دیکھنے گیا تھا۔ آپ اور اکل ماما کی باتیں کر رہے تھے۔ مجھے سامنے آنا اچھا نہیں لگا۔“ کسن ذہن سے بڑی گہری و با معنی بات نکلی تھی۔ مزہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی پہلی ذہانت و لیاقت عمر سے بڑی سوچ کی وسعت اسے اپنے ہم عمر بچوں میں ممتاز کرتی تھی۔

شعور سے نکل ہی آگئی کے در اس پر وہاں ہو چکے تھے۔

”بابا! ماما ایک اچھی عورت نہیں۔“ وہ اس کے قریب آ کر بولا۔

”ماما گندی ہیں، جھوٹ بولتی ہیں، نانو بھی گندی ہیں اور گرینڈ پابھی۔ ہم ان سے نہیں بات کریں گے۔ وہ سب گندے ہیں۔“ وہ مزہ کے سینے پر سر رکھ کر آہستہ آہستہ نفرت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

مزہ نے دایاں بازو آگے بڑھا کر اسے سینے سے بچھنچھنچ لیا تھا۔ گرم گرم آنسو خاموشی سے اس کے چہرے کو بھگور رہے تھے۔

کتنی اذیت ناک ہے انہوں کی جدائی، جیتے جی انہوں کو چھوڑ دینا۔ زندہ دگر ہو جانے کے برابر ہے۔ اسے یہ بوجھ اٹھانا ہی تھا، زندہ دگر ہونا ہی تھا۔ دوسروں کے لیے وہ جیتا رہتا تھا مگر اب وہ اپنے لیے جینا چاہتا تھا۔ اس سو دریاں کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

زندگی اُس پر ضرب لگاتی چلی آئی تھی اور ان ضربوں نے گویا اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُن جانے میں وہ اس عورت کو شریک سفر بنا بیٹھا تھا جو اُن کی کرن کی دشمن تھی۔ اُس سے دل کا تعلق اس کا ابھی برقرار تھا۔ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی وہ غیر مرد کی محبت میں گرفتار تھی۔

ایک راز سے پردہ اٹھنا تھا کہ پھر ہر راز سے پردے ہٹنے چلے گئے۔ سب کچھ عیاں ہوتا چلا گیا مگر اس طرف بلا کی بے فیرتی و بے حسی تھی۔

ہر راز عیاں ہونے پر، ہر بات کھلنے پر بھی نہ اُن کی پیشانی عرق آلود ہوئی، نہ ٹٹا ہیں، پیشانی و جھک سے بچھکیں وہ اسی طرح مطمئن و مسرور ہیں۔ البتہ کرن کے متعلق جان کر منال نے الزامات و طعنوں کی بوجھاڑ کر دی تھی۔ اپنی کسی بات پر وہ شرمندہ نہ تھی، مگر مزہ کو مسلسل ٹیڑھ کر رہی تھی وہ کرن کے حوالے سے۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا، وہ آتے ہی مزہ سے اُلجھنے لگی تھی۔ اس کے چپٹے چلانے پر مزہ سونے ہوئے ذوالنون کی طرف اشارہ کر کے بولا کہ وہ خاموش رہے۔

”میں کیوں خاموش رہوں، مجھے برباد کر کے رکھ دیا، آپ کی اس جھپٹی نے، مجھے آپ نے چاہا کب؟ کب محبت کی؟“ وہ چپٹی۔

”بات کو مت بڑھاؤ، میں کہہ رہا ہوں۔“ مزہ سرد لہجے میں گویا ہوا۔

”بات بڑھ چکی ہے وہ لڑکی نہیں ناگن ہے، جس نے بار بار میری خوشیوں کو ڈسا ہے، میرے سکون کو زہر کر ڈالا ہے۔“ وہ اس سے زیادہ چیخ رہی تھی۔

”جو اس مت کرو، خبردار جو تمہاری زبان پر کرن کا نام بھی آیا تو.....“

”اوہو..... اس کو کہتے ہیں محبت اور اس کا جوش، مجھے ہر جائی ہن و بے وفائی کے طعنے دیتے ہو اور خود اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ بیوی کے پہلو میں کھڑے ہو کر غیر عورت کی طرف داری کر رہے ہو۔“ منال کا لہجہ سخت طنزیہ و جڑانے والا تھا۔

”شٹ آپ، بد زبان عورت، زبان بند کرو اپنی ورنہ.....“ شدید طیش میں اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

”ورنہ کیا کر لیں گے آپ؟ دوسرے کو آئینہ دکھانا کتنا آسان ہے۔ خود بھی دیکھیں اور اُس اذیت کو محسوس کریں جو مجھے ہو رہی ہے۔“ وہ نظروں کی نظر بیٹھی تھی، جھکن اور اپنی لٹلی تسلیم کرنا جانتی نہ تھی۔ اسی چیخ و پکار میں بیڈ پر سوائے ڈالٹون کی آنکھ کھل چکی تھی۔ وہ اسی طرح لیٹا مندی مندی آنکھوں سے سب دیکھ رہا تھا۔

ماں کی شیطے برساتی نکا ہیں و چیخا چلاتا لہجہ جو اسے کبھی پسند نہ رہا تھا۔ باپ کا ستانت و سنجیدگی کا لہجہ اوڑھے باوقار انداز جو اسے پسند تھا مگر اس وقت وہ باپ کے چہرے پر نظر آتے فیض و غضب کے نئے رنگ دیکھ کر سہا جا رہا تھا۔ اس کا ننھا سادل خوف کے مارے تجزی سے دھڑک رہا تھا۔

”تم..... تم! کیا اذیت محسوس کرو گی؟ جو دوسروں کو تکلیف میں رکھنا جانتے ہوں، وہ خود درد محسوس نہیں کرتے۔ مجھے آئینہ کیا دکھاؤ گی، میرا خمیر، میرا کردار کسی غلاطت، کسی فریب کی رسوائی سے بد نما نہیں ہے، اگر تم مجھے سرور شاہ کے بارے میں خود ہی بتا دیتیں تو میں اتنا گلٹی ٹیل نہیں کرتا جتنا تمہاری اور پھر خود سرور شاہ کی زبانی سن کر مجھے اذیت ہوئی ہے۔ مرد کتنا ہی بُرا، کتنا ہی پتھر ہو لیکن عورت کا خلوص، ایثار و محبت اسے موم بنا دیتی ہے، مگر تم نے کبھی ان جذبوں تک رسائی نہیں پائی۔ آشنائی نہیں پیدا کی تو مجھ سے کس بات کا شکوہ؟“

”اوکے۔“ وہ اُس کے قریب آ کر ایک ہاتھ کر پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں طعنے دیکھتے ہوئے پھنکاری۔ ”آپ نے کبھی مجھے بتایا کہ آپ کرن کو پسند کرتے ہیں؟ اس کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ اس کے عاشقوں میں سے ایک آپ بھی ہیں؟“

”منال!..... اپنی زبان کو لگام دو۔“ وہ طعنے سے چیخا۔

”کیوں تمام لگا میں صرف عورت کے لیے ہوتی ہیں؟ مرد جہاں چاہے منہ مارتا پھرے، اس کے لیے کوئی پابندی، کوئی زنجیر نہیں ہوتی ہے۔ مرد بڑا گناہ کر کے بھی نیک و پارسا کہلاتا ہے، عورت ایک خطا کر کے بھی سزاوار ہو، میں نہیں مانتی ان باتوں کو، آپ کل بھی کرن کی محبت میں بندھے تھے اور آج بھی ہیں اور شاید مرتے دم تک رہیں گے۔“

حزہ کی خاموشی کرن سے ہمیشہ رہنے والی محبت کا اقرار جو منال کو نئی طرح بھرا گیا تھا۔ وہ مشتعل ہو کر بولی۔

”پھر تم میرے ساتھ کہاں ہو، میرے کہاں ہو، مجھ سے شادی کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ بد نصیبی سے میرا اور اس کا فیس ملتا ہے اور

بہی چہرہ بھی آپ کو میرے قریب لایا اور پھر آپ کی خواہشیں پوری ہوتی چلی گئیں۔ مراد اور اس کی خواہشیں..... "وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔  
 "محبت اور طلب، خلوتوں میں چہرہ میرا نہیں کرن کارہا پھر..... خواہ جسم کوئی بھی ہو تصور چاہاں تو میرے چہرے میں بھی کرن کا  
 چہرہ ہی دکھاتا رہا اور محبت کا حاصل بھی۔" وہ زہریلے انداز میں کہہ رہی تھی۔ حنزہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر  
 پے در پے تھپڑوں سے اس کا چہرہ سرخ کر ڈالا۔

اُس کی آنکھوں میں بھی خون کی سرخی لہرانے لگی تھی۔

اُن کی نگاہوں سے ذوالنون کی موجودگی گویا فراموش ہو چکی تھی۔ ذوالنون جس کی حساسیت وادراک حد سے سواتھی۔ ماں کی  
 زبان درازی کے نا آشنا گوشے اور باپ کے اس قہر و غضب میں بھرے خون خوار روپ نے اسے اتنا ہراساں و خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ ڈر کر  
 چپ بھی نہ سکا تھا اور تیزی سے اپنا منہ رضائی میں چھپا لیا تھا۔

اُس کا معصوم و ناپختہ ذہن جو پہلے ہی ماں اور باپ کے درمیان بے گامگی کے احساس کا شکار تھا۔ اس وقت ان کے درمیان  
 ہونے والی وہ جدوجہد نے اسے نئے و بھیاںک جذبے سے آشنا کر دیا تھا۔

نفرت شدید تر نفرت کا جذبہ!

عورت سے جنونی نفرت کا جذبہ!

ساتنے چہرے پر ہاتھ رکھے روتی چیختی، چلاتی ناز بیا زبان بولتی عورت اُسے ہاں نہیں کوئی اور عورت لگی جو کسی اپنی جیسی دوسری  
 عورت کے خلاف بڑے بڑے لفظ بول رہی تھی۔

اُن کرب ناک لمحوں میں وہ دس سال کی عمر میں شہور کی کئی منزلیں اذیت ناک انداز میں پھیلا نکلا چلا گیا تھا۔

بے حد جنگ و مشکل ترین گمراہی تھی اس کے ذہن میں اور آگے کا سزا حد کشن و دشوار ہو گیا تھا۔ وہ اُس کی ایتر ہوتی ذہنی  
 حالت سے بے خبر ایک دوسرے پر الزامات لگانے میں مصروف تھے، پھر اس نے پھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک اور کرب ناک منظر دیکھا تھا۔  
 منال روتی چیختی سوٹ کیس میں اپنے کپڑے وغیرہ بھر کر چلی گئی اور اُس کے بعد اس نے حنزہ کو دیکھا جو پہلے سے تیار شدہ سوٹ کیس اٹھا کر  
 آگے بڑھا تھا اور اُس پر نظر ڈال کر چند جینے کھڑا کھڑا رہ گیا تھا۔ اُس نے بھی باپ کو جاتے دیکھ کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

"ذوالنون امیری جان۔" سوٹ کیس رکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا تھا اور اسے ہانڈوں میں بھر کر پوری شدت سے رو پڑا تھا۔

"بابا! آپ کہاں جا رہے ہیں؟" کونین جو دوسرے کمرے میں ماں باپ کی لڑائی کی آوازیں سن کر گھبرا رہا تھا، ماں کو جاتے  
 دیکھ کر یہاں آیا تھا اور یہاں باپ کو بھی تیار دیکھ کر پریشانی سے بولا۔

حنزہ نے اُس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ بھی خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں ابھی آنسو چمک رہے تھے، چہرے پر نشان تھے،  
 آنسوؤں کے۔

”میں جا رہا ہوں، مجھے جانا ہوگا۔“ دوسرے ہاتھ سے کونین کو لپٹاتے ہوئے وہ بھرائے لہجے میں بولا۔  
 ”ہمیں آپ کی ضرورت ہے بابا، آپ مت جائیں۔“

”میں نہیں رُک سکتا، اگر رُک گیا تو مر جاؤں گا، میری شریانیں پھٹ جائیں گی، میں یہاں نہیں رہ سکتا، مجھے روکنا مت۔“ اُس کے آنسو اُن کے سر کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

”میں ماما کو لے آؤں گا، آپ مت جائیں۔“ کونین نے تسلی دینی چاہی۔

”مائی فٹ، مجھے نفرت ہے اس عورت سے جو رشتوں کے تقدس کا قتل کرتی ہے، اگر وہ میرے سامنے آئی تو میں خودکوشٹ کر لوں گا۔“  
 اُن دونوں کو طیغہ کرتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا انداز اتنا سرد اور دکھا ہوا گیا کہ پھر کونین کی جرأت نہ ہو سکی اسے روکنے کی اور ذوالنون تو کچھ بولا ہی نہ تھا۔ اس کا ذہن شاک کے زیر اثر تھا۔ وہ چترائی ہوئی لگا ہوں سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ دیکھتا رہا تھا، جانے سے قبل جزوہ نے ان سے معافی مانگی، ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا کہا اور بھی نہ معلوم کیا کچھ وہ کہتا رہا تھا اور آخری لمحے وہ لگا ہیں چرا کران کے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ جاتے لمحے انہوں نے اس کی پیشانی پر وہ بوسہ بھی نہ دیا تھا جو کہیں جانے سے قبل دینے کے عادی تھے۔ کونین روتا ہوا اُن کے پیچھے گیا تھا مگر وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکا تھا۔ اس کا چہرہ پاٹ تھا اور آنکھیں خشک، مگر دل کی دنیا میں زبردست جاتی پھیلی ہوئی تھی۔ ماں سے ہمیشہ اسے تسلی کا احساس ملا تھا۔ باپ سے ملنے والی تمام محبت و اُلفت، اعتماد و اعتبار کے بھرم بھی ٹوٹنے چلے گئے۔ بہر حال ان ٹوٹے احساسات کی گرد پھیل رہی تھی۔

”پرنس..... پرنس! بابا ہمیں چھوڑ گئے پرنس!“ کونین واپس آ کر اس سے لپٹ کر رو پڑا، وہ پھر بھی ایسے ہی بیشار ہا۔

”پرنس! بابا نہ معلوم کہاں گئے ہیں؟ ماما بھی چلی گئی ہیں..... تم بولنے کیوں نہیں..... تمہیں کیا ہوا؟“ کونین نے گھبرا کر اسے جھنجھوڑا تو وہ بے ہوش ہو کر اس کی گود میں گر گیا۔ کونین کی چیخوں نے ملازمین کو کمرے میں اکٹھا کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آسمان پر ہلکی ہلکی دھند تیزی سے بڑھ رہی تھی اور خوشگوار موسم میں سردی کا احساس پھیلنے لگا تھا۔ سبزے میں بے شمار پھولوں پر بیٹھی منزل لاتی تلیوں کے پیچھے بھانگی سرخ فزاک میں گولڈن بالوں کی دو پونٹوں میں وہ خود بھی ایک خوب صورت و دل کش تلی لگ رہی تھی۔ بٹر فلائی نیٹ پکڑے وہ کئی گھنٹوں سے تلیوں کے ساتھ کھیل میں مصروف تھی۔ کبھی انہیں پکڑ لیتی اور کبھی چھوڑ دیتا، مگلا اور باسکٹ میں ڈھیروں رنگ برنگے پھول رکھے تھے۔ وہ اپنے اس مشغلے سے بہت خوش تھی۔ اس کے ساتھ آئے ہریرہ اور ایرج کافی تاہم گزر جانے کی وجہ سے گھر جانا چاہ رہے تھے مگر وہ تیار نہ تھی۔

”حورین! آئی اور می گھر آگئی ہوں گی، وہ ہمیں گھر میں نہ پا کر پریشان ہوں گی، پلیز چلو ناں۔“ ایرج نے کہا۔

”وہ دونوں گروسری کرنے گئی ہیں جلدی نہیں آئیں گی۔“

”وہ آگنی ہوں گی، ہمیں چلنا چاہیے۔“ ہریرہ ماحول میں چھانے والے سرمئی غبار دیکھ کر بولا۔

”میں نے کہا تھا نہیں آئی ہوں گی۔“ سیٹ نیچے کر کے وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے چیخنے والے انداز میں بولی۔

”آگنی ہوں گی۔“ ہریرہ کا انداز بھی چیخنے والا تھا۔

”ہو جائے شرط؟“ حورین ہاتھ پھیلا کر بولی۔

”ڈن۔ ہارگنی تو یہ تمام چاکلٹیں اور ویلز میرے ہوں گے؟“

”یس، اگر جیت گئی تمہیں مرغانین کر ڈان دینی ہوگی، بالکل مرنے کی طرح؟“ حسب عادت اس نے کہا جو ہریرہ نے مان لیا اور

وہ تینوں گھر کی طرف لوٹے تھے۔

گھر سے کچھ دوران دونوں نے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے ہریرہ نے کی تھی، وہ پہلے پہنچ کر تسلی کرنا چاہتا تھا کہ اگر می اور آگنی

آئی نہ ہوں تو وہ شرط ہارنے کی صورت میں اپنے بچاؤ کے لیے کوئی تدبیر کر سکے۔ حورین جو اس کی چالاکی سمجھ گئی تھی، اس نے بھی دوڑنا

شروع کر دیا، ان دونوں سے پیچھے آتی ہوئی ایرج انہیں آواز میں دیتی آ رہی تھی، مگر وہ دونوں نمبرون شریرہ ہنگامہ پسند طبیعت کے مالک

تھے۔ کہاں سننے والے تھے۔ اسی بھاگ دوڑ میں حورین کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی جینیں بھی نکل گئی تھیں۔

حورین ڈھلان سٹیج سے پھسلتی ہوئی نیچے گرتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی پھولوں کی باسکٹ سے پھول، ٹانفیاں، چپس اور ویلز کے

پیکٹ بھی ادھر ادھر لڑھکتے غائب ہو گئے تھے۔

وہ زمین پر آتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ سبز گھاس پر اس کے سر سے نکلا سرخ خون پھیلنے لگا تھا۔ ایرج اسے بے ہوش اور خون

دیکھ کر رونے لگی تھی، جبکہ ہریرہ بدحواس سا گھر پر گیا تھا۔ گھر پر ان چاروں میں سے کوئی بھی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ ملازم اور ملازمہ کو لے کر

آیا۔ ان کی مدد سے وہ حورین کو ہسپتال لے کر جا رہے تھے، جب وہ واپس لوٹے تھے اور اسی ناٹم اسے ہسپتال لے کر روانہ ہوئے تھے۔

”تھیمیکس گاڈ! کوئی فریکچر نہیں ہوا ہے، ورنہ میں تو ڈری گیا تھا۔“ انس دواؤں کے ذریعہ سوتی ہوئی حورین کا رخسار چوم کر

پُر تشکر انداز میں بولا۔ اس کے سر میں زخم آیا تھا اور چند معمولی سی چوٹیں تھیں۔ ڈاکٹر نے ایک گھنٹے کی ٹریٹمنٹ کے بعد چھٹی دے دی تھی۔

ایرج کی زبانی وہ تمام صورت حال سے باخبر ہو چکے تھے۔ سدا اور فاریہ نے اسے ڈانٹا تھا اور سدا نے سزا کے طور پر اسے مرعانا یا تھا، کرن

کے کہنے پر اس کی سزا معاف ہوئی تھی۔

”نہیں ہوا تو کل ہوگا، یہ لڑکی اس طرح حرکتیں کرتی رہے گی تو کب تک نقصان سے بچ سکتی ہے۔“ کرن ہنکرا انداز میں بولی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو یا راجو! حورین بچی ہے ابھی۔“ انس کو برا محسوس ہوا۔

”آج بچی ہے کل بڑی ہوگی، پھر لڑکیوں کو بڑے ہوتے وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ بچپن کی پختہ عادتیں عمر کے ساتھ مزید پختہ ہو

جاتی ہیں اور حورین کی یہ شرط لگانے کی عادت مجھے نہ معلوم کیوں خوف زدہ کر دیتی ہے۔ مجھے ڈر رہتا ہے اس کی اس عادت سے۔“

”بلاوجہ کے خدشے پالنا کوئی تم سے سیکھے۔“ انس نے ہنس کر کہا۔

”یہ خدشے نہیں ہیں الہام ہے، کوئی خفیہ سرگوشی ہے جو اکثر میرے اندر گونجا کرتی ہے یا میری چھٹی حس جو عموماً اشارپ ہو جاتی ہے۔“  
 کھوئی کھوئی پریشان سی کرن کو انس نے بغور دیکھا، پچھلے کچھ دنوں سے وہ مضطرب و بے کل رہنے لگی تھی۔ اس کی زندہ دلی، بڑے سکون مسکراہٹ گویا  
 کھو چکی تھی۔ اس کی کیفیت خود اسے بھی بے چین کیے ہوئی تھی۔ گزرتے وقت نے اسے کرن کے بہت قریب کر دیا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اب  
 اس کے چہرے پر رنج و مگر کی معمولی سی لکیر دیکھ کر پریشان و بے چین ہو جاتا تھا۔ گویا زندگی و مسرت کا ہر احساس اس سے مربوط تھا۔  
 ”میں دیکھ رہا ہوں جب سے حورین اسکول کے سوئمنگ پروگرام سے گولڈ میڈل جیت کر لائی ہے، جب سے تم پریشان و مگر مند  
 ہو، ایسی کیا بات ہے۔“

”انس! یہاں کا آزادانہ ماحول، یہاں کی عریاں تہذیب مجھے خوف زدہ کر رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی ہماری حورین یا امیرج و  
 ہریرہ پر یہاں کی تہذیب و آزادی کا معمولی سا بھی سایہ پڑے، اس سے قبل ہمیں یہاں سے نکل جانا ہے۔ ابھی وقت ہمارے ہاتھوں سے  
 نکلنا نہیں ہے۔“

”جبک اٹ ایزی کرن! کیا فضول سوچتی رہتی ہو، ہمیں اپنے بچوں پر اپنے خون پر اعتماد ہونا چاہیے۔“

”انس بھائی! کرن بھابی درست کہہ رہی ہیں۔ یہ معاشرہ اور یہاں کی بے راہ روی مجھے بھی پریشان کیے ہوئے ہیں پھر بات خون و  
 خاندان پر اعتماد کی نہیں ہوتی ہے۔ بات یہیں آتی ہے آگ میں رہ کر آپ خود کو کس حد تک بچا پائیں گے؟“ قاریہ بھی کرن کی ہم خیال تھی۔  
 ”کرن بھابی اور انس کا معاملہ تو تم جانتی ہو قاریہ! پھر کس طرح یہ واپس جاسکتے ہیں، یہ بھی تو سوچو۔“ سعد نے گفتگو میں حصہ لیا۔  
 ”سعد بھائی! وہ دور گزر گیا۔ بہت خوف زدہ ہوئے، بہت ڈرے مگر اب نہیں ڈرتا ان کے خوف سے۔ ہم یہاں اپنے بچوں کی  
 تربیت خراب نہیں کر سکتے، ہمیں پاکستان واپس جانا ہے بس۔“ کرن قطعیت بھرے انداز میں بولی۔  
 ”او کے، او کے اتنی جلدی ڈپریشن میں آپ خواتین جھلاندہوا کریں، ہمیں پاکستان جانا ہے لیکن بچوں کی ابتدائی تعلیم مکمل ہونے  
 کے بعد سب چلیں گے۔“ انس اور سعد نے رے یقین لہجے میں کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہال روم میں وہ سب جمع تھے۔

صمد، صمد کی بیوی صنوبر، راحیلہ بیگم، ذوالنون، کونین اور صمد کا بیٹا ہنزو، بیٹی حضرتی اور دوسرا بیٹا خضر۔ اسنے نفوس ہونے کے باوجود  
 وہاں خاموشی اپنے پورے وجود سمیت حاصل تھی۔ البتہ راحیلہ بیگم کی کھٹی کھٹی سسکیاں ماحول کے سکوت میں ارتعاش سا پیدا کر دیتی تھیں۔  
 صمد ابھی ابھی کہیں سے آکر بیٹھا تھا۔ تمام نگاہیں اس کے چہرے پر جمی بے تابی سے اٹھی تھیں۔ اسی طرح جبک بھی گئی تھیں۔ ناکامی و  
 نامرادی صمد کے چہرے پر عیاں تھی۔ راحیلہ بیگم کی سسکیاں مزید بڑھ گئی تھیں۔

”مت روئیں ماما! کب تک ہم سے اپنے بچوں سے دور رہے گا، وہ آج نہیں تو کل لوٹ آئے گا۔ ہماری خاطر اپنے گھر اپنے بچوں کی خاطر“۔ ماں کو تسلی دے کر اس نے ذوالنون اور کونین کو دونوں بازوؤں میں لے کر خود سے لپٹا لیا تھا۔ شدت ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”نہ پتہ، نہ ٹھکانہ، اس کی منزل کا نہیں پتہ ایسا کہاں چلا گیا میرا بچہ۔ مجھے خبر بھی تو ہو کہ کہاں گیا ہے“۔ راحیلہ کو کسی دم قرار نہ تھا۔ ”وہ پاکستان سے باہر گیا ہے۔ میں نے فریول اینجنسی سے معلومات لی ہیں، آپ روئیں نہیں۔ صرف دعا کریں، وہ لوٹ آئے گا بہت جلد، صنوبر بچوں کو تیار کرو، ہم کھانا باہر کھائیں گے“۔ وہاں موجود ڈپریشن کو دور کرنے کے لیے اس نے پروگرام بنایا تھا مگر کوئی بچہ باہر جانے پر راضی نہ تھا۔ صنوبر نے انہیں گھر ہی کھانا کھلا کر دوسری ضروریات سے فارغ کر دینے کے بعد کمروں میں سونے کے لیے بھیج دیا تھا اور خود دوسرے کاموں میں لگ گئی تھیں، جبکہ صمد اور راحیلہ بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔

”بھابی نے آنے سے انکار کر دیا مگر قاعدہ آئی کہہ رہی تھی، کچھ دن بعد بھابی کا ٹھکانہ آجائے گا تو وہ خود چھوڑ جائیں گی یہاں“۔ ”وہ عورت نہ اچھی بہو ثابت ہو سکی، نہ اچھی بیوی اور نہ اچھی ماں“۔

”کونین نے ان باتوں کا اتنا اثر نہیں لیا ہے جس قدر ذوالنون دل و دماغ پر اثر لے بیٹھا ہے۔ ایک آنسو اس کی آنکھ سے نہیں گرا ہے اور زبان کو جیسے تالا لگ گیا ہے۔ کچھ بولتا بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں اگر اس کی بی بی کنڈیشن رہی تو کسی سائیکالوجی پرائیلم کے سرکل میں پریشرائز ہو سکتا ہے۔ یہ بہت بڑا پرائیلم ہے ماما، اسے کسی طرح دل کا غبار نکالنا چاہیے، اسی طرح وہ ریٹیکس ہو سکتا ہے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، کچھ بھی“۔ انس ٹی طرح پریشان تھا۔

”اللہ نہ کرے جو میرے بچے کو کچھ ہو۔ اس کی جان تو باپ میں اٹکی رہتی تھی، اس کی تو یہ حالت ہونی ہی تھی“۔ راحیلہ بیگم زور و شور سے رونے لگیں۔

ایک ہفتہ مزید گزر گیا، نہ حذرہ نے کوئی رابطہ کیا، نہ منال لوٹی اور نہ ہی ذوالنون کی خاموشی و بے حسی میں کمی آئی۔ کونین اس کا بے حد خیال رکھنے لگا تھا۔ گھر کے سب لوگ اسے وی آئی پی ویلیو دے رہے تھے، مگر اس میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا۔ یہ وہی گھر تھا جہاں آ کر وہ بے حد خوش و خرم رہا کرتا تھا۔ وادی سے کہانیاں سنتا، چچی سے کمانوں کی فرمائش کرتا، بچا کے ساتھ آئس کریم کھانے جاتا اور بچوں سے گہری دوستی رکھتا تھا اور اب..... اسے کچھ نہیں پسند آ رہا تھا۔

ہنزدہ اور خضریٰ جانب بھی نگاہ اٹھا کر دیکھ لیا کرتا مگر خضریٰ جس سے اس کی فریڈ شپ تھی، نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ تھا اور چھ ماہ کی عربیہ تو اس کی گود و محبتوں سے محروم ہو گئی تھی۔

اس وقت بھی وہ سوچوں میں گم بیٹھا تھا، جب اچانک ہی کونین نے چھ ماہ کی عربیہ کو اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”پرنس! یہ تمہیں دیکھ کر مسکرا رہی ہے، تم سنبھالو اس کو“۔ وہ بڑی زور سے چونکا تھا اور اس کا یہ چونکنا اندر داخل ہوتے صدمہ کی



نگاہوں میں تجسس چمکا گیا، وہ وہ ہیں کھڑے ہو کر بغور اس کے ہندرتاج سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا، جس کی لمحہ بہ لمحہ کیفیت بدل رہی تھی۔  
 ”یہ..... یہ اس کو تم نے کیوں مجھے دیا ہے؟“ شدید غصے و جنون سے اس کی آواز کانپ رہی تھی، اعصاب تن گئے تھے۔  
 ”اتنا غصہ کیوں ہو رہے ہو۔ یہ عریضے تمہیں اچھی لگتی ہے ناں۔“  
 ”تمہیں لگتی مجھے اچھی۔۔۔ وہ چہنا۔“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ کونین اس کی حالت پر پریشان ہوا۔

”یہ لڑکی ہے اور مجھے لڑکیوں سے نفرت ہے، آئی بیٹ گرل۔“ اس نے شدید اشتعال سے کہتے ہوئے عریضے کو گود سے نیچے اچھال دیا تھا اور اس طرح کرنے سے بچی پوری طرح گلا پھاڑ کر روئی تھی۔ کونین نے بھرتی سے بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا تھا مگر وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

”تم پاگل ہو گئے ہو، ہانکل پاگل۔“ کونین غصے سے بولا۔

”ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں، آئندہ اسے میرے پاس لائے تو اس کو جان سے مار دوں گا۔“



بے حد خون خوار و سخت لہجہ تھا اس کا، پھر وہ وہاں رکا نہیں تھا۔ دھپ دھپ قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے تیرے بگڑے ہوئے تھے۔

”کونین بیٹا عریضے کو اپنی آنٹی کو دے آئیں۔“ صد صوفی پر بیٹھتا ہوا اس سے مخاطب ہوا تھا۔ کونین نے حکم کی قیصل کی اور پھر فوراً واپس صوفی کے پاس آ گیا جو کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔

”انکل! آپ نے دیکھا پرس نے عریضے کو گود سے پھینک دیا، پھر اس کا لہجہ و انداز، چہرے کے تاثرات کتنے خطرناک تھے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے وہ کبھی ایسا کچھ کر نہ دے۔ اس کی آنکھوں میں نفرت تھی، بہت شدید نفرت۔“ ذوالنون کی انجھا کو بچنی جتنی حالت نے سے ڈرا دیا تا۔

”پریشان نہ ہوا ایسا نہیں ہوگا۔ میں اسی کوشش میں تھا کہ وہ اپنی خاموشی و بے حسی سے نکل کر کسی جذبے کا اظہار کرے، خواہ غم و غصہ، ہنسنا و رنا، مارنا پھینکانا کسی بھی طرح کا کوئی جذبہ، جو اس کے اندر بھری بند کیفیت کو ظاہر کرے جس سے اس کا دل و دماغ فریش ہو اور وہ منفی شخصیت جو اس کے اندر اُبھر رہی تھی، ظاہر ہو۔ شکر اللہ کا کہ وہ خطرہ ٹلا ہے اب اسی کا جو مزاج ہو وہ ہمارے سامنے ہوگا، پوشیدہ نہیں۔“  
 اُن کے پریشان لہجے میں کچھ اطمینان اُبھرا تھا۔ کونین اس نفسیاتی نقطے کو سمجھ نہ پایا تھا۔

☆.....☆.....☆

وقت کا طائر بہت جیزی سے پرواز بھرتا چلا گیا تھا۔ سال پر سال گزرتے رہے اور ان گزرتے سالوں میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ کل کے مصوم بچے آج کے بھرپور جوان تھے۔ حزرہ ہنوز لاپتہ تھے، البتہ کسی نہ کسی جاننے والے کے ذریعے ان کی موجودگی کا سراغ

مٹا رہتا، کبھی وہ اسپین میں، کبھی ٹورنٹو تو کبھی ناروے میں نظر آتے۔ اب نہ معلوم یہ اتفاق تھا یا ان کی احتیاط کہ کسی کو قریب آنے کا موقع نہیں دیا۔ صرف جھٹک دکھا کر غائب ہو جاتے تھے۔ مگر والے یہ سن کر ہی خوش ہو جاتے تھے کہ وہ زندہ سلامت ہیں اور کبھی نہ کبھی تو دشتِ سیاحتی سے آگیا کر گھر کی راہ لیں گے۔

کوئین ایم بی اے کے بزنس سنبال چکا تھا، جس میں نانا کا بھرپور تعاون اسے حاصل تھا، کیونکہ دوھیال میں زیادہ تر یہی رشتہ اور تعلقات صمد کی فیملی سے رہے تھے، جہاں صمد کے دونوں بیٹے اور ایک بیٹی میڈیکل لائن سے باپ کی طرح وابستہ تھے۔ ان کا بزنس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ حمزہ اپنے باپ کا بزنس سنبال رہا تھا جو پہلے منال نے سنبالا ہوا تھا اور باپ کی مرضی پر ان کے ساتھ شرکت داری کر چکی تھی۔ سسرال سے تعلق انہوں نے پہلے بھی نہ رکھا تھا، پھر حمزہ کے جانے کے بعد تو وہ تقریباً بالکل لا تعلق ہو گئی تھیں۔ نت نئی دلچسپیوں نے انہیں بچوں سے بھی دور کر دیا تھا۔ بزنس پارٹنرز، شاہنواز، گیدرنگز وغیرہ میں وہ اپنی ماں فائقہ بیگم سے بھی آگے بڑھ گئی تھیں۔ فائقہ بیگم کے بیٹے نہیں تھے۔ نواسوں کے روپ میں بیٹے پا کر وہ بے حد سرور رہتی تھیں اور اسی طرح برہان لٹاری بھی نواسوں کو بیٹوں کی جگہ دے چکے تھے۔ والدہ حضور کو اس دُنیا سے گئے برسوں گزر گئے تھے۔ بڑے کردار جاہ و جلال سے زندگی گزارنے والی والدہ حضور کا آخری وقت بڑی کسپری کرب و تکلیف میں گزرا تھا۔ منال اور فائقہ نے اس سے تمام بدلے چکائے تھے۔ ہر بدلہ سود سیت وصول کیا جا چکا تھا۔

انسان بھی کتنا نادان ہے۔ دکھوں کے بیج بوتا ہے۔ کرب کی فصل کاٹتا ہے۔ ایک عورت پر عورت کا ظلم صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے، رشتے ہوئے اپنے گل کو کیوں فراموش کر دیتی ہے؟ مکافات عمل کو کیوں بھول جاتی ہے؟ عورت پر عورت کا ظلم صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے، رشتے بدل جاتے ہیں، منصف نہیں بدلتی، ذہنیت و فطرت نہیں بدلتی، نہ معلوم کب یہ معجزہ ہوگا؟ کہ عورت اپنے مقام، اپنے فرض کو شناخت کر کے دُنیا میں ہونے والے آدمیوں کا تو خاتمہ کر دے گی۔

حمزہ کے جانے کے بعد کچھ عرصہ تک منال بھی برہان ہاؤس میں روٹھی بیٹھی رہی تھی۔ فائقہ بیگم نے تھوڑا وقت گزرنے کے بعد سمجھایا کہ وہ ایسی بے وقوفی نہ کرے۔ حمزہ چلا گیا مگر اس کی دولت، بزنس سب موجود ہے اور بچے بھی، عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ضمیر تھوک کر بزنس و جائیداد اور بچوں کو یہاں لے آئے اور منال کو ماں کے آئیڈیلز ہمیشہ سے پسند رہے تھے۔ وہ فوراً حساب کتاب بے باقی کر آئی تھیں، حالانکہ اس سے قبل ان کو منانے کئی بار راجیلہ بیگم اور صمد اور اس کی بیوی نے بہت کوشش کی کہ وہ دونوں بچوں کو ان کے پاس چھوڑ جائیں مگر فائقہ نے نہیں مانیں کیونکہ انہیں خوف تھا کہ اگر بچے یہاں رہے تو کہیں بچا اور دادی کے فیور میں نہ آ جائیں اور سب کچھ ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اس خوف سے وہ بچوں کو وہاں چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں اور ساتھ لے آئیں اور پھر ان کی پوری کوشش یہی رہتی کہ بچے ان سے مل نہ پائیں یا اگر ملیں بھی تو بہت کم وقت کے لیے۔ اس دوران بھی گورنس ان کے درمیان موجود رہتی، تاکہ وہ کچھ سکھا، بجز کانہ سکیں۔

کوئین عام فہم تھا، وہ ہر رنگ میں رنگنے اور ہر ماحول میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ باپ کی بے حسی و ماں کی بے نیازی وہ بھی بڑی طرح محسوس کرتا تھا مگر اس نے ان احساسات کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا تھا، ذوالنون کی طرح۔

ذوالنون جو شروع سے ہی ایک مشکل و نہ سمجھ آنے والا بچہ تھا، باپ کی موجودگی میں ہی وہ بے حد حساس و کم گو اور سنجیدہ تھا، پھر باپ کی غیر موجودگی و حالات نے اسے بالکل مختلف روپ دیا تھا۔ حمزہ کی دوری نے اسے سب سے دور کر دیا تھا، حتیٰ کہ چچا، چچی، وادی اور کزنز جن پر وہ جان دیتا تھا، وقت نے ایسی کڑی آزمائش میں اسے جتلا کیا کہ وہ سب سے متنفر، بدعین و دور ہوتا گیا۔ بے اعتمادی، بے اعتباری نے اسے کسی پر اعتماد کرنا نہیں سکھایا تھا۔ وہ گویا ہر شے، ہر تعلق، ہر بندھن سے بے گانہ، لاپرواہ بے نیاز ہو گیا تھا۔ بڑھتی عمر اسے سنجیدگی و خاموشی کے بحر بے کراں میں ڈبوئی چلی گئی۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز اپنی دنیا، اپنی پڑھائی میں گم ہوتا چلا گیا۔ اپنے مزاج و عادات کے برعکس وہ ہمیشہ سے پڑھائی میں نمایاں ترین پوزیشنز لیتا آیا تھا۔ برہان لغاری نے بہت چاہا کہ وہ باہر جا کر کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے سے شلک ہو جائے مگر اس نے اپنے ملک پر کسی بھی دوسرے ملک کو ترجیح نہ دی تھی۔

”کوئین! پرنس کہاں ہے؟“ منال اندر آ کر اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”وہ حیدر کے ساتھ گیا ہے کچھ دیر قبل۔ آپ کو کوئی کام تھا؟“ وہ کف لکس بند کرتا ہوا ان سے مخاطب ہوا۔

”یہ لڑکا کبھی مجھ میں نہیں آئے گا، بچپن سے آج تک مجھے شیز کیا ہے اس نے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے بیڑ پر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا ہوا ماما! آپ کیوں اتنی ٹینس ہیں۔ کیا کیا ہے پرنس نے؟“ انہیں پریشان دیکھ کر وہ ان کے قریب بیٹھے ہوئے شکر انداز

میں بولا۔

”پرنس..... نارمل بی بیوٹر نہیں ہے اس کا، ٹوٹی ایب نارمل ہے وہ۔ سرفراز خان کی بیٹی نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا ہے۔ اتفاقاً

پرنس سے ملاقات ہوگئی اس کی اور اس نے ہیلو ہائے کی توجوا پرنس نے اسے نہ معلوم کیا کیا جھاڑ پائی۔ انسلٹ کر دی اس کی دوستوں کے سامنے۔ انوشہ نے مگر جا کر بیگم نوشین سے شکایت کی، رورو کر نہ حال کر لیا اس بیٹی نے، بیگم نوشین نے مجھے کال کی اور مشورہ دیا کہ مجھے پرنس کا میڈیکل چیک آپ کروانا چاہیے۔“

ماں کی گفتگو پر کوئین کے چہرے پر چھائے ٹکڑے ٹکڑے اثرات زائل ہو گئے تھے۔ اب وہ ہونٹ بھینچے اپنی بے ساختہ اُبھرنے والی

مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔

”ان کی باتوں نے مجھے اس قدر شرمندہ کر دیا کہ میں نے فوری معذرت کی اور کوئی لفظ نہ کہہ پائی اور پہلی بار ایسا نہیں ہوا ہے، نہ

معلوم کتنی مرتبہ وہ ایسی چیپ حرکتیں کر چکا ہے۔ مونا، حرا، فلف، فریاد اور بھی بے تحاشہ لڑکیوں کی وہ اسی طرح ”عزت افزائی“ کر چکا ہے اور میں معذرتیں کر کے تھک چکی ہوں، آخر کوئی حد ہوتی ہے، کوئی وجہ ہو، بلاوجہ وہ ”گرتا رہتی“ کا فنکار ہو گیا ہے اور مجھے کچھ نہیں آتا وہ اتنا روکھا اور غیر مہذب ہونے کے باوجود لڑکیوں کے لیے اتنا پُرشش کیوں ہے؟ لڑکیوں کی جانب نگاہ اٹھانا بھی تو جین سمجھتا ہے۔ اس پر وہ دل و جان سے فدا ہیں۔“ منال کے لہجے میں اب غصے کے ساتھ تعجب و تحس موجود تھا۔

”ماما! پرنس کی پر سنائی پرنس جیسی ہے۔ وجیہ، اسارت، ڈشنگ اور اس کا دماغ آسمان پر پہنچانے میں ان ہی لڑکیوں کا ہاتھ

ہے، یہ آپ بھی جانتی ہیں، وہ لڑکیوں سے کم عمری سے دور بھاگتا ہے، پسند نہیں کرتا مگر اس نے ایسا رویہ کبھی نہیں اپنایا تھا۔ اچھی یا بُری کبھی کوئی گفتگو نہ کی تھی، اب اگر اس کی زبان شرارے اُڑاتی ہے تو وہ سب لڑکیوں کے عمل کا ہی رد عمل ہوا ہے۔ وہ بے قصور ہے اور آپ یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہیں کہ شاید اسے کوئی میڈیکل، فزیالوجی پر اہل علم ہے تو ایسی کوئی بات نہیں ہے، وہ سوئی صدفٹ ہے۔“ کونین ہنس کر بولا۔

”اور رہا یہ سوال کہ لڑکیاں اس کے پیچھے کیوں بھاگتی ہیں تو بہت سادہ سی بات ہے۔ آسانی سے مل جانے والی چیز کی کوئی قدر نہیں کرنا، قابل دید وہی چیز ہوتی ہے جو بہت مشکل سے بڑی محنت کے بعد حاصل ہو، شاید وہ اسی لیے گزرنے کے لیے نہ کشش و قابل حصول ہے۔“

”یہ سب آپ کے بابا کی وجہ سے ہے، پرنس نارل نہیں ہے، وہ شروع سے حمزہ سے اٹیچڈ تھا ان کے جانے سے پھر کوئی رابطہ نہ رکھے جانے کی وجہ سے اس کے اندر یہ ایب نارلٹی ڈویلپ ہوئی ہے جو ہم میں رہتے ہوئے بھی وہ ہم میں موجود نہیں ہوتا اور میرے ساتھ اس کا رویہ روکھا ہوتا ہے، جیسے سب کی ذمہ دار میں تھا ہوں۔“ بہت مزہ کی کہی ہوئی بات وہ پھر دہرائی تھیں اور کونین کو معلوم تھا، اگر اس نے فوراً ہی ٹاپک نہ بدلا تو گفتگو طویل ہو جائے گی۔

”آج آپ کی کوئی پارٹی نہیں ہے؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”پارٹی ہے مگر میں نے جانا کینسل کر دیا ہے۔“ وہ اس کی طرف بخور دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ گرے پیٹ، وہ ہائٹ شرٹ پر گرے اینڈ بلیک ٹائی میں ٹائی پن لگا تا وہ تیار ہوا، بہت ہینڈم لگ رہا تھا اس کا سر پاپا، اس کا فیس حمزہ سے بے حد بچ کر تھا۔

”کیوں کینسل کر دی ہے، آپ گھر میں کیا کریں گی، نا تو بھی پارٹی میں گئی ہیں۔“ ماں کو اپنی جانب متوجہ پا کر وہ ہوشیار ہوا تھا۔

”گھر میں تو میں نہیں رہوں گی، سز سرفراز کے ہاں جا رہی ہوں، کچھ گفتگو لے کر، تاکہ اس نالائق کی بدسلوکی کی تلافی کر سکوں۔ سرفراز صاحب کو تو تم جانتے ہی ہو، چیف جسٹس ہیں اگر ان سے طریقے سے معذرت نہ کی گئی تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا اور میں نہیں چاہتی دریا میں رہ کر مگرچھ سے بھر کیا جائے۔“

”مما! اس دریا میں نامعلوم کتنے مگرچھ ہیں، آپ کب تک اپنا پیہ ایسے تھنوں میں برباد کرتی رہیں گی۔ بہتر یہی ہوگا کہ ایسے مگرچھ اپنی پھلیوں کو سمجھائیں کہ دوسرے کے تالاب گندے کرنے کی سعی نہ کریں۔“ بڑے لوگوں کی خوشامدوں سے اسے چڑھی۔

”سب کچھ اس طرح نہیں ہوتا کونین! جس طرح ہم چاہتے ہیں۔ بے خوف و خطر اور اطمینان سے جینے کے لیے ہمیں ایسے لوگوں سے روابط مستحکم رکھنے پڑتے ہیں۔ پھر یہ یہاں کا اصول ہے۔ کچھ لینے کے لیے، کچھ دینا بھی پڑتا ہے، اگر میں یہ حکمت عملی نہ اپناتی تو پرنس نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا تھا، خیر بہت باتیں ہو گئیں۔ یہ بتاؤ کہاں جا رہے ہو؟“

”چاچو کی طرف جا رہا ہوں۔“ وہ کچھ گڑبڑا کر بولا۔

”کیوں؟“ ان کے تپو بگڑے۔

”وہ..... واو بھی..... کافی دنوں سے یاد کر رہی ہیں۔“

”کیا چکر ہے؟ آپ کو دادو بہت یاد کرنے لگی ہیں؟ بہت جانے لگے ہو اس طرف..... آپ کو اچھی طرح معلوم ہے مجھے آپ لوگوں کا دہاں جانا، ان سے ملنا پسند نہیں ہے، ٹھیک لوگ نہیں ہیں وہ۔“

”بہت کم جاتا ہوں وہاں، دادو کے بار بار یاد کرنے پر۔“

”اصل فساد کی جڑ ہی بڑھیا ہے۔ پہلے مزہ کو بھڑکا کر ہم سے دور کیا، پھر پرنس کو باغی کیا اور اب آپ کے پیچھے لگی ہیں۔“

کوئین نے ہونٹ سمجھنے لے، بہت ہائی سوسائٹی ہو کر کرنے والی اپنی ایجوکیٹڈ ماں کا یہ جاہل عورتوں والا انداز اسے کبھی نہیں بھاتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسلام آباد آئے اسے چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔

ایک مدت بعد اپنے ملک کی سر زمین پر دوبارہ بسنے کی خوشی نے اسے ہی نہیں، حورین کو بھی بے حد متاثر کیا تھا۔ قاریہ اور اس کے بچے بھی بہت خوش تھے، البتہ انس اور سعد کی کیفیت عام سی تھی۔ وہ کئی بار یہاں آچکا تھا بلکہ قاریہ بھی میکے میں ہونے والی تقریبات اٹینڈ کرنے وقفے وقفے سے آتی رہی تھیں۔ کرن یہاں سے جانے کے بعد ایک دفعہ بھی نہ آسکی تھی۔ دل میں وہی پرانا خوف جو کسی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا، جو وہ کبھی بھولتی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ برہان لغاری، منال اور والدہ حضور نے اسے ابھی تک معاف نہ کیا ہوگا اور نہ وہ معاف کر سکتے تھے۔ بدلہ لینا اور کبھی نہ معاف کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ ان کا ورثہ تھا، ان کی بگڑی میں لگا وہ طرہ تھا جو نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا، پھر اس نے تو انہیں ایسی ہلکتی فاش دی تھی جو ناقابل فراموش دنیا قابل معافی تھی، یہی وجہ تھی جو اس نے کراچی کے بجائے اسلام آباد میں سکونت اختیار کی تھی۔ اس کی وجہ سے سعد اور قاریہ بھی کراچی نہ گئے تھے، اتنا عرصہ رہنے سے ان میں محبت کے تعلق انوٹ ہو چکے تھے۔ اتنے مضبوط کہ ان کے کہنے کے باوجود وہ لوگ کراچی نہیں گئے تھے۔ ان کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ قاریہ کامیکہ کراچی میں مقیم تھا۔ ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ دو شادی شدہ بھائی اور ایک بیوہ بہن وہاں رہائش پذیر تھیں۔ اپنی فیملیز کے ہمراہ شروع سے ان کے تعلقات کی ڈور اتنی مضبوط تھی کہ ان سچے و کھرے و بے لوث جذبول کو قاریہ کے میکے میں بھی مکمل پذیرائی ملی تھی۔ قاریہ کے والدین اور بہن بھائیوں نے بھی کرن، انس اور حورین کو سکون کی طرح ہی چاہا تھا۔ کرن و قاریہ، حورین، ہریرہ اور امیرج میں کوئی تفریق نہ تھی۔ پیار و محبت ان سب کے لیے یکساں تھی۔ قاریہ کی بھابیوں کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ کرن ان کی سگی نند نہیں ہے، وہ اسے سگی نند سمجھتی آئی تھیں۔

اپنے دیس میں آکر ماضی پھر سے اس کے لیے تازہ ہو گیا تھا، جس میں سرفہرست ماں کی یاد تھی جو کبھی دل سے جدا نہ ہوئی تھی مگر یہاں آکر لگتا تھا، اس کی سانسوں میں ان کی کھوئی ہوئی تہک دوبارہ آہی ہے، پھر ایک احساس تھا، ایک خیال اس شخص کے متعلق جس کو اس نے دوست سمجھا تھا، بھائی سمجھا تھا اور وہ ان رشتوں کو پھلا لیک کر دل کا تعلق قائم کر بیٹھا تھا اور بہت دور تک جا پہنچا تھا، جہاں سے واپسی اتنی سہل نہ تھی مگر پھر بھی اس نے اسے واپس لانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس کی شادی کی صورت میں..... صدر نے اطلاع دی تھی، جزوہ کی شادی کی۔ ان دنوں وہ اور انس، مرغینی اور مدثر صاحب کی جدائی کے غم میں اس قدر ٹنڈ حال و کھرے ہوئے تھے کہ ناچھی طرح اس خبر کو سن

سکے اور نہ ہی حزرہ کو مبارک باد دے سکے۔ دو بارہ زندگی کے بکھیروں کی جانب لوٹنے وقت لگا تھا اور اسی دوران وہ حزرہ اور صمد سے ہر رابطہ بھول چکی تھی، پہلے غیر دانستہ، پھر دانستہ اور اب اس کے دل میں سوہوم سی خواہش جاگ رہی تھی کہ جانے حزرہ اپنی ازدواجی زندگی میں خوش ہے؟ اس کی بیوی کیسی ہے؟ اور بچے، پھر نہ جانے کیا بات تھی حزرہ کے متعلق وہ جتنا سوچتی اتنی ہی اس کے اندر وحشت و عجیب سی سرایت کی پھیل جاتی تھی جو اسے مضطرب کر ڈالتی، پھر وہ یہ سوچ کر خود کو تلی دیتی کہ حزرہ یقیناً خوش ہوگا، اچھی زندگی گزار رہا ہوگا، مرد کی محبت کب پائیدار ہتی ہے، وہ جتنی شدت سے آگے بڑھتا ہے، اس سے ڈگنی شدت سے پیچھے ہٹتا ہے، شاید اب اپنے بیوی بچوں میں گمن ہو کر اپنی سابقہ جذباتیت پر جھینپتا ہوگا، اپنا مذاق اڑاتا ہوگا۔

وہ دعا کرتی تھی، جہاں رہے خوش رہے۔ اس سے ملنے کی اُمید کو دبانایا سو مند تھا کہ اس ایک باب کے کھلنے سے ہر ورق سامنے آتا، جن باتوں کو بچوں سے چھپا کر رکھا تھا کہیں وہ از خود ہی سامنے آ جائیں یہ انہیں کسی قیمت پر گوارا نہ تھا، پچھلے کئی ہفتوں سے حورین کی ضد نے اس کی ٹینڈیں اُڑادی تھیں، سکون و رہم برہم کر ڈالا تھا۔ وہ بلی اے آنرز کے لیے کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے پر بند تھی۔ اس نے دوسرے تمام شہروں کی اعلیٰ یونیورسٹیوں کے پروزز آگے رکھے تھے، مگر وہ بند تھی کراچی میں ہی ایڈمیشن لینے کو۔ اس نے حسب عادت اسے خوب باتیں سنائیں، ڈانٹا جوا بدبوک ہڑتال کر کے کمرے میں بند ہو گئی اور اپنی ضد پوری کروا کر ہی باہر آئی تھی۔

انس نے کبھی اس کی بات نہیں مانی تھی، ہر ضد پوری کی تھی، اس بار بھی اس کی وجہ سے حورین اپنی منوانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور پہلی بار کرن انس سے ناراض ہوئی تھی۔

”بہت خاموش ہو، کیا بات ہے؟ کیا پرابلم ہے؟“ اسے سنجیدہ دم صدم دیکھ کر انس مخاطب ہوئے تھے۔

”کوئی پرابلم نہیں ہے۔ کیا پرابلم ہو سکتی ہے مجھے بھلا؟ سب کام، ہر خواہش صریح پوری ہوتی ہے، بھلا میں کیوں پریشان ہوں گی؟“ انس کے بے فکرے انداز میں وہ نئی طرح تپ کر بولی تھیں۔

”اوہ! ارے بھئی! آج ہماری بیگم بہت بدلی بدلی، بلکہ روشنی روشنی دکھائی دے رہی ہیں، خیر تو ہے کیا ناراضگی ہو گئی ہے؟“ انس کرن کی طرف متوجہ ہو کر تعجب سے گویا ہوا۔

”پلیز انس! ہر بات کو اتنا ایزی لینے کی عادت ترک کرنی ہوگی آپ کو۔ میری مرضی کے خلاف آپ نے حورین کو کراچی ایڈمیشن لینے کی پرمیشن دی ہے، سب جانتے ہیں بلکہ نقصان اٹھانے کے باوجود آپ نے اسے منع نہیں کیا، ہمیشہ سے آپ اس کی ہر بات مانتے، ہر ضد پوری کرتے آئے ہیں اگر یہ ایک ضد نہ مانتے تو قیامت تو نہ آ جاتی، کتنی دفعہ کہا آپ سے، وہ لڑکی ہے اور ایسی ہٹ دھرمیاں وہ ضدیں اس کے فوچر کے لیے جاہ کن ثابت ہو سکتی ہیں، مگر آپ سمجھنا ہی نہیں چاہتے یہ سب۔“

”میں ان میں سے نہیں ہوں ڈارلنگ! جو کل کی فکر میں اپنا آج بھی برباد کر دیتے ہیں، آج کو آج ہی انجوائے کرو، کل کی کل دیکھی جائے گی، ایسی معمولی معمولی باتوں کی ٹینشن مت لیا کرو۔“ انس نے اس کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے بٹاش لہجے میں کہا۔ کرن غصے

سے دور جا بیٹھی تھی۔

”یہ معمولی باتیں نہیں ہیں، مجھے ڈر ہے کہ وہ کراچی گئی تو کہیں.....“  
”کچھ نہیں ہوگا۔“

”کیسے نہیں، آپ نہیں جانتے ان لوگوں کو، بہت ذرا رنج ہیں ان کے، حورین کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔“ اس کا ضبط جواب دے گیا، وہ نرمی طرح رو پڑی تھی۔

”بچی مگر، یہی سوچ مجھے بر لہ بے کل رکھے ہوئے ہے۔“

”یہ کیا بچوں کی طرح اندیشے پال رہی ہو، ایسا کچھ نہیں ہوگا، بلا وجہ دوسروں کا شکار مت بنو، زخم صرف تب تک تکلیف دیتا ہے جب تک تازہ ہو، اس کے مہرتے ہی اس کی تکلیف، اس سے وابستہ درد کے رشتے بھی بھول جاتے ہیں، ہم بیس سال بعد واپس آئے ہیں، وہ بھی اسی شہر میں اب ایسی کوئی بات نہیں ہوگی، پھر کراچی کوئی تنگ گلی یا کسی چھوٹے محلے کا نام نہیں ہے، جہاں جاتے ہی وہ مگر جائیں گے، وہ روشنیوں، رنگوں کا شہر ہے جہاں لاکھوں لوگوں کا اژدھام ہے، بھاگتی دوڑتی زندگی میں کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ پرانی باتوں کو کھوجتا پھرے۔ میں کتنی بار کراچی آتا جا تا رہا ہوں، پارٹیز، فنکشنز، اینڈ کرتار ہا ہوں اور کسی سے بھی سامنا نہیں ہوا، بالخصوص حوران سے مگر ان کی بھی تو وہ اسے کیسے شناخت کر سکتے ہیں؟“ انس نے اسے تسلی دینے کی سعی کی مگر وہ ماں تھی ایک ماں کا دل کس قدر کزور و وہی ہوتا ہے، یہ صرف وہ ہی جان سکتا ہے جو ان باتوں کا احساس رکھتا ہو۔ انس کی اتنی تسلی و دلاساؤں کے باوجود وہ اپنے دل کو سمجھانہ پار ہی تھی۔

”میں سمجھتی ہوں، سب جانتی ہوں مگر آپ حورین کو منع کر دیں۔“ وہ انس کے ہاتھ پکڑ کر جذباتی لہجے میں بولی۔

”اوکے، تو حقیقت سنو، تمہاری اس کیفیت اور ڈر کو جانتے ہوئے میں نے حور کو سمجھایا تھا اور وہ ماں بھی گئی تھی، کسی اور یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے مگر وہ بے حد ڈسٹرب ہونے کے ساتھ ہی جنس بھی ہو گئی تھی کہ اسے منع کرنے، روکنے کی وجہ کیا ہے آخر؟ تمہاری کیفیت اور میری مخالفت نے اسے اس حقیقت کے قریب پہنچا دیا تھا جو ہم اس سے چھپاتے آئے ہیں اور پوشیدہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ..... ہوا مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اتنی شدید ترین مخالفت کی وجہ سے کیا بتائیں گے؟“ کرن روٹا بھول کر نئی الجھن کا شکار

ہوئیں۔

”یہ انسانی فطرت ہے، اسے جس عمل سے روکا جائے، وہ از خود اس کی طرف ایسے کھنچا جاتا ہے جیسے لوہے کو مٹنا ٹیس کچ کرنا ہے، حور بھی بھند تھی کہ اسے کچ بتایا جائے، اسے کراچی سے روکنے کے پیچھے ایسا کیا راز ہے، میں نے بہت ٹالا، بہت سمجھایا مگر وہ پریشان تھی، جاننے کے لیے اصل معاملہ اور اس وجہ سے میں نے اسے اجازت دی کہ اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا نہ ہو۔ یہ وجہ تھی اسے پریشان دینے کی جس پر آپ اتنی ناراض ہو رہی ہیں اور اتنے قیمتی آنسو بھی بہا ڈالے ہیں جو مجھے گوارا نہیں ہے۔“ اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو کرن نے گہری سانس لی۔

”میرے اندر کے خوف نے مجھ سے میرے حواس و بوجھ چھین لی ہے، یہ تو بہت سیدھی بات ہے جس کا خیال مجھے کبھی نہیں آیا،

اب کیا ہوگا؟“

”انشاء اللہ سب بہتر ہوگا، دل پر قابو پاؤ اور اسے خوشی سے اجازت دو۔“

”ہاں۔ اب تو یہ کرنا ہی ہوگا۔“ وہ بیٹھتے ہوئے آزر دگی سے بولیں۔

”ڈونٹ وری ڈیزا وہاں فار یہ مہابی کی فیملی جو ہے انہوں نے کب ہمیں غیر سمجھا ہے، سعد کی شادی سے آج تک وہ ہمیں سگوں سے زیادہ سمجھتے ہیں پھر حورین کی ان کے بچوں سے فرینڈ شپ ہے، کئی بار وہ لوگ نیو یارک میں مل چکے ہیں۔ امی جان اور صادقہ آپنی کی عادت تم جانتی ہو، وہ ہم سے بڑھ کر خیال رکھیں گی اور ایرج اور ہریہ بھی ہیں۔“ وہ ہر ممکن طریقے سے اسے سمجھا رہے تھے۔ اس نے سر ہلا کر ہاں کہہ دی تھی مگر حورین کی روانگی تک وہ اسے سمجھاتی رہی تھیں۔

”مما! چلیں، بہتر ہو جائے اگر کراچی.....“

”شٹ آپ حور! کبھی سیریس بھی ہو جایا کرو، میری فیملی سمجھنے کی کوشش کرو جان! میں آپ کو کس طرح خود سے جدا کر رہی ہوں، یہ میرا دل جانتا ہے اور آپ کو میری پروا نہیں ہے۔“ کرن جو آج کل بات بات پر جذباتی ہو رہی تھی، بے اختیار رو پڑی تھیں۔

”اوہ ممما! میں مذاق کر رہی تھی، اگر آپ روئیں گی تو میں نہیں جاتی۔“ حورین نے ماں سے لپٹ کر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں۔ میں تمہارے کیرئیر میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی۔“

”پھر آپ کے یہ آسو میرا راستہ روکتے ہیں، مجھے بے چین کرتے ہیں۔ میری اور پاپا کی کمزوری ہیں آپ کے آنسو۔“ وہ رومال

سے کرن کا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

”اپنا خیال رکھنا، کسی سے بھی فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انجینی لوگوں سے ملو تو میرا پاپا کا نام بتانے سے گریزی کرنا۔“

”ایسا کیوں ہے ممما! یہ سمجھو آپ مجھے بار بار کہ چکی ہیں، کوئی تو سبب ہوگا۔“ بار بار ان احتیاطی تدابیر نے اسے الجھا دیا تھا۔

”ہاں ہے۔“ کرن نے اس کے ڈارک براؤن سلکی بال سہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہاں انس کے کچھ کاروباری دشمن ہیں، ان کی وجہ

سے ہے سب۔“

”مجھے یقین نہیں، پاپا کے تو دشمن ہو ہی نہیں سکتے، میرے پاپا اس دنیا کے سب پاپوں سے بہتر پاپ ہیں، وہ کسی کے دشمن نہیں

ہو سکتے۔“ اس نے قطعیت سے وہ سب ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

”وہ خود کسی کے دشمن نہیں ہیں، ان کے دشمن ہیں۔“ کرن نے آہستگی سے کہا۔

”او کے ممما! میں خیال رکھوں گی۔“ کرن کی مضطرب بیگنی بیگنی آنکھوں میں اسے کسی آن جانے درو کی ایک دل دوز کیفیت نظر آئی

تھی۔ کل یہاں سے انہیں روانہ ہو جانا تھا، پہلی فلائٹ سے کراچی کے لیے۔ وہ دیکھ رہی تھی، بات بات کرن کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔



ماں کی کیفیت دیکھ کر اس کا دل بھی بہت اداس و پڑا مردہ ہو گیا تھا۔ سب سے چھپ کر کئی بار وہ رو بھی گئی تھی، اب بھی دل چلا کہ وہ خاموشی سے اٹھ کر لان کے پچھلے حصے میں آگئی جہاں گھنے درختوں کے نیم اندھروں میں اسے کوئی آنسو بہاتے نہیں دیکھ سکتا تھا، وہ اپنے آنسو کسی سے شہر کرنے کے موڈ میں نہ تھی، سو سو روئے کبھی کے رنگ برنگے پودوں کے پاس بیٹھ کر رونے میں اسے کوئی جھجک، کوئی فکر لاحق نہ ہوئی تھی۔

”روئے روئے سے میرے سر کا نظر آتے ہیں

یہ کس کی شامت کے آثار نظر آتے ہیں“

نہ معلوم کس طرح ہریرہ اسے ڈھونڈتا وہاں جا نکلا اور اس کی ہانگی آنکھیں دیکھ کر توجہ خیر انداز میں منگتا یا تھا۔

”ایک تم! ہر جگہ میرے پیچھے آدم بو، آدم بو پکارتے پہنچ جاتے ہو“

”اچھا آدم بو تم نے مجھے جن بنا دیا اگر پیچھے لگ گیا تو کیسے پیچھا چھڑا پاؤ گی، یہ معلوم ہے؟“ وہ دھپ سے اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

”پیچھے پڑ کر تو دیکھ میں بتاؤں گی“۔ وہ بدو جواب آیا۔

”ارے بندہ تو بچپن سے عاشق ہے آپ پر، اس سے بڑھ کر اور کیا پیچھے پڑنا ہوگا“۔ وہ حورین کی طرف دیکھ کر ہنس کر بولا۔

”ہونہہ، تم اسی خواہش پر مر جانا“۔ وہ بے نیازی سے بولی۔

”بہت پہلے مر گئے ہیں تم پر، اب بار بار کیا مریں گے“۔

”اچھا اچھا جو اس مت کرو، ہمیشہ بے وقوف رہو گے“۔ حورین کٹری ہو کر بڑ بڑائی، ساتھ وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

”حورین اتنی سچ روئی ہو؟“ اس بار سنجیدگی سے وہ اس کی آنکھوں اور چہرے کو غور سے دیکھتا ہوا استفسار کرنے لگا۔

”ہاں“۔ اس کی آواز ایک بار باوجود ضبط کے بھرا گئی۔

”کیوں؟“ وہ از حد حیران تھا۔

”کیوں کیا؟ کیا میں رو نہیں سکتی؟“ وہ جھلا گئی۔

”نہیں“۔

”کیوں نہیں؟“

”پتھر بھی کبھی روتے ہیں“۔ یکھت وہ قہقہہ لگا کر بولتا ہوا سر پٹ بھاگتا تھا اور غصے سے چلاتی حورین اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

☆.....☆.....☆

راہیلہ بیگم سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں، جب چائیک ہی بے حد مانوس سی خوشبو کے ساتھ مخصوص آہٹیں بھی ساعت میں گونجی تھیں۔

”السلام علیکم دادو“۔ ہر جذبے و اُمتنگ سے یکسر بے نیاز بھاری ساٹا لہجہ و جیہہ چہرے پر چھائی سنجیدگی کی دیز تہ، دو سامنے تھا جس کو

دیکھ کر محاورے کا نہیں حقیقت ان کی آنکھوں میں ٹھنڈک اتر جاتی تھی، دل میں سکون و اطمینان پھیل جاتی تھی، وہ خوشی سے مسکراتی آگے بڑھی تھیں۔

”وعلیکم السلام جگ جگ جیو“۔ اس کی پیشانی چوم کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سرشاری سے بھرپور تھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اتنے دن لگا دیئے یہاں آنے میں۔ معلوم بھی ہے دادو تمہاری صورت دیکھ کر جیتی ہے پھر بھی اتنے دن لگاتے ہو آنے میں ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی اس قدر دوری ہے“۔ وہ رونے لگی تھیں۔

”سوری دادو! آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی“۔ ذوالنون آہستگی سے بولا تو وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرنے لگیں۔

”ماں کبھی ہے تیری اور نانا، نانا ٹھیک ہیں؟“

”فرسٹ کلاس ہیں سب، مزے میں ہیں“۔

”کوئین ایک ہفتہ قبل آیا تھا، شکایت کر رہا تھا تمہاری“۔

”میری شکایت“۔ سیاہ کنھی موٹھوں تلے گلابی لبوں پر لمبے بھرو کو مسکراہٹ اُبھر کر معدوم ہوئی تھی بھران کی طرف دیکھ کر بولا۔

”مجھ سے تو نہیں کی“۔

”ہاں، تم سے کیوں کرتا، میں جو بیٹھی ہوں یہاں“۔

”اللہ آپ کا سایہ ہم پر تاحیات رکھے“۔ وہ دھیسے سے گویا ہوا۔

”کیوں تنگ کرتے ہو ماں کو، وہ پہلے ہی ڈکھی ہے، سہاگن ہوتے ہوئے بھی بچاؤں کی طرح رہ رہی ہے۔ مزہ نہ کم ڈکھ دیتے ہیں جو تم بھی اسی کو پریشان کرنے لگے“۔ راحیلہ بیگم کے لہجے میں بہو کی محبت تھی۔

”یہ صرف آپ کی سوچ ہے دادو، ورنہ میں نے ماں کو کبھی بابا کو مس کرتے نہیں دیکھا، ان کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ لائف کو اسی طرح انجوائے کرتی ہیں جس طرح ان کے سرکل میں تمام میرڈ، اُن میرڈ لیڈیز کرتی ہیں“۔ یک دم اس کے لہجے میں بیزاری اکٹاہٹ درآئی تھی۔

”ٹو کیا جانے پگلے! عورت اپنے ڈکھ سات پردوں میں چھپا کر رکھتی ہے، اس کے بٹے مسکراتے چہرے کے پیچھے روتا، سسکتا دل کسی کو نظر نہیں آتا“۔

”آپ نہ معلوم کتنی صدیوں پرانی عورت کا ذکر کر رہی ہیں۔ اس دور کی عورت ایسی خوب صورت و شگفتہ صفات سے آشنا نہیں ہے۔ یہ درود بنا جاتی ہے، درد سہا نہیں“۔ اس کے لہجے میں نفرت و ناپسندیدگی اتنی شدید تھی کہ راحیلہ سب بھول بھال کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

”ارے..... پرنس بھائی!“ اندر داخل ہونے والا معیذا سے بیٹھے دیکھ کر خوشی سے چمکتا ہوا اندر آیا اور اس سے لپٹ گیا۔

”اونٹ کی طرح قد بڑھ گیا ہے مگر تیز نہ آئی، یہ کیا اٹھائی کیروں والا طریقہ ہے، نہ سلام نہ دعا، آکر آسیب کی طرح چٹ گیا“۔ وہ معیذا کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولیں۔

”سلام تو میں نے کیا تھا دادو“۔ وہ سنبھل کر بیٹھا۔

”کب کیا تھا؟“

”ابھی تو کیا..... مگر دل میں“۔ اس نے مسکراہٹ دہائی۔

”ایسے سلام کا کیا قاعدہ جو خود سنو، خود جواب دو“۔

”اوکے، آئندہ زور سے سلام کروں گا“۔ وہ ٹھٹھل سا ہوا۔

”تم آرام سے بیٹھو، میں تمہارے لیے انڈوں کا حلوا بناتی ہوں“۔ وہ اٹھتے ہوئے اس سے گویا ہوئی تھیں۔

”آپ ریٹ کریں دادو، میں آئی سے ملتا ہوا آیا ہوں، وہ تیار کر رہی ہیں“۔

”ارے رہنے دو یا رات تمہارے ویلے سے ہم کو بھی مل جائے گا دادو کے ہاتھوں کا بنا ہوا انڈوں کا حلوا، ورنہ..... آہ! ہمارے نصیب

میں تو ڈنڈے ہی ہوتے ہیں بجائے حلوے کے“۔ محیر نے سر داہ بھری، ساتھ ان سے ایک تھپڑ بھی وصول کیا۔

”ایک نمبر کے شریر ہو، حرکتیں دیکھا کرو اپنی“۔ وہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔

”ہماری حرکتیں ایک عالم دیکھتا ہے، ہمیں فرصت کہاں ہے“۔

”پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“

”فٹنٹنگ! اور آپ سناؤ، آج کل یونیورسٹی میں ایڈمیشن چل رہے ہیں، نئے کمرز کی دھڑا دھڑا انٹریز ہو رہی ہوگی؟“۔

”ہاں، ظاہر بات ہے، نئے اسٹوڈنٹس تو آئیں گے“۔

”ہنزہ کس وقت آرہا ہے اسپتال سے اور حضر بھی نہیں آیا ابھی تک“۔

”لیجئے نام لیتے ہی حاضر ہو گئے دونوں“۔ پورچ میں کارز کئے کی آواز آئی تھی۔ آواز سن کر محیر ہنستے ہوئے بولا۔

”بائی داوے جو نام لیتے ہی نازل ہوتے ہیں، انہیں کیا کہتے ہیں؟“ وہ ڈالٹون کے ساتھ چلتے ہوئے شرارت سے پوچھنے لگا۔

”آج کل محیر کہتے ہیں“۔ اس کے سنجیدہ جواب پر محیر کا چہرہ پھاڑ قبہ تھا۔

☆.....☆.....☆

دہائٹ ہاؤس میں شام پوری رونقوں اور گلیٹیوں سمیت اُترتی تھی۔ وہ دن میں کراچی پہنچے تھے، سب سے ملنے اور خاطر تو وضع

کے بعد بی بی جان جن کی حکمرانی بلا شرکت غیرے سب پر چلتی تھی، انہوں نے دوپہر کو زبردستی اُن سب کو آرام کرنے کروا کر میں بھیج دیا

تھا۔ سدا اور قاریہ جو انہیں چھوڑنے آئے تھے، ان کے علاوہ ان تینوں نے دوپہر سو کر ہی گزار دی تھی۔ شام میں فریش ہو کر وہ اپنے کمروں

سے نکلے تو بی بی جان کے حکم پر لان کی ہنر تراشیدہ گھاس پر سرخ قالینوں پر دسترخوانوں پر چائے اور دیگر لوازمات کا بھرپور اہتمام کیا گیا

تھا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا۔ ہنسی، مذاق اور اپنائیت دیکھا گت کی چاشنی نے لطف دوہالا کر دیا تھا۔

”ارے..... یہ کیا بھی! تم نے اتنی جلدی کیوں ہاتھ کھینچ لیا؟“

بی بی جان جو سب کا دھیان رکھ رہی تھیں، حورین کو دیکھ کر بولیں۔

”بی بی جان! میں نے بہت سارا کھایا ہے“۔ وہ مسکرا کر بولی۔

”دو بیج پنے کی چاٹ اور دو پھنگلی وہی بڑوں سے تمہارا پیٹ بھر گیا؟ لڑکی! یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ یہ ڈائٹنگ، دائٹنگ میں لڑکیوں کو کرنے نہیں دیتی، یہی تو عمر ہے کھانے پینے کی“۔ وہ اس کی پلیٹ میں چکن رول، وہی ٹیل اینڈ ایک سینڈوچز رکھتے ہوئے بولیں۔ حورین جو اسپاکی اور آٹلی غذا کی عادی نہ تھی، پھر بی بی جان کی بے انتہا محبت و اہمیت سے متاثر تھی۔ سمجھ نہیں پاری تھی کہ کس طرح ان کا دل بھی رکھے اور اس فوڈ سے بھی بچ جائے۔

”کھاؤ بیچے! یہی کھانے کے دن ہیں۔ دیر سے بھی مجھے سوکھی سڑی سی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ مومے اس فیشن کو آگ لگے جس نے بیجے اور بیجیوں کو بی بی کے مریضوں کی طرح سوکھا کر دیا ہے“۔ وہ اس کی نفل سائز ڈش میں سموسوں اور ڈشس کا اضافہ کر کے بڑے پیار سے سرزنش کرتے ہوئے بولیں اور پلیٹ پکڑ کر دوسری طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

”گھبرائے گھبرائے سے میرے سر کا نظر آتے ہیں“۔ اس کے قریب بیٹھا ہریرہ مسکراتے لہجے میں اس کی جانب معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہریرہ پلیز ہیلپ می!“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ہوں..... ایک شرط پر“۔ وہ اس کے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔

”ذلیل، مرد کو نہیں ڈوب کر“۔

”تمہاری آنکھوں سے گہرے بھی کوئی ساگر ہو سکتے ہیں، ڈوبنے کے لیے“۔

”سر محفل کا نا پھوسی نہیں چلے گی“۔ رؤف نے احتجاج کیا۔

”یہ چیٹنگ ہے“۔ سفیان نے احساس دلایا۔

ان سب کے لہجے سرگوشیوں سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ وجہ بی بی جان کا فوجی ڈسپلن تھا جس کی پاسداری ہر چھوٹے بڑے پر لازم تھی۔

”یہاں آئے ابھی چوبیس گھنٹے نہیں ہوئے اور ”ظالم سماج“ کی دیواریں راستے میں حائل بھی ہونے لگیں، اسی لیے منع کر رہا تھا یہاں آنے کو“۔ ہریرہ کے اعزاز میں ان سب کی دبی دبی ہنسی نے بی بی جان کو ان کی طرف متوجہ کیا جن کو متوجہ ہوتے دیکھ کر وہ سب جلدی جلدی اپنی پلیٹوں پر جھک گئے۔ حورین نے بھی گڑبڑا کر سموسہ ہاتھ میں اٹھالیا۔

☆.....☆.....☆

فاقہ اور منال ابھی پارٹی سے آکر بیٹھی تھیں، حسب معمول منال کے خسن کو سراہا گیا تھا۔ دو جوان بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود اس کی رعنائی و دل کشی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ایسے ستائشی و توصیفی جملے سننے اور نگاہوں کی داد لینے کی عادی ہو چکی تھی مگر آج وہ کچھ مضطرب و افسردہ سی لگ رہی تھی۔ فاقہ، بیٹی کی خاموشی و اضطراب پر نگاہ رکھے ہوئے تھیں۔ پارٹی میں وہ اس کی بے چینی نوٹ کرتی رہی تھیں، مگر آکر وہ پوری طرح اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

جس بے دلی سے منال نے پرس پھیلا، سینڈل سے پاؤں آزاد کیے اور بے جان انداز میں صوفے پر گرنے کے انداز میں نیم دراز ہوئی تھی۔ وہ فاقہ کو چوکھانے، بلکہ پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

”آر پرومات؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے استفسار کرنے لگی تھیں۔

”ییس۔ لمبیدہ سے کہہ کر کافی بخوائیں، سر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ روہی کے چمکتے ہوئے ایئر کنڈیشنر سے ہوتے ہوئے بولیں۔

”زیادہ درد ہو رہا ہے تو ڈاکٹر کو فون کر دیتی ہوں۔“

”نو۔ نو۔ نو۔“ معمولی سا درد ہے، کافی سے ٹھیک ہو جائے گا، اگر کبھی ہوا تو بیچن کلرز ہیں میرے پاس وہ لے لوں گی۔“ وہ اب میکس آٹار رہی تھی، پھر اس کے بعد ڈاکٹرنڈ کی انگوٹھیوں کا نمبر آیا تھا۔ ایک ایک کر کے تمام زیورات اس کے جسم سے اتر کر قریب رکھی ٹیبل کے شیشے کی سطح پر جمع ہو گئے تھے۔ آخر میں ریٹ واچ اور برسٹ رکھ کر وہ صوفے پر دراز ہو گئی تھی۔

لمبیدہ کافی لے آئی اور مک انہیں دیئے تھے۔

”لمبیدہ ایہ جیولری، پرس اور سینڈل لے جا کر منال کے بیڈروم میں رکھاؤ۔“ وہگ لیتے ہوئے بولیں۔

”اچھا بیگم صاحبہ! لمبیدہ نے بڑی احتیاط سے سب سامان اٹھایا اور وہاں سے چلی گئی۔ اس کی واپسی تک ان کے درمیان خاموشی رہی تھی۔ وہ صوفے کے پاس منال کے سلپر رکھنے لگی تو وہ گویا ہوئیں۔

”کوئین اور پرس نے ڈنر کیا تھا؟“

”کوئین صاحبہ کسی دوست کے ہاں گئے تھے اور پرس صاحبہ نے منع کر دیا تھا، انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔“

”کھانا نہیں کھایا، کیوں؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”معلوم نہیں جی، میں کھانے کا کہنے لگی تو پوچھنے لگے ٹیبل پر کون کون ہے۔ میں نے کہا آپ کے سوا کوئی نہیں، دونوں بیگم صاحبہ

پارٹی میں گئی ہیں اور کوئین صاحبہ کسی دوست کے ہاں ڈنر کریں گے تو کہنے لگے، مجھے بھوک نہیں ہے، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ لمبیدہ نے پوری بات بتادی اور ان کے اشارے پر باہر چلی گئی۔

”سنا سنا! یہ لڑکا اس طرح ٹیڈ کرتا ہے مجھے۔“

”ٹیڈ نہیں کرتا، بس نیچر ہے اس کی، بلاوجہ ٹینس مت ہوا کرو۔“ وہ کافی پیتے ہوئے لاپرواہی سے گویا تھیں۔

”آپ نہیں سمجھ رہی ہیں ماما، میں جانتی ہوں اسے، قد میں اپنے باپ اور بھائی سے بھی اونچا ہو گیا ہے، مگر انداز ابھی بچکانہ ہی ہے، اس عمر میں نوجوان ایسی کسی بات کی پروا نہیں کرتے لیکن اس کے اندر کا ضدی و خود سرچا ابھی بھی اس طرح توجہ مانگتا ہے۔“ منال کے لہجے میں اضطراب تھا۔

”وہ بچپن سے ہی بہت مختلف مزاج رکھتا ہے، آج کی کی جزییشن کی طرح کوئی فضول یا بانی نہیں ہے اس کی، بہت عقل مند، سادہ اور خود اعتماد ہے۔ میری فرینڈز بہت تعریف کرتی ہیں اس کی۔“

”وہ خود اعتماد نہیں، اُلجھن کا شکار ہے۔ شدید بد اعتمادی ہے اُسے، حمزہ چلے گئے اور اس کا ذمے دار وہ مجھے سمجھتا ہے بلکہ ہر عورت، ہر لڑکی اس کے لیے قابلِ نفرت ہے۔“

”کیوں لوگوں کی باتوں میں آکر اپنا ذہنی سکون تباہ کرتی ہو، لوگ بکو اس بھی تو کرتے ہیں۔“ وہ خانیگ نخیل پر رکھ کر بولیں۔  
 ”سچ ہے جو لوگ بتاتے ہیں پھر کیا ہم گھر میں اور گھر میں ہونے والی پارٹیز میں، اس کا سلوک نہیں دیکھتے۔ اول تو کسی سے لٹنے کو راضی نہیں ہوتا اور اگر راضی ہو بھی جائے تو نگاہ اٹھا کر دیکھنا تو درکنار سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا، پھر جو شخص ماں سے ڈھنگ سے بات نہ کرتا وہ وہ کسی سے کیا اچھا سلوک کرے گا۔“ منال نے چند گھونٹ کافی لے کر نگیل پر رکھ دیا تھا۔

”قد بے شک اس کا بڑھ گیا ہے۔ عمر بچپن کی حدود سے نکل آئی ہے، مگر وہ بچپن کے اس لمحے کی قید سے ابھی تک خود کو آزاد نہیں کر پایا، جب اس کا باپ ایک عورت کی چاہ اور دوسری عورت کی مخالفت میں سب رشتے فراموش کر کے گھر سے چلا گیا تھا۔ باپ کا وہ روپ باپ کی وہ نفرت اور خود کو چھوڑ کر جانے والے ان اذیت ناک لمحوں کی قید میں وہ آج تک ہے اور نہ معلوم کب تک رہے گا۔ ایسے میں اسے بھرپور پیار و توجہ کی ضرورت ہے۔“

”جو میں نہیں دے سکتی، کسی مڈل کلاس عورت کی طرح۔ میری اور ذمے داریاں ہیں، مصروفیات ہیں۔ وہ کیوں نہیں سمجھتا یہ سب؟“ وہ جھنجھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ساتھ فائدہ بھی اٹھ گئیں۔

”اوکے، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی ٹینشن لی جائے، ریٹ کرو، میں دیکھتی ہوں پرنس کو۔“ وہ اس کو تسلی دیتے ہوئے پرنس کے پورشن کی طرف آگئیں، مگر وہاں کی تمام لائٹس آف دیکھ کر وہ چند لمحوں کے کھڑی سوچتی رہیں کہ آگے بڑھیں نہ بڑھیں، کیونکہ لائٹس آف ہونے کا مطلب تھا، وہ اب کسی قیمت پر اپنے روم کا دروازہ نہیں کھولے گا، خواہ کچھ بھی ہو جائے، وہ خاموشی سے پلٹ آئیں۔

☆.....☆.....☆

”یہ تمہو بڑا کیوں سو جا ہوا ہے تمہارا؟ مسکراہٹ کہیں گروئی رکھ دی ہے؟“ حورین نے ہریرہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”حقیقت نہ پوچھ میرے فسانے کی

تیرے جاتے ہی بدل گئی نظر زمانے کی

لوگ پوچھتے ہیں میں خوش کیوں نہیں  
کیوں کہوں میری عادت تھی تیرے سگ مسکرانے کی۔ وہ ایک ادا سے بولا  
”جو اس کرتے کرتے مر جانا، مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے کا۔“

”دو قدم ساتھ تو چلو میرے ساتھ اس راہ پر

عمر بھر کا نہ بنا لیا تو کہنا

محبت تو سبھی کرتے ہیں اس دنیا میں

ہر حال میں بنا لیا تو کہنا

”واہ..... واہ بھئی! کیا زبردست مشاعرہ ہے مگر راز شاد۔“ شریروں کا پورا ٹولہ انٹری دیتا ہوا شور مچا رہا تھا۔

”دہرانے کے جذبے نہیں ہوتے یہ بچو!“ بردباری سے فرمایا گیا۔

”دہرا نہیں کر سکتے دادا جان، تو دہرا دیجئے۔“ واصف کے احترام و سعادت مندی پر لڑکیاں ہنسنے لگیں اور لڑکے مسکرا دیئے تھے۔

”اے یہ دادا کس کو کہا؟“ ہریرہ تڑپ اٹھا۔

”جسہیں!“

”مجھے۔ تو تم کون ہو؟“

”ہم بھی فوج کے دادا، نا نا وغیرہ وغیرہ ہیں۔“ واصف نے چالاکی سے بات سنبھالی۔

”وس! تو بہت غلط آدمی ہے، تیری نانچ ہمیشہ کمزور رہی ہے۔“ سفیان نے اسے دھپ مارتے ہوئے کہا۔

”آدمی؟ یہ آدمی کس کو کہا تو نے؟“ واصف زور سے چیخا۔

”تجھے بھائی!“

”میں..... میں تجھے آدمی نظر آ رہا ہوں؟“

”یارا یہ گدھا ہے تو نے اسے آدمی بنا دیا۔“ ہریرہ نے کہا۔

”میرے بھائی! آہستہ بول۔“ رؤف نے سرگوشی کی۔

”کیوں؟“ ہریرہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”گدھا نہ امان جائے گا۔“ رؤف کی وضاحت نے واصف کے پتھے لگا دیئے، وہ اس کے پیچھے مٹکا تان کر بھاگا، جبکہ ہاتھوں

کے قہقہے وہاں گونج رہے تھے۔ ہریرہ نے اٹھ کر واصف کو پکڑ کر بٹھایا تھا۔

”وس! کا مطلب تھا کہ وہ ابھی لڑکا ہے، آدمی تو پاپا بننے کے بعد کہلاتے ہیں۔“ ہریرہ نے واصف کا ہنرہٹھا کرنا چاہا۔

”دسی تو ابھی بھی ”پاپا“ لگتا ہے۔“ سفیان نے ہنستے ہوئے اس کی اسماٹ نمس پر چوٹ کی اور محفل پھر ایک بار زعفران زار بن گئی۔  
 ”تم تے تو پھر بھی بہتر ہوں، پچھلے ہننے تیار ہو کر یہ ڈیٹ پر جا رہا تھا۔ قہری بیس سوٹ زیب تن کر کے جاتے جاتے بی بی جان سے تعریف سننے کا موڈ ہوا اور پہنچ گیا ان کے پاس۔“ واصف سفیان کی طرف دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا جس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔  
 ”انٹا قاتا دن بی بی جان کا روزہ تھا۔ وہ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھنے کی عادی ہیں اور جس دن ان کا روزہ ہو، اس دن سب لوگ از خود احتیاط کرتے ہیں، ان سے گفتگو کرنے میں اور ہم تو دوری رہتے ہیں کیونکہ روزے میں بی بی جان کا مزاج ”سوائیزے“ پر ہوتا ہے، اگر کسی کو بلاوجہ شامت، بلوانی، دولتوان سے مخاطب ہونا کافی ہوتا ہے۔“

حورین دلچسپی سے دیکھ اور سن رہی تھی۔ لڑکیوں کی دبی دبی کمی کمی جاری تھی۔ سفیان کے چہرے پر کھسیاہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔  
 ”یہ صاحب پہنچ گئے ان کے پاس اور کہنے لگے بی بی جان! کیسا لگ رہا ہوں اس سوٹ میں، سات ہزار کا آج ہی لایا ہوں۔ بی بی جان نے ہاتھ میں پکڑی تیغ ایک طرف رکھی اور ٹینک درست کر کے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور بولیں، نا ہنجا رہے مجوزے سات ہزار کو آگ لگا کر آ گیا، یہ کوئی سوٹ ہے پہلے خود کو تو دیکھ، اپنی صحت دیکھی ہے، ایسا لگ رہا ہے جیسے ڈنگر پر کپڑے ٹانگ دیئے ہوں، یہ ٹانگیں اور ہاتھ دیکھ، گویا بلیاں فٹ ہوں اور یہ منہ..... منہ دیکھو جیسے سوکھا چھوڑا ہو۔“

”واصف بی بی جان کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ سب ہنس رہے تھے۔ اسی دم جلا کی نگاہ کھڑکی پر پڑی تھی جہاں سے بی بی جان کو جھانکتے دیکھ کر اس کی قہقہے کرتی ہنسی اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اسے خاموش دیکھ کر موٹل اور سنبل کی نگاہوں نے بھی بی بی جان کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اٹھ کر جانا ہی چاہتی تھیں کہ بی بی جان جلدی سے دروازے کی سمت بڑھیں اور دوسرے لمحے وہ کمرے کے اندر تھیں۔ غیر متوقع طور پر انہیں سامنے دیکھ کر لڑکوں کو گویا سانپ سونگھ گیا اور لڑکیاں باسوائے حورین اور ایرج کے کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ سب ہی بوکھلائے، گھبرائے ہوئے تھے۔ کچھ ساعت قبل قبہتوں سے گونجنے والا لاؤنج کیمبر خاموشی کی لپیٹ میں تھا۔

”بی بی جان! آئیں یہاں بیٹھیں۔“ حورین اٹھ کر ان سے مخاطب ہوئیں، جو ڈیز ٹینک کے پیچھے سے سب کو باری باری گھور رہی تھیں۔

”سدا خوش رہو بیٹی! میں یہاں یہ دیکھنے آئی ہوں، میرے بھائیوں کے یہ نا ہنجا رہتے دسپوختیاں کس پر اتنا کھلکھلا رہے ہیں۔ ذرا میں بھی سنوں، کون ان کے مذاق کی زد پر ہے؟“ وہ ان کو گھورتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ان سب نے ہی سکون کی سانس لی کہ وہ کچھ دیر قبل کہی گئی بات نہ سن پائی تھیں ورنہ.....

”ہم اور کسی کا مذاق اڑائیں استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ یہ کس طرح ممکن ہے بی بی جان! کیا آپ کو اپنی تربیت پر مجبور نہیں۔“  
 واصف نے کانوں کو ہاتھوں لگاتے ہوئے بھولین سے کہا۔

”اپنی تربیت پر تو مجبور ہے مگر تمہاری نیت پر نہیں۔ سب جانتی ہوں، جتنا تم زمین کے اوپر ہو اس سے ڈگنا زمین کے نیچے ہو۔“



تمہاری شرارتوں سے تو شیطان بھی پناہ مانگا ہوگا۔ انہوں نے واصف کے دھپ لگائی۔ ”لڑکیو! مجھے میاں کے ہاں دعوت ہے، چل رہی ہو؟“

”بی بی جان! آپ بھول رہی ہیں، آج حورین نے ڈنر میں انوائٹ کیا ہے ہمیں۔“ مول نے تیزی سے یاد دہانی کرائی۔

”ہاں..... ہاں یاد آیا، مجھے بھی کہا تھی بچی نے۔“

”بی بی جان! آپ چلتیں ہمارے ساتھ تو بہت مزہ آتا۔“ حورین نے کہا۔

”ضرور چلتی بیٹی! اگر مجھے میاں کے ہاں جانا اہم نہ ہوتا۔ عام تقریبات میں میں ہانکل نہیں جاتی مگر جہاں کچھ حقے تحائف دینا ہوتا ہے وہاں جانا پڑتا ہے، ورنہ لوگ سوچتے ہیں دینے سے جان چھڑانے کے لیے شرکت نہیں کی۔“ حورین سے بیٹھے لہجے میں بات کر کے لڑکیوں سے مخاطب ہوئیں۔

”ہر وقت ہا، ہی ہی میں وقت ضائع کرتی رہا کرو۔ کوئی ڈھنگ کا کام کرنے کا تو کبھی سوچنا ہی نہیں۔“

”میں کپڑے پر لیس کرنے جا رہی تھی۔“ جیلانے قدم آگے بڑھایا۔

”سب نماز پڑھنے کے بعد جانا اور جلدی لوٹنا، پر یہ مت سوچنا کہ گھر سے نکل گئے تو اب کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔“ ان کا انداز حکمیہ تھا۔

☆.....☆.....☆

”کیا کھاؤ گے؟“ ہنزہ نے مینیج دیکھتے ہوئے ذوالنون سے پوچھا۔

”جو مرضی چاہو، منگواؤ۔“ وہ چیئر پر ڈھیلے انداز میں بیٹھتا ہوا بولا۔

”پھر بھی اپنی اپنی چائس ہوتی ہے کوئی فلوٹ ڈش بتا دو۔“

”کوئی ڈش میری فلوٹ نہیں ہے۔“

”جہاں تک مجھے یاد ہے، تم سی فوڈ بہت شوق سے کھایا کرتے تھے۔“ ہنزہ مینج کارڈ ویز کو پکڑاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”ہاں، وہ پاسٹ تھا، اب پریزنٹ میں نہیں۔“ اس کے انداز میں وہی برللی سنجیدگی و سپاٹ قطعیت تھی جو کسی کو بھی ایک حد سے تجاوز کرنے نہیں دیتی تھی۔ ہنزہ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا۔

”کبھی اپنے اس پہلی خول سے باہر بھی آ جایا کرو یا رہ، یہی ہنسنے اور مسکرانے کے دن ہیں، پھر نہ معلوم زندگی موقع دے نہ دے۔“

”یہ خول میری ذات کا حصہ بن گیا ہے۔ اس سے باہر نکلتا بھی چاہوں تو نہیں نکل پاؤں گا۔“ اس کی خوب صورت و بھاری آواز میں عجیب جاذبیت تھی۔

”تم نکلتا نہیں چاہتے میری جان!“ جواب میں وہ خاموش رہا تھا۔ ویز ٹرائی لے آیا تھا اور بے حد آہستگی سے چیزیں اور کراکری ٹیبل پر سیٹ کر رہا تھا۔ ذوالنون نے وقت گزاری کے لیے ادھر ادھر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وحسی لائٹس، اے سی کولنگ میں دل فریب

خوشبوؤں سے ماحول مہک رہا تھا۔ لائٹ میوزک کے ہمراہ کانٹوں، چھپوں کی ٹھکنے نہیں، انوکھا تاثر پیش کر رہی تھیں، تمام ٹیبلو ریڈورڈ تھیں۔ لوگ کھانے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے، مگر کسی کی آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔ ماحول کا سکون و سکوت اسی طرح قائم تھا۔ ویٹرز بھی وہاں اس طرح آ جا رہے تھے، گویا زمین پر نہیں، پانی پر چل رہے ہوں۔ ان کے دبے دبے قدموں کی چاپ ریڈ کارپٹ ہنسم کر رہا تھا۔

ویٹرز کھانا سرد کر کے چلا گیا تھا۔

انہوں نے کھانا شروع کیا ہی تھا، جب ان سے کچھ فاصلے پر ٹیبل پر بیٹھے ایک نوجوان کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔

”ان حسینوں سے رسم و قاعدوں لگانا

سراسر بھول ہے

جس دن یہ اقرار کرے محبت کا

سمجھ لینا اپریل فول ہے“ بڑے دل چلے انداز میں کہا گیا تھا۔ جواب میں ایک نسوانی قہقہہ اُبھرا تھا۔ ساتھ دھبی آواز میں دوسرے قہقہے بھی۔

چکن فرائیڈ رائس سے چکن ٹیس فوڈک میں پھنسائے منہ کی طرف جانا ڈوالون کا ہاتھ ڈک گیا تھا۔ اس کی نگاہ بے ساختہ سامنے اٹھ گئی تھی۔ سرخ و سیاہ احتجاج کے اسٹاکش سوٹ میں اس کی گلابی مائل سفید رنگت، شرارت سے چمکتی براؤن آنکھیں ان پر سایہ گھن دواز پکوں کا چلن، ستواں ناک، لپ اسٹک سے رنگے سرخ یا توتی لیوں پر سحر انگیز مسکراہٹ اور گالوں میں پڑنے والے گہرے گہرے ڈھیل، وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

کوئی احساس

کوئی جذبہ

دل کی بیخیز زمین میں سر نہ اٹھا سکا تھا، مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ صعب مخالف کی جانب اٹھنے والی اس کی نگاہ فوراً نہ پلٹ سکی تھی۔

”اہم ہوں ہوں، لڑکی خوب صورت ہے نام؟“ سامنے کھانا کھانا ہوا ہنزہ اس کی جانب دیکھتا شوخ و معنی خیز لہجے میں گویا ہوا۔

”وہاٹ! ان سنس، یہ لڑکیاں ہوتی ہی بے وقوف ہیں اور یہ گرل تو ہانگل ہی غیر مہذب ہے۔“ وہ یولا تو ڈونیا بھر کی بے زاری و بے گامگی اس کے لہجے میں در آئی تھی۔ کھانے کے دوران پھر ان کی گفتگو دوسرے موضوع پر چلتی رہی تھی اور برابر کی ٹیبل سے دھیمے دھیمے قہقہوں و چٹکوں کی آوازیں آتی رہی تھیں، پھر وہ متوجہ نہ ہو سکا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ باہر نکل رہے تھے۔ ہنزہ کے چند جاننے والے مل گئے۔ مجبوراً سے انہیں کہنی دینے کے لیے اندر دوبارہ جانا پڑا تھا۔ وہ محضرت کر کے باہر لان میں نکل آیا تھا جہاں آرائشی پودوں کے ساتھ پھولوں کی سیٹنگ بڑی دل کش تھی۔

یہاں لاکنگ کا انتظام بہت نامناسب تھا۔ سرکری کے اکلوتے بلب نے سحر خیز روشنی پھیلا رکھی تھی، وہ وہاں نصب بیچ پر بیٹھ گیا اور آسمان کو دیکھنے لگا۔

آسمان پر چاند اپنی پوری آب و تاب سے لشکرے مار رہا تھا۔ شاید ماہ کا وسط چل رہا تھا جو چاند کی جولانیاں عروج پر تھیں۔ گزرے وقت کے کئی مناظر اس کے ذہن کی اسکرین پر متحرک تھے جن میں وہ اپنے باپا کی اُنٹلی پڑے آگے آگے رواں دواں تھا۔

چاند اور چاندنی رات!

ستاروں بھرا آسمان

گنگنا تیں، پھولوں کے بوجھ سے جھکی شاخیں، معطر فضا، یہ سب باپا کو پسند تھا اور اسے بھی، ایسی ہی ایک رات تھی جب اس نے باپا کو چاند کو سمجھتے پایا تھا اور ان کے سینے پر سر رکھ کر دریافت کیا تھا۔

”باپا! آپ کو مون اچھا لگتا ہے؟“

”ہوں!..... ہاں۔ اچھا لگتا ہے مجھے چاند اور چاند رات۔“

”مجھ سے بھی اچھا؟“ وہ چاند کو گھورتے ہوئے جلیسی لہجے میں بولا۔

”آپ جلیس ہو رہے ہو مون بیٹے؟“ مزہ نے بیٹے کے انداز کو محسوس کر کے مسکرا کر پوچھا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

وہ ہنس پڑا۔

”مون سے بھی کوئی جلیس ہوتا ہے مون سب کا ہے۔“

”میں تو صرف آپ کا ہوں۔“ وہ ایک بار پھر ان سے پلٹا تھا۔

”ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“ مزہ نے اس کے رخسار چومتے ہوئے کہا۔

”پھر مون کو آپ اس طرح مت دیکھا کریں، جس طرح مجھے دیکھتے ہیں۔“

”مون کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اس میں ہمیشہ اپنے اس دوست کا چہرہ نظر آتا ہے جو دور ہو کر بھی ہمارے دل سے قریب ہوتا ہے،

ہماری نگاہوں سے دور نہیں ہوتا۔“ باپ کی کھوئی جھگی سی آواز آج بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی اور اس کے اندر ہل تھل ہونے لگی۔

”باپا! مون اور مون نائٹ آج بھی آپ کی پسند ہے؟ کیا آپ آج بھی اس میں اپنے فریڈز کے چہرے دیکھتے ہیں؟ کیا مون

میں آپ کو میرا چہرہ نظر آتا ہے؟ اس نے بیچ سے سر نکا کرنا بھیس موندنی تھیں۔ وحشتیں، حسرتیں اس کے ارد گرد تھاں ہونے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”مزہ آگیا! آج تم نے حاتم طائی کی روح کو بھی حیران کر ڈالا ہے، اتنی بھاری سخاوت دکھا کر۔“ سفیان اپیل پائی کی ڈش اپنی

جانب کھسکا تا تو سفینی انداز میں گویا ہوا۔

”دعا دو بیٹا! مجھ کو، نہ میں اس سے شرط جیتتا، نہ یہ مزے اڑاتے۔“ ہریرہ نے گرین سلاد بریانی پر ڈالتے ہوئے اترا کر کہا۔  
حورین اور مول ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بے اسرار انداز میں ہنس چڑی تھیں۔

”ارے لڑکیو! اب تو اپنی ہنسی پر قابو کرو، سب مُڑخو کرو دیکھ رہے ہیں۔“ واصف نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”اوکے، تم لوگ کھاؤ، ہم اتنے میں باہر کی سیر کرتے ہیں۔“ حورین اور مول اٹھتے ہوئے بولیں۔ ایرج، بیلا اور زہرا آؤس کریم

کھا رہی تھیں۔

”تم کہاں جا رہی ہو، ابھی ہم بہت کچھ کھائیں گے۔“ ہریرہ نے پھینچا۔

”ہاں ہاں کھاؤ، تمہارا مال ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”کیا..... کیا مطلب؟“ ہریرہ نے پوچھا کر پلیٹ نیچے رکھی۔

”کوئی مطلب نہیں ہے، صی کو میں نے والٹ دے دیا ہے، پل پے کر دے گا۔“

”بٹ میری ہارٹ بیٹ ڈسٹرب ہو رہی ہے۔ مجھے..... مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے..... جیسے وال میں کچھ کالا ہے۔“ وہ کھانا

بھول کر حورین کی جانب دیکھ رہا تھا جو ایک انداز سے مسکرا رہی تھی۔

”یار! کیوں ایسی بات کرتا ہے، جلدی جلدی کھا۔“ سفیان نے نوکا وہ مول کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئی۔ ریٹورنٹ کا وسیع کوریڈو

عبور کرتے ہوئے وہ خوب ہنس رہی تھی۔ آنے والے وقت کا سوچ کر جب ہریرہ کو معلوم ہوا تھا کہ جس فراخ دلی، دریا دلی و سخاوت کے

پچھلے تمام ریکارڈ توڑے گئے ہیں، ان سب کے اخراجات کا منبع ہریرہ کی جیب تھی، جس سے بہت صفائی سے رقم اڑائی گئی تھی اور اس میں یہ

دونوں ہی شریک تھیں۔

”مجھے لگ رہا ہے، ہریرہ کو شک ہو گیا ہے۔“ میڑھیاں اترتے ہوئے مول نے کہا۔

”مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے۔ بہت لومڑ ہے وہ۔“ حورین کے انداز میں لاپرواہی تھی۔ میڑھیاں اترتے ہوئے وہ چونک کر زکی تھی۔

”مول! ہم روٹنگ سائیڈ آگئے ہیں جہاں سے آئے تھے، وہاں لاؤنج اور کوریڈو کے بعد پارکنگ شیڈ تھا مگر یہاں لان ہے۔“

وہ آخری اسٹیپ پر زک گئی تھی جبکہ مول نے گھاس پر قدم رکھ دینے تھے۔

”یہ اسی ریٹورنٹ کا بیک سائیڈ ہے، ہم جب بھی آتے ہیں یہاں واک ضرور کرتے ہیں۔ کم آن، تھوڑی دیر واک کر کے چلتے

ہیں۔“ وہ چہلکتی ہوئی اس طرف آگئیں جہاں ڈوائٹون یادوں کے سطر میں جھوٹا۔

”شش..... وہاں کوئی ہے۔“ مول نے زک کر سرگوشی کی۔

”کہاں؟“ اس نے پوچھا اور پھر مول کے اشارے پر دیکھا۔ وہ کارنر کی بیچ پر ایسی انداز میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

بلو جینز لائٹ بلو اینڈ وائٹ ٹی شرٹ میں اس کی شخصیت نمایاں تھی۔ چاند کی روشنی کا بھرپور ٹکس اس کے چہرے پر تھا۔ جس سے

اس کی سرخ و سپید رنگت و چہرے کے خوب صورت نقوش از حد ماورائی روپ لیے ہوئے تھے۔ سیاہ گھنی مونچھوں نے اس کی وجاہت کو وقار بخشا تھا۔

”کتنا پنڈم ہے، کتنا ڈشنگ، کم از کم میں نے آج سے قبل کسی شخص کو اتنا خوب صورت نہیں دیکھا اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ اس نے میک اپ بھی نہیں کر رکھا جس طرح فلمی ہیروز کرتے ہیں۔“ موہل نے سرگوشی کی۔

”اچھا..... پھر اسے ہائی جیک کر لیتے ہیں۔“ حورین کا لہجہ بلند تھا۔

”ارے اب ایسی بھی بات نہیں، میں ایسے ہی کہہ رہی تھی۔“ موہل ہنسی تھی۔ ان کی آوازوں سے وہ خیالوں سے لوٹ آیا تھا مگر اعزاز نہ بدلا۔

”ارے مجھے کوئی گڑ بولگ رہی ہے، ہماری بالوں کے باوجود اس شخص نے آنکھیں نہیں کھولی ہیں۔“ موہل نے اسے غور سے دیکھا۔

”دیکھو، کہیں مر مر تو نہیں گیا، بیٹھے بیٹھے۔“ وہ دونوں چند قدم آگے بڑھی تھیں اور اس کی چلتی سانسوں کی آمد و رفت انہیں دور سے نظر آگئی تھی۔

”ٹھیک گاؤ! زندہ ہے مگر یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا ہے۔“

”تم کیوں فکر کر رہی ہے۔“ دماغ کروہ آنکھیں بند کرے یا کھولے ہمیں کیا۔ چلو یہاں سے خواہ خواہ ہمہردیاں ضائع کر رہی ہو ایک اجنبی کے لیے۔“

”حورین! اتنی سیلفش مت بنو، اجنبی ہے تو کیا ہوا۔ انسان بھی تو ہے اور بھیہنا اسے کوئی نہ کوئی ایسا شاک لگا ہے جس سے اس بے چارے کی یہ حالت ہو گئی ہے جو ہچکاموں کو چھوڑ کر یہ یہاں خاموشی میں بیٹھا ہے۔ ہوش دجو اس سے بیگانہ ہو کر۔“ اس کا موم جیسا دل کھلنے لگا۔

”اگر بی بی جان کو معلوم ہو گیا کہ تم اس گوشہ تنہائی میں ایک اجنبی شخص کے سامنے کھڑے ہو کر ہمدردیاں بانٹ رہی ہو تو جان سکتی ہو کیا حال ہوگا؟“ حورین کو موہل کی ہمدردانہ طبیعت سے اس وقت اختلاف تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے جانا چاہ رہی تھی۔

ادھر ذوالنون کو اپنی طبیعت پر جبر کرنا بہت بھاری لگ رہا تھا۔ دو لڑکیاں قاصدے پر کھڑیں اس کی ذات کو ڈسکس کر رہی تھیں، جو اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس نے سیدھا بیٹھے ہوئے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

ایک اجنبی نگاہ ان پر ڈالی تھی اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ایکسکیو زی!“ حورین اس سے مخاطب ہوئی مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا تھا۔

”ایکسکیو زی..... ایکسکیو زی مسز! میری بات تو سنیں۔“ حورین اس کے پیچھے تقریباً بھاگی تھی۔

”شٹ آپ، مجھے تم جیسی لڑکی کی بات سننے کا شوق نہیں ہے۔“ اعزاز تھا کہ تلواری، لہجے میں گویا ہزاروں اڑدھوں کا زہر۔ موہل ساکت رہ گئی۔ حورین غم و غصے سے دنگ رہ گئی۔

”مجھ جیسی لڑکی! واہٹ یو مین؟“ اس نے مقابل کی جانب دیکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا جس کی آنکھوں میں سرخ آندھی بھری ہوئی تھی۔ وجہہ چہرے کے عضلات کھینچے ہوئے تھے۔

”حورین! چھوڑو ناں کیوں بات بڑھارہی ہو۔“ شدید غصے کے اثر میں حورین کو احساس نہیں تھا مگر مول اس شخص کے جڑے تیوروں سے بُری طرح خائف ہو چکی تھی۔ وہ اسے پکارتے ہوئے بولی جو اس کی راہ میں حائل تھی۔

”نہیں پہلے انہیں بتانا ہوگا، مجھ جیسی لڑکی کا مطلب۔“ وہ شدید غصے سے بولی۔

اس شخص کو جارحانہ انداز میں اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر مول بدحواس تھی۔

..... ❁ .....  
..... ❁ .....

وہ کوئی جواب دیئے بغیر ہوا کے سرکش جھونکے کی مانند گزر گیا تھا۔

”اوہاؤ! انسان تھا یا کوئی آتش فشاں! تھینکس گا! چلا گیا۔“ اس کے جانے کے بعد مول کی رُک ہوئی سانس بحال ہوئی تو تشکرانہ لہجے میں بولی۔

”آتش فشاں کیوں..... وہ تو بہت ہینڈسوم تھا۔ بہت ڈشنگ، اس جیسا وجہہ مرد تم نے کبھی دیکھا نہ تھا۔“

”دیکھ لی اس کی خوب صورتی کی اصلیت، کتنی بدتمیزی سے پیش آیا تھا وہ۔“ حورین کا موڈ بُری طرح آف تھا۔ مول مارے غصے کے خاموش کھڑی تھی۔

”کچھ لوگوں کی بیوٹی ان کے منہ بند ہونے تک قائم رہتی ہے، منہ کھلتے ہی سب سچائی نظر آ جاتی ہے، پھر وہ شخص کچھ زیادہ ہی بدتمیز و بددماغ تھا۔“

”اب چھوڑو یارا! مجھے نہیں معلوم تھا تم بھی بھول جاؤ اور یہ سوچو، ہریرہ سے اپنی چوری کب تک چھپ سکتی ہے، جب اسے معلوم ہوگا تو.....؟“ اسے فکر لاحق ہوئی۔

”اس کو ہینڈل کرنا میں جانتی ہوں، تم کمرت کرو، چلو چلتے ہیں ان لوگوں نے کھانا کھالیا ہوگا۔“

”کھانا کھالیا ہوگا اور ”میل“ بھی پے کر دیا ہوگا۔“ مول کے شوخی سے کہنے پر وہ ہنستی ہوئی میزھیوں کی طرف بڑھی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو پارٹنر! کیا سوچ رہے ہو، بہت بڑی رہنے لگے ہو، کیا ایکٹیو شیز چل رہی ہیں جن میں بڑی ہو کے بھائی سے ملنے کی فرصت نہیں ہے۔“ وہ میز میں کھڑا ماحول میں اترتی رات کی خاموشی میں گم تھا۔ جب پیچھے سے آکر کونین نے اس کے شانے پر بازو رکھتے ہوئے کہا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”ایسی ایکٹیو شیز ایکٹیو یعنی کوئی نہیں ہے۔“ کونین سے اس کا اندازہ دوستانہ و مہذب تھا۔

”کلاسز تو ابھی آف ہوں گی؟“

”جی..... ٹیکسٹ ویک سے کلاسز لگنے لگیں گی۔“

وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

”نالوشکار پر جا رہے ہیں، کہہ رہے تھے تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیوں؟ شکار پر بہت انجوائے منٹ لیتی ہے۔“

”مجھے معصوم و خوب صورت پرندوں کو مارنے میں کوئی انجوائے منٹ نظر نہیں آتی۔ پرندے فضاؤں میں پرواز کرتے ہی حسین

لگتے ہیں۔“

”ہوں..... بات تو اچھی ہے تمہاری مگر پائی اپنی ہا ہیز ہیں۔“

”دادو کے پاس گئے تھے، بہت یاد کر رہی تھیں آپ کو۔“

”ہاں..... یار! سوچ تو روز رہا ہوں لیکن..... وہ.....“

”مئی کے خوف سے نہیں جا رہے ہیں۔“ وہ اسے جزیرہ دیکھ کر بولا۔

”ہوں..... نہ معلوم مئی کو کیا وہم واندیشے ستائے رکھتے ہیں۔ وہ ہمارا وہاں جانا بالکل پسند نہیں کرتیں۔ خاص طور پر صحرا نکل کی

لڑکیاں انہیں پسند نہیں ہیں۔“

”مئی.....“ مئی کی طرح ہی بے حس و بے درو ہیں۔“

”اؤں ہوں۔ وہ ہماری مئی ہیں۔“ کونین کے لہجے میں سمجھہ تھی۔

”میں نے کب انکار کیا ہے۔“

”تم ماما سے ہمیشہ سے دور رہے ہو، ایک گھر، ایک چھت کے نیچے رہ کر بھی۔“

”ایک گھر میں، ایک چھت کے نیچے رہنا دلوں کو نہیں جوڑتا..... اگر ایسا ہوتا تو ہمارے معاشرے میں بیاد و اعتماد کی مثالی محبت

موجود ہوتی۔ ہم سب کے رشتوں میں بندھ کر وہ اپنائیت و محبت نہیں پاتے جو ہمارا حق ہے۔“

”مئی سے خفا کیوں رہتے ہو، جبکہ وہ تمہاری فگر میں کیا کچھ نہیں کرتیں، کم از کم میں نے کسی ماں کو اتنا پریشان و غم مند نہیں دیکھا۔“

”آپ نے ابھی ماں اور ماں کی امتداد کبھی کہاں ہے۔“ اس نے سوچا۔

”ماما کو مت آپ سیٹ کیا کرو۔ بابا کے جانے کے بعد وہ کتنی تنہا اور دکھی ہو گئی ہیں۔ اب ہم ان کی کیئر نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا؟

پاپا ایک غیر عورت کی خاطر ہمیں، ماما کی سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔“ کونین انسر دگی سے بولا تو ذوالنون کے چہرے پر نفرت و غصے کی سرخی پھیل گئی۔





”آنکھوں آنکھوں میں یہ سب ہو گیا اور معلوم بھی نہیں ہوا۔“

”ڈاکہ دل پر پڑے یا جیب پر، لٹنے کے بعد ہی خبر ہوتی ہے کہ آنکھوں آنکھوں میں یہ کیا ہو گیا۔“ سہو کے کہنے پر قہقہہ پڑا تھا۔

”شٹ آپ، یہاں میرا دل رو رہا ہے اور تم لوگوں کو کسی آری ہے۔“ ہریرہ چیخ کر بولا۔

”اوہ سواری برادر! یہ تاؤ تمہارے نوٹ کیسے تھے؟“

”نوٹ کیسے تھے سے مطلب..... نوٹ نوٹ کی طرح ہی تھے، کاغذ کے اور کیسے نوٹ ہوں گے؟“

”اچھا اچھا میں سمجھا آپ نے کوئی آپٹیکل نوٹ بنوائے ہیں۔“

”پلیز! معاملہ سنگین ہے، اس لیے سنجیدگی اختیار کی جائے۔“

”مجھے معاملہ ممکن نظر آ رہا ہے، ہریرہ کی شکل دیکھ کر۔“ سہو نے کہا اور وہ بے وقوفیہ پھرا بھرے۔ ہریرہ کے گھورنے پر وہ ایک

دم چپ ہو گئے۔

”سوال! تم بتاؤ تم نے ہریرہ کے دس ہزار روپے تو کہیں نہیں دیکھے؟“ سہو جو پہلے ہی بوکھلائی ہوئی تھی گھبرا کر بولی۔

”ناں..... نہیں، میں نے اور حور نے ہریرہ کی جیب سے دس ہزار روپے نہیں نکالے..... بل..... بلکہ دیکھے ہی نہیں۔“ بوکھلاہٹ

میں وہ سچائی اُگل بھی تھی۔ سب کی تجسس نظریں حورین کی طرف تھیں۔

”اس کو کہتے ہیں بے وقوف کی دوستی سے عقل مند دشمن کی دشمنی بہتر ہے۔“ واصف عرف وصی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”آہ! اس کا مطلب ہے وہ دس ہزار روپے تم نے اڑائے میری جیب سے؟“ ہریرہ ڈھکی ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

”مار ڈالوں گا تمہیں۔ جب ہی میری پمشی حس کل بار بار اشارہ ہو رہی تھی کہ کچھ گڑبڑ ہے مگر میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کہاں ہیں

میرے روپے، شرافت سے تاؤ؟“

”وہ حورین کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا، جبکہ وہ آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب کسک رہی تھی۔“

”ختم ہو گئے۔“

”وہاٹ..... کیسے اور کہاں؟“ وہ پوری شدت سے چیخا۔

”کل..... پارٹی انہی روپوں کی تھی۔“

”اب تم میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکتیں۔“ وہ اس کی طرف بڑھا تھا اور حورین تیزی سے باہر بھاگ لی تھی، ہریرہ اس کے پیچھے

بھاگا تھا۔ ابھی وہ کوریڈور سے نکلے ہی تھے کہ بی بی جان کمرے سے نکل آئی تھیں، وہ دونوں وہیں رُک گئے۔ بی بی جان نے باری باری

دونوں کو گھورا۔

”یہ کس خوشی میں کد کڑے لگائے جا رہے ہیں؟“

”بی بی جان! یہ ہریرہ.....“

”سوری بی بی جان! میں ایسے ہی.....“

بی بی جان کی خشکیں نکلیں ہریرہ کو بدحواس کر گئی تھیں اور اسے معلوم تھا کہ اگر انہیں اصل بات معلوم ہو گئی تو انہا سے ہی ڈانٹ پڑے گی کہ مرد ہو کے لڑکی کے آسرے پر کھانے جاتے ہو۔

”میں ایسے ہی..... یہ کیا ہوتا ہے؟..... ہیں؟ غضب خدا کا پورا گھرا کر رکھ دیا۔“ وہ ناک پر پھسلتی بینک کے پیچھے سے گھور کر بولیں۔

”بی بی جان! غلطی میری تھی۔“ ہریرہ کے منت مبرے اشارے پر حورین سنجیدگی سے بولی تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ در آئی۔

”تم تو بہت لائق بچی ہو، اس گھر کی لڑکیوں سے زیادہ سمجھ دار اور قابل، یقیناً غلطی اس نالائق کی ہی ہوگی۔ چلو جاؤ آئندہ کوئی ایسی نالائق دیکھی تو بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔“

وہ حورین کے بعد اس سے بولیں تو ہریرہ اسے مُکا دکھانا چلا گیا۔

”یونیورسٹی کب سے جاؤ گی؟“ وہ اسے ساتھ لے آگے بڑھ گئی تھیں۔

”کل سے جوائن کریں گے۔“

”ٹھیک ہے آج سے دس بجے سب اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے جائیں گے، صبح آٹھ بجے مجھے سب ناشتے کی نھل پر ملنے چاہئیں، نو بجے سب کو روانہ ہو جانا ہے، سن لو سب جو چاہوں گی طرح کونوں کھدروں میں چھپے ہماری باتیں سن رہے ہو، خوب پیش کر لے بہت ہو ہو..... ہا..... ہی ہی..... ہو گئی، اب سنجیدگی اختیار کرو۔“

نو جوان پارٹی جو ادھر ادھر چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی، بی بی جان کی جہانم یگی پر کھسیا کر رہ گئی۔

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو میرے ساتھ بازار چل سکتی ہو۔“

”تو تھینکس بی بی جان! ممانے پہلے ہی سال بھر کا کوڈ بھردیا ہے۔“

☆.....☆.....☆

وسیع و عریض لان کے وسط میں کرسیوں پر برہان لغاری، فائٹھ اور منال بیٹھے گفتگو میں مگن تھے، درمیان میں رکھی سینئر نھیل چائے اور دیگر لوازمات سے بھری تھی۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے مگن تھے۔

”جی! آپ نے پالیٹکس جوائن کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی، ہمارے پاس اتنا کچھ ہے کہ آنے والی نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں پھر خواہ تو اورد در کریں مول لے رہے ہیں؟“ منال ان سے مخاطب تھی۔

”آپ کے چچا کو ہر اتج میں نئے نئے شوق چڑھتے ہیں۔ اب یہ نیا شوق دیکھیں کیا رنگ دکھاتا ہے۔“ فائٹھ خوش دلی سے بولیں۔

”اگر لائف سے قمرل، ایکسٹنٹ نکال دی جائیں تو زندگی بھر ہو جاتی ہے، جوش و ولولہ انگیزی انسان کو جوان و شاداں رکھتی

ہے، ہر دریا میں ناؤ چلائی ہے، سیاست کے دریا کی بھی سیر کر کے دیکھتے ہیں۔“  
 ”بہت سوچ سمجھ کر اس جانب بڑھئے گا، اس دریا میں ہمیشہ ہی طغیانی رہتی ہے۔ کہیں کنارے پر ہی کشتی سمیت ڈوب جائیں۔“ قائد نے ہنستے ہوئے مشورہ دیا۔

”دریا نیا ہے تو کیا ہوا، ہم تو پرانے تیراک ہیں، کچھ محنت کے بعد منزل تک پہنچ ہی جائیں گے۔“  
 ”پرنس آج کل بہت بڑی ہے۔ ملاقات ہی نہیں ہو رہی ہے کئی دنوں سے۔“  
 ”صبح جلد بیدار ہوں تو مل پائیں گی ان سے یارات ڈنر پر ان دونوں نام ہی آپ دونوں غیر حاضر ہوتی ہیں۔“  
 ”پرنس ایک ایب نارل بچہ ہے پاپا، وہ جان کر ہم سے دور بھاگتا ہے۔ وہ ہمارے درمیان رہنا ہی نہیں چاہتا ہے۔“  
 ”آپ کو تو اس سے ہر وقت شکایت رہتی ہے کبھی یہ جاننے کی بھی کوشش کی کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ کیوں ایسا رویہ ہے اس کا؟“  
 ”مجھے معلوم ہے جو وہ چاہتا ہے۔۔۔۔۔ مگر میں ایسی ماں نہیں بن سکتی جو اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرے، وہ جائے تو دروازے پر اسے خدا حافظ کہے، وہ آئے تو اپنے ہاتھوں سے کھانے بنائے کھائیں، اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرے، وہ جائے تو دروازے پر اسے خدا حافظ کہے، وہ آئے تو اپنے ہاتھوں سے کھانے بنائے کھائیں، اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرے۔“  
 ”ماں کسی بھی طبقے کی ہو، ماں ہوتی ہے لیکن اچھی ماں وہی ہوتی ہے جو آئیڈیل ہو، جو بچوں کے لیے فخر کا باعث ہو، شرمندگی کا نہیں۔“  
 ”آپ نہیں سمجھ سکتے پاپا، اس کی فرسٹریشن، اس کی سائیکالوجی پر اہلیم، یہ سب اسے باپ سے ورثے میں ملا ہے۔“

☆.....☆.....☆

وہ صبح بڑی خوش گوار و خوب صورت تھی۔

گھر کے مرد نماز فجر کے بعد جو گنگ اور نوجوان پارٹی ورزش میں مشغول تھی۔ خواتین نماز و تلاوت قرآن پاک سے فراغت کے بعد کچن کا رخ کر چکی تھیں۔ بیلا جو سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی، ساتھ ہی اس کے فضیلہ پرہمتی تھی، وہ دونوں کالج کے لیے تیار ہونے میں مصروف تھیں، موئل، زدیا اور حورین یونیورسٹی جانے کے لیے لباس منتخب کرنے میں مصروف تھیں جو کھل سے اب تک منتخب نہ ہو رہے تھے، کیونکہ یونیورسٹی میں آج ان کا پہلا دن تھا، وہ چاہتی تھیں اس طرح تیار ہوں جس میں ان کی شخصیت بڑھتا رہے۔

”جلد کپڑے پسند کرو، نام گزرے جا رہا ہے، یونیورسٹی یہاں سے بہت دور ہے اور اگر بی بی جان نے آکر یہاں کپڑوں کے لیے زحیر دیکھ لیے تو سوچ لینا۔۔۔۔۔ صبح ہی صبح خالی پیٹ اتنا کچھ سننے کو ملے گا کہ معدہ برداشت نہیں کر پائے گا۔“ زدیا اُدھر اُدھر بنگرے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں تو اپنے کپڑے ایک ہفتہ قبل ہی منتخب کر چکی ہوں اور اب کپڑے تبدیل کرنے جا رہی ہوں۔ تم دونوں کو ہی نہ معلوم کیا کر رہے ہے۔“ حورین بالوں میں برش کرتی لا پرواہی سے گویا ہوئی۔

”ڈیڑہ! تم یوسیدہ ڈریس بھی زیب تن کرلو تو سب میں منفرد نظر آؤ گی۔ اوپر والے نے بڑی سخاوت سے تمہیں حُسن عطا کیا ہے، مسئلہ تو ہم عام صورت لوگوں کا ہے، خود کو نمایاں کرنے کے لیے اتنی کڑی تنگ و دو کرنی پڑتی ہے۔“ موئل نے کپڑوں کے ڈیزائنرز وار ڈروپ میں ہینگ کرتے ہوئے کہا تو زویا نے تائید میں گردن ہلائی تھی۔

”میری ماما کہتی ہیں، ہم اپنی خوب صورتی سے نہیں اخلاق و کردار سے سراہے جاتے ہیں، اگر ہمارا اخلاق اچھا نہیں ہے، کردار شفاف نہیں ہے تو سب فضول و بے معنی ہے۔“ وہ ہاتھ نکلتے ہوئے بولی۔

”تم لوگ یونیورسٹی جا رہے ہو یا کسی فیشن شو میں؟“ راہ داری سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ کھلے دروازے سے اندر پڑی تو وہ کپڑوں، جیولری، جوتوں اور دوسرے سامان پر نگاہ ڈال کر حیرانگی سے کہنے لگا۔

”یونیورسٹی کیا ایسے ہی سرعہ آزمائش پھاڑ چلتے جاتے ہیں بھی، مانا کہ وہ ایک تعلیمی درس گاہ ہے مگر وہاں لوگ بھی تو ہوں گے جن کے آگے اپنی پوزیشن مضبوط رکھنی ہے۔“ زویا ایک سوٹ اٹھاتے ہوئے بولی۔

”وہ کہتے ہیں ہانفرسٹ امپریشن از دالاسٹ امپریشن۔“ حُسن کی دلدادہ موئل نے بھی شانے اُچکاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

”اوہ..... مجھے تو ابھی پتا چلا، امپریشن اور پوزیشن کا۔“

”پلیز ویسی! جاؤ ابھی دیر ہو رہی ہے، بی بی جان کی آواز آنے والی ہے۔“ دونوں نے اسے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا تھا۔

ہریرہ اور سفیان انہیں یونیورسٹی چھوڑنے آئے تھے۔ اس سے قبل بھی سفیان انہیں کئی بار یونیورسٹی لاجکا تھا اور ان کی فیکلٹی کے علاوہ پیکنگ، کامن روم، کیفے ٹیریا، سیمینار ہال، کنٹینین کے علاوہ فٹ ہال اسٹیڈیم، کرکٹ اسٹیڈیم، ہاکی گراؤنڈ تک ازبر کر دیتے تھے۔

”او کے گرلز! خیال رکھنا پہلا دن ہے، ریٹنگ ہو سکتی ہے۔“ ہریرہ نے انہیں ہوشیار کیا جو کار سے اتر چکی تھیں۔

”ڈونٹ کیئر یار! میں اسی لیے پہلے انہیں یہاں کے چپے چپے سے روشناس کروا چکا ہوں۔ اب ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔“ سفیان نے تسلی آمیز لہجے میں کہا اور خدا حافظ کہہ کر دونوں چلے گئے۔

وہ بہار کے مست جموں کی طرح خراماں خراماں آگے بڑھی تھیں۔ جاڑھ کی نئی قمیص پر سرخ ریشم اور ستاروں کی دیدہ زیب ہلکی سی کڑھائی تھی، شلوار سادہ تھی، دوپٹے کے کناروں پر بھی ایسی ہی کڑھائی تھی۔ دوپٹہ اس نے سینے پر پھیلا یا ہوا تھا۔ بالوں کی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی، ہائیں ہاتھ پر بیگ لٹکائے، دائیں ہاتھ سے سینے پر لگی کتابیں دفاتر پکڑے اس کے چہرے پر دل آویز مسکراہٹ تھی۔ چہرہ اتنی بڑی، اتنی دل آویز آرزو پوری ہونے کی خوشی میں مزید دل کش لگ رہا تھا۔ وہ ہر شے کو بڑی محبت و اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو جھلکانے لگے تھے۔

آج بڑا سہانا دن تھا۔

خوابوں کی تعبیر پانے کا۔

خوابوں کے برآنے کا۔

یہ زمین، یہ شہر، یہ فضا اسے پکارتی تھی، بلاتی تھی، عجیب بات تھی اس شہر میں، وہ پہلی دفعہ آئی تھی مگر اسے کوئی اجنبیت و نا آشنائی محسوس نہ ہوئی تھی بلکہ یہاں آکر اس کے اندر ایک گہرا سکون و طمانیت اور آسودگی چھائی چلی گئی تھی۔

”معلوم نہیں مجھے یہاں آنے سے کیوں روک رہی تھیں؟ یہ شہر، یہ جگہ بہت پُر سکون ہے، یہاں آکر میرے اندر غیر محسوس تبدیلی آئی ہے۔ بہت نئی، بہت اجنبی سی، ایسا لگتا ہے یہاں آنے سے قبل میں ادھوری تھی، یہاں آکر مکمل ہوئی ہوں۔“ وہ بڑبڑاتی تو وہ دونوں متوجہ ہوئیں۔

”خبریت تو ہے ناں..... یہ کیا خود سے باتیں کرنا شروع کر دیں؟“

”میں سوچ رہی تھی، اتنا خوب صورت شہر ہے، اتنے اچھے لوگ ہیں پھر مگر میرے یہاں ایڈمیشن لینے کے خلاف کیوں تھیں؟“

”ہوسکتا ہے وہ تمہیں خود سے دور کرنا نہیں چاہتی ہوں اور اس بہانے سے روک رہی ہوں۔“ موئل نے چلنے ہوئے قیاس آرائی کی۔

”نہیں، ایسی بات ہے کہ یہاں ہمارے شہر میں انس انٹل کے کچھ دشمن ہیں، اس خوف سے وہ پریشان تھیں اور نہیں چاہتی تھی کہ تمہارا ایڈمیشن یہاں ہو، اس لیے پلیز انٹل آنٹی کے نام بتانے سے گریز کرنا۔“ زویا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس پر یقین نہیں۔ میرے پاس بہت نرم دل اور اچھے ہیں۔ کوئی ان کا دشمن کیوں ہوگا؟“ اس موضوع پر وہ پھر اُلجھ گئی تھی۔

”ڈیزا ہمیشہ اچھے لوگوں کے تو دشمن ہوتے ہیں۔ نرے لوگ اچھے لوگوں کی اچھائی برداشت نہیں کر پاتے اور دشمن بن جاتے ہیں۔“ وہ باتیں کرتی ہوئیں اپنے ڈپارٹمنٹ میں پہنچ گئی تھیں۔

کلاس میں اسٹوڈنٹس سے تعارف کے مراحل پر وینس جنٹری کے توسط سے ہوئے۔ پھر سارا دن اسی طرح ادھر ادھر گھومتے پھرتے گزرا تھا۔

”ہیلو! کیا آپ ہم سے دوستی کریں گی؟“ وہ کیفے ٹیریا میں بیٹھی تھیں، جب وہ تین لڑکیاں ان کے پاس آکر کھڑی ہوئیں، ان کے لبوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

”کیوں نہیں، زندگی دوستی کے لیے ہی ہوتی ہے۔“ حورین نے مسکرا کر کہا اور ان لوگوں نے مصافحہ کیا اور بیٹھ گئیں۔

”ہم آپ کی کلاس فیلو ہیں۔ آج لیٹ ہو گئے تھے، اس لیے ہمارا تعارف نہ ہو سکا تھا۔ میں شاہ ہوں، میں ردا ہوں، بہاول پور سے آئی ہوں، اس کی فرسٹ کزن ہوں۔“

”میں شمرین خان اور بیہیں کراچی کی پیداوار ہوں۔“ تینوں لڑکیاں خوش شکل و خوش مزاج تھیں۔ سمو سے کھانے اور چائے پینے کے دوران میں گہری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ وہاں سے آکر گھاس پر بیٹھ گئی تھیں۔

نئی کلاسز کا آغاز تھا۔

خوب گہما گہمی ہر سونپھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ نئے آنے والے اسٹوڈنٹس بہت گھبرائے ہوئے، بولکھلائے ہوئے ہوتے چہروں کے ساتھ الگ ہی نظر آ رہے تھے، جن میں اکثر کسی نہ کسی کی شرارت کا شکار ہو رہے تھے اور فضا مردانہ و زنانہ تہمتوں سے گونج اُٹھتی تھی۔

”حورین! وہی لڑکا..... جو اس دن ریسٹورنٹ میں ملا تھا۔“

مول نے کچھ قاصلے سے گزرتے ذوالنون کی طرف اشارہ کیا جو دوستوں کے ہمراہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھے بنا اس کے چہرے پر وہی ہی ہارعب سنجیدگی تھی جو اس کی شخصیت کو بددعا رہا تھی۔

”ہوں تو ہونے دو، ہمیں کیا؟“ حورین نے اچھٹی سی نگاہیں اس کی طرف دیکھ کر شانے اُچکاتے ہوئے منہ بنا کر کہا، اس کے ہنسنے سے اس کے چہرے پر سرد مہری دور آئی، جو سب نے ہی محسوس کی تھی۔

”اچھا..... یہ وہی بد مزاج واکڑو لڑکا ہے۔“ زویا گردن گھما کر دور جاتے ذوالنون کو دیکھتے ہوئے گویا تھی۔

”ویسے تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شخصیت بہت زبردست ہے اس کی، پھر وہی بات صادق آتی ہے خدا حسن دینا ہے تو نزاکت آتی جاتی ہے اور یہاں حسن کا تعلق زمانہ نہیں مردانہ ہے تو نزاکت کی جگہ بد مزاجی و غرور نے لے لی ہے۔“ زویا اس جانب گردن موڑے برابر ریچرکس پاس کر رہی تھی۔

”گردن ٹوٹ کر گر جائے گی، اگر اسی طرح دیکھتی رہی تو..... باز آ جاؤ ایسا کوئی وہ یوسف جانی نہیں ہے، عام سا انسان ہے۔“

حورین غصے سے بولی۔ وہ اس شخص کے ہاتھوں ہوئی اپنی جگہ دو تین کہی نہیں بھول سکتی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی اسے اس کے لفظ اور نظرت و حقارت میں ڈوبالہجہ بھی یاد آ گیا تھا۔

”تم لوگ پرنس کو جانتے ہو؟“ شہینہ اشتیاق انداز میں گویا ہوئی۔

”نہیں بھئی! ہم کیوں جاننے لگے اس کڑوے کرے کو؟“ حورین نے اس طرح منہ بنا کر کہا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

مول نے ریسٹورنٹ کے پارک والا حصہ بھی سنا ڈالا تھا۔

”وہ ایسا ہی ہے، کسی لڑکی کو خاطر میں نہیں لاتا مگر ہماری جو صنف ہے وہ اس کے ہر ایسے انداز، بات کو اعزاز سمجھ کر قبول کرتی ہے، بہت کریزی ہیں اس کے لیے، اب تم لوگ دیکھنا یہاں کے تماشے۔“

☆.....☆.....☆

صبح ہی صبح بادل خوب ٹوٹ کے بر سے تھے۔

دھلا دھلا یا سبزہ مزید گھبر گیا تھا۔ کرن نے سلپر سے پاؤں آزاد کیے اور بیٹکی بیٹکی گھاس پر نیچے پاؤں ٹپکتے ہوئے ان کے اندر کچھ سکون و ٹھنڈک کا احساس پھیلنے لگا تھا۔ بجز کئی ہوئی سوچیں، سلگتے ہوئے خیالات جو حورین کے جانے کے بعد سے اس کے اندر کھین ہو گئے تھے، کچھ دیر کے لیے ان میں پھواری پڑنے لگی تھی۔

تینوں بچوں نے کال کی تھی۔ بہت خوش تھے۔

ہریرہ نے انجینئرنگ کالج میں ایڈمیشن لیا تھا، اربنچ نے میڈیکل میں اور حورین نے یونیورسٹی جو ان کی تھی جو اس کی خواہش تھی۔ بہت دیر تک ان کے درمیان باتیں ہوتی رہی تھیں۔ حورین کی آواز انہیں سہارا دیتی ہے، نقشی دیتی ہے، بیٹی کی آواز زندہ رہنے کا احساس دلاتی تھی، ورنہ زندگی میں رکھا ہی کیا تھا، ماسوائے ان..... خوف، اندیشوں، دوسروں کے جو کسی سانپ کی مانند ہر وقت ڈستے رہتے تھے۔ اس کی بھرپور محبت بھری رفاقت بھی ان کے اندر کا وہم دور نہ کر سکی تھی۔ ان کا وجدان کہتا تھا حورین کا اس شہر میں جانا ٹھیک نہیں ہے، کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا..... اور ایسی ہی سوچیں انہیں مسلسل پریشان اور ہائی بلڈ پریشر کا مریض بنا چکی تھیں۔ دن میں کئی بار وہ حورین کو فون کرتیں، اس کی پوری روئیں معلوم کرتی کہ وہ کہاں گئی اور کس سے ملی، شرمین، ثناء اور ردا سے دوستی کا سن کر یہی نصیحت کی کہ اپنے متعلق کم سے کم بات کرے اور اس سے زیادہ دوست نہ بنائے۔

”مجھے معلوم تھا آپ یہیں ہوں گی اس لیے چائے یہیں لے آئی۔“ قاریہ چائے کا گام اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ دونوں وہاں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئی تھیں۔

”تھینکس بھابی اشدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی چائے کی۔“

”دل سے دل کو رواد ہوتی ہے کرن! ہم جن سے محبت کرتے ہیں ان کی پسند و ناپسند، خواہشات و ضروریات کا ہمیں از خود ہی ادراک ہو جاتا ہے۔“ قاریہ کے غلوں سے ان کی آنکھیں پھینکنے لگی تھیں۔

”سمجھ میں نہیں آتا، خود کو بد نصیب سمجھوں یا خوش نصیب؟“ انہوں نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے نم لہجے میں کہا۔

”مجھے غیروں نے اپنا بنا یا اور انہوں نے دھکا مارا۔“

”میں ناراض ہو سکتی ہوں۔“ قاریہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”ارے کیوں؟ کیا ہوا؟“ کرن تک ٹھیل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اتنے سال سے ساتھ رہنے اور محبت کے باوجود ہم غیر ہیں ابھی بھی؟“

”اوہ سوری!“ کرن نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے محبت بھرے انداز میں کہا۔

”میرا یہ مقصد ہرگز ہرگز نہیں تھا۔ آپ لوگوں نے تو محبتوں اور بے لوث تعلقات کو زندہ رکھا ہوا ہے، ورنہ یہ قدریں تو ہم اپنے ہاتھوں سے کھو رہے ہیں۔ مجھے تو آپ لوگوں سے ہی محبتیں ملی ہیں۔ آپ میرے لیے اینٹوں سے بڑھ کر سگے ہیں لیکن بات تو وہی آئے گی کہ ناخن خواہ آپ کتنا کاٹ دیں مگر گوشت سے جدا نہیں کر سکتے۔ اسی طرح میری جزیں تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا جو غیروں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا، ہنسیال، دودھیال، ماں کا گھر، باپ کا گھر، کہیں بھی میرے لیے پناہ نہ تھی، رشتوں کا یہ تقاضا تو نہیں ہوتا ناں.....“

”جو یا دیں تکلیف دیں، انہیں بھول جانا اچھا ہے۔ بھول جاؤ سب کچھ۔“

”کاش! بھولنا اتنا آسان ہوتا تو میں کب کی بھول چکی ہوتی“۔ ماضی کی خاک ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھی۔

”پلیز کرن! سنبھالو خود کو، تمہاری دن بہ دن گرتی صحت نے انس بھائی کو بھی آپ سیٹ کر رکھا ہے۔ حورین کی جدائی اور تمہاری طبیعت، حورین میں تو ان کی جان ہے، بڑے حوصلے اور ضبط سے وہ اس کی کمی کو برداشت کر رہے ہیں۔ ادھر تمہاری طبیعت انہیں آپ سیٹ کیے ہوئے ہے۔“

”او کے میں سنبھال لوں گی خود کو۔“

☆.....☆.....☆

حزہ کی تصویر ہاتھ میں تھی۔ اس کا ذہن سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا اور ماضی کے مرفزاروں میں کھو گیا تھا۔ جب اچانک ہی حیدر کی کال نے اسے چونکا دیا تھا۔

”ہی! اس نے اسکرین پر نام دیکھتے ہوئے کہا۔“

”یار! کہاں ہوتی؟“

”گھر پر ہوں، خیریت؟“ حیدر کے لہجے میں کچھ تھا، وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”خیریت نہیں ہے یار بس تم آ جاؤ۔“ حیدر نے اسے ہسپتال کا ایڈریس بتاتے ہوئے تاکید کی۔ موبائل آف کرتے ہوئے اس کے چہرے پر نلکھ رہا تھا۔ اس نے سائیز پر رکھے والٹ، گلاسز اور کی چین اٹھائی اور موبائل شرٹ کی جیب میں رکھا ہی تھا، جب دروازہ ٹاک کرتی مثال اندر آئی تھی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ انہوں نے آتے ہی سوال کیا۔

”حیدر کی طرف۔“

”حیدر سے روز ہی ملتے ہو، آج میرے ساتھ چلو مسز حیدر کے ہاں پارٹی میں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے حکم کی انداز میں بولیں۔

”مما! آپ جانتی ہیں مجھے ان پارٹیز، گید رنگز سے کس قدر الرجی ہے، پھر بھی آپ مجھے اصرار کرتی ہیں۔ سوری میں نہیں جا سکوں گا آپ کے ساتھ۔“ وہ نرم مگر حتمی انداز میں بولا۔

”کیوں آخر..... آپ کو برا کچھ کام سے کیوں الرجی ہے؟ میری تمام فرینڈز کے بچے بہت شوق سے ایسی پارٹیز انجوائے کرتے ہیں پھر آپ کیوں بھاگتے ہیں ایسی گید رنگز سے؟ یہی تو انجوائے منٹ کے دن ہیں۔“ انہوں نے آتے ہی حسب عادت گفتگو شروع کر دی تھی جو اسے ہمیشہ سے ناگوار گزرتی تھی اور اس لمحے جب وہ حیدر کی کال پر فگر مند، جانے کو تیار تھا، ان کی گفتگو اصرار اور خواہش اسے اس وقت بہت بھاری لگ رہی تھی۔

”میں بہت بُرا بیٹا ہوں آپ کا، کبھی آپ کی توقعات پر پورا نہیں اُتر سکوں گا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں پلیز.....“



”اسی طرح جس طرح تمہارا باپ چھوڑ گیا تھا“۔ وہ تپ کر بولیں۔

”مما! پلیز..... بابا کو درمیان میں مت لائیں“۔ اس کی ذمہ داری پر ہاتھ پڑا تو وہ کراہ اٹھا۔

”کیوں بہت تکلیف ہوتی ہے اس شخص کے خلاف سن کر..... جو چھوڑ کر بزدلوں کی طرح بھاگ گیا، جس نے نہ بچوں کا سوچا نہ نوازتے ہیں“۔ وہ سوکھی کٹڑی کی طرح دھڑ دھڑ سلکتی چلی گئی تھیں اور ذوالنون کی رگ رگ میں خون شرارے بن کر دوڑنے لگا تھا۔ اس کے وجہ پر چہرے پر آگے کی مانند سرخی چھا گئی تھی۔ منہ کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا وہ اس وقت۔

”جس طرح تمہارا باپ چھوڑ کر چلا گیا، تم بھی چلے جاؤ، مجھے ضرورت نہیں ہے کسی کی..... میں تمہارے لولوں گی“۔ وہ ہسٹریکل انداز میں چیخنے لگی تھیں، آواز سن کر فائدہ اندر آ گئی تھیں۔

”کیا ہوا منال! کیوں چیخ رہی ہو؟“ وہ دونوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ذوالنون ہونٹ بیچنے کھڑا تھا۔

”مما! آپ ریلیکس ہو جائیں، ایسا کچھ نہیں ہے جو آپ سمجھتی ہیں“۔ منال کے آنسو اس سے برداشت نہیں ہوئے تھے۔

”ہلو دور..... ہاتھ مت لگاؤ مجھے، میں کوئی نہیں ہوں آپ کی“۔ وہ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ جھٹک کر باہر چلی گئیں۔

”پریشان نہ ہو میرے بچے! وہ کچھ دیر بعد اپنا غصہ بھول جائے گی، آپ کہیں جا رہے ہو؟“ منال کے رویے کو نظر انداز کر کے فائدہ جیت بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہوئیں۔

”جی نا تو“۔ وہ مڑی طرح ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

”او کے آپ جاؤ، میں منال کو سمجھا دوں گی“۔ فائدہ اس کی پیشانی چومتی ہوئی گیا ہوئیں تو وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ بہت تیز

ڈرائیونگ کرتا ہسپتال پہنچا تھا جہاں پورا گروپ حاضر تھا۔

”السلام علیکم“۔ وہ دوستوں کو سلام کرتا ہوا سیدھا بیڈ کی طرف آیا تھا جہاں مامون (جس کو سب شرارت سے ماموں پکارتے

تھے) بیڈوں میں جکڑا نیند کے انجکشن کے زیر اثر سو رہا تھا۔ ہائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی اسٹینڈ سے لٹک رہی تھی، اس کے ماتھے پر اور دونوں ہاتھوں پر ڈریسنگ تھی۔

”کیا ہوا..... کیسے ہوا یہ سب؟“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا، ان سب کے چہرے سنجیدہ تھے۔

”ایکیڈنٹ..... روڈ پر گاڑی سلپ ہوئی تھی“۔ مڈر بولا۔

”بائیک سلپ ہونے پر اتنے گہرے زخم نہیں آتے“۔ ذوالنون جانچی لگا ہوں سے بے سادہ پڑے مامون کو دیکھتا ہوا بولا۔

”ہاں یار! ماموں کے ساتھ کوئی اور چکر چلا ہے“۔

”شٹ آپ! ایسے موقع پر تو سنجیدہ ہو جایا کرو“۔ ذوالنون منزل کو غصے سے جھڑک کر بولا تو وہ گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

”کیا چکر ہو سکتا ہے؟“ حیدر نے بڑے سوچ انداز میں کہا۔

”ہوش میں آ کر بتائے گا، کیوں کہ یہ ایسا تھا۔“

”اسے ہوش نہیں آیا ہے؟“ وہ بے حد پریشانی سے بولا۔

”آیا تھا، تکلیف سے بے چین ہو رہا تھا، اس لیے ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن لگایا ہے تب یہ سکون سے سویا ہے۔“

”اوہ۔“ اس نے گہری سانس لے کر کرسی کی بیک سے سر ٹکا دیا۔

”تم لوگ جاؤ اب، رات کو میں یہاں رہوں گا، کل ڈسچارج ہو جائے گا۔“ حیدر جواد، مدثر اور منزل کی طرف دیکھتا ہوا بولا، وہ

کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ مامون کی ڈرپ ٹیم ہو گئی تو نرس بدل کر چلی گئی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے، یہ کس طرح اتنا زخمی ہوا ہے؟“ تنہائی میسر آتے ہی ذوالنون سنجیدگی سے حیدر کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”میں کچھ اندازہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ شاید کوئی حادثہ ہی ہو یا پھر راکٹ گروپ کی کارروائی۔“ حیدر کا انداز متذبذب تھا۔

”یہ ان کی ہی حرکت ہے، مجھے یقین ہے، انہوں نے ہی تار چر کیا ہے۔“ اس کے انداز میں تنہی تھی۔

”اس بار ان کو معاف کرنے والا نہیں ہوں۔“ ذوالنون کے انداز میں ہاتھوں جھنسی گرج تھی، حیدر نے تائید میں گردن ہلانی تھی۔

”تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو، کوئی مسئلہ ہے؟“ حیدر اس کی جانب بخور دیکھتا ہوا استفسار کرنے لگا۔

”نہیں، کچھ نہیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”مجھ سے چھپا رہے ہو، جو تمہاری رگ رگ سے واقف ہے۔“ حیدر سے دوستی بہت پرانی تھی۔ وہ واحد دوست تھا جو اس کے

تمام دکھوں سے، تمام غموں سے مکمل آگاہی رکھتا تھا اور دل و جان سے اس کو چاہتا تھا، خود سے بڑھ کر اس کی پروا کرتا تھا۔

”آئی سے کوئی بات ہوگی۔ یقیناً وہ نرس صاحب کو کسی پارٹی میں لے جانے کے لیے بھند ہوں گی اور ہمارے پرس کے تو کسی

سے مزاج ہی نہیں ملتے، جانے سے منع کر دیا ہوگا۔“ حیدر مسکرا کر بولا۔

”مما جانتی ہیں، مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں پھر بھی.....“

”پھر بھی کیا یارا زندگی بار بار نہیں ملتی، بندے کو اس ایک بار میں ہی اسے ہر موڑ، ہر خوشی، ہر دکھ شیشز کرنے پڑتے ہیں اور یہ دنیا

کا عجیب دستور ہے جو جس سے بھاگتا ہے وہی اس کے آگے آتا ہے جیسے تم پارٹیز سے بھاگتے ہو، ہنگاموں سے دور رہتے ہو، لڑکیوں سے

چڑتے ہو۔“ آخری لفظوں پر وہ خوشی سے ہنس پڑا تھا۔

”اسٹاپ اٹ، ورنہ تمہارے منہ پر یہ شپ لگا دوں گا۔“

”میرے منہ کو تو بخشو، اپنے دل پر شپ لگا رکھی ہے تم نے، یہی کافی ہے۔“

مامون کو ہوش آ گیا تھا، اس نے یہی بتایا تھا کہ ہانگ سلب ہوئی تھی۔

”حیدر! تم اپنی فریض جوں لے آؤ۔“ حیدر چلا گیا تو وہ کہی اس کے بیڑے کے قریب رکھ کر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔  
 ”ایسے..... ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ اس نے نگاہیں جراتے ہوئے کہا۔  
 ”تمہارے چہرے سے وہ سچ کو جتنا چاہتا ہوں جو تم چھپا رہے ہو۔“ اس کے گھمبیر لہجے میں یقین و اعتماد کی صداقت تھی۔  
 ”میں نے کہا ناں بائیگ سلپ.....“

”شٹ آپ، تم نے مجھے اتنا ہی احمق سمجھا ہوا ہے، تم جھوٹ کہو گے اور میں مان جاؤں گا..... کیوں چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس کی سرمئی آنکھوں سے غلطی و برہمی سرخی بن کر چھانے لگی۔ مامون مزید چھپانہ سکا، بول اٹھا۔  
 ”میں لائبریری میں بیٹھا تھا، وہاں پڑھتے پڑھتے ناٹم گزرنے کا احساس نہیں ہوا، تم مجھے میں چلا گیا ہوں، باہر تم میں سے کوئی بھی نہ تھا، میں پارکنگ سے گاڑی نکال رہا تھا جب میں نے راکہ اور اس کے ساتھیوں کو کچھ لڑکیوں کو تنگ کرتے دیکھا.....“  
 ”اور ہیرو بن کر اتنی ماری ہو گی تم نے۔“ اس کا موڈ بگڑ گیا۔  
 ”پھر ان بد معاشوں کو من مانتیاں کرنے دیتا؟ تم ابھی طرح جانتے ہو وہ کس کس کی کٹر کے لوگ ہیں اور کس حد تک جاسکتے ہیں۔“  
 ”وہ لڑکیاں بھی برائے کر یکٹری تو نہ ہوں گی جو ان کو موقع ملا۔“  
 ”سمجھا کرو یا ر! وہ نٹو کر تھیں۔“

”اوکے، اوکے بس اب خاموش ہو جاؤ، ریٹ کرو، خواہ مخواہ اسنے ڈھی ڈھی ہوئے، خون ضائع کیا۔“ اس نے ڈانٹتے ہوئے اسے چپ کیا۔

”یہ کہاں کی شرافت ہے یا ر! تم ہمدردی کرنے کے بجائے ڈانٹ رہے ہو۔“ مامون نے گزور لہجے میں احتجاج کیا۔  
 ”ایسی احمقانہ حرکت پر تمہیں کاغذ سے پرچہ حاکم گھوموں؟“  
 ”تمہیں صرف محبت کی نگاہ سے دیکھو۔“ اس کے انداز پر ڈوا لٹون اسے گھور کر رہ گیا، جواباً اس نے سمجھنے کی اداکاری کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

وہ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے، معالیٰ بی جان کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ان سب کو بریک لگ گیا تھا۔  
 ”اے ہائے..... بڑا غضب ہوا۔“ وہ بیٹھتے ہوئے افسردگی سے گویا ہوئیں۔ وہ پچیس انداز میں ان کی طرف متوجہ ہوئے۔  
 ”کیا اچھے میاں نے چوتھی شادی کر لی؟“ رؤف کو کھد بد ہوئی۔  
 ”شاید اللہ میاں کو پیارے ہو گئے؟“ مسعود نے قیاس کیا۔  
 ”ان کے ایک درجن بچوں اور دو عدد بیویوں کی کفالت کون کرے گا؟“

”خاموش کم بنتو، جب بھی بولنا ہے نکاحی بولنا، اس گھر کی لڑکیاں تو لڑکیاں، موعے لڑکوں کی بھی گز گز بھری زبانیں ہیں، عقل تو بالکل ہی کوری ہے، سوچیں گے، نہ سمجھنے کی زحمت کریں گے۔ فینچی کی طرح کتر کتر زبانیں چلاتے ہیں بس۔“ وہ بیگ کے پیچھے سے سب کو گھورتے ہوئے ڈانٹ رہی تھیں، معاصیرا آئی آ کر پوچھنے لگیں۔

”بی بی جان ارات کے لیے کیا پکاؤں؟“

”میرا کبچہ پکاؤ۔“ وہ ہنسا کر بولیں۔

”وہ تو پہلے ہی جلا ہوا ہے۔“ وصی کی بے ساختہ زبان کھلائی۔

”نمبر ابھی تجھے بتاتی ہوں گئے۔“ وہ چہل پر ادھر ادھر گناہ دوڑاتی ہوئی بولیں۔ چہل وصی پہلے ہی صوفے کے نیچے ٹانگ سے

دھکیل چکا تھا۔

”ان کا مغز نکال کر پکالو، ویسے ہی پڑے پڑے سز جائیں گے۔“ چہل کی تلاش میں ناکامی پر وہ اسے دھموکا جڑتے ہوئے بولیں۔

”اللہ خیر کرے، آج بہت آدم خوردی کی باتیں کر رہی ہیں، کن لوگوں سے مل کر آ رہی ہیں بی بی جان آپ؟“ ہریرہ حیرائی سے گویا تھا۔

”مت پوچھ کن سے مل کر آ رہی ہوں۔“ شخصہ سانس بھر کر توقف کے بعد گویا ہوئیں۔ معاصیرا آئی بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی

تھی۔ معاصیرا، معاصیرا اس گھر کی بہو نہیں تھیں۔ بی بی جان کی چھوٹی بھابھیاں، دونوں سگی بہنیں تھیں۔ اچھی تربیت تھی یا بی بی جان کا بھرپور اختیار،

ان میں دورواجی چٹکلس پیدا نہ کر سکا تھا جو اکثر اس جیٹھانی و دیواری کے رشتوں میں موجود ہوتی ہے۔ دونوں نے بہت تدبیر و اخلاق سے

اپنی ذمے داریاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ بی بی جان کی ہر بات مانتی تھیں۔ بڑا احترام کرتی تھیں۔

ابھی بھی ان کی جھڑک سن کر مسکرا کر ان کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

”اچھے میاں اور پیارے میاں میں زبردست معرکے کے بعد گھر کا ہوا رہ گیا۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا، ان کے ابا، اماں کہاں ہیں؟“ معاصیرا اٹھ سے بولیں۔

”زمین، جائیداد، گھر و سامان کے ساتھ ساتھ اماں ابا کا بھی ہوا رہا ہے۔ ابا میاں اچھے میاں کے ساتھ رہیں گے اور اماں بی

بیارے میاں کے ساتھ، کتنے ڈکھ و تکلیف کا مقام ہے۔ یہ ماں باپ بارہ تیرہ بیچوں کو سنبھالتے ہیں، پرورش کرتے ہیں، دل و جان سے

بیاد کرتے ہیں، رکھتے ہیں اور یہ بیچے ماں باپ کو نہیں سنبھال سکتے۔ زندگی میں ہی جدا کر دیتے ہیں۔ نہ معلوم کیا ہو گیا ہے ہم مسلمانوں کو۔

ہم نے اپنی دینی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے، نہ ہمیں حقوق العباد یاد ہیں نہ حقوق اللہ۔ صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ ہمارے

اخلاق، ہمارے کردار، ہمارے کسی بھی اعزاز سے وہ اخلاق و رواداری ظاہر نہیں ہوتی جو غیر مسلموں کو بھی کشاں کشاں کھینچ کر دین اسلام کی

طرف لے آتی تھی۔“ ان کے لہجے میں سچ تھا اس ماحول کا، اس بے لگام تہذیب کا جو اس دور میں پروان چڑھ رہی تھی۔

”بے راہ روی، نفسا نفسی، بد اخلاقی و بد کرداری ہولناک جاہی کی طرح ہمارے لوگوں میں رچ بس رہی ہے۔ گناہ کو گناہ سمجھنا

چھوڑ کر اپنا لیا جاتا ہے تو پھر تباہیاں و بربادیاں مقدر بنتی ہیں۔“

”اوپر والا سب کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین) آپ ان کو یہاں لے آئیں۔ ہمارے گھر میں کوئی بزرگ نہیں ہیں۔ ان کے آنے سے ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جائے گی۔ بزرگ تو گھر کی شان و رحمت ہوتے ہیں۔“

جمیرا کے لہجے میں ان ماں باپ کے لیے دکھ تھا جو آج اپنی اولاد پر بوجھ بن گئے تھے۔ سب افسردہ ہو گئے تھے۔

”میں نے بہت ضد کی ساتھ لانے کے لیے مگر وہ کچھ اس طرح بکھرے ہیں کہ سنبھل نہیں پارہے ہیں۔“

”جس گھر میں غلط قسم کی بہو نہیں آجاتی ہیں، وہاں پھر ایسا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ ایسے عاقبت نااندیش لوگ دنیا و آخرت دونوں تباہ کر دیتے ہیں۔“

”اولاد، اولاد، کیا کچھ جن نہیں کرتا انسان اولاد کے لیے اور پھر صلہ ملتا ہے نیک اولاد بڑھا پنے کی لاشی ہوتی ہے، اگر اس میں دیکھ لگ جائے تو سب فضول و بکواس ہے، ایسی اولاد سے بے اولاد ہونا اچھا ہے۔“

بی بی جان از حد دل برداشتہ تھیں۔

☆.....☆.....☆

کوئین نے صدمہ چاچو کے گھر میں پھیلے خانے و خاموشی سے انداز لگایا کہ گھر میں صرف دادو ہوں گی یا کوئی ایک ان کے پاس زکا ہوا ہوگا اور وہ ذات یقیناً حضرتنی کی ہی ہوگی۔

جیسے نقوش و ستھری رنگت والی حضرتنی شیریں گفتار و ہر ایک سے اپنائیت و احترام سے بات کرنا، جس کی صفت تھی۔ سنجیدہ کول احساسات والی۔

”السلام علیکم!“ ملازمہ نے اسے دیکھ کر سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام! سب لوگ کہاں ہیں؟“

”سب گھر والے شادی میں گئے ہوئے ہیں۔“

”گھر میں کوئی نہیں ہے؟“ وہ چونک کر بولا۔

”وادی ہیں اور حضرتنی بی بی ہیں۔“

”جھینکس گاڈا“ وہ سرور سا اندر بڑھا۔ دادو کے کمرے میں گیا تو وہ سو رہی تھیں۔ وہ واپس پلٹا تو حضرتنی ادھر آ رہی تھی۔ ملازمہ

نے اسے بتا دیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ وہ جواب دیتا ہوا اس کے ساتھ لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔

”تم نہیں گئیں شادی میں؟“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

”نہیں، موڈ نہیں تھا، پھر دادو کو تنہا نہیں چھوڑتے۔“ وہ بھی جیسے پریشان تھی۔ پنک اور لائٹ بلور ٹیڈ سوٹ میں وہ فریش لگ رہی تھی۔

”دادو اس نام کیوں سو رہی ہیں، طبیعت ٹھیک ہے؟“

”طبیعت بہتر ہے، ساری ساری رات عبادت کرتی ہیں، پھر دن میں بھی وہ آرام نہیں کرتیں، کبھی کبھی اس طرح سو جاتی ہیں۔“  
 ”ہاؤس جاب مکمل ہونے والا ہے تمہارا، اس کے بعد کیا ارادے ہیں؟“

چیکا کا ہسپتال جوائن کروں یا اسپیشلائزیشن کے لیے فارن کنٹری چلی جاؤں، ابھی ڈسائیز نہیں ہے، کیونکہ فیصلہ دادو کو کرنا ہوتا ہے، اس لیے کچھ بھی سوچنا قبل از وقت ہوگا۔ ملازمتنا ٹھیک لے آئی تھی۔ ایک ایک گلاس ان کی طرف بڑھا کر وہ چلی گئی تھی۔

”اگر دادو نے تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ بنا دیا تو.....“ وہ معنی خیز انداز میں اس کی جانب دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”پھر چپ چاپ شادی رچا لوں گی۔“ اس کے صلح چہرے پر پھیلی قوس قزح اسے نہایت دل کش لگی۔

”آپ کھانا کھا کر جائیے گا، میں سامرہ کو پھلکے بنانے کا کہتی ہوں۔“

”بھانگو نہیں، میری بات کا جواب دو پہلے۔“ اسے فرار ہوتے دیکھ کر وہ چپکا۔

”اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔“ اس کی تمام بولڈ نہیں ہوا ہو گئی تھی۔

”ہر بات کا جواب ہوتا ہے، میری بات کا جواب بھی ہے۔ بتاؤ دادو کی پسند کے لڑکے سے شادی کر لو گی تم؟“

”ہاں.....“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”کیوں..... تمہارا کوئی آئیڈیل نہیں ہے؟“ وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا اور دل میں خواہش پھیل رہی تھی۔

شاید وہ ایسی کوئی بات کہہ دے جس سے دل کی ڈولتی کشمی کو سہارا مل جائے۔

”میں آئیڈیلزم پر یقین نہیں رکھتی، ہمیں ملتا وہی ہے جو ہمارے مقدر بنا دیا جاتا ہے، پھر ہم کیوں اپنی آنکھوں کو ان سپنوں کا

عادی بنائیں جن کو تعبیر دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔“ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی وہ بہت کچھ کہہ گئی تھی۔ لمبے بھر کو کونین کی نگاہوں میں

اندھیرا سا چھایا تھا لیکن جلد ہی اس نے بے قرار دل کو اس خیال سے بہلایا کہ وہ ابھی اس کے جذباتوں سے نا آشنا ہے۔ اس لیے عام بات

کہہ رہی ہے۔ یہ بات اس کے لیے نہیں ہے مگر وہ اس امر سے ناواقف تھا کہ صعب نازک کی نگاہیں بے حد ذریعہ اور احساسات بے حد

شارپ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی جانب اٹھنے والی نگاہوں کے منہموم سے فوراً ہی مقابل کے جذبات و احساسات بھانپ جاتی ہیں۔

وہ بھی اس کی بدلتی نگاہوں کے رنگ پہچان گئی تھی، گو کہ کونین کے انداز میں کوئی عامیانا پن نہیں آیا تھا۔ وہ اسے پہلے کی طرح

مخاطب کرتا تھا۔ بات چیت، گفتگو، عزت و احترام ویسا تھا مگر ان سب میں اب ایک رنگ، خوشبو شامل ہو گئی تھی۔ وہ خوشبو تھی چاہت کی۔ وہ

مہک اس تک پہنچ چکی تھی اور قبل اس کے کہ وہ ہنس پھیلنے لگے۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے اس تک وہ بات پہنچا دی تھی۔

”شاید دادو جاگ گئی ہیں، میں ان کے پاس جا رہا ہوں، اس ٹاپک پر ہم پھر بات کریں گے، کیونکہ مجھے لگ رہا ہے، تم مجھ سے

کچھ چھپا رہی ہو۔“

وہ کہتا ہوا اٹھ گیا اور خسرئی اس کی پشت گھور کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

آنکھوں کو کھول کر استعمال کرنے کی عادت ڈالو، دن گزر چکا، رات ہونے والی ہے۔“ حورین نے قریب کمرے پر رو سے کہا۔  
 ”یہ عادت تمہاری خراب ہے۔ بات سمجھتی نہیں ہو اور شروع ہو جاتی ہو۔“

”بات بھی تو وہ کیا کرو جو سمجھ میں آئے۔“

”اب تم میں سمجھ کی کمی ہے تو پھر میرا کیا قصور؟“ وہ شوخ ہوا۔

”ہریرہ پلیز! میں بکواس سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”پھر کس کا موڈ ہے۔“ اس نے جھک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر چونک کر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”ارے..... تم تو کافی سنجیدہ، رنجیدہ وغیرہ وغیرہ لگ رہی ہو، کیا ہوا روئی صورت کیوں بنا رکھی ہے؟“

”مئی بہت یاد آ رہی ہیں۔“

”اتنا عرصہ تو نہیں ہوا، ہمیں یہاں آئے ہوئے۔“

”یاد نا تم سے جڑی تو خدھی ہوتی ہے۔“ وہ بہت ادا سنبھی۔ انس برنس کے سلسلے میں ناروے روانہ ہوئے تھے اور کل اس سے ملنے

ہوئے گئے تھے۔ کل کے علاوہ بھی وہ اس سے ملنے آتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی سیل فون کے ذریعے وہ ان سے رابطے میں رہتی تھی۔

انس سے اس کی بے تکلفی و محبت حد سے سواتھی۔ ان کے درمیان باپ بیٹی والا محبت و احترام کا رشتہ بھی تھا تو دوستی بھی تھی۔ باپ

کی طرح وہ ماں سے اتنی قریب نہ ہو سکی تھی۔ کرن نے انس کے بے حد لاڈ پیار کے مقابل اپنے مزاج میں کچھ سختی و تکلف رکھا تھا، تاکہ وہ

ماں اور باپ کو ہم مزاج سمجھ کر ان حد و حدود سے باہر نہ نکلے جو ایک لڑکی ہونے کے ناتے اس کے لیے ضروری تھیں۔

ان کی اسی حکمت عملی کے باعث وہ نارمل تھی، ورنہ جن بچوں کو اتنی مودل سپورٹ، آرام و زندگی کے ساتھ ساتھ بے حد پیار و

محبت بھی مل جائے تو وہ اخلاقی اعتبار سے تباہ ہو جاتے ہیں۔

”ٹھیک بات کہی ہے تم نے۔ لوگندھا حاضر ہے۔“ وہ قریب ہو کر بایاں شانہ اس کی طرف کرتا ہوا بولا۔

”ہٹو۔ کیا کر رہے ہو؟“ حورین نے گھور کر کہا۔

”گندھا حاضر ہے..... یارا جب کوئی روتا ہے تو گندھے کی تلاش ہوتی ہے، اس لیے آفر کر رہا ہوں۔ میرے شانے پر سر رکھ کر

روؤ، تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔“ اس نے مصومیت سے وضاحت کی۔

”جسمیں یہ خوش فہمی کیوں ہو گئی کہ میں تمہارے اس بد بودار گندھے پر سر رکھ کر روؤں گی؟“ وہ اُداسی بھول کر بھڑک اُٹھی۔

”میں نے تو یہی دیکھا ہے۔“ وہ مسکراہٹ ضبط کرتا گویا ہوا۔

”کیا دیکھا؟“ وہ کمرے میں ہاتھ رکھ کر غرائی۔

”محبوب! اپنے محبوب کے گندھے پر ہی سر رکھ کر روتی ہے۔“

”اپنی بجواس بند کرو، ورنہ.....“

”ورنہ.....؟“ اس نے دوڑتے ہوئے کہا۔

”تمہیں جان سے ماروں گی۔“

”بس کیا نہیں تک تھا ہمارا ساتھ

انتظار ہی کرتے رہے ہم تمہارا

کب ہوگی اس کم بخت دل میں روشنی

اور کب ہوگا پیار کا انتہا تمہارا؟“

”سودھ جاؤ ورنہ اسی حسرت میں مر جاؤ گے تم۔“

”چند گھر سکتا ہے درخت نہیں

سورج ڈوب سکتا ہے آسمان نہیں

دھری سوکھ سکتی ہے پرور یا نہیں

”ڈنیا سودھ سکتی ہے مگر ہریرہ نہیں۔“

سودھنے وہاں آتے ہی ہانک لگائی تھی۔

”کبھی بھی سکون سے رہنے مت دینا، مجال ہے کبھی پرانی یومی نصیب ہو جائے اس گھر میں آکر۔“ ہریرہ نے دھائی دی۔

”یار! بھائی سے بھائی کا کیا راز۔“

”بھائی! ابھی ڈسٹرب مت کر، ٹو جا ابھی۔“

”کیوں جاؤں؟“

”بس جا رہی ہوں، تم دونوں بیٹیں بیٹھ جاؤ۔“ حورین ان کی بک بک سے ٹھک آ کر قدم آگے بڑھانے لگی تو سودھ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھپی لہجے میں کہا۔

”پلیز ناراض ہو کر مت جاؤ، میں بھی ہریرہ کی طرح تمہارا بھائی ہوں۔“ کہہ کر وہ ڈکا نہیں تھا سیدھا اندر بھاگا تھا اور اس کے پیچھے ہریرہ ڈکا تان کر حورین مسکراتی ہوئی چھپ آگئی جہاں ایرج، زویا، مولیٰ بیٹھیں فیشن میگزینز دیکھ رہی تھیں۔

”سودھ اور ہریرہ کیوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے ہیں؟“ ایرج کٹن اس کی جانب بڑھاتے ہوئے استفسار کرنے لگی۔

”دونوں میں بحث ہو رہی ہے۔“

”کس بات پر؟“



”سود کہتا ہے، یہ میری بہن ہے اور ہر یہ کہتا ہے میری“۔ وہ تینوں کلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ ساتھ اس نے بھی دیا۔

”ارے۔ یہ گھر کوسر پر کس نے اٹھا رکھا ہے؟“ کمرے سے بی بی جان کی رعب دار آواز ابھری۔

”اوگا ڈا! یہ بی بی جان بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔“ حورین کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

”بی بی جان کے جملوں میں ایسے ہی ناممکنات شامل ہوتے ہیں۔“

اپنی بات کا جواب نہ پا کر بی بی جان کمرے سے نکل آئی تھیں۔ انہوں نے جلدی سے میگزینزیشن کے نیچے دبائے تھے۔

”جواب نہیں دیا میری بات کا؟“ وہ غصے سے گویا ہوئیں۔

”بی بی جان!.....! وہ.....“ سود کا سوٹ گر گیا تھا۔

”سود کا سوٹ گرنے سے ایسی آواز؟“

”وہ سوٹ میں خود بھی تھا۔“ موہل کے جواب کیسے ہی ہوتے تھے، ان تینوں کے چہرے سینے پر جا لگے تھے، ہنسی روکنا محال ہو رہا تھا۔

”ذوب مرو کہیں، اتنی بڑی ہو گئی ہو، بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ کل کوسر مال جاؤ گی تو ہماری تربیت پر اٹھلیاں اٹھوانا۔ لوگ

کیا بولیں گے۔“

”گھر والوں نے ڈھنگ سے جھوٹ بولنا بھی نہیں سکھایا۔“ زویا کی سرگوشی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ان کی دہلی ہنسی عجیب

آوازوں سے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔ انہوں نے منہ پر دوپٹے رکھ لیے۔

”ارے کیا ہو گا تم لڑکیوں کا۔ ذرا موقع ملا نہیں اور شروع ہو گئیں دانت ٹکانے کو اور کوئی کام ہے بھلا اس ہنسی خضبول کے علاوہ؟“

ایک لہا لہا پھر ان کو سننے کو ملا تھا۔

☆.....☆.....☆

”السلام علیکم نانہ.....!“ برہان لغاری نے خوب صورت و گھمبیر آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر تکانہ کی جگہ مسکراہٹ

نے لے لی۔ وہ اٹھے اور بڑے بڑے جوش انداز میں آنے والے ذوالنون کو گلے لگا کر سلام کا جواب دیا۔

”مائی شیر جوان.....! کہاں ہوتے ہو آج کل، آنکھیں ترس جاتی ہیں۔“ وہ محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا تھے۔

سیاہ لیدر کی سینڈل وہائٹ کاٹن کے شلوار سوٹ میں اس کی سرخ و پیدرنگت اور دراز قامت نمایاں تھی۔

”جس طرح ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے، اس طرح ان صاحب کی دوڑ یونیورسٹی یا پھر دوستوں تک ہے۔“ وہاں پہلے سے موجود

کوئین نے اسے دیکھتے ہوئے کہا وہ برہان کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔

”دوست..... یا گرل فرینڈز؟“ برہان لغاری ہنس کر گویا ہوئے۔

”یہ تو آپ کو خود بتائے گا۔“ وہ اس سے لگا ہیں چرا کر شرارت سے بولا۔

”کیوں پرنس! ایسی بات ہے تو شرماؤ مت“۔ پھر سرگوشی کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”تمہاری عمر میں ہماری دوستی لڑکوں سے کم لڑکیوں سے زیادہ تھی..... اور سچ بات ہے جو مزہ گرل فرینڈ شپ.....“  
”اونانو.....! یہ کس قسم کی بات شروع ہوگئی ہے۔“ وہ جھنجھلایا تھا۔

”میری جان.....! اس عمر میں اسی قسم کی مہنگو اچھی لگتی ہے۔“ وہ ترمگ میں تھے، ویسے بھی وہ اپنی مصروف زندگی میں اردگرد سے خاصے بے خبر رہتے تھے۔ منال کی شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے اور ایک عرصے تک بے خبر رہے تھے، پھر رفتہ رفتہ منال سے ان کی ناراضگی دور ہونے لگی تھی۔ اس وقت تک مزہ جاچکا تھا۔ ایک مدت بعد انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ بیٹی اور داماد میں کون ان بن ہوئی ہے مگر منال کا پڑ سکون چہرہ وہ بے لگرا انداز و طرز زندگی انہیں مطمئن کر گئے، نہ انہوں نے جاننے کی سعی کی، نہ انہوں نے بتانے کی، مصروف زندگی نے انہیں فرصت بھی نہ دی تھی جو وہ بچوں کی طرف متوجہ ہوتے، آتے جاتے انہیں پیار کرنا، مہنگے مہنگے گلٹس دینا، یہ ذمہ داری تھی ان کی۔ کونین اپنی بے تکلف عادت کے باعث سب میں گھلنے پلنے کا عادی تھا۔ وہ اکثر ان کے ساتھ تفریحی پروگرامز میں ساتھ ہوتا تھا۔ اس طرح وہ اس سے بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ ذوالنون نے شروع سے اپنے گرد ایک تکلف و اجنبیت کی دیوار قائم رکھی تھی جو آج تک قائم تھی اور وہ نہ چاہنے کے باوجود اس کے مزاج کے مطابق ملتے تھے، سچی آج وہ بات کو اپنے انداز سے کہتے تھے۔

”نانو.....! وہ عمر اس کی نہ معلوم آئے گی بھی یا نہیں؟“

”اس بات کا کیا مطلب ہوا؟“ وہ از حد حیران ہوئے۔

”نانو جان.....! پرنس کو گرلز پسند نہیں ہیں۔“

”ارے ایہ کیا بات ہوئی.....؟“ اب وہ بغور قریب بیٹھے ذوالنون کو ایسی جا مٹتی لگا ہوں سے دیکھ رہے تھے، گویا وہ کوئی عجوبہ ہو۔

”آئی ڈونٹ بلیو۔ یہ آج بڑی آمیزگ بات سنی ہے میں نے۔“

”نانو.....! اب بھی آپ کے انٹیرز ہیں؟“ کونین کو اس کی حالت دیکھ کر بڑا لطف آ رہا تھا۔ سرخ چہرہ، ناگواری کی بے انتہا

قلقین لے کر وہ بڑے ضبط سے بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔“ وہ ہنس کر بولے۔

”نانو.....! میں جارہا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ابھی تو آئے ہو۔“

”مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“

”اوکے، ذرا جلدی جلدی چہرہ دکھا دیا کرو۔“ وہ کونین کی مسکراتی نگاہوں کو اتور کرتا کرے سے باہر نکل آیا۔

☆.....☆.....☆

وہ یونیورسٹی گئیں تو خبر ان کی منتظر تھی۔

ثناء اور ردا کی گاڑی نہیں آئی تھی۔ وہ انتظار میں کھڑی تھیں۔ جب ہی ردا کی گروپ کے کچھ لڑکوں نے آکر ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ جب چھیڑ چھاڑ حد سے بڑھنے لگی تو اندر سے آنے والے ایک لڑکے نے ان لڑکوں کو منع کیا، اسی وقت ان کی گاڑی آگئی، وہ فوراً وہاں سے چلی گئی تھیں۔ گزرتے میں انہوں نے اس کو ان بدتمیز لڑکوں سے ستم کٹھا ہوتے دیکھا تھا۔

”تم بزدل لڑکیو.....! اس طرح کیوں بھاگیں۔ شور کر کے دوسرے اسٹوڈنٹس کو بھی بلا سکتی تھیں اور یہ ردا کی گروپ کیا بلا ہے؟“

زویا نے کہا۔

”پوری جامعہ خالی ہو گئی تھی۔ کچھ اسٹوڈنٹس تھے مگر کسی میں جرأت نہ تھی۔“

”ردا کی گروپ میں کون لوگ ہیں؟“ حورین نے پوچھا۔

”سارے بد معاش لڑکے ہیں، جو نہ پڑھتے ہیں، نہ پڑھنے دیتے ہیں جن کا مشن یہی ہے قلم کی بجائے اسلحہ ہاتھ میں آئے۔

تعلیم کی جگہ فساد و بے باقی ہر جگہ پھیلے، جو اکثر اوقات مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔“

”ایسے لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں، ان کے لیے نو انٹری کا بورڈ ہونا چاہیے۔“

”یہ ایسے ویسے لوگ نہیں ہوتے۔ ان کے پاس یہاں کے بڑے لوگوں سے زیادہ اثر و رسوخ و تعلقات ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی

سیاسی پارٹیوں سے ان کو ہر قسم کی سپورٹ ملتی ہے۔“ ثناء طنزاً ہنس کر بولی۔

”وہ چیپٹر فرسٹ ٹائم میں کلوزڈ ہوا ہے۔ پالیٹکس اور ایجوکیشن!“

”چلو چھوڑو یار! ہمیں اس کا شکر یہ یاد کرنا چاہیے؟ جس نے ہماری مدد کی۔“

”اور نہ معلوم ردا کی فٹنوں سے بچانے کیلئے کسی نے اس کی مدد کی یا نہیں۔“ مول کے اعزاز پر وہ ہنس پڑی تھیں۔

”شرم کرو، جس نے ہیپ کی، اس کی ہی ٹی اڈار ہی ہو۔ وہ ہے کون؟“

”مامون نام ہے اس کا، پرنس کی گید رنگ کا ہے۔“ پورے ڈپارٹمنٹ میں دیکھنے کے باوجود بھی وہ کہیں نہیں ملا، وہ آگے بڑھی تو

کینٹین کے آگے بنے گاؤن میں ڈوائون کو تھاپیٹھے پایا۔ وہ قائل کھولے کچھ نوٹ کر رہا تھا۔

”ان سے معلوم کرو کہ مامون صاحب کہاں ہیں؟“ زویا نے سرگوشی کی۔

”ہمش..... وہ جواب دینا تو درکنار، نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔“ شمرین نے آہستگی سے کہا۔

”اب کوئی مرد ایسا نیک پارسا بھی نہ ہوگا کہ کوئی لڑکی بات کرے اور موصوف جواب نہ دیں۔“ زویا نے منہ بنا کر کہا۔

”وہ ایسا ہی ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔“ شمرین کچھ زیادہ ہی اس سے متاثر نظر آ رہی تھی۔ حورین ہر جوش انداز میں بولی۔

”شرط لگاتی ہو، وہ نگاہ اٹھا کر دیکھے گا؟“

”امپا سبل..... ایسی شرط کیوں لگا رہی ہو جو ہار جاؤ گی۔“

”میں ہارنا نہیں جانتی۔“

”یہ کیا فسول بحث میں پڑ گئی ہو، چھوڑو ناں چلو یہاں سے۔“

”نہیں، اب شرط لگا کر اور جیت کر ہی جاؤں گی۔“

”اوکے، ہم بھی دیکھتے ہیں اس اعتماد کو۔“ وہ متعلق ہو گئی تھیں۔

”ہو گئی شرط؟“ حورین نے شمرین سے کہا۔

”ہاں ہو گئی..... مگر یہ بتاؤ ہارنے کے بعد کیا کرو گی؟“

”جو تم چاہو۔“

”بیز اہٹ لے کر چلو گی۔“

”وائے ناٹ.....“ وہ پلاننگ کے تحت آگے بڑھی تھیں۔ حورین اور زویا پتھر کی بیچ پر بیٹھ گئیں تو شمرین اور شاہ ذوالنون کی جانب

بڑھی تھیں۔

روا اور مول دور رہی، چونکہ کے درخت کے نیچے رک گئی تھیں۔

”ایکسکی زی۔“ شاہ نے اپنی کانچی آواز پر بمشکل قابو پا کر سر جھکائے نوٹ بک پر تیزی سے لکھتے ہوئے ذوالنون کو مخاطب کیا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح بے نیازی کا مظاہرہ کرتا لکھتا رہا۔ شمرین نے قاتمانہ انداز میں کچھ فاصلے پر بیٹھی حورین کی طرف دیکھا تھا جس کے چہرے پر وہی ایسی اطمینان طاری تھا۔ اس نے شاہ کو اشارہ کیا کہ وہ دوبارہ کہے۔

”ایکسکی زی۔ آپ کو معلوم ہے ماموں کہاں ہیں؟“ اعتماد کو بمشکل سنبھال کر شاہ دوبارہ مخاطب ہوئی تھی۔

”آئی ڈونٹ نو۔“ سخت کمر درالجبہ بے اہتنائی سے بھرپور مقابل کو تو جین و تزیل کا شدت سے احساس دلاتا لہجہ اس کا انداز وہی

تھا۔ شمرین و شاہ آگاہ تھیں اس انجام سے مگر پھر بھی ان کے چہروں پر پھلتی خالت صاف محسوس ہو رہی تھی، وہ وہاں سے آگے چلی گئی تھیں۔

”کچھ لوگ خود کو پاپولر کرنے کے لیے بہت پرانے طریقے آزما تے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے سب ان کو دیکھیں، چاہیں، ہر

زبان پر ان کی گفتگو ہو، ہر آنکھ میں ان کا عکس ہو اور خوش قسمتی سے ایسا ہو جائے تو وہ خود کو کوئی بے حد اہم پر سنائی سمجھتے ہیں۔“ حورین نے کچھ

تیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔ آواز صاف ذوالنون کی سمت جاری تھی۔ حورین دیکھ رہی تھی، اس کے قلم کی روانی میں سستی آنے لگی تھی۔

”ایسے لوگ ”اہم“ نہیں ”احق“ ہوتے ہیں جو انسان ہو کر بھی انسانی اپنی کیلنس سے تاملد ہوتے ہیں۔“ ذوالنون نے ایک جھلکے

سے نوٹ بک بند کر کے قلم پاکٹ میں لگایا اور کھڑے ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا جو بظاہر انجان بنی زویا سے باتیں کر رہی تھی۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے، اس کی نگاہوں سے شعلوں کی لپک آ رہی ہے، اس کے ارادے درست نہیں لگ رہے ہیں۔“

زویا کی آواز میں خوف کا عنصر نمایاں تھا۔



حورین کی بے فکری اور زویا کا خوف حد سے سواتھا۔ چند سیکنڈ وہ حورین کی جانب خون خوارنگا ہوں سے دیکھتا رہا، اس پر اس وقت سب کی نگاہیں تھیں، درخت کی اوٹ میں کھڑی مول اور ردا آگے ہل کے پیچھے روپوش شا اور ثمرین اور اس طرف کی تمام کارروائی دیکھ کر آتے ہوئے اس کے دوستوں کی مکمل توجہ اس طرف ہی تھی۔

باقی دوسرے طلبا ماہی باتوں میں مگن ان سے بے خبر تھے۔

”سرفراہان محمود کی کلاس کا نام ہو گیا ہے۔“ زویا نے ایک دم ہی راہ فرار سوچی اور حورین کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگی تھی۔ وہ بھی مزے سے مسکراتی ہوئی چل رہی تھی، اس کے چہرے پر جیت کی خوشی تھی۔ ایک بے حس و بے مروت شخص کو آئینہ دکھانے کی خوشی تھی۔ اس وقت وہ تیزی سے کلاس روم کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔ ثمرین کے علاوہ انہوں نے حیران آمیز مبارک باد دی تھی، شرط چیتنے کی۔

ثمرین کچھ شاکڈ سی تھی۔ اسے قطعی اُمید نہیں تھی کہ وہ شرط پار جائے گی۔ لڑکی کی پرچھائی سے دور بھاگنے والا، نام سے گریزاں کبھی نگاہ نہ اٹھا کر دیکھنے والا ذوالنون عرف پرنس، حورین کی طرف نگاہ اٹھائے گا، نہ صرف نگاہ اٹھائے گا بلکہ..... کئی سیکنڈ تک دیکھے گا۔ خواہ ان نگاہوں میں درد کی..... خشونت..... نفرت و جلال کے رنگ نہ ہوں تھے۔

کسی اور لڑکی کی طرف وہ اس ”جاں ہوا“ سے دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا یا شاید آج سے قبل کسی لڑکی نے اتنی جرأت و بہادری کا مظاہرہ بھی نہ کیا تھا۔ وہ تو اس کی ایک چشم آتش سے پکھل جاتی تھیں، ثمرین خود کو بہلاتی تسلیاں دیتی، ان کے ساتھ چل رہی تھی۔

”کیا ہوا یار.....؟ اس لڑکی کی طرف تم بڑے خطرناک انداز میں دیکھ رہے تھے، کوئی بات ہوئی ہے؟“ ماسون نے استفسار کیا۔

”کون لڑکی؟ میں نہیں جانتا۔“ حسب عادت وہ اپنی وحشت پر قابو پا چکا تھا، چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی سرخی بھی قدرے معمول پر آ چکی تھی۔

”وہ بہت کیوٹ لڑکی ہے، وہاں بیٹھ کر بیٹھی یقیناً تمہیں ہی کچھ کہہ رہی تھی، میں نے سیرھیوں سے اترتے ہوئے خود دیکھا ہے۔“

حیدر بولا۔

”اس مخلوق کا کام ہی بک بک کرتے رہنا ہے، جس کو سننے کی میری عادت نہیں ہے اور رہا سوال خوب صورتی کا، تو تمہیں گدھیاں بھی بڑی خوب صورت لگا کرتی ہیں۔“ وہ ان کے قابو میں آنے والا کہاں تھا۔

”تم جھلانے کی کوشش مت کرو۔“ ذوالنون جواب دیئے بنا آگے بڑھنے لگا۔

”یہ کیا حرکت ہے، تم جواب دیئے بنا آگے جا رہے ہو۔“

”اُن لئے سوالوں کے جواب نہیں ہوتے ہیں۔“ وہ سر جھک کر آگے بڑھتے ہوئے گویا ہوا۔ اس کے ہلڑے تیز دیکھ کر حیدر نے دوستوں کو اشارہ کیا کہ وہ اس موضوع کو بند کر دیں، ورنہ نتیجے میں اس کا موڈ آف ہوگا۔

☆.....☆.....☆

تیری مسکان میری کمزوری ہے

کہنا پڑا، میری مجبوری ہے

تم کیا سمجھتے ہماری مجبوری کو

کیا خاموشی کو زبان دینا ضروری ہے

وہ تینوں بیٹھی شام کو زیب تن کیے جانے والے کپڑوں کو منتخب کر رہی تھیں، جب اندر آتے ہر پرہیزگار نے مسکراتی ہوئی حورین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ معلوم کتنے ناکام شاعر مرے ہوں گے جو ان کا بدل تم نازل ہوئے ہو“۔ حورین اسے گھورتے ہوئے بیڑ بانی، موٹل اور زویا مسکرانے لگی تھیں۔

”میں شاعر تو نہیں

مگر اے حسین جب سے دیکھا میں نے تمہ کو

مجھ کو شاعری آگئی

میں عاشق تو نہیں

مگر اے حسین جب سے دیکھا میں نے تمہ کو

مجھ کو عاشقی آگئی.....“

”فارغ ڈسک، سدر جہاڑ اور مذاستے جوتے لگاؤں گی کہ ساری عاشقی نکل جائے گی“۔ حورین نے غصے سے چیخے ہوئے کہا۔ راہ داری سے گزرتی ہوئی بی بی جان لٹک کر ڈک گئیں۔

لہک لہک کر وہ گارہا تھا، توجہ پوری طرح سے غصے سے سرخ حورین پر تھی جو اس کے اس انداز سے شروع سے ہی بے حد چڑتی تھی۔ اب بھی وہ اسے غصے سے گھور رہی تھی، اسی اثنا میں وہ بے قدموں بی بی جان اندر داخل ہوئی تھیں۔

”اس عمر میں تو ایسا ہوتا ہے، نیند جاتی ہے، چین کھوتا ہے“۔ تینوں لڑکیاں انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں، اسی دم ہر پرہیزگار کو بھی کسی گزبڈ کا احساس ہوا تھا مگر اس کے ہوشیار ہونے تک بی بی جان اس کے سر پر پہنچ چکی تھیں۔

”خوب..... بہت خوب، کیا ہو رہا ہے یہ؟“ اس کی پشت پر ایک دھموکا جڑ کا وہ طنز آگویا ہوئیں۔

”وہ..... وہ بی بی جان، ان کو لعتیں سنار ہاتھا“۔ وہ کمر سہلانا ہوا بڑا کر گویا ہوا۔

”لعتیں سنار ہے تھے.....؟ اچھا ذرا میں بھی سنوں“۔

”وضو کر کے آتا ہوں ابھی“۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

”دیکھو لڑکے! میں جانتی ہوں تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو، سمجھتے ہو مجھ میں عقل نہیں ہے، یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“

”بالکل نہیں بی بی جان، میں بھلا اتنا بدتمیز و غیر مہذب ہو سکتا ہوں، آپ کا احترام و عزت ہم سب ہی دل و جان سے کرتے ہیں۔“

”مجھے لفظوں کے ہیر پھیر میں الجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سنا ہے میں نے، جو تم ابھی فضول گوئی کر رہے تھے۔ ارے اللہ کی مار ہو ایسے نوجوانوں پر جو دل فقیر کے کٹھنوں کی مانند لیے بھرتے ہیں۔ اس دور میں مردانگی کا فقدان ہے۔“ بی بی جان حسب عادت شروع ہو چکی تھی، ہریرہ سرا۔ سنگی کا شکار سمجھ نہیں پارہا تھا، کس طرح گلو خلاصی کروائے۔ وہ تینوں ہنسی ضبط کیے سیدھی سادی بچوں کی طرح گردن جھکائے کھڑی تھیں۔

”قاریہ نے تمہیں بالکل کھلا چھوڑا، یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ بچہ کن میراثوں میں بیٹھنے لگا ہے۔ غضب خدا کا بہنوں کو مشقیہ گانے سنا رہا ہے۔ تو یہ..... تو یہ کیا وقت آ گیا ہے، آنکھوں کا پانی مر گیا۔“

”بی بی جان! اچھے میاں کا فون ہے۔“ واصل نے اطلاع دی۔

”اچھے میاں کا فون؟ تو یہ کیا پلٹ کیسے ہو گئی؟ اچھے میاں کب سے اتنے اچھے ہو گئے کہ فون کریں۔“ حیرانگی در حیرانگی ان کے لہجے میں عیاں تھی۔

”بی بی جان! اچھے میاں فون نہیں کر سکتے؟“ حورین نے پوچھا۔

”بڑا ہی سنجوس کمپی چوس ہے وہ منحوس۔ فون نہیں کرتا، کبھی کوئی کام بھی ہو تو بس کال دیتا ہے، نہ معلوم اتنی دولت کہاں لے کر جائے گا، قبر میں بھرے گا کیا اپنی؟“ وہ اچھے میاں کی شان میں قصدہ گوئی کرتی باہر نکل گئیں۔

”تھینکس یار! تم نے بچا لیا ورنہ..... آج جڑے پھنسنے تھے۔“ ہریرہ واصل کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ٹھکانا انداز میں بولا۔

☆.....☆.....☆

منال نے تیسرے پیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، معافاً نقد بیگم نے ان کا ہاتھ نچیل تک جانے سے قائل ہی اپنے ہاتھ میں تھا حے ہوئے سرزنش کی۔

”بی بی پور سیلٹ۔ سنبھالو خود کو، پہلے ہی آڈٹ ہو رہی ہو۔“

”پلیز ماما مجھے دیں۔“ وہ بیکنے بیکنے خوار آلود لہجے میں گویا تھیں۔

”شٹ آپ، حالت دیکھو اپنی، بچے گھر کسی بھی نام آسکتے ہیں، کیا جواب دو گی ان کو؟ کوئین تو شاید بہل بھی جائے مگر پرس..... اگر اسے معلوم ہو گیا، تم ڈر تک کرتی ہو تو بہت بڑا ہوگا۔“ وہ منال کو زبردستی بیڈ پر لٹائیں پریشان کن لہجے میں گویا ہوئیں۔

”ہونہہ پرس..... پرس..... مجھے پروا نہیں ہے اس کی۔ میں اس کے باپ کی پروا نہیں کرتی تو وہ خود کو کیا سمجھتا ہے۔“ نشہ اس کے حواسوں پر اپنی گرفت حاوی کرنا جا رہا تھا، وہ بے ربط ہو رہی تھی۔

”آواز بند کرو اپنی..... شاید وہ گھر میں موجود ہے۔“

”میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے ماما، جس کو میں دل و جان سے بڑھ کر چاہتی ہوں، وہ ہی مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ مجھے تیرے  
 ناقابل اعتنا سمجھتا ہے۔ میں نے انس سے محبت کی، اس نے مجھے ذلیل کیا، رسوائی و تحقیر سے میرا کردار و شخصیت کربتی کر چکی کر دیا۔ میں نے  
 برداشت کیا۔ حزرہ سے محبت کرنا چاہی، وہ مجھے کبھی نہ ختم ہونے والا احساس کتری و ذلت کی اذیت میں مبتلا کر کے چلا گیا، میں نے پھر بھی  
 صبر کیا۔ اب..... اب میرا..... بیٹا..... میرا خون، جو مجھے خود سے بھی بڑھ کر عزیز ہے، وہ میری پرواہ نہیں کرتا، حزرہ کی جدائی کا مجھے ذمے دار  
 سمجھتا ہے۔ یہ ڈک، یہ ڈک، مجھے اندر ہی اندر مار رہا ہے۔ میں مر رہی ہوں دھیرے دھیرے“۔ ان کی آواز مدہم ہوتے ہوتے بند ہو گئی۔ نشتے  
 کی زیادتی سے لمحوں میں مدہوش ہو گئی تھیں۔ فاکتہ بیگم جو سر ہانے تینیس منال کا سر سہلا رہی تھیں، انہوں نے رضائی منال کو اوڑھائی تھی۔  
 اسے سی کی کولنگ بڑھا کر انہوں نے ڈریک اور لوازمات اٹھا کر وارڈوب کے خفیہ حصے میں ایڈجسٹ کیے تھے، لاک کر کے چابی بھی مخصوص  
 خفیہ ٹھکانے پر رکھی تھی۔ انٹرفیشز کا سپرے کر کے وہ روم کا دروازے بند کر تیں میٹرہیاں اتر رہی تھیں۔

”اوہ ویری امیڈنگ ایونٹ! انانو آپ اس ناٹم گھر پر؟“ رست وایج باندھتا ڈالونون حیرانگی سے گویا ہوا۔

”آج کل آپ کے نانو کے ساتھ پارٹیز میں جانا پڑ رہا ہے، اس لیے ناٹمگ تبدیل کرنی پڑی ہے۔“ وہ اس کے قریب آ کر  
 اپنائیت سے بولیں۔

”آپ کہیں جا رہے ہیں؟“ لائٹ بلو چیئرز اور وائٹ شرٹ میں اس کی شان دار شخصیت و جیہد لگ رہی تھی۔

”نہیں۔ آپ کو کوئی کام ہے؟“

”نہیں آپ جا سکتے ہو.....“ وہ مسکرائیں۔

”ماما بھی گھر پر ہی ہیں؟“ ایک دم اسے کوئی خیال آیا۔

”ہاں..... وہ اپنے روم میں ہیں۔“

”میں مل لوں ان سے.....“ اس نے آگے قدم بڑھائے اور فاکتہ کو یک دم ہی اختلاج قلب نے آن گھیرا، وہ سرعت سے اس  
 کے آگے آگئیں۔

”آپ کی..... ماما..... ہاتھ روم میں ہیں، وہ ہاتھ لینے میں کتنا ناٹم لیتی ہیں، یہ آپ جانتے ہیں ناں۔“ اس کی سوالیہ نگاہوں سے  
 شپٹا کر وہ بولیں۔ ڈالونون کے چہرے سے لمبے بھر کو تذبذب ظاہر ہوا تھا۔

”اوکے، ماما کو کہہ دیجئے گا، میں چلتا ہوں۔“ وہ چلا گیا، فاکتہ بیگم کے چہرے کی آڑی رنگ بحال ہونے لگی تھی۔

منال کی لاپرواہی سے انہیں یہی خدشات لاحق ہونے لگے تھے۔

وہ حیدر کے ساتھ بیزاہٹ آیا تھا۔ حیدر کا ڈنکر کی طرف گیا ہوا تھا۔ اس نے کرسی کی بیک سے سر نکا کر آنگھیں بند کر لی تھیں۔ اس  
 لڑکی نے آج صبح یونیورسٹی میں جو حرکت کی تھی، وہ اسے ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ اتنی بولڈ، اتنی کونفیڈنٹ لڑکی آج سے قبل اس سے نہ نکرائی



تھی۔ اس کی جرأت اسے از حد مشتعل کر چکی تھی۔ وہ جب سے ذہنی خلفشار و انتشار کا شکار تھا، بھلا کسی لڑکی کو کیا حق پہنچتا ہے، اس کی عادت و مزاج پر تنقید کرنے کا؟ وہ جیسا ہے جو بچپن سے لے کر ہی، کسی کو کیا ضرورت پڑی اس پر بیٹھ کرنے کی۔

”مادام! آپ شرط ہاری ہیں، اس لیے عطیہ لینی ہے یہ آپ کی، جو آپ پی پی پی موڈ ہمارے ساتھ شیئر کریں۔“ پیچھے سے کسی لڑکی کی مسکراتی ہوئی آواز آئی تھی۔

”ہم سے کوئی جیت سکا ہے جو یہ صاحبہ جیتیں، کہا بھی تھا شرط مت لگاؤ مگر..... نہیں ان کو یقین تھا ان کا وہ پوز ڈھیر ضرور ان کو جتائے گا۔“ اس کے اندر ایک عجیب سا احساس بجلی کی طرح دوڑا تھا۔ یہ دوسری چبکتی وہ اعتماد آواز دی تھی جس نے اسے صبح سے مضطرب کر رکھا تھا۔ اس آواز کو وہ لاکھوں میں شناخت کر سکتا تھا۔ شاید بات بھی اس کے بارے میں ہو رہی تھی۔ بے ساختہ ہی اس کی ساتھیوں اس جانب مبذول ہو چکی تھیں پھر ”پوز ڈھیر“ کے لقب پر اس کی پیشانی زہ شکن ہو چکی تھی۔

”میں ابھی تک شاکڈ ہوں کہ کس طرح ذوالنون نے تمہاری طرف دیکھ لیا۔ وہ میرا تو کیا نفرت سے کسی کو دیکھنے کا روادار نہیں ہے۔“

”تم لوگ نہیں جانتی ایسے لوگوں کی سائیکالوجی کو، ایسے لوگ جن کو ذرا بھی مظلوم ہو جائے کہ ہمیں لوگ پسند کرتے ہیں، ہماری کچھ ویلیو ہے تو ہمیں یہ اس طرح کے ہنکنڈے آزما تے ہیں، فینس ہونے کے لیے، اپنی ویلیو کو زیادہ پالش کرنے کے لیے اور جہاں معاملہ لڑکیوں کا آجائے تو پھر اسی طرح بے نیازی و لاپرواہی کا مظاہرہ کیے جاتے ہیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کا کریم بنا جائے، لڑکیوں کو پرانا نہ بنایا جائے۔“ لفظ تھے یا لٹا رہے، اس کے اندر گویا آگ بھڑکنے لگی، وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”ہلیو اب ایسے ہی مت کہو، وہ بہت برا میٹ کریکٹر اور شریف انفس ہیں، وہ پوز نہیں کرتے، یہ بجلی وہ لڑکیوں سے دور رہتے ہیں۔“

”ایک دن میں نے تم لوگوں کو ان صاحب کی اصلیت نہ دکھا دی تو کہا، ایسے میرا موقع ملنے ہی زبردین جاتے ہیں۔“ ایک بُرا اعتماد کنک دار منھکڑا ذاتی آواز ابھری اور اسے لگا، اگر وہ یہاں سے فوراً نہ اٹھا تو ضرور کچھ ٹھنڈا کر بیٹھے گا۔

”پہلے دن موصوف کی آنکھیں اٹھوائی ہیں آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا.....“ وہ کسی آتش فشاں کی مانند پھٹ پڑتا، اگر فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر باہر نہ نکل جاتا۔ پیچھے کڑے حیدر نے تمام منھگوں لی تھی۔ وہ خاموشی سے ہاتھ میں پکڑا سامان نیمل پر رکھتے ہوئے اپنی نگاہوں سے برابر کی نیمل کے گرد بیٹھی لڑکیوں کو دیکھنے لگا اور ان کو وہ شناخت کر چکا تھا۔ یہ وہی لڑکیاں تھیں جن کو وہ صبح کینے کے پاس دیکھ چکا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بھاپ اُڑاتے پیزا کو دیکھا، ساتھ سیلز کا پاؤل تھا اور کوئلڈ ڈرنک، جس کے لیے وہ لایا تھا، وہ جاچکا تھا اور وہ جانتا تھا، اب کل سے قبل وہ ذوالنون سے نہیں مل سکے گا۔ غصے میں وہ اپنا روم بند کر کے بیٹھ جاتا ہے، کسی کی ہمت نہیں ہوتی پھر اسے اس کی مرضی کے خلاف باہر لانے کی۔

یہاں کی صورت حال سے بے خبر وہ سب پیزا کھانے کے دوران گپ شپ میں مصروف تھیں۔ وہ بھی بنا کھائے، وہاں سے نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

صدا صاحب، صنوبر بیگم، ہنزہ، معیز، خضرئی، عربیہ اور کونین ابھی کھانے سے فارغ ہوئے تھے۔ عربیہ کونین کی فرمائش پر کولڈ کافین بنا کر لے آئی تھی، سب کو سرو کرنے کے بعد وہیں تک گئی تھی۔

”بھابی صاحبہ! آج کل بہت زیادہ بڑی ہیں، کئی بار فرائی کر رہا ہوں مگر ہر بار سیل فون بڑی مل رہا ہے یا بند ہوتا ہے۔“ صمد نے کونین سے دریافت کیا۔

”آج کل نانو کے ساتھ پارٹیز وغیرہ میں مصروف ہیں، دراصل نانا جان اس پارٹیشن میں حصہ لے رہے ہیں، اس گہما گہمی میں مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔“

”آپ کے نانا کو کس یوگس کھیل میں انٹرسٹ ہے، شاید دنیا کی بدترین سیاست ہمارے ہاں ہوتی ہے جہاں نہایت بے حسی، بے ضمیرگی و بے حسیتی کے کھلے مظاہرے آپ کو نظر آئیں گے۔“ معیز سنجیدگی سے بولا۔

”اپنی اپنی نیچہ ہوتی ہے بیٹا۔ اپنی ویز مجھے بھابی صاحبہ سے ملتا ہے، بلکہ مجی بھی کب سے ملتا چاہ رہی ہیں ان سے۔ ان سے نا تم لے کر انفارم کرنا تا کہ ہنزہ کی شادی کی ڈیٹ فکس کر سکیں۔ ہنزہ کے سسرال والے بار بار کال کر رہے ہیں، ہم اس لیے جواب نہیں دے پا رہے ہیں کہ بھابی سے مشورہ نہیں ہوا ہے۔“ صمد صاحب اٹھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

”جی بہتر انکل! میں کل جواب دیتا ہوں۔“ کونین نے متودب لہجے میں کہا۔ وہ باہر نکلے تو صنوبر بھی ان کے پیچھے چلی گئی تھیں۔

”ہماری ہونے والی بھابی گھر والوں پر یو جھ ہیں جو بار بار فون کر رہے ہیں۔“ بڑوں کے جاتے ہی منزل کی زبان کھلائی تھی۔ وہ ہنزہ کی جانب دیکھ کر بولا۔

”لو کیا یو جھ ہی ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے ماں باپ پر اور شادی کے بعد شوہر کی جیب پر، بھائی ہوشیار ہو جائیں۔“ خضرئی نے سمجھایا۔

”میری بیوی ابھی آئی بھی نہیں اور تم لوگوں نے کان بھر نے شروع کر دیے۔“

”میرے خدا! بھائی یہ آپ کہہ رہے ہیں؟“ عربیہ شدید حیران تھی۔

”بھابی گھر پر آئی بھی نہیں اور آپ بدل گئے۔“ خضرئی پریشان تھی۔

”میں نے کامن بات کی ہے۔ تم لوگ اتنے کنفیوز کیوں ہو گئے۔“ ہنزہ ہونٹوں پر در آنے والی مسکراہٹ چھپا کر پوچھنے لگا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، میں ہنزہ کے ساتھ ہوں۔“ کونین نے ہنزہ کی حمایت میں کہا۔

”ارے..... آپ نے فوراً پارٹی بدل لی؟“ خضرئی نے شانے اچکا کر کہا۔

”سسر! ابھی آپ نے سنا نہیں کونین بھائی کے نانا جان سیاست دان بن گئے ہیں۔ سیاست اب ان کی فیملی ممبر ہے۔ ڈیلی آپ کو اسی طرح موصوف پارٹیز بدلتے نظر آئیں گے۔“ خضر کے کہنے پر ان کے لیوں پر گہری مسکراہٹ در آئی تھی جب کہ کونین جینپ کر رہ گیا تھا۔

”بال کی کمال نکالنا کوئی تم سے نکھے۔ حضرتی میں آپ کے ساتھ ہوں۔ بے فکر ہیں میں ان میں سے نہیں ہوں جو پارٹی بدلتے ہیں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر گویا ہوا تھا گو کاس کے لفظوں کی ادائیگی بہت عام فہم تھی مگر حضرتی اس کی آنکھوں سے لودیتی تھی جون سے بے خبر نہ رہ سکتی تھی جو کچھ عرصے سے وہ اپنے اس خوش مزاج خوش گفتار تازا زاد کی بدلتی نگاہوں میں دیکھ رہی تھی اور خوف زدہ تھی۔

چانتی تھی کہ.....

محبیوں کا موسم

چاہتوں کی رات

آفتوں کی برکھا

کب اس خاندان کو اس آئی ہے؟ محبتوں نے ہمیشہ جدائی کے زہر پینے ہیں۔ چاہتوں کو ہمیشہ تاراج کیا جاتا رہا ہے۔ آفتوں کو ہمیشہ در بدری مقدر ہوئی ہے۔ محبت اس خاندان کے لیے ہمہ وقت رسنے والا ناسور بن کر رہ گئی ہے۔

”میں مذاق کر رہا تھا سویت سسر! تم سچ سمجھ گئیں۔“ اس کی گہری خاموشی کو ہنرہ نے صدمہ سمجھا اور اس کا سراپے سینے سے لگاتا ہوا پیار سے گویا ہوا نہ جانے کس احساس کے تحت وہ بے اختیار رونے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

بی بی جان کا پی پین ہاتھ میں لیے حساب کتاب کرنے میں مصروف تھیں۔ حمیرا لیکن میں رات کے ڈنر کے لیے مصروف تھیں۔ لڑکیاں سب وہیں تھیں۔ کوئی نوٹس بنانے میں مصروف تھی تو کوئی نیٹ کی تیاری میں تھیں۔ بی بی جان ہار ہار تاک پر بھٹنے والی نینک کو درست کرتیں۔ لڑکیوں کی طرف کن اکھیوں سے دیکھتی جا رہی تھیں۔ لڑکیاں اپنا ہوم ورک ان کے سامنے کرتی تھیں۔ لڑکوں کو بھی گاہے بگاہے ان کے سامنے حاضری دینی پڑتی تھی، وہ از حد محتاط طبیعت کی مالک تھیں۔

بی بی جان اولاد کے لیے اس حاورے کی قائل تھیں کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ، دیکھو شیر کی نگاہ سے، سوان کی نگاہیں ہی نہیں، وہ خود بھی ہمہ وقت ان کے درمیان موجود رہتی تھیں اور ان کی کڑی حکمت عملی کے باعث ہی گھر میں موجود نوجوان نسل میں وہ بے باکی و فضولیات سراپت نہ کر سکتی تھیں جو اس عمر میں عموماً نوجوان لڑکے لڑکیوں میں گھر کر جاتی ہیں۔

”حمیرا! ذرا یہاں تو آؤ۔“ وہ کتاب بند کر کے قدرے اونچی آواز میں بولیں۔

”جی بی بی جان!“ حمیرا ان کے قریب بیٹھے ہوئے گویا ہوئیں۔

”اگلے ماہ جشید صاحب اپنی بیٹی نمرہ کی شادی کر رہے ہیں، سوچ رہی ہوں وہاں کیا دینا چاہیے؟ اللہ بخشے مرحوم ابا جان کے بڑے اچھے تعلقات تھے اس فیملی کے ساتھ ان کے والدین کو فوت ہوئے عرصہ بیت گیا مگر آج تک اسی محبت و خلوص سے ملتے ہیں۔“

”جو آپ مناسب سمجھیں بی بی جان۔“ حمیرا سادگی سے گویا ہوئی تھیں۔

”لو..... یہ کیا بات ہوئی؟ میرا دماغ زیادہ فالتو ہے جو میں ہی سوچوں۔“ ان کی طبیعت کچھ کہہ مار کے گدھے جیسی خصلت کی تھی جو

نہ معلوم کب سیدھے چلتے چلتے ایشہ کرکڑا ہو جائے۔ وہ ایک دم ہی نروٹھے پن سے گویا ہوئی تھیں اور ان کے بدلتے تئور دیکھ کر میرا بوکھلاسی گئی تھیں۔ لڑکیوں نے ترچھی لٹکا ہوں سے دیکھا تھا اور ایک دم در آنے والی مسکراہٹ چھپانے کے لیے مزید جھک گئیں۔

”میرا..... یہ مطلب نہیں تھا بی بی جان! آپ بُرا مان گئیں۔“ میرا نے ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنا نیت سے کہا تو وہ غصہ بھول کر مسکرائیں۔

”میں بُرا کیوں مانوں گی۔ یہ تمہارے اور میرا کے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ اب میری انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دو۔ ماشاء اللہ جو ان بچے بچیوں کی مائیں ہو، ان کے رشتوں ناتوں کا بھی سوچنا ہے، پھر جب نئی رشتے دار یاں بنتی ہیں تو لینے دینے کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کب تک مجھ پر چھوڑ کر بیٹھو گی۔ تمہیں ایسے معاملوں سے پنہا آنا چاہیے یہ مقصد ہے میرا۔“

”بی بی جان! اللہ آپ کو سلامت رکھے یہ کام بھی اور وہ کام بھی سب آپ کو ہی کرنے ہیں۔ انشاء اللہ آپ ہی کریں گی۔“ میرا مطمئن تھیں۔

”یہ بھی خوب کہا تم نے مگر میری چند اتنی لمبی زندگی کی چاہت کس کو ہے، بس میں تو یہ چاہتی ہوں اگلے جہاں کی تیاری پوری ہو اور بلاوا آ جائے۔“ ان کے لہجے میں حسرت سی در آئی تھی۔

”ایسے مت کہیں اللہ آپ کو لمبی مردے۔“ میرا تڑپ کر بولیں۔

”کس کا بلاوا آ گیا اور کہاں سے؟“ سعود کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”خاموش رہو، بلا سوچے کچھ بولنا شروع کر دیتے ہو۔“ میرا نے ڈانٹا۔

”سعود! ہاسٹل سے کچھ لوگ آئے تھے تمہارا پوچھ رہے تھے۔“ پیچھے اس کے ہریرہ اور وہی داخل ہوئے تھے۔

”ہاسٹل سے..... کون لوگ تھے خیریت ہے نا؟“ ہریرہ نے پوچھا۔

”خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ وہ بی بی جان کی موجودگی سے ناواقف تھے۔

”کیوں..... کیا ہوا؟“ اس کے ساتھ سب چونک گئے۔

”ان میں سے ایک ڈاکٹر تھا، کہہ رہا تھا اس نے تمہارے موزے مریض کو بے ہوش کرنے کے لیے سوگھائے تھے مگر..... وہ مر گیا۔“ سعود ان کی بکواس پر فٹکا گھور کر رہ گیا جب کہ وہ اس کی کسی صورت دیکھ کر بے اختیار قہقہے لگانے لگے تھے۔

”مت ہنسا کرو اتنا دل مردہ ہو جاتا ہے حد ہوتی ہے کسی بات کی۔“ بی بی جان کی کراہی آواز پر انہوں نے چونک کر دیکھا تو قہقہے ان کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ ان کی طرف دیکھ کر سعود چرانے والے انداز میں مسکرایا۔

”یہ کیا بکواس کر رہے تھے، کون سا مریض سعود کے موزے سوگھ کر مر گیا.....؟ ہیں..... جاؤ اپنا بنیان جا کر سوگھاؤ، شاید سانسیں بحال ہو جائیں۔“

☆.....☆.....☆

بیرے آف ہونے کے بعد وہ ڈپارٹمنٹ کے سامنے بنے لان میں بیٹھ گئی تھیں۔ شرمین، شاہ، ردا، زوبا، مول اور حورین بہت کم عرصے میں دوستی و بے تکلفی کی ڈور میں بندھ چکی تھیں۔ اس وقت بھی ردا اور زوبا کینٹین سے کولڈ ڈرنکس اور سمو سے لے آئی تھیں۔ کھانے پینے کے دوران ان کی گفتگو پڑھائی سے ہٹ کر پھر اس شرط کی جانب گھوم چکی تھی جو شرمین نے بڑے مان و یقین سے لگائی تھی اور بڑی بے یقینی دیکھی کے ساتھ ہاری تھی، تب سے وہ حورین سے کچھ چھینکی چھینکی ہی رہتی تھی۔ یہ بات حساسی حورین نے محسوس کی تھی۔ اس وقت وہ بول اٹھی تھی۔

”اسکی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ شرمین نے مسکرا کر کزور لہجے میں کہا۔

”کسی غیر شخص کے لیے ہمارے درمیان تکلف کی دیوار آ جائے، یہ ناپسندیدہ بات ہے پلیز..... خود کو ایڑی لٹل کر دو۔“

”مجھے یہ لٹل ہوتا ہے ایسا میری وجہ سے ہوا اور..... معلوم ہے..... اس دن جو ہم بیزاہٹ میں ڈوالٹون کا مذاق اُڑا رہے تھے، وہ سب سن رہا تھا۔“

”کیا.....؟ تم نے دیکھا تھا؟“ حورین کے علاوہ وہ تینوں حیرانگی سے گویا ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں پر یک دم ہی پشیمانی چھلنے لگی تھی۔

”اس نے ہماری گفتگو سنی تھی اور اس وقت اس کا چہرہ نصے سے دکھ رہا تھا اور شاید نصے کی زیادتی کے باعث وہ بغیر کھائے جا چکا تھا، ساتھ حیدر تھا وہ بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔“ شرمین کے انکشاف نے ان کو حیران پریشان کر ڈالا تھا، البتہ حورین پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

”یہ بات تمہیں کل ہی بتانی چاہیے تھی نا۔“ ردا نے کہا۔

”کیوں کیا کرتی تم؟ حورین نے چھیڑا۔

”یہ بہت بُرا ہوا ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”ہاں یار ارٹیکل بہت لٹل ہوا ہے، بات ہمارے درمیان رہتی تو ٹھیک تھی۔“

”ٹینشن نہ لو، جو ہوا اچھا ہوا، جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔“

”حورین! اس قدر سخت چہرمت بنو۔ مذاق اس وقت تک رہتا ہے جب تک کسی کی دل شکنی نہ ہو، ورنہ یہ گناہ بن جاتا ہے۔ ہمیں فوراً اس بندے سے معذرت کرنی چاہیے۔“ مول کی تجویز پر وہ متفق ہو گئی تھیں۔

”اس کڑوے کریلے سے ایکسکیوز کرتی ہے میری جوتی، پھر میں نے کوئی مذاق نہیں کیا تھا۔ اسے اس کی اصلیت سے آگاہ کیا تھا۔“

”تمہاری سوچ مثبت نہیں ہے حور۔“ ثناء نے آہستگی سے کہا۔

”تم لوگوں کی یہ بلا وجہ کی امدردی میری کچھ سے باہر ہے جو ہوا، ہو چکا ہے۔ جس طرح ہنجرے سے اُڑنے والے پرندے واہس نہیں آتے اسی طرح جو ہو چکا ہوتا ہے، نہ پلٹ سکتا، نہ درست ہو سکتا ہے۔“

”انسانوں اور پرندوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہم میں اپنی غلطی کو سدھارنے کی صلاحیت قدرت نے رکھی ہے۔“ شرمین نے

سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا..... تو جاؤ اور جا کر سدھارو اپنی غلطی کو، ایک بددماغ اور بد مزاج شخص کو مزید غرور اور احساسِ تقاؤ میں مبتلا کر دو جو کرتا ہے، بالکل درست کرتا ہے۔ صعب نازک سے اس کا تھیک بھرا زلت آمیز رویہ بالکل جانتے ہے۔ یہ تو اسی قابل ہے ہونہ۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی بوتل جھٹکے سے نیچے رکھی تھی، اپنی ناک اور پر س اٹھا کر وہاں سے چلی گئی تھی، وہ چاروں اسے منانے کے لیے پیچھے گئی تھیں۔

اوپر ٹیس پر کھڑے ڈوالٹون کی سرخ انگارہ لگا ہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ اوپر اتنا تابی کھڑا تھا مگر اپنا نام سن کر اس نے نیچے دیکھا تھا، پھر اس کے چہرے کی سرخی اور پیشانی پر شکنوں کا جال بنتا چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

راحیلہ بیگم اور صد صاحب دو گھنٹے سے بیٹھے برہان ہاؤس میں منال کا انتظار کر رہے تھے، مزید ایک گھنٹہ گزرنے کے باوجود کوئی وہاں نہیں آیا تھا۔ برہان ہاؤس جو خاطر تواضع و مہمان نوازی میں مشہور تھا، جہاں آنے والا سائل بھی خالی ہاتھ و خالی پیٹ نہیں جاتا تھا، وہاں آنے والے ان دونوں نفوس کو سادہ پانی پلانے تک کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی، سینگ روم تک رہنمائی کے بعد کسی ملازم نے اندر جھانکا تک نہ تھا۔

بہت صبر و تحمل سے وہاں بیٹھا انتظار کر رہے تھے، انہوں نے منال کے مزاج کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسے نام آنے کا فیصلہ کیا تھا، جب کونین اور پرنس دونوں گھر میں نہ ہوں، کیونکہ انہیں معلوم تھا منال اپنے طرز عمل و بد مزاجی کے مظاہرے سے گریز نہیں کرے گی اور وہ دونوں بچے وادی اور چچا کی بے عزتی برداشت نہ کر سکیں گے، پھر منال اور قائدہ بیگم کو یہ الزام لگانے میں دیر نہ لگتی کہ وہ از خود بچوں کو باغی کرنے کے لیے آئے تھے۔ ایسے الزامات کا سلسلہ بچوں کے بچپن سے ہی جاری تھا جن میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شدت آتی جا رہی تھی۔ تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ ایسے وقت میں آئے تھے مگر تیزی سے گزرتے وقت نے انہیں پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔

انتظار کی اذیت سے خوب دوچار کر کے وہ اندر آئی تھیں، بغیر آستینوں کی چھوٹی ٹائٹ پنک شرٹ اور لوڈ ٹراؤزر میں پلیوس جھکے مزاج کے ساتھ۔ صد سلام کرتا ہوا کھڑا ہوا تھا، انہوں نے نہ سلام کا جواب دیا، شان کو بیٹھنے کا کہا۔ بے چارے شرمندہ سے خود ہی بیٹھ گئے۔

”ہنزہ کی شادی کی ڈیٹ لکسڈ کرنی ہے اسی سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا تھا۔“ صد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”جو کرنا ہے کر لیں، مجھے درمیان میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں۔“ درمیان میں نیبل تھا، دوسری طرف مشکل صوفے پر پاؤں پر پاؤں رکھے منال روکھے انداز میں گویا ہوئیں۔ ان کے ہر انداز سے نظرت و بے زاری عیاں تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو منال تم ہمارے گھر کی بہو ہو۔ بڑی بہو اسی رشتے سے تمہارا حق ہے ہر کام میں مشورے و شرکت کا۔“

راحیلہ بیگم نے پہل کی۔

”بہو.....؟ مطلب بھی جانتی ہیں کہ بہو کس کو کہتے ہیں؟“ وہ ان کی بات کاٹ کر طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

”ہاں اچھی طرح..... بیٹے کی بیوی کو بہو کہتے ہیں۔“

”کہاں ہے بیٹا؟ پہلے بیٹے کو تو تلاش کر لیں۔ پہلے اس بزدل شخص کو تو لے کر آئیں جوڑے داروں سے بچنے کے لیے بھاگ گیا جس کو نہ بیوی کی ضرورت تھی نہ بچوں کی۔ عیاش زدہ، آوارہ آدمی۔“

”اپنی زبان کو قابو میں رکھو، بیٹا۔ راحیلہ بیگم سے برداشت نہ ہوا۔“

”تمہیں رہے گی میری زبان قابو میں۔ مجھ سے شوہر اور بچوں سے باپ جدا ہوا ہے۔“

”یہ تم بھولو کہ ماں سے بیٹا اور بھائی سے بھائی بھی جدا ہوا ہے۔ میں حمزہ کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتی۔“ ان کا دھیمہ لہجہ

بارعب تھا۔

”سننا پڑے گا آپ کو، جو شخص اپنے لُٹس کی خوشی کی خاطر پیچھے ایک نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا کر کے چلا گیا تو جس نے نہ بیوی کی پروا کی، نہ بچوں کی، میں ایسے شخص کی کبھی عزت نہیں کر سکتی۔“ وہ نہایت بدتمیزی سے راحیلہ بیگم سے مخاطب تھیں۔

”پلیز بھابی! کول ڈاؤن، ہم یہاں پرانے قصے دہرانے نہیں آئے ہیں۔ آپ خواہ ہمیں اپنا نہ سمجھیں مگر ہم آپ کی اور بچوں کی صورت میں حمزہ بھائی کو دیکھتے ہیں، اسی لیے ہم آئے ہیں کہ آپ سے مشورہ کر کے حمزہ کی شادی کی ڈیٹ فکس کریں، آپ بتائیں کہ آپ کے پاس فارغ دن کب ہیں؟“ صمد نے معاملہ بگڑتے دیکھ کر مصالحت آمیز لہجہ میں کہا۔

”تم لوگوں کے لیے نہ آج ہے اور نہ کبھی ہوگا وقت۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی آپ.....؟“ صمد نے نرمی سے کہا۔

”صاف کہہ رہی ہوں، مجھے تم لوگوں سے ملنا گوارا نہیں ہے اور نہ ہی کوئین اور پرنس کا۔“ انہوں نے کھڑے ہو کر حقارت بھرے لہجہ میں کہا۔

”تیری اسی بد مزاجی، غرور اور سمجھنڈ نے تجھے ہر خوشی سے محروم کر دیا ہے اور میرے بیٹے کو مجھ سے دور..... ابھی وقت ہے منال اللہ سے رور و کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگ لے۔ سب درست ہو جائے گا ورنہ پچھتاؤں کی آگ قبر تک پچھتاؤں چھوڑے گی۔“ راحیلہ بیگم جو بہت مبر سے اس کی گستاخیاں سمجھ رہی تھیں، بالآخر غصے سے بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اوہو..... نوسو چوہے کھا کر ملی جج کو چلی۔ ماضی کی ڈکٹیشن کر پٹ عورت، آج چار سجدے کر کے دوسروں کو اللہ کا خوف دلاری ہے۔ پہلے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھو پھر دوسروں کو نصیحت کرنا۔“

”یہاں جو کرتا ہے، وہی بھر کر جاتا ہے۔ دنیا کو دنیا میں ہی بھگت کر جانا پڑتا ہے۔ میں اپنا کیا بھگت رہی ہوں۔“

”اور مرنے کے بعد بھی بھگتو گی۔“ وہ بدتمیزی کے عروج پر تھی۔

”بھابی! پلیز ماما بزرگ ہیں آپ کی۔“ صمد بچنے بچنے لہجے میں بولا۔

”نکل جاؤ تم لوگ یہاں سے، آئندہ یہاں قدم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ملنا نہیں چاہتی تم لوگوں سے، پھر کیوں آجاتے

ہو۔ غصے و خنجر سے اس کی بُری حالت تھی۔ مروت و لحاظ ان کی فطرت میں شامل نہ تھا پھر یہ وہ لوگ تھے جو اس کی ناپسندیدگی کی فہرست میں سب سے پہلے نمبر پر آتے تھے، سو وہ کسی رواداری و انکساری کی قائل نہ تھیں۔ اس کے شدید طرز عمل نے صمد کو شرم سار کر کے رکھ دیا تھا۔ مستزاد ماں کی بے عزتی و شدید ترین توہین آمیز رویے نے انہیں منال سے خنجر کر کے رکھ دیا تھا، اگر ماں کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ ایک لمحہ یہاں زکنا گوارہ نہ کرتا۔ اس کی بہ نسبت راحیلہ بیگم کے چہرے پر ٹھہراؤ و سکون کی کیفیت موجزن تھی، گویا ان پر اس تلخک آمیز سلوک کا کوئی اثر نہیں ہوا ہو۔ ان کا یہی اطمینان منال کو بے سکون کر رہا تھا۔

”جو ہمارا فرض تھا، وہ ہم نے ادا کر دیا، آگے تمہاری مرضی ہے تم آتی ہو یا نہیں۔ ہمارے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے اور رہا سوال بچوں کا تو تم ان کو نہیں پابند کر سکتی۔ وہ ہاشور و ہوش مند ہیں، کھرا کھونا پچھاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ویسے بھی ناشوں سے گوشت جدا نہیں کیا جاسکتا، یہ قدرت کا اصول ہے۔“

”ہونہہ..... مائی فٹ۔“ وہ ان کی جانب سے پیٹھ پھیر کر کھڑ ہو گئی۔ راحیلہ بیگم اور صمد صاحب خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ کار میں بیٹھنے ہی لگے تھے، جب گرے کار اندر آئی تھی جس میں بیٹھے کونین کو دیکھ کر ان دونوں کے ہی چہروں پر ٹنگرات اُبھر آئے تھے۔ کونین بھی انہیں دیکھ چکا تھا۔ حیرت انگیز مسرت و اشتیاق اس کے وجہ چہرے پر اُبھرے تھے۔ وہ ڈرائیور کے اُترنے سے قبل ہی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل کر تیز تیز قدموں سے ان کی جانب بڑھا تھا۔ کار کی آواز سن کر منال باہر نکل آئی تھی۔ باہر کا منظر اس کے خون کی گردش تیز کرنے کے لیے کافی تھی۔

راحیلہ بیگم نے کونین کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیشانی چومی تھی۔ صمد نے بھی بڑی گرم جوشی سے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ اس وقت جو والہانہ انداز و محبت کونین کے چہرے سے عیاں تھا، وہ منال جیسی حاسد اور کم ظرف عورت کو طیش دلانے اور اس شک کو یقین میں بدلنے کے لیے کافی تھا جس میں بنا دیکھے وہ خنجر کی طرف سے جتنا ہونچکی تھی۔ اس کی لُس لُس میں آگ بھڑکنے لگی تھی۔

”دادو! اٹکل! پلیز کچھ دیر مزید بیٹھ جائیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا، آپ لوگوں کو یہاں دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ نہ معلوم کتنے عرصے بعد آپ لوگ یہاں آئے ہیں، پرس بھی آنے والا ہوگا۔“ کونین بالکل بچوں کی مانند اصرار کر رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔

”آئیں گے بیٹا! ابھی تو اجازت دیں آپ کی آئی وینٹ کر رہی ہیں۔“

”ہاں بیٹا! عصر کی نماز بھی پڑھتی ہے، صمد کو ہاسپل بھی جانا ہے۔“

”مما! آپ نے دادو اور اٹکل کی خاطر تواضع اچھی طرح کی ہے۔“ کونین ماں سے گویا ہوا جو قریب آکھڑی ہو گئی تھی۔

”تم فکر مت کرو میرے بچے، تمہارے ممانے اتنی شان دار خاطر تواضع کی ہے کہ شاید ہی کسی کی اس گھر میں کی جاتی ہو، کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔“ راحیلہ بیگم کالجپٹھٹھا اٹھ لے ہوئے تھا جس سے کونین سمجھ نہ پایا مگر منال کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

”یہ اس گھر کی روایت ہے جس حیثیت کا مہمان ہوتا ہے، اسی حیثیت کو مد نظر رکھ کر مہمان نوازی کی جاتی ہے۔“ منال بھی

راحیلہ بیگم کے انداز میں بولیں۔



”او کے بیٹا! اجازت دیں۔ او کے بھائی صاحبہ اللہ حافظ“۔ منال نے بھی بیٹے کے خیال سے مسکرا کر گریٹ سے باہر جانے

تک ہاتھ ہلایا تھا۔

”میں پہنچ کر کے آتی ہوں، آپ بھی فریش ہو جائیں پھر باتیں ہوں گی“۔

ان کی زیرک نگاہوں سے بیٹے کی بے چینی و بے قراری محلی نہ رہ سکی تھی جو وہ اسے فوراً موقع دیتی کہ ان کی ملاقات کا ایک ایک لفظ جاننے کا خواہش مند ہوگا۔ اس کی خواہش سے ہٹ کر اس کے اندر نئی پلاننگ جنم لے رہی تھی اور اسے پلان کرنے کے لیے تہائی و کیسوٹی کی ضرورت تھی۔ کونین کو اس نے بہانے سے وہاں سے ٹالا تھا، وہ حسب عادت ماں کی بات مانتے ہوئے خاموشی سے آگے بڑھ گیا تھا، حالانکہ دل میں کھد بھور ہی تھی، جلد سے جلد معلوم ہو، ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اور مواد ہاں کب جائیں گی.....؟

جہاں اس کے خوابوں کی ملکہ، سپنوں کی پری رہتی ہے۔ اسے یقین تھا ماما سے ایک بار دیکھیں گی تو پھر اس کی محبت کو سراہے بنانہ رہ سکیں گی، اس لیے ضروری ہے ماما ہاں جائیں۔

☆.....☆.....☆

ملازمہ خیرون سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سامنے بی بی جان پنگ پر بیٹھیں اسے گھور رہی تھیں جو کئی چٹخیاں کرنے کے بعد کل آئی تھی اور آج پھر چٹخیاں کا کھاضا تھا۔

”بی بی! تمہیں ہم نے کام کے لیے رکھا ہے یا چٹخیاں کرنے کے لیے۔ غضب خدا کا پورے صینے میں چار مرتبہ آئی ہے اور آج پھر چٹخیاں مانگ رہی ہے“۔ گھورنے کے بعد وہ کلس کر بولیں۔

”مجبوری ہے بی بی جان“۔ خیرون منٹائی تھی۔

”کیا مجبوری ہے، میں بھی سنوں۔ جھوٹی مکارن آج کیا بہانہ ہے؟“ انہوں نے ناک پر پھسلتی نینک درست کرتے ہوئے معنی خیزی سے کہا۔

”وہ..... میری بیٹی کی حالت ٹھیک نہیں ہے“۔

”اچھا کیا ہوا اس غریب کو؟“

”بی بی ہو گئی ہے اس کو“۔ خیرون کہنے کے بعد منڈھانپ کر رونے لگی۔

”ارے چپ کرنا پنجاب عورت! تیری زبان بے فلاح چلتی ہے۔ پچھلے پنجے ٹوٹی تھی اور کہہ رہی تھی کہ تیرے بیٹے کی حالت نازک ہے۔ تجھے چٹخیاں دے کر چوکیدار کو بھیج کر طبیعت معلوم کروائی تو پتہ چلا وہ بھلا چنگا گلی میں کینچے کھیل رہا ہے۔ معمولی سا نزلہ ہو رہا تھا بچے کو اور تو اس بہانے پندرہ دنوں کی چٹخیاں کر کے بیٹھ گئی، پھر دو دن آنے کے بعد تو نے کہا تیری ساس کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اس بہانے سے تو کئی چٹخیاں کر کے بیٹھ گئی، تیرے مگر معلوم کروایا تو پتہ چلا، وہ بہت عرصے سے معذور ہیں۔ میں نے تجھے پھر بھی معاف کیا کہ چلو کوئی ایسی

مجبوری ہوگی جو بتائی نہ جاسکتی ہو، یہاں ہم معاف پر معاف کر رہے ہیں اور تو احسان ماننے کے بجائے ہمیں بے وقوف سمجھ رہی ہے، نرمی کا فائدہ اٹھا رہی ہے۔“ بی بی جان تمام کسر آج نکالنے کے موڈ میں تھیں۔ خیرون روتے ہوئے قسمیں کھانے لگی۔

”چپ قسم مت کھا۔ دیکھو بہت لحاظ کر لیا میں نے تیرا، مگر آج تو نے جھوٹی قسم بھی کھائی ہے، ایسے لوگوں سے مجھے سخت ترین نفرت ہے، سمجھ نہیں آتا کیسی ظالم عورت ہے تو، کیسی سنگ دل ماں ہے تو، بچوں کی معمولی تکلیفوں پر ماں تڑپ اٹھتی ہے، صحت کی دعائیں مانگتی ہے اور تو جان کر جھوٹی بیاریوں کو بڑی بتاتی ہے تاکہ ان بہانوں سے آرام کرے لیکن جان لو دعا کسی کا سکا نہیں ہونا، جھوٹ کبھی نہیں چھپتا..... میرا ذرا ادھر آؤ۔“ خیرون سے باتیں کرتے کرتے وہ میرا کو پکارنے لگیں، جبکہ اتنا کچھ سننے کے باوجود خیرون اپنی بات پر قہقہہ مچا کر وہ جھوٹ نہیں بولتی ہے۔

”جی بی بی جان!“ میرا وہاں آ کر گویا ہوئیں۔

”چوکیدار کو کھوڑا راجیو کو ساتھ لے کر جائے اور خیرون کی بیٹی کو لے کر آئے، تم اتنے میں فون کر کے ڈاکٹر زیدی کو بلاؤ، تاکہ اس بچی کا چیک آپ ہو جائے۔“ میرا ”جی اچھا“ کہہ کر آگے بڑھ گئیں اور خیرون کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا۔

”بی بی جی! آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔“ اس کا انداز مضطربانہ تھا۔

”تکلیف کی کیا بات ہے، اچھا ہے سرکاری اسپتالوں میں دھکے کھانے سے بچ جاؤ گی، مگر بیٹھے بہترین و مفت علاج ہوگا۔“

”مگر..... مگر وہ گھر پر نہیں ہے، اس کی خالہ لے گئی ہے اسے۔“

”ارے تو ماں ہے ڈائن؟ اتنی خراب طبیعت میں تو نے اسے جانے دیا۔“

”اس کے پیچھے بھی درو بھری داستان ہے، اب میں اسے سنبھالوں یا گھر گھر جا کر دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے محنت کروں۔“

میری بہن ترس کھا کر اسے لے گئی، تاکہ میں کام پر آسکوں۔“ دو روہانے لہجے میں بولی۔

”واہ بہن! شاباش ہے تیرے دماغ پر، منٹوں میں کہانی گھڑ ڈالی، اگر کہیں جھوٹ بولنے کا مقابلہ ہوا تو پہلا انعام جیت کر لائے گی

تو جھوٹی۔ چل جا کر انہیں منع کر کے آ۔ چشیاں نہیں دیکھتی اپنی نچھوہ لینے مینے سے پہلے آ جاتی ہے، اس کے علاوہ الگ بہانوں سے بھرتی ہے پھر بھی آنکھ میں لحاظ نہیں ہے۔“ خیرون جا چکی تھی مگر بی بی جان مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

”اس گھر کے تنگ میں وہاں نہیں ہے جو ملازم بھی سرچڑھ جاتے ہیں۔ اول تو گھر میں ملازموں کی ضرورت نہیں ہے، بیچیاں

کرنا چاہیں تو آرام سے کر سکتی ہیں مگر آگ لگے موئے فیشن کو جب تک گھر میں نوکروں کی تعداد نہ ہو، لوگوں پر رعب بھی کیسے پڑے گا، دولت کا، حیثیت کا، اویچھے لوگ ہی ایسی اوجھی حرکتوں سے متاثر ہوتے ہیں اور ان جیسی بڑھرا م عورتوں کے مزے آ جاتے ہیں۔“ ان کا غصہ عروج پر تھا۔

☆.....☆.....☆

کوئین فریش ہو کر آیا تو بے تکلف چائے کا اہتمام تھا۔ سیاہ فیروزہ پیٹری ورک سے مزین خوب صورت ساڑھی باندھ سے منال تیار بیٹھی تھی۔ ذوالنون بھی یونہی رشتی سے آچکا تھا۔ براؤن ٹراؤڈر اور وہائٹ ٹی شرٹ میں نکھر نکھر بیٹھا تھا۔ چائے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ بہت سرسری طور پر وہ ذوالنون کو اس کی وادی اور چچا کی آمد کے متعلق بتا چکی تھی، اپنا طرز عمل وہ بالکل گول کر چکی تھی۔

”ڈیڑی کا فون آیا تھا اسلام آباد سے۔ ان کو اور می کو مزید کچھ دن وہاں رکنا ہوگا، کچھ اپورٹنٹ میٹنگز رہتی ہیں ان کی۔ وہ کہہ رہے تھے، ٹوکیو میں وہاں کی ایک بڑی بزنس پارٹی سے انہوں نے کچھ مشینری خریدنے کی بات کی ہے، بلکہ انہیں ہاف پے منٹ بھی کی جا چکی ہے اگر ہم نے نقل پے منٹ اسی ہفتے نہ کی تو وہ پارٹی ایڈوانس کی رقم ہڑپ کر جائے گی اور مشینری نہ ملنے سے ویسے ہی ہمارے بزنس کو بڑا نقصان ہوگا۔“ کوئین کی مسرتوں کے پھول کھلتے ہی مرجھا گئے تھے۔ اس کے بڑے سکون چہرے پر ایک دم ہی رنجیدگی پھیلی تھی، لہجہ بھر کو اس کا چہرہ تار یک ہوا مگر فوراً ہی وہ خود کو منجھال چکا تھا لیکن ذوالنون کی نگاہوں سے اس کے بدلے چہرے کے تاثرات مخفی نہ رہ سکے تھے۔

”نانا جان نے کبھی ذکر نہیں کیا۔“ کوئین آہستگی سے گویا ہوا۔

”نانا جان نے اس آئینہ ڈے کے لیے سر پرانز رکھا ہوگا۔“

”کیا مطلب تمہارا؟“ تم اتنی طنزیہ گفتگو کیوں کرتے ہو؟“

”وہی مطلب ہے میرا جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ دادو کے ہاں جانے سے بچنے کے لیے آپ نے یہ پلاننگ کی ہے، ورنہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے جو ابھی کرنا ہم ہو۔“ ذوالنون کے لہجے میں وہی بے باکی دہرائی تھی جس سے منال کو چڑھتی۔

”پرنس اپلیز ماما کو ڈسٹرب مت کیا کرو۔“

”میں وہی کہہ رہا ہوں جو سچائی ہے۔“

”میں تمہارے منہ لگتا نہیں چاہتی، تم بد تمیز ہو، تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں، تمہیں جرأت کیسے ہوئی مجھ پر الزام لگانے کی۔“ وہ بڑی طرح سنج پانچتی۔

”مئی اپلیز کول ڈاؤن، پرنس آپ سے بہت عیار کرتا ہے۔“

”مما! اگر آپ کی پلاننگ نہیں ہے تو آپ یہ کام شادی کے بعد کر لیں۔ شادی کے بعد آپ چلی جائیے گا۔“ اس کے وجیہ چہرے پر مخصوص سمجیدگی تھی۔

”ایسی کوئی ایمر جنسی نہیں ہے۔“ وہ بڑی طرح تھلا رہی تھی۔

”میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔“ ذوالنون نے اطمینان سے کہا۔

”سٹ اپ شادی میں شرکت کرنے کی کوئی ایسی ایمر جنسی نہیں ہے، شادیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہ شادی بھی ہو جائے گی ہمارے بغیر۔“ وہ ساڑھی کا پلو سنجالتی ہوئی اٹھی اور کہتی ہوئی چلی گئی۔

”مئی کے ساتھ تمہارا ایسا رویہ مجھے اذیت پہنچتا ہے، مت شمس کیا کرو انہیں، وہ پہلے ہی آپ سیٹ رہتی ہیں۔“ کونین آرزو کی سے گویا ہوا۔

”میں تمہیں پہلے ہی کہتا تھا مئی“ مئی کی طرح ہی سردو بے حس اور بہت خود غرض عورت ہیں۔“ وہ سرد لہجے میں گویا ہوا تو کونین پھر کچھ نہیں بولا، اس میں اور ذوالنون میں یہی فرق تھا۔ ذوالنون ہر بات صاف گوئی اور منہ پھٹ انداز میں مقابل کے منہ در منہ کہنے کا عادی تھا، خواہ نتیجے میں کتنی ہی گالیاں و باتیں سننے کو طیس، وہ پروانہ کرتا تھا اور وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا تھا جو بات کچھ لحوں قبل ذوالنون نے کہی تھی۔ وہ بھی سمجھ گیا تھا مگر کہہ کر ماں کی دل شکنی اسے گوارا نہ تھی۔ اپنے نونے دل کی پروانہ تھی جہاں ڈھیروں خواب راکھ ہوئے تھے۔

”مئی کے ساتھ میں جاؤں گا۔“ اس نے بالکل اُن ہونی بات کہی تھی، کونین نے حیرانگی سے اس کی جانب دیکھا پھر بولا۔

”مئی کے ساتھ..... اور تم.....؟ پھر تو بہت اچھے لمبے ہوں گے میری زندگی میں۔“

”میں نے ایسی کوئی ناممکن بات نہیں کی ہے۔“ بھائی کی حیرانگی پر وہ بے ساختہ ہنس کر کہا تھا۔

”کم از کم میرے لیے سب سے زیادہ حیران کن بات ہے تم جو مئی کے ساتھ چند لحوں میں اختلاف کر بیٹھے ہو، کئی بیٹے کس طرح گزار سکتے ہو۔“

”آپ کی خوشی کی خاطر مجھے یہ جبر بھی منظور ہے جو میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا..... بابا کے بعد میری حیات سے وابستگی آپ کی ذات ہے بھائی اور میں نہیں چاہوں گا کہ..... بابا جیسی زندگی آپ گزاریں۔“

”تم..... تم..... کہنا کیا چاہ رہے ہو.....؟“ وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

”بابا جب ہم سے جدا ہوئے تھے، اس وقت جو تکلیف، جو رنگ، جو رنگ ان کی آنکھوں میں، ان کے چہرے پر، ان کے وجود پر پھیلا ہوا تھا، اس تکلیف کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس اداسی و وحشت کا رنگ میری زیست کا رنگ بن گیا ہے۔ ان لحوں کی گرفت سے میں آج تک نہیں نکل پایا ہوں اور شاید کبھی نکل بھی نہ پاؤں گا۔“ ایک طویل عرصے کے بعد وہ اپنے دل کی بات کر رہا تھا۔ اپنے باپ کی بات کر رہا تھا، وگرنہ وہ ایسی گفتگو سے اجتناب کرتا تھا کہ یہ گفتگو اس کے رستے زخموں کو حریہ کرید ڈالتی تھی۔

”اوہ..... پرنس اتم نے بابا کا ذکر کیا؟ تمہیں بابا یاد ہیں؟“

”کیسی بات کر رہے ہیں بھائی آپ..... باپ بھی کوئی بھولنے والی شخصیت ہوتے ہیں۔ اسٹوٹلی ہمارے بابا جیسے باپ۔“ اس کی سرخی مائل آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ سنجیدہ چہرے پر یاسیت پھیل گئی تھی۔

”یاد انہیں کیا جاتا ہے جنہیں بھول جاتے ہیں، بابا کو میں کبھی نہیں بھولا، نہ کبھی بھول سکوں گا۔“ اس نے تیزی سے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑی تھیں۔ کونین نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا، پیشانی چوم کر۔

”بابا کی نامرادی و نارسانی کا ہلکا سا رنگ کچھ لحوں قبل میں نے آپ کی آنکھوں میں بھی اُبھرتے دیکھا تھا۔ اس کی وجہ کون ہے، یہ

میں نہیں جانتا، کیوں ہے یہ سمجھ سکتا ہوں، آپ کی آنکھوں میں یہ رنگ پھر کبھی مجھے دوبارہ نظر نہ آئے، اس لیے ماما کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔“ اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے وہ اطمینان سے گویا ہوا اور کونین ہنس پڑا۔

”غضب کے نظریاز ہو پھر بھی نازنینوں کو شکایت ہے تمہاری کم لٹائی کی..... اپنی دے ماما کے ساتھ میں ہی جاؤں گا۔“

”ماما کسی بزنس کے چکر میں نہیں جا رہی ہیں۔ وہ صرف ہنزہ کی شادی کے فنکشن سے لاتعلقی رہنے کی وجہ سے جا رہی ہیں، مجھے یقین ہے۔“

”میں ماما کو دکھ دینا نہیں چاہتا۔ مجھے جانے دو وہاں سے میں رابطے میں رہوں گا۔ تم ہر فنکشن میں شرکت کرو اور کوشش کرنا کہ انہیں میری اور بابا کی کمی محسوس نہ ہو۔“ کونین نے شانہ چھپتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

حورین ان چاروں سے خفا تھی۔

وہ اس کے منع کرنے کے باوجود ڈالٹون سے معذرت کرنے لگی تھیں اور حیرت انگیز بات تھی کہ وہ جواب میں کوئی کڑوا سیلا جملہ کہنے کے بجائے خاموش رہا تھا، البتہ اس کے ساتھیوں سے ان کی خاصی گپ شپ رہی تھی۔ یہ سب مول نے اسے بتایا تھا، اب بھی وہ ان سے آگے آگے چل رہی تھی۔ سارا دن اس نے انہیں لٹ نہیں کرائی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم پارکنگ لٹ سے گزر رہی تھی، تب ہی اچانک کسی کار کا دروازہ بند ہوا تھا اور اس کا دوپٹہ بھی کھنچا تھا۔ اس نے گھبرا کر دوپٹے کی طرف دیکھا جو آف وائٹ ڈرائیو تک ڈور کے نیچے دبا ہوا تھا اور وہ شخص دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

”اے مسٹر..... اوسٹر“۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی پیچھے سے چبھی تھی۔

چونک کر پیچھے دیکھنے والا ڈالٹون تھا۔ وائٹ شلوار، سرخ قمیص پر سرخ و سپید پرنٹڈ دوپٹے کو ایک ہاتھ سے سنبھالے شرمندگی و خصلت جس کے چہرے سے مترشح تھا، وہ سخت برہنگی سے اسے گھور رہی تھی۔ دوپٹے کا پلو ڈور میں پھنسا دیکھ کر وہ جیزی سے پلٹا تھا۔

جیب سے چابی نکال کر اس نے بنا کچھ کہے ڈور کھولا تھا۔ دوپٹہ اندر لاک میں پھنسا گیا تھا۔ اس نے اس طرح منہ بنا کر دوپٹہ کا وہ پلو تھا جیسے نہ معلوم کسی ناپسندیدہ و ناقابل برداشت چیز کو ہاتھ لگانا پڑ رہا ہو۔ دوپٹہ نئی طرح پھنسا ہوا تھا جس کو اس نے نچل سے نکالنے کے بجائے جھنجھلاہٹ میں کھینچا تھا اور دوسرے لمحے چر کی آواز کے ساتھ وہ حصہ وہیں پھنسا رہا گیا تھا۔ ایک جھکے سے دوپٹہ اس نے باہر پھینکا تھا۔

”آہ! آپ نے میرا دوپٹہ پھاڑ دیا؟“ حورین پھرتی سے دوپٹہ درست کرتی ہوئی احتجاجاً بولی۔

”دوپٹے کی پاکیزگی و تقدس سے واقفیت نہیں رکھتیں تو کیوں یہ قارمیلٹی بھاری ہیں، چھوڑ دیں، کیوں اسے رسی کی طرح لٹکا رکھا ہے؟“۔

”مسٹر! آپ کی نگاہ کمزور لگتی ہے۔ میرے سات میٹر کے دوپٹے کو رسی کہہ رہے ہیں، آپ نے پہلے آنکھیں بند کر کے دروازہ بند

کیا، پھر میرا دل پٹ پھاڑ دیا اب لپکھو دے رہے ہیں۔“ جو ابا دو بیچ کر بولی۔

اس وقت پارکنگ ایریا میں کوئی نہیں تھا، صرف اس کے پیچھے آئی ہوئی زویا اور مولیٰ تھیں جو حیدر سے بات کر رہی تھی مگر ان کی نگاہیں اس طرف نہیں اٹھی تھیں۔

”پہلے آپ اپنے دماغ کا علاج کروائیے، بشرطیکہ وہ موجود ہو۔“ یہ کہہ کر وہ اطمینان سے آگے بڑھ گیا تھا، اس کے لیوں پر دل آویز قاتحانہ دجسی مسکراہٹ تھی۔ حورین خاموش نہیں ہوئی تھی مگر وہ جاچکا تھا۔ حیدر سے باتیں کر کے وہ دونوں آئیں تو اسے پشیمان ہوا وہ پٹ پٹا تھا میں نے کرخسے سے بڑھاتے دیکھ کر حیرت سے بولیں۔

”ارے یہ کیسے پشیمان.....؟ کتنا خوب صورت دوپٹہ خراب ہو گیا۔“ زویا نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

”شاید میری نظر لگ گئی، مگر یہ پشیمان کیسے؟“ مولیٰ نے کہا۔

”تمہارے اسی چہیتے راجہ اندر نے پھاڑا ہے، اوپر سے کہتا ہے میرے پاس دماغ نہیں ہے۔“ ہلکے ہلکے انداز میں بات کرتے اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”راجہ اندر..... لاجول والا تو ہے۔ تم نے اسے خطاب بھی دیا تو کیسے گھٹیا انسان کا جو مقدس رشتے پامال کرتا تھا، اگر نام ہی دینا تھا تو یوسف ثانی، شہزادہ گلنار، ونیس وغیرہ کا دے سکتی تھیں۔

”ارے چھوڑو لفظی سے ہوا، مگر چلو باہر ڈرائیو رات گزار کر رہا ہوگا۔“ مولیٰ نے بات رفع دفع کرنے کی سعی کی۔ حورین نے نگلی بھری نگاہوں سے دونوں کی جانب دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

کرن اور قاریہ شاپنگ کر کے آ رہی تھیں، جب کار سٹائل بند ہونے پر ایک مصروف سڑک پر رزک گئی تھی۔ وہ دونوں شاپنگ پر بڑے زور و شور سے تہرہ کر رہی تھیں، مگر کرن کی نگاہ کچھ فاصلے پر رزک کی ایک کار کی بیک سیٹ پر پڑی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتی رہی گئی۔ لفظ اس کے گلے میں گھٹ گئے۔ زبان اکڑ کر رہ گئی۔

تیس برس بعد ان کو دیکھ رہی تھی جن کو دیکھنے کی چاہ دل نے تازیت نہ کی تھی۔ وہ بالکل ویسے ہی تھے گریس نل، صحت مند، چاق و چوبند، اتنے طویل عرصے نے بھی ان کی صحت پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ شاید دولت نے نہ انہیں بوڑھا ہونے دیا تھا نہ کمزور۔ وہ آج بھی تیس سال پہلے جیسے تھے۔ ان کے برابر میں ایک ماڈرن سی عورت بیٹھی تھی، اس کے چہرے سے اعتماد و اطمینانیت ظاہر ہوتی تھی۔

یہ سب ایک نظر میں اس نے دیکھا تھا اور جمٹ سائیڈ میں رکھا رسالہ اٹھا کر اپنے چہرے کے آگے کر لیا کہ چہرہ چھپ کر رہ گیا۔

”کیا ہوا کرن! تم کانپ کیوں رہی ہو.....؟“ قاریہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

”سا..... سامنے..... دیکھو.....“ وہ میگزین چہرے سے ہٹائے بنا بولیں۔

”اوہ..... اچھا! مگر تم ڈر کیوں رہی ہو؟ وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہیں۔“ فاریہ ڈرائیور کے خیال سے دھیسے سے بولیں۔

”تم نہیں جانتی، یہ کس قدر خطرناک ہیں۔ پلیز شو فر سے کہہ دو کار دوسرے راستے سے لے کر چلنا۔“ خوف و وحشت سے ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ فاریہ نے ڈرائیور کو ہدایت دی کہ کار بلیو ایریا سے لٹالے اور اسی لئے سگنل کھل جانے کے باعث ٹریفک رواں دواں ہو گئی تھی۔ شوکی قسمت کہ برہان لغاری کی کار کاروٹ بھی وہی تھا جو ان کی گاڑی کا تھا۔ کرن کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ جا کر ان کی گاڑی دوسری طرف مڑی تو ان کی جان میں جان آئی اور وہ پھر بھی احتیاط سے کئی راستے بدل کر گھر پہنچے تھے۔ فاریہ بے دم ہوتی کرن کو سہارا دے کر اس کے بیڈروم تک لائی اور بیڈ پر لیٹنے میں مدد دی تھی۔

”کرن! کرن! سنبھالو خود کو، اتنا ڈرنے کی کیا بات ہے؟“ وہ ملازمہ کو کولڈ ڈرنک لانے کا کہہ کر کرن کے قریب بیٹھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولیں۔ کرن نے زار و قطار رونا شروع کر دیا تھا۔

”وہ آگئے، ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آپہنچے۔ بہت بُرا ہوا، یہ بہت بُرا ہوا، مجھے ڈرتا تھا، یہی ڈرتا تھا۔“ دوسری طرح خوف زدہ تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہوا، یہ محض اتفاق ہے، انہوں نے ہماری طرف دیکھا نہیں ہے۔“

”یہ اتفاق نہیں ہے بھائی! میرا دل کہتا ہے یہ اتفاق نہیں ہے۔“

ملازمہ کو کولڈ ڈرنک لے آئی تھی، فاریہ اپنے ہاتھوں سے گھونٹ گھونٹ پیا رہی تھی۔

”یہ بہت پرانی آگ تھی جو اب راکھ بن چکی ہے، تم فکر مت کرو۔“

”آگ راکھ میں تبدیل ہو جائے مگر راکھ میں چنگاریاں دہلی رہتی ہیں جو وقت آنے پر پھر سے شعلے بن جاتی ہیں، پھر سب کچھ جلا کر بھسم کر ڈالتی ہیں۔“

”اب کچھ بھی بھسم نہیں ہوگا جو ہونا تھا وہ ہو گیا، خود کو ریلیکس رکھو۔ آج رات کی لٹائٹ سے انس بھائی آرہے ہیں، اس طرح ان کا استقبال کرو گی۔“ فاریہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے شوخی سے بولیں۔

”یہ رشتے بھی کتنا کمزور اور بزدل بنا دیتے ہیں۔ وقت بھی کیسے کیسے مذاق کرتا ہے۔ انسان سے کیسی اُن ہوتی پہلیاں بچھوانا ہے۔ ایک وقت ایسا تھا جب میں تنگ دستی دور کرنے کی غرض سے اسکول میں پڑھایا کرتی تھی۔ وہ وقت مجھے اپنی زندگی کا حسین دور لگتا تھا۔“ وہ ماضی کے اسرار میں کھو گئی تھی۔

”اسکول کا وقت ختم ہوتا تو میرا دل بڑا گھبراتا تھا۔ واپسی پر گھر جانے کے خیال سے میں ہر روز سب سے آخر میں نکلتی تھی۔ میری دوست بہت ناراض ہوتی کہ مجھے اسکول سے اتنا مشتاق ہے تو وہیں پڑی رہا کروں۔ آہ..... گزر گیا وہ وقت جو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ کبھی نہیں گزرے گا اور آج میں اس خوف میں مبتلا ہوں کہ کہیں میرا گھر مجھ سے چھوٹ نہ جائے۔ میرے اپنے نہ مجھ سے چھڑ جائیں۔ کل گھر سے بھاگنے والی لڑکی آج گھر کو جانے سے ڈرتی ہے۔ کل تک جس کو کسی کی پروا نہ تھی، آج وہ سب کی فکر میں گھلتی جا رہی ہے، کیا تضاد ہے نا یہ

وقت کا۔ وہ گہری سانس لیتی ہوئی گویا ہوئی تو قاریہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہی زندگی ہے۔ ایسے تجربات کی ہمیشی میں جل کر کندن بنا جاتا ہے۔“

”برہان لغاری یہاں کیا کر رہے ہیں اور وہ عورت کون تھی جو ان کے ساتھ بیٹھی تھی؟ وہ منال تو ہرگز نہ تھی۔“ ان کی ذہنی رو پھر

بھکی تھی۔

”برہان لغاری کوئی غریب آدمی تو نہیں جو ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں جاسکتے، بلکہ وہ پوری دنیا میں اس طرح گھومتے ہیں جس

طرح کوئی عام آدمی شہر کے علاقوں میں گھومتا ہے۔ وہ کہیں بھی جاسکتے ہیں، اب تم اپنے خوف پر قابو پانے کی سعی کرو۔ ہم دونوں تھے کل کو

بچوں کی موجودگی میں ایسی ہی پھوٹیشن ہوئی تو کس طرح بچوں کو سمجھائیں گے..... یہ سوچا ہے؟“

”میں بہت کوشش کرتی ہوں مگر ان کے میں نے ایسے ایسے روپ دیکھے ہیں کہ میں خود پر قابو نہیں کر سکتی۔“ ان کے لہجے میں بے

چارگی تھی۔

☆.....☆.....☆

دل میں پیدا کرو پہلے میری ہی جراثیم

اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے

دل بچھا سکتا ہوں میں، آگھیں بچھا سکتا ہوں میں

ہنزہ کی شادی کی تقریبات عروج پر تھیں۔ ”صد ہاؤس“ دل کش روشنیوں سے جھللا رہا تھا۔ مہمانوں کی کثیر تعداد اندرون و

بیرون ملک سے شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی۔ مایوں، مہندی کی رسمیں، پچھلے تین دنوں سے جاری تھیں۔ آج شادی کا دن تھا۔ ایک

افرائقی سی ہرست نظر آ رہی تھی۔

ذوالنون نے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا کہ حزرہ اور کونین کی کی محسوس نہ ہو مگر وہ دیکھ رہا تھا، صد ہاؤس اور دادو کی آگھیں ہر تقریب

میں بھیک رہی تھیں۔ کئی اہم موقعوں پر صنوبر آئی کی آگھیں اسے دیکھتی تھیں اور ہنزہ، منزل اور خضر تو کونین کو بہت یاد کرتے رہے تھے۔

”ذوالنون! یہاں سب سے الگ تھلک کھڑے کیا سوچ رہے ہو، کوئی مسئلہ ہے؟“ خضرنی اس کے پاس میز پر چلی آئی۔

”نہیں۔ اندر بہت شور ہو رہا تھا۔“ خضرنی وہ واحد لڑکی تھی جس سے وہ احترام سے بات کرتا تھا، بے حد عزت بھی کرتا تھا۔

”ہوں، ایسے موقعوں پر ہی لڑکیوں کو گانے کے مواقع ملتے ہیں۔“

”گانے کے نہیں، لوگوں کے کان خراب کرنے کے۔“ اس کی بات پر وہ مسکرا دی تھی۔

”اگر ایسے جوئی لوگ نہ ہوں تو پارٹیز جان دار نہ رہیں۔“



”اگر ایسے ہی لوگ ہونے لگے تو جان ہی نہ رہے گی۔“ وہ منہ بنا کر بولا اور حضرتی بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

”تم نہیں سدھرنا۔ کمرے میں آ جاؤ، میں نے چائے بنوائی ہے۔“ وہ اس کے ساتھ کمرے میں آ گیا جہاں عریہ حضرت سے ضد کر رہی تھی کہ وہ اسے میچنگ کی چوڑیاں دلوالائے جو ابھی نکالتے میں ٹوٹ چکی ہیں مگر وہ لے جانے کو راضی نہ تھا۔

”آپنی ادیکھیں نہ حضرت مجھے.....“ پیچھے سے آتے ذوالنون کو دیکھ کر وہ کٹری کی کٹری رہی گئی۔ وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا ہوا؟ چپ کیوں ہو گئیں؟ ایک گھنٹے سے میرا مارچ کھا رہی ہو۔“ وہ ذوالنون کی طرف دیکھتا ہوا شرارت سے بولا۔

”کیا مسئلہ ہے؟ بیٹھ جاؤ۔“ وہ عریہ سے مخاطب ہوا جو اس کے کہنے پر اس پھرتی سے پٹلی تھی کہ چیز سے گرتے گرتے ہی تھی۔

”وہ..... میرا..... سینڈل..... ٹوٹ..... گیا..... تو.....“

”ہیں۔ یہ ذوالنون بھائی کو دیکھ کر چوڑیاں سینڈل کیسے بن گئیں؟“

”پریشان مت کرو اسے۔“ حضرتی نے ڈانٹا۔

”جو اسے لینا ہے، شاہنگ کروالاؤ۔“

”لیکن..... گاڑی کوئی بھی نہیں ہے۔“

”میری گاڑی لے جاؤ۔“

”تو آپ خود ہی لے جائیں، آپ کو بھی تجربہ ہو جائے شاہنگ کا۔“

”نہیں..... نہیں، میں نہیں جاؤں گی ان کے ساتھ جانے سے بہتر ہے میں ننگے پاؤں بارات کے ساتھ چلی جاؤں، چنگیز خان نا

ہوں تو۔“

”لو اس سے اچھی بات کیا ہوگی، ایک گھنٹے سے میں تمہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ حضرت خوش ہو کر بولا۔

”بکو اس مت کرو، لے کر جاؤ اسے۔“ ذوالنون نے چابی اس کی جانب اُچھالتے ہوئے کہا تو عریہ حیرت سے بے ہوش ہوتے ہوئے

ہوتے ہی۔

”میرے پیچھے پیچھے آؤ ورنہ.....“ وہ عریہ کو وارننگ دیتا ہوا چلا گیا۔ پیچھے عریہ بھی نکل گئی تھی۔ ملازمہ چائے انہیں پیش کر چکی

تھی۔ ساتھ ہنزہ بھی آ کر بیٹھ گیا تھا۔

”شادی کرنا بھی کتنا بڑا جنجال ہے۔ اب مجھے محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ چائے کے گھونٹ لیتے آستائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”ابھی تو اتنے شوق سے روتا ہے کیا

آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا“

ذوالنون نے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

”واہ یار! تم تو چھپے رستم نکلے۔ لا جواب کر دیا تم نے مجھے۔ کونین کی واہیسی کب تک ہوگی؟ یہ معلوم ہے یا نہیں؟“  
 ”وہ جلد آ جائیں گے۔“ وہ کپ نھیل پر رکھتا ہوا بولا۔  
 ”میں دادو کو دیکھتی ہوں۔“ حضرتی اٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”میرے خیال میں کچھ وقت آپ بھی دادو کے پاس گزار لیں، ان سے ذعائیں لیں تاکہ جنجال آپ کے لیے خوش حال بن جائے۔“ وہ تینوں ساتھ ہی کمرے سے نکلے تھے۔ لاؤنج میں مگھتے ہی وہاں موجود گانے گاتی لڑکیوں نے ہنزدہ کو گھیر لیا تھا۔ وہ خاموشی سے لاؤنج سے باہر نکل آیا تھا۔ پیچھے سے اس نے حضرتی کی آواز سنی جو بھاگتا ہوا اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔

”ہرا! وہ مارا..... پکڑی میں نے آپ کی چوری۔“ وہ بڑے جوش و خروش سے قریب آ کر اس سے مخاطب ہوا تھا۔  
 ”چوری؟“ وہ متعجب ہوا تھا۔

”تمہاری چوری۔“

”کیسی چوری؟“

”جیسی چوری ہوتی ہے۔“ وہ اس کی حالت سے مفلوظ ہو رہا تھا۔

”ذیکھو سیدھے سیدھے بات کرو۔“

”میں سیدھی ہی بات کر رہا ہوں۔“

”کیا ہوا؟ تم عربیہ کو شاپنگ کروانے لے کر جا رہے تھے پھر کیا ہوا جو بکواس کرتے ہوئے آئے ہو۔“

”عربیہ کو مانے نہیں جانے دیا کہ اس کے پاس پہلے سے ہی ہر چیز ڈبل ہے، اسے کریز ہے شاپنگ کا، وہ منہ بنا کر چلی گئی۔“

”اوکے..... لاؤ چابی دو۔“

”اچھا..... مجھے باتوں میں لگا کر بیٹھ رہے ہیں؟“

”حضرت! بہت ہو گیا ہے میری بروداشت کو مت آزماؤ۔“

”پہلے میں سب کو بتاؤں گا پھر آپ کو۔“

”اچھا..... ادھر آؤ میرے قریب۔“ وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔

”نہیں..... ایسی باتیں دور دور سے ہی اچھی لگتی ہیں۔“ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر کئی قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہنے لگا۔

”یار بتاؤ تو سہی کیا مطلب ہے تمہاری بات کا؟“ وہ زچ ہو کر بولا تو حضرت کے انداز نے اس کی چھٹی حس کو چوکنہ کر دیا تھا۔

”آپ کی فرینڈ شپ کسی لڑکی سے نہیں ہے؟“

”لڑکی سے.....؟ پاگل ہو گئے ہو تم؟“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ اس کا انداز چڑانے والا تھا۔

”مجھے تمہاری بکواس سے کوئی سروکار نہیں ہے، میں جا رہا ہوں۔ مجھ سے بکواس کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ وہ غصے سے کہتا ہوا

چلتا تھا۔

”اچھا..... تو پھر یہ کیا ہے.....؟“ خنصر کا انداز ڈرامائی تھی۔ ذوالنون بے ساختہ چلتا تھا اور پھر اس کی آنکھوں میں برہمی کی جگہ

تعجب و حیرانگی نے لے لی تھی۔

خنصر کے ہاتھ میں سرخ و سپید کپڑے کا ٹیس تھا۔ اس کی نگاہوں میں کل والا مظہر گھوم گیا جب وہ جامعہ سے واپسی پر موہاٹل

بھولنے کے باعث کار سے جلدی میں لگلا تھا اور دیکھ نہ سکا تھا کہ کوئی دوپٹہ ہوا کے جھونکے سے اڑ کر ڈرائیونگ ڈور میں پھنس گیا ہے۔ اس

نے جلدی میں دوپٹے کو کھینچ کر نکالا تھا اور پھر یہ بھی دیکھتا گوارا نہ کیا تھا کہ روہ جانے والا وہ دوپٹے کا پٹن کہاں گرا ہے جو اب خنصر کے ہاتھ

لگ گیا تھا اور خنصر کب سے کسی ایسے ثبوت کی تلاش میں سرگردان تھا۔



”مجھے نہیں معلوم کہ یہ کہاں سے آیا اور کیسے؟“ اس نے شانے اُچکاتے ہوئے بالکل لاپرواہی و لاپٹی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ خنصر جیسا کائیاں و ڈھیت بندہ بھی گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کا تمام جوش و اشتیاق جھاگ کی مانند بجھ گیا۔

”رنگی..... آپ نہیں جانتے اس ٹیس کے متعلق؟“

”میرے خیال میں تم اس کو اسٹپ پیپر پر تحریر کروالو اور یقین آنے تک پڑھتے رہنا۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوا تھا۔

”کیا..... کیا تحریر کراؤں؟“ خنصر ہنوتق بن گیا تھا۔

”بھی کہ میں اس ٹیس کے بارے میں نہیں جانتا۔“ ذوالنون اس کی یوگلاہٹ سے مظلوظ ہو رہا تھا۔

”او کے..... لیکن..... مجھے یقین نہیں آیا۔“

”کیوں.....؟“ اس کی نگاہیں بار بار اس نکلے پر اٹھ رہی تھیں۔

”یہ آپ کی کار کی فرنٹ سیٹ کے نیچے دبا ہوا تھا اور آپ کہتے ہیں۔“

”اوہ..... کم آن خنصر! مٹی ڈالو اس پر، تیاری کرنی ہے یا نہیں..... اٹکل مقررہ ٹائم پر ہارات لے کر جائیں گے۔ کون تیار ہے،

کون نہیں، وہ پرواہ نہیں کریں گے۔“

”ہاں..... ہاں بالکل درست بات کی ہے آپ نے۔ ایک تو ڈیڑی انتظار نہیں کریں گے، دوسرے بے عزتی الگ ہوگی، اگر

وقت پر تیار نہ ہوئے تو۔“ وہ ایک دم ہی چونک کر کہتا ہوا اندر کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

”یہ تو دے کر جاؤ.....“ ذوالنون نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کو دے کر جاؤں.....؟“ وہ ٹٹک کر رہ گیا۔

”ہاں..... نہیں..... میرا مطلب ہے پیسے دو اس کو۔“

”کیوں پیسے دوں؟ اس کی آنکھوں میں بھی جوت پھر چلے گی۔“

”کتنا حسین ہے یہ نہیں، کسی دل رُہا کے دل کی طرح، سوچ رہا ہوں وہ خود کس قدر خوب صورت ہوگی؟ جس کا دوپٹا اتنا حسین و

دل کش ہے۔“

”بھاڑ میں جاؤ، میرا ہی دماغ خراب ہو گیا تھا جو تم سے بکو اس کی۔“ وہ غصے میں اندر چلا گیا تھا، خضر کی معنی خیز مسکراہٹ نے

اسے خوب تپا ڈالا تھا۔ خضر اس کے پیچھے اندر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

تم سے اُلت کے تقاضے نہ بھمائے جاتے

ورنہ ہم کو کبھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

تم سے اُلت کے تقاضے نہ بھمائے جاتے

”ہلیز ہریرہ! مجھے ڈسٹرب مت کرو۔“ حورین نے ہریرہ کو دیکھتے ہوئے بخیرگی سے کہا، جو قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔

”تم ڈسٹرب ہوتی ہو.....؟ نئی خبر ہے۔“

”میں انسان نہیں ہوں کیا؟“ اس نے جھلا کر کہا۔

”نہیں۔“

”کیا.....؟“

”مم..... میرا مطلب ہے تم مجھے پری لگتی ہو، پری۔“ ہریرہ نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔

”جسہیں معلوم ہے پری کے ”ان کو“ کیا کہا جاتا ہے؟“

”دیو۔“ اندر آتے شریر ٹولے میں سے ایک نے خضرہ چست کیا۔

”ہو گے تم خود دیو بلکہ..... دیوؤں کے دیو مہادیو۔“ ہریرہ جل بھن کر بولا۔ وہ ہنستے ہوئے کارپٹ پر بیٹھ گئے تھے، جہاں ہریرہ

فلور کیشنز کے سہارے نیم دراز ہوا تھا۔ حورین سونے پر بیٹھی تھی۔

”یہ ٹیکنیکل دور ہے۔ لوگ چاند سے آگے پہنچ گئے ہیں اور ہم ابھی تک پریوں اور دیوؤں کے چکر میں گم ہیں۔“ واصف نے

احساس دلانے کی سعی کی۔

”ٹیکنیکل دور میں دیو بھلے ناپید ہو گئے ہوں مگر پریاں تو بھائی تا قیامت رہیں گی۔“ سحود نے بُرے یقین لہجے میں کہا۔

”جب دیونہیں ہوں گے تو پھر پریوں کا کیا کام؟“ سفیان بولا۔

”بھئی پریاں ہمارے لیے ہیں، دیویوں کے لیے تھوڑی ہیں۔“ ہریہ حور کی طرف دیکھ کر بولا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

”تو ب..... تو ب اس دور کے نوجوان.....؟ اللہ کی پناہ! مرے جا رہے ہیں شادی کے لیے۔ لڑکیوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کرتے

ہی چہروں پر پھنکار برس رہی ہے۔ صورت نہ شکل، بھاڑ سے نکل۔“ وہی نے بی بی جان کے انداز میں کہا اور ان قبیلوں میں حورین اور ابرج کی کنسی بھی شامل تھی۔

”درست کہتی ہیں بی بی جان، آپ لوگوں کی حرکتیں ہی ایسی ہیں۔“ ابرج متنب لہجے میں بولی۔

”سسر! تم کیوں منہ لٹکا کے بیٹھی ہوئی ہو، اپنی پرالیم؟“ واصف نے حورین کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا تو دوسرے بھی

اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

”بچھے دو تین دن سے بہت اُداس و تنہا تنہا لگ رہی ہیں۔“

”مئی، بیبا بہت یاد آ رہے ہیں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”مجھے بھی یاد آ رہے ہیں۔“ ابرج اس کے قریب ہوتے ہوئے اُداسی سے بولی۔

”یہاں کوئی پریشانی ہے؟ کسی نے کچھ کہا تو نہیں ہے؟“ حساس طبیعت کے مالک واصف نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے

بہر روی سے پوچھا۔

”ارے نہیں..... یہاں تو سب اتنے اتھے، اتنے کیمرنگ ہیں کہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ ہم گھر سے دور ہیں، بس انسان ازل سے

محبیوں کا طلب گار اور چاہتوں کا مستلاشی ہے۔ محبت و چاہت کتنی ہی مل جائے، ہمیشہ تنگی دامن کا شکار احساس رہتا ہے۔“ حورین نے مسکرا کر وضاحت کی تھی۔

”ہوں..... تو یوں کہیں نا اب مئی، بیبا سے ناز اٹھوانے نخرے دکھانے کو دل چل رہا ہے۔“ سفیان مسکرا کر گویا ہوا۔

”ویسے بات تو درست ہے، آپ کو کتنی بھی محبتیں مل جائیں مگر والدین سے ملنے والی محبت و توجہ کا احساس ہی الگ ہوتا ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟“ وہی سرد سے حیرانگی سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں..... یہ تم کس خوشی میں اتنے حیران ہو رہے ہو؟“

”خوشی میں نہیں دکھ میں.....“

”کس دکھ میں.....؟“

”کل تم اپنی ”سکلی“ سے کہہ رہے تھے، پھر تمہیں اس سے اتنی محبت ہے جتنی دُنیا میں کوئی کسی سے کر نہیں سکتا اور اب کہہ رہے ہو،

دُنیا کی سب سے بہترین محبت وہ ہے جو آپ کے والدین آپ سے کرتے ہیں۔“

”اس میں نیا کیا ہے؟ یہ تو اپنی ہر سبکی سے یہی کہتا ہے۔“

”یہاں کوئی خفیہ بات چیت نہیں ہو رہی ہے۔“ سرد شپٹا کر بولا۔

”بہت جھوٹے ہو یا تم، کچھ تو لحاظ کرو۔“

”دیکھو وصی! بہت ہو گیا۔“ ان دونوں کو ایک دیکھ کر وہ بھڑک اٹھا۔

”یہی تو تمہیں کہہ رہے ہیں، بہت ہو گیا ہے۔ لڑکیوں سے جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔“ وہ دونوں سرد کو گھیرنے میں کامیاب ہو گئے

تھے۔ ہر یہ مسکراہٹ منبسط کیے سرد کے غصے سے پھولتے پھکتے تھے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو، خود تم سب سے بڑے جھوٹے ہو۔“

”تجھ سے تو جھوٹے ہیں بھائی۔“ وصی باز آنے والا نہیں تھا۔

”کل سو بائیں پرٹو کیا کہہ رہا تھا اپنے دوست سے.....؟“

”کیا کہہ رہا تھا؟“ وصل سنبھل کر بیٹھا۔

”شاہد رکھول کر واش روم کے دروازے کے پاس کھڑا ہو کر کہہ رہا ہے، یار میں کراچی میں نہیں سوات میں ہوں، یہاں بڑی

طوفانی بارش ہو رہی ہے۔ بارش بند ہوتے ہی میں پہلی فلائٹ سے آ جاؤں گا۔“ وہ وصی کو گھور کر بولا۔

”یہ سفیان صاحب! انہوں نے واش روم کا نیا نام ایجاد کیا ہے، ایئر پورٹ۔“

”ایئر پورٹ.....؟“ حورین اور امیرج سخت متعجب ہوئیں۔

”جب بھی کوئی امیرج جسی کال آتی ہے ان کے پاس تو فوراً کہہ دے گا سر! سوری میں ایئر پورٹ پر بیٹھا ہوں۔“ سرد کا انداز ایسا

تھا کہ ان کے ساتھ وہ دونوں بھی نہیں پڑے تھے۔

”ہم تو مذاق کر رہے تھے، تم سنجیدہ ہو گئے یار۔“ وہ اسے منانے میں لگ گئے جو ناراض تھا، اسی اثنا میں بی بی جان اندر آئی تھیں۔

وہ الٹ ہو گئے۔

”بی بی جان! آج کل یہ کاپی آپ کے ہاتھ میں بہت نظر آنے لگی ہے۔“ واصف نے بہت مہذب انداز میں ان کے ہاتھ میں پکڑی

کاپی اور بین کی طرف اشارہ کیا۔ یہ وہ مخصوص کاپی تھی جس میں خاندان اور باہر کی تقریبات میں دیئے گئے تحائف و رقوم کا اندراج ہوتا تھا۔

”تقریبات بھی بن بلائے مہمانوں کی طرح نازل ہونے لگی ہیں۔ پہلے سال میں چند تقریبات ہوتی تھیں، سب دور نزدیک

کے مل بیٹھتے تھے، پرانی یادیں تازہ کرتے تھے، من بڑا شانہ ہوتا تھا مگر اب تو سال گزر جاتا ہے اور کام ختم نہیں ہوتے ہیں، اب تقریبات

میں وہ لطف نہیں رہا، کام ایسے ہوتے ہیں جیسے بوجھ سے جان چھڑائی جا رہی ہو، پھر نیتوں میں کھوٹ آ گیا ہے، دعوت ایک اور تقریبات کئی

ہوتی ہیں۔“ بی بی جان کا پسندیدہ موضوع چھیڑا گیا تھا جس پر وہ گھنٹوں سیر حاصل گفتگو کر سکتی تھیں۔

”جیسے بچھلے ہنٹے میں گئی تھی، بھٹی صاحب کے بیٹے کے ویسے میں، وہاں کئی کام ایک ساتھ تھے۔ بیٹے کا دلیر، بیٹی کی رخصتی، پوتوں کے عقیقے اور پوتیوں کی بسم اللہ شریف۔ لوگوں کی ذہنیت میں یہی فتور آ گیا ہے، ویسے والے کی پوری ناٹ پٹ جاتی ہے۔ تقریبات نہ ہوں گا رو بار بن گئیں۔“ وہ سانس درست کر کے قدرے توقف کے بعد گویا ہوں۔

”اس ملک کی مہنگائی کا تو پوچھو نہیں، پاکستان تو کوئی چاند پر بھی نہ جاسکا مگر یہاں کی مہنگائی چاند کو بھی پیچھے چھوڑ کر ساتویں آسمان کو چھو رہی ہے۔“ وہ کھس کر کہہ رہی تھیں۔

”بی بی جان! ہماری عورتوں کا پسندیدہ موضوع ہے مہنگائی، کیا وجہ ہے آخر میں نے کبھی مردوں کو اس نگر میں ہلکان ہوتے نہیں دیکھا.....؟“ سفیان جو آج کل بی بی جان کو اسی گٹھ جوڑ میں مصروف دیکھ رہا تھا، کہ تو بڑے مزے سے گیا مگر جواباً کئی لمحوں تک ان کی کڑی نگاہوں کے زیر اثر وہ کراسے احساس ہوا، بے دھیانی میں وہ کیا لفظی کر بیٹھا ہے؟

”سنو میاں! مرد تو صرف ایک کام میں اُلجھتا ہے اور لاکر بندھی گئی رقم عورت کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ مانو بڑا کار نامہ انجام دے دیا ہو، وہ اپنی ذمے داری سے آزاد ہو جاتا ہے، اب کم بختی آتی ہے عورت کی، بلز، بچوں کی پڑھائی کے اخراجات، گھر کا بجٹ، چھوٹی موٹی خریداری اور یہ جو نیا فیشن نکلا ہے، ایک کام میں چار کرنے کا پھر یہ جو تم لوگوں کی آئے دن کی پارٹیاں ہیں، ایسے تمام کام عورتوں کی سمجھ داری و کفایت شعاری سے ہوتے ہیں، ہر ضرورت کے لیے تم ماں کو پکارتے ہو یا باپ کو، ایک دفعہ کے بعد دوسری مرتبہ باپ سے جیب خرچ کیوں نہیں مانگتے؟ معلوم ہے ناں لات لگے گی، ماؤں کو مسکا لگا کر دس ہار لیتے ہو، ایسے اور دوسرے مسائل ہوتے ہیں جن کی تمام تر ذمے داریاں فقط عورت ہی بھاتی ہے۔ مردوں کو تھوڑی معلوم ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو ایک دن گھر میں گوشت پکا ہوانہ ملے تو باہر کھا کر آتے ہو۔“ حسب عادت وہ لیکچر دے بیٹھی تھیں۔

”بی بی جان! ہمارے ہاں ایسے مسئلے نہیں ہوتے ہوں گے، کیونکہ ہمارے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ بڑے بچا اور بچا کا شمار چند ٹاپ کے بزنس میٹروں میں ہوتا ہے۔“ وہی نے کہا۔

”وہی بات آگئی نا، بڑے لوگوں کے خرچے بھی بڑے ہوتے ہیں اور پھر بیٹا ہر گھرانے میں خواہ کسی بھی طبقے کا ہو میانہ روی و توازن رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ دولت ہونے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ دونوں ہاتھوں سے خوب لٹاؤ، پھر کنگال ہو کر بیٹھ جاؤ۔“

”آپ تو آج شادی میں جانے کی کہہ رہی تھیں۔“ امیرج نے پوچھا۔

”ہاں..... میں تو بھول ہی گئی، تم لوگوں کی باتوں میں۔ یہی معلوم کرنے آئی تھی کہ آج میرے ساتھ کون چلے گا؟“ وہ صینک درست کرتی ہوئی گویا ہوئیں۔

”شادی میں.....“ امیرج اور حورین کے علاوہ وہ سب چونک کر گویا ہوئے تھے۔

”ہم سب..... ایک دوست کے..... ہاں..... مدعو ہیں۔“ وہی نے گھبرا کر کہا۔

”دوست..... رشتے داروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں؟“

”وہ، بی بی جان.....“ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، ایسے میں ان کی مدد کرنے کی کوشش حورین نے کی۔

”بی بی جان! میں چلوں آپ کے ساتھ“۔ حورین نے کہا۔

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں، بھلا اس سے اچھی بات کیا ہوگی، ان ناہنجاروں کو میں کون سا خوشی سے لے جانا چاہ رہی تھی۔

دراصل شروع سے اماں، اماں نے تمہا گھر سے باہر نکلنے نہ دیا کہ شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں تمہا نہیں نکلتیں۔ بس وہی عادت پڑ گئی ہے، اس

بڑھاپے میں بھی تمہائی کا تصور محال ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی پھر اسے جلد تیار ہونے کا کہہ کر چلی گئیں۔

”ارے یہ کیا غضب کر لیا؟ اپنے پاؤں پر خود کھانسی مار لی؟“

بی بی جان کے قدموں کی آواز دور ہوتے ہی وہ سب اس سے مخاطب ہوئے۔

”اُن کے لہجے میں اتنی محبت تھی، ایسی محبتیں حاصل کرنے کے لیے میں خود کو ہزار بار نقصان پہنچا سکتی ہوں۔“

”یہ بات درست ہے مگر بی بی جان کی رشتے داریاں بہت مشکل ہوتی ہیں اور اس پر تعارف کی ڈوریں بڑی طویل ہوتی ہیں۔

ایسے ہی موقع پر ایک دفعہ میں ان کے ساتھ تھا، ایک خاتون سے تعارف ہوا، بی بی جان پوچھنے لگیں۔ آپا ہمیدہ! تمہاری بہن کی پھوپھی

نوا سی جس گھر میں گئی ہے، وہ لوگ کیسے ہیں.....؟ سنا ہے بڑے ظالم لوگ ہیں۔ جواب میں آپا ہمیدہ نے ایک طویل سرد سانس لے کر درجہ

حرارت کو چھینرنے کی ناکام کوشش کی، پھر بولیں وہ تھے ہی منحوس لوگ، پہلی بار دعوت پر آئے تو من بھر دو دھ پھٹ گیا، چھوٹے بھائی کے

ساتویں بیٹی ہو گئی، بریانی کے چاول اینٹھ گئے، قور سے گا گوشت کم گلا، فرائی میں نمک تیز ہو گیا اور.....“

”بس بس ٹھیک ہے جو ہوگا میں خوشی سے برداشت کر لوں گی، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ حورین ہنستی ہوئی کھڑی

ہو کر گویا ہوئی۔

☆.....☆.....☆

شہر کے اعلیٰ ہوٹل میں بارات کا انتظام تھا۔ راحیلہ بیگم اور صدر صاحب نے کسی کو رعایت نہ دی تھی، ان کی وجہ سے ہی بارات ٹائم پر

سبزہ زار پہنچ گئی تھی، جہاں مہمانوں کا جوش و خروش سے والہانہ استقبال کیا گیا تھا۔

ریگ ویو کا طوقان برست پھیلا ہوا تھا۔ مہمانوں کی کثیر تعداد تھی جو وہاں پھیلی ہوئی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ باوردی ویٹرز

مہمانوں کو کوئلڈ ڈرنگس سرور کر رہے تھے۔ حسین ماحول تھا۔

رنگین فضا تھی۔

حسینوں کے قہقہے، مدہ جینوں کی اداؤں کے جال ہر سو بکھرے تھے۔ کوئی الجھ رہا تھا کوئی بچ رہا تھا مگر سب کے لبوں پر ہنسی تھی۔

سب خوش باش و مطمئن نظر آ رہے تھے۔ اس بھرے بے فکر و خوش باش ہجوم میں فقط وہی تھا، جو اس خوشی کے موقع پر بھی مسکراتا۔ سا



تھا۔ دادو کی آنکھوں سے گرتے آنسو، چچا کی افسردگی اور نجیدگی جو اس اہم موقع پر بڑے بھائی کی غیر موجودگی کے خیال سے درآئی تھی۔ اس پورے ہفتے میں اس نے ہر تقریب کے دوران ان لوگوں کو اپنے ہاں کے لیے روتے، افسردہ ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا تھا اگر ماما اس موقع پر تھوڑی اپنے دل میں محبتیں نکال کر شرکت کرتیں تو یقیناً ان خوشیوں میں کچھ رنگ حقیقی بھی پیدا ہو جاتے۔ ماما خود گئیں، ساتھ کوئین کو بھی لے گئیں تاکہ وہ بھی شرکت نہ کر سکے۔ اسے اپنی ماں کی یہ عادت شروع سے ناپسند تھی کہ وہ پسند نہ کرتی تھیں کہ وہ دادو اور چچا کی فیملی سے ملیں۔ اس کے علاوہ بھی ان سے اس کو بے حد شکایتیں تھیں مگر ان کے اس طرز عمل نے اسے سخت متاثر کر دیا تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، بھرے ہجوم میں وہ خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ مسکراتے چہرے، ہنستے لوگ اسے خود پر، اپنے والدین کی ناکام زندگی کا مستحکم اڑاتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے اندر ابھرتی وحشتوں میں اور اضافہ ہو جاتا اگر منزل اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ نہ کرتا۔

”تم! یہاں کیا کر رہے ہو وہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں، بھائی کا نکاح ہونے والا ہے۔“ منزل اسے ایک طرف توجہ دیکھ کر بولا۔

”ایسے ہی بیٹہ کیا تھا، چلو.....“ وہ اس کے ساتھ اسٹیج کی طرف آ گیا جہاں نکاح کی تیاری مکمل تھی۔ محمد صاحب نے اس کا ہاتھ تھام کر بٹھالیا تھا۔

پارکنگ لائٹ میں کاروں اور دوسری بڑی گاڑیوں کی طویل قطاریں تھیں۔ ڈرائیور کو کار پارک کرنے کے لیے جگہ نظر نہ آ رہی تھی۔

”کاکا! آپ جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کر دیں، ہم اندر جا رہے ہیں۔“ حورین بڑی عمر کے ڈرائیور سے مخاطب ہوئی اور بی بی جان کے ہمراہ آگے بڑھ گئی۔ آسانی کلر کی سیاہ ہارڈروالی ہلکی کڑھائی کی ساڑھی میں سادہ سا بھوڑا بنائے بی بی جان آج تمام دنوں سے بہت منفرد اور اچھی لگ رہی تھیں۔ گولڈ کی نازک سی جھمکیاں اور گلے میں لاکٹ چین، کلائیوں میں وہی گولڈ کی چوڑیاں تھیں جو عام دنوں میں بھی ان کی کلائیوں کی زینت بنی رہتی تھیں۔ میک آپ کے نام پر صرف آنکھوں میں کامل لگا گیا تھا۔ اس ساڈھی میں بھی ان کا سنن ہاؤس لگ رہا تھا۔

گیٹ سے کچھ اندر ان کا استقبال ایک سو بر خاتون نے کیا تھا۔

”میں ابھی آپ کو ہی کال کرنے والی تھی۔ بارات آگئی، نکاح بھی ہو گیا اور آپ کا کچھ پتا بھی نہیں تھا۔ اس سے قبل آپ ہر کام میں وقت سے پہلے آ جاتی تھیں۔“ لائٹ پر ہل شلوار سوٹ میں لائٹ میک آپ اور چیلری میں وہ خوش اخلاق و مزاج خاتون ڈالین کی والدہ تھیں۔

”سدا خوش رہو، گھر سے نام سے پہلے ہی نکلے تھے، ڈرائیور کا بھی گدھا گاڑی سے بدتر چلا کر لایا ہے۔“ بی بی سلام کا جواب دے کر ان کو مبارک باد دے کر ان سے بغل گیر ہوئی تھیں۔

”بی بی جان! یہ کس کی لڑکی ہے؟ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“ وہ حورین سے ہاتھ ملاتے ہوئے پُر اشتیاق لہجے میں بولیں۔

”قاریہ یاد ہوگی نا تمہیں؟“

”ہاں..... ہاں اچھا یہ قاریہ کی بیٹی ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیاری ہے، آئیں۔“ وہ ان کی پوری بات سنے بنا ہی بولتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھیں۔

”گوڑی کو بہت بولنے کی عادت ہے، پوری بات سنے بنا ہی.....“ وہ سرگوشی میں حورین سے مخاطب ہوئیں۔

”کوئی بات نہیں بی بی جان! فاریہ آئی مجھے می کی طرح ہی پیار کرتی ہیں۔“ وہ ان کے ہمراہ چیز پر بیٹھ گئی تھی۔

شادی کی مخصوص رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ رنگ برنگے مہنگے ملبوسات، بیش قیمت جیولری کی چمک دمک، امپورٹڈ پرفیومز کی مہکار، نہ ناز نہ مردانہ قبضوں کی جھنکاریں ماحول میں گونڈ تھیں۔

وہ بہت دلچسپی سے اردگرد کا نظارہ کر رہی تھی۔ اس کی یہاں پر یہ پہلی تقریب میں شرکت تھی اور اسے اچھا لگ رہا تھا۔

کھانا ڈیزائن نے سرد کرنا شروع کر دیا تھا۔ کئی طرح کی ڈشز تھیں۔ اس نے فروٹ سلاد اور چائیز رائس رغبت سے کھائے تھے، دہی بڑے چمکے تھے، سویٹ ڈش میں صرف رسوائی پلیٹ میں ڈالی تھی۔ اس کے برعکس بی بی جان نے ہر ڈش سے انصاف کیا تھا اور اسے بھی اصرار کرتی رہی تھیں کہ خواہ کھاؤ نہیں مگر سب چیزیں چکھو ضرور اور وہ اس کی متحمل نہ تھی۔

”آج کل کی لڑکیوں کی کوئی خوراک ہی نہیں ہے۔ ذرا سا کھایا اور بس، پھر گیا پیٹ، یہ کوئی کھانا ہوا ہلا.....؟“ بی بی جان تیسری مرتبہ چکن روسٹ اور آلو بخارے کی چٹنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اسے سرزنش کر رہی تھیں۔

”لوگ کیسے ہیں؟ بات لانے کے بعد لا کے والوں کی اصلیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ کوئی حراج و خرقہ تو نہیں دکھایا یہاں آنے کے بعد.....؟“ اکرم صاحب اور ان کی بیگم بی بی جان کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد آ کر وہ ضروران کے پاس بیٹھے پھر کوئی بلا تا تو معذرت کر کے چلے جاتے۔ اب کھانے سے فارغ ہو کر مسز اکرم آ کر ان کے درمیان بیٹھی تو بی بی جان پر تجسس انداز میں گویا ہوئی تھیں۔

”نہیں بی بی جان! بہت ہی اچھے لوگ مل گئے ہیں جتنا غیر برادری میں بیٹی دینے سے ڈر رہی تھی، میرے رب نے میری لالچ رکھ لی۔ مہکار کے سرال والے اتنے ہی اچھے اور بااخلاق، ہامروت لوگ ہیں، میں ابھی طوائف ہوں آپ کو، دیکھئے گا آپ خود بھی۔“ بی بی جان کے سرالیوں کے متعلق بات کرتے ہوئے ان کے چہرے پر طمانیت کے چراغ روشن تھے، پھر وہ حورین سے مخاطب ہوئیں جو ان کے درمیان خاموش بیٹھی تھی۔

”بیٹا! آپ کیوں یہاں تنہا بیٹھی پور ہو رہی ہیں، وہاں اسٹیج پر جائیں، دولہا ڈلبھن کے پاس ہنگامہ مچا ہوا ہے۔“ ساتھ ہی انہوں نے ایک لڑکی کو آواز دی تھی جس کا نام بینش تھا۔ وہ بہت خوشی خوشی اسے لے کر بیگ پارٹی کی طرف آئی تھی، سب سے تعارف ہوا تھا، وہ سب ڈلبھن کی کزنز تھیں۔ حورین ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

سامنے اسٹیج تھا جو کیمروں اور مووی کیمروں کی روشنیوں سے جھگڑا رہا تھا۔ ڈیپ میرون کلر کے شرابہ سوٹ میں ڈلبھن حسین لگ رہی تھی۔ اس کے برابر میں براجمان دولہا بھی شیروانی سوٹ میں بہت سویرو ڈیزائنٹ لگ رہا تھا۔ دونوں کی جوڑی بہت زبردست لگ رہی تھی۔ اسٹیج پر قبضوں کا ساز اور ہنسی کا ترنم، شوخ فقروں کا جلت رنگ بچ رہا تھا۔

بینش نے اسے اسٹیج پر لے جانا چاہا مگر اس نے یہیں بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ اچانک چونک کر سیدھی بیٹھی تھی۔ اسٹیج پر ایک معمر

خاتون کا ہاتھ پکڑ کر بے حد احتیاط سے اوپر لاتے ہوئے شخص کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہی اس کی پیشانی پر ناگواری کی گلنیں در آئی تھیں۔

”ہاؤ سو ہینڈسم، ڈشنگ، یہ دولہا کا کون ہے؟ میں کب سے اسے دولہا کے ساتھ دیکھ رہی ہوں۔“ وہاں بیٹھی ایک لڑکی ہر اشتیاق

لہجے میں بولی۔

”تم پوچھ تو ایسے رہی ہو جیسے دولہا کی پوری فیملی کو جانتی ہو۔“ دوسری لڑکی ہنسی۔

”ہاں سب کو جانتی ہوں، دولہا میاں کے دو بھائی، دو بہنیں ہیں اور یہ داوی ہیں مگر..... یہ چار رنگ پر سائلی والا بندہ کون ہے؟

نہیں جانتی۔“ جتنی اس لڑکی کی گفتگو میں بے باکی تھی، اتنی ہی نگاہوں میں بھی۔

”یہ ہنزہ بھائی کے کزن ہیں، منہ دھور کھو یہاں تمہاری دال نہیں گلنے والی۔“

”یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ وہ ڈھٹائی سے ہنس کر بولی۔

”وہ جتنے ہینڈسم، ڈشنگ ہیں، اس سے بھی زیادہ مفرد ہیں۔ دیکھا نہیں تم نے جب سے آئے ہیں، مجال ہے جو کسی کو آنکھ اٹھا

کر دیکھا ہو۔

”تم فکرمت کرو، صرف تعارف کراؤ اور پھر کام میرا.....“

”نہ بابا! مجھے شوق نہیں ہے بھڑوں کے چپے کو چھیننے کا۔“ بیٹش کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی قنطیلت بھرے لہجے میں گویا ہوئی

تھی۔ وہی نہیں، وہاں بیٹھی تمام لڑکیاں سرگوشیوں میں ذوالنون کی پر سائلی ڈسکس کر رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں ٹھہر ٹھہر کر سٹیج پر اٹھ رہی تھیں،

جہاں وہ موجود تھا۔

بے وقوف لڑکیوں کے امتحان، خواب، ہر چمکتی شے کے پیچھے بھاگنے والی ناکھ لڑکیاں جن کا معیار صرف ظاہری رکھ رکھاؤ اور

خوب صورتی ہوتا ہے۔ تصویر کا ایک رخ دیکھ کر اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دینے والی ان جیسی فضول اور احمق لڑکیوں سے اسے سخت ترین چڑ

تھی۔ وہ اٹھ گئی تھی، بیٹش اور لڑکیوں کے روکنے کے باوجود.....

”بھائی! آج تو ماحول کی رنگینی سے نگاہوں کو حرارت دیجئے، واہ! ہر سمت حسن کی فراوانی ہے، ایک سے بڑھ کر ایک حسین ہیں

ہے۔“ خنجر نے ہاتھ میں پکڑے کمرے کو گلے میں لگاتے ہوئے ذوالنون کے قریب چہرہ کر خالصانہ مشورہ دیا، جواب میں وہ درخشش سے

گھور کر رہ گیا۔

”اس کوٹ سوٹ میں بے حد سمارٹ لگ رہے ہیں آپ، کئی لڑکیوں کی مائیں آپ کا ایڈریس پوچھ چکی ہیں۔“

”اپنا ایڈریس دے دیجئے۔“ وہ ہونٹ بھینچ کر گویا ہوا۔

”دے دیا تا۔“ وہ بے ساختگی سے بولا۔

”تو زبان بند کر کے بیٹھ جاؤ۔“ خنجر کی زبان اسے ہمیشہ زچ کرتی تھی۔

”وہ شعر سنا ہے آپ نے.....“

جو چپ رہے گی زبان مخنجر

لہو پیکارے گا آستین کا“

”خضر پلیر! جاؤ یہاں سے۔“

”عربیہ سے چپ کر یہاں بیٹھا ہوں۔ اس کی اور اس کی اونگی بوگی فرینڈز کی فونو کھینچ کھینچ کر بچھ آ گیا ہوں مگر ان کی طبیعت سیر نہیں ہو رہی، تصویریں بنوا بنوا کر۔“

”دادو کی کوئی تصویر لی تم نے؟“

”ابھی تو نہیں لی، چلیں آپ کے ساتھ لیتا ہوں۔“

”رہنے دو۔ دادو ابھی وہاں مصروف ہیں، نہ معلوم اور کتنی رسومات رہ گئی ہیں، فضول ٹائم ویسٹ ہوتا ہے ہمارے ہاں۔“ وہ رست واضح دیکھتا ہوا بے زاری سے گویا ہوا۔ خضر مسکرا کر بولا۔

”آپ اپنی شادی پر ٹائم ویسٹ مت کیجئے گا۔ نکاح ہوا اور آپ ڈلبہن کو لے کر تعاقب ہو جائیے گا، جو ہوگا میں سنبھال لوں گا۔“

”شٹ آپ۔“ اس کی نگو اس پر وہ مسکراہٹ ضبط کرتا ہوا بولا۔

”او کے ہاں! اوہ..... ہو..... زبردست محسوس ہوتا ہے۔ زمین پر آکاش مع چاند ستاروں کے مجسم ہو کر اتر آیا وہ بہت خوب.....“ ایک دم خضر کی توصیف سے بھرپور آواز پر ڈالٹون کی نگاہیں بے ارادہ ہی اٹھ گئی تھی۔ سامنے سے گزرتی حورین کود کچھ کر اس کا چہرہ سپاٹ ہوتا چلا گیا۔

سیاہ ٹراڈ زرسوٹ پر بڑا سادو پٹہ پھیلائے وہ خضر کے قیاس پر پوری اتر رہی تھی۔ سیاہ سوٹ پر باریک باریک گولڈن تارے چمک رہے تھے۔ اس جگہ گاہٹ میں دمکتا چاند چہرہ دستارہ آنکھیں، پشت پر پھیلے گولڈن براؤن گھنے بالوں کی آبشار..... ادھر ادھر دیکھے بنا وہ بڑے شاہانہ انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے نگاہیں جھکالی تھیں۔

”شاید وہ ڈلبہن والوں کی طرف سے آئی ہیں۔“ خضر کی نگاہیں بہت دور تک اس کے تعاقب میں گئی تھیں۔

”تمہیں کیا مسئلہ ہے جو بے سکون ہو رہے ہو؟“

”نہ معلوم آپ کس مٹی کے بنے ہیں جو ایسے ایسے حسین شاہکار دیکھ کر بھی آپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا؟“ خضر بیٹھ کر حیرانگی سے بولا۔

اسی وقت صمد صاحب کے وہاں آنے سے وہ خاموش ہو گیا تھا۔

”انکل! کتنا وقت اور لگے گا؟“

”زیادہ نہیں..... بس رخصتی ہونے والی ہے۔“ صمد صاحب اس کے شانے پر مسکرا کر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”بی بی جان! کب تک چلیں گی؟“ وہ ان کے قریب آ کر استہوار کرنے لگی۔

”چلتے ہیں بیٹا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ سزا کرم بی بی جان کو ڈیپن کے پاس لے گئی تھیں، تاکہ وہ اسے دعائیں دے سکیں۔ وہ سائینڈ میں کمزری ہو گئی تھی، تب ہی اسے کسی کی بڑے حدت لگا ہوں کا احساس ہوا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، فرسٹ رو میں کچھ دور بیٹھا ڈالٹون اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور لگا ہیں ملتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات ایسے اُبھرے جیسے یک دم منہ میں کوئی کڑوی شے آ گئی ہو۔ ایک انداز سے وہ گردن موڑ چکا تھا۔

”ہونہہ..... بے شرم کہیں کا.....“ اس نے جمل کر سوچا۔

☆.....☆.....☆

انس بزنس ٹور سے واپس آ چکا تھا۔

کرن کی اُتری صورت و کمزور صحت نے اسے آتے ہی اس کی جانب سے ہٹ کر دیا تھا۔ فاریہ کی زبانی وہ تمام صورت حال سے واقف ہو گیا تھا، حالانکہ کرن نے بہت کوشش کی تھی کہ کم از کم آتے ہی اس کی طرف سے انس کسی پریشانی و فکر میں مبتلا نہ ہو مگر..... جو دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے ہوں، چاہت جن کی وقاؤں پر نازاں ہو، ایسے چاہنے والوں سے کچھ چھپا نہیں رہتا، بن کہے وہ سب جان جاتے ہیں۔“

دن بھر وہ ان کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہا تھا۔ کراچی بات بھی چاروں بچوں سے کی تھی پھر رات میں وہ کرن کو سمجھانے کے ارادے سے بیٹھ گیا تھا۔

”ایک ماہ چار دن میں تم سے دور رہا ہوں..... اس تھوڑے سے عرصے میں تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے؟“ اس نے اس کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے سنجیدہ تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے، آپ کو وہم رہتا ہے۔“

”وہم کے صحرا میں تم ابھی تک بھٹکتی پھر رہی ہو، وقت جن اور اوراق کو اپنے منگ لے جا چکا ہے، ان لفظوں کی دہشت میں تم ابھی تک مبتلا ہو، کم آن یا راتھو کر مار کر اس خوف کے کچے گھڑے کو توڑ دو، جس نے ہماری زندگی جیتے جی جہنم بنا دی ہے۔“ اس کے لہجے میں کرب و یاسیت تھی۔

”میں کیا کروں؟ میں خود سے ایسا کچھ نہیں کرتی ہوں، خوش رہنا کس کو اچھا نہیں لگتا، میں بھی خوش رہنا چاہتی ہوں، خوش رکھنا چاہتی ہوں، آپ کو اور ہم سے وابستہ لوگوں کو لیکن..... لیکن میرے اندر جو سرگوشیاں ہوتی ہیں، وہ مجھے خوش رہنے نہیں دیتیں، ہنسنے نہیں دیتیں۔“ وہ یک لخت رو پڑی تھی۔ انس نے اسے سینے سے لگا لیا اور گویا ہوئے۔

”کیا میری محبت پر، میری وفا پر، میرے بازوؤں پر بھروسہ نہیں ہے تمہیں؟ خدا کی قسم، کبھی کوئی ایسی بات ہوئی تو پر اٹھنے والی

آٹھیس نکال دوں گا۔ تمہاری طرف بڑھنے والے قدموں کو موت کی نیند سلا دوں گا، تم پرواہ کیوں کرتی ہو.....؟" اُس کا لہجہ محبت کی آگ میں دھکا ہوا، بڑبڑاتا تھا۔ اس کے ہر لفظ میں سچائی و محبت کی مہک تھی، کچھ ایسی ہی جنونی محبت وہ اس سے کرتا تھا۔

"یہ آپ نے کیسے سوچ لیا، آپ کی محبت پر جس دن شک کروں وہ لمحہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہو۔ یہ آپ کی محبت ہی تو ہے جس نے وہی بنا دیا ہے مجھے۔"

"جدائی والی باتیں نہیں کیا کرو یا..... ابھی تو زندگی ڈھنگ سے نہیں گئی۔ ہم نے حیات کا بہت سارے گناہے اچھے۔ وہ اسے ہانپوں میں بھرتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں بولا اور وہ دل کی بات دل میں ہی چھپا گئی تھی کہ کس طرح بتاتی اسے اس کے وہم حقیقت کا چہرہ دکھانے لگے ہیں، اندر ہوتی سرگوشیاں اب واضح ہونے لگی ہیں۔

برہان لغاری کا اتنے قریب سے نظر آنا کوئی وہم نہیں تھا، اس دن کوئی نیکی آڑے آگئی تھی جو اس کی نگاہ ان پر پڑ گئی تھی، ورنہ معاملہ برعکس بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اسے دیکھ لیتے اور وہ بے خبر رہتی جس طرح برہان لغاری رہے تھے پھر کیا ہوتا.....؟ وہ زمین پر ہونے کی بجائے زمین کی تہہ میں لاش بن کر پڑے ہوتے اور حورین..... حورین اس کا کیا حشر کرتے..... اپنے باپ سے اسے کسی خیر کی توقع ہرگز نہ تھی۔ وہ جانتی تھی انسانی روپ میں پوشیدہ وہ ایک بھیڑیا، ایک ورنہ ہے جو اپنے دشمنوں کی نسلوں کو بھی نیست و نابود کر کے چھوڑتے ہیں پھر اس بات کا کیا ثبوت تھا کہ وہ دوبارہ نہ ملیں گے؟

☆.....☆.....☆

ہنزہ کے دیسے کے ایک بچے بعد منال واپس آگئی تھیں۔ اس دوران برہان لغاری اور قاتلہ بھی اسلام آباد سے آچکے تھے۔ منال بہت فریش اور خوب صورت نظر آ رہی تھیں، وہاں جا کر انہوں نے اپنے پیمرا اسٹائل بدل دیا تھا اور اس پیمرا اسٹائل میں وہ اپنی عمر سے کئی سال پیچھے نظر آ رہی تھیں۔ قاتلہ بیگم نے ان کو بہت سراہا تھا۔

برہان لغاری بزنس میننگ کی وجہ سے جا چکے تھے، وہاں وہ چاروں بیٹھے تھے۔ منال قاتلہ کو اپنے نور کے بارے میں بتا رہی تھیں جس میں تقریباً نانوے فیصد شاپنگ اور بیوٹی ٹرینٹ کے متعلق گفتگو ہوتی تھی۔ کونین سے باتیں کرتے ڈوائنوں کی سماعتوں میں بخوبی ماں کی آواز پہنچ رہی تھی۔

"ہنزہ کا موڈ کیسا رہا؟ شادی کے دوران مجھے ہار ہار کال کرتا رہا تھا۔"

"بہت مس کر رہے تھے بلکہ سب نے ہی بے حد مس کیا تھا آپ کو۔"

"مجھے معلوم ہے..... شاید نصیب میں نہیں تھا اس کی شادی میں شرکت کرنا، اپنی وے اس کی بیوی کیسی ہے، ملاقات تو ہوئی ہوگی؟" کونین نے وہ وقت بڑی مظلوموں سے گزارا جب ہنزہ کی شادی کی تقریبات ہو رہی تھیں اور وہاں وہ بند کرے میں شدید یوریت و دل گرفتگی کا شکار ہو رہا تھا، کیونکہ وہاں انہوں نے دو تین معمولی سی بزنس میننگز میں شرکت کی تھی جن میں کسی مشینری کا کوئی ذکر تک نہ تھا۔

منال جموٹ بول کر آئی تھیں اور اس بار ماں کی غلط بیانی پر اسے از حد ملال ہوا تھا مگر ایک لفظ اس نے نہیں کہا تھا، صرف خاموشی سے اپنے بیڈروم تک محدود ہو گیا تھا جس کا منال نے کوئی نوٹس نہ لیا تھا، ویسے بھی ان کو اپنی ذاتی دلچسپیوں سے فرصت نہ تھی۔

”وہ کیسی ہیں؟ یہ آپ ان سے مل کر دیکھئے گا، ورنہ جہاں تک میرا خیال ہے، عورتیں تمام ایک ہی فطرت کی ہوتی ہیں۔“ ذوالنونو شائے اُچکا کر بولا۔

”میں شام تک جاؤں گا تم بھی چلو گے؟“

”نہیں..... میں ماما کے ساتھ جاؤں گا۔“ وہ ماں کی جانب دیکھتا ہوا قدرے بلند لہجے میں گویا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

”اوہ! امیڑنگ ڈے، کہاں چلیں گے آپ میرے ساتھ؟“ منال خوشی سے چبکتی آواز میں مخاطب ہوئی تھیں۔

”مشینری دیکھنے.....“ ان کی جانب دیکھتا ہوا ذوالنونو سے بولا۔

”مشینری..... کون سی مشینری.....؟“ بے دھیانی میں وہ پوچھ بیٹھی تھیں۔

”جو آپ نوکیو سے لینے گئی تھیں جو بے حد اہم تھی۔“

”وہ..... وہ مشینری ایچو نیلی.....“ سچ کے سامنے جموٹ اس طرح بے نقاب ہوتا ہے، وہ فوراً ہی کوئی جواز پیش نہ کر سکتی تھیں۔ اسی وقت بیٹی کا ہاتھ دبا کر فائدہ لاد بھرے لہجے میں کہنے لگیں۔

”ڈیزاؤ ڈینگ آپ کے نانا جان کریں گے، دراصل پیچرز پر برہان کے دستخط تھے۔“ وہ کہہ رہی تھیں اور جو باہا ذوالنونو کے چہرے پر پھیلنے والی گہری سنجیدگی دونوں ماں بیٹی کو بخیل کر چکی تھی۔

”آپ کے لیے بڑی فنکارانہ شاپنگ کی ہے میں نے۔ ایک سوٹ کیس آپ کے سامان سے بھرا ہوا ہے، اس میں آپ کے فرینڈز کے لیے بھی گفٹس ہیں۔“

”تھینکس اے لائٹ ماما سامان اور چیزیں کبھی رشتوں کا نعم البدل نہیں بن سکتے۔ آپ بہت زیادتی کرتی ہیں۔“ وہ دھمے لہجے میں گویا ہوا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور اس کے پیچھے کونین بھی چلا گیا تھا۔

”دیکھا ماما جب سے آئی ہوں، اکثر اکڑا ہے۔ مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا ہے۔ یہ زہرا اس بڑھیا کا بھرا ہوا ہے۔ وہ چاہتی یہی ہے جس طرح اس کا بیٹا چھوڑ کر بھاگ گیا، اسی طرح مجھے بھی بیٹے چھوڑ دیں۔“ منال منہ بنا کر ماں سے مخاطب ہوئی تھی۔

”بے فکر ہو ڈیئر! ایسا کچھ نہیں ہوگا، تمہارے بیٹے تمہارے ہی رہیں گے، کونین کی کوئی فکر نہیں ہے۔ وہ چلتا ہے آپ کے اشاروں پر، پرائس پرائیم کرتا ہے۔ اس کو ہینڈل کرو، اس کے انداز سے ٹائم نکال کر اس کے ساتھ چلی جاؤ، وہاں کچھ دیر بیٹھ کر گفٹس وغیرہ

دے کر چلی آنا۔ اس سے پرنس بھی خوش ہو جائے گا اور تمہاری سسرال پر بھی رعب پڑ جائے گا۔“ قائد نے نرے سوچ انداز میں حل نکالا۔

”مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔ میں نہیں جاتی وہاں.....“ ان کے اعزاز میں مخصوص کبیڈگی اور نفرت تھی جو وہ ان سے کرتی تھیں۔  
 ”اتنی جلدی نمبر لوز مت کرو، بات سمجھنے کی کوشش کرو“۔ انہوں نے سخت لہجے میں سرزنش کی۔  
 ”آپ وہاں جانے کی بات کر رہی ہیں، مجھے ان کے ناموں سے نفرت ہے۔“

”میں نے کب کہا ان سے نفرت مت کرو..... مگر جب دوسروں کی آگ اپنے گھرنک آنے کا اندیشہ ہو تو مکمل پانچک کی جاتی ہے۔ پرنس کی وجہ سے آپ کو اپنی نفرت کو تھوڑا سمٹنا کرنا ہوگا ورنہ..... وہ تمہاری ریخ سے آؤٹ ہو جائے گا۔“ فائنڈ بیگم ہمیشہ کی طرح منال کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ وہ گہری سانس لے کر گویا ہوئیں۔  
 ”ٹھیک ہے ماما! کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو دل نہ چاہنے کے باوجود ہمیں کرنے پڑتے ہیں کیونکہ اس میں ہماری کامیابیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہے پرنس کے بغیر میں زندہ بھی نہیں رہ پاؤں گی۔“

☆.....☆.....☆

”ہریرہ..... ہریرہ“۔ حورین اسے آوازیں دیتی ہوئی لاڈلج تک آئی تھی جہاں وہ آرام سے کشتز کے سہارے نیم دراز ٹی وی پر اسپورٹس چینل لگائے بیٹھا تھا، ساتھ ہی سحود اور وصی بھی تھے۔

”میں ہر طرف تمہیں آوازیں دیتی پھر رہی ہوں اور تم جواب نہیں دے رہے۔“ وہ اس کے قریب پہنچ کر پاؤں بیخ کر بولی۔

”بہت پیاری ہے آواز تمہاری

اسے سنتے رہنے کو دل چاہتا ہے

میں زندگی میں اور کیا چاہوں

اگر مل جائے رفاقت تمہاری“

وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے عاشقانہ اعزاز میں کہہ رہا تھا۔ وصی اور سحود نے مسکراہٹ نہیڈ کرنے کے لیے سر جھکا لیے تھے۔

”سٹ آپ! کبھی سیریس بھی ہو جایا کرو۔“

”میں تو سیریس ہی ہوں، رب جانے تم کب سیریس ہوگی؟“ وہ آہ بھر کر معنوی ڈومستی لہجے میں گویا ہوا۔

”تم سے بات کرنا ہی فضول ہے، دیکھنا میں تم سے بات نہیں کروں گی۔“ وہ غصے سے بھر کر جانے لگی۔ ہریرہ نے پک کر اس کا

زمین کو چھوٹا آنچل پکڑا اور گویا ہوا۔

”یوں ناراض ہو کر غصے میں جایا نہیں کرتے

اپنے دیوانوں کو ستایا نہیں کرتے

ہر وقت بس جسے تمہارا خیال ہو



اسے اپنی دوستی کے لیے تڑپایا نہیں کرتے۔

”صبر کرو، ابھی میں تمہاری ساری عاشقی نکلاؤتی ہوں۔ بی بی جان۔“ وہ اس سے دوپٹے کا پلو چھڑوا کر آگے بڑھتے ہوئے بی بی جان کو پکارنے لگی تھیں۔ اسی لمحے ہریرہ دروازے میں کھڑا ہوا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر منت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

”میں نے سنا ہے، ہم اسلام آباد جا رہے ہیں، کیا درست ہے؟“

”یہ خبر کسی دشمن کی اڑائی لگ رہی ہے۔“

”دیکھو تم پھر پٹری سے اتر رہے ہو..... آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے، تم سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے؟“ وہ نرمی طرح زنج تھی۔

”پہلے تم وعدہ کرو..... شادی صرف مجھ سے کرو گی۔“ وہ اس کی براؤن دل کش آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ دانت بلیک پرنٹڈ کاشن کے سوٹ میں اس کی سرخ و سپید رنگت نمایاں تھی۔

”اوہ شٹ انداق کی بھی حد ہوتی ہے۔ آپ لوگ جا رہے ہیں اگلے ہفتے، ایک ویک اینڈ کے لیے.....“ وہی کو اس پر ترس آئی گیا۔ وہ ہریرہ کو ڈپٹ کر حورین سے مخاطب ہوا۔

”اوہ..... سچ..... آپ لوگ بھی چل رہے ہونا.....“ ممالیچا سے ملنے کی خوشی سے اس کے چہرے پر گلاب کھل اُٹھے تھے۔

”نہیں بہنا! اگلی دفعہ ہمارا جانا ہوگا، آپ لوگوں کے ساتھ لمبی چٹھیوں میں گھومنے کا مزہ آتا ہے۔ سب ہوں گے، خوب انجوائے منٹ ہوگی۔ ابھی تو آپ لوگ ہی جائیں کیونکہ آپ کی ماما آپ کو مس کر رہی ہیں۔“ رات بھر مارے خوشی سے اسے نیند مشکل سے آئی تھی۔

بات ان سے روز ہوتی تھی مگر جو راحت ایک دوسرے کی قربت میں ملتی ہے۔ اس نے اس کے اندر بہت زیادہ نفسی بھردی تھی۔ اس کی خواہش تھی، وہ ہر ویک اینڈ اسلام آباد میں گزارے مگر یہاں بھی بی بی جان کی حکمت عملی کام آئی، انہوں نے نیندی سے منع کر دیا کہ وہ ان کو نہیں بھیجیں گی کہ اس طرح وہ اپنی بھرپور توجہ پڑھائی کی طرف نہ دے سکیں گے، البتہ دو تین ماہ بعد چند دن کے لیے وہ آ جائیں گے۔

”ایکسکیوز می مس!“ وہ ڈپارٹمنٹ کی جانب بڑھ رہی تھی، پیچھے سے آتی مردانہ آواز سن کر وہ زکی تھی اور مڑ کر دیکھا تھا۔ لائٹ گرے پینٹ، ریڈیٹی شرٹ میں ملیس وہ کوئی اجنبی شخص تھا۔

”جی.....“ اس کے چہرے پر ابھی ڈاڑھی موٹھیں تھیں۔ حورین کو جو اس کی حرکت ناگوار گزری، وہ اس کا نرمی طرح گھور کر دیکھتا تھا۔

”یہ پاؤچ آپ کی فائلز سے گرا ہے۔“ اس نے پشت کی طرف کیا ہوا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تھا۔ اس میں پنک ٹکر کا پاؤچ تھا۔

”بہت شکریہ آپ کا۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے پاؤچ لے لیا۔

”ارے شکریہ کی کیا بات ہے، ہمارا کام ہی مدد کرنا ہے، میرا نام رؤف ہے مگر میرے دوست.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر ہنسا۔ دشمن بھی مجھے روکی پکارتے ہیں۔“ اس کی وحشت خیز نگاہیں حورین کے چہرے پر جمی تھیں۔

”میری کلاس کا نام ہو رہا ہے۔“

”مس! آپ کو کوئی کام ہو، کوئی پریشانی ہو، کسی اسٹوڈنٹ سے شکایت ہو یا پروفیسر سے، مجھے بتائیے گا، سب پر حکومت چلتی ہے میری۔“ اس کے لہجے میں بد معاشوں جیسی ہٹ دھرمی، فخر و غرور تھا۔ حورین خاموشی سے وہاں سے چلی گئی اور وہ اوجھل ہونے تک اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس کے ساتھی قریب آ گئے تھے۔

”کیوں استاد! میں نے کہا تھا، اسے دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔“

”قمیڑ سے نام لے، جانتا ہے وہ کون ہے اب؟“ رؤف عرف روکی اپنے ساتھی کو غصے سے دیکھتا ہوا گویا ہوا۔

”سوری ہاس! وہ زبان ذرا بے قابو ہو جاتی ہے۔“ وہ کان پکڑ کر بولا۔

”ہاس! اب تو قافیہ اشار میں ڈر پکا ہے نا۔“ دوسرا ساتھی خوشامدی لہجے میں بولا تو اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ساتھی خوشی سے شوخیاں کرتے آگے بڑھ گئے اور اسی دم درخت کے پیچھے کھڑا حیدر نگہرات میں گھر گیا تھا۔ وہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ روکی کو حورین سے بات کرتے دیکھ کر رک گیا تھا، تمام گفتگو سننے کے بعد وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے کیا ارادے ہیں؟ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

حورین ختم ہونے کے بعد وہ کینے ٹیریا میں بیٹھی چائے اور سموسوں سے پیٹ بھر رہی تھیں۔ موضوع روکی کی ذات تھی۔ ان سب نے بھی ٹیلیزی سے دیکھا تھا۔

”تمہیں ذرا ڈر نہیں لگا اس سے ہاتس کرتے ہوئے؟“ ٹرین کے لہجے میں خوف کا عنصر نمایاں تھا، یہی تاثرات ان چاروں کے بھی تھے۔

”میں تمہاری طرح بزدل نہیں ہوں پھر وہ ایک انسان ہی تو ہے، کوئی آدم خور مگر مجھ نہیں۔ ایک ذرا سی بات کا تم نے اتنا بڑا جھگڑا بنالیا ہے۔“ حورین نے سموسہ کھاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”آدم خور مگر مجھ اس کے آگے بے ضرر ہے۔ بہت دہشت ہے اس کی یہاں پر، پچھلے سال میرا کزن یہاں پڑھتا تھا، اس نے بتایا تھا کسی معمولی سی بات پر مشتعل ہو کر روکی نے پچھلے سال دو اسٹوڈنٹ کو گولی مار کے ہلاک کر ڈالا تھا اور کوئی کچھ نہ کہہ سکا تھا اس سے۔“

”پلیز آئندہ اس کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ بہت خوف آتا ہے اس سے، بلکہ یہاں ہر لڑکی کو اس سے بچ کر چلا دیکھا ہے۔“ وہ ایک کے بعد ایک اسے سمجھا رہی تھیں اور اسے بلاوجہ ہنسی آ رہی تھی۔

”ہو جائے شرط اگر میں نے.....“

”نہیں..... نہیں..... اس کے لیے کوئی شرط نہیں لگے گی۔“ وہ دل کر بولیں۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے حورین، یہ کوئی ایڈونچر نہیں ہے جو تم اس قدر بڑے جوش ہو رہی ہو، وہ ایک خطرناک بندہ ہے..... وہ

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

ایک مجرم ہے، جس کا کام ہی دہشت گردی کرنا اور بے گناہوں کو پریشان کرنا ہے۔ وہ ایک بڑی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے، ایسے لوگ جائز و ناجائز کی پروا نہیں کرتے، کیونکہ ان کے پیچھے بے حد اثر و رسوخ والے لوگ ہوتے ہیں۔“ وہ چائے سمو سے بھول کر اسے سمجھانے لگ گئی تھیں، کیونکہ ان کا اور حورین کا ساتھ کئی ماہ پر محیط تھا۔ اس عرصے میں وہ اس کی خمدی طبیعت کے متعلق جان گئی تھیں۔

”بہت عرصہ ہو گیا شرط لگائے ہوئے۔ یہاں آ کر میں شرط لگانا بھول گئی ہوں۔“ وہ بدستور شوخ موڈ میں تھی۔

”خدا کے لیے ہوش کے ناخن لوجورین۔“ مول نے پوکھلا کر کہا۔

”کہاں ملتے ہیں؟“ وہ بر جھکتی سے بولی تو اسے چند سیکنڈ گھورنے کے بعد وہ ہنس پڑی تھیں۔

”میں سمجھ گئی دوستو! لیکن میں بلاوجہ کسی سے خوف زدہ ہونے والی نہیں ہوں۔ نہیں تو میں مقابلہ کرنے کی جرأت رکھتی ہوں۔ تم لوگ لائبریری آ جانا مجھے نوٹس کے لیے تیاری کرنی ہے۔“ حورین چائے کا خالی گنگنیل پر رکھتے ہوئے بولی اور بیک اور فائز اٹھا کر باہر نکل آئی۔

کوریڈور میں اسے ڈوائنون کا پورا گروپ کھڑا نظر آ رہا تھا، ساتھ وہ بھی تھا۔ بلو جینز، بلیک شرٹ میں دنیا بھر کی سنجیدگی چہرے پر طاری کیے وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان ہونے والی بحث سے خاصا لائق و قدرے بے زار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تمام راستہ بلاک کر کے کھڑے تھے۔ حورین نے وہاں سے جانا مناسب نہیں سمجھا، وہ واپس مڑنے لگی تھی، تب ڈوائنون کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرانی تھی۔

”بس شتم، ہمیں کسی کے فیئر میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔“

”وہ لڑکی کا معاملہ ہے یا رہم کس طرح بے لکری سے بیٹھ سکتے ہیں۔“ مڈر جنڈ بانی انداز میں گویا ہوا تو ان سب نے ہنس ہنس ہنس مٹائی۔

”گزشتہ دو سالوں میں روکی گروپ سے ہماری بہت مارا ماری ہو چکی ہے اور جب سے کچھ بے گناہ لڑکوں کی جانیں ضائع ہوئی ہیں، تب سے میں تہیہ کر چکا ہوں، ہم اسے بالکل نظر انداز کریں گے، ایسا کرنے سے وہ دم دہائے بیشار بتا ہے۔“ وہ سخت لہجے میں بولنا چلا گیا، اسی دم حیدر کی نگاہ اس کی طرف اٹھی تو وہ کچھ گڑبڑا سا گیا تھا جب کہ ڈوائنون کہہ رہا تھا۔

”لڑکیاں یہاں پڑھنے نہیں، اپنے پرپوزل تلاش کرنے آتی ہیں۔ گمر بیٹھے بیٹھے انتظار کرنے سے بہتر یہ لڑکیاں اس طرح چلی آتی ہیں۔ ان کے پیچھے مغز ماری کرنا بالکل فضول ہے۔“ حیدر کے ساتھ ساتھ دوسرے بھی اس طرف متوجہ ہو گئے تھے جہاں حورین اپنے متعلق اس کا ریمارکس بن کر آگ بگول ہو گئی تھی۔ واپس جانے کی بجائے وہ ادھر آگئی۔

”کیا کہا آپ نے..... لڑکیاں یہاں پرپوزل تلاش کرنے آتی ہیں؟“ وہ ڈائریکٹ ڈوائنون سے مخاطب ہوئی تھی جس کی گہرے آنکھوں میں لمحہ بھر جیرا گئی نمودار ہو کر محدود ہوئی تھی۔ وہ اس کی وہاں موجودگی سے یکسر لاعلم تھا۔

”بالکل، میں نے غلط نہیں کہا۔“ اس کے لہجے میں اکٹھڑپن تھا۔

”پلیز..... پلیز! میری بات سنیں مس حورین۔“ حیدر پریشانی سے اس سے مخاطب ہوا تھا۔ مول اور شرین وغیرہ بھی وہاں آگئی تھیں۔ دوسرے اسٹوڈنٹس بھی جمع ہونے لگے تھے کیونکہ یہ راستہ لائبریری سے ملحقہ تھا۔

”کیا ہوا حورین! اتنا غصے کیوں ہو رہی ہو؟“ مول اس کے سرخ تھے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”ان صاحب کا کہنا ہے کہ لڑکیاں یہاں پڑھنے نہیں پڑھتی، پر پڑھو گھڑنے آتی ہیں۔“ غم و غصے سے اس کی آواز کانپ رہی تھی، جبکہ ذوالنون اطمینان سے اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

”تم کیوں اتنا مہم لوز کر رہی ہو، جانتی ہو وہ کیسا بندہ ہے، چلو فضول میں یہاں تماشہ بن رہا ہے۔“ مول نے سرگوشی کی۔

”ان کو معافی مانگتی ہوگی، اپنے الفاظ واپس لینے ہوں گے۔“

”مس اخدا کے لیے، آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں، ذوالنون نے آپ کو نہیں کہا ہے۔“ مامون نے حورین سے کہا۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں.....؟“ پروفیسر آفتاب حسن صالح ہاں آ کر مخاطب ہوئے تو وہ سب ہی مؤدب ہو گئے تھے۔

”آفس میں آئیں آپ لوگ۔“ وہ باری باری حورین اور ذوالنون پر نگاہیں ڈال کر گویا ہوئے اور ان کے جاتے ہی وہاں سے بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ وہ لوگ سر آفتاب کے روم میں بڑھ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

حسب معمول کونین کا استقبال گرم جوشی سے کیا گیا تھا۔

وہ جو یہ سوچ سوچ کر شرمندہ ہو رہا تھا کہ ہنزہ کی شادی میں شرکت سے انکار کرنے اور اس طرح اچانک چلے جانے پر وہ کس کس کو وضاحت دے کر مطمئن کرے گا اور ہمیشہ کی طرح اس کو کسی جھوٹ یا بہانے کا سہارا نہ لینا پڑا تھا۔

عجب لوگ تھے وہ..... شکوہ..... شکایت..... بگ.....

ان کی سرشت میں شامل نہ تھا۔ بڑی محبت سے سب پیش آئے تھے۔ دادو اسے لپٹائے خاموش آنسو بہاتی رہی تھیں۔ صبر چاچو،

صنوبر آئی، منزل اور عریہ کسی نے اسے نہیں جتایا بلکہ ایک بار عریہ نے کہا بھی کہ انہوں نے اپنے دوست کی شادی مس کر دی تو صنوبر آئی نے اسے سرزنش کی تھی۔

ہنزہ اپنی بیوی کے ساتھ آج صبح ہی منی مون کے لیے روانہ ہوا تھا۔ کونین سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

”کیا سوچتے رہتے ہو؟ کتنا کمزور کر لیا ہے خود کو تم نے۔“ تنہائی میسر آتے ہی دادو تشویش بھرے انداز میں مخاطب ہوئی تھیں۔

”آپ لوگوں کو بہت مس کیا ہے دادو۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا، بزنس مینٹنز کے علاوہ تمام ٹائم میرا روم میں گزرا ہے۔“ ان کی

شفقت بھری آغوش میں سر رکھ کر اس کے کتھن دل کو قرار ملنے لگا تھا۔

”میں جانتی ہوں میرے بیٹے! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو دہرانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دل کو دل پہلے ہی آگاہ کر دیتا

ہے پھر ہم سب اس ڈور سے بندھے ہوئے ہیں جس کو نصیب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہم سب نصیب کی کٹھ چتلیاں ہیں میرے بیٹے۔

اس کی جنبش پر ہماری آرزوئیں، حسرتیں، تمنائیں اپنا وجود پاتی ہیں۔“

”کونین بھائی! چلیں آپ کو بھائی کی شادی کی سووی دکھائیں۔ آپ کے خیال میں میں نے ہر ایونٹ کی مکمل کوریج کی ہے۔“

حضرت آرتے ہوئے گویا ہوا۔

”حضرتی کو آنے دو، پھر سب بیٹھ کر دیکھنا۔“ دادو نے کہا۔

”حضرتی کہاں ہے، مجھے نظر نہیں آئی، جب سے آیا ہوں۔“ جس دشمن جاں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس رہی تھیں، ہر آہٹ پر

جس کا گماں تھا، اس کے ذکر پر اس کے اندر کیف و سرور پھیلنے لگا تھا۔

”ہاسٹل گئی ہوئی ہے، رات کو کوئی ایمر جنسی آگئی تھی تب سے وہیں ہے۔“ اسی وقت صنوبر نے آکر حضرت سے کہا کہ وہ حضرتی کو

لے آئے۔

”مئی! مجھے ایک ضروری کام سے ابھی جانا ہے۔“ وہ رست واضح دیکھتا ہوا گویا ہوا۔

”ابھی تو سووی دیکھنے بیٹھ رہے تھے، ماں نے کام کا کہا تو تمہیں ضروری کام یاد آ گیا؟“ دادو اسے گھور کر پوچھیں۔

”میں کوئی کام چور تھوڑی ہوں دادو جان، وہ تو.....“

”اوکے..... میں چلا جاتا ہوں حضرتی کو لینے۔“ اس کی دلی مراد برآئی۔ وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بنا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اللہ مرد را ذکرے، آپ کا بیک اپنا پن مجھے پسند ہے، میں اسے میں کھانا تیار کر داتی ہوں۔“ صنوبر نے ستائشی لہجے میں کہا۔

وہ سرور سا کارڈ رائیو کرتا ہوا ہاسٹل پہنچ گیا پھر حضرتی کو کار تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

”اسٹوڈنٹ اتی دیر سے آئے ہو، کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ ممانے ایک گھنٹہ پہلے فون کیا تھا۔“ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر پرس

ڈیش بورڈ پر رکھ کر سیٹ بیک سے سر ہکا کر آنکھیں بند کر کے بولی۔

”کونین نے کار اشارت کرتے ہوئے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

خوب صورت چہرے پر تھکن سے لرزاں چٹکیں..... سیاہ بالوں کی بے ترتیب ٹیپ.....

اس نے حسن کو اتنا بے پروا دیکھی نہ دیکھا تھا، وہ ہر ایک کا خیال کرنے والی فقط خود سے ہی لاپرواہ تھی اور اس لاپرواہی میں بھی

اس کا حسن سحر انگیز تھا۔

”ارے سورج کس سمت سے نکلا ہے، جو تم اتنے خاموش بیٹھے ہو۔ کیا پچانے کسی بات پر کورٹ مارشل کیا ہے؟“ حضرتی موجودگی

میں اتنی خاموشی معنی خیز تھی۔ وہ کہتی ہوئی آنکھیں کھول کر بیٹھی تو ڈرائیو تک سیٹ پر خلاف معمول کونین کو دیکھ کر بوکھلا گئی۔

”آ..... آ..... آپ؟ ممانے کہا تھا، حضرت کو بھیج رہی ہیں۔“ وہ اس وقت شرمندگی سے نگاہ نہ اٹھا پارہی تھی۔

”جی..... میں..... میں نے سوچا، حضرت روز ہی یہ کام انجام دیتا ہے، کبھی ایسی خدمت ہمیں بھی کر لینی چاہیے۔“ وہ دل کشی سے

مسکرا کر گویا ہوا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی تمام تر کوفت و بے زاری بھول گیا تھا۔ گویا کوئی جادو کی چمڑی لہرا کر سب غم بھلا دیئے۔

”آتم سوری! میں نہ معلوم کیا کیا کہہ گئی خضر سمجھ کر۔“

”نہیں کوئی بات نہیں، مجھے بُرا نہیں لگا، اگر گالیوں میں بھی محبت و اچانیت ہو تو میں رات دن کھانے کو تیار ہوں۔ خلوص و مروت سے آپ مجھے جوتے بھی لگا نہیں گی، تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ وہ مسکراہٹ چھپائے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ جو اب خضرئی مارے شرمندگی کے نگاہ اٹھانے پاری تھی اور وہ کارڈ رائیو کرتے ہوئے اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”پلیز ایسا مت کہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا..... میں..... میں ایسی بد تمیزی کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

کوئین ہنس پڑا۔

”اوہ گاڈ! مت روؤ بھئی! میں تو مذاق کر رہا تھا، کیسا چڑیا سا دل ہے تمہارا اور بین بیٹھی ہو ڈاکٹر۔ مریض تکلیف سے بعد میں روتے ہوں گے، پہلے آپ ہی رونے لگتی ہوں گی۔“ وہ اسے چھبڑتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں..... میں مریض کو سنبھالنا جانتی ہوں۔“ اسے ہستے دیکھ کر وہ سنبھل کر بولی۔ ”آپ کب آئے؟“ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی بولی۔

”کل رات کو.....“

”کیسا رہا آپ کا سفر.....؟“

”جس میں بہت مس کیا میں نے۔“ خلاف توقع وہ اس لمحے اپنے جذبوں کی زور آوری سے ٹھکت کھا کر گویا ہوا۔

”آپ..... کو بھی بہت مس کیا، سب نے بھائی کی شادی کے ہر فنکشن میں.....“ وہ لگا ہیں چرا کر گویا ہوئی۔

”مجھے معلوم ہے لیکن اس وقت میں اپنی اور تمہاری بات کر رہا ہوں..... کیا تم نے بھی اسی طرح مس کیا مجھے جس طرح میں نے

لمحوہ، تمہاری یاد میں، تمہاری چاہ میں، تمہاری جستجو میں گزارا ہے، کیا ایک پلی بھی تم نے ایسا گزارا ہے؟“ وہ ڈاکٹرین پر لگا ہیں جمائے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ گم سم بیٹھی خضرئی سے مخاطب تھا اور وہ کب سے لاشعوری طور پر کسی ایسے ہی وقت سے ڈرتی تھی جو اس پر بھی وارد ہوا تھا۔ کوئین کی بدلتی نگاہوں کے جذبوں کی خبر اس کے دل کو بعد میں ملی ہوئی۔ اس کی حساس طبیعت بہت پہلے یہ راز جان گئی تھی اور احتیاط برتنے لگی تھی مگر جب انہونی ہوتی ہے تو.....

”خضرئی! اتنی گہری خاموشی؟ کچھ تو کہو.....“

”کیا کہوں.....؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

”کچھ بھی..... اقرار..... انکار.....“ اس نے کارایک سائیز پر روک دی تھی۔ کچھ قاصطے پر کولڈ اسپاٹ تھا۔ ہارن بجانے پر ایک

لڑکا کولڈ ڈرنک دے کر چلا گیا تھا۔

”میں آپ کی بات سمجھ نہیں پاری ہوں۔“ وہ کانپتے ہاتھوں سے کولڈ ڈرنک لیتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

”اوہوں..... سمجھتے ہوئے بھی نا سمجھ بننے کی سعی نہ کرو۔ ہم ٹین ایجر نہیں ہیں جہاں ان تین لفظوں کی اداسگی کے بغیر جذبوں کا

اظہار کمال نہیں ہوتا ہے۔ ہم ڈی شعور ہیں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

”ان تمام دعوؤں کے باوجود پھر کیسی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں..... میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہی ہوں، میں شادی وہیں کروں گی جہاں گھر والے کہیں گے، کیونکہ ہمارے لیے ہمارے بزرگ ہم سے بہتر و عمدہ فیصلے کرتے ہیں۔ بہترین سوچ سکتے ہیں۔“

”اوہ..... بہت ضدی ہو۔“ وہ سیپ لینا ہوا مسکرا کر بولا۔

”یہ میں نے تمہارے لیے خریدا تھا، دیکھو کیسا ہے؟“ اس نے میرون کلر کا جیولری بکس کھول کر اس کی طرف بڑھایا جس میں دل کی شکل کا برسلٹ تھا۔ اس میں لگے بیش قیمت ہیرے کی چمک سے نگاہیں خمیر ہو رہی تھیں۔

اس ہیرے کے برسلٹ سے زیادہ چمک و روشنی اسے کونین کی آنکھوں اور چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

”لاؤ کلائی میری طرف۔ میں اپنے ہاتھ سے پہناؤں گا۔“

”بہت بہت شکریہ! مجھے ضرورت نہیں ہے اس گفٹ کی۔“ وہ اپنے لہجے میں ٹکھائی پیدا کر کے گویا ہوئی۔

”کگ..... کیوں..... کیا ہوا؟“ وہ ہکا بکارہ گیا۔

”میں آپ سے گفٹ نہیں لے سکتی۔“

”کیوں میں کوئی غیر نہیں ہوں جو تم یوں ہنگامی ہو۔“

”اور ایسا کوئی قرہی رشتہ بھی نہیں ہے جو میں یہ گفٹ لے لوں۔“

”فخری! یہ کیا کہہ رہی ہو، میرا قرہی تعلق نہیں ہے؟“ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ کچھ لمحوں قبل چمکنے والی روشنی یک دم فیوز ہو گئی تھی۔

”آپ میرے کزن ہیں۔ تایا کے بیٹے ہیں مگر اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”نہیں ہے..... مگر بن تو سکتا ہے، میں بنانا چاہتا ہوں۔“

”ناممکن..... ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے دھواں دار روٹا شروع کر دیا تھا، اب وہ کیا بتاتی اسے کہ وہ اس کی مٹی کی نفرت و مزاج سے پوری طرح آگاہ ہے۔ کچھ عرصے قبل اس کے پاپا دادو کے ساتھ ہونے والے توہین آمیز سلوک سے واقف تھی، وہاں سے آنے کے بعد دادو نے سب بتا ڈالا تھا۔ وہ کبھی اس سے کچھ چھپاتی نہیں تھیں۔

کونین جب اسے خاموش کرانے میں ناکام رہا تو کولڈ ڈرنک کی رقم دے کر کارڈ رانیو کرنے لگا تھا، پھر سفر بالکل خاموشی سے کٹا تھا۔

☆.....☆.....☆



پر دوسرا آفتاب حسن نرم مزاج و دوست پرور صفت کے باعث تمام ہی اسٹوڈنٹس کے لیورٹ تھے۔ انہوں نے اپنے آفس میں بلا کر حیدر کی تمام گفتگو سنی تھی۔ خاصی دیر وہ لو جو ان نسل کو افہام و تفہیم، مصبر و قہل، رواداری و مروت کا درس دیتے رہے تھے۔

حورین نے انہیں پہلی بار سنا تھا اور ان سے متاثر بھی ہوئی تھی مگر جب انہوں نے ذوالنون کے بجائے خود اس سے معذرت کی تو وہ ہرٹ ہو گئی تھی۔ معاملہ ختم ہو گیا تھا مگر اس کے دل میں گمراہی پڑ گئی تھی۔ ذوالنون کی بات متضاد خود معذرت نہ کرنا، اسے اپنی اپنی مسئلہ لگا تھا کیونکہ وہ ریمارکس اسے ملا تھا۔ وہ سخت انا پرست تھی۔

گھرا کر بھی وہ چپ رہی تھی۔ رات ڈسٹک سے نیند بھی نہ آئی تھی۔ اذان ہوتے ہی اس نے نماز فجر ادا کی اور لان میں نکل آئی تھی۔ ہر سو گزرتی رات کے گیسو پھیلے ہوئے تھے۔ خوشبوؤں سے لدی ہوا میں وہ کچھ دیر تک ٹہلتی رہی تھی۔ تم گھاس کی ششک نے اس کے بھڑکتے ہوئے ذہن کو تازگی بخشی تھی۔ سردیوں میں واقع ہونے لگی تھی۔ وہ جگن میں چلی آئی کہ شاید ایک کپ چائے سے سر کا بوجھل پن دور ہو جائے، لیکن خالی تھا۔ دونوں آنٹی اور بی بی جان اپنے کمروں میں نماز و تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہو کر اشراق کی نماز کے بعد باہر آتی تھیں۔ وہ اپنے لیے چائے بنا کر کنگ میں ڈال کر لان میں آگئی تھی۔ پییدہ سحر کی تمام رعنائیاں عروج پر تھیں اور وہ بھی سوچوں کے صحرا میں سر پٹ دوڑ رہی تھی۔ اسے اس شخص کو بے سکون کرنا تھا جو اسے بے چین کر کے بڑے کرفر سے گردن اکڑا کر گھوم رہا تھا۔ اس بدو مانغ و مفرد شخص کو ایسا سبق دینا چاہ رہی تھی جو اسے عرصے تک یاد رہتا۔

سوچوں کے صحنوں میں ڈوبتے ڈوبتے بالآخر ایک سراسر اس کے ہاتھ میں آئی گیا، وہ خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

جہاں تم ہو وہ دنیا کب تمہاری ہے  
وہ دیکھو چاند نکلا ہے  
ستارے جگمگاتے ہیں  
ہماری خنجر آنکھیں  
تمہیں ہی سوچتی آنکھیں  
تمہیں ہی ڈھونڈتی آنکھیں  
دعائیں مانگتی آنکھیں  
تمہیں واپس بلاتی ہیں  
یہ دل جب بھی دھڑکتا ہے  
تمہارا نام لیتا ہے

یہ آنسو جب بھی بہتے ہیں  
تمہارے ڈکھ میں بہتے ہیں  
سنو! اب لوٹ آؤ نا.....

”پرنس! پرنس! آج شام گھر میں ہی رہنا۔“ وہ بیڈ پر نیم دراز تھا، منال کیونکس لگاتی اس سے مخاطب ہوئیں۔  
”کیوں.....؟ ایسا کیا ہے؟“ وہ خیالوں کی حسین وادیوں میں کھویا ہوا تھا۔ منال کی بے جا مداخلت نے اس کا موڈ آف کر دیا تھا۔  
”آج شام میں گرینڈ پارٹی دے رہی ہوں۔ بہت بڑے بڑے لوگوں کو مدعو کیا ہے۔ کل ہر طرف ہماری پارٹی کے چرچے ہوں گے۔“ وہ ہاتھوں پر پھونکیں مارتی ہوئی بڑے مسرت لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”مما! آپ پور کیوں نہیں ہوتی ہیں؟ روزانہ پارٹیز، ڈینچ اور اینڈ کر کے کیا ملتا ہے آپ کو.....؟“ وہ منہ بنا کر بولا۔  
”یہی انجوائمنٹ تو لائف ہے میرے بیٹے۔“

”مجھے پسند نہیں ہے، میں ایسی پارٹی اینڈ نہیں کرتا ہوں، یہ آپ جانتی ہیں، میرا مصنوعی لوگوں کے درمیان دم گھٹتا ہے۔“  
”پرنس! ہم جس سوسائٹی میں موو کرتے ہیں، اس سرکل کا مین حصہ ہے ایسی گید رنگ، سب ملتے ہیں، ہلا گلا کرتے ہیں۔“  
”پلیز ممما! آپ مجھے فورس مت کریں، میں نہیں آؤں گا۔“ اس کا انداز ہنوز برقرار تھا۔  
”ٹھک آگئی ہوں میں تمہاری بکواس من من کر، کبھی تو میرا خیال کر لیا کرو۔ میرا دل خوش کرنے کی خاطر۔“ منال کو نری طرح غصہ آ گیا تھا۔

”یہ آپ کا خیال ہی تو ہے جو یہاں رہ رہا ہوں ورنہ.....“  
”ورنہ..... ورنہ چلے جاتے اس بڑھیا کے پاس، ان کرپٹ میاں بیوی کے پاس جو میرے اور میرے والدین کے خلاف تمہارے کان بھرتے ہیں، سکھاتے ہیں تمہیں ہمارے خلاف۔“  
”آپ ہر معاملے میں ان کو مت گھسیٹا کریں۔“ ڈوائنون کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”نہ وہ ایسے ہیں اور نہ میں کسی کی باتوں میں آنے والا ہوں۔“

”آخر کوئین بھی تو ہے، اس نے کبھی مجھے ہاں نہیں کہا، وہ تم سے بڑا ہے۔“  
”اپنی اپنی فطرت ہوتی ہے، کوئی برداشت کر لیتا ہے اور کوئی نہیں کر پاتا۔“  
”اپنی فطرت بدلو، اس طرح کنوئیں کا مینڈک بن کر زندگی نہیں گزار سکو گے میری جان۔“ وہ بیٹے کے وجہہ چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے حلاوت آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔  
”آپ میری پروا مت کیا کریں۔“

”کیسے نہ کروں، ماں ہوں تمہاری“۔

اسی لمحے دروازہ ٹوک کرتی فاقہ بیگم اندر آئی تھیں۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹے میں؟“ وہ ان کے درمیان بیٹھتے ہوئے ہشاش بشاش لہجے میں گویا ہوئیں۔

”کیا باتیں ہوں گی، یہ پرس تو بالکل ہی ناکارہ بن کر رہ گیا ہے۔“ منال قدرے جل کر گویا ہوئیں۔

”بیٹا! کیوں تنگ کرتے ہو ماں کو..... خیر یہ فون بل دینے آئی ہوں، آپ لاؤنج میں چھوڑ آئے تھے، ایک کال آئی تھی ابھی۔“

فاقہ بیگم کے چہرے پر بڑا سراہی مسکراہٹ ابھری تھی۔ ”ایک لڑکی تھی۔ وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔“

”لڑکی کی کال..... وہ بھی پرس کے سیل پر.....؟“ منال بیگم غور سے ڈوائفون کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں، جو نانو کے منہ سے

کسی لڑکی کا سن کر گڑبڑا گیا تھا۔

”ہاں..... رو رہی تھی۔ پرس اس سے خفا ہے کسی بات پر۔“

”میں کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی کو یقین دلانا ناممکن لگ رہا تھا۔“



”کون ہے یہ لڑکی؟“ منال اس کی جانب کھوجتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔ ان کے انداز میں محسوس کی جانے

والی سرد مہری تھی۔ ”اور آپ نے یہ لڑکیوں سے دوستی کب سے شروع کر دی؟“

”دہاٹ رہیں ماما میں یہ سب کیوں کرنے لگا۔“ وہ ہونٹ کاٹا ہوا بولا۔

”ڈونٹ بی کلی منال! کیا اسٹوپز سوال کر رہی ہو، یہ ایک جزیٹیشن کا قہر ل ہوتا ہے۔ انجوائے منٹ ہوتی ہے اگر اس ایج میں یہ

سب نہیں ہوگا تو ہماری عمر میں ہوگا۔“ فاقہ بیگم نے کال انڈیکس کی تھی، وہ کچھ زیادہ ہی بڑے جوش دکھائی دے رہی تھیں۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی کس اسٹوپز لڑکی نے یہ سب حرکت کی ہے اور آپ خواہ مخواہ.....“

”ہوتا ہے، ایسا ہوتا ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، آپ پریشان مت ہوں۔“ فاقہ بیگم اس کی بات قطع کر کے گویا ہوئیں۔

”ماما! آپ نہ معلوم کیوں اتنی بڑے جوش ہو رہی ہیں، میں ایسی لڑکی کو بہونانے کا سوچ بھی نہیں سکتی جو اس طرح گھروالوں سے

ریکونٹ کرتے ہوئے اپنی اکورڈ پوزیشن کا خیال نہ رکھے۔ وہ کتنی گھسیاد ان میگز فیلٹی سے تعلق رکھتی ہے، ایسی لڑکی کی پرچمائیں بھی میں

اپنی فیلٹی پر نہ پڑنے دوں۔“ منال شانے اچکاتے ہوئے منہ بنا کر کہہ رہی تھی۔

”منال! ڈیڑھ کیا ہو گیا ہے؟ کل تک تمہیں لگتی تھی کہ پرس لڑکیوں سے دور بھاگتا ہے، اسے کوئی پرابلم ہے، اب کیوں اس قدر

ٹینس ہو رہی ہو؟ ہمارے لیے یہ مسرت کا دن ہے۔“ وہ منال سے مخاطب تھیں۔ ڈوائفون اسی لمحے غصے سے پیر پھٹتا کرے سے نکل گیا۔

”دیکھا آپ نے ماما! چوری اور سینڈوری، کس طرح یہاں سے گیا ہے۔“ منال فاقہ بیگم سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”آپ بھی کبھی بہت زیادتی کر بیٹھتی ہیں، کیا ضرورت تھی اس سے اس طرح سخت انداز میں دریافت کرنے کی؟ اس کی نیچر کو اچھی طرح جاننے کے باوجود آپ کا رویہ مجھے بہت بُرا لگا ہے، جس سوسائٹی میں ہم رہتے ہیں وہاں نوجوان کیا کچھ نہیں کرتے، کس کس طرح فیملی اور فیملی ممبرز کی عزت و ناموس کو روندنا جاتا ہے، وہ جیاں بکھیری جاتی ہیں پھر والدین ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ معاشرے میں ان کے لیے اعلیٰ مقام بناتے ہیں، حالانکہ وہ کھوٹے سکے ہوتے ہیں، نہ کردار ہوتا ہے نہ اخلاق و قابلیت۔“ منال سر جھکائے من رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

گرمی کی شدتیں مروج پر تھیں۔

ہر صبح طلوع ہونے والا سورج پہلے سے زیادہ تپش و گرمی اپنی جلتی سلکتی شعاعوں میں سمیٹ کر لارا تھا۔ زمین و آسمان دو یک رہے تھے۔ ہر ذی روح اس قیامت خیز گرمی سے پختک رہے تھے۔

ایسے میں بی بی جان کا حراج دو آسمان ہو کے رہ گیا تھا۔ بات بے بات وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھیں۔

”یہ گرمی کم ہونے کے بجائے دن بدن بڑھ رہی ہے۔ کچھ نہیں آتا کیا ہوگا، کیوں اس قدر گرمی ہونے لگی ہے جو برداشت سے باہر ہے؟“ سیرالائٹ نہ ہونے کے باعث ان کے قریب بیٹھے ہوئے گویا ہونیس جو گیلری میں بیٹھی تھیں جہاں عقلمی لان سے تیز ہوا آرہی تھی وہ ماربل کے ٹھنڈے فرش پر گاؤں کیوں کے سہارے نرم دراز تھیں۔

”یہ سب بد اعمالیوں کی گرمی ہے سیرا! گناہوں کے الاؤ اس قدر بھڑک اُٹھے ہیں کہ کہیں نیکیوں کی ٹھنڈک ہوتی بھی ہے تو محسوس نہیں کی جاتی ہے۔“ وہ ایک آہ بھر کر گویا ہونیس۔

”بی بی جان! اچھے میاں کے اماں، ابا کیسے یکے بعد دیگرے اس ڈنیا سے چلے گئے۔ کل تک دونوں بیٹے و بہوئیں جنہیں گھر میں رکھنے کی روادار نہ تھیں، ایک ماہ بھی تو وہ دونوں جی نہ سکے۔“ حیرانے اسے افسردگی سے کہا۔

”انسان کو مارنے کے لیے گولی و بم کی ضرورت نہیں ہے۔ ارے انسان تو کالج سے بھی زیادہ نازک اور پھول سے زیادہ نرم مٹی سے بنا ہے۔ اس کو مارنے کے لیے بد صورت رویے اور نفرت ہی کافی ہے۔ شاید ہم غذا اور پانی کے بغیر زندہ رہ سکیں مگر محبت، اہمیت اور غلوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ نفرت و بے اعتنائی اگر دوستوں کے درمیان بھی آ جائے تو بے چین و مضطرب کر ڈالتی ہے پھر سوچو..... ماں باپ اولاد کے درمیان آ جائے تو.....؟“

”مار ڈالنے کی جیسے اچھے میاں کے والدین ایک عرصے سے بیماری، تنگدستی و بے بسی سے لڑ رہے تھے مگر اولاد کی بے اعتنائی و نفرت برداشت نہ کر سکے اور زندہ گیاں ہار بیٹھے۔“ سیرا بھی بہت طولی تھیں۔

”ہمارے معاشرے میں یہ سب بہت تیزی سے کسی موذی مرض کی طرح پھیل چکا ہے۔ آپ کو ہر گھر میں ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہوئی نظر آئیں گی۔ موضوع ایک ہی ہوتا ہے، صرف کردار بدل جاتے ہیں، کہیں بہو ساس، سر کی زیادتیوں کا شکار ہے تو کہیں ساس

سسر، بہو کی چلتی بازیوں، سازشی جال میں مقید نظر آتے ہیں تو کبھی مندوں کی چالاکیاں ظلم کی انتہاؤں کو چھوٹی نظر آتی ہیں تو کبھی دیور بھابیوں کی ستم ظریفیوں کے آگے در بدر دکھائی دیتے ہیں۔“

”افسوس و دکھ کا مقام یہ ہے کہ ایسے بد اخلاقی و بے حسی سے بھرپور مظاہرے ہم مسلمانوں کے گھروں میں رائج ہو رہے ہیں، ہم جس مذہب کی پیروی کرتے ہیں جس کو مانتے ہیں اس مذہب اسلام میں ہر رشتے کے آداب و مرتبے سے آگاہی بخشی ہے۔ ہمارا دین تو ہے ہی رواداری، درگزر، محبت و مروت کے پھولوں سے مہکتا جن ہے پھر ایسی نفرت و جھگڑوں کو مزاج بنانے والے ہم میں سے کیوں ہو گئے ہیں؟“

”جب میں کہیں ایسی لڑائیاں و حق تلفیاں دیکھتی ہوں تو دل چاہتا ہے اس دنیا کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔“ بی بی جان سیدھی پٹھنی ہوئی رنجیدگی سے گویا ہوئی تھیں۔

”دراصل بات یہ ہے کہ ہم اپنے مذہب کو مانتے تو ہیں مگر یہ مذہب کو جاننے اور اسے سمجھنے کی کوشش بالکل نہیں کرتے، نہ ہماری نمازوں میں تسلسل ہے، نہ دوسرے عملیات میں روانی، اگر ہم اپنی نمازیں درست کر لیں تو انشاء اللہ سب کام درست ہو جائیں گے، پھر مگر کو جنت یا دوزخ بنانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے عورت پر لڑکی کی تربیت بہترین ہوتی ہے تو وہ سسرال میں اپنی قابلیت، اپنی ذات کو منوانے میں کامیاب رہتی ہے، گرویدہ کر لیتی ہے سب کو اپنا اور اپنے اور غیر سب ہی اس کی تعریف و عزت کرتے ہیں، ورنہ معاملہ برعکس ہی ہوتا ہے جیسے اچھے میاں اور پیارے میاں کی بیویوں کی مثال ہے اگر ان کی تربیت میں نیکی و اچھائی اور بڑوں کی عزت کرنے اور چھوٹوں کی غلطیوں کو درگزر کرنے کی صلاحیت ہوتی تو گھر جنت کا نمونہ ہوتا۔“

”درست کہہ رہی ہیں آپ۔ بڑوں کی نفرتیں و عداوتیں بچوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں، دونوں بھائیوں کے بچوں کو میں نے کبھی ساتھ نہیں دیکھا، بلکہ میت والے دن بھی ایک دوسرے سے دور تھے۔“

”بچپن سے جن کے دلوں میں فاصلے پیدا کر دیئے گئے ہوں، وہ اتنی آسانی سے تھوڑی سیٹھنے والے ہیں۔ یہ ان جاہل عورتوں کی ناعاقبت اندیشیاں اور بد عقلیاں ہوتی ہیں جو بیٹیوں کے جوان ہونے پر ان کی راہوں میں رکاوٹیں بنتی ہیں۔“

”کس طرح بی بی جان؟“ سیرا اور حمیرا دونوں حجب ہوئی تھیں۔

”جب مائیں اپنے بیٹوں کے لیے لڑکیاں دیکھنے نکلتی ہیں تو صرف لڑکی کی خوب صورتی کو ہی ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ آنے والی بہوئیں اور جانے والی بیٹیاں کس طرح رہ رہی ہیں؟ ساس، مندوں اور دیورانیوں اور جھیشانیوں سے تعلقات کی نوعیت کیا ہے کیونکہ لڑکی جو ماحول گھر میں دیکھ کر آئے گی، وہی برتاؤ اپنے سسرال میں کرے گی۔ میں کہتی ہوں بیٹیوں کو اکھوں کا جہیز مت دو لیکن کروڑوں کی تربیت دو۔“

☆.....☆.....☆

حیدر وغیرہ اور شرین، مول وغیرہ سے بے تکلف ہو چکے تھے۔ آج کل ان کی گفتگو حورین اور پرنس کے درمیان چھڑی سرد جنگ کے مطابق ہی ہوتی رہتی تھی کیونکہ دونوں فریق ایک جیسے مزاج و طبیعت کے حامل تھے۔ دونوں میں سے کوئی جھگڑنے کو تیار نہ تھا۔ ذوالنون کی آج بھی یہی ضد تھی کہ لڑکیاں پر پوزل تلاش کرنے آتی ہیں، بلکہ شکار کی تلاش میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔ حورین نے ان الزامات کو اپنی اتاد و قار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا وہ اپنی فضول بکواس پر تمام طالبات سے معافی مانگے۔ یہ معاملہ بہت خطرناک صورت اختیار کر سکتا تھا اگر بروقت پرو فیسر آفتاب حسن مداخلت نہ کرتے اور دونوں کو نہ سمجھاتے۔

پروفیسر آفتاب حسن کے احرام میں ذوالنون نے اپنی زبان بند کر لی تھی، مزید اس نے کچھ نہ کہا تھا مگر حورین سے معذرت کرنے پر راضی نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر آفتاب حسن اس کے والد کے جاننے والوں میں سے تھے اور بہت حد تک وہ اس کی فیملی بیک گراؤنڈ اور بالخصوص ذوالنون کی طبیعت و مزاج سے پوری طرح واقف تھے، اس لیے انہوں نے مناسب لفظوں میں حورین سے ذوالنون کی جانب سے معذرت کی تھی۔

اس وقت بھی وہ لوگ فری بیڈ میں لان میں بیٹھی تھیں، تب ہی وہ لوگ اسی طرف آئے تھے۔ ٹیک سلیک کے بعد وہ لوگ حورین سے مخاطب ہوئے تھے۔

”حیدر! آپ مجھے فورس نہیں کر سکتے۔“

”ہیس! ہم آپ کو فورس نہیں کر رہے بلکہ ریکورڈ کر رہے ہیں، بھول جائیں جو ہو اسو ہوا، پھر ذوالنون نے جو کہا وہ آپ کے لیے نہ تھا..... بلکہ..... بلکہ ایسی لڑکیوں کے لیے تھا جو ایسا کرتی ہیں اگر کہیں تو یہاں کی ڈیڑھوں مثالیں دے سکتا ہوں جس سے ثابت ہو جائے گا کہ ذوالنون نے ایسی لفظ بات نہیں کہی ہے۔“ حیدر کے بعد مامون اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”آپ لوگ کچھ بھی کہیں، لیکن میں جانتی ہوں جو غلط ہے وہ غلط ہے، اگر چند لوگ بُرا کرتے ہیں تو یہ مطلب نہیں کہ سب بُرے ہیں اور اگر ایسا بھی ہے تو کسی کو جن نہیں پہنچانا کو بُرا کہنے کا۔“ اس کا موڈ بُری طرح آف ہو چکا تھا۔

”حورین پلیز! کول ڈاؤن۔ سب بھول کیوں نہیں جاتیں، سر آفتاب حسن نے معذرت تو کر لی ہے، اب بلاوجہ بات کو طول دینا ہے۔“ شرین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا۔

”سب سے زیادہ افسوس مجھے اس امر کا ہے، سر آفتاب نے بھی ایسے فیصلے کا ساتھ دیا ہے جو مصیبت مخالف کی عزت و توقیر کرنا نہیں جانتا۔“ حورین کسی طرح سر ہٹ کر نہ تھی، اس سے قبل وہ چاروں بھی اسے کئی مرتبہ سمجھا چکی تھیں اور وہ نہ مانی تھی۔

”آپ سر آفتاب سے بدگمان مت ہوں مگر حورین ادوہ بہت گریٹ انسان ہیں ان جیسے نائیس لوگ دنیا میں نایاب ہیں۔“ مڈ نے بھی لب کشائی کی۔

”آپ کچھ بھی کہیں میں بہت ہرٹ ہوئی ہوں اس کے رویے سے۔“

”اور..... حور! کم آن جو ہوا پلیز بھول جاؤ۔ سر آفتاب کی ہم سب عزت کرتے ہیں تم بھی کرتی ہو، ان کی خاطر ہی فراموش کر دو۔ ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے اس ٹاپک پر ماحول ٹینس ہوئے۔ اگلے ماہ سے سمسز شروع ہونے والے ہیں اور ہم تیار یوں کے ساتھ ساتھ پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ پلیز خود بھی رُ سکون ہو جاؤ اور دوسروں کو بھی ہونے دو۔ فضول میں آپ سیٹ رہنے لگی ہو“۔ زویا کے اعزاز میں ناصحانہ پن تھا جس کی سب نے تائید کی تھی۔

”او کے میرا کیا جاتا ہے اگر تم لوگوں میں ہی سیلف رسیکٹ نہیں ہے تو پھر میں کون سا اس پر کوڑے برسا رہی ہوں“۔ حورین نئی طرح کییدہ خاطر ہو کر بولی تھی۔

حیدر، مامون، مدثر کچھ دیر مزید وہاں بیٹھے رہے تھے پھر اٹھ کر اپنے ڈیپارٹمنٹ چلے آئے تھے جہاں پریذ شروع ہونے والا تھا۔ پریذ کے بعد وہ ڈوائس کے ساتھ بیٹھے، اس کی اس پریشانی کو ڈسکس کر رہے تھے جو پچھلے کچھ ہفتوں سے اسے پوری طرح موبائل پر ریج کر چکی تھی۔

پہلے صرف اس کی کال اس کے موبائل پر آتی تھی لیکن اس کے بعد نانا، نانا جان، ماما، کونین اور اس کے فرینڈز کے موبائلز پر بھی کالز آنے لگی تھیں۔ وہ سب سے اس کی شکایت کرتی اور ایسے میں اس کے لہجے میں اتنی صداقت و سچائی ہوتی تھی کہ کوئی بھی یہ جان ہی نہیں پاتا کہ وہ اداکاری کر رہی ہے۔

وہ جو کوئی بھی تھی، بہت ذہین و مزاج شمس تھی جس سے بھی بات کرتی وہ اس کی سائیڈ ہو جاتا تھا۔

اسے حیرانگی تھی، ہرگز نہ ان کی حیرانگی و پریشانی کے ساتھ ساتھ تجسس میں بھی اضافہ کرتا جا رہا تھا۔

وہ کون ہے؟

اس طرح کر کے کیا حاصل کرنا چاہتی ہے؟

جس کا مقصد شاید اسے ذہنی خفاشا میں مبتلا کرنا تھا اور وہ ہو گیا تھا۔ بے سکونی، اضطرابی کیفیت میں وہ مبتلا ہو چکا تھا۔ مسترا دما

کے چلے کئے ریمارکس، نانا جان کی فراخ دلانہ آفرز، کونین کی شوخیوں، دوستوں کی شرارتیں اس کے حوالے سے، جس کو وہ جانتا بھی نہ تھا جس کے وجود سے وہ یکسر لاعلم و انجان تھا۔

اسے ملال اس بات کا تھا کہ سب اس کے مزاج و مرشت سے اچھی طرح واقفیت رکھنے کے باوجود اسے جھٹلا رہے تھے۔

نہ معلوم وہ لڑکی تھی یا ساحرہ؟

”تمہارا موڈ مجھے کچھ زیادہ ہی بگڑا ہوا لگ رہا ہے۔ کیوں نہ کچھ عرصے کے لیے سمسز کے بعد ساؤتھ ایریا چلیں وہاں کی خوب

صورتی یقیناً فریش کرے گی، قدرتی حسن سے مالا مال ہیں وہ ایریا“۔ حیدر نے کچھ زیادہ ہی اس کی سنجیدگی محسوس کر کے کہا۔

”لیکن..... وہاں جانے سے قبل کسی کی اجازت ضروری ہے“۔ مامون ذوق معنی لہجے میں گویا ہوا۔

”کس کی؟“ ڈالون نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”وہی..... جو آپ کی بے اعتنائی.....“

”اپنا منہ بند کرو، بہت ہو گیا۔“ حسب توقع وہ بھڑک اٹھا۔

”ریلیکس..... ریلیکس میرے بھائی! وہ جو کوئی بھی ہے تمہیں پریشان کر کے انجوائے کر رہی ہے۔ شاید وہ یہی چاہتی ہے کہ تم

اس طرح ڈپریشنڈر ہو اور ڈپریشن میں سب سے دور ہو جاؤ۔“ مڈثر نے سوچ کر کہا۔

”یار اتم کیوں اسے سر درد بنا رہے ہو، بہت سارے ذرائع ہیں اس راز کو سامنے لانے کے لیے، ہم کسی بھی ذرائع سے معلوم کر

سکتے ہیں اس کا تروالی کا نام وائیڈریس اور پھر.....“

”وہ بہت چالاک لڑکی ہے ایسے تمام مراحل کو مد نظر رکھ کر اس نے یہ ٹیم شروع کیا ہے۔ اسے ٹریس کرنے کی کوشش ٹھیک ہو گئی

ہے۔“ حیدر نے تفصیل بتائی تھی۔

”ابنی دے۔ اس سینٹر کو بند کرنے کے پروسیجرز ہمارے پاس بہت سارے ہیں مگر..... ہم خود اسے ڈھیل دے رہے ہیں کہ

دیکھتے ہیں محترمہ کس حد تک جاتی ہیں۔“ وہ تینوں بیٹھے آراہ دے رہے تھے۔ ان کے درمیان موجود ڈالون بالکل خاموش تھا۔

☆.....☆.....☆

منال پنک اور بلیک باڈروالی فینسی ورک کی ساڑھی میں تک سب سے تیار ملازموں کو ہدایات دے رہی تھیں۔

سطح کلف شدہ وردیوں میں مصروف ملازم صبحی سے ادھر ادھر متحرک تھے۔ لیکن سے اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔

”کونین! آج بہت اچھی طرح سے ڈریس اپ ہونا۔“ وہ لاؤنج سے گزرتے کونین سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”اوہ! کوئی خاص مہمان آرہے ہیں؟“ وہ مسکرایا۔

”ارے میں نے کل بتایا تھا آپ کو کہ سزطلعت اپنی بیٹیوں کے ہمراہ آرہی ہیں۔ میں نے انہیں ڈنر پر مدعو کیا ہے۔“

ان کے انداز میں خاصی مسرت پنہاں تھی۔ کونین نے انہیں اس طرح بے فکری سے مسکراتے ہوئے خوشی کا اظہار کرتے بہت کم

ہی دیکھا تھا۔ وہ جب بھی اس طرح مسکراتیں تو خوشی آنکھوں سے اور بے فکری ہر احساس سے عیاں ہوتی تھی۔ اسے ہاں کا یہ روپ بہت

سرور کرتا تھا اور اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اسی طرح سدا ہنستی مسکراتی رہیں۔

”کوئی بات ”خاص“ معلوم ہوتی ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔“ وہ اس کی جانب دیکھتی معنی خیزی سے گویا ہوئیں۔ ”گیس کرو؟“

”آپ کے ہر مہمان میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے، کم از کم میں گیس نہیں کر سکتا۔ کیوں نالو! ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ وہ

اندرا آتی فائقہ بیگم سے تائیدی لہجے میں گویا ہوا۔



” بلاشبہ میرے بیٹے۔“ انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

”او کے جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔ وہ آنے والے ہیں۔“ کونین فوراً ہی سر ہلاتا ہوا تاجبھاری کے انداز میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کی بچی تاجبھاری و فرما برداری منال اور قانقہ بیگم کو سرشار کر دیتی تھی۔

”مما! پاپا ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ میں نے کہا بھی تھا کہ آج جلدی آئے گا۔“ منال رست و اوج دیکھتی ہوئی بولیں۔

”میں وہی تو بتانے آئی تھی۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”کیا.....؟ کیا ڈیڑی نہیں آرہے؟“ وہماں کے چہرے پر لکھی تحریر بنا کہے پڑھ چکی تھی۔

”ہاں، کوئی بزنس ڈیپلیکیشن اچانک ہی آ گیا ہے، اس وجہ سے وہ معذرت کر رہے تھے۔“

”اوہ ممما! ڈیڑی سے ملاقات ہو جاتی ان کی تو اچھا تھا تا.....“

”اوہ کم آن ڈیڑی کیوں اس قدر پریشان ہو رہی ہو؟ مسز طلعت تھوڑی دیر میں آرہی ہیں۔ ابھی پہلی ملاقات ہے، اس کے بعد بھی ہوتی رہیں گی۔“

”سوری ممما! میں بہت جلد آپ سیٹ ہو جاتی ہوں۔“ ایک خفیف مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری تھی۔

مسز طلعت نام کے مطابق ابھی تک نہ پہنچی تھیں۔ کونین کے ساتھ ذوالنون بھی بیٹھیں اور نانو کے مہمانوں کے انتظار میں بے چین دکھ رہا تھا۔ منال کے بار بار اصرار کے بعد وہ یہاں موجود تھا۔

”ڈنر کب شروع ہوگا؟“ ذوالنون گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

”مسز طلعت کا انتظار ہو رہا ہے، وہ آ جائیں۔“ کونین نے تسلی دی۔

”آخر میری سمجھ میں نہیں آتا، ممما ایسے لوگوں سے متاثر کیوں ہوتی ہیں جو ویسٹرن ممالک میں رہتے ہوں۔“ اس بار اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”مسز طلعت کوئی ایسی ویسی نہیں ہیں، انگلینڈ میں ہائی سٹیٹری میں موو کرتی ہیں، بہت ٹاپ ہول تک ریلیشن ہیں اور بزنس تو کئی ملکوں تک پھیلا ہوا ہے۔“ منال حسب عادت قصیدہ گوئی میں مصروف تھیں۔

”میں جا رہا ہوں۔“ ذوالنون سے مزید مروت نہ برتی گئی۔

”پرنس مہری جان! بیٹھ جاؤ پلیز اوہ آرہی ہیں، ابھی کال آئی ہے۔ آپ کے نانا جان بھی مصروفیت کے باعث نہیں آئیں گے، ان کو کھنی دینے کے لیے کسی کو تو ہونا چاہیے نا۔“ قانقہ محبت بھرے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”سوری نانا میں کھنی نہ دے پاؤں گا۔“

”ہاں، آپ کو تو نکلے نکلے کی لڑکیوں کو کھنی دینے کی عادت ہے۔ اپر کلاس کی لڑکیوں کی کھنی کیسے انورڈ ایبل ہوگی آپ کے

لے۔“ منال بیگم تخت طہریہ انداز میں گویا ہوتی تھیں۔

”مما پلیز! کول ڈاؤن“۔ کوئین ماما کے بگڑتے تہوار اور ذوالنون کا مزاج دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”منال! تم بھی حد کرتی ہو، بلا سوچے کبھی ہر بات کہہ دیتی ہو۔ پرنس! بیٹھو اتنی جلدی ڈس ہارٹ مت ہو کر ڈو“۔ وہ منال سے

تخت لہجے میں کہہ کر اس سے مخاطب ہوتی تھیں۔

”سوری نانا مجھے مت روکیں، میرا یہاں سے جانا ہی ٹھیک ہے، ورنہ ماما کی پارٹی خراب ہو جائے گی اگر میں یہاں رہا تو“۔

اس کے وجہ چہرے کے نقوش میں سرخی تھی، وہ فوراً چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”یہ بی بی جان کیا عجیب و حیرت انگیز بلکہ..... بلکہ تجسس آمیز کام کر رہی ہیں، کچھ سمجھ نہیں آ رہا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا

ہے؟“ سرد پریشان انداز میں وحسی سے مخاطب ہوا تھا۔

”مجھے لگ رہا ہے ان کا کسی کو قتل کرنے کا ارادہ ہے“۔ وہ سرگوشیاں انداز میں گویا ہوا۔

”قتل!“ سرد آنکھیں نکال کر بولا پھر اس کی شرارت سمجھ گیا۔

”گلتا ہے تمہارا ہی کریں گی، تمام گناہوں کی توبہ کر لو“۔

”اچھا“۔ اس کا انداز چلانے والا تھا۔

”ہاں کیونکہ مرتے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی ہے۔ توبہ کے دروازے زندگی میں ہی کھلے رہتے ہیں“۔ وہ عالمانہ انداز میں کہہ اٹھا۔

”کیا ہوا؟ کس کے دروازے کھل گئے؟“ سعود اور ہریرہ اندر داخل ہوتے ہوئے پُرتجسس انداز میں گویا ہوئے تھے۔

”سعود کی سنگ دل محبوبہ کے دل کے دروازے“۔ وحسی کوئی سوچھی تھی۔

”مبارک ہو یار! اس خوشی میں پارٹی کب دے رہے ہو؟“ وہ اسے گھیر کر بیٹھتے ہوئے استفسار کرنے لگے۔

”میں کوئی پارٹی دارنی نہیں دوں گا“۔ وہ نصی سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ”تم لوگ سیدھی بات کرنا تو جانتے ہی نہیں“۔

”یار پارٹی نہیں دینا چاہتے تو نہ دو مگر..... اس قدر فخر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ ہریرہ حیرانی سے بولا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں اس وحسی کو سمجھا رہا تھا کہ کبھی تو اپنے ہائیں شانے والے فرشتے کو آرام کا موقع دیا کرو جو تیرے

گناہ آلودر جشمر بھر کر تنگ آچکا ہوگا، کبھی اس پر رحم کھائے“۔ سرد نے جوش کے بجائے اب ہوش کی لاشی پکڑی تھی۔

تم دونوں چوٹیں اڑا رہے ہو، بات کیا ہوئی؟“ ہریرہ کے پوچھنے پر وحسی نے ساری بات بتادی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

”شاباش ہے بھئی!“ اسی دم بی بی جان اندر آ کر گھومتے ہوئے بولیں اور جو اب انہی ان کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

”کل سے کہہ رہی ہوں اسٹور والی دو چھتی سے چار کے مرتبان اتار دو مگر تمہارے کانوں پر کوئی جوں نہیں رہتی“۔

”بی بی جان! آپ نے ہمیں لڑکیوں کی طرح گندہ سمجھا ہوا ہے جو ہمارے سر میں جوئیں ہوں اور وہ بھی اتنی تعداد میں کہ کان پر رکھیں۔“ وہی کی زبان بے قابو ہوئی تھی اور بی بی جان کا ہاتھ۔

”زبانیں تمہاری لڑکیوں سے زیادہ تیز ہیں جو کتر کتر قبیلگی کی طرح چلتی بھی رہتی ہیں اور کام کے نام پر سانپ سونگھ جاتا ہے۔“  
 گراؤنڈ فلور کی بنی دو چھستی سے وہ بڑے بڑے بھاری بھر کم مرتبان اُتارنا گوا آسان سے تارے توڑ کر لانے سے کم ہی معرکہ رہا تھا۔ کئی مرتبان ان کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لہزش دیکھ کر وہاں کھڑی بی بی جان نے کہا تھا۔  
 ”خبردار ایک بھی مرتبان نہیں ٹوٹنا چاہیے۔“

”اگر..... ہماری ہڈیاں ٹوٹ گئی تو؟“ سمود نے ہانپتے ہوئے گلہ کیا۔

”تو کوئی بات نہیں۔“ نہایت اطمینان سے جواب ملا۔

”ہڈیاں جڑ جائیں گی مگر..... مرتبان جو داوی کی نشانی ہیں، ٹوٹ گئے تو کبھی نہ جڑ پائیں گے۔“

”ان مرتبانوں میں برادری کے خاندان والوں کی روئیں تو براجمان نہیں ہیں جو یہ اسے ہماری بھر کم ہیں۔“ ہریرہ کی سرگوشی پر انہوں نے مشکل سے قہقہے رو کے تھے۔

بہت سخت محنت کے بعد وہ چھوٹے بڑے کئی قسم کے مرتبان اُتارنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

”کیسے پسینے پسینے ہو گئے ہیں کچھ لڑکے! محنت کی عادت جو ختم ہو گئی ہے۔“ پسینوں سے شرابور ہانپتے ہوئے لڑکوں کو دیکھ کر وہ ہمدردی کے بجائے غصے سے بولیں اور نیا حکم صادر کیا کہ وہ تمام مرتبان گھن میں پہنچادیں۔

”بی بی جان! اتنا سارا اچار بنا نہیں گی آپ؟ میرا مطلب ہے بیچنے کا ارادہ ہے کیا؟“ ہریرہ کو بہت تعجب ہو رہا تھا۔

”جینا۔“ حسب توقع وہ خوش دلی سے مسکرائیں۔ ”ارے نہیں جینا! یہ جو مرتبان دیکھ رہے ہونا سال سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ان میں بھرے ہوئے اچار اور مرے۔“

”کیا جنات وغیرہ کی دعوتیں کرتی ہیں آپ؟“ مہمان ہونے کی وجہ سے ان تینوں سے وہ کافی رعایت برتی تھیں، اس لیے بے دھڑک وہ لوگ ان سے ایسے سوال بھی پوچھ لیا کرتے تھے جو یک پارٹی خواہش کے باوجود نہ پوچھ سکتی تھی۔

”جنات تو مفت میں بدنام ہیں، ہم انسان کسی جن سے کم ہیں کیا۔“

”بی بی! پھر بھی اتنا ڈھیروں اچار اور مرے مقصد سمجھ نہیں آیا۔“ ہریرہ ابھی بھی گولگولی کیفیت میں تھا۔

”دراصل بی بی جان کے ہاتھوں بنا اچار اتنا لذیذ اور عمدہ ہوتا ہے کہ خاندان کے علاوہ دوست، احباب بھی بلا جھجک مانگ کر لے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ اچار کے اختتام تک جاری رہتا ہے۔“ سمود نے کھل کر وضاحت کرتی۔

”بی بی جان بتاتی بھی تو کئی قسم کے اچار ہیں۔ لوگ ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا مانگتے آتے ہیں۔“ وہی کے لہجے میں تو صیغہ تھی۔

”یہ تو خاندانی روایت چلی آرہی ہے، ہمارے بزرگوں کے دور سے۔“ بی بی جان کی آنکھوں گزرتے وقت کے چراغ لودینے لگے تھے۔ نقل اس کے کہ وہ کتاب ماضی کے اوراق پلٹتے بیٹھ جاتی، ملازمہ شربت لے آئی تھی اور انہوں نے جان بچ جانے پر تشکر آمیز سانس لیے تھے۔

☆.....☆.....☆

ذوالنون کے فیسے میں جانے کے بعد ماحول خاصا ٹینس ہو گیا تھا۔ کونین جو پہلے ذوالنون کی ماں کے ساتھ مس اٹھرا سٹینڈنگ اور رویے پر اسے سمجھاتا رہا تھا مگر اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ ماما اس کے ساتھ بہت سرد رویہ اختیار کرتی تھیں اور ان کا یہ رویہ اس وقت تک کمزور نہیں ہوتا تھا، جب تک وہ ایسے ہی کسی جوانی رویے کا اظہار نہ کرے۔

اس لیے وہ اب زیادہ تر اسے تنہائی میں سمجھانے کو ترجیح دیتا تھا۔

جس دن سے کسی لڑکی نے موہاگل پر شرارت شروع کی تھی، اس دن سے ماما اس کی سخت دشمن بن گئی تھیں۔ بات بے بات اس کو جاہل عورتوں کی مانند طعنے دیتی تھیں۔ اس کی دل آزاری کر کے نہ معلوم ان کو کیوں سکون ملتا تھا؟

ان نامعلوم فون کالز کی وجہ سے ان ماں بیٹے کے درمیان تناؤ تھا۔ شروع شروع میں اس نے بھی سچ سمجھ کر ذوالنون کو بہت آفرز کی تھیں مگر رفتہ رفتہ بھائی کی سچائی اور اظہار پر یقین آچکا تھا۔ یہ حقیقت منال بیگم تسلیم کرنے کو تیار نہ تھیں۔ ان کی اسی ہٹ دھرمی و بے یقینی نے ان کے درمیان قاسلے بڑھا دیئے تھے۔

”جب بچے قدم میں ہم سے بھی اونچے ہو جائیں تو بہت سوچ سمجھ کر ہینڈل کیا جاتا ہے ان کو، کتنی بار سمجھایا ہے لیکن.....“

”اوہ ماما! آپ خیال مت کریں۔ اس کا چلے جانا ہی بہتر ہے، ورنہ ہمارا امپریشن مسز طلعت اور ان کی بیٹیوں پر اچھا نہیں ہوتا۔“ مسز طلعت اپنی دونوں صاحب زادیوں کے ہمراہ تشریف لاجکی تھیں۔ قائد بیگم اور منال نے بہت بڑے تپاک طریقے سے استقبال کیا تھا۔ مسز طلعت بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ دونوں بیٹیاں بھی ماں کے ساتھ کھڑی سیاہ کوٹ سوٹ میں ملبوس چمکے نقوش و سفید رنگت والے اس خوبرونو جوان کو دیکھ رہی تھیں جس کی شخصیت سے وقار و تمکنت چاند کی کرنوں کی طرح جھلجھل ہو رہی تھیں۔

”یہ میری بیٹیاں ہیں، زینبی اور زمرہ۔“ مسز طلعت نے تعارف کروایا۔

”ہاؤ سو کیٹ۔“ انہوں نے ہاری ہاری دونوں کے رخساروں کو چوما۔

”مسز طلعت! آپ کی بیٹیاں بھی آپ کی طرح دل آویز پر سنائی کی مالک ہیں۔“ منال اور قائد بیگم کی تعریف میں کوئی بناوٹ و چاپلوسی نہ تھی۔ زینبی و زمرہ میں ماں کی طرح وقار تھا۔

عام سے ٹراؤزر سوٹ پر دوپٹے اور ہلکے سے میک اپ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھیں، ان کے لباس سے انداز سے ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ کسی آزادو بے ہاک ملک کی پروردہ ہیں۔ زینبی تعلیم سے فارغ تھی۔ زمرہ انگلش لٹریچر میں ایم اے کر رہی تھی۔

”یہ میرے بڑے بیٹے ہیں کونین۔ ایم۔ بی۔ اے کے بعد اپنا پرنس سنبھال رہے ہیں۔“ منال نے کونین سے تعارف کروایا، جو با مسز طلعت کو سلام کیا تو انہوں نے بڑی شفقت سے جواب دے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ لڑکیوں سے بھی پہلو ہائے ہوئی تھی۔ وہ انہیں لے کر لیونگ روم میں آگئی تھیں جہاں ان کی تو اشیح جیری اور پائن اپٹل سے کی گئی تھی۔ ساتھ ہی ملازمہ کو کھانا لگانے کا آرڈر بھی دے دیا گیا تھا۔

”مسز طلعت! آپ مانی نہیں ورنہ میرا تو آپ کے اعزاز میں ایک بڑی پارٹی دینے کا ارادہ تھا۔ اس طرح کوئی انجمائے منت ہو رہی ہے۔“ منال ان سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے، مگر کا ماحول، آپ لوگوں کی اپنائیت۔ یہ سب کسی پارٹی میں کہاں ملتا ہے؟ بناوٹی لوگ، بناوٹی اعزاز، بناوٹی چہرے، کھوٹے سٹے کی طرح لگتے ہیں مجھے۔ میں ہی نہیں طلعت صاحب اور پچیاں بھی سخت پوریت محسوس کرنے لگی ہیں ان پارٹیز میں۔“ منال اور فاطمہ بیگم نے تعجب خیز نظروں سے ایک دوسروں کی جانب دیکھا تھا۔

”کئی پارٹیز پر میں نے جانے سے معذرت کر لی تھی۔ عجیب لوگ ہو گئے ہیں یہاں کے۔ خلوص، مروت، وفا تو گویا بھول ہی گئے ہیں۔“ مسز طلعت کے لہجے میں عجیب سی آنجھی تھی۔

”جو جس کے نزدیک ہوتا ہے، جو زیادہ محبت و چاہت کا اظہار کرتا ہے، پیٹھ پیچھے وہی اس کا بدترین دشمن ہوتا ہے۔“ مسز طلعت کے انداز میں ڈکھ و ناپسندیدگی تھی۔

وہ دونوں ماں بیٹی اندر ہی اندر جزیب ہو رہی تھیں، وہ جس جگہ سے آئی تھیں وہاں کی ذرا بھی نمائندگی نہ کر رہی تھیں۔ اپنی باتوں سے، اعزاز سے، کسی دور افتادہ علاقے کی باسی لگ رہی تھیں۔ پارٹیز میں بگیرا نظر آنے والی سوشل سی مندردی وہ ماں بیٹیاں اس وقت اپنے مختلف روپ میں تھیں کہ وہ حیران تھیں۔

کھانا بہت بے تکلف ماحول میں کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کے دور میں مسز طلعت کو کچھ یاد آیا۔

”منال! آپ کے دوسرے بیٹے نظر نہیں آ رہے؟ آپ نے ان کا بھی ذکر کیا تھا۔“

”پرنس کے دوست کے ہاں فنکشن ہے، وہاں گئے ہوئے ہیں۔“ انہوں نے پہلے ہی جھوٹ کی تیاری کر لی تھی۔

”کونین ازینی کولا بھری دکھاؤ۔“ وہ مسکرا کر زینی کی طرف دیکھ کر گویا ہوئیں۔

کونین جو یہاں سے جانے کا سوچ رہا تھا، اس نئے حکم پر جزیب ہو کر رہ گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا، صاف انکار کر دے جس طرح ذوالنون اپنی مرضی و مرشت کے خلاف کسی بھی کام کو منع کر دیتا تھا مگر..... اگلے لمحے وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔ اس نے اوّل روز سے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ مہما کو خوش رکھے گا۔ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو انہیں ڈکھی کرے۔ چا جو ڈکھان کی جھولی میں ڈال کر گئے تھے وہ اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ اس تکلیف کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔

اس دور میں یہی ہوتا ہے، جو محبت کرتا ہے وہ آزما یا جاتا ہے ایک بار نہیں، بار بار.....  
 زینسان کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ زینبی نے بھی لائبریری دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ لان میں چلی آئی تھیں۔  
 ”کیا ہائیز ہیں آپ کی؟“ وہ چلتی ہوئی کونین سے مخاطب ہوئی۔

”ہائیز؟“ وہ دل کشی سے مسکرایا۔ ”ایجوکیشن لائف میں وہی کاسن ہائیز ہی ہیں۔ لانگ ڈرائیونگ، میوزک، پکچرز، ہلبہ گلہ جو اس  
 عمر میں ہوتی ہیں۔“

”اس عمر میں؟“ وہ اس کی بات اُچک کر شوخی سے بولی۔

”ابھی کیا آپ خود کو دادا ابا کی اسج کا سمجھنے لگے ہیں؟“

”اتنا تو نہیں..... لیکن ٹین ایجر تو اب نہیں ہوں۔“ کونین کے انداز میں وقار و اعتماد تھا۔

”شاید آپ نے خود پر بڑے بیٹے ہونے کے حوالے سے بہت زیادہ ذمے داریاں ڈالی ہوئی ہیں، اسی باعث آپ خود کو  
 ادورا اسج سمجھتے ہیں، ورنہ پر سنالٹی تو آپ کی ابھی بھی کالج اسٹوڈنٹ کی طرح ہے۔“ زینبی اس سے از حد متاثر نظر آ رہی تھی۔  
 ”میں سمجھ نہیں رہا، یہ میری تعریف ہے یا.....“

”ارے نہیں..... یہ آپ کی تعریف ہے، بالکل جائز اور اصلی۔“ وہ کھٹکھٹا کر گویا ہوئی تھی۔ کونین مسکرا کر رہ گیا۔

آسمان پر چاند کی روشنی مدھم تھی۔ لان میں لگے لپ سے مرکزی روشنیاں ہر سونو پھیلی ہوئی تھیں۔ موتیا اور موگرے کی روح پرور  
 خوشبوئیں ہوا کے ساتھ مل کر فضاؤں میں گردش کر رہی تھیں اور اس کے دل میں عجیب سی خوابیدہ خواہش بیدار ہونے لگی تھی۔

دل کی اسکرین پر وہ چہرہ اپنی تمام احتیاط، لاپرواہی و بے نیازی و دل آویزی سمیت روشن ہو گیا تھا۔

دل پاگل ہے، اس کے ہاؤلے پن کی کوئی حدود تو نہیں، جب یہ پاگل پن پر آتا ہے تو پھر دنیا انشت بد نماں رہ جاتی ہے۔

محبت کے سمندر میں، خواہشوں کی سر پھری موجیں تلاطم برپا کرتی رہتی ہیں۔ اس کے اندر بھی ایک خواہش کی موج اپنی زور  
 آوری دکھانے لگی تھی، چمکنے لگی تھی کہ..... اس وقت اس کے ساتھ زینبی کے بجائے خضرئی ہوتی اور وہ وقت کی تیلیوں کو اپنی مٹھیوں میں قید کر  
 لیتا..... کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔

زینبی اس کے ساتھ چلتی ہوئی نہ معلوم کیا باتیں کر رہی تھی۔ اسے ہوش نہ تھا، وہ دماغی طور پر غیر حاضر تھا۔

”مسٹر کونین؟“ اپنی باتوں کے جواب میں اسے خاموش پا کر زینبی نے اسے پکارا تھا مگر وہ کم تھا کسی سرڈنٹ کو اڈر سے گیت اُبھرا تھا۔

محبت چوے جن کے ہاتھ

جوانی پاؤں پڑے دن رات

سین نہ ہائے..... وہ کسی کی بات

زینی نے تعجب سے اس کے کھوئے کھوئے انداز کو دیکھا تھا۔

نینوں میں جن کے کاہل بن کر

رہے سہانی رات.....

محبت چوے جن کے ہاتھ

جوانی پاؤں پڑے دن رات

سنیں نہ ہائے..... وہ کسی کی بات

”مسٹر کونین! کیا آپ ٹھیک ہیں؟“ اس بار اس نے کونین کا شانہ ہلا کر کہا تو وہ گڑبڑا کر حواسوں میں لوٹا تھا۔

”ہاں..... ہاں میں ٹھیک ہوں۔ چلیں اندر چلتے ہیں۔ بہت ٹائم ہو گیا ہے۔“ وہ اپنی بات پوری کر کے تیز قدموں سے اندر

غائب ہوا تھا۔ زینی اس کے الجھن آمیز رویے پر ہکا بکارہ گئی تھی۔

سزطلعت اندر خوش گپیوں میں ان کے ساتھ مصروف تھیں۔

کونین خاموشی سے کار نکال کر جا چکا تھا، دل کے راستوں پر۔

☆.....☆.....☆

تم زندگی تیری راہ میں

شب آرزو تیری چاہ میں

وہ آہڑ گیا، وہ بسا نہیں

جو چھڑ گیا، وہ ملا نہیں

جو دل و نظر کا سرو تھا

وہی اک گلاب امید کا

میری شاخ جاں پر کھلا نہیں

میرا ہم سفر جو عجیب ہے

تو عجیب تر ہوں میں، آپ بھی

مجھے منزلوں کی خبر نہیں

اسے راستوں کا پتہ نہیں

وہ ایڑی جیت پر بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند کیے سوچوں میں گم تھا۔ ایک ہفتے قبل مہما سے ہونے والی جھڑپ نے اسے مزید ڈسٹرب کر

دیا تھا۔ وہ بھی اس بار صلح کے موڈ میں نہ تھیں۔ اسے دیکھتے ہی جملے پھینکنے شروع ہو جاتی تھیں کیونکہ اس بد تیز لڑکی کی کا لڑ برابری آ رہی تھیں۔ بات اتنی نہ بگڑتی، صرف مذاق تک نہیں رہتی اگر وہ لڑکی اپنا نام بتا دیتی یا ان کے ہزار بار پوچھنے کے باوجود وہ انون کوئی فرضی نام بتا دیتا۔ وہ دونوں ماں بیٹے اس وقت غصے و بے اعتمادی کے شکار تھے۔

مثال جن کی مدت کی خواہش رہی تھی کہ وہ منصف مخالف میں دلچسپی لے، فریڈ شپ کرے جیسا کہ ان کے سرکل سوسائٹی میں ہوتا تھا مگر وہ انون ان کی آرزوں کے برعکس تھا۔ اس کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے خول سے باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ صبر کر کے بیٹھ گئی تھیں تو اب ان کا لڑنے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ پہلے وہ اس کو کسی لڑکی کی شرارت سمجھی تھیں مگر شرارت طویل نہیں ہوتی ہے۔ انہیں یقین تھا۔

یہ لڑکی یقیناً صدمہ کی چھوٹی بیٹی مریدہ ہے۔ وہ ان کی پلاننگ سمجھ گئی تھیں کہ کس چالاکی سے وہ لوگ ان کی زندگی کا جہنم بنانے کا ارادہ رکھتی تھیں..... لیکن وہ بھی کم نہیں تھیں کہ ایک بیٹے کو وہاں منسوب نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ تو پھر دونوں بیٹوں کا معاملہ تھا جو سر کر بھی انہیں منظور نہ تھا، اسی وجہ سے ان کے درمیان بدگمانی و سرد مہری کی دیوار قائم ہو گئی تھی۔

گو کہ ابھی انہوں نے اپنے خدشوں کا اظہار کسی سے نہ کیا گیا مگر وہ انون کچھ کچھ ان کے طنز یہ اشاروں سے سمجھ رہا تھا اور یہی ان کو ان سے بدظن کرنے کا باعث تھا۔

سیل فون کی بیل نے اسے حوجہ کر لیا تھا۔

”ذوالنون بول رہا ہوں۔“

”بولتے رہتے پلیز۔“ دوسری طرف سے شوخ نسوانی آواز نے اس کے اعصاب جھنجھوڑ دیئے تھے۔ وہ سخت غصے سے گویا ہوا۔

”تم..... اسٹوڈنٹس نہیں سکوگی مجھ سے۔“

”اوہ..... چنانہ کون چاہتا ہے۔“ دوسری طرف سے سرد آہ بھر کر کہا گیا پھر ایک قہقہہ گونجا تھا۔

”یو چیپ گرل! تم نے جرات کیسے کی میرے رشتے داروں سے کنٹیکٹ کرنے کی؟ انہیں مس گائیڈ کرنے کی تم سوچ بھی نہیں

سکتیں، جو میں تمہارا حشر کروں گا۔“ اس کے لہجے میں آدم خوردہ دونوں جھسی خراہٹ تھی۔ غصے و جنون کی حدوں سے وہ اگل چکا تھا۔ لمبے بھر کو دوسری طرف خاموشی چھائی تھی، پھر دوسرے لمبے دہی قہقہہ گونجا تھا۔

”چچ چچ..... اتنا غصہ..... اتنا غصہ نہیں کرتے۔“

”شٹ اپ۔“

”اتنا غصہ کرو گے تو دو باتیں ہوں گی۔ تمہارے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی یا دل کام کرنا بند کر دے گا، اگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا تو

پھر بھی دو باتیں ہوں گی، یا تو لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے یا سائیکس، اگر سائیکس سمجھیں گے تو بھی دو باتیں ہوں گی.....“

”میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“ اس نے اس کی بات قطع کر کے خون خوار لہجے میں کہہ کر سیل آف کر کے بیڈ پر اچھالا اور خود دونوں

ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔



شدید اشتعال میں اس کا وجہ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شریانوں میں خون کی روانی بڑھ چکی تھی۔  
 ”بہت ہو گیا، اب اس اسٹوری کا ڈراپ سین کرنا پڑے گا۔“ اس نے مصمم ارادہ فیصلہ کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”حورین پلیز! اس بے وقوفی کو سب سے ختم کر دو۔ مجھے لگ رہا ہے تمہارا مذاق سنگین صورت اختیار کرنا جا رہا ہے۔“ زویا نے سنجیدگی سے اس سے کہا جو ابھی آواز بدل کر ڈوٹون کونٹنگ کر رہی تھی اور کئی ہفتوں سے اس نے یہ سلسلہ شروع کر رکھا تھا، جب سے ڈوٹون نے اسے ہرٹ کیا تھا، بجائے معافی مانگنے کے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔

کافی دنوں تک حورین اس کی اس حرکت اور سخت الفاظ کی گرفت میں بے چین رہی تھی اور آخر کار مول اور زویا کو اعتماد میں لے کر اس نے یہ پلاننگ کی تھی۔ پہلے وہ دونوں مان نہیں رہی تھیں مگر اس نے بھی منوا کر چھوڑا تھا، پھر ان کے ذریعے ہی حیدر وغیرہ سے وہ تمام فون نمبرز اس طرح حاصل کیے گئے کہ خود انہیں بھی محسوس نہ ہو سکا۔ آج پہلی بار وہ ڈوٹون سے مخاطب ہوئی تھی۔

”یہ مذاق نہیں انتقام ہے اس اسلٹ کا جو اس نے میری کی اور مجھے ذہنی طور پر تار چر کیا۔ ابھی تو کچھ نہیں ہے، آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا۔ موصوف کو سچ سچ پاگل خانے نہ پہنچا دوں تو۔“ وہ ہنستے ہوئے نیم دراز ہو کر گویا ہوئی۔

”مصل کو کبھی کبھی قریب آنے دیا کرو۔ معلوم ہے وہ سم کے ذریعے تم تک باسانی پہنچ سکتا ہے۔ اتنا عرصہ بھی وہ اس لیے شاید مہر کرتے رہے کہ تم نے ان سے براہ راست بات نہ کی تھی۔“ مول نے اسے سمجھانا چاہا۔

”اب میں اتنی بے مصل بھی نہیں ہوں کہ ڈائریکٹ اپنی سم استعمال کروں گی۔“ وہ چہرے پر آئے بال سمیٹتی گویا ہوئی۔  
 ”پھر یہ سم کس کی ہے؟“ وہ دونوں چونکی تھیں۔

”خان بابا کی۔“

”خان بابا کی؟“ زویا آچھلی۔

”کیا مطلب؟ وہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“ مول نے پوچھا۔

”دماغ سے۔“ وہ کھٹکھٹا کر ہنستی ہوئی گویا ہوئی۔

”اوہ پلیز سسٹنس پیدا مت کرو۔“

”پیام میرے لیے نیا سیل لے کر آئے تھے، پہلے والا میرے لیے بے کار تھا۔ ایک دن اتفاقاً مجھے معلوم ہوا کہ خان بابا (ڈرائیور) کے پاس سیل فون نہیں ہے، میں نے وہ سیل انہیں دے دیا تھا۔ اب کچھ دیر کے لیے لے لیتی ہوں۔“ وہ بانیں آنکھ دبا کر شوخی سے گویا ہوئی۔

”اوہ! گیم تم نے اچھا کھیلا ہے۔“ وہ دونوں بھی ہنس پڑی تھیں، پھر مول کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔

”آج ان کی گفتگو سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ اب ہر طریقے سے یہ معلوم کر کے رہیں گے، کس کی شرارت ہے؟“

”تو کریں معلوم..... خان بابا صاف بول دیں گے کہ صیب ام کو نہیں معلوم کون لڑکی آپ کو تنگ کرتا ہے۔“ حورین سب سے زیادہ برا اعتماد تھی۔

تم دل کو بے قرار کیوں نہیں کرتے  
میری محبت پر اعتبار کیوں نہیں کرتے  
جی نہیں سکتا ہو کہ جدا تم سے  
لیکن تم تو محبت کا اظہار نہیں کرتے  
ہریرہ منگلتا تھا اور داخل ہوا تھا۔

”شرم نہیں آتی تمہیں؟ دروازہ ناک کیے بغیر اندر آتے ہو۔“ وہ تینوں جو آڑی ترچھی بیڈ پر بیٹھی تھیں، جلدی سے سیدھی بیٹھ گئی تھیں۔ حورین اسے گھور کر بڑبڑائی۔

”دروازہ پہلے سے کھلا تھا..... میں سمجھا میرے لیے کھلا ہے۔“ وہ شرمندہ ہونے والوں میں سے نہ تھا۔  
”ہونہہ! میرے لیے کھلا ہو، منہ دھور کھو۔“

”تم منہ دھونے کی بات کرتی ہو، میں نہا کر آیا ہوں۔“

حورین اسے گھور کر رہ گئی، جب کہ وہ دونوں ہنس پڑی تھیں۔

”اتنا فصد مت کرو یہ خوب صورت چہرہ بگڑ کر رہ جائے گا اور مانیں تمہارا نام لے لے کر بچوں کو ڈرایا کریں گی۔“ وہ کچھ جھک کر اس کے بال بگاڑتا ہوا بولا۔

”ہریرہ بھائی! کیوں تنگ کرتے ہیں آپ اس کو؟“ مول نے اس کی سائیڈ لی۔

”بی بی جان کو معلوم ہو گیا تو خیر نہیں آپ کی۔“

”بی بی جان نے ہی تو بھیجا ہے مجھے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم نے کہا تھا نا اسلام آباد جانے سے قبل شاہجگ کرنا چاہتی ہو۔“

”ہاں ہاں..... کیا تم نے بی بی جان سے اجازت لے لی؟“ حورین لڑائی بھول بھال کر بیڈ سے اترتے ہوئے گویا ہوئی۔

”اگر شاہجگ سینئرز اس دنیا میں نہ ہوتے تو تم لوگ کیا کرتیں؟ کیسے زندگی گزارتیں؟“ وہ از حد حیران تھا۔

”اگر ہم نہ ہوتے تو شاہجگ سینئرز نہ ہوتے، کیونکہ ہم نے ہی ان شاہجگ سینئرز کو قائم کیا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے کاروبار

صرف ہم خواتین کی وجہ سے چل رہے ہیں۔“ حورین فخریہ اعزاز سے بولی۔

”وہ کسی نے کہا ہے کہ۔“

وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ“

”تو صرف کائنات ہی نہیں، کائنات کی ہر شے زن کی وجہ سے ہی گل و گلزار و روشن ہے۔“ وہ ایک کے بعد ایک جواب دے رہی

تھیں۔ ہر پرہیزگاری کی موجودگی میں لا جواب ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہنزہ اور اس کی بیوی مٹی مون سے واپس آچکے تھے۔ راحیلہ بیگم نے بہو کے مشورے سے ڈنر پر خاصا اہتمام کروایا تھا، کیونکہ آج کوئین کی بھی ہنزہ کی بیوی سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ پہلے ہی ان سے ملاقات کے دن گن گن کر گزار رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد بھی کئی بار آچکا تھا، البتہ ذوالنون نے کافی دنوں سے کوئی چکر نہ لگایا تھا اور نہ ہی کال کی تھی۔

وہ ایسا ہی تھا۔ خبر گیری کرنے پر آتا تو کالز پر کال کرتے، مگر پر بھی آتا یا پھر ایسے ہی بھول کر بیٹھ جاتا، وہ کوئین کے ذریعے اس کی خیر خیریت معلوم کرتی رہتی تھیں۔

کوئین سب کے لیے تعارف لے کر آیا تھا، (مثال کی بے خبری میں) ہنزہ کی بیوی کے لیے طلاق سیٹ تھا جس میں قیمتی گینٹوں کا کام تھا۔ وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ مزے دار باتیں ہو رہی تھیں۔ صبرائیل، صنوبر آنٹی، وادو سب ہی موجود تھے۔ ہنزہ کی ایک ایک بات بتائی جا رہی تھی۔ خضر کے شوخ جملوں کے ساتھ محفل زعفران زار بھی۔ ہنزہ کی بیوی نے اسٹیش کافی بتائی تھی سب کے منع کرنے کے باوجود وہ افس رہا تھا۔ ہاتھیں کر رہا تھا مگر اس کے اندر اضطراب و اضطراب زرد آندھی کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر قبل یہ وقت، یہ لمحات اسے زندگی کا حاصل لگ رہے تھے۔ پھولوں کی تمام خوب صورتیاں، تاروں کی تمام نسیاں پاشیاں اسے یہاں بکھری ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر کیا گئی، گویا چرخوں میں روشنی نہ رہی۔ پھول مرجھا کر اپنا رنگ دیکھو بیٹھے تھے۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، پھر وہ بیٹھا نہیں تھا، جلد آنے کا کہہ کر چلا گیا تھا۔

خضر نے کمرے کی کڑکی سے اس کی کار کو دور تک جاتے ہوئے دیکھا تھا، پھر اس کی نظریں لوٹ آئی تھیں۔ نہ معلوم اس کے گداز دل میں کیسا احساس جاگزیں ہوا تھا، وہ اسی کڑکی کی چوکھٹ سے ہاتھ لٹک کر روئے لگی تھی۔

جذبوں نے جب تک جواب کی ادا اور مٹی ہوئی تھی، تب تک وہ اس کے ساتھ، اس کے سامنے بیٹھی رہا کرتی تھی۔ احتیاطاً پلکوں کو جھکائے ہوئے مگر جب جذبوں کی زور آوری جواب و احتیاط کو تار تار کر کے سامنے ایسا وہ ہو گئی تو پھر اس نے گریز دے رکھی کو ہتھیار بنایا تھا لیکن..... ایسا کر کے اسے بے نامی اداسی نے آن گھیرا تھا۔ دل نمک کا پھاڑ بن گیا تھا جو آنکھوں کے راستے بہتا تھا۔

کوئی طلب بھی نہیں سو گوار بھی ہوں

پکارتی بھی نہیں جھانکتا بھی ہوں

تجانے کتنے ارادوں میں بٹ گیا ہے وجود

اسے بھلا بھی دیا اور بے قرار بھی ہوں

”چندا! دادو کی لڑتی آواز، کانپتا ہاتھ اپنے شانے پر محسوس کر کے اس نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔“ کیا ہوا چندا کیوں رو رہی ہو؟“ دادو جب بہت لاڈ میں ہوتی تو اسے اسی نام سے پکارتی تھی۔

”کچھ نہیں دادو! بس ایسے ہی۔“ وہ دوپٹے چہرے پر رگڑتی ہوئی گویا ہوئی مگر آنسوؤں پر کب کسی کا بس چلا ہے، وہ رگ نہیں رہے تھے۔

”بس ایسے ہی۔“ وہ اسے شانوں سے قہام کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ”چلو مل کر روتے ہیں، میرا بھی ایسے ہی دل چاہ رہا ہے۔“ آواز ان کی پہلے ہی بھرائی ہوئی تھی۔ قل اس کے کہ خستہ سنبھلتی وہ اسے سینے سے چٹائے بے آواز رو رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں میری بیٹی! جو تجھ پر اور میرے بچے پر گزر رہی ہے، گزر اوقت ایک بار پھر نئے روپ میں میرے سامنے کھڑا ہے۔ حزر اور کرن مجھے آج کل بہت یاد آ رہے ہیں، تمہارا کو نین کو دیکھ کر کتراتا، اس کی موجودگی میں زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتا اور اس کا ہر دوسرے تیسرے دن بھاگ بھاگ کر آتا، بے چین نکلتا ہے، بے تاب انداز کچھ بھی میری لگا ہوں سے چھپا نہیں ہے۔“ وہ روتے روتے اس حقیقت کو عیاں کر رہی تھی جو وہ سمجھتی تھی کہ کوئی نہیں جانتا۔

”دادو! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے کبھی بھی ان کی پذیرائی نہیں کی بلکہ..... پہلے قدم پر ہی لوٹا دیا تھا۔“ وہ سستی ہوئی بولی۔

”مجھے احساس ہے میری بیٹی! تم بالکل درست کر رہی ہو، یہ وہ راستے ہیں جن پر گامزن ہو کے منزل نہیں ملتی، تپائیاں، رسوائیاں ملتی ہیں۔ محبت کا ایک گلشن میں نے خود خاک کیا تھا کی راکھ نہ معلوم کب تک مجھ پر چھٹکی جاتی رہے گی۔“ ان کے آنسوؤں میں ندامت و پچھتاوے تھے۔

☆.....☆.....☆

بیٹا! ہمیں ہمارا مذہب از حد وسعت قلبی و تحمل و رواداری کا درس دیتا ہے، بالخصوص منصف نازک کی عزت و احترام تو سب پر لازم ہے۔ عورت صرف ایک جسم و تسکین کا نام نہیں ہے، اس سے بہت سارے احترام و عزت، محبت و خلوص کے رشتے بھی وابستہ ہیں کہ ماں کے روپ میں جنت کا کس، بہن کے روپ میں شہدای چھاؤں، بیٹی کے روپ میں چاہت ہی چاہت، شریک حیات کے روپ میں راحت و وقا۔ ان کے علاوہ بھی عورت سے وابستہ رشتوں میں سکون و اپنائیت ہوتی ہے، مثلاً دادی، نانی، بھینچو، خالہ، تائی، چچی وغیرہ وغیرہ۔“ پروفیسر آفتاب حسن نے موقع دیکھ کر اسے اس کی زیادتی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی کیونکہ انہیں احساس تھا اس واقعے کے بعد حورین ان سے کچھ کہنی کہنی ہی رہنے لگی ہے۔ اس کے خنکی بھرے رویے نے ہی انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ غلطی سراسر ذوالنون کی ہے۔

”سرا میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن یہ جنس بہت بڑی بے راہ روی کا بھی شکار ہے اور اس کو ہم کسی باعزت و اخلاقی

رشتے سے وابستہ نہیں کر سکتے۔ مجھے ان کریکٹرز سے نفرت ہے، شدید نفرت۔“ وہ ہائٹ کلف شدہ شلوار سوٹ میں اس کی شان دار شخصیت نمایاں تھی۔ گرے آنکھیں شفاف و روشن تھیں، وجہ چہرے پر سنجیدگی تھی۔

”پھر وہی بات ہوگئی جس طرح ہاتھ کی تمام انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح ہر لڑکی بھی خراب نہیں ہوتی، سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”اس اوکے آپ ڈائریکٹ وہ بات کریں جو کہنا چاہ رہے ہیں۔“ وہ قریب دیکھی ڈائری کے ورق اٹھاتا ہوا گویا ہوا۔

”ہاہاہا..... بہت نگاہ شناس ہو، میں کہہ رہا ہوں، یہاں چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کرتا ہوں، چند اسٹوڈنٹس کے ساتھ ان لڑکیوں کو بھی انوائٹ کریں گے اور تم معذرت کر لینا، ہلکے پھلکے انداز میں۔“ وہ چائے میں چینی ملائے ہوئے اس کی حالت سے بے خبر کہہ رہا ہے تھے، جبکہ ڈوائٹون کی نگاہیں ڈائری کے ایک ورق پر رکھے موبائل نمبر اور نمبر کے سامنے لکھے نام پر جم کر رہ گئی تھیں۔ چند لمبے قبل نظر آنے والا اس کا مطمئن انداز بدل گیا تھا۔

”کیا ہوا تم خاموش کیوں ہو گئے؟ آؤ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”سر! سر!..... یہ نمبر..... یہ نمبر کتنا کیوں گیا ہے؟“ وہ ڈائری ان کے آگے ٹھیل پر رکھتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”یہ نمبر جو دین کا تھا۔“ وہ اس کے اندر ہوتی، بھیانک اپیل سے بے خبر چائے کاک بڑھاتے ہوئے اطمینان سے بولے۔

”تھا سے مطلب سر؟“ وہ مضطرب ہوا۔ ابھی ڈور کا سرا ہاتھ آ کر نکل رہا تھا۔

”جو دین نے دو سرا میل لے لیا ہے بلکہ یہ نمبر اس کے شو فر کا ہے۔ جو دین نے اسے یہ موبائل گفٹ کیا ہے مگر آپ کیوں انکو آئی کر رہے ہو؟ موبائل کے ذریعے معذرت کا ارادہ ہے کیا؟“ وہ شو فی سے بولے تھے۔

”شی ڈونٹ لائک۔“ وہ نفرت بھرے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

موسم ایر آلود تھا۔ ہوا بند اور شدید گھٹن و جس ماحول میں پھیلا ہوا تھا۔ سر آفتاب کے ہاں ہونے والی پارٹی ابھی ختم ہوئی تھی۔ تمام اسٹوڈنٹس جا چکے تھے۔ جو دین اور ڈوائٹون کے علاوہ سر آفتاب نے انہیں دانستہ روکا ہوا تھا۔ جو دین بار بار رسٹ وایج دیکھ رہی تھی۔

”سر! ابھی تک گھر سے شو فر نہیں آیا ہے۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔“ وہ سر کے قریب آ کر پریشان لہجے میں گویا ہوئی۔

”پریشان نہ ہوں، ڈوائٹون آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔“ وہ شفقت سے مسکرا کر ڈوائٹون کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے جو جانے کی تیاری میں تھا۔ ان کی بات سن کر ٹھنک کر ڈک گیا۔

”آتم سوری سر! میرا روٹ الگ ہے۔“

”زیادہ فاصلہ نہیں ہے، ڈراپ کرو، موسم کے تیز دیکھ رہے ہو کسی بھی وقت برس سکتا ہے۔“

”سر! شو فر آتا ہوگا، میں انتظار کر لوں گی۔“

”موسم ٹھیک ہوتا تو میں خود تمہیں ڈراپ کر آتا۔ اس وقت آپ دونوں انا کی قید سے نکل آؤ جو ہوا وہ بھول جاؤ۔ ابھی بہت سارا وقت تم لوگوں کو ساتھ گزارنا ہے، اگر اسی طرح نفرتیں، عداوتیں پالتے رہے تو کل اپنے گولڈن جہیز کو کس طرح یاد کرو گے جو ہر اسٹوڈنٹ

اپنی آئندہ زندگی میں یاد رکھتا ہے۔" ان کے لہجے میں ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ دونوں ہی سر جھکا کر رہ گئے۔ سر آفتاب نے خود اس کے لیے ڈرائیونگ ڈور کھولا تھا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ دوسرے ہاتھ ملاتا ہوا محکم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سحر انگیزی مہک بھیل گئی۔

سر آفتاب کا راجھل ہونے تک ہاتھ ہلاتے رہے تھے۔ ان کی کوشی مضافاتی علاقے میں تھی۔ یہاں بہت بہت فاصلے پر پھلنے کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔

وہ جب ڈرائیونر کے ساتھ آئی تھی، تب بھی موسم ہیگا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے بھی تھے۔ سر سبز اور ہر سو پھیلی خاموشی کو اس نے خوب انجوائے کیا تھا اور اس وقت وہ اتنی ہی بیزار و خوف زدہ تھی۔ دن میں لگا ہوں کو تراوت بخشنے والا سبزہ اس وقت آنکھوں میں خوف بھر رہا تھا۔ آسمان سیاہ تھا اور اس کی سیاہی ہر شے پر محیط تھی۔ فضاؤں میں عجیب مذاسرار سرگوشیاں تھیں، اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ ساتھ بیٹھا شخص کسی رو بوٹ کی مانند تھا، ایک لفظ نہ کہا تھا۔ پارٹی میں بہت مختلف وطن سار نظر آنے والا اس وقت وہی اپنے کشور پین و سر دمہری میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر ششے سے باہر پھیلی سیاہی کو دیکھنا شروع کیا مگر یہ کیا؟

"یہ..... یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ یہ راستہ غلط ہے۔" وہ کار کو پیچھے کی بجائے آگے رواں دواں دیکھ کر ہراساں ہو کر چیختی۔

"خاموش رہو، مجھے معلوم ہے یہ راستہ غلط ہے۔" اس کے لہجے میں گویا ڈوہوں کی پھنکار تھی وہ پوری جان سے کانپ اٹھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کے انداز میں وحشت تھی۔

"میں نے کہا نا خاموش رہو۔" وہ دھاڑا۔

"کیوں خاموش رہوں؟ تم..... تم گھٹیا انسان کا رو کو، کار رو کو اور نہ میں....." ڈر، خوف، وحشت خیز لگا ہوں سے کبھی باہر کا جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی اس کے سفاک چہرے کو دیکھ رہی تھی، جہاں صرف درندگی و بے رحمی دکھائی دے رہی تھی۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی تھی۔

"پلیز! میری بات سنو کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ تم..... تم آخر چاہتے کیا ہو؟" کوئی راہ فرار نہ پا کر وہ بلک اٹھی تھی۔

"اتنی آسانی سے بتا دوں۔" وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوا۔

"تم کو میں ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ تم جیسی لڑکیوں کے باعث عبرت ہوگی۔ تم اپنی مکاریوں سے دوسروں کی زندگی، جینن و سکون سب ختم کر دیتی ہو۔" اس نے ایک ویران جگہ پر گاڑی روک دی تھی۔

اس کے چہرے پر خطرناک عزائم کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھیں ابھرنے لگی تھیں، اس کے لفظوں میں شعلوں کی لپک تھی۔

"تم نے سب کالز کے ذریعے جس قدر مجھے ذہنی و جسمانی ڈسٹرب کیا، ان سب کا بدلہ لوں گا۔" اس نے ڈیش بورڈ میں رکھی ایک بولس لگائی تھی اور از حد مسرت سے جھک کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ کی گرفت میں جکڑ لیے تھے۔ وہ بُری طرح مچلنے لگی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے معاف کر....." بولس سے تیزاب اس کے چہرے پر پھینکا جا چکا تھا۔ اس کی لڑخیز چیخوں سے کار گونج اٹھی تھی۔



بادل بڑی زور سے گر جاتا۔

اس شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نیم خوابیدہ آنکھیں ارد گرد دھما مٹائی، ہر شوگپ اندھیرا تھا، بیڈ کے مین سامنے کھڑکی سے باہر موسلا دھار بارش دکھائی دے رہی تھی۔

کمرے کی دیوار خاموشی میں باہر ماربل کے فرش پر گرنا بارش کا پانی بہت شدت سے شور کر رہا تھا۔ اس کی آواز اور ڈولنوں کی بے ترتیب سانسوں کی آوازیں اس تاریک ماحول میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ کئی لمحوں سے وہ یہی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کچھ دیر قبل جو اس نے دیکھا، وہ خواب تھا یا..... یہ خواب ہے؟

بارش اسی طرح برس رہی تھی اور بادلوں کی کھن کرج، بجلی کی چمک اسی طرح تھی۔

کار میں وہ اور حورین..... اور اس کا حورین کے چہرے پر ایسی بھینکنی اس کی درد و تکلیف میں ڈوبی اذیت ناک کراہیں، وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کوئین اسے پکارتا ہوا اندر آیا تھا۔ اندھیرا دیکھ کر اس نے تمام لائٹس آن کی تھیں۔ بیڈ پر اسے سینے میں شرابور دیکھ کر پریشانی سے آگے بڑھا۔

”پرنس! کیا ہوا پرنس! تمہیں اسے پیسے کیوں آرہے ہیں؟“ اس کے شانے پر بازو رکھے ہوئے ایک جہاں کی گھر تھی اس کے لیے جس۔

”اوہ..... تمہیں کس کا ڈاؤن خواب تھا؟“ گہری سانس لے کر ڈھیلے انداز میں وہ بھائی کے شانے سے سرٹکا کر گویا ہوا۔

”خواب؟ کیا خواب دیکھ لیا؟“ اس نے برادرانہ شفقت سے ڈولنوں کو ہٹایا کیونکہ وہ ایسی بے تکلفی بہت کم کرتا تھا۔

”بہت بھیاک، بہت خطرناک“۔ وہ ابھی اس کیفیت سے نکل نہیں پایا تھا۔

”خواب محض خواب ہوتے ہیں ان سے کیا ڈرنا، کم آن لاگ ڈرائیوگ پر چلتے ہیں وہاں سے پھر داد کی طرف چلیں گے۔“ وہ اطمینان سے بیٹھتا ہوا بولا، جبکہ ڈولنوں کے چہرے پر حیرانگی درآئی تھی۔

”بھائی اس نام لاگ ڈرائیوگ اور دادو کے ہاں جانا ٹھیک رہے گا؟“ اس کے استفسار پر کوئین کے منہ سے نکلنے والا تہتہ بے ساختہ تھا۔

”ڈنبر برادر! یہ رات کے نہیں دن کے چارج رہے ہیں۔ آپ آج یونیورسٹی سے جلدی آگئے تھے اور سو گئے تھے۔“ کوئین کی وضاحت پر خفیف سی مسکراہٹ اس کے چہرے کو روشن کر گئی اور اسے یاد آیا کہ وہ آج یونیورسٹی گیا تھا اور دوپہر یونیورسٹی کے سر آفتاب کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ کئی دنوں سے اسے گھبراتا رہے تھے۔

وہاں باتوں کے دوران اتفاقاً اس کی نگاہ ڈائری میں نوٹ حورین کے سیل نمبر پر پڑ گئی تھی۔ سر آفتاب کی وضاحت کے باوجود

اسے اس کا گیم بھگنے میں دیر نہ لگی تھی، وہ انہیں کچھ بتائے بغیر واپس آ گیا تھا۔ غصے و جنون کے باعث اس کی حالت ضبط سے باہر تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ لڑکی جو دوسری تمام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ خود سر، گھمنڈی، بددماغ کیوں اسے پریشان کرنے پر کمر بستہ ہے اور اب اس انکشاف نے اسے بالکل آڈٹ کر دیا تھا کہ وہی لڑکی ہے جو اسے اور دوسرے لوگوں کو اس حوالے سے تنگ کرتی رہے گی۔ وہ اسی سوچ میں سو گیا تھا پھر جو کچھ دیکھا تھا وہ اس کے غصے و جنون کا اثر تھا جو خواب میں نظر آیا۔

☆.....☆.....☆

انس نے کالام میں ایک خوب صورت کا بیج خریدا تھا۔

اپنی مرضی سے اس میں کچھ تبدیلیاں کروانے کے بعد نئے سرے سے اس کی تربیت و آرائش کروائی، جس سے کا بیج کی خوب صورتی کئی گنا بڑھ گئی اور یہ کا بیج اس نے ویڈیو گیم ایڈورسری پر کرن کو گفٹ کیا تھا۔ وہ چاروں سالگرہ منانے اس کا بیج میں آئے تھے۔ سارا دن سیر سپاٹے میں گزر گیا۔ ذرا ایک اعلیٰ ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چل رہا تھا، انس اور سعد باتوں میں مشغول تھے۔ قاریہ بھی ان کی گفتگو میں گام بہ گام حصہ لے رہی تھی۔ اس کے برابر پیشی کرن واقعی طور پر وہاں سے غائب تھی۔ بیرون پلہری بنا رہی ساڑھی جس پر ایک گولڈن بارڈر اور گولڈن ڈیزائن کٹرا سٹ میں دیدہ زیب کام ہوا تھا۔ گولڈن بلاؤز میں اس کا تناسب سراپا آج بھی وہی دل کشی و رعنائی لیے ہوئے تھے۔ گزرے تیس سال گویا اسے چھوٹے بھائی گزر گئے تھے۔ اس کے سراپے میں عجیب و غریب نمکنت نے اسے شان دار بنا دیا تھا۔ انس اس کی محبت میں ہر حد و عبور کر چکا تھا، وہ اسے دیکھ کر جیتا، ہر گزرتا دن ان کی محبت میں اضافے کا باعث تھا۔

اب بھی اس کی وارفتگی بھری نگاہیں ہار بار چل چل کر اٹھ رہی تھیں۔ میچنگ جیولری، لائٹ میک اپ میں ان کا حسن دو چہرہ تھا۔

"باز آ جاؤ"۔ سعد نے کافی کلنگ اٹھاتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔ "بھائی کو نظر لگا کر چھوڑو گے؟ کب سے دیکھے جا رہے ہو....."

"کیوں بھی! آپ کو کیا تکلیف ہے! اپنی بیوی کو دیکھ رہا ہوں۔"

"لیکن انداز تو آپ کا محبوبہ کو دیکھنے والا ہے۔"

"محبوبہ کو ہی دیکھ رہا ہوں۔ شادی کے تیس سال بعد بیوی دیکھنے والی نہیں بھینکنے والی شے بن جاتی ہے۔" وہ کافی سے سب لیتے ہوئے شوخی سے بولے۔

"ار..... رے انس بھائی اکیسی باتیں کر رہے ہیں..... میرا تو خیال کیجئے۔" قاریہ نے خوف زدہ ہونے کی بھرپور ایکٹنگ کی تو وہ

تینوں مسکرا دیے۔

"بے فکر رہیے بھابی صاحب! آپ کے بارے میں یہ ایسا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ اُس نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے

پُر اعتماد لہجے میں کہا۔



”کیوں بھی! مجھ پر یہ پابندی کیوں؟ تیس سال میں بیوی بچھیننے کے لائق ہو جاتی ہے تو مجھ پر ان کو نہ بچھیننے کی پابندی کیوں؟“  
سدا اس طرح جربز ہو کر گویا ہوئے جیسے وہ فار یہ بیگم کو اسی وقت فارغ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں اور انس کی بات ان کی راہ میں رکاوٹ بنی ہو۔ فار یہ بیگم نے انہیں خشکیں لگا ہوں سے گھورا تھا۔

”اس لیے جناب من! کہ بھابی صاحبہ اب کے بیوی ہی نہیں بلکہ دو بچوں کی ماں بھی ہیں جن میں سے ایک عدو کڑیل جوان بیٹا ہے اور جب بیٹا باپ کے قد کے برابر ہو جاتا ہے تو ماں کو بڑی مضبوط پناہ گاہ لگتی ہے، اب تم ان کو نہیں پھینک سکتے یہ.....“ وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرانے لگے تھے۔ فار یہ بیٹے کے ذکر پر فخر سے مسکرانے لگی تھیں اور سدا صاحب نے شغنی آہ بھری تھی۔

”تم سے میں آج اتنے سال بعد بھی نہیں جیت سکتا یا مگر یہ مجھ پر اور بیوی والا کیا فلسفہ جھاڑا ہے جو مجھ نہیں آیا؟“

”یہ فلسفہ نہیں میرے جذبات ہیں برادر۔“ وہ کافی کا بس لے کر کرن کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔ کافی سے نکلتی بھاپ کی پر چھائیں میں جس کے حسین وند وقار چہرے پر شرم کی قوس قزح نکھری ہوئی تھی۔

”لوگ پہلے محبت کرتے ہیں پھر شادی۔“ انس نے جذب کے عالم میں کہا شروع کیا۔ کرن کے چہرے پر سرفی گہری ہونے لگی تھی۔  
”محبوبہ جب تک محبوبہ رہتی ہے تو زندگی بہاروں، ستاروں، چاند اور چاندنی کی طرح دل کش و حسین لگتی ہے اور جب محبوبہ بیوی بن جاتی ہے تو سمجھو..... بہاروں کی مہک، ستاروں کی طرح چمک، چاند کی طرح دیکھتے دن چاروں کی چاندنی محسوس ہوتے ہیں اور بیوی کسی آسپ کی طرح خود پر مسلط نظر آتی ہے۔ میں نے پہلے شادی کی پھر محبت کی۔ کرن پہلے میری بیوی بنی اور پھر محبوبہ۔“ اس کا لفظ لفظ انوٹ محبت کی خوشبو میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا لہجہ چاہت کی خوشبوؤں سے معطر تھا۔ کہیں بھی کسی غلطی، کسی کسک، کسی تڑپ کی بے چینی نہ تھی۔  
سدا نے بہت عقیدت سے انس کا ہاتھ چوما تھا۔

☆.....☆.....☆

خضرئی وارڈ کے راولڈ سے فارغ ہو کر بیٹی تھی کہ وارڈ بوائے ایک وزیٹنگ کارڈ لے کر اس کے پاس آیا، کارڈ پر چمکتے نام نے اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب کر دی تھیں۔ عجب سنساہٹ اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اس شخص کی آنچ و بیٹی لگا ہوں کی تپش سے بچنے کے لیے وہ گھر میں چھپی پھرتی تھی، کمرے میں مقید ہو جاتی تھی۔

مگر یہاں..... ہسپتال میں..... کس طرح قرار حاصل کرے؟

”ڈاکٹر! کیا جواب دوں.....؟ منع کر دوں؟“ وارڈ بوائے کی زیرک نگاہوں نے اس کے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھتے ہوئے درست گمان کیا تھا..... اور وہ چاہنے کے باوجود اثبات میں گردن نہ ہلا سکی تھی۔ دوسرے لمحے وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ گرے پینٹ سوٹ، وائٹ شرٹ پر آویزاں گرے نائی میں چمکتے خوب صورت چہرے پر ایک ایسی سحر انگیز مسکراہٹ تھی جس میں کئی رنگ تھے۔ شکوے، شکایت، اپنائیت و چاہت، اُلفت و محبت جو روشنی بن کر اس کی آنکھوں میں جگمگا رہی تھی۔ وہ ان چمکتے رنگوں کی وقتی روشنیوں کی تاب نہ لاسکی

اور نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔

”بیٹھ جاؤ۔“

”جھینکس اسے لاٹ، ورنہ میں سمجھا تھا آپ مجھے اسی طرح سزا میں کھڑا رکھیں گی۔“ وہ مسکرا کر کہتا ہوا کرسی پر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

”سزا..... کیا، کیا ہے آپ نے جو میں آپ کو سزا دوں گی.....“ اس نے اپنی آہل پھل ہوتی دھڑکنوں اور سنسناتے اعضاء پر قابو

پاتے ہوئے مخصوص انداز میں کہا جو انداز سے باوقار و معہر بنا تھا۔

”آپ کو تلاش کرنے کی جسارت، روبرو ملاقات کی گستاخی کی سزا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کو نمین..... بھائی.....“ ایک عرصے سے وہ اسے ”بھائی“ کے خطاب سے پکارتی آئی تھی مگر جب

سے کو نمین نے نئے جذبوں کی تشہیر شروع کی تھی، جب سے اس کی زبان کو نمین کو پکارتے ہوئے ہر بار لڑکھڑا جاتی تھی۔

اس نے اس کے ان چاہتوں کے سبب جذبوں کی پذیرائی نہیں کی تھی۔ ہر بار شدت سے رد کرتی اور ٹھکراتی آئی تھی مگر..... کو نمین

کے چہرے پر ناگواری اور تیشی اس کی زبان کو بے ربط کر دیتی تھی۔

”ٹٹا، ٹٹا، ٹٹا، تمہارے منہ سے نکلا یہ لفظ مجھے زہر لگتا ہے۔“ وہ نرمی طرح جزیب ہو کر گویا ہوا تھا۔

”تعلقات کبھی بھی زہر خندہ نہیں ہوتے ہیں۔“

”اگر رشتوں کو غلط طریقے سے پکارا جائے تو گالی بن جاتے ہیں۔“ کو نمین کا رد عمل متشعل تھا۔ خضریٰ پہلو بدل کر رہ گئی۔

”کیا ایسے گے آپ، کولڈ ڈرنک، چائے یا کافی؟“ اس نے موضوع بدلا تھا۔ کو نمین نے جواب میں کچھ توقف سے اس کی طرف

دیکھا پھر بولا۔

”زہر۔“

اس کے جواب میں اتنی قطعیت و سرد مہری تھی کہ وہ چند ہی دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ زبان حرکت کرنا بھول گئی۔

”اپنی بے زہنی و بے احتیائی کے زہر سے ویسے ہی تم مجھے دھیرے دھیرے قتل کر رہی ہو۔ تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہاری طرف سے

غافل ہوں؟ نہیں..... ہرگز نہیں۔ تمہارا کترانا..... کمرے میں چھپ کر بیٹھنا..... فون نہ سننا..... میرا نمبر دیکھ کر سیل آف کر دینا..... کچھ بھی

چھپا نہیں ہے مجھ سے۔“ اس کے گھبر لہجے میں سرد آج تھی۔

خضریٰ کی نگاہیں جھکتی چلی گئی تھیں۔ دل کی دھڑکنوں میں عجیب سوگوار سا انتشار برپا ہو گیا، وہ اضطراب میں ہونٹ دانتوں سے

کانٹنے لگی۔

”میری حالت ذبح ہوتے جانور سے بھی زیادہ اذیت ناک ہے، کیونکہ وہ گردن کٹ جانے کے بعد اذیت سے راحت پالیتا ہے

اور میں تو مسلسل کرب میں ہوں، کیونکہ مجھے ذبح کرنے کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ میری گردن کے بجائے جسم سے ابتداء کی گئی ہے۔“

”یہ سب لایعنی..... لا حاصل ہے۔“ بالآخر اس کا اعتماد بحال ہوا تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھائی تھیں مگر اس کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا اور اتر کام پر کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔

”جس دور میں ہم رہتے ہیں، یہاں سب ممکن ہے۔ صرف جذبوں میں صداقت ہونا شرط ہے..... تم صرف ایک بار اقرار کر لو..... لا حاصل کو حاصل میں کر کے دکھاؤں گا۔“ اس کے لہجے میں سچی محبت کی کلیاں کھل اٹھی تھیں۔ نگاہوں میں جذبوں کی شمعیں روشن اور انداز سے جنوں خیر مشق کی دیوانگی جھلک رہی تھی۔

”آئم سو سوری۔ میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اور جذبات آپ کے لیے میرے دل میں نہیں ہیں۔“

”ا..... چھامیں مان جاؤں گا..... اگر مجی سب تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو تو.....“ اس کے چہرے کی آڑی رنگت، کانپتے لب و رخسار، آنکھوں میں اُلٹتی نمی، لہرزاں ہاتھ جن کی اُلگلیوں کو وہ اضطرابی انداز میں ایک دوسرے میں بار بار بیوست کر رہی تھی۔ وہ تمام حرکات و سکنات جو اس سے بلا ارادہ و بے اختیار سرزد ہو رہی تھیں، اس کے جذبوں کی حقیقت بیان کر رہی تھیں۔

وہ اقرار

وہ اظہار

دوراز

جو وہ خود سے چھپا رہی تھی، نگاہیں چراری تھی۔ وہ از خود ہی عیاں ہو رہا تھا۔ اپنا ہیڈ کھول رہا تھا۔ محبت ایک خوشبو ہے۔

اور وہ پہلی اس خوشبو کو چھپانے کی سعی کر رہی تھی، پھر ناکامی کو مقدر بننا ہی تھا۔ خوشبو کو عیاں ہونا ہی تھا۔ سو وہ عیاں ہو گئی۔

”میں باہر کھڑا دروازے پر اس وقت تک دستک دیتا رہوں گا جب تک دروازہ کھل نہ جائے۔“ کونین کے لبوں پر دل کش جسم تھا۔ اس کے چہرے پر یقین پالینے کی خوشی تھی۔ تم نے کہا تھا میں غلط دروازے پر دستک دے رہا ہوں۔

”ہاں کہا تھا اور..... اب بھی کہہ رہی ہوں یہ دروازہ کبھی وا نہ ہوگا۔“ وہ سرعت سے اپنی کیفیت پر قابو پا کر بولی۔

”میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو تو مانوں۔“ وہ شوخ ہوا۔ قہقہے اس کے کراس کی شوخیوں کو مزید موقع ملتا خصرتی کی کو لیگ کے بروقت آنے سے از خود ہی موضوع بدل گیا تھا اور خصرتی نے طمانیت بھری سانس لی تھی، جبکہ کونین کے لبوں پر بڑی آسودہ و ہنس مکھ مسکراہٹ تھی۔

☆.....☆.....☆

امتحانوں کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ آج کل لائبریری میں تمام شیٹیں بک تھیں۔ بک شیلف سے بکس نکلائی جا رہی تھیں۔ ایسے میں جب بے فکرے وغیرہ سنجیدہ اسٹوڈنٹس بھی پڑھائی کی طرف راغب دکھائی دیتے تھے، ان مصروف ترین دنوں میں

رؤف عرف روکی کا شریک نہ رہے۔ اپنی غیر نصابی دشا انگیز سرگرمیوں میں مگن تھا۔ اس باران کا منصوبہ امتحانی پرچہ حاصل کرنے کا تھا، تاکہ سرمایہ داروں کی بگڑی اولادوں کو فروخت کر کے منہ مانگی رقم اور دوسری من پسند مراعات حاصل کر کے پیش کر سکیں اور عین وقت پر جب وہ اپنے منصوبے کی کامیابی کے قریب قریب پہنچ چکے تھے۔ ذوالنون اور اس کے ساتھیوں کی وجہ سے ان کا تمام منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے تمام پیچھے منسوخ کر کے نئے سرے سے ترتیب دیئے تھے اور سخت ترین نگرانی کی جا رہی تھی۔ سیاسی پشت پناہی کے باعث روکی کے خلاف کوئی سخت ایکشن نہ لیا گیا، صرف وارن کر کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ اس نے آئندہ ایسی حرکت دوبارہ کی تو اسے جامعہ سے خارج کر دیا جائے گا۔ وہ اپنی ناکامی و بے عزتی پر سخت طیش میں تھا اور موقع کی تلاش میں، تاکہ ذوالنون اور اس کے ساتھیوں کو اچھی طرح مزہ چکھایا جائے۔ اس کی حالت گھائل ناگ کی مانند تھی۔

ذوالنون اور اس کے ساتھی روکی اور اس کے ساتھیوں کی فطرت سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں جو کرنا تھا، وہ کر کے مطمئن تھے اور قنات بھی وہ کسی موقع پر ان کو حالات خراب کرنے کا موقع نہ دینا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ روکی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر دور سے ہی راستہ بدل لیا کرتے تھے۔

آج بھی یہی ہوا تھا۔ ذوالنون اور حیدر انہیں گیٹ کے پاس کھڑا دیکھ کر دوسرے راستے کی طرف بڑھ رہے تھے، جب روکی کے ساتھی نے بلند آواز میں ہٹ کی تھی۔

”بزدلوں کی طرح کہاں بھاگ رہے ہو.....؟ اگر مرد ہو تو مقابلہ کرو، ورنہ چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھ جاؤ۔“ کئی شخصوں نے قہقہے ابھرے جن میں روکی کا قبضہ سب سے بلند تھا، وہ بڑی اشتعال انگیز لگا ہوں سے ذوالنون کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر گہری سرخی چھانے لگی تھی۔

”اسٹاپ اٹ۔“ حیدران کی جھلے بازی برداشت نہ کر سکا، وہ غصے میں بھرا ہوا آگے بڑھا تھا۔ ذوالنون نے ہاتھ بڑھا کر سختی سے اس کا بازو تھام لیا تھا۔

”چھوڑ دو مجھے..... میں بتاتا ہوں چوڑیوں کی ضرورت کس کو ہے.....“

”بوش سے کام لو، کچھ میں پتھر پھینک کر گندگی پھیلانا چاہتے ہو کیا؟“ ذوالنون روکی کی طرف گھورتا ہوا ذمہ داری لے لے کر گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ روکی نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے ہتھیار نکالنے کے لیے ہاتھ اندر کیا ہی تھا کہ دور سے آتے پرنسپل کو دیکھ کر دانت بھینچ کر رہ گیا۔

”پرنسپل آ رہے ہیں تم لوگ ادھر ادھر ہو جاؤ، شکار نکل گیا ہاتھ سے، کتنے دنوں بعد موقع ملا تھا۔“ اس کی انگارہ نگاہیں دور جاتے ہوئے ذوالنون پر تھیں۔

”کوئی بات نہیں استاد! بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔“ ان کے بے ہاک قہقہے لہڑائی میں گونج اٹھے تھے۔

”ہماری خاموشی اور گریز کو یہ گیدڑ ہماری کمزوری و بزدلی سمجھ کر خود کو شیر سمجھنے لگے ہیں، اب ان کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔“ حیدر نے غصے سے کہا تھا وہ سب گلاس کے باہر نمبرس پر موجود تھے۔ حیدر کی زبانی سن کر وہ بھی مشتعل تھے۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم، ان کو ان کی اوقات یاد دلانی ہوگی۔ ہماری برداشت سے یہ لوگ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“

”اب کون کا وہ حال کریں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔“

”اور تانی بھی.....“ مڈر، مامون کے بعد حیدر بولا، تو وہ ہنس پڑے۔

”تم بھی تو کچھ کہو، گوتم بدھ کے مجسے کی طرح گم صم کھڑے ہو؟“ حیدر ڈالٹون کی جانب دیکھتا ہوا گویا ہوا۔

”اسخان ہونے تک کوئی کچھ نہیں کہے گا، ان لوگوں سے اُلجھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو نہ خود پڑھتے ہیں اور نہ کسی اور کو پڑھتا دیکھنا چاہتے ہیں۔“ اس کے انداز میں وہی سنجیدگی و قطعیت تھی جس کے آگے کسی کی بھی مجال نہ تھی ایک لفظ کہنے کی۔

وہ خاموش ہو گئے تھے۔ مامون کو بے قرار دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟“

”مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے، اگر انہوں نے پہل کی تو؟“

”پھر ہم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“

☆.....☆.....☆

سعود احمد داخل ہوا تو اس حسین لڑکی کو دیکھ کر ٹھنک کر رک گیا جو اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ خاصا بڑا اعتماد انداز تھا اس کا۔

”آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“ وہ ادھر ادھر دیکھ کر گویا ہوا۔

”چاندنی۔“ لڑکی نے اٹھلا کر جواب دیا۔

”پھر آپ یہاں کیا کر رہی ہیں، آپ کو تو آسمان پر ہونا چاہیے تھا۔“ لڑکی کا بے تکلفا مذاہر انداز سعود کے لیے حوصلہ بخش رہا تھا۔

”آپ ہیں کون؟ اور یہاں گیٹ کے پاس کیوں کھڑی ہیں؟“ معاً اس کی نگاہ اس کے لباس اور ہاتھ میں پکڑی جھاڑو پر پڑی تو

وہ گڑبڑا کر گویا ہوا تھا۔

”میں نئی ملازمہ ہوں، یہاں جھاڑو دکھائی تھی کہ آپ آگئے۔“

”تو کرائی.....؟“ وہ اس کے چہرے اور مناسب لباس اور ٹھیک ٹھاک حلیے کو دیکھتا ہوا حیرانی سے گویا ہوا۔

”ہاں صاحب! نصیب نصیب کی بات ہے۔“ اس نے مسکسی ہی شکل بنا کر آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”صورت تمہاری تو کرائی جیسی نہیں ہے..... تمہیں تو..... رانی بننا چاہیے کسی کی۔“ اسے اپنی جانب راغب دیکھ کر سعود نے

جذباتی انداز میں کہا۔

”چاندنی..... او چاندنی! کہاں مرگئی کبخت۔ ڈراسا کام تھے سے نہیں ہوتا۔ یہ ٹونے لاؤنج کی جماڑو لگائی ہے، کارپٹ پر تمام کر کر ہو رہی ہے۔“ بی بی جان کی کمراری پاٹ دار آواز نے سمود کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ اندر لاؤنج کی صفائی کا معاہدہ کر رہی تھیں، ساتھ ساتھ تاثرات بھی جاری تھے۔

”ایک تو یہ بڑی بی بی ہر وقت بڑ بڑ کرتی رہتی ہیں۔ اس عمر میں بھی ان کی آنکھوں میں دور بین فٹ ہے۔ معمولی سی دھول بھی نظر آ جاتی ہے ان کو۔“ وہ منہ بنا کر بولی تھی پھر آگے بڑھتے ہوئے سمود کو دیکھ کر بولی۔

”آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں پھر کب ملیں گے؟“

”کل اسی وقت۔“ وہ تیز چل چلا ہوا اشارے سے بولا تھا۔ سے ڈر تھا بی بی جان باہر آئیں تو حشر ہو جاتا ہے۔

”اری لڑکی ہے یا چھلاوہ؟“ سمود کے مقدر نے یاوری کی تھی جو وہ دوسرے گیٹ سے اندر گیا تھا اور بی بی جان یہاں سے باہر آئی تھیں۔ ”کیسی پارہ صفت لڑکی ہے، ایک جگہ جمال ہے جو تک جائے۔“ وہ کھوجتی لگا ہوں سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ان کی حساس سماعت نے چاندنی کی آواز سن لی تھی۔

”تھوڑی ہوا کھانے باہر آگئی تھی بیگم صاحب! صفائی کرتے کرتے دم کھٹنے لگا تھا۔“ بی بی جان کے جاہ و جلال کے آگے وہ زیادہ بول نہ پاتی تھی۔

”دم لینے زک گئی تھی، ایسا کیا پہاڑ کھوڈا لاٹو نے نامراد۔ حیرے ہاتھوں میں دم نہیں، زبان میں بہت دم ہے، جب دیکھ پڑ پڑ چلتی ہے اور یہ بتا..... تو ابھی کس سے باتیں کر رہی تھی؟“ وہ اسے گھور کر گویا ہوئیں۔

”میں..... میں کس سے باتیں کروں گی بیگم صاحب!“ ایک لمحے کو وہ گڑبڑائی، پھر اطمینان سے بولی۔ جھوٹ بولنے میں ماہر تھی وہ۔

”میرے کانوں میں آوازیں آئی تھیں۔“ ان کا انداز ہنوز وہی تھا۔

”خود سے ہی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے عادت ہے جی بولتے رہنے کی۔ کوئی ہو یا نہ ہو، میں خود سے باتیں کرتی ہوں بلکہ میری ماں کہتی ہے، میں رات کو بھی سوتے میں باتیں کرتی ہوں۔“ اس نے مصوم سی صورت بنا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں اُڑتی چڑیا کے ہر گن لیتی ہوں اور یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں دل کا حال نہیں جانتی، پر چہرے پڑھنے میں کوئی اس گھر میں میرا ثانی نہیں، سبھی نا.....؟ سوچ سمجھ کر رہتا۔ سب لوگ مجھے بی بی جان کہتے ہیں، تم بھی یہی کہتا۔ چل اب دھیان لگا کر کام کرو۔“ چاندنی برق رفتاری سے اندر گئی تھی اور بی بی جان وہاں فضا میں پھیلی پریوم کی مہک سے اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگیں کہ یہ خوشبو کون استعمال کرتا ہے؟

☆.....☆.....☆

”سز طلعت و ہاٹ اے دو من؟ میری سمجھ میں یہ عورت نہیں آئی۔“ منال مد ہوش خمار آلود لہجے میں فائقہ سے مخاطب تھیں۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنے پسندیدہ شغل سے فارغ ہوئی تھیں۔ فائقہ ڈرنک اور دوسرا سامان سیف میں رکھ رہی تھیں۔

”اتنی دولت، اتنی عزت اور بے حساب محبتیں ملنے کے باوجود وہ عورت خود کو بدل سکی نہ بیٹیوں کو۔ دیکھنے میں تو طلعت صاحب بھی ماڈرن، ہائی فائی نظر آتے ہیں مگر بیٹی اعتبار سے وہ بھی کنزرویٹو ہیں۔ پرانی قدروں پر چلنے والے اسٹوپڈ شخص۔“

”ایسے لوگوں کے ہارے میں ہی کہا جاتا ہے لکیر کے فقیر۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے لیکن ایسے لوگ اپنی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔“ فائقہ بیگم نے نوشی کا سامان لاک کر کے ان کے پاس بیٹھے ہوئے بولیں۔

”مجھ سے کہنے لگیں نماز پڑھا کرو، دعا مانگا کرو، تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا، سز طلعت میرے پاس سب کچھ ہے۔ گل نما بنگلہ، شان دار بزنس، خدمت کے لیے ڈیڑھ لاکھ روکر، میرے پورٹیکو میں اپورٹڈ ماڈرن گاڑیاں، ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ محبت کرنے اور خیال رکھنے کے لیے مہیا ہیں اور سہارا بننے کے لیے دو جوان خوب صورت، شان دار وجہ بنے ہیں میرے پاس سب کچھ ہے پھر میں یہ سب کچھ کیوں کروں؟ بھی ان لمبی لمبی نمازوں اور دعاؤں کی ضرورت تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جو فریب ہیں جن کو دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں ملتی۔“

”پھر کیا بولیں وہ؟“ فائقہ ان کے بالوں میں اٹھلیاں پھیرتے ہوئے دلچسپی سے استفسار کرنے لگیں۔

”ان کے چہرے پر ایک دم ہی شدید خوف کے آثار اُبھر آئے۔ وہ کانپتے لہجے میں گویا ہوتیں۔ منال یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ فوراً تو بے کیجئے اللہ کی ذات سے تو بندے کو آخری سانس تک مانگنا ہوتا ہے۔ اس کی رحمت و ہدایت کی دعا تو ہمیں ہر لمحہ کرنی چاہیے اور ڈرتے رہنا چاہیے جو آپ نے کہا وہ آپ کی باتیں درست ہیں۔ اس ذات پاک نے آپ کو بہت نواز ہے، اس کا شکر جتنا ادا کیا جائے، کم ہے وہ ذات ایسی ہے، کسی کو نواز کر آزما تی ہے اور کسی کو بے نواز سے..... وہ مکمل وعظ کے موڈ میں تھیں۔ میں ہی بہانا بنا کر اٹھ آئی۔“

”نشان کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ وہ سیدھی لیٹ گئی تھیں۔ خوب صورت چہرے پر حسرت و ملال، تشنگی و بے وقسی، نا آسودگی و بے ثباتی کے رنگ گنڈھ ہونے لگے تھے۔ وہ مٹھور آنکھیں جو کسی کی طرف نرم انداز میں اٹھنے کی عادی نہ تھیں جن میں حقارت و تکبر بصارت کی طرح رہتا تھا، ان کی آنکھوں میں اس وقت وہ حزن و سوزنی بن کر تیر رہا تھا۔

کسی چٹان کی طرح اکڑی ہوئی بلند قامت دکھائی دینے والی منال اس وقت خاک کے ریزوں کی طرح تکھری ہوئی تھیں۔

”ایک بات ان کی میری دل میں خار بن کر چبھ گئی۔“ دیر سے دیر سے بندھوتی آنکھوں کو بمشکل کھول کر انہوں نے فائقہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کون سی بات؟ انہوں نے کیا کہا؟“ بیٹی کے لہجے میں لرزاں اس لمحے وہ نامراد و پڑمردگی کی ایسی شدید تڑپ محسوس کر رہی تھیں جس نے ان کا دل بھی بے گل کر ڈالا تھا۔

”عورت جب بیوی بن جاتی ہے تو شوہر کی رفاقت میں زندگی گزارنا اس کی خوش نصیبی ہوتی ہے..... یہ بات وہ عام انداز میں کر رہی تھیں مگر مجھے لگا، وہ مجھے سنارہی ہوں اور..... اس پہ مجھے لگا کہ دنیا کی سب سے غریب..... سب سے فقیر عورت ہوں میں.....“

بند ہوتی پوجھل آنکھوں کے گوشوں سے بے اختیار آنسو نکل نکل کر بجھے میں جذب ہونے لگے تھے۔ چند لمحوں تک وہ مجھ سے لہجے میں مزہ کو کھتی رہی تھیں، گالیاں دیتی رہی تھیں پھر آنکھیں بند کیے دنیا دانیہا سے غافل ہو گئی تھیں۔

”مائی پور گرل! ایک ظلمی تمہیں عذاب میں مبتلا کر گئی ہے۔ جذبات کی حکمرانی دل پر چل سکتی ہے اگر دماغ پر بھی یہ غالب آنے لگیں تو اس طرح بہاریں خزاؤں میں بدل کر زندگی کی ہر خوب صورتی و حسن پر بد صورتی دے سکونی کی خاک بکھیر دیتی ہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی دکھ سے سوچ رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

صنوبر ارحیلہ بیگم کے پاس بیٹھی محضری کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی و نظرات کے سائے تھے۔

”فکر مند کیوں ہوتی ہو بہو محضری ایک قابل ڈاکٹر ہے۔ تم تو جانتی ہو، ڈاکٹر تو بن گئی ہے وہ، مگر دل چڑیا جیسا ہے، تکلیف میں مریض ہوتے ہیں اور تڑپتی وہ خود ہے۔ ہر ایک کا ڈکھ درد اپنی جان سے لگانے کی عادی ہے وہ اسی لیے اتنی کم گو و سنجیدہ ہو گئی ہے۔“ انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں ان کی گفتگو کرنی چاہی تھی۔

”نہیں ماما! مجھے کچھ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی بڑے ڈپریشن کے صدمات سے گزر رہی ہے۔ بات یہ نہیں ہے کچھ اور ہے۔“

”کیا بات ہوگی، پوچھ لیتی اس سے۔“ انہیں ان کے ان جذبات کی پردہ داری رکھنی تھی، جو پردے میں رہتے تو اچھا تھا، اس لیے وہ اپنے لہجے میں لاپرواہی دنا آشنائی سمو کر کہہ رہی تھیں۔

”میں نے پوچھا تھا تو سن کر کہنے لگی، سب میرا دہم ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے، مگر میرا دل کہتا ہے ایسی کوئی بات ضرور ہے جو مجھ سے وہ شیر نہیں کرنا چاہ رہی۔“ ان کے انداز میں مست کی بے چینی تھی۔

”ماما! وہ آپ سے بہت کھوڑا ہے، آپ کی ہر بات مانتی ہے، آپ معلوم کریں اس سے کسا سے کیا پر اہم ہے۔“

”اچھا..... اچھا میں معلوم کروں گی، تم خواہ مخواہ پینشن مت لو۔ ہر یہ کی بیوی کب تک آئے گی میکے سے؟“

”ایک ہفتے کا کہہ کر گئی ہیں۔“

”ایک ہفتہ.....؟ کیسے گزرے گا، اسے گئے آج دو دن ہوئے ہیں اور ایسا لگ رہا ہے گویا مینوں گزر گئے۔“ ان کے انداز میں پوتے، بہو کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

”مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے، بہت محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ کتنی جلدی سب کو اپنا گردیدہ بنا چکی ہے۔ کونین بھی ماریہ کی بہت عزت کرتے ہیں اور مجھے اچھا لگتا ہے۔“



”ہاں مجھ سے بھی کہہ رہا تھا آپ کا اور آئی کا، ماریہ بھائی کے روپ میں۔ بپہر پرائز فائل آیا ہے۔“ مسکراتے ہوئے ایک دم ہی افسردہ ہو کر گویا ہوئی تھیں۔

”ذوالنون کی مجھے فکر لگی رہتی ہے۔ وہ باپ کی جدائی اور ماں کی سخت طبیعت کا روگ لگا بیٹھا ہے۔ اس کی خاموشی، تنہائی، گہری سنجیدگی، جو اس کی شناخت بن چکی ہے، یہ اچھی نہیں ہے۔ اس عمر میں جب اس کے ہم عمر بڑے دکھ و سوچ سے مبرا زندگی کی سرتمیں و راحتیں کشید کر رہے ہیں اور وہ اندر ہی اندر رکھ میں دہلی ہوئی چنگاری کی طرح جل کر خاک ہو رہا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کی فکر میں وہ ہمیشہ کی طرح آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”بہت لائق و حساس ہے وہ، اسی لیے سب سے الگ ہے۔ بھائی کے رویے سے زیادہ ذوالنون نے حمزہ بھائی کی جدائی کا اثر لیا ہے۔ بچپن سے آج تک وہ اسی غم و محرومی کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔“

”ذکھ کتنا ہی بڑا ہو، کسی سے شکر کرنے سے گھٹ جاتا ہے، تکلف کی شدت مائدہ پڑنے لگتی ہے، وہ کچھ کہتا ہی نہیں، اندر ہی اندر جلا رہا ہے خود کو۔“

”بہت دن ہو گئے ہیں، کوئی پتھر نہیں لگایا۔“

”میں جانتی ہوں اس کا مزاج مثال یہاں ماریہ کو دیکھنے اور ہمیں مبارک باد دینے نہیں آتی، اس لیے وہ مارے ندامت کے نہیں آیا۔“ راحیلہ تنگم دور رہ کر بھی دونوں پوتوں سے اور ان کے مزاج سے واقف تھیں۔ ایک عمران کی گھر میں جھٹائی، دیورانی سے سیاسی چالوں میں گزری تھی، اب وہ سب سے مستحب تھیں مگر نگاہ شناسی نہ لگتی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات بادل خوب ٹوٹ کر بر سے تھے۔ ہر شے ڈھل کر نکھر گئی تھی۔ ابھی بھی آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، جس پر کبھی کبھی سفید بادل کا کوئی ٹکڑا جموتا ہوا گزر جاتا تھا۔ بڑا خواب ناک ماحول تھا۔ خوشگوار ہواؤں کے مست جھونکے نیچے لان میں لگے خوب صورت پھولوں کی خوش نما گھاس دور رشتوں کی چنگھتی ہریالی سرمئی ماحول میں روح کو تراوت بخش رہی تھی۔ وحسی وحسی پھوار پھر کرنے لگی تھی۔

”مجھے معلوم تھا تم بیس پر ہی ہو گی۔“ ثمرین ٹرے میں دھک بھاپ اڑاتی چائے لے کر وہیں چلی آئی تھی ٹیس پر۔

”موسم بہت خوب صورت ہو رہا ہے۔“ حورین نے اس کے لیے کرسی آگے کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ان کپڑوں میں تم بھی موسم کا ایک حصہ لگ رہی ہو بلکہ..... بادل کا ایک ٹکڑا۔“ دھک اس کی جانب بڑھاتے ہوئے اس کے سرمئی لباس کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئی جس میں اس کی گلابی رنگت نمایاں تھی۔

”زودیا کہاں ہے؟“

”سوری ہے، پڑی ہوئی، نہ معلوم اس لڑکی کو اتنی نیند کیوں آتی ہے؟ آج موسم کی وجہ سے یونورشی نہیں گئے تو وہ نیندیں پوری کر

رہی ہے۔" وہ زویا کے زیادہ سونے کی وجہ سے بہت چڑتی تھی۔

"سونے دو، کیوں چڑتی ہو اس کے سونے سے.....؟" وہ چائے کا پلے لیتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"بی بی جان نے دیکھ لیا تو وہ حال کریں گی کہ رات بھی سونے سے ڈرا کرے گی۔"

"اس کے پلے کئے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ شفق رنگ رخساروں پر گہرے گڑھے پڑے تھے جنہوں نے اس کے صبح

چہرے کو مزید جلا بخشی تھی۔ مول نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

"تم لوگ کچھ دنوں سے کس موضوع پر ڈسکس کرتے ہو جو تمہارے چہروں سے غر مندگی و تشویش چھلکے لگتی ہے؟"

"آج کل روکی گروپ سے ان کی زبردست چپقلش چل رہی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ روکی گروپ جامعہ میں کسی ہنگامہ آرائی

کی کوشش میں مصروف عمل ہے اور ذوالنون بھائی اور ان کے دوستوں کی کوشش ہے کہ وہ سب نہ ہو پائے جو وہ کرنا چاہ رہے ہیں تاکہ

امتحانات اچھے ماحول میں ہو جائیں۔"

"اب ایسا نہ ابھی نہیں ہے وہ..... یہ تمہارے ذوالنون صاحب اور ان کے ساتھی خواہ مخواہ ہیر دہنے کے لیے پردہ پیٹنڈہ کر رہے

ہیں۔" وہ چائے پیتے ہوئے منہ بنا کر کہہ رہی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، تم ان سے بلا وجہ کی دشمنی میں کچھ خود غرض ہو گئی ہو، اسی لیے منع کرنے کے باوجود تم ان سے ملتی

ہو، حالانکہ جامعہ کی ہر فعل مند و باشعور لڑکی ان کی پرچھائیں سے بھی بچ کر گزرتی ہے، تم جانتی نہیں ہو۔ وہ کہتے گئے ہوئے چپ لوگ

ہیں یا تم جانتا بھی نہیں چاہتی ہو۔" وہ ملامت آمیز لہجے میں بولی۔

"تم ہر دفعہ اس شخص کی حمایت کرتی ہو جو کبھی وقت پڑا تو تمہاری حمایت نہیں کر سکتا۔ تم کیوں اس کی سائیڈ لیتی ہو؟" حسب

معمول پھر ان کے درمیان ذوالنون کی ذات تنازع بن رہی تھی۔

"پلیز حورین! سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"اوکے، میں سمجھ گئی، اب تم کہو کیا کہتا ہے تمہارا ہیر دہ؟" حورین کے انداز پر مول مسکرانے لگی۔

"وہ میرا ہیر نہیں، بھائی ہیں۔" مول نے ہنس کر وضاحت کی۔

"اچھا..... یہ انقلاب کب ہوا؟" حورین طنز بولی۔

"کچھ دنوں سے کافی تبدیلی آگئی ہے ان میں، اب ہم سے گفتگو بھی کر لیتے ہیں مگر انداز میں وہی سنجیدگی دو قار ہوتا ہے۔ تم تو ہم

سے دور دوری رہتی ہو، اس لیے تمہیں کیا معلوم۔"

"مجھے کچھ معلوم کرنا بھی نہیں ہے۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"حیدر بتا رہا تھا، روکی نے جو حرکت کی اور موقع پر پکڑا گیا، اپنی اس ناکامی اور اسٹوڈنٹس پر رعب قائم کرنے کے لیے وہ چاہتا

ہے کہ کسی وجہ سے ہنگامہ ہو، یونیورسٹی بند ہو جائے، امتحان نہ ہوں تاکہ اول اس کا جو رعب دو بدبہ ہے، وہ قائم رہے اور دوئم آئندہ کوئی ان کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالے، اس لیے وہ ان لوگوں کے علاوہ دوسرے اسٹوڈنٹس کو بھی تنگ کر رہا ہے۔

”جو ہوگا، دیکھا جائے گا، آؤ نیچے چلتے ہیں بارش تیز ہونے لگی ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے آگئی جہاں سہو کی آواز آ رہی تھی۔

چاندنی اوسیری چاندنی

چاندنی اوسیری چاندنی

اسے معلوم نہیں تھا، وہ دونوں اوپر سے آ رہی ہیں، وہ گیلری میں رکھے پودوں کی صفائی کرتی چاندنی کو دیکھتے ہوئے گارہا تھا۔

ان کے قدموں کی آہٹوں سے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔

”یہاں ابھی کون تھا؟“ مول پُرسکون انداز میں کام کرتی چاندنی سے مخاطب ہوئی تھی جس کے انداز میں ڈرامہ کی ڈرامہ کی ڈرامہ یا

گھبراہٹ نہ تھی۔

”کوئی نہیں تھا بی بی جی!“

”کوئی تو تھا، اس کے گانے کی آواز میں نے خود سنی ہے۔“

”گانے کی آواز مانی کے کوارٹر سے آ رہی ہوگی۔“ وہ ڈھٹائی سے بولی۔

”اچھا..... میوزک کے بغیر گانے کی آواز۔“

”میں کیا جانوں..... جب کام کرتی ہوں تو کان بند کر لیتی ہوں۔“

”ہاں ٹھیک بول رہی ہے، کان بند رکھتی ہے، منہ کھولے رکھتی ہے۔“ بی بی جان بگڑے تیز لے لیے وہاں آ کر چاندنی سے مخاطب

ہوئی تھیں۔

”اری دیدی ہوئی تھی سب کچھ کہا یوں کونوں کھدروں میں کام نہ کیا کر، تجھے حمیرا، میرا کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹوانے کے لیے

رکھا ہے یا اس طرح گھر کے کونوں میں چھپکی کی طرح چپکنے کے لیے.....“

”مجھے تو جی صفائی پسند ہے۔ کچن میں سرخے مصالحوں کی بو سے میرا دم گھٹتا ہے۔ سبزیاں کانٹے سے میرے ہاتھ خراب ہو جاتے

ہیں۔“ اس نے بڑے انداز سے اپنی پسندنا پسند سے آگاہ کیا، حورین نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔ مول اسے گھور رہی تھی۔

”آئے ہائے مہارانی کے مزاج تو دیکھو۔“ بی بی جان نے شدید غصے میں اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

”خبروں نے ایک جیتی جاتی مصیبت میرے لیے بھیج دی۔ ایک نمبر کی چھلاوا لڑکی۔ ایک پل میں ادھر، ایک پل میں ادھر،

جوان جہاں لڑکوں کا گھر ہے، میں کہاں تک چوکیداری کروں.....؟ اوپر سے اس لڑکی کے چلنے مجھے ٹھیک نہیں لگتے، پر چھائیں بن کر رہنا

پڑتا ہے مجھے اس کی۔“

”چھٹی کریں نا بی بی جان! اس کی، کیوں سرور دکھا ہے؟“

”نہیں نہیں..... ایسی بات نہ کہیں جی، میری بوڑھی بیوہ ماں اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کے پیٹ سے روٹی کیوں چھینتی ہو۔“ وہ ایک دم ہی ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگی۔

”اچھا..... اچھا ہاتھ مت جوڑ، ہم بھلا کیوں کسی کی روزی پر لات ماریں گی۔ ہم ہوتے کون ہیں، سیدھی طرح کام کر، نہ تجھے شکایت، نہ ہمیں شکایت۔“ وہ اوپر سے جتنی سخت نظر آتی تھیں، اندر سے بالکل نرم تھیں۔ منہ پھٹ و صاف گوئیں مگر لحاظ و مروت کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑتی تھیں۔ چاندنی کو اس ہاتھ جوڑے دیکھ کر وہ موم کی طرح پکھیل گئی تھیں۔

”بہت بڑی اداکارہ ہے یہ لڑکی۔ گھر کے لڑکوں کو اس نے اٹو بنایا ہوا ہے۔ کبھی کوئی اکلہار عشق فرما رہا ہوتا ہے تو کبھی کوئی گیت سنا رہا ہوتا ہے۔ کل وہی معلوم ہے کون سا شعر سنا رہا تھا؟“

”چاندنی آج سے میں نے اپنا نام چاند رکھ لیا ہے کیونکہ.....“

چاندنی چاند سے ہوتی ہے ستاروں سے نہیں  
محبت ایک سے ہوتی ہے ہزاروں سے نہیں  
دونوں ہنس پڑیں۔

”سب معلوم ہونے کے باوجود تم بی بی جان کو کیوں نہیں بتاتیں؟“

”میں جانتی ہوں یہ سب وقت گزارا ہے، ورنہ اس گھر کے لڑکوں کی پسند ایسی چیپ نہیں ہو سکتی۔“

”مجھے تمہاری عادت بہت پسند ہے مولیٰ! تم سب میں اچھا دیکھتی ہو، اچھا سمجھتی ہو۔“ وہ مولیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے تو صلی لہجے میں گویا ہوئی۔

”تم بہت بہت اچھی ہو بس.....“ وہ کچھ آگے کہتی کہ ایک دم اس کا پاؤں سلب ہوا تھا۔ وہ بے اداسان گری تھی۔ سردیوار سے لکرانے کے باعث خون نکل آیا تھا۔ مولیٰ کو سہارا دینے کی خاطر آگے بڑھنے والی حورین اس کے سر سے نکلے خون کو دیکھ کر ہڈیانی انداز میں چیختی لگی۔ اس کی چیخوں نے لمبے بھر میں سب کو وہاں جمع کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آنسو کا ایک قطرہ

اور پانی کی ایک بوند

شکل و شباہت ایک جیسی لیکن

دونوں کی حیات ہے کتنی

پھلتے ہی، پھکتے ہی

اک لمحے کو ٹھہرتے ہی

اگلے لمحے کو نانا، نانا ہو جانا

فرق صرف اتنا ہے ان میں

پانی اک بوند پہ دھبے کا گماں دے جائے

اور آنسو کا یہ قطرہ جذبات کا بیاں دے جائے

”کیوں سوچتے ہو اتنا بیٹا! سوچیں تمہاریوں کے جنگل میں بسکا دیتی ہیں، جہاں انتشار کے ہانگ و ٹنگر کے پھوڑتے رہتے ہیں۔“ سر آفتاب حسن نے چائے کا کپ سار سمیت اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ممانت سے کہا۔

”یہ سوچیں ہی تو میری گئی رفتی ہیں سر! ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس جانے کے لیے مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آتی ہے۔ آہٹ پاتے ہی یہ مجھے اپنوں کی طرح پناہ میں لے لیتی ہیں اور میں بند آنکھوں سے وہ دیکھنے لگتا ہوں جو کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔“ وہ بھاپ اڑاتی چائے کے سب لیتے ہوئے دھبے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

پروفیسر آفتاب حسن نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ آسانی کلر کے کاشن کے کلف شدہ شلوار سوٹ میں اس کے چہرے پر ایک ایسی خمیر تھی جس سے اس کی محرومیاں وہ تمام نا آسودہ و نامکمل خواہشات بے نقاب ہو جاتی تھیں جن کو وہ سرد مہری و لافلتی میں چھپائے رکھتا تھا۔ بہت کم لوگ تھے ایسے جن کے آگے اس کی محرومیوں و نا آسودگیوں کا پردہ گر جایا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک پروفیسر آفتاب بھی تھے

”دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ جو گزر گیا، اسے بھولنا بہتر ہے۔ ابھی آپ کے آگے ساری لائف ہے، گزرے وقت کو بھول کر آنے والے وقت کو سنوارنے کی جستجو کریں۔ خوشیوں کے خزانے پوشیدہ آپ کے شکر ہیں۔ انہیں کھوجیں، تلاشیں پھر دیکھنے کا ساری سر تیس آپ کی دسترس میں ہوں گی۔ زندگی بہت خوب صورت ہے۔“

”شاید..... میرے لیے کبھی بھی خوب صورت نہ ہوگی۔“ اس کی خوب صورت گرے آنکھوں میں سر تھی ہی چھانے لگی تھی۔

”ملاطبات، بہت خراب بات ہے یہ۔ امید تو مومن کا ہتھیار ہے۔ مایوسی کی اندھیری راہوں کا چراغ ہے، امید ہی تو دراصل بندے کا اپنے رب کی ذات پر یقین کا اظہار ہے۔ کتنی غلط سوچ ہے آپ کی۔“ وہ مارے جذبات کے چند لمحوں میں چائے ختم کر کے اس سے خشکی سے مخاطب ہوئے۔

”امید تو وہ پننگ ہے جس کی ڈور آخری سانس کے ساتھ ہی ٹوٹی ہے پھر مسلمان کا نا امید ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟“

”سر! یہ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔“ اس نے خالی کپ سار پر رکھتے ہوئے ملامت سے کہا۔

”ہر شے کے دو عکس ہوتے ہیں، ایک اچھا اور ایک بُرا۔ ایک خوب صورت اور ایک بد صورت۔ ایک شیریں اور ایک تلخ۔ ایک مثبت اور ایک منفی، آپ بچپن سے آج تک صرف نیکو سائیز دیکھتے آئے ہیں۔“

”سرا! اس میں میری کوئی خطا نہیں، جو مجھے دکھایا گیا، وہی میں دیکھ رہا ہوں۔ لوگوں کے پاس بہت سارے رشتے ہوتے ہیں، دوستیاں ہوتی ہیں، مشغلے ہوتے ہیں، وہ ان کے ساتھ لائف انجوائے کرتے ہیں، میرے پاس صرف ایک باہاتے اور مجھے ان کے ہوتے ہوئے کسی اور رشتے کی ضرورت بھی نہ تھی، وہ میرے لیے تمہاری سب کچھ تھے۔“ وہ اندر سے سمندر کی لہروں کی طرح مضطرب ہونے لگا تو اٹھ کھڑا ہو گیا۔

”کیا باپ اور بچوں کا رشتہ اتنا ہی بے وقعت و بے جان ہوتا ہے کہ کسی عورت کی خاطر سب کو لمحے بھر میں ٹھوکر مار کر توڑ دیا جائے..... چھوڑ دیا جائے؟“ بچپن کی وہ بے رحم یادیں ذہن کی اسکرین پر پھر اُٹھنے لگی تھیں، گو کہ وقت کی دھول نے سب کچھ دھندلا دیا تھا۔ تمام چہرے گنڈے ہو گئے تھے مگر اس واقعہ کی تمام جزئیات اسے پوری طرح از بر تھیں۔

”کول ڈاؤن میرے بچے! ریٹیکس..... ریٹیکس.....“ پروفیسر آفتاب حسن نے اٹھ کر اس کی پیشانی چوی تھی، پھر اسے صوفے پر اپنے قریب بٹھا کر بہت محبت و شفقت سے گویا ہوئے۔

”دو عورتوں کی وجہ سے ہماری درمیان جدائی آئی اور اب میری تالیخ کے مطابق عورت ہے ہی قابلِ نفرت۔“

”نہیں، غلط بالکل غلط۔“ وہ سادگی سے مسکرائے تھے۔

”سرا آج آپ عہد کر کے بیٹھے ہیں کہ میری ہر بات کو غلط ثابت کریں گے؟“ وہ اپنی سابقہ منتشر حالت پر قابو پا کر مسکرا کر بولا۔

”ارے یہ آپ نے کیسے سوچ لیا۔“ جواباً وہ بھی ہنس پڑے تھے۔

”آپ کی باتیں بتا رہی ہیں۔“ اس کے لبوں پر بھی نرم مسکراہٹ تھی، جو اس کے وجہ چہرے کو دلکش بنا رہی تھی۔

”ہاں میں ہاں ملانے والے دوست ہوتے ہیں، نہ عقل مند آپ سے حقیقی و سچی محبت کرنے والا وہی شخص ہے جو آپ کو غلط پر رو کے اور درست سمت رہنمائی کرے..... آپ کو اپنے دل دو ماغ سے اس غلط فہمی کو نکالنا ہوگا کہ عورت ذاتِ فساد کی جزا ہے۔ لائقِ عزت و احترام نہیں ہے، قابلِ نفرت ہے۔“ وہ دھمکے لہجے میں اسے سمجھانے لگے۔

”محبت آدم علیہ السلام کی روح ہے، محبت کے بغیر جنت کی خوب صورتی بھی بے رنگ ہے۔ محبت کے خیر سے ہی عورت نے جنم لیا ہے ذوالنون، آپ کو معلوم ہوگا اللہ نے آدم علیہ السلام کو بنایا، ہر آرام و آسائش جنت میں دیں مگر جنت بھی حوا کے بغیر آدم علیہ السلام کے لیے بے رونق تھی۔“

ذوالنون بہت خاموشی سے سن رہا تھا۔

”عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔“

”بدلتے وقت نے پرانی قدروں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس وقت کی محبت اور آج کی محبت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا دن و رات میں ہے۔“

”نہیں بیٹا! سچی محبت ہمیشہ لازوال ہوتی ہے۔ یہ وہ چاند ہیں جن کو کبھی گرہن نہیں لگتا، یہ وہ پھول ہیں جو کبھی مرجھاتے نہیں۔ یہ وہ ورد ہے جو ہمیشہ سینے میں دل بن کر دھڑکتا رہتا ہے۔ یہ محبت آدم علیہ السلام کی میراث ہے، یہ وہ شیخ ہے جو دل کے ایوانوں میں ایک بار ضرور روشن ہوتی ہے اور روح تک منور کر ڈالتی ہے۔“ پروفیسر آفتاب حسن کی ٹینک کے دیڑھیشوں کے پار سے نظر آنے والی ہر دم جھمی جھمی آنکھوں میں کچھ دینے کو دینے لگے تھے، ان کا انداز کھویا سا تھا۔

”میں کس طرح یقین کر سکتا ہوں سر! شاید مجھے کبھی یقین نہیں آئے گا۔“ اس کی بھاری آواز میں بے چینی کی گہرائی تھی۔ پروفیسر آفتاب حسن نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، پھر نہ شوق انداز میں گویا ہوئے۔

”آپ یقین کرو گے۔“

”ناممکن ہے سر!“

”جب محبت کی کوئٹل پھوٹی ہے تو میرے بیٹے! ناممکن بھی ممکن بن جاتا ہے، یہاں سب ایک بار محبت ضرور کرتے ہیں اور آپ بھی کرو گے.....“

”اوہ مائی گاڈ! یہ آپ مجھے وعادے رہے ہیں یا بدوعا؟“ وہ منہ بنا کر اس بُری طرح جربز ہوا تھا کہ اس کے تاثرات دیکھ کر آفتاب حسن ہنسنے لگے تھے۔

”یہ احساس بعد میں ہوگا بچے! یہ ذعا ہے یا بد ذعا..... کیونکہ یہ وہ آگ ہے جو لگنے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔“

”اوکے سر! میں چلتا ہوں۔“ وہ ٹوٹس پیر زانٹا تے ہوئے گویا ہوا۔

”ہوں..... ضرور۔“ وہ اسے پھینرنے لگے۔

”نہیں سر! آپ سے بھاگ کر کہاں جاؤں گا؟ آپ کے پاس آ کر میری وحشتوں کو سکون ملتا ہے، زندگی سے شناسائی ہونے لگتی ہے۔“ اس کے لہجے میں ان کے لیے بڑی عقیدت و احترام تھا۔

”پارٹی امتحانوں کے بعد قائل ہے نا؟“

”پارٹی..... جو آپ کہیں گے سر، وہی ہوگا۔“ پارٹی سے البتہ اسے وہ خواب یاد آ گیا اور وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

موتل کے سر میں معمولی زخم آیا تھا، وہ نارٹل تھی۔ اس کی بہ نسبت حورین ابھی تک خوف زدہ تھی۔ موتل کے سر سے پتے خون نے اسے بُری طرح حواس باختہ کر ڈالا تھا اور چیخ چیخ کر اس نے سب ہی کو اس کی طرف دوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کل سے اب تک اسی طرح کم صدم تھی، سب نے مول سے زیادہ اس کی دل جوئی کی تھی۔ سیرا، جمیرا، آفاق صاحب، صادق صاحب اور خود بی بی جان اس کی دل جوئی کر رہی تھیں۔ نوجوان الگ اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ وہ ان کی اس قدر محبت و اپنائیت پر شرمندہ تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ وہ سب کو نارمل نظر آئے اور کوشش کے باوجود وہ اپنے چہرے پر چھائی دہشت و خوف سے چمٹکارا نہ پار رہی تھی۔ اس کے شعور میں بچپن کا خوف کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اسے اب بھی وہ سب اچھی طرح یاد ہے جب ایک مرتبہ اس کے پاپاشیو بنا رہے تھے، وہ بھاگتی ہوئی واش روم میں داخل ہوئی تھی اور پاپا سے پٹ گئی تھی اور دوسرا لمحہ بڑا بھیا تک تھا۔

واش روم کے وائٹ ماربل فرش پر سرخ سرخ خون تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ اس نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا تو پوری جان سے کانپ اٹھی تھی۔ پاپا کے شانوں پر پڑا وائٹ ناول، ہاتھ میں پکڑا بڑا رگلے سے نکلنے خون میں سرخ تھے اور اسی وقت اس کے منہ سے ہڈیانی چیخیں نکلنے لگی تھیں پھر اسے ہوش نہ رہا تھا اور کافی دنوں تک وہ اسی خوف کے زیر اثر اسپتال میں ایڈمٹ رہی تھی۔ باپ کو زندہ سلامت دیکھ کر وہ رفتہ رفتہ نارمل ہو گئی تھی مگر یہ خوف اس کے ساتھ ساتھ جوان ہوتا آیا تھا۔ وہ آج بھی کسی کا معمولی سا خون دیکھ کر ایسی ہی وحشت و خوف میں جھٹلا ہو جاتی تھی۔

”دیسے تو بڑی بہادر بنتی ہو، معمولی سا خون دیکھ کر ابھی تک تمہارے حواس کم ہیں، کیا ہوگا تمہارا؟ کیا بونگی بڑی ہو کر.....“ ہریرہ نے کل سے چھینڑ چھاڑ کر اسے زچ کر رکھا تھا۔

”شت آپ ہریرہ! میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی“۔ وہ اسے گھور کر گویا ہوئی۔

”بندہ اسی آس میں جی رہا ہے“۔ وہ ہائیں آنکھ دھا کر ڈھٹائی سے گویا ہوا۔

”لگاؤں بی بی جان کو آواز.....؟“ وہ غصے سے بل کھا کر گویا ہوئی، ہریرہ ہنس پڑا۔

”ہریرہ بھائی! کیوں تنگ کر رہے ہیں، ایک تو ویسے ہی کل سے اس قدر اس کا خون خشک ہو چکا ہے“۔ مول نے حورین کی سائیڈ لی۔

”اس کو کہتے ہیں مدھی ست، گواہ چست۔ چوٹ تمہیں لگی ہے اور خون اس کا خشک ہو گیا“۔ وہ باز آنے والا نہ تھا۔

”مول! تم نے ابھی میڈیسن لی ہیں اب سو جاؤ، میں کل یونیورسٹی چلی جاؤں گی، کلاسز اینڈ کروں گی تو نوٹس مل جائیں گے، وہ ہم شیئر کر لیں گے، تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے“۔ حورین مول کے پاس سے اٹھتے ہوئے تسلی آ میز لہجے میں گویا ہوئی۔

”تم اکیلی ہو جاؤ گی؟ زودیا کو بھی ٹھوہور ہا ہے“۔

”ہاں تو کیا ہوا، وہاں شرین ردا بھی تو ہوں گی“۔

”ٹھیک ہے..... مگر اپنا خیال رکھنا“۔

”اور ساتھ فیڈ ضرور لے کر جانا“۔ ہریرہ نے نکلوا لگایا، جو ابادہ اسے مارنے کے لیے پیچھے بھاگی تھی۔

مول کروٹ لے کر ہنس پڑی تھی۔



شرین اور رواد بوندوشی نہیں آئی تھیں۔ وہ کچھ کوفت میں مبتلا ہوئی تھی، ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ تنہا ہو، پہلا بھریڈ اینڈ کر کے وہ لائبریری کی جانب بڑھ گئی تھی، ماہ پر سے گزرتے ہوئے وہ نیچے بکھرے اسٹوڈنٹس کو بے نگہری سے خوش گپیوں میں گمن دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ امتحانات کی تاریخ آچکی تھیں۔ دو ہفتوں بعد امتحان ہونے تھے۔ طلباء کو دیکھ محسوس نہ ہوتا تھا کہ امتحان ہونے والے ہیں۔

”السلام علیکم مس!“ اس نے مڑ کر دیکھا، اس سے کچھ ہی فاصلے پر وہ سب کھڑے تھے۔ بیو جیمز، وائٹ شرٹ میں ملیوں کھڑے محسوس پر بے ساختہ اس کی نگاہ اٹھی تھی۔

اس کے چہرے پر اسے کچھ پریشانی و مگر مندی کے سائے نظر آئے تھے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا۔

”آپ اکیلی ہیں آج؟“ حیدر اسے تہاد دیکھ کر استفسار کرنے لگا۔

”جی..... زویا اور مول کی طبیعتیں ٹھیک نہیں ہیں، شرین اور رواد نہ معلوم کیوں نہ آئیں۔“

”اگر آپ تہائی محسوس کر رہی ہیں تو ہماری کہنی میں آسکتی ہیں۔“

”تو جھینکس، مجھے امتحان کی تیاری کرنی ہے۔“

”اوکے، اگر پھر بھی کوئی مسئلہ ہو تو ہم حاضر ہیں۔“ حیدر ویسے بھی اسے بہت زیادہ تعظیم دیتا تھا۔

”جھینکس“۔ وہ سیدھی لائبریری روم میں آگئی، وہاں بھی زیادہ تر چیز زخانی پڑی تھیں، بہت کم طلباء وہاں تھے، وہ کتابیں لینے کے لیے ریکس کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

انس اور کرن بیڈ پر نیم دراز تھے۔ واک سے واپس آ کر وہ اپنے بیڈ روم میں آگئے تھے۔ کرن ان سے گویا ہوئی تھیں۔

”نہ معلوم کب جو رین کا بچپنا جائے گا، ابھی بھی بچوں جیسی ضد کرتی ہے۔“ انس کے لبوں پر تبسم جاگزیں ہوا۔

”ہوں..... کیا کہتی ہے ہماری بیٹی؟“

”اچھا..... گویا آپ تو جیسے جانتے ہی نہیں ہیں؟“ ان کے انداز میں مصنوعی ناراضی تھی۔

”آپ بتائیں گی تو جانیں گے۔“

”وہ کہتی ہے ہم اس سے ملنے کراہتی جائیں، وہ ایگزام کی وجہ سے آ نہیں سکتی۔“ ان کے لہجے میں اضطراب جھکولے لینے لگا۔

”رائٹ پھر چلتے ہیں۔“

”انس! آپ سب جانتے ہوئے بھی کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں..... کرن اس خوف کے خول میں کب تک یوں زندگی کو بے رنگ کرتی رہو گی۔ ہر ڈر، ہر خوف کی ایک حد ہوتی ہے۔ کب

لنگوگی اس بودے خوف کے چنگل سے، جس نے ہماری سب کی زندگی بے مزہ کر دی ہے۔" انس اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے گویا ہوا۔

"یہ خوف بے وجہ نہیں ہے، آپ جانتے ہیں۔" وہ ان سے ہاتھ چھڑا کر کانپتے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"کچھ بھی ہو..... اب اس خوف کی دیوار کو ہم نے توڑنا ہے۔ کرن اپنی زندگی ہم نے جی لی، جس طرح بھی مگر اب ہماری زندگیاں ہماری بیٹی سے وابستہ ہیں۔ میں اسے کسی خوف کے چنگل میں تاحیات سرگرداں بھٹکتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے لیے تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا، مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہمارے لیے نہیں، اپنی بیٹی کے لیے، اس کے اچھے مستقبل کے لیے۔"

"انس! آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے، وہ انسان نہیں۔"

"وہ جو کوئی بھی ہیں، میں ان کو متا دینا چاہتا ہوں، میں کون ہوں، بہت برداشت کر لیا میں نے تمہاری خاطر..... مگر اب اپنی بیٹی کی خاطر میں برداشت نہیں کر سکتا، مارو یا مرنے والا، اسی پر فیصلہ ہوگا اب۔" بہت عرصے بعد اس نے انس کو غصے میں دیکھا تھا اور وہ کچھ کہہ نہ سکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

فائل پر اس کا قلم رواں تھا کہ ایک دھماکا ہوا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے کئی قازر کی آوازیں خاموش ماحول میں گونج اٹھی تھیں۔ وہاں موجود طلباء میں افراتفری مچ گئی۔ وہ سب گیٹ کی طرف سر ہٹ بھاگے تھے، ان کی بدحواسی و دھکم پیل سے وہاں عجیب شور مچ گیا تھا۔ اس نے کبھی ایسا ماحول دیکھا نہ تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے ان کو تیزی سے بھاگتے دیکھ رہی تھی۔

"بیٹی! نکلو یہاں سے نیچے زبردست ہنگامہ ہو رہا ہے، کتنے ہی اسٹوڈنٹس چلے گئے ہیں، آپ کیا کر رہی ہو یہاں؟ وہ بیچوں یہاں کے دروازے لاک کرنے آیا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر حیرانی سے گویا ہوا، اس کی آواز سن کر حواسوں میں لوٹی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے نیکل سے اس نے سامان سمیٹا تھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آئی تھی۔ نیچے نگاہ ڈالتے ہوئے اس کا دل بالکل ہی بے قابو ہو گیا تھا۔ کچھ دیر قبل جہاں زندگی کی خوب صورتیاں نکھری تھیں، اب وہاں موت کا بد صورت سناٹا چھا رہا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ اسی اثنا میں حیدر بھاگتا ہوا اوپر آیا تھا۔

"مجھے یقین تھا آپ یہیں ہوں گی، چلیں آپ کو یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا۔" حیدر نے تیزی سے کہتے ہوئے اس کے کانپتے ہاتھوں سے قانٹری تھیں۔ وہ پریشان نگاہوں سے حیدر کی بلیو شرٹ پر سرخ سرخ دھبے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گردن پر بھی زخم تھے، جن سے خون رس رہا تھا۔

"یہ..... یہ..... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ قازرنگ اور تمہارے زخموں سے خون نکل رہا ہے۔" وہ روہاسی لہجے میں گویا ہوئی۔

"جلدی کریں، ابھی وقت نہیں ہے، کوئی بھی گولی یہاں آسکتی ہے، پلیز آپ میرے ساتھ آئیں۔" حیدر اسے جھپٹی سائیڈ سے

چھپتا چھپاتا ایک آفس ٹائپ روم میں لے آیا تھا۔ وہ روم میں بڑھ گیا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے تم؟ میں نے کہا تھا نہ وہ چلی گئی ہوگی پھر بھی.....“ حورین کو حیدر کے پیچھے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تھا اور حورین کے قدم تو گویا زمین سے چپک گئے۔ وہ خوف زدہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی جس کی دائیں شرٹ خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ فرش پر خون کے دبے پھیلے ہوئے تھے۔

”کم آن سسٹر!“ حیدر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا جس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ذوالنون نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

متوحش چہرہ، رنگت زرد

خوف و دہشت سے آنکھیں پھٹی ہوئیں، اگر حیدر آگے بڑھ کر اسے سنبھال نہ لیتا تو وہ گر پڑتی۔

ذوالنون نے غیر ارادی طور پر اسے کرسی پیش کی تھی اور کمر سے پانی کا گلاس بھر کر دیا تھا مگر اس نے پانی نہیں پیا اور ایک دم ہی ہی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر دنا شروع کر دیا تھا۔



ذوالنون نے استہجائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ ڈارک بلوسٹ میں اس کی صاف و شفاف رنگت نمایاں تھی، چہرے کے گرد لپٹے دو دو سیاہ بازو اور لرزتا، کانپتا اس کا نازک سراپا اس کے لیے بہت انوکھا دنیا تھا سب کچھ..... گلاس ریک میں رکھتے ہوئے اس نے حیدر کی طرف دیکھا جو شدید تکلیف کے باعث بول نہیں پا رہا تھا۔

”چلو..... میں تمہاری ڈیرینک کروں، پلیزنگ زیادہ ہونے لگی ہے۔“ وہ حیدر کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

باہر اب بالکل خاموشی تھی۔

حورین کا خوف و دہشت سے بُرا حال تھا، وہ خود کو ان لوگوں کے درمیان دیکھ کر عجیب محسوس کر رہی تھی پھر ماحول پر چھائی وحشت اور یہاں کی خون کی سرخیاں دیکھ کر اس کا خوف مزید بڑھ گیا تھا اور وہ ادھ مری ہو گئی تھی، ایسی سنگین صورت حال کا اس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ ایسا وقت دیکھنے کو ملے گا، وہ بھی ایسے لوگوں کے درمیان رہ کر جن کی وہ پر چھائیوں کو بھی ناپسند کرتی تھی۔

دس منٹ بعد ذوالنون حیدر کی ڈیرینک سے فارغ ہو کر باہر آیا تو وہ ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”ایکسکیوز می؟“ ہالا خراس کو مخاطب کرنا پڑا، اس کی آواز پر وہ ایسی اچھلی تھی جیسے کرنٹ لگا ہو، شہنشاہ اس نے چہرے سے ہاتھ

ہٹائے تھے، چہرہ شدت گریہ سے سرخ تھا، پھٹی پھٹی آنکھیں اس کی گرے مغزوری نگاہوں سے نگرانی تھیں۔ حورین نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

”آپ اپنے گھر کال کر کے گاڑی منگوائیں فوری، یہاں ہم زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتے، پولیس بہت جلدی یہاں آنے والی ہے۔“ اس کی بھاری آواز کی دل کشی اس بے کل کر دینے والے سنانے کو چیرنے لگی تھی۔

”مم..... مم.....“ وہ خوف و دہشت کے باعث ہکلا کر رہ گئی۔ ذوالنون نے بہت حیرانگی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ زرد پڑتی

رگت اس پر مستزاد بوجھلاہٹ و سراہنگی نے اس کی حالت بگاڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے آگینوں و کانپتے ہاتھوں کی لرزش اور گنگ ہوتی زبان نے اس کی تمام بہادری و جہب زبانی کا پول کھول دیا تھا، خول کے اندر سے وہی ڈری، سہی ڈر پوک لڑکی برآمد ہوئی تھی جو بادل کے تیز گرجے اور بجلی کے کڑکنے سے ڈر جائے، ایسی شدید ٹینشن کے باوجود اس کے اندر قہقہے اُٹنے لگے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ نئے اور خوب ہنستا چلا جائے۔

اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے وہ لڑکی تھی جس نے پہلی مرتبہ اسے چیلنج کیا تھا، اپنے ہونے کا احساس دلایا تھا۔

وہ صنفِ نازک کی علم بردار تھی، حقوق نسواں کی آواز بلند کرنے اور لڑنے والی سرپھری لڑکی اباہر سے بہت خاص و مضبوط کسی چٹان کی طرح نظر آنے والی لڑکی اور حقیقت اندر سے وہی عام سی کم ہمت، کم حوصلہ لڑکی تھی۔ ڈوائون کے لبوں پر گہری حسرتانہ مسکراہٹ ابھر کر اس کے وجہہ چہرے کو روشن کرنے لگی تھی، وہ بڑی کاٹ دار نگاہوں سے اس کے لرزاں وجود کو دیکھ رہا تھا۔

ادھر حورین کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ڈر، خوف، وہشت کے ساتھ ساتھ اب اس پر گھبراہٹ سوار ہونے لگی تھی، کیونکہ جھکی ہوئی نگاہوں کے باوجود وہ بخوبی ڈوائون کی نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پر شدت سے محسوس کر رہی تھی اور اس شخص کے ساتھ کی گئی زیادتیاں اسے اچھی طرح یاد آنے لگی تھیں۔ اگر وہ شخص اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لینے کی سعی کرے تو اس وقت کون روک سکتا تھا اسے؟ وہ ابھی پوری طرح اس کی دسترس میں تھی اور خود کو بچانے کی طاقت و ہمت محسوس نہ کر رہی تھی۔

اسے یقین تھا کہ ڈوائون اس کی بے بسی و کمزوری سے پوری طرح آگاہ ہے، اسی لیے وہ جو نگاہ اٹھا کر دیکھتا اپنی انسلٹ تصور کرتا ہے، کس طرح نگاہیں جمائے کھڑا ہے۔

ایک عجیب سے احساس سے اس کی گردن سینے سے لگ گئی، سیاہ مخمیری ہلکی سرخ جھیکے عارضوں پر لڑنے لگی تھیں۔ ڈوائون نے از حد دلچسپی سے اس کے چہرے پر دھوپ چھاؤں کا منظر دیکھا تھا اور گہری سانس لے کر اندر بڑھ گیا تھا، پھر اس کی واپسی فوراً ہی ہوئی تھی۔ حیدر اس کے ساتھ تھا، اس کے خاصی چہنٹس آئی تھیں، اسی لیے وہ کئی جگہوں سے غیوں میں جکڑا ہوا تھا مگر پھر بھی بہت حوصلے سے چل رہا تھا، حورین سے مخاطب ہوا تھا۔

”مس! آپ اپنے گھر کال کر کے کسی کو بلائیں، ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا“۔ حیدر کو دیکھ کر اسے خاصی ڈھارس ملی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے پرس سے سیل فون نکالا تھا لیکن کچھ کپاہٹ کے باعث سیل بار بار اس کے ہاتھ سے کنٹرول نہ ہو رہا تھا۔

”حیدر! تم ٹرائی کرو، ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے“۔ لمبے بھر میں اس کے چہرے پر وہی تاؤ اور لہجے میں بیزاری در آئی۔ حیدر نے اس کے مطلوبہ نمبر کو پیش کیا تھا مگر دوسری طرف سیل آف تھا، دو تین بار ٹرائی کے باوجود وہ کامیاب نہ ہوا تھا۔

”سیل آف ہے“۔ حیدر پریشانی سے گویا ہوا۔

”اب خود جھکتو، میں نے منع بھی کیا تھا خواہ مخواہ کی ہمدردیاں اسی طرح گلے پڑتی ہیں“۔ وہ منہ پھٹ تھا، سو کہہ گیا۔

”قارگاڈ سیک پار! کچھ تو خیال کرو۔“ حیدر سرگوشی میں بولا مگر حورین کی سماعتیں بے اثر نہ تھیں وہ سن رہی تھی اور اس کے بدلے موڈ اور تیور بھی بھانپ چکی تھی لیکن جان کرا نمود کرنے میں ہی اسے اپنی بہتری نظر آ رہی تھی۔

”سنتی ہے تو سن لے، یہ میرا در نہیں ہے۔“

”پلیز ڈوائلن! اپنے غصے پر قابو پاؤ اور سوچو ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے..... کیونکہ ہمیں ان کو بھی ساتھ لے کر یہاں سے نکلنا ہوگا۔ مجبوری ہے، ان کے نمبر پر رابطہ نہیں ہو پارہا ہے۔“ اسے خود کو گھورتے پا کر وہ شانے اُچکا کر آہستگی سے بولا۔

”تم کچھلی سائیڈ سے ذیلی سڑک پر آ جاؤ، میں کسی نہ کسی طرح گاڑی وہاں لے کر آ رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر تیزی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔ حیدر حورین کے ہمراہ کچھلی سائیڈ سے چھپتے چھپاتے باہر نکل چکا تھا۔

جامعہ کے اندر باہر پولیس اور رینجرز کی بھاری نفری تھی، پولیس موبائلز کے ہورنز سے نکلتی جیٹس آوازوں نے اس خاموش ماحول کو لرزا کر رکھ دیا تھا، ان آوازوں میں اتنی وحشت تھی کہ وہ پوری طرح غمگین تھی، پورا وجود دل بن کر دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ذیلی سڑک پر پہنچے ہی تھے، جب دو کاریں وہاں نہ کی تھیں۔ گرے کار سے ہریرہ باہر نکلا تھا، حورین کو دیکھ کر اس کے چہرے پر چھائے پریشانی و فکر کے سائے یکفخت چھٹ گئے تھے۔

”شکر ہے خدا کا کہ تم زندہ ہو..... میں تو یہاں ہنگامے کا سن کر تم پر قاتحہ پڑ چکا تھا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا، اگلے لمبے حورین اس کے سینے پر سر رکھ کر ایسے روئی، گویا برسوں کے بھٹکے کو ویرانے میں کوئی شناسا مل جائے۔

”آپ لوگ جو بھی ہیں مگر میں آپ کو نیک فرشتوں کے نام سے پکاروں گا، مہری کزن ایسی چواہشن سے فرسٹ ٹائم انٹروڈیوس ہوئی ہیں، خوف و دہشت سے جوان کی حالت ہے، اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ میں یہاں گزیر کی اطلاع ملتے ہی فوراً روانہ ہو گیا تھا مگر ہر جگہ رکاوٹیں دیکھ کر میں نے یہ رستہ اختیار کیا تھا۔“ وہ حیدر اور ڈوائلن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا، حورین خود پر خاصی حد تک قابو پا چکی تھی مگر ہریرہ کا دایاں بازو ابھی بھی اس کی گرفت میں تھا۔ حیدر، ہریرہ سے گھٹکوں میں مصروف تھا، جبکہ ڈوائلن بہت خاموشی سے بیویجیکٹ میں لمبوس شانے کو اس کی دو دھیا ہاتھ کی گرفت میں دیکھ رہا تھا، کچھ لمحوں قبل دہشت میں ہراساں کسی ہرنی کی طرح جس لڑکی کو اس نے دیکھا تھا وہ اس شخص کے قریب کھڑی مطمئن دہ سکون نظر آ رہی تھی، گویا ہر خوف و فکر سے اسے امان مل گئی ہو۔ وہ علیک ملیک کے بعد چلے گئے تھے۔

”ہوں، چلو۔“ وہ گہری سانس لے کر کار کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

راحیلہ بیگم کو خطرئی سے بات کرنے کا موقع مگر میں میسر نہ ہو رہا تھا، خطرئی ہاسپٹل سے نکلی ہوئی آتی، کبھی لہج کرتی یا کبھی مانع کے ہی تھا کان کے باعث سو جاتی تھی، پھر شام میں ہی وہ کمرے سے باہر نکلتی تھی، اس وقت تک سب مگر میں موجود ہوتے تھے۔ ڈنر کے بعد

سب سے پہلے واک کے بعد اپنے روم میں جانے والی خضرئی تھی اور وہ روز اس موقع کی تلاش میں تھیں کہ کسی طرح وہ خضرئی سے تہائی میں گفتگو کر سکیں۔ خضرئی واک کے لیے باہر نکل رہی تھی جب انہوں نے اس سے کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ واک پر جائیں گی۔

”دادو جان! یہ آج آپ کو واک کا کیسے خیال آ گیا؟“ خضرئی نے شپکین سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... دادو واک پر نہیں جاسکتیں؟“ منزل بول اٹھا۔

”جاتی تھیں ہیں..... مگر جاتی نہیں ہیں۔ مجھے تو کچھ دال میں کالا لگ رہا ہے۔“ وہ شوشی سے گویا ہوا۔

”بیٹا! میرے جوتے کھائے بہت دن ہو گئے ہیں اس لیے کالا، ہرا، پیلا نظر آنے لگا ہے، ابھی لگیں گے جوتے تو حواس ٹھکانے

آ جائیں گے۔“ راحیلہ بیگم مصنوعی غصے سے گویا ہوئیں۔

”دادو! آپ کس کی باتوں میں آ رہی ہیں، آئیں چلیں۔“ خضرئی ان کا ہاتھ پکڑ کر لان میں آ گئی، جہاں دھیرے دھیرے چلتی ہوا

شہنشاہی دُخو شہوار تھی۔

”تم نے خود کو اتنا مصروف کر لیا ہے بیٹا کہ گھر میں رہنے کے باوجود بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔“ تھوڑا سا چل کر وہ اس کے

ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے شکایتی انداز میں گویا ہوئیں۔

”مصروفیات از خود ہی بڑھ گئی ہیں۔“ وہ ان کے برابر والی کرسی پر برائمان تھی، وہاں لگے سرکری بلب کی روشنی میں اس چہرے

کی پڑھائی نمایاں تھی، جگنوؤں کی طرح چمکنے والی آنکھیں کسی دیرانے کا پتادے رہی تھیں۔ اس کے ضبط پر، اس کے کرب پر، ان کا دل

تڑپ کر رہ گیا، وہ جس آگ میں سوخت ہوئی جارہی تھی، وہ چشم وہ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی محسوس کرنے لگیں۔

”فراہ کا یہ راستہ جو تم نے چنا ہے، درست نہیں ہے میری بیٹی! اس طرح کب تک خود کو اور دوسروں کو فریب دو گی؟ تمہارے اس

طرز عمل نے، گریڈ خاموشی نے آج تمہاری ماں کو چومکایا ہے، کل باپ پریشان ہوگا، پھر بھائی اور بھابی تمہاری کھوج میں لگ جائیں گے،

کس کس سے چپاؤ گی؟ کیا بتاؤ گی؟ اپنی آدم بے زاری، تمہا پسندی، خاک ہوتا روپ، ورنگ اور لیبوں پر جاہ خاموشی کی کیا دلیل پیش کرو

گی۔“ ان کا انداز نامحمانہ تھا۔

دادو! می نے کچھ کہا ہے آپ سے؟“

”ہاں..... تمہاری گرتی صحت اور گوشہ نشینی نے اسے پریشان کر دیا ہے۔“

”دادو! میں ہمیشہ سے ایسی ہوں، تمہائی پسند، کم گو پھر میری پروفیشنل لائف اتنی ٹف ہے کہ..... میں ہلہ ٹک، موج مستی انورڈ نہیں

کر سکتی، یہ میری نچر نہیں ہے، مجی تو خود میڈیکل فیلڈ سے ایچ رہی ہیں، وہ میری پراہلز سمجھتی ہوں گی پھر.....“

”صنوبر ڈاکٹر شادی سے پہلے تھی، شادی کے بعد اس نے گھر، شوہر اور بچوں کو پورا پورا وقت دینے کے لیے خود کو الگ خانوں

خانہ بنا لیا، وہ اب صرف اچھی بہو، بیوی اور ماں ہے، ڈاکٹر نہیں۔ ڈاکٹر کی نگاہوں سے دل کی کیفیات چھپ سکتی ہیں مگر ماں کی نگاہ سے

نہیں۔“ وہ اسے رسائیت سے سمجھا رہی تھیں۔

”میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ میں خود کو زمین پر محسوس کر رہی ہوں نہ آسمان پر، زمین و آسمان کے درمیان مطلق ہو کر

رہ گئی ہوں۔“ اس کی آواز میں درد کی کرچیاں تھیں۔

”مت سوچا کرو..... جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔“

☆.....☆.....☆

انس نے کرن سے کراچی جانے کا اقرار کر دیا اور چھوڑا تھا، جس روز ان کی فلائٹ تھی اسی صبح کرن ہاتھ روم میں سلب ہو گئی جس کے نتیجے میں ان کی دائیں ٹانگ میں فریکچر ہو گیا تھا۔ شروع کا ایک ہفتہ کرن نے بڑی تکلیف میں گزارا تھا، دو ہفتے تک وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہ کر تکلیف کم ہونے کے بعد ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوئی تھیں، اس دوران انس نے تو انہیں ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا ہی تھا، سہ اور قاریہ نے بھی اسے کسی حقیقی رشتے کی محسوس نہ ہونے دی تھی، دن رات اس کا خیال رکھا تھا۔

کیا سوچ رہی ہیں مادام! وہ بکلیوں کے سہارے نیم دراز تھی اور بہت گہری سوچ میں مستغرق ساؤنڈ نیچل پر رکھے کوشل کے گھدانا میں بے سرخ پھولوں کو نکلے جا رہی تھی۔ انس جو کسی بزنس میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا، میگزین نیچل پر رکھ کر اس کے قریب بیٹھے ہوئے شوخ لہجے میں گویا ہوا۔

”میں یہی سوچ رہی ہوں، میری وجہ سے آپ لوگوں کا بھی کراچی جانے کا پروگرام خراب ہو گیا۔“

”پروگرام کا کیا ہے، پھر بن سکتا ہے، مگر میں نے عہد کر لیا ہے کہ جب تک تمہاری اپنی خواہش نہیں ہوگی، میں کبھی تمہیں کراچی جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔“ انس کے لہجے میں بے لوث چاہت کی آمیزش تھی جس نے کرن کو زندگی سے پیار کرنا سکھایا تھا۔

”کیا مطلب؟“ کرن نے ان کی طرف دیکھا، وہ بھی ان کی طرف دیکھ رہے تھے، اس سے ان کی گڑے آنکھوں میں ایک ایسا حزن و کسک ٹو دینے لگا تھا کہ وہ نگاہیں نہ ملا سکی تھیں۔

”مطلب آپ اچھی طرح سمجھ رہی ہیں۔“ وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

”ایسا خطرہ کسک! ایسی تکلیف زدہ حرکت کرتے ہوئے آپ کو میرا خیال نہیں آیا؟ حورین کا نہیں سوچا؟ شکر ہے ٹانگ کی ہڈی محفوظ ہے، ہڈی ٹوٹ جاتی یا..... خدا نخواستہ کچھ اور ہو جاتا تو ہم کیا کرتے؟ یہ نہیں سوچا یہ حرکت کرنے سے قبل؟“ وہ ان کا سرد ہوتا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر آرزوگی سے کہہ رہے تھے اور کرن ہکا بکا سی ان کی صورت دیکھ رہی تھی۔

”میں نے تمہیں دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ چاہا ہے کرن! جن کو ہم دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں ان کی تمام خوبیوں، خامیوں سے ہمیں آگاہی رہتی ہے، ہم ان کو اتنا جانتے ہیں جتنا شاید وہ بھی اپنے آپ کو نہیں جانتے۔“

”جو بااؤہ کچھ نہ کہہ سکیں، نہ معلوم کس جذبے کے تحت ان کے آنسو و خساروں پر پہنچے لگے تھے۔“

”رودت، تمہارے یہ آنسو مجھے کمزور کرنے لگتے ہیں۔“ اس نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”جان بوجھ کر تم سلب ہوئیں، تاکہ کراچی جانے سے بچ جاؤ، میں یہ سوچ کر لرز جاتا ہوں کہ اس سے بڑی چوٹ لگ جاتی تو.....“

”آٹھ سواری، میں نے آپ کو تکلیف پہنچائی مگر..... مگر میرے پاس کوئی اور تریب نہ تھی کراچی جانے سے بچنے کے لیے۔“ وہ

پھیکے لہجے میں گویا اقرار جرم کر رہی تھی۔ ”میں آپ سب کو ہرٹ کرنے پر شرمندہ ہوں، مگر مطمئن بھی کہ ہم زندہ رہیں گے تو ساتھ رہیں گے اور مجھے وہاں زندگی نظر نہیں آتی۔“

☆.....☆.....☆

”مما! ڈیڑی کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں آج کل، پہلے ویک اینڈ کو ملاقات ہو جاتی تھی، ایک عرصے سے وہ بھی نہیں ہو رہی۔“ منال سونے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے فائدہ سے مخاطب ہوئیں۔

”ہاں..... ان کی کمی مجھے بھی محسوس ہونے لگی ہے، میں نے شکایت کی تھی تو کہنے لگے عادت ڈال لو، آگے تو اس سے بھی زیادہ مصروفیات آئیں گی۔“ وہ ہاتھوں پر ہینڈ لوشن کی ماسٹ کرتے ہوئے ہنس کر کہہ رہی تھیں۔

”ڈیڑی کو بھی نہ معلوم کیوں سیاست میں داخل ہونے کی سوجھی، سب کچھ تو ہے ہمارے پاس۔ عزت، دولت، دنیا کی ہر آسائش سے بھری زندگی، پھر کیوں خود کو مصروف کر رہے ہیں۔“ وہ کشن لگا کر نیم دراز ہو گئی تھیں۔

”یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کی طلب بڑھتی ہی رہتی ہے، پھر جو مزہ عکرائی کرنے میں ہے، وہ کسی میں بھی نہیں ہے میری جان۔“

”جانتی ہوں ممما! یہ نشہ..... کرسی کا نشہ ہر نشے سے بڑھ کر ہوتا ہے، یہ بھی سوچیں، اس کا چسکا جان کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور میں نے زندگی میں اتنا کچھ کھوایا ہے کہ اب کچھ کھونے کا تصور بھی مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے، میں بے سکون ہو جاتی ہوں۔“ فائدہ بیگم نے لوشن ڈریٹنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے آئینے میں ان کے عکس کو دیکھا تھا۔ پنک گلر کے ٹراؤڈر سوٹ میں بکھرے بالوں کے ساتھ وہ خود بھی بکھری بکھری لگ رہی تھیں۔

”ڈارلنگ!، وہ ان کے قریب بیٹھ کر بال سنوارتے ہوئے گویا ہوئیں۔“ اپنے ڈیڑی کی نچر جانتی ہو، وہ دل میں آئی بات اور فیصلہ کبھی نہیں بدلتے، خواہ اس کا زلٹ کچھ بھی نکلے جو انہوں نے سوچا ہے وہ کہہ دیں گے، اب میرا اور آپ کا خون جھلانا، کڑھنا بے معنی ہے۔“

”جانتی ہوں، پھر بھی میں چاہتی ہوں ڈیڑی پہلے جیسے بن جائیں، آفس کے بعد سارا ناٹم ہمارے ساتھ گزارنے والے، کتنی گنڈ فیلنگ ہوتی تھیں جب ڈیڑی ہمارے ساتھ پارٹنر شیز مکر کرتے تھے، کبھی لاگ ڈرائیو، تو کبھی ڈنر پر ساتھ ہوتے تھے۔“

”اوہ.....! یہ آج کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ کون کہہ سکتا ہے آپ دو جوان بیٹوں کی ماں ہیں، باتوں سے بالکل..... چاکلڈ لگ رہی ہیں۔“ فائدہ بیگم مسکرائی تھیں۔

”مما شاید عورت ہمیشہ ادھوری رہتی ہے، وہ اپنی ذات کے کھوئے ہوئے حصے کو کسی نہ کسی وجود میں، کسی نہ کسی رشتے میں تلاش



کرتی رہتی ہے، میں بھی اپنا گمشدہ حصہ اپنے لوگوں میں تلاش کرتی ہوں۔“

”اب کیا ٹینشن ہے، مسلسل ٹینس کیوں رہنے لگی ہیں، معلوم تو ہو؟“

”مجھے کیا ٹینشن ہوگی کچھ بھی نہیں۔“ وہ سیدھی بیٹھی تھیں۔

”مسز طلعت کو ڈنر پر انوائٹ کر لیتے ہیں، ان سے گپ شپ میں بوریت دور ہو جائے گی۔“

”بوریت دور نہیں ہوگی، اور بڑھ جائے گی۔“ وہ منہ بنا کر گویا ہوئیں۔

”کیا مطلب؟“ وہ از حد حیران تھیں۔

”وہ عجیب پاگل عورت ہے ماما! ایک آزاد معاشرے میں رہ کر بھی جس کی ذہنیت و سوچ میں تہدیلی نہیں آتی، وہ اس دور میں بھی

صدیوں پرانے انداز کے دوپٹے اوڑھتی ہے، جس کو ہر ایک فاسٹ میں جیم برینڈ کے بجائے، پراٹھا اور اچار پسند ہے، بیڑا کی بجائے وہ

دال چاول شوق سے کھاتی ہے، اسی رنگ میں اس نے دونوں بیٹیوں کو رنگا ہوا ہے اور تو اور طلعت صاحب بھی تھری ٹیس سوٹ میں ٹوپی پہن

کر نماز پڑھتے ہیں، اپنے اسٹینڈرڈ کے لوگ نہیں ہیں وہ۔“ ان کے چہرے اور لہجے سے آکٹاہٹ دنا گواریت عیاں تھی۔

”یہ عادت آپ کی ابھی تک نہ گئی، جس کی طرف جتنی تیزی سے لگتی ہو، اس سے اتنا ہی بے زاری سے چھوڑنے میں ٹائم بھی

نہیں لگاتی ہو۔“

”ہلکتے عادتیں کہاں ترک ہوتی ہیں ماما!“ وہ انداز سے مسکرائی تھیں۔ اسی دم منال کا فون بیل بج اٹھا تھا۔

”کیا ہوا؟“ منال کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر وہ پریشانی سے گویا ہوئی تھیں۔ ”کس کی کال تھی؟“

”یونیورسٹی میں کچھ ڈسٹرنس ہوگئی ہے۔“ وہ تیزی سے ذوالنون کے موبائل سے رابطہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور ان کے بار

بارٹرائی کرنے کے باوجود رابطہ نہ ہوا تھا۔

”پریشان مت ہو، پرنس ٹھیک ہوگا۔“ وہ متوحش ہوتی منال کو تسلی دیتے ہوئے اپنے سیل سے اس کا نمبر فرمائی کرنے لگی تھیں۔

اس سے رابطہ کرنے میں انہیں بھی ناکامی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”چاندنی..... او چاندنی! ادی کہاں مرگئی کبھت۔“ بی بی جان وراثے سے اسے آوازیں لگاتی کچن تک چلی آئی تھیں۔ وہ

مزے سے واک مین کانوں سے لگائے میوزک کی نے پر پاؤں ہلارہی تھی۔

”اچھا یہاں یہ عیش ہو رہے ہیں۔“ وہ اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوئیں تو وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی تھیں اور اسی عجلت میں واک

مین سے چمکارا پایا تھا۔ اس دوران بی بی جان کی کاٹ دار لگا ہیں اسے گھورتی رہی تھیں۔

”کیا ہو رہا تھا یہ؟“

”کچھ نہیں..... وہ..... وہ میں.....“ اس سے کچھ نہ کہا گیا۔

”پہلے یہ مجھے بتا..... مجھے تیرے اماں، باوانے کتنی تنخواہ پر تیری کنیز رکھا ہے جو ہر دم مجھے تیرے پیچھے پیچھے ہی رہنا پڑتا ہے۔“  
 ”ایسا نہ کہیں بی بی جی! کنیز تو میں آپ کی ہوں، آپ کی خدمت کرنے آئی ہوں۔“ وہ مسکین صورت بنا کر گویا ہوئی۔  
 ”مجھے کھن مت لگا، میں کہتی ہوں، ایک جگہ کتنی کیوں نہیں ٹو؟ چھلاوا کیوں بنی رہتی ہے۔“ وہ اس کے اعزاز سے متاثر ہونے والی نہ تھیں۔

”آپ ہی تو کہتی ہیں، لڑکیوں کو بھاگ بھاگ کر کام کرنا چاہیے۔“ اس نے ان کی بات کو جواز بنا کر جان چھڑانی چاہی۔  
 ”ہوں..... بھاگ بھاگ کر کام کرنے کی ترغیب دیتی ہوں، چھپ چھپ کر آرام کرنے کا مشورہ نہیں، تجھے میں نے کہا تھا، میرے کرے کی بیڈھیٹ بدل دے۔“

”تو بدل دی ہے بی بی جان۔“ وہ بات قطع کر کے بولی۔

”تکیوں پر غلاف کون چڑھائے گا؟“

”اوہ وہ میں بھول گئی، ابھی چڑھاتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اگر اس گھر میں کام کرنا ہے تو اپنی عقل لٹکانے رکھا کر، ادھر سے اور گندے کام مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔“ چاندنی سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ وہ چاندنی کے پیچھے جانا چاہ رہی تھیں معائن کی نگاہ ہریرہ کے ساتھ اندر داخل ہوتی حورین پڑ پڑی تو اس کی خوف زدہ ہی اتری صورت دیکھ کر وہیں ڈک گئی تھیں، پھر اضطرابی انداز میں آگے بڑھیں، حورین ان کی طرف بھاگتی ہوئی آئی اور ان سے لپٹ کر شدت سے رو پڑی۔  
 ”ارے..... کیا ہوا بیٹی! ہائے اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“ وہ نرمی طرح بولکھائی تھیں اس کے اس طرح زار و قطار رونے سے۔  
 ”بی بی جان آپ پریشان مت ہوں۔“ ہریرہ نے مختصر ان کو تفصیل بتائی، اس دوران وہ لاؤنج میں آگئے تھے۔ حمیرا، سمیرا سمیت سب جمع ہو گئے تھے۔ زویا بھاگ کر پانی میں گلو کو زلا کر لے آئی تھی۔ بی بی جان نے اپنے ہاتھ سے اسے پلایا تھا۔ حمیرا، سمیرا بھی بہت پیار سے اس سے پیش آئی تھیں۔

”لو بھلا اور سنو، اب کتب بھی میدان جنگ بن گئے، درس گاہوں سے تو جاہلیت کے اندھیرے مٹا کر علم و فضل کی روشنیاں ملتی ہیں جو ذہنوں کے جس زدہ درجوں کو شعور و آگہی کی تازگی عطا کرتی ہے جس سے انسان میں تیز و تہذیب پیدا ہوتی ہے، اچھے نرے کو کھینے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، ادب و آداب آتے ہیں، اگر درس گاہوں میں لڑائی، جھگڑے، قتل و غارت گری شروع ہو جائے گی تو ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو کون علم و دین کی روشنی دے گا؟ علم و عمل سے بے بہرہ و صبر و استقامت اور تحمل مزاجی ہم سے نکل جائے گی تو پھر ہم میں اور چودہ سو سال قبل زمانہ جہالت کے لوگوں میں کون تمیز کرے گا، کون آئے کا حق و محبت کی مشعل سے جہالت کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے؟“

”بی بی جان! علم و آگہی کی جو مشعل ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روشن کی تھی، وہ تاقیامت روشن رہے گی، اسے کسی میں طاقت نہیں ہے گل کرنے کی، یہ سب خیر و شر کی لڑائی ہے جو ازل سے چلی آ رہی ہے اور اب تک جاری رہے گی، یہاں وہی کامیاب رہ سکتا ہے جو ایمان کی حفاظت کرتا ہے“۔ وہی نے کہا۔

ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

”وہی، سفیان، سعود وغیرہ بھی آگے تھے۔ جامعہ میں ہنگامے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی“۔

”عجب ہے آج کل کی جزییشن بھی جو ظلم حاصل کرنے جاتے ہیں، وقت پڑنے پر اس کو ہی بھول جاتے ہیں، فائدہ کیا ایسی تعلیم کا“۔ میرا، حیران کن کی طرف جاتے ہوئے گویا تھیں۔

”چلو! ٹھو، دل بڑا کرو چندا، نہ معلوم وقت کیا کیا دکھائے گا، اس طرح حواس کھو گی تو گزرگنی زندگی، جا کر ہاتھ لو، کپڑے پہنچ کرو، میرا چائے بنا رہی ہے، مخالفت آؤ پھر چائے پیتے ہیں۔ تمیرانے کافی ساری چیزیں بنائی ہیں“۔ وہ حورین کو کسی بچے کی طرح ٹریٹ کر رہی تھیں، ہر دم ہنستی مسکراتی حورین کا یہ روپ انہیں متنا سے لبریز کر گیا تھا۔ حورین خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی، وہ کھڑی ہوئی تو زویا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا۔

”چلو میں تمہارے وارڈ روپ سے سوٹ نکال دوں گی“۔

”اس سے ابھی کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، بچی ڈری ہوئی ہے“۔ بی بی جان اس کی بڑے تجسس طبیعت سے بخوبی واقف تھیں، اسے حورین کا ہاتھ پکڑے جاتے دیکھ کر تنہی لہجے میں گویا ہوئیں۔

”جی اچھا“۔ مارے شرمندگی کے وہ یہی کہہ سکی۔

”پروردگار کا شکر ہے ہر یہ، تم ناٹم پر پہنچ گئے، مجھے تو یہ سوچ کر ہول اٹھ رہا ہے، اگر پرانی بچی کو کچھ ہو جاتا تو..... کیا مت دکھائی میں انس اور کرن کو، میں نے ہی اصرار کر کے بلوایا تھا بچی کو“۔ حورین کی دیگر گوں حالت نے سب کو ہی حیران کر دیا تھا۔

”میں فون کر کے پہلے اسلام آباد خیریت کی خبر دے دوں، ان کو معلوم ہوگا تو پریشان ہوں گے“۔ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”بی بی جان! انہیں یہ مت بتائیے کہ حورین نے یہی طرح ڈرگئی ہے بلکہ کہہ دیجئے گا کہ وہ آج یونیورسٹی گئی نہیں تھی“۔ سعود اپنی رو میں کہہ گیا پھر یک دم ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو سانس رو گیا، بی بی جان کی نگاہوں کے فریم میں تھا وہ۔

”اچھا..... اور کچھ سمجھاؤ گے نہیں مجھ بے عقل کو؟“

”نہیں..... نہیں میرا مطلب تھا“۔ وہ گڑ بڑا گیا۔

”ہاں..... اب اتنے بڑے دن آگے ہیں میرے کہ یہ کل کے بچے آج مجھ کو قتل کی باتیں سکھائیں گے“۔ وہ سعود کو گھور کر گویا ہوئیں، باقی سب گردنیں جھکائے بیٹھے تھے فرما رہے تھے داروں کی طرح۔

”سوری بی بی جان“

”یہ لفظ بھی خوب ہے، سامنے والے کی بڑی سے بڑی بے عزتی کر دو اور جواب میں کہہ دو ”سوری!“ وہ آسانی سے معاف کرنے والی نہ تھیں۔

”سعودا سوچ سچھ کر بولا کرو، بھلا بی بی جان سے زیادہ کوئی عقل مند ہو سکتا ہے۔ ہماری بی بی جان دوسروں کو عقل دیتی ہیں اور تم ان کو سکھا رہے ہو، آئندہ سوچ سچھ کر بولنا“۔ وحسی نے خاصی ہوشیاری سے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا تھا مگر وہ جلدی میں بھول گیا کہ باتوں میں کھن کی آمیزش ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے۔

”یک نہ شد و شد، یہاں آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا ہے، ارے میرے قابل و ہونہار بھائیوں کی ناکارہ اولاد تو ہمیں دنیا میں یہی گھرا تھا پیدا ہونے کے لیے، کیا ہوگا میرے بھائیوں کا؟“ وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں اور ان سب نے نکل کر سانس لی تھیں۔

”کس نے کہا تھا تجھے مشورہ دیتے کو؟“ وحسی نے اسے ڈانٹا۔

”اور تجھے کس نے کہا تھا؟“ وہ اس سے دوہرہ بولا۔

”مجھے تجھ پر ترس آ گیا تھا“۔

”کیوں..... کیا میں اندھا ہوں؟“

”ہاں عقل کے اندھے کو بھی اندھا کہتے ہیں“۔

”اگر میں اندھا ہوں تو..... تو ہانکل معذور ہے عقل سے“۔

”اوہو، کیا ہے بھئی! کوئی اچھی بات بھی کرے گا یا یوں ہی آپس میں چونچیں لڑاتے رہو گے“۔ مول نے کہا، قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتے، اسی لمحے چاندنی نے چائے لکھنے کی اطلاع دی تھی۔

☆.....☆.....☆

حیدر کے ذمہ کی بیڑا بیچ اس نے عارضی طور پر کر دی تھی، اس کے خود بھی خاصے ذمہ آئے تھے جو پشت اور سینے کی طرف تھے جن میں اب قابل برداشت ٹیسس اٹھنی شروع ہو گئی تھیں اور اس سے ڈرائیونگ کرنا مشکل ہو رہا تھا، حیدر فرنٹ سیٹ پر اس کے برابر میں تقریباً اٹھ حال بیٹھا بار بار فتوہ کی کاٹکار ہو رہا تھا۔

”یار اڈوالٹون ایسا کب ختم ہوگا؟ ہاسپٹل کب آئے گا؟ جان لکل جا رہی ہے، ہاسپٹل ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا“۔

”حاتم طائی بننے کا ارادہ رکھتے ہو تو دل میں صبر و استقامت بھی بھر پور انداز میں رکھو“۔ اسٹیرنگ گھماتے ہوئے وہ طنز یہ انداز

میں بولا۔

”دیکھو بھائی، مجھے معلوم ہے تو ایک عرصے تک اس موضوع پر جوتے مارتا رہے گا، اس حقیقت سے قطع نظر کہ جو کچھ میں نے کیا

وہ ایک نکلی ہے، بلکہ جس طرح بھی رہے تم میرے ساتھ رہے، اگر میں حورین کا خیال نہ رکھتا تو نہ معلوم کیا ہوتا..... اور تم نے دیکھا تھا وہ کس قدر خوف زدہ تھی، کم از کم میں نے آج سے قبل کسی بولڈ، بریلز کی کو اس طرح روتے نہیں دیکھا۔“

”حورین کا ڈرا، سہا خوف سے زرد چہرہ اور آنسوؤں سے کانپتا وجود جھماکے سے اس کی ذہن کی اسکرین پر طلوع ہوا اور بے ساختہ اس کے لبوں پر دل فریب مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

”اسٹوڈنٹ گرل ایئر لیا کیا بے وقوف ہی ہوتی ہیں۔“

”ہاں..... میرے بھائی! جس دن کوئی لڑکی تمہیں گمراہی کی تو پوچھوں گا، کون بے وقوف ہوتا ہے۔“ حیدر غصہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ کار ایک پرائیویٹ ہاسٹل لے آیا تھا جہاں کونین پہلے سے موجود تھا، وہاں ہنزہ نے خود انہیں اٹینڈ کیا تھا اور خواب آور انجکشن کے ذریعے وہ دونوں بے خبر سو گئے تھے۔

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں ٹیوب لائٹس آن تھیں، کھڑکیوں کے شیشوں سے نظر آتے باہر کے منظر میں اترتی رات کی سرسراہٹیں تھیں۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو حیدر ابھی تک بے سدھ پڑا تھا، اس کی جانب سے آنے والی ہلکی خراٹوں کی آوازیں اس کی گہری دہڑ سکون نیند کی نماز تھیں۔

”ذوالنون بیٹے! اب کیا ٹیل کر رہے ہیں؟“ اسے نیند سے بیدار دیکھ کر صومال کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوئے تھے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اکل۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”ٹھیک کیسے نہیں ہوں گے، آخر گمر کے ڈاکٹر کس لیے ہیں۔“ کونین اور ہنزہ جو اسی بل اندر داخل ہو رہے تھے، کونین نے شوخی سے کہا۔

”آل رائٹ مائی سن۔“ صومال نے مسکراتے ہوئے کہا، کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے تو ہنزہ اور کونین اس سے دریافت کرنے لگے کہ یونیورسٹی میں کیا ہوا ہے اور انہیں یہ چوبیس کس طرح آئیں، اس دوران حیدر بھی بیدار ہو چکا تھا اور وہ بھی ذوالنون کی طرح ہنزہ کی انٹل ٹرینٹ کے باعث خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔

”جو آج ہوا، اسے بہت پہلے ہونا تھا، ہم سے روکی اپنا مطلب حاصل نہ کر سکا تو آج اس نے اس اسٹوڈنٹس تنظیم سے چھیڑ چھاڑ کی جو ان کی مخالف پارٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ ان تنظیمی لوگوں میں برداشت کہاں ہوتی ہے، یہ لوگ بن بادل برسات کی مانند ہوتے ہیں، بے موقع بن بادل برس پڑتے ہیں۔“ حیدر نے آج ہونے والے جھگڑے کی تفصیل بتائی تھی۔

”سمجھ میں نہیں آتا، تنظیمی اداروں میں کیفر کی طرح پھیلتی ہوئی پائیکس کو سیاست دان اور حکمران اگنور کیوں کرتے آئے ہیں جو اسٹوڈنٹس ہاتھوں میں قلم کی جگہ ہتھیار پکڑیں گے ان کا لیوچر کس طرح برائٹ ہوگا؟“

”میں نے جب ایک جینٹل پر یہ نوز دیکھی تو فوراً ہی تمہیں کال کی تھی مگر کافی دیر بعد بھی تمہاری طرف سے ریسپانس نہیں ملا تو میں

یونین دہلی گیا وہاں ریجنل پولیس کی بھاری نفری نے راستے بلاک کر رکھے تھے، ان کے آفیسرز سے معلوم ہوا کہ اندر کوئی نہیں ہے، میں ہنزہ کے پاس آیا تھا کہ تم آگئے۔“ کونین نے اسے دیکھتے ہوئے کہا جس کی وہ ہائٹ شرٹ جگہ جگہ سے خون کے دھبوں سے پرتھی جو سوکھ کر مزید بد نما لگ رہے تھے۔

”تم لوگوں کے چوٹیں کس طرح آئیں؟“ ہنزہ نے انٹرکام پر کافی کا آرڈر دیتے ہوئے ان دونوں سے استفسار کیا تھا۔  
 ”دراصل ہم کوچ سے اندازہ ہو چکا تھا کہ آج کچھ صورت حال گڑبڑ چل رہی ہے، ڈوالٹون نے دوسرے فرینڈز کو بھی الرٹ کر دیا تھا کہ وہ خبردار رہیں، ارد گرد سے اگر کچھ غیر معمولی بات دیکھیں تو فوراً وہاں سے نکل جائیں، وہ لوگ تو فوراً ہی نکل گئے تھے، ہم بھی نکل جاتے مگر وہاں پھنسے بے قصور اسٹوڈنٹس کی مدد کرنے کے دوران ہی یہ ذہم آئے ہیں، لوگوں کے ارمان اس طرح پورے ہوئے ہیں۔“  
 ”ایک نئے تک تم دونوں کو بیڈ ریٹ کرنا ہے، ڈریٹنگ کروانی ہے، مگر کاڈاکٹر ہوں، اس لیے ایڈمٹ نہیں کر رہا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود سے ہائل لاپرواہ ہو جاؤ۔“ کافی پینے کے بعد ہنزہ اپنے پیشہ ورانہ انداز میں مخاطب ہوا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
 ”اوکے، فکرمٹ کرو۔“ کونین نے ہنزہ سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”اوکے تم لوگ جا کہاں رہے ہو، مگر چلو وہاں سب ڈوالٹون کو ملنے کو بے چین ہیں۔“ ہنزہ نے دونوں کی طرف دیکھ کر اصرار کیا۔  
 ”اکیچ علی ماماں کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہیں، نالو نے انہیں بہلایا ہوا ہے، کچھ میں بھی سمجھا کر آیا ہوں، اگر اس وقت ہم نہ گئے تو وہ نہ معلوم کیا خیال کریں، تم کہہ دینا، بہت جلد ہم آئیں گے۔“

”حیدر کو ڈراپ کر کے وہ گھر آئے تو رات اپنے سیاہ گیسو کا کتات پر دراز کر چکی تھی۔ ماحول میں تمھیں خاموشی رہتی تھی۔“  
 ”تم، اپنے روم میں جا کر کپڑے چینج کرو، میں ماما اور نالو کے پاس جا رہا ہوں۔“ کار سے اتر کر کونین اس سے مخاطب ہوا۔  
 اس نے کپڑے چینج ہی کیے تھے کہ گیٹ کھول کر تیزی سے مثال اندر داخل ہوئی تھیں، ان کے پیچھے فائٹنگ بیگم اور کونین تھے۔  
 مثال بڑے والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی تھیں اور اس کے ہاتھوں کو چوم کر رونے لگی تھیں، ان کے انداز میں متا کاسس تھا، تڑپ تھی۔ ڈوالٹون شاکڈ رہ گیا تھا۔ اس نے ان کا یہ انداز کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ ان کے اسی روپ کو دیکھتا آیا تھا جس میں ان کی لاپرواہی و بے نیازی کے ساتھ طنز و بات پر اس کے باہا کے حوالے سے کڑوے کیلے طعنے دینے کی ناقابل برداشت عادت تھی، اس نے انہیں ہمیشہ ایک خود مر، خود پسند، بے حس و مشرور عورت کے روپ میں دیکھا تھا جو اسے قطعی پسند نہ تھا۔ یہ بے ترتیب ہال، اہتر چلیے اور اسے لپٹائے بے قراری سے روتی ہوئی عورت کا روپ، ایک ماں کا روپ تھا، ایسی ماں کا روپ جس کا متقاضی تھا۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ سے ایسی ٹوٹ کر چاہنے والی ماں کی متلاشی تھیں، ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو پانی نہیں، سچے موتی تھے۔ وہ موتی جو صرف ماں کی متا کے ساگر میں ہی پائے جاتے ہیں۔

”ماما! میں ٹھیک ہوں، لگنہ کیجئے۔“ اس نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

”منال! اللہ کا شکر ہے ہمارے پرنس کو کچھ نہیں ہوا، صرف معمولی زخم آئے ہیں، آرام کرنے دو اس کو“۔ قائد نے نرمی سے انہیں ڈوالٹون سے دور کیا تھا، وہ صوفے پر بیٹھ کر بھی رو رہی تھیں۔

”مما! بی بی بریو۔ پرنس ٹھیک ہے“۔ معمولی چونٹیں ہیں، ایک ہفتے ریست کرے گا ٹوٹ ہو جائے گا، آپ ٹینس نہ ہوں“۔ کونین ان کے قریب بیٹھ کر انہیں سمجھانے لگا۔

”آپ کیا فیمل کر رہے ہیں پرنس! جن زیادہ تو نہیں ہے؟“ قائد اس کے قریب بیٹھ کر استفسار کر رہی تھیں۔

”نہیں نانا!“ اس کی بھرپور مسکراہٹ میں آسودگی تھی۔

”نانو! پہلے ڈنر کر لیتے ہیں پھر پرنس کو میڈیسن دینی ہیں“۔

”غیر وزہ سے کہہ کر کھانا نہیں منگوا لیتے ہیں، پرنس کو میں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی، بہت تکلیف ہے ان کو، یہ چمپارہ ہیں مگر میں محسوس کر رہی ہوں، یہ چہرے پر دیکھیں کیسی زردی پھیل گئی ہے“۔

وہ اس کے قریب آ بیٹھی تھیں اور بہت محبت بھرے انداز میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”بہت یاد آ رہا ہے بیٹے پر“۔ قائد بیگم مسکرا کر گویا ہوئیں۔

”یاد تو میں اسے بہت کرتی ہوں، یہ الگ بات ہے کہ آج سے قبل احساس نہیں ہوا تھا“۔ وہ اور بھی کچھ کہہ رہی تھیں مگر ڈوالٹون غنودہ حالت میں اپنے اندر آرتی سرشاری و طمانیت میں اپنے اندر چھائی برسوں کی تھکنی و محرومی میں کچھ تدارک دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مئی! حضرتی کے لیے رضوان علوی کے بیٹے مہران علوی کا پرنس پزل آیا ہے۔ ویسے تو اور کئی فیملیز کے پرنس پزل ہیں مگر مجھے یہ مہران علوی کی فیملی حضرتی کے مزاج کے مطابق لگ رہی ہے۔ آپ حضرتی سے معلوم کر لیں“۔ صنوبر بیگم راجیل بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

”رضوان علوی کا مار بٹز کا پرنس ہے؟“ وہ یادداشت پر زور دیتی ہوئیں پوچھنے لگی تھیں۔

”جی..... جی وہی حضرتی فیملی ہے، چار افراد پر مشتمل، بیٹی کی شادی بھی وہ بیٹے کے ساتھ کریں گے، مجھے تو پرنس پزل ہر لحاظ سے حضرتی کے لیے موزوں لگ رہا ہے، کیونکہ حضرتی طبیعتاً تنہائی پسند و کم گو ہے، ایسی لڑکیوں کے لیے ایسی فیملیز مناسب رہتی ہیں پھر مہران سے آپ بھی کئی بار ملی ہیں، بہت ڈینٹ اور انس کھ لڑکا ہے اور اس کی خواہش پر ہی یہ پرنس پزل آیا ہے“۔

”انہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا حضرتی کی جانب پر؟“ ان کے اندر افراتفری پھیل رہی تھی۔ کونین کا سراپا ان کی نگاہوں میں چمکنے لگا تھا، اس کی محبت کی دیوانگی سے واقف تھیں، اس کی پُرشوق نگاہوں کا اضطراب و جنون ان سے مخفی نہ رہا تھا اور جانتی تھیں یہ لمحے ان کی زندگی میں ضرور آئیں گے کہ کسی نہ کسی دن ان سے حضرتی کے لیے آنے والے رشتوں کی بابت رائے لی جائے گی۔ وہ کس طرح کس دل سے حق بات کہیں گی؟

”نہیں می! مسز رضوان کا کہنا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے، حضرتی جاب کرے یا نہ کرے، رضوان صاحب کا بھی یہی کہنا ہے کہ مہران ان کا اکلوتا بیٹا ہے، سب کچھ اسی کا ہے، اگر حضرتی شادی کے بعد شوقیہ اپنی جاب جاری رکھے تو ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”اچھا..... میں حضرتی سے معلوم کرتی ہوں، ویسے مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کرے گی، ہماری تربیت بھی ایسی ہے کہ اتنا پڑھنے لکھنے کے باوجود حد سے تجاوز نہیں کر سکتیں۔“ صنوبر بیگم کو ان کی بات سے پورا پورا اتفاق تھا، وہ چلی گئی تھیں۔

راحیلہ بیگم کی نگاہوں میں کوئین اور حمزہ کے چہرے کسی سزا کی طرح ثبت ہونے لگے تھے، ان کے اندر وحشت و بے چینی صحرائی بکولے کی طرح گردش کرنے لگی، وقت ایک بار پھر خود کو دہراتا ہوا محسوس ہوا، کل انہوں نے طاقت کے غرور میں، نظرتوں کے جذبات میں ڈوب کر اپنے بیٹے کی محبت کو نیست و نابود کیا تھا، خود اپنے ہاتھوں سے اپنے چمن میں آگ لگائی تھی اور وہ آگ ایسی آگ تھی جو ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود بجھی نہ تھی، اب بھی وہ آگ انہیں بھسم کرنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی، جس سے وہ مضطرب تھیں۔

”اے غفور! رحیم! اے پروردگار! اے ستر ماؤں سے زیادہ ہم سے محبت کرنے والے! ہم کو چاہئے والے رب امیری حالت پر رحم فرما، مجھ میں حوصلہ نہیں ہے، اب مزید گھر چلنے دیکھنے کا، تیری قدرت بہت بڑی ہے، جہاں سے بندوں کے اختیار کی حد ختم ہوتی ہے وہاں سے تیری حد شروع ہوتی ہے۔ تو تو وہ بادشاہ ہے جس کی بادشاہت ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے، ہمارا اول و آخر سہارا و امید صرف تو ہے۔ پروردگار! امیری مدد کر، ہماری اُجھٹوں کو سلجھا دے۔ آمین۔“

جب بندہ ہر طرف سے مایوسیوں و ناامیدیوں کے گھور اندھیرے میں بھٹکنے لگتا ہے تو نور کی ایک وہی کرن نظر آتی ہے جس کا درپچہ ہر وقت اپنے بندوں کے لیے وار ہوتا ہے جو شب کے کچھلے پہر صمد دیتا ہے، کون ہے مانگنے والا..... جس کو میں نوازاؤں..... کون ہے بخشش کا طلب گار، جس کو بخش دوں..... کون ہے گناہوں سے تائب ہونے والا، جس کو میں معاف کروں۔ اس کی صدائیں بے حساب ہوتی ہیں، اس کی کرم نوازیوں کی طرح لامحدود، بندہ اس کی طرف چل کر جاتا ہے، وہ دوڑ کر آتا ہے۔

ایک وقت تھا جب نوشابہ، اپنی بیٹی کرن سمیت ایک صبر آزما امتحان سے گزر رہی تھیں۔ سسرال سے ٹھکرائی ہوئی، شوہر کی ناپسندیدگی کا بوجھ لیے، جب انہیں انہوں کی ضرورت تھی، اپنائیت کی چاہ تھی، جب جواب میں انہیں انہوں سے اس قدر سرد مہری دے گا لگی ملی تھی کہ انہوں نے بھرپور توجہ سے صدق دل سے اپنے رب کو پکارا تھا، اس سے لو لگائی تھی، اس کے بعد انہیں کسی کی طلب نہ رہی تھی، ان کی بے چینی و بے کالی کو قرار مل گیا تھا، ان سب کی کڑوی بات، ہر ناروا رویہ انہیں بے سکون رکھتا، صبر و سکون کی وہ بھسم مثال تھی جب راحیلہ بیگم اپنی دیوانیوں (جو مدت ہوئی ان سے قطع تعلق کر چکی تھیں) سے مل کر ان کے خلاف بڑے بڑے پروپیگنڈے کرتیں، مقصد صرف ان ماں بیٹی کو وہاں سے بے دخل کرنا تھا، جس میں وہ کامیاب ہوگی تھیں لیکن وہ کامیابی آنے والی ہر ناکامی کا آغاز تھی، ماضی ان کے لیے گلے سے لپٹنا سانپ بن چکا تھا جو ہر موقع پر ان کو ڈستا تھا، کل نوشابہ کو نماز و وظائف میں مشغول دیکھ کر ان کو جادو گرنی وقت نہ پروردگار نے والی راحیلہ بیگم



آج اپنے نام اشکوں سے سجدے کی جگہ بھگو دیا کرتیں، دن و رات کا وقت ان کا زیادہ تر جائے نماز پر ہی گزرتا تھا، پھر بھی خمیر کا بوجھ کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

روح پر چھائی تھکن روز بروز بڑھ رہی تھی، دل کی بے چینی فرو نہ ہوتی تھی، ذہن پر کشمکش تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔  
دعا خیر قبولیت کی سند نہ پا سکی تھیں۔

سجدوں میں شاید ابھی وہ اخلاص پیدا نہ ہو سکا جو ان کی دانستہ و نادانستہ کی گئی خطاؤں و گناہوں کو معاف کر داسکے، مشکلات و مصائب کے دوران پر دانتے نئی نئی پریشانیاں انہیں گھیرے تھیں۔ حسب توقع حضرت نے کوئی انکار و اقرار نہ کیا تھا۔ ساٹھ چہرے کے ساتھ فیصلہ بزرگوں کا خشاء پر چھوڑ دیا تھا۔

کوئین کو آگے بڑھنے سے روکنے کا اس سے بہتر راستہ اور کوئی نہ تھا، کوئین کی ہر روز بڑھتی دیا گئی نے اسے فکر مند کر رکھا تھا۔  
”مجھے تم سے یہی امید تھی میری بچی، مگر میں تمہارے دل کے کرب سے بھی بے خبر نہیں ہوں، میری دعا ہے تمہیں ڈھیروں خوشیاں ملیں اور..... اس دیا آنے کے لیے بھی دعا کرتا، اللہ تم جیسا سیر و حوصلہ سے بھی عطا کرے۔“ وہ حضرت کو لپٹا کر بولیں۔

☆.....☆.....☆

”لو ہو گئے پھر؟“ زویا اندر آتی ہوئی بولی۔

”کیا ہوا؟“ مول اور حورین چونک کر گویا ہوئیں۔

”وہی ہوا، جس کا اندیشہ ڈوائون بھائی کو تھا۔“

”ہاں..... چلو اچھا ہے اب ڈرامے سے تیاری کریں گے، ورنہ سچ مجھے بڑی ٹینشن ہو گئی تھی۔“ زویا ان کے قریب بیٹھے ہوئے کہنے لگی۔

”سچ بات تو یہ ہے کہ اگر بی بی جان کا ڈر تمہیں نہ ہو تو تم بڑھنے جاؤ گی نہیں، اپنے بیڈروم میں رسالے پڑھتی رہو اور صوبی دیکھتی رہو۔“

”تم سے بالکل میرے دل کی ترجمانی کی ہے تم نے۔“ وہ ہنستی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی، مول نے اسے گھورا تھا ڈھٹائی پر۔

”بھئی! میرے خیال میں لڑکیوں کا پڑھنا اس حد تک درست ہے کہ وہ رسالے پڑھ سکیں، نیٹ پر چٹنگ کر سکیں اور تھوڑی بہت الٹی، سیدھی انگلش بول کر اپنی فرینڈز کو امپریس کر سکیں، یہ اتنی بڑی بڑی ڈگریز لے کر بھی ہم لڑکیوں کو وہی چولہا، ہانڈی وغیرہ کرنا ہوتا ہے۔“  
”ضروری نہیں ہے، اس دور میں ایجوکیشن ضروری ہے، چولہا ہانڈی کے لیے ملازم انورڈیکے جاسکتے ہیں یا کسی بھی ہوٹل سے ضرورت پوری کی جاسکتی ہے مگر تعلیم آپ خرید نہیں سکتے، اسے حاصل کرنا پڑتا ہے۔“

”ہمارے ہاں ایسی کسی عیاشی کا تصور ہی حماقت ہے، منھی بچی، ہمارے مردوں کا پیٹ گھر کی خواتین کے ہاتھوں سے کپے کھانوں سے ہی بھرتا ہے، کبھی کبھی ہی من کا ذائقہ بدلنے باہر نکلتے ہیں۔“ زویا نے توجہ پریش کی۔

”بڑی اماں! تمہیں کون سا سدا اسی گھر میں رہنا ہے۔“ مول نے خمی بچی پر چڑ کر اسے بڑی اماں کے لقب سے پکارا، حورین کھٹکھٹا کر ہنس پڑی تھی۔

”مجھے تو اس گھر سے باہر جانے کے چانس نظر نہیں آتے۔“

”اوہ..... کیا ارادے ہیں؟“ حورین نے شوخی سے پھینڑا۔

”مجھے نیک نظر نہیں آتے۔“ مول نے کہا، تینوں ہنس پڑیں۔

”بزرگوں کی نظریں مجھے آج کل کچھ گڑ بڑ لگ رہی ہیں۔“ زویا نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

”بزرگوں کی نظریں یا کسی اور کی نیت؟“

”جیس فرینڈز! کسی نے ایسی نظر سے دیکھا ہی نہیں تو“ نیت“ کیسے معلوم ہوگی۔“ زویا مسکرا کر گویا ہوئی تھی۔

”خواہ مخواہ سانس کری ایٹ کرنے کی، کام کوشش کرتی ہو، تم بتاؤ حورین! کل یونیورسٹی میں کیا ہوا تھا؟“

”بتایا تو تھا، کتنی مہربان ہوئی۔“

”یہ بتاؤ، حیدر وہاں تھا یا تمہاری خاطر زکا تھا، جہاں تک میرا خیال ہے وہ ڈوالنون بھائی کی پرچمائیں ہے، کبھی بھی ہم نے اسے

ان کے بغیر نہیں دیکھا تو کل کیا وہ ان کے ساتھ نہیں تھے؟“ وہ دونوں ہی تجسس تھیں، کل سے اب تک کئی بار اسے کریدنے کی سعی کر رہی تھیں۔

”تو پھر اس سٹوڈنٹ کے ساتھ اس“ بھائی“ کا دم چھلے لگانے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ بڑبڑائی۔

”ضرورت ہے، ڈوالنون بھائی کی پرستائی ہے ہی اتنی گریس فل کہ بندہ خود ہی احترام کرنے لگتا ہے۔“ مول نے کہا۔

”ہونہ، ال منرف، جاہل، ڈونیا بھری بے حسی ہے اس میں۔“ ڈوالنون کی تعریف پر وہ سٹخ پا ہو کر گویا ہوئی تھی۔

”ارے رے..... ایسا کیا کر دیا اب انہوں نے؟“ زویا سخت حیران تھی۔

”میں کل جو زندہ نکل کر وہاں سے آئی ہوں تو اس میں حیدر کی کوشش تھی، وہ مجھے لائبریری سے لے کر آیا، حالانکہ اس کی حالت

بہت دیک تھی، بہت انجڑ تھا وہ، مگر پھر بھی اس نے میری خاطر اسٹریگل کی، مجھے مشکلوں سے وہاں سے نکالا، تم تو جانتی ہو مجھے بلڈ سے کس

قدر خوف محسوس ہوتا ہے، حیدر کو خون میں دیکھ کر میرے حواس گم ہو رہے تھے۔ مزید اسے دیکھ کر تو میں بُری طرح بدحواس ہو گئی تھی۔“

”کیوں..... کیا وہ بھی انجڑ تھے؟“ زویا چونک کر گویا ہوئی۔

”شاید..... کیونکہ اس کی وہاٹ شرٹ خون سے ریڑھ ہو رہی تھی۔“

”اوہ! اس کا مطلب ہے وہ بھی اس جھگڑے کی زد میں آئے ہیں۔“ زویا کی تجسس آمیز طبیعت پارے کی طرح متحرک تھی۔

”یقیناً تمہیں وہاں سے نکالنے کے چکر میں وہ انجڑ ہوئے ہوں گے۔“

”مجھے نکالنے کے چکر میں خواہ مخواہ، اس کا اپنا ہی کوئی چکر ہوگا۔“ حورین جھنرے سے گویا ہوئی تھی۔

”تم ان کی طرف سے ہمیشہ بدگمانی میں مبتلا رہتی ہو، وہ نہ سے نہیں ہیں، وہ اگر تمہاری مدد نہیں کرتے تو تم کس طرح وہاں سے نکل پاتیں؟“ مول ذوالنون کی سائیڈ لیتے ہوئے بولی۔

”اس نے میری کوئی مدد نہیں کی، حیدر کی وجہ سے میں باہر آئی ہوں۔“ وہ کسی طور ماننے کو تیار نہ تھی۔

”حیدر نے ان کی بیک پر ہی تمہاری سپورٹ کی، اگر ان کی منشاء نہ ہوتی تو حیدر تمہاری ہیلب کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔“

زویا بھی مول کی طرح ذوالنون کی سائیڈ لے رہی تھی، اس کے حسین چہرے کی فراخ پیشانی پر ٹکٹوں کے جال بن گئے تھے، آنکھوں سے ناگواری عیاں تھی۔

”تم جب اس شخص کی حمایت لیتی ہو، مجھے سخت برا لگتا ہے۔“

”ہم ان کی حمایت نہیں لے رہے، تم مانڈ مت کرو۔“

مول اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر نرمی سے گویا ہوئی۔

”یہ تو وہی انداز ہوا کہ کسی کے گلے پر چھری رکھ کر کہو، ہم تمہارے گلے پر چھری پھیر رہے ہیں، پلیز تکلیف محسوس مت کرنا۔“ اس کے جلے کے انداز پر دونوں ہنس پڑی تھیں، پھر مول اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لگاؤٹ بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

”یو ڈونٹ نو مائی سوئیٹ فرینڈ اتم سے زیادہ ہمیں کوئی عزیز نہیں ہے۔“

تمہارے لیے یہ خوب صورت قطعہ عرض ہے۔

نئے دور کے نئے خواب ہیں، نئے موسموں کے گلاب ہیں

یہ مجھوں کے چراغ ہیں، انہیں نظرتوں کی ہواندے

ذرا دیکھ چاند کی چٹیوں نے بکھر بکھر کر تمام شب

تیرا نام لکھا ہے ریت پر کوئی لہر آ کے مٹانے دے

”مجھے تمہاری ایسی باتیں امپریس نہیں کر سکتی ہیں انڈرا شینڈ؟“ وہ ہونٹوں تلے مسکراہٹ دبا کر مصنوعی غصے سے بولی۔

”او کے..... او کے مادام اسکی اور کاغذ ہم پر نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا مطلب یہ تھا کہ تم ہماری باتوں کو مانڈ کیے بنا

یہ بتا دو کہ بے چارے ذوالنون بھائی سے اب کیا خطا ہو گئی جو تم ان کو ایسے نمز سے پکار رہی ہو جو ان پر سوٹ نہیں کر رہے ہیں۔“

”یس پر فیکٹ، تم بھند ہو کہ حیدر نے تمہاری ہیلب کی ہے تو اس کی پیچھے بھی ذوالنون کی ذات ہے۔“ زویا نے بھی مول کی تائیدی کی۔

”تمہارا وہ ”بھائی“ حیدر سے کہہ رہا تھا، یہ وہ ہمدردی ہے جو گلے پڑتی ہے۔ حیدر نے آہستہ سے کہا کہ یارا خیال کروہ سن رہی

ہے تو موصوف کہنے لگے، سنی ہے تو سن لے، اٹ اٹاٹ مائی ہیڈک۔“ وہ غصے میں اس کی نقل اُتارتی چلی گئی۔

”کوئی گھٹیا سے گھٹیا شخص بھی اس طرح کسی گرل کی انسٹ نہیں کرتا ہے۔ اس شخص کو تو لگتا ہے انسانیت چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔“

”او کے کھنڈ کرتے ہیں اس صحیفہ کو، ابھی ہمارے پاس ایکسٹرانائم ہے اور میں چاہتی ہوں اس نائم کو خوب انجوائے کرتے ہیں، بہت دن ہو گئے ہم نے کوئی پنک کا پروگرام نہیں بنایا ہے، کیوں نہ شان داری پنک منائی جائے؟“ زویا نے یکنف ہی موضوع بدل کر پُر جوش انداز میں کہا۔

”ہوں..... ہوں، کیوں نہیں، بی بی جان سے اجازت کون لے گا؟“

”حورین کس مرض کی دوا ہے، یہ لے گی اجازت۔“

”میں..... نہ..... نہ مجھے ڈر لگتا ہے بی بی جان کی فنگل سے۔“

”فضول ہی لگتا ہے، بی بی جان جتنی اہمیت تمہاری باتوں کو دیتی ہیں، اتنی کسی اور کو نہیں، تم کہہ کر تو دیکھو، انکار نہیں کریں گی۔“ زویا نے ہمت بڑھائی۔

☆.....☆.....☆

بے خبر لوٹ کر سوائے ہیں وہ نیندیں میری

جذبہ دل پر ترس کھانے کو جی چاہتا ہے

کب سے خاموش ہوا ہے جان جہاں کچھ تو یلو

کیا ابھی اور تھم ڈھانے کو دل چاہتا ہے

ہریرہ طہیث عاشقی کے انداز میں گنگنا تا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

”پہلے نام لینے سے حاضر ہوتے تھے، اب بتانا م سے ہی حاضر ہو جاتے ہو، اتنی خباثت بڑھ گئی تمہاری۔“ حورین نے جل کر کہا۔

”کیا کریں پر دوشن تو ملتی تھی۔ آخر تم سے رشتے داری جو بڑھ گئی ہے۔“ وہ بھی ہریرہ تھا، لا جواب ہونا جس نے سیکھا نہ تھا۔

”مجھ سے کون سی رشتے داری بڑھ گئی ہے تمہاری؟“

”یاد کرو..... کل یہی وقت تھا اور ایسا ہی موسم جب میں کار کسی سپر اسٹار ہیرو کی طرح دوڑتا ہوا یونیورسٹی پہنچا تھا جہاں تم اس

نو جوان کے ساتھ ڈری، سبھی کھڑی تھیں اور پھر مجھے دیکھ کر میری طرف اس محبت سے بڑھیں..... جیسے..... جیسے.....“

”کوئی بے بی اپنے پیار کی طرف بڑھتی ہے۔“ وہی نکلا لگا تا ہوا اندر داخل ہوا تھا، وہ تینوں کھٹکھٹا کر ہنس پڑی تھیں۔

”یار! دل تو چاہ رہا ہے تجھے ایسی بدو عا دوں کہ ساری زندگی یاد کرنے۔“

”میں بنا بدو عا کے بھی ساری زندگی تمہیں یاد کروں گا۔“

”وہی! پلیز خاموش رہو، ہریرہ کل کی بات سنار ہے ہیں۔“ زویا نے ٹھک کر اسے چپ رہنے کو کہا۔

”ہاں..... کل میں یونیورسٹی گیا تو موسم بڑا سہانا تھا، اُیر آلود تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں نمی تھی، درختوں میں کوئل کوک رہی تھی، ہادل

برسنے کو تیار، ماحول میں خواب ناک مرگئی اندھیرا.....“

”شٹ آپ، جسٹ شٹ آپ“۔ حورین چبکی۔

”ہریرہ بھائی! گپ مارنے کی نہیں ہو رہی ہے، سچ سچ بتائیں“۔ مول مسکراتے ہوئے اصرار کرنے لگی۔

”اچھا..... لیکن تم کیوں ناراض ہو رہی ہو؟“

”تمہاری اس بکو اس سے مجھے چڑ ہے۔“

”مگر مجھے تمہارا کل میرے شانے پر سر رکھ کر رونا بہت اچھا لگا ہے۔ میری کھلی آفر ہے جب بھی تمہیں رونا ہو، یہ شانہ حاضر ہے۔“

”کل..... کل تو میں بہت ڈر گئی تھی اس لیے.....“

”میری دعا ہے تمہیں ایسا ڈر ہر وقت لگے۔“ وہ مسکرایا۔

”ہونہہ، تم ایسی تمنا نہیں لے کر ہی مر جانا۔“

”میں نے تم کم ایسی محبت دیکھی ہے۔“ وہی کھڑے ہوتے ہوئے گویا ہوا۔

”ہم جیسی محبت؟“ ہریرہ فخریہ انداز میں گویا ہوا۔

”ہاں..... اس دور میں بھلا کون بھائی اپنی بہن سے ایسی محبت.....“ اس کی بات ادھوری رہ گئی، ہریرہ اس کی طرف بڑھا تھا، وہ

پہلے سے ہوشیار تھا، اسے پاس آتے دیکھ کر وہ بھاگا تو ہریرہ بھی پیچھے بھاگا تھا۔

”شس کم جہاں پاک“۔ حورین نے ہڈ سکون انداز میں کہا۔

☆.....☆.....☆

رستے بھر رو کر ہم سے پوچھا دل کے چھالوں نے

بستی کتنی دور بسالی دل میں بسنے والوں نے

کون ہمارا درد پڑھے گا ان زخمی دیواروں پر

اپنا اپنا نام لکھا ہے سارے رونے والوں نے

دل کا ثمن سے رشتہ کیا ہے؟ عشق کا حاصل آنسو کیوں؟

ہم کو کتنا زہر پلایا ان بے درد سوالوں نے

”ان غلاؤں میں کچھ رو یافت نہیں کر پاؤ گے، واپس آ جاؤ۔“ پروفیسر آفتاب حسن نے اس کی جانب دیکھ کر کہا تو وہ گہرا سانس

لے کر بیٹھ گیا۔

”سر! کسی اور کو بھی انوائٹ کیا ہے آپ نے؟“

”ہاں، حیدرہ، مامون، صفدر نے آنے کی ہامی بھری ہے زویا، مول اور حورین بھی آئیں گی، میری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ تمام طلباء و طالبات آئیں مگر لوگ آج کل میوزک مستی، ہلہ گنگناج گانے والی پارٹیز میں جانا پسند کرتے ہیں یہاں ہونے والی روکی پھینکی محفل میں انہیں کوئی چارم، کوئی اٹریکشن فیل نہیں ہوتی وہ نہیں آتے۔“

”وہ اپنے مخصوص مشفقانہ نرم انداز میں بات کر رہے تھے۔“

”آپ افسردہ نہ ہوں سراجراغ سے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ جب ہم چلیں ہیں تو کارواں تین ہی جائے گا۔ اچھائی کی روشنی دیر سے پھیلتی ہے مگر ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ مسرت سے جھوم اٹھے تھے۔

”جھینکس جگ من! جب آپ جیسے جوان عزم و اہل حوصلے والے لوگ میرے ساتھ ہیں تو مجھے کوئی اندیشہ ناکامی نہیں ہے۔“

”جھینک سر! آپ ہمیں اپنے ساتھ ہی پائیں گے۔“

”انشاء اللہ، میں ذرا ہاتھ لے کر آ رہا ہوں، تب تک اگر کوئی گیٹ آجائے تو ریسو کیجئے گا۔“ وہ کہہ کر بیڈروم کی طرف بڑھ گئے، وہ پھیل پر رکھے نوزہیے زپڑھنے لگا تھا، کچھ دیر بعد کال بکل ہوئی تھی۔

اس نے گیٹ کھولا تو سیدھی نکا ہیں اس کی نگاہوں سے نکرائی تھیں جو کچھ کنفیوزی ہو گئی تھیں اسے وہاں دیکھ کر۔

”سر! آفتاب حسن ہیں؟“ جارحٹ کے وہائٹ سوٹ میں جس پر لائٹ اینڈ ڈارک پنک گلر کی کڑھائی میں ہمرنگ ستارے موتی چمک رہے تھے، پنک نازک سی جیولری میں سادہ فریش چہرے سے وہ چاند کی طرح اجلی اجلی اور انگریز لگ رہی تھی۔

”میں نے پوچھا ہے آپ سے، سر آفتاب حسن ہیں؟“ اسے خاموشی سے کھڑے دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر گویا ہوئی، اس کے انداز میں بے اعتمادی تھی، ایک تو وہ اس کے راستہ دینے کے باوجود اندر نہ آئی، دوسرے پیچھے ہٹ کر جو اس نے بے اعتمادی کا تاثر چھوڑا تھا، اس نے ڈالٹون کا دماغ پوری طرح کھولا ڈالا، جو اب اس نے دروازہ زوردار آواز سے بند کر دیا۔



دھاڑ سے بند ہونے والے دروازے کی صدا پیچھے آنے والی مول اور زویا نے بھی سنی تھی، وہ حیرانی سے دروازے اور اس کی جانب دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے پر شرمندگی اور غصے کی سرخی چھاری تھی۔

”کیا ہوا؟ یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے؟“ زویا نے پوچھا۔

”وہ جانور ہے، میں جا رہی ہوں۔“ وہ شدید غصے میں واپس مڑی تھی، وہ دونوں حیران و پریشان سی اس کے پیچھے تھیں۔

”کیا ہوا تھا ابھی؟ وہ آواز کیسی تھی؟“ سر آفتاب حسن نے وہاں آ کر دریافت کیا، وہ دروازے کی زوردار آواز سن کر بوکھلا کر آئے تھے۔

”آپ کے گیٹ ہیں باہر سر!“ وہ اپنے اندر اچھلتے اشتعال پر قابو پانے کی جدوجہد میں ان سے مخاطب ہوا۔

”میرے گیٹ!“ انہوں نے ڈالٹون کی طرف دیکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ اس کی ذہین آنکھیں متحجب انداز میں اس کی بدلی

ہوئی کیفیت کو کھوج رہی تھیں، کچھ دیر قبل وہ بہت مطمئن و مسرور نظر آ رہا تھا، اب اس کے چہرے پر تناؤ و جھجلاہٹ واضح تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے، کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اس کے حراج کے خلاف ہوئی ہے، ایسا کیا ہوا ہے؟ وہ سوچتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے، اسی لمحے یقیناً ان کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ذوالنون نے جس گیٹ کا نام لینے سے گریز کیا تھا، اس کا بڑا موڈ وہ گیٹ کہیں حورین تو نہیں ہے؟ اس خیال کے آتے ہی وہ گیٹ کھول کر باہر نکلے تھے، وہاں ان کا چھوٹا سالان خالی تھا، وہ پارکنگ لاٹ کی طرف گئے تو وہاں حورین، مول اور ذویا کو کھڑے پایا۔ حورین کے چہرے کی غیر معمولی سرخی دور سے نظر آ رہی تھی۔ ساتھ کھڑی مول اور ذویا سے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ مسلسل لٹی میں سر ہلا رہی تھی۔

”السلام علیکم سر!“ وہ قریب پہنچے تو تینوں نے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام! یہ آپ لوگ یہاں کیوں کھڑی ہیں، اندر آئیں۔“ انہوں نے مشتاقانہ انداز میں سلام کا جواب دے کر کہا تھا۔

”سر یہ حورین.....“

”سرا! چانک ہی میرے سر میں درد ہونے لگا ہے، آٹم سو ری سرا میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے مول کی بات قطع کر کے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، آپ یہاں آ کر یہیں سے واپس چلی جائیں، اندر چلیں، وہاں حرے وار چائے پیئیں گے، بھاگ جائے گا سرور۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے سرور کو کامل پیش کیا مگر حورین کسی صورت اب ذوالنون کا سامنا کرنے کو تیار نہ تھی۔

”میں ٹیکسٹ ٹائم ضرور جوائن کروں گی سرا! ابھی تو پلیز جانے دیں، میں نے شو فر کو کال کر دی ہے، ابھی وہ راستے میں تھا، واپس آ رہا ہے۔“

”پروفیسر آفتاب حسن کی اس سے بڑھ کر انسٹ کیا ہوگی کہ کوئی مہمان آ کر دروازے سے ہی واپس لوٹ جائے، کیا ہم آپ کو ایک کپ چائے پلانے کے بھی قابل نہیں ہیں؟“ اس نے تالائق صربان ہیں ہم؟“

انہوں نے جذباتی انداز میں کہا، حسب توقع وہ ان کے دباؤ میں آ گئی تھی۔

”پلیز سرا! ایسا مت کہیں، آپ بہت گریٹ ہیں سر۔“ انہیں ناراض دیکھ کر حورین اپنی خشکی بھول کر گویا ہوئی، اس کا ساتھ ان دونوں نے بھی دیا۔

”سرا! ہم سب یہاں آئے ہیں آپ کے پاس، اس سے بڑھ کر آپ کی قابلیت اور تالائق ہونے کی کیا دلیل ہو سکتی ہے؟“ ذویا نے کہا۔

”اور رہی بات چائے پینے کی تو ہم صرف چائے نہیں پیئیں گے، چائے کے ساتھ سمو سے اسٹ بھی کھائیں گے۔“ مول نے خواہش ظاہر کی۔

”چلیں سرا! میں نے شو فر کو منع کر دیا ہے۔“ حورین سیل آف کر کے پرس میں رکھتی ہوئی بولی، وہ تینوں ان کے پیچھے اندر داخل ہوئی تھیں۔

مول اور زویا، ذوالنون سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگی تھیں، وہ آکر صہیل کے صوفے پر بیٹھ گئی، کوشش کے باوجود اپنے چہرے پر آئے کیسے گی کے تاثرات چھپانے لگی تھی۔

سر آفتاب انہیں یہاں بٹھا کر نہ معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مول اور زویا ذوالنون کے ساتھ باتیں کرنے میں ایسی سگن ہوئی تھیں کہ اس کی یہاں موجودگی کو گویا فراموش کر چکی تھیں۔

ذوالنون کی اس حرکت سے وہ پہلے ہی تپتی ہوئی تھی اور اس طرح ان کا اسے نظر انداز کر کے اس کیلئے انسان کے ساتھ باتیں بنانا نئی طرح کھول رہا تھا، جبکہ وہ انہیں اس کے نامناسب طرز عمل کے متعلق بتا چکی تھی، جسے سن کر انہوں نے اس کے فطرتاً عمل کو برا کہا تھا اور اب اس کے معمولی سے لٹ کر وانے پر سب بھول کر اس سے باتیں کر رہی تھیں، حورین کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ قصداً اسے جلانے کے لیے ان سے باتیں کر رہا ہے۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“ سر آفتاب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ان تینوں سے گویا ہوئے، پھر حورین کو تنہا بیٹھا دیکھ کر گویا ہوئے۔ حورین آپ وہاں تنہا کیوں بیٹھی ہیں، یہاں آئیں۔“

سر آفتاب نے اس سے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو انہوں نے اس کے لیے اسی سینٹر صوفے پر جگہ بنائی تھی، جس کے ایک سائیڈ وہ بیٹھا تھا، جس کی موجودگی اسے ایک آنکھ نہ بھار رہی تھی مگر اسے مجبوراً بیٹھنا پڑا تھا۔ سر خود درمیان میں بیٹھ گئے تھے۔

”آپ کہاں غائب ہو گئے تھے سر؟“ زویا نے کہا۔

”چائے تیار کرنے کے لیے رکھ کر آیا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”وہاٹ! آپ خود سر۔“ مول حورین سے گویا ہوئی۔

”نہیں، کوکنگ تو ویسے بھی زیادہ تر میں خود ہی کرتا ہوں، باقی دوسرے کاموں کے لیے بخشو ہوتا ہے، پھر دو افراد کے لیے کوکنگ ہوتی ہی کتنی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص شیشا نہ ملاحت بھرے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”آج اتفاقاً بخشو اپنے دوست سے ملنے گیا تو وہاں دیر ہو گئی ہے اسے، ورنہ جب مہمان آتے ہیں تو کچن کی ذمہ داری وہی سنبھالتا ہے۔“

”سر الیڈیز کی موجودگی میں آپ کچن مین ٹین کریں، میں اس سے ایگری نہیں کرتا۔“ ذوالنون نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”جی سر! بالکل درست بات کہہ رہے ہیں۔“ زویا اور مول نے گردن بھی زہان کے ساتھ ساتھ ہلائی تھی۔

”اٹس اوکے مائی چلڈرن! یہ چائے اکوشلی حورین کے لیے ہے۔ یہ ہم سے ملے بنائی واپس جا رہی تھیں، سر میں درد کی وجہ سے۔“ ان کے انداز میں بڑی اپنائیت تھی، ایسی ہی جیسے کسی باپ کے لہجے میں اپنے بچوں کے لیے ہوتی ہے، حورین شرمندہ سی ہو گئی، وہ ان سے پھر معذرت کرنا چاہ رہی تھی، معاس کی نگاہ اس کی جانب اٹھی تھی جو کُن اکھیوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا، اس کی سرسختی مقرر



آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی، لبوں پر مبہم استہزائیہ مسکراہٹ۔

اس کے اندر لہو کی کھولن شرارے بن کر دوڑنے لگی اور شدت سے دل چاہنے لگا کہ اس کے تھپڑ لگائے کہ چہرے کا رنگ اس کی ٹی شرٹ کے کھڑکی طرح ریڈ ہو جائے اور آنکھیں فیروز ڈبلب کی طرح بے نور نظر آئیں۔

”جھینکس سرا جو آپ آگئے تھے اگر میں چلی جاتی تو آپ کی گریس فل کمپنی سے محروم رہنے کا افسوس رہتا، بعض اوقات ہم اپنے راستے میں آنے والے کانٹوں سے نہچنے کے لیے راستہ بدل لیتے ہیں اور انجانے میں نقصان کر بیٹھتے ہیں، اگر ہم ایسوشل نہ ہو جائیں تو ایک ٹھوکرے سے وہ خار ہٹ سکتے ہیں۔ بات ہے ہماری جذباتیت کے آڈٹ آف کنٹرول ہونے کی۔“

اس کے ذوق منی لہجے میں گہری کاٹ تھی، ذوالنون نے پہلو بدلا تھا۔

”سرا! میں چاہوں گی ہماری آج کی محفل کا فرسٹ سبجیکٹ ”گڈ مینرز“ ہونا چاہیے۔ اکیچے ٹیلی سرا! گڈ مینرز سے ہماری پرستاشی کی شناخت ہوتی ہے۔ ذوالنون کے چہرے پر چھائی کچھ لمبے قیل کی ریشاش و طمانیت، ناگواری اور شگھی میں بدلنے لگی تھی، ہر بار وہ اس کے اعزازوں سے بڑھ کر ثابت ہوتی تھی، اس سے قیل اس نے کسی لڑکی کو اپنے خلاف نہیں پایا تھا، اس کو دیکھ کر بڑی سے بڑی گھمنڈی و طرحدار لڑکی موسم کے سانچے میں ڈھل جاتی تھی، اس کی بہنڈھی، بجاقتنا کی بے عزتی کو کسی اعزاز کی طرح سمیٹتی تھیں، کبھی کسی کے منہ سے لفظ شکوہ نہ نکلتا تھا۔ اس سر بھری لڑکی نے صحیح مستوں میں اسے چوٹا دیا تھا۔

اب بھی وہ براہ راست اس کو ٹارگٹ بنائے نظکوں سے اچک کر رہی تھی۔ وہ اس سے کزور نہ تھا، ہر حملے کا بھرپور جواب دینا جانتا تھا مگر پہلے بھی ایک مرتبہ وہ اس لڑکی کی وجہ سے سر آفتاب کے سامنے کنفیوز ہوا تھا۔ اب دوبارہ ایسا ہرگز نہ چاہتا تھا، سو برداشت کر گیا۔ حیدر، ماسون اور تو صیف بھی آگئے، رود اور شمرین کے آنے کے بعد وہاں ایک ہفتے قیل ہونے والے جامعہ میں ہنگامے کے متعلق باتیں ہونے لگی تھیں۔

چائے کے ساتھ سر آفتاب نے خاصا انتظام کر رکھا تھا۔ ان پانچوں نے فل کر لاؤنج میں بچھے کارپٹ پر دسترخوان لگا کر چائے اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔ وہ سب کھانے پینے کے دوران ہلکی پھلکی باتوں میں مگن تھے۔ سر آفتاب بار بار اچھے میزبان کی طرح انہیں کچھ نہ کچھ پیش کر رہے تھے۔

”حورین! تمہارا موڈ کیوں آف ہے؟“ شمرین نے سمو سے پرکچپ ڈالنے ہوئے سرگوشی میں حورین سے دریافت کیا۔

”میرا موڈ کیوں آف ہونے لگا۔“ وہ تھرا ماس میں سے چائے نکالتی ہوئی سپاٹ انداز میں گویا ہوئی، لیکن میں سامان کی سیٹنگ کے دوران موٹل اور زویا ان دونوں کو تمام باتوں سے آگاہ کر چکی تھیں، موٹل وزویا کا خیال تھا اس نے جو میمزز کی بات کر کے صرف ذوالنون کو نشانہ بنایا تھا، وہ اس کا طرز عمل درست نہیں تھا۔ شمرین اور روانے بھی ان کی بات کی تائید کی تھی۔

وہ چاروں جو اس سے دوستی و محبت کا دم بھرتی تھیں، ذوالنون سے لٹ ملنے کے بعد سے اس سے دور ہوتی جا رہی تھیں، کل وہ اس کے ساتھ تھیں، آج اس شخص کی طرف داری میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتی تھیں، سب کچھ جاننے کے باوجود شمرین کا سوال اسے جلا گیا تھا۔

”کچھ بھی کہو تمہارا بی بیو میٹر نارمل نہیں ہے۔“ روانے سمجھایا۔

”معلومات فراہم کرنے کا شکریہ۔“ کہہ کر وہ رُک نہیں، چائے کا کپ لے کر ٹیس پر آگئی جہاں تازہ و شفاف ہوانے اس کا

استقبال کیا تھا۔

سر آفتاب حسن کا یہ چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ شہر کے بنگلوں سے دور، اس مضافاتی علاقے میں تھا جہاں آبادی برائے نام تھی، یہاں درختوں اور پہاڑوں کے درمیان اُگی جھاڑیوں، جنگلی پھول و پودوں نے ہر بھرا بھل بنا ڈالا تھا، ماحول میں ایک بڑے سکون خاموشی اُتر آئی تھی۔ وہ وہاں رکھی چیز پر بیٹھ کر دور سر کی پہاڑ کے عقب میں آہستہ آہستہ گم ہوتے سورج کے سرخ قہال کو دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو حورین صاحب! ہاؤ آریو؟“ حیدر اس کی طرف آ کر بولا۔

”قائمن، آپ بتائیں کیسے ہیں؟“ پہلی بار اس کے لہجے میں حیدر کے لیے عزت و نرمی پیدا ہوئی تھی۔

”اللہ کا بڑا کریم ہے، بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا، اس نے بھی حورین کی خوش مزاجی کو

محسوس کیا تھا۔

”اس دن تمہیں کافی چائے آئی تھی، وہ ٹھیک ہو گئیں؟“

”جی، اب تو بہت بہتر ہوں، چند دن تکلیف رہی تھی۔“

”خصوصاً مجھے آپ کو شکریہ کہنا تھا، اگر آپ اس دن میری مدد نہ کرتے تو..... نہ معلوم کیا ہوتا؟“ اس کے انداز میں صداقت تھی۔

”وہ میرا فرض تھا، پریشانی اطلاع دے کر نہیں آتی مگر ہماری گہری نگاہیں روکی اور اس کے ساتھیوں کی نقل و حرکت پر تھیں، بہت

مرحبہ اس نے ہم کو بھڑکانا چاہا تھا، اگر ذوالنون کی رہنمائی ہمیں میسر نہ ہوتی تو یہ بنگلہ بہت پہلے ہو چکا ہوتا۔“

”حیرت ہے، روکی تو بہت منکر المزاج آدمی ہے، میری اکثر اس سے گفتگو ہوتی رہی ہے، وہ بہت نرم لہجے میں بات کرتا ہے۔“

”اب میں کیا کہوں، سب آپ کے سامنے ہے، دراصل جو لوگ ڈبل مائنڈ ہوتے ہیں، وہ ہری شخصیت کے لوگ! وہ ہمیشہ اپنا

بھیا تک چہرہ ماسک میں چھپا کر رکھتے ہیں جو ایسے وقت ماسک سے باہر آتا ہے، آپ ایسے لوگوں کے لیے ہاتھی والی کہادت دے سکتی

ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”ہاتھی والی مثال..... کیا؟“

”میری امی اکثر دیتی ہیں یہ مثال کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔“ اس کے انداز پر وہ قہقہہ لگا کر گویا ہوا۔

”سوری، مجھے مثالیں یاد نہیں رہیں۔“ وہ بھی مسکرائی تھی۔

”حیدر! چل رہے ہو؟“ ذوالنون بولا ہوا اس طرف آیا تھا، وہاں حورین کو بیٹھا دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے

تھے۔ یہی حال حورین کا ہوا تھا، اس کی مسکراہٹ یکثرت غائب ہوئی تھی، حیدر کی حساس نگاہوں نے فوراً ہی معاملہ بھانپ لیا تھا۔

”بیٹھونا چلتے ہیں ابھی“۔ اس نے چیز کی طرف اشارہ کیا۔

”میں جا رہا ہوں، تم آتے رہنا“۔ وہ اس کی ہائیکش نظر انداز کر کے سر آفتاب کے روم کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

”کچھ ایٹنی کنٹنس، میئر ز آپ اپنے فرینڈ کو بھی سکھائیے“۔ وہ جان کر تیز لہجے میں گویا ہوئی جس کو ذوالنون نے بخوبی سنا، وہ پلٹ

کر جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ سر آفتاب اسی ساعت کمرے سے نکلے تھے۔ اس نے اجازت لی تو حیدر بھی وہاں چلا آیا تھا۔ وہ مامون کی کار

میں آیا تھا، اب اسے معلوم تھا شرمین اور ردا کی موجودگی میں وہ جانے والے نہیں تھے، اس لیے وہ پہلے ہی ذوالنون سے کہہ چکا تھا۔

”آج تو سارا ناٹم باتوں میں گزر گیا یا ایک دوسرے کے انتظار میں، اگلی بار سب ناٹم پر آئیں گے تو محفل جھے گی، تم آج یقیناً

سب سے پہلے آگئے ہو گے“۔ حیدر نے کارڈ رائٹ کر کے ذوالنون سے پوچھا۔

”ہاں“۔

”حورین، ردا اور موہل کب آئی تھیں؟“

”میرے بعد“۔

”سر آفتاب بھی کمال ہیں، پتھر کو موم بنانا چاہتے ہیں، کچھ عرصہ قبل حورین ہم سے اپنی پرچھائی بھی پچاتی تھی، آج سر کی بدولت

وہ ہم میں سے ہیں، ہم سے بات کرتی ہیں، ہمارے درمیان پشیمتی ہیں“۔

”تم اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو، وہ زمین کی ہی مخلوق ہے کوئی آسمان سے اتری ہوئی نہیں ہے“۔ حورین کے بار بار ڈر کر پر وہ

اپنی کبیرگی مزید پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

”تم یا ران کے نام پر انکارے کیوں چپانے لگتے ہو“۔

”پھر کیا پھول برساؤں؟“ وہ ترشی سے گویا ہوا۔

”میرے خیال میں تمہیں اب اپنا رویہ تبدیل کرنا چاہیے“۔

”میرے خیال میں مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا ہے کہ ایک بددماغ اور کم عقل لڑکی کے لیے اپنا رویہ بدلوں“۔

”بات ایسی نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو اور ویسے بھی.....“

”پلیز میں اس نا پاک پر کوئی بکو اس سننا نہیں چاہتا“۔

اس کے سنجیدہ لہجے میں وہ مخصوص قطعیت تھی جو مقابل کو جرح کا موقع نہ دیتی تھی۔

☆.....☆.....☆

منال، فاقہ بیگم کے ساتھ پارٹی سے لوٹی تھیں، ملازمہ نے آکر اطلاع دی کہ راحیلہ بیگم کا فون آیا تھا، کچھ دیر بعد وہ کال بیک

کریں گی۔

”اوہ، کیسے یاد آگئی آپ کی ان کو؟“ فائقہ بیگم ڈریس چھینج کر کے آتے ہوئے بولیں، منال بھی ٹائٹ ڈریس بدل چکی تھیں۔  
 ”یونوما! یاد تو ہماری ان کے دل میں دھڑکن کی طرح رہتی ہے، مگر ہم لٹ ہی نہیں دیتے تو وہ جھجکتی ہیں، ورنہ رات دن فرصت نہ ہو، ہمیں ان کی محبت والفت کے سمندر میں غوطہ زن رہنے سے۔“

وہ ہالوں میں اٹھلیاں پھیرتی ہوئی ادائے بے نیازی سے گویا تھیں۔

”کوئی توجہ ہوگی کال کرنے کی۔“ وہ ہڈتجسس انداز میں گویا ہوئیں۔

”بس، کوئی نہ کوئی ایپورٹینج ہے ورنہ ان کی ہمت کہاں ہوتی ہے، بلاوجہ کال کرنے کی، کوئی پروگرام ہوگا جس میں انوائٹ کرنا چاہ رہی ہوں گی۔ ان کے ساتھ بھی پرائیلم ہے، کوئی بھی مسئلہ ہو، سب سے پہلے وہ میری طرف ہی دوڑتی ہیں کہ گھر کی بڑی بہو ہوں، میری مرضی کے بنا کوئی کام نہیں ہو سکتا، عجیب لوگ ہیں وہ ماما! کتنی بار ان کی انسلٹ کر چکی ہوں مگر ہر بار وہ سب بھلا کر آ جاتے ہیں۔“

”ان کے آنے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جس سے رشتہ جوڑا ہے وہ آئے تب بات ہے، ورنہ سب دکھاوا ہے، جھوٹ ہے۔“  
 ہمیشہ کی طرح فائقہ بیگم نے انہیں سرالیوں سے خطر کیا تھا۔ فائقہ وہ عورت تھی جو سسرال سے وابستہ ہر شے کو ٹھوکر لگاتی آئی تھیں، نہ انہوں نے اپنی ساس کی عزت و قدر کی، نہ کوئی احترام بخشا اور ایسی ہی تربیت وہ بیٹی کی کرتی آئی تھیں، یہی وجہ تھی کہ منال ان لوگوں کو ذرا بھی وقت دینے کو تیار نہ تھیں، حالانکہ ان کا بہترین رویہ کبھی کبھی ان کے ضمیر کو گھنور دیتا تھا اور ضمیر کے بیدار ہونے سے قبل ہی فائقہ بیگم یا ان کے اندر موجود ان کے خلاف نفرت ہر اچھے احساس و جذبات کو ختم نہ لینے دیتے تھے۔

ملازمہ فون لے آئی تھی، دوسری طرف راجیلہ بیگم تھیں۔

”جی فرمائیے؟“ ان کے لہجے میں سرد مہری و کمر دراپن موجود تھا۔

”کیسی ہو بہو!“ راجیلہ بیگم کے لہجے میں محبت تھی۔

”میں نے آپ کو کتنی مرتبہ کہا ہے مجھے اس نام سے نہ پکارا کریں، نفرت ہے مجھے اس نام سے۔“ وہ بہو، لفظ پر چڑ کر بولیں۔

”میرا ارادہ تمہاری دل شکنی نہیں ہے، پر کیا کروں یہ رشتہ جھوٹ بھی نہیں ہے، تم میری بہو ہو۔“ ان کے لہجے میں نفی درآئی۔

”تمہارے بزدل بھگوڑے بیٹے نے تم سے یہ حق چھین لیا ہے، اب صرف میں اپنے بیٹوں کی ماں ہوں، نہ کسی کی بہو، نہ کسی کی بیوی۔“ فائقہ بیگم کے لبوں پر داد بھری مسکراہٹ تھی، گویا بیٹی کے طرز گفتگو سے بہت خوش ہوں۔ منال بھی ان کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ کر رہی تھیں۔

”میرے بیٹے سے جو تمہارا رشتہ ہے وہ پاک و جائز ہے، کیوں گالی بناتی ہو اس مقدس تعلق کو، میری بہو، میرے بیٹے کی بیوی بنے ہا تم ان بچوں کی ماں بھی نہیں کہلائی جاسکتی ہو، بہتر ہو گا حواس قابو میں رکھو۔“ راجیلہ بیگم نے آئینہ دکھایا تو لمبے بھر کو تو وہ چپ رہ گئیں، پھر کچھ توقف کے بعد جھلاہٹ بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔

”کس لیے کال کی ہے؟“

”تمہیں اطلاع دینی تھی، صمد کی بیٹی حضرتی کا رشتہ آیا ہے، وہ لوگ معنی کی تاریخ طے کرنا چاہتے ہیں، اگر تمہارے پاس وقت ہو تو

آ جاؤ۔“

وہ کیا کہہ رہی تھیں، حضرتی کی معنی انہیں اپنی ساتھیوں پر صمد کے کامن ہوا، بھلا حضرتی کا کتنا اتنی آسانی سے کیسے نکل سکتا ہے؟ جب کہ انہوں نے خود کونین کی آنکھوں میں اس کے نام پر دھپ جلتے دیکھے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ کونین حضرتی کو جنوں کی حدوں سے بڑھ کر چاہتا ہے۔

”ہو.....! ہو کیا ہوا..... آواز نہیں آ رہی؟“ دوسری جانب سے ان کی پریشان آواز سن کر وہ ہوش میں آئی تھیں۔

”کیا کہا؟ کس کی معنی ہو رہی ہے؟“ اس نے تصدیق چاہی۔

”حضرتی کی، صمد کی بڑی لڑکی، خیر تم کو کہاں یاد ہوں گے بچے، مدت ہو گئی ان سے تمہیں ملے ہوئے۔“

”ہاں..... ہاں یاد ہے مجھے وہ سانولی، صمد سے نقوش والی حضرتی۔“

”ارے۔“ راحیلہ بیگم کی قہقہہ لگتی تھی، انہیں شرمندہ کر ڈالا۔

”نہ معلوم تمہیں کس کا نقش یاد ہے، شاید کسی ملازمہ کی بیٹی ذہن پر ہوگی، حضرتی کا حسن پھولوں کو شرماتا ہے، رشتوں کی بھرمار ہے

اس کے لیے۔“

”یہ رشتہ کہاں سے آیا ہے؟“ وہ تجسس ہوئیں۔

”رضوان علوی کے صاحب زادے، مہران علوی کا ریکس این ریکس ہیں وہ۔“ راحیلہ بیگم کے لہجے میں فخر و انبساط تھا، وہ چونک پڑیں۔

”رضوان علوی..... مار بڑو الے؟“

”ہاں وہی بہت بڑا بزنس ہے ان کا، پوری دنیا میں نام ہے۔“ نہ معلوم وہ ان کو جانتی تھیں یا خود کو بہلا رہی تھیں یا ہم انداز میں

انہیں کوئی پیغام دینا چاہ رہی تھیں۔

”پھر آ رہی ہو تم؟“

”یقیناً، میں چند دن بعد آتی ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا۔

”اوہ..... کیا ہاتھ مارا ہے۔ یہ لڑکی بڑی قسمت والی ہے۔ رضوان علوی کی پراپرٹیز اور بینک بیلنس کا تو شمار بھی نہیں ہے، پھر اکلوتا

بیٹا ہے، سب کچھ اس لڑکی کا ہی ہوگا۔“ وہ درشک بھرے انداز میں فائدہ سے گویا ہوئیں، جو سب سن چکی تھیں۔

”ہوں..... مگر شکرو کرو، کتنی آسانی سے جان چھوٹ گئی ورنہ کونین کہتا تو ہم کس طرح انکار کر سکتے تھے، ہماری بلائی ہے۔“

”اوہ بس ماما بہت آسانی سے یہ سب ہو گیا۔“ وہ از حد مسرور تھیں۔

”مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کے اور پرنس کے ریلیشن بہت اچھے ہو گئے ہیں، وہ بھی بہت پہنچ ہو گیا ہے، ہر وقت ناک پر رہنے والا غصہ بہت کم ہو گیا ہے، اب ہمیں کبھی بھی دینا ہے۔“

”جھینکس گاڈمما! مجھے وقت سے قبل وصل آگئی، میں جانتی ہوں، پرنس وہ مہرہ ہے جو میری شکست کو کامیابی میں بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس خان کی کی گئی ذلت آمیز بے عزتی کا بدلہ میں لے کر رہوں گی۔“

☆.....☆.....☆

راحیلہ بیگم نے ریسور کریڈل پر رکھا تھا۔ خود بیڈ پر دراز ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے۔ منال کے ہر اعزاز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بیٹے کی پسند سے آگاہ ہیں۔ ایک عورت ہی دوسری عورت کے اندر کا حال اس کے چہرے سے، آنکھوں سے اور لفظوں سے بہت کچھ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہاں تو معاملہ بھی مزاج شناسی و یکساں طبیعت کا تھا۔ منال کی اور ان کی ایک ہی فطرت ہے، وہ بخوبی جانتی تھیں۔

”کیا ضروری ہے، جب وقت کی طنائیں ہمارے ہاتھ میں ہوں، فیصلوں کے اختیارات ہمیں حاصل ہوں، حکمرانی کی سب سے بلند سند پر براجمان ہو کر ہم صرف اور صرف اپنے ذاتی مفادات کی خوشنودی کے لیے ایسے فیصلے کریں جو جتنی خوشی و سرور تو دیتے ہیں مگر پھر جب وقت کی طنائیں ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہیں اور حکمرانی کی بلندی سے معزولی کی پستی میں ہم گرتے ہیں تو ہمارے ہاتھ شکست و ریخت آتی ہے جو ایک ناسور کی طرح آخری سانس تک ہمیں کرب میں جتلا کرتی ہے۔ کاش یہ سب ہمیں اس وقت سمجھ میں آ جائے جب وقت اور فیصلے ہمارے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔“

آنسو ان کے عمر رسیدہ چہرے پر قوتور سے بہ رہے تھے۔ منال کے رویے نے ان کے ماضی کی ڈائری کے وہ اوراق کھول دیئے تھے جب وہ معزہ کی کرن سے محبت و جنون کو جاننے کے باوجود اس تک وہ وہیں رہی تھیں کہ کوئی ایسی بات، کوئی ایسی وجہ مل جائے کہ وہ ان کو ہمیشہ کے لیے جدا کر داسکیں اور بہت جلد وجہ مل گئی، جس کا انہوں نے پھر پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک تیر سے دو شکار کامیابی سے کیے، کرن اور نوشاہد دونوں کو ہی گھر سے الزام لگوا کر نکلوا یا تھا اور انجانے میں ایک وبال اپنی جان پر لے لیا تھا۔

برائی کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے، جو گڑھا دوسرے کے لیے کھودا جاتا ہے، انسان کا لالچ و حنادا سے خود اس میں ڈن کر دیتا ہے، کر بھلا سو بھلا، کر برا ہو برا۔ یہ رہنمائی ہمیں راہ بھٹکنے کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہے اور اس وقت تک ہم سب کچھ کھو چکے ہوتے ہیں۔

”منال! میری ذمہ ہے وہ دکھ تمہاری جمہولی میں نہ گریں جو میری متامیں کاتنوں کی طرح پیوست ہو چکے ہیں۔ شریک سڑکی بے اہتنائی تمہارا مقدر بنی ہے، خدا نہ کرے، بیٹے کی جدائی تمہارا نصیب بنے۔ مجھے ڈر ہے، میں خوف زدہ ہوں، میرا وجدان کہتا ہے، شاید وہ کہانی پھر برائی جائے گی، عشق و فراق لازم و ملزوم ہیں، ویسے بھی یہاں کس کو محبت کی فضا اس آئی ہے، مجھے اندیشہ ہے کچھ ہونہ جائے۔“

☆.....☆.....☆

یونیورسٹی مکمل ہو گئی تھی۔

پہلا پیریٹائینڈ کر کے وہ لان میں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ سب قریب قریب بیٹھی تھیں جبکہ حورین ان سے کچھ قاصطے پر بیٹھی، نوٹس بک کھولے لکھنے میں مصروف ہو گئی تھی، اس کے انداز میں ایک ہفتہ قبل ہونے والی ڈوائون سے ملاقات کے بعد، ان چاروں کا اس کی سائیڈ لینے پر جواخلاف ہوا تھا، وہ خفگی ابھی تک قائم تھی جس نے اسے ان سے دور کر دیا تھا۔

”یہ تمہاری خود ساختہ ناراضی کب تک چلے گی؟“ ثمرین نے اسے چھیڑا۔ ”کسی بھلے شخص سے خواہ مخواہ کا عناد اچھا نہیں ہوتا ہے۔“ زویانے کہا۔

”حورین! یہ بلا وجہ کے تنازعات ہم میں اختلافات کا باعث نہ بن جائیں۔ تمہارے مزاج ہمیں مایوس کر رہے ہیں۔“

”بلا وجہ؟“ وہ نوٹ بک بند کرتی حورین سے گویا تھی۔

”لیس..... آف کورس۔ تم گزری باتوں کو بھلا کیوں نہیں دیتیں، وہ خود کو بدل چکے ہیں، تم بھی بدل جاؤ۔“ روانے مشورہ دیا۔

”میں کیوں کسی کی خاطر خود کو بدلوں؟ میرا اس سے رشتہ بھی کیا ہے، نہ میں اس سے تعلق پیدا کرنے کی آرزو مند ہوں، اس سے بے عزت ہونا تم انورڈ کر سکتی ہو، میں نہیں۔“ وہ غصے کی انتہا پر تھی۔

”ریلیکس یا راتم ٹمپر کیوں لوڑ کر رہی ہو، جو ہمارے درمیان فریڈ شپ ہے وہ کسی زبردستی کی محتاج نہیں ہے۔ تم مائنڈ مت کرو۔“ موئل سے اس کی ناراضی برداشت نہ ہوتی تھی۔

”میرے سامنے اس کی سائیڈ مت لیا کرو۔“ بات اتنی بڑی تو نہ تھی جو بھلائی یا نظر انداز نہ کی جاسکتی ہو۔ انسان جب سوچ سمجھ کر فیصلے کرتا ہے تو بڑی سے بڑی بات نظر انداز کر دی جاتی ہے، ناقابل معافی زیادتی بھلا دی جاتی ہے، معاف کر دی جاتی ہے، یہ سب کلمے دل دو ایش مندی سے کیا جائے تو ممکن ہوتا ہے اور یہاں تو سب باتیں محض ضد و انانہ کی سرپرستی کی مرہون منت تھیں، ایک طرف وہ جھکنے کو تیار نہ تھی تو دوسری جانب وہ کھیل کرنے کو تیار نہ تھا۔

بظاہر ان کا آپس میں ایسا کوئی تعلق نہ تھا اور عجیب بات تھی اس لائق تھی و بے نیازی کے مظاہروں نے ان کے درمیان ایک تعلق پیدا کر دیا تھا، لوگ ان کی جانب متوجہ ہونے لگے تھے۔

”اوکے، موڈ درست کرو۔“ وہ مسکرا دی تھی، ماحول کی کشیدگی مٹ گئی تھی، وہ ہاتھیں کرتی ہوئی کینٹین میں آ گئی تھیں جہاں گرم سوسوں اور چائے کے دوران فیشن میگزینز پر گفتگو کرتے ہوئے وہ کچھ دیر قبل ہونے والی کشیدگی بھول چکی تھیں۔

”مل پے میں کروں گی۔“ حورین نے پرس سے پیسے نکالنے ہوئے کہا۔

”شیور..... شیور..... وائے ناٹ.....“ ثمرین کے ساتھ وہ کلکلا اٹھیں۔

”مس ایل کی صحت کی جا چکی ہے۔“ کاؤنٹر پر موجود شخص کی بات سن کر وہ لمبے بھر کو حیران رہ گئی تھیں۔

”یہ چائیک حاتم طائی کی آمد کیوں کر ہوئی؟“

”یہ کس کی سخاوت ہے؟“

”یہ کس کو ہمارے کھانے پینے سے محبت ہو گئی؟“

”کوئی بھی ہو، مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے، ہم دو دفعہ کے بجائے دس دفعہ یہاں آئیں گے۔ وہ اسی طرح تل پے کرتا رہے۔“

(آئین) ”روا کی بات پر وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں جبکہ حورین دوبارہ نمبر کی طرف بڑھی تھی۔“

”تل کس نے پے کیا ہے؟“ اس کے لہجے میں سخت سرد مہری تھی۔

”سوری مس! وہ..... میں.....“ نمبر حواس باختہ تھا۔

”آپ مجھے نام بتائیں اور یہ چارج پکڑیں۔“ اس نے غصے میں ہاتھ میں پکڑے نوٹ کاؤنٹر پر رکھے تھے۔ نمبر کے چہرے پر

موجود گھبراہٹ و خوف نے ان کے چہروں کی مسکراہٹ تذبذب میں بدل دی تھی۔

”وہ..... وہ..... آپ میری پرائیلم سمجھیں مس!“ نمبر کا انداز رو دینے والا تھا۔

”میں آپ کی شکایت پرنسپل سے کروں گی، ہمیں کیا سمجھ کر آپ نے کسی سے حکمت لی اور اب اس کا نام بھی چھپا رہے ہیں۔“

نمبر کے چہرے پر سراسیمگی و گھبراہٹ حد درجہ بڑھ گئی تھی، درمیانی عمر کے سانولے چہرے والے نمبر کی آنکھوں میں التجا تھی، وہ کہتا چاہ رہا

تھا مگر کسی خوف کے باعث کہہ بھی نہیں پاتا تھا، اسی لمحے ذوالنون اندر داخل ہوا تھا۔

اس کی تیز لگا ہوں نے کچھ محسوس کیا تھا، وہ سیدھا موٹل کے پاس آ کر بولا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“

موٹل نے صورت حال بتادی۔

”معاملہ کیا ہے؟“ وہ سنجیدگی سے نمبر سے دریافت کرنے لگا۔

”آگے کتواں، پیچھے کھائی والا معاملہ ہمارے سامنے درپیش ہے صاحب۔“

”جو پوچھا جا رہا ہے، اس کا سیدھے طریقے سے جواب دو، ورنہ.....“ اس کے سخت لہجے کے آگے وہ کھٹکھٹا کر گویا ہوا۔

”رو کی صاحب نے کہا ہے کہ یہ مس جب بھی یہاں آئیں، تو ان سے تل نہ لیا جائے اگر میں نے تل لیا تو وہ مجھے یہاں کینٹین

سمیت زندہ جلادیں گے۔“ نمبر نے ڈرتے، کا پتے لہجے میں انکشاف کر ہی دیا۔ ذوالنون نے جلتی نگاہ قاصدے پر کھڑی حورین پر ڈالی، نہ

معلوم ان نگاہوں میں کیسے احساسات تھے کہ وہ اس سے نگاہیں چرانے پر مجبور ہو چکی تھی۔

”یہ نوٹ اس کے منہ پر مارنا میری طرف سے۔“ وہ نوٹ نمبر کی طرف اُچھال کر تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

رو کی کی اس اونچی حرکت پر اسے شدید سبکی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کیا سمجھا تھا، اسے، جو ایسی گھٹیا حرکت کرنے کی جرأت



ہوئی۔ وہ اسے ایسی غیر مہذبانہ حرکتوں سے مرعوب ہونے والی لڑکی سمجھ رہا تھا؟ ایسا کرتے ہوئے اسے اس کی عزت کا خیال نہیں آیا؟ کیوں.....؟

کیا وہ اتنی ہی مری ہوئی لڑکی تھی؟

سوچوں گا ایک الاؤ تھا جو اس کے اندر بھڑک اٹھا تھا جس میں لکڑیاں روکی کی حماقت نے مہیا کی تھیں، تو آگ ذوالنون کی اس ایک نگاہ نے بھڑکائی تھی، آنکھوں کی کاٹ، زبان کی کاٹ سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ عزت، وقار اور احترام صنف نازک کے کردار کی شناخت ہوتی ہے۔ یہ وہ پیش بہا خزانے ہیں جن کی حفاظت بڑی جان لٹائی سے کی جاتی ہے کہ یہ وہ آگینے ہیں جو معمولی سی ٹھیس سے بکھر جاتے ہیں۔ ایک غلط طرز عمل داغ دار کر دیتا ہے، ایک گرم ٹکا چھلسا دیتی ہے، جس طرح ابھی اس شخص کی نگاہ نے اسے عرش کی شفاف رفعتوں سے پاتال کی سیاہ ظلمتوں میں لاپھینکا تھا۔

شوہنی قسمت روکی اسے ڈپارٹمنٹ کے باہر ہی مل گیا تھا۔

”ہیلو“۔ وہ ہشاش بشاش سا اس کی جانب بڑھا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ نہ معلوم کیوں وہ اس کے چہرے کو تھپڑوں سے لال نہ کر سکی، چمکتا ہوا ہاتھ بے دم ہو گیا تھا۔

”حرکت!“ اس کے مسکراتے چہرے پر حیرانگی درآئی تھی۔

”کنٹینٹن میں آپ نے مل پے کیوں کیا ہے؟“

”اوہ..... میں ڈری گیا تھا کہ نہ معلوم کیا بات ہو گئی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، اس کی نگاہیں اس کے چہرے کو گرفت

میں لیے ہوئی تھیں، حورین کے پیچھے آتی وہ چاروں ٹھنک کرڑک گئی تھیں۔ روکی کو دیکھ کر ان کے چہروں کے رنگ خنجر تھے۔

سرخی مائل گندمی رنگت، وبہترین ہائٹ والا ردف عرف روکی اگر عام انسانوں کی طرح نارمل ہوتا تو پاپلر پرنٹاٹی ہوتا مگر غلط طرز

عمل و نرے ہینکلے لوگوں کی سرپرستی و رہنمائی میں وہ اچھائی و نیک نامی کی معراج سے گر چکا تھا، شہر پسندی و وہشت گردی اس کی پہچان بین

چکی تھی، انسان کی خصوصیات نیک ہو یا بد، ان کا عکس ضرور اس کے کردار و مزاج پر ثبت ہو جاتا ہے۔

روکی بھی اپنا تعارف آپ بن چکا تھا، بے ترتیب بال، چہرے سے چھلکی ہوئی خشونت، آنکھوں سے برستی ہوئی وحشت و دہنگ

لہجہ سے کبھی بھی اچھے لوگوں میں شمار نہ ہونے دیتا تھا، لوگ اس کے قریب سے گزرنے سے بھی گریزاں رہتے تھے۔

”آپ نے مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھا ہے؟ کیا سوچ کر آپ نے یہ حرکت کی؟“ حورین غصے میں بوٹی چلی گئی۔

”کول ڈاؤن، کول ڈاؤن“۔ دو قدم آگے بڑھ کر اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ پھر لگاؤٹ سے گویا ہوا۔

”بہت احترام ہے اس دل میں آپ کا، پہلی بار میں کسی لڑکی کی عزت کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔ اس سے قبل میں لڑکیوں کو صرف

وقت گزاری کا ذریعہ سمجھتا رہا تھا۔ آپ کو برا لگا ہے، میں معذرت کرتا ہوں، پلیز مجھ سے خفا مت ہو جائیے گا۔“ اس کے نرم لہجے میں از حد

الٹا سٹ آئی تھی، ان چاروں کی سانس رکنے لگی۔

”آپ ناراض تو نہیں ہیں نا؟“ وہ مضطرب ہوا۔

”اٹس اوکے، آئندہ خیال رکھئے گا۔“ مخصوص پرفیوم کی مہک متواتر آ رہی تھی جس کا مطلب تھا وہ آس پاس موجود ہے۔ وہ جانتی

تھی ان دونوں میں محاذ آرائی ہے، اس کے نام پر ہی اس نے اس کو حقارت آمیز لگا ہوں سے دیکھا تھا۔ بڑا حقیرانہ انداز تھا۔

اسے جلانے کے لیے وہ روکی سے دوستی برقرار رکھنے کا فیصلہ کر بیٹھی۔

”جھینکس۔“ وہ گویا جھوم اٹھا۔

”سنا ہے یہاں ہنگاماً آپ نے کروایا تھا؟“ اس سوال پر اس کے چہرے پر رنگ چٹکوں کے لیے حفر ہوا، پھر وہ سنبھل کر بولا۔

”ابھی آپ کا فرسٹ ایئر ہے، یہاں نہ معلوم کیا کیا سٹیشن گی، یہاں میرے دوست کم، دشمن زیادہ ہیں جو ہر معاملے میں مجھے

بدنام کرتے ہیں۔ وہ نہ معلوم اور کب تک وہاں کھڑا رہتا، میری ٹی بیٹل بن کر حورین آگے بڑھی تو وہ چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

کرن کی ٹامک میں تکلیف معمولی سی رہ گئی تھی، اب وہ اسٹک کے سہارے چل پھر لیتی تھیں، اس وقت بھی اسٹک کے سہارے

چلتی ہوئی فاریہ کے پاس آ بیٹھی تھیں۔

”کیا بات ہے بھابی! بہت اُداس لگ رہی ہیں؟“ کرن نے ان کے چہرے پر پچھلی اُداسی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”بس آج صبح سے ہی طبیعت اُداس ہے، کچھ اچھائی نہیں لگ رہا ہے۔“ ان کی مسکراہٹ میں گہری اُداسی تھی۔

”بچے یا دار ہے ہیں؟“

”آپ کو نہیں آتے؟“

”ہاں..... کیوں نہیں، ماں بننے کے بعد عورت کی آدمی ذات بچوں کے لیے ہی وقف ہو جاتی ہے، بچوں کے دم سے ہی گھر میں

رواق ہوتی ہے۔“

فاریہ کی اُداسی کی وجہ وہ بھانپ گئی تھی، خود ان کا بھی یہی حال تھا، پھر جب سے حورین نے کالز کر کے انہیں کراچی آنے کی امداد

شروع کی تھیں وہ اندر ہی اندر مضطرب ہو چکی تھیں۔

”بات درست ہے آپ کی، بچوں کے دم سے ہی بہاریں ہیں مگر ہم جو ان کی جدائی برداشت کر رہے ہیں، وہ ان کے منہ سے

مستقبل کے لیے ہے۔“

”ہاں ہماری کوشش یہی ہے کہ ان کا فیوچر برائٹ ہو مگر حورین کا بڑھتا ہوا اصرار مجھے اُلجھن میں جلا کر رہا ہے، کوئی نہ کوئی بات

ایسی ضرور ہے شاید کوئی پرائلم ہے اسے۔“

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

”حالانکہ ہونی تو نہیں چاہیے تھی، سب بہت خیال رکھنے والے، چاہنے والے ہیں، بی بی جان بہت خیال رکھتی ہیں اس کا۔“  
 ”ارے یہ بات نہیں ہے قاریہ۔“ انہوں نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہاں موجود لوگوں کی بہت تعریف کرتی ہے وہ اور بی بی جان کی تو کچھ زیادہ ہی دیوانی ہے، اس سے زیادہ ان کی محبت کا اور ثبوت کیا ہوگا کہ وہ اتنے ماہ سے ان کے ساتھ رہ رہی ہے، ورنہ وہ ایک دن ہمارے بغیر کہیں گزرنے والی نہ تھی۔“

”پھر کیا وجہ ہے آپ معلوم کرتیں؟“

”میں نے بہت کوشش کی مگر وہ کہتی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے، مجھے وہم ہے لیکن میں جانتی ہوں ایسی کوئی بات ضرور ہے۔“  
 ”کرن! ایک دفعہ اپنے دل سے خوف کو نکال کر کراہتی جانے کے لیے تیار تو ہو..... دیکھنا کچھ نہ ہوگا، کیا دل نہیں چاہتا اپنے شہر کو دیکھنے کا، وہاں کی لڑکائیوں میں سانس لینے کا، زندگی کا ابتدائی حصہ جہاں گزرا، وہ آپ کو یاد نہیں آتے ہیں؟“  
 قاریہ نے انجانے میں ان کے زخموں پر نمک چھڑک دیا تھا، وہ شدت تکلیف سے تڑپ کر رہ گئیں مگر منہ سے آہ نہ نکالی تھی۔  
 ”بتائیں نہ کرن! کیا یاد نہیں آتے وہ گزرے دن؟“

”یہ کیسے سوال کر رہی ہیں بھائی! بھلا یہ بھی کوئی بھلانے کی باتیں ہیں۔“ کرن کی آواز میں کچپکاپ تھی۔ ”یادیں تو ہماری زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں جن کے سہارے ہم آئندہ کی زندگی کا سفر طے کرتے ہیں، اگر یادیں نہ ہوں تو ہم کس طرح جی سکتے ہیں؟ مجھے یاد آتا ہے سب، اس زندگی کا موازنہ گزری حیات کے لمحوں سے از خود ہوتا رہتا ہے، کبھی ہم زندگی کی خوشیاں پانے کے لیے ہاتھ آئی ہوئی خوشیوں کو گنوا دیتے ہیں، ان کی صورت سے نا آشنا ہو جاتے ہیں، اسنے انہیں اور بیگانے کی طرح خوشیاں مقدر بنتی ہیں تو ہم ان کو پہچان نہیں پاتے، لائق ہو جاتے ہیں میری طرح، کل تک تھی داماں تھی، آج سیراب ہوں تب بھی وہ سب محسوس نہیں کر سکتی جو مجھے کرنا چاہیے۔“

☆.....☆.....☆

”بیک مین! کیا پرابلم ہے؟“ برہان لغاری شکاری ڈریس میں اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ ابھی شکار پر سے لوٹے تھے، ملازم سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ آج بھی کمرے سے باہر نہیں نکلا ہے تو وہ فکر مند سے اس کے کمرے میں چلے آئے تھے۔  
 ”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوئے، دوسرے لمحے وہ چونک گئے، اس کی پیشانی دکھ رہی تھی، وہ نیم فنوڈگی میں تھا۔

”ہائی فلوور ہو رہا ہے، آپ کو بتانا چاہیے تھا۔“

”میں ٹھیک ہوں نانا جان! آپ کپڑے چینج کر لیں، سارے دن کی محکم ہے آپ کی، کیا شکار کیا آج؟“ کوئین ہت کر کے اٹھ بیٹھا تھا۔

”تیر ہیں بہت اعلیٰ نسل کے ان کا گوشت بہت ذائقے دار ہوتا ہے۔ ملازم مصالحہ لگا رہے ہیں پھر روٹ کریں گے کھا کر دیکھنا،

کتنے لذیذ ہوتے ہیں مگر تمہیں ہوا کیا ہے، آئے تو میرے ساتھ شکار پر ہوتے ہو لیکن ایک بار بھی یہاں سے باہر نہیں نکلے۔ وہ اس کی بے ترتیب حالت دیکھ کر استفسار کر رہے تھے، اس سے قبل کونین کو انہوں نے ہمیشہ چاق و چوبند تک سک سے تیار دیکھا تھا، پہلی بار انہوں نے اسے اسی سوٹ میں دو دن پہلے دیکھا تھا، شیو بھی بڑھی ہوئی تھی، آنکھیں بھی بھیجی سی، دو دن سے کمرے میں بند وہ مکمل طور پر زندگی سے لاطعلق نظر آتا تھا۔ وہ جب بھی شکار پر آتے تو پوری تیاریوں سے آتے تھے جس میں سرفہرست فرسٹ ایڈ بکس ہوتا تھا، وہ منگوا کر انہوں نے قرما میٹر سے اس کا بخار چیک کیا، پھر اسی حساب سے اسے ٹیبلٹ اور سیرپ پلایا، ساتھ لوکر کو کافی اور سینڈویچز لانے کا آرڈر بھی دیا۔

”نانا جان! آپ آتے ہی میری حج رو داری میں لگ گئے، آپ ہاتھ لیں، کپڑے پہنچ کریں، شکار سے واپسی پر بہت تھکن ہو جاتی ہے۔“ کونین ان کے التفات پر نکل سا ہو گیا۔

”ایک بات بتاؤں مائی ڈیزیزن! آدمی اور گھوڑا کبھی تھکن کا شکار نہیں ہوتا، اسوشلی جب شکاریوں کو خوب شکار مل جائے تو تھکن تمام بھاپ کی صورت اُڑ جاتی ہے۔“ وہ از حد سرور تھے بے حد شاداں۔

”نانا جان! آپ کو بہت انٹرسٹ ہے شکار میں۔“

”جنون کی حد تک، آپ کا نانا جان پرانا شکاری ہے، افریقہ کے گھنے جنگلوں تک میں شکار کھینے کا اعزاز حاصل ہے ہمیں۔“

”اوہ ویری فنی! آپ کو خوف نہیں محسوس ہوا وہاں تو سنا ہے آدم خور قبیلے آباد ہیں اگر لوگ ان کے ہاتھ لگ جائیں تو بھون کر کھما جاتے ہیں۔“ کونین کے سوال پر وہ ہنس پڑے تھے۔

”ہم نے دو گا نیڈز ہائیر کر لیے تھے، ہم نے بہت شکار کیے ہیں جانوروں، پرندوں سے لے کر انسانوں تک کے، کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔“

”انسان کا شکار؟“ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”نہیں سمجھ پائے آپ!“ وہ معنی خیر انداز میں مسکرا کر بولے۔ ”مجھے محسوس ہوا ہے آپ کی یہ کنڈیشن کسی گرل کی وجہ سے ہوئی ہے۔“

”ووہ..... ووہ..... ووہ“ گھبرا اٹھا۔

”اونہوں، مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے، نام بتائیں مجھے اس لڑکی کا، پھر دیکھنے کا رات کو ہی وہ آپ کے بیڈروم میں ہوگی۔“

ان کے انداز اور ارادے نے اسے سر تا پا لرزا ڈالا تھا۔ یہ انہوں نے کیا کہہ دیا تھا؟ اس کے دل میں اپنی محبت کے لیے بہت عزت و احترام تھا۔

ایسی رذیل سوچ، اتنا گھٹیا خیال!

ایسا ناپاک ارادہ، اس سے بڑھ کر محبت کی توہین کیا ہوگی؟

”کیا سوچ رہے ہو بیک مین! کسی لڑکی کا ہی چکر.....“

”نو..... نو..... نونا نانا جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے کسی لڑکی کا چکر نہیں ہے۔“ وہ لمحوں میں پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ اس کے اندر کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس کی محبت شبنم کے قطروں کی طرح پاکیزہ تھی۔ لاکھ پر چمکتے چاند کی طرح منور و بلند۔

”شر ماؤ مت، بتا دو مجھے، پھر اپنے نانا جان کے سوسرہ دیکھیے گا۔“ برہان لغاری اس کی مضطرب کیفیت کو شرم پر محمول کر رہے تھے جبکہ وہ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی یہ سوچ کر نام ہوئے جا رہا تھا کہ یہ اس لڑکی کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کو وہ پیار و احترام کی نگاہوں سے دیکھتا تھا، وہ بیٹے کی کلیوں کی طرح نرم و نازک لڑکی، جس کی نگاہیں بارحیا سے جھکی رہتی تھیں، اس قابل تھی اس کے متعلق ایسا سوچا جائے؟

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ کونین کے لہجے میں ناپسندیدگی سمٹ آئی تھی۔ برہان لغاری اسے آرام کی تلقین کرتے ہوئے چلے گئے تھے۔

وہ غمگین ہو کر کئیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

اس کی براؤن آنکھوں میں ٹھنڈی ہوا بھرا آئے تھے جس نے کلی و اضطراب کو دور فرغ کرنے کے لیے یہاں آیا تھا وہ یہاں آ کر حد سے سوا ہو گیا تھا۔

اس دن اچانک اس نے وہاں سے گزرتے ہوئے سب کچھ سن لیا تھا، دادو کی ماما سے فون پر گفتگو کے بعد ماما اور نانا کے اظہارِ مسرت و اظہارِ خیال نے اس سے قوت گویائی چھین لی تھی۔

اس وقت بہت کچھ ٹوٹ کر بکھرا تھا۔

اس کا دل، رشتوں پر اعتماد، متا پر اعتبار، ماں! پوری کائنات میں جس کا کوئی ثانی نہیں ہے، ماں وہ ہستی ہے جو بچوں کی خوشیوں کے لیے اپنی سرسبز خاک کر دیتی ہے، بچوں کے لیے دشمنوں کا پناہ گاہ ہے۔

ماما نے کیا کیا.....؟

انہوں نے ماما کا مفہوم ہی بدل ڈالا ہے، انہوں نے ماں اور اس کی ماما سے تنہی کہانی کو بدل ڈالا ہے۔ ایثار، قربانی، مہربانی، درگزر و اخلاص کے ہر روپ کو انہوں نے کر یہہ کر ڈالا ہے، گہنا دیا ہے۔ اس کے احساسات کی ہانکل درست جانچ کی تھی بنا کہ وہ اس کی پسند سے واقف بھی ہو گئی تھیں۔ اس موڑ پر آ کر ان کے اندر کی متا مردہ ہو گئی اور انتقام کی ماری عورت پوری طرح بیدار ہو گئی۔ انہوں نے وہی کیا جو ایک خود پرست و خود پسند عورت کی فطرت کرواتی ہے۔ یہ بات کوئی اور اسے بتاتا تو وہ یقین نہ کرتا مگر اپنی سماعتوں سے سب سننے کے بعد اسے لگا اگر ایک لڑکی بھی وہاں وہ زکا تو دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ ماما نہیں تو پاگل ضرور ہو جائے گا۔

اسی وقت کسی نیچے امداد کی طرح برہان لغاری کی کال آ گئی اور سیدھا یہاں چلا آیا۔ گزشتہ دو دن سے کچے گھڑے کی مانند بکھرا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مجھے لگتا ہے تمہارے ہوش و حواس ٹھکانے پر نہیں ہیں۔“ گھر میں فرمت ملتے ہی مول نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

”کیوں؟ میں نے ایسی کیا نازیبا حرکت کر دی۔“ وہ انگور کھاتے ہوئے ہنس کر گویا ہوئی۔

”کیا ضرورت پڑی تھی تمہیں اس سے اتنی باتیں کرنے کی؟ آنکھیں دیکھی تھیں اس کی، جیسے کوئی شیطان دیکھ رہا ہو، سب جانتی ہو کتنی باتیں سنی ہیں اس کے متعلق پھر بھی۔“

”کسی کے اچھے اور بُرے ہونے سے مجھے کیا سروکار، اچھا تو ہمیں خود ہونا چاہیے، خود پر اعتماد ہونا چاہیے۔“ اس نے مٹھی بھر کر

انگورز بردستی اس کے منہ میں بھرتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”تم جھجکتی کیوں نہیں ہو؟“ وہ جھنجھلائی۔

”میں سمجھنا نہیں چاہتی۔“

”ہوں، ٹھیک کہہ رہے تھے کل ذوالنون بھائی۔“

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“ اس نے کانچ کے انگور سے بھرے ہانڈل کو رکھتے ہوئے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے.....“ اس نے چڑایا۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ! صورت دیکھی ہے کبھی آنسنے میں خود سے اس نے اپنی۔“

”لڑکیاں ہیں دیکھنے کے لیے ان کو، انہیں کیا ضرورت پڑی ہے آئینہ دیکھنے کی۔ جب بھی آئینہ دیکھتے ہیں، ٹوٹ جاتا ہے۔“

اٹیچڈ ہاتھ سے برآمد ہو کر زویا بھی شریک ہو گئی تھی۔

”ظاہر ہے ایسی بھیا تک شکل آئینہ کیسے برداشت کر سکتا ہے۔“

مول اور زویا دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

”تمہیں تو سیاست میں آجانا چاہیے، وہاں تم جیسے لوگوں کی خوب جتنی ہے جو مندر منہ اعتماد سے جھوٹ بولتے ہیں۔“

”ان سے بلاوجہ کی دشمنی میں تم حد سے گزر گئی ہو۔“

”قالتو بکواس چھوڑو، یہ بتاؤ کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

”ارے..... اتنی بے چینی، جاننے کے لیے، خیریت ہے نا؟“

”سنا ہے..... محبت کا آغاز اسی طرح ہوتا ہے، نطرت اور محبت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔“ وہ دونوں اسے زچ کرنے پر کر

بتے تھیں۔ اس کی حالت زخمی ناگن کی طرح ہو گئی، وہ فونوں کرتی ان کی طرف کشنوا اچھالنے لگی تھی۔

”پاگل! جنگلی! تم نے ایسا سوچا بھی تو کیسے؟“

”ٹھیک کہہ رہے تھے وہ، تمہیں دنیا میں آنے کی اتنی جلدی تھی کہ محل لینے کے لیے بھی نہ ٹھہری۔“ زویا ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی،

کمرے میں بونچال سا آگیا تھا، حورین نے کشنز کے علاوہ میگزینز بھی اچھالنے شروع کر دیے تھے اور دونوں ہنستے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔

”وہ ہوتا کون ہے میرے بارے میں کنکس دینے والا؟“ وہ تھک کر بیٹھ گئی۔

”حورین! ٹھنڈے دماغ سے سوچو گی تو سب سمجھ جاؤ گی، روکی اچھا لڑکا نہیں ہے، یہ تم بھی جانتی ہو، یہ الگ بات ہے کہ تم بلاوجہ کسی کو نیچا دکھانے کی خاطر اس کو لفٹ دے رہی ہو، جس سے شریف لڑکیاں جھجکتی ہیں۔“

”اور ہمیں ڈر ہے کہ تم خود نیچے نہ گر جاؤ۔“

وہ دونوں سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگی تھیں۔

”میں ایسی بے وقوف نہیں ہوں۔“

”جو ہم نے سمجھانا تھا، وہ کوشش کر ڈالی، اب تمہاری مرضی ہے جس طرح بھی معاملے کو چنڈل کرو مگر ہمیں ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔“ دونوں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”حورین بی بی! آپ کو بی بی جان بلا رہی ہیں۔“ خیرون نے حورین سے آکر کہا۔

”بی بی جان نے بلایا ہے..... خیریت تو ہے نا؟“ وہ دونوں جھجس ہوئیں۔

”خیریت ہی ہے جی۔“ خیرون نے دانت نکالتے ہوئے اطلاع دی۔

”بی بی جان کی حورین سے خوب ہنسی ہے، فارغ ہوں گی تو سوچا ہوگا بلا کر ڈراکپ شپ کی جائے۔“

”شکر ہے خدا کا ابی بی جان کی کسی سے ہنسی ہے، ورنہ انسان کسی دوست کے بنا کیسے رہ سکتا ہے۔“ مول کی بات پر زوہیا اور خیرون نے گردن ہلاتی تھی۔

”بی بی جان کی دوست اور میں! یہ بہت بڑا اعزاز ہے میرے لیے۔“

”خیرون! چاندنی کو واپس کیوں بلا لیا؟ یہاں تو بڑی رونق رہتی تھی اس سے اور بی بی جان کو اس کے پیچھے واک کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔“ اس ہنستے سے خیرون نے کام دوبارہ سنبھال لیا تھا اور چاندنی واپس چلی گئی تھی، مگر کے لڑکوں نے بھی وقت بے وقت گھرا آنا چھوڑ دیا تھا۔

”میری بہن! اسے اپنے ساتھ دوسری کونھی پر لے جانے لگی ہے، یہاں پر چکن کا سارا کام دونوں بیگمات کرتی ہیں، پر وہاں تو وہ لوگ خود بل کر پانی بھی نہیں پیتے، اس کے لیے بھی انہیں گھاس پکڑانا پڑتا ہے لیکن یہ کمرے کا حال کیا ہو رہا ہے؟“ خیرون کا دھیان اب کمرے کی طرف گیا تھا۔

”حورین بی بی پر جن آئے تھے ابھی، انہوں نے یہ سب کیا ہے۔“ زوہیا حورین کی طرف دیکھ کر شرارتی انداز میں گویا ہوئی۔

”اوئی..... اللہ معافی بی بی جی! ایسے مت کہیں۔“ خیرون کا فٹ ہوتا چہرہ انہیں بے ساختہ ہنسا گیا تھا۔



”ہمارے محلے میں ایک لڑکی پراتے ہیں جن، بہت بُرا حال ہے اس لڑکی کا۔“  
 ”اچھا میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جن ہمیشہ لڑکیوں پر ہی کیوں آتے ہیں؟ انہیں مرد پسند نہیں ہیں کیا؟“  
 ”تم لوگوں نے کیا باتیں شروع کر دی ہیں، میں بی بی جان کے پاس جا رہی ہوں۔“ حورین نے انہیں ٹوکا۔  
 ”کسی دن اس لڑکی کو بی بی جان کے پاس لے آنا، اسے جو تے ماریں گی پھر کبھی جن نہیں آئے گا۔“ مول کو اس لڑکی سے  
 ہمدردی تھی۔

”اوہ گاڈ اتم ایک بات کی کھوج میں لگ جاتی ہو، تمہیں معلوم ہے پتھر کہاں ملے گی؟“

”کتاویں میں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ کتابی کیزا ہے، رات دن کتابوں میں منہ چھپائے نظر آتی ہے، ہوگی کسی کو نے کھدوے میں کتاب میں منہ چھپائے پڑھ  
 رہی ہوگی۔“ زویانے حسب عادت تشریح پیش کی تھی، وہ اسے گھورتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی، یہ سب کے آرام کا نام  
 ہوتا تھا، وہ خیرون کے ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔  
 ”بی بی جان، میں بلا کر لے آئی۔“ خیرون چبکی۔

”بلا کر لائی ہے، یاد ریاضت کر کے لائی ہے؟“ سائیز نیبل پر رکھا چشما اٹھا کر لگاتے ہوئے وہ سخت لہجے میں بولیں۔

”بی بی جان! آپ نے بلایا ہے؟“

”ہاں ہاں، آؤ بیٹھو۔“ ان کے لہجے میں ایک دم ہی چاشنی کھل گئی، مشکل بیڈ پر اپنے قریب اس کے لیے جگہ بنا کر گویا ہوئیں۔

”شکر یہ بی بی جان۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”برابر والے کمرے میں کچھ دیر لیٹ کر ٹو بھی آرام کر لے۔“ وہ مودب کھڑی خیرون سے مخاطب ہوئیں۔

”میں بیس ٹھیک ہوں۔“ وہ گھبرا کر گویا ہوئی۔

”دماغ چل گیا ہے تیرا کیا؟ کہہ رہی ہوں اندر جا کر لیٹ۔“ معمولی سی حکم عدولی ان کے شاہانہ مزاج کا آگ بگولہ کرنے کو کافی تھی۔

”بی بی جان! آپ سو جوتے ماریں، میں آف نہیں کروں گی مگر تمہا کرے میں سونے کا مت کہیں۔“ وہ بڑی طرح گھگھکیائی۔

”لو دیکھو، اس اٹنی کھوپڑی کی بات، کیوں ری، میں تجھے آرام کرنے کا کہہ رہی ہوں یا کالا پانی کی سزا سن رہی ہوں؟“

”بی بی جی! بہت ڈر لگ رہا ہے۔ گھر سے نکلی تھی تو حاجی میاں کی لڑکی گھور گھور کر دیکھ رہی تھی، میں سمجھ گئی، آج میرے ساتھ کوئی

برائی ہے۔“

”اری چپ کر وہی، حاجی صاحب کی بیٹی کی نظروں میں کون سے برائی کی خیر دینے والے آئے گئے ہوئے ہیں۔“

”جن آتے ہیں اس پر جن۔ وہ سب خبر کر دیتے ہیں۔“ خیرون کے لہجے سے پکا اعتقاد جھٹک رہا تھا۔

”جن آتے ہیں جن۔“ بی بی جان نے غصے میں اس کی بھدی آواز کی نقل اتاری، حورین نے ہنسنے کا اشارہ کیا، خیرون کا خوف اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ گھر سے ڈری ہوئی آئی تھی، مستزاد زویا کی شرارت نے اس کے وہم کو پختہ کر دیا تھا اور وہ یہ سوچ کر ڈر رہی تھی کہ اس لڑکی کا جن اس کا چچا کرتا ہو یا یہاں تک آن پہنچا ہے، مگر بی بی جان کے آگے کس کی ٹہل سکتی ہے، انہوں نے اسے دوسرے کمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا تھا۔

”جن لڑکیوں کی عمریں بڑھ جائیں اور ان کی شادی نہ ہو تو ان پر ہسٹریا کا دورہ پڑنے لگتا ہے، جو کئی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، اس میں زیادہ تر ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں لڑکیاں آسیب زدہ ہو گئی ہیں یا ان پر جنوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ کتنے ہی جاہلیت کے مارے لوگ ذات برادری اور امری غریبی کے پتھروں میں پڑ کر بچیوں کی عمریں نکال دیتے ہیں، جب ان کی ایسی کیفیات ہوتی ہیں تو پھر نام نہاد دہرے فقیروں کے پیچھے بھاگتے ہیں جہاں نہ صرف ایمان و دولت کا ضیاع ہوتا ہے بلکہ کئی بے خمیر جعلی بیروں کی ہوس کا شکار مظلوم بچیاں ہو جاتی ہیں پھر وہ کچھ کہہ نہیں پاتیں، شرم مانع ہوتی ہے اگر کوئی جرأت کر بھی لے تو پھر صاحب وہیں لڑکی کو ہالوں سے پکڑ کر بے دردی سے مرمت کرتے ہیں یا عجیب عجیب دھونیاں دے کر انہیں زبان کھولنے کی مزادیتے ہیں۔“

”کیا یہ سب سچ ہے بی بی جان۔“ اس کے روٹھے کھڑے ہو گئے تھے۔

”ہاں..... بالکل سچ۔“

”ان لڑکیوں کے والدین کچھ نہیں کہتے، کوئی کس طرح والدین کے سامنے ان بچیوں کو مار سکتا ہے۔“ اس کی براؤن آنکھوں میں حیرانی و خوف چمکنے لگا تھا، یہ سب اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔

”وہ عقیدت کے مارے، عقل کے اندھے ہوتے ہیں، لڑکیاں کتنا بھی چلائیں، شور مچائیں، مدد کے لیے پکاریں، وہ بت بنے رہتے ہیں کہ پھر صاحب کے جھول لڑکی کی آواز میں جن بول رہا ہوتا ہے اور وہ نکلنے لڑکی کو نہیں جن کو پہنچ رہی ہوتی ہیں، اس طرح وہ دونوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔“ بی بی جان نے اس معاشرے کا ایک بھیا تک ایسا سے سنایا تھا، جسے سن کر وہ دم بخود تھی۔

”اوہ مائی گاڈ اتنی سفاکیت، اتنی بے رحمی۔“

”اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ دین میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، جب ہم دین کو سمجھیں گے نہیں تو اپنا نہیں گے کس طرح سے؟ پورے پورے داخل کس طرح ہوں گے، آج اس لاطمی کے باعث ہم فرقوں، طبقتوں اور جماعتوں میں بٹ گئے ہیں، یہ سب سزائیں نہ جاننے کی وجہ سے ہیں۔ خیر چھوڑو، خیرون کی وجہ سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔“ انہوں نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر موضوع بدلا تھا۔

”یہ بتاؤ یہاں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے، دل لگ گیا ہے نہ تمہارا؟“

”جی مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، سب اتنا چاہتے ہیں، کیئر کرتے ہیں لیکن..... کیوں پوچھ رہی ہیں، مجھے یہاں آئے بہت نام ہو چکا ہے۔“

”یونہی بیٹا! میں محسوس کر رہی ہوں، تم کچھ پریشان ہو جاتی ہو کبھی کبھی، بے زاری رہنے لگتی ہو، اس لیے میں نے سوچا تم سے تنہائی میں کسی دن معلوم کروں گی کہ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے بی بی جان۔“ ان کے غلوں سے اس کی آنکھیں بھرا آئیں، وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھیں۔  
”جس دن بھی کچھ محسوس کرو، فوراً بتانا پھر دیکھنا کسی شامت جاتی ہوں، پر مجھے اُمید ہے تم سے کوئی خفا نہیں ہو سکتا، اتنی موٹنی صورت ہے تمہاری، اتنے اچھے مزاج و اخلاق ہیں کہ دشمن تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“ بی بی جان اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھیں اور ان کی نگاہوں میں بے ارادہ ذوالنون کا چہرہ آ گیا۔

”اگر یہ سب سنتے تو یقیناً تم شاگرد رو جاتے ایڈیٹ۔“ وہ تصور میں ذوالنون سے مخاطب ہوئی تھی۔  
جب سے زویا اور موئل ذوالنون سے ملنے لگی تھیں، تب سے اسے ان سے کبھی کبھی بھرپور بے گانگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور اسے اب محسوس ہوا بی بی جان ہر ایک پر خصوصی توجہ دیتی ہیں، یہ ان کی محبت کا انداز تھا۔

☆.....☆.....☆

”بہت عرصہ ہو گیا ہے یا تمہیں کوئی دعوت کھلائے ہوئے، ایسا کرو آج تو ڈنر پر انوائٹ کر بی ڈالو۔“ مامون نے ذوالنون کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”کس خوشی میں؟“

”اسی خوشی میں کہ میں نے تم سے فرمائش کی ہے، اب کبجوس مت ہو۔“  
”یہ تو وہی بات ہوئی، مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ تم خود کیوں نہیں کر لیتے سب کو انوائٹ۔ ذوالنون کی گردن جمہیں چھری پھرنے کے لیے نظر آ رہی ہے۔“ حیدر نے ہمیشہ کی طرح ذوالنون کی سائیڈ لی۔  
”ارے یار! ہمارا یار تو دوستوں کا دوست ہے، ایسا دریا دل دوست کسی کسی کو ملتا ہے، ہم تو لگی ہیں جو ایسا دوست ملا ہے۔“  
توصیف نے بھی چالپوسی شروع کی۔

”اوو..... ایک نہ شددو شدد۔ اتنا کھن تم یقیناً ذوالنون کا بی بی شوٹ کروا کر دو گے۔“ حیدر پیچھے ہٹنے والا کہاں تھا۔

”او کے! بتاؤ کہاں لو گے ڈنر؟“

”ان کی باتوں میں کیوں آرہے ہو، ساری پاکٹ منی ان لوگوں نے اپنی گرل فرینڈ پر گنوا دی ہوگی، اب تمہیں لوٹنے آئے ہیں اور تم ہو کمان کی باتوں میں آرہے ہو۔“

”حیدر! دوست ہے دشمنوں کی طرح باتیں کرنا زیب نہیں دیتا تجھے۔“

”اچھا..... بس بس میرا دماغ چاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر باہر آ گیا تھا، دوسرا بڑبڑا فری تھا۔

حیدر کے پیچھے ہی ذوالنون بھی باہر نکل گیا تھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ ہوا سرد تھی، ماحول میں بھی خشکی کا اثر نمایاں تھا۔

”کافی کاموڈ ہو رہا ہے۔“ ذوالنون نے کہا۔

”ہوں..... تو چلتے ہیں۔“ حیدر نے اس کے کندھے پر ہا زور رکھتے ہوئے قدم آگے بڑھائے تھے۔ سامنے سے آتے ہوئے

روکی کو دیکھ دو دنوں رُک گئے تھے۔ روکی بھی سخت نظرت بھری نگاہوں سے ذوالنون کو گھورنے لگا۔

”کیا بات ہے آج کل اس جگہ کے بہت چکر لگانے لگے ہو؟“ ذوالنون اس کے قریب آ کر سخت لہجے میں گویا ہوا۔

”تمہیں کیا پریشانی ہے؟“ وہ بھی اس کے مقابل آ کر بیٹھا۔

”مجھے تمہارا اس جگہ آنا قطعی پسند نہیں ہے۔“

”تم اس جگہ کے ٹھیکے دار کب سے بن گئے؟“

”میں بے معنی سوالوں کے جواب نہیں دیتا، لاسٹ وارنگ ہے تمہارے لیے، یہاں نظرت آنا، اسی میں تمہاری بچت ہے۔“

ذوالنون کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ روکی چند لمحوں اس کی جانب دیکھتا رہا پھر بیٹھا۔

”دیکھ لوں گا تمہیں۔“ وہ جانے کو مڑا۔

”میں بھی چاہتا ہوں، تم مجھے دیکھو اور یاد رکھو تا کہ آئندہ یہاں آتے ہوئے تمہیں ہزار مرتبہ سوچنا پڑے۔“ ایک عرصے بعد اس

کے اندر پرانے والا ذوالنون بیدار ہوا تھا جو مخالف پارٹی کے لیے قہر ثابت ہوتا تھا۔ روکی کو کئی معرکوں میں وہ اس کی اوقات بتا چکا تھا۔ روکی

کو وہ سب یاد تھا، سو وہ خاموشی سے چلا گیا مگر اس کے تیور خطرناک تھے۔ حیدر منہ کھولے حیرت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ وہ ہشاش لہجے میں حیدر سے مخاطب ہوا۔

”یہی سوال میرا تم سے ہے، بہت عرصے بعد میں اس روپ میں دیکھ رہا ہوں۔“

”سرا آفتاب کی باتوں نے مجھے اس روپ سے بیگانہ کر دیا تھا مگر اب محسوس ہو رہا ہے محض شرافت و خاموشی انسان کو بزدل بنا دیتی

ہے۔ میں مزید اس پالیسی پر نہیں چل سکتا جو انسان کو بزدل اور بے ہمت ثابت کرے، ویسے بھی یہاں کی کچھ کم عقل و عاقبت نائنڈیش بے

وقوف لڑکیوں نے اس دو لک کے حوصلے بلند کیے ہیں۔“ وہ سائینڈ سے آتی حورین کو دیکھ کر جتانے لگا۔

”مسز! آپ کو لیڈر بننے کا شوق ہے تو کہیں اور جا کر اپنا شوق پورا کیجئے، یہاں آپ کی دال نہیں گلنے والی۔“ حورین طنز یہ انداز

میں کہہ رہی تھی۔

”میں لڑکیوں کے منہ نہیں گلتا۔“ اس نے حاضر سے کہا۔

”کسی کو خواہش بھی نہ ہوگی۔“

”پلیز اسٹاپ اٹ، یہ آپ دونوں کیا بچوں کی طرح بی ہو کر تے ہیں۔“ حیدر نے بات بڑھتی دیکھ کر کہا۔ ”مس حورین! پلیز آپ روکی سے دور رہیں تو بہتر ہے۔“

”وہ تم لوگوں کی نگاہوں میں بُرا ہوگا، مگر میں اسے بہترین انسان سمجھتی ہوں، کم از کم وہ دوسرے کرپٹ لوگوں کی طرح ماسک زدہ نہیں ہے۔“

اس نے ذوالنون کی طرف دیکھ کر کہا جس کے چہرے پر سرنی آگ کی طرح بڑھنے لگی تھی۔



ایک قبر آلود نگاہ اس کے ہٹ دھری برساتے چہرے پر ڈال رہی تھی۔ حیدر نے فکر مندی نگاہ ذوالنون کے آگے بڑھتے وجود پر ڈالی تھی پھر آہستگی سے حورین سے مخاطب ہوا۔

”وہ بہت ٹونا بکرا شخص ہے، حورین جی پلیز امیری رکھو ٹسٹ ہے آپ سے محض نظریاتی اختلاف کے باعث آپ کوئی انتہائی قدم مت اٹھالیجئے گا کیونکہ ضد و انانہ میں ہم جتنا نقصان اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں اتنا دشمن کو بھی نہیں پہنچا سکتے۔“ حیدر کے انداز میں سادگی و اپنائیت تھی۔

”پہلے ہمیشہ آپ کے دوست کی طرف سے ہوتی ہے اور میری عادت ادھار رکھنے کی نہیں۔ بندے کو کام سے کام رکھنا چاہیے۔“

”ایگزامز چند دنوں میں شروع ہو جائیں گے، تیاری کر رہی ہیں آپ؟ اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو پلیز تکلف مت کیجئے گا۔“ حیدر کی پیشکش پر وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی جہاں وہ چاروں کھڑی تھیں، ان کے چہروں پر فکر و ناراضگی عیاں تھی۔

”تم لوگوں کو کیوں سانپ سوگھ گیا ہے۔“ حورین قریب آ کر بولی۔

”اگر تم ذوالنون بھائی سے دوستی نہیں کر سکتی ہو تو دشمنی بھی مت کرو۔“ روانے جنمایا تھا۔

”عجیب دماغ ہے تمہارا بھی، جس سے دشمنی رکھنی چاہیے اس سے دوستی رکھ رہی ہو، ایک کریکٹریس شخص سے جو مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہے۔“ شرین کا انداز بھی ناصحانہ تھا۔

”کچھ بھی کہہ لو، کچھ بھی سمجھاؤ اس لڑکی سے اپنی بات منوانہیں سکتے اور زیادہ کہو تو مائیکڈ کر جاتی ہے۔“ زویانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کے چہرے پر ناگواری پھیلتی جا رہی تھی۔

”پلیز! بند کر دیو موضوع۔ لاہیری چلتے ہیں، کچھ کتابیں لیتی ہیں۔“ مول نے حورین کے بگڑتے تیور دیکھ کر آستائے ہوئے لہجے میں کہا۔



میں نے مانا کہ یہ تقدیر کا لکھا ہے اٹل  
میرا ایمان دعاؤں میں اثر ہوتا ہے  
اس کو مانگوں گی خدا سے میں جنوں کی حد تک  
مشق جب حد سے گزرتا ہے تو امر ہوتا ہے

باہر دور تک دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ہواؤں میں نمی تھی۔ وہ ٹیرس پر کھڑا خلاؤں میں کچھ تلاشنے کی سعی میں مصروف تھا۔ اپنے دل میں پھیلی ہوئی ویرانی اسے ہر شے بکھری نظر آ رہی تھی۔ ہر شے سے گویا آداسی و حزن ٹپک رہا تھا۔ کل تک جو دنیا پھولوں سے مہکتی اور رنگوں سے چمکتی دکھائی دیتی تھی، یکھٹ ہی اس کے پھول مرجھا کے کانٹے بن گئے تھے اور رنگ اُڑ کر سیاہی رہ گئی تھی۔

وہ سیاہی تھی یا پلٹے جذبوں کی راکھ!

”صاحب! بڑی بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں آپ کو“۔ ملازم نے آکر اطلاع دی تو وہ دل نہ چاہنے کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ وہ لاؤنج میں آیا تو سب جمع تھے۔ نانا جان، نانو، ماما اور ڈوالتون، بہت عرصے بعد ساتھ بیٹھے تھے۔ نانا جان نے اسے دیکھ کر اپنے ہاتھیں پہلو میں جگہ بنائی تھی۔ دائیں پہلو میں ڈوالتون بیٹھا ہوا تھا۔

”ہم سوچ رہے ہیں، ہمارے گھر میں اب کسی حسین و خوب صورت وجود کا اضافہ ہونا چاہیے“۔ برہان لغاری نے کونین کی جانب دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا تو وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

”اوہ اس عمر میں بھی آپ کو کسی ایسے وجود کی ضرورت ہے؟“ فائقہ نے دوسرا مطلب اخذ کرتے ہوئے انہیں لگاڑا تھا۔

”سوئی عقل والی عورت! میرا اشارہ کونین کی طرف ہے، تم عورتوں کی عقل تو ہمیشہ گھاس چرنے لگی ہوتی ہے۔“

”بات ساری آدمی کے کردار کی ہوتی ہے۔“ فائقہ بیگم نے گہری چوٹ کی تھی کیونکہ انہیں معلوم ہوا تھا کہ برہان لغاری آج کل اپنے آفس میں آپریٹر سے خاصے تعلقات رکھے ہوئے ہیں۔

”ماما پلیز! بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی لڑائی بیڈروم میں لڑیں۔“ منال نے دبے لہجے میں ماں کو سرزنش کی تھی۔

”فکار کا پروگرام میں نے اس لیے نہیں بنایا تھا کہ بر خودار تمام ٹائم روم میں لاکند ہو کر گزار دیں پھر مزاج بھی ان کا اتنا اور رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کونین کسی لڑکی سے ٹوکرنے لگے ہیں مگر نہ معلوم کیا پرابلم ہے کہ بتانے سے گریزاں ہیں، حالانکہ میں نے اوپن آفر کی تھی۔“

”پلیز نانا جان!“ نانا جان کا بے باک انداز گفتگو اس کی حساس و سحری طبیعت پر گراں گزرتا تھا پھر گفتگو بھی اس پاکیزہ وجود کے متعلق جس پر اس نے کبھی تپتی نگاہ نہ ڈالی تھی، اس کے متعلق ایسے گھٹیا مشورے کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ وہ ان کی بات قطع کر کے سنجیدہ انداز میں گویا ہوا تھا۔

”کونین! آپ اس قدر کفیوز کیوں ہو رہے ہیں، ہم اسے بہو بنا کر لائیں گے۔ اس گھر میں واقعی ایک خوب صورت وجود کی ضرورت ہے۔ پرنس کے ایسے کوئی ارادے نظر نہیں آتے، انہیں ابھی صرف اپنی تعلیم سے پیار ہے جلد یا بدیر ان سے بھی کوئی لڑکی ایسی ضرور نکرائے گی جو ان کے خول کو توڑ کر پیار کرنا سکھائے گی۔“ فائدہ بیگم سامنے صوفے پر براجمان ذوالنون کی طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے کہہ رہی تھیں، جبکہ ان کے لبوں پر آویزاں مسکراہٹ کی خاطر وہ دھجے سے مسکرایا تھا مگر اس کی ذہین حساسیت سے لبریز آنکھیں کونین کے طرز عمل و مضطرب کیفیت کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

اور اس کے اندر گویا سانے سے اترنے لگے تھے۔ پیار چہرہ از زندگی سے بے رغبت بھی بھی آنکھیں، کنزور و شکست وجود۔ اس کی نگاہوں میں ایک سراپا لہرانے لگا جس کو دیکھے برسوں گزر گئے تھے مگر اس وجود کا، اس چہرے کا ایک ایک نقش اسے ازبر تھا۔ آج برسوں بعد وہ وجود، وہی انداز سے کونین میں براجمان نظر آئے تھے۔ وہ دل کی عمیق گہرائیوں سے کسی درد کو ابھرتے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی نالوثخیک کہہ رہی ہیں کونین! آپ اپنی خواہش کا اظہار تو کریں ہم ہر طرح سے پورا کریں گے۔“ برہان لغاری نے ہمیشہ اپنی زندگی میں بیٹوں کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی تھی۔ دو بیٹیوں سے انہیں دو بیٹیاں ملیں۔ اولاد زینہ سے ہنوز محروم رہے تھے۔ اب نواسوں کی صورت میں انہیں وہ دونوں ملے تھے جن کو وہ بیٹوں سے بڑھ کر چاہتے تھے، بے حد محبت کرتے تھے۔

”آپ کافی بچیں نانا جان! مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔“ ملازمہ کافی سرو کر کے گئی تھی۔ بھاپ اڑاتی گرم کافی کی پیالیاں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ کونین مسکرا کر ان سے مخاطب تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بڑا افساد تھا۔ جتنے لب، روتی آنکھیں، حزن زدہ چہرہ۔

مثال کن اکھیوں سے بچنے کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی کیفیت کا انہیں پوری طرح اندازہ تھا مگر جب دل پر نظرت کی برف جم جاتی ہے تو مستجابیسا لازوال گداز محبت بھرا احساس سب مرد پڑ جاتے ہیں۔ وہ بھی بے حس بنی اس کی محبت کے درد کو نظر انداز کرتی رہی تھیں۔

”آپ شادی کیوں نہیں کریں گے بھائی؟“ ذوالنون نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔

”ہاں..... ہاں ہاؤ یار! ہمیں نہیں ملتا چاہ رہے تو اپنے بھائی کو تو لازمی ملتا ہے۔ آپ کے انکار کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔“

برہان لغاری کافی کا بپ لیتے ہوئے مگر مندی سے گویا ہوئے۔

فائدہ بیگم اور مثال نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف تشریح بھری نظروں سے دیکھا۔ کافی کی پیالیاں ان کے ہاتھوں میں کانپ اٹھیں۔ اسی لمحے بے ساختہ اس کی نظریں ان کی طرف اٹھی تھیں۔ درد کا ایک اور تیر اس کے سینے میں ترادو ہو گیا۔

یہ مہربان وجود، کل تک اس کے لیے زندگی سے بھرپور سائباں تھے..... آج ان کی نامہربانوں کے باعث ہی وہ خود کو زندگی سے دور بہت دور محسوس کر رہا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا ان محبت بھری ہستیوں کی وہ مکروہ شکلوں کو نہ شناخت کر پاتا۔ اس دن اس کی سماعتیں بے آواز ہو جاتیں، جب اتفاقاً طور پر ان کی گفتگو اس نے سنی تھی، پھر ایک محبت کے کھونے کا دکھا سے نہ ملا تھا..... کئی محبت و چاہت بھرے رشتوں سے

دست بردار ہونا پڑا تھا۔ انسان عمر بھر کی کمائی یک دم لٹ جانے کے غم سے ہلاک نہیں ہوتا..... مگر جن رشتوں پر ایک عمر سے انحصار کرتا آیا ہو، وہ وچھن جائیں تو جینا محال ہے۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ خواہ مخواہ کونین کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ آج کل کے جوان اتنی جلدی پابند ہونا پسند نہیں کرتے، پھر کون سا ہمارے کونین کی عمر لگے جا رہی ہے جو آپ سیریس ہو رہے ہیں، جب ان کا موڈ ہوگا، خود کہہ دیں گے۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ لڑکے کے برسر روزگار ہوتے ہی اماں، اماں کے سر پر سہرا سہانے کی تیاریاں شروع کر دیتے تھے اور بے چارہ لڑکا ساری زندگی ڈسے داریاں دروڑے داریاں کی چکی میں پستاؤنیا سے سدھا جاتا تھا، اب ایسے نہیں ہوتا۔“ فائدہ بیگم ہوشیاری سے جینتر ابدل کر گویا ہوئی تھیں، کیونکہ انہیں ڈر تھا خدا نخواستہ کونین اپنی پسند کا اظہار کر دیتا ہے تو کون روک سکتا ہے ان کو من مانی کرنے سے، پھر ساتھ ان کے ذوالنون بیٹھا تھا جس کی ہٹ دھرمی و مشتعل مزاجی سے وہ دونوں ہی خوف زدہ رہتی تھیں۔ سیر کو سوا سیر مل جاتا۔ ان کی تمام سازش و مکاری دھرمی کی دھرمی رہ جاتی اور خضریٰ کو دلہن بن کر آتے یہاں کیا تا تم لگتا؟

”نانو جان کا خیال بالکل درست ہے۔ دراصل اب ہماری وراثتی کارماریٹ اسکوپ اتنا طاقتور نہیں رہا ہے کہ گاچک چائنا دورا لیمز کو زیادہ قابل بکھتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے چند ہفتوں میں، میں ان ممالک کا وزٹ کروں جہاں بزنس مارکیٹ کا مورال ٹاپ کلاس ہے۔ وہیں کوئی ملک منتخب کر کے بزنس کا سیٹ آپ کر دیں گے۔“ کونین کہہ رہا تھا۔ ذوالنون کی نگاہیں اس کے اترے، تھکے تھکے چہرے پر تھیں۔ اضطراب و اضطراب کا طوقان تھا جو ان کے اندر چکرانے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بڑے کمرے میں جمع تھے۔

بی بی جان کو اچانک ہی ووسی کی شادی کرنے کے ارمان جاگے تھے۔ یہ خواہش تو سب ہی کی تھی مگر ووسی سنجیدہ دکھائی نہ دے رہا تھا مگر اس پر بی بی جان کا دباؤ بڑھتا ہی گیا تو بالآخر وہ ہتھیار ڈال کر ان کی خواہش کے سامنے سرنگوں ہو گیا تھا۔ جامعہ میں امتحان چل رہے تھے۔ لڑکیوں کو اس دوران سر کھانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ پرسوں امتحان سے فارغ ہو کر وہ لمبا ریٹ کرنا چاہتی تھی مگر بی بی جان نے فقط دو دن ریٹ کے لیے دیئے تھے۔ اب وہ ان کے سامنے لائن حاضر تھیں مگر ووسی کی شادی کا سن کر ان کی باقی کوفت و تحسن بھاپ بن کر اڑ گئی۔

”بی بی جان! ووسی کی شادی کا چرچا کئی دنوں سے سن رہا ہوں۔ شادی کے لیے ایک عدد لڑکی کی بھی ضرورت ہے۔ آپ ووسی کی شادی ”لڑکی“ سے ہی کر رہی ہیں یا.....“ سمود کی زبان حسب عادت رواں ہوئی مگر ان کے خشونت بھرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ دائیوں تلے زبان دبا کر بیٹھ گیا۔

”ہاں..... کہوڑک کیوں گئے؟ لڑکیوں کی زبانوں کو بھی تم نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ہر وقت کتر کتر چلتی رہتی ہے، سوچے سمجھے



بغیر۔ نالائق کبھی کسی لڑکے کی شادی لڑکے سے ہوئی ہے؟“

”ہوئی ہے بی بی جان! حال ہی میں امریکہ میں دو.....“

”چپ ہو جانا مراد۔“ مثالیں ہمیشہ اچھے و نیک لوگوں کی دی جاتی ہیں۔ بد بخت و بدکار لوگ مثال نہیں بنتے۔ امریکہ کو کولبس نے دریافت کیا تو یہ کچھ زندہ سے دھنسا ہوا تھا، صدیاں گزارنے کے بعد وہ گند و کچھڑ و جل و حلا کے نئے و جدید شہر آباد ہو گئے مگر وہاں کی خلیس آج تک اس گند و خضن زدہ کچھڑ سے تسخیری ہوئی ذہنیت لے کر پیدا ہوتی ہیں جن کی گندگی و نجاست ان کے کردار اور فعال سے ظاہر ہوتی ہے۔“ بی بی جان کے مطالعے کی عادت ہر خبر سے باخبر رکھتی تھی۔

”بی بی جان! آپ نے وہی بھائی کے لیے لڑکی پسند کر لی ہے؟“ حورین نے محتاط انداز میں ان کی ٹونہ چھیچھی کی۔

”میں تو کہہ رہی ہوں وہی سے، اگر اسے کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دے۔ اچھا ہے ہم زحمت سے بچ جائیں گے مگر یہ ماننا ہی نہیں۔“

”آپ کی پسند ہی میری پسند ہوگی بی بی جان!“ وہی کے لہجے میں اعتماد و عقیدت تھی۔

”تم کیا کہتی ہو سیرا؟ کسی لڑکی کو بہو بنانا پسند کرو گی؟“ وہی سے مطمئن ہو کر وہ سیرا سے مخاطب ہوئیں جو تمہیرا کے ساتھ سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر گویا ہوئیں۔

”بی بی جان! ہم آپ سے بہتر کس جان سکتے، آپ کی پسند ہی ہماری پسند ہے۔ ان بچوں کو ہم سے زیادہ آپ نے پرورش کیا ہے۔“

”بھلی بھلی بہو آئے گی، کچھ تو بتاؤ کسی ہو؟“

”رنگ صاف ہو اور تھوڑی اسمارٹ۔“ ان کے ہا ہا کہنے پر سیرا کہہ بیٹھیں۔

”یہ کیسی کم ظرفی و گندہ ذہنیت والی بات کر دی تم نے سیرا۔“ وہ ناک پر پھیلتا چشمرہ دست کرتی ہوئی حیرانگی سے گویا ہوئیں۔

”میں نے کچھ غلط کہہ دیا بی بی جان؟“ وہ شٹھائی۔

”گوری بہولانے کی چاہ ہے تمہیں بھی۔ وقت کے چلن کے ساتھ مت چلو۔ گوری ذہین گھونگھٹ اٹھتے ہی گوری سے ”گوریلہ“

بن جاتی ہے اور ری بات اسمارٹس کی تو دو بچوں میں آج کل لڑکیاں غبارہ بن جاتی ہیں۔ حسن و جوانی کبھی سدا رہنے والی چیز نہیں ہیں۔ وقت ہر ذی روح کو جس نہیں کر کے رکھ دیتا ہے۔ ہمیشہ صورت سے زیادہ سیرت و اخلاق والے لوگ پسند کیا کرو۔“ ان کا انداز ناصحانہ تھا۔

”میرا مطلب یہی تھا بی بی جان!“ سیرا جھینپ کر گویا ہوئی تھیں۔

”خیر تمہاری بات نہیں، آج کل لوگوں کا مزاج یہی بن گیا ہے۔ اپنے گھر میں کالی کھوٹی بیٹیاں بیٹھی ہیں، خواہ گھر میں لڑکے کا رنگ اُلٹے توئے جیسا ہو، بہو چاہیے دورہ جیسی سفید، جب وہ گوری چڑی کی بہو، اپنی طبیعت کی سیاہی ہر سو پھیلاتی ہے تو پھر ایسی عورتیں سر پکڑ کر روتی ہیں کس سے اچھا تھا ہم ایسی بہو لے آتے جو خوب صورت نہ ہوتی مگر دل جس کا حسین ہوتا، مزاج جس کا خوب صورت ہوتا۔“

”او گاڈ! بی بی جان تو انسان کو شرمندہ کر کے بھی نہیں چھوڑتیں۔“ زویا نے سرگوشی کی۔

”حمیرا! شفقت بھائی کی بیٹی دیکھی ہے تم نے؟ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ اس نے گریجویشن کیا ہے۔ پچھلے ہفتے ایک محفل میں ملاقات ہوئی تھی، بہت تیز رفتار اور باادب لڑکی ہے، حالانکہ اکلوتی ہونے کے باعث گمراہی کی لاڈلی ہے مگر میں نے اس لڑکی میں ذرا بھی کوئی ایسی بات نہ دیکھی جو آج کل کی بگڑی لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ رنگت چینیلی کی طرح نکلتی ہوئی ہے، نین نقوش جاذب نظر، ہر لحاظ سے وہی کے لیے موزوں ہے۔“

”بی بی جان! پھر دیر کس بات کی؟ ابھی چلتے ہیں بات چکی کر آتے ہیں۔“ حمیرا، حمیرا دونوں خوش خوش کھڑی ہوئی تھیں۔

”ہاں..... چلو، مجھے امید ہے شفقت بھائی انکار نہیں کریں گے۔“ وہ اٹھ کر تیار ہونے چلی گئیں۔

”یارو! مجھ پر بھی بی بی جان کو رحم آ جائے۔ ذمہ کرو سب مل کر (آمین)۔“ سوہو گنگنا تا ہوا وہی کے گلے لگ گیا۔ بڑوں کے بعد وہ سب وہی کو گھیرے ہوئے تھے۔

”یارا سب سے پہلے میرے سر پر ہاتھ بھیرو۔“ ہریرہ سر جھکا کر اس کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

”تاکہ میں بھی جلد سے جلد یہ مبارک دن دیکھوں۔“ جو باؤسی نے بڑے درویشانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ بھیرا۔

”بابا! صرف میرے ہی نہیں، اس کے سر پر بھی ہاتھ بھیرو۔“ اس کے انداز پر سب ہنس پڑے تھے۔ ہریرہ حورین کا ہاتھ پکڑ کر گویا ہوا تھا۔

”تم بکواس کرنے سے باز آنا تا۔“ حورین نے جھکے سے ہاتھ چھڑایا۔

”ہمارے دیدہ تر کو محبت ہوگئی تم سے

کسی گہر سمندر کو محبت ہوگئی تم سے

کسی لمحے اگر تم کو محبت ہوگئی مجھ سے

مجھ لینا مقدر کو محبت ہوگئی تم سے“

”ہونہہ، اسی آرزو میں مرجانا تم۔“ حورین تن تن کرتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ وہ تینوں بھی چلی گئیں۔

”چلو بھائیو! اب ہم یہاں ڈک کر کیا کریں گے۔ کائنات کے تمام رنگ یہاں سے غائب ہو چکے ہیں۔“

☆.....☆.....☆

صنوبر بیگم محسوس کر رہی تھیں جب سے حضرتی کی بات چکی ہوئی تھی۔ راحیلہ بیگم کو چپ سی لگ گئی تھی۔ گفتگو تو وہ پہلے ہی بہت کم کیا کرتی تھیں۔ اب ان کی خاموشی عجیب تھی۔ یہی خیال انہوں نے صدر صاحب سے ظاہر کیا تو وہ چونک کر گویا ہوئے۔

”مماراشی نہیں ہیں کیا، اس رشتے پر؟“

”نہیں ان کی مرضی سے ہی رشتہ قبول کیا ہے، انہوں نے خود بہان اور مسز بہان سے رضامندی ظاہر کی ہے۔ آپ موجود تھے اس وقت“۔ صد صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”پھر کیا بات ہو سکتی ہے؟ آپ نے حضرتنی سے معلوم کیا تھا، کہیں ایسا تو نہیں، یہاں اس کی دلچسپی نہ ہو، کیونکہ وہ ہم سے زیادہ ماما کے قریب ہے، بہت کلوز فرینڈ شپ ہے ماما سے حضرتنی کی“۔ صد صاحب بڑے سوچے انداز میں گویا تھے۔

”آپ بھی کسی باتیں کرتے ہیں ماما ستنے اہم موضوع پر میں حضرتنی سے اس کی مرضی معلوم نہ کروں گی۔ لہاں سے جوتے تک میں اس کی پسند و مرضی کا خیال رکھتے آئے ہیں تو زندگی کا سماجی منتخب کرنے کے لیے ہم اپنی مرضی کریں گے“۔

”میں یہی تو سوچ رہا ہوں پھر ایسی کیا بات ہو گئی جو ماما پریشان ہیں“۔ وہ مسکرا کر گویا ہوئے تھے۔

”منال بھابی نے کال کی تھی، وہ بڑی ہیں آنہ سکیں گی پھر ذوالنون اور کونین نے بھی کافی ٹائم سے یہاں چکر نہیں لگایا، ماما انہیں دیکھ کر کافی خوش ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے میرا وہ ہم ہو کہ وہ حضرتنی کی بات پکڑ کر کرنے کے بعد سے متحمل رہنے لگی ہیں، شاید وہ ان دونوں بچوں کو یاد کر رہی ہوں۔ ذوالنون تو ویسے بھی کم آتے ہیں، البتہ کونین بنتے میں کئی چکر لگایا کرتے تھے، وہ بھی نہ معلوم کیوں نہیں آ رہے“۔

”میں کال کر کے معلوم کرتا ہوں اور جانتا ہوں ماما اور ہم لوگ کتنے اداں ہو رہے ہیں اس کے بغیر“۔

فون تو ہم بھی کر سکتے ہیں مگر منال بھابی کی وجہ سے نہیں کرتے۔ ان کو پسند نہیں کہ ہم ان کی اولاد سے کوئی رابطہ رکھیں۔ مگر آفس کہیں بھی۔ ہم اس خوف سے فون نہیں کرتے کیونکہ وہ آفس میں بھی ان کے ساتھ ہی ہوتی ہیں“۔

”وہ دونوں اب بچے نہیں رہے بیگم۔ ماشاء اللہ اب جوان ہیں اور عقل و سمجھ داری میں ہم سے بھی آگے ہیں۔ بھابی بیگم ہوں یا ان کے والدین۔ وہ ہمارا نمبر سیل اسکرین پر دیکھ کر خود سیف کر لیتے ہیں۔ میں تو عموماً بات کرتا رہتا ہوں، کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ ذوالنون کے اسی بنتے امتحانات ختم ہوئے ہیں، چند دن پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ جب اس کے امتحانات ہو رہے تھے“۔

”حضرتنی کی معنی کی تاریخ مانگ رہے ہیں وہ لوگ۔ ماما سے بات کی تھی میں نے، وہ کہہ رہی ہیں سب ساتھ بیٹھ کر مشورہ کر لو، جب کسی کی کوئی مصروفیت نہ ہو تو وہ تاریخ ان کو دے دی جائے“۔ خاصے عرصے بعد صد صاحب صنوبر کو فارغ ملے تھے۔ وہ فرصت سے باتیں کر رہی تھیں۔

”اگلے بنتے مجھے ایک کانفرنس میں اسلام آباد جانا پڑے گا، تب تک ہسپتال کی تمام ڈسے داریاں حضرتنی اور ہنزہہ پر رہیں گی اور اس سے آگے آنے والے کئی بنتے ہمیں ٹائم نہیں ملے گا۔ دراصل ہم اور سینئر زل کر ایک تحریک چلا رہے ہیں۔ ان بے ایمان اور بے ضمیر لوگوں کے خلاف جو میٹاؤں کے بہروپ میں چور لٹیرے ہیں، ان جیسے شیطان صفت لوگوں کی گناہوں کی کاوشوں کے باعث آج انسانی اعضاء کا کاروبار عروج پر ہے۔ خاص طور پر گردے کی تجارت سرفہرست ہے“۔

”انسان اپنے مقام سے کتنا گرتا جا رہا ہے۔ دولت حاصل کرنے کی ہوس میں وہ اللہ کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ موت کو بھی بھول

جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک نینوز چینل پر ایک خبر دیکھی تھی۔ پڑوسی ملک کے نوجوان کے کوئی ایسا ہی ڈاکٹر دونوں گردے نکال کر فرار ہو گیا تھا۔ اس لڑکے کا درد و کرب میں تڑپتا چہرہ، بے بسی سے بہتے آنسو میں آج تک بھلا نہ سکی ہوں۔ "صنوبر کے لہجے میں رنج و ملال تھا۔

"ایسے بے شمار کیسز ہمارے یہاں بھی موجود ہیں۔ ہم یہی کوشش کر رہے ہیں، لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات، بہم پہنچائی جا سکیں، بلکہ ہم ایک ایسا قانون پاس کروانے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں لوگوں کو اس امر کے لیے راضی کیا جائے کہ وہ بخوشی اپنا ایک گردہ وقف کریں، جب ایسا ہوگا تو از خود ہی یہ چوریاں رک جائیں گی۔ مردہ خمیر لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ ایسے لوگ بھی راہ راست پر آجائیں گے جو کاروبار کرتے ہیں اور ضرورت مندوں سے لاکھوں روپیہ ہوتے ہیں۔"

☆.....☆.....☆

کرن بالکل صحت یاب ہو گئی تھیں۔ اب چھڑی بھی استعمال نہ کر رہی تھیں۔ بغیر چھڑی کے وہ چلتے ہوئے بے حد خوشی محسوس کر رہی تھیں۔ اسی خوشی میں انہوں نے آج ڈنر پر خاصا اہتمام کیا تھا اور اپنے ہاتھوں سے کئی ڈشز بنائی تھیں۔ بہت خوش گوار ماحول میں کھانے اور گرین ٹی کا دور چلا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سعد اور فارید نے اس کو تحائف دینے سے انس پہلے ہی بلیک ڈائمنڈ کاٹنگس سیٹ گفٹ کر چکا تھا۔ "کرن! میں سوچتا ہوں میں اس قابل تو نہ تھا کہ تم جیسی شریک حیات مجھے ملتی۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر تم مجھے نہ متیں تو آج زندگی کا چہرہ اتنا حسین نہ ہوتا۔ اتنے بڑے سائے سے گزر کر کیا میں اس طرح خوش و مطمئن رہ سکتا تھا؟ اس نے میرے جذبوں کو، میرے احساسات کو، محبت کو قتل کر دیا تھا، جذبوں کا قتل انسانی قتل سے زیادہ سنگین ہوتا ہے لیکن شاید میرے جذبوں میں ابھی کچھ جان باقی تھی۔ احساسات پوری طرح ہلاک نہ ہوئے تھے۔ محبت لب جاں تھی تمہاری رُخِ غلوم رفاقت پاکر از سر نو ہر جذبہ، ہر احساس بیدار ہوا اور میں خود کو آج خوش نصیب انسانوں میں شمار کرتا ہوں۔" وہ سامنے بیٹھی کرن سے پیار بھرے لہجے میں مخاطب تھے۔

"آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں جن سے مجھے شرمندگی ہو، آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے جو مجھ سی ادنیٰ حیثیت کا آپ نے رتبہ بڑھایا ہے۔ مان دیا ہے، وگرنہ میں خاک کے ذرے سے بھی کتر و بے وقعت تھی۔" کرن کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے۔ "اوپنہ..... یہ حسین رات آنسو بہانے کے لیے نہیں ہے۔" انس نے بڑی چاہت سے ان کے آنسو اپنی آنکھوں کی پوروں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

"میرا دل چاہتا ہے تجھ پر محبت بار بار دہرائتا رہوں، کیونکہ ہر بار مجھے ایک نئی سرشاری و مسرت محسوس ہوتی ہے۔" بلوسا ڈمی میں اس کے حسین چہرے پر چھائی قوس قزح بہاروں کی طرح دل کش لگ رہی تھی۔

"نہ معلوم کیا بات ہے، میں آج کل شدت سے محسوس کر رہی ہوں کہ حورین کی یاد مجھے ہمہ وقت آنے لگی ہے۔" بہت خوب صورتی سے انہوں نے ان کی وادگی سے بچنے کی راہ نکالی۔

"بہت استاد ہو۔" وہ خوشی سے مسکرا کر گویا ہوئے۔

”حورین کے امتحانات ختم ہو گئے ہیں۔ ہریرہ اور نثر بھی فارغ ہیں، ہم ان کو کل ہی بلوا لیتے ہیں۔“

”حورین یہاں آنے کو راضی نہیں ہے، میری آج فون پر بات ہوئی ہے، وہ کہتی ہے یہاں بوریت ہے اور بی بی جان نے وصی کے لیے لڑکی پسند کر لی ہے، وہ جلد ہی وصی کی شادی کا ارادہ رکھتی ہیں۔“

”مجھے بھی کال کی تھی، سمیرا بھائی اور انظہر بھائی نے بھی مبارک باد دی تھی۔ میں نے سحہ کو کہا ہے کہ وہ قاریہ بھابی کو لے کر مبارک باد دینے جائیں۔ اتنے اہم موقع پر انہوں کی شمولیت ضروری ہے۔“

”سحہ بھائی نے کیا جواب دیا؟“

”سحہ نے کوئی جواب نہیں دیا، جانتی ہو قاریہ بھابی تمہاری تمہائی کے خیال سے جانا پسند نہیں کریں گی۔“

”میرا خیال رکھنا ایسا ضروری نہیں ہے۔“

”محبت خیال رکھنا سکھا دیتی ہے جان من۔“

”ایک سر پر اندوڑوں آپ کو۔“ وہ انس کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پولیس تو وہ سرور سے اٹھ بیٹھے۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔“ انس کے انداز میں تجسس تھا۔

”میں..... آپ لوگوں کے ساتھ کراچی چلوں گی۔“

☆.....☆.....☆

”ہریرہ، ہریرہ۔ کہاں ہو بھئی؟“ حورین نے تیز لہجے میں کہا۔

”دل کی آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ہر جگہ، ہر سمت، ہر سو مجھے ہی پاؤ گی۔“ وہ دو جہرے پر شہر مسکراہٹ سجائے اس کے سامنے تھا۔

”ہریرہ! میں سیریس ہوں۔“

”مجھے سیریس ہونے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔“

”تم اسی حسرت میں مر جاؤ گے، سمجھے۔“

”ذرا پیار سے سمجھاؤ تو شاید سمجھ جاؤں۔“

”ہمیں شاپنگ کرنی ہے، تم ٹافٹ تیار ہو جاؤ۔“

”شاپنگ پر؟ نہ بابا معاف کرو۔“ اس نے فوراً کان پکڑے۔

”شاپنگ سینٹر چلنے کو کہا ہے، پچانسی کے تختے پر لٹکے کو نہیں کہا۔“ اس کی شوخیاں حورین کو ہمیشہ چڑا دیا کرتی تھیں۔

”ایک ہی بات ہے تم تو ایک ٹاپس کی جوڑی بھی پورا شاپنگ سینٹر چمانے کے بعد لیتی ہو، پوری شاپنگ کرو گی تو لگتا ہے میں

بوڑھا ہو کر واپس آؤں گا۔“ ہریرہ کہاں باز آنے والا تھا۔

”مبالغہ آرائی کوئی تم سے سیکھے۔“

”تم چل رہے ہو یا نہیں؟“ وہ پاؤں بیچ کر یولی

”ایک شرط پر چلا ہوں۔“

”کیسی شرط؟“

”پہلے..... کہو آؤ تو یوں۔“ وہ مسکرایا۔

”جنم میں جاؤ۔“ حسب توقع وہ غصے سے چینی تھی۔

”مائی ڈیئر! تمہارے بغیر کہیں دل نہ لگے گا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہارے بغیر جانیں سکتی، دیکھنا تمہیں جا کے دکھاؤں گی، بڑے آئے سپر مین بن کر۔“ وہ اسے شعلے لگتی

لگا ہوں سے دیکھتی ہوئی گیٹ کی جانب بڑھنے لگی تھی۔

”بچھتاؤ گی، بازار میں گم ہو جاؤ گی۔“

”کچھ اس کرتے رہو، میں تمہیں جا کر دکھاؤں گی۔“ وہ اسے پھینچ کرتی ہوئی واپس چلی۔ اس کا پرس صوفے پر ہی پڑا رہ گیا تھا۔

ہریرہ نے پرس سے رقم نکال کر وہیں چھوڑ دیا اور خود اپنے روم میں آ کر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا حورین اس کے اور رقم لیے

بغیر نہیں جائے گی۔

☆.....☆.....☆

پورا ایک ہفتہ اس نے بہت خاموشی سے کونین کی حرکات و سکنات کو سمجھنے اور دیکھنے میں لگا دیا اور اس دوران اس پر کئی انکشافات

ہوئے کہ کونین کسی ایسی پریشانی میں مبتلا ہے جو اسے ہر دم گھیرے رہتی ہے۔ شوخ و خوش مزاج کونین بنجیدہ و آدم بیزار ہو گیا تھا۔ خاص بات

جو اس نے نوٹ کی تھی وہ بہت حیرت انگیز و گہرا انگیز تھی۔

مما اور اس کے درمیان خاصے فاصلے آ گئے تھے۔ نانو سے بھی دور ہو گیا تھا۔ یہ انکشافات ایسے تھے کہ اسے حقیقی معنوں میں

تشویش نے آن گھیرا تھا، کیونکہ کونین نے شروع سے ممما کی سائیڈ لی تھی، وہ از حد مہربان تھا ان پر، ان کے خلاف کوئی جائز لفظ بھی سننے کا روا

دار نہ تھا۔ ان کے حکم پر وہ آنکھیں بند کر کے عمل کرنے کا عادی تھا۔ اب نہ معلوم ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ ممما سے بات بھی برائے نام کرتا تھا اور

زیادہ تر وقت اپنے روم میں گزارنے لگا تھا۔

”ہمارے درمیان یہ جینسی فاصلوں کی خلیج کیونکر پیدا ہوئی ہے بھائی؟“ وہ موقع دیکھ کر اس کے پاس جا پہنچا تھا۔

”کیسے فاصلے؟ کیسی خلیج؟ میں تو تمہارے پاس ہوں، تمہارے قریب۔“ کونین کہتا ہوا اس کے گلے سے لگ گیا تھا۔ ذوالنون

نے بھی بڑی چاہ سے اسے لپٹا لیا تھا۔ کونین کی آنکھیں بھرا آئیں، بمشکل انہیں چھلکے سے روکا تھا۔

”بھائی! آپ جانتے ہیں میرا بچپن، بچپن میں رخصت ہو گیا تھا۔ چھ سات سال کی عمر میں میرا ذہن بالغ ہو گیا تھا پھر اب تو واقعی میں بڑا ہو چکا ہوں۔ اس لیے مجھ سے جموٹ بولنے کی کوشش بالکل مت کیجئے گا۔ سچ کی پرکھ ہے مجھے۔“ وہ بھائی کے رنگ بدلنے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تم جو پوچھتا چاہتے ہو پوچھو، میں سچ بولنے کی کوشش کروں گا۔“ کونین کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بددلی واضح تھی۔

”شادی سے انکار، پھر ملک سے فرار ہونے کا منصوبہ کس لیے ہے؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا ناں تمام مسائل۔“

”آپ نے حقیقت چھپائی ہے۔ اس دن بھی مجھے آپ کے لفظوں سے جموٹ کی بو آ رہی تھی اور ابھی بھی وہ بو برقرار ہے۔“

ذوالنون کے انداز میں گہری سنجیدگی تھی جس سے اپنائیت، بے حد محبت و اُنسیت کی خوشبو آ رہی تھی۔

اس کا دل تو پہلے ہی گھائل و اجڑا ہوا تھا۔ اپنوں کی سازش نے اس سے زندہ رہنے کی اُنسگ ہی چھین لی تھی۔ پہلی بار اس نے باپ کی کمی کو پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ ان کی موجودگی میں اسے اس دورے نہیں گزرنا پڑتا، اگر ایسا ہوتا بھی تو وہ باپ کے سینے سے لگ کر وہ تمام اُنسو بہا دیتا جو اس کے اندر گروہے ہیں اور اس سکتے اُنسوؤں کی ٹھنڈی بڑھ کر اسے بے گل کیے دے رہی تھی۔

ذوالنون کو دیکھ کر اسے بڑی اتھوٹ ملتی تھی۔ اپنی مضبوطی کا احساس ہوتا تھا، اس لیے بھی وہ چاہ رہا تھا کہ اس کے سینے سے لگ کر وہ تمام اُنسو بہا ڈالے جو اس کے اندر تیزاب بن رہے ہیں۔ وہ وجہہ شکل، ڈچین آنکھوں، حساس دل والا ذوالنون، اس کے چہرے کے ہر نقوش سے وہ اپنے لیے پیار و مگر مندی جھلکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

مما کے رویے سے بدظن ضرور تھا مگر انہیں کوئی رنج پہنچانے کا ارادہ نہ رکھتا تھا، اس لیے ہونٹوں پر گلل لگا لیے تھے کہ ایک عرصے بعد ذوالنون اس کے قریب ہوا تھا۔ ان کا خیال رکھنے لگا تھا، اگر اس کے منہ سے سچائی نکل گئی تو وہ ایسا تباہ کن طوفان بن جائے گا جس کی زد سے کوئی شے تباہ ہونے سے نہ بچ پائے گی۔

”بھائی! جموٹ کے لیے اتنا سوچنا پڑتا ہے، سچ ان احمیاط سے مبرا ہوتا ہے۔“ وہ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر کہہ بیٹھا۔

”سچ تم مان نہیں رہے، اب جموٹ بولنے کے لیے سوچنا تو پڑے گا۔“ وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

”مجھے افسوس رہے گا اس بات کا کہ آپ نے مجھ پر احماد نہیں کیا۔“ یک دم ہی اس کے لہجے میں ڈھیروں سحکن اور افسردگی در آئی۔ کونین مضطرب ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیا کہے جو ذوالنون کو مطمئن کر دے اور اس کی پردہ داری بھی قائم رہے۔ اس کی نظریں خلاؤں میں بھٹکنے لگیں۔

”میری جان! میں تم پر سب سے زیادہ اہتمام و اعتماد کرتا ہوں، مگر ایسا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں جو تم سے شیئر کروں۔“ اسے مسلسل خاموش دیکھ کر کونین نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”بڑا پیار آ رہا ہے تمہیں اپنے اس سڑیل حزان بھائی پر۔“ میرون و گولڈن بیاردی ورک والی ساڑھی میں ہلکی پھلکی تیاری میں

منال وہاں آکر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

”آپ زیادتی کر رہی ہیں ماما پر بس جیسے لوگ دنیا میں کم ہی آتے ہیں۔“

”ہاں، آپ بھائی کی حمایت نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔“ وہ ہنستے ہوئے ان کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔

”ماما! آپ نے اس بات کا نوٹس کیوں نہیں لیا؟“

”کس بات کا پر بس؟“

”بھائی کسی دوسرے ملک میں سیٹل ہونے کی بات کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ پوری سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔

”پر بس..... پر بس کی وجہ سے۔“ وہ بڑی طرح گڑبڑا گئیں۔

”یہ کوئی وجہ نہیں ہے ماما! ہمارا پر بس بہت مضبوط پوزیشن میں ہے۔ چائیز اور جاپانیز آئٹمز ہماری تیار کردہ مصنوعات کا کسی طور

مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں، اس لیے ہمیں بیرونی مارکیٹ میں فضول محنت کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں قطعیت تھی۔

”بابا کے جانے کے بعد بھائی کے جانے کی گنجائش رہتی ہے؟“ پرانے زخموں سے ناکھٹے ٹوٹنے لگے تھے۔ کیا ہماری قسمت یہی

ہے کہ ہم ایک ایک کر کے ایک دوسرے سے جدا ہوتے رہیں، سسکتے رہیں؟ جدائیاں ہی ہمارا مقدر ہیں؟“

”پر بس! یا اس قدر جذباتی کیوں ہو رہے ہو؟“ کونین نے اس کے شانے پر بازو رکھتے ہوئے کہا مگر اس کا موڈ بدستور آف تھا۔

”نانا جان! ٹھیک کہتے ہیں آپ کی شادی ہونی چاہیے، پھر ہم دیکھیں گے، آپ کہاں بھاگتے ہیں، کیوں ماما! آپ کا کیا خیال

ہے؟“ اس کا موڈ یک دم ہی ہشاش بشاش ہو گیا۔

”اوہ..... پر بس! آپ بھی ایسی تنگ کو کر سکتے ہیں۔“ منال سرت بھری حیرانگی سے گویا ہوئی تھیں۔ وہ دونوں مسکرائے تھے۔

”ماما! میں بھی اس دنیا کی مخلوق ہوں، ہنسنا مسکرانا آتا ہے مجھے۔“

”یوں کہہ سکتے ہیں اس معاملے میں کبھی نہیں۔“

”اوکے، جیسا تم چاہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شانے اُچکائے۔

”مجھے شاپنگ سینٹر جانا ہے، چل رہے ہو کونین؟“

”پر بس کو لے جائیں ماما! ان کو بھی تجربہ ہونا چاہیے۔“ منال کی طرح اس کا انداز بھی جھینپا جھینپا سا تھا۔

”میں اور شاپنگ، کم از کم مجھے لیڈ بزنس شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور نہ ہی میں کار میں بیٹھ کر منتظر کر سکتا ہوں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا، میں اپنی شاپنگ خود کرتی ہوں اور ایک ہی بوتیک سے کرتی ہوں، چائیم ضائع نہیں کرتی۔ آپ چل کر پور نہیں

ہوں گے پر بس! اور اصل کونین نے آج تین مینٹلز انٹینڈ کی ہیں، بہت تھک گئے ہوں گے، اس لیے آپ کو ہی چلانا ہوگا میرے ساتھ۔“ اس

کے لہجے میں بان بھرا اصرار تھا، سو وہ راضی ہو گیا۔

☆.....☆.....☆



وہ غصے سے مول کو لے کر مارکیٹ چلی آئی تھی۔ اس نے پرس چیک کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ چھوٹی موٹی شاپنگ کی ادائیگی مول نے کی تھی، پھر بوتیک سے انہوں نے خاصی خریداری کی تھی۔ کپڑے، جیولری، جوتے اور میچنگ پرس۔ ایک کے بعد ایک وہ چیک کرواتی گئی تھیں، کاؤنٹر پر شاپرز کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

”مول! پرس سے روپے غائب ہیں۔“ مل کی ادائیگی کے لیے جیسے ہی اس نے پرس کھولا، رقم کو غائب پا کر پریشانی سے گویا ہوئی۔

”میرے سامنے تو تم نے رکھے تھے، آرام سے دیکھو۔“

”نہیں ہیں..... بار بار دیکھ چکی ہوں۔“ گلف شاپنگ کرنے وہ پہلی بار آئی تھیں۔ کاؤنٹر ادر چہرے سے سخت مزاج لگ رہی تھی۔ اس سے کسی لحاظ و مروت کی توقع ہی عیب تھی۔

”اوہ۔ میرے پرس میں بھی معمولی سی رقم ہے اور یہ میڈم مجھے رعایت دیتی ہوئی نظر بھی نہیں آ رہی۔ بڑی سیکی ہوگی اگر انہوں نے ہماری درخواست نہ مانی تو.....“

مول بھی اس صورت حال پر سخت پریشان ہو گئی تھی۔

”ریٹیکس..... میں بات کرتی ہوں، اگر چاہیں گی تو اعتبار کریں گی، ورنہ سامان واپس کر دیں گے۔“ حورین کی خود اعتمادی موڈ کر آئی تھی۔

”پلیز! واپسی کی بات مت کرو، کسی طرح سے راضی کر لو کہ وہ سامان ہمیں دے دے، مگر جا کر ہم چارجز پہنچا دیں گے۔“ مول کسی طرح سے وہ سامان چھوڑنے کو راضی نہ تھی۔

ذوالنون منال بیگم کو بوتیک میں مصروف چھوڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ خوب صورت انداز میں سگی سجائی بوتیکس اور شاپس پر لڑکیوں و عورتوں کا رش تھا۔ ہر چہرہ عموماً وقت کی قید سے آزاد میک آپ کے ڈھیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ انٹرمارڈرن، فیشن ایبل نظر آنے کی جستجو میں باوقار لباس و باحیا انداز کو خیر باد کہتیں، دعوت نگارہ دیتی، وہ عورتیں اور لڑکیاں اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں جن کی نگاہوں کی زد میں وہ خود کو مسلسل محسوس کر رہا تھا اور اسی احساس نے اس کے چہرے پر ناگواری و نا پسندیدگی کے رنگ بکھیر دیئے تھے۔ وہ ان سٹائشی نظروں کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، جب اس کی نگاہ سامنے اٹھی تھی۔

شاکنگ پنک سوٹ پر بلیک اشارز کے فینسی کام والے لباس میں اس کے چہرے کی گلابیاں نمایاں تھیں، کاؤنٹر پر شاپرز کا ڈھیر تھا۔ قریب دو کھڑی کاؤنٹر پر موجود خاتون کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ عورت مسلسل لٹی میں سر ہل رہی تھی۔

ذوالنون اس کی طرف بڑھ گیا۔ قدموں کی آہٹ اور تیز کلون کی خوشبو پر اس نے دیکھا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ آہستگی سے بولا۔

”میں..... رقم گھر بھول آئی ہوں۔“ اس کے منہ سے بروقت نکلا۔

”نو پراہلم“۔ کہتا ہوا وہ آگے بڑھا اور اس کے انکار کے باوجود کاؤنٹر پر ادا ہو گئی کر دی تھی۔ حورین مارے شرمندگی و توہین کے کٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ ادا ہو گئی کر کے جا چکا تھا، مگر اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔

”حورین! میں نے باری باری سب کو فرائی کیا ہے۔ لگتا ہے سامان چھوڑ کر ہی جانا پڑے گا۔“ مول اس کی کیفیت سے بے خبر قریب آ کر گویا ہوئی تھی۔

”نہیں، شوگر کو بلاؤ، وہ سامان لے کر جائے گا۔“

”یہ کیا بول رہی ہو تم؟ اور تمہیں ہوا کیا ہے۔ اتنی سردی میں بھی پیسے میں تر ہو، چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“ مول حیران و پریشان تھی۔

”سامان کی قیمت، ذوالنون نے ادا کر دی ہے۔“ ان چند لفظوں کی ادا ہو گئی نے گویا اس کے حلق میں خراشیں ڈال دی تھیں۔ کتنا تکلیف دہ و اذیت ناک ہوتا ہے ان لوگوں سے ایسے وقت میں مدد حاصل کرنا، جب خواہشوں کے انہار سامنے ہوں اور پرس خالی۔ اس کے سامنے ہمیشہ اپنی خودداری و انا کا پرچم اس نے بلند رکھا تھا اور اس طرح بھرے گئے میں وہ اس کی خودداری و انا پر بھر پور چوٹ لگا گیا تھا اور وہ خود کو زمین میں دھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”اوہ! ذوالنون بھائی یہاں آئے تھے؟“

”کاش اس کے آنے سے قبل موت آ جاتی۔“ دل سے کراہ نکلی۔

”تم نے ان سے کہا کہ ہم رقم گھر بھول.....“

”پلیز! شوگر کو بلاؤ، لوگ ہماری طرف متوجہ ہو چکے ہیں، مگر جا کر سب معلوم کر لینا۔“ مول کی ذوالنون کے نام پر بڑھ چوٹی اسے ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ منہ بنا کر بولی۔ مول اس کی جانب دیکھتے ہوئے شانے اچکا کر باہر نکل گئی، چند لمحوں بعد ڈرائیور اس کے ہمراہ تھا۔

”تمہارا موڈ کیوں آف ہو گیا ہے، حالانکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ.....“

”اس نے مجھ پر احسان نکھیم کیا ہے۔“

”احسان تو احسان ہی ہوتا ہے، اب تم نہ مانو تو دوسری بات ہے۔“

”وہ احسان تو ایسے کر کے گیا، گویا بیک دے کر گیا ہو، بل ادا کرنے کے بعد ایسا گیا ہے جیسے کسی فقیر کے کٹورے میں نوٹ ڈالنے کے بعد کوئی بندہ مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔“ وہ بویک سے نکل کر فرسٹ فلور کی جانب بڑھتے ہوئے اسے تمام رووا دنا سنا چکی تھی، جسے سن کر مول نے کہا۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو حور! اصل میں وہ اتنی نرم طبیعت کے ہیں تمہاری سبکی کے خیال سے پھر مخاطب نہ ہوئے ہوں گے۔“

”میں سب جانتی ہوں، تمہاری اور اس کی فطرت۔“

”اوہ خدایا، تم خواہ مخواہ انگارے چپاری ہو، بجائے ان کی منونیت کے، تم انا الزام لگا رہی ہو ان پر، اگر انہیں تماشہ ہی دیکھنا ہوتا تو وہ آکر بل کیوں ادا کرتے؟“ مول کو اس کے انداز پر اعتراض تھا۔

”بس خاموش رہو، میں جانتی ہوں تم ویسے بھی اس کی ہمدردی کے فوری میں جتلا رہتی ہو، تمہیں میں ہی غلط نظر آؤں گی۔“ وہ چمکی۔

”مائی گاؤ تم نہ معلوم کب ان کی خطائیں معاف کرو گی؟ تمہارے ساتھ وہی مثال فٹ ہوتی ہے۔ نیکی کر دیا میں ڈال۔“ مول ہنستے ہوئے باہر نکل آئی تھی، جبکہ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

باہر سردی کا احساس نمایاں تھا، ہوا میں بھی ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔

”حورین! باہر سردی کچھ زیادہ ہی لگ رہی ہے، یہاں سے گھر کا قافلہ طویل ہے، کیونکہ نہ کافی پی لیں، کیفے بھی سامنے ہے۔“

مول نے دوپٹے کو اٹھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔

”میرا سو ڈال نکل بھی نہیں ہے۔“

”ہلیز! میری خاطر پی لینا۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

”یاد کرو، ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں، بل کی ادا تھی کے لیے اب کون آئے گا؟“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی تھی۔

”ارے اب ہم اتنے بھی غریب نہیں ہوئے کہ کافی نہ پی سکیں۔ میرے پرس میں اس وقت اتنے روپے ہیں کہ ان میں ہم ڈنر بھی کر سکتے ہیں۔“ مول ہنستے ہوئے گویا ہوئی تھی تو وہ بھی بے ساختہ مسکرائی تھی۔ اسی لمحے اس کی نگاہ سامنے پڑی تھی اور وہ نگاہ جھپکتا بھول گئی تھی۔

مہرون، گولڈن بیادری ساڑھی میں ملیس، شانوں اور سینے کے گرد میچنگ رنگی شال ڈالے تک سبھی تیار اس کی ماما کی ہم نکل باوقار عورت کھڑی سیل پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟ تم کیوں حیران کھڑی ہو؟“ مول نے حیرانگی سے کہا۔

”حیرت، یہ خاتون بالکل میری ماما کی طرح ہیں۔“ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں مول نے بھی دیکھا، وہ بھی حیران ہوئی تھی۔

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو، کرن آنٹی کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا مگر فونوز میں دیکھ کر وہ یاد ہیں۔ یہ خاتون حیرت انگیز طور پر کرن آنٹی کا عکس لگ رہی ہیں۔ تم تو افریقہ سے ہے کہ یہ معمولی سی موٹی ہیں، اگر اسماٹ ہوتیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا، یہ کرن آنٹی نہیں ہیں۔“

وہ دونوں کھڑی باتیں کر رہی تھیں، جب ہی ذوالنون وہاں نظر آیا تھا، اس کی نگاہ ان دونوں پر پڑی تھی۔ مول نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ مول کی جانب دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ درآئی تھی۔

”ارے وہ دیکھو، ذوالنون بھائی۔ چلو ان کا شکر یہ ادا کرتے ہیں۔“ مول اسے ہاتھ کے اشارے سے وٹ کر تھی حورین سے بولی۔

”ضروری نہیں ہے، میں نہیں جاؤں گی۔“ ذوالنون پر نگاہ پڑتے ہی اسے اپنی بے عزتی کا احساس مزید قوی لگا تھا۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

”ہماری مشکل میں جو کام آئے، اسے ٹھیکس کہنا ہمارا فرض ہے۔ تم اپنے کپیکس سے باہر مت نکلو، انا کے ذمہ میں تمام منہ ز بھول جاؤ، مگر میں ایسی احسان فراموش نہیں ہوں۔“ مول زیادہ بولنے کی عادی نہ تھی مگر اس وقت حورین کی ہٹ دھرمی نے اسے چڑا دیا تھا۔ وہ زویا شمرین، ردا سے اس کی حمایت لیا کرتی تھی مگر اس کی بے لگی خند نے اسے تپا کر رکھ دیا تھا۔

”ہاں، ہاں جاؤ۔ جاؤ جا کر اس کے پاؤں دھو کر پیو، اگر اس سے بھی اس کے احسان کا بدلہ پورا نہ ہو تو اس کی غلامی کرنے ساتھ گھر چلی جانا۔“ حورین بھی اس وقت کوئی ادھار رکھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ آس پاس گزرتے لوگوں کے خیال سے دھیسے لہجے میں گفتگو کر رہی تھیں۔

”ایکسکے زئی۔“ وہ کرن کی ہم شکل خاتون سیل فون پرس میں رکھتے ہوئے ان کے قریب از خود ہی آگئی تھیں۔

”جی.....“ وہ دونوں چونک اٹھی تھیں۔ ان کو اپنے سامنے دیکھ کر جب کڈوالنون بھی دھبی رفتار سے اسی طرف آرہا تھا۔

”میں نے سوچا خود ہی جا کر ان سویٹ سی لڑکیوں سے تعارف کراؤں جو بہت دیر سے، غور سے مجھے دیکھتے ہوئے آپس میں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔“ وہ ان کی طرف آ کر خوش دلی سے گویا ہوئیں۔

”اوہ، سوری میڈم! دراصل میری کرن کی ماما کا فیس سیم آپ کے فیس جیسا ہے، ہم حیران ہو رہے تھے کہ کیا کوئی اتنی مشابہت بھی رکھ سکتا ہے۔“

”ہیلو مول! کیسی ہو؟“ ڈوالنون قریب آ کر گویا ہوا۔

”میں ٹھیک ہوں..... کیا آپ دونوں.....“ وہ گوگو کی کیفیت میں تھی۔

”یہ میرا بیٹا ہے۔ پرس نے مجھے بتا دیا ہے کہ آپ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ مول سے تو تعارف ہو گیا ہے۔ آپ کا نام کیا ہے بیٹا؟“ ان کا روئے سخن اس کی طرف تھا۔ ان کی سیاہ چمک دار آنکھوں کے حصار میں اس کا چہرہ تھا جو خود کو اس وقت بے حد بے وقوف و بے بس محسوس کر رہی تھی۔ ماما کے چہرے والی یہ عورت تھا ہوتی تو وہ ان سے بہت اچھی طرح ملتی۔ اپنے تمام احساسات ان سے شیئر کرتی جو انہیں دیکھ کر اس کے دل میں جاگے تھے مگر پاس کھڑے اس شخص نے سارے احساسات مٹھی کر دیئے تھے، حالانکہ وہ اس وقت اس سے بالکل اجنبی بنا کھڑا تھا۔ مول سے گفتگو کرتے وقت بھی اسے بالکل نظر انداز کر چکا تھا۔

”حورین۔“ ان کے دہرانے پر اسے کہنا پڑا۔

”گڈ مومول..... حورین..... بہت خوب۔ ایک بات ہے آپ کو میری شکل اپنی ماما سے ملتی ٹھیل ہو رہی ہے اور مجھے بھی آپ کچھ اپنی اپنی سی ٹھیل ہو رہی ہیں۔“ ان کا ارد کا حورین کی جانب مائل تھا۔

”ماما! انون نے جلدی آنے کو کہا تھا۔“ ڈوالنون نے مداخلت کی۔

”او کے، ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ بی بی جان پریشان ہو رہی ہوں گی۔ سردی بھی پڑھ گئی ہے۔“ اس نے مول کو چلنے کا اشارہ

کرتے ہوئے معذرت بھرے لہجے میں ان سے جان چھڑانی چاہتی تھی، جن کی نگاہیں اس کے اندر عجیب سی بے چینی بھر رہی تھیں۔ بے نام اُلجھن و گھبراہٹ اسے اپنے اندر پھینکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور دل کہہ رہا تھا، ان نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔

”ہم کافی پیئے جا رہے ہیں، آپ دونوں بھی ساتھ چلیں، نہ جانے کیا ہو رہا ہے اس دل کو، آپ سے بہت ساری باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“ منال کے لہجے میں سچ تھا۔ نہ معلوم کیا ہوا تھا انہیں کہ میڑھیاں اترتی اس لڑکی کو انہوں نے دیکھا تھا۔ پھر دل میں عجیب سی خواہش چلی کہ اسے ہار دیکھیں اور دیکھتی رہیں۔ شوخی قسمت اس وقت انہوں نے اس لڑکی کو اپنی جانب چونک کر متوجہ ہوتے دیکھا تھا اس نے ساتھ دوسری لڑکی کو بھی اس طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ اس دوران سیل کے بہانے اس کی جانب ہی کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ دوسری لڑکی کی آنکھوں میں ابھرتی حیرانگی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ وہ اپنے اندر ابھرتے تجسس سے باز نہ رہ سکیں۔ اسی اثنا میں ذوالنون شاپنگ بیگز کار میں رکھا آیا تھا۔ دوسری لڑکی نے ذوالنون کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ ان کے تجسس کو مزید ہوا لگی، پھر ان کو ذوالنون سے یہ معلوم کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ دونوں یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ وہ سیدھی ان کی طرف چلی آئی تھیں۔

”سوری..... ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ حورین نے معذرت کی تھی۔

”سوری نہیں چلے گی، آپ کو کافی چینی ہوگی، کم آن پلیز۔“ منال اس کا ہاتھ تھام کر بڑی اپنائیت سے آگے بڑھی تھیں۔ ساتھ موٹل کو بھی لیا تھا۔

حورین اس التفات پر بری طرح شہنشاہی تھیں۔ موٹل کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار تھی۔ وہ بڑی شرارتی نظروں سے حورین کو دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں سے زیادہ سرا سیدہ و حیران ذوالنون تھا۔

وہ کسی کو خاطر میں نہ لانے والی ماں کا یوں حورین پر بری طرح فریفت ہونا، اپنائیت بھری گفتگو اور ریشہ منظمی ایسا رویہ تو کبھی اس نے ان کو کسی کے ساتھ کرتے نہ دیکھا تھا۔

کافی کے ساتھ چیز، سینڈوچ اور برگر کا آرڈر اس نے دیا تھا۔ ماما حورین سے انٹرویو لینے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ ماما کا انداز اسے اب بری طرح کوفت میں جلا کرنے لگا تھا۔ ان کا حورین کو لٹ دینا، اسے ناگوار لگ رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے ٹیبل پر پڑا میگزین اٹھا لیا تھا۔

”آپ کے والدین آپ کو بہت چاہتے ہیں؟“ وہ حورین سے مخاطب ہوئیں۔

”جی..... لیکن وہ یہاں نہیں، اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔“

”اوہ..... آپ یہاں کس کے پاس ہیں؟“

”دونوں ماموں کی فیملیز ہیں، ایک خالہ بھی ہیں جنہیں ہم سب بی بی جان کہتے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بتا رہی تھی۔ چہرے پر گھبراہٹ تھی، اس دوران کافی، سینڈوچ اور برگر آچکے تھے۔ اصرار کے باوجود اس نے صرف کافی لی تھی۔ اس کے گونٹ بھی کسی بد مزہ

سیال کی مانند اس کے مطلق میں اتر رہے تھے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح اس شخص کے ساتھ بیٹھ کر اپنے بارے میں گفتگو کرے گی۔ بظاہر وہ شخص لائق و بے نیاز بنا بیٹھا تھا مگر وہ جانتی تھی اس کی ساتھیوں اس طرف مرکوز ہیں۔ چہرے پر ناگواری و ناپسندیدگی ثبت ہو کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا، اپنی ماسے ایسے رویے کی توقع نہ کرتا تھا۔ مثال کی نظریں ایک سرے کی طرح ایک ایک نقوش کا جائزہ لے رہی تھیں اور ان کے اندر کی دنیا میں غلام برپا تھا۔

لاشعور بہت سی سرگوشیاں کر رہا تھا۔

آگہی و ادراک بھی انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہے تھے۔ شدید شور، شدید ہنگامہ ان کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ سب کی آوازیں ایسی گونڈ ہوئی تھیں کہ کوئی ایک آواز بھی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ وہ حورین کو دیکھے جا رہی تھیں۔ ذہن کے کیڑوں پر ماضی کی تصویر بننے و مٹنے لگی تھی۔

”آپ کی ماسا کی کوئی پھجڑی بہن ہیں؟“

”نہیں“۔ اس نے مختصر جواب دیا تھا۔ مثال بیگم بھی گویا حواسوں میں لوٹنے لگی تھیں۔ اب انہوں نے اپنی پوزیشن کا ستر کرنے کے لیے موئل سے بھی ایسے ہی سوالات شروع کر دیئے تھے۔ اس دوران کافی کے ساتھ سینڈوچز و برگر سے بھی لطف اندوز ہوتی رہی تھی۔ ذوالنون نے بھی صرف کافی پی لی تھی۔ اب وہ ایسی آکٹا ہٹ بھرے تاثرات چہرے پر سجائے بیٹھا تھا کہ ذرا سا اشارہ ملے اور وہ ہوا کی طرح غائب ہو جائے۔

حورین کے سیل فون کی بپ پر ذوالنون نے چونک کر دیکھا تھا۔

”ہیس“۔ اس نے اسکرین پر ہریرہ کے سیل نمبر دیکھ کر کہا۔

”تم شاپنگ کرنے نکل گئیں، پہلے پرس میں رقم تو چیک کر لیتیں۔“

”کیا مطلب؟“ حورین کے انداز میں جھلاہٹ تھی۔

”تمہارے پرس سے میں نے رقم نکال لی تھی تاکہ میرے آنے تک تم جانہ سکو..... مگر پرس چیک کیے بغیر چلی گئی..... میں کب سے ٹرائی کر رہا ہوں، کوئی مسئلہ تو نہیں؟“ وہ متشکر انداز میں پوچھ رہا تھا، لاؤڈ آن ہونے کی وجہ سے آواز بخوبی ذوالنون تک بھی پہنچ رہی تھی۔ چہرہ اس کا ساٹھا تھا مگر کن اکھیوں سے وہ حورین کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ موئل اور مثال گفتگو میں مگن تھیں۔

”ہریرہ! میں تمہیں مار دوں گی، نان سنس۔“ اس نے غصے میں سیل آف کر کے پرس میں رکھا اور مثال سے اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کی ماسا کراچی آئیں تو ضرور ملوایئے گا۔“ وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

کار کی طرف بڑھتے ہوئے اسے محسوس ہو رہا تھا، گویا کسی گھٹن سے نجات ملی ہو۔

”کیا بات ہے یار! ذوالنون کی ماسا تم پر کچھ زیادہ ٹارو رکھائی دی ہیں۔ مجھے لگتا ہے دال میں کچھ کالا ہے۔“ موئل پارکنگ کی طرف

بڑھتے ہوئے صحتی خیر لہجے میں بولی۔

”کوئی کالا، پیلا نہیں ہے، تم اپنا دماغ درست رکھو۔ بیٹے کی طرح وہ بھی کسی کپیکس کا شکار نظر آئی ہیں۔“ حورین منہ بنا کر بولی۔  
 ”کیا..... تم کس قسم کی لڑکی ہو، وہ تم سے اتنے اخلاق و محبت سے ملی ہیں، تمہیں اتنی اہمیت دی ہے اور تم کہتی ہو، وہ کسی احساس  
 کتری کا شکار ہیں۔“

”تم زیادہ اعتماد بھی کہہ سکتی ہو۔“

”میرے خدا۔ حورین اتم..... تم مجھے لگتا ہے سائیکس ہوگئی ہو۔“ مول کو اس کا بے چک اماناز بالکل نہ بھایا تھا۔ وہ تیز لہجے میں گویا ہوئی۔  
 ”یہ حقیقت ہے اس عورت نے مجھے ذرا بھی انسا نہیں کیا، میری ماما کی فیس کا پی ضرور ہیں مگر طبیعت میں میری ماما کے بالکل  
 متضاد ہیں۔ کم از کم میں ان سے دوبارہ ملنا پسند نہیں کروں گی۔“ وہ سامنے نظر آتی کاری جانب بڑھ گئی۔  
 اس لئے مول بھی اس سے پوری طرح بدظن ہوگئی تھی۔ اس کے خیال میں حورین نے بدظالمی و احساس فراموشی کی تمام حدیں توڑ  
 دی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ آفس سے گھر جانے کی بجائے صدا نکل کی طرف جانے والی سڑک پر کار ڈال چکا تھا۔ موسم نکلی سے بوجھل تھا۔ اس کے دل کی  
 طرف احساسات سرد پڑ گئے تھے۔ انسان پر کیسے کیسے حالات کے تغیرات اترتے ہیں اور وہ انجان سامان کی لپیٹ میں الجھتا چلا جاتا ہے، نہ  
 اسے سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ چھوٹا سا کلزا پوری طرح حاوی و احساسات پر قابض ہے۔ اس کے مرہون منت انسانی زندگی جنت بھی بن جاتی  
 ہے اور جہنم بھی۔ اس کے مزاج کی بدولت بہاریں منگلتی ہیں، خزا نہیں ڈیرے لگاتی ہیں۔ انسانی زندگی کی بادشاہت کا تاج اسی کے سر پر  
 ہے۔ جذبات و احساسات پر اس کی حکمرانی ہے۔ کل جب وہ ان راستوں پر کار دوڑاتا تھا تو لگتا تھا سفر طویل ہے، منزل نہ معلوم کب آئے  
 گی؟ دیدار یار کے لیے آنکھیں حد سے زیادہ بے قرار رہتی تھیں، آنکھیں، آرزوئیں یہی دعائیں کرتیں کہ پہلا دیدار اسی ایسر کا ہو  
 جو اس کا چین و قرار لوٹ کر انجان بنی ہوئی ہے اور اب..... بالکل سلوڈا رہیو تک کے باوجود لگ رہا تھا، صدا نکل کا گھر بہت قریب ہے۔ ساتے  
 گویا سٹ گئے تھے جن کی طوالت اسے کبھی کوفت میں جتلا رکھتی تھی۔ دل ڈعا گو تھا کہ اس سے سامنا نہ ہو جس کو سب سے پہلے دیکھنے کی آرزو  
 ہوا کرتی تھی۔ دل کی خواہشیں کبھی بھی ایک جیسی نہیں رہتیں، موسموں سے بھی زیادہ تیزی سے بدلتی ہیں۔ کل جس کی محبت زندگی زیت کی چاہ  
 پیدا کرتی تھی، آج اس کی دید کے خیال سے روح فنا ہوتی نظر آ رہی ہے۔ صدا نکل کی کالز سے متواتر موصول نہ ہوئیں تو وہ آنے والا نہ تھا۔  
 کار پور ٹیکو میں کھڑی کر کے وہ اندر چلا آیا۔ خلاف معمول وہاں سٹائے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ لاپٹی سے گزر کر لاؤنج کی طرف  
 بڑھا، وہ بھی خالی تھا۔ لاؤنج سے ملحقہ کوریڈور میں بھی کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ حیران و پریشان سا دادو کے کمرے کی طرف بڑھا، دھک دینے  
 کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ کھلا تھا۔ وہ دشمن جاں سامنے تھی۔

شاید نماز پڑھ کر نکلی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اپنا چہرہ شدت گریہ سے ہوتی سرخ آنکھیں اور آنکھوں میں موجود وہی

اُداسی و بے کلی جو خود اس کے وجود کو بھی اپنی گرفت میں جکڑے ہوئے تھی۔

وہ دونوں بے خود سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے، جو لفظ کبھی زبان نہ کہہ سکی تھی، وہ آنکھیں بیان کر رہی تھیں، جو اعتراف کبھی زبان کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکی تھی وہ اس لمحے لگا ہوں نے کر دیا تھا اور نہ معلوم کب تک آنکھوں کی لنگھو آنکھوں سے جاری تھی، معاً باہر سڑک سے گزرنے والی کسی گاڑی کے تیز ہارن نے دونوں کو چونکا دیا تھا۔

”آ..... آ..... آپ؟“ دونوں سنبھل گئے۔ حضرتنی کے چہرے کی رنگت حفریہ ہو گئی۔ یہ کیا ہوا تھا جس راز کی وہ حفاظت کرتی رہی تھی، اس طرح عیاں ہوا تھا۔ اس کا تخلص تیز ہو گیا، نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔

”سب لوگ کہاں ہیں؟“ کوئین کو معلوم تھا وہ اس کو پسند کرتی ہے اور اعتراف نہیں کرتی..... آج اعتراف ہوا بھی تو دل کو اور پوجھل کر گیا۔ اس کے گریز اور نکار کی وجہ سے اب سمجھ میں آئی تھی۔ وہ قریب رہ کر بھی ماں کو سمجھ نہ سکا تھا اور وہ دور رہ کر بھی آگاہ تھی۔ وہ دل سے اس کی عظمت کا قائل ہو چکا تھا۔

”آپ بیٹھیں ناں کوئین بھائی!“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”نہیں..... میں چلوں گا، مجھے کچھ ضروری کام ہے۔“

”ابھی تو آپ آئے ہیں۔“ وہ اس کے یوں جانے پر بولی۔

”میں نے کچھ دوستوں کو ڈنر پر بلوایا ہے، مجھے ہوٹل پہنچنا ہے، یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا خیریت معلوم کرنا چلوں۔“ اس نے بہانہ تراشا۔

”فیملی میں کسی کی شادی ہے، وہاں می پاپا اور دادو گئی ہیں، بھابی بھی ساتھ ہیں۔ ہنزہ بھائی باسٹل گئے ہیں۔ خضر اور مزل بھی

کسی پارٹی میں گئے ہیں اور عریہ بھی اپنی فریڈ کے ہاں..... آپ بیٹھیں ناں۔“

”میں پھر کبھی آؤں گا، اوکے۔“ وہ کہتا ہواڑکا نہیں۔

☆.....☆.....☆

ان لوگوں کے درمیان نیا محاذ قائم ہو گیا تھا۔ گھر آ کر اس نے ہریرہ سے خوب لڑائی کی تھی۔ ہریرہ کو اپنی غلطی کا احساس تھا۔ اس

نے وہ حرکت اس لیے کی تھی کہ وہ اس طرح جانہ سکے گی اور وہ فریڈ ہو کر انہیں خود لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس دن اتفاق ہی تھا کہ حورین شدید غصے میں پرس چیک کیے بغیر چلی گئی تھی، سو وہ خاموشی سے اسے چیخا چلاتا دیکھ رہا تھا۔ صرف بی بی جان کے خوف سے وہ دروازہ لاکھنڈ کیا تھا اس نے، موٹل جو حورین کے رویے سے سخت بختر ہوئی تھی، زویا کو آ کر اس نے سب کچھ بتایا تو وہ بھی اس کی ہم خیال ہو گئیں۔ دوسرے دن کال کر کے ردا اور شمرین کو بھی بلایا گیا، کیونکہ استحقاقات کے بعد یونیورسٹی میں چھٹیاں تھیں۔

ردا اور شمرین نے بھی حورین کے رویے کو غلط قرار دیا تھا۔ ان چاروں کا خیال تھا۔ اسے ان کو تھمکنس ضرور بولنا چاہیے اور وہ کسی



طور ماننے کو تیار نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا وہ صرف اس کی ادا کی گئی رقم لوٹائے گی، بغیر کسی اظہار کے۔ ذوالنون نے بھیک کے انداز میں احسان کیا ہے جس کا شکر یہ صرف رقم کی ادا ہو چکی ہے۔ اس نے گمراہی سے کہا کہ اس سامان کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، ورنہ اپنی شاپنگ وہ دس بار دیکھتی اور دکھاتی تھی۔ اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر حاجی نے ان کے درمیان سرد جنگ کا آغاز کر دیا تھا۔

حورین نے ذوالنون کی دی گئی رقم خرین اور ردا کے ہاتھ ہی بھجوائی تھی، جو اس نے یہ کہہ کر واپس کر دی تھی کہ یہ رقم چیریٹی سینٹر میں دی جائے اور اس بات نے اسے پتھے لگا دیئے تھے۔ اس نے شاپرزمع سامان کے ان چاروں کو سوچ دئے تھے۔ وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ انہوں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر حورین انا کے خول میں بند ہو چکی تھی۔ اسے دوستوں کی باتیں ذوالنون کی حمایت و چاہلیسی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چاروں ریاکاروں کا رد و عتاب ہیں، وہ ان لوگوں سے برائے نام ہی تعلق رکھتی تھی اور اس کی اس سرد مہری نے انہیں از خود ہی ذوالنون کی جانب جھکا دیا تھا۔ ہر بات وہ اس کے گوش گزار کرتی اور وہ عادت کے برخلاف انہیں لٹ دینے لگا تھا۔ اس دوران پروفیسر آفتاب کی کال پر وہ سب وہاں جمع تھے۔ چائے کا دور ہو چکا تھا، نہ معلوم اس کے دل میں کیا آئی، وہ مظلومہ رقم لے کر اس کے قریب پہنچ گئی۔

”یہ پکڑیں اپنی رقم اور خود ہانٹتے پھریں۔“ وہ کئی بڑے نوٹ اس کے آگے رکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔ اس کے چہرے پر درجھی اُبھرنے لگی۔



اس کے برابر میں بیٹھے سر آفتاب نے پہلی نگاہ ذوالنون کے سرخ ہوتے چہرے پر ڈالی، پھر رو برو کھڑی حورین کو دیکھا جس کے چہرے کے تاثرات بھی بگڑے تھے۔ ”اوہ شٹ“ اس نے شدید اشتعال میں وہاں رکھے گئے نوٹ ہاتھ مار کر دور پھینکے تھے اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کبھی کیا ہو خود کو تم؟ تم جیسی لڑکیوں کے دماغ درست کرنا جانتا ہوں۔“ وہ لٹا ہوں سے شعلے برساتا ہوا اس سے قہر آلود لہجے میں گویا ہوا۔

”مجھ جیسی لڑکی، ہونہ، پہلے اپنے گریبان میں جھانکو، خود کیا ہو؟“ وہ بھی گھائل شیرنی کی طرح دھاڑی تھی، اسی لہجے کا بکا سے سر آفتاب کو مدافعت کرنی پڑی، دوسرے کمرے سے حیدر، ماسون اور وہ چاروں بھی گھبرائی ہوئی وہاں آگئی تھیں جہاں وہ تینوں موجود تھے، نیچے کارپٹ پر نوٹ پھیلے ہوئے تھے اور انہیں چوبیس بجھنے میں دیر نہ لگی تھی۔

”کول ڈاؤن، ریٹیکس مائی چائلڈز، یہ ہو کیا رہا ہے؟ پہلے مجھے بتاؤ تو سمجھی، یہ کس بات کا جھگڑا ہے؟ ہوا کیا ہے؟“ پروفیسر آفتاب ایک دم پریشان ہو بیٹھے تھے، ان دونوں کے چار حانہ تیوروں سے۔

”تھنک سر، خواہ مخواہ میرے گلے کا ہار بننا چاہ رہی ہے۔“ اس کے انداز میں مخصوص رعوت واکٹرین اُتر آیا تھا۔

”مائی لٹ!“ حورین نے منہ کھولا ہی تھا کہ سر آفتاب نے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑی متانت و رعب سے کہا۔

”کیپ کو اینٹ، کوئی نہیں بولے گا، دونوں میں سے۔ بیٹھ جائیں سب، حیدر، یہ تمام نوٹ اکٹھے کر کے یہاں رکھو۔“

حیدر نے وہ نوٹ نچل پر رکھ کر خوب صورت سپروٹ کے نیچے دبا دیے تھے، پھر سر آفتاب کے دوبارہ کہنے پر مول نے وہ تمام انگٹو دہرا دی تھی جو چند دنوں قبل ان کی شاپنگ سینٹر میں ہوئی تھی۔

”یہ بہت اچھی بات ہے، ذوالنون نے آپ کی ہیلپ کی، آپ کے کام آئے، میں خوش ہوں۔ ذوالنون نے اچھائی و مرد باری کی راہ اپنائی ہے حورین، اکثر اوقات ایسا ہو جاتا ہے، ہم غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں جو ہم سمجھتے ہیں ایسا ہوتا نہیں ہے، ذوالنون نے آپ کی مدد پر غلوس و سنجیدگی سے کی ہے، آپ کس مس انڈر اسٹینڈنگ کا شکار ہو رہی ہیں۔“ مول سے ساری بات بہت توجہ سے سننے کے بعد وہ ملاحت مہرے لہجے میں حورین سے مخاطب ہوئے، جو منہ بنائے بیٹھی تھی۔

”سرا! میں سمجھتی ہوں، مہرز، ایٹنی کیٹس سے میں نابلد نہیں ہوں۔“ اُس نے ایک تپتی ہوئی نگاہ کچھ قاصلے پر راجحان مول، زویا وغیرہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”سب جانتی ہوں اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ غلوس و احسان میں کیا فرق ہے۔ میری بات کا مین پوائنٹ یہ ہے کہ احسان، احسان میں فرق ہوتا ہے.... غلوس وہ بھی سنجیدگی سے پڑھو تو سامنے والے کو ممنون کر دیتا ہے لیکن یہی غلوس کسی کے چہرے پر، کسی کی اتا، کسی کی عزت لیس و خودداری پر بھر پور ملٹا چنے کی طرح مارا جائے تو آپ خود ٹھیل کر سکتے ہیں سرا! اس کاری ایکشن کیا ہوگا؟ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے گا؟“

حورین کے لہجے میں وہ تمام حساسیت موجود تھی جو وہ گزشتہ تین دن سے پہلے ذوالنون کے انداز، پھر مول، زویا، ردا اور شمرین سے مسلسل بحثوں کے بعد اس کے اندر آتی تھی، جس سے وہ خود کو بالکل تنہا سمجھنے لگی تھی، ان چاروں کے چہرے چند سیکنڈز کے لیے پھیکے پڑے تھے۔ مامون اور حیدر حورین سے متاثر نظر آ رہے تھے جبکہ وہ جس کی ذات اس جھگڑے کا سبب بنی تھی جو اصل نساد کی جز تھی۔ وہ چہرے پر یونیا بھر کی بے نیازی دے پر واپس آئے تاکہ پرانے گھر کے اس طرح اکڑا بیٹھا تھا گویا اس کی نہیں کسی اور کی بات ہو رہی ہو۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا.... کس طرح آپ دونوں کو سمجھاؤں؟.....“

پروفیسر آفتاب حسن کو بات کی تہہ میں پہنچنے میں دیر نہ لگی تھی، وہ ذوالنون کے مزاج شناسا تھے۔ اس کی نیچر، اس کے ایٹنی ٹیڈو کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جان گئے تھے اس نے اپنی نیچر کے مطابق اسے پرابلیم میں دیکھ کر اس کی مدد تو کر دی مگر پھر مرکز حورین کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا ہوگا اور حورین جو پہلے ہی اس کے سامنے سکی کے خیال سے گھبراہٹ کا شکار تھی، اس کی اس لا پر واپس نے اسے دوہری شرمندگی سے دو چار کر ڈالا، مستر اس کا رقم لینے سے انکار کرنے نے اس کو اشتعال انگیزی میں جھلا کر دیا تھا، نتیجتاً بات بدھتی چلی گئی۔

”آپ پریشرانہ ہوں سرا! وہ ان کا شکر چہرہ دیکھ کر بولا۔“

”اُم سوری، ایٹی ویز میں نے جو کچھ کیا، انسانی ہمدردی و اخلاقی طور پر کیا..... انہیں مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہے، اکیچو علی یہ مس انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے یہ ان کا اپنا ایٹنی ٹیڈو ہے، اپنی تھکنگ ہے، ان کا اپنا آپ ہے، ایسے لوگ جیسے خود ہوتے ہیں، گھٹیا ذہنیت و گھٹیا

سوچ رکھنے والے ایسی سوچ وہ دوسروں کے متعلق بھی رکھتے ہیں۔ اس نے معذرت بھی کی تو اسے لفظوں کے تیروں سے گھائل کر ڈالا تھا، اس کے اندر گویا شعلے بھڑکنے لگے تھے۔

”نو..... نو..... نو مائی من! اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“ حالات کو پھرتاؤ کی جانب بڑھتے دیکھ کر انہیں مداخلت کرنی پڑی۔  
 ”اُمّ ماٹ ماٹ ڈسرا کیونکہ انہوں نے اپنا آپ ایک سپوز کر دیا ہے، ایسی لوڈز فیٹنگو میری ہو نہیں سکتی ہیں۔“ حورین کسی طور سر منڈر کرنے کو راضی نہ تھی تو وہ بھی چٹان کی طرح اکڑا ہوا تھا، مضبوط دھوس۔

”یہ ضد برائے ضد، بحث برائے بحث والا معاملہ چل رہا ہے، آپ دونوں ہی شاید سوچ چکے ہیں کہ کوئی کچھ بھی سمجھائے، کچھ بھی کہے آپ نے سننا نہیں ہے، محض انا و فضول ہی ضد نے آپ کو اس حد تک بدگمان کر ڈالا ہے کہ اس طرح ہی سلسلہ چلا رہا تو آپ لوگوں کے درمیان گڈ فیٹنگو کبھی نہیں ہو سکتی ہیں۔“

سرا آفتاب حسن یک دم ہی بے حد پیچیدہ ہو گئے اور ان کی اس پیچیدگی کو سب نے ہی محسوس کیا۔  
 ”سرا آپ افسردہ نہ ہوں۔“ حیدر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”میں رنجیدہ ہو جاتا ہوں کہ جب دیکھتا ہوں ہم بلاوجہ کی رنجشوں و جھگڑوں میں پڑ کر اپنی زندگی کے سب سے خوب صورت دنوں کو بد صورت و اجاڑ کر لیتے ہیں، میں سوچتا ہوں محبت، خلوص، رواداری، صبر و برداشت کی ضرورت جتنی اس وقت ہم کو ہے، اس سے نقل شاید ہی کبھی رہی ہو، آج آپ کہیں سے بھی گزر جاؤ، ہر جگہ افراتفری و خود غرضی نظر آتی ہے، زندگی کے حسن ماند پڑ گئے ہیں، ان کی شوخی و دل کشی وقت سے نقل اڑ گئی ہے۔“

وہ کہہ رہے تھے اپنی دہشتی و دل کش آواز میں اور لفظ مدھ بھری خوشبو کی طرح ان کے ذہنوں میں سرایت کرنے لگے تھے۔  
 ”اُمّ سو ری سرا! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“ حورین نے شرمندہ لہجے میں کہا۔  
 ”میں چاہتا ہوں، ہم خود اپنی ذات سے ابتدا کریں، درگزر راور رواداری کے پرچار کی، درگزر راور رواداری جب ہمارے مزاج کا حصہ بن جائے گی تو پھر از خود محبت و خلوص کے گل کھلیں گے جن کی جاوداں خوشبوؤں سے حیات کے گلستان اپنے حسین جوین پر محیط ہو کر زندگی کو زندگی بنا دیں گے۔“ وہ چند لمبے توقف کے بعد گویا ہوئے۔ ”یہ جب ہی ممکن ہوگا جب ہم اُمّ و ا بیٹ کہنے کے بجائے یو آر دا بیٹ اکہیں گے، جب ہم کسی کو عزت دیں گے تو ہمیں جواباً ذمگی عزت ملے گی۔“ آخری لفظ انہوں نے بغور ذوالنون کی جانب دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

”عشق، پیار، محبت، مجھے ندرت ہے ان لفظوں سے سرا! عشق مجازی تو فنا ہونے والا عشق ہے، بھلا تو عشق حقیقی میں ہے، محبت تو صرف اللہ کی ہے جس کی طاقت کبھی نہیں بدلتی اور پیار وہ ہے جو ہم رب کے محبوب اور اپنے آقا و سردار صلی اللہ علیہ وآلہ سے کرتے ہیں، ان جذبوں کی صفات بہت پاک و مقدس ہیں۔ میں اس دور کے اس قمر ڈکلا اس عشق و محبت کی بات نہیں کر رہا، جو گندگی کی طرح گلی گلی گھرا پڑا

ہے، میں اس محبت کی بات کر رہا ہوں جو اس کائنات کے وجود میں آنے کا باعث بنی جو اصل عشق کی اساس ہے۔ ضروری نہیں ہے دو جنس مخالف کی دوستی کا مطلب محبت ہی ہو۔ وہ محبت جو نفسانی آلائشوں سے پاک و انسانیت سے بھرپور۔

”زور پھر بھی ”محبت“ پر ہی رہا سہرا!“ مامون نے ہنستے ہوئے کہا تو سب کے لبوں پر مسکراہٹ در آئی تھی جس سے کشیدہ ماحول میں کچھ تازگی ابھری تھی، وہ بہت کچھ سمجھاتے رہے تھے۔

”یہ رقم وجہ تازعہ بنی ہے یہ اب حیرتی میں جائے گی آپ دونوں پلیز بھول جائیں جو ہوا سو ہوا، حورین نے رقم دے دی اور ذوالنون نے لے لی، اب یہی سمجھتے گا آپ لوگ“ سر آفتاب نے وہ تمام نوٹ اٹھاتے ہوئے کہا، ذوالنون کے سنجیدہ چہرے پر کافی پراڈڈ مسکراہٹ ابھری تھی جو حورین کو خوب تپائی تھی مگر وہ مصلحتاً چپ رہی اور وہیسی تک چپ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”منال! کیا بات ہے، دیکھ رہی ہوں دو چار دنوں سے بہت سوچوں میں گم رہنے لگی ہیں، کوئی سکرٹ پرائلم ہے جو ماما سے بھی شیئر نہیں ہوگا؟“ فائقہ بیگم نے منال کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

”ماما! کبھی آپ سے کچھ چھپایا ہے جو اب چھپاؤں گی، میں نے تو وہ باتیں بھی آپ سے شیئر کی ہیں جو انسان خود سے بھی شیئر نہیں کرنا چاہتا۔“

”ڈیش رامنٹ، بٹ کوئی ابلجمن تو ہے۔“ ریڈ اینڈ بلیک پرنٹڈ ساڈھی میں پلیوس منال کے سادہ چہرے پر گہری سوچوں کا عکس سرخی بن کر چھپایا ہوا تھا، براؤن خوب صورت آنکھوں میں بھی سوچ و اضطراب تھا۔

”ایک کنفیوژن ہے ماما سے میں خود بھی سمجھ نہیں پائی ہوں کہ وہ حقیقت ہے یا صرف میرے احساسات کی کارستانی۔“ فائقہ بیگم نے چونک کر دیکھا تھا ان کی طرف۔

ان کا لہجہ!

ان کا انداز!

گزرے وقت کی اس دیوانگی کی جھلک لیے ہوئے تھا جس نے انہیں حیات کی سرتوں سے دور کر دیا تھا، سب ہی کچھ چھین کر تہی داماں کر دیا تھا، پھر آج ایک عرصے بعد وہ اس صحنہ میں چکراتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”ایسا کیا ہے بیٹا! مجھے مینشن ہونے لگی ہے۔“

”اوہ لو ماما! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ، نیش تو میں ہوں۔“

”ایسی کوئی مینشن نہیں پائنی ہے آپ کو اب، سب کچھ کھو دیا ہے اس پاگل پن میں، ملتا نے کو بچا ہی کیا ہے؟ صرف بچے ہیں کیا ان

کو بھی.....“

”میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟ آپ کچھ کیا رہی ہیں؟“ منال نے حیرانگی سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کے الفاظ سے مجھے اس ڈیول کی بو آ رہی ہے جس نے ہمیں ہل ہل اذیتوں و دلتوں سے نوازا تھا، بلکہ ہم ابھی بھی اسی کی وجہ سے ایسی زندگی گزار رہے ہیں جس میں سکون و خوشیاں دہلی دہلی ہیں۔“

”وہ ایسا تو نہ تھا ماما! محبت اس نے مجھ سے کی تھی، دل و جان سے چاہا تھا مجھے، عجیب محبت تھی اس کی، ہم روز ملتے تھے مگر کبھی بھی اس نے میرا ہاتھ تک پکڑنے کی جسارت نہ کی، کبھی ایسی نگاہ نہ ڈالی جو مجھے لگا ہی لگا ہی جھکانے پر مجبور کر دیتی، بہت پاکیزہ و سچی محبت کرتا تھا وہ مجھ سے، تب تو مجھے ان جذبوں سے آشنائی نہ تھی، میں محض پاپا کے پلان کے مطابق ان کی بزنس مارکیٹ ڈاؤن کرنے کی سازش لے کر محبت کا ڈھونگ رہ چاہی تھی، اپنے دل کی حالت سے بے خبر..... اس کے اتو بننے پر ہنستی تھی، مذاق اڑاتی تھی۔ یہ سب تو اسے کھونے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ محبت ہوتی کیا ہے؟ سچا چاہنے والا موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ وہ کسی معتبر و معزز شخصیت کی طرح آپ کی عزت کرتا ہے، تعظیم کرتا ہے۔“

”اچھا..... آپ کو اس کی محبت یاد ہے اور جو اس نے کیا وہ بھول گئیں آپ کہ کس طرح ایک دنیا کے سامنے وہ کرن کو لے کر ہماری عزت قدموں تلے روند کر چلا گیا تھا، ایک مدت تک جگ ہنسائی ہوئی تھی ہاری، کس بری طرح لوگوں سے منہ چھپا کر رہتے تھے ہم یہ یاد نہیں۔“

”یہ بھولنے والی باتیں نہیں ہیں ماما، یہ وہ نقش ہیں جو دل پر ثبت ہیں۔“ ان کے منھل لہجے میں صدیوں کی محکمن درآئی تھی۔

”پھر آج اس کی یاد کا کیا جواز ہے؟“

”کبھی دشمن بھی اچھے وقت کی طرح یاد آ جاتے ہیں، انسان کو صرف دو لوگ، دو رشتے یاد رہتے ہیں، ایک دشمن کو کبھی بھلایا نہیں جاتا، ایک دوست ہوتا ہے جو ہر موقع پر ساتھ دیتا ہے، آج کے دشمن کل کے اچھے رہنے والے دوست ہی تو ہوتے ہیں۔“

”جب سے پرنس کے ساتھ شاپنگ سے آئی ہیں، تب سے آپ کو پریشان دیکھ رہی ہوں آخر ہوا کیا مجھے بھی معلوم ہوا؟“

”ماما! انہوں نے حورین سے ملاقات کا ایک ایک لفظ انہیں سنا ڈالا، لمبے بھر کو فائدہ بیگم بھی چونک اٹھی تھیں مگر پھر گویا ہوئیں۔“

”یہ محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے ڈیز اور نہ وہ بھائیوں و بہنوں جیسے رشتوں سے محروم تھی پھر وہ یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا

چکے ہیں۔“

انہوں نے دانستہ کرن اور انس کے نام لینے سے گریز کیا تھا۔

”آئی نو، مگر..... مگر اس لڑکی میں جو حکمت و وقار تھا، لہجہ کا ٹھہراؤ، گفتگو کا وسیلہ دل نشین انداز اور..... آنکھ میں وہی پراؤ ڈیسی

چمک۔“ ان کے ذہن کے کیونوں پر حورین کی شبیہ کا ایک ایک نقش اُبھرا ہوا تھا۔

”اس لڑکی میں ایسا کچھ ضرور تھا جو مجھے ایک عرصے بعد بے قرار کر گیا ہے۔“

”آل رائٹ، ٹینس مت ہوں، ہم ایک آدھ دن میں اس لڑکی کو یہاں لٹچ پر انوائٹ کر لیتے ہیں، ساتھ ایک بار اس کا فیملی بیک گراؤڈ پوری طرح معلوم بھی کر لیں گے، تسلی مل جائے گی آپ کو بھی۔“

”اوکے، پرنس آجائے تو کہتی ہوں اس سے۔“ ان کے انداز میں بے چینی ہنوز تھی۔

☆.....☆.....☆

بی بی جان شفقت صاحب کے گھر سے ہمارا لونی تھیں، یہ سب ان کی رواداری، ہر ایک سے حسن سلوک اور آپس میں پیار و محبت سے جڑے رہنے کا انداز تھا کہ شفقت صاحب اور ان کی بیوی نے روایتی طور پر چند دن سوچ و پکار کے بھی نہ مانگے تھے اور فوراً ہی ہاں میں جواب دے دیا تھا۔ گھر میں خوشیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

تازہ گلاب جاسن اور جم جم سے بھرا نوکر ملازموں سے لے کر گھر کے ہر فرد کا منہ بیٹھا کراچکا تھا، خصوصاً سب نے وہی کو مٹائی کھلا کھلا کر بوکھلا ڈالا تھا۔ لڑکے آتے جاتے اس کے منہ میں کھی گلاب جاسن، کھی جم جم ٹھونس رہے تھے اور جبراً اسے کھانے پر بھی مجبور کر رہے تھے۔

”قار کا ڈسک، تم لوگ کیا مجھے شادی سے پہلے ہی شوگر کا مریض بنا کر مار ڈالنا چاہتے ہو؟ حد ہوتی ہے کوئی مٹائی کھلانے کی بھی۔“

وہی مسود کو پھر اسی ارادے سے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر جھنجھلایا تھا۔

”دیکھو بیٹے! شوگر، شوہر میں فقط ایک لفظ کا کاہر پھیر ہے مگر تاشیر دونوں کی ایک ہی ہے، اچھا شوہر بننے کے لیے بندے کو شوگر کی طرح ہی بیٹھا بنانا پڑتا ہے۔“ مسود نے کسی بزرگ کی طرح سمجھایا۔

”مئے اپنے مشوروں کو اپنے لیے سنبھال رکھو۔“

”ہماری ہونے والی بھابی کا اسم مبارک تو معلوم ہی نہیں ہے۔“ رؤف نے اہم سوال کیا تھا۔

”شاید ابھی نام رکھا نہیں گیا ان کا۔“ سفیان کے لیوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ وہی نے گھور کر دیکھا تو وہ منہ پھاڑ کر ہنس پڑا۔

”چند نام ہے ہماری بھابی کا، وہ خود بھی چاندی ہیں۔“

”چند؟ واؤ! پر بیٹی نیم اب وہی یہی کہتا نظر آئے گا۔ چند او چند! یہ کیا ہو گیا میرا دل کھو گیا او چند۔“ مسود کے گنگٹانے پر چھت پھاڑتے ہی لگا تھا، وہی بھی ہنس پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

تیری نظر میں کہاں باریاب ہونا تھا  
تمام عمر یہی اضطراب ہونا تھا  
بڑی اُمید تھی کار جہاں میں دل سے مگر  
اسے تیری طلب میں خراب ہونا تھا

حضرتی ڈیز! مہران علوی تم سے ملنا چاہتے ہیں، کئی بار کالز کر چکے ہیں، خاصے بے تاب ہیں ملاقات کے لیے، اب بتائیں کیا کہوں ان سے؟“ وہ ہسپتال سے آ کر ہاتھ لینے کے بعد کچھ سستانے کو لپٹی ہی تھی کہ بھابی چائے کے ساتھ اسٹیکس لے کر اس کے پاس آگئیں، ان کے لہجے میں کٹنگ اور آنکھوں میں شوخی تھی، وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

حضرتی کے اندر گویا سائے اترنے لگے، اس نے کبھی اس پہلو پر نہ سوچا تھا کہ مہران علوی اس سے ملاقات کا خواہش مند بھی ہو سکتا ہے۔

”ارے کیا سوچنے لگیں؟“ وہ قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”کچھ نہیں بھابی! بس ایسے ہی“ اس نے پکراتے سر کو ہاتھوں سے تھاما تو چہرے پر ہاتھ آجانے کی باعث بھابی نے کچھ اور ہی مطلب اخذ کیا پھر پلیٹ میں سینڈویچ رکھ کر ہنستی ہوئی بولیں۔

”اوہ گاڈ! تمہاری یہ شرمانی کی ادا، میرا دل لوٹ لے گئی، اتنی بولڈ کافیزنٹ ڈاکٹر کو میں اس طرح شرماتے دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی“۔ وہ کچھ ڈال کر پلیٹ اس کی طرف بڑھا کر بولیں۔

”میں صرف چائے لوں گی“۔ بھابی کی حیرانگی پر اس کے لبوں پر مدہمی مسکراہٹ کی کرن چمکی تھی وہ اس کی دل کے تپائی سے بے خبر تھیں۔

”نہیں، بالکل نہیں، پراپر ڈائیٹ لیتی تم چھوڑ چکی ہو، صحت دن بہ دن گرتی جا رہی ہے، پھر ہارڈ ورکنگ بہت ہو، میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی“۔ انہوں نے اس کی محارمت والے لہجے کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے زبردستی سینڈویچ کے پیس کر کے اپنے ہاتھ سے کھلایا تھا۔

”پلیز بھابی! اب اور تجاہش نہیں ہے“۔ اس نے انہیں دوسرے سینڈویچ کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔

”چلو یہ بھی بہت ہے کہ تم نے ایک تو کھایا“۔ وہ چائے سرو کر کے بولیں۔

”پھر کیا جواب دوں مہران کو؟“ وہ اپنے لیے فلاسک سے چائے نکالتی گویا ہوئیں۔

”آپ کو معلوم ہے مجھے یہ سب اکورڈنیل ہوتا ہے“۔

”میں ہی کیا سب گمراہ لے تمہاری نیچر جانتے ہیں“۔

”پھر میں کس طرح ان سے مل سکتی ہوں؟“

”حضرتی! کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو نہ چاہنے کے باوجود کرنے پڑتے ہیں“۔

”کیا مطلب؟“ اس نے کپ لیوں سے بنا کر استفسار کیا۔

”ہم جس سوسائٹی میں موڈ کرتے ہیں وہاں اس سے بڑی بڑی باتیں بہت عام سے انداز میں ہو جاتی ہیں۔ ہماری فیملی ایجوکیٹڈ، ماڈرن میڈیسن میں شمار کی جاتی ہے اور اس میں آپ کا پروفیشن بھی آتا ہے جہاں میل، فی میل کی ایک ہی کھینچ گھری ہے۔ یہ مہران

علوی کی اعلیٰ پرورش کا ہی ثبوت ہے کہ نہ انہوں نے ڈائریکٹ آپ سے رابطہ کیا، نہ ہسپتال گئے، اگر چاہتے تو کوئی مشکل نہ تھی، پہلے سز برہان علوی آئی اور دادہ سے پر مشن لے کر گئی ہیں، اس کے بعد مہران نے مجھ سے رابطہ کیا کہ میں تم سے درخواست کروں۔ ان کی باتوں نے اس کے اندر اضطرابی پلچل پھیلا دی تھی۔

”بھابی! پلیز ابھی کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا، پچا کانسفرنس اٹینڈ کرنے گئے ہوئے ہیں ہسپتال کی، ممبر سپونسیٹی میری اور بھائی کی ہے اور ان دنوں O.T میں بہت تاہم دینا پڑ رہا ہے، میزرا پریٹ کرنے کے بعد تو مڑ دوں جیسی حالت ہو جاتی ہے، آج بھی ایمر جنسی میں دو میزرا پریٹ کیے ہیں، اب دل چاہ رہا ہے لیکن تان کے سوجاؤں۔“

”اچھا..... میں مہران کو سمجھانے کی کوشش کروں گی، تم سوجاؤ۔“ وہ ٹرائی لے کر چلی گئیں، وہ بے جان انداز میں لہٹی تھی۔

☆.....☆.....☆

بے خبر لوٹ کر سوتے ہیں وہ نیندیں میری

جذبہ دل پر ترس کھانے کو دل چاہتا ہے

کب سے خاموش ہوا ہے جان جہاں کچھ تو بولو

کیا ابھی اور تم ڈھانے کو جی چاہتا ہے

”کب تک ناراضگی کے فخر سے گھائل کرتی رہو گی یارا بھول جاؤ گزری باتوں کو، میں تم سے معافی مانگ چکا ہوں، مگر تم ہو کہ معاف کر کے ہی نہیں دے رہی ہو پلیز، اتم سو ری آگین۔“ بریرہ اس کے آگے گھٹنے کے بل بیٹھ کر معافی مانگتا ہوا گویا ہوا۔

”معافی؟ ہونہ، تم اپنی گردن بھی کٹو لو تو معاف نہ کروں، تمہاری اس شرارت نے میرا کتا بڑا، بلکہ ناقابلِ حلفی نقصان کیا ہے، وہ کبھی پورا نہیں ہوگا، ایک کم طرف و پچھوڑے شخص کے سامنے جو نیکی ہوئی ہے، وہ انسلٹ میں کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں میں وہ مہتر از سر نو تازہ ہو گیا جب وہ بونیک کی اونر سے پریشانی بیان کر رہی تھی اور وہ مسلسل لٹی میں سر ہل رہی تھی۔ اسے ان پر اعتماد نہ تھا کہ وہ مگر سے رقم لا کر دے رہی ہیں۔ نہ وہ اس کی ڈائمنڈز کی جیولری رکھنے کو تیار تھی، نقل اس کے کہ وہ اسے ٹھیک ٹھاک سنا کر واپس پلٹتی، اس لئے ہماری قدموں کی تیز گونج سے وہ تیز تیز چلتا ہوا اس طرف آیا تھا، مخصوص مہک اور خوب صورت گیمبر لہجہ اسے پسینہ پسینہ کر گیا تھا۔ وہ مارے شرمندگی و خجالت کے سینے سے لگا سر نہ اٹھا سکی تھی، اس نے کاؤنٹر پر چار چڑپے کرتے وقت نہ معلوم کیا کہا تھا کہ وہ سخت مزاج اور یک دم ہی مصری کی ڈلی بن گئی، اس نے حورین سے معذرت کرنی چاہی تھی مگر وہ چینی طور پر وہاں سے غائب تھی۔

وہ النون کا اس طرح سے جانا اسے دہری شرمندگی میں جتا کر گیا تھا، وہ دل میں سوچ چکی تھی اس کا شکر یہ ادا کرنے کا، مگر اس کی رعوت بھری بے نیازی اس کے شاہانہ مزاج کو بھڑکا گئی اور پھر غصے و ضد میں وہ ہر ایسا کام کرتی چلی گئی جو خود اس کی سرشت و تربیت کے خلاف تھا۔ ”حورین! تم رو رہی ہو! اوہ..... میں برا ہوں بہت برا..... پلیز مجھے معاف کر دینا، اس دن بھی میں تم سے مذاق کر رہا تھا، میں



نے دم پرس سے اس لیے نکالی تھی کہ تم پرس چیک کیے بنا جاؤ گی نہیں اور اتنی دیر میں، میں تیار ہو کر آ جاؤں گا اور میں پانچ منٹ میں پہنچ کر کے آ گیا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنی ایسٹبل ہو جاؤ گی کہ چیکنگ کے بنائے پرس اٹھا کر چل دو گی، میں فوراً ہی کار نکال کر تمہارے پیچھے گیا مگر کسی بھی مارکیٹ کی پارکنگ میں کار نہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کسی نئی مارکیٹ گئی ہو، سیل فون پر رابطہ بھی نہ ہو رہا تھا۔ ہر وقت موج مستی، ہلا گھ و شرارتوں میں گمن رہنے والے ہریرہ کے چہرے پر افسوس و دکھ بہت اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔ حورین کے بے تحاشہ رونے نے اسے پریشان کر ڈالا تھا، اس سے قبل اس نے اسے اس طرح روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”تمہیں کتنی دلفہ سمجھایا، ہر وقت مذاق اچھا نہیں ہوتا ہے لیکن تمہیں کبھی سمجھ آئی ہے نہ آئے گی، کوئی مرتا ہے مرے، کسی کی عزت جاتی ہے جائے، کسی کی انسلٹ ہوتی ہے ہوتی رہے، تمہیں کسی کی جگ سے کیا سرود کار؟ تم وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔“ وہ روتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھی۔

”پلیز حور! میں بے حد پشیمان ہوں، تم رونا بند کرو پلیز۔“

”نہیں، میں روؤں گی، تم مجھے منع نہیں کر سکتے۔“ وہ بھانگی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور کمرہ لا کڈ کر لیا، ہریرہ خاصی دیر تک دروازہ ناک کرتا رہا تھا اور تھک کر بائیک لے کر چلا گیا۔

وہ بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ صاف کرنے لگی، دراصل آج کل زویا، موہل، شمرین، رواد سے تعلقات اس حد تک کشیدہ ہو گئے تھے کہ ان کے درمیان بات چیت بھی برائے نام ہی رہ گئی تھی، وہ دانستہ ذوالنون سے ملنے لگی تھیں جو آج کل بڑا خوش مزاج اور ان کو لٹھ دینے والا بنا ہوا تھا۔ سر آفتاب کے ہاں ہنسنے میں ایک بار ان سب کی ملاقات ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بارہا اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے شاید باہر بھی ملنے لگی تھیں اور وہ اتنی ہی اس سے دور ہونے لگی تھیں۔ اس نے ہمیشہ محبت و چاہت پائی تھی، وہ پہلی بار ماما، پاپا سے دور ہو کر بھی ان کی سنگت میں بہل گئی تھی۔ اب ان کی بدلتی دوستی کی بے ڈنڈی نے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اس تنہائی و غم نے ایسی بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا کہ بلا سوچے کچھ ہریرہ سے منہ پھلا کر ان سب کی زیادتیوں کا بدلہ لے رہی تھی۔

باہر راہ داری میں کسی کے سپر رز کی آوازیں آرہی تھیں، وہ تیزی سے بیڈ پر دروازہ ہو کر کھیل اوڑھ چکی تھی، دروازہ کھلا، کوئی اندر آیا تھا۔

”حورین! اتفاقاً تیار ہو جاؤ، بی بی جان نے کہلویا ہے وہی بھائی کے سرال والوں نے ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔“ آنے والی بیلا تھی۔

”میں نہیں جاؤں گی، مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس نے کھیل سے منہ نہ نکالا۔

”ارے آ کر سو جانا، چلو مزہ آئے گا، سب جا رہے ہیں۔“ وہ قریب آئی۔

”میرے سر میں درد ہو رہا ہے، میں نے گولی کھائی ہے، سوؤں گی تو ٹھیک ہو جائے گا، پلیز دوبارہ ڈسٹرب مت کرنا۔“ وہ بھیجا چہرہ دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

”اچھا مگر بی بی جان کہاں مانیں گی۔“ بیلا لالہ ابالی طبیعت کی مالک تھی۔

”میں کل ان کو خود منا لوں گی“۔ اس نے جان چھڑائی۔

”او کے، اپنا خیال رکھنا بی بی جان کا خوف نہ ہوتا تو میں تمہارا سرد باد تھی مگر بی بی جان کو تو جانتی ہو اگر ڈرا بھی دیر ہوئی تو.....“

”تم جاؤ، مجھے آرام آ جائے گا“۔ بیلا گردن ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

کرن نے کراچی جانے کی ہامی بھری تو انس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے اسی دن سے انتظامات شروع کر دیے تھے، سعد اور قاریہ بھی انہیں اس شہر سے متعلق پرانی خوشگوار باتیں یاد دلا دلا کر اس اچانک نمودار ہونے والے جذبے کو مضبوط بنانے کی سعی کر رہے تھے۔ ”مجھے سمجھ نہیں آتا بعض اوقات کہ کراچی سہیل ہونے کا فیصلہ درست بھی ہے یا غلط؟“ وہ لاؤنج میں بیٹھے ہی پلاننگ کر رہے تھے، جب معا کرن نے ابلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

”کرن! فیصلہ ایک بار ہوتا ہے بار بار نہیں، پھر یہ فیصلہ تم کو ایک نہ ایک دن کرنا ہی تھا اور یہ بالکل درست فیصلہ ہے۔ کوئی سوچنے بکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم بہت جلد یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے“۔ انس نے انہیں تذبذب میں دیکھ کر اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

”میں..... کس طرح وہاں ایڈجسٹ ہو سکوں گی؟ میرا منی کبھی مجھے تمہا نہیں چھوڑتا، مستقبل کے روزنوں سے نکال کر دوسوں و خدشوں کے سانپ، بچھو ہر وقت ڈستے رہتے ہیں“۔ ان کے لہجے میں گزرے دنوں کی کک تھی۔ سعد نے آگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”دوسوں و خدشوں کے ان سانپوں و بچھوؤں کو آپ کو خود اپنے یقین، احماد کے قدموں سے چکنا ہوگا، مارنا ہوگا، اپنی خوشی کے لیے اپنے سکون کی خاطر بہادر بننا ہوگا کرن“۔

”پھر ایسی کوئی پریشان ہونے والی بات بھی نہیں ہے، وہاں سب اپنے ہیں اور اتنی جرأت رکھتے ہیں کہ بُری نظر سے دیکھنے والوں کی آنکھیں نکال کر پھینک سکیں“۔ قاریہ نے بھی ہمت بندھائی۔

”آپ نے وہاں انفارم تو نہیں کر دیا؟“ کرن مسکرا کر گویا ہوئیں۔

”ارے نہیں..... تمہاری طرح مجھے بھی سر پر اتڑ دینے میں حزرہ آتا ہے“۔

”اتنا عرصہ ساتھ اور ایک گھر میں گزارنے کا آپ لوگوں کا یہی مزاج تو ہے جس نے کبھی آپ دونوں کے درمیان معمولی سی بھی ٹکراؤ نہ ہونے دی اور ہم دونوں بھائی بھی ایک گھر، ایک چھت تلے آرام سے رہ رہے ہیں، ورنہ گھر کے بنوارے سے قتل ہی دلوں کے بنوارے ہوتے ہیں پھر گھر کے، گھر تو مل جاتے ہیں، دل کبھی نہیں مل پاتے“۔ سعد کے لہجے میں آنچ دیتا ہوا ڈکھ دسرت کا احتجاج تھا۔

”وہ دن کبھی نہ آئے سعد بھائی، جب ایسا ہو“۔

☆.....☆.....☆

رات بارش ہوئی تھی، بیڑ پودے سب دھل کر گھر گئے تھے، ہواؤں میں نمی موجود تھی، اس بارش سے سردی میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔  
برہان لغاری کا رو باری وزٹ پر کوئی آئے تھے، ان کے اور قائفہ کے درمیان کچھ دنوں سے تعلقات کشیدہ چل رہے تھے، وجہ  
تازعدان کی لیڈی آپریٹنگھی۔ اسٹارٹ دیکھتے نقوش والی مارتھا جوزف، جو کرکچن تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اپنی خوب صورت ڈریسنگ اور  
نازغروں سے انہیں اپنی جانب راغب کر چکی تھی۔ برہان صاحب تو ویسے بھی ایسے چہروں وادواؤں کے شیدائی تھے، انہوں نے پہلی بار میں  
ہی اس کواد کے کر دیا تھا اور قبل اس کے کہ بات آگے بڑھتی قائفہ بیگم تک اسی دن یہ خبر بیون نے پہنچادی جو درحقیقت ان کے لیے جاسوسی  
کرتا تھا، انہوں نے گھر بیٹھے بیٹھے ہی مارتھا جوزف کو جاب سے نکلوا دیا تھا مگر برہان لغاری سے ناراضگی ان کی چل نکل تھی، اس وزٹ پر وہ  
ان کو اس لیے ساتھ لائے تھے کہ ان کی خفگی دور کر سکیں۔

”میں آپ کے ساتھ آگئی ہوں تو یہ مطلب نہیں ہے کہ میں آپ کو معاف کر چکی ہوں، کم از کم میرا نہیں تو کوئی اور ذوالنون کا تو خیال  
رکھنا چاہیے تھا آپ کو؟ کتنی عزت کرتے ہیں آپ کی، اپنی عمر کا نہیں تو ان بچوں کا خیال ہی کر لیا ہوتا۔“ قائفہ ترش روی سے کہہ رہی تھی۔  
”ایسا کچھ نہیں تھا قائفہ، تمہیں فضول افکار میں نہ دی تھی کسی نے، کیا مجھے اپنی ساکھ پر سناٹا کا خیال نہ ہوگا؟ اور پھر ایک لیڈی  
آپریٹنگ سے انہیں چلاؤں گا؟ اتنا غیر دانش مند سمجھا ہوا ہے مجھے؟“ وہ ایسے اعزاز میں کہہ رہے تھے جس میں ڈکھ و افسوس کا عنصر تھا۔  
”مجھ سے جھوٹ مت بولیں برہان!“ انہوں نے شانے سے ہاتھ ہٹایا۔

”تمہاری قسم“

”ہا.....! میری قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔“

”او کے اب ناراضی دور کرو، ایک عرصے بعد اس طرح مل کر بیٹھنے کا موقع ملا ہے، کیوں ویٹ کرتی ہو اس نام کو۔“ ان کے  
شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ شمار آلود لہجے میں گویا ہوئے۔  
”پراس کریں، پھر کبھی مجھے چیٹ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے؟“ قائفہ حریف اپنی خفگی قائم نہ رکھ سکی تھی، وہ مسکرا کر گویا  
ہوئے۔ ”نہیں کبھی نہیں.....“ انہوں نے انکار میں گردن ہلائی۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں ہوٹل سے ڈنر کر کے لوٹ رہے تھے، جب کارڈ رانیو کرتے ذوالنون کی نگاہ سائڈ میں پڑے کسی وجود کی طرف اٹھی تھی۔  
”کیا ہوا؟“ برابر میں بیٹھے حیدر نے اسے کاررو کئے دیکھ کر پوچھا۔  
”سامنے کوئی گرا ہوا ہے، شاید کوئی ایکٹیوٹ ہوا ہے۔“ ذوالنون حیرتی سے باہر نکلا تھا۔ بیچھے اس کے حیدر بھی چلا آیا تھا، وہ  
بھاگتے ہوئے اس طرف گئے تھے جہاں سڑک سے دور زمین پر کوئی نوجوان بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ذوالنون نے حیرتی سے بیٹھ کر اسے  
سیدھا کرتے ہوئے جنس چیک کی جو بہت دھیمی چل رہی تھی، وہ شخص بے ہوش تھا۔

”زندہ ہے؟“ حیدر تشریح بھرے انداز میں جھک کر پوچھنے لگا۔

”ہاں، مگر کنڈیشن از ویری سیریس۔“

”شاید کسی ٹرک سے حادثہ ہوا ہے، وہ ہی لوگ ایسا کرتے ہیں، ماہر کرپٹ کر دیکھتے بھی نہیں ہیں۔“ حیدر نے سڑک سے گزرتے ٹرکوں کو دیکھتے ہوئے غصے سے کہا، اس وقت سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی، سردی اور گہری دھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

”محسوس تو ایسا ہی ہو رہا ہے، ابھی اسے فوراً ہسپتال لے کر چلنا پڑے گا، سر سے اب بھی خون نکل رہا ہے، بلیڈنگ پہلے ہی کافی ہو چکی ہے۔“

وہ دونوں اُسے اٹھا کر گاڑی کی کچھیل سیٹ پر لٹا چکے تھے۔ کار کا زرخ صدا نکل کے ہسپتال کی طرف تھا جہاں اس نوجوان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا، وہاں کا تمام اسٹاف اسے جانتا تھا، کسی بھی پریشانی سے گزرے بغیر وہ لوگ اس نوجوان کو ٹریٹمنٹ دے رہے تھے، اس کی حالت کافی تھوڑی تھی۔ وہ دونوں وہیں موجود تھے جہاں روم کے اندر ڈاکٹر ز اور دوسرا اسٹاف موجود تھا، اس وقت دوسرے ڈاکٹر ز تھے۔ ہیڈ نرس نے بتایا تھا کہ کچھ دیر قبل ہی ڈاکٹر ہنزہ اور ڈاکٹر خستری گھر گئے ہیں۔

”سرا آپ کہیں تو ڈاکٹر ز کو کال کر کے بلاؤں؟“ وہ مودب انداز میں پوچھی۔

”نو، تمہیں کس، مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو میں خود کال کروں گا۔“ وہ سپاٹ لیجے میں گویا ہوا تو نرس چلی گئی، حیدر بے ساختہ مسکرایا۔

”تم کس خوشی میں تو تھو پیٹ کا ایڈ بنے ہوئے ہو؟“

”کیا ہے یارا، اگر تم اس غریب سے خوش اخلاقی سے پیش آجاتے۔“

”یہ سخاوت تمہارے لیے چھوڑ دی ہے میں نے۔“ اس نے شانے اچکا کر کہا۔

”کوئی تمہاری بارے میں بالکل درست رائے رکھتا ہے۔“ وہ کوئی ہڈ زور دیتا ہوا گویا ہوا تو ذوالنون تیرہی چڑھا کر بولا۔

”یہ کوئی سے کیا مراد ہے تمہاری؟“

”کوئی نہیں بھائی!“ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا، اسی اثناء میں ڈاکٹر اندر سے باہر نکلتا دکھائی دیا تو وہ دونوں اس کی جانب بڑھ گئے۔

”پوشٹ ابھی بے ہوش ہے۔ بلیڈنگ بہت زیادہ ہو جانے کے باعث کنڈیشن ویکینس کا شکار ہے، چونٹیں بھی زیادہ آئی ہیں۔“

ڈاکٹر اس کی جیب سے نکلنے والا سامان ان کے حوالے کرتا ہوا بتانے لگا تھا۔

”کوئی سیریس میٹرنو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب؟“ حیدر پوچھنے لگا۔

”جب تک انہیں ہوش نہیں آجاتا، کچھ نہیں کہہ سکتے۔“ ڈاکٹر کے جانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا،

دس بج چکے تھے، حیدر نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ اب اس لڑکے کے گھر والوں کو انفارم کر دینا

چاہیے، کیونکہ اس لڑکے کی جیبوں سے نکلے سامان میں والٹ اور موبائل فون بھی تھا، ذوالنون نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سیل سے نمبر

چیک کیا، اسکرین پر نمبر کے ساتھ جو نام آیا اس نے اسے چونکا ڈالا تھا۔

”والٹ میں دیکھا، شاید آئیڈنٹی کارڈ موجود ہو؟“ اس کی فراخ چمکتی ہوئی پیشانی پر گلنیں ابھر آئی تھیں، حیدر کو والٹ میں آئیڈنٹی کارڈ مل گیا تھا، اس نے نکال کر دیکھا تو چونک کر بولا۔

”ہریرہ سعد، یہ تو کچھ جانا بچھانا چہرہ لگ رہا ہے۔“ وہ کارڈ پر آویزاں فوٹو دیکھ کر نام پڑھتا ہوا گویا ہوا۔

”ہوں یہ کزن ہے اس کا، یونیورسٹی میں ملے تھے نا۔“ یک دم اس کے مزاج میں سنجیدگی در آئی تھی، دانستہ حورین کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔

”اس کا.....؟ حیدر نے الجھن بھرے لہجے میں کہا اور پھر اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ ”اس کا“ کا ملبوم بچھ گیا۔

”اچھا اچھا یہ حورین کا کزن ہے۔ ہاں مجھے یاد آیا، اس دن یونیورسٹی میں گڑبڑ ہوئی تھی، یہ ہی حورین کو پک آپ کرنے آیا تھا۔“ حیدر کو وہ سب یاد آچکا تھا۔

”کیا کرنا چاہیے اب؟“

”کنٹیکٹ کرو.....“ اس نے سیل فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن کس سے؟ یہ پہلا نمبر حورین کا ہے مگر ایسی نئو سے خواتین کا ڈیٹا بسٹ جلد ہی ایروٹھل ہو جاتا ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے گویا ہوا۔

”زویا، موٹل بھی تو ساتھ ہی رہتی ہیں، ایسا کر ڈگر کے نمبر پر کال کرو۔“

گھر پر کال کی تو فون کسی ملازم نے اٹھایا اور بتایا کہ گھر پر حورین کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

”اب کیا کریں؟ سب گھروالے کسی دعوت میں گئے ہوئے ہیں اور نہ معلوم کب واپسی ہو، ہم اتنا رسک بھی نہیں لے سکتے۔“

”اس کو ہی انفارم کرو، طریقے سے۔“

”میں ایسا کرتا ہوں، خود چلا جاتا ہوں۔“ حیدر نے تجویز پیش کی۔

”تم ایڈریس سے واقف ہو؟“

”ہاں، پچھلی دفعہ سر آفتاب کے ہاں سے میں ہی ڈراپ کر کے آیا تھا انہیں۔“

☆.....☆.....☆

حیدر کو اچانک دیکھ کر اس کی حیرانی ختم نہ ہوئی تھی کہ ہریرہ کے ایکسیڈنٹ کا سن کر وہ بالکل حواس باختہ ہو گئی۔

”ایزی، ایزی، کوئی سیریس بات نہیں ہے، معمولی سا انجری ہے وہ۔“ اپنی توقع سے بھی بڑھ کر اسے بدحواس دیکھ کر حیدر کو اسے

سمجھانے میں دیر لگی۔

”یہ سب میری وجہ سے ہوا، میں نے جھگڑا کیا اس سے، وہ مجھے منار ہاتھا، میں نہیں مانی، یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔“ سارا راستہ دو روٹی بڑ بڑاتی ہوئی آئی تھی۔ حیدر کے ساتھ وہ مضطربانہ انداز میں چلتی ہوئی روم تک آئی تھی، وہ سفید ٹیوں میں جکڑا بے سادہ پڑا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

آنسو بہت خاموشی و روانی سے بہ رہے تھے، وہ ایک تک آنسو برساتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی، اسے ارد گرد کا ہوش نہیں تھا، وہ یہ بھی نہ محسوس کر رہی تھی کہ کسی کی نگاہیں بہت گہرائی سے اس کے چہرے کا اس کی ایک ایک حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی ہیں۔ وہ ہریرہ کو دیکھتے ہوئے روئے جا رہی تھی، جس کی پیشانی پر ڈورینگ تھی، کبیل کے ٹیپے جسم میں نہ معلوم کہاں کہاں پٹیاں ہوں گی۔

دائیں بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی، وہ بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا، اس کا دل کا پھینے لگا، ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ وہ اس طرح خاموش ہوا ہو۔ ہر دم ہنسا، شرارتیں کرنا، موج و مستی میں وقت گزارنے والے ہریرہ کو یوں دیکھ کر اس کے اندر وحشتیں بڑھنے لگی تھی، وہ ایک دم ہی متوحش ہو کر اسے پکارنے لگی۔ ”مس حورین! ایک اٹ ایزی پلیز!“ حیدر نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا جبکہ ذوالنون ایک طرف خاموش کھڑا ہوا تھا۔

”میرا دل گھبرا رہا ہے، یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا؟ خاموشی تو اس کو رہنا نہیں آتا۔ اوگا ڈا! یہ سب میری وجہ سے ہوا، اس کی حالت میں ڈسے دار ہوں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

حیدر بیٹھا اسے تسلیاں دے رہا تھا، سمجھا رہا تھا کہ وہ اب خطرے سے نکل آیا ہے۔ پریشان کن کوئی بات نہیں ہے، وہ دو واؤں کے زیر اثر سو رہا ہے۔ یہ سب اسے ذوالنون نے بتایا کہ جب وہ حورین کو لینے گیا تھا، اس کے پیچھے سے ہریرہ کو ہوش آ گیا تھا، شدید تکلیف کے باعث اس نے زیادہ بات نہ کی تھی، ڈاکٹر نے اسے یہاں کچھ دن کے لیے ایڈمٹ کر لیا تھا۔

”آپ کسی سے رابطہ کریں، اب تک وہ ڈنر سے فارغ ہو گئے ہوں گے۔“ حیدر کو حورین نے بتایا تھا کہ سب لوگ اس کے کزن کے سرال ڈنر پر گئے ہیں تو اس نے ایسے خوشی کے موقع پر اطلاع دینا اچھا نہ سمجھا، اب جبکہ انہیں یہاں آئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ حیدر نے کہا۔

”دوسی بھائی کراچی سے باہر گئے ہوئے ہیں، سرمد کو یا سفیان کو کال کرتی ہوں۔“ اس نے ہریرہ کے سیل فون سے نمبر پیش کرتے ہوئے کہا۔ اس کا خوف و سراپتگی ڈاکٹر کی تسلی آمیز باتوں سے کم ہوئی تھی، اب آنسو تو ختم گئے تھے مگر پلکوں پر نمی موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔ پہلے اسے ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ ہریرہ کو اس حال میں دیکھ کر وہ بدحواس تھی، اتنی بوکھلائی ہوئی کہ وہاں موجود ذوالنون کی موجودگی محسوس نہ کر سکی۔ اس کی موجودگی سے جب آگاہ ہوئی تھی جب اسے مسلسل روتے دیکھ کر وہ ان دونوں ڈاکٹر ڈکولے کر آیا جنہوں نے ہریرہ کو ٹریٹمنٹ دی تھی۔ انہوں نے ہی اُسے بتایا تھا کہ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔

اس کی موجودگی کے خیال سے ہی وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ حیدر اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اسٹاف روم سے ان کے لیے کافی

بھی آئی تھی۔ وہ اپنی سابقہ سردمہری و بے نیازی برقرار رکھتے ہوئے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے۔“ حیدر نے ذوالنون کی طرف کافی کاگ بڑھاتے ہوئے آہستگی سے منگٹکیا تھا۔ جو ابادہ اسے گھور کر رہ گیا تھا، وہ کافی ہیڈنرس نے پہنچائی تھی۔

کال سرد نے ریسو کی تھی اور کچھ دیر بعد سفیان کے ساتھ موجود تھا۔ ان کے چہروں سے پریشانی و فکر مندگی ہویا تھی۔ ہریرہ کو دیکھنے کے بعد وہ حورین کے پاس چلے آئے تھے، جو ایک دم ہی بھیجی بھیجی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں اس کے ارد گرد بیٹھ کر پیار سے تسلی دینے لگے تھے جس کے آنسوؤں میں پھر روانی آگئی تھی، وہ یہی کہے جا رہی تھی کہ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔

”جھینکس گاڈ! کوئی فریکچر نہیں ہوا ہے۔ ڈم گہرے ہیں مگر جلد بھر جائیں گے، ڈوٹ اوری پریشان مت ہو۔“ سفیان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت بھرے لہجے میں کہا، وہ لوگ اس وقت سنجیدگی میں بڑے باوقار دکھائی دے رہے تھے۔ سرد ذوالنون کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ جو ہمارے کزنز ہیں، ہریرہ اور حورین کی محبت بھی عجیب ہے یا، ہر وقت لڑتے رہتے ہیں کبھی ہم نے ان میں امن و صلح نہ دیکھی مگر اب اس کو ذرا سازشی دیکھ کر اس کی کیا حالت ہے۔“

وہ باہر کوڑیڈور میں ان سے مل چکے تھے اور عادت کے مطابق بے تکلف ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی تھی۔ ذوالنون کو شش کے باوجود نہ مسکرایا۔

”اتاق تو انجڑ ہے، تم کہہ رہے ہو ذرا سا۔“ وہ اٹھ کر ہریرہ کے قریب چلی آئی اور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ اس لمحے ذوالنون کی نگاہیں بے ساختہ اس کے چہرے پر اٹھی تھیں، بلیک سوٹ پر لٹھی دھاگوں کی کڑھائی والے سوٹ میں اس کے بکھرے سبے حسن کی تمام رعنائیاں و زیبائیاں عروج پر تھیں۔ مسلسل گریہ زاری سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، ذراک براؤن آنکھیں سوچ کر کچھ زیادہ ہی دل شش لگ رہی تھیں۔ گولڈن براؤن بالوں نے اس کی پشت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اُلجھے اُلجھے سلکی بالوں کی بے ترتیب کچھ لٹیں اس کے چہرے کے گرد بھی تھیں، جن کو وہ کانوں کے پیچھے کرتی مگر پھر وہ چہرے کو چھوئے لگتی تھیں۔ اس کا لباس بھی سلوٹ زدہ تھا، اس بے ترتیب چلیے میں وہ ایک ایسا سحر میٹھے ہوئے تھی کہ نہ معلوم اس کے اندر نیا دلو کا احساس جاگا تھا۔ اس کے اندر زبردست سراہستگی و وحشت جنوں پھیلاتا چلا گیا، وہ اس سے نظر ہٹا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب ہمیں اجازت دیں۔“ وہ سرد سے مخاطب ہوا۔

”آپ لوگوں نے جو احسان کیا، وہ تو ہم کبھی نہ اتار سکیں گے لیکن پھر بھی دل کی گہرائیوں سے آپ کا شکر یہ ادا کرتے ہیں۔“ سرد نے بڑی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”ورنہ آج کل لوگ مدد کرنے کے بجائے مرنا ہوا دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔“ سفیان ان دونوں سے ہاتھ ملا کر مخاطب ہوا تھا۔

”او کے، پھر ملاقات ہوگی، یہ ذوالنون کے انکل کا ہسپتال ہے اگر کوئی بھی کام ہو تو تکلف مت کرنا، ویسے بھی ہم ہیڈنرس سے

کہہ دیتے ہیں، وہ آپ لوگوں کا خیال رکھیں گی۔“ حیدر کن اکھیوں سے ذوالنون کے سرخ پڑتے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔  
 ”ہیڈنرس، کوئی ریلیشن شپ ہے ان سے؟“ وہ دونوں خود اسی لیلڈ کے تھے، فوراً تازہ گئے، وہ اسے زچ کر رہا ہے۔  
 ”ہے تو نہیں، لیکن ہونے میں دیر کتنی لگتی ہے۔“ حیدر کہہ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ وہی نرس سامنے سے تیز تیز چلتی ہوئی ادھر ہی آئی  
 نظر آئی تو وہ حیدر کو آنے کا اشارہ کرتا باہر نکل گیا، پیچھے حیدر کے قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”کونین اشام کو بیڑی رہے گا۔“ منال ناشتے سے فارغ ہو کر اٹھتے ہوئے کونین سے بڑے چاہت بھرے انداز میں مخاطب ہوئیں۔  
 ”کوئی کام ہے؟“ وہ اٹھتے اٹھتے بیٹہ گیا۔

”جی۔۔۔ بہت بڑا کام۔۔۔۔۔ بلکہ بہت خوب صورت کام۔“ ان کے ہونٹوں کی تراش میں معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔  
 ”اس سے آپ کا کیا مطلب ماما؟“ اس کا لہجہ عام سا تھا۔

”آئی مین مائی سن! مجھے بھی محسوس ہونے لگا ہے میری ڈائری ان لاء کو اب ہمارے درمیان آ جانا چاہیے، اس کے لیے میں نے  
 مسٹر شیرازی کی بیٹی کا انتخاب کیا ہے، اسی نئے امریکہ سے آئی ہے۔ بہت کیوٹ، بہت ویل آف ہے، آپ دیکھیں گے تو میری پسند کی داد  
 دیں گے۔“

”میں نے اس دن آپ کو بتا دیا تھا کہ میں اب شادی کبھی نہیں کروں گا۔“ اس کے لہجے میں ادب کے ساتھ ہی قلعیت بھی تھی۔  
 منال نے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کے جھکے چہرے پر ہلکی سرخی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی بیٹا؟ شادی سے اس طرح انکار کرتے تو میں نے کسی کو نہیں دیکھا، البتہ کسی کو فوری تو کسی کو دیر سے راضی ہوتے  
 ضرور دیکھا ہے، یہ بالکل ہی انکار کی وجہ بھی تو کچھ ہو؟“

کونین کے اور اپنے تعلقات میں جو ایک خاموش سرد مہری محسوس کر رہی تھیں، انہیں ڈر تھا وہ اب ظاہر نہ ہونے لگے، کیونکہ  
 فائدہ تو واقف تھیں مگر برہان اور ذوالنون بے خبر تھے۔ برہان صاحب کی اپنی بے تحاشہ معروضیات تھیں جن کی وجہ سے شاذ و نادر ہی انہیں  
 موقع ملتا تھا ان کے درمیان بیٹھنے کا، اس لیے ان سے تو انہیں کم کم ہی خوف تھا مگر آج کل ذوالنون کی چٹھیاں تھیں اور وہ زیادہ وقت گھر میں  
 ہی گزارنے کا عادی تھا اور وہ دیکھ رہی تھیں، ذوالنون بھائی کی جانب سے فکرمند ہے۔ وہ اس کی خاموشی و بدلی کیفیت جاننے کی جستجو میں  
 ہے اور قبل اس کے کہ وہ اصل حقیقت تک پہنچ پائے وہ اس خوف کو مٹانے کا پلان بنا چکی تھیں۔

”میری زندگی میں کسی لڑکی کی گنجائش نہیں ہے۔“

”ریزن؟“ اس بار ان کے لہجے میں سختی تھی۔

”ڈیٹ از نوٹ ریزن۔“



”میں کیسے مان لوں؟ کوئی تو وجہ ہوگی؟“

”آپ مجھے فورس مت کریں پلیز ماما!“

آپ ریزن وو، میں فورس نہیں کروں گی۔“

”ریزن!....“ اس نے جن زخمی لگا ہوں سے ان کی جانب دیکھا تھا وہ اگر ان ماؤں کی طرح ہوتیں جو حساس و گداز دل رکھتی ہیں تو لے

بھر میں پکھل جاتیں، اپنے آپ پر شرمندہ ہوتیں کہ خود ہی اس کی زندگی میں آگ لگا کر خوش تھیں کہ خود پرستی و ہٹ دھرمی اس کی سرشت میں تھی۔

”ریزن..... آپ جانتی ہیں ماما!“ اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا تھا۔

”میں..... میں..... کیا مطلب ہے آپ کا؟“ یہ انہوں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ وہ کبھی اس طرح بھی ان کی چوڑی ظاہر کر سکتا ہے،

وہ گڑبڑا گئی تھیں۔

”میں آپ کو فورس نہیں کروں گا ماما لیکن میری آپ سے ریکونٹ ہے، پھر کبھی مجھ سے آپ یہ خواہش ظاہر نہ کیجئے گا۔“

وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا تو مثال ساکت رہ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

سردی اپنے عروج پر تھی۔

رات ہونے والی بارش نے ٹھنڈ میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اب زرد و صوب ہر سو پھیلی ہوئی حرارت بخش رہی تھی۔ ہریرہ کی طبیعت

کافی بہتر تھی مگر اس کی چھٹی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ زخموں میں تکلیف کے باعث زیادہ تر بیڈ پر ہی گزارتا تھا مگر زبان اس کی اسی رفتار سے چلتی

تھی، بالخصوص حورین کی دیگر گوں حالت و بے تحاشا آنسوؤں نے اسے حیران کر ڈالا تھا اور مزید خوش بھی۔

بی بی جان نے اس کے صدقات اُتارے اور کئی شکرانے کے لواقل ادا کیے تھے کہ اللہ نے اس حادثے میں اس کو اپنی رحمت سے

ڈھانچے رکھا تھا۔ چوٹیں جو آئی تھیں، زخم جو لگے تھے وہ ایک نہ ایک دن ٹھیک ہو جائیں گے، اگر خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو اس کا مادا ممکن نہ

تھا، کیونکہ ٹرک کی زد میں آکر بائیک پر زہ پر زہ بکھر گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ بیٹھی ہوئی یہی ذکر کر رہی تھیں۔ حمیرا میرا گھر گئی تھیں، یہاں

مول، زویا اور حورین موجود تھیں، ہریرہ جاگا ہوا تھا۔

”میں تو اللہ کا جتنا شکر کروں، کم ہے کہ اس باری تعالیٰ نے میرا منہ اجلا رکھا، میں تو یہ سوچ سوچ کر ہول رہی ہوں اگر بچہ نکلنے

سے اُچھل کر دور نہ گرتا تو..... میرے منہ میں خاک، تو کیا ہوتا؟“

وہ ہریرہ کے قریب کرسی پر بیٹھیں بڑے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ بھرتے ہوئے باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔

”پھر یہ ہوتا کہ حورین کے ہاتھوں میں میرے بجائے کسی اور کے نام کی مہندی لگتی اور یہ کسی اور پیا کے سنگ ہنسی خوشی چلی

جاتی۔“ وہ تھرماس سے چائے نکالتی حورین کی جانب دیکھتا ہوا گیا ہوا۔

”لڑکے! اچھا اچھا بولو، دیکھو ایسی باتیں کرو گے تو میں تمہاری اس حالت کی پروا کیے بغیر مار لگا دوں گی۔“ بی بی جان نے غصے سے کہا تو ہریرہ نے فوراً کان پکڑ لیے تھے۔

”تم کیا جالو میری حالت؟ جب تک تم اپنے والدین سے دور ہو، میری ذمے داری ہے اور ذمے داری نبھانا لو ہے کے پتے چبانے کے مترادف ہے۔ میں تو کوئی اونچ نیچ ہونے سے ڈرتی ہوں اور یہی ذمہ داری ہے جس طرح تینوں بچے میرے پاس ہنسی خوشی وہ تندرست آئے ہیں، اسی طرح واپس بھی جائیں۔“

”یہ آپ کی دعاؤں کا ہی ثمر ہے بی بی جان! جو میں آپ لوگوں کے درمیان ہوں..... ورنہ ایک لمحے کو تو مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا کہ میں اب کبھی بھی آپ لوگوں کے درمیان لوٹ کر نہ آسکوں گا۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”خیر میرے بچے! مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ اس کو قاریہ کی مانتا ٹھنڈی رکھتی تھی، میری اور بھائی، بھائیوں کی لالچ رکھتی تھی۔ سو اس نے وہاں دو فرشتے بھیج دیے، انسانی روپ میں جو تمہیں یہاں لے آئے۔ اے مول! تم کہہ رہی تھیں وہ لڑکے تمہاری یونورٹی میں پڑھتے ہیں، جانتی ہو تم ان کو، ذرا فون کر کے بلاؤ تو سہی، میں شکر یہ تو ادا کر دوں ان بچوں کا، جنہوں نے اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ مجھ پر ہی کیا ہم سب ہی، میں ان سے ملنے کو تڑپ رہی ہوں۔“ وہ حورین سے چائے کا کپ لیتی ہوئی مول سے مخاطب ہوئیں، یہ فرمائش وہ بار بار کر چکی تھیں۔ اتفاق کی بات تھی، حیدر اور ذوالنون دونوں سے ہی رابطہ نہیں ہو رہا تھا، اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔

”نہ مظلوم کس طرح نمبر ملاتی ہو، چلو سیل حورین کو دو، وہ ملائے گی۔“ وہ مول کو ڈانٹتی ہوئی بولیں۔

”ہاں، حورین کے ہاتھوں میں جادو ہے یہ جو چاہے وہ کر سکتی ہے۔“

ہریرہ نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھ کر کہا جو مول کے ہاتھ سے سیل فون لیتے ہوئے خاصی کنفیوز تھی۔

”اب میں تمہاری پیاری کالنگا کر رہی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں جو دل چاہے گا، بولتے جاؤ گے۔“ نہ مظلوم کیوں اسے غصا آ گیا۔

”بیٹی! صبر سے کام لو، علاج چل رہا ہے غریب کا۔“ بی بی جان کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ وہ تینوں ہنس پڑے تھے۔ حورین

خاموش رہی۔

”کسی کا غصہ کسی پر نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بی بی جان کو صاف صاف بتا دو کہ وہ شخص کبھی بھی تمہارے شکر یہ کے قابل نہیں

رہا ہے، خواہ وہ کبھی عزت بچائے یا جان، وہ ان چند خصوصی لفظوں کا مستحق نہیں ہے۔“ مول اس کے گلے حراج دیکھ کر گویا ہوئی تھی۔

”اتنا کچھ ہونے پر تمہیں اپنی خود ساختہ انا دگریز چھوڑ دینی چاہیے اور سن لو ہم از خود نمبر روٹنگ ڈائل کر رہے ہیں، اب تمہیں خود

ان سے بات کرنی ہوگی اور بلانا ہوگا۔“ زویا نے ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

”لڑکیو! یہ کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے؟ میں نے فون ملانے کو کہا ہے۔“

”حورین ملارہی ہے بی بی جان!“ زویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں باہر گیلری میں جا کر نمبر پیش کرتی ہوں، شاید یہاں سکنلز نہ مل رہے ہوں۔“ ہریرہ اس وقت دواؤں کے زیر اثر سو گیا تھا۔ بی بی جان کے علاوہ ان دونوں کی نگاہیں بھی اس پر ہی مرکوز تھیں جن سے وہ پریشان ہو رہی تھی۔ گیلری میں آ کر اس نے حیدر کا نمبر پوچھا۔ ابتدائی خیر خیریت کے بعد اپنا مدعا بیان کر دیا تھا اور یہ بھی کہ ساتھ ڈالٹون کو لے آئے۔

”مس حورین! آپ شاید اس بندے کی نیچر جان گئی ہوں گی، اول تو اسے اپنی نیکی کی تشہیر پسند نہیں ہے۔ اس حوالے سے وہ کسی بھی پروٹوکول کو نہیں ایکسپٹ کرے گا.....“

”پلیز حیدر! آپ فرمائی تو کریں انہیں انگری کرنے کی، ہماری بی بی جان جو سوچ لیتی ہیں وہ کر کے چھوڑتی ہیں، جب تک وہ ان سے مل کر ٹھیکس نہیں کہہ دیں گے، انہیں بے سکوئی رہے گی، کچھ ایسی نوعیت کی حساس ہیں وہ۔“

”آپ سے پہلے مول اور زویا بھی فون کر چکی ہیں اور آپ کی طرح ہی گفتگو انہوں نے بھی کی ہے مگر وہ منع کر چکا ہے۔“

”اوہو..... ان سے کہہ دیں، ایک ہارٹ لیس بی بی جان سے اور بے فکر رہیں، نہ ان کو ریڈ کار پٹ پروٹوکول دیا جائے گا، نہ توپوں کی سلامی ہوگی اور نہ ہی ان کی نیکی ضائع ہوگی۔ بی بی جان کا مان رہ جائے گا۔“ اس کے جملے کھلے انداز پر حیدر کے بھرپور تہمتے کی آواز آئی تھی۔

”جواب نہیں ہے آپ کا، کیا فٹنا سٹک پرائشس مارے ہیں، آپ ایسا کریں خود اسے شرم دلائیں، بزرگوں سے دعائیں لینے میں کتھرا رہا ہے۔“

”میں..... میں کس طرح؟“ حیدر کی بات پر وہ شٹا کر رہی تھی۔

”بات سمجھئے، یہ میرے قریب ہی بیٹھالا ڈور آن ہونے باعث تمام گفتگو سن چکا ہے۔“ حیدر کی وضاحت نے اس پر گھڑوں پانی ڈال دیا تھا، وہ بالکل حواس باختہ ہو گئی، بھلا کس طرح اس سے بات کرے؟ پہلے دن سے ان کے درمیان بننے والی دیواریں اب بہت بلند ہو چکی تھیں، اگرچہ ان دیواروں میں مضبوطی نہ تھی، اتنا ضد وہ چھوڑ بیٹھتے تو شخص ریت کی دیواریں ثابت ہوتیں مگر اتنا ضد تو پھر لوہے سے بھی مضبوط ہوتی ہے۔

”ہے..... لو۔“ اس کی آواز عجیب سی شرمندگی دکھست سے لرز رہی تھی۔ نظریں فرش سے چپک کر رہی تھی۔ زویا اور مول کی نگاہیں وہ خود ہی محسوس کر رہی تھی اور سم گئی تھی، یہ ان کا بچھایا ہوا جال ہے، پہلے اس سے غلط بیانی کی اور پھر وہاں شاید حیدر کو اس ٹیم میں شریک کیا ہے جو وہ ڈالٹون کے ساتھ بیٹھا کال ریسیو کر رہا تھا، وہ بھی لا ڈور آن کر کے.....

”ہیلو“ دوسری جانب سے ڈالٹون کی گھمبیر آواز میں اعتماد تھا اور وہ گویا تصور کی آنکھوں سے اس کی دیگر گوں حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا مگر کسی نیکی کے موڈ میں تھا فوراً ہی بولا۔

”ڈونٹ وری، ہم بہت جلد آئیں گے، ٹائم ملتے ہی۔“ دوسری جانب سے بہت دل نشیں انداز میں کہہ کر رابطہ سکلیٹ کر دیا گیا۔

☆.....☆.....☆

”ڈنٹ وری؟ یہ تم نے کہا ہے حورین کو؟ اُس ویری ویری امیزنگ۔“ حیدر نے حیرانی سے ذوالنون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”میں نے ایسی کون سی حیران کن بات کر دی ہے جو تم اس قدر پریشان ہو رہے ہو؟“ وہ کشتز کے سہارے نرم دراز ہوتا ہوا مسکرا کر استفسار کر بیٹھا۔

”حیران ہونے والی بات ہے بھائی تم اس لڑکی سے مخاطب تھے جس کی طرف دیکھنا بھی تمہیں گوارا نہیں ہے۔“ حیدر اس کے نرم وٹھے انداز پر حیران تھا۔

”مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی؟ میں سختی سے بولوں تب تمہیں قرار نہیں ہنری سے کہوں تو تم بے چین ہو جاتے ہو، چاہے کیا ہوا آخر تم؟“  
 ”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو مگر میری جان! تم بچھلے چند دنوں سے کچھ کچھ بدلے بدلے سے لگ رہے ہو۔“ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بڑے تجسس انداز میں گویا ہوا تھا۔ بلوچمنز، ہٹی شوخ رنگوں کی لائٹنگ شرٹ میں ملبوس اس کی وجہ پر سانس لیا تھا۔  
 تھی، مگرے خوب صورت آنکھوں میں روشنیوں کے شگم میں ایک حزن بھی نمایاں تھا۔ وہ حزن اسے سب سے دور رکھتا تھا، وہ سب میں منفرد و بے وقار نظر آتا تھا۔

”یومین، دم کل آئی ہے؟ سیٹنگ فکل آئے ہیں یا میں ایلین بن گیا ہوں جو تمہیں بدلا بدلا نظر آ رہا ہوں؟“ خلاف معمول وہ خوشگوار موڈ میں بات کر رہا تھا۔ حیدر اسے دیکھے گیا۔

”تمہیں محبت پر کتنا یقین ہے؟ آئی یومین محبت دنیا میں باقی ہے؟“

”محبت ہی دنیا کے قائم و دائم رہنے کی وجہ ہے، سر آفتاب نے بتایا تھا کہ محبت صرف اسی کا نام نہیں جو مرد و عورت کے درمیان ہو، محبت کے بہت سے رنگ ہیں، بہت سے روپ ہیں۔ ہر رنگ میں اس کی پاکیزگی ہے، ہر روپ میں تقدس ہے جہاں یہ مقدس جذبے نہیں، وہاں پھر محبت کے فریب میں حیوانیت ہوتی ہے۔“

”ہوں، خاصی الہامی سوچ ہے محبت کے بارے میں تمہاری..... کیا کسی سے ”محبت“ کرنے لگے ہو؟“ حیدر کا لہجہ ذوق منی تھا۔  
 ”محبت کرنے نہیں لگا، محبت کرتا ہوں۔“

”اچھا بھئی اچھے رسم نکلے، کون ہے وہ ذات شریف؟“ حیدر نے مارے تجسس کے اس کے چہرے سے چہرہ ملا دیا، اس نے دھکا دے کر دوڑ کر گیا۔

”شٹ یارا“ وہ جھنجھٹایا، حیدر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”میں نے جتنی شدت سے محبت کی ہے، اتنی ہی شدت سے نفرت بھی کی ہے، بلکہ کرتا ہوں۔ ابھی بھی اور ہرگز کرنے والا دن میری نفرت کو بڑھاتا ہوا ہی گزرتا ہے۔“ لکھنت اس کے لہجے میں خون خواری در آئی۔

”ارے ایسا کون ہے وہ جس کو تم جان سے بڑھ کر چاہتے ہو اور وہ کون بد بخت ہے جو تمہاری نفرتوں کا مستحق ہے؟“

”ڈنیا میں، میں جس کو سب سے زیادہ چاہتا ہوں وہ میرے بابا ہیں۔“ باپ کے ذکر پر اس کے چہرے پر تازگی اُبھری تھی جو دوسرے پل ہی غائب ہو کر تندی و نفرت میں بدل گئی تھی۔

”اور ڈنیا میں، میں جس سے سب سے زیادہ نفرت کرتا ہوں وہ..... وہ عورت ہے جس نے ہمیں بابا سے دور کر دیا اور بابا کو سب سے دور کر دیا۔ میں اس عورت کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔“ اندرونی جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، حیدر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”تم ہمیشہ اس عورت کے ذکر پر آگ بولہ ہو جاتے ہو، میرے خیال میں تمہارا انداز فکر تمہیں کسی ایسے گمراہی کے راستے پر نہ لے جائے جہاں سے واپسی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ بہتر ہوگا اگر ہم انکل کی واپسی تک اس بات کو سوچیں ہی نہ کہ کبھی کبھی حقیقت ہماری سوچوں سے یکسر الٹ ہوتی ہے۔ بس اب تو یہی دعا ہے، انکل جلد از جلد واپس لوٹ آئیں تاکہ تم بھی دل سے خوش ہونا سیکھ جاؤ۔“

☆.....☆.....☆

جہاز گراہی کے لیے ٹیک آف کر چکا تھا۔

کرن اپنی سیٹ پر نیم مردہ سی بیٹھی تھی، ان کے برابر میں بیٹھے ہوئے انس نے ان کا سر دہاتھ بڑی چاہت سے اپنے مضبوط ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔ ”ٹیک اٹ ایڈی کرن! بی کیئرنگ یار، آنکھیں کھولو۔“ انس نے جھک کر سرگوشی کی تھی، کرن نے ہنسنے کی بجائے آنکھیں کھولی تھیں مگر ان کے چہرے پر ایک سکوت و خاموشی مثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ تمام رعنائی و فکری خزاں زدہ پھول کی طرح مرجھا گئی تھی، ایک ماہ کی مسلسل ذہنی جدوجہد کے بعد وہ آج رخت سز کو نکلی تھیں۔ اس شہر کے لیے جہاں زندگی نے اپنے بہت سارے پہلوؤں سے اسے آگاہ کیا تھا جس کا ہر پہلو ایک دوسرے سے مختلف تھا۔

”جس منگواؤں؟“ انس نے دریافت کیا تو انہوں نے انکار میں جواب دیا۔

”اب سنبھلو! اپنے بچوں کے پاس جا رہے ہیں ہم، اپنے شہر جا رہے ہیں۔“

”اور موت کے قریب بھی۔“ ان کی آواز گزرتی تھی۔

”وہم ہے سب، ایک لمٹ ہوتی ہے یار ہر چیز کی، کب اس خوف سے باہر نکلو گی؟ اچھی باتیں سوچو، اچھے دن یاد کرو، کل کے خدشات میں کیوں آج کو بھی خراب کرتی ہو۔“ وہ نرمی سے سمجھانے لگے تھے۔

”یہ سوچو، جب ہم بالکل غیر متوقع طور پر سب کے سامنے جائیں گے تو وہ سب کیسے سر پرانز زدہ جائیں گے اور کتنی حورین، اس کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ ہوگا۔ ہریرہ، بشرح کس قدر ایکسائیز ہوں گے۔ قاریہ بھابی کو دیکھو، کتنی خوش و سرور دکھائی دے رہی ہیں، حالانکہ وہ جانتی ہیں ہریرہ کے ایکسیڈنٹ کے بارے میں، پھر بھی کتنی بہادری کا ثبوت دے رہی ہیں۔“ وہ برابر میں بیٹھے سدا اور قاریہ کے متعلق کہنے لگے تھے۔

”ہریرہ اب تو بہتر ہے، جب بھابی نے سنا تھا تو دو دن بہت ڈپر لہڑ رہی تھیں، دن میں کئی بار اس سے بات کرتی رہی ہیں۔“

”میرے کہنے کا مقصد یہی ہے، پریشانیاں اور مشکلیں سب پر آتی ہیں جو وقتی طور پر پریشان بھی کرتی ہیں اور بے چین بھی، جب وہ وقت گزر جاتا ہے تو اس کی یاد میں پھر ساری زندگی خراب نہیں کی جاتی۔ میرا دل کہتا ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا، دشمنی کی آگ ایک بار سرد ہو جائے تو پھر نہیں بھڑک سکتی۔ اپنے شہر کی زمین پر ہر قدم تمہیں بہت اعتماد سے ہر خوف و دوسو سے سے مبرا ہو کر رکھنا ہے، ہم نے جو کیا تھا وہ غلط نہ تھا، ڈرتے وہ ہیں جو کچھ غلط کرتے ہیں۔“

حیدر اور ذوالنون، بی بی جان سے ملنے آئے تو وہاں حورین نہیں تھی، میرا بیگم اور مول موجود تھیں۔ بی بی جان ان سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں، شکر یہ کہ ساتھ بہت ساری دعاؤں سے بھی نوازا تھا انہیں، یہ مہذب و نیک اطوار نوجوان بہت پسند آئے تھے۔

ایسی شائستگی و وقار وہ اپنے بھائیوں کے بچوں میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں مگر وہ مسخرے بنے رہتے تھے، البتہ اب وہ وہی میں کچھ سنجیدگی دیکھ رہی تھیں، کیونکہ وہ مصروف رہنے لگا تھا۔

”ہلیز یار! مجھے یہاں سے ڈسپارچ کروادو، بیڈریٹ کرتے کرتے میں خود کو بیڑی بکھینے لگا ہوں۔“ ہریرہ جوان سے خاصی باتیں کر چکا تھا، بے تکلف انداز میں بولا۔

”ہاں ہاں کہ تم پھر مینڈک کی طرح پھدکتے پھرو، جب تک مارے زخم مندمل نہیں ہو جاتے، جب تک میں چھٹی لینے والی نہیں ہوں۔“

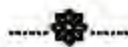
بی بی جان نے کہا، اسی اثناء میں میرا اور مول سینئر ٹیبل پر چائے کے ساتھ لوازمات رکھ چکی تھیں، ذوالنون نے اعتراض کیا تھا۔

”تکلف کیسا بیٹے! آپ لوگوں کے احسان کا کوئی بدل ہی نہیں ہے۔“

”حیدر کو گھر ڈراپ کر کے وہ آگے بڑھا تھا، جب گھنکیسی سینئر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔

پرہل گھر و پلیٹ کے سوٹ پر پرہل اور بلیک پھولوں کے پرنٹ والا بڑا سا وہ پتہ شانوں پر پھیلائے، بلیک اسکارف سر پر خوب صورتی سے باندھے وہ بڑے طمطراق سے سڑک کی جانب ہی آ رہی تھی۔ بائیں بازو پر شوڈر پرس لگ رہا تھا، دائیں ہاتھ میں شاپر پکڑا ہوا تھا، وہ دائیں بائیں دیکھے ہٹا سوچوں میں گم چلی آ رہی تھی۔ ذوالنون کی نگاہیں بے ساختہ اس کی جانب اٹھی رہ گئی تھیں، سردیوں کی اس گلابی شام میں دل کشی و حسن اسے اس کے چہرے پر چھایا محسوس ہونے لگا تھا، وہ حسن پرست نہیں تھا مگر کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی دل کے اندر عجیب سی آج سگئے گئی تھی، وہ اس سے دور بھاگنا چاہتا تھا مگر پھر از خود ہی نگاہیں اس کی حلاشی رہتی تھیں۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ شام اپنا آچھل سینے کو تھی، وہ جیسی لینا ہی چاہتی تھی کہ اچانک بلوکارا اس کے قریب رکی تھی۔



حورین نے کار کو بالکل اپنے قریب رکھ دیکر گھبرا کر دیکھا، جو چہرہ اسے ڈرائیونگ ڈور سے جھانکتا ہوا نظر آیا، لمبے بھر کو وہ اسے دیکھ کر مگ رہ گئی، بھلا اس شخص سے ایسی نوازش کی توقع کیوں کر ممکن تھی۔

”میموری گھر سیف کر کے آئی ہیں یا آئی سائیز ویک ہو گئی ہے؟“ وہ اسے ہونٹوں کی طرح کھڑا دیکھ کر گویا ہوا۔  
”نہیں..... میں“ وہ نرمی طرح بولکھلائی۔

”اوہ شٹ..... کم آن، اب یہاں تماشا لگانے کا ارادہ ہے؟“ وہ ارد گرد سے گزرتے لوگوں کی پُر تجسس نگاہوں سے اکتا کر بولا۔  
”تو تجھیں کس..... میں چلی جاؤں گی“۔

”میں بھی آپ کو ڈراپ ہی کروں گا، ساتھ لے جانے کا ارادہ نہیں ہے“۔

اس کے اکھڑا صراہ بھرے انداز سے وہ شش و پنج میں مبتلا تھی کہ ایک احسان لینے کے لیے جو نتائج بھگتنا پڑے تھے، دوسرے احسان کی خود کو وہ تحمل نہ سمجھتی تھی۔ حقیقی طور پر اس کا دل اس کی طرف سے صاف نہ تھا۔ ایک وہ تھا کہ مسلسل اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا، کچھ دیر قبل دکھائی دینے والی سروت کی رعنائیاں اس کے وجیہ چہرے سے اوجھل ہونے لگی تھیں۔ ان خوب صورت آنکھوں میں جہاں کچھ دیر قبل ایک شوق و انبساط جگمگا رہا تھا وہاں اب ہلکی ہلکی برہمی کی سرخی چھانے لگی تھی۔

”میں چلی جاؤں گی“ اپنے ارد گرد اکتھا ہونے والے لوگوں اور زکٹی ہوئی گاڑیوں کو دیکھ کر وہ حواس باختہ ہونے لگی۔

”اب تمہیں میرے ساتھ ہی چلنا ہوگا“۔ تماشا بنتے دیکھ کر وہ پوری طرح کھول اٹھا اور اس کا تیر بھی بگڑ گیا تھا۔

”ابنی پرابلم مس؟“ کار سے اتر کر ایک نوجوان اس کی طرف بڑھا۔

”تھنک“ اس لمبے وہ ڈرائیونگ ڈور کھول کر اتر اور ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا اشارے لے لیا اور ایک نگاہ اس کے ہوائیاں اڑتے چہرے پر ڈال کر اس سوئز بونڈ نوجوان سے گویا ہوا۔

اس کے درشت لہجے اور ناخوشگوار انداز نے اس نوجوان کو اُلٹے قدموں واپس کر دیا تو حورین بھی خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ

گئی۔ اشارے والی سیٹ پر رکھ چکا تھا۔ بہت جا رہا تھا انداز میں اس نے کار اشارت کی۔

”کس اسٹوپ نے ایڈوانس دی تھی اس نا تم آپ کو تباہ کرنے کی“۔

چہرے قفل ہونے والے تماشے نے اس کی ساری خوشگوار ریت غارت کر دی تھی۔

”مجھے کسی ایڈوانس کی ضرورت نہیں ہے، میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں“۔ وہ حواسوں پر قابو پاتی پُر اعتماد لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”وہ تو آپ کی حرکتوں سے ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ کس قدر ایجنسی فینس اور مہل ہیں آپ۔ اس کا انداز سنجیدگی سے پُر تھا۔

”یہ شہر ہے یہاں جو لڑکیاں بے خبری میں گھروں سے نکل جاتی ہیں تو..... گھر لوٹ کر جانے کے قابل نہیں رہتی ہیں“۔ اس کی

آواز پست تھی۔

”نہ معلوم کیا سمجھ کر آپ ایسی بات کہہ رہے ہیں، ورنہ میں نے ایسی کیا حرکت کر دی جو آپ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“ میں تو ہریرہ کے لیے گفٹ لینے آئی تھی۔“ ذوالنون کا نام سنانا اندازاً سے ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

”گھر سے کسی کو بھی لے کر آ سکتی تھی۔“ وہ اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا اگر میں تمہا گھر سے شاپنگ کرنے آئی۔ روز لاکھوں لڑکیاں مختلف ضروریات کے تحت گھر سے نکلتی ہیں اور گھر پہنچتی ہیں پھر میں کیوں نہیں نکل سکتی؟“ اس کی بھرا سے وہ زری طرح مشتعل ہو گئی تھی۔

”بحث برائے بحث کی فضول عادت سے مجھے بڑ ہے۔“ وہ بڑ بڑایا۔

حورین نے کچھ حیرت و تعجب سے دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کی گریے آنکھیں دھڑا اسکرین پر مرکوز تھیں۔ براؤن پینٹ کوٹ میں اس کی وجہ پر سناٹا نمایاں تھی۔ کپڑوں سے پھونتی دل آویز مہک..... بھینکتی شام کے گہرے پڑتے سائے اس کا روڈ انداز، روش ڈرائیونگ، وہ بہت کچھ کہنے کی چاہ کے باوجود چہرہ جھکا کر رہ گئی اور وہ بھی گویا حواس میں لوٹ آیا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا اسے اب محسوس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔

حورین کو لگت دینا وہ بھی خوب نازخروں سے بچہ آزمائی کے بعد، بھلا ایسا کیے مگر ہوا؟ کسی محرزہ انسان کی طرح بلا سوچے سمجھے۔

”اوہ مائی گڈنیس!“ وہ بے دھیانی میں خود کو ڈپٹا ڈپٹا لیش بورڈ میں مکارا بیٹھا۔ غصے بھنچلا ہٹ اور کوفت سے زری حالت تھی۔

”کیا ہوا.....؟“ اس کے جنونی انداز پر وہ بولکلا اٹھی اور وہ ساہقہ رویہ برقرار رکھتے ہوئے اس کی جانب دیکھے بنا بگڑے لہجے میں گویا ہوا۔

”تھنک۔“ حالت ایسی تھی گویا ابھی نیند سے بیدار ہوا ہو۔

تمام راستہ خاموشی سے کٹا۔ ذوالنون نے پھر کوئی بات نہ کی۔ حورین بھی اس کی جانب سے زرخ موڑے کھڑکی کے ساتھ لگے شیشے سے باہر دیکھتی رہی۔ ایڈریس بتانے پر گیٹ کے سامنے کار صرف اس کے اترنے تک زکی اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی، شکر یہ یا اندر آنے کی دعوت دیتی، وہ کار اس کے اترتے ہی بھگا کر لے گیا اور وہ چند لمبے تیزی سے دور ہوتی بلوا کارڈ کی سرخ لائٹس کو دور ہوتے دیکھتی رہی۔

وہ الجھا اور بکھرا ہوا شخص اسے بھی الجھا گیا تھا۔ عجیب سا احساس تھا اس نامہرباں کی مہربانوں کا، گویا گلاب کی کلیوں میں کانٹے آویزاں تھے۔ خوشنمائی و خوشفا کی کا گھائل انداز سیٹھے۔

☆.....☆.....☆

ایکشن کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ برہان لغاری بھی بے پناہ معروف تھے۔ جلسے جلوسوں و دیگر تقریبات میں پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا، سوچے سمجھے بغیر۔ اس بات کا یقین تھا کہ برسر اقتدار آ کر سب سود سمیت وصول کر لیا جائے گا۔

آج وہ گھر پر ہی تھے، شام کی چائے پر وہ فاقہ نگیم، منال اور کونین کے ساتھ معروف گفتگو تھے۔ منال بہت گہرائی سے باپ اور



پھر ماں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی اور یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ کچھ عرصے سے جوان دونوں کے درمیان ایک کشیدگی چل رہی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔

”میرا اب بھی مشورہ وہی ہے نانا جان! آپ اس راہ سے واپس لوٹ آئیں، زیادہ راستہ صبور نہیں کیا ابھی آپ نے۔“ کونین نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، وہ اس کے انداز پر مسکرا دیے۔

”راتے پر قدم رکھ دیے ہیں مائی سن اب منزل پر ہی جا کر رکھیں گے۔“

”منزل؟.....“ جو ابا وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

”انسوس کا مقام بھی ہے کہ منزل جو ہمارے ملک پاکستان کی صورت میں ہمیں مل چکی ہے، وہ پا کر ہم کجا ہونے کے بجائے منتظر ہو رہے ہیں۔“

”یک مین ایئر انجوائے کرنے کی ہے۔ یہ گورکھ دھندے آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے جو کچھ میں نہ آئے وہ نہ سمجھتا بہتر ہے۔“ انہوں نے لائٹ سے سگار ساگاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”کونین کی بات درست ہے، آپ خواہ مخواہ اس طرف چلے گئے ہیں۔“ فائقہ بیگم نے بھی اس کی تائید کی۔

”کرسی میں بڑی کشش ہوتی ہے مئی جی! ہم نے بہت سے خاندان اس کی چاہ میں تباہ ہوتے دیکھے ہیں، کوئی نہ کوئی تو راز ہے اس کی چاہ میں۔“

”اوہ منال! آپ بھی اپنے قادر کی طرف داری کر رہی ہیں۔“ فائقہ بولی۔

☆.....☆.....☆

مہران علوی کا اصرار ہرگز رتے دن کے ساتھ شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خضریٰ..... سے فون پر بات کرنے کے لیے ہند تھا، گویا خضریٰ کے فون پر نہ آنے کی وجہ نے اس کے جذبہ شوق کو مزید ہوادی تھی اور بالآخر راحیلہ بیگم کو خضریٰ کو سمجھانا پڑا کہ وہ اس سے بات کرے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

”میرا..... دل نہیں مانتا دادو۔“ وہ ان کی جانب دیکھتی ہوئی بے چارگی سے گویا ہوئی۔ اس کی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔

”کبھی دل کی بات آن سنی کر کے دوسرے کی بھی مانتی چاہیے۔“ دادو نے اس کا سر سینے سے لگاتے ہوئے رسائیت سے سمجھایا۔

”دادو! میں جانتی ہوں، نہ چاہنے کے باوجود میں اس مراب کی طرف بڑھتی چلی گئی جو لا حاصل تھا۔ میرے دل میں محبت کی کلی بنا کھلے ہی مر جھا گئی ہے اور میں جانتی ہوں..... میرے اندر بہار صرف ایک شخص کے لیے اترتی ہے وہ نہیں تو..... کچھ بھی نہیں ہے۔ اب میں مہران علوی سے محبت تو کیا..... شاید ہمدردی کے چند لفظ بھی نہ کہہ پاؤں گی۔“

جب سے کونین یہاں سے لوٹا تھا اور اس نے اس کا ٹوٹا بکھرا، شکستہ روپ دیکھا تو وہ اس سے اپنے جذبات کچھ دن تک تو

چھپائے رہی مگر جب کھن حد سے تجاوز کر گئی اور پھر اچانک ہی مہران علوی اس کی جانب متوجہ ہونے لگا تو اس گفتگو میں وہ بڑی طرح ہرٹ ہو رہی تھی کہ دادو (جو اس کی مزاج آتشا و ہمزاتھیں) نے بڑھ کر ہمیشہ کی طرح اسے سہارا دھو لیا۔

”ایسے مت سوچو، کچھ بھی نہیں ہوا تمہارے اور کوئین کے درمیان، جس طرح خاموش محبت پیدا ہوئی تھی وہ اسی طرح قفل لگائے فنا ہو جائے گی۔ تمہاری محبت، تمہارے جذبے ابھی اُن چھوئے ہیں۔ مہران علوی کے ساتھ تم کوئی دھوکہ نہیں کرو گی، کوئی فریب نہیں دو گی، یہ سب خیالات دل سے نکال دو۔“

ان کے پورے دلائل کے ساتھ سمجھانے کے باوجود وہ خود کو مہران علوی سے بات کرنے پر ہائل نہ کر سکی، اس کی کال اسے جبراً اٹینڈ کرنی پڑی۔

”ہیلو۔۔۔ اس کے انداز میں خود بخود بھیدگی در آئی۔

”جی۔۔۔ مہران علوی۔۔۔۔۔ آپ ڈاکٹر مختاری؟“

دوسری جانب سے بے اشتیاق لہجے میں ایک عالم شوق کا ہویا تھا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

”اوہ جینکس گاڈ! آپ کی آواز تو سنائی دی، آپ کو معلوم ہے ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا ہے انتظار کرتے ہوئے۔۔۔ وہ ہنسا۔

”دراصل میں آپ سے کچھ ضروری بات، بلکہ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی۔۔۔ وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

”یہ پورا مہینہ اگر میں کہوں، میں نے صرف آپ کو سوچتے ہوئے گزارا ہے۔۔۔ ملنے کی آرزو تو اسی دن سے ہو رہی تھی، جب سے

آپ کی غیر موجودگی میں ہنزہ کی شادی کی فونوز میں آپ کو دیکھا تھا۔“

اس کی بے وقار آواز میں ٹھہراؤ کے ساتھ جذبوں کی کھنگ بھی تھی۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”اس طرح کیسے بتا سکتا ہوں، میرا مطلب ہے، اب تو فیس ٹوفیس بات ہونی چاہیے۔“

دوسری جانب جذبوں کی جولانیاں عروج پر تھیں۔

”ابھی تو نہیں۔۔۔۔۔“

”پھر کب؟“

”آپ کو ہیٹ کرنا ہوگا۔“

”یس، میں کر سکتا ہوں تا زیت۔۔۔۔۔ مگر ایک شرط پر۔۔۔۔۔“

”وہ کیا؟“ حضرتی بے ساختہ کہہ اٹھی۔

”آواز کا یہ تعلق ٹوٹے نہ پائے۔“ وہ آہوں کو دبا کر ہائی بھر بیٹھی۔

☆.....☆.....☆

بھیڑ میں زمانے کی

ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں

دست دراز لہجوں میں

سلوٹس سی پڑتی ہیں

ایک ذرا سی رہنمائی میں

شک کی زبردستی پر

اس طرح سے کھلتے ہیں

فاصلے کی اینٹوں سے اینٹ جڑنے لگتی ہے.....

جہاز سے اترتے وقت ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ذہن بگولوں کی مانند چکر رہا تھا۔ ماضی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ آنکھوں کے

سامنے بہت سارے چہرے تھے۔

اپنے چہرے، پرانے چہرے۔

شفیق چہرے، رقیب چہرے۔

ماضی کے جھولے جھولتی ہوئی وہ حال میں نیم خوابیدہ کیفیت میں کسی شمار زدہ کیفیت میں انس صاحب کا ہاتھ پکڑے میٹھیوں میں

رہی تھی، پھر جیسے ہی زمین نے ان کے قدموں کو چھوا، ان کے قلب میں ایک عجیب سی پھوار پڑنے لگی تھی، میٹھی میٹھی، ششدری ششدری۔ ایک

ایسی مانوس سی مہک جو ممتا کی آغوش سے آتی ہے۔ لازوال مہکار، اصول خوشبو! زمین بھی تو ماں ہوتی ہے۔

ماں تو نو ماہ اپنی کوکھ میں رکھتی ہے۔ زمین کی کوکھ صدیوں سے ہم آدم زادوں و زادیوں کے لیے وقف ہے۔ اس کا درجہ ممتا سے

زیادہ بلند ہے۔

زمین کی مہک، ممتا کی خوشبو، دونوں ہی ہم آہنگ ہو کر اس سے لپٹی تھیں اور ان کے آشفقہ جذبات پھل کر موتیوں کی صورت

میں رخساروں سے بننے لگے تھے۔

ایک طویل عرصے بعد انہوں نے اس شہر میں قدم رکھا تھا جو ان کا اپنا تھا، جہاں انہوں نے اپنی کو غیر بننے دیکھا تھا، غیروں کو

اپنوں سے بڑھ کر پایا تھا۔ کچھ رشتے کھوئے تھے، کچھ پائے تھے اور ان لمحوں میں جو قریب تھے وہ پس منظر میں چلے گئے تھے، جو چھڑ گئے

تھے وہ قلب و نگاہ میں سٹ آئے تھے۔ اُن انگنت چہروں میں ایک چہرہ بہت واضح تھا۔

ذہلی شام کی اُدا سیاں لیے ہوئے دور نور چہرہ نوشاہہ بیگم اور ان کی ماں کا تھا جن سے مچھڑنے کا ملال انہیں تادم آخر ہوتا تھا۔ اُن صاحب کے علاوہ ان پر گزرنے والی کیفیات سے سدا اور قاریہ بھی واقف تھیں۔ سو وہ خاموشی سے ان کے ہمراہ چلتے رہے۔ گھر پر ان کی اچانک آمد نے سب کو سرت بھری حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بہت والہانہ طریقے سے ان کو ویکلم کہا گیا۔ ان جنتیوں سے تو سب گھروالے ملتے رہے تھے کہ ان سے رو برو ان کی پہلی ملاقات تھی۔ بڑے تو بڑے بچوں نے بڑھ کر ان کی پندیرائی کی پھر جس شدت و محبت سے حورین ان سے لپٹی تھی، اسے آغوش میں بھر کر ان کے بے سکون و اتر دل کو خاصا اطمینان ملا تھا۔

”آئی مس یوما! رٹلی مس یو“۔ وہ ان کے گال چومتے ہوئے گلوگیر لہجے میں گویا ہوئی۔ اس کے چہرے سے بے تحاشہ خوشی عیاں تھی۔

”اسی لیے میں آئی ہوں میری جان“۔ وہ اس کو لپٹاتے ہوئے بولیں۔

”یہاں آکر آپ ماما کی بیٹی بن گئیں، اب میرا کیا ہوگا؟“ سب گھروالوں کی بھرپور توجہ اور حورین کو دیکھ کر جو کرن میں بھرپور تبدیلی آئی تھی جو زندگی و پیش کش تھی اس نے اُن کو بہت سرور کر دیا تھا۔

”آپ کی بیٹی آپ کی رہے گی، یو ڈونٹ وری“۔ وہ جھٹ اس کے شانے سے لپٹتے ہوئے لاڈلے انداز میں گویا ہوئی تو وہ دونوں مسکرا دیئے۔

ان کے آجانے سے گویا خوشیاں اُٹھ آئی تھیں۔ دونوں بہوؤں نے کچن سنبھال لیا تھا جہاں سے نت نئے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھونٹنے لگی تھیں۔ بی بی جان نے لڑکیوں کو ہدایات دی تھی کہ وہ انجیسی میں ملازماؤں سے اپنی نگرانی میں صفائی کروائیں، تاکہ وہاں کے روضان لوگوں کو دینے جائیں۔ ساتھ ساتھ وہ خود بھی گاہے بگاہے جائزہ لے رہی تھیں، سب سے اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ آج اچانک ہی ہریرہ کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ خاصی حد تک صحت یاب ہو چکا تھا۔

سدا اور قاریہ کے ساتھ کرن اور اُنس کو بھی اسے نارمل حال میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ہریرہ اور نضر بھی کھل سے گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

قسمت کے کھلونوں سے بہل جاؤں گا ایک دن

منظر کی طرح میں بھی بدل جاؤں گا ایک دن

سورج کی طرح تجھ کو بھرتا ہے جہاں میں

میں سایہ دیوار ہوں ڈھل جاؤں گا ایک دن

کب تک یوں ہی بھٹکوں گا زمانے کے تصور میں

اے عمر رواں تجھ میں نزل جاؤں گا ایک دن  
چھوڑا ہے تیرا ساتھ تو یہ فیصلہ کر کے  
خود ٹھوکریں کھا کھا کر سنبھل جاؤں گا ایک دن

”ہاڈ آر یو پارٹنر!“ ذوالنون نے کونین کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ سوچوں میں غرق تھا، سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”آئی ایم فائن، آڈیٹھو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا چکا تھا۔

”یونینورسٹی بند ہے؟“ وہ پوری طرح سے بھائی کی طرح متوجہ ہو چکا تھا۔ ڈارک کوٹ سوٹ میں اس کی وجیہہ پر سٹائلی عیاں تھی۔ مسکراہٹ سے ہمیشہ محروم رہنے والے گلابی لبوں پر اب اکڑ مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔ سرخ و سپید رنگ والے وجیہہ چہرے سے وہ کرتھلی دپے زاری بھری رجوت غائب ہو چکی تھی جو کسی کو بھی اس کے قریب نہ ہونے دیتی تھی۔ گرے آنکھوں میں البتہ طلال و تڑپ کی وہ سرخی جنوز موجود تھی جو باپ سے جدائی کے وقت ایسی ٹھہری تھی کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ بڑھتی چلی گئی۔

”آپ یہاں تمہا بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟“

”اسٹڈی کر رہا تھا۔“ کونین نچل کی جانب اشارہ کر کے بولا جہاں رکھے اخبارات میں پہلے صفحے پر سیاسی خبروں میں برہان لغاری کی تصویر بھی موجود تھی، جلسے میں تقریر کرتے ہوئے۔

”نانا جان کی یہ ہانی مجھے پسند نہیں آئی، اینی ویز آپ فری ہیں؟“

”ہوں، کہیں چلنے موڈ ہے؟“

”نہیں، دادو کے پاس چلتے ہیں، بہت ناٹم ہو گیا ہے ان سے ملے ہوئے۔“

”وہاں..... اچھا.....“ کونین کے چہرے پر ایک سایہ سا بھرا یا۔

”بھائی! ایک بات بتائیں گے؟“ اس کی حساس نگاہوں سے اس کی کیفیت چھپی نہ رہ سکی تھی، وہ سنجیدگی سے استفسار کرنے لگا۔

”آں..... ہاں..... ہاں، ہاں۔“ اسے اس لمحے کا ڈر تھا کہ کہیں وہ اس کی نگاہوں میں چھپے اس درد سے آشنا نہ ہو جائے جو اس

کو اندر ہی اندر دیکھ کی طرح چاٹ رہا تھا اور ہر خوشی سے بڑھ کر عزیز ہو چکا تھا، وہ سمجھوتہ کر چکا تھا اپنے اس دکھ نارمانی سے مگر یہ سب اسے تھما ہی گوارا تھا۔ ذوالنون کو وہ اس لیے کی ہوا بھی نہیں لگا چاہتا تھا۔ جانتا تھا وہ اس کی خاطر کسی کو خاطر میں نہیں لائے گا۔ دادو کے ہاں کوئی اس کی بات کو رد نہیں کر سکتا تھا تو یہاں ناو اور ماما کی ڈیکلریشن بھی اس کے سامنے زیر ہو جاتی۔ خضریٰ اس کی ہو سکتی تھی مگر..... وہ خود غرض نہ تھا، نہ خود پرست۔ یہ اس کی سوچ تھی کہ اس کی چاہت صرف اس کی نہ ہو، گھر بھر کی چاہت بن کر رہے۔

”آپ دادو کے ہاں جانے سے کترانے لگے ہیں، کوئی بات ہوئی ہے؟“

”ارے نہیں بھئی!“ اسے اپنا تہہ بھرم سے میرا محسوس ہوا۔

”ایسی کوئی بات کیوں ہوگی بھلا؟ وہاں سب اتنا چاہتے ہیں، اس قدر محبت دیتے ہیں۔ انکل، آئی، ہنزو، منزل، خضرئی، پھر دادو کی محبت، ان کا انداز تو سب سے منفرد ہوتا ہے، رگیل خون بڑھ جاتا ہے۔“

”آئی ڈونٹ نو، آپ مجھے بھلا رہے ہیں یا خود کو؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ کونین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب ہی تو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔“ وہ بھی دھجھے سے مسکرا کر بولا۔

”قاریو کا سنڈ انفارمیشن مائی جونیئر برادر! مطلب پرست لوگ مجھے پسند نہیں۔“

دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑے۔ اسی دم حیدر کی کال اس کے سبل پر آئی تو وہ تردد میں پڑ گیا۔

”کیا کہا ہے حیدر نے؟“ کونین اسے شش و پنج میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”وہ اسی وقت ملنا چاہتا ہے۔“

”کوئی ضروری کام ہوگا۔“

”شاید کافی سیریس تھا، ہم دادو کے ہاں پھر چلیں گے۔“

☆.....☆.....☆

ندوہ انکار کرتی ہے، نہ اقرار کرتی ہے

لیکن مجھے پتا ہے وہ مجھے ہی عیار کرتی ہے

”بھائی! ذرا ڈھنگ سے ”پتا“ کرواؤ کہیں لڑکی کوگی بہری تو نہیں ہے۔“

سرمد نے لگرمندی کا اظہار کیا، وہ سب ہال میں جمع تھے۔ موسم بھی ٹھنڈا تھا۔ سردی نے برقیلی بانہیں پوری طرح وا کر دی تھیں، ہر شے کو سردی نے جکڑ لیا تھا، یہاں بھی سردی سے پوری طرح لطف اندوز ہوا جا رہا تھا۔ گرم گرم کافی کے ساتھ ڈرائی فرانس بھی خوب کھائے جا رہے تھے۔ گھر کی خواتین اور مردوں کی سسرالی دعوت تھی، کرن اور قاریہ وہاں گئی ہوئی تھیں اور نوجوان پارٹی کو پوری طرح موقع مل گیا تھا۔ وہ بلبلہ لگہ کرنے میں مصروف تھے۔ تمام لڑکے کارپٹ پر کشتہ کے سہارے ڈھیر تھے۔ لڑکیاں صوفوں پر کھیل شائون تک ڈالے سگری بیٹھی تھیں۔ ان میں صرف حورین تھی جو ہلکا سا سویٹر پہنے بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں کاجو اور نکمین پتے کی پیٹ تھی۔ ساتھ ہی کارٹر نیبل پر رکھا گنگ سا تزکپ کافی سے بھرا بھاپ اُڑا رہا تھا۔ وہ بیڑے سرد انداز میں بیٹھی ڈرائی فرانس کھا رہی تھی۔

وہ ایک دوسرے کو ڈراؤنی کہانیاں سنا رہے تھے۔ سرد اور سفیان کو سردیوں کی خاموش راتوں میں ایسی کہانیاں پڑھنے، قہقہے سننے سنانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ لڑکوں کی حرم میں لڑکیاں سن تو لیتی تھیں، پھر ڈر کے مارے جو ان کا حال ہوتا، وہ بیان سے باہر ہے۔ اس وقت

بھی وہ کروہ بند کیے اس ٹاپک کی کہانیاں سنا رہے تھے۔ معاہرہ کی زبان ملی، وہ سنجیدگی سے کہانی سنتی ہوئی حورین کو دیکھ کر تنگنایا۔  
 ”ڈونٹ قاذول ہریرہ! اب تمہیں کوئی لٹاسٹک ڈراؤنی کہانی سنانی ہے اور تم سناؤ گے، اس طرح حورین سے الجھ کر فرار نہیں پاسکو  
 گے۔“ وحی نے سمجھ کی۔

”اس کو قاتلو بکواس کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔“ حورین نے چوٹ کی۔  
 ”اگر ایسی بات ہے تو سنو، میں ایک ہانگل سچا واقعہ سنا تا ہوں، جو حال میں میرے ساتھ پیش آیا ہے۔“ سب کی گھورتی نگاہوں  
 اور حورین کے چیلنج نے اس کے اندر کی انکو بیدار کر دیا، وہ اکڑ کر بیٹھتے ہوئے بڑے جوش لہجے میں بولا۔  
 ”پہلے حلف اٹھاؤ، یہ جو تم سنانے جا رہے ہو، یہ واقعہ سچا ہی ہے۔“

”جیے! ابھی اس ایکسیڈنٹ میں انجریز ہونے سے پہلے اسکو روک کر اٹھے ہو، نہ معلوم ابھی فٹنگ درست ہوئی ہے یا نہیں؟ خدا خواستہ ایک  
 آدھا اسکو ونگل کر کر گیا تو پرابلم ہو جائے گی۔ انسانی اسکو پارٹس ملتے بھی نہیں ہیں۔“ اسے حورین کی طرف بڑھتے دیکھ کر وحی گویا ہوا تھا۔  
 ”جمل منڈے! شروع ہو جا۔“ سرد نے کافی پیتے ہوئے چمکا مارا۔

”وہ سردی کی ایک بڑی تاریک رات تھی۔ بارش برس کر دکھائی تھی جس سے سردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ہوائیں بہت تیز  
 تھیں۔ آسمان پر چھائی سیاہی نے زمین کی ہر شے کو اپنے گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ ماحول میں کثیف دھند آلود تار کی چھائی تھی۔ ہواؤں کے  
 جھکڑوں میں ایسا ہنسوتا تھا، گویا لاکھوں چڑھیں مل کر رو رہی ہوں۔“ اس نے کسی کہنہ مشق کہانی سنانے والے کی طرح کہنا شروع کیا۔  
 ”پہلے یہ بتا، ایسی رات میں ٹوکوں نکلا تھا؟“ وحی نے کہا۔

”اور کہاں نکلا تھا، میرا مطلب ہے کہاں گیا تھا؟“ سرد بھی گویا ہوا۔  
 ”دیکھو فرینڈز! اگر سنتا ہے تو سنو، ورنہ میں چلا۔“ اس نے ڈرایا۔  
 ”لیکن بتانے میں حرج کیا ہے؟“ سفیان نے اصرار کیا۔

”اچھا..... یہ روز روز جو ڈاکٹر پڑھتے ہو تو ان کے رائٹرز سے کبھی دریافت کیا ہے کہ وہ کہاں اور کیوں ایسی کہانیاں تحریر کرتے  
 ہیں، کبھی پوچھا ہے کسی سے؟“ وہ بری طرح چڑچکا تھا۔

”اسٹاپ! اٹ، اسٹوری ساری کر کر رہی ہے پلیز۔ درمیان میں کوئی نہ بولے۔“ رؤف نے مصالحتی انداز میں کہا تو ہریرہ  
 پھر گویا ہوا۔

”سخت ترین سردی میں آسمان سے لے کر زمین کی ہر شے مہیب تاریکی میں گم تھی۔ رگوں میں خون جمادینے والی ہواؤں میں  
 چڑیلوں کی آہیں، سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے ایک دوست کے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ جیسے ہی میرے  
 قدموں میں تیزی آئی، ساتھ ہی مجھے ایک عجیب سی آواز آئی اور میں چونک اٹھا۔“

”کیسی آواز؟“ سب بے ساختہ کہا اٹھے۔

”چمن چمن کی آواز“۔ ہریرہ کے چہرے پر اس لمحے سہا دینے والی سنجیدگی تھی اور وہ خاص خاص موقعوں پر ہی سنجیدہ ہوتا تھا۔

”چمن چمن کی آواز! او مائی گاڈ! یعنی کوئی..... کوئی چیزیل.....“ مول کی کھٹکھی بندھ گئی۔

”اوہ..... پلیز مول! چپ ہو جاؤ، نام مت لو“۔

نشر اور زویا بھی خوف زدہ ہی ہو گئی تھیں، کیونکہ ہریرہ کا انداز سچ کی غمازی کر رہا تھا پھر گھر میں کوئی بڑا نہ تھا، وہ لوگ بھی سب

ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے اس لیے ارد گرد سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ رات ہونے کے باعث وہ خوف زدہ ہو رہی تھیں۔ البتہ حورین بہت خاموشی سے کافی پی رہی تھی۔

”پہلے تو میں سمجھا مجھے وہم ہوا ہے۔ یہ چمن چمن کی آواز میری سماعت کا قریب ہے، اسی خیال سے میں تیز تیز چل رہا تھا اور آواز

بھی اسی انداز سے بڑھ رہی تھی۔ چمن چمن چمن..... چمن چمن چمن..... چمن چمن چمن..... میں تو اتنی سخت سردی میں بھی پسینے پسینے ہو گیا۔

اب میں تیز تیز چلنے لگا اور چمن چمن چمن بھی تیز تیز ہونے لگی۔ پہلی دنگہ مجھے معلوم ہوا خوف کس کو کہتے ہیں۔ میں بھاگنے لگا تو آواز اور بھی

بڑھ گئی۔ چمن چمن کوئی اور بھی میرے ساتھ اسی اسپینڈ سے بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں سانس لینے کے لیے زکا تو وہ چمن چمن بھی

زک گئی پھر میں چلا، وہ بھی چلی۔ میں نے اندھیرے میں دائیں بائیں دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا، لیکن آواز آتا بند نہ ہوئی، جیسے میرے قدموں

کے ساتھ وہ چمن چمن کی آواز قدم بڑھا رہی ہو“۔

”جسہیں صرف اس کی پازیب کی آواز سنائی دے رہی تھی؟“ سرد نے حیرانگی سے دریافت کیا۔ ہریرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بڑے بہادر ہو یا رادو نہ میرا تو اس طرح کے تصور سے ہی خون خشک ہو جاتا ہے“۔

”وہ شے نظر کہاں آئی ہے ابھی اتنی دیر سے یہ صرف بھاگ رہا ہے آواز سن کر نہ معلوم کہاں تک بھاگے گا؟“ واصف جوائی لیتے

ہوئے بولا تو وہ سب ہنس پڑے۔ رؤف نے ناسخا نہ انداز میں کہا۔

”حقیقت کو ہنسی میں نہ جھٹلاؤ۔ یہ سوچو ایسی ماورائی مخلوقات نظر کہاں آتی ہیں، ان کا مقصد تو صرف شرارت کر کے پریشان کرنا

ہوتا ہے“۔ ہریرہ نے کہا۔

”جسہیں نظر آئی وہ ساتھ چلنے والی جو چمن چمن اپنی پازیب بجا رہی تھی؟“

”ہاں..... بہت قریب سے دیکھا میں نے، بلکہ ہاتھوں میں اٹھایا اپنے“۔

اس کی سنجیدگی دیکھ کر جہاں لڑکوں کے چہروں پر تجسس و اشتیاق اُٹھ آیا وہیں لڑکیاں یک دم بدحواس ہی ہونے لگیں۔

”پلیز یارا! اب کلاگس پر آ جاؤ“۔ سفیان زیادہ سسٹنس برداشت نہ کر سکا۔

”تم لوگ آنے دو گے تو آؤں گا ناں“۔



”او کے! کہو ہم..... ہر تن گوش ہیں۔“

”یہ سلسلہ خاصی دیر تک چلتا رہا، میں چلا وہ چمن چمن میرے ساتھ چلتی۔ وہ میرے ساتھ ہی ساتھ تھی۔ ایک جگہ جا کر میں اندھیرے میں کسی پتھر سے ٹکرایا اور وہ بھی میرے ساتھ ٹکرا کر گری اور پورے ماحول میں چمن چمن چمن کی زوردار آواز سنانے میں دو دو دو تک پھیلتی چلی گئی۔“ وہ بولتے بولتے ایک دم ہی رگ گیا تو سب بے قراری سے گویا ہوئے۔

”ارے یا راجپ مت ہو، بولتے رہو۔“

”ہوں..... پھر..... پھر جیسے میں گرا وہ بھی میرے ساتھ ہی گری، اسی دم لائٹ آگئی اور میں نے دیکھا.....“ وہ دانستہ رُکا۔

”کیا دیکھا؟ وہ روشنی میں نظر آئی؟ کسی تھی وہ؟“ ملی جلی آوازوں سے کمرہ گونج اٹھا اور پھر ہریرہ کے قہقہے کمرے میں گونج رہے تھے، وہ سب حیرانگی سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

”خوف سے پاگل ہو گئے ہو یا ہمیں پاگل بنا رہے ہو؟“ سرمد کا انداز کافی مشکوک سا تھا، وہ بتانے لگا۔

”ہوا تو یہی تھا میں سمجھا آج وہ ناقابل یقین بات میرے ساتھ ہو گئی ہے جس کو میں کسی سچ نہیں مانتا۔“

”مگر وہ سب کیا تھا آخر؟“ حورین کو کبھی تجسس نے اُبھارا۔

”دراصل اس دن میرے کوٹ کی جیب میں چیخ زیادہ تھا جو میں بھول چکا تھا، مجھے نوٹس بک لینے کے لیے فرخ کے ہاں جانا ضروری تھا۔ پہلے راستے میں کار کا ناز بچھ رہا۔ پیدل اس کے علاقے تک پہنچا تو لائٹ چلی گئی۔ فرخ کا فلیٹ بھی آبادی سے باہر تھا۔ لائٹ آف ہونے کے بعد تو لگتا ہے جگل میں بندہ گھوم رہا ہے۔ وہ چمن چمن میری جیبوں میں بھرے سکے تھے جن پر مجھے کسی الیزوڈ شیڑہ کی نوخیز پائل کا گمان ہو رہا تھا۔ ٹھوکر کھا کر گرا تو وہ سکے جیب سے نکل کر زمین پر گرتے چلے گئے اور مجھے یاد آیا ان سکوں کو میں جیب میں بھر کر بھول چکا تھا۔“

ہریرہ کے ساتھ اب وہ سب بھی ہنس رہے تھے۔

”میں یہی سوچ رہی تھی کہ اب چڑیلوں کے بھی اسے نرے دن آگئے کہ وہ تم جیسے بندے کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔“ حورین نے کہا۔

”ان کو معلوم ہے ان کی ملکہ پہلے ہی مجھ پر فدا ہے، اسی لیے وہ ایسی کوشش ہی نہیں کرتیں۔“ ہریرہ نے لاجواب ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ سب سر آفتاب کے ہاں موجود تھے۔ پرو فیسر آفتاب خان نے انہیں بلایا تھا۔ ہنس کھ، خوش مزاج، ہمدرد طبیعت رکھنے والا، ہر ایک کی خدمت کے جذبے سے سرشار، حیدر پر بہت نازک وقت آن پڑا تھا۔ وہ جو ہر وقت کسی نہ کسی کی اُلجھن کی سلجھن بنا رہا تھا، اچانک پڑ جانے والی اپنی اُلجھن کا کوئی سرا نہ سلجھا پارہا تھا۔ اس نے ذوالنون سے ڈائریکٹ رابطہ کیا اور وہ اسے ان کے پاس لے آیا۔ معاملہ بے

حد گھمبیر تھا۔ حیدر کی بہن کی مگنی بچپن میں اس کے تایا کے بیٹے سے ہو گئی تھی، چند سال قبل اس کا مگنی ترا یک حادثے میں ہلاک ہو گیا، تعلق از خود ہی ختم ہو چکا مگر اب وہاں سے زور دیا جا رہا ہے کہ وہ تعلق نونا نہیں ہے، اس لڑکے کا بڑا بھائی اس سے شادی کرے گا جو پہلے ہی تین عدد بیویوں کا شوہر تھا اور شادیوں کے 35 سال بعد بھی بے اولاد ہے۔ حیدر کے والد کے انکار پر ان کے درمیان دیرینہ دشمنی ہو گئی تھی۔ حیدر کا تعلق زمین دار گھرانے سے تھا۔

جہاں دولت کی فراوانی کے ساتھ جہالت کی عکرائی بھی تھی اور وہاں ابھی تک صدیوں پرانے رسم و رواج رائج تھے۔ حیدر اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث پڑھائی کے اعلیٰ مدارج طے کر رہا تھا مگر ان کے خاندان میں ثانوی تعلیم کو ہی سب سے بڑی ڈگری سمجھا جاتا تھا۔ بے تحاشا دولت و آزادیوں نے انہیں اس طرف راغب نہیں ہونے دیا تھا۔

پروفیسر آفتاب حسن نے اس کا صل یہ نکالا کہ وقت ضائع کیے بغیر چند لوگوں کی موجودگی میں حیدر کی بہن صبوحی کی شادی کر دی جائے پھر معاملہ ختم ہو جائے گا، جب لڑکی ہی نہ ہوگی تو وہ کیا کر سکے گا۔

”لیکن سزا! صبوحی کب تک چھپ سکتی ہے؟ یہاں رہے گی، کبھی نہ کبھی وہ ضرور ان کی نگاہوں میں آ جائے گا، تب وہ اسے نہیں..... چھوڑیں گے۔“ حیدر کا لہجہ کانپ رہا تھا اور آنکھیں نم تھیں۔

”ڈونٹ کیئر ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ ڈالٹون نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو اس نے اس کے شانے سے سر نکا دیا۔

”مین پرائلم یہ ہے کہ ایسا کون نوجوان ہے جو صبوحی سے شادی کے لیے راضی ہو، پھر ڈے دار اور اچھے عزت دار خاندان سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ نڈرو بہادر بھی ہو، جو ان حالات کو احسن طریقے سے فیس کر سکے۔“ وہ ان سب پر نگاہ ڈالتے ہوئے پُرسوج انداز میں گویا ہوئے۔

”سزا! اسی سوچ نے میرے حواس گم کر دیے ہیں۔“ حیدر کے لہجے میں ذہنی خلقتشار نمایاں تھا اس دم مامون کہا اٹھا۔

”سزا! اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں؟“

”ضرور، ضرور بیٹے! یہاں آپ سب کو بلانے کا مقصد یہی ہے کہ ہم سب ایک ہیں، ہم ایک کنبہ بن چکے ہیں، ایک خاندان بن گئے ہیں، ہم میں سے کوئی جدا نہیں ہے، ہم میں سے کسی ایک کی تکلیف سب کی تکلیف ہے۔ ایک کا مسئلہ سب کا مسئلہ ہے جس کا صل ہمیں مل جل کر نکالنا ہوگا۔“

”سزا! آفتاب کے مخصوص، شفیق و نرم لہجے نے مامون کو حوصلہ بخشا۔“

”سزا! میرے بڑے بھائی برازیل میں رہائش پذیر ہیں وہ ان دنوں یہاں شادی کے ارادے سے آئے ہوئے ہیں، والدہ ان کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں، وہ چند ہفتوں میں شادی کر کے واپس جانا چاہتے ہیں اور اس بار والدہ اور مجھے ساتھ لے جانے کا ارادہ کر کے آئے ہیں۔ میں تو ایترنی سمسٹرز کے بعد جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہارون بھیا سے مل لیں اور اگر حیدر مناسب

مجھے تو اپنے والدین سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کر سکتا ہے۔“

”جھینکس گاؤ! بیٹھے بیٹھے رب کی بہت بڑی عنایت ہوئی ہے۔ ویلڈن مائی سن! آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ بہت اعلیٰ اور اچھے خاندان کے فرد ہو۔“

مامون کی پیشکش پر سب کے چہرے کھل گئے تھے۔ حیدر تو شادی مرگ کی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ ذوالنون کے سر تھپتانے پر آنسوؤں سے رو پڑا۔

”آپ کے گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟“

”میری بہن بہت سیدھی سادی گھریلا لڑکی ہے، اس نے گریجویٹیشن کیا ہے مگر پرائیویٹ، تمہارے بھائی ایسی لڑکی کو پسند کریں گے؟“

”آف کورس، میرے گھر والوں کو ایسی ہی لڑکی کی تلاش ہے، جب ہی وہ شادی کرنے میں آئے ہیں ورنہ مائی ڈیئر! لڑکیوں کی وہاں کیا کمی ہے۔“ مامون نے آگے بڑھ کر حیدر کو گلے لگاتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر بڑی اپنائیت بھری مسکان تھی۔

پروفیسر آفتاب نے اسی وقت پہلے مامون کی والدہ اور بھائی کو تمام صورت حال بتا کر ان کی رضامندی معلوم کی۔ مامون کے کہنے کے مطابق ہی اس کے گھر والوں نے کسی بھی پس و پیش سے کام لینے کے بجائے فوراً ہی رضامندی ظاہر کر دی۔ دوسرا مرحلہ حیدر کے والدین سے معاملہ طے کرنا تھا، وہ بھی حیدر کی بدولت بخیر و خوبی نپٹ گیا، ان لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، جس طرح اچانک یہ سب ہوا، اسی طرح نپٹ بھی رہا تھا۔

آج ان کا ملازم چھٹی پر تھا۔ ردا اور حورین نے کافی بنائی تھی۔ زدیا اور شرمین سب کو سرو کر رہی تھیں۔ سر، ذوالنون کے ساتھ ڈسکس کر رہے تھے کہ کیا لالچہ عمل بنایا جائے جو فل پروف ہو، کیونکہ حیدر کا کرن ڈی حیثیت تھا۔ بڑے زمین داروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ لوگ اس کے ایک اشارے پر خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ ان کے علاقے میں کشیدگی پھیلی ہوئی تھی۔

حیدر اتم نے ایسی فیملی میں اپنی بہن کی مکنتی ہونے کیوں دی تھی؟

”سر! ہمارے ہاں ایسے فیصلے بعض اوقات ایسے وقت میں ہو جاتے ہیں جب بچے دنیا میں موجود نہیں ہوتے۔ صبوحی کے دنیا میں آتے ہی تایا جان نے کہا کہ یہ لڑکی میری بہو بنے گی غالب کی بیوی۔ بس زبان ہو گئی پھر تایا جان بانی نچر بہت اچھے آدمی تھے، انہوں نے کبھی بھی اپنے کسی فیصلے سے کسی کو ڈکھ نہ پہنچایا تھا۔ سب کا خیال رکھتے تھے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے۔ یہی نچر غالب کی تھی۔ اس کی ذات کسی کے لیے بھی تکلیف کا باعث نہ تھی، پھر وہ بے حد وسعت قلب و روشن خیال تھا۔ صبوحی کو وہ بہت خوش رکھتا۔“ حیدر کے لہجے میں گزرے دنوں کی یادیں مچکنے لگی تھیں۔

”ہارون بھائی بھی صبوحی کو بہت خوش رکھیں گے۔“ مامون نے کہا۔

”انشاء اللہ..... اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“ سرنے کافی فخر کرتے ہوئے کہا۔

”حورین! تم پارٹی کب دے رہی ہو؟“ ثمرین نے چمک کر کہا۔

”کیوں، ایسا کیا ہوا جو حورین پارٹی دے۔“ حیدر نے چمک کر در یافت کیا۔

”اس کے والدین کراچی آگئے ہیں اور اس کا کزن بھی صحت یاب ہو گیا ہے۔ اس کو ڈائل پارٹی دینی ہوگی۔“ روانے دھونس

بھرے لہجے میں کہا۔

”کچھ عرصے صبر کرو، ابھی پاپا کسی خوب صورت لوکیشن کی تلاش میں ہیں، جیسے ہی سلیکشن ہوئی پارٹی ہکی ہے۔ دوسری پارٹی کے

لیے تمہیں خود ہریرہ سے ہی رابطہ کرنا پڑے گا۔“ پروفیسر آفتاب کے برابر میں بیٹھا ہوا ذوالنون پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس نے دانستہ ایک نگاہ

حورین پر نہ ڈالی تھی، حالانکہ دل میں عجیب سی بے چینی سرایت کر رہی تھی مگر وہ سوچ چکا تھا، اس دن جو کسی بے اختیار جذبے کے تحت بے

قابو ہو کر وہ اسے ڈراپ کرنے گیا تھا اور پھر کتنے دنوں تک خود سے ہی نظریں نہ ملا پایا تھا۔ وہ سب حورین سے پارٹی مانگ رہے تھے۔

ذوالنون اٹھ کر باہر گیلری میں چلا آیا جہاں باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

فروری کے شروع کے دن تھے۔ سردیاں جو بن پر تھیں۔ نیچے مختصر سے لان میں گلاب کے پھولوں کے رنگ و مہک نمایاں تھی۔

”تم باہر کیوں آگئے؟“ کچھ دیر بعد حیدر اس کے قریب کھڑا پوچھ رہا تھا۔

”یوں ہی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ کرسی پر بیٹھتا ہوا گویا ہوا۔

”ایک بات کہوں؟“ حیدر اس کے قریب بیٹھتا تنکرا انداز میں بولا۔

”مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ میں نے اپنے ذاتی مسئلے میں تم لوگوں کو تھکیت کر سراسر خود غرضی و مفاد پرستی کا ثبوت دیا ہے۔“

”ایسا تم کس طرح سوچ سکتے ہو، دوستی سے بڑھ کر بھی کوئی رشتہ پائیدار ہو سکتا ہے، تمہیں ہم پر اعتماد نہیں ہے یا اپنی دوستی پر؟“

”اعتماد سے عاری تو اپنے ہی تایا زاد کی دشمنی ہے جس نے یہ دن دکھایا ہے، میری تو کب سے خواہش تھی کہ پاپا زمینیں فروخت

کر کے شہر میں سیٹل ہو جائیں مگر زمین داروں کی زمین سے محبت ہر محبت سے ہماری ہوتی ہے، خواہ وہ محبت خون کی دشمن بھی بن جائے تو

ہماری محسوس نہیں ہوتی۔“

”ڈونٹ وری یار! تم قلمت کرو، ہم کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔“

پھر آنا ناقابا سب ہوتا چلا گیا۔

مامون کی والدہ کو گھر میں بھولانے کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی، کیونکہ ان کی کوئی بیٹی تو تھی نہیں، جو ایسے موقع پر رحمت پٹ تیاری

کرواتی، یہاں یہ فریضہ پانچوں نے مل کر انجام دیا۔ شادی کی شاہگ کی تو مختصر سی تھی کیونکہ جس ماحول میں شادی ہو رہی تھی وہ بہت رسمی

تھی۔ بہت ہی سادہ انداز میں شادی ہوئی تھی جس میں گنتی کے افراد کو شرکت کرنی تھی۔

پروفیسر آفتاب حسن دونوں جانب سے پیش پیش تھے، ان کا بازو ذوالنون بنا ہوا تھا۔ دو خاندانوں کو باہم استوار کرنے کا سہرا ان

کے سر تھا۔ انہوں نے ایک ہفتے کے اندر اندر تمام کارروائی مکمل کر لی تھی جن میں سب سے اہم کام ہارون اور صبوحی کا نکاح تھا۔

آفتاب صاحب چند گواہان کو لے کر ہارون کا نکاح پڑھوا آئے تھے، کیونکہ فوراً ہی یہاں سے وہ برازیل جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، وہ لوگ جس طرح گئے تھے، نکاح کر کے اسی طرح خاموشی سے آگئے تھے۔ اس طرح صبوحی کے ڈاکو مینس تیار ہونے میں زیادہ تر دن نہ ہوا تھا۔ بہت قلیل مدت میں اس کا پاسپورٹ بن گیا، صرف ویزا ملنے میں چند دن لگے۔

دو ہفتے وہ لوگ اس چکر میں ایسے لگے تھے کہ گمروالوں سے تقریباً دور ہی ہو گئے تھے۔ آج وہ بی بی جان کے قریب بیٹھی سب رو داد سنار ہی تھی۔

”آئے ہائے آگ لگے ایسی دولت و جائیدادوں کو جو آپس میں خون کو خون کے خلاف کر دے، ایسی دولت سے غربت بھلی۔“  
بی بی جان نے سنتے ہی کان پکڑ کر کہا، وہ آپس کی رنجشوں کے بالکل خلاف تھیں۔

”ماموں کا بھائی خوش تو ہے نا؟ کہیں بعد میں نہ کہے کہ بڑی دوستی ڈھول گئے میں ہاں نہ دیا، نیکی پر بدی کو غالب آتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔“  
”نہیں آئی صبوحی ہماری سوچ سے بڑھ کر کیوٹ ہے۔ ہم نے تصویریں دیکھی ہیں۔ ہارون بھائی انہیں پا کر بہت خوش ہیں۔“  
مول نے فار یہ سے کہا۔

”رخصتی تو ابھی نہیں ہوئی ہے۔“ میرا نے پوچھا۔  
”جیسے ہی ویزا ملے گا، وہ لوگ رخصتی کرالیں گے اور دوسرے دن روانہ ہو جائیں گے، جب تک عمر دراز صاحب کو معلوم ہوگا، صبوحی ان کے خوابوں کی پہنچ سے بھی دور جا چکی ہوگی۔“

”نام دیکھو ذرا، عمر دراز ایسے شیطان صفت لوگوں کی عمریں سچ سچ دراز ہی ہوتی ہے اگر یہ کبخت مر ہی جاتا تو یہ سب تو نہ کرنا پڑتا۔ خود سوچو کوئی اس طرح بھی بیٹیاں بیاتا ہے۔ بزاروں جمیلے ہوتے ہیں مگر بیٹی کو کنوئیں میں گرنے سے بچانے کے لیے بے چارے دل پر پتھر رکھ کر سب کر رہے ہیں۔ ایک تو بیٹی کی رخصتی وہ بھی ان حالات میں اور اتنی دور لڑکی چلی جائے گی، مجھے تو سوچ سوچ کر ہی ہول اٹھ رہے ہیں۔ کس طرح صبر و ضبط کر رہے ہیں۔“

”صبوحی کی تو لاٹری لگ گئی ہے، بی بی جان اجو ہارون بھائی جیسا شخص ملا ہے ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ ان کے پاپا اس عمر دراز کو ہی صبوحی کا ہاتھ پکڑا دیتے، وہ صبوحی سے پورے بیس سال بڑا ہے۔ تین عدد بیویاں پہلے ہی موجود ہیں، چوتھی کی بھی وہ چارہ رکھے ہوئے ہے۔“  
”زویا! اگر حیدر پروفیسر آفتاب صاحب اور ذوالنون بھائی کو درمیان میں نہ ڈالتا تو ہو سکتا تھا اس کے والد جو زمین دارانہ مزاج رکھتے ہیں، صبوحی کو اپنے اس اجڈ و گتوار بیٹے کو سوہنپ دیتے۔“

”یہاں تو انہوں نے جس لگن و غلوں سے کام کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے، پھر حیدر کے گاؤں کے کتنے ہی پکڑو ذوالنون بھائی کو لگانے پڑے ہیں۔ صبوحی کے کاغذات انہوں نے ہی تیار کروائے ہیں، اپنے کسی دوست کی وساطت سے اور نکاح بھی انہوں نے اپنی

ذمے داری پر کروایا ہے۔“ ذویا کی قصیدہ گوئی ذوالنون کی شان میں شروع ہو چکی تھی۔

”بڑا نیک و شریف بچہ ہے۔ بہت باادب اور سنجیدہ ہے۔ بہت خوشی ہوئی تھی، مجھے ان بچوں سے مل کر خاص طور پر اس بچے ذوالنون نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ عجیب سا دکھ ہے اس بچے کی آنکھوں میں۔“ بی بی جان کرن اور قاریہ سے ذوالنون اور حیدر کا ذکر کر چکی تھیں۔

”ہریرہ کی صحت یابی کی خوشی میں جو پارٹی دینے کا سوچ رہے ہیں اس میں ان دونوں بچوں کو ضرور مدعو کریں گے۔“ قاریہ نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں ضرور پہلا دعوت نامے کا کارڈ ان ہی کو جائے گا۔“

”رات کھانے میں کیا بنائیں کرن! آج کا صبح آپ ہائیں؟“

سیرا خا موٹی سے بیٹھی لیوں پر دھبی مسکراہٹ سجائے سب کو سنتی ہوئی کرن سے مخاطب ہوئی۔

”جو آپ بنانا چاہیں بے فکری سے بنائیے۔ انس اور سعد گھر کی بنی چٹنی بھی بہت شوق سے کھالیں گے۔“

”گھر کے بچے کھانوں کا کرین تو یہاں کے مردوں کو بھی ہے مگر ڈش میں چکن اور منن لازمی ہے، خصوصاً یہ یک جزیشن کو تو بیڑا اور برگز میں بھی فلنگ چکن کی چاہیے، ہنریوں سے ازلی دشمنی ہے۔“

”یہ نوجوان نسل تو بالکل ہی عقل سے پیدل ہے۔ ہر اچھی غذا سے ان کو بیرہ ہے، کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ متوازن غذا ضروری ہے مگر سنتا کون ہے۔ میرے سامنے بے دلی سے کھا لیتے ہیں اور ایسے کھانا جسم کو نہیں لگتا۔“

”دراصل فاسٹ فوڈ کی چارمنگ نے بیڑہ غرق کیا ہے۔“ ان کے ہاتھوں میں نیا موضوع لگ گیا تھا۔ وہ تینوں اٹھ کر باہر چلی آئی

تھیں۔ لان میں بھری سنہری دھوپ سرد موسم میں انوکھا مزہ دے رہی تھی وہ وہاں کرسیوں پر بیٹھ گئی تھیں، ان کا موضوع گفتگو صوبتی ہی تھی۔

”دو تین دن میں صوبتی کا دیزہ آجائے گا، پھر ہم میں سے کسی ایک کو مامون کے ساتھ جا کر ڈبلن کو لانا ہوگا، یہ آئی کی خواہش ہے۔“

”میں تو نہیں جاؤں گی مجھے گاؤں کے نام سے ہی وحشت ہوتی ہے۔“

”گاؤں میں تو سردی بھی بہت زیادہ ہے۔ مجھے تو یہاں کی سردی بھی برداشت نہیں ہے، وہاں تو میری تھپی جم جائے گی۔“ موئل جو ابھی بھی سویٹرز اور شال پہنے ہوئے تھی، گردن ہلا کر بولی۔

”ردا اور شمرین کی فرسٹ کرن کی شادی ہے، وہ لوگ وہاں نہیں جائیں گے تو پھر کون جائے گا؟“ انہوں نے دانستہ حورین کو نہ

کہا کہ وہاں ذوالنون کی موجودگی لازمی تھی اور ان کے درمیان ابھی بھی پہلے والی بیگا گئی تھی۔ ان دو بہنتوں میں ساتھ رہنے کے باوجود ان میں کوئی بات نہ ہوئی تھی، وہی مخصوص گریز و اجتناب والا سلسلہ تھا تو وہ کس طرح ان کے ساتھ جانے پر راضی ہوتی ذوالنون کے خیال سے۔

مگر اس نے اگلے لمحے ان کو حیرت میں ڈال دیا یہ کہہ کر.....

”میں جاؤں گی۔“

”تم.....؟ جاؤ گی؟“

”ہاں، حیدر نے ایک دفعہ مجھ پر احسان کیا تھا، میں خوشی سے جاؤں گی۔“

☆.....☆.....☆

”پرنس! آج کل بہت بڑی رہنے لگے ہو، کیا ہائیر ہیں بیٹا؟“ قاتقہ نے ذوالنون سے مخاطب ہو کر کہا۔

”کوئی خاص مصروفیات نہیں ہیں نانا!“ وہ صریحاً چمپا گیا کہ وہ کبھی بھی پرانے پھندے میں ٹانگ اڑانے کا مشورہ نہ دیں گی۔

”مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ اسٹیشنل ایکٹیویٹیز ہیں آپ کی۔“ قاتقہ کے قریب بیٹھی مثال اس کی جانب دیکھتے ہوئے شوخ انداز

میں کہنے لگیں۔

”اوہو ماما! آج کل یونیورسٹی بند ہونے کی وجہ سے یوریت بہت زیادہ محسوس ہونے لگی ہے، اسی لیے کچھ وقت میں حیدر کے ساتھ

اس کے دلچ میں گزار لیتا ہوں، وہاں ٹائم بہت اچھا پاس ہو جاتا ہے۔“

”اوہ مائی پورن! ٹائم پاسنگ کے لیے یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ہائیر ہیں۔ پائیز، کلب، گیٹ نوڈیڈ کیا نہیں ہے، ہمارے شہر

میں بلکہ ایک فنکشن میں رات کو جاتا ہے، وہاں چلو دیکھنا کیسے کیسے لوگ ہوں گے۔“ مثال بڑے جوش انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”سوری ماما! آپ کو معلوم ہے میرا ایسے لوگوں کے درمیان دم گھٹتا ہے جہاں صرف قصص و بناوٹ ہوتی ہے۔“

”ایک چہرے والا کون ہے یہاں؟ سب کے چہروں کے پیچھے چہرہ ہوتا ہے، دوہری زندگی کون نہیں گزار رہا ہے؟“

”نو ماما! دنیا بھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے جس دن ایک بھی فریڈیا سندر ہا تو یہ دنیا بھی سندر ہے گی۔“

”اب میں کیا کہوں، آپ شروع سے اپنی مرضی کرنے کی عادی ہیں۔“

”کیا ہوا ماما؟ آپ نئس ہیں۔“ ایک عرصے بعد مثال بیگم کے لبوں پر شکوہ دیکھ کر وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”کوئین کی طرف سے مثال بہت نئس رہنے لگی ہیں۔ فکر مند تو میں بھی ہوں نہ معلوم کوئین جیسے جونی یوائے کو کیا ہوا ہے جو وہ

بالکل ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ ہنسنا بولنا سب چھوڑ دیا ہے۔ آفس اور اپنے بیڈروم کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ پوچھیں تو کہتا ہے کوئی پرابلم

نہیں ہے۔“ قاتقہ بولتی چلی گئیں۔

”کچھ عرصے کے لیے آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔“

”ایک عرصے سے چھوڑا ہوا ہے۔“

”مگر اب نہیں۔“ مثال نے غصے سے کہا۔

”بھائی تیار ہو جائیں تو شادی کرو بیجے۔“

”شادی! وہ راضی ہو تب ناں۔“

”ان کو راضی ہونا پڑے گا بلکہ ہو جائیں گے جب اس ٹکس لیڈی کا نام سنیں گے۔ رٹلی وہ اس دنیا کی تو لگتی ہی نہیں ہیں۔“  
ذوالنون کی آواز میں احرام کے رنگ نمایاں تھے۔

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ منال سرا سمہ ہونیں۔

”صدا نکل کی بیٹی حضرتی آپ کی۔“

انہیں محسوس ہوا سمیت سر پر آگری ہو، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ یہ خواہش پالے ہوئے ہے، جس لڑکی کو ٹھکرانے کے لیے انہوں نے اتنے سعادت مند و محبت کرنے والے بیٹے کو، اس کے احساسات کو نظر انداز کر دیا تھا، وہی دروازہ کھولنے کی وہ سہی کیے ہوئے تھا جو بہت ضدی وہٹ و حرم تھا جو بولتا بہت کم تھا مگر اس کی بات پتھر پر لکیر کی مانند اٹل ہوتی تھی۔  
وہ بہت گہری نگاہوں سے ماں اور نانو کے مضطرب چہرے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟ میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟“

”نہ..... نہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ منال بیگم کو اپنی اکثری ہوئی زبان کو حرکت دینے میں دقت ہوئی۔

”آپ کی دادو اور انکل حضرتی کی معافی کرنے والے ہیں، ان کا پرنسپل سلیکٹ کر لیا ہے انہوں نے۔“ قانقہ نے کہا۔

”واٹ؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“ اسے زبردست شاک لگا۔

”آپ کو معلوم نہیں؟ یہ سلسلہ کئی ماہ سے چل رہا ہے۔“

”مجھے دادو کی طرف گئے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے مگر یہ بہت لٹا ہوا ہے، حضرتی آپ کی کو میں نے ہمیشہ اپنی بھابی کے روپ میں دیکھا ہے۔“ اضطراب و اضطراب اس کے وجہ چہرے سے جھلکنے لگا تھا۔

”ضروری تو نہیں بیٹا! جو ہم چاہیں وہی ہمیں ملے۔“

”ہمارے ساتھ ہر بار ایسا ہی کیوں ہوتا ہے، قسمت دروازے پر دستک دیتے دیتے ہاتھ کیوں روک لیتی ہے؟ راستہ کیوں بدل لیتی ہے؟“

ایک دم ہی پرانی وحشت و نارمائی کے ڈکھوں نے دھاوا بول دیا اور ایک ایک کر کے پرانے زخموں کے ناکے ٹوٹنے لگے، وہ وہاں سے چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

دور نزدیک، نگاہوں سے جہاں بھی دیکھوں  
اپنے ہی شہر کے تاریک مکاں بھی دیکھوں  
ہر قدم اپنی محبت کے نشاں بھی دیکھوں



غیر تو غیر ہیں، اپنا نظر آتا بھی نہیں  
 اس بھری دنیا میں جہاں بھی دیکھوں  
 لوگ آسانی سے ماضی کو بھلا دیتے ہیں  
 اور میں اپنے ہی ماضی کو عیاں بھی دیکھوں  
 تمنخیاں بیٹے دنوں کی بھی بھلاتے ہوں گے  
 اور میں ماضی کو حال میں رواں بھی دیکھوں  
 دل میں جو آگ ہے چہرے پر نمایاں ہے  
 میں تصور کی لٹکا ہوں سے دھواں بھی دیکھوں

”کرن! میں کیا سن رہی ہوں تم طلحہ گھر لینے کی بات کر رہی ہو، اُس کہہ رہے تھے یہ تمہاری خواہش ہے۔“ بی بی جان انہیں تنہا دیکھ کر ان کے پاس چلی آئی ہٹکرو پریشان سی۔

”آپ بیٹھیں بی بی جان! کرن نے بڑی محبت سے انہیں شانوں سے تمام کر صوفے پر بٹھایا اور خود بھی قریب ہی بیٹھ گئیں۔

”آپ تو جانتی ہیں بی بی جان! جس کو ایک بار سانپ ڈس لے پھر وہ شخص رسی سے بھی خوف زدہ ہو جاتا ہے، عجیب سی وحشت، عجیب سی دہشت اس کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور مجھے تو رشتوں کے سانپوں نے اتنا ڈسا ہے کہ میرا دل ہی نہیں روح بھی ٹکا رہے۔ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود بھی میں خود کو وہیں کھڑی پاتی ہوں اور جب سے یہاں آئی ہوں، میرا ماضی سزا بن گیا ہے۔“

”میں جانتی ہوں کرن! مجھ سے تم لوگوں نے سب کچھ چھپایا ہے، دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ڈکھ دینے والے، غم سینٹے والے، لبوں پر مسکراہٹیں نکھیرنے والے تو سرت سے چمکتی آنکھوں میں رنج و الم کے آنسو نکھیر دینے والے۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ اس طرح سوچوں کے کھنڈر میں ڈوبی رہو گی تو کس طرح زندگی کی سرتوں سے اپنا حصہ کشید کرو گی؟ وقت زخم لگاتا ہے تو وقت ہی مرہم بھی فراہم کرتا ہے۔ زخم بھر جاتے ہیں نشان نہیں بنتے۔ غم اور خوشی زندگی کا سکہ ان ہی دو رخ پر کھڑا ہے۔“ وہ کرن کو بہت نرمی و اپنائیت سے سمجھا رہی تھیں۔

”اس دور میں ڈپریشن کی دوا اسی لیے پھیلی ہے کہ ہم لوگوں نے اچھی یادیں ذہنوں سے کھرچ دی ہیں۔ ہم ڈکھ دینے والے دنوں کو یاد کرتے ہیں۔ اچھی سوچیں خوب صورت خواب دیکھنا چھوڑ دیئے ہیں۔ زندگی خود ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے ایک ایسا بوجھ بنا لی ہے جو نڈا اٹھانے کی سکت ہے، نہ پھینکنے کی ہمت۔“

”سوچوں پر کس کا زور چلا ہے یہ تو زور آور لہروں کی مانند ہر بند و احتیاط کو توڑ کر آگے ہی بڑھتی رہتی ہیں اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتی ہیں۔۔۔۔۔

جین  
سکون  
اطمینان۔

”سب سے بڑا ذہنی سکون و آسودگی ہماری عبادت ہے۔ جب ہم پانچ وقت اپنے رب کے آگے پورے خلوص و محبت سے سجدہ ریزہ ہوتے ہیں تو ہمارے اندر آسودگی کسی انرجی ٹانک کی طرح بھر جاتی ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت اور اذکار کی مشغولیت ہمیں ایسی روحانی طمانیت و خوشی سے بہرہ ور کرتی ہے کہ ایسی طاقت کسی دوا میں نہیں ہے۔ تم نے بتایا تھا تمہاری امی کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ ان کی زندگی تمہارے سامنے تھی۔ کھٹنائیوں، اپنوں کی بریریت، مجازی خدا کی طرف سے ملی ہوئی بے انتہائی و بے زحمتی نے ان کا کیا حال نہ کیا ہوگا..... مگر دیکھا تم نے ایک جہنم جیسی زندگی گزارنے کے باوجود ان کے صبر و استقامت، متانت و تحمل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اس لیے کہ وہ رب کائنات سے لڑکا چکی تھیں اور جو اس سے لڑکا لیتا ہے، یہاں کے ڈکھ، یہاں کی تکلیفیں سب عارضی ہوتی ہیں۔“

بی بی جان جو انہیں سوا ترہائی سکون کی ادویات استعمال کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں، موقع ملتے ہی ناسخانا انداز اپناتی تھیں۔

”میں ان جیسی کبھی نہیں بن سکوں گی، مجھ میں اتنی برداشت اتنا حوصلہ کہاں ہے بی بی جان! میں بہت بے صبری و ناشکری ہوں، میں بیچ کا نہ نماز تو پابندی سے پڑھ لیتی ہوں مگر راتوں کو جاگ کر عبادت مجھ سے نہیں ہوتی ہے۔“ ماں کے ذکر پر اس کی آنکھیں رجم رجم تھیں۔

”جب بندہ عشق مجازی سے نکل کر عشق الہی میں پہنچتا ہے تو ناممکن بھی ممکن بن جاتا ہے۔ ہم تو کس کے مارے لوگ ہیں، ایسے ارفع و اعلیٰ درجات تک مقدر ہی لے کر جاسکتا ہے لیکن پھر بھی ہمیں مقدر بھر عبادت کی سعی کرتے رہنا چاہیے اور آج سے میں یہ میڈیسنز تمہیں بڑی مقدار میں استعمال کرتے نہ دیکھوں ورنہ مجھے بڑی تکلیف ہوگی۔“ دوہرے میں رکھی ادویات کی جانب اشارہ کر کے بولیں۔

”بی بی جان! پلیز، ان میڈیسن کے بغیر میں نہیں رہ سکتی۔“ وہ ایک دم ہی لجاجت سے بولی۔

”رہ لو گی اب تم ہم سب کے درمیان ہو۔“

”لیکن بی بی جی!“

”کچھ نہیں سنوں گی، سب لے کر جا رہی ہوں جب دینی ہوگی، خود دوں گی اگر زیادہ بے چینی محسوس ہو تو ٹھنڈے پانی سے وضو کر لینا اور چلتے پھرتے، آٹھتے بیٹھے درود شریف پڑھنے کی عادت بنا لو، ڈپریشن سے نجات کی سب سے موثر اور انمول دوا ہے۔“ انہوں نے میڈیسن کے ریک کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

لینڈ کروزر میں وہ مختصری بارات حیدر کے گاؤں پہنچ چکی تھی۔

ہارون، ماسون، ان کی والدہ اور حورین نے ان کا پُر جوش انداز میں استقبال کیا۔ روایتی انداز میں مگر بہت خاموشی کے ساتھ۔

حیدر کی ماں بڑی محبت و مروت سے ملی تھیں۔ زیور اور قیمتی ملبوسات میں وہ روایتی زمین دارنی دکھائی دے رہی تھیں مگر ان کے ہندوکار چہرے پر کسی بھی قسم کا تکبر و حاکیانہ پن نہ تھا۔

بہت خلوص سے ملی تھیں، ان کے انداز میں ماحول کی ساری افسردگی و صحن ہو جوتھی جوان حالات نے انہیں سوچی تھیں۔  
 ”پریشان مت ہو، بہن! نہ فکر مند ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا، میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ سے بڑھ کر صبوتی کو چاہوں گی، کیونکہ ماں جیسی محبت و چاہت صرف ماں ہی دے سکتی ہے مگر میں اسے آپ کی طرح ہی محبت دینے کی کوشش کروں گی، وہ میری بیٹی بھی ہوگی اور بہن بھی۔“ حیدر کی والدہ ان سے گلے ملتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی، بے ساختہ رو پڑیں۔  
 ”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے اور میری بیٹی کا اچھا نصیب بھی جو آپ جیسے فرشتہ صفت لوگ مل گئے، ورنہ نہ معلوم کیا ہوتا۔“ وہ ان سے علیحدہ ہوتے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”اب آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔“ وہ انکساری سے گویا ہوئیں۔

”خوہرین سے ملی ہیں اماں آپ؟“ حیدر اندر داخل ہوتا ہوا بولا۔

”جی، بہت اچھی ہے شکر ہے تم اچھے لوگوں میں رہتے ہو۔“ وہ خوہرین کی جانب دیکھتی ہوئی گویا ہوئی تھیں۔

”آپ یقیناً صبوتی سے ملنے کو بے تاب ہوں گی، چلیں آپ کو ملواتے ہیں۔“ حیدر کی ہمراہی میں وہ آگے بڑھنے لگے۔

جدید و قدیم کے احراج سے کچی سنوری حیدر کی حویلی اسے بے حد پسند آئی۔ سرخ اینٹوں سے بنی حویلی میں ہر جدید آسائشات موجود تھیں۔ بہت عام سے انداز میں رہنے والے حیدر کو دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔

”یہاں بہت خاموشی ہے، اتنی بڑی حویلی میں کتنے کم لوگ ہیں، کیا یہاں ایسی ہی خاموشی رہتی ہے؟“ وہ حیدر سے گویا ہوئی۔

”اس رس کشی کے باعث آپ کو یہاں سناٹے و خاموشی کا راج دکھائی دے رہا ہے، ورنہ یہ رو رو دیوار تو خاموشی کو ترستے تھے۔“

صبوتی اور مرداراز بھائی کے درمیان رشتہ نہ ہونے کے باعث سارا خاندان ہم سے ترک تعلق کر چکا ہے۔ سب کی دیرینہ آرزو یہی تھی کہ یہ بے جوڑ رشتہ ہو جائے، اس وجہ سے سب ہم کو الگ تھلگ کر کے مزادے رہے ہیں کہ ہم گھبرا کر ان کی مان لیں۔“

”سوسیڈ ایسی کیوں ہے حیدر ایہ معاملات تو بالکل پرسٹل ہوتے ہیں، ان میں کسی اور کا انٹرنیٹز کس طرح ممکن ہے؟“

”آپ نہیں سمجھیں گی، جب انسان ذات پات، خاندان و برادری کے چکر میں پڑ جاتا ہے تو اس طرح ہی کے مسائل جنم لیتے

ہیں۔ ان خود ساختہ مسائل کے حل کے لیے ہی میں نے آج یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ کس طرح اماں اور بابا سائیں کو راضی کیا ہے، میرا دل ہی جانتا ہے مگر میں اپنی بہن کو ساری زندگی زندہ دو گور نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک ساٹھ سالہ شادی شدہ شخص کے ساتھ کس طرح وہ خوشی بھری زندگی جیتی۔“

اس کے لہجے میں بہن کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

صوتی تصویروں سے زیادہ خوب صورت تھی۔ اس کی بے حد سفید و گلابی رنگت، بڑی بڑی تلالانی براؤن آنکھیں، دل کش سراپا و جاذب خدو خال اسے پاک کوئی بھی اپنی قسمت پر رشک کر سکتا تھا۔ وہ حیدر کے تعارف کروانے پر بڑی محبت سے ملی تھی جس میں ایک حیا آمیز دمیا جسم بھی تھا کہ وہ ہاراتی تھی۔ کمرے میں ملازما نہیں تھیں جو ان کو دیکھ کر چلی گئی تھیں۔ حیدر کے کہنے پر کافی اور سینڈوچز ملازمہ لے آئی تھی۔

”آپ لیں، میں ذرا آگسٹ روم میں جا رہا ہوں، وہاں سب موجود ہیں۔“ حیدر اٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

”کافی تو پی لیتے ادا!“ صوتی نے کہا۔

”میں وہیں پی لوں گا، ڈو النون میرا انتظار کر رہا ہے۔“

”سر آفتاب ہم سے بہت پہلے آئے ہیں؟“ اس کے نام پر حورین کو یاد آیا کہ وہ دونوں ان کے ساتھ نہیں تھے، شاید پہلے آئے ہیں۔

”وہ ایک گھنٹہ قبل پہنچے ہیں۔“

حیدر چلا گیا، وہ صوتی سے باتوں میں لگ گئی، کچھ دیر بعد مامون کی والدہ بھی وہاں آگئیں۔ صوتی سے بڑی شدت اور چاؤ سے طیس۔

رات میں بڑے تکلف ڈنر تھا۔

ان کی روائی اگلے دن تھی، یہ اندرون سندھ کا علاقہ تھا، یہاں سے کراچی کا سفر سارے دن پر محیط تھا۔ رات میں سفر کو پروفیسر

صاحب نے غیر محفوظ قرار دیا تھا، اس لیے روائی اگلے دن رکھی تھی۔ کھانے کا انتظام مردانے وزنانے میں علیحدہ علیحدہ کیا گیا تھا۔ کھانے

کے بعد اس کی ملاقات سر سے ہوئی، ساتھ ان کے وہ بھی تھا، اپنے مخصوص لاپرواہ انداز میں اس کی ذات کو فراموش کیے بیٹھا تھا۔

”سرا یہاں عجیب سی خاموشی ہے، ایسی خاموشی جو وحشت میں جھلا کرتی ہے۔ یہاں کے لوگ روپوت کی طرح ہیں، خاموش و کم

صم کوئی مودت ہی نہیں ہے۔ یہاں لوگ صرف کام سے کام رکھتے ہیں۔ حیدر کے گھر والے کچھ خوف زدہ بھی ہیں۔“ موقع ملتے ہی وہ

سر آفتاب سے گویا ہوئی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ ہنگاموں و نت نئی شرارتیں کرنے والے کزنز اور بی بی جان کی ہردم گونجنے والی آواز کی اتنی

عادی ہو گئی تھی کہ یہاں آ کر وہ سخت بددلت محسوس کر رہی تھی۔

”آئی ایم سوری بیٹا! آپ پور ہو رہی ہیں، دراصل یہ اپنی نوعیت کی ایک بڑی عجیب شادی ہے، اس طرح تو کسی کے مرنے پر بھی

نہیں ہوتا ہے جو ہم کر رہے ہیں، وہ آسان نہیں ہے مگر جب ان لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہاں کیا ہوا ہے؟ وہ ہلکت کھا چکے ہیں تو سوچو کیا

ہوگا؟“ پروفیسر خود بھی خامسے شکر دکھائی دے رہے تھے۔

”سرا یہ پولیس پر دیکھن کیوں نہیں لے لیتے؟“

”یہ خاندانی جھگڑے ہیں، یہاں اثر دوسرخ چلتے ہیں، قانون کو ان لوگوں نے ہائی جیک کیا ہوا ہے، دولت کے بل بوتے پر

ناجائز اختیارات لاصدود ہیں۔“

”پھر تو نامکن ہے سرا! ان لوگوں کو یہاں ہونے والے اس کام کی خبر نہ ہو، جبکہ وہ لوگ اس قدر پاورفل انفارمیشن رکھتے ہیں۔“

حورین کی بات پر ذوالنون نے چونک کر اس کی جانب دیکھا، اس بات کی تصدیق تو اس کا دل بار بار کر رہا تھا۔  
”نہیں، یہ کام بہت خفیہ طریقے سے کیا گیا ہے۔“

”سر! مجھے کچھ کام ہے۔“ اس کی بھاری آواز گونجی پھر وہ چلا گیا۔ سر آفتاب بھی کچھ دیر بعد چلے گئے، وہ اٹھ کر صبحی کے پاس آگئی۔  
”آؤ بیٹی!“ حیدر کی اماں نے اسے قریب ہی بٹھالیا، وہ دونوں خواتین اپنے وقتوں کے قصے لے کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ صبحی کے لبوں پر وہی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، وہ ساس کے پہلو میں بیٹھی خاصی مطمئن دکھائی دے رہی تھی، وہاں بھی اس کی طبیعت نہ بدلی، وہ کتنی دیر تک بے مقصد کمرے میں بیٹھی رہی اور پھر بھی کئی کھینے گزر جانے کے باوجود نیند آنکھوں سے اوجھل رہی تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ششدری ہوا کے مست جموں سے لے کر بھر کو اس کے اندر پھیریری ہی اٹھی مگر اس وقت ماحول کچھ اتنا سحر انگیز ہو رہا تھا کہ وہ غیر معمولی طور پر چادر لپیٹے نچے بیٹریاں اترتی چلی گئی، وہاں اندھیرے میں فسوں خیز چاندنی کا غبار پھیلا ہوا، ہر شے کو اپنی ماورائی گرفت میں سیپے ہوئے تھا۔

سیاہ آسمان پر بے شمار ستاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان کے درمیان چاند فراخ دلی سے اپنی روشنی لٹا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے رُک گئی، آگے کوئی کھڑا تھا، اس کے لباس سے اٹھنے والی تیز مہک سے وہ سمجھ گئی۔  
”یہ کیا حماقت ہے، اس وقت کمرے سے نکلنے کی؟“ وہ درشکی سے قریب آ کر مخاطب ہوا۔



اس کی درشت آواز میں نمایاں کڑھکی نے اسے ٹھنک کر رُک جانے پر مجبور کر دیا اور ساتھ ہی وہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہوئی تھی۔  
”ایٹی وے، تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو، ایسی حماقتانہ حرکتوں سے۔“ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔  
”مانیٹڈ یور لینگویج۔ مجھے اس انداز میں بات سننے کی عادت نہیں ہے۔“ حورین کو اس کے انداز سے اپنی چنگ کا احساس ہوا، وہ غصے سے بولی۔

”آئی ڈونٹ کیئر، یو گویک۔“ ذوالنون کی آواز میں سختی و دروغت حد سے زیادہ تھی وہ اس کے مد مقابل آن کھڑا ہوا۔  
”کیوں؟ آپ مجھ پر کس وجہ سے رعب جمانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“  
”یو گویک۔“ اس نے گویا کچھ سنا ہی نہ تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی، میں یہاں مامون کے ساتھ آئی ہوں، حیدر کی گیسٹ ہوں، اگر ان دونوں میں سے کوئی مجھے منع کرے تو میں مانوں گی، ورنہ..... آپ سے کوئی.....“

”مگر ٹراسٹو پنڈ ہوتی ہیں، یہ صرف میں نے سنا تھا۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ چڑانے والے انداز میں گویا ہوا۔  
”لیکن، اس حد تک ہوتی ہے اس کا مجھے اندازہ اب ہوا ہے۔“

اس کے انداز و الفاظ نے اس کے پتھے لگا دیے۔ اس مرد موم میں بھی اسے اپنے اندر شعلے سے لپکتے محسوس ہونے لگے۔ غصے کی لہر اتنی زور آور تھی کہ وہ کانپ اٹھی۔

”اور بوائے کیا ہوتے ہیں؟“ وہ سخت مشتعل تھی۔

”مصل کو قتل لگا کر رکھنے والے نہیں ہوتے، استعمال بھی کرتے ہیں۔“

”مائی فٹ..... استعمال بھی کرتے ہیں۔“ اس نے غصے سے دہرایا۔

اشتعال انگیزی کے باوجود والون کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اس نے اس کی جانب محتاط نظروں سے دیکھا۔ فسوں خیز چاندنی کا خواب ناک غبار برسو پھیلا ہوا تھا۔ ششدری ہواؤں میں بزرے کی کیلی سی مہک جو احساسات کو بوجھل نہ ہونے دے رہی تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی وہ بھی اس چاندنی کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی۔

کسی بھگی ہوئی روح کی طرح مضطرب، کسی سہانے خواب کی طرح سحر انگیز

اس کی دو دھیائی دھمت میں چاندنی چمک رہی تھی۔ چہرہ تمام دل کشی سمیٹے ہوئے تھا۔ یہ حسین چاندنی وغبار اس کے گلابی سراپے کے لیے اُتر تھا۔

وہ حسن و شباب کا مرصع تھی۔

وہ حسن پرست نہ تھا۔

مگر پھر بھی نہ معلوم سینے کے اندر کوئی شے پھڑپھڑا رہی تھی۔

”پلیز، میں درخواست کر رہا ہوں، اندر چلی جائیں۔“ وہ گہری سانس لیتا ہوا خلاف توقع بے حد نرمی سے بولا۔ حورین اس پل، پل موڈ بدلتے شخص کے بارے میں ابھی سوچ نہ پائی تھی کہ یکنخت فضا فائزنگ کی زور دار آوازوں سے گونج اٹھی۔

☆.....☆.....☆

خوش شکل و جاذب نظر پرنائی رکھنے والے مہران علوی کی بار بار کی کئی کالز نے بالآخر غصہ خیزی کو ان سے ملنے پر مجبور کر دیا۔ وہ آج ہی سی کے دل آویز ماحول میں گرم لباس و سادہ چہرہ لیے اس کے زور و ہوشی تھی۔ رہی گفتگو کے بعد غصہ خیزی نے چپ سادہ لی۔

اس کے اندر کا ٹھہراؤ و متانت اس درجے کی تھی کہ مہران علوی جو ملاقات کی اول خواہش سے ہی اپنے اندر جذبوں و آرزوؤں کے لاتعداد گلستان کو مہلکا ہوا محسوس کر رہا تھا اور ان گلوں کی خوشبو اسے پیش کرنا چاہتا تھا مگر سامنے ٹیٹھی وہ شاداب چہرے واداس آنکھوں والی باوقار لڑکی کے زعب حسن نے کچھ اس طرح مسخر کیا تھا کہ وہ جو بہت بے باک و حاضر دماغ تھا، سب فراموش کر کے گاہے بگاہے سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت اصرار کے باوجود اس نے صرف کافی لینے پر اکتفا کیا۔

غصہ خیزی کے گریز و اجتناب کو وہ حیا آمیز تکلف سمجھ رہا تھا۔

"زیادہ باتیں کرنے والے لوگ مجھے پسند نہیں ہیں لیکن آپ زیادہ باتیں کریں گی تو مجھے اچھا محسوس ہوگا۔" خضرئی جب سے آئی تھی، اس نے صرف کافی پی تھی اور اب لگا ہیں جھکائے ٹیبل پر رکھے اس بچے کو دیکھ رہی تھی جو مہران اس کے لیے لے کر آیا تھا یا پھر گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ مہران کو اس نے ایک نظر بھی نہ دیکھا۔

اس کی خاموشی سے گھبرا کر وہ شوخی سے بولا۔

"مجھے باتیں کرنے کی عادت نہیں ہے۔"

"شاید آپ کو مسکرانے کی بھی عادت نہیں ہے۔"

اس نے جھک کر اس اعزاز سے کہا کہ وہ مسکرانے کے بجائے گڑبڑا کر رہ گئی۔

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، آپ کو میرا اس طرح بلانا پسند نہیں آیا، نہ آپ مجھ سے بات کر رہی ہیں، نہ میری طرف دیکھ رہی ہیں۔"

ایک بے حد شان دار ڈرنکاسٹیج میں نے اپنے ذہن میں سلیکٹ کیا تھا۔ وہ سب آپ نے ڈراپ کر دیا، کیا آپ اتنی ہی ریزروڈر تھی ہیں؟"

"جی ہاں..... میں بائی نیچر ایسی ہی ہوں، آپ مجھے پورا اور ڈل بھی کہہ سکتے ہیں۔ لوگ میری کتھنی میں بوریت محسوس کرتے

ہیں۔ مجھے ہنسنا، مسکرانا نہیں آتا؟..... بات ابھی آگے نہیں بڑھی ہے، آپ چاہیں تو فیصلہ بدل سکتے ہیں۔" وہ دم لہجے میں بولتی چلی گئی۔

"ارے..... ارے..... مائی گڈ نہیں! میں نے ابھی قدم بڑھایا بھی نہیں ہے کہ آپ زمین کھینچنے پر کمر بستہ ہو گئی ہیں۔ بخدا آپ

جیسی بھی ہیں، میں آپ سے دل و جان سے رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں۔" وہ گھبرا کر گویا ہوا۔

"اب چلنا چاہیے، بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"اتنی جلدی؟"

"جلدی کہاں گھنٹہ ہونے والا ہے۔"

"ابھی بہت ساری باتیں کرنی ہیں، لیو جہر پلاننگ کرنی ہیں اور ابھی میں نے آپ کو دل بھر کر دیکھا بھی کہاں ہے۔" اس کے

دھمے لہجے میں جذبوں کی چنگاریاں سلگنے لگی تھیں۔ لگا ہوں کی حدت سے اسے اپنے رخسار سلگتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

"ابھی ان چھوٹے جذبوں کی تھاب کشائی باقی ہے۔" خضرئی کو اپنا دم گھٹاتا محسوس ہونے لگا۔ یہ محبت اور یہ جنون خیریاں کسی اور

کے حوالے سے کی گئی ہوتیں تو وہ سرشاری و مسرت سے جھوم جھوم اٹھتی۔ یہ سب اسے برداشت کرنا محال تھا۔ وہ یہاں گھر والوں کے

بڑھتے اسرار پر چلی تو آئی تھی مگر مہران علوی کی محبت و چاہت بھرے انداز کو ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"دیر ہو رہی ہے، اب چلنا چاہیے۔" وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی تو مہران علوی کو بھی جبراً خواہشوں کو دل میں ہی مقید رکھنا پڑا،

مگر وہ خوش تھا کہ خضرئی کے روپ میں اسے اس کا آئیڈیل مل گیا۔

☆.....☆.....☆

”منال! سارا دن بستر پر گزرا دیا ہے، ابھی بھی کسلندی دور نہیں ہوئی ہے۔ میں یور ہو گئی ہوں، گھر میں پڑے پڑے چلو اٹھو، ہاتھ لے کر فریٹس ہو جاؤ، پھر باہر چلتے ہیں۔“ فائقہ، منال کے بیڈروم میں داخل ہوئیں تو اسے ہنوز بیڈ پر دراز دیکھ کر گویا ہوئیں۔

”میرا قلعی موڈ نہیں ہے ماما، آپ چلی جائیں۔“ وہ جمای لیتے ہوئے بولی۔

”تمہارے بغیر مجھے کہیں جانا کہاں اچھا لگتا ہے۔“ وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

”میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔“

”لیزی گرل مت بنو، ہاتھ لوگی تو موڈ بن جائے گا، کم آن گیٹ اپ ناؤ۔“

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ طلوعاً و کرہاً اٹھنے پر مجبور ہو گئی۔ فائقہ بیگم کا انداز دوستانہ تھا۔

”ہری آپ، آج انا لین نوڈ کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”بلٹر کو کہہ دیں اس کو تمام انٹرنیشنل نوڈ کی کوکنگ آتی ہے۔“ اس کی آنکھیں ابھی بھی یو جمل اور آواز خارا آلود تھی۔

”میں نے منع کیا ہے، اتنی ہیوی ڈرنک مت پیا کرو۔“

”سیری ٹریچڈی بھی تو اتنی ہیوی ہے ماما۔“ اس کے لہجے میں نارمانی کا ڈکھ سکتے لگا۔

”کوئی ٹریچڈی نہیں ہے، کیا کچھ نہیں ہے تمہارے پاس؟ دولت، عزت، گھر۔ خوب صورت و محبت کرنے والے بیٹے دنیا کی ہر آسائشات موجود ہیں، اگر حزرہ کی غیر موجودگی کو تم ٹریچڈی کہتی ہو تو یہ بہت بڑی بھول ہے۔ وہ ایک محدود سوچ کا حامل بے حد قدامت پسند شخص تھا۔ ایسے لوگ خود کچھ بھی کریں مگر خود سے وابستہ لوگوں کو اپنی گرفت میں ہی رکھنا پسند کرتے ہیں اگر وہ ہوتا تو تم پابند زندگی گزار رہی ہوتی۔“

”کچھ بھی کہیں ماما، میں محسوس کرتی ہوں کہ حزرہ جاتے نہیں تو ان کی سنگت میں رہ کر میں یقیناً اس آسب سے بچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جاتی جو آج کل میرے سائے کی طرح مجھ سے جڑا ہے۔“

”مت سوچا کرو اس منحوس شخص کو۔“ فائقہ نفرت انگیز انداز میں بولیں۔

”میں کب یاد کرتی ہوں اسے، وہ تمہاریوں میں خود ہی چلا آتا ہے۔“

”کیوں آنے دیتی ہو اسے خیالوں میں؟ ہونہ نہ معلوم کیوں بھول جاتی ہو کہ اس نے کیا کچھ نہیں ہمارے ساتھ؟“

”ہم نے اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ کیا تھا۔“

منال کے لہجے میں ملال کے ساتھ ساتھ طنز بھی جھلک رہا تھا۔

”وہ اس سے زیادہ کا مستحق تھا۔“

”جو ہونا تھا ہو گیا، اب کیا دل جلا نا، ختم کریں اس ناپک کو۔“



ماں کے بگڑتے موڈ کو دیکھ کر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”خود ہی شروع کرتی ہو اور خود ہی ختم بھی۔ نہ معلوم کب تمہاری یہ دیوانگی زائل ہوگی؟ ایک ڈیڑھ ماہ بعد ضرور تم اس کی یاد میں بے قرار ہونے لگتی ہو۔ مجھے ڈر ہے بچوں کے کالوں تک کبھی یہ ذکر پہنچ گیا تو..... بہت بُرا ہوگا۔ ابھی بھی وقت ہے، خود کو سنبھالو، بھول جاؤ اس کو۔“ فائقہ سخت غصے میں تھیں۔

☆.....☆.....☆

فائزنگ کی پُر شور آوازوں سے خاموش نضا گونج اُٹھی، اسی تناسب سے اس کا دل بھی کانپ کر رہ گیا۔ وہ بے ساختہ گھبرا کر بولی۔

”یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ آوازیں قریب سے آرہی ہیں۔“

”اسی کا خدشہ تھا، کمرے میں جاؤ۔“ اس کے لہجے میں خوف و ڈر کا شائبہ تک نہ تھا۔

”یہ لوگ کہیں حیدر کے کزنز وغیرہ تو نہیں ہیں؟“ ڈر و خوف کے نئے ادراک سے وہ کانپ اُٹھی۔

”ان لوگوں کو شاید معلوم ہو گیا ہے کہ.....“

”شٹ آپ، خود جاؤ گی یا اٹھا کر لے جاؤں؟“

اس کی بات کے جواب میں وہ غرایا۔ ماحول میں فائزنگ کی آوازیں مزید بڑھ گئی تھیں، کیونکہ حیدر کی حویلی کے اطراف سے بھی جوانی فائزنگ شروع ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی مختلف آوازیں تھیں جن میں بھاگنے دوڑنے کے بھاری قدموں کی آوازیں نمایاں تھیں۔ وہ محافظ تھے جو پوزیشن سنبھال رہے تھے۔ کچھ دیر قبل ماحول پر چھائی دل کشی و خوب صورتی پر اب رقص الٹیں متحرک تھا۔ ہر سو وحشت و دہشت رقصاں تھی۔

حورین جو پہلے ہی بُری طرح سمجھ چکی تھی، اس کی بات پر تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے کمرے میں آئی اور کانوں میں اُلگھیاں ڈال کر بیٹھ گئی۔

ذوالنون اسے اس وقت دیکھتا رہا، جب تک اس نے واپس جا کر کمرہ بند نہ کر لیا، وہاں سے وہ سیدھا راہ داری کی طرف بڑھا جس سے ملحقہ چھوٹی حویلی تھی جو گاؤں سے باہر کے مہانوں کے لیے گیٹ روم کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ وہ راہ داری سے نکل کر صحن میں آیا تو حیدر مل گیا۔

”کہاں چلے گئے تھے یار؟“ وہ پریشانی سے استفسار کرنے لگا۔

”لان میں تھا۔“

”لان میں..... چاندنی رات کا مزہ لینے؟“ وہ ہنس کر بولا۔

”یہ چاند اور چاندنی راتیں مجھ جیسے بندے کو اپیل نہیں کرتے ہیں، میں تو یونہی حالات کا جائزہ لینے چلا گیا تھا۔ تم نے دیکھا ہماری ٹول پر وہ پلاننگ نے کیا کام دکھایا ہے۔“ وہ مطمئن لہجے میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”دش فٹاسنگ یار! تم نے دوستی کے معنی ازبر کر دئیے ہیں، اگر تم نہ ہوتے تو نہ معلوم کیا ہوتا؟ پھر ایک بے گناہ لڑکی فرسودہ خود ساختہ رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ جاتی۔ سونے چاندی کی دیواروں میں مقید اس کی تشہ آرزوؤں، خواہشوں کی سسکیاں تاحیات اس کے اندر ہی اندر گونجتی رہتیں۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو ذوالنون، اخواہشوں و آرزوؤں کا قتل جسمانی قتل سے بڑھ کر ہوتا ہے۔“

”اس قدر جذباتی کیوں ہو رہے ہو جو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو جاتا ہے۔ تقدیر قدرت کے ہاتھوں تحریر ہوتی ہے تو تدبیر انسان کرتا ہے۔ تقدیر و تدبیر کی یہ سہ کشی ازل سے جاری ہے اور اب تک جاری رہے گی۔“

اسے سمجھاتے وقت اس کے لبوں پر وحیرانہ جھمکاؤں کا

”تم جیسے دوست، پروفیسر آفتاب اور حیدر کی فیملی سب لوگوں نے میری ہی نہیں، میری فیملی کی بھی.....“

”اوہ شٹ آپ یار! بے کار کے تکلفات میں مت پڑو، یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟“

اس نے اس انداز میں کہا کہ حیدر جس کی آواز مونہیت سے بھیک گئی تھی، لمحے بھر میں وہ خود کو سنبھال کر گویا ہوا۔

”جب تک ان کے حوصلے پست نہیں ہو جاتے۔“

”پھر تو یہ ایک طویل مدت لے گا، دولت و اختیارات کی جنگ چھوٹی جنگ نہیں ہوتی ہے۔“ وہ گہرا سانس لے کر کہنے لگا۔

”بالخصوص وہاں، جہاں معاملہ چھوٹی اناؤ غیرت کا ہو۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کئی راہ داریوں، محن عبور کر کے اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں سر آفتاب کرسی پر بیٹھے کسی ٹھیک سوچ میں مگمگ تھے۔

آہٹ پر وہ چونکے اور انہیں دیکھ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”شکر ہے رب کائنات کا کہ وہ لوگ یہاں کی حدود سے نکل چکے ہیں۔“ مامون، ہارون، صبوحی اور حیدر کی والدہ کو ان لوگوں

نے ڈنر کے بعد ہی روانہ کر دیا تھا، کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ عمر دراز کے کالوں میں ہارون اور صبوحی کی شادی کی خبر پہنچ جائے۔ اس خبر کو چھپانے

کے لیے ان کو بے حد تنگ و دوکرنی پڑی تھی۔ اس دوران عام ملازموں کو چھٹیاں دے دی گئی تھیں۔ قابل اعتماد ملازم میں جو حویلی میں موجود

تھے انہیں حویلی سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ رشتے داروں اور گاؤں کے ذمی حیثیت لوگوں نے صبوحی کا رشتہ عمر دراز سے نہ کرنے پر

پہلے ہی قطع تعلق کر لیا تھا اور ایک طرح سے یہ صبوحی کے حق میں بہتر ہوا تھا جو اس کا کام آسان ہو گیا تھا کہ وہ اب گاؤں کی حدود و عمر دراز کی

گرفت سے دور ہو چکی تھی اور دونوں بعد وہ یہ ملک ہی چھوڑ دینے والی تھی۔

پروفیسر آفتاب نے فائرنگ کی آواز سنتے ہی سیل پر مامون سے رابطہ کیا اور معلوم کیا کہ وہ لوگ کہاں تک پہنچے ہیں اور جواباً یہ سن

کہ وہ گاؤں کی حدود سے بہت دور جا چکے ہیں، انہیں تسلی ہوئی۔

”جی سر! میں نے بھی کنکٹ کیا تھا۔ حیدر اور وہ قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ حیدر نے اطلاع بہم پہنچائی۔“

”سرا میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ مس عورین کو بھی ان کے ساتھ بھیج دیں، آپ نے نہیں بھیجا۔ اب یہ گڑبڑ ہو گئی آگے کیا حالات ہوتے ہیں، ہم ان سے بے خبر ہیں۔“ ذوالنون موقح دیکھتے ہی وہ شکوہ زبان پر لے آیا جو اسے بے چین کر رہا تھا۔

”وہ لوگ سیدھے اپنے گھر نہیں جائیں گے، میں کسی طرح بھی کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں پھر عورین کے بچہ تیس سے پریشان لیتے وقت ان کو یقین دلایا تھا کہ وہ میری ذمہ داری پر جا رہی ہے، واپسی بھی انشاء اللہ میری ذمہ داری پر ہی ہوگی۔ صبح ہی ہم نکل چلیں گے۔“

ان کے لہجے میں وہی اطمینان و نرمی تھی جس نے ان کی شخصیت کو دوست نواز و بڑا دقار بنا دیا تھا۔ ان کے لبوں پر ہمہ وقت رہنے والا حیرت انگیز، چہرے پر چھائی مشفق سی روشنی انہیں عام لوگوں میں ممتاز کرتی تھی۔

”اسے لانا بے مقصد ہی ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

”وہ بے مقصد نہیں بہت اچھے مقصد کے لیے لائی گئی تھی۔ صبوحی کو ڈولہن بنا کر ایک بہن، ایک دوست کی حیثیت سے لے جانے کے لیے مگر ضروری نہیں ہوتا کہ جو ہم سوچیں وہی ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے اپنے اردوں کے نوٹنے سے اللہ کو پہچانا ہے۔ شناخت کا ایک لمحہ زندگی بدلنے کے لیے کافی ہوتا ہے جو ہم نے سوچا تھا، وہ نہیں ہوا اب بھی وہی ہوگا جو اس کا حکم ہے۔“

ان کے لہجے میں کوئی طعنے نہ تھا مگر ذوالنون نکل سا ہو گیا۔

”مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ لوگ پہلی بار یہاں آئے ہیں، آپ کی نہ مہمان داری ہو سکی، نہ وہ خاطر تو واضح جو ہماری روایت کا حصہ ہے۔“

”ایک گئی بات بتاؤں؟“ ذوالنون حیدر سے گویا ہوا۔

”ضرور۔“ حیدر ہمدرد گوش ہو گیا۔

”تم پور کرنے لگے ہو۔“ اس کے اعزاز پر سر آفتاب مسکرا دیئے۔

”میرا مقصد.....“

”کچھ بھی ہوتا ہمارا مقصد۔ ہمیں نوازش، کرم، مہربانی، شکر یہ جیسے تکلیف دہ لفظوں سے گھائل نہ کرو، کیونکہ ایسے الفاظ فریضہ شب کو کند چھری سے حلال کرتے ہیں۔“

”او کے، کافی بنواتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا، اسی وقت اس کے والد خاں گھبرائے ہوئے حواس باختہ سے اندر داخل ہوئے۔

”کیا ہوا بچا!“ ان کی بدحواس و خفیہ صورت دیکھ کر وہ تینوں کھڑے ہو گئے۔ حیدران سے استفسار کرنے لگا۔

مگر وہ اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ جواب دینے کے بجائے ہلکا کر رہ گئے۔

”خیریت نہیں ہے۔“ وہ بے مشکل کہہ پائے۔

☆.....☆.....☆

رات کا نہ معلوم کون سا پہ تھا جب ایک دم ہی کرن خواب سے جاگی تھی، بہت ڈراؤنا خواب دیکھا تھا انہوں نے، دل کی رفتار بری طرح غیر متوازن تھی۔ ان کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار تھے۔ ہاتھ پیروں میں بُری طرح سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو کرن!“ برابر میں سوئے ہوئے انس صاحب جو ابھی نم فٹوڈگی میں تھے، ان کے اس طرح اٹھ کر بیٹھنے سے وہ مشکرا نما از میں گھبرا کر اٹھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”پا..... نی۔“ بمشکل تمام ان کے لبوں سے نکلا۔ انس صاحب نے سائیز میں رکھے جگ سے گلاس میں پانی نکال کر انہیں دیا اور خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پانی پی کر ان کے حواس درست ہوئے تو بولیں۔

”بہت بُرا خواب دیکھا ہے میں نے۔ خدا میری بچی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ ان کا لہجہ کانپ رہا تھا۔ ”خواب محض خواب ہوتے ہیں بیگم ان سے ڈرنا چھوڑ دو، سو جاؤ۔ ہماری بیٹی خیریت سے ہے کچھ کھنکھنے لگی ہی تو بات کی تھی ہم نے۔“ وہ ان کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے دلاس دینے لگے۔

”نہیں خواب ہمیں آنے والے حالات کے مطابق کوئی نہ کوئی تسمیرہ ضرور کرتے ہیں، آگاہی دیتے ہیں۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہے۔ اس انداز میں میرا دل بہت دنوں بعد بے چین ہوا ہے۔ وہ بھی حورین کے حوالے سے، میری بچی کسی مصیبت میں ہے۔“ وہ روئے لگیں۔

”افوہ ایہ کیا تو ہم پرستی ہے یا ر، یہ کیا بات ہوئی۔ یہ دوسو سے وہم پیدا کرنا ہمارے نفس کی شیطانی تہوتی ہے دیکھو..... شیطانون کی انسانوں سے نفرت و بغض کا اعجازہ محض اس امر سے لگا لو کہ وہ بیٹھے بٹھائے ایسے دوسو سے ذہنوں میں ڈال کر مسرت محسوس کرتا ہے، اس لیے جب بھی ایسے دوسو سے آئیں تو لاجول ولاقوۃ الا بالہدٰی علیٰ عظیم پڑھا کرو۔“

وہ رسانیہ سے اسے سمجھانے لگے۔

”لیکن..... حورین کے ہی متعلق کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ ہم سے دور ہے اور یہ دوری دوسووں کے لیے بہت ہے۔“

”میں آپ کی بات مانتی ہوں، ایسا اکثر اوقات ہوتا ہے مگر کوئی بات ہے ضرور.....“ ان کی طبیعت بے حد مضطرب تھی۔ ”سونے کی کوشش کرو پلیز۔“ وہ لیٹ گئیں، انس کافی دیر تک ان کے بالوں میں آہستگی سے اُگلیوں سے مساج کرنے لگے۔ عام حالات میں کرن اس عمل سے منٹوں میں پُر سکون نیند سو جایا کرتی تھی مگر اس وقت وہ بُری طرح خواب کے زہر اثر بے چین و بے کل تھیں۔ خواب اپنی پوری جزئیات سمیت ان کے حواسوں پر متحرک تھا۔

جنگل بیابان میں انہوں نے حورین کو بے حس و حرکت پڑے دیکھا تھا۔ قریب بمیامک چہرے والے گدھوں کے غول اس کی

جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہی وہ چیخ مار کر جاگ گئی تھیں، جب سے اب تک ان کے اندر کی بے سکونی کو قرار نہ تھا۔

انس صاحب کے آرام کے خیال سے وہ سوتی بن گئی تھیں، جب انہوں نے دیکھا کہ وہ گہری نیند میں ڈوب چکے ہیں تو آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے نکل کر ٹیبل پر چلی آئیں۔

رات پوری طرح تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ماحول میں خوشگوار قابل برداشت ٹھنڈک تھی۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ سیاہ آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، انہوں نے کئی گہرے گہرے سانس لے کر اندر کی ٹھنڈک کو باہر نکالا۔ اس ٹھنڈی ہوا اور بے سکوت ماحول نے بھی ان کی ٹھنڈک و بے چینی کو فروغ نہ کیا۔ وہ گھٹائل پرندے کی طرح ادھر ادھر پکر لگاتی رہیں۔ بار بار حورین کا چہرہ ان کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔

بند آنکھیں

بے حس و حرکت چہرہ۔

ساکت وجود۔

اور اس کے قریب بڑھتے ہوئے گدھ، وہ خوف و وحشت سے کانپ اٹھیں، لاجول پڑھنے لگیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی روانی بھر بڑھ گئی تھی۔

اس لمحے انہیں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو بی بی جان نماز کی چادر باندھے ان کے قریب چلی آئیں۔

”بی بی جان ابی بی جان امیں نے بہت بُرا خواب دیکھا ہے“۔ وہ ان کے سینے سے لگ کر روتے ہوئے بولیں۔

بی بی جان انہیں بازو کے گھیرے میں لیے اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

”ہمیشہ یاد رکھو، خواب کیسا بھی ہو، کبھی بھی اسے بُرا نہیں کہنا چاہیے۔ بُرے سے بُرے خواب کو بھی اچھا ہی تصور کرنا چاہیے۔“ ان کے قریب بیٹھ کر وہ ناسکانت انداز میں گویا تھیں۔

”کیوں بی بی؟“

”ہمارے ذہنی ارتکاز کا سوچوں پر گہرا اثر ہوتا ہے جو ہم اپنے اندر سوچ لیتے ہیں، اس کا رد عمل ظاہر بھی ہو جاتا ہے۔ ہماری ذہنی قوت بہت طاقتور ہوتی ہے، اب بُرے سکون ہو کر سوچو، کچھ بھی نہیں ہے، حورین بالکل خیریت سے ہے اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ چلو وضو کر کے آؤ، تہجد کا وقت ابھی ہے۔ نماز ادا کرو اور دُعا مانگو، دعا میں بڑی طاقت ہے۔ برائی کو نال دیتی ہے، آؤ۔ یہ تہجد کا وقت تو ویسے بھی دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔“

ان کی بُرا اثر باتوں نے کرن کی متحوش حالت میں کچھ کی کی تھی، وہ اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

☆.....☆.....☆

”کیا ہوا اکل! آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟“ ذوالنون نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”عمر دراز کا پیغام آیا ہے، وہ برادری کے بزرگوں کو لے کر یہاں آنا چاہتا ہے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے سے سخت نگر جھلک رہا تھا۔ کیوں؟ وہ کیا کرے گا یہاں آکر۔“

حیدر کے چہرے پر فیس کی سرخی چھلکنے لگی۔

”یہ بات یعنی ہے کہ ان کو یہاں کے متعلق معلومات مل چکی ہیں۔“

پروفیسر آفتاب زمان نے بے یقین لہجے میں کہا۔

”حق ادا! یہی بات ہے۔“

”جب ہم ان سے سب تعلق توڑ چکے ہیں، بلکہ ابتدا انہوں نے کی تھی اور ان کے ساتھ تمام برادری کے افراد شامل ہیں۔

تعلقات توڑنے کے بعد وہ لوگ اب کس حیثیت سے آرہے ہیں اور کیوں آرہے ہیں؟“

”جس طرح دریا میں مگرچھ کی حکومت چلتی ہے۔ اب کوئی چاہے یا نہ چاہے، سب کو اس کا تابع ہونا پڑتا ہے۔ یہی حال ہمارا

ہے، عمر دراز ایک ایسا ہی مگرچھ ہے اور اس کا ہی قانون چلتا ہے، ایک مدت سے شہر میں رہ کر تم یہاں کے طور طریقے بھول چکے ہو۔“ وہ

حیدر سے مخاطب تھے۔

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، اس مگرچھ کی موت ہی اس گاؤں کی نجات کا باعث ہوگی، میں اسے اپنے علاقے کی زمین پر قدم

رکھنے نہیں دوں گا۔“

حیدر جو صوبی کے معاملے میں پہلے ہی رنجیدگی کا شکار تھا کہ اکلوتی بہن کی جس عجلت و مجبوری میں آنا فانا شادی کرنی پڑی۔ تمام

اس کی شادی کے حوالے سے سوچ گئی تمنائیں خاک ہوئیں۔ آرزوئیں ملیا میٹ ہوئیں، وہ آنسو جو وقت و رخصت وہ اپنے اندر اتار گیا تھا۔

عمر دراز کے ہٹ دھرم پیغام نے انہیں بھڑکتے شراروں میں تبدیل کر دیا۔ وہ شدید غیض و غضب میں دروازے کی سمت بڑھا۔ ذوالنون

نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر ہٹا دیا۔

”جوش میں کام آئے ہوتے ہیں، سنبھالو خود کو۔“

”مدت ہوگئی یا رابہ بے سرو پارم و رواج برداشت کرتے کرتے۔“

”حیدر! یہ وقت حکمت عملی کا ہے جذباتیت کا نہیں۔“

پروفیسر آفتاب نے بھی اسے رمان سے سمجھایا۔

”سرا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا جس طرح سے میں نے صوبی کو رخصت کیا ہے، میں جانتا ہوں ایسی شادی تو کسی ہتیم و سیر لڑکی

کی بھی نہیں ہوتی، جس طرح میری بہن کی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہوئی اس کی ہمت دیکھیں کہ کس ہٹ دھرمی سے یہاں آ کر یہ دیکھنا

چاہتا ہے کہ اسے ملنے والی معلومات درست ہیں یا غلط؟“

حیدر کی اشتعال انگیزی کم نہیں ہو رہی تھی۔

”صبوحی تمہاری بہن ہی نہیں، میری بیٹی بھی ہے، اس کی خوشیاں دیکھنے کی میری بھی بہت چاہ تھی، اس کی ماں نے کس طرح صبر کیا ہے اور کس دل سے رخصت کیا ہے۔ جانے کے بعد سے بار بار وہ بے ہوش ہو رہی ہے۔ یہ سب ہم نے صبوحی کی بہترین زندگی و پائیدار خوشیوں کے لیے ہی کیا ہے۔ میں مرد راز سے کمزور نہیں ہوں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتا ہوں، مگر وہ میرا خون ہے۔ میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے، کس طرح سے میں اپنے خون کو اپنی آنکھوں سے رائیگاں ہوتے دیکھ سکتا ہوں؟ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ آپ بتائیں ادا! میری سوچ غلط ہے؟“

وہ حیدر کے بعد سر آفتاب سے مخاطب ہوئے۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں امصر صاحب امرائی کا جواب امرائی سے دینا مرد مومن کے شایان شان نہیں ہوتا، بہادری تو صبر و استقلال میں ہے۔“

سر آفتاب تو خود غلوں و ایماء کی مٹی سے بنے تھے، ان کی تو فطرت ہی بھائی چارگی و بے لوث پیار و محبت کو فروغ دینے والی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے متاثر کن انداز میں کہا۔

”یہ میری بہادری اور میرا خون ہے، ان سے کس طرح سے نبٹا جاسکتا ہے، یہ تدبیر میں خود کروں گا مگر..... اس وقت مسئلہ ہے آپ لوگوں کی یہاں موجودگی کا، آپ جو ہمیں عزیزوں سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ آپ لوگوں نے وہ کیا جو اپنے نہیں کرتے۔ آپ کی محبت ہمارے دلوں میں ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ہم نہیں چاہیں گے کہ آپ لوگوں پر معمولی سی بھی آج آئے۔ آپ لوگوں کی موجودگی میں، میں ان لوگوں کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوں۔ آپ کے جانے کے بعد ہی ان سے کوئی مذاکرات ہوں گے۔“ ان کا لہجہ بے حد اُلجھا ہوا تھا۔

”جی! ہم کسی سے کوئی مذاکرات نہیں کریں گے۔“

حیدر کا لہجہ مودب تھا مگر اشتعال انگیزی فرو نہ ہوئی تھی۔

”حیدر! آپ کا اس معاملے میں بولنا مناسب نہیں ہے، آپ کے والد حالات کے مطابق فیصلہ کریں گے جو بہتر ہوگا۔ آپ اپنی اشتعال انگیزی و جذباتیت پر قابو رکھیں جو بے حد ضروری ہے۔“

”ہم اسی وقت یہاں سے نکل جائیں تو بہتر نہ ہوگا سر؟“ ڈو والٹون نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ کیا بات کی تم نے؟ یہ ممکن نہیں۔ ہم اس طرح ان حالات میں اپنے محسنوں کو نہیں جانے دیں گے۔“ حیدر کے والد نے فوراً کہا۔

”چھادست کہہ رہے ہیں، رات کے اس وقت اور ایسے حالات میں ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔“ حیدر نفی میں گردن ہلاتا ہوا بولا۔

”ذوالنون کی بات درست ہے اصغر صاحب! ہمیں اس وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے، جس انداز سے باہر قازنگ ہو رہی ہے، محسوس ہوتا ہے انہیں شاید آپ کے انکار و اقرار کی ضرورت نہ ہوگی، اگر وہ یہاں ہماری موجودگی میں آگے تو آپ کی مشکلات مزید بڑھ سکتی ہیں اور ہم نہیں چاہیں گے کہ ہماری وجہ سے آپ کی پریشانیوں میں وسعت ہو۔“

سر آفتاب کا انداز حتمی تھا جس سے ان باپ بیٹے کے چہروں پر تفکرات بڑھنے لگے۔ وہ شرمسار و نجل دکھائی دینے لگے۔

”آپ بے فکر رہیں سر! کسی میں ہمت نہیں ہے جو بغیر اجازت اس دلہیز پر قدم بھی رکھ سکے، یہاں دشمن کا پرندہ بھی پر مارنے کی جسارت نہیں کر سکتا ہے۔“

”آپ پریشان مت ہوں، جو ہوگا دیکھا جائے گا، ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے، یہ ہماری عزت و آن کا مسئلہ ہے۔“ اصغر صاحب بھی روکنے پر مقرر تھے۔

”سر! آپ کے ساتھ اس حورین بھی ہیں۔“ حیدر انہیں جانے پر ہند دیکھ کر آہستگی سے بولا۔ اصغر صاحب بھی ان کے مضبوط دلائل کے آگے خاموش ہو گئے۔ وہ ہر خطرے و مصائب سے ان کی خاطر نکلنے کو تیار تھے مگر پروفیسر آفتاب اور ذوالنون کے آگے انہیں جلد ہی سر ہنڈ کرنا پڑا اور انہیں اجازت دینی پڑی۔

”پریشان مت ہو حیدر! حورین ہمارے ساتھ ہی جائے گی، اللہ مالک ہے۔ مجھے اُمید ہے ایسی کوئی بات نہ ہوگی جو پریشانی کا سبب بنے۔“

”او کے سر! جو آپ نے کہا وہ سر! آنکھوں پر مگر میں کسی طور آپ کو تنہا نہیں جانے دوں گا۔ آپ کو محدود سے باہر نکلنے سے محفوظ کر آؤں گا، یہاں آپ کا کوئی اعتراض قابل قبول نہ ہوگا۔“

یہاں پر ان کی ایک نہ چلی، وہ ایک الگ گاڑی میں محافظوں کے ہمراہ نکلے تھے۔ پہلی گاڑی میں محافظ تھے اور دوسری لینڈ کروزر ان کی تھی، گاڑی حیدر ڈرائیو کر رہا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر ذوالنون تھا، بیک سیٹ پر پروفیسر اور حورین تھے۔ دونوں گاڑیاں دوسرے راستے سے جارہی تھیں، ان کے درمیان خاموشی تھی۔ وہ تینوں نہ مطوم کن سوچوں میں گم تھے۔ ان سے قطع نظر حورین بری طرح خوف و دہشت کا شکار تھی۔ حالات کی ایسی سنگینی کا اسے ادراک نہ تھا۔ اسے ذوالنون نے ہارون و دامون وغیرہ کی روانگی کا نہیں بتایا تھا اور اس قازنگ سے وہ یہی سمجھی کہ یہ ان پر ایک کیا گیا ہے۔ اسی خیال نے اس کے حواس گم کر دیئے تھے اور وہ بے اختیار ان کے خیریت سے رہنے کی دعائیں مانگنے لگی۔ قازنگ بہت شدت سے کی جارہی تھی، اس کی جان ان ہنگاموں سے نکلنے لگی۔

حیدر کے ہمراہ سر آفتاب اس کے روم میں آئے، ان کی زبانی وہ حالات سے باخبر ہوئی۔ صبحی، ہارون وغیرہ کی بخیریت روانگی کا سن کر اسے طمانیت ہوئی تھی گو کہ وہ جس مقصد کے لیے لائی گئی تھی، وہ ادھورا رہا تھا مگر صبحی کی رخصتی سب سے اہم کامیابی تھی۔

گاڑیاں پوری رفتار سے کچے کچے راستوں پر بھاگے جارہی تھیں، حیدر نے احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسرے راستے کا انتخاب



کیا تھا جو دشوار گزار ہونے کے باعث عام گزرگاہ نہ تھی اور محفوظ تھی۔

گاڑی میں بیٹھ ہونے کے باعث سردی کا احساس نہ تھا۔ باہر دونوں جانب پھیلے ہوئے ٹیلوں اور قد آور جھاڑیوں پر ٹھہرتی ہوئی چاندنی پھیلی ہوئی بے حد بے اسرار روئے سوز لگ رہی تھی۔

”انسانی ذہن و مزاج بھی کتنی سرعت سے اپنے احساسات بدلتے ہیں، چند گھنٹے قبل جب میں نے حیدر کی حویلی میں ستاروں کے جھرمٹ میں چمکتا ہوا چاند دیکھا تھا تو اس کی لمبوں خیز چاندنی نے کس طرح دل کو سخر کر دیا تھا۔ ہر شے چاندنی کے غبار میں چھائی ہوئی کس قدر ماورائی و دل کش لگ رہی تھی کہ خود اس مقدس چاندنی کا حصہ بن جانے کو دل چاہتا تھا اور اب محض چند ہی گھنٹوں میں یہ سب کس قدر خونخاک لگ رہا ہے۔“ وہ گھاس ڈور سے باہر جھانکتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

ذوالنون چونکہ انداز میں بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں تاریکی کی دبیز چادر کو چاندنی کا نازک سا سراپا چاک کرنے میں ناکام تھا۔

ماحول پر پرہول سکوت طاری تھا۔

ایک ایسی جاگد خاموشی جو کسی طوفان کی آمد کا ہاتھ دیتی ہے۔

کچھ تھا۔

کچھ ہونے والا تھا۔

کیا ہونے والا تھا؟

اس سے وہ قطعی لاطم تھا مگر چمشی حس برابر مضطرب تھی وہ کسی خطرے کی نشان دہی کر رہی تھی، مطلع کر رہی تھی اور اسی دم باہر پھیلے ہوئے بے ترتیب جھاڑیوں و ٹیلوں سے فائرنگ کی گئی۔

حملہ اتنا اچانک و شدید تھا کہ آگے چلنے والے محافظوں کو فوراً سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا اور انہیں فوراً ہی اپنے بچاؤ کے لیے جھکتا پڑا۔ حیدر کے ہاتھ سے اسٹیرنگ بے قابو ہو چکا تھا اور گاڑی نشیب کی جانب بڑھنے لگی۔ اسی وقت حورین کی جانب کا دروازہ کھل گیا اور وہ چیختی ہوئی نشیب کی گہرائی میں گرتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

بے تھاشا تجھے یاد کیا

اور بھلایا بھی بہت ہے تجھ کو

ساری رونق ہی تیرے دم سے ہے

اور تیرے بکھرے ہوئے غم سے ہے

جس قدر

میں نے تعلق تیرا محسوس کیا

اتنی گہرائی تو روحوں میں ہوا کرتی ہے

جس قدر

میں نے تیری ذات کو خود میں پایا

اتنی یکتائی کہاں مقس ہے

فاصلے و قسبیں کھو بیٹھتے ہیں

دوریاں پھینکی پڑیں

اتنی شدت سے تجھے سوچا ہے

اتنی شدت سے تجھے چاہا ہے

شدتیں عشق کی معراج ہوا کرتی ہیں

کوئین نے کارپورج میں کھڑی کی اور پھر فوراً ہی باہر نکلنے کے بجائے ڈرائیو تک ڈور کے لاک پر ہاتھ رکھے اپنے دل کو تسلی دے رہا تھا جو یہاں آنے کے ارادے سے ہی جو محصل و بے سکون ہو گیا تھا، آج ہنزہ نے کال کی تھی اور بتایا تھا کہ دادو انہیں بہت یاد کر رہی ہیں، وہ فرصت ملتے ہی آجائے۔ سو وہ آفس سے سیدھا سہیل چلا آیا اور آکر وہ اس کے سامنے کے خیال سے دل گیر تھا۔

”السلام علیکم کوئین بھائی! کیا بات ہے اندر جانے کا کیا راستہ بھول گئے ہیں۔ چلیں آئیں، میں آپ کو راستہ دکھاتا ہوں۔“ خضر جولان کے آخری حصے میں ایک سرساز کر رہا تھا۔ دس منٹ کا عرصہ گزارنے کے باوجود جب کوئین کو کار سے نہ نکلنے دیکھا تو قریب آکر کھڑکی میں منڈال کر گویا ہوا۔

”اوہ..... ایسی کوئی بات نہیں ہے، دراصل مجھے آفس کا ایک اہم کام یاد آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا، ابھی جاؤں یا کل پر چھوڑوں؟“

خضر کو دیکھ کر وہ جھل سا ہو گیا اسے بات بتانی پڑی۔

”اب کل پر ہی چھوڑیں، آفس ٹائمنگ ویسے بھی ختم ہو چکی ہے۔“ وہ اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

حسب معمول اس کا استقبال اسی محبت و خلوص سے کیا گیا جو اس گھر کے کینوں کا وطیرہ رہا تھا۔

اس خلوص مروت میں ڈوب کر روح پر لگے زخم بھی مندمل ہونے لگتے تھے۔

”یہ کیا حالت بتائی ہے؟ کس قدر کمزور ہو گئے ہو، اپنا خیال کیوں نہیں رکھتے۔“ راحیلہ بیگم کا دل آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں

سے بہنے لگا۔

”دادو! آپ روئیں مت، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”کیا ٹھیک ہو؟ صحت دیکھی ہے اپنی؟“ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھامے راحیلہ بیگم گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”ایسی کوئی پرابلم نہیں ہے، آپ میری فکر نہ کیا کریں۔“ اس نے محبت سے ان کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا۔

”کیسے نہ کروں، تمہارا باپ جیتے جی مارا گیا، زیادتیاں میں نے کی تھیں، سزا کی صرف میں ہی مستحق تھی مگر وہ سب کو سزا دے

گیا۔ اپنے لیے بھی آزمائش بھری سزا تھی اس نے۔ روح گھائل کر لی اس نے اپنی اور ابھی تک اس کا پتا نہیں ہے، اسے خیال بھی نہیں ہے

کہ کوئی کس بے قراری سے اس کی راہ تک رہا ہے۔“

قطرہ قطرہ آنسو ان کی آنکھوں سے بہ رہے تھے۔ لہجے میں حزن و سوگ کی مضطرب کر دینے والی آگ دکھ رہی تھی۔

”آپ ڈعا کیا کریں دادو، آپ کی دعائیں انہیں ضرور ایک نہ ایک دن لے کر آئیں گی۔“ باپ کے ذکر پر اس کے چہرے پر سایہ

سالہانہ لگا۔ شفیق و نرم مزاج باپ کو وہ کبھی بھلا نہ سکا تھا مگر جب سے ماں اور نالو کے نفرت بھرے عزائم اس گھر کے لوگوں کے خلاف ہائیں

اس پر آشکارا ہوئی تھیں، تب سے اسے احساس ہوا تھا کہ جزو نے انہیں اس طرح چھوڑ کر بہت بڑی زیادتی کی ہے، وہ ساتھ ہوتے تو آج

خضرئی اس کی دسترس سے دور ہونے کی بجائے پہلو میں ہوتی اور پھر خزاں بہاروں کے پیرا بن اور نہ کہ اس کی حیات کا حصہ ہوتی۔

بعض اوقات ایک غلط فیصلہ کنی زندگیوں کو تباہیوں سے ہٹانے کا کردار دیتا ہے، جہاں خواہشیں حسرتوں کا روپ دھار لیتی ہیں اور پھر

حسرتیں تاحیات مندی بچے کی طرح ہسکتی رہتی ہیں، بگتی رہتی ہیں۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ دادو کی ماضی کی زیادتیوں کا تاوان بھگتنا پڑ رہا ہے یا ماں کی اغوشوں کی ادا جیگی ہے یا باپ کی جذباتیت کی سزا ہے۔

ظالمیوں کے خطا کار کچھ لوگ تھے سزا سب کو مل رہی تھی۔

”میرا دل، میرے لب، ہر دم دعا گو رہتے ہیں بیٹا! اچھا یہ بتا گھر میں سب کیسے ہیں؟ بہو، فائقہ اور تمہارے نالو، وہ تو آج کل

بہت مصروف ہوں گے۔ انکیشن میں حصہ لے رہے ہیں اور وہ چھوٹا کیسا ہے؟ اس کو تو فرصت ہی نہیں ملتی کہ آکر دادو کو ایک نظر دیکھ ہی

لے۔“ وہ فردا فردا سب کی خیریت معلوم کر کے بڑے پیار بھرے لہجے میں ذوالنون کے بارے میں استفسار کرنے لگیں۔

کوئین بھی سب کی خیریت سے مطلع کرتے ہوئے ذوالنون کے بارے میں بتانے لگا، وہ ٹھیک ہے اور آج کل اپنی دوست کے

ہمراہ گاؤں کی سیر کو گیا ہوا ہے۔

”شکر ہے حزنہ کی جدائی کے دکھوں سے وہ خود کو نکال کر دنیا کے ہنگاموں میں گمن تو ہے، ورنہ مجھے بڑی فکر رہتی، اب تم کہو گے

میں نے فکر فکر کی رٹ لگا رکھی ہے، پھر کیا کروں عمر کے اس حصے میں آکر انسان گرو دعا ہی کر سکتا ہے۔“

”آپ کی دعا اور آپ کی فکر ہماری زندگی کے قیمتی ترین اثاثے ہیں، کبھی زندگی کی الجھنوں میں الجھ بھی گئے تو دل میں یہ یقین کا

دیواروشنی دکھاتا رہے گا کہ کسی کے لب ہمارے لیے ڈعا گو ہیں، مایوسیوں سے نکالنے کے لیے۔“

”کوئین بھائی! ماما پوچھ رہی ہیں ڈنر میں کیا لیں گے آپ؟“  
 اور یہ چائے دیکر لوازمات کے ساتھ ٹرائی میں رکھ کر لے آئی۔  
 ”ڈنر تو میں کروں گا پل گریل!“ وہ اسے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

”اتنے عرصے بعد آئے ہو ایسے ہی تھوڑی جانے دے گی بہو پھر تمہارے چچا بھی بہت یاد کر رہے تھے، ان سے مل کر جانا۔“  
 ”او کے دادو! اگر اتنا کچھ کھانے کے بعد اب کھانے کی گنجائش کہاں رہے گی۔“

اور یہ کو پلٹ میں لوازمات بھرتے دیکھ کر وہ بولا۔

”آپ بھی کیا حضرتی! آپنی کی طرح ڈائنٹ کونٹنس ہیں۔ آپنی کو بھی اپنی اسارٹ نہیں کی بڑی فکر رہتی ہے، حالانکہ میرا دعویٰ ہے  
 آپ جیسے لوگ پھیل بھی جائیں تو بھی خوب صورت ہی لگیں گے۔“ دادو کے بعد اس نے لوازمات سے بھری پلٹ اس کی طرف بڑھاتے  
 ہوئے شوٹی سے کہا۔

اسی لمحے مسکراتی ہوئی صنوبر بیگم اندر داخل ہوئیں۔

”میں نے سوچا آج شام کی چائے آنٹی کے روم میں ہی پی جائے۔“

وہ خوش دلی سے کہتی ہوئیں ساس کے برابر میں بیٹھ گئیں۔

”جگ جگ جیو بہو! ہر گھر میں تم جیسی بہو ہو تو گھر اسی طرح جنت کے گوارے بن جائیں، رشتوں کو توڑنے اور جوڑنے میں بڑا  
 کردار عورت کا ہی ہوتا ہے اور جس طرح سے تم نے ہمارا دل، اپنی خدمت گزاروں کی محبت سے تسخیر کیا ہے، ایسا اس دور میں بہت کم لوگ  
 کرتے ہیں۔“

انہوں نے محبت پاش لگا ہوں سے صنوبر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ سب آپ کی محبت ہے جو آپ نے مجھے ساس ہوتے ہوئے بھی ماں کی طرح محبت دی ہے، ورنہ اپنی امی کی ڈتھ کے بعد تو  
 میں کبھی تھی کہ انمول محبت کا یہ خزانہ چمن چکا ہے، اب کبھی نہیں ملے گا۔ ہم عمر کے کسی بھی دور میں پہنچ جائیں، ہمیں ماں جیسی پر نور ہستی کی  
 ضرورت رہتی ہے۔“

”ارے میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر؟ اندر داخل ہوتے ہوئے حضرت نے رک کر حیرانگی کی ایک ٹنگ کی۔

”شیر اور بکری مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے البتہ گیدڑ ضرور میرے سامنے کھڑا ہے۔“ اور یہ کہنے پر ان کے لبوں پر مسکراہٹ درآئی۔

”جنگلی ملی! میرے معاملے میں اپنی سادس جیسی ناگ نہ اڑایا کرو، اگر مجھے تمہارے سائزرنگز کا خیال نہ ہوتا تو کب کے تمہارے

کان کاٹ چکا ہوتا۔ ماما جی کبھی ہی اگر اس کے کان کاٹ دو گے تو سائزرنگز کیسے پہنے گی، پھر جنگلی ملی سے کان کٹی بندر یا بن جائے گی۔“ وہ

دھپ سے کوئین کے برابر میں بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

”ذرا بھی تم لوگوں میں محفل نہیں ہے، موقع ملا اور شروع ہو گئے۔ میں نے تمہیں حضرتنی کو لینے بھیجا تھا۔“ صنوبر نے دونوں کو ڈانٹا۔  
 ”ان کی کال راستے میں ہی آگئی تھی، وہ لیٹ نائٹ آئیں گی، کئی ایمر جنسی کیمر آئے ہیں، بھائی بھی لیٹ آئیں گے، چلا آجائیں گے۔“

”بھائی گھر میں نہیں ہیں؟“ ہنزہ کے ذکر پر اسے یاد آیا۔ ”وہ آج ہی اپنے میکے گئے ہیں۔“

”کچے قیے کے کہاب اور پراٹھے کھانے ہیں آئی ا“ وہ جس سے فرار چاہ رہا تھا اس سے سامنا ہونے کا امکان نہ رہا تھا۔ وہ  
 بشاش لہجے میں بولا۔

”بریانی اور کڑا ہی گوشت بھی تیار کر رہی ہو، سوئیٹ ڈش کیا بناؤں؟“ صنوبر اس کی فرمائش پر کھل ہی گئیں۔  
 ”قرنی!“

”قرنی! یہ تو خاص ڈش نہیں ہے، کچھ اور بتائیں۔“ مختصر نے کہا۔

”سیرے لیے خاص ہے، کیونکہ آٹی بنائیں گی۔“ اس نے سینڈویچ کھاتے ہوئے کہا۔

”بے فکر ہو، دس ملائی کے دو پیکٹ بھی رکھے ہیں، اریہ نے جیل بھی بنائی ہے۔“

”اریہ کے ہاتھ کے بنے کھانے کھانا، خود کو مزادینے کے مترادف ہے۔“

”مت کھانا کو نہیں بھائی تو کھائیں گے۔“ وہ لا پرواہی سے گویا ہوئی۔

”پھر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ ملازمہ نے آکر بتایا کہ مہران علوی اپنی می کے ساتھ تشریف لائے ہیں، راحیلہ بیگم کی  
 بے ساختہ نظرس کو نین کے رنگ اڑتے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

☆.....☆.....☆

اس اچانک افتاد سے وہ سنبھلے تھے۔ گاڑی بے قابو ہونے کے باعث آگے بڑھتی گئی اور اس سے قبل کہ وہ کوئی تدبیر کرتا اس کی  
 سائیڈ کادر واڑہ جنگلوں کے باعث کھلا اور وہ بھی کسی بال کی طرح لڑھکتا ہوا نیچے گرنے لگا اور لڑھکتا ہی چلا گیا کیونکہ گاڑی ریگستانی علاقہ عبور  
 کر رہی تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا کسی چیز کو پکڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا مگر ہاتھ میں صرف خشک پودوں کی ٹہنیاں آ رہی تھیں جو سہارا بننے  
 کے بجائے خود بے وزن ہو کر اس کے ہاتھ میں آ رہی تھیں، گرتے گرتے وہ ایک جگہ رُک گیا، جہاں ریت کا دریا سا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک اسی  
 طرح بے حس و حرکت لیٹا رہا، اس وقت ہوش و حواس گویا گم ہو کر رہ گئے تھے۔

کتنی دیر وہ یوں ہی چت پڑا آسمان کی بدلتی رنگت کو دیکھتا رہا، جہاں آخری پہرے کے ستارے ست روی سے منزل کی جانب مائل  
 یہ پرواز تھے۔ ٹھہرا ہوا چاند بھی گویا ساری رات چاندنی لٹا لٹا کر اب تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا۔ ماحول میں خاموشی تھی اور ہوا میں بوجھل پن  
 پنہاں تھا۔

معاں کا شعور بیدار ہوا تو چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے چاروں طرف اسے ریت ہی ریت دکھائی دے رہی تھی، وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا، اس کی نظریں ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی جہاں دم توڑتی رات کی سیاہیاں وحشت پھیلا رہی تھیں۔ وہ ایک بندھ ٹیلے سے لڑھکتا ہوا آیا تھا۔ جسم میں خاصی چوٹیں بھی آئی تھیں مگر اس وقت اسے اپنے ساتھیوں کی فکر تھی کہ وہ کہاں ہیں اور ان کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا ہے..... ان سے تو وہ بے خبر تھا، البتہ حورین کو اس نے خود گرتے دیکھا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی وہ برق رفتاری سے آگے بڑھنے لگا۔ اس صحرائی علاقے میں کئی گھنٹے سرگرداں رہنے کے بعد بھی وہ نہ حورین کو ڈھونڈ پایا اور نہ ہی حیدر اور سر آفتاب کے متعلق جان پایا۔ رات دیر سے دیر سے اپنا سیاہ آٹھل سمیٹ چکی تھی۔

ٹیلے افق کے کناروں سے صبح صادق کی روپوشی سرخیاں نمایاں ہو رہی تھیں، پرندوں کی چپکاروں سے فضا گونج رہی تھی۔ نہ معلوم کتنا سفر طے کرنے کے بعد اسے کسی گاؤں کے آثار دکھائی دیے۔ سامنے کھیت تھے اور کھیتوں کے درمیان کچرا ستہ بنا ہوا تھا۔ سورج کی سنہری روشنی آہستگی سے پھیل رہی تھی، وہ حوصلوں کو سنبھالے آگے بڑھتا رہا۔ دائیں جانب ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان نظر آ رہی تھی۔ کھیتوں میں خاصے خاصے پر ایک کسان بل چلا رہا تھا۔ وہ دکان کے قریب چلا آیا، اندر ایک باریش فضا تخت پر بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔ ڈولنوں کو دیکھ کر انہوں نے آیت پوری کر کے قرآن کو جزدان میں چوم کر ایک کے اوپر رکھا اور آنکھوں پر ہینک درست کرتے ہوئے دکان سے باہر آئے۔ وہ تجسس بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”السلام علیکم“ اس نے اس کی جھجک محسوس کر کے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، آپ..... کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”جی، میں یہاں انجمنی ہوں، ایک حادثہ مجھے یہاں لے آیا ہے۔“

”حادثہ؟“

”جی ہاں، رات ہماری گاڑی ایک حادثے کا شکار ہو گئی تھی، اس میں، میں، نہیں اور میرے ساتھی بھی تھے، مجھے ان کی تلاش ہے، یہ کون سی جگہ ہے؟“

”آپ کس گاؤں سے آئے رہے تھے؟ ویسے آپ گاؤں کے نہیں لگتے۔“

اس کی نگاہیں ہنسنے کے پیچھے سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اس کے منہ سے حیدر کے گاؤں کا نام سن کر وہ خوف زدہ لہجے میں گویا ہوئے۔

”ارے پھر تو آپ کا یہاں ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے، آپ میرے ساتھ چلیں، جلدی کریں، ابھی کسی نے بھی آپ کو دیکھا

نہیں ہے۔“

”یہاں مجھے کس سے خطرہ ہوگا؟“ وہ متعجب ہوا۔

”شاید آپ کو معلوم نہیں ہے، ہمارے سائیں کا نام مرد روز سائیں ہے، ان کی دشمنی چل رہی ہے اپنے چچا اصغر علی سے، آپ میرے ساتھ آئیں، تمام باتیں مگر جا کر بتاؤں گا۔“

بزرگ بہت زیادہ خوف زدہ و متحکرتھے۔ ذوالنون ایک گہری سانس لے کر ان کے پیچھے چل پڑا۔ تقدیر کا مذاق ایسا ہی ہوتا ہے وہ جس سے بچ کر نکل رہے تھے، اس کی حدود میں قسمت کی تم ظریفی سے آن پھنسے تھے۔ معاملہ گھمبیر تھا، حیدر اور پروفیسر آفتاب کے ساتھ اسے حورین کی فکرا بہت زیادہ ہونے لگی تھی۔ وہ نہ معلوم کہاں تھی؟ گاڑی سے مرنے کے بعد وہ کہاں گئی؟

سرخ اینٹوں سے بنے کشادہ صحن میں پرانے طرز کے بے لکڑی کے دروازے سے وہ بزرگ کے پیچھے داخل ہو گیا۔ اس کے اندر آتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھادی۔

”یہ گودام ہے اور قدرے محفوظ جگہ ہے، سامنے نکال لگا ہوا ہے، وہاں سے آپ ہاتھ منہ دھولیں، میں اتنے میں ناٹھتے کا انتظام کرتا ہوں۔“ وہ بزرگ صحن کے وسط میں لگے لگے کی طرف اشارہ کر کے گویا ہوئے۔

”شکر یہ بزرگوار! مجھے ناٹھنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ تکلیف نہ کریں۔“

”تکلیف کسی پینا! آپ مہمان ہیں اور مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔“

”میں آپ کی قدر کرتا ہوں مگر مجھے بھوک و پیاس کی طلب نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں تعلقیت تھی۔

”گھبراؤ مت، ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، بڑے سائیں کو پتا نہیں چلے گا۔“

انہوں نے بڑی اپنائیت سے اسے تسلی دی تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”نہ مجھے آپ کے بڑے سائیں سے ڈر ہے اور نہ ہی میں گھبرا رہا ہوں، دراصل بات یہ ہے کہ میرے تین ساتھی اور بھی ہیں، ان میں سے ایک لڑکی ہے۔ وہ میرے ساتھ حادثے کا شکار ہوئے تھے، ان کی خیر جب تک مجھے نہیں ملے گی، جب تک میں سکون سے نہیں بیٹھ سکوں گا۔“

”اوہ لڑکی بھی ہے؟ رب خیر کرے، لیکن آپ کا سامنا کسی سے ہو گیا تو بہت بُرا ہوگا، کیونکہ آج کل سائیں کا موڈ بہت بگڑا ہوا ہے، ان کے چھوٹے بھائی کی منگ تھی اصغر علی کی بیٹی۔ چھوٹے سائیں کے مرنے کے بعد وہ یہاں کے رواج کے مطابق بڑے سائیں کے

حصے میں آگئی تھی۔ بڑے سائیں نے اصغر علی کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنی امانت لینے آ رہے ہیں، جو اب اصغر علی نے انکار کر دیا اور یہی نہیں اپنی بیٹی

کی شادی اپنے لڑکے کے دوست کے بھائی سے کر دی اور چھپ چھپا کر انہیں بھگا بھی دیا۔ ایسا کبھی بھی ہمارے گاؤں میں نہ ہوا تھا۔ بڑے

سائیں تو اسی وقت ان کے گاؤں میں آگ لگا کر حویلی والوں کو قتل کرنے کا ارادہ کر چکے تھے اگر ان کے بزرگ اور دوسرے بڑے لوگ

انہیں روک نہ لیتے تو اب تک سب خاک ہو چکا ہوتا، پھر کل رات فائرنگ میں ان کے کافی لوگوں کی جانیں گئی ہیں۔“

ان سے گفتگو کے دوران وہ ہاتھ منہ دھو کر فارغ ہو چکا تھا۔

”آپ مجھے سچے اور کمرے لگتے ہیں۔ جناب! آپ بالکل سچ بتائیں کیا مرد راز اور اس لڑکی کا جوڑ تھا؟ احساسات سے زیادہ روایات عزیز رکھنی چاہئیں؟ اصغر علی نے جو کیا وہ غلط ہے؟“

”نہیں سب درست ہے، والدین سے بڑھ کر اولاد کی بہتری کون چاہ سکتا ہے۔ میری زندگی کا ایک حصہ شہر میں گزارا ہے، وہاں رہ کر میں نے جانا تھا، زندگی کے اصل معنی کیا ہیں۔ یہاں صاف ماحول اور کھلی فضا ہے مگر دلوں پر لگے پرانے رنگ آلودگی و گرد و صاف نہ ہو سکی ہے اور نہ ہوگی، کیونکہ اللہ بھی ان لوگوں کی حالت نہیں بدلتا جو اپنی حالت بدلنے کی سعی نہیں کرتے۔“

وہ اسے لے کر ایک چار پائی پر بیٹھ گئے۔

”آپ دکان یوں ہی چھوڑ کر آگئے۔“

”ساون آگیا ہوگا، وہ نماز پڑھ کر آ جاتا ہے۔“

”ساون کون ہے؟“

”سیری بہن کا بیٹا ہے، دکان وہی چلاتا ہے میں صرف کھولتا ہوں۔ ایسا کرو، کچھ دیر آپ سستالو، میں اتنے میں ناشتہ لے کر آتا ہوں اور سن گرن لینے کی کوشش کرتا ہوں، آپ کے ساتھیوں کی۔“ وہ بزرگ جن کا نام محمد افضل تھا۔ ذوالنون کی زبانی سب سن کر بہت متاثر ہوئے۔ وہ روشن ذہن و دماغ کے مالک تھے۔ علاقے میں عمر دراز کی عالمانہ حاکمیت کو وہ پسند نہ کرتے تھے مگر یہاں کے علاوہ کوئی اور ٹھکانہ نہ ہونے کے سبب مجبوراً رہے تھے۔ اب ذوالنون کی صورت میں ایک ہم مزاج اور ہم خیال مل گیا تو وہ پورے غلوں سے اس کی مدد کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

ذوالنون پر جب سے انکشاف ہوا تھا، عمر دراز کے علاقے میں ہونے کا اس وقت سے اسے یہ سوچ جکڑے ہوئے تھی کہ خدا نخواستہ وہ ان کے ہاتھ لگ گئی تو..... کیا ہوگا؟؟؟

☆.....☆.....☆

یادیں

لمحے بیت جاتے

مگر

یادیں چھوڑ جاتے

کچھ یادیں قائم رہتیں

جب تک زندگی قائم رہتی

یادیں



من میں رچ جاتیں  
روح میں اتر جاتیں  
بالکل خوشبو کی طرح  
پھر یادیں زلاتی ہیں  
اکثر یہ تر پاتی ہیں  
تجہائی

ہاں تجہائی میں مجھ کو  
اس کے خیالوں میں لمحے بیت جاتے ہیں  
مگر

یادیں چھوڑ جاتے ہیں

ان کے مسلسل بہتے آنسوؤں میں وہ ہر شکوہ عمارت و حند لای گئی تھی۔ وہ ایک تک اس چار منزلہ عمارت کو دیکھ رہی تھیں جو کبھی اس کا مسکن رہی تھی۔ زندگی کے خشک و بخر دنوں کا آغاز اس گھر کی وہلیز سے ہوا تھا۔ جس کا پچھلا حصہ قائلو و بے مصرف ہونے کے باعث ان ماں بیٹی کے مصرف میں آیا تھا، پھر بعد میں وہ تاریک و تھکن زدہ جگہ بھی دوسرے لوگوں کو گل نظر آنے لگی تھی۔

”کرن! کرن! پلیز سنبھالو خود کو، برو کر آ رہا ہے، ہمارے پیچھے تمہیں اس طرح روتے دیکھے گا تو کیا سمجھے گا۔“ انس صاحب نے کرن سے کہا۔

کراچی آنے کے بعد کرن کی خواہش کے مطابق انہوں نے حمزہ کے پرانے گھر کو تلاش کرنا شروع کر دیا تھا، چند دنوں کی کوششوں کے بعد انہیں یہ خوشی مل گئی جس پر ”برائے فروخت“ کا بورڈ آویزاں تھا۔

وہ وہاں کی ایک معروف اسٹیٹ انجینسٹی کی ملکیت تھی۔ وہ ان سے انس نے خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رات کرن کو وہ بتانہ سکے تھے۔ ناشتے کے بعد بتایا تو وہ بے قرار ہو گئی کہ ابھی دیکھ کر آئیں گی اس جگہ کو۔ وہ ساتھ لے آئے۔

برو کرنے آ کر تالا کھولا تو انس کا راندہ لے آئے۔ کرن لان سے ملحقہ اس حصے کو بتور دیکھ رہی تھی جہاں اب خوب صورت انجینسٹی تھی، وہاں دو کمروں اور مختصر سے مکن والی ان کی رہائش تھی۔

”سرا! آئیں اندر سے دیکھ لیں پھر آپ کی منشا کے مطابق ڈیکوریت کریں گے۔“

برو کر ایک نو عمر لڑکا تھا جو بہت مودب انداز میں بول رہا تھا۔

”کرن! اندر چلیں۔“ وہ کھوٹی کھوٹی سی کرن سے مخاطب ہوئے۔

”آپ جائیں میرا سب دیکھا ہوا ہے۔“ ان کی آواز ہنسی ہوئی تھی۔

”آئی نو بھر بھی قارئین کو پوری کرتی ہے۔“

”آپ جائیں پلیز، میں یہیں رہوں گی۔“ وہ ان کی کیفیت سے آگاہ تھی، سو خاموشی سے کہہ کر آگے بڑھ گئے، بروکر پہلے آگے

بڑھ چکا تھا۔

وہ کار سے نکل کر باہر آگئیں۔ یہ وسیع لان والا آشرمانہ جو اب خاموشیوں و سناٹوں کی زد میں گم سم کھڑا تھا۔ کل یہاں خوشیاں و قہقہے رقص کرتے تھے، زندگی پوری طرح سے رواں دواں رہتی تھی، ماسوائے اس سال خوردہ حصے کے جہاں وہ ماں، بیٹی قسمت کی گردش سے انہوں کے دور پر آ پڑی تھیں اور بے رحم وقت نے ان رشتوں کی اصلیت ظاہر کر دی تھی جن رشتوں پر بہنوں کو بڑا مان و غرور ہوتا ہے۔

مہذب رفتہ ان کی ساتھیوں میں گونجنے لگا تھا۔

کئی چہرے تھے۔

کئی آوازیں تھیں۔

ایک چہرہ ایک آواز جو اس کی سب سے بڑی خوشی بن چکی تھی، وہ ماں تھی۔ اس بند دور و دیوار سے گویا آوازیں آنے لگی تھیں۔

”کرن! انسان وہی دونوں جہاں میں کامیاب ہوتا ہے جو دوسروں کی بھلائی چاہتا ہے۔ اپنے لیتے تو سب ہی جیتے ہیں۔ مت غصہ ہوا کرو اتنا۔“

”ای ای ایہ سوچ اب بدل چکی ہے۔ اب وہی انسان کامیاب ہے جو صرف اپنے لیے جیتا ہے اور اپنی بھلائی چاہتا ہے۔ کیا ملتا ہے آپ کو دن رات بے دام کی ملازمت بن کر؟ ایک کپ چائے بھی ہم یہاں اپنی مرضی سے نہیں پی سکتے۔“

”ملا صرف اللہ سے مانگو جو نصیب میں ہوتا ہے، مل جاتا ہے۔ میں تو احسان مند ہوں، بھائیوں اور بھائیوں کی جوائنٹ پُر آشوب دور میں بھی ہم ماں بیٹی کو رکھا ہوا ہے، ورنہ میں تمہیں لے کر کہاں بھگتی پھرتی وقت بہت خراب ہے۔“

”آپ کو عادت پڑ گئی ہے ہر وقت خود پر ترس کھانے کی اور ان کی شکرگزاری کی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کوئی ملازمت بھی رکھیں تو رہائش کے علاوہ انہیں کیا کچھ نہ دینا پڑتا اور ہر وقت کی غلامی ملازمت بھی نہ کرتی۔“

”آج بھی درجہ حرارت عروج پر پہنچا ہوا لگ رہا ہے۔ خیریت تو ہے ناں پھپھو جان، کیا ہوا یہ گولہ باری کیسی؟“ حمزہ کا شوخ مگر سنجیدہ انداز تھا۔

”اس لڑکی کے دماغ میں ہر وقت نہ معلوم کون سی بھٹی سلکتی رہتی ہے کہ جب بھی منہ کھولتی ہے، شعلے ہی نکلتے ہیں، خیر چھوڑو، آؤ بیٹھو۔“

”میں پیڑا لے کر آیا ہوں، مجھے معلوم تھا تم اسکول سے بھوکی آئی ہو گی۔“

”ہونہہ“ اپنے پاس رکھو یہ بیڑا، مجھے نہیں کھانا یہ اللہ واسطے کا کھانا۔“

”ارے ارے لڑکی! کسی کو تو بخش دیا کر سب کے ساتھ ایک ماسلوک کرتی ہے۔“

”آپ نصرت نہ ہوں پھوپھو! مجھے عادت ہے اس کی ہر بات برداشت کرنے کی پھر میں جانتا ہوں کہ کرن کو نصرت جتنی جلدی آتا

ہے، اتنی جلدی اتر بھی جاتا ہے۔“

”عزہ بیٹا! میں یوں ہی تو فگر مند نہیں رہتی ہوں، ماں کے گھر میں سب برداشت کر لیتے ہیں مگر کل کو جب سسرال جائے گی تو

کون سسرالی برداشت کرے گا۔“

”بے فگر ہیں پھوپھو! اس کا شوہر بہت کیتھ کرنے والا ہوگا، وہ کسی کو بھی اس کی طرف انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں دے گا، پکوں

پر ہٹھا کر رکھے گا۔“

”ارے تمہیں کیسے معلوم ہے بیٹا؟“

”وہ..... وہ..... میں..... نے اس کی ہاتھوں کی لکیریں دیکھی ہیں۔“

”ہونہہ جھوٹا کہیں گا۔“

”پھر بدتمیزی، کتنی مرتبہ کہا ہے بڑا بھائی ہے۔“

لوشا بہ بیگم کی اور عزہ کی آوازیں اس کے اطراف میں گونج رہی تھیں۔ گیٹ سے باہر آتے اس کو دیکھ کر وہ سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

محمد افضل انڈے پرائیوٹ اور چائے کے ہمراہ واپس آئے تھے، ان کے اصرار کے باوجود والنون نے صرف چائے لی تھی، ان کی

زبانی اسے معلوم ہوا کہ رات اصغر علی کا بیٹا اور اس کے ساتھ جو شخص تھا، وہ ڈنچی ہوئے تھے اور ان کے آدمی انہیں رات کو ہی لے کر چلے گئے

تھے۔ حورین ان کو بھی نہ ملی تھی۔

”پھر کہاں گئی؟“ اس کے اندر وحشتیں حد سے زیادہ تھیں۔

”میں نے اپنے سنبھلوں کو کہہ دیا ہے، وہ خاموشی سے اس بچی کو ڈھونڈ رہے ہیں، بس ذکا کر دو وہ سائیں کے آدمیوں سے محفوظ رہے۔“

”میں اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا، میں جا رہا ہوں۔“ وہ اضطراب و اضطراب کی کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔

”باہر خطرہ ہے۔“

”مجھے پروا نہیں۔“

”اچھا ٹھہرو، میں باہر کچھ بندوبست کر کے آتا ہوں پھر چلے ہیں۔“

”کیسا بندوبست؟ میں ایک لمحہ بھی نہیں رُک سکتا۔“

”آپ چلے جائیں گے، سائیں کو چتا چل گیا کہ میں نے اس کے دشمن کے دوست کو پناہ دی ہے تو وہ میری کھال میں بھس بھروانے میں دیر نہیں کرے گا۔“

ان کی وجہ مقبول تھی پھر اپنے محسن کی وہ بھی خیر خواہی چاہتا تھا، اس لیے اسے کچھ نہ کہنا پڑا، گوکہ ہر لمحہ اسے صدیوں جیسے لگ رہا تھا۔  
”یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ یہ کیسی بے چینی، کیسا اضطراب ہے کسی پل، کسی لمحے مجھے سکون نہیں مل رہا ہے، میں نے ہر لمحہ ہر ساعت اس سے چھپنے کی، اس سے دور رہنے کی کوشش کی مگر سب بے سود ثابت ہوئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے، حورین کی طرف میرا اتنا جھکاؤ کیوں ہو گیا ہے؟ میں جو اس کی طرف ایک نظر دیکھنے کا روادار نہ تھا، اب نظریں صرف اور صرف اس کے دید کی منتظر ہیں۔“

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

یہ کیا ہے؟

”شاید تم اسے پسند کرنے لگے ہو۔“ اس کے اندر ایک سرگوشی ابھری، وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ قلب کی اس شرارت نے اسے مزید مضطرب کر دیا۔

”پسندیدگی کا دوسرا نام محبت ہے، کیا تم اس سے محبت کرنے لگے ہو؟“

”محبت؟ کیسی محبت؟ میں محبت کر سکتا ہوں۔“ وہ خود پر ہنسا۔

”محبت تو وہ لوگ کرتے ہیں جو محبت کی آغوش میں پردان چڑھتے ہیں جن کا لمحہ چاہت کے ساگر میں ڈوب کر گزرتا ہے۔ محبت کی چاشنی جن کی زبان کو طاعت آمیز بنا دیتی ہے۔ محبت وہ لوگ کرتے ہیں جو محبت پاتے ہیں۔ مجھ جیسا حراماں نصیب شخص جو محرومیوں و جدائی کی انگلی پکڑ کر چلا ہوں، وہ بھلا ایسے نازک اور انوکھے جذبوں کو کیسے کشید کر سکتا ہے۔ میرا دل مردہ ہے، ایک پتھر ہے اور پتھروں میں کسی پھول نہیں کھلتے۔“ وہ اپنے اندر کی بدلتی ہوئی کیفیت سے تیرا آزماتا تھا جو اس کے تمام دلائل سے منحرف تھے۔

”پھر کیا ہے یہ سب..... کیوں اتنے بے گل و پریشان ہوں، اگر وہ نہیں ملتی ہے تو نہ ملے، تم کیوں بے چین و منتظر ہو رہے ہو، وہ اپنی مرضی سے آئی تھی۔“

اس کا دل بھی کسی چالاک وکیل سے کم نہ تھا۔

”وہ ہمارے ساتھ آئی تھی، ہمارے ذمے داری ہے۔“

”تم مجھے بنا رہے ہو یا اپنے آپ کو اقرار کیوں نہیں کر لیتے محبت کا؟“

”اوہ شٹ آپ، نہیں کرتا میں کسی سے محبت، عزت ہے مجھے اس لفظ سے۔“

ابھی نہ معلوم کب تک یہ بحث کا سلسلہ چلا، افضل صاحب کے آنے سے خاموشی چھا گئی۔ وہ اس تکرار سے ٹھہرا کر سا ہو گیا۔

”لڑکی مل گئی ہے۔“ وہ بڑے جوش انداز میں گویا ہوئے۔

”تھینک گاڈ! کہاں ہے وہ؟“ گو یاویرا نے میں چپکے سے بہار آگئی تھی۔

بچھے چراغ کو یک دم ہی نئی روشنی مل گئی۔ اس کے چہرے پر طمانیت کی سرخی دوڑنے لگی۔ گرے آنکھوں میں زندگی مسکرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

حورین نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک پتنگ پر لینا پایا، کچھ دیر تک وہ غنودگی کی کیفیت میں یوں ہی لیٹی رہی پھر رفتہ رفتہ شعور بیدار ہوا تو وہ حادثا سے یاد آنے لگا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ خوف زدہ لگا ہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کئی اینٹوں سے بنا دوہ کرہ اتنا چھوٹا تھا کہ فقط ایک پتنگ وہاں موجود تھا جس پر وہ دراز تھی، سامنے چوکھٹ پر دروازہ موجود تھا، وہاں سے کچا آگن اور آگن کی زمین پر گھومتی مرغیاں اور چوڑے نظر آرہے تھے۔ وہ جھجکتی ہوئی مزید آگے بڑھی اور چوکھٹ سے جمائیک کر دیکھا تو سامنے چوہے پر ایک عورت روٹیاں پکا رہی تھی، وہاں پر تین لڑکیاں بھی تھیں، ایک جھاڑو دے رہی تھی، دوسری میلے کپڑے جمع کر رہی تھی اور تیسری ایک طرف چھٹی چٹائی پر بیٹھی فریم میں کپڑا لگانے کڑھائی میں مصروف تھی۔ قریب اس کے رنگین دھاگوں کے کپچھے تھے اور شیشے کے کلاڑے بھی تھے جو دھوپ سے چمک رہے تھے۔ پہلی نظر اس لڑکی کی ہی اس پر پڑی تھی، وہ کپڑا اور سوئی وہیں چھوڑ کر پھرتی سے اس کی طرف آئی۔

اس کی آنکھوں میں سرست انگیز تجسس تھا، اسے بڑھتے دیکھ کر وہ دونوں لڑکیاں بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے گرد آگئیں۔

”آپ کو ہوش آ گیا یا جی؟“ جھاڑو دینے والی لڑکی نے دریافت کیا۔

”مجھے یہاں کون لایا؟“ ان عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی ہمت بندھی۔ وہ لڑکیاں اسے بہت بے ضرر اور ملن ساری لگیں، جبکہ روٹی پکاتی ہوئی عورت کے چہرے پر سختی و بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر اسے دیکھنا گوارا نہ کیا۔ ماں کی نسبت وہ تینوں بیٹیاں خاصی خوش اخلاق و مہمان نواز تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ ان سے گھل مل گئی تھیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ لڑکیاں لکڑیاں چننے لگی تھیں، وہیں ایک جگہ سے بے ہوش پڑی نظر آئی اور وہ کسی نہ کسی طرح اسے وہاں سے لے آئی تھیں، کیونکہ ریت پر گرنے کے باعث وہ خطرناک چٹوٹوں سے بچ گئی مگر چاک کرنے کے باعث پورے جسم کا جوڑ جوڑ بہت شدت سے درد کر رہا تھا۔

”تکلیو! اسے ناشتہ بھی کراؤ گی یا یا تم ہی بگھارتی رہو گی۔ سارا کام یوں ہی پڑا ہے اور سورج سر پر چڑھ آیا ہے۔“

اس عورت نے بیٹیوں کو گھورتے ہوئے کہا تو وہ تینوں اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔ ایک لڑکی کی ہمراہی میں وہ داش روم تک گئی۔ ناشتے میں بیسن کی موٹی روٹی جس پر مکھن کا استعمال کثرت سے کیا گیا تھا، ساتھ چار اور لسی کا بڑا گلاس دیکھ کر اس کی طبیعت حلا کر رہ گئی۔ اس نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ کھانے کے لیے لڑکیاں خاصا اصرار کرنے لگیں پھر ماں کی خفیہ آواز سن کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔

اس کا ذہن بُری طرح ماؤف ہو رہا تھا جو کچھ ہوا تھا وہ ہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسی آزمائش میں گرفتار ہوں گے۔ وہ تہانہ معلوم کہاں اور کن لوگوں میں آ پہنچی تھی اور یہاں سے نکلنے کی کیا تدبیر ہو سکتی تھی۔ نہ معلوم ان لوگوں کا کیا ہوا۔ سوالات ذہن میں جنم لے رہے تھے مگر وہ جواب کس سے مانگتی۔ عجیب اداسی بھری فضا تھی یہاں کی دشتوں کو آ جا کر کروینے والی۔ وہ خود کو ایک خول میں بند محسوس کر رہی تھی۔

کیا ہوا تھا اور کیا ہونے والا تھا؟

وہ اپنوں سے دور ان اجنبی لوگوں اور اجنبی جگہ پر پھنس گئی تھی۔ اس کے دل کو ایک لمحہ سکون نہ تھا۔ وہ خود کو ہواؤں میں معلق محسوس کر رہی تھی۔ بے بسی و بے کسی کے شدید ترین احساس سے مظلوم ہو کر وہ بے تماشہ رونے لگی۔ گھر سے اور اپنوں سے دوری کا احساس اسے کندھ چھری سے ذبح کرنے لگا۔ پاپا، ماما، بی بی جان، ہریرہ کئی چہرے تھے جو اسے یاد آ رہے تھے، بڑا پارہے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا ان سے چھترے جیسے سالوں گزر گئے ہوں۔ کوئی جادو کی چھتری گھمائے اور پلک جھپکتے ہی وہ ان کے درمیان پہنچ جائے، پھر کبھی خواب میں بھی وہ اپنوں سے دور نہ ہو۔

شدید وحشتیں رقصاں تھیں اس کے اندر۔ دور روئے جاری تھی۔ اسے اپنے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس عورت نے پھر ان لڑکیوں کو کمرے میں نہیں آنے دیا۔ کچھ دیر پہلے وہ لڑکیاں میلے کپڑوں کی گھنٹریاں لے کر نہر پر دھونے چلی گئی تھیں۔ وہ عورت مرغیوں کو روٹی توڑ کر ڈال رہی تھی۔ حورین سے مخاطب ہونے کی اس نے کوشش نہیں کی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی کچھ مردانہ آوازیں گونجیں۔ بھاری جوتوں کی آواز اس طرف آتے ہوئے محسوس کر کے وہ خوف سے کانپ اٹھی۔ آنے والا آکر چوکت کے فریم میں ایسا تادہ ہو گیا۔ وہ خوف و دہشت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے ساختہ اس کی نظر اٹھی اور اٹھی رہ گئی۔ دوسرے لمحے وہ بے تماشہ بھاگ کر اس کی طرف بڑھی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر روئی۔



ایک عجیب..... بالکل انجانا فیر شٹا سا احساس اس کے اندر سرایت کر رہا تھا۔ حورین کو دیکھ کر جو تشکر و طمانیت کے جذبات ابھرے تھے ان پر اس کی بے ساختہ جذباتیت نے اجنبی رنگ پھیلا دیے تھے اور وہ اس کے اس انداز پر گم صم کھڑا رہ گیا تھا۔ بے آواز روتی ہوئی حورین کو تسلی یا اپنا تیت کا ایک لفظ نہ کہہ سکا تھا۔ وہ اس کے دائیں بازو کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیے رو رہی تھی اس کے انداز میں سادگی و پچکانہ پن تھا۔ اس خطرناک حادثے نے یہ بھلا دیا تھا کہ وہ کس کے شانے پر سر رکھے رو رہی ہے جس شخص کی پرچھائیں سے وہ بھاگتی تھی، اس وقت اسی کی چھائیں بنی بازو سے لپٹی آنسو بہا رہی تھی۔

حیات کا یہ پہلا لمحہ تھا جو کوئی صنف مخالف میں سے اس سے قریب آیا تھا اور نہ اس نے جو قاصط اپنے اور دوسروں کے درمیان ایک عمر سے رکھے تھے ان قاصطوں کو عبور کرنے کی کسی میں بھی ہمت نہ تھی خصوصاً صنف مخالف میں تو اس کی ماں بھی اس کے ریز روڈ موڈ کے باعث ایک لمٹ میں رہتی تھیں۔ اس نے کسی کو بھی فریبک نہ کیا تھا۔ وہ اپنے دکھوں و غموں کو سینے اپنے خول میں بند رہنے والا شخص تھا۔ حورین کئی لمحوں تک اس کے بازو پر چہرہ رکھے روئی رہی۔

خوب آنسو بہانے کے بعد دل کو تسکین ملی، جو صلے تر دتازہ ہوئے تو وہ از خود ہی اس کے بازو سے غلیبہ ہو گئی۔ بازو اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی گویا وہ ہوش و خرد کی دنیا میں لوٹا تھا۔ رگ و پے پر چھائے نامانوس احساس کے سحر سے آزاد ہوا تو اس نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

بیگا چہرہ، بکھرے بال، حنجر رنگت، چینی کی ڈال کی مانند نازک سراپا بھی بھی ہو لے ہو لے کانپ رہا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی گویا ڈوبنے کو آخری لمحے کا سہارا مل گیا ہو اور وہ ساحل پر آنے کے بعد بھی امید و ہم میں مبتلا ہو۔

”فیک اٹ اپ۔“ حورین کو اس طرح روتے دیکھ کر وہ آہستگی سے گویا ہوا مگر اس کے آنسو اتار سے بہتے رہے تھے۔

”ریٹیکس..... ہم یہاں سے بہت جلد روانہ ہو جائیں گے۔“

اس کے سوسو کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”بس۔ چپ ہو جاؤ، مت روؤ۔“

”میں..... رو نہیں رہی۔“

”پھر یہ کیا ہیں؟“

”یہ..... خوشی کے آنسو ہیں۔“

”خوشی کے آنسو؟“ اس تمام صورت حال میں وہ پہلی بار بھر پورا انداز میں مسکرا کر ذوق معنی لہجے میں گویا ہوا۔

”میں نے صرف ”مینڈکی“ کے آنسو کے متعلق سنا تھا۔“

”آپ نہیں جان سکیں گے، میرے دل کی کیفیت۔“

اس وقت وہ حقیقتاً بے حد خوش تھی جو اس کی شرارت برداشت کر گئی تھی وہ اس کے ہمراہ اس چھوٹے کمرے میں آگئی تھی۔

”جب میں نے خود کو ان اجنبی لوگوں کے درمیان دیکھا تو نہ معلوم کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اب کبھی بھی اپنے لوگوں میں

واپس نہ جا پاؤں گی اور..... اور اس خیال نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔“

چند لمبے قبل رکنے والے آنسو پھر جاری ہو گئے تھے۔

”اوکے، پلیز اب رومت، میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہم شام سے پہلے یہاں سے نکل جائیں۔“ اس کے لہجے میں ملامت تھی۔

”ہم ہیں کہاں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟“

”یہاں کسی کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں میں باہر انتظام کرنے جا رہا ہوں۔“ وہ دانستہ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے

کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈیوڈھی میں محمد افضل نفل سے اس کے منتظر تھے۔ حسب عادت ان کی بیوی ذلیخانہ اپنی بد مزاجی کے تمام تیران

پر آزمائے وہ ان بن بلائے مہمانوں کی میزبانی کرنے کو قطعی تیار نہ تھی۔ افضل جتنے ملنسار، خوش اخلاق و مہمان نواز تھے ان کی بیوی اتنی آدم

بیزار، بداخلاق و تیز طرار تھی۔

انفل نے بیوی منت سماجت کے بعد اسے آواز دہی رکھنے پر مجبور کیا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے پاس بھکاری کی ذرا بھی آواز نہ آئی تھی

اور وہ یہی سوچ کر شرمندہ تھے کہ اگر مہمان ان کی بیوی کو جو اس بن لیں تو کتنی سکی ہو۔

☆.....☆.....☆

”دادو! میں اس لیے منع کر رہی تھی۔“

حضرتی کے چہرے پر ناپسندیدگی واضطرب پھیلا ہوا تھا۔

”اس میں کیا قباحت ہے بیٹی! کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ زندگی تمہیں گزارنی اسی کے ساتھ ہے۔ اچھا ہے شادی سے قبل

مہران کے بارے میں اچھی طرح جان لو ان کی پسند و ناپسند، عادت و مزاج کے مطابق بعد میں پریشانی نہیں ہوگی۔“ راحیلہ بیگم نے از خود اس کی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”دادو! آپ کہہ رہی ہیں؟“ وہ حیرانگی سے کہتی ہوئی بیٹھی۔

”ہاں۔ میں کہہ رہی ہوں۔“

”سب جان کر بھی؟“

”ہاں۔ سب جان کر بھی، اس میں برا کیا ہے میرے بچے عقل مندی کا قاضہ یہی ہے کہ وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلا جائے پھر

بہیں تم پر بھی اعتماد ہے اور مہران پر بھی اس لیے اجازت دیتے ہیں باہر نکلنے کی۔“

”اوہ نودادو! میں انور ڈیپس کر سکتی ایسی میٹنگز۔“

”پھر وہی بات..... تمہارا مستقبل اس سے وابستہ ہونے والا ہے، بہتر یہی ہوگا کہ دل کی بھلا کر حقیقت کو اپنا ڈھانچا ہی میں بھلائی ہے۔“

راحیلہ بیگم دیکھ رہی تھی کہ مہران علوی کی دلچسپی جس قدر اس کی جانب بڑھ رہی تھی وہ اس قدر ہی اس سے اکڑی اکڑی ویزار

دکھائی دینے لگی، حالانکہ انہوں نے دیکھا تھا کہ کونین نے خود کو بہت بہادری سے سنبھال لیا تھا۔ کل رات ڈنر پر مہران علوی سے ملاقات

کے وقت وہ خود پر کھل قابو پائے ہوئے بہت اچھی طرح ان سے ملتا تھا اور وہ ماں بیٹے اس کی خوش اخلاقی و سلجھے ہوئے مزاج کے گرویدہ ہو

گئے تھے۔ وہ جو مسلسل اسے نظروں میں رکھے ہوئے تھی، اس کی دلیری و دسخت قلبی پر عیش کر اٹھی اور تب سے تہیہ کر چکی تھی کہ وہ حضرتی

کو بھی حقیقت ماننے پر مجبور کرے گی۔ اس کا موقع بھی انہیں جلد مل گیا کیونکہ مہران علوی نے حضرتی کو ڈنر پر مدعو کیا تھا جو ایک ہوٹل میں تھا

اور حسب عادت وہ زہری طرح چڑھ رہی تھی کیونکہ خود انہوں نے مہران علوی سے ہامی بھری تھی اور اب مجبوراً اسے اس کے ساتھ جانا تھا۔

”چلو! شو جا کر تیار ہو، مہران آنے والے ہیں، وہ ٹائم کے کس قدر پابند ہیں، یہ تم بھی بخوبی جانتی ہو اور اچھی طرح سے تیار ہونا،

ایسے ہی سر جھاڑ اور منہ جھاڑ اٹھ کر تھک چل دینا۔“ ان کے لہجے میں تہیہ تھی۔

”میری بچھ میں نہیں آ رہا دادو! آج کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“

”نشرح! بہن کو تیار ہونے میں مددو۔“ وہ اندر آنے والی نشرح سے مخاطب ہوئی تھیں۔ حضرتی نے حیران و پریشان انداز میں

ان کی طرف دیکھا تو وہ قصداً اس سے نظریں چرا کر صبح پڑھنے میں مجھیں۔

☆.....☆.....☆



تھیں جب کبھی ملیں فرمیں، میرے دل سے بوجھ اتار دو  
 بہت دنوں سے اداس ہوں، مجھے کوئی شام ادھار دو  
 مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں میرے خدو خال  
 مجھے اپنے رنگ سے رنگ دو، میرے سارے رنگ اتار دو  
 کسی اور کو میرے حال سے نہ غرض ہے، نہ کوئی واسطہ  
 میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو، میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو  
 میری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے جدائیوں کے عذاب نے  
 میرے دل پر ہاتھ رکھو ذرا، میری دھڑکنوں کو قرار دو  
 تمہیں صبح کیسی لگی، میری خواہشوں کے دریا کی  
 جو بھلی لگی تو تھیں رہو، اسے چاہتوں سے نکھار دو

ڈانٹنگ ہال کی فضا میں مدھم مدھم سرگوشیاں گردش کر رہی تھیں۔ وہ اس کے مقابل سیاہ جار جٹ کے سوٹ میں ملیں بیٹھی تھی۔ اس کی چاندنی جیسی رنگت دکھ رہی تھی شرٹ اور دوپٹے پر سیاہ اور سرخ موتیوں کا کام کا تھا اور اس پر بیچنگ کی جیولری تھی اور ریڈ ہی لپ اسٹیک نے ہونٹوں پر سج کر پورے چہرے کو روشن کر ڈالا تھا۔ مہران علوی کی محبت پاش لگا ہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ سرخ گلابوں کا بو کے اس کے شوریدہ جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ ساتھ موجود کارڈ پر جلی حروف میں لکھی گئی وہ غزل اس کے جذبوں کا عکس تھی مگر سے پک کرنے، یہاں ہوگی میں آنے اور ڈنر کرنے تک وہ کئی بار اس سے محبت کا اظہار کر چکا تھا اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں عام عاشقوں کی طرح عامیہ گراؤ نہ تھی بلکہ اس کے انداز میں حکمت تھی۔ وہ دل سے اس پر فریفتہ تھا مگر بات جب ایک طرف محبت کی ہو تو پھر جو باہو گرم جوشی و یگانگت نہیں ملتی۔ خضرنی نے اس کے جذبات و احساسات کو دل سے محسوس نہ کیا تھا سوا سے اس کا اظہار محبت جھنجھلاہٹ و اکساہٹ میں مبتلا کر دیا کرتا تھا ہر چند کہ وہ دل پر جبر کرتی اور اپنے احساسات اس شخص کے ساتھ ہی منسوب کرنا چاہتی تھی جو اس کی تقدیر تھا مگر ہر بار دل کسی پنچھی کی طرح ہاتھوں سے نکلے جاتا تھا۔

”آپ بے حد کیوٹ ہیں، بہت دلکش لگتی ہیں، سوچا بھی نہ تھا کہ آپ جیسی حسین و باحیالڑکی میری شریک حیات بنے گی۔“

ڈنر کے بعد کافی پیتے ہوئے وہ آہستگی سے قدرے جھک کر گویا ہوا۔

مارے گھبراہٹ کے اس کے ہاتھوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

”مما کہتی ہیں خضرنی بہت دور دور رہتی ہے ریز روڈ۔ پراڈ ڈی۔ میں نے کہا تھا آپ کو سمجھنے میں لٹھی ہوئی ہے۔ خضرنی ازویری

ٹائس۔ بس وہ شرماتی ہے اور یہی کو اپنی مجھے زیادہ پسند ہے۔“

”آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“

”تعریف کرنا شرمندگی تو نہیں ہوتی۔“

”مجھے محسوس ہوتی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ایز پوٹش، میں ٹرائی کروں گا کہ کبھی وہ کام نہ کروں جس سے آپ کو شرمندگی ہو۔“ وہ فوراً ہی سعادت مند بچے کی طرح گویا ہوا تو بے ساختہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ درآئی۔

”ٹھیکس گاڈا آپ مسکرائی تو..... آپ کو معلوم ہے آپ کی مسکراہٹ کتنی خوب صورت ہے۔ جب آپ مسکراتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے خزاؤں میں بہا آگئی ہو۔“ وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا اور وہ اسے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ لگا ہے انہی کی انہی رو گئی تھیں دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔

سیاہ ڈنسٹ لمبوس اپنی دلکش پرسنالٹی کے ساتھ کھڑا وہ کچھ غیر ملکیوں سے الوداعی مصافحہ کر رہا تھا۔ اس کا پرسکون انداز گواہ تھا کہ وہ اس کی یہاں موجودگی سے بے خبر ہے۔

”اوہ..... یہ تو کونین ہیں آپ کے کزن، اکل ہی تو ان سے ملاقات ہوئی ہے بہت ٹائرس پرسن ہیں۔ ان سے مل کر بہت مسرت ہوئی تھی۔“

اس کی نگاہوں کے تعاقب میں مہران کی نگاہ بھی اس جانب انہی تھی۔ کونین کو دیکھ کر وہ متاثر کن لہجے میں بولا۔

”چلیں۔“ وہ بھرا کپ کافی کا ٹیبل پر رکھ کر گویا ہوئی۔

”کونین سے قول لیں۔“

”نہیں چلیں۔“ یکھت اس کے چہرے سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ چہرے کی رنگت زرد ہو گئی۔

”آر یور انٹ؟“ وہ اس کی بدلتی کیفیت دیکھ کر پریشانی سے بولا۔

”جی۔ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ سخت سراہستگی کا شکار تھی۔

”مجھے نہیں لگ رہا ہے۔“

”ابھی ابھی سر میں درد محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ مہران ویٹر کو مل پے کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر کچھ لمبے قبل

جو مسرت و انہماک کے رنگ جھلکار ہے تھے ان کی جگہ اب فکر و تردد نے لے لی تھی۔ پل بھر میں خستہ کو اس نے مرجھاتے دیکھا۔ وہ ڈعا

کر رہی تھی کونین کی نگاہ اس پر نہ پڑے لیکن ایسی دعائیں مستجاب کب ہوئی ہیں جو اس لمبے ہو جاتیں۔ اسی لمبے وہ بھی آگے بڑھا جب وہ

کھڑی ہوئی تھی دونوں کی نگاہیں بے ساختہ ٹکرائیں۔ وقت کی رفتار یک دم تھم سی گئی۔

دو دل ایک ہی انداز میں دھڑکنے لگے۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک جیسا ہی درد تھا۔

خضرئی نے لگا ہی جھکالی تھیں کہ مبادا جھلک نہ پڑیں۔ ایسے ہی وقت سے وہ ڈرتی تھی اور دعا مانگتی تھی کہ کبھی بھی مہران کی مہراہی میں کوئین سے سامنا نہ ہو۔ وہ کس طرح خود کو سنبھال پائے گی؟ آج وہ ہو گیا تھا جس کے نہ ہونے کی دعا وہ مانگتی رہی تھی اور وہ خود کو کسی مجرم کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ لپ اسٹک سے سرخ ہونٹوں کو اس نے دانتوں سے کاٹ کر حقیقت میں سرخ کر لیا تھا۔ کوئین ان کی ٹھیل کی طرف چلا آیا۔ مہران بڑی گرم جوشی سے ملا۔

”اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ یہاں پر ہیں تو ساتھ ہی ڈنر کرتے۔“

”جھینکس، بزنس ڈیپلیکیشن کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ ان سے فارغ ہو کر جانے ہی والا تھا کہ آپ لوگوں پر نظر پڑ گئی۔“

کوئین پوری طرح خود پر قابو پا چکا تھا۔ خضرئی خود پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی۔ اس کا سر بری طرح چکرانے لگا۔ کوئین سے رسماً ہیلو ہائے بھی زیر لب کی تھی۔

”ایک کپ کافی پئے بغیر ہم آپ کو جانے کی اجازت بھی نہ دیتے اگر چاہتا تھا اس وقت خضرئی کی طبیعت نا ساز نہ ہو گئی ہوتی۔“

”کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ خضرئی بے مشکل خود کو سنبھالنے لگی تھی۔

”معمولی ساسر میں درد ہے۔“

”لیکن تمہارے چہرے سے بہت زیادہ تکلیف ظاہر ہو رہی ہے۔“

”چہرے جھوٹ بولتے ہیں ان پر اعتبار مت کیا کریں۔“

وہ آہستگی سے کہہ بیٹھی

”گھر جا کر کوئی اچھی میڈیسن لے لو جو فوری ریٹیکس دے۔“

ان دونوں کی گفتگو کے دوران مہران علوی خاموش کھڑا تھا۔

”آپ پریشان مت ہوں، درد ابھی خود ٹھیک ہو جائے گا۔ خضرئی کے لہجے میں خواہ مخواہ سرد مہری در آئی تھی۔

”اوکے۔ میں اجازت چاہوگا۔“ وہ مہران سے مصافحہ کر کے لہجے ڈگ بھرتا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

”آپ کو ان سے اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ آپ کی بہتری کے لیے کہہ رہے تھے۔“ داخلی دروازے سے باہر

نکلنے ہوئے وہ خضرئی سے مخاطب ہوا۔

”میں نے ایسا کچھ غلط تو نہیں کہا۔“ کوئین کے جاتے ہی اس کی خود اعتمادی بحال ہونے لگی تھی۔ اسے خود بھی احساس تھا اپنے

تاروا انداز کا جو اشتعال اس کے رویے میں از خود ہی آیا تھا اور کیوں آیا تھا؟ اس سے وہ خود بھی بے خبر تھی۔ البتہ اندر دو کسی گوشے میں دم جمم ہونے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

”آج یہ چندال چو کڑی سر جوڑے بیٹھی ہے، کس کی کبختی آنے والی ہے۔ کس کے مقدروں نے دعا کرنے کی ٹھانی ہے؟“ بی بی جان نے ان کو سر جوڑے بیٹھے دیکھا تو بلند آواز میں کہنے لگیں۔

”بی بی جان! ہم آپ کو ایسے سازشی و شر پسند نظر آتے ہیں؟“  
”رؤف کسی صورت بنا کر بولا۔

”اس سے بھی بڑھ کر فتنہ و فساد تو تمہارے اندر برپا رہتا ہے۔“  
”آپ کی قسم ہم نے شرارتیں کرنی چھوڑ دی ہیں۔“

”اے خیردار! جو جوئی قسمیں کھائیں، خوب جانتی ہوں تم لوگوں کو، یہ بتاؤ میرا سر جوڑے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟“  
”یہ واضح اپنی منگنی کی پلاننگ کر رہا تھا۔“

”مڈرنے فوراً ہی بھاڑا پھوڑا، واضح بولکلا گیا۔“

”اچھا، میں بھی تو سنوں، کیا پلاننگ ہے؟“ وہ ناک پر ہنسل آنے والی ٹیکنگ کو آنکھوں پر لگا کر وحی کو گھورتے ہوئے پوچھنے لگیں۔  
”یہ یوں ہی بگواس کر رہا ہے۔“ وحی کی بولکلا ہٹ دیدی تھی۔

”خاموش رہو، میں اس کی بگواس سننا چاہتی ہوں، ہاں بتاؤ کیا کہہ رہا تھا۔“ وہ مڈرن کو گھور کر بولیں تو وہ فوراً شروع ہو گیا۔

”وحی کی خواہش ہے کہ ہماری ہونے والی بھائی کا منگنی کا سوٹ کم از کم پچاس ہزار سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ جیولری کی شاپنگ دہنی سے کرنے کا ارادہ ہے جس میں خاص طور پر ایک سیٹ ڈائمنڈ کا ہے۔“

”بی بی جان! پلیز، آپ مانڈمٹ کیجئے گا، میں تو ایسے ہی بات کر رہا تھا۔ کرنا تو سب آپ کو ہی ہے۔“ وحی نری طرح بولکلا یا ہوا تھا۔

”جس گھر میں بڑے موجود ہوں، اس گھر میں چھوٹوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتی ہیں۔ ہم خواہ منگنی کا سوٹ پچاس ہزار کا بنوائیں یا پچاس روپے کا۔ ہیروں کے زیور بنوائیں یا ہینٹل کے، یہ ہمارے کرنے کا کام ہے، تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔“

”جی جی، میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔“

وحی کزنز سے مذاق کر کے ہی پھنس گیا تھا۔

”میں پہلے ہی کہہ رہی تھی، شیطانی ٹولہ سر جوڑے بیٹھا ہے، یقیناً کسی کی نری گھڑی آنے والی ہے۔ یہ معلوم نہ تھا اپنے ہی گھر میں نقب لگانے کی سوچی جا رہی ہے۔“

بی بی جان کے غصے سے سرخ چہرے پر ذرا بھی نری نہ تھی۔ وہ مذاق میں بھی ایسی باتیں برداشت کرنے کی قائل نہ تھیں۔

☆.....☆.....☆

ذوالنون کے جانے کے بعد وہ واپس اسی کمرے میں آگئی تھی، اس کی آمد سے قبل جس خوف و وحشت کا وہ شکار تھی اس سے اسے نجات مل گئی تھی۔ وہ خود کو بادل کے کسی شفاف ٹکڑے کی طرح ہلکا پھلکا و آزاد محسوس کر رہی تھی۔ طمانیت کے احساس سے وہ سرشار تھی۔ اس کی وہی کیفیت تھی جو سیاہ گپ اندھیرے سے روشنی میں آنے پر ہوتی ہے۔ وہ سوچوں میں گم تھی۔ معاہدہ برصغیر میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی پھر مراد نے چیلوں کی آواز پر اس نے جھانک کر دیکھا۔ ذوالنون کے ہمراہ جو شخص آیا تھا، وہی تھا۔ ہاتھ میں گوشت کا شاہ پر پکڑے وہ آگے بڑھ گیا اور اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

”زیلخا یہ مرغ ہے، بہترین طریقے سے پکانا مہمانوں کے لیے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، تمہارے اماں، ابا اور نئے میں خزانے چھوڑ گئے ہیں جو تم دل کھول کر لانا۔“ زیلخا کی فیسے بھری آواز گونجی۔

”کچھ تو شرم و حیا کرو زیلخا، مہمان گھر میں ہیں۔“

”گھر میرا ہے، مجھے کسی کی بھی پروا نہیں ہے جس کو چاہتا ہے پکڑ کر لے آتا ہے مہمان بنانے کے لیے۔ گھر میں جو تین بیٹیاں بیٹھی ہیں ان کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ان کے بھی ہاتھ پیلے کرنے ہیں کہ نہیں؟ تو اگر اسی طرح حاتم طائی، ہمارا ہاتھ بیٹیاں یوں ہی بیٹھی رہیں گی۔“

”تجھے ہر وقت یہی فکر رہتی ہے، اُنھہ جائیں گی ذولیاں ان کی بھی۔“

”خالی ہاتھ جنازے بھی نہیں اُٹھتے، ذولیاں کہاں اُٹھے گی۔“

”دل چھوٹا نہ کر جلی عورت! مہمان رحمت ہوتے ہیں رحمت۔“

اسی دم تینوں لڑکیاں آگئی تھیں۔

”ماں! پھر ابا سے لڑ رہی ہے۔“ بڑی لڑکی نے کہا۔

”میں لڑتی ہوں یا یہ لڑتا ہے۔“

”ابا کو لڑنا نہیں آتا، پہل تمہاری طرف سے ہی ہوتی ہے۔“

”ابھی یہ زبان پکڑ کر گدی سے کھینچ لوں گی، آئی بڑی باپ کی حمایتی، چل بسن بیاز کاٹ کر دے، ویسے تو مینوں گھر میں گوشت نہیں پکنا مہمانوں کے آتے ہی نہ معلوم کہاں سے تیرے باپ کے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی آجاتی ہے۔“ زیلخا کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ محمد افضل وہاں سے جا چکے تھے۔ وہ تینوں لڑکیاں شرمندہ چور نکالوں سے اس طرف دیکھ رہی تھیں جہاں حورین دم سادھے بیٹھی تھی۔ باہر ہونے والی بکرا اس نے سنی تھی اور دم بخورہ گئی تھی۔ اس کے لیے یہ سب بہت حیرت انگیز اور نیا تھا۔

اس نے اپنے ماں باپ کو ہمیشہ ایک دوسرے سے محبت کرتے دیکھا تھا۔ بے تحاشا دولت کی فراوانی نے کبھی کسی کے لیے ایسا مسئلہ پیدا نہ ہونے دیا تھا کہ کوئی ایسا منظر اس کی نگاہوں سے گزرتا۔ کراچی میں بی بی جان کے ہاں بھی اسے ایسا کوئی ماحول نہیں ملا تھا جو ایسے حالات دیکھتی۔ محمد افضل بہت نیک دل و ظلم آدی تھا۔ اس کے گھر کے حالات بے حد دگرگوں تھے۔ تین جوان بیٹیاں اور تیزی سے

بڑھتے ہوئے مسائل نے جہاں اس کی کردوہری کی تھی وہاں اس کی بیوی کی خوش مزاجی، خوش اخلاقی بھی سلب کر لی تھی۔ محدود مسائل و لامحدود مسائل نے اسے چڑچڑاپن عطا کیا تھا۔ وہ آدم بے زار بھی ہو چکی تھی۔

گھن میں ایک بار پھر کھانا پکانے کے برتن کھڑکڑانے لگے تھے، ساتھ زلیخا کی زبان پھر رفتار پکڑ چکی تھی۔ اس بار نشانہ بیٹیاں تھیں جو نہر پر پکڑے دھونے کے دوران اس کی اوزھنی گم کر آئی تھیں۔

دو پہاڑ ڈھل رہی تھی۔ صبح سے دو پہاڑ۔ ان چند گھنٹوں میں وہ بھوک و افلاس، غربت و تنگ دستی کے مہبوم سے بخوبی آشنا ہو چکی تھی۔ اس گھر کے کینوں کی پہلی و آخری پریشانی غربت تھی۔ غربت کسی خون آشام آسب کی طرح ان کا قطرہ قطرہ چوس رہی تھی اور وہ چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کر پارہے تھے۔ اسے ان لوگوں سے بہت ہمدردی ہو گئی تھی۔ زلیخا کی بد مزاجی پر بھی اسے طیش نہیں آ رہا تھا۔ وہ حالات سے شکست کھائی عورت تھی۔

بھنا ہوا گوشت اور تندور کی موٹی موٹی روٹیاں ٹرے میں لے کر بڑی لڑکی آئی تھی۔ بہت محبت و اصرار سے اسے کھانے پر مجبور کرتی تھی، وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ کھا سکی تھی۔

”آپ کو ماں کی باتیں بری لگی ہیں، محاف کر دیں۔“ اس کا انداز بے چارگی لیے ہوئے تھا۔ حورین نے فوراً ہی اس کے بندھے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنائیت سے کہا۔

”اوہ لو، ایسی کوئی بات نہیں ہے، مجھے برا نہیں لگا۔“

”ماں کو حالات نے ایسا کر دیا ہے، باپ بہت قرض ہے جس کا اتارنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے ہیں، ورنہ وہ دل کی بہت اچھی ہے۔“

”پلیز میں اس وقت بالکل بھوک محسوس نہیں کر رہی ہوں، تمہارے کہنے سے کافی کھا چکی ہوں۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر کچھ شرما کر بولی۔

”ہاں، پوچھو۔“

”وہ..... ابا کے ساتھ جو نو جوان ہیں، وہ کون ہیں آپ کے؟“

اس کے سوال پر وہ کچھ پریشان ہی گئی، بھلا کیا رشتہ تھا اس شخص سے اس کا؟ کیا لگتا تھا وہ اس کا؟ شاید کل تک کچھ نہیں..... مگر آج

وہ اس کے لیے خضر راہ کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ مایوسی و خوف کے اندھیرے میں اُمید و حیات کے جگنو کی مانند تھا وہ۔

”کوئی خاص رشتہ ہے جو بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔“

وہ اس کی خاموشی کو دوسرے معنی پہناتی شوخی سے گویا ہوئی تھی۔

”مگتیر ہیں آپ کے واہ جی! جوڑی تو زبردست ہے آپ کی۔“

”اوائے نہیں، تم غلط سمجھی ہو۔“ وہ تیزی سے بولی اور اسی دم باہر سے آنے والی زلیخا کی کراہی آواز پر وہ جلدی سے برتن سمیٹ کر

باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی جیسے اسے حورین کی بات پر یقین نہ آیا ہو، حورین اس کی غلط فہمی پر الگ بکا بکا تھی۔ ہل ہل بدلے موڑ والے اس شخص کے متعلق وہ کبھی اس انداز میں نہیں سوچ سکتی تھی۔ وقتی طور پر مدد لینا دوسری بات تھی۔ شام ڈھلنے کے بعد وہ آ گیا۔

”میں سارا دن انتظار کرتی رہی، سر آفتاب سے کنٹیکٹ ہوا؟“

”سراور حیدر دونوں کے پلٹس لگی ہیں وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

”وہ ٹھیک تو ہیں نا؟ کوئی سیریس بات تو نہیں ہے؟“ پریشانی و گھر مندی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

”اوپر وونٹ میں وقت لگے گا لیکن وہ خطرے سے باہر ہیں۔“

”ہم یہاں سے کب چلیں گے، مجھے یہاں وحشت محسوس ہو رہی ہے، میں یہاں اب ایک لمحہ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتی۔“

”ہوں، چلیں، میں نے کار کا انتظام کر لیا ہے۔ جانے سے قبل اپنے میزبان کی میزبانی کا کچھ حق ادا کرنا چاہتا ہوں، یہ رقم وہاں

رکھ دو، محمد افضل صاحب بہت غیور و خوددار ہیں اور ضرورت مند بھی۔ وہ کسی طرح یہ رقم نہیں لیں گے، خاموشی سے رقم رکھنے کا مقصد یہی ہے کہ ان کو خبر ہونے تک ہم بہت دور نکل گئے ہوں گے۔“

اس نے جیکٹ کی جیب سے ہنز فونوں کی گڈی نکال کر اسے دی اور اس نے خاموشی سے وہ بجلی کے نیچے رکھ دی۔ محمد افضل تنہوں

بیٹیوں کے ہمراہ اسے سڑک تک چھوڑنے آئے تھے۔ پیچھے پیچھے چھینچتی ہوئی زلیخا بھی تھی، اسے معلوم ہوتا کہ مہمان اسنے کم نام کے لیے آئے ہیں تو وہ کبھی بھی ایسا برتاؤ نہ کرتی مگر جو وہ کر چکی تھی، بدل نہیں سکتا تھا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔

افق کے کناروں پر گہری شفق چھائی ہوئی تھی۔ ماحول میں سرسئی اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھنے لگا تھا۔ ہوائیں خوشگوار خنک

سموئے ہوئے تھیں۔ سڑک کے دونوں اطراف کھیت لہلہا رہے تھے۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی کھڑکی کے شیشے سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔

ذوالنون بہت احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہا تھا، اس کے وجہ چہرے پر اس وقت از حد سنجیدگی تھی۔ سارا دن اس نے محمد افضل اور

ان کے کچھ قریبی ساتھیوں کی مدد سے حیدر اور اس کے گھر والوں کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں اور اسے معلوم ہوا تھا، کل رات عمر

درازنے اپنے چیلوں کے ساتھ مل کر حیدر کی حویلی پر قبضہ کر لیا۔ تمام دولت و جائیداد چھین کر اس کے ماں باپ کو بھی کہیں قید کر دیا ہے۔

حیدر نہ معلوم کس طرح سر آفتاب کو لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ کراچی جا کر اس نے ایک دوست کے توسط سے پولیس سے

مدد لے لی تھی۔ معاملات ان کی توقع سے بڑھ کر گھمبیر ہو گئے تھے۔ وہ جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہتا تھا۔

”مما، پپانے کالز کی ہوں گی اور کوئی رسپانس نہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے ہوں گے۔ میرا سیل فون بیگ میں تھا۔ وہ نہ معلوم کہاں

گر گیا ہے۔“ اسے ایک دم ہی خیال آیا تو گھر مندی سے اس سے مخاطب ہوئی۔ جواباً اس نے جیب سے اپنا فون نکال کر اس کی جانب

بڑھایا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے سیل لے لیا، پھر چونک کر گویا ہوئی۔

”میں کس طرح بات کروں؟“

”جس طرح بات کرتے ہیں۔“

”مگر مجھے چاہیے کہ آواز سنتے ہی رونا آجائے گا اور وہ پریشان ہو جائیں گے۔“ اس کی آواز بجھنے لگی۔

اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کی طرف ایک نظر ڈالی۔

سرخ عارضوں پر سیاہ دروازہ پلکیں لرزاں تھیں۔ آنسو ضبط کرنے کی سعی میں وہ گلابی ہونٹ دانتوں سے گھائل کرتی دل کے کسی

گوشے میں براجمان ہو گئی تھی۔ چند سیکنڈ تک وہ اسے ترجمی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

”نہ معلوم لیڈیز آنسوؤں کے خزانے کہاں رو پش رکھتی ہیں۔ ذرا کوئی بات ہوئی نہیں اور وہاں بن بادل برسات شروع ہو جاتی

ہے۔“ وہ مسکرا کر تسخرانہ لہجے میں بولا۔

”آپ کیا سمجھیں گے عورت اور اس کے احساسات کو۔ آپ نے صرف عورت سے نفرت کرنا سیکھا ہے۔ اس کا مستحکم اڑانا،

اسلٹ کرنا آتا ہے آپ کو، آپ عورت سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں، بتا سکتے ہیں؟“ اس کی تسخر بھری مسکراہٹ اسے جلا گئی تھی۔

”عورت کتنی فراڈی و کتنی ڈرامہ باز ہوتی ہے، اچھی طرح جانتا ہوں۔“

وہ بھی یلغخت پٹری سے اتر گیا۔

”مرد سے بڑھ کر فراڈی و ڈرامہ باز ہرگز نہیں ہو سکتی۔“

”یہ الزام ہے، سراسر جھوٹ ہے، کبھی تم؟“

”سمجھنے کی ضرورت آپ کو ہے، مجھے نہیں۔“

”پلیز..... میں اس وقت کسی فالو کو اس کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

اس کا موڈ نری طرح بگڑ چکا تھا۔

”سچائی کا سامنا نہ کرنا کی آپ کی عادت ہے۔“

”شٹ آپ۔“ وہ بری طرح دھاڑا۔

”آپ کو بات کرنے کی تمیز نہیں ہے، کیسے مسلمان ہیں آپ جو عورت کی عزت کرنا نہیں جانتے۔“

وہ بے ساختہ رو پڑی اور آنسوؤں نے اسے احساس دلایا کہ خواہ مخواہ ہی بات کہاں سے کہاں جا پہنچی، اگر حالات نے اسے سر

بھری لڑکی کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا تو اسے بھی اس کے ساتھ اچھا دردم برتاؤ رکھنا چاہیے تھا۔ کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوا۔

”آئی ایم سوری۔ پلیز..... خاموش ہو جاؤ۔“ وہ بدستور روتی رہی۔

”میرا ارادہ آپ کی دل آزاری کا ہرگز نہ تھا..... نہ معلوم مجھے غصہ کیوں آ گیا، پلیز..... میں کوشش کروں گا، اب ایسی کوئی بات



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

نہ ہو جو آپ کو ڈکھی کر دے۔"

اس نے کارروک کر حورین سے معذرت کی۔ اس کے شرمندہ انداز میں خجالت و سچائی تھی، بو جھل آواز میں کوئی احساس تھا۔  
 "آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔ میں ساری رات اسی طرح بیٹھا رہوں گا، کار نہیں چلاؤں گا۔" اس کے انداز میں قلعیت تھی، وہ روتے روتے خاموش ہو گئی، آنسوؤں سے بھیکے چہرے سے ہاتھ ہٹالیے۔  
 "کار چلائیں، مائند میرا تکمیل رہا ہے۔" اس نے دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے کار اسٹارٹ کر دی۔  
 کار میں خاموشی چھا گئی۔  
 دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

☆.....☆.....☆

برہان لغاری جس جوش و ولولے سے انٹیشن میں کھڑے ہوئے تھے، اس سے بھی بڑھ کر وہ ٹکست کا شکار ہوئے تھے، جن مہربانوں نے انہیں اس میدان میں کھڑا کیا تھا، وہ ٹکست کے بعد پینہ دکھا چکے تھے۔ ان کے پاس بیرون ملک فرار کے علاوہ کوئی حل نہ تھا، سو وہ اسی رات پہلی فلائٹ سے چلے گئے تھے اور کہاں گئے تھے اس سے گمراہی لگی لاپم تھی۔ ان کی ٹکست سے منال خاصی افسردہ ہوئی تھیں، جبکہ فائقہ مطمئن تھیں اور منال کو بھی سمجھا رہی تھیں کہ جو ہوا، اچھا ہوا۔

"مما! آپ کیوں اس قدر ایزی لیل کر رہی ہیں، راضی تو میں بھی نہیں تھی، پاپا کو روکنا تو میں بھی چاہتی تھی مگر اب جب کہ وہ ٹکست کھا گئے ہیں تو مجھے بے حد رنج ہو رہا ہے۔"

"برہان لوڈ کریکٹر ہیں، ایسے لوگ عمر کے کسی بھی حصے میں اپنی ہابیز نہیں چھوڑتے اور کسی منشر کی کرسی پر بیٹھ کر وہ کیا کچھ نہ کرتے۔ یہاں تو میں ان کی ہر حرکت پر نظر رکھتی ہوں، وہاں یہ ممکن نہ تھا۔" وہ ایزی چیئر پر جمولتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"یہ مرد عورت کا رشتہ بھی کیا ہوتا ہے، کوئی قریب رہ کر بھی ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر ہوتے ہیں، پھر جو دور ہیں ان کا کہنا ہی کیا۔"

"یہ کن فضول سوچوں میں الجھ گئی، مسز مہرین کے ہاں پارٹی میں جانا ہے، گیٹ نوٹید رہے حور ہے گا۔"

"آج کل کوئی پارٹی انٹینڈ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا، جہاں جاؤ پینا ہی کا نا پک چلتا ہے۔ لوگ ہمدردی کے نشوونما میں طفرہ تھیک کے پھر لیٹ کر مارتے ہیں۔ لوگ کتنے کہنے ہوتے ہیں، دوسروں کی خوشیوں پر جلتے ہیں اور ڈکھوں پر خوش ہوتے ہیں، میرا سوڈ نہیں ہے۔"

وہ کسلندی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

"ڈیز! ہم لوگوں سے جس قدر منہ چھپائیں گے، لوگ اس قدر ہی ہماری ٹوہ میں رہیں گے، باتیں بنائیں گے، پھر ہم کب تک چھپ سکتے ہیں۔"

"کم از کم جب تک لوگ....."

”پھر وہی بات..... ہمیں کسی کی پروا نہیں ہے۔ میری طرح اسٹراٹگ۔ جو، مائی سوئیٹ ہارٹ! میں نے زندگی میں کیسے کیسے حالات دیکھے ہیں، کیسے کیسے مصائب سے دوچار ہوئی ہوں، برہان کو کھو کر پایا ہے۔ میری جگہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو سرخڑ کر دیتی، وقت کی ڈھول میں رُل جاتی مگر میں کامیاب رہی اور پہلے سے زیادہ اسٹراٹگ ہو گئی۔ کیا کچھ نہیں ہے میرے پاس، بلا شرکت غیرے ہر شے پر میری حکمرانی ہے۔ برہان بھی میری مرضی کے بنا کوئی فیصلہ نہیں کرتے“۔ ان کے انداز میں کسی ملکہ کی مانند مطمئن و شادمانہ پن تھا۔ مثال ان کو رشک آمیز لگا ہوں سے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو مائی ڈیر؟“

”مما! آپ نے ابھی کہا تھا..... آپ نے برہان کو کھو کر پایا ہے..... کیا میں اُسے پھر سے نہیں پاسکتی؟ کھویا تو میں نے بھی اُسے ہے۔“ اس کے ذہن کی اسکرین پر وہ خوب صورت چہرہ پوری طرح نمودار ہوا۔ دھجھے لہجے میں نارسائی کا ڈکھ تھا۔ فائنڈ چیئر سے اٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں۔

”نہیں“۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”نہیں..... کیوں ممما!“ وہ بے قراری سے بولی۔

”تالی دونوں ہاتھوں سے بھتی ہے، ایک ہاتھ سے کبھی نہیں۔ اسی طرح جب تک دونوں طرف محبت میں صداقت نہیں ہوگی، دونوں ایک دوسرے سے کہنا نہیں چاہیں گے تو ملن کس طرح ممکن ہے۔ برہان اور میں پھر ایک ہوئے تو ہم نے چاہا تو ایک ہوئے اور تمہارے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ تم سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو جس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔“

”میرادل کہتا ہے وہ میری طرف لوٹنے کا ضرور واپس آئے گا۔“ اس کے لہجے میں یقین تھا۔ فائنڈ بیگم نے زبردستی اسے پارٹی میں لے جانے کے لیے تیار کروایا اور خود بھی تیار ہو کر ڈرائیو کے ہمراہ روانہ ہو گئیں۔ فائنڈ بیگم اس کا دل بہلانے کے لیے دلچسپ گفتگو کر رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے خیالات کو توجہ سے سن رہی تھی اور ساتھ ساتھ خود بھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی جا رہی تھی۔ سنا اس کی نگاہ دوسرے روڈ پر موجود کار پر پڑی اور انہیں محسوس ہوا جیسے ان کا تصور حقیقت بن گیا ہو، اسی لمحے سٹپل آف ہو گیا اور تمام گاڑیاں رُک گئیں۔

اس نے بہت تیزی سے پلکیں جھپکائی تھی۔ دوسرے لمحے اسے یقین ہو گیا، وہ تصور نہیں حقیقت تھا، کیونکہ اس کے ساتھ جو وجود برابرا تھا وہ اس سے اس قدر نظر کرتی تھی کہ کبھی خواب میں بھی اسے دیکھنا گوارا نہ تھا۔ اس ہنستے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر اس کے وجود میں گویا کانٹے اُگ آئے تھے، شعلے دکھ اُٹھے تھے۔

”مما! کیا آپ بھی وہی دیکھ رہی ہیں جو میں دیکھ رہی ہوں؟“ فائنڈ بیگم بھی بے حد حیرت سے ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ پر پل ساڑھی میں وہ کرن ہی تھی اور اس کے برابر میں ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھائیں۔ ان کی آنکھوں کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ گزرتے وقت نے گویا کرن پر کوئی اثر نہ چھوڑا تھا۔ وہ آج بھی کل کی طرح خوب صورت اور اسارت تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر خوشحال و کامیاب

زندگی گزارنے کی طمانیت و بٹاشت تھی جس نے اس کی زندگی کو سرتوں سے ہمکنار کیا تھا، اس کی شخصیت کو بھی وقار حکمت عطا کی تھی جو اسے سب میں ممتاز بناتی تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں کی شرور بارنگ ہیں ان پر موجود تھیں، جن سے وہ بے خبر تھے۔ منال کے اندر تو آتش فشاں پھٹنے لگا۔ اس کی نگاہیں کرن کے مسکراتے چہرے سے ہوتی ہوئی اس کے بازو پر ٹھہر گئیں جو اس نے کرن کے شانے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اس سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا جس پر کرن کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر رہی تھی۔ اس کے اندر آگ ہی آگ پھیلنے لگی تھی۔

”یہ لوگ کراچی میں ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔“

ناقذہ حیرانگی سے گویا ہوئی تھیں۔ اسی لمحے سگنل آن ہوا تو انہوں نے ڈرائیور کو ان کی کار کا پچھا کرنے کو کہا مگر جب تک ڈرائیور گاڑی ٹرن کر کے اس روڈ پر گیا، انس کی کار وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ منال غم و غصے سے ڈرائیور کو مفصلات سے نواذنے لگی۔

☆.....☆.....☆

کار تیزی سے رواں دواں تھی۔

رات کے سائے پھیل چکے تھے، ارد گرد بکھرے کھیت کھلیاں تاریکی کی چادر اوڑھ کر نہ اسرا دلگ رہے تھے۔ انہیں سفر کرتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ معمولی سی ہونے والی جھڑپ کے بعد ان کے درمیان خاموشی حاکی ہو گئی تھی۔

کار ڈرائیور کرتے وقت اس کی نگاہیں تیزی سے ارد گرد جائزہ لے رہی تھیں جہاں تقریباً تمام جگہیں ایک جیسی ہی آ رہی تھیں۔ اندھیرے میں نظر آتے کھیتوں و میدانوں کے درمیان کہیں کہیں کچی آبادیاں بھی آ رہی تھیں جہاں ہلکی ہلکی زور روشنی میں نہائے اکاؤکا بلب سے کسی آبادی کا پتہ چلتا تھا جو بہت کم رقبے پر مشتمل ہوتی تھی۔

اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر ست ہو گئے تھے۔ کشادہ پیشانی پر ٹنگنوں کا جال سا بھرا آیا تھا۔ اس نے کار روک دی تھی۔

”کیا ہو؟“ حورین نے چونک کر پوچھا۔

”یہ راستہ غلط ہے۔“

”وہاٹ؟“ اس کے حلق سے چیخ نما آواز برآمد ہوئی۔

”آہستہ کان میرے ذوقی ہیں۔“ اس کے جینے پر وہ بولا۔

”اب کیا ہوگا، اس ویرانے میں کوئی سیلپ کرنے والا بھی نہیں ہوگا، کیسے گھر جائیں گے؟“ وہ بری طرح گھبرائی۔

”ریلیکس، میں دیکھتا ہوں، شاید کوئی گاؤں مل جائے۔“ وہ نرم روی سے مخاطب ہوا۔

”اگر نہیں ملتا تو..... پھر کیا ہوگا؟“

”جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“ اس نے گہری سانس لے کر کار اشارت کر دی تھی اور اس سڑک پر موڑ لی۔ جہاں سے خاصے قاصدے

پر کچھ گھنٹوں کی مانند چلتی ہوئی روشنیاں آبادی کا پتہ دے رہی تھیں۔

”یہ سب اس کالی زبان والے ہریرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔“ وہ بلند آواز میں بڑبڑائی تھی۔

ذوالنون کے اندر اس نام سے عجیب سا احساس جاگا تھا۔ کڑوا سیلا دھواں اپنے ارد گرد پھیلتا ہوا اس نے محسوس کیا۔

”کہہ رہا تھا، مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو، میں تم بن کیسے رہوں گا۔ میں نے کہا تم جیسے بھی رہو مگر میں بہت خوش رہوں گی۔“

گھبراہٹ و پریشانی کی زد میں وہ تیز آواز میں خود سے ہم کلام تھی اور وہ نہ جانے کے باوجود اس کی باتیں سن رہا تھا۔

”کہنے لگا ممکن ہی نہیں ہے میرے بغیر تم کہیں خوش رہ سکو، دیکھنا کتنا خوار ہوگی، بچھتاؤ گی۔ میرے بنا اور یہی ہوا جو وہ کہتا ہے،

وہ ہو جاتا ہے۔“ ذوالنون بالکل خاموش رہا تھا، اس کی خاموشی محسوس کر کے وہ بھی چپ ہو گئی تھی۔ ایک بوجھل سکوت ان کے درمیان تھا۔

کل رات پوری فیاضی سے چاندنی نچھاور کرنے والا چاند آج سیاہ بدلیوں میں زرو پوش تھا۔ اسی سبب زمین و آسمان پر تاریکیوں کی مہیب

چادرتی نظر آ رہی تھی۔

بہستی کے قریب جا کر اس نے کارروک دی۔ وہ کوئی چھوٹا بازار تھا جس کی ڈکانیں بند تھیں، البتہ بند دکانوں کے آگے کہیں کہیں

بلب روشن تھے جنہوں نے دور سے اسے راستہ دکھایا تھا۔

”یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا، راستہ کس سے معلوم کریں گے؟“

”عام طور پر گاؤں میں لوگ جلد سونے اور جلد بیدار ہونے کے عادی ہوتے ہیں، بارہ بج چکے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نصف

رات گزر رہی ہے پھر بھی باہر نکل کر دیکھتا ہوں، کوئی نہ کوئی شاید مل ہی جائے۔“ وہ اسے وہیں بیٹھے رہنے کا کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ اس نے

باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا ہی تھا کہ ایک آدمی کو اپنے طرف آتے دیکھ کر وہ چونکا ہو گیا۔ اس آدمی نے قریب آ کر سلام کیا، ہاتھ ملایا۔

”میں مسجد کی چھت سے کھڑا بہت دیر سے آپ کی گاڑی کو آتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ یہ خبر میں نے میاں صاحب کو بھی دی تھی، وہ کہنے

لگے ہمارے یہاں ایسا کوئی نہیں ہے جس کے مہمان گاڑی میں آئیں، یہ کوئی اجنبی ہیں جو راستہ بھٹک کر ادھر آ رہے ہیں، آپ کو لینے کے

لیے ہی انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ آئیں اب میرے ساتھ چلیں، ہمشیرہ کو بھی لے لیں۔“

آنے والا شخص تقریباً اس کا ہم عمر تھا۔ وائٹ شلوار سوٹ میں طہوں سر پر ٹوپی جمائے وہ احترام بھری نگاہوں سے اس کی طرف

دیکھ رہا تھا۔

”تو ٹھیکس، بہت مہربانی آپ کی اور آپ کے میاں صاحب کی۔ مجھے آپ کراچی جانے والا راستہ بتادیں اگر لیٹ نہیں ہو رہا

ہوتا تو ضرور آپ کے میاں صاحب سے شرف ملاقات حاصل کرتا۔“

”ارے..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ..... تو بہ تو بایسے مت کہیں، میاں صاحب سے تو گھڑی بھر ملاقات کے لیے لوگ دو دو

سے آتے ہیں۔“

وہ شخص متغیر رنگت سے گویا ہوا۔

”آپ دیکھ رہے ہیں، میرے ساتھ خاتون ہیں، ان کی وجہ سے میں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا ہوں، تاکہ کوئی پرہیز نہ ہو۔“  
 ”خاتون کی وجہ سے ہی آپ کا اس وقت سترہ خطر ہے۔“  
 ”میں مطلب نہیں سمجھا آپ کا۔“

”آپ سمجھ بھی رہے ہیں اور نہیں بھی۔ ان علاقوں میں شریک لوگوں کے ٹھکانے ہیں جو اکثر لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں اور صاحب حیثیت لوگوں کو اغوا کر کے تاون وصول کرتے ہیں۔ رات کے وقت ان راستوں سے خاتون کے ساتھ گزرنا ذرا بھی دانش مندی نہیں ہے۔“  
 وہ لوگ کار کے قریب کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ آواز حورین کی ساتھیوں تک بھی پہنچ رہی تھی، وہ گم سمی ہو گئی تھی۔  
 ڈالٹون کو اس کی باتوں میں صداقت محسوس ہو رہی تھی۔ ان تمام حالات سے وہ واقف تھا۔ اس وجہ سے وہ بنا ز کے فاسٹ ڈرائیونگ کرتا رہا تاہم قدرت کو کچھ اور منظور تھا جو وہ ہلک گیا تھا۔ اسے اپنی فکر نہ تھی لیکن حورین کے خیال سے اس نے یہاں رات نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حورین کو بتایا تو وہ خاموش رہی۔

”آئندہ اپنے کزن کی ”سیاہ زبان“ سے بچنے کا۔“ اس کی آواز میں نہ معلوم کیا تھا، وہ دیکھتی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

ہونٹ میں کونین سے ملاقات ہونا اور وہ بھی مہران علوی کی موجودگی میں، اس کے لیے بہت شدید صدمے کا باعث بنا تھا۔ اس نے اس ملاقات کا اتنا شدید ڈپریشن لیا تھا کہ اگر بروقت اسے ٹریٹمنٹ نہ ملتی تو وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو جاتی۔ ساری رات وہ دواؤں کے زیر اثر سوئی رہی تھی، پھر دن چڑھے بیدار ہوئی تو سب کو اپنے قریب دیکھ کر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”فحشری! ایک بات بالکل صحیح بتائیں۔“ وہ ناشتے سے فارغ ہوئی تو صنوبر بیگم سنجیدگی سے مخاطب ہوئیں، سب جا چکے تھے۔  
 ”مہران علوی کو آپ پسند نہیں کرتیں؟“

”یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہیں آپ؟“ اس کی آواز جسی تھی۔

”میں محسوس کر رہی ہوں، آپ خوش نہیں ہیں، آپ بالکل بدل گئی ہیں۔ خاموش، تنہائی پسند بلکہ بیزار رہنے لگی ہیں۔ مہران سے رشتہ ہونے سے قبل ایسا کچھ نہیں تھا۔ آپ بہت خوش و خرم رہتی تھیں۔“

صنوبر بیگم اس کی گرتی ہوئی صحت و بدلتی ہوئی طبیعت کے لیے از حد فکر مند تھیں، انہوں نے یہی انداز لگا لیا کہ مہران علوی سے نسبت طے ہونے کے بعد اس میں یہ سب تبدیلیاں آئی ہیں۔

”ایسا کچھ نہیں ہے مہی! مہران اچھے ہیں۔“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”پھر آپ آپ ہیٹ کیوں رہنے لگی ہو؟“

”شاید ہسپتال کا کام بہت سخت ہو گیا ہے۔“

”ہاں، اس طرف بھی میرا دھیان گیا تھا، پھر یہی بات ہو سکتی ہے، میں صدمہ سے کہوں گی، ہسپتال میں کسی اور لیڈی ڈاکٹر کو پابندت کریں۔ اب آپ ہسپتال جوائن نہیں کریں گی۔“ وہ قطعیت بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔ حضرتی اس اقدام پر یو کھلا کر بولی۔

”میں نے گھر میں بیٹھنے کے لیے کوالیفیکیشن حاصل نہیں کی ہے، مجھے کام کرنا ہے، لوگوں کو میری ضرورت ہے۔“

”نی الحال تو آپ آرام کرو، صمد اور ہنزہ نے چند روز کے لیے آپ کو مکمل بیڈ ریست کرنے کی تلقین کی ہے۔“

صنوبر چلی گئیں تو وہ کمرے میں تہوار ہو گئی۔ تنہائی میسر آتے ہی پھر وہ مناظر ڈھن کی اسکرین پر چلنے لگے۔

ان ڈارک براؤن حزن آمیز نگاہوں سے اسے مہران کے ہمراہ دیکھ کر کیسا درد کیسی تڑپ جاگی تھی۔ محرومی و بے بسی اس کی نگاہوں سے عیاں تھی۔

”کتنا اچھا ہوتا کونین اگر آنتی کبھی تمہیں یہاں آنے کی اجازت نہ دیتیں۔ نہ تم یہاں آتے، نہ یہ ادھوری کہانی شروع ہوتی۔ تم اپنی دنیا میں گمن رہتے تو میں بھی دل کی تمام سچائیوں کے ساتھ مہران علوی کو قبول کر لیتی۔ میری زندگی اس طرح ایک پرل نہ بنتی۔“

”وہ سوچوں میں گم تھی۔ معذور و ذہناک کر کے اریہ اندر آئی تھی۔“

”آپنی! کونین بھائی آئے ہیں آپ کی عیادت کو۔“

”انہیں کس نے خبر کی؟“ غیر ارادی طور پر اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”یقیناً تم نے۔ تمہارے پیٹ میں کوئی بات نہیں رہتی، کسی کوچھینک بھی آجائے تو اعلان کرتی پھرتی ہو اور میں کون سا مردی تھی جو تم نے انہیں خبر کر دی۔“ اریہ حیرانگی سے نرم مزاج و خاموش طبع بہن کو وہیلی بارفیسے سے گرجے برستے دیکھ رہی تھی۔

”آئی ایم سوری آپ! میں نے انہیں کال نہیں کی۔“ وہ خوف زدہ سی بولی۔

”پھر الہام ہوا ہے انہیں؟“

”انہوں نے رات کو ہی فون کیا تھا آپ کی طبیعت معلوم کرنے کے لیے۔ کہہ رہے تھے آپ سے اور مہران علوی سے ہوٹل میں ملاقات ہوئی تھی، وہیں انہیں معلوم ہوا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات سے اب تک وہ کئی کالز کر چکے ہیں، آپ کے جاگنے کا سن کر ملنے آئے ہیں۔“

اس کے گلے موڈ کے پیش نظر وہ ایک سانس میں کہتی چلی گئی۔

”جا کر کہہ دو ان سے، میں سوری ہوں۔“

”لیکن آپ تو جاگ رہی ہیں۔“ بہن کا رویا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”تم سے جو کہا ہے وہ کرو، دادو کے پاس لے جاؤ انہیں۔“

”دادو، بھابی کے ساتھ گئی ہیں اور می بھی ابھی شاپنگ کو گئی ہیں۔“

”سب کو ابھی جانا تھا، خود جا کر بیٹھ جاؤ ان کے پاس۔“

قل اس کے کہ کوئی اور بات ہوتی، بھاری قدموں کی چاب پن کراس نے جلدی سے آگئیں بند کر لیں تھی، آنے والا کو نہیں ہی تھا۔  
”ارے! میں جا رہا ہوں۔“ وہ کہہ کرڑ کانٹیں، تیزی سے چلا گیا تھا۔ وہ گولوکی کیفیت میں کھڑی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

منال کی حالت دیوانوں کی مانند ہو گئی تھی، جب سے انہوں نے انس کو اس روڈ پر گزرتے دیکھا تھا۔ وہ خود کو سنبھال نہیں پاری تھیں۔ کل سے اب تک کئی چکر وہ اس روڈ کے لگا چکی تھیں۔ اس امید پر کہ شاید وہ یہاں سے پھر گزرے، گئی گھنٹے اس انتظار میں وہ کھڑی بھی رہی تھیں مگر اس کو نہ آتا اور نہ وہ آیا اور ان کے اندر گویا دھشتوں کا جنگل اُگ آیا۔ بھوک پیاس اُڑ گئی۔ نیند نے فرار حاصل کیا۔ قاتلہ نے بڑی ہمت و حوصلے سے انہیں سنبھالا تھا، ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ خود کو ہی نقصان پہنچا لیتی۔ کرن کا مطمئن خوش و خرم چہرہ، آسودہ مسکراہٹ اور ان کے شانوں پر دکھائیں کا ہاتھ انہیں پل پل کسی تیز دھار چھری کی طرح گھائل کر رہا تھا۔

وہ بن جل کی مچھلی کی مانند تڑپ رہی تھی۔ خواب انہوں نے دیکھے تھے اور تعبیر کرن کے حصے میں آئی تھی جو پہلو اس کی رفاقت کے لیے تھا وہ کرن کا حصار بن گیا تھا۔

”میں ماروں گی تمہیں کرن، زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم نے مجھ سے میری خوشیاں چھینی ہیں، میں تم سے تمہاری زندگی چھین لوں گی، اتنا تڑپاؤں گی، اتنا سکاؤں گی کہ مرنے کے بعد بھی تمہیں لہ بھر سکون نہ مل پائے گا۔“ وہ جھیلی پر نکا مار کر عزم لہجے میں بولیں۔  
”پاگل مت بنو منال! سنبھالو خود کو، اس شخص کے پیچھے تم نے اپنی پوری زندگی برباد کر ڈالی ہے اب تو بھول جاؤ اسے۔“  
قاتلہ بیگم اسے جھنجھوتے ہوئے فہمائشی لہجے میں گویا ہوئیں۔

”کل تک میں اس کی محبت میں بے سدھ تھی ماما، مگر میری نگاہوں نے جو منظر کل دیکھا، اس کی رنگین مسرتوں بھری زندگی کا لمحہ میری آنکھوں میں سمٹ آیا ہے، جس کی خاطر میں نے اپنی ہر خوشی تیاگ دی، اس کٹھور شخص کو میری خوشیاں تو کیا تم کی بھی پروا نہیں ہے۔ ایسے بے حس و بے وفا شخص کے لیے میں نے روگ پالا، نفرت ہو رہی ہے مجھے اپنی اس بے وقوفی پر۔“

ان کے لفظوں میں نفرتوں کا زہر گھلا ہوا تھا۔

”میری محبتیں بے انتہا تھیں تو نظر میں لاسدو وہوں گی۔ ان دونوں سے میں ایسا انتقام لوں گی کہ ساری زندگی بھول نہیں پائیں گے۔“ اس کے حسین چہرے پر بڑے بھیاک عزائم تھے۔

”میری محبت اسے نہ ڈھونڈے گی مگر میری نفرت انہیں بہت جلدی ڈھونڈ لے گی، یہ میرا دل کہتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

پختہ و نیم پختہ مکانوں کے صحنوں میں وحشی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ گلیوں میں کتے گھومتے پھر رہے تھے، ہر نو پھیلی خاموشی میں



کتوں کے بھونکنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس نوجوان کی ہمراہی میں اس نے کار اس جگہ لاکر روک دی جو مکانوں سے قاصطے پر تھی۔ ایک خاصا کشادہ میدان تھا جس کے ایک طرف کھیتوں کا سلسلہ تھا اور سامنے مسجد تھی جو شاید کسی پہاڑی کوکٹ کر تعمیر کی گئی تھی جس کی بنا پر وہ کافی بلندی پر واقع تھی۔ سرخ آبنٹوں سے بنی اس مسجد کے بزم گنبد و میناروں سے نور برس رہا تھا۔ کئی میڑھیاں عبور کر کے وہ مسجد کے گنن میں پہنچے تھے اور وہاں سے دائیں طرف ایک چوڑی راہ داری سے گزر کر ایک بڑے کمرے کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہونے سے قبل وہ نوجوان گویا ہوا۔

”یہ بابا صاحب کی آرام گاہ ہے۔ جوتے ہاہری اُتار کر اندر آ جائیں۔“ مؤدب انداز میں وہ لڑکا ذوالنون سے مخاطب ہوا۔ اندر کہیں لوہان سلگ رہا تھا۔ لوہان کی خوشبو میں لپٹی گلاب موتیا کی مہکار نے ماحول کو بے تقدس روپ بخشا تھا۔ بڑی روح پرور فضا تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی ذوالنون کے پیچھے چل رہی تھی، اندر سفید براق چاندنی چھٹی ہوئی تھی، سفید ہی رنگ کے گاؤں کیے جا بجا رکھے ہوئے تھے، وہاں بھی بلب روشن تھا مگر باہر جو وحشت و ویرانی وہ دیکھتی ہوئی آئی تھی، وہ اس جگہ مفقود تھی بلکہ یہاں بے حد آسودگی، بروقتی اور روح کو نہ سکون کر دینے والی فضا تھی۔

”آپ لوگ بیٹھیں، بابا صاحب تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہو کر ابھی کچھ دیر میں آتے ہی ہوں گے، بلکہ آپ لوگ ہاتھ منہ دھولیں۔ یہ کمرے سے ملحقہ ہاتھ روم ہے۔“ وہ شخص مخاطب ہوا تھا۔

”آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ ذوالنون کو اس کی سادگی و شفیق انداز بہت بھایا تھا۔

”مجھے حارث کہتے ہیں، بی اے کی ڈگری یافتہ ہوں۔“ اس نے بھی مسکراتے ہوئے تعارف کرایا تھا۔

”یہاں کیا کرتے ہو؟“

”بابا صاحب کی خدمت کرنے سے بڑھ کر سعادت کیا ہو سکتی ہے۔“ اس کے لہجے کے ساتھ آنکھوں میں بھی والہانہ عقیدت اُبھر آئی تھی۔

”کون ہیں یہ بابا صاحب؟“ اس سحرارے سے وہ اُلجھ گیا تھا۔

”بہت بڑی، بہت اونچی ہستی ہیں بابا صاحب۔ یہ پورا گاؤں ہی نہیں، ارد گرد کے تمام گاؤں اور شہروں سے لوگ ان سے ملنے اور دعائیں کرانے آتے ہیں۔ بہت اثر ہے ان کی دعاؤں میں۔ اللہ بہت جلدی سنتا ہے ان کی۔ کوئی ضرورت مند خالی نہیں جاتا یہاں سے۔ اتنے نئی دور یاد دل ہیں بابا صاحب۔ وہ بابا صاحب کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ گاؤں کے لوگ تعلیم کی روشنی میں کتنے بھی بہرور ہو جائیں، ان کی سادہ لوح طبیعت اس بھری فقیری و باباؤں کے سحر سے نکل نہیں سکتی۔ اس بڑے آشوب و بے قریب نفسی کے سنگین دور میں کون وئی کامل ہے جو لوگوں کی پریشانیوں و حاجتوں کے لیے دستِ دعا دراز کرے گا۔ ایسے لوگ اس دور میں نایاب ہو گئے ہیں جو دوسروں کی پریشانی و تکالیف کو اپنی کچھ کر اپنی راحتوں اور مسرتوں کو فیروں کے لیے وقف کر دیں۔ اب تو جملی و جموٹے ہیرو بابا گاؤں

دشوروں میں بکھرے پڑے ہیں اور اپنی جھینٹیں بھرتے ہیں۔ حادثہ سے اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ کمرے سے بلحقہ ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا تو وہاں سے چلا گیا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر آیا تو حورین کو بھی اس نے بھیج دیا۔ حورین ہاتھ منہ دھو کر آئی تو وہ گاؤں کے سہارے نیم دراز تھا، آنکھیں بند کیے ہوئے کسی سوچ میں گم۔ وہ دوپٹے سے چہرہ صاف کرتی ہوئی ایک طرف دیوار کے سہارے بیٹھ گئی، اس کے چہرے پر بے حد ادا سی تھی۔

”بھوک لگ رہی ہے؟“ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے گویا ہوا۔

”نہیں۔“ اس نے جھوٹ کہا۔ صبح سے اب تک وہ تقریباً بھوک ہی رہی تھی۔ زلیخا کی جلی کئی باتیں اور خود اس کی اچاٹ طبیعت نے بھوک کا احساس نہ ہونے دیا مگر اب بھوک بڑی شدت سے لگ رہی تھی۔

”لیکن تمہاری آواز بتا رہی ہے، تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اس کی طرف گھوما تھا، اپنی گرم لٹا ہیں اس کے چہرے پر ڈالنا مسکراتے لہجے میں گویا ہوا۔

”اگر میں کہوں ہاں پھر اس وقت کھانا کہاں سے آئے گا؟ بازار تو سارے بند پڑے ہیں۔“ وہ ٹکا ہیں جھکا کر یولی۔

”حادثہ کہتا ہے، بابا صاحب جو ہمارے میزبان ہیں، وہ بہت اونچی ہستی ہیں، ایسی کچھٹی ہوئی ہستی نے ہماری بھوک مٹانے کا انتظام بھی کیا ہوگا۔“ اس کی آواز میں استہزاء تھا، اسی لمحے دروازہ کھلا، بڑی سی ٹرے میں حادثہ کھانے کی ڈشیں اور پراٹھے رکھ کر لایا تھا۔ ساتھ پانی کا جگ اور گلاس بھی تھے۔ ذوالنون اٹھ بیٹھا۔ حادثہ نے ٹرے ایک طرف رکھ کر پہلے دسترخوان بچھایا پھر بالترتیب اس پر ٹینڈے گوشت کی ڈش، اٹھے، پراٹھے اور جگ گلاس رکھ کر گویا ہوا۔

”وقت زیادہ ہونے کی وجہ سے یہی دستياب ہو سکا ہے۔“

”بے حد شکر یہ، بلکہ معذرت کہ بے وقت تکلیف دی ہے آپ کو۔“

حورین دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی کہ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرنے والا اکثر مزاج شخص کس قدر خوش اخلاقی سے پیش آ رہا تھا، جیسے خسرو بد مزاجی اسے چھو کر نہ گزری ہو۔

”معذرت کر کے آپ شرمندہ کر رہے ہیں، یہ بابا صاحب کا اصول ہے کہ کوئی بھی مہمان بنا خاطر تواضع نہ جائے۔ مہمانوں کی بڑی عزت کرتے ہیں بابا صاحب۔ گاؤں والوں کا ہر مہمان بابا صاحب کا مہمان ہوتا ہے، پھر آپ تو خالص بابا صاحب کے مہمان ہوئے کہ سیدھے نہیں آئے ہیں۔“

”ہیں کہاں بابا صاحب؟ کب تک ملاقات ہوگی؟“ اس کے انداز میں مروجیت نہیں، اشتیاق کی نغمی سی کرن تھی۔

”آپ کھانا تناول فرمائیں، بابا صاحب آتے ہی ہوں گے۔“ وہ انہیں کھانے کی تلقین کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے؟“

”میں کھا چکا ہوں، آپ کھائیں۔“ وہ کہہ کر چلا گیا۔

”ذنیابیں ابھی اچھے لوگ موجود ہیں۔“ حورین نے پلیٹ میں اس کے لیے سالن نکالتے ہوئے کہا۔

”جو کھانا کھلاتے ہیں۔“ اس نے لقمہ لیتے ہوئے شوٹی سے کہا۔

”آپ بلاوجہ لوگوں پر طنز کرنا کب چھوڑیں گے؟“ اس کے انداز پر وہ بری طرح تپ گئی تھی۔

”چھوڑ دیا۔“ اس نے بھرپور انداز میں مسکرا کر کہا۔

حورین نے کچھ نہیں کہا۔

بہت مزے دار کھانا تھا، دونوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو حادثہ کسی جن کی طرح حاضر ہوا اور برتن

سمیٹ کر لے گیا۔ وہ بہت باحیا و شریف النفس آدمی تھا۔ ایک بار بھی اس کی نگاہیں حورین کی جانب نہیں بھگی تھیں۔

کچھ دیر گزری تھی، جب ایک بارش نوراتنی چہرے والے بزرگ شفیق مسکراہٹ سمجھائے اندر داخل ہوئے۔ سفید شلوار کرتے پر

سفید ہی ٹوپی اوڑھے بڑی گرم جوشی و محبت بھرے انداز میں وہ ذوالنون سے ملے۔ ان کے ہنور چہرے پر اتنی شفقت و مروت تھی کہ

ذوالنون بھی لمبے بھر کو تو سکتے میں رہ گیا۔ حورین نے سلام کیا۔

”بیٹھو بچو! راستہ بھٹک کر یہاں آ گئے۔“ وہ خود بھی ایک طرف سٹ کر بیٹھ گئے اور ان سے مخاطب ہوئے۔

”جی۔ نہ معلوم کس طرح راستہ بھول گیا اور ادھر آ گلا۔“

”نہ معلوم راستہ بھٹکے ہو یا کسی منزل پر پہنچ گئے ہو۔ انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ راستہ کس سمت جانے والا ہے۔ سب راستوں

سے واقفیت و منزلوں کا پتہ تو صرف ایک ہستی کو معلوم ہے، وہ ہستی جو وحدۃ لا شریک ہے، جو سب جہانوں کو چلا رہا ہے۔“

وہ گویا خود سے ہم کلام تھے۔ اس اثنا میں حادثہ ثرے میں چائے کی پیالیاں رکھنے لے آیا اور ان تینوں کو دے کر خود بھی اپنی

پیالی لے کر بابا صاحب کے قریب بیٹھ گیا۔

”شہر سے آئے ہو، اس لیے میں نے چائے بنوائی ہے کہ شہر والے جب تک چائے نہ پی لیں ان کی محکم نہیں اترتی ہے۔“ وہ

شفیق انداز میں گویا ہوئے۔

”بابا صاحب! ہم نے بہت تکلیف دی ہے آپ کو اس وقت۔“ حورین نے بہت مؤدب لہجے میں کہا۔ وہ پوری طرح ان سے

متاثر ہو گئی تھی۔ ان کے اخلاق و مہمان نوازی کی۔

”بیٹی! تکلیف کسی، مجھے آج بڑی راحت نصیب ہوئی ہے۔ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے گھر مہمان آتے ہیں

اور خصوصاً بیٹی کی صورت میں تو خوش قسمتی دوہری ہو جاتی ہے۔“

ان کے مسرت سے سرشار لہجے میں کوئی بناوٹ و جھوٹ نہ تھا۔ وہ مہمان نوازی کے کئی قصے سناتے چلے گئے۔

”وہ وقت گزر گیا جناب! جب مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا اور ان کی خاطر تو اشع میں ادھار مانگ لینے سے گریز نہ کیا جاتا تھا۔ اب تو یہ جذبہ کم کم لوگوں میں رہ گیا ہے۔“ ذوالنون نے چائے پیچے ہوئے گنگلو میں حصہ لیا، جو ابادہ مسکرا کر بولے۔

”میاں! نیکی اور اچھائی کسی بھی روپ میں اپنا وجود ضرور قائم رکھتی ہے، جس دن صلہ رحمی و حقوق العباد جیسے بے مثل جذبوں کو فرسودگی کا قتل لگا کر چھوڑ دیا جائے گا، اس وقت دنیا کے تمام بد صورت و کربہ چہرے بے نقاب ہو کر انسانی اقدار کو سلب کر لیں گے۔ جب حیوانیت اپنے عروج پر ہوگی اور رقص الٹیس میں ہر شے اور برا اخلاقیات سے آزاد ہو کر انسان حیوانوں سے بھی بدتر ہو جائے گا، پھر دنیا ہی نہ رہے گی۔“ رات کے پُر سکون ماحول میں ان کی دھیمی و شیریں آواز ان کی سماعتوں میں رس پکارتی تھی۔

چائے پی جا چکی تھی، حادثہ پیالیاں سمیٹ کر باہر لے گیا۔ چند منٹ بعد واپس آ کر وہ بابا سے کچھ قاصطے پر مؤذبانہ انداز میں گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

”آپ کو تحسن محسوس ہو رہی ہے بر خوردار! ہم چلتے ہیں، آپ آرام کریں۔“ وہ ذوالنون کے چہرے پر موجود بیزارگی بھانپ کر گویا ہوئے۔

”نہیں..... میں تحسن محسوس نہیں کر رہا، اگر آپ کی عبادت میں غفل واقع نہ ہو تو آپ کی صحبت سے فیض یاب ہونا ہماری خوش قسمتی ہوگی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تجربہ کا وقت ہے اور آج عجیب بات یہ ہے کہ نیند بھی نہیں آرہی ہے۔ یہ وقت آپ کے ساتھ ہی گزاروں گا، اگر آپ کو آرام کرنا ہو تو بلا تکلف کہہ دیجئے گا۔ بے شک میرا غریب خانہ ان تمام آسائشات سے محروم ہے مگر یہاں وہ سکون و راحت موجود ہے جو شہری زندگی میں مفقود ہو چکی ہے۔ درحقیقت آسائشات کو حیات کا جزو بنالینا اپنے ساتھ دشمنی کرنے کے مترادف ہے۔ آج جو دنیا میں بے چینی و اضطراب کسی وبا کی طرح پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اس کا اصل سبب ان ہی آسائشات کا حصول ہے۔ خواہ جائز ہوں یا ناجائز۔ لوگ دین و آخرت کو بھلا کے آسائش کو حاصل کرنے کی تک وہ وہ میں زندگی کے حسن سے محروم ہو رہے ہیں۔“

”زندگی حسین کہاں ہے؟ مجھے زندگی کبھی حسین نہیں لگی بابا!“

اس کے اندر کی شکستگی ایک لمحے کے لیے اس کی سر مٹی آنکھوں اور بھاری لہجے میں نمایاں ہو کر غائب ہو گئی۔

”زندگی بہت پیاری ہے، بہت خوب صورت ہے۔ اس کی خوب صورتی دیکھنے کے لیے یہ ظاہر آنکھیں نہیں، دل کی آنکھیں کھولنی پڑتی ہے۔ اس رب کی کائنات کے حسن کو دیکھنے کے لیے من کو ہر آسودگی سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ قلب نکمرہ ہوگا تو ہر شے اپنے اصل حسن کے ساتھ دکھائی دے گی۔ نفس جب طہارت و پاکیزگی کے نور سے جگمگائے گا تو اللہ کی اس دنیا کے ہر ذرے سے رنگ و روشنی چمکتی نظر آئے گی۔“



خوشبو سے ہواؤں سے بھی ملنے نہیں کچھ لوگ  
موسم کی اداؤں سے بھی ملنے نہیں کچھ لوگ  
مل جائیں تو جیون کو سجاتے ہیں لیکن  
پھمڑیں تو دعاؤں سے بھی ملنے نہیں کچھ لوگ

”آپ ایک بات پوچھوں؟“ اپنی سوچوں میں اُلجھی خضریٰ نے یوں ہی بیٹھے بیٹھے سر ہلادیا۔

”آج جو آپ نے کونین بھائی کے ساتھ کیا، وہ کیا تھا؟“ وہ اس کے قریب بیٹھے ہوئے گویا ہوئی۔

”وہاٹ؟..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس نے چونک کر بہن کی طرف دیکھا۔ شفاف رنگت، جاذب نظر نقوش و دل کش خند و خال والی اریہ قد میں اس کے برابر ہو چکی تھی اور جس انداز سے وہ اس کے قریب بیٹھی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ عقل و شعور، دانش و فہم کی حدود میں بھی داخل ہو چکی ہے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”آپ کا رویہ ان کے ساتھ نارمل نہ تھا۔ وہ آپ کی وجہ سے شاید کل رات سو بھی نہ سکے تھے۔ ان کی سرخ آنکھیں اور چہرے کی تھکن بتا رہی تھی کہ وہ بے حد پریشان رہے ہیں۔ رات سے صبح تک انہوں نے کئی کالز کی تھیں پھر وہ آپ کے بیدار ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ آپ میڈیسنز کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ میرے انفارم کرنے پر وہ آئے تھے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ جو کچھ آپ نے صبح کہا تھا وہ سب انہوں نے سن لیا تھا۔ شاید وہ میرے پیچھے پیچھے چلے آئے تھے۔ انہیں امید بھی نہ ہوئی کہ آپ ان سے ملنے سے انکار کریں گی، وہ بھی اس انداز میں۔“

تاسف و پریشان کن انداز میں گنگو کرتی یہ وہ اریہ تھی جو اپنے لالہ ابالی انداز میں خضریٰ سے لڑتی جھگڑتی دکھائی دیتی تھی، اس کی چھیڑ چھاڑ پر گھنٹوں چہرہ چھپائے روٹی رہتی تھی۔

اس کے سامنے بیٹھی یہ اریہ بہت باشعور، سمجھ دار اور معاملہ فہم تھی۔

”آپ ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟ میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟“ خضریٰ کو مسلسل اپنی جانب نظریں مرکوز کیے دیکھ کر وہ گھبرا کر بولی۔

”نہیں۔“

”پھر؟“

”میں سوچ رہی ہوں تم اتنی بڑی ہو گئی اور مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ میری بہن میرے قد جتنی ہو گئی ہے۔“ اس کے لبوں پر تبسم تھا۔

”دراصل آپ! آپ نے ہمیشہ سے ہی میرے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھا ہے، ورنہ ہمارے درمیان عمر کا فرق کوئی زیادہ نہیں

ہے، آپ مجھ سے صرف دو سال بڑی ہیں، یہ کوئی فرق نہیں۔ میں نے بہنوں میں ذہل عمر کے فرق کے باوجود فریڈ شپ دیکھی ہے۔ آپ!

اگر بھائی بہنوں کے محافظ کہلائے جاتے ہیں تو بہنیں بہنوں کا عکس ہوتی ہیں، روح ہوتی ہیں۔“

”اوہ مائی گڈنس..... ار یہ اتھ واقعی بڑی ہوگئی ہو۔ نہ صرف بڑی ہوگئی ہو بلکہ بڑی بڑی باتیں بھی کرنے لگی ہو۔“ خضرئی نے فرط مسرت سے اسے گلے لگا لیا۔ ”آئی ایم سوری، میں نے آج تمہارے ساتھ بہت بُرا کیا۔“

”اِس اوکے۔ میں ہرٹ نہیں ہوئی مگر کونین بھائی کو بے حد ہرٹ کیا ہے آپ نے۔ آپ کو ان سے سوری کرنا چاہیے۔“ اس نے علیحدہ ہو کر کہا۔

”میں نے ان سے ملنا ضروری نہیں سمجھا، اس لیے میں نے کہہ دیا۔“

”آپ کیوں ملنا نہیں چاہتی ہیں ان سے؟ کوئی وجہ تو ہوگی؟“

”تم کیوں اتنا فورس کر رہی ہو؟“ اس کا انداز گھٹتہ تھا۔

”اس لیے کہ..... آپ دونوں کے درمیان جو کچھ ہے، وہ میں ایک عرصے سے محسوس کر رہی ہوں مگر اب لگتا ہے کہ سب کو معلوم ہو جائے گا۔“

”اور..... یہ! ہمارے درمیان کیا ہے؟ کیا سب کو معلوم ہو جائے گا؟“ وہ استغہامی نظروں سے بہن کی جانب دیکھ رہی تھی اور اس کی نگاہوں میں اسے اپنے دل کی تحریر نظر آگئی۔ وہ تمام داستان رقم تھی جو اس نے ہر ایک سے چھپائی تھی۔ وہ دم بخور رہ گئی۔

”آہی! میں نے بتایا تھا نا ابھی آپ کو، بنش ایک دوسرے کا عکس ہوتی ہیں، روح ہوتی ہیں، پھر بھلا روجوں سے کوئی بات چھپتی ہے؟ میں سب جانتی ہوں، آپ کی خاموش محبت کو منال چچی کی وجہ سے زبان نہ مل سکی مگر کونین بھائی جیسے کمرے اور سچے بندے ان سے کرا سکتے تھے، اگر آپ ان کو ذرا بھی اشارہ کر دیتیں تو وہ کیا کچھ نہ کر دیتے۔“ انکشافات کی بند گھڑی اور یہ کھول کر بیٹھی تو وہ حیران رہ گئی۔

”پلیز ار یہ! آج کے بعد میں کبھی تمہارے منہ سے یہ نہ کہہ نہ سوں، کیا تم نے مجھے اس قدر خود غرض و خود پسند سمجھا ہے کہ میں اپنی خوشیوں کی خاطر منال آئی کی امیدوں کا محور چھین لوں؟“

”منال آئی جیسی خود غرض و خود پسند عورت کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ وہ کب کسی کی خوشیوں اور اُمیدوں کا خیال رکھتی ہیں؟ وہ بڑی کینہ پرور اور حاسد مزاج عورت ہیں بلکہ..... وہ عورت کے روپ میں ایک زہریلی ناگن ہیں۔ ان میں اتنا زہر ہے کہ ان کے زہر سے ان کا گھر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اپنی زندگی میں تو ان کا زہر پھیلا ہی تھا، اپنے اس بیٹے کو بھی وہ معاف نہ کر سکیں جو انہیں سب سے زیادہ چاہتا ہے۔“ ار یہ کے لہجے میں منال کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

”ار یہ! ایسا مت کہو، مجھے ان پر بے حد ترس آتا ہے۔ حزرہ انکل انہیں چھوڑ کر چلے گئے، شاید ہا ہر کسی ملک میں جا کر انہوں نے کسی میم سے شادی کر لی۔ انہوں نے پلٹ کر ان کی خبر نہ لی، اسی وجہ سے وہ ایسی ہو گئی ہیں۔“ خضرئی نے رسائیت سے سمجھایا۔

”حزرہ انکل بہت ہنس تھے۔ ان کے جانے کی وجہ آئی ہی ہوں گی۔“

☆.....☆.....☆

بابا صاحب کو ان کے ساتھ بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ محاذ انہیں جانا پڑ گیا۔ گاؤں کے کسی شخص کی اچانک طبیعت خراب ہونے کے بعد دم کروانے کے لیے کوئی انہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ ان سے معذرت کرتے اور آرام کی تلقین کرتے ہوئے حادثہ کو ساتھ لے کر چلے گئے تھے۔

”وہاں جا کر آرام کرو، گیت بند کر لینا“۔ ان کے جانے کے بعد وہ حورین سے مخاطب ہوا جو ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی۔

”میں یہیں ایڑی فیمل کر رہی ہوں“۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”جیسے آپ کی مرضی.....“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولا اور خود وہیں اس سے خاصے فاصلے پر چہرے پر ہازور کھ کر لیٹ گیا۔

ان کے درمیان خاموشی جال بٹنے لگی تھی۔

نہ معلوم کتنی دیر گزری تھی۔ وہ گزرتے وقت کے کسی لمحے کی گرفت میں بیٹھے بیٹھے ہی سوچی اور نہ معلوم کتنی دیر تک محو خواب رہی۔ نیند کی کیفیت میں اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو، آوازیں دے رہا ہو۔ پہلے بہت دور دور سے، پھر رفتہ رفتہ آوازیں قریب آگئیں۔ ابھی وہ کچھ نہیں پاری تھی کہ وہ خواب ہے یا حقیقت، اپنے شانے پر بھاری ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ وہ اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے اس کے شانے پر رکھا ہاتھ ہٹاتے ہوئے ملامت سے کہا۔

”اس طرح سوؤ گی تو تھک جاؤ گی۔ میں باہر جا رہا ہوں، ایڑی ہو کر سو جاؤ۔ اوکے.....“ وہ اسے دیکھتا ہوا اٹھ گیا، جبکہ وہ اسی طرح نیند بھری آنکھوں سے اسے دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ بند ہونے والے دروازے کی آواز اسے ہوش و حواس میں لے آئی۔ اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اپنے منتشر ذہن کو یکجا کر لیا۔

کل سے اب تک کتنے نئے والوں کے روپ دیکھے تھے اس نے اس شخص کے۔ ہر روپ پہلے سے بہت مختلف ہوتا تھا۔

مغرور، گھمنڈی، خود پرست، خود پسند، کسی کو خاطر میں نہ لانے والا اور خصوصاً صنف مخالف کو کوئی اہمیت و وقعت نہ دینے والا، سر بھرا، بددماغ۔ اس کی اسی بددماغی کے باعث اول روز سے اس کی اس شخص سے دشمنی رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نینچا دکھانے اور بے عزت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

اب جب وقت نے اسے اس کے دم و دم پر ڈالا تو وہ اسے نجات دہندہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تھا، قریب تھا۔ دور سے اس سڑیل مزاج بندے میں جتنی برائیاں نظر آتی تھیں، اب ان گزرے گھٹنوں میں ساتھ رہنے سے معلوم ہوا تھا کہ باہر سے چٹان کی طرح سخت اور لوہے کی مانند بے لچک دکھائی دینے والا یہ شخص اپنے ظاہر پن سے بالکل ہی متضاد ہے۔ نرم مزاج، از حد خیال رکھنے والا، پرواہ کرنے والا اور بے حد با کردار و باہمت، ایسے اوصاف ہی تو ایک مرد کو شان دار بناتے ہیں۔ مردوں کے چہرے نہیں، کردار خوب صورت ہونے چاہئیں۔

خوب صورت چہرے وقت کے ساتھ ساتھ بگڑ بھی جاتے ہیں۔

خوب صورت کردار ہمیشہ خوب صورت رہتے ہیں۔

چہرے کی بد صورتی قابل قبول ہوتی ہے۔

کردار کی بد صورتی کبھی قبول نہیں کی جاتی ہے۔

باہر سے مضبوط و توانا نظر آنے والا یہ شخص اندر سے بھی اتنا ہی مضبوط و پاک ہاڑ تھا۔ اس کے اندر عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ شانے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ یہ سوچیں از خود ہی اس کی جانب بڑھنے لگیں۔ اس کا بایاں ہاتھ اپنے دائیں شانے پر آ کر ٹھہر گیا جہاں کچھ دیر قبل ڈو النون کا ہاتھ تھا۔

”نامعلوم اس کی یہ دانستہ حرکت تھی یا غیر دانستہ؟“ وہ خود سے ہم کلام تھی۔

”اتنا کچھ ہونے پر بھی تمہارے دل سے اس بھلے آدمی کے لیے کدورت نہیں جائے گی۔ سوچو اگر ایسے وقت میں جب کوئی تمہارا پرسان حال نہیں تھا، اس نے پورے خلوص سے تمہاری مدد کی، اگر اس کے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال ہوتا یا وہ موقع سے فائدہ اٹھانے والا بندہ ہوتا تو بہت سارے مواقع تھے اس کے پاس، اگر وہ تمہارا گلا دبا کر کہیں پیٹنگ بھی دیتا تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا۔ کیوں وسوسوں کو دل میں جگہ دیتی ہو؟ اس شخص نے تمہارے ساتھ نیکی کی کہ تم بیٹھے بیٹھے سو رہی تھیں، تمہاری تکلیف کے خیال سے اٹھ کر خود باہر چلا گیا تاکہ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ تم اس کے شانے پر ہاتھ رکھنے پر اس کی نیت پر شک کر رہی ہو۔ وہ بھی تمہیں آوازیں دینے کے بعد بیدار کرنے کے لیے رکھا۔ نف ہے تمہاری سوچ پر۔“

اس کے ضمیر نے اچھی طرح اس کی خبر لی اور وہ اپنی سوچ پر خود ہی شرمسار ہو گئی، پھر کافی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد بھی نیند نہیں آئی تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ وہ چہرے پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ آہٹ پر پلٹ کر دیکھا اور اسے دیکھ کر تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟“ وہ ایک جست میں اس کے قریب آیا۔

”کچھ نہیں..... میں ٹھیک ہوں۔“

”پھر اٹھ کر کیوں آگئیں؟“ وہ اس کے مقابل کھڑا تھا۔

”میں نے سوچا کہ.....“

”میں چھوڑ کر تو نہیں چلا گیا۔“ سینے پر ہاتھ باندھے گہری نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”نہیں..... ایسا تو نہیں سوچا میں نے۔“ چہرے پر آتی بالوں کی لٹ کوکان کے پیچھے کرتی وہ سادگی سے گویا ہوئی۔

”کیوں؟“ بار بار کان کے پیچھے سے آجانے والی لٹ پر اس کی نظریں دلچسپی سے مرکوز تھیں۔ حورین اس کی نظروں کی تپش

محسوس کر رہی تھی۔ وہ کنفیوژن کا شکار تھی۔ جھکی لٹا ہوا اٹھ نہیں رہی تھی۔



”میں نے پوچھا، کیوں ایسا نہیں سوچا؟ میں ایسا کوئی قابل اعتبار و قابل بھروسہ شخص نہیں ہوں۔ یونہی، اسٹھلی آپ کے لیے۔“ اس کے انداز میں ہلکا سا طرسٹ آیا تھا۔

”آئی ایم سوری، میں غلط تھی۔“ اس نے فراخ دلی سے معافی مانگی۔

”میری کبھی خواہش نہیں رہی کہ آپ مجھے سوری کہیں، نہ ہی میں امید کرتا ہوں۔ ہر ایک کی اپنی نیچر ہوتی ہے۔ نیچر کے مطابق ہی موومنٹ بھی ہوتی ہے، جس سے ہم ہٹ نہیں سکتے۔“

اس کا انداز اس بار ہر طرز و حقیر سے پاک تھا۔ وہ سرخ اینٹوں سے بنے اس وسیع و بلند چہترے کی سائیز میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کی تھلید حورین نے بھی کی۔

ماحول میں ابھیلا سا سکوت تھا۔ ہوائیں کثیف اور پھولوں کی خوشبوؤں سے بوجھل تھیں۔ آسمان چاند اور ستاروں سے بھگمگا رہا تھا۔

آکاش سے دکھتی روشنیوں میں وہاں پھیلی تاریکی انوکھا منجم پیش کر رہی تھی۔ روشنی دتار کی کاہی بلاپ اس کے لیے نیا تھا۔

”آپ کی باتیں کچھ کچھ بی بی جان جیسی لگتی ہیں۔“

”بی بی جان..... شی از ویری ناکس، وہ بہت گریٹ ہیں۔“ ذوالنون کے لہجے میں بھرپور ستائش تھی۔

”آف کورس، جب میں کراچی آئی تھی اور ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے ان سے بے حد خوف محسوس ہوا تھا، میں نے سوچا میں ان کے ساتھ نہیں رہ پاؤں گی۔“

”میں نے تو ان میں ایسا کچھ محسوس نہیں کیا۔“ باہر آ کر اس کا ذہن نہ معلوم کن اُلجھنوں میں گرفتار ہونے لگا تھا جس سے وہ اندر عجیب سی بے چینی و اضطراب محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کیفیت سے نکلنے کے لیے وہ کتنی دیر تک کمرے میں چہرے پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا اور خاصی جدوجہد کے بعد بھی جب وہ اپنی مضطرب کیفیت پر قابو نہ پاسکا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بے اختیار نظریں اس کی طرف اُٹھیں جو فوراً ہٹ نہ سکیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے سوری تھی۔

میرون کھر کے اشارے پر ایگزیری سوٹ میں اس کا سلگوتی حُسن نمایاں تھا۔ میرون جھلملاتا ہوا دوپٹے سر سے ڈھلک کر شانوں پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک موٹی سی لٹ اس کے چہرے کو چھوتی ہوئی عجیب رحمانی عطا کر رہی تھی۔ بے داغ، شفاف چہرہ، گلابی رنگت، سیاہ درواز عارضوں پر چمکی پلکیں، سیاہ متناسب ابرو، ستواں ناک اور بھرے بھرے گلابی ہونٹ، وہ حسین نہیں، حسین ترین تھی۔ ایسا حُسن جو چہرہ کو بھی موم کی طرح پگھلا دے۔ وہ تو انسان تھا جو پتھر نہیں موم سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے۔

رات کے اس لمحے میں جہاں بلب کی زرد روشنی وحشت پھیلا رہی تھی، اس پر نگاہ پڑتے ہی اسے محسوس ہونے لگا، گویا اس کے خوابیدہ وجود سے سفید روشنیاں نکل رہی ہوں۔ بڑی کشش، بڑا سرد و تھان روشنیوں میں۔ اسے عجیب سا کیف خود پر چھایا محسوس ہونے لگا۔ اس کے اندر کی دُنیا زبرد بر ہونے لگی۔

”ذوالنون حزاہ! یہ کیا؟ تم بھی ایک عام سے ہی مرد نکلتے۔ حسن کے آگے سر نظر کر دینے والے عام سے بزدل مرد۔ کیا ہوا تمہارے جنس مخالف سے نفرت کے دعوے کا؟ قدم قدم پر ان کی تعجب کا؟ تم نے ان گنت لڑکیوں کے دل مساکر کیے۔ ان صنفوں کو تم نے کبھی قابلِ اعتنا نہیں گروانا۔ آج..... ابھی تم نے جس سے شکست کھائی، جس کے حسن کے تم اسیر ہوئے ہو، تمہارے جذبیوں میں رنگ جس کی صورت نے بھرا ہے، یہ وہی لڑکی ہے جو کچھ عرصے سے تمہارے مد مقابل رہی ہے، حرمت نسواں کی جو علم بردار ہے۔ تم اس کے حسن سے شکست کھا گئے ہو؟..... حسن ہی تو عشق کی ابتدا ہے اور عشق داناؤں کا شیوہ نہیں ہے۔“

اس کے اندر جیسے کوئی اس کی بدلتی کیفیت پر استہزاء یہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اندر سے اٹھنے والی آوازوں نے اسے ہوش و خرد کی دنیا میں واپس کھینچا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، کئی لمبے لمبے اپنی کیفیت پر قابو پانے میں لگے پھر اس نے آنکھیں کھولیں تو خود پر قابو پا چکا تھا مگر اب اسے یہاں اپنا دم گھٹنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ساتھ ہی حورین کی بے آرامی کا خیال بھی آیا کہ اس طرح بیٹھے بیٹھے، وہ مزید تحسن کا شکار ہو جائے گی اور اس کی موجودگی میں وہ لیٹ نہ سکے گی۔ اسی خیال سے اس نے کمرے سے باہر جانے کا پر دو گرام بنا کر اسے آوازیں دیں۔ سوا آوازیں دینے کے بعد بھی وہ بیدار نہ ہوئی تو مجبوراً آگے بڑھ کر اس کے شانے پر دو صیرے سے ہاتھ رکھ کر اسے منجھوڑا۔ نتیجتاً وہ گھبرا کر بیدار ہو گئی۔ اُسے آرام کی تحقیر کرتا وہ یہاں سے چلا آیا۔ کھلی فضا اور تازہ ہوا میں اسے اپنے چہرہ پر اپنا ٹوٹا پھوٹا خول چڑھانے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ خود بھی باہر چلی آئی مگر اتنی دیر میں وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے اس سے گفتگو کرنے لگا۔

”آپ سے ایک ہی تو ملاقات ہوئی ہے، ویسے بھی وہ بظاہر جنسی سخت اور قصور نظر آتی ہیں، درحقیقت وہ ایسی نہیں ہیں۔ سب کو بے حد چاہتی ہیں، خیال رکھتی ہیں مگر ظاہر نہیں کرتیں۔ میں سوچتی ہوں آج کل جو گھریلو مسائل ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے تدارک کے لیے بی بی جان جیسی ہستی ہر گھر میں موجود ہونی چاہیے۔ پوری نہیں تو آدمی برائیاں تو ختم ہو ہی جائیں گی۔“

وہ اس سے اس طرح گفتگو کر رہی تھی جیسے بے حد کلوز فرینڈ شپ ہو۔

”شاید بابا صاحب اور حارث آرہے ہیں۔“ کافی دیر گپ شپ کرنے کے بعد دور سے نظر آتے اشخاص کو دیکھ کر وہ گویا ہوئی۔

”وہی ہیں۔“ ذوالنون نے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہتی ہیں۔ بقول بی بی جان کے، دُنیا ابھی اچھے اور نیک لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔ یہ بابا صاحب بھی ان اچھے اور نیک لوگوں میں سے ہیں جو کسی کی تکلیف کی خاطر اپنا آرام بھی توج دیتے ہیں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بابا نے آتے ہی وضو کر کے اذان دینے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ فجر کی اذان کا وقت ہونے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

کسی بخت کا مارا تھا ستارہ نہیں تھا وہ  
جسے لوٹ کر ہر پہل چاہا ہمارا نہیں تھا وہ  
قدم جب بھی بڑھا میرا صدائیں گونجتی رہیں  
جو مزے کے میں نے دیکھا تو پکارا نہیں تھا وہ

کوئین نے سارا دن سڑکوں پر بے مقصد کار دوڑاتے ہوئے وقت گزارا۔ کل رات سے اب تک وہ بے سکون رہا تھا۔ بھلا اس نے یہ کب چاہا تھا کہ وہ اس دشمن جان کو اس طرح دیکھے۔ خوابوں میں وہ اسے اپنے ساتھ دیکھتا آیا تھا۔ پارکوں، ساحلوں اور ہوٹلوں کے پُر سکون گوشوں میں کینڈل لائٹ ڈنڈر کرتے وہ ساتھ ہوتے تھے۔

اسے مہران کے ہمراہ دیکھ کر دل لمبے بھر کو توڑک سا گیا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا کہ یکفخت تمام روشنیاں تاریکیوں میں بدل گئی ہوں۔ جسم و جاں میں سنانے پھیلنے چلے گئے تھے مگر پھر یہی کیفیت حزن و سوز کی، موت و زیت کی، خضرئی کی غم آنکھوں میں دیکھ کر اسے پھر زندگی سے رابطہ جوڑنا پڑا تھا۔ خود کو سینٹا اور خوش ظاہر کرنا پڑا مگر اس وقت وہ مزید لوٹ گیا جب اسے محسوس ہوا، خضرئی خود کو سنبھال نہیں سکی تھی۔ اس کی بگڑتی طبیعت نے اسے متوحش کر ڈالا تھا۔ دل کا تقاضا تو یہی تھا کہ اسے لے کر فوراً ہسپتال چلا جائے مگر عقل نے دانش مندی کا عصا پکڑ کر یاد کروایا کہ اسے یہ حق حاصل نہیں ہے۔ دل کی اس یاد آوری پر اسے کھونے کا احساس اس قدر ہوا کہ وہ پھر وہاں سے ہوا کی طرح غائب ہو گیا۔ مہران نے کیا کہا؟ خضرئی نے کس طرح ری ایکٹ کیا، اسے کچھ یاد نہ تھا۔

یاد تھا تو صرف یہ کہ وہ اسے کھو بیٹھا ہے، جو اس کی زیت کا عنوان تھی، حسین تصورات جس کے وجود سے قائم تھے، لمبے بھر میں سب ملیا میٹ ہو چکا تھا۔ ہاتھوں میں صرف ڈرن ہونے والی خواہشوں کی خاک تھی۔ ساری رات نیند سے وہ بے نیاز رہا تھا پھر جیسے ہی اریبہ نے نوید دی کہ وہ ٹھیک ہے، خطرے سے باہر ہے اور جاگ چکی ہے، وہ اسی وقت کار لے کر نکل کھڑا ہوا۔ خضرئی اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ جان کر اس کے گھائل دل کو مزید چوٹ پہنچی اور وہ اسی لمبے تیزی سے واپس پلٹ آیا۔ آرزوؤں کی تمام ٹوٹی کرچیاں، جذبیوں کے تمام شتر اسے اپنی روح میں پیوست محسوس ہوئے۔ وہ تڑپ اٹھا۔ کس قدر سہل ہوتا ہے حقیقی انداز میں سوچنا۔

اس نے بھی تو یہی سوچا تھا کہ وہ اب اسے بھول جائے۔ اس سے ملاقات نہ ہو اور جب سوچ نے حقیقت کی جھلک دکھائی تو وہ بھی برداشت نہ کر پایا اور دھواں دھواں دل کے ہمراہ سڑکوں پر منگشت کر رہا تھا۔ سوچ عملی پیر بن اڑھ کر جب حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے تو اسی طرح تکلیف دہ اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ گھر میں داخل ہوا تو منال بیگم کو اپنا خنجر پایا۔

”آپ کہاں ہو بیٹا؟“ سرخ ساڑھی میں تک سکہ سے تیار وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

”کہیں نہیں ماما! ایک دوست کی طرف تھا۔ وہ بڑی کوشش کے باوجود ہونٹوں پر دھبھی سی بھی مسکراہٹ نہ لاسکا۔

”او کے، اب نام ویسٹ کیسے بنا میرے ساتھ مسز کرمانی کے ہاں چلو، ان کے ہاں گیٹ نوٹو گیدر ہے، اسٹیشنل انہوں نے تمہیں مدعو کیا ہے۔ وہ فوراً ہی مدعا بیان کرنے لگیں۔

”آئی ایم سوری ماما.....!“

”نو..... کوئی سوری، کوئی ایکسکوز نہیں مانوں گی۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے اپنے حکمیر انداز میں بولیں۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں جب ہی تو آپ کو ساتھ لے کر جا رہی ہوں، پارٹی میں چلیں گے تو طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ تنہائی تو خود کو بیمار کر ڈالتی ہے وہاں لوگوں سے ملیں گے تو ریٹیکس ہو جائیں گے۔“

”ماما! پلیز، میرا کوئی پارٹی اینڈ کرنے کا موڈ نہیں ہے، ٹیکسٹ نام چلوں گا، ابھی بالکل ہمت نہیں ہے۔“

مثال بیگم نے سختی دیکھی تھی اس کی جانب دیکھا۔ براؤن شرٹ اور آف وہائٹ پینٹ کوٹ میں اس کی وجیہ صورت پر تھکن، پڑھدی اور بے سکونی کے گہرے تاثرات تھے۔ کبھی وہ انہیں مضبوط چٹان کی طرح محسوس ہوتا تھا، اب وہ کسی بھری مٹی کے تودے کی طرح کمزور اور ناتواں دکھائی دے رہا تھا۔

وہ سب جانتی تھیں، یہ سب ان کی سفاک اور بے رحم خدا اور ان کی وجہ سے ہوا ہے، اگر وہ خود کو عورت کے مقام سے نہیں، ایک ماں کے لحاظ سے دیکھتیں تو کبھی بھی اس چٹان کو کمزور نہیں کر سکتی تھیں مگر وہ سب کو مزہ کے حوالے سے دیکھتی تھیں۔ اپنے ماضی کے حوالے سے دیکھتیں کہ جب انہیں محبت میں ناکامی و دکھ ملا تو پھر کوئی کس طرح ان کے ہوتے ہوئے کامیاب ہو سکتا ہے۔ کوئی کس طرح خوشیاں منا سکتا ہے۔ اس میں خواہ ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

”او کے، ریٹ کریں، مگر میں آپ کو انعام کر دیتی ہوں کہ مسز کرمانی کی بیٹی ڈوٹی کو میں اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر چکی ہوں، آج یہ میٹ فائل کر کے آؤں گی۔“

”ایسا کس طرح کر سکتی ہیں آپ؟“ وہ حیرتی سے گویا ہوا۔ ”یہ لائف میری ہے ماما! اس کو کس طرح گزارنا ہے اور کس کے ساتھ گزارنا ہے، یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے۔“

”اوہ اب آپ کو بھی بولنا آ گیا ہے، کل تک آپ کے منہ میں زبان نہیں تھی، یہ اتنی لمبی زبان کہاں سے آگئی؟“ وہ تیوریاں چڑھا کر بھر پور طنز یہ لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں ہے، منہ میں گستاخی کر رہا ہوں، میں صرف کہہ رہا ہوں مجھے شادی کبھی نہیں کرنی ہے۔“

وہ مزہب انداز میں کہتا ہوا میٹر حیاں چڑھا گیا۔

☆.....☆.....☆

نماز فجر اور اشراق کی نماز کے بعد بابا صاحب نے ان کے ہمراہ ناشتہ کیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ذوالنون نے جانے کی اجازت مانگی۔

”اتنی جلدی بچو؟ ابھی کچھ دیر ٹھہریں۔ شہر کی زندگی تو آپ دیکھتے ہی ہیں، چند دن رہ کر یہاں کی زندگی بھی دیکھئے“۔ انہوں نے دھیسے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا جس کی تائید ساتھ بیٹھے حارث نے بھی کی۔

”شکر یہ بابا! آپ کی عنایتوں کی وجہ سے میں دوبارہ یہاں کا رخ ضرور کروں گا، انشاء اللہ۔ مگر ابھی اجازت چاہوں گا۔ بہت ضروری کام ہیں جو شہر میں رُکے ہوئے ہیں“۔ وہ سنجیدگی سے ان سے مخاطب تھا۔

”جب بھی آپ آئیں گے، اگر زندگی نے دغا نہ دیا تو مجھے منتظر پائیں گے، ویسے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنے کو دل چاہتا ہے، ان لوگوں میں آپ بھی شامل ہیں“۔

انہیں رخصت کرنے کے لیے وہ کار تک آئے۔ حورین ان سے دعائیں لینے کے بعد کار میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ ذوالنون کے شانے پر ہاتھ رکھے دوبارہ آنے کی دعوت دے رہے تھے، پھر وہ ان سے اور حارث سے مصافحہ کرنے کے بعد کار میں آ بیٹھا۔

ان کی کار ترقی راہ پر گامزن ہوئی تو شیم سحر کی نوخیز روشنی پر سنہری دھوپ پھیل چکی تھی۔ کیت کٹلیان، اوٹومی نیچی پگڈنڈی، کنویں سے پانی بھرتی عورتیں، کپے پکے آنگنوں کے گوشوں سے نکلتا سرخی دھواں، یہ مناظر اس کے لیے نئے اور خوب صورت تھے۔ وہ گھڑکی سے باہر بڑے شوق و ذوق سے دیکھنے میں مگن تھی۔

”فطرت سے ہم آہنگ رہنے والا انسان آج بھی سکون و راحت کی زندگی گزار رہا ہے۔ ان لوگوں کو ذہنی سکون کے لیے گولیوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی نیند بڑی گہری و خوب صورت ہوتی ہے“۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے لب کشائی کی۔ ”وقت سے آگے نکلنے کی کوشش میں ہم ان نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہ وقت کے ساتھ چلنے والے لوگ قدرت سے سب حاصل کر رہے ہیں“۔

”یہ سب دیکھنے کی حد تک بہت خوب صورت ہے، اگر ہمیں عملی طور پر یہ سب کرنے کو ملے تو میں شاید کبھی نہ کر سکوں۔ یہ پانی سے بھرے گھڑے سر پر اٹھا کر چلنا یا وہ مٹی کے چولہے پر رکھنا پکانا، میں کبھی نہ کر سکوں گی“۔ اس نے باہر دیکھتے ہوئے جھرجھری لے کر کہا۔

”ضرورت ایجاد کو جنم دیتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی.....“ اس نے دیوار پر اٹلے تھا پتی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دنگ رہ گئی۔

”راستہ تو آپ نے اچھی طرح نوٹ کر لیا ہے؟“

”ہوں، میں بار بار بھٹکنے والوں میں سے نہیں ہوں“۔

”بار بار سے کیا مراد؟“

”میرے خیال میں ایک بار تو ہر کوئی بھٹکتا ہے“۔

”بھگتنا ضروری ہے کیا؟“

”بھگتنا آدم کی سرشت میں شامل ہے، خواہ ایک باری ہو۔“

”یہاں سے کتنا سفر ہوگا؟“ وہ اس کی بات سمجھ نہ سکی۔

”بہت جلد ہم پہنچ جائیں گے۔“ اس نے گاڑی کو دائیں طرف ٹرن لیتے ہوئے کہا۔ وہ خوشی سے چمک کر گویا ہوئی۔

”ایسا لگ رہا ہے بہت عرصے بعد میں می، پچاسے طوں کی، انہیں دیکھوں گی۔ ویسے تو کئی ماہ سے میں ان سے دور تھی۔ مجھے کبھی

اس طرح فریال نہیں ہوا جس طرح ان دونوں میں ہوا ہے۔ دراصل مچھڑنے کا درد تو وہی جان سکتا ہے جو کسی سے مچھڑا ہو۔ کیا آپ سے کوئی

مچھڑا ہے کبھی؟ کسی کی جدائی محسوس کی ہے آپ نے؟“

”آہ..... یہ اس نے کیا سوال کہہ دیا؟ کیا سوال کر دیا؟ رستے ہوئے زخموں پر نمک رگڑ ڈالا، لمبے بھر کو اس کا چہرہ خنجر ہو گیا۔

”مچھڑنے کا کرب۔“

جدائی کی تڑپ۔

عمر و میوں کا درد۔

بھلا مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے؟ اب تک کی زندگی انہی خارزاروں میں لہو لہان ہوتے ہوئے گزار دی ہے۔ دونوں کی

جدائی خیمیں بے گل کر گئی ہے، یہاں تو ایک عمر کے زخم ہیں یہ۔“

”اوہ سوری! میں شاید زیادہ ہی بول گئی ہوں۔“ اس کی تیزی سے سرخ ہوتی رنگت اور آنکھوں میں پھیلتے دشت کے سائے

اسے سہاگے تو وہ دھیسے سے پوئی۔

وہ بدستور خاموش رہا۔ ان کے درمیان بھی کوئی بات نہ ہوئی۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ شرمندہ ہو کر سوچنے لگی کہ

اس نے ایسا کیا پوچھ لیا جو وہ منہ پھلا کر اسے نظر انداز کرنے لگا۔

صبح رخصت ہو کر رو پہ ہو گئی، جب اس نے کار ایک ٹیم کے بیچے روکی۔ سامنے ہی چائے کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اس کے

اشارے پر ایک لڑکا آیا، اسے چائے کا کہہ کر وہ بھی باہر نکل گیا۔ یہاں سڑک کے دونوں اطراف آم کے درختوں کی بہتات تھی۔ ابھی ان

درختوں میں کیریاں لگی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آم کا سیزن ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

ذوالنون چند لمبے ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد ہوٹل کی طرف بڑھ گیا جہاں سے اس کی واپسی چند لمحوں بعد ہی ہو گئی تھی۔ وہ

ہاتھوں میں منرل واٹر کی بوتل پکڑے چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے لڑکا چائے کا گگ ٹرے میں رکھے آ رہا تھا۔

بوتل اس نے حورین کو پکڑائی۔

اسے چائے دے کر وہ قریب ہی ایک چتر پر بیٹھ گیا۔

حورین نے چائے پیچے ہوئے اس کی جانب دیکھا، وہ اسے کچھ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی فراخ پیشانی پر ٹخنیں تھیں جو اس کی اندرونی پریشانی کی نماز تھیں۔ وہ چائے سپ کرتے ہوئے دو درختاؤں میں تک رہا تھا۔ چہرے پر غیر معمولی سرخی ابھی تک موجود تھی۔ چائے پی کر وہ روانہ ہوئے۔ کچھ دور ہی چلے ہوں گے کہ ریلوے پھاٹک آ گیا جو بند تھا۔ کچھ پر بعد ریل کو یہاں سے گزرنا تھا۔ زوالنوں کو کاررو کنی پڑی تھی۔

”مجھے کچھ کہنا ہے..... مگر سمجھ نہیں پا رہا ہوں کس طرح کہوں؟“ سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”اسکی کیا بات ہے؟“ وہ استغاب یہ انداز میں کہا اُٹھی۔

”آپ کے بیٹرس سے گاؤں آنے کی پر مشن کس نے لی تھی؟“

”سر آفتاب نے۔“

”سر آفتاب کی بجائے میرے ساتھ آپ کو دیکھ کر ان کا کیا تاثر ہوگا؟ دو دن، دو راتیں جو آپ نے اس طرح گزارا ہیں کس سر

آفتاب کو معلوم ہی نہیں کہ ہم کہاں ہیں؟ زندہ یا مردہ.....“

”لیکن آپ تو کہہ رہے تھے، سر ہوش میں آچکے ہیں۔“ وہ گہرا کر کہنے لگی۔

”وہ ڈنجر زون سے باہر آئے ہیں مگر ان کی حالت کی وجہ سے انہیں ابھی فتوہ کی میں رکھا جا رہا ہے۔ اپنی وے، اس وقت تو جو

میں کہہ رہا ہوں، وہ پراہم مل کرنے کی کوشش کریں۔“

”پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ جو ہوا، وہ بتاؤں گی۔“

”یہ سب ہمیں چھپانا ہے۔“

”کیوں؟ اس میں چھپانے کی کیا بات ہے؟“

”بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارا معاشرہ۔ یہاں دو گھنٹے لڑکی کہیں غائب ہو جائے تو قابل قبول نہیں ہوتی، پھر آپ تو.....“

کہتے کہتے وہ دانستہ رک گیا۔

”میں سمجھا نہیں، آپ بھی ہیں میرے ساتھ اور دو دن ہم نے اچھے لوگوں میں گزارے ہیں، خراب لوگوں میں نہیں۔“

”جی..... میں بھی ہوں آپ کے ساتھ۔“ اس کی کم عقلی پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مگر مجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ یہاں سوخون کر کے بھی مرد سرخرو ہتا ہے، انڈرا شیٹنگ؟“

”آپ بے فکر رہیے۔ میری بیٹرس اور جہاں میں رہتی ہوں، وہاں کے لوگ بہت اوپن مائنڈڈ ہیں وہاں عورت اور مرد کی

برتری و کمتری کا کوئی چکر نہیں ہے، پھر میرے بچا اور ماکمل اعتماد کرتے ہیں مجھ پر۔ وہ کبھی بھی مجھے غلط نہیں سمجھ سکتے۔ آپ پریشان نہ

ہوں۔“ اس کے لہجے میں ماں باپ کی محبت کا بھرپور اعتماد بول رہا تھا۔

”میں یہی چاہوں گا کہ کسی کو اس حادثے کے متعلق معلوم نہ ہو۔ آپ کسی کو بھی نہیں بتائیں گی۔ مجھے پسند نہیں ہے لوگ خواہ مخواہ اٹنی سیدھی باتیں کریں۔“

اس کے لہجے میں مخصوص سرد مہری اور اکثر پین لوٹ آیا تھا، پھر وہ کچھ نہ بولا۔ فرین گزرنے کے بعد پھاٹک کھل گیا۔ وہ کراچی کی حدود میں داخل ہوئے تو روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ اپنے اندر بہت ولولہ انگیز اور نشاط آمیز توانائی محسوس کر رہی تھی۔ اپنوں سے ملنے کی خوشی نے اس کو جدائی کے معنی سمجھا دیتے تھے۔ دو دن میں کتنا بڑا انقلاب آیا تھا جو اسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ ذوالنون نے اسے گیٹ سے کچھ پہلے ہی اتار دیا۔

”اندر نہیں چلیں گے؟“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے گویا ہوئی۔

”نہیں..... یہاں سے سیدھا مجھے ہسپتال جانا ہے اور پھر ہارون بھائی سے ملنا ہے۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔

”میں بھی ان سب کے بارے میں جانا چاہتی ہوں۔“

”انتظار کرنا پڑے گا۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بنا چلا گیا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کمرے تک جاتے ہوئے اسے کوئی نہیں ٹکرایا، ورنہ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ کس طرح جھوٹ کہے گی؟ اور کیا کہے گی کہ جاتے وقت یہاں سے بیگ بھر کر لے گئی تھی اور وہ ایسی میں بیٹھ پر س بھی ساتھ نہیں۔ لباس طحہہ شکن آلود اور گلگیا ہو رہا ہے، یقیناً اس موقع پر وہ نہ معلوم کس طرح جھوٹ بھائی۔ یہ پہلی اسٹیج اس کے لیے بہت خطرناک تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر وارڈ روم سے سوٹ نکال کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ خامی دیر شاور لینے کے بعد وہ فریش ہو گئی۔ ہاتھ روم سے باہر نکل تو اسی وقت نسرہ اندر داخل ہوئی۔

”اوہ..... یہ تم ہی ہوتی؟“ وہ حیرانی سے گویا ہوئی۔

”نہیں..... میرا جھوٹ ہے۔“ اس نے بالوں سے ٹاول الگ کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔ نسرہ خوشی کے اظہار کے لیے اس سے لپٹ گئی۔

”تم کب آئیں؟ معلوم ہی نہیں ہوا.....“

”کچھ دیر قبل ہی آئی ہوں، سب لوگ کہاں ہیں؟“ حورین بالون میں برش کرتی ہوئی استفسار کرنے لگی۔

”ایڈورڈ ریلڈیز اینڈ جینٹلس ویس بھائی کے سرال گئے ہیں۔ ویس بھائی اور ہیریہ بھائی وغیرہ سب شکار پر گئے ہیں۔ باقی بیچے، ہم لوگ تو ہم سووی دیکھ رہے تھے۔“ نسرہ نے تفصیل بتائی۔

”کیا بات ہے، ویس بھائی کے سرال والے کچھ زیادہ ہی جلدی جلدی دعو تیں کرنے لگے ہیں۔“

”وہ چاہتے ہیں، جلد از جلد شادی ہو جائے۔“



”ابھی مگنی بھی تو نہیں ہوئی ہے۔“

”ضروری تھوڑی ہے کہ پہلے مگنی ہو پھر شادی۔ ڈائریکٹ شادی بھی ہو جاتی ہے، اکثر خاندانوں میں۔“

”یعنی چٹ مگنی پٹ بیاہ نہیں، بلکہ ٹافٹ بیاہ۔“ دونوں ہنس پڑیں۔

”تم کھانا گلو آؤ، میں ہال ہانڈہ کر آ رہی ہوں۔“

تشریح کھانا گلو آنے چلی گئی۔ وہ ہال ہانڈہ کر آئی تھی کہ موٹل اور زویا کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ بھی تشریح کی طرح والہانہ

انداز میں اس سے ملیں۔

”کیسا رہا تمہارا وزٹ؟ حیدر کی بہن کی شادی انجوائے کی؟ گاؤں کی خوب سیر کی؟“ دونوں نے یکے بعد دیگرے سوالات

شروع کر دیئے۔

”ریلیکس..... ریلیکس یا راسب بتاؤں گی، پہلے کھانا تو کھانے دو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں، وہاں کھانا کھانے کو نہیں ملا جو آتے ہی کھانے کی رٹ لگا دی ہے؟ یہاں ہمارا انتظار کے مارے نہ حال ہے، لہجہ لہجہ گن

کر گزار رہے تھے کہ تم آؤ گی تو ایک ایک تفصیل پوچھیں گے۔“ دونوں کچھ زیادہ ہی اکیسا بکھڑے ہو رہی تھیں۔

”تمہارے جانے کے بعد ہم لوگ اتنا بچھتاے کہ کیوں منع کیا، ساتھ جاتے تو کیا مزہ آتا۔“ زویا کے انداز میں بچھتاہوا تھا۔

”کھانے کے بعد ہی میں تمہیں سب بتاؤں گی، اس سے قبل نہیں۔“

”او کے، چلو پہلے ٹھونسو۔“

”وہ ان کے ساتھ ڈائمنگ روم کی جانب بڑھتے ہوئے دل ہی دل میں ایسی کہانی تراش رہی تھی جو جھوٹ ہوتے ہوئے بھی

جھوٹ نہ لگے۔ اس شخص نے احتیاطی تدابیر کے طور پر جو کچھ بھی سمجھایا تھا وہ اب کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اب آپ بتائیں می! میں کیا جواب دوں مہراں علوی کے پیرش کو؟ پہلے عبدالصمد صاحب کی میٹنگ لائیک ٹائم لے رہی تھی۔“

اب ہنزہ اور معجز کو اسپتال تزیین کرنے کی سوجھی ہے تو وہ اب امریکہ جانے کی تیاری کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ان ہاپ بیٹوں کو

کوئی فکر نہیں ہے کہ کیا کرنا ہے، یہاں ہر دوسرے روز مہراں کی ممال کرتی ہیں کہ کب آؤں، مگنی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے؟“ صنوبر

بیگم ماس کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔

”صاف کہہ دو، ابھی ہمارے گھر میں کچھ مسئلے چل رہے ہیں، انہیں جلدی کا کوئی ٹائم فریم نہیں دے سکتے۔ ہاں اگر وہ اپنے بیٹے

کی مگنی کرنے کو تاجی ہی بے قرار ہیں تو وہ کہیں اور جا سکتی ہیں۔“

”می! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اتنے عرصے ان کو انتظار میں رکھ کر اب یہ کہہ دینا کہ وہ کوئی اور لڑکی دیکھ لیں، مناسب ہوگا؟“

ساس کی بات پر ہکا بکا سی مخاطب ہوئی تھیں۔

”پھر بتاؤ کیا کریں؟“ ان کا انداز نرم تھا۔

”آپ ان لوگوں کو فورس کریں، سمجھائیں کہ بیٹیوں کے رشتوں میں بڑی نزاکت اور سوجھ بوجھ سے کام لیا جاتا ہے۔ اچھے اور

مناسب رشتے اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔ اس پر پوزل کو گونانا میرے لیے تو سب سے بڑی حماقت ہوگی۔“

”مہران کی ماں مجھے بہت جلد باز اور کچھ تک چڑی سی لگتی ہے۔ ایسی عورتیں ساس بن کر بڑے ظلم ڈھاتی ہیں، میرا تو اب دل

نہیں بچ رہا۔“

”بہت نامناسب بات ہوگی اگر ہم نے انہیں منع کر دیا تو۔“

ساس کا انداز دیکھ کر اب ان کا دل بھی ڈالنا ڈول ہونے لگا تھا مگر وہ عروت و اخلاق، لحاظ کا پیکر تھیں، اس لیے فوری فیصلہ

نہیں کر پاری تھیں۔

”ارے وہ کیا کہیں گی، اگر یہاں رشتہ کرنا ہوگا تو وہ ضرور مانیں گی۔“

”ٹھیک ہے، اگر اب کال آئی تو یہی کہوں گی اور سچ بات تو یہ ہے مہی! جب سے یہ پر پوزل قبول کیا ہے، تب سے خضرتی کی

طرف سے بہت پریشان رہتی ہوں، وہ دن بدن بدلتی جا رہی ہے۔ ہزار دفعہ پوچھ چکی ہوں اگر وہ خوش نہیں ہے تو بتائے مگر ہر بار وہ یہی کہہ

دیتی ہے کہ وہ خوش ہے۔ اسے ہارے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔ نہ معلوم یہ کیسی خوش ہے جو تک کی طرح گھلتی جا رہی ہے وہ۔“

☆.....☆.....☆

خلاف معمول منزل بیگم بہت خوش خوش، چپکتی ہوئی پرس جھلاتی اندر داخل ہوئی تھیں۔ فائنٹہ جو ابھی ایونٹک میں کرنے والی تھی

پھلکی ایکس سائز سے فارغ ہو کر بیٹھی، ٹیوس پی رہی تھیں، طویل عرصے بعد بیٹی کو اس طرح خوش و خرم، اٹھیلیاں کرتے دیکھ کر گلاس بجیل پر

رکھ کر کھڑی ہوئی تھیں۔ اتنے میں قریب آ کر وہ ان سے لپٹ گئی، پھر بڑی مسرت سے ان کے دونوں گال چوم کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”وہاٹ سر پرائز؟“ وہ حیرت آمیز خوشی سے گویا ہوئیں۔

”گیس اٹ ماما“ انہوں نے کھلکھلاتے ہوئے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

”انس کے متعلق انفارمیشن ملی ہے.....“ وہ بھی ایک کاٹیاں تھیں۔

”ڈش راسٹ، بٹ آپ نے کس طرح گیس کیا؟“

”آپ کی مدد ہوں ڈاٹر!“ وہ تھانے سے گویا ہوئیں۔

”اوہ ایس، آئی ایم پراؤ ڈاٹ آف یو ماما!“

”کیا معلوم ہوا؟ اور کس نے یہ انفارمیشن دی ہے؟“

”اس دن میں نے شوگر کو ڈانٹا تھا، چاب سے نکال دیا تھا، بس وہی چاب دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ایسی شان دار انفارمیشن لیا کہ میں نے اسے چاب دینے کے ساتھ سیلری بھی ڈبل کر دی ہے۔“

ان کی آنکھوں میں بڑی ہیبت ناک چمک تھی اور مسکراہٹ میں سفاک پن ان کے ہر سرت چہرے کے ہر عضو سے جھلک رہا تھا۔

”کیا..... کیا.....؟ مگر یہ بات بہت غلط ہوئی کہ تم نے ایک ادنیٰ ملازم کو اپنے راز میں شامل کر لیا۔ ان چھوٹے لوگوں کے ہاتھ میں جب بڑے لوگوں کی کنزوریاں آجاتی ہیں تو یہ لوگ اپنی اوقات سے بڑھ کر منہ پھاڑتے رہتے ہیں، ہمیشہ بلیک میل کرتے ہیں۔“

بیٹی کی اس حرکت سے وہ سخت تالاں ہوئی تھیں۔ ان کا راز ایک ملازم کو معلوم ہو گیا تھا، ان کی جلد بازی اور غفلت کے باعث۔

”نورے ماما! وہ خواب میں بھی مجھے بلیک میل کرنے کا سوچ نہیں سکتا، ایسے کتوں کی دم میں ہمیشہ پیرتے رکھتی ہوں۔“

”اوکے، گاڈ بلیس یو۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوئیں۔

”جھینکس ماما!“

”کیا انفارمیشن ملیس؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔“

”سب سے زیادہ اہم خبر یہ ہے کہ ان کی اکلوتی اولاد ایک لڑکی ہے، بس یہی انفارمیشن تو مجھے چاہیے تھی۔“

ان کی آنکھوں کی ہیبت ان کے چہرے پر چھانے لگی تھی اور ان کا حسین ترین چہرہ کسی خون آشام چڑیل جیسا بن گیا تھا۔

”بیٹی ہے..... مگر تم کو کرنا کیا ہے اس کی بیٹی کا؟“ اس کی باتیں قاعدہ پیگم کو ذرا بھی سمجھ نہ آ رہی تھیں۔

”گیس کریں ماما! ذرا ماحصل کے گھوڑے دوڑائیں کہ میں کیا کروں گی ان ذلیل لوگوں کی بیٹی کا؟“ ان کے مسکراتے انداز میں

زہری زہر تھا۔

”اوہ..... کہیں تمہارا ارادہ ان کی اکلوتی بیٹی کو بھونانے کا تو نہیں ہے؟ وہی پرانی اسٹوری کہ بہو پر ظلم و ستم ڈھا کر اپنا بدلہ لینے کا تو

ارادہ نہیں؟“ وہ کچھ توقف کے بعد گویا ہوئیں۔ ”مگر مجھے یہ ارادہ پسند نہیں۔ خود سوچو، کرن اور انس کی بیٹی کوئی عام لڑکی نہ ہوگی اور سب

سے بڑھ کر حسین کتنی ہوگی۔ دراصل اس جہان میں عورت کا حسن اتنی بڑی طاقت ہے کہ بڑے بڑے ریسلرز چپت ہو جاتے ہیں، ٹھکت کھا

جاتے ہیں، پھر کونین، ایک تو وہ فطرتاً صلح جو، مفاہمت پسند ہے۔ انکساری دے بے نفسی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ دم یہ کہ مختصری کو

نہ پانے کے غم نے اس کی رہی سہی کا یا پلٹ دی ہے۔ اب وہ تمہارے کسی منصوبے میں ساتھ نہ دے گا۔“

ماں کی گفتگو سن کر اس کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”ارے ایسے کیا مسکرا رہی ہو؟ میں نے غلط کہا ہے کیا؟“

”بس ماما!“ اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر وہ زور سے ہنس پڑی۔

”اس بار جو میں نے سوچا ہے وہ آپ کے کیا کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا، پھر میرے پلان کا مین کردار کونین کبھی نہیں ہو سکتا۔“

”کیا مطلب؟ پھر کون ہوگا؟“

”پرنس“۔ وہ مستحق خیزی سے گویا ہوئی۔

”پرنس؟ وہ کس طرح؟“ وہ حیرانگی در حیرانگی کا شکار ہوئیں۔

”مجھے تو تم ہے ماما جس کو صرف میں کھیل سکتی ہوں۔“

”مجھے سمجھاؤ تو سہی۔“ ان کا اندازہ اشتیاق تھا۔

”سمجھاؤں گی، ضرور سمجھاؤں گی، مگر ابھی نہیں، وقت آنے پر۔“ وہ اطمینان سے اٹھتی ہوئی بولی۔

”کب آئے گا وقت؟“

”بہت جلد..... بہت ہی جلد۔“

”اتنا وقت میں کس طرح گزاروں گی؟ مجھ سے سسٹمز ہنرم نہیں ہوتا۔“

”عادت ڈالیں۔ ابھی تو شروعات بھی نہیں ہوئیں اور آپ ابھی سے سراپکا رہی ہیں، پرنس آئے ہیں یا نہیں؟“

”کال آئی تھی، ابھی کچھ دیر بعد آئیں گے، کراچی آچکے ہیں۔“

”ڈنر میں تمام ڈشز ان کی لیورٹ بنوائی ہیں؟“

”بالکل، اس نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ ڈنر ہمارے ساتھ کرے گا۔“ فائقہ بھی ان کے ساتھ اندر کی جانب بڑھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”ماما! اب تو اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔ میرے انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کو اس نے ہی ٹھنڈا کرنا ہے۔ سالوں سے

رستے زخموں پر وہی مرہم رکھے گا۔ وہ یہ سب کرے گا، وہ کر سکتا ہے۔ وہ آگ سے بنا ہوا ہے۔ اس کے جسم میں شرارے دوڑتے ہیں۔ وہ

بے حد جذباتی ہے۔ ایسے لوگوں میں ان کے دماغ نہیں، جذبات حکومت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں اور کرنے کے بعد

انہیں بچھتاوا بھی نہیں ہوتا کہ کیا کیا جائے۔“ اس کے انداز سے وحشت گونج رہی تھی۔

”میں آپ کے ڈیڑی کو فون کر کے بتاؤں کہ انس اور کرن مل چکے ہیں۔ وہ خود معاملہ کلیئر کر دیں گے۔ میرے خیال میں ہمیں

اس معاملے میں ہر کسی کو ملوث نہیں کرنا چاہیے۔“

”نہیں ماما ڈیڑی کو میں خود اظہار کروں گی مگر انتقام کے بعد، ابھی تم مجھے پرنس کو لے کر ہی کھیلنا ہے۔“

☆.....☆.....☆

حورین کو ڈراپ کرتے وقت دل میں ایک انہونا خیال آتا تھا کہ کاش! وہ اسی طرح چہرہ جھکائے ہمیشہ اس کے پہلو میں بیٹھی

رہے، پھر وہ سزکبھی ختم نہ ہو۔ دل کی اس آرزو پر وہ ہنس پڑا۔ اس نے یہ کب چاہا تھا کہ اس لڑکی کے متعلق اس انداز سے سوچے کہ پھر اپنی

ہی سوچوں سے نظریں چراتا پھرے۔

اس کو ڈراپ کر کے وہ سارے راستے اس کے متعلق ہی سوچتا رہا تھا جس کے متعلق کبھی سوچنے کا تصور بھی نہ کیا تھا۔

دل پر ایسی ویرانی چھائی کہ ہر احساس پر اس سے چھڑنے کا سوگ چھاتا چلا گیا اور وہ فاسٹ ڈرائیونگ کرتا ہوا ہسپتال پہنچ گیا وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سر آفتاب کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔ وہ دوائیوں کے باعث ابھی بے خبر سو رہے تھے، وہاں ان کا ملازم تھا جس کی زبانی معلوم ہوا کہ حیدر کو آج اس کے رشتے دار آ کر لے گئے ہیں۔ ان لوگوں میں صلح صفائی ہو گئی ہے اور ساتھ ہی وہ پیغام بھی چھوڑ گیا تھا کہ وہ اس سے رابطہ نہ کرے، وہ خود موقع دیکھ کر کال کرے گا کہ وہ اس کو ان لوگوں کے سامنے نہیں لانا چاہتا، کیونکہ یہاں بھی اس نے اپنا کمرہ الگ لیا تھا اور خود کو تنہا ظاہر کیا تھا اور ملازم کے ذریعے ہی معلوم ہوا کہ صوبی بھی آج ہی ہارون کے ساتھ ساڈتھ افریقہ کے لیے روانہ ہو گئی ہے۔ ساتھ ہارون کی والدہ اور ماموں بھی چلے گئے، حالانکہ ماموں کو تو ابھی یہاں رہنا تھا مگر وہ حیدر کے سمجھانے کی وجہ سے چلا گیا۔ ان لوگوں کے خیریت سے نکل جانے سے اسے دلی مسرت ہوئی تھی کہ جن کی خاطر یہ سب ہوا تھا اگر کسی مصیبت میں پھنس جاتے تو ساری نکالینے اور پریشانی بے مقصد رہتی۔

ان کے جذبے نیک تھے، ریاضے پاک تھے، کامیابی کو تو مقدر بننا ہی تھا۔

پروفیسر آفتاب نے ہوش میں آتے ہی اسے سینے سے لگا لیا پھر حورین کا پوچھا تو اس نے تمام بات بتادی۔

”آپ نے میری عزت رکھ لی بیٹے! شکر یہ کے الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔ میرے سر سے کتنا بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر نمون لہجے میں بولے۔

”آپ میری تنگی ضائع کر رہے ہیں سر!“

”اللہ آپ کو بہت نوازے گا، میری دعا ہے رب کائنات سے کہ آپ کو کسی پریشانی میں جتنا نہیں کرے۔ ہر امتحان سے سرخرو فرمائے۔ (آمین)“

میرا بی بی یہ سوچ سوچ کر ناراض نہیں ہو رہا تھا کہ اس بچی کا کیا ہوگا؟ نہ معلوم کیسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہوگا۔ میں اس کے چہرے سے کیا کہوں گا؟ کس طرح ان سے رابطہ کروں گا؟

”سر! آپ جیسے لوگ جو دوسروں کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، بے لوث سب کے کام آتے ہیں، ایسے لوگوں کی اللہ حفاظت کرتا ہے اور آپ جیسے لوگوں کے فضائل ہم گناہ گار بندہ ہوں۔ یہ سب تو اس کی ہی مہربانی ہے۔ یہ فیضو کہاں چلا گیا؟ کھانا منگوا لیتا ہوں کسی

”ارے نہیں، میں تو بہت ہی گناہ گار بندہ ہوں۔ یہ سب تو اس کی ہی مہربانی ہے۔ یہ فیضو کہاں چلا گیا؟ کھانا منگوا لیتا ہوں کسی کو ایسی والے ہوٹل سے۔ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو، کھانا کھا لو اور پھر گھر پر جا کر آرام کرو۔“ وہ اس کے تھکے تھکے وجود پر نگاہ ڈالتے ہوئے اپنائیت سے گویا ہوئے۔

”فیضو کو میں نے کھانے کے لیے ہی بھیجا ہے۔ آپ پر ہیزی کھانا کھا لیجئے اور میں گھر جا کر کھاؤں گا۔ ماما رونا تو ویٹ کر رہی ہیں۔“

”او کے، میں ڈسپارچ ہو کر جاؤں گا تو آپ کو ڈنر میرے ساتھ کرنا ہوگا، وعدہ کریں۔“

”انشاء اللہ سر!وائے ناٹ۔“ اس کا لہجہ پُر یقین تھا۔

”مجھے خوشی ہے آپ اپنی ماما کا خیال رکھنے لگے ہیں، ان سے محبت کرنے لگے ہیں۔ کوشش کریں کہ ماں جیسی عظیم ہستی کا دل نہ

توڑیں، کبھی ان کی حکم عدولی مت کریں۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔“ وہ زبردہاری سے سمجھا رہے تھے۔

”اٹ! از رمانٹ سرائس پہلے بہت لفظ تھا۔ پاپا کے جانے کا قصور وار ماما کو ہی سمجھتا تھا کہ انہوں نے پاپا کے ساتھ کچھ ایسا نہ کیا

ہے جو پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ پاپا کے جانے کا سارا قصور میں ماما پر ہی ڈالنا تھا۔ انہیں ڈلا کر، انہیں ستا کر، ٹیز کر کے میں خوش ہوتا تھا

کہ پاپا کو ان کی طرف سے پہنچائے گئے تمام دکھوں کا احتساب میں کر رہا ہوں..... مگر اب انہیں دیکھ کر سوچتا ہوں اگر مری لفظ ہوتی تو آج

تجا نہیں ہوتی اور اس سوچ نے مجھے میری لٹلیوں کا احساس دلایا اور میں نے سچے دل سے توہ کی کباب زندگی بھر میں ان کو ڈکھ نہ دوں گا۔

آپ بھی ڈعا کریں سرائس اپنے فیصلے پر نابت قدم رہوں۔“

سر سے اجازت لے کر وہ گھر آ گیا۔

منال نے اس جذباتی انداز میں استقبال کیا کہ اسے محسوس ہوا جیسے وہ دو دن نہیں، دو سال بعد لوٹ کر آیا ہے۔ اس کی پیشانی

کے انہوں نے کئی بو سے لیے، ہار ہار سر سینے سے لگایا اور سب سے حیرت انگیز بات کہہ روئی بھی تھیں۔

وہاں موجود فاقہ اور کونین اس سے نارمل انداز میں ملے۔ ماں کی اس والہانہ محبت نے اسے بھی سرشار کر ڈالا تھا۔ وہ بھی ان

سے بے حد اپنائیت سے ملا۔ ان کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔

”پرنس یار! نہ معلوم تم کیوں مجھے قربانی کے بکرے کی طرح لگ رہے ہو۔ اس بے خبر کو بھی ذبح کرنے سے قبل ایسے ہی پیار و

محبت دی جاتی ہے۔“ وہ ذوالنون کو دیکھ کر شوخی سے گویا ہوا مگر منال بیگم جو مزید پیار نچھاور کرنا چاہ رہی تھیں، اس کی ذوق منی بات سن کر سنبھل

گئیں۔ فاقہ کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

”بقر عید تو ابھی بہت دور ہے۔ آپ کیوں ابھی سے یاد کرنے لگے۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

”کچھ سیانے بہت پہلے سے ہی قربانی کے بکرے کو پالنا شروع کر دیتے ہیں۔ بہت پیار و محبت سے پالتے ہیں، پھر اس کی

بڑیاں چوستے ہیں اور بوٹیاں بھون بھون کر کھاتے ہیں۔“

”میں نے سنا ہے زیادہ ثواب حاصل کرنے کی نیت سے لوگ پہلے ہی جانور پالتے ہیں اور دیکھا بھی ہے۔“

”ثواب.....“ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ”ثواب کی نیت تو کسی کسی کی ہوتی ہے، ورنہ سب کی نیت ایسے کھشت کی ہوتی ہے۔“

ذوالنون بہت غور سے بھائی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”ارے بے موقع کیا بحث چھیڑ کر بیٹھ گئے۔ چلو کھانا لگ چکا ہے، سب ساتھ کھائیں گے، مزہ آئے گا۔“

منال نے آگے بڑھ کر پہلے کونین کا بازو پکڑا، پھر پرنس کا اور دونوں کو لے کر کھانے کے کمرے میں آگئی۔

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد سب معمول چائے یا کافی کا دور چلنا مگر وہ معذرت کر کے اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔ اس کی تحسین کے خیال سے کسی نے اصرار نہ کیا۔

ہزاروں خواہشیں دل کے نہاں خانوں میں ہوتی ہیں

یہ بے آباد قصبے بھی کہاں ویران رہتے ہیں

بلا کی افراتفری ہے ہماری ذات میں لیکن

ہمیں اس بددھیانی میں بھی دھیان رہتا ہے

وہ نائٹ سوٹ زیب تن کر کے بستر پر لیٹا تو سب عادت سائینڈ ٹیبل پر روشن لیپ کو آف کر دیا۔ کمرہ ایک دم ہی گہرے

اندھیرے کا حصہ بن گیا۔ اس نے آنکھیں جیسے ہی بند کیں، ویسے ہی چم سے سیاہ بدلیوں میں ایک دم ہی نکل آنے والا وہ چہرہ کسی اداس میں

بیکے شندری چائے کی کھار میں جگر کا ماطلوع ہو گیا۔

”اگر تم نہ ملے تو میرا کیا ہوتا؟“ اسے لگا اس کے کندھے سے لگی وہ بھی آنسو بہا رہی ہے۔ اس کی گداز اٹھیاں ہنوز اس کے

بازوں کو گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔

اس نے بے چین ہو کر کروت بدلی۔

”میں معافی چاہتی ہوں آپ سے“۔ اس کی لڑزاں اور ندامت سے مہری آواز کانوں میں گونجی۔

”کس بات کی معافی؟“ یہ اس کی اپنی آواز تھی۔

”میں نے آپ سے بہت زیادتی..... نہیں بلکہ زیادتیاں کی ہیں۔ آپ وہ نہیں ہیں جو لگتے ہیں۔ آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کو

سمجھنے میں غلطی کی۔ بار بار انسلٹ کی۔“

”سوری کی کوئی ضرورت نہیں ہے جو آپ مجھے سمجھتی ہیں میں اس سے بھی زیادہ خراب اور نڈا آدمی ہوں۔“

”پلیز ایسا مت کہیں۔“ وہ از حد پریشان تھی۔

”بلبل! اگر اس دنیا میں سرخوردہ بنا چاہتی ہو، کامیابی کے ساتھ تو کسی پر بھی اتنی جلدی بھروسہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں

تو لوگوں کا کام ہی اپنی مکاریوں کا فریب دینا ہے۔“

”مجھے علم ہے، آپ مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہیں۔“

”ہمارے بزرگوں نے آپ کی صنف کی اسی خوبی پر کبھی بھروسہ نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ بڑوں کی بات سے میں کیسے انکار کر

سکتی ہوں؟“

اس کی مسکراتی ہوئی آواز ابھی بھی اسے اپنی ساتوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”میری سب سے بڑی بے وقوفی یہی ہے کہ میں نے آپ سے معذرت کرنا چاہی، یہی میری حماقت ہے۔ ہے نا؟“

”یو ڈونٹ مائنڈ، آپ خود ہی بار بار اپنی تعریف کر رہی ہیں۔“

”آپ نہیں سدھر سکتے۔ آپ انجوائے کرتے ہیں، دوسروں کی انسلٹ کر کے، انہیں ذہنی تارچہ کر کے۔ میں آپ سے بات نہیں کروں گی۔“

اس کی نگاہوں میں اب اس کا ناراض چہرہ تھا جو یکفخت غائب ہو گیا اور ساتھ اس کی نیند بھی لے گیا۔ وہ مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھا۔ گھپ اندھیرے میں وہ اس چہرے کو تلاش کر رہا تھا جو ابھی اس کے تصور کے آسمان پر چاند کی مانند چمک رہا تھا، پھر اچانک ہی وہ چاند سیاہ بادلوں میں چھپ گیا اور وہ جو نیند کے غمار میں بستر پر آیا تھا اس نے راستے میں اسے کتنا تنگ کیا تھا، وہ زنج ہو کر ہار بیٹھی کبھی کہ اب بات نہیں کروں گی مگر زیادہ دیر کی خاموشی اسے بھی پسند نہ تھی۔ سب بھلا کر پھر شروع ہو جاتی اور وہ بھی اسے نہ ٹوکتا کہ کچھ دیر قبل اس نے کیا کہا تھا۔ اس کی باتیں، اس کی آواز ایک دم ہی بہت بیٹھی گئے گی تھی۔

نیند تو ایسی فرار ہوئی کہ آنے کا نام ہی نہ تھا۔ وہ یو جمل دل سے اپنے روم کا دروازہ کھول کر باہر گیلری کی جانب بڑھتا ہوا تھا کہ برابر میں کونین کے پورشن کی طرف دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ کونین کے بیڈ روم کا دروازہ لاک نہ تھا اور اندر سے آتے دھوئیں نے اسے ایک دم اس طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بے تماشہ بھاگتا ہوا کمرے تک پہنچا۔

اندر داخل ہوتے ہی گہرے دھوئیں نے اس کا استقبال کیا۔ اندر آگ دیکھ کر اس کے حواس بے قابو ہو گئے۔ وہ اونٹھے منہ پڑے بے حس و حرکت کونین کو دیکھ کر مڑی طرح چیخا ہوا اس کی طرف بڑھا۔



تیزی سے جھک کر اس نے اونٹھے پڑے کونین کو سیدھا کیا تھا۔ وہ شاید دھوئیں کے باعث دم گھٹنے سے بے ہوش ہو گیا تھا، مگر اس کے چہرے یا جسم پر کوئی چوٹ یا زخم کے نشان نہ تھے۔

اسے چھوڑ کر وہ پیچھے مڑا تھا جہاں کارپٹ کے خاصے بڑے حصے نے آگ پکڑی تھی اور شدید ترین دھوئیں میں اسے اپنا دم گھٹاتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے اٹھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے پانی سے لبریز جگ کو آگ پر چھڑکا تھا۔ چمن چمن چمن کی تیز آواز کے ساتھ کافی حصے سے آگ بجھ چکی تھی۔ اس نے کھڑکیوں سے پردے ہٹائے تو کمرے میں بھرا دھواں باہر ہواؤں میں تحلیل ہونے لگا تھا۔ دھواں دیکھ کر وایج من مرہٹ بھاگتا ہوا آیا تھا۔

”کیا ہوا صاحب! یہ دھواں کیسا ہے؟“

”سب خیریت ہے آپ جاؤ۔“ وہ واپس چلا گیا تھا۔ چوکی دار کو اس نے دروازے سے ہی واپس کر دیا تھا۔ اس کی فراخ پیشانی



پُرسوجھنوں سے پُرتھی۔ چہرے پر بھی گئی پریشان کن رنگ تھے۔ سب سے پہلے وہ کونین کو کسی چھوٹے بچے کی طرح اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اپنے بیڈروم میں لے یا تھا اور بیڈ پر لٹا کر اس کی نبض چیک کی جو اب نارمل تھی اور اسے کچھ دیر بعد ہوش آنے والا تھا۔ ذوالنون اٹھ کر دوبارہ اس کے بیڈروم میں آ گیا جہاں اب آگ اور دھواں نہ تھا مگر اسمیل باقی تھی۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسکاٹی کارپٹ پر بکھرے ان سگریٹ کے ککڑوں کو دیکھا تھا جن کے باعث آگ لگی تھی۔ وہ آگ تو اس کی بروقت مداخلت سے بجھ چکی تھی مگر ان استعمال شدہ سگریٹ کے ککڑوں نے جو اس کے اندر آگ سلگائی تھی، اس کی شدت حد سے سواتھی۔

کونین کا بدلا بدلا رویہ اور کھویا کھویا انداز تو وہ خاصی مدت سے دیکھ رہا تھا اور کئی بار اس کی اس تبدیلی و پریشانی کی وجہ بھی جانتا چاہی مگر ہر بار وہ ہنس کر ٹال گیا یا اس انداز میں موضوع بدلا کہ وہ پھر اصرار نہ کر سکا اور وہ اندر ہی اندر کوئی ڈکھ پاتا رہا۔

وہ ڈکھ کیا ہے.....؟ کیا روگ پال لیا ہے.....؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا معاملہ ہے..... ایسی کیا بات ہے جو وہ اس سے بھی پرائیوٹسی برتنے پر مجبور ہو گیا، جس سے ہر بات، ہر مسئلہ شیئر کرتا تھا۔ قریب ہی الٹی پڑی الیش ٹرے میں اس نے وہ تمام سگریٹ کے ککڑے جمع کیے اور اپنے روم میں چلا آیا جہاں کونین اسی وقت اٹھ کر بیٹھا تھا۔ ذوالنون نے الیش ٹرے والا ہاتھ پشت کی جانب کر لیا۔

”اورے..... میں تمہارے بیڈ پر کیسے آ گیا؟ میں تو اپنے روم میں تھا.....“ وہ حیرانگی سے اس کی جانب دیکھتا ہوا گیا ہوا۔

”آپ نیند میں چلنے لگے ہیں۔“ وہ قریب کر ہی پر بیٹھ گیا۔

”میں اور نیند میں؟ امپاسبل.....“ کونین نے مسکرا کر کہا۔

”پھر آپ میرے روم میں کس طرح آ گئے؟“

”میں کیسے آ گیا؟ پلیز یا رہیلیاں مت بھھاؤ۔“

”ہیلیا میں نہیں آپ بن گئے ہیں بھائی۔ مجھتیں اور امانت تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے مگر ہمارے ساتھ تو متنازعہ معاملہ ہے۔“ بہت عرصے بعد ذوالنون کو اس نے پرانے موڈ میں دیکھا تھا اس کی سنجیدگی اور سوچتی آنکھیں مقابل کو کسی قابل نہیں چھوڑتی تھیں۔

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہو پرس! میری محبت تمہیں کیونکر کم محسوس ہوئی؟ میرا اعتماد تمہیں کہاں کمزور محسوس ہوا؟“

”یہ کیا ہے بھائی؟ ان عارضی سہاروں کی ضرورت آپ کو کب سے محسوس ہونے لگی؟“ اس نے پشت کی جانب کیا ہوا ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا تو کونین بھونچکا سا رہ گیا۔ اپنی غائب الدماغی پر اس کی نظریں چمکتی چلی گئیں۔ اسموگنگ اس نے سب سے چھپ کر شروع کی تھی۔ دل کی دھستوں کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڈانے کی سعی کیا کرتا تھا۔ خضریٰ سے رشتہ توڑ کر اس دھوئیں سے اس نے جوڑ لیا تھا اور سوچا تھا کبھی کسی کو اس کے اس فعل کی خبر نہ ہوگی اور خبر ہوئی تو کس کو..... جس کے آگے وہ شرمسار ہو گیا تھا۔

”آپ نے ہمیشہ ایسی بیڈھٹ سے نفرت کی ہے، پھر ایسا کیا ہوا کہ آپ چین اسموکر بن گئے؟ اگر میں اتفاقی طور پر گیلری کی طرف نہ جاتا تو..... نہ مظلوم آپ کو کتنا نقصان پہنچتا اور ہمارے لیے تو زندگی اور زیادہ بوجھل ہو جاتی۔“ شدت جذبات سے اس کی آواز لرز

اٹھی تھی۔ کونین گویا مجھے کی مانند اسے تک رہا تھا۔

”آج آپ کو بتانا ہی ہوگا، بھائی کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ.....؟ ایسا کیا ہے جس نے آپ کو ہم سے دور کر دیا ہے، ایسا کیا ہوا ہے؟“ اس کا انداز حسی و ٹھوس تھا۔

”تھنک یار! کچھ نہیں ہوا ہے..... کیا ہوگا بھلا؟“

”آپ می سے بھی دور ہو گئے ہیں، یہ میں بہت عرصے سے فیل کر رہا ہوں۔“ وہ آج اس کو بخشے کے موڈ میں نہ تھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو، ایسا کچھ نہیں ہے اور یہ اسموگنگ تو میں نے ایسے ہی شروع کی تھی، اب چھوڑ دوں گا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ بڑوں کو ایسے کوئی قابل گرفت کام نہیں کرنے چاہئیں جو چھوٹوں کے آگے لگا ہیں جھکانے پر مجبور کر دیں۔“

”بھائی!“

”لیں۔“

”میری طرف دیکھیں۔“ اس کے انداز میں مہمبیر سنجیدگی تھی۔

”تمہاری طرف ہی دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے پچھلی مسکراہٹ سے کہا۔ ڈوالٹون اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر بولا۔

”اب وہ قاتل جو ایک عرصے سے چھپاتے آ رہے ہیں۔“

☆.....☆.....☆

مول، زویا، نضر، وغیرہ کو وہ جھوٹ و بیچ کی آمیزش سے ایک کہانی تیار کر کے سنا چکی تھی۔ یہاں زیادہ پریشانی اس کو یوں نہ ہوئی کہ جن حالات میں ہارون و صبوحی کی شادی ہوئی تھی۔ اس سے وہ ناواقف تھیں، اس لیے اسے اتنی تک دوڑ نہ کرنی پڑی تھی۔ ڈوالٹون کے سنگ گزارا وقت اس نے نہیں بتایا تھا۔

”آنے سے اس کے آئے بہار

جانے سے اس کے جائے بہار

بڑی مستانی ہے میری محبوبہ

میری زندگانی ہے میری محبوبہ“

ہریرہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے گنگلتا تھا۔

”اس دیری بیڈ سوگ۔“ وہ دور کھکتے ہوئے بولی۔

”پھر بتاؤ خود ہی کون سا سناؤں۔“ وہ جبکہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا شوخی سے گویا ہوا تھا۔

”دور ہٹو بد تمیز“۔ وہ اسے ہاتھوں سے دور کرتی ہوئی یولی۔

”اگر تم سے محبت کرنا بد تمیزی ہے تو میں خود کو بد تمیز کہلوانے میں فخر محسوس کروں گا“۔ وہ سینہ تان کر بولا۔

”اوہ گاڈ! تم ایسی باتیں کرتے ہو“۔ وہ زچ ہوئی۔

”اس لیے کہ تم ایسی باتیں نہیں کرتی ہو“۔ وہ برجستہ بولا۔

”میرا دماغ خراب نہیں ہوا ہے جو ایسی باتوں کروں گی“۔

”میرا دماغ ہی نہیں آنکھیں بھی خراب ہیں تب ہی تم جیسی بد صورت، بد مزاج، چڑچڑی لڑکی کی محبت میں جھلا ہو گیا ہوں“۔ اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

”تم..... تم جاتے ہو یہاں سے یا میں بی بی جان کو بلاؤں؟“ وہ بری طرح زچ ہو چکی تھی۔

”ہاں ہاں شوق سے۔ میں چاہتا ہوں بی بی جان وہی کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی فیصلہ کر ہی ڈالیں“۔ اس کے لیوں پر گہری

مسکراہٹ تھی۔

”شٹ آپ“۔ وہ غصے سے کھڑی ہوتی ہوئی چینی۔

”آئی ڈونٹ مانسٹ“۔ ہریرہ نے شانے اچکائے۔

”تم سے بات کرنا ہی فضول ہے، جارہی ہوں میں“۔ وہ غصے سے خون خوں کرتی آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”آئم سوری یار۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ پلیز بیٹھو تو سہی۔ میں نے تمہیں کتنا مس کیا ہے، کتنا یاد آئی ہو یہ تو سنو“۔

”یاد تو تمہیں بہت آئی ہوں گی کہ تنگ کرنے کے لیے جو کوئی نہ ملا ہوگا۔ تمہیں شرم نہیں آتی مجھے تنگ کرتے ہوئے۔

”میں تنگ نہیں کر رہا، حقیقت بتا رہا ہوں“۔

”مجھے نہیں سننی“۔ وہ وہاں سے سیدھی اپنے پورشن میں آگئی جہاں حسب معمول خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چپا آفس اور مرابی بی

جان کے روم میں تھیں۔ وہ بیڈ روم میں آکر بیڈ پر لیٹ گئی جب سے گاؤں سے آئی تھی، طبیعت میں عجیب سی بے کلی محسوس ہونے لگی۔ وہاں

سے آئے اسے آج تیرا دن تھا اور موڈ فریش ہونے کے بجائے بوجھل پن بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کیفیت کو

وہ کوئی نام بھی نہ دے پاری تھی کہ ایک دم سے ہی آدم بے زار کیوں ہو گئی تھی۔

اس دوران پروفیسر آفتاب سے بھی اس کی بات ہوئی تھی۔ ان کی طبیعت اب پہلے سے قدرے بہتر تھی۔ وہ ڈسپارچ ہو کر گھر جا

چکے تھے۔ حیدر کے متعلق ابھی تک کوئی خبر نہیں مل سکی تھی۔ اس کے متعلق جاننے کے لیے اس نے دوبارہ ڈوائٹون کو کال کی تھی مگر وہاں سے

کوئی جواب نہ ملا تھا۔ اس نے کال ریسیونڈ کی تھی اور یہی بات اسے اُداس کیے ہوئے تھی۔

☆.....☆.....☆

صنوبر بیگم نے ساس کے دینے ہوئے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مہران علوی کی والدہ کو وہی جواب دیا تھا کہ اگر وہ اپنے بیٹے کی شادی جلدی کرنا چاہتی ہیں تو کہیں اور کر سکتی ہیں، انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا اور جواب میں انہوں نے کہا تھا۔ وہ اس گھر کے علاوہ کسی اور سے رشتہ جوڑنا نہیں چاہتیں، اس کے لیے خواہ انہیں کتنا انتہا رہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

مہران علوی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ حضرتی کے پاس ہاسٹل پہنچے تھے، بہت رنجیدہ سے۔

”آپ اس بات کو اتنا سیریس کیوں لے رہے ہیں مہران صاحب ابائی داوے می نے ایسے ہی کہہ دیا ہوگا۔“ حضرتی نے آہستگی سے کہا۔

”یہاں میری جان پر بن آئی ہے اور آپ کو کوئی پروا ہی نہیں ہے.....“ مہران نے شکوہ کنناں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”لائف بہت منف ہے اگر ایسی معمولی معمولی باتوں کو دل پر لیس گے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ ٹرائی کیا کریں اور ایڈجسٹ کرنے کی۔“

بے بی پنک کاشن کے سوٹ میں اس کی شفاف رنگت نمایاں تھی۔ خوب صورت چہرے پر حکمت تھی، ہر دو قاری جاؤ بیت تھی۔

”خبریت تو ہے ناں مہران صاحب ا“ اپنی جانب اسے مسلسل دیکھتا پا کر وہ کچھ حیرانگی سے گویا ہوئی تھی۔

”ایک بات ہے جو ہمیشہ سے مجھے تنگ کر رہی ہے اور اکثر میں نے چاہا کہ آپ سے وہ بات شیئر کروں۔ پوچھوں جو میں ٹیل کر رہا ہوں، جو میرا دل کہہ رہا ہے یہ کس حد تک درست ہے، مگر ہر بار میری زباں پر یہ بات آتے آتے ڈک جاتی تھی۔ میں ڈر جاتا تھا کہ کہیں

میں آپ کو کھوندوں۔ آپ فحاشہ ہو جائیں۔“

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

مہران علوی کو پہلی بار اس نے سمجھ دیا اور پریشان دیکھا تھا۔

”ایسی کیا بات ہے؟“

”آپ پراس کریں کہ جو میں آپ سے پوچھوں گا، آپ بالکل سچ بتائیں گی۔“ اس کا لہجہ شدید ذہنی الجھنوں کا غماز تھا۔

”میں جھوٹ نہیں بولتی، جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔“ وہ پوری توجہ سے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ مہران علوی کئی لمحوں تک خاموش رہا تھا۔ ٹیل کی سلخ پر ان کی انگلیاں اضطرابی انداز میں نقش و نگار بناتی مٹاتی رہی تھیں۔ کچھ توقف کے بعد گویا ہوا۔

”میں..... میں یہ ٹیل کر رہا ہوں آپ..... میرے ساتھ خوش نہیں ہیں۔“ مہران علوی کی آنکھیں اس سے اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

دو اپنی کئی گئی بات کا رد عمل اس کے چہرے کے تاثرات سے جانچنا چاہتا تھا۔ زبان سیدھی بات کو بھی کئی طرح کے ہیر پھیر دینے کی

ماہر ہوتی ہے جس طرح چاہے صورت حال کو مخالف و موافق کرنے کے ہنر سے آشنا ہوتی ہے۔ زبان کی بہ نسبت چہرہ اور آنکھیں اتنی تیزی سے خود کو نہیں بدل سکتی ہیں اور اس کے چہرے کی اڑتی رنگت و نگاہوں کی بوکھلاہٹ نے اس کے خدشوں کو حقیقت کی زبان دے دی تھی۔

اس کے دل کی دھڑکنیں یک دم ہی تھمنے لگی تھیں۔ ہر متحرک دھندلا گیا تھا۔

”لب واکرنے سے قبل سوچ لیجئے، آپ نے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے۔“

”مجھے یاد ہے مگر جو آپ نے کہا وہ بھی..... غلط نہیں ہے۔“ حضرتی نے صاف گوئی سے کہا اور مہران طلوی اسے دیکھا رہ گیا۔

”مجھے افسوس ہے آپ کو یہ سن کر شاک لگا ہے مگر میں نے آپ سے کہا تھا میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”ایسا کیوں ہوا؟ میرا مطلب آپ کے والدین نے آپ کو فورس تو نہ کیا ہوگا..... پھر آپ زبردستی کیوں سب کرتی رہیں؟“ وہ

فلکت لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”دادو اور می نے جب مجھ سے پوچھا اس وقت تک میں سمجھتی تھی کہ بہت آسانی سے میں کپرو مائز کر لوں گی، لائف سیشنل ہو

جائے گی مگر گزرتا وقت مجھے احساس دلانے لگا ہے جو ہم سوچتے ہیں ویسا کبھی نہیں ہوتا۔ کچھ جذبے ایسے ہوتے ہیں جن سے ہم کپرو مائز

نہیں کر سکتے۔ کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن کو سینے میں دبائے ڈنیا سے گزر جانے کو دل کرتا ہے۔ بہت اچھا ہوا مہران صاحب جو آپ نے

کہہ دیا، ورنہ مجھے کہنے میں بہت دیر ہو جاتی۔ آپ کو زندگی کا سفر کسی اور کے ساتھ کرنا ہوگا۔ میں آپ کے لیے اچھی لائف پارٹنر ثابت نہ ہو

سکوں گی۔“ اب چھپانے کو بچا ہی کیا تھا سو وہ سب کہتی چلی گئی۔

”ہوں..... آپ نے مجھے فیصلہ بھی سنا دیا..... اتنی جلدی کس بات کی ہے؟“

”جلدی نہیں، بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ سنایا ہے۔“

”یہ بات اور یہ فیصلہ ہمارے بڑوں کے درمیان ہوا تھا۔ میں اس کو توڑنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا ہوں۔“

”او کے میں بات کروں گی۔“

”مجھے کچھ وقت چاہیے پلیز، ابھی آپ خاموش رہیں۔“ مہران طلوی کے انداز میں اُلجھنیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ سب لاؤنج میں بیٹھی ہوئی عنقریب ہونے والی وصی کی شادی کی تیاریوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ ساتھ ان کے بی بی جان بھی تھیں۔

”بی بی جان! آپ ہی فیصلہ کیجئے، گولڈ کے جیولری سیٹ کتنے خوائے جائیں اور کتنے تولے کے خوائے جائیں؟“ میرا ان سے

مخاطب ہوئی تھیں۔

”میری مانو تو ایک بھی گولڈ کا سیٹ نہ خنواؤ تو بہتر ہے۔“

”ایسا کس طرح ہو سکتا ہے بی بی جان..... بھلا سونے کے بغیر بھی شادی ممکن ہے؟“ میرا حیرانگی سے گویا ہوئی تھی۔

”پھر ہم سوسائٹی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، صاحب حیثیت کہلاتے ہیں۔“ میرا کی حیرانگی بھی میرا کی طرح تھی۔

”یہ تو میری سوچ ہے جو میں نے کہہ دی اور جو تم بہتر سمجھو کرو۔“

”بی بی جان! آپ نے جو کہا ہے ضرور اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔ آپ کھل کر وضاحت کیجئے۔ یہ بے حد اہم معاملات ہیں۔“

کرن نے سیرا حیرا کی ہونٹیں دکھائی کران سے کہا۔

”میں جانتی ہوں لڑکے کی بارات بری اور لڑکی کی جہیز سے جتنی ہے جن میں خاص شے زیورات ہوتے ہیں۔ خواہ وہ بیروں کے ہوں یا چاندی سونے کی۔ ایک وقت تھا جب بے حساب طلائی زیورات شادی میں پہنائے جاتے تھے۔ پچاس پچاس تولہ سونا خود سیرا حیرا کو اماں ہانے زیورات کی شکل میں دیا ہے جن میں ایک ایک سیٹ بیروں کا بھی تھا۔ اس دور میں یہ سب اتنا آسان نہ تھا تو اتنا مشکل بھی نہ تھا۔ دل بھر کر انہوں نے زیورات پہنے تھے مگر آج وہ دور نہیں ہے۔ اچھے بڑے لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں۔ چوروں، لٹیروں سے یہ جہاں کبھی بھی مکمل پاک نہیں رہا ہے۔ اس وقت میں بھی چوریاں ہوتی تھیں، ڈاکے ڈالتے تھے، لٹیروں سے لوٹتے تھے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ لوگوں نے خوف کے مارے زیورات کا استعمال ہی ترک کر دیا ہو۔ آج کے دور میں لوگوں کے پاس سونا چاندی، ہیرے جواہرات سب کچھ ہے مگر وہ استعمال نہیں کر سکتے کہ لوگوں کا ایمان اب اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ نہ انہیں اللہ کا خوف رہا ہے نہ آخرت کی فکر..... اپنی عزت و غیرت بھلا کر شیطان کا موموں میں لگ گئے ہیں۔“

”آپ کی بات درست ہے بی بی جان! آج چمن جانے یا چوری ہو جانے کے خوف سے لوگ مجبوراً آرٹیفشل جیولری استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔“

”میں کہتی ہوں پھر کیا ضرورت پڑ گئی، ایسے خطرات مول لینے کی..... پھر انہیں استعمال بھی نہ کرو۔ خفیہ جگہوں پر سینت سینت کر رکھو۔ اس سے بہتر ہے سونے وغیرہ کی جیولری نہ دو۔ ان ہی روپوں میں کچھ اور ملا کر زمین، قلت یا کوئی گھر گنت کر دو عمر بھر کی آسانی ہے، یہ جب تک ساتھ رہیں تب تک وہ کرائے پر دے دیں اور جب ضرورت پڑے تو خود سیٹل ہو جائیں۔ نہ اس کے چوری ہونے کا خدشہ نہ چھپا کر رکھنے کا جھنجھٹ۔ اگر دل نہ مانے تو ایک ہلکا پھلکا سا بنوادو پھر آج کل تو ویسے بھی شادی، ویسے میں سینگ کے فل سیٹ ہوتے ہیں اور دیگر سیٹ لے لینا میرا تو یہی ارادہ ہے۔“

”بی بی جان! آئیڈیا تو آپ کا زبردست ہے مگر ذرا مشکل بھی ہے۔ دراصل معاشرے کے بنے ریت و رواج اتنی آسانی سے تو نہیں بدلتے ناں۔“ سیرا نے ان کے مشورے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”آہستہ آہستہ ہی کسی بدلنا تو چاہیے۔“

پھر کافی دیر تک موضوع گفتگو زیورات و بری کے دوسرے لوازمات رہے تھے، کیونکہ گھر کے بچوں میں سے یہ پہلی شادی تھی۔ سب کی خوشی دیدنی تھی۔ ہر کوئی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا خواہاں تھا۔

کرن انس کے آنے پر اپنے روم میں آگئی تھیں۔ انس صاحب ہاتھ سے قارغ ہو کر بیٹھے تو ملازم چائے لے کر آئی تھی۔

”کیا بات ہے ڈیئر! کچھ دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں، بے حد آپ سیٹ رہنے لگی ہو کیا پرالم ہے؟“ چائے پیتے ہوئے وہ

مخاطب ہوئے۔

”کچھ نہیں“۔ وہ قریب بیٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”کوئی تو بات ہے جو رخ روشن پر بدلیاں چھائی ہوئی ہیں۔“

”میں یہاں آ کر خوش نہیں ہوں، ہر پہل مجھے یہ دھڑکا لگتا رہتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے، کوئی سماعتوں میں سرگوشیاں کرتا ہے۔“

راتوں میں عجیب خواب دیکھنے لگی ہوں۔“ ان کے لہجے میں اضطراب و بے بسی تھی جو تنہائی پاتے ہی کسی آسیب کی طرح چٹ جاتی تھی۔ سب کے سامنے وہ خود جو سنجال لیتی تھیں، بہلا لیتی تھیں مگر تنہائی میں وہ انہی دوسروں کو ہموں کا شکار ہو کر مضطرب رہنے لگی تھیں۔

”ڈونٹ وری ڈارنگ ایہ سب آپ کے دل میں چھپ ہوئے برسوں کے ڈر و خوف ہیں جو موقع ملتے ہی حاوی ہو جاتے ہیں۔“

”میں مانتی ہوں ایسا ہی ہے مگر آپ کیوں یہ بھولتے ہیں کہ یہ ڈر و خوف محض میرا وہم نہیں ہیں..... حقیقت ہیں پھر آپ یہ بھی

کیوں بھولتے ہیں کہ ہم دشمنوں کے شہر میں ہیں۔ کبھی بھی، کبھی بھی، کسی موڑ پر ہماری ان سے ٹک بھڑ ہو سکتی ہے۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔“

کرن کے اندیشوں پر انس ہمیشہ کی طرح مسکرا دیئے تھے۔

”آپ ہمیشہ میری پریشانوں کو مذاق میں آزادیتے ہیں۔ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ اب ہم دونیں، ہماری بیٹی بھی ہے، اگر

حورین کو.....“

”پلیز کرن!“ انہوں نے کپ سا اینڈ ٹیبل پر رکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”بلاوجہ کے وہم میں مت پڑا کرو کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ میری بیٹی کا بال بھی بیکا کر سکے۔ حورین میری زندگی ہے، میری

جان ہے۔“

”وہ ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی محبت ہی ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے اور لوگ کمزوریوں سے قائمہ اٹھاتے ہیں۔“

”محبت کمزور ہوتی ہے، محبت کرنے والے نہیں۔“

”پھر بھی انس میں چاہتی ہوں ہم یہاں سے واپس چلیں اور ساتھ حورین کو بھی لے چلیں۔ میں یہاں مطمئن نہیں ہوں۔“ ان کی

آنکھوں میں انجانا خوف اور لہجے میں دوسو سے لرزاں تھے۔ انس صاحب نے ہاتھ بڑھا کر انہیں شانے سے قحام لیا۔

”میں ہوں ناں کچھ نہیں ہوگا۔ تم اور حورین ہی تو میرے جینے کی وجہ ہو، ورنہ میرے پاس کیا ہے جو مجھے زندہ رہنے پر راضی

کرے اور پھر اب وہ کوشی بھی ڈیکوریشن کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کا کیا ہوگا جو اتنے پیار و شوق سے خریدی ہے تم نے؟“ انس

صاحب کے لہجے میں نرمی و پیار تھا۔ اپنا نیت و بے لوث محبت کے اسی انداز نے کرن کو ان سے نتھی کیا ہوا تھا۔

”چلیں وہاں کا ایک راؤنڈ لگا کر آتے ہیں، ڈنر بھی باہر کریں گے۔“ قبل اس کے کہ کرن کچھ کہتی، اسی لمحے دروازہ ٹاک کر کے

حورین آئی۔

”اوہ آئیے آئیے کیسے فرصت مل گئی ہماری بیٹی کو ہمارے پاس آنے کی؟“ حورین کو دیکھ کر وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔

”جی! یہ فاضل ہے، بڑی آپ رہتے ہیں، میں نہیں۔“ وہ آکر ان کے شانے سے لگ کر شکایتی انداز میں گویا ہوئی۔  
”اس کو کہتے ہیں اُلٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے۔“

کرن نے بھی بیٹی کو محبت پاش لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سیاہ و سفید پرینٹڈ سوٹ میں اس کی سرخ و سفید رنگت و چہرے کے دلکش نقوش واضح تھے۔ اس کے سادہ چہرے پر تازگی تھی، براؤن بالوں کی چوٹی کمر پر جھول رہی تھی۔ کانوں میں گولڈ کے نازک سے رنگ تھے اور ہانسیں ہاتھ میں رسٹ واچ۔ سوٹ کی میچنگ کا دوپٹہ بہت سلیقے سے اوڑھا ہوا تھا۔ کرن کو جو اس سے اختلافات رہتے تھے۔ وہ بی بی جان کی صحبت میں رہ کر مٹ چکے تھے۔ اسی لیے وہ بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگی تھیں۔ ابھی بھی ان کی نگاہیں بالائی بالا اس کی نظر اُتار رہی تھیں جو اس سادگی میں بھی رحمانی و دل ربائی کا چکر تھی۔

”پہلو تو آپ یہ بتائیے کہ ہم میں سے چور کون ہے اور کو تو ال کون؟“ انس بیٹی کو لپٹاتے ہوئے شوخی سے کرن سے گویا تھے۔  
”میں۔“ ہاپ بیٹی کو مسکراتے دیکھ کر وہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔

”دونوں آپ ہی ہیں..... چور بھی، کو تو ال بھی؟“

”اوہو۔ آپ تو بعض اوقات بال کی کمال نکال لیتے ہیں۔“ وہ بیٹھ گئی تھیں۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ کی روشنی تھی۔

”یونہی کب سے کل رہتی ہے؟“

”کل سے۔“

”پروفیسر صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہوئی کیسے ہیں وہ؟“

”ٹھیک ہی ہوں گے۔ کل یونہی کب سے ملاقات ہوگی۔“ سر آقا ب کے نام پر وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

کونین چند دنوں کے لیے بزنس ٹور پر ناروے چلا گیا تھا۔ اس رات ڈالٹون کی جذباتی کیفیت اور قسم دینے پر اس نے اپنے دل کی ہر بات اس کو سنا ڈالی تھی۔ ایک عرصے سے جو خباہت وہ اپنے دل میں چھپائے نڈھال ہو رہا تھا، اسے سنا کر کافی ہلکا پھلکا اپنے دل و دماغ کو محسوس کر رہا تھا۔ اس تمام قصے کو اس نے صرف اپنی ذات تک محدود رکھ کر سنایا تھا نہ اس میں خضریٰ کی چاہت کا بتایا تھا کہ وہ بھی اسے دل ہی دل میں چاہتی ہے اور نہ ہی ماما اور نانو کی وہ تمام باتیں و حرکات بتائی تھیں جن کے باعث وہ ان سے دور ہوا تھا۔ بھائی کی پسندیدگی سن کر وہ ششدر ہو گیا تھا کہ خضریٰ کو ہی اس نے کونین کے حوالے سے دیکھا تھا اور اب وہ کسی اور کی امانت تھی۔ کونین اس سے خاموش رہنے کے عہد و پیمانے لے کر جا چکا تھا۔

وہ بھائی کی نامرادی پر متشعل ہو کر رہ گیا۔ حیدر کے ساتھ وہ یونہی کب سے گیا تھا۔ دو جیریز کے بعد فری جیریز تھے۔ وہ اسے لے کر

کینٹین چلا گیا۔



”کیا بات ہے، کچھ ڈسٹرب دکھائی دے رہے ہو؟“ حیدر نے چائے کا آرڈر دینے کے بعد اس کے سنجیدہ چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے آتم رائٹ۔“

”مجھے تم سیڈ دکھائی دے رہے ہو۔ کوئی آنکھن ہے، کوئی پریشانی ہے جو تمہاری آنکھوں میں سرخی سے نمایاں ہے کہ شاید تم نیند بھی پوری طرح نہیں لے رہے۔ کوئی توجہ ہے ناں پھر تم ہی تو کہتے ہو کہ خوشیاں ہانٹنے سے زیادہ ہوتی ہیں اور ڈکھ ہانٹنے سے کم۔“

”جس شخص کی پوری حیات ہی ڈکھ و محردیوں سے عمارت ہو، وہ کس سے ڈکھ شیئر کر سکتا ہے اور کون کب تک کرے گا؟“

”کیا سوچ رہے ہو یا؟“ حیدر اسے خاموش دیکھ کر گویا ہوا۔

”یو آر ناٹ کنفیوڈ آتم ویری ویری پرلیکٹ انڈرا سٹوڈ۔“ اس نے وجہ سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ وینٹر سے چائے لیتے ہوئے گویا ہوا۔

”میری دعا ہے ایسا ہی ہو۔“

”کل صبح کی کال آئی تھی۔ وہ بہت خوش ہے ہارون بھائی سمیت سب کی بے حد تعریف کر رہی تھی۔“ اس نے چائے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اگر ہمارے اپنے خوش ہوں تو ہم از خود ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ اپنوں کی خوشیاں، اپنوں کے ڈکھ براہ راست ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔“

”ہوں۔ یہ بات تو پرلیکٹ ہے۔ سر آفتاب کی طرف چلتے ہیں وہ آج بھی نہیں آئے ہیں۔ شاید ابھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ ڈوانون نے چائے کے بسپ لیتے ہوئے کہا۔

”حورین سے ملاقات ہوئی ہے تمہاری؟“

اچانک حیدر نے پوچھا اور لمبے بھر کو اس کے اندر کھلبلی مچتی تھی۔

”وہاں سے آنے کے بعد ایک بار بھی نہیں۔ اس نے دوبارہ کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں نے کال ریسیو نہیں کی۔“

”کیوں.....؟“ حیدر کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

”ہر کیوں کا جواب نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے حیدر کی طرف دیکھے بنا کہا۔

”لیکن تمہیں جواب دینا پڑے گا کہ تم نے کس خوف کی وجہ سے کال ریسیو نہ کی؟ کوئی توجہ ہوگی؟“ وہ معنی خیزی سے بولا۔

”دماغ تو نہیں چل گیا ہے تمہارا؟ ہر بات کا الٹا ہی مطلب لیتے ہو۔“

”اوکے..... سیدھا مطلب تم ہی سمجھاؤ۔“ اس کا انداز جنوزو ہی تھا۔

”کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم فضول سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”غلط لفظ بولا ہے تم نے۔“

”کون سا؟“

”سپنس..... حالانکہ تم کو کہنا چاہیے تھا رو میٹس۔“

”اوہ شٹ۔ تمہیں لگو اس کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے۔“

وہ بری طرح تپ کر گیا ہوا، جبکہ خود اس کے دل کی دنیا زبرد زبرد ہو رہی تھی۔ صبح مخالف سے وابستہ ہونے والے اس جذبے سے اسے نظر تھی۔ پیار، محبت، عشق ان لفظوں سے وہ نا آشنا تھا اور تب تک ہی سب ٹھیک تھا۔ جب تک کسی کی پروا بھی نہ تھی اور جب سے محبت کی یہ خورد و کوشل اس کے دل کی زمین پر آگئی تھی، سب کچھ بدل گیا تھا۔ دن، رات، نیندیں، خواب، موسم و جذبے، سب ہی بدل کر رہ گئے تھے اور وہ کوشش کے باوجود ان کو کچھ نہیں پارہا تھا۔ دل کی اس بناوت نے اسے اضطراب بخشا تھا جسے حیدر نے مزید بڑھا دیا تھا۔ جس جذبے کا اقرار وہ خود سے نہیں کر رہا تھا تو اس سے کیونکر کرتا۔ وہ کامن روم سے نکل رہی تھی۔ گیلری سے گزرتے ڈوائنوں کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھی تھی، اس وقت وہ تنہا تھا۔

”ایکسکیو زی۔“ حورین کی آواز سن کر وہ نکلتا مگر مزکر نہ دیکھا تھا۔

”حیدر اور سر آفتاب کے متعلق پوچھنا ہے۔“ اس کے انداز میں پرانی والی بے گانگی و سرد مہری محسوس کر کے وہ محتاط انداز میں بولی۔

”سر کی طبیعت ابھی مکمل ٹھیک نہیں ہوئی ہے اور حیدر یونہی آ رہا ہے۔“ خاصے روڈ انداز میں جواب دے کر وہ چلا گیا تھا۔

حورین نے حیرانگی و حنگلی کے انداز میں اس کی پشت کو گھورا تھا۔

”اوہ گاڈ ای آدی ہے یا گرٹ؟ جس طرح ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جاتے ہوئے وہ اپنا رنگ بدلتا ہے، اسی طرح یہ شخص موقع

دیکھ کر موڈ بدلتا ہے۔ گاؤں میں اس طرح کیئر کر رہا تھا گویا اس سے بڑھ کر میرا کوئی ہمدرد، کوئی خیر خواہ نہیں ہے اور اب اس طرح ملا ہے جیسے جانتا

ہی نہیں ہے، عجیب شخص ہے۔“ وہ بڑبڑائی ہوئی وہیں کھڑی تھی، اس سے بے خبر کر وہ چاروں اسے ڈوائنوں سے بات کرتے دیکھ چکی ہیں۔

”ارے تم نے بھی وہی دیکھا ہے جو میں نے دیکھا ہے؟“

”آج لگ رہا ہے، سورج غلط سمت سے نکل آیا ہے۔“

”مجھے لگ رہا ہے، میں خواب دیکھ رہی ہوں۔“

”مجھے یقین تھا ایسا ایک دن ضرور آئے گا اور وہ دن آ گیا۔“ ردا، شرین اور مول کے بعد زویا نے کھٹس دیے تھے۔

”ارے اسے کیا ہو گیا؟ کیا بولے جا رہی ہو؟“

”جو دیکھا ہے، وہی کہہ رہے ہیں ڈیر! دشمنی، دوستی میں بدل گئی۔ دو مختلف راستے ایک ہی منزل پر چلنے لگے۔ دن اور رات کب

ایک ہوتے ہیں، یہ ہمیں معلوم ہی نہ ہو سکا۔“ شرین اسے معنی خیزی سے دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”یہ انقلاب کس طرح برپا ہوا معلوم تو ہو؟“ وہ چاروں اپنی اپنی کہہ رہی تھیں، حورین ان کے ہمراہ وہاں سے لابی میں چلی آئی تھی کہ یہاں پراسٹوڈنٹس کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ آزادی سے لنگھ کر سکتی تھیں۔

”تم لوگ اس طرح ری ایکٹ کیوں کر رہی ہو؟ یہ کوئی ایمرنگ پوائنٹ نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے بھی بات کرتی تھی، کوئی پہلی بار بات نہیں کی جو تم لوگ اس قدر ایکساٹنڈ ہو رہی ہو کہ حواس ہی کھوٹی جا رہی ہو۔“ حورین کے انداز میں سنجیدگی تھی۔

”ہاں کرتی تھیں مگر اس طرح نہیں، بڑے نرم انداز میں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس سے حیدر کے متعلق پوچھ رہی تھی اور سر آفتاب کے متعلق جو یونیورسٹی نہیں آئے ہیں۔“ وہ کہتی ہوئی سامنے حیدر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ جو زیست کا سفر ہے

یہ جو رشتہ ہے میرا

تم اگر ساتھ نہ دو گے

تو یہ کس طرح کئے گا

میری سوچ کی حدود تک

یہ گماں بھی کیسے آئے

کوئی پل بنا تمہارے

بھلا کیسے بیت جائے

میرے پاس تم نہیں ہو

میرے پاس کب نہیں ہو

میری یاد کے نگر میں

میرے خواب کے سفر میں

میری سوچ کی تہوں میں

میری آنکھ کے کھنور میں

میرے دل میں، جاں میں، تن میں

ہاں تم ہی ہو، ہر کہیں ہو

مہران علوی چند ہفتوں بعد پھر اس کے سامنے موجود تھا۔ گرے چنٹ، وہاٹ شرٹ میں ترتیب سے سنوارے گئے بال اور چہرے پر موجود جھی مسکراہٹ نے اس کی شخصیت کو وقار بخشا تھا۔

”مہران علوی صاحب! کیا لیں گے آپ؟ کولڈ ڈرنک، کافی یا ٹی؟“ چھ سات ماہ کے عرصے میں پہلی بار وہ اس سے اعتماد بھرے لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔ مہران کو یہ دوستانہ انداز بہت پسند آیا تھا۔

”آج ہر فیصلہ آپ کا ہے گا جو آپ چاہیں مگوا لیں۔“ اس کے انداز میں کوئی خاص بات تھی۔ حضرتی نے چونک کر دیکھا تھا پھر سر ہلاتے ہوئے انٹرکام پر کافی لانے کا آرڈر دیا تھا۔

”دو سیزر کیے ہیں۔ حکمن سی فیل ہو رہی ہے، ایسے میں کافی بیٹ رہے گی۔ کافی آپ کو پسند بھی ہے۔“

”میری پسندنا پسند کا خیال ہے آپ کو؟“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”جی ہاں، جتنے ٹائم سے ہم مل رہے ہیں، اتنے عرصے میں ایک دوسرے کی پسند و ناپسند سے بندہ واقف ہو جاتا ہے۔“

”پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے حضرتی؟“ وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

”میرا اب بھی فیصلہ وہی ہے جو پہلے تھا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”فیصلہ بدلا بھی تو جاسکتا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایک آس و امید پنہاں تھی۔

”جن فیصلوں پر ہماری زندگی، ہماری خوشیوں کا دار و مدار ہو، وہ فیصلے صرف ایک بار کیے جاتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے فیصلے میں دیر کی اور آپ کو خواہ مخواہ انتظار کی زحمت دی۔ ایسا مجھے بہت جلد کرنا چاہیے تھا۔“ نرس لڑے رکھ کر چلی گئی تھی جس میں بھاپ اڑا سگ رکھے ہوئے تھے۔

”آپ بہت ناکس، بہت گریٹ ہیں۔ کوئی بھی لڑکی آپ کی لائف پارٹنر بن کر خوش رہے گی۔“ وہ کافی کاگ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

”کوئی بھی لڑکی؟“ اس کے دھیمے لہجے کی عجیب سی آواز نے پل بھر کو حضرتی کو گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ادا سی کہہ رہی تھی۔ ”کوئی اور لڑکی کیوں تم کیوں نہیں؟“

”اس سے قبل میں نے بہت سوچا، بہت کوشش کی کہ میں آپ کو انکار نہ کروں، کپرومانز کروں مگر پھر خیال آیا جہاں حیات کے پھول آخری سال تک مہینے ہیں وہاں کپرومانز کا جس زیادہ دن قابل برداشت نہ ہوگا۔ زندگی محبت کے سہارے گزارنی جاسکتی ہے۔ محبت ملنے کی آرزو میں گزارنی جاسکتی ہے مگر کپرومانز کے قہر و ہرگز نہیں۔“

کافی سب کرنا مہران اس کی ہر بات بغور سن رہا تھا۔ اس کی جانچتی نگاہیں ٹھہر ٹھہر کر اس کا جائزہ لے رہی تھیں، پھر وہ گویا ہوا۔

”آپ کی یہ اسٹائل، فریش چہرہ اور یہ بولڈ کانیفیڈنٹس میں آپ سے پہلے ہونے والی ملاقات میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ آپ

کے چہرے پر چھانے والی ناپسندیدگی کو میں پہلے دن ہی بھانپ گیا تھا۔ آپ کی اکتاہٹ و جھلاہٹ کو شرم و حیا کا نام دے کر میں نے کتنے عرصے خود کو بہلائے رکھا۔ دل سے اٹھنے والی صداقت بھری آوازوں کو اگنور کرتا رہا، پھر ممانے بھی یہی محسوس کر کے مجھے کہا تو میں نے یہی کہا کہ ان کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ خضریٰ بہت شریف و نیک لڑکی ہے۔ عام لڑکیوں سے بے حد مختلف و باوقار۔ کافی گامگ نخیل پر رکھ کر وہ اس سے گویا ہوا تھا۔

”دراصل میں ماما کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلیم دیتا تھا کہ آپ کی اس وقت کی فیملی کو سمجھ نہیں آتی تھیں۔ کوئی ٹیکہ خیال اس لیے نہ تھا، کیونکہ مجھے معلوم تھا میرا پرپزل ایکسپٹ کرنے کے لیے آپ کو فورس نہیں کیا گیا ہوگا، کیونکہ آپ کی فیملی ایجوکیشنڈ و ماڈرن ہے، پھر آپ خود ایک ڈاکٹر و بااختیار تھیں۔ آپ کی مرضی کے بغیر تو یہ ممکن ہی نہ تھا۔“ وہ اپنے مخصوص دھمکے انداز میں کہہ رہا تھا۔ خضریٰ خاموشی سے کافی کے سپ لیتی من رہی تھی۔

”ہر بار مجھے نخیل ہونے لگا، کچھ نہ کچھ ہے۔ آپ کی آنکھوں کی اُداسی و چہرے کی بے زاری میرے جذبیوں کو قتل کر رہی تھی۔ میری محبت کی کلیاں بن گئے مگر جہاں ہی تھیں۔ اسی نگلش کے دوران ایک رات ڈنر پر میری ملاقات آپ کے کزن کونین سے ہوئی تھی۔“ اس نے خضریٰ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور خلاف توقع کونین کا نام سن کر خضریٰ شٹا گئی، دل تیزی سے دھڑک اٹھا، کانپتے ہاتھوں سے اس تک تمام رکھا تھا۔

”ایسی ہی کنڈیشن میری ہوئی تھی جب میں نے کونین کی آنکھوں میں بھی آپ کی آنکھوں والی ویرانی و اُداسی دیکھی تھی۔ میرا اضطراب تب ہی سے بڑھ گیا تھا۔ دل کی حالت بے قابو ہو چکی تھی۔ دل سرگوشی کرتا، خضریٰ تمہارے لیے نہیں بنی، وہ کسی اور کی چاہت ہے اور میری نگاہوں میں از خود ہی کونین کو سراپا آجاتا اور میں گم سم ہو کر رہ جاتا پھر میں سوچتا کہ آپ سے پوچھوں کہ حقیقت کیا ہے؟ کیا آپ میرا ساتھ نہیں چاہتیں؟ کیا میرا دل جو کہتا ہے وہ سچ ہے؟ مگر آپ کی سنجیدگی و کم گوئی حوصلہ دیتی تو گویا میں لنگ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں؟ میں نے شروع سے ایسے خیالات کی لڑکی کی چاہ کی ہے جو میری محبت کا جواب محبت سے دے، جس کی تمام آرزوئیں، خواہشیں، جذبے و احساسات میرے لیے ہی ہوں، جس کی آنکھوں میں مجھے اپنا پنکس نظر آئے اور آپ میں ایسا کچھ نہ تھا۔ ابھی میں اس اُبھرنے کو سلجھانہ پایا تھا کہ اچانک اس رات ہوٹل میں کونین سے ملاقات ہونے پر جو آپ کی ایجوکیشنل سائٹس آئیں، ان سے تمام معاملات میری سمجھ میں آ گئے۔“

”آ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے کونین صرف میرے کزن ہیں؟“ اس کے دل و دماغ پر گویا برف جمنے لگی تھی جس راز کو وہ سالوں سے چھپاتی آرہی تھی وہ اب عیاں ہونے لگا تھا۔

”وہی کہہ رہا ہوں جو شاید آپ اپنے آپ سے بھی چھپاتی آرہی ہیں۔ محبت ایک ایسا پھول ہے جو خود تو نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے مگر اس کی مہک چھپائے نہیں چھپتی، پھلتی ہے اور پھلتی چلی جاتی ہے۔ اسے چھپانا فضول ہے۔“ اس کا انداز ایک اچھے مازدار دوست کی طرح تھا۔

”مہراں صاحب پلیز! آپ مجھے رسوا کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو.....“

”ارے ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ مجھے ایسا ہی کم ظرف و چھچھورا سمجھا ہوا ہے، اگر آپ کو رسوا کروں گا تو میری رسوائی نہ ہوگی؟ آفٹر آل میرا آپ سے رشتہ ٹوٹا نہیں ہے اور نہ کبھی ٹوٹے گا۔“ وہ ذومعنی انداز میں کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

یونیورسٹی میں اس دن موقع ہی نہ مل سکا، حیدر سے بات کرنے کا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ حیدر سے اس کے والدین کے متعلق معلوم کرے جو اس کے کزن عمر دلاز کی گرفت میں چلے گئے تھے۔ حیدر کو یونیورسٹی میں مطمئن دیکھ کر وہ کچھ مٹی تھی، یقیناً اس کے حالات بہتر ہیں جو وہ وہاں نظر آ رہا ہے مگر یہ سب کس طرح ہوا، یہ جاننے کی جستجو سے بے کھل کیے ہوئے تھی۔ گاؤں سے آئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا، اس دوران ہزار کوشش کے باوجود سر آفتاب سے مل نہ پائی تھی۔ سب کے ذریعے ہی ان سے بات ہوتی رہتی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ وہ ان سے رو برو ملاقات کرے، ان کی محبت یا بی پر مہارک ہا دوے۔

ان سے ملنے کے لیے وہ چاروں بھی بے چین تھیں۔ اصل حقائق سے وہ واقف نہ تھیں کیونکہ انہیں صرف یہی بتایا گیا تھا کہ سر آفتاب بیمار ہیں جو لوگ اکثر موسم کی تبدیلیوں سے ہو جاتے ہیں۔ اس دوران سر آفتاب اپنے گھر کے بجائے کسی دوست کے ہاں شفٹ ہو گئے تھے۔ اب جبکہ وہ پوری طرح فٹ تھے تو اپنے گھر آچکے تھے اور وہ لوگ ان سے ملنے کو بے قرار تھے۔

”کیا سوچا جا رہا ہے؟“ کرن روم میں داخل ہوتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”مما! میں سر سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”اس میں سوچنے والی کیا بات ہے چلی جائیں؟“

”زویا، موٹل وغیرہ بھی جانا چاہتی ہیں۔“

”آپ لوگ ساتھ تو جاتی ہیں، پھر اب کیا ہوا؟“ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر استعجابیہ انداز میں کہا۔

”مما! گاؤں میں جو کچھ بھی ہوا میں نے سب آپ کو بتایا۔ آپ ہر بات سے آگاہ ہیں، وہاں سے آنے کے بعد سر سے یہ پہلی

ملاقات ہے اور ضرور وہاں ہونے والے حادثے کا ذکر بھی ہوگا۔ احتیاط کے باوجود کوئی نہ کوئی بات نکلے گی اور سب کھیل بگڑ جائے گا۔“ وہ ان کے شانے پر چہرہ ٹکاتے ہوئے اُلٹھے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ماں کے شانے پر سر رکھتے ہوئے ذہن میں جھم سے کسی کا مضبوط شانہ یاد آیا تھا اور اپنی اس بے اختیار حرکت پر اسے شدید شرمندگی ہوئی تھی۔

”مجھے آپ پر فخر و اعتماد ہے اور آپ نے مجھ سے وہ سب نہ چھپا کر ایک قابل اعتماد و سچی محبت کرنے والی بیٹی کا ثبوت دیا ہے۔

ماں باپ کا یہ اعتماد و اعتبار ہی بیٹیوں کو گھر سے باہر نکلنے دیتا ہے جو بیٹیاں والدین کے اعتماد و بھروسے کی کانچ کو ٹھیس نہیں لگتے دیتیں، وہ بڑی کامیاب و کامران زندگی گزارتی ہیں اور باقی دوسری بیٹیوں کے لیے زندگی بڑی کٹھن و خاردار ہو جاتی ہے۔ آپ کے پاس سائٹ پر جا رہے

ہیں۔ وہ آپ کو ڈراپ کرتے چلے جائیں گے۔ زویا اور مول کو میں شاپنگ پر لے جاؤں گی اور کہہ دوں گی۔ میں نے آپ کو مخ کیا تھا ساتھ لے جانے کو، تاکہ ہم شاپنگ کر سکیں۔“ کرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ ماما! پورا رویری ویری گریٹ۔“ اس نے محبت سے لپٹتے ہوئے ان کے گال چوم ڈالے تھے۔

”خوش رہو سدا۔ میری دعا ہے ڈکھ کا سایہ بھی تمہیں چھو کر نہ گزرے۔ تا دم آخر خوشیوں، مسرتوں، راحتوں کی آغوش میں جمو متی رہو۔ ہنسی مسکراتی رہو۔“ اس کی پیشانی چومتے ہوئے دل میں دعائیں دی تھیں۔ آنکھوں کے ساحل سے دھموتی نکل کر اس کے کھٹے ہالوں میں گم ہو گئے تھے۔

انس صاحب کی اس میں جان تھی۔ وہ بھلا اسے کس طرح انکار کر سکتے تھے۔ وہ اسے سر آفتاب کے ہاں لے آئے تھے۔ سر آفتاب ان سے بڑے تپاک سے ملے۔ ان کے انداز میں وہی مخصوص شفقت و حلالت تھی، عجز و انکساری تھی جو لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا دیتی تھی، وہاں پہلے سے موجود ذوالنون کو دیکھ کر اسے حیرانگی نہ ہوئی تھی کہ جانتی تھی وہ ان کی پرچھائی ہے۔ انہوں نے انس صاحب سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ انس صاحب نے مصافحہ کرتے وقت بے حد غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ بیوی جنیز، وائٹ اینڈ بیوٹی شرٹ میں لمبوس وہ دروازہ دیکھ چہرے والے انوجوان انجینیئرس نہ ہوا تھا۔

”مائس ٹومیٹ یوسن۔“ وہ اس کی ہم رنگ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گویا ہوئے تھے، جو ابادہ بھی بولا۔

”تھینکس سر۔“ اسے حیرانگی ہو رہی تھی۔ اس شخص کی آنکھیں بالکل اس کی آنکھوں کی ہم رنگ تھیں۔ سرمئی رنگ کی، زندگی سے بھرپور آنکھیں۔ انس صاحب چند منٹ ہی ٹھہرے تھے۔ بزنس کے سلسلے میں انہیں فوری جانا تھا۔ وہ سر آفتاب سے معذرت کرتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ سر آفتاب سے باتوں میں مشغول ہو گئی تھی۔ سامنے بیٹھے ذوالنون کو اس نے از خود نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کی یونیورسٹی والی سرد مہری و بیگانگی وہ بھولی نہ تھی۔ وہ بھی اس کی خفگی کو محسوس کر رہا تھا۔ تب ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ سجائے گا ہے بگا ہے گفتگو میں حصہ لے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ٹھہر ٹھہر کر اس کے چہرے پر اٹھ رہی تھیں۔

”حیدر کے کزن نے ان کی زمینوں، جویلی و جائیداد کے عوض اس کے والدین کو روکا کیا ہے۔ حیدر نے سب خوشی خوشی اس کے نام لکھ دیا ہے۔ اب وہ یہیں گھر خرید چکا ہے۔ ان دنوں اپنے والدین کو لینے گاؤں گیا ہوا ہے جو وہاں کسی قریبی عزیز کے ہاں سکونت پزیر ہیں۔“ انہوں نے تفصیل سے حیدر کے حالات گوش گزار کیے تھے۔

”سرا عمر دراز نے سب کچھ ان سے لے لیا ہے تو اب ان کو پرالہو ہوں گی۔ پیر تو ہم ہے۔ پیسے کے بغیر تو کچھ نہیں ہے۔“

”وہ ایک مثال ہے، مرا ہاتھی بھی سوالا لکھ کا ہوتا ہے تو یوں ہی سمجھیں۔ تمام دولت و جائیداد دینے کے بعد بھی یہ لوگ کافی چینگ ٹیلنس کے مالک ہیں پھر حیدر بزنس کرنے کی پلاننگ کر چکا ہے۔“ ملازم کو لڈ ڈریک سرو کر گیا تھا۔

”پھر تو ان کی دشمنی ختم ہو گئی ہوگی سر؟ صوبتی خطروں سے باہر ہو گئی ہے۔ وہ اب یہاں آ سکتی ہے۔“

”عمر راز کی زندگی میں یہ ناممکن ہے۔“ ڈو النون نے جواب دیا تھا۔

”وہ سب کچھ لے چکا ہے اس کے باوجود بھی.....“

”ہاں، ایسے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، صرف لینا جانتے ہیں، دینے کے لیے معافی بھی نہیں ہوتی ایسے لوگوں کے پاس۔“

”یہ انتہائی جذبے انسان کو حیوان کیوں بنا دیتے ہیں؟ دوسروں کو دکھ دینے والے خود بھی خوش کہاں رہ سکتے ہیں؟“ حورین نے

افسردگی سے کہا۔

”معاف کر دینے میں بھی تو راحت ہے۔“ سر آفتاب نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

پھر شام تک وہ ان کے ساتھ رہی تھی۔ بہت سارے موضوعات میں گفتگو ہوتی رہی تھی جس میں زیادہ تر سر آفتاب اور ڈو النون

بات کرتے رہے تھے۔ اس سارے وقت میں اس نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ ڈو النون کا موڈ پو نیورٹی والے موڈ سے یکسر مختلف تھا۔

بہت فریٹش و بے تکلف انداز تھا۔ کئی بار اس کی نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کی تھی اور جب بھی وہ اس کی جانب دیکھتی، وہ نگاہیں

جھکا لیتا تھا۔ انجان بن جاتا تھا۔ وہ سچا کھرا بندہ جو حق بات مقابلے کے سامنے کہنے سے نہیں ڈرتا تھا، نہ معلوم کیا ہوا تھا اسے جو وہ اس طرح

خود کو چھپانے لگا تھا۔

”میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ وہ ڈرائیو رکوال کر رہی تھی جب وہ قریب آ کر گویا ہوا تھا۔

”تو جینکس میں شو فر کے ساتھ جاؤں گی۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”اگر آپ کے مزاج میں اتنی ہی حاکمیت ہے تو مجھے ہی شو فر سمجھیں۔“ اس کی بھر پور مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو روشن کر ڈالا

تھا۔ سینے پر بازو باندھے چمکتی نگاہوں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ نہ معلوم کیا تھا ان سحر انگیز نگاہوں میں جو وہ نگاہیں جھکا کر رہ گئی۔ دل کی

دھڑکنیں نئی طرح بے ترتیب ہوئی تھیں۔ وہ جواباً کچھ کہہ نہ سکی تھی۔

”بچو! کیا ڈسکشن ہو رہی ہے؟“ سر روم سے باہر آ کر یوں لے

”سر! میں نے انہیں ڈراپ کرنے کی آفر کی ہے۔“

”اچھا ہے آپ لوگوں کا روٹ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔“

”سر! میں شو فر کو کال کر رہی ہوں، انہیں خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔“

”کوئی زحمت نہ ہوگی اور آپ جلد پہنچ جائیں گی۔“

سر آفتاب کو وہ منع نہ کر سکی تھی۔ طوعاً و کرہاً وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی جس کا دروازہ ڈو النون پہلے ہی کھول چکا تھا۔ اس کے بیٹھتے

ہی اس نے سر آفتاب کو ہاتھ بلا کر الوداع کہا تھا، انہوں نے بھی مسکرا کر ہاتھ ہلایا تھا اور اس نے کار آگے بڑھا دی تھی۔

”ناراض ہو؟“ پندرہ منٹ گزر جانے کے باوجود وہ خاموش بیٹھی رہی تو ڈو النون اس سے مخاطب ہوا تھا۔



”میں آپ سے کیوں ناراض ہوں گی؟“ اس کے لہجے میں موجودا تعلق نے دم بھر کو اسے مضطرب کر دیا تھا۔ وہ ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔  
وہ سا حرو تھی.....

اپسرا تھی.....

جو کسی آسیب کی طرح اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ اس کی مہکتی رفاقت میں جذبے مد ہوش ہونے کو بے قرار تھے۔  
جس نے اس کے بے رنگ خوابوں کو دل کش رنگ دیے تھے، جس کے حسین تصور سے زندگی پہلی بار انگڑائی لے کر بیدار ہوئی  
تھی۔ وہ اس قدر بے گانہ تھی کہ اس کے جذبات ہی نہ سمجھ سکی۔

”کیوں ہم میں دوستی نہیں ہے؟“ وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا گویا ہوا۔

”دوستی اور ہم میں..... یہ ناممکن ہے۔“

”کیوں ہماری دوستی ناممکن ہے؟“

”آپ بے حد موڈی ہیں، ذوالنون صاحب! دوستی ہم خیال، ہم مزاج لوگوں سے کی جاتی ہے۔ آپ جیسی نیچر والوں سے ہرگز  
نہیں۔“ اس کی بات کا نرمانے کے بجائے وہ ہنس پڑا تھا۔

”میرے خیال میں آپ یونیورسٹی والی بات پر ناراض ہیں.....“

”جی نہیں، میں کسی بات پر ناراض نہیں ہوں۔“ وہ اس کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ لمبے بھر کو دونوں کی نگاہیں ٹکرائی تھیں۔ وہ اس کی  
بڑتی نگاہوں کی زور آوری سے گھبرا کر نگاہیں جھکانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

پل پل بدلتے مٹھنص کا یہ کیسا نا آشنا رنگ تھا؟

چہرے کا تاثر

نگاہوں کی حدت

بندلیوں کی گویائی.....

اس کا ہر انداز ایک با معنی پیغام لیے ہوئے تھا۔ وہ سنانے میں رہ گئی۔ لمبے بھر کو نگاہوں کے تصادم نے اس پر اس کے جذبے  
آشکارا کر دیے تھے۔

”آٹم سو ری اس دن میں اس انداز میں بات کرنا نہیں چاہتا تھا مگر میں نے آپ کے پیچھے آتی ان کرانا کا تین کو دیکھ لیا تھا، اس  
لیے روڈ رو یہ رکھا تھا، تاکہ وہ غلط مطلب نہ لیں۔“ اس نے رسائیت سے سمجھایا تھا۔

”کرانا کا تین..... وہ کون ہیں؟“ اس کے لیے یہ لفظ بالکل نئے تھے۔

”نقل و حرکت، حساب کتاب رکھنے والے فرشتے۔“

”اوہ“۔ اس کا اشارہ شمرین، زویاد وغیرہ کی طرف تھا۔ اس کے اس طرح کا خطاب دینے پر وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی۔ ”آپ سٹنس آف ہیومر سے واقف ہیں“۔ وہ شانے اُچکا کر گویا ہوئی۔

”وقت انسان میں ہر سٹنس خود پیدا کر دیتا ہے۔ اہمیت احساس کی ہوتی ہے، جذبات کی ہوتی ہے۔ ان کے بنا تو انسانیت ہی ادھوری ہے“۔ کارڈ رائیو کرتے ہوئے وہ جیسے گم سا ہو گیا تھا۔ حورین خاموش ہو گئی تھی۔

”ایک نیوز ٹی ہے روکی کے حعلق۔ وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہے۔“

”اوہ کیا ہوا تھا اسے؟ کس طرح؟“ اس خبر سے وہ آرزو ہو گئی تھی۔

”ایکشن میں کھیلتگ کرتے ہوئے مخالف پارٹی سے جھڑے کے دوران بلٹ اس کے برین میں لگ گئی تھی۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا“۔

”انسان ہی انسان کا خون بہا رہا ہے“۔ اسے بے حد افسوس ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں روکی کا سراپا گھوم رہا تھا۔ طاقت کے نشے میں پُور، جس کے قدم زمین پر پڑتے تھے تو زمین میں دھمک پیدا ہوتی تھی، ہل تک زمین کو قدموں تلے روندنے والا آج اسی زمین میں، اسی مٹی کا حصہ تھا۔

”اگر بندہ قدم اٹھانے سے قبل سوچ لے کہ جس راستے کو اس نے چنا ہے، اس کا انجام کیا ہوگا“۔ اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔

”شاید اسی کو لک بھی کہتے ہیں“۔

”میں لک پر بھی یقین نہیں کرتا، غلطی ہم کریں، نام نصیب پر رکھ دیں“۔

”اس کے قادر نہیں تھے، شاید وہ اس لیے بری صحبت کا شکار ہوا“۔

”جن کے قادر نہیں ہوتے ضروری نہیں وہ میر رسٹ بن جائیں“۔ اس کے انداز میں ایک چیخن تھی۔ وہ چپ رہ گئی، پھر ان کے درمیان بات نہ ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

منال بیٹھی گہری سوچ میں غرق تھی۔ قاعدان کے قریب بیٹھیں تو انہوں نے ان کی طرف دیکھا تھا مگر سوچ کے دائرے سے باہر نہ نکلی تھیں۔

”آخر کب تک یہ سوچ و پچار ختم ہوگی؟ میں کہتی ہوں ضد چھوڑ تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ میں برہان کو انکار کر دیتی ہوں، وہ خود ہی.....“

”نہیں می! میری خاموشی کو میری کمزوری نہ سمجھیں۔ میں بہت کچھ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں اور کر کے دکھاؤں گی“۔ وہ نخوت بھرے انداز میں بولیں۔

”کب کس دن کر کے دکھاؤ گی؟ جب وہ یہاں سے دوبارہ فرار ہو جائیں گے؟ ایک عمر انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے گزار

دی۔ طویل عرصے بعد موقع آیا ہے تو اس کو تم ویسٹ کر رہی ہو۔

”میں ویسٹ نہیں کر رہی، پہلے جو بھی کچھ ہوا وہ میری جلد بازی و جذباتی پن کی وجہ سے ہوا۔ اس بار میں بہت سوچ سمجھ کر وار کرنا چاہتی ہوں۔“

”ایسا نہ ہوڈیٹر ہم سوچتے رہ جائیں اور وہ اُلٹا وار ہم پر ہی کر دیں۔ سوچیں حد سے بڑھ جائیں تو بے مقصد ہو جاتی ہیں۔“

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، بہت جلد آپ خوش خبری سنیں گی۔ توڑا سا صبر بس پھر آپ خوش ہو جائیں گی اور کہیں گی، واہ میری بیٹی نے کیا بدلہ لیا ہے۔“ انہوں نے وحشیانہ سا تہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

”مجھے اس پل کا، اس لمحے کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔“

”ہیلو یہ کس کا انتظار ہو رہا ہے؟“ ذوالنون نے اندر آتے ہوئے ان کی ادھوری بات سن کر کہا۔

”پرنس! آج سارا دن غائب رہے، پروفیسر صاحب سے اتنی محبت کیوں ہے آپ کو؟“ منال کے لہجے میں شہد بہہ رہا تھا۔

”مام! اگر وہ میری زندگی میں نہ ہوتے تو میری زندگی بھی نہ ہوتی۔“

”آپ ان کی محبت میں حزرہ کی محبت محسوس کر کے خود کو بہلاتے رہے ہیں، اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی آپ بھول نہ سکتے۔“

منال اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تاسف بھرے انداز میں بولیں۔

”مئی! محبت کوئی سبق نہیں ہوتا جو بھول جائیں تو یاد آئے۔“ پہلی بار اس نے ان کے ساتھ باپ کے متعلق بات کی تھی۔ منال

کا دل ایک دم ہی خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ اسی موقع کی وہ کب سے تلاش میں تھیں کہ وہ کسی طرح حزرہ کا ذکر کرے۔

”حزرہ آپ کو چاہتے بھی تو دل و جان سے تھے۔ دوسرا وہ بھر کر بولیں۔“

”مئی! ایسا کیا ہوا تھا..... جو بابا ہم کو ایسا چھوڑ کر گئے کہ پھر پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا؟“ بچپن سے ذہن میں کسی نیزے کی

طرح گڑھا ہوا سوال آج نکلا تھا۔ بچپن کے وہ لمحے جب حزرہ اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ از سر نو تازہ ہو گئے تھے۔ اس کا وجہ چہرہ دھواں

دھواں ہو گیا تھا۔ ”کون ہے وہ عورت جس کی خاطر بابا نے ہم سب کو چھوڑ دیا۔ ہم ان کے لیے زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہو گئے۔ دنیا

میں سب سے زیادہ نفرت کرتا ہوں میں اس عورت سے۔“

میں اسے شوٹ کر دوں گا۔“ اس کی گرے آنکھوں میں مارے اشتعال کے خون سا اتر آیا تھا۔

”ریلیکس..... ریلیکس مائی ڈیئر سن!“ منال نے چپکارتے ہوئے اس کی پیشانی چومی تھی۔ ان کے چہرے پر ملال تھا مگر آنکھوں

میں فاتحانہ چمک تھی۔

”میں بتاؤں گی آپ کو اس عورت کا نام اور مرد کا بھی۔“

”آپ جانتی ہیں اور مرد کون ہے؟“ وہ اُچھل پڑا تھا۔

”ہماری خوشیوں کی قائل وہ عورت ہی نہیں بلکہ اس مکارو دعا باز عورت کا شوہر بھی ہے۔ دونوں برابر کے شریک رہے ہیں۔“  
منال بیگم گلو کیر لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”منال! بی بی، مہر کرو۔ بچے کے آگے کیا بات لے کر بیٹھی ہو؟“ منال کے آنکھ کے اشارے پر قائلہ لہجے میں گویا تھیں۔  
”بہت صبر کر لیا میں نے ماما! اب ہمارے دشمنوں کو اپنے قلم کا حساب دینا ہوگا۔ آج میں پرنس کو وہ سب بتاؤں گی جو چھپائی آ رہی ہوں۔“

”پائل مت بنو منال! تم ہوش کھو بیٹھی ہو۔“

”نانو پلیز! ماما کو بولنے دوں۔ میں اپنے دشمنوں کے بارے میں جانتا چاہتا ہوں۔ مجھے ان سے حساب لینا ہے۔ ہر اس پل کا جو بابا کے بغیر ہم گزارتے آئے ہیں۔ میں بدلہ لوں گا، ہر اس عمری کا جو ان کے توسط سے ہمیں ملی ہیں۔“ وہ سراپا آتش فشاں نظر آ رہا تھا۔  
آنکھوں میں گویا دہکتی آگ کی مشعلیں روشن ہو گئی تھیں۔ چہرے پر بے تحاشا سرخی چھا گئی تھی۔ ”کون ہیں وہ لوگ.....؟ کہاں ہیں.....؟ کیا نام ہیں؟“

”کول ڈاؤن، کول ڈاؤن مائی سن! سب بتاتی ہوں نام ہے.....“

”پرنس! ذرا میرے ساتھ چلو۔“ بڑی عجلت میں کونین اندر داخل ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔ منال کے لب و لہجے وہ گئے تھے۔  
”آر پورائٹ بھائی؟“ اسے بدحواس دیکھ کر وہ فکر مندی سے گویا ہوا۔  
”تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”وہ بات یہاں بھی ہو سکتی ہے اور ایسی کیا بات ہے؟“ قائلہ اور منال کا موڈ بری طرح بگڑ گیا تھا۔ سین کھانگس پر اس کی آمد انہیں اس قدر ناگوار گزری کہ مارے شدید غصے و کوفت کے وہ یہ بھی سوچ نہ سکیں کہ کونین ایسی کیا خاص بات کرنا چاہتا ہے.....  
وہ والنون بھائی کی کیفیت دیکھ کر صریحاً ماں سے ہونے والی گفتگو بھول گیا۔

”یہ ہم بھائیوں کا سیکرٹ معاملہ ہے ماما۔“ وہ والنون کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے گیا اور کار میں بیٹھ کر گیٹ سے باہر نکل گئے تھے۔  
”اتنے عرصے بعد موقع ملا تھا، وہ بھی ضائع ہو گیا۔“ قائلہ بڑبڑائیں۔

”نومما! تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ وہ بہت جلد واپس آئے گا اور پھر وہی ہوگا جو میں چاہوں گی اور میں چاہوں گی انس و کرن کی بربادی۔“ انہوں نے انگڑائی لیتے ہوئے سرور لہجے میں کہا۔

☆.....☆.....☆

اگر جذبوں میں صداقت ہو اور رب سے گہرا تعلق ہو، بندہ باری تعالیٰ کی نشا پرائی ہو جاتا ہے تو رب بھی اسے زیادہ عرصے تک اس کی خواہش سے دور نہیں رکھتا کہ وہی تو فرماتا ہے.....

”اے ابن آدم ایک تیری چاہت ہے، ایک میری چاہت ہے، ہو گا وہی جو میری چاہت ہے، پس اگر سپرد کر دیا ہے آپ کو اس کے جو میری چاہت ہے تو میں بخش دوں گا وہ جو تیری چاہت ہے اور اگر نافرمانی کی اس کی جو میری چاہت ہے تو میں تمہا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے اور بالآخر ہو گا وہی جو میری چاہت ہے۔“

انہوں نے ایک دوسرے کو دل ہی دل میں چاہ کر فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور اللہ نے بھی انہیں سبر و تحمل کا پھل بہت بیشمار دیا تھا۔ مہران علوی نے کونین سے رابطہ کر کے حضرتنی سے ہونے والی گفتگو حرف بہ حرف سنا ڈالی تھی اور ساتھ یہ بھی کہ وہ اریہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب کونین کے لیے خاموش بیٹھنا ناممکن تھا۔ پہلے بات صرف ان تک تھی تو اسے لگنے لگی مگر اب سوال آ گیا تھا حضرتنی کے وقار کا اور وہ کسی قیمت پر اس کے وقار کو مجروح کرنا پسند نہ کرتا۔ وہ مہران علوی سے گفتگو کے دوسرے دن تمام بزنس مصروفیات ترک کر کے پاکستان چلا آیا تھا جہاں اس نے پہلے مہران علوی سے ملاقات کی۔

مہران علوی سے مل کر اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کے جذبے میں کوئی مکاری نہیں ہے۔ وہ زندہ دل و آزاد طبیعت کا مالک تھا۔ اپنے لیے لائف پارٹنر بھی وہ اسی مزاج کا چاہتا تھا اور اریہ اس کی ہم مزاج و ہم خیال تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے معاملہ ذوالنون کے سامنے پیش کیا تھا اور اس نے چھوٹا بھائی ہوتے ہوئے بہت نرم دہاری و محبت کا ثبوت دیا تھا۔ نامعلوم کس طرح اس نے نانو اور می کو راضی کیا اور وہاں صد صاحب کے ہاں بھی اپنی نادیہ جاو کی چھتری گھمائی تھی جو وہ لوگ بھی راضی ہو گئے تھے۔ اسی بیٹے میں حضرتنی کی انگلی میں کونین کے نام کی انگوشی اور اریہ کی انگلی میں مہران علوی کے نام کی انگوشی پہنائی جا چکی تھی۔ یہ بظاہر ناممکن نظر آتا ہوا کام اتنی آسانی و سرعت سے ہوا تھا کہ سب حیران بھی تھے اور خوش بھی۔

صرف فیملی کے لوگوں کی موجودگی میں ہی یہ رسمیں ہوتی تھیں۔ طویل عرصے بعد حضرتنی کے حسین چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔ اپنے اطراف میں بیٹھی مثال و قاعدہ بیگم کے فرور و خنجر سے مبرا انداز نے اسے سرت بخشی تھی۔ سامنے بیٹھے کونین کی چاہت بھری نگاہوں کی تپش وہ اپنے عارضوں پر محسوس کر کے نگاہ نہ اٹھا پاری تھی۔

دوسرے صوفے پر بیٹھے مہران علوی کے چہرے پر بھی سرت کی روشنی تھی۔ شرمیلی، لجائی اریہ کو دیکھ کر وہ اپنے بروقت فیصلے پر خوش تھا اور اس کے پیرئس بھی بہت خوش تھے۔

دلوں بعد اس گھر میں خوشیوں نے قدم رکھا تھا۔ وہ سب سرور تھے۔ ایسے میں دو ایسے بھی تھے جن میں سے ایک کی آنکھیں دھبے دھبے گیلی ہو رہی تھیں۔ دوسرا اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر دل کے آگن میں یادوں کی دھواں دار بارش ہو رہی تھی۔ ان دونوں دادی، پوتے کی یادوں و آنسوؤں کا محور ایک ہی شخص تھا۔

مزہ..... جو پہلے بیٹے کی اس خوشی کے موقع پر موجود نہ تھا۔ راحیلہ بیگم بڑی شدت سے بیٹے کو یاد کر رہی تھیں۔ ذوالنون کو بھی باپ کی کمی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سگ رہا تھا۔ ساری خوشی بے مزہ ہو کر رہ گئی تھی۔ باپ کی یاد اس شدت سے اس پر

حادی ہوئی تھی کہ وہ ان ہنستے مسکراتے لوگوں میں اپنا دم گھنٹا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تھا۔

”جا کہاں رہے ہیں، کھانا لگ رہا ہے؟“ صنوبر نے کہا۔

”آتا ہوں ابھی۔“ وہ کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ کار نے کر نکل گیا تھا۔ غم و خوشی ایک ہی آئینے کے دو رخ ہیں۔ یہ آگے پیچھے آتے رہتے

ہیں۔ وہ جو آج بے حد خوش تھا کہ بھائی کی اندھیری زندگی میں محبت کی روشنی داخل ہو چکی تھی۔ یک دم ہی باپ کی غیر موجودگی کے خیال نے مسرت کے پھولوں کو مرجھا دیا تھا، بے رنگ و بو کر دیا تھا۔ وہ سیدھا حیدر کے پاس آ گیا جو گاؤں سے آچکا تھا اپنے والدین سمیت۔

”خیریت تو ہے نا؟“ اتنے آپ سیٹ کیوں لگ رہے ہو؟“ حیدر اسے دیکھتے ہوئے پریشان کن انداز میں استفسار کرنے لگا۔

”کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ صوفے پر ڈھیلے انداز میں بولا۔

”میں نہیں مان سکتا، کوئی بات ضرور ہے، پلیز مت چھپاؤ۔“

”آج بابا کو بے حد مس کر رہا ہوں میں۔“ وہ بکھرے لہجے میں گویا ہوا۔

”اوہ، ایسے اہم موقع پر وہ ہوتے تو بہت اچھا ہوتا۔“ وہ بھی افسردہ ہو کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”انگل آئی کہاں ہیں؟“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے گویا ہوا۔

”وہ سر آفتاب سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔“

”یہاں کی تمام سیٹنگ ہو گئی ہے؟“ وہ کمرے میں لگا ہیں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ کمرہ ایک دم سادہ تھا۔

”مجھے سمجھ نہیں ہے اسی لیے میں نے حورین و زویا وغیرہ کو بلا دیا ہے تاکہ وہ مجھے مشورہ دیں کہ کس طرح سیٹنگ کی جائے۔“

”تم ان لوگوں پر زیادہ بھروسہ کرنے لگے ہو۔“

”وہ بہت سو برا و ناکس لڑکیاں ہیں، میں ان سے ملنے کو برا نہیں سمجھتا۔“

”میں نے برا کب کہا ہے؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”اچھا ابھی نہیں کہا۔“ وہ دوہرہ بولا۔

”تم عورتوں کی طرح روٹھنے لگے ہو، افسوس مجھے مانتا نہیں آتا۔“ وہ اسے چراتے ہوئے بولا۔

”حالانکہ تمہیں عادت ڈال لینا چاہیے مانتے کی۔“

”کیوں؟ میں کیوں مانتے کی عادت ڈالوں؟“

”اس لیے کہ تمہاری آدمی زندگی حورین کو مانتے مانتے گزرے گی۔“

”وہاٹ..... اس کا یہاں کیا ذکر؟“ وہ چونک کر سیدھا بیٹھا۔

”مجھ سے مت چھپاؤ کہ تم حورین کو پسند کرنے لگے ہو۔“

”اوہ شٹ آپ، بکو اس مت کرو یا ز“۔ اس کی آواز اتماد سے خالی تھی۔

”یہ بکو اس نہیں ہے، میں نے تمہاری آنکھوں میں اس کا عکس دیکھا ہے۔ یہ اس کی محبت ہی تو ہے جو تم سر تا پا بدل گئے ہو۔“

”تم اقرار کرو یا راتھیں سکون مل جائے گا جس جذبے سے تم بچ رہے ہو، جان کے انجان بن رہے ہو، یہی وجہ تمہاری ہے

سکوئی واضطراب کی ہے، کروا اقرار مان جاؤ کہ تم اس سے محبت کرنے لگے ہو۔“

”نہیں کرو ایسی باتیں، محبت و جہت کو نہیں مانتا میں۔“

”جاننے لگے ہو، اقرار کب تک نہ کرو گے، دیکھتا ہوں۔“ حیدر منکا لہراتا ہوا گویا ہوا۔

”منہ دھور کھو۔“

”میں تمہا کر بیٹھا ہوں مگر جب تک تمہارے منہ سے یہ نہ ن لوں کہ تم حورین کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہو، سکون سے نہیں رہوں

گا۔“ آہٹ پر انہوں نے مڑ کر دیکھا تھا۔

ساننے دروازے کے وسط میں کھڑی حورین کو دیکھ کر حیدر تو ایسا لولا کھلایا کہ کچھ کہنے بنا کرے سے غائب ہو گیا۔ حورین کے غصے

سے سرخ چہرے کو دیکھ کر لگ رہا تھا، وہ سب سن چکی ہے۔ اس نے ایک نظر ڈالوٹون پر ڈالی اور واپسی کے ارادے سے مڑی ہی تھی کہ آگے

بڑھ کر ڈالوٹون نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔



”ہاتھ نہ لگاؤ مجھے۔“ حیدر کی بکو اس اور اس کا بھر پورا استحقاق سے بازو پکڑ کر روکنا حورین کو پوری طرح مشتعل کر چکا تھا۔

”ٹھنڈے دل سے میری بات سنیں۔“ اس نے بازو چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اب کیا رہ گیا ہے سننے کو؟ کچھ اور باقی ہے؟“

سی گرین کلر و بلیو کے کنٹراسٹ انیمیر اینڈری سوٹ میں اس کی گلابی مائل رنگت میں اس وقت مارے اشتعال کے سرخیاں دوڑ

ری تھیں۔ براؤن سمر انگیز آنکھوں میں، بجلیاں سی کو بند رہی تھیں۔ بدن چینیلی کی نازک ڈال کی طرح دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

”ابھی میں نے کہا ہی کیا ہے؟..... سب کہنا سننا باقی ہے۔“ اس کی بھاری آواز میں ڈومنتویت تھی۔ حورین کچھ کہنے سے کوتاہ

نہ تھی، وہ اسی وقت واپس جانا چاہ رہی تھی۔

”مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے آپ کے کہنے سننے سے، مجھے افسوس ہے میں نے ایسے لوگوں سے تعلق رکھا۔“ وہ سخت برا فروخت تھی۔

”کیسے لوگ؟ آپ کو احساس ہے، آپ کیا کہ رہی ہیں؟“

”آپ کو احساس ہے کچھ دیر قبل میرے متعلق کیسی گفتگو کر رہے تھے؟“

”وہ غیر مہذب ہرگز نہ تھی جو آپ ناراض ہو رہی ہیں۔ دوستوں کے درمیان ایسی باتیں عام ہوتی ہیں۔“ اس نے رسائیت سے سمجھایا۔

”ہوتی ہیں مگر ان باتوں میں دوسروں کی شخصیت پر بات کرنا کہاں کی شرافت ہے؟“ اس کا غصہ ہنوز قائم تھا۔

”اوکے، اگر آپ کی ناراضی میرے معافی مانگنے سے دور ہوتی ہے تو میں تہہ دل سے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ یقین جانے جو کچھ ہوا بلکہ آپ نے سنا، وہ بالکل غیر ارادی گفتگو تھی۔“

اس کے وجہ چہرے پر اذہد نجدگی در آئی۔ تمسیر لہجے میں تھکن سی تھی۔ حورین نے گفتگو میں کرجس رد عمل کا اظہار کیا تھا، لہجے بھر کو اس کے قلب میں بے چینی دنوں پھوٹ سی ہو گئی تھی۔

اسے اس احساس نے بے دم کر دیا کہ اس کے اندر محبت کی آگ سلاک کر وہ خود کس قدر بے خبر و اناجان تھی۔ اس کا غصہ بخیر، اس کی لائق کا ثبوت تھا۔ یک طرفہ محبت کتنا دکھ دیتی ہے۔

کس قدر رکھائل کرتی ہے۔

جیسے زہر کا پیالہ پینے کے بعد موت نہ آئے۔

پھر وہ بہت خاموشی سے وہاں سے نکل گیا، مزید کچھ کہے بنا۔ اس کی تیزی سے چلتی ہوئی زبان بھی ایک دم ٹک گئی۔ ذوالنون کا اس طرح جانا اسے اناجانی سی افسردگی میں جھکا کر گیا۔

نہ معلوم کیا ہوا تھا جو اسے اچانک ہی اپنے رویے کے نامناسب ہونے کا احساس ہونے لگا۔ ذوالنون کی موجودگی میں غم و غصہ پھری لہروں کی مانند بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ پانی میں ریت کی طرح بیٹھ گیا اور افسردگی و شرمندگی کی بوجھل سی گہرا اس پر چھانے لگی تھی۔

حیدر جو اسے دیکھ کر شرمندگی و بوکھلاہٹ کے باعث وہاں سے چلا گیا تھا۔ ذوالنون کو جاتے دیکھ کر اندر آ گیا۔

”میں بے حد نادم ہوں۔“ وہ اس کے قریب آ کر نیچی آواز میں چہرہ جھکا کر بولا۔

”آپ نے بہت ہرٹ کیا ہے۔“ اس کا لہجہ خشکی سے بھر پور تھا۔

”مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کی دل آزاری کا سبب بنا۔ آپ بیٹھیں تو کسی پلیز۔“ حیدر نے نام لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھنے کا کہا۔

”نو ٹھینکس، میں جاری ہوں۔“ کہہ کر واپسی کے ارادے سے مڑی۔ حیدر پھرتی سے اس کی راہ میں حائل ہو گیا اور بولا۔

”آپ نے سب سن لیا ہے تو کچھ اور بھی سنئے جو سننا لازمی ہے۔“

”حیدر! اب مزید کچھ سننے کی گنجائش نہیں ہے، میرا رات چھوڑو۔“

”اتنی کٹھور مت بنیں، آپ کو میری بات سننی ہوگی۔ یہ میرے دوست کی عزت، اس کی زندگی کا معاملہ ہے۔ وہ ڈکھ و محرومی کی نہ خار گود میں پل کر جوان ہوا ہے۔ نارسائی و اضطراب اس کی ذات کے حصے رہے ہیں۔ ان ڈکھوں و محرومیوں نے اسے تنہائی پسند و کم گو بنانے کے علاوہ صعب نازک سے نفرت بھی کرنا سکھا دیا تھا۔ جنگوں جیسی اداسی، صحراؤں جیسی خشکی، پہاڑوں جیسی سخت زندگی گزارتے



دیکھا ہے میں نے اس کو۔ وہ ایسا سر پھر اٹھیں ہے جو اپنی بھی پرواہ نہیں کرتا۔

”یہ بے معنی باتیں آپ مجھے کیوں سنار ہے ہیں؟“ وہ چڑ کر گویا ہوئی۔

”یہ بے معنی باتیں نہیں ہیں، ان باتوں کے تمام معنی آپ کی ذات سے وابستہ ہو چکے ہیں۔“ حیدر کے انداز میں اعتماد سٹ آیا تھا۔

”کیا مطلب؟“ اس کے لہجے میں لرزش تھی۔

”پہلی دفعہ میں نے اس کی آنکھوں میں زندگی کی بھر پور چمک دیکھی ہے۔ پہلی دفعہ میں نے اسے کسی کی پرواہ کرتے دیکھا ہے۔

پہلی دفعہ اس کی گفتگو میں کسی صعب مخالف کا نام بڑے ”احترام“ سے آیا ہے۔“ حیدر غمگین نظر کر بول رہا تھا۔ سامنے کھڑی حورین یک تک اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ گاؤں میں گزرنے کئی مناظر اس کی نگاہوں میں یکے بعد دیگرے آتے چلے گئے۔

بلاشبہ خود سے بڑھ کر اس نے اس کا خیال رکھا تھا۔ قدم قدم پر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ کسی لمحے بھی اسے احساس نہیں ہونے

دیا تھا کہ وہ تنہا ہے، اپنوں سے دور ہے۔ ہمہ وقت سرد مہری، بے نیازی و تحفہ و غرور میں غرق رہنے والے شخص کی شخصیت کے کئی انوکھے و حیران کر دینے والے روپ اس نے دیکھے تھے مگر.....

”مجھے اس اسٹوری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور آئندہ میں ایسی کوئی کہو اس نہیں سنوں گی، سمجھے۔“ وہ کرسٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

”خدا کے لیے! حورین، ایسے مت کہیں۔ میں آپ سے اس کی خوشیوں کی بھیک مانگ رہا ہوں، پلیز آپ سمجھنے کی کوشش

کریں۔“ حیدر کے انداز میں عاجزی درآئی۔

”اس ٹوٹے بکھرے بندے کے مزید ریزے مت کریں۔ وہ اندر سے بہت ڈکھی ہے اور تنہا ہے۔ وہ دوسروں کے غموں کا مداوا

کرنے پر کمر بستہ رہتا ہے مگر اپنے دکھ و غم کسی سے شیر نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے وہ اب بھی اپنی سابقہ روش پر قائم رہ کر آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔ گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگتا رہے گا۔ میں اسے خاک ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“ حیدر کی آنکھوں میں اُجھرتا آنے والی نمی اس کی

چٹی و بے غرض دوستی کا ثبوت تھا۔ وہ اس کی محبت سے بہت متاثر ہوئی۔

”میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی، میں مجبور ہوں۔“ وہ نرم و سپاٹ لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی اور پھر حیدر کے کچھ کہنے سے قبل

زویا اور موہل ہاتھوں میں پھولوں کے بکے پکڑے اندر داخل ہوئیں۔ انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے حیدر خود کو سنبھال چکا تھا۔ حور بھی خود پر قابو پا چکی تھی مگر ایک بے نام سانپا اسے اپنی رگ و پے میں پھیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب سی خاموشی وجود میں آتی چلی گئی۔

”تم لوگ کہاں رک گئے تھیں؟“ اسے ان کے ہمراہ بیٹھنا پڑا۔

”ایک جانے والی مل گئی تھیں، ان سے علیک ملیک میں دیر ہوگئی۔ یہ آئی، اٹکل کہاں ہیں جن سے ہم ملنے آئے ہیں؟“ زویا

نے کہا۔

”وہ آرہے ہیں، سر آفتاب کے ہاں سے۔“ حیدر ملازمہ کو کولڈ ڈرنک لانے کا کہنے کے بعد ان سے مخاطب ہوا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا..... مہمان حاضر، میزبان غائب؟ کیا آپ کے والدین کو ہمارا آنا پسند نہیں آیا جو وہ موجود نہیں ہیں؟“ زویانے خاصے بے صبرے پن سے کہا۔

”ارے نہیں..... ایسی بات نہیں ہے، دراصل میں ان کو بتانا بھول گیا تھا کہ آج میں نے آپ لوگوں کو مدعو کیا ہے، سر آفتاب کی کال پہلے ہی آچکی تھی۔ اب پر اہم یہ تھی کہ نہ سر آفتاب سے اور نہ آپ لوگوں سے معذرت کی جاسکتی تھی۔ اس کا سبب بہترین طریقہ تھا کہ کچھ وقت سر آفتاب کے ہاں گزار کر واپس آجائیں، تاکہ آپ لوگوں سے بھی ملاقات ہو جائے۔“ حیدر نے مفصل انداز میں جواب دیا۔

”ارے تمہیں کیا ہوا، یہ چہرے پر بارہ کیوں نہ رہے ہیں؟“ مولیٰ اس کی جانب دیکھتی ہوئی حیرانگی سے گویا ہوئی۔ ”ہمارے ساتھ تو تم بڑی خوش خوش آئی تھی، اب بالکل چپ چپ ہو، کیا ہوا؟“ زویا بھی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ جو بالکل غیر متوقع طور پر پیش آنے والی چوتھین سے فوری طور پر نکل نہ پائی تھی، ان کی باتوں سے چونک کر گویا ہوئی۔

”میں تم لوگوں کی وجہ سے پریشان تھی کہ تم کہاں رہ گئی ہو۔“

☆.....☆.....☆

”دادو! بھڑے اس دور میں بھی زونما ہو سکتے ہیں، ہم منزل کھو کر بھی پا سکتے ہیں؟ کیا جذبوں میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ من چاہی مراد پا سکتے ہیں۔ مجھے ابھی بھی یقین نہیں ہوتا کہ یہ سب ہو چکا ہے۔“

ہردم کم صم رہنے والی کم گو اور سنجیدہ مزاج خسنی کو بہت خوشیاں مل گئی تھیں۔ ہردم زندگی سے بے زار رہنے والی لڑکی کے لبوں پر مسرت سے لبریز تبسم رہنے لگا تھا۔ اس کی سیاہ خوب صورت آنکھوں میں حیات نو کی جوت جل اٹھی تھی۔ چہرے کے ہر نقش سے الوہی روشنی عیاں تھی۔

”اللہ کا نظام ازل سے اب تک یکساں چلتا آیا ہے اور چلتا جائے گا۔ اس کے ظاہری نظام میں آج تک ہم نے کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔ رات کا ابھرنا، دن کا ڈھلنا، آفتاب کا غروب ہونا، ماہتاب طلوع ہونا، وقت کا چلنا، موسموں کا آنا جانا، اُن گنت اس باری تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جن کا عروج و زوال اسی طرح قائم و دائم ہے۔ صدیوں سے تبدیلی، انسانی ذہنوں سے صادر کیے گئے احکامات و انتظامات اور تسلسل و روانی گواہی دیتی ہے، وہ ذات ”وحدۃ لا شریک“ ہے۔ اس کی یکتائی و وحدت کا کامل یقین ہمیں اس کائنات میں موجود ہر ذرے سے ملتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔ بندہ مجھ سے جیسا گمان رکھتا ہے میں ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ کرتا ہوں۔ یہاں تم نے اپنے بڑوں کی عزت کا پاس کیا، ان کی خواہشات کا احترام کیا، اپنے دل کی آرزو کو دل میں ہی دبائے رکھا اور ایسا ہی ظرف کو نین نے بھی دکھایا اور کامیابی کا راستہ پایا۔“

راحیلہ بیگم اس رشتے پر بے حد خوش تھیں لیکن انفرادی کے کچھ رنگ ان کی ذات کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ حمزہ کی جدائی کو وہ شدت سے محسوس کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں خوشی و غم سے نم رہتی تھیں۔

”یہ سب آپ کی دعاؤں کے طفیل ہوا ہے دادو جان! میں نے اکثر آپ کو راتوں کو وظیفہ پڑھتے دیکھا ہے، دعا نہیں مانگتے دیکھا ہے۔“ وہ عقیدت بھرے انداز میں ان کا ہاتھ چوم کر گویا ہوئی۔

”دعاؤں اور وظیفوں کے علاوہ سچے دو طرفہ جذبوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے بیٹا۔ جذبہ اگر یک طرفہ ہو تو نہ دعائیں کام آتی ہیں، نہ وظائف اگر ایسا ہوتا تو میرا بیٹا، میرا حزرہ آج اس طرح ہم سے دور نہ ہوتا۔“ وہ غر حالی ہی صوفی کی پیش سے سرٹکا کر بیٹھ گئیں۔

”دادو! جس سے انکل محبت کرتے تھے کیا وہ حزرہ انکل سے محبت نہیں کرتی تھیں؟ کون تھی وہ؟“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھی تھی، ان کا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں بے حد محبت سے تھام رکھا تھا۔

راحیلہ بیگم کا دل بھی گویا پرانے دور کی گزری باتوں کو تازہ کرنے کے لیے بے کل ہونے لگا۔ وہ یادوں کے پھولوں کو از سر نو تازہ کرنے کو تیار ہو گئی تھیں۔ مختصری دل و جان سے ان کی جانب متوجہ تھی۔

جب ہمارے اپنے ہم سے ہمیشہ چھڑ جاتے ہیں، ان کے ہمراہ گزرا وقت ہر شے سے بڑھ کر اہول ہو جاتا ہے اور ہم ماضی پرست ہو جاتے ہیں، دل کرتا ہے آنکھیں بند کیے ان گزری ہوئی ساعتوں میں گم رہیں، جب ہم ان پیاروں کے درمیان تھے جن سے جدائی کا تصور بھی محال تھا، پھر ان سے چھڑ کر بھی رہنا پڑتا ہے، جینا پڑتا ہے، زندگی اسی کا نام ہے۔

”کاش! جانے والے اپنی یادیں، اپنی بھینس بھی لے جائیں تو زندگی ارزاں نہ لگے۔“ راحیلہ بیگم بھی آنکھیں بند کیے ماضی کے گلستانوں میں سرگرواں اسے ایک ایک بات سے آگاہ کرتی چلی گئیں۔ نوشاہہ کی مظلومیت، کرن کی مصومیت، حزرہ کی پوشیدہ محبت، دیورائوں کی مکاریاں اور اپنی بھی ایک ایک زیادتی اسے بتائی۔ بڑے ظرف سے اپنی ہر نفرت و ظلم سے پردہ اٹھاتی چلی گئیں۔

”اوہ..... وہ منال آئی کی بہن ہے، ہم شکل، کاروبار بنی۔ پوری داستان سننے کے بعد وہ حیرت سے گویا ہوئی۔

”ہاں..... لیکن صرف چہرے کی مشابہت کی حد تک، ورنہ وہ میرا تھی۔ اسے کھو کر مجھے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا ہے۔ اسے کھونے کا ذکر میرے ساتھ قبر تک جائے گا۔ اسے کھو کر میں نے سب کچھ کھو دیا۔ میرے کیے کی سزا، میرے ساتھ میری نسل بھگت رہی ہے۔“ وہ پھر رونے لگیں۔ کونین و ذوالنون کی محرومی انہیں تڑپانے لگی۔

”پلیز..... دادو! امت روئیں، آپ دعا کریں حزرہ انکل واپس آ جائیں۔ منال آئی، کرن آئی جیسی بن جائیں۔“ اس کے آنسو بھی اتار سے بہ رہے تھے۔ محبت کا درد کیا ہوتا ہے، اس سے وہ آشنا تھی۔ حزرہ کے درد کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔

”برسوں بعد میں نے اپنے ماضی کی سیاہ کتاب کے ورق تمہارے آگے وا کیے ہیں، میرے اندر جلتی ندامت و شرمندگی کی آگ معمولی سی سرد ہوئی ہے۔ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا اور نہ انسان۔ میں نے دیکھا ہے ہر عروج کو زوال ہے، ہر سکرائی کو ٹھکوی ہے، ہر طاقت کو کمزوری ہے۔ آنسو! یہ بات جب ہماری سمجھ میں آتی ہے تو اس وقت تک ہم سب کچھ گنوا چکے ہوتے ہیں۔“

☆.....☆.....☆

بزرے میں گھری پھولوں سے جگی دہانت ماربل کی پڑ ٹکڑو عمارت اس کے سامنے تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر زمردی نائلز سے جم کرتے فرش پر چل کر اندر آتے ہوئے اس گھر کے گوشے گوشے کو بڑی حسرت و انفرادی سے دیکھ رہی تھی۔ اس گھر سے اس کی کبھی نہ بھولنے والی یادیں وابستہ تھیں۔ اس گھر میں ڈری، کبھی اپنی ماں کے دوپٹے کا پلو پکڑے وہ یہاں کے کینوں کی نفرت انگیز حقارت آمیز نگاہوں سے خوف زدہ کام کرتی ماں کے شانے سے چپکی رہتی تھی۔ بچپن اسی خوف و کم ہانگی کے احساس میں گزرا تھا۔

شعور آگئی نے اسے بچپن کے گھٹن زدہ دور سے نکال کر جوانی کے دور سے حعارف کروایا تو وہ اپنے حقوق اور ماں کی عزت کے لیے بہت غرر، منہ پھٹ و خود مر ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ کسی کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ ماسوائے اس ایک شخص حمزہ کے جو اس کی ہرز یادتی ہنس خوشی برداشت کرتا تھا۔ کبھی اس نے برا نہیں مانا، ہمیشہ مسکراتا رہتا۔

”یہ کیا ہے یارا پھر رو رہی ہو، تمہیں معلوم مجھ سے تمہارے آنسو بالکل برداشت نہیں ہوتے۔ تمہیں میری خواہشوں کا بھی خیال نہیں ہے۔“

اس کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب ان کی آنکھوں سے یادیں آنسو بن کر بہنے لگی تھیں۔ انس صاحب کے خنکی بھرے انداز پر وہ سنبھلی۔

”آئی ایم سوری، بس..... یہ آنسو بھی، موقع بے موقع نکل آتے ہیں۔“ ہاتھ میں دپے رومال سے تیزی سے چہرہ صاف کرتی ہوئی گویا ہوئیں۔

”میں جانتا ہوں کرن! اس گھر کے چپے چپے سے تمہاری یادیں وابستہ ہیں۔ بہت سارے رشتے، بہت سارے چہرے تمہارے تصور میں سرگرداں ہو جاتے ہوں گے، کئی آوازیں سماعت میں گونجنے لگتی ہوں گی۔“ وہ ان کو ہونے پر ہنسا کر محبت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

”مگر رادقت بھلا یا نہیں جاتا، بلکہ بھلا یا جا ہی نہیں سکتا۔ یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے مگر دل دکھانے والی باتوں کے بجائے ان اچھی باتوں کو یاد کریں جن سے ہمیں راحت ملتی ہو، سکون ملتا ہو۔ ایسا کرنا ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم کر سکتے ہیں تو پھر کیوں ایسی باتوں کو یاد کریں جن سے وہاں ہنگامی آنسوؤں سے مشروط ہو۔“

”زندگی میں کچھ مقام ایسے بھی آتے ہیں جب ہم با اختیار ہوتے ہوئے بھی بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ یہ آنسو اور آوازیں ان ہی بے اختیار جذبوں کے عکاس ہیں مگر میں کوشش کروں گی کہ آپ کو آئندہ دکھایت کا موقع نہ دوں۔“ کرن نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اتنا خیال ہے میرا اتنی محبت کرتی ہوا!“ انس اس کے شانوں پر ہازور کھتے ہوئے شوخ انداز میں گویا ہوئے۔

”خیال سے بڑھ کر خیال ہے مجھے آپ کا۔ محبت سے بڑھ کر محبت کرتی ہوں میں آپ سے۔ آپ کی محبت نے ہی یہ گھر مجھے دلایا ہے، کس کو معلوم تھا اس وسیع و عریض تین پور حوض میں بنے گھر کے ایک فالتو بے کار حصے میں رہنے والی وہ مسکین لڑکی کبھی اس پورے گھر کی مالک ہوگی۔“ ان کے ہیکلے سے لہجے میں انس کی بے مثل محبت کا اعتراف اور ساتھ میں ممنونیت کا بے غرض احساس بھی تھا۔

”اوہ۔“ آج بڑا خوش نصیب دن ہے۔“ ان کے مسکراتے لہجے میں مرشاری تھی۔

”بالآخر آج میں نے تمہارے لمبوں سے وہ امرت بھرے لفظ سن ہی لیے جن کا مجھے ایک عرصے سے انتظار تھا۔ تمہارا اقرار محبت، میرے لیے سرمایہ حیات ہے۔ دنیا کے ہر بڑے خزانے سے بڑھ کر قیمتی خزانہ ہے۔“

سرت ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ بڑے بڑے جوش انداز میں انہوں نے کرن کو بانہوں میں جکڑ کر گھما ڈالا۔

”یہ ایک گہری کیا حیثیت ہے، پوری دنیا خرید کر دے سکتا ہوں۔“

☆.....☆.....☆

”ہیلومی! کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ ان کے قریب بیٹھی ہوئی منال پوچھنے لگی۔

”آپ کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“ وہ ان کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟ مجھے بھی تو معلوم ہو۔“ صوفی کی بیک سے سرٹکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے کہ کس قدر کمزور پڑ گئی ہو، کل تک جن پر تھوکتا بھی گوارا نہیں کرتی تھی، اب ان ہی میں سے ایک کو بھونکا کر لاد رہی ہو۔“

فائقہ بیگم کے انداز میں بھر پور مٹھرتھا۔

”آپ جانتی ہیں یہ میں نے کیوں کیا ہے۔“

”پرنس کی خوشنودی کے لیے مگر سوچو، کل وہ بھی کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے اور کہے کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو پھر کیا کرو گی؟ میرا خیال ہے یہ انتقام و شقام کی باتیں بھول جائیں تو اچھا ہے۔ ہمارے دشمن اسی طرح ہمارے ناک کے نیچے اپنی تلخ کا جشن مناتے ہوئے خوش و خرم زندگی کی بہاریں لوتے رہیں گے، ہم اس طرح بے چین و مضطرب زندگی گزارتے رہیں گے۔“

ان کا انداز بھر پور ناراضی و تضرع لیے ہوئے تھا۔ منال بیگم نے بغور ماں کے بگڑے تیروں کو دیکھا، پھر کچھ توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

”مما! آپ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈس ہارٹ کیوں ہو جاتی ہیں؟ میں جو کچھ کر رہی ہوں اس میں کیا بہتر ہے اور کیا غلط، یہ مجھے معلوم ہے، اپنا مطلب نکالنے کے لیے لوگ گدھے کو بھی باپ بنانے سے گریز نہیں کرتے۔ میں نے بیٹے کو بیٹا ہی رہنے کے لیے یہ کڑوا گھونٹ بھرا۔“

”مجھے آج کل تمہاری باتیں سمجھ نہیں آ رہی ہیں۔“ انہوں نے منہ بنا کر کہا۔

”آپ سمجھنے کی کوشش کریں، آپ نے دیکھا تھا اپنی خواہش پوری نہ ہونے پر کونین جیسا سعادت مند و فرماں بردار ماں کے اشارے پر جان نچھاور کرنے والا بیٹا، کس طرح بدل گیا تھا، یہ تو نہ معلوم میری کون سی بھولی بھنگی نیکی کام آگئی جو پرنس کے دل میں میری محبت جاگ اٹھی، ورنہ اس نے کبھی ڈھنگ سے مما بھی نہ پکارا تھا۔ آپ خود سوچیں اگر پرنس کا رویہ پہلے کی طرح ہی ہوتا تو کس انتقام کا سوچ سکتے تھے؟“

”بات تو درست ہے مگر اتنی دیر مت لگاؤ کہ شکار جال بچانے سے پہلے ہی فرار ہو جائے۔“ ان کا موڈ قدرے بحال ہو گیا تھا۔

”ڈونٹ وری ماما! میرے بچھائے جال سے شکار کے لیے فرار ممکن نہیں۔“ ان کے ہونٹوں پر بڑی خالمانہ مسکراہٹ آئی تھی۔  
 ”یہ مت بھولو کہ وہ پہلے ہی ایک بڑی شکست کا ہاتھ مارے گلے میں پینا چکے ہیں۔ یہ جال کا شانان کے لیے مشکل نہ ہوگا۔“  
 ”اوہ ماما!“ فائقہ کے طعنے نے انہیں کوڑا سا مارا تھا۔ وہ غصے سے کھڑی ہو گئیں۔  
 ”کیا ہوا؟“ فائقہ معنوی حیرت سے گویا ہوئیں۔

”آپ کو لاکھ بار کہا ہے، مت دہرایا کریں ان گزری باتوں کو، جو میرے ذمہ کھرچ ڈالتی ہیں۔ لہو لہان کر دیتی ہیں، سانس روک دیتی ہیں۔“

”جب سے تم نے کرن کو انس کے پہلو میں دیکھا ہے، تب سے تم کپیلیکس کا شکار ہو گئی ہو، اسی وجہ سے سچ بھی تمہیں برداشت نہیں ہو رہا ہے۔“

”اوہ ہوا یہ آپ مجھے کہہ رہی ہیں، کرن کو انس کے ساتھ دیکھ کر میں جلیس ہو گئی ہوں۔“ وہ پوری طرح سے بدگمانی کے ذریعہ تھی۔  
 ”اس میں غلط کیا ہے؟“ فائقہ بھی تیوری چڑھا کر گویا ہوئیں۔  
 ”ماما! میرا منہ کھلواؤں تو بہتر ہے۔“  
 ”میں نہیں ڈرتی تمہارے منہ کھولنے سے، کہو جو کہنا ہے۔“

”آپ کس وجہ سے بگڑ رہی ہیں۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔  
 ”ان لوگوں کو اتنی ڈھیل مت دو، جو کرنا ہے فوری طور پر کرو۔“ بیٹی کے عمل بھرے انداز نے انہیں بھی خرد کی دنیا میں لاکڑا کیا۔  
 ”ماما! یہ میں بھی چاہتی ہوں، جو کرنا ہے ابھی کرنا ہے مگر اس دن آپ نے دیکھا ہی تھا کہ کس طرح بات شروع ہوتے ہی وہ کونین کے ساتھ چلا گیا تھا، تب سے ابھی تک کوئی موقع نہیں مل رہا کہ پرس سے بیٹھ کر ٹھیک طرح سے بات کی جائے، پھر بات بھی کوئی عام نہیں ہے۔ بہت احتیاط و دانش مندی سے اس کی برین واشنگ کرنی ہے۔“  
 ”ہاں، ٹول پر دف پلاننگ ہونی چاہیے اگر پرس کو ڈرا سا بھی شک ہو گیا تو پھر جو کچھ ہو وہ بھی کم ہے۔“ فائقہ بیگم جھرجھری سی لے کر گویا ہوئیں۔

”اسی لیے ماما میں بہت سوچ سمجھ کر چال چل رہی ہوں، اگر پرس کو معمولی سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا اور ہم ناکام الگ ہوں گے۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا..... دروازے کے پیچھے کوئی ہے۔“ بات کرتے ہوئے ان کی نگاہ دروازے کے نیچے سے آتی پر چھائیں پر پڑی تھی۔ وہ دونوں بھاگ کر دروازے کی طرف گئیں۔  
 ”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ دروازے سے باہر نکل کر کوڑے دور کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتی ہوئی گویا ہوئیں۔

گیٹ کے نیچے سے آتی پرچھائیں میں نے دیکھی ہے ماما۔ باتیں سن لیے جانے کے خوف سے دونوں کی رنگت خستہ تھی۔  
 ”ناممکن، وہ پرچھائیں پردے کی ہوگی اگر کوئی ہوتا تو اتنی جلدی یہاں سے جائیں سکتا تھا پھر کوئی سروٹ ہمارے حکم کے بغیر  
 یہاں نہیں آسکتے اور یہ نام کوئین وپرنس کے آنے کا بھی نہیں ہے۔“

خوب اچھی طرح دیکھنے کے بعد فائدہ مطمئن انداز میں گویا ہوئی۔

”آج کل پرنس کچھ آپ سیٹ ہے، وہ بھی نامم بے نامم آجاتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی تو نہیں جو ہماری باتیں سن کر چلا  
 گیا۔“ منال بڑی طرح حواس باختہ تھیں۔

”کوئی نہیں آیا ہے اگر کوئی ہوتا تو بھاگتے بھاگتے یہ لہبا کو ریڈور کر اس کرنا وہ ہماری نگاہوں سے اوچھل نہیں ہو سکتا تھا۔ چلو اندر  
 خواہ مخواہ خود بھی پریشان ہوئیں اور مجھے بھی کیا۔“

☆.....☆.....☆

”بھائی!..... بھائی!.....“ نثر کا انداز تھی ساتھا۔

”کیا ہے؟“ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، ساتھ حورین بھی کھڑی تھی۔

”شاپنگ سینٹر لے چلو۔“ حورین نے کہا۔

”سروٹ ہوں تمہارا؟“

”بھول گئے؟“ وہ شوخی سے بولی۔

”گلابادوں کا تمہارا۔“

”کیا ہے کڑوے کر لیے کیوں بنے ہوئے ہو؟“ حورین حیرانگی سے بولی۔

”رات کو میں نے کتنا اصرار کیا، سی ویو چلنے کے لیے، تم مانی؟“

”حورین کے انکار کی سزا مجھے تو مت دیں۔“

”تم اس کے ساتھ ہو، سزا برابر ملے گی۔“

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر گردن اکڑاتے ہوئے زعب سے گویا ہوا۔

”یہ نخرے کس کو دکھا رہے ہو، نہیں جاؤ، ہم خود بھی جا سکتے ہیں، چلو نثر۔“ وہ ایک دم ہڑپٹیش انداز میں آگے بڑھی۔

”ارے ناراض مت ہو، بات سنو۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا ہے؟“ وہ زرخ موڑے بنا کر، کرارے لہجے میں بولی۔

”آئی ٹوی۔“

”یہ پرانا طریقہ ہے، کوئی نئی بات کرو۔“ وہ جل کر کہہ اٹھی۔

نشر اس کے انداز پر بے ساختہ ہنس پڑی۔

”تم شادی کے لیے راضی تو ہو پھر دیکھنا میں کس طرح آسمان سے تارے توڑ کر تمہارے قدموں میں بچھا دوں گا۔ چاند تمہاری

مانگ میں سجا دوں گا تم ایک بار ہاں تو کرو۔“ وہ کہہ رہا تھا کہ اسی دوران وصی، سفیان، سرمد اور رؤف وہاں آگئے تو وہ خاموش ہو گیا۔

”تم لوگوں کو بھی ہمیشہ غلط وقت پر ہی انٹری مارتی ہوتی ہے۔“

”ہم بالکل صحیح وقت پر آئے ہیں، دراصل آج کل وصی کو چنگ لینے کی سوچ رہا ہے، ہم نے مختلف طور پر فیصلہ کیا ہے کہ تم سے بڑھ

کر کوچ ہمیں کہاں ملے گا، سو ادھر ہی چلے آئے۔“ رؤف نے بڑے مدبرانہ انداز میں بات شروع کی۔

”کیوں بھی! مجھ سے کیا کو چنگ لوگے؟“ وہ حیران ہوا۔

”وصی کو شادی کے شروع دنوں میں رومانٹک ورڈز یعنی ڈائلاگز بھابی سے کہنے پڑیں گے جو اس بے چارے کو یوں لے نہیں آتے

اور تمہارے پاس ان لفظوں کا ذخیرہ ہے۔ ذرا ترس کھا کر کچھ سے بھی عنایت کرو۔“ ان کی باتوں کے دوران نشر اور حورین جا چکی تھیں۔

”اٹ اذویری سہیل۔ یہ سب سیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کیا مطلب؟“ وصی بے ساختہ بول اٹھا۔

”یار! جب بھی تمہیں رومانٹک اسٹیو کی ضرورت پڑے مجھے بلا لیتا، تمہارے حصے کے ورڈز میں ادا کر دیا کروں گا۔“

اس کی شرارت پر وہ قہقہے لگانے لگے، جبکہ وصی نے معنوی غصے سے کشن اٹھا کر اسے دے مارا تھا۔

”پھر کیا خیال ہے تمہارا..... دیکھو نواب کہاں سیکھتے پھرو گے۔“ ہریرہ اسے چراتے ہوئے گویا ہوا۔

”بکو اس مت کرو، ایسا بھی ہوتا ہے کیا۔“

”خدا گواہ ہے میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے۔“

”مجھے نہیں کرنا یہ مانگے کارومانس۔“ وصی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ تو بی بی جان کی آواز ہے، شاید وہ ادھر ہی آ رہی ہیں چلو بھاگ چلو، ورنہ طویل لچکر سننے کو ملے گا۔“

☆.....☆.....☆

اسے سی کی خوشگوار کوٹنگ، خاموش کرے کی اداسی، اس کے اندر بے چینی، بے سکونی کو مزید بڑھانے لگی تھی۔ وہ کرے سے نکل

کر باہر گیلری میں آ گیا۔ جولائی کی جس زدہ گرمی کو آج ہونے والی موسلا دھار برسات نے خشکا کر دیا تھا۔ ابھی بھی آسمان پر گہرے سیاہ

بادل تھے جو کسی بھی لمحے برس کر جل تھل کر سکتے تھے، بند ہوا اس بات کی غماز تھی۔

باہر کے موسم سے تمام جس و ٹھن رخصت ہو کر طمانیت پھیلا گئی تھی مگر وہ اپنے اندر کے جس و ٹھن کا کیا کرے؟ جس کے چانس



گھٹنے کے بجائے بڑھنے کے ہی تھے۔ وہ وہیں کرسی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کے وجہہ چہرے پر گھمبیر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ گرے سحر انگیز نگاہوں میں گہری سوچوں کے کس تھے۔ کل انجانے میں حیدر کے ہاں کی جانے والی گفتگو حورین نے سن کر جو رسپانس دیا تھا، اس کی لائق، غصہ، سرد مہری اس حقیقت کا اظہار تھی کہ دل کے برے جذبوں کا مظہر صرف وہی تھا۔

دل کی زمین پر محبت کا گلاب اس کے لیے ہی کھلا ہے جس چاہت کے منبکے گلاب کی مہک وہ ابھی پوری طرح سونگھ بھی نہ پایا تھا کہ پہلے ہی کانٹوں نے اس کے جذبوں، احساس و چاہت کو گھائل کر دیا تھا۔ لہولہان کر دیا اور وہ جو بچپن کے دور سے محبتوں کے معاملے میں تھی دست و تکی دامن رہا تھا، اس بار بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا۔

حورین کچھ نہ کہتی اگر محض خاموش رہ کر بھی اپنی ناراضی و ناپسندیدگی کا اظہار کری تو حسیت، خودداری، شجاعت سے محرومی کا احساس تو جاگزیں ہو کر اسے بے قرار نہ کرتا۔ وہ آنا پرست شخص تھا۔ محبت میں انا نہیں ہوتی مگر جہاں محبت کا جواب محبت نہ ہو وہاں.....؟

”مائی جانلڈارات کے اس سے جب ایک کائنات بر سکون نینداور حسین خواہوں کے حرے لوٹ رہی ہے تو آپ کیوں محروم ہیں؟“ نہ معلوم کس وقت دبے قدموں سے سر آفتاب وہاں آکر رہے ہوئے۔ انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑا ہوا، انہوں نے فوراً ہی اسے پیٹنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سامنے پڑی کرسی پر براجمان ہو گئے۔

”بہت ساری نعمتوں سے محروم بچپن سے ہی لکھ دی گئی تھی میرے نصیب میں، اب شاید نیند سے بھی محروم رہتا پڑے گا۔“

”حد سے زیادہ حساسیت کی ایک بڑی ٹریڈی یہ بھی ہے کہ ایسی طبیعت کے لوگ دوسروں کے لیے تو مسرت و انبساط کے ذرائع تلاش کرتے رہتے ہیں مگر اپنے لیے چھوٹی خوشیاں بھی انورڈ نہیں کر سکتے۔“

”فطرت انسان کے اندر ہی سانس لیتی ہے، اس سے چھٹکار بھلا کس طرح ممکن ہے۔ حساسیت و بے حس ہاری ذات کے ہی پہلو ہیں۔“

”آئی نو..... مگر اتنی حساسیت بھی بندے کو بے سکون کر دیتی ہے۔ اس جگہ پر توازن ضروری ہے۔ اعتدال ہمیشہ سرخ زور رکھتا ہے۔ کتاب حیات سے زندگی کے ان اوراق کو پھاڑ کر پھینک دیں جو ناپسندیدہ ہیں۔“

”پھر میری لائف کی بک میں رہے گا کیا؟“

اس کے لیوں پر ڈکھوں سے بوجھل مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

”بہت ساری خوشیاں، بہت سارے دکھ، اُن گنت خوشیاں۔“

سر آفتاب کا شیشی و مہرباں لہجہ اس کے فم سے نڈھال دل کو رفتہ رفتہ ڈھارس دے رہا تھا، بکھرا وجود سسٹے لگا۔

”اپنے جذبات کو، اپنے لفظوں کو اظہار کا موقع دو، بیشتر کرو، ورنہ اندر ہی اندر ان سب کو گھونٹتے رہو گے تو خود بھی بے سکونی اور تھکن کا شکار ہو کر زندگی سے خوشی و دلچسپی کھودو گے۔“

”سرا! کچھ باتیں اُن کمی ہی اچھی لگتی ہیں، کچھ جذبات پردے میں رہ کر ہی اپنی خوب صورتی قائم رکھتے ہیں اور کچھ لفظ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو بندہ کسی اور سے کیا خود سے بھی شیر نہیں کرنا چاہتا۔“ یہ صدائیں اس کے اندر ہی گونج کر رہ گئیں۔

”گاؤں سے واپسی پر میں نے آپ میں بہت بڑی تہدیلی دیکھی ہے۔“ اس کی سوچوں سے بے خبر سر آفتاب اپنی کبے جا رہے تھے۔

”کیسی تہدیلی سرا!“ وہ یونک کر استفسار کرنے لگا۔ دل میں چھپا چور بہم سا گیا، اگر وہ اس کے دل کی بات جان گئے تو.....

”بہت اُلجھے اُلجھے پریشان سے رہنے لگے ہیں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ حیدر کے گھریلو معاملات کا آپ اتنا اثر لیں گے تو میں آپ کو اس معاملے سے دور رکھتا۔“

”اوہ!“ اس کی رگ و پے میں ایک طمانیت سی دوڑ گئی۔

بارش پھر زوردار انداز میں شروع ہو گئی۔ فرش پر گرنے والے پانی کی حیرت آواز جلتی سی بجانے لگی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے سرا حیدر کی طرف سے میں خوش ہوں کہ اس کی جرأت رائیگاں نہیں گئی۔ وہ جس غلامانہ و جاہلانہ ماحول سے اپنی بہن کو بچانا چاہتا تھا، اس میں کامیاب ہو گیا اور اپنے والدین کے ساتھ یہاں شفٹ بھی ہو چکا ہے۔ اس کی یہی خواہش بھی تھی مگر اس کے والد صاحب نہیں مانتے تھے، اب اپنی خوشی سے یہاں آگئے تو حیدر مطمئن ہو گیا ہے۔“

بے جا اور فضول رسم و رواج اسی طرح انسانوں کو ہیزا کرنے لگتے ہیں پھر ان سے جان چھڑانے میں ہی عافیت و طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حسب معمول ان سے ملنے آیا تھا، ان کی شفٹ و مہربان سگت میں بیٹھ کر وقت گزرنے کا احساس موسم کے بگڑے تیروں نے دیا تھا۔

سر آفتاب کے اصرار پر وہ وہاں رُک گیا تھا کہ آج کل دل کی بے کلی نے جو بے سکونی عطا کی ہے اس سے چھٹکارا مل جائے مگر آتش عشق تو وہ آگ ہے جو ”جلائے نہ جلے اور بجھائے نہ بجھے۔“

☆.....☆.....☆

وہی کی شادی کی تیاریاں ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ اس کی ہونے والی بیوی کے نانا کی ڈیٹھ ہونے کے باعث شادی ملتوی ہو گئی۔ وہاں سب بڑے زور شور سے گھر میں ہونے والی پہلی شادی کی تیاریوں میں مگن تھے، اس خبر سے ہوا سے محروم خباہتوں کی مانند ہو گئے تھے۔

”بھابی صاحبہ کے نانا جان کو بھی ان ہی دنوں میں نکٹ کٹنا تھا؟“ سفیان نے غمگین انداز میں کہا۔

”چند دن صبر کر لیتے تو اسی کی شادی کر کے چلے جاتے، جانا تو تھا، کون روکتا بھلا۔“ سرد نے سفیان کی تائید کی۔

”ہمارے یار کے دل سے پوچھو..... کیا ہیبت رہی ہے؟ دن کا چین، رات کی نیند، سب نانا کی ”ننہ“ کی بھینٹ چڑھ گیا۔“

”کتنی مشکلوں سے دن گن گن کر گزارے تھے۔“

”اب پھر وہیں پہنچ گئے، جہاں سے چلے تھے۔ نہ روئے! نہ رو۔ یہ ظالم دن بھی گزر جائیں گے۔“ وہ سب وہی کو گھیرے بیٹھے تھے۔ لہجوں میں بڑی سوز و گداز ہے مگر آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

”شٹ آپ، میں کیوں روؤں؟ میرے ہنسنے، مسکانے کے دن ہیں۔“ وہی ان کی شرارتوں پر چڑ کر گویا ہوا۔

”ہاں بیٹا!..... یہی دن ہیں پھرتو.....“ فانتہ فقرہ ادھورا چھوڑا۔

”پھرتو..... پھرتو کیا؟ تم لوگ کیوں، میرا داغ خراب کر رہے ہو، میں ویسے ہی ٹینشن میں ہوں اور تم ہو کہ.....“

”ناراض کیوں ہوتے ہو یا راجم تو تمہارا غم ہانٹنے آئے ہیں۔“ رؤف نے کسی صورت بنا کر کہا۔

”ہانٹنے کی ضرورت نہیں ہے اس کا سارا غم تو ہی؟“ ہریرہ کے کہنے پر وہ اس طرح چلایا گویا شہد کی کھسی نے ڈنک مارا ہو۔

”اللہ نہ کرے، میرا معاملہ تو ابھی سیدھا بھی نہیں ہوا اور تم نے پہلے سے ہی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی ٹھان لی۔“

”بھڑکتے کیوں ہو؟ وہی کو دیکھا، کیسا صبر کر رہا ہے، تم بھی کرنا۔“

”شٹ آپ، شٹ آپ، مجھے تو ہا چھوڑو، نہیں چاہیے تمہاری ہمدردیاں۔“

”کتنا صدمہ ہے تمہیں بھالی کے نانا کی ذمہ کا، اتنا تو ان کی تانی کو بھی نہیں ہوگا۔“ سرد نے اس انداز میں کہا کہ ان کی دہنی دہنی

ہنسی نکل گئی تھی جہاں سے بری طرح تپا گئی، اسی وقت بی بی جان اندر آئیں۔

”یہ کس بات پر دانت نکالے جا رہے ہیں؟“ وہ آتے ہی گویا ہوئیں۔

”ہم وہی کے پاس آئے تھے، اس کی شادی کی تیاریت کرنے۔“

☆---☆---☆

گرے پیٹھ کوٹ، دہانت بے داغ شرٹ میں اس کی اچھی، نکھری پرستارنی میں دل کو لٹنے والی چچی خوشیوں نے اُجالے نکھیر

دیے تھے۔ وہ زندگی سے بھرپور جھنگاتی لگا ہیں اس کے گہرائے، لہجے چہرے کو دکھ رہا تھا۔

”میں نے سوچا کسی ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے بہترین جگہ ”ہسپتال“ کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے، سو نہیں لٹے چلا آیا۔ آپ کو

کوئی اعتراض تو نہیں؟“ اس کے شوخ انداز میں محبت و الفت کا پھرا سمندر موجزن تھا۔ وہ بڑی استحقاق بھری نگاہوں سے اس کے صبیح

چہرے کو دکھ رہا تھا، جہاں اس کے حاضروں پر لڑاں سیاہ پلکوں کی جنبش اسے مہوت کر رہی تھی۔

”آپ..... آپ گھر آ جاتے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”آؤں گا، اس وقت تو صرف اور صرف اپنی باتیں کرنی تھیں، اس لیے یہاں کا رخ کیا ہے..... ایک بات پوچھوں؟ تاؤ کی؟“

خضرئی سے لگا ہیں نہ اٹھائی گئیں، اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کس انداز میں دعا مانا گئی تھی؟ جو یہ ممکن، ممکن ہو گیا۔“

کوئین کے انداز میں گزرے جاں کسل وقت کی کک، اُبھرائی۔ خضرئی کی آنکھوں میں بھی وہ تکلیف، وہ مناظر ایک ایک کر کے

گزرنے لگے اس کی آنکھیں بھرنے لگیں، جبکہ کوئین سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”حضرتی! محبت کی اس مہک کو میں نے اس عمر سے محسوس کیا تھا جب شعور ناپختہ و آگئی خوابیدہ ہوتی ہے۔ تمہیں دیکھنا اور دیکھتے رہنا میری اولین تمناؤں میں شمار رہا ہے پھر جس طرح وقت گزرتا گیا، جذبات و محسوسات کو بھی بدلنا گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے محسوس ہونے لگا اگر تم نہ ملیں تو زندگی ہر خوشی، ہر سکھ وطمینان سے دور ہو جائے گی مگر.....“ وہ چند لمحوں کے وقف کے بعد پوچھنا انداز میں گویا ہوا۔

”مئی کی ناپسندیدگی و نفرتوں سے آپ بھی آگاہ تھیں، وہ وہاں کے چھوڑ کر جانے کا تصور وار سسرال والوں کو ہی ٹھہراتی ہیں اور وہ بھی میرے جذبات پہچان گئی تھیں اور یہاں بنا کچھ کہے وہ ایک ماں نہیں، روایتی بہو، روایتی دیورانی، روایتی چچی بن گئی تھیں۔ ہمارے درمیان ایک خاموش سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔

”آئی کی رویے کی وجہ سے ہی میں نے بھی آپ کے جذبیوں کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ آئی کی نفرت کے جھلنے صحراؤں سے گزرنا میرے لیے کوئی ایسا مشکل بھی نہ تھا کیونکہ پھولوں سے محبت میں کانٹوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، پھر مجھے نہ معلوم کیوں آئی سے ایک بے نام لگاؤ ہے۔ میں ان سے نفرت نہیں کرتی، انہیں ناپسند نہیں کرتی، مجھے ان سے ہمدردی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ انہوں نے لائف کی ان خوشیوں و بے فکریوں سے وہ سکون حاصل نہیں کیا جو شادی شدہ زندگی میں عورت کو ملتا ہے۔ مہمانگاہی میں شادی کے بعد ہر عورت کی اولین ترجیح اس کا شوہر اور پھر اس سے وابستہ تمام رشتے اور گھر ہوتا ہے، کیونکہ گھر تو بننا ہی محبت و چاہت کے خوشگوار جذبیوں و احساسات سے ہے جو انہیں حاصل نہیں ہوئے۔ ان کی شخصیت متاثر تو ہوئی ہی تھی۔“

اس کا وہیما لہجہ بناوٹ و ریا کاری کے فریب سے پاک غلوں و مروت اور وفا کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ منافقت و مکاری اسے چھو کر نہ گزری تھی۔

”انکل کیوں گئے؟ کہاں گئے؟ اس کا ہمیں آج تک ادراک نہیں ہے۔ انکل کے جانے کے بعد آپ اور ڈاؤنٹون ہی ان کی امیدوں و محبتوں کا محور ہیں پھر آئی آپ سے بہت اٹیچڈ ہیں، اسی وجہ سے میں بالکل ہی دور ہو گئی تھی کہ میرے درمیان میں آنے سے آپ لوگوں سچ میں مس انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو جائے اور نئے رشتے نفرتوں و عداوتوں کی زمین پر استوار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تمہیں اعزاز کی طرح ملنی چاہئیں، خیرات کی طرح نہیں۔“

”مجھے فخر ہے اپنے انتخاب پر، تمہاری رفاقت میری حیات کا حاصل ہوگی۔ ہمیں مل کر ان نفرتوں و بیگانگی کی دیواروں کو ڈھانا ہوگا۔ مجھے یقین ہے بہت جلد میرے گھر میں آکر گھر کو گھر بنا دو گی۔“

☆.....☆.....☆

سر آفتاب نے ان سب کے اصرار پر ایک پینک پارٹی رکھی تھی۔ شہر سے باہر مضامعات میں، یہ پارٹی منانے کا اہتمام کیا تھا۔ وہ سب خوش تھے سوائے حورین کے جس نے جانے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ کوئی بھی اس کے بغیر جانے کو تیار نہ تھا مگر وہ کسی طور جانے کو راضی نہ تھی۔

”کوئی وجہ تو ہونے جانے کی؟“ شہرین نے کہا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ گھاس نوچتے ہوئے گویا ہوئی۔

”بہنی کئی نظر آ رہی ہو، پھر اگر طبیعت خراب بھی ہے تو سیر و تفریح سے ٹھیک ہو جاؤ گی۔ دیکھنا تمہیں دوا کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔“ روانے بھی اس سے ہائی بھروائی چائی۔

”نہیں، میں نہیں چاہتی میری وجہ سے تم لوگ بھی انجوائے نہ کر سکو۔“ پرہل دوہانت پر عذ کائٹن کے سوٹ میں اس کے خوب صورت چہرے پر سنجیدہ تاثرات تھے۔ ڈراک برادرن دل کش آنکھیں ڈہنی یوجہ تلے دہنی ہوئی تھیں۔ اس کا دلی سکون اسی دن سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ جب اس نے نادانستگی میں ان کی گفتگو سنی تھی اور اسے پوری شدت سے اس حدیث کا مہموم واضح ہوا جس میں چھپ کر گفتگو سننے سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ ذوالنون کے منہ سے نکلنے والے اپنے نام نے اسے رکنے پر مجبور کیا تھا پھر اپنے ہی حوالے سے کی جانے والی گفتگو نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے، بعد میں ذوالنون معذرت بھی کر چکا تھا۔ حیدر نے بھی ایکسکو رکھا اور ساتھ میں بڑی جرات و صاف گوئی سے وہ اپنے جگری دوست کی محبت و دلی جذبات بھی بتا گیا تھا، نہ معلوم کیا ایسی آن دیکھی طاقت تھی، حیدر کے لفظوں میں جو اسے انجانے جذبات میں جکڑ چکے تھے، وہ ان سے بچھا چیزانے، بھاگنے کی ہر سی کر کے ناکام ہو گئی تھی۔ جذبات و احساسات پر جو حمل پن طاری تھا، طبیعت اس کی عجیب سی ہو گئی تھی۔ بے زار، اکڑی اکڑی، لائق بیگانہ، یونورٹی آنے کے بعد اس کی یہی کوشش ہوتی کہ ذوالنون سے سامنا نہ ہو اور شاید اس کی بھی یہی کوشش رہی تھی جو ان دنوں میں ایک بار بھی آنے سے سامنے نہ آئے تھے، البتہ آتے جاتے دور سے بھی ان کی لگا ہیں ایک دوسرے پر اٹھتیں تو وہ تیزی سے راستہ بدل لیتے تھے۔

اس پوشیدہ آنکھ چھوٹی سے حیدر پوری طرح آگاہ تھا۔ ذوالنون کو وہ ڈائریکٹ اور حورین کو ان ڈائریکٹ نقرے کتا رہتا تھا۔ حورین سن کر اگنود کر دیتی۔ ذوالنون سے ٹھیک ٹھاک بحث چل نکلتی۔ پکنگ کا پروگرام بھی اس نے محض ذوالنون کی وجہ سے ہی ملتوی کیا تھا۔ ان لوگوں کے احساسات و محبت مجروح ہونے کا اسے ڈکھ بھی ہو رہا تھا مگر.....

”اب ایسی بھی کیا ضد یا ر! سب اتنے پیار سے اصرار کر رہے ہیں تو مان جاؤ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے کوئی اور ہی بات لگ رہی ہے۔“ زویا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ذوقی لہجے میں کہا۔

”کیا..... کیا بات؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو، جب ایسی کوئی بات نہیں ہے تو؟“

”میں کیوں گھبراؤں گی، ہر بات کا اُلٹا مطلب نکالنا تمہاری عادت ہے۔“ زویا کے انداز میں واضح ذوالنون کا حوالہ محسوس کر کے وہ تضح کر کہا تھی۔

”ارے ایسی بات نہیں ہو سکتی، کیونکہ آج کل راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔“ موہل ہنس کر کہنے لگی تو وہ بھی مسکرانے لگی۔

”ہاں بھئی! یہ تم نے بالکل درست کہا۔“

وہ چاروں اس کے نزدیک ہو کر بیٹھے ہوئے چکیں۔

”آج کل تو چین کی بانسری بج رہی ہے، جنگ یک دم ہی سرد پڑ گئی اور کسی کو محسوس بھی نہیں ہوا! یہ کیا ماجرا ہے؟“ شرین اپنی یادداشت کو کوئی ہونٹی گویا ہونٹی۔

”شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پینے لگے!“ روانے آنکھیں منکائیں۔

”کئی بار ہم سر آفتاب کے ہاں مل چکے ہیں، وہاں بھی نگرانا منتشر، دونوں جانب خاموش سمجھوتے..... معاملہ گزبڑ ہے۔“

”زویا کی بات کی وہ بھرپور تائید کرنے لگی۔

وہی ہوا جس کے خوف کی وجہ سے پتنگ پر جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ بعض دفعہ گریز بھی تشہیر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

”زویا! تم کسی باتیں کر رہی ہو؟ آئی ڈونٹ بلیو۔“ وہ گھاس پر رکھا ایک ویکس اٹھا کر غصے سے آگے بڑھ گئی۔ وہ چاروں اسے منانے کے ارادے سے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔

”یہ میرے دوست کی عیث چاہت کی قوت ہے جو اس کی آن دیکھی محبت کی خوشبو دھیرے دھیرے دوسروں کو بھی باور کرانے لگی ہے، قبل اس کے کہ یہ ہر شو بھیل جائے، آپ خاموشی سے سمیٹ کر اپنے آنچل سے باندھ لیں۔“ قریب سے گزرتا حیدر بڑبڑاتا آگے نکل گیا۔ وہ ہونٹ بھیج کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

ہیش تک سک سے تیار رہنے والی منال بیگم کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ اُلٹھے بکھرے ہال، گریہ وزاری کے باعث متورم آنکھیں اور سوجھا چہرہ کل سے اب تک وہ ایک ہی سوٹ میں تھیں جو ٹکٹوں سے بڑھا تھا۔ ان کی ذہنی وجد باقی حالت بھی ان ہی کپڑوں کی طرح سلوٹ زدہ، اُلٹھی، بکھری ہوئی تھی، کل تک پھول کی طرح تر و تازہ تھیں۔ خوشی خوشی ایک پارٹی اینڈ کرنے نکل تھیں، اپنی پوری تیاریوں کے ساتھ سنٹل پر گاڑی زکی تو ان کی نگاہ برابر والی کار پر پڑی اور بے ارادہ اُٹھنے والی نگاہ پلٹنا بھول گئیں اور بھلا پلٹتی بھی کیونکر، ایک طویل عرصے بعد ”گوہر مقصود“ نظروں کے سامنے تھا۔ وہ بے خودی دیکھے چلی گئیں، اتنا عرصہ گزارنے کے بعد بھی وہ اسی طرح وجیہہ و اسارت تھا۔ وہی بے پروا وہ بے نیاز انداز جو مقابل کو زیر کر دیا کرتا تھا۔

نگاہوں کی حدت محسوس کر کے انس صاحب نے گردن موڑ کر دیکھا فوراً تو انہیں اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔ دوسرے لمحے بڑے شور ماحول نے انہیں یقین دلایا کہ یہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ گہری آنکھوں میں برہنگی و نفرت کی شدت پوری طرح پھیل چکی تھی۔ وہ تمام کٹھنایاں و مشکلات یاد آتی چلی گئیں جن کا باعث منال کی ذات تھی اور آج تک کرن اس کے خوف سے بڑے سکون زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ ان کا دل چاہا، اسی لمحے کار سے نکل کر اس بلا کا گھاگھونٹ کر کرن کو اس کے خوف سے نجات دلا دیں مگر اس مصروف شاہراہ پر یہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

منال ان کی سوچوں سے بے خبر بڑی محمورنگا ہوں سے ان کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ وہ آج کچھ زیادہ ہی دل لگا کر تیار ہوئی تھیں اور اس لیے یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھیں کہ ان کے حسن کے سحر سے انس اب نکل نہیں پائیں گے اور وہ کرن کو شکست دے دے گی۔ انس صاحب کا خود کو نکلے جانا انہیں کھل مفرور کر کے خوش نہی کے جال میں جکڑ گیا۔ وہ انا پرستی کے بہکاوے میں آ کر یہ بھی فراموش کر گئیں کہ وہ ایک معزز خاندان کی بہو اور دو جوان بیٹوں کی ماں ہیں۔ وہ سب فراموش کر بیٹھی تھیں، یاد تھا تو صرف یہ کہ انس کو کرن سے چھیننا ہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو ڈارنگ! مجھے یقین تھا تم ایک دن ضرور آؤ گے۔ میں کب سے تمہاری منتظر ہوں۔ مجھے معلوم تھا تم ایک دن لوٹ کر آؤ گے۔“ انہوں نے بڑی ناگواری سے ان کی جانب دیکھا اور نفرت سے بولے۔

”تم کل بھی تھرڈ کلاس تھیں اور آج بھی تھرڈ کلاس ہو، تھرڈ کلاس پر سن تھرڈ کلاس جگہوں پر ہی سب سے ہیں۔ معزز و عزت دار گھرانوں میں تم جیسی ”عورتوں“ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔“

سستل کھل گیا تھا۔

وہ اس پر حقارت بھری نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئے تھے۔ منال شاکندہ گئیں۔ اتنے سالوں میں اس کی نفرت و حقارت ڈگنی و بڑھ گئی تھی۔ کتنی تحقیر و تذلیل تھی اس کے لیے میں۔ کتنی نفرت و حقارت تھی ان نگاہوں میں۔

خوش نہی کی خوش نما تمٹیاں لٹکا بھر میں آؤ گئیں۔ بے عزتی و بے وقعتی کسی طوفان کی طرح ان کے اندر حشر اٹھانے لگی۔ لمبے بھر قبل وہ خود کو آکاش کے روضوں پر دیکھ رہی تھیں۔ لمبے کے ہزارویں حصے میں وہ زمین پر چت تھیں۔ ہر سو آگ ہی آگ تھی، پھر کیسی پارٹی؟ کہاں کی پارٹی؟ پارٹی کا تعلق دل کی راحت سے ہوتا ہے اگر دل ہی جل رہا ہو تو..... ڈرائیو کو انہوں نے واپس گھر چلنے کا حکم دیا۔ انس سے ہونے والی گفتگو کو کانگش میں تھی کچھ لفظ ایسے ہوتے ہیں جو زبان سے زیادہ چہروں سے پڑے جاتے ہیں۔ ڈرائیو لفظ بہ لفظ نہیں مگر چہروں سے بہت کچھ اخذ کر چکا تھا لیکن ظاہر نہ ہونے دیا۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی وہ بچھرے ہوئے طوفان کی طرح ماتے میں آنے والی ہر شے کو اٹھا کر پھینک رہی تھیں، گلدان، ٹیبلو کے گلاسز شوہر کا رپٹ پر بکھرتے جا رہے تھے۔ اسی جنونی انداز میں انہوں نے اپنی جیولری اُتار کر پھینکنا شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ وہ انس و کرن کو گالیاں دیتے ہوئے کوس رہی تھیں، بد دعائیں دے رہی تھیں۔ بری طرح روتی بھی جا رہی تھیں۔ کسی ملازمہ کے فون کرنے پر فائدہ بیگم آفس سے آئیں، انہوں نے بڑی دقتوں کے بعد سمجھا بجا کر انہیں خاموش کیا، ورنہ وہ جنون میں خود کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھیں۔ فائدہ بیگم نے انہیں ان کا ”مخصوص مشروب“ پلا کر سلا دیا۔ ساری رات و دن چڑھے تک وہ مدہوش رہی تھیں، بیدار ہوتے ہی ان کی وہی دیوانگی بھی جاگ اُٹھی تھی۔ فائدہ بیگم پھر انہیں سنبھالنے لگیں۔

”مما! وہ پتھر ہے، اس نے میری انسلٹ کی، جو اس کی خاطر اپنی زندگی، اپنا گھر، اپنا سب کچھ جلا بیٹھی، یہ صلہ دیا ہے اس نے۔“

کہتا ہے میں کل بھی بچ تھی، آج بھی بچ ہوں، مجھ جیسی گری ہوئی عورتوں کی جگہ اچھے و عزت دار خاندان میں نہیں ”بازار“ میں ہے، اس نے



مجھے طوائف بنا دیا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

”اپنے ہاتھوں سب بھسم کر کے تمہیں اب محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا وہ پتھر ہے پتھر۔“ قانقہ بھی بے حد آرزو تھیں۔  
 ”اب دیکھنا ماما، اس پتھر کو میں کس طرح ریزہ ریزہ کرتی ہوں، عورت محبت میں پھولوں کی طرح نرم ہو جاتی ہے تو نفرت میں اس کا کوئی ٹانی نہیں ہوتا۔ مجھ پر اس وقت تک ہر خوشی حرام ہے جب تک میں اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لے لیتی، یہ عہد میرا ہے۔“  
 ان کی نگاہوں میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ اسی دم باہر سے بھاری بوٹوں کی دھمک محسوس کر کے قانقہ بیگم مخاطب ہوئیں۔  
 ”جلدی سے سوئی بن جاؤ، میں نہیں چاہتی وہ جاتے وقت تمہاری حالت دیکھ کر ٹھنس ہو۔“

”ٹھنس ماما! میں چاہتی ہوں، وہ میری حالت دیکھے، مجھ پر ہوئے ظلم کا اسے ادراک ہوتا کہ میں اسی طرح انتقام لے سکوں جس طرح میں چاہتی ہوں۔ اس نے مجھے طوائف کہا، دیکھنا میں اس کی بیٹی کو کیا بناتی ہوں۔“ ان کی حالت ڈھی ناگن کی مانند تھی۔  
 ”ایسا ہی ہوگا مگر پلیز اس ناٹم جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو، وہ فریش ہو کر آجائے تو ہم اپنی منوائیں گے، ایسا کرنے کے لیے اسے بہت سارے اسٹیمنا کی ضرورت ہے۔ ایک دن اسے آزاد رہنے دو۔“

ماں کی بات کچھ ان کے دماغ میں آگئی، وہ چادر اوڑھ کر سوئی بن گئیں۔ قانقہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں جب وہ دروازہ ٹاک کر کے اندر آیا۔

”ماما اس وقت سو رہی ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

بلو، جنیز، ریڈ، بلوٹی شرٹ میں گھرا گھرا خوشبوؤں سے بھرا پرنس انہیں اتا بھایا کہ بے ساختہ وہ بلائیں لے بیٹھیں۔

”ہاں، بس ڈرامہ میں درد ہے، میں نے ٹھیلٹ دی ہے، ابھی سو کر اٹھیں گی تو بالکل فریش ہوں گی، آپ فکر مت کریں۔“

”میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔“ اس نے جیب سے سیل فون نکالا۔

”میں نے ٹھیلٹ دے دی ہے، معمولی سا درد ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بے فکری سے جائیں، منال اٹھیں گی تو سب سے پہلے آپ کو کال کرواؤں گی۔“

اس کے لہجے میں ماں کے لیے جو چاہت بھرے ٹکرات تھے، وہ چادر میں چہرہ چھپا کر لیٹی ہوئی منال کے لیے بڑے حوصلہ افزاؤ خوش کن تھے جو جینا ان کے معمولی سے سر درد کا سن کر اتنا پریشان ہو گیا تھا تو وہ ان کی آگ بھڑکائی داستان سن کر کیا کچھ نہ کرنے پر کمر بستہ ہو جائے گا۔ وہ اب تصور میں اسے انتقام لیتے دیکھتے ہوئے حقیقتاً سو گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

سامنے نیلگوں سمندر کی نہ جوش لہریں بڑے والہانہ انداز میں آ کر ساحل کو چوم رہی تھیں۔ وہ سب ہٹ میں بیٹھے خوش گپوں میں مصروف تھے۔ سر آفتاب کے ساتھ ان کے ڈپارٹمنٹ کے کچھ اور بھی اسٹوڈنٹس چلے آئے تھے۔ سر آفتاب نے حورین کے کسی عذر کو

قبول نہ کیا تھا اور اسے لے آئے تھے۔ وہ سارے راستے خود کو سنبھالتی رہی۔ ان چاروں نے اس سے سواری کی تھی مگر وہ جانتی تھی شک کا کٹنا ایک بار چہ جائے تو زخم جلدی نہیں بھرتا، انہوں نے اس کی ناراضی کے خوف سے اپنے لفظوں کی معافی تو مانگ لی تھی مگر اتنی جلدی وہ اپنے تجسس کو نہ چھپا پائیں گی اور جاننے کی لہو میں لگی رہیں گی۔ اس لیے وہ احتیاط کے ہر پہلو کو ملحوظ خاطر رکھ کر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

موسم کی خوب صورتی نے ان کی پچک کا مزہ دوہالا کر دیا تھا کہ ابر آلود سیاہ بادل، دلوں کو سرشار کرتی ٹھنڈی ہوائیں، ماحول پر چھایا خواب ناک سا اندھیرا تاحد نگاہ پھیلا ہوا سمندر جس میں اٹھتی لہریں کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں۔

ماسیوں نے وسیع و عریض ہٹ کے فرش پر دریاں و چاندنیاں بچھادی تھیں۔ دو حصوں میں ایک طرف لڑکیاں، دوسری طرف لڑکے درمیان میں پروفیسر آفتاب ساتھی پروفیسرز کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بی ایس سی کا وہ اسٹوڈنٹس بڑے بڑے جوش انداز میں شروع ہوا تھا۔

”مجھے تو یہ تمہارے دل کی آواز لگ رہی ہے۔“

پروفیسر آفتاب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس وقت کمانے پینے کے سامان کا جائزہ لینے گئے ہوئے تھے، انہوں نے آتے ہی پہلے کمانے کی اطلاع دی۔ پہلے کمانا کھایا جائے، کچھ دیر آرام کے بعد پھر پانی کی طرف جایا جائے۔ ان کے حکم کی دیر تھی، لمحوں میں دسترخوان پر کھانا سج چکا تھا۔ بریانی، چکن کڑا ہی، فرنی، فرنی اور کولڈ ڈرنکس ان کی تواضع کے لیے تھے۔ بہت خوش گواری ماحول میں کمانا کھایا گیا۔ پروفیسر آفتاب تو تھے ہی ہر دل عزیز، نرم مزاج و شفیق شخصیت، تمام اسٹوڈنٹس سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اس وقت وہ پروفیسرز بھی جو جامدہ میں سخت رعب و دبدبہ رکھتے تھے ان تمام اسٹوڈنٹس سے دوستوں کی طرح مکمل مل گئے تھے۔ کمانے کے دوران بھی ان کے ملے جلے قہقہے گونجتے رہے۔ کمانے سے فراغت کے بعد کوئی بھی سمندر سے دور رہنے کو تیار نہ تھا۔ لڑکے آگے اور لڑکیاں پیچھے۔ وہ پانچوں بھی چلیں اتار کر ننگے پاؤں چلی آئی تھیں۔ ہنگلی ہنگلی ٹھنڈی ریت پر پاؤں رکھتے ہی جسم و جاں میں ایک تراوت سی دوڑ گئی تھی۔ حورین کو پہلی دفعہ محسوس ہوا، اس نے یہاں آ کر اچھا کیا ہے۔ ابر آلود موسم نے سمندر کی خوب صورتی کو مزید اجاگر کر دیا تھا۔ وہ باتیں کرتی جا رہی تھیں، یہاں پر لوگ چھٹی کا دن نہ ہونے کی وجہ سے بہت کم اور خامسے فاصلوں پر تھے، وہیں کچھ ٹھلے نوجوان بھی سوسٹنک کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی گہری نگاہیں ریڈ و گولڈن شینڈ کے سوٹ میں ملبوس حورین پر تھیں جو ٹکونی حسن کے باعث ان چاروں میں نمایاں تھی۔ اس کے گولڈن براؤن بال پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ کانوں میں گولڈ کی نازک رنگرز، آنکھوں پر گولڈن سن گلاسز لگائے وہ اس نوجوان کو دیکھ کر ہنس گئی۔

شرین، موئل، ردا اور زویا اونٹ پر بیٹھی تھیں۔ بے حد اصرار کے باوجود وہ نہیں بیٹھی تھی۔ اسے خوف آتا تھا۔ وہ قریب پڑے پتھر پر بیٹھ کر ان کو اونٹوں پر ہچکولے کھاتے دیکھ کر شکر آ رہی تھی۔ معاً اس کے پیچھے سے مردانہ آواز ابھری۔

”اوحینہ! اولیم پری! کر رہی کیسی جاو گری.....“



اُس نے وہ بھی بھئی بھئی ہے پاک آواز بھٹی سنی تھی۔ اس کے مسکراتے لب بھنج گئے، چہرے پر خاموش سنجیدگی در آئی۔ بلاشبہ وہ سوچ اسی کے لیے ٹکٹا گیا تھا کہ آس پاس اس کے سوا کوئی اور لکس نہ تھا۔

”آج چاند زمین پر اتر آیا ہے“۔ وہی بدست آواز اُبھری تھی۔

”اسے کُثر کہیں یا بھڑو؟“ کوئی دوسری آواز اُبھری۔

”جو چاہے بھجو مگر یہ میرے لیے ہے“۔ لہجے میں خاصا گھمنڈی پن تھا۔

”یہ چیٹنگ ہے یا رابر حسین چیز کیا تمہارے لیے ہے؟“

”ہاں، دُنیا کی ہر حسین شے پر صرف میرا حق ہے“۔

وہ تین آوازیں تھیں جو اس کی پشت سے اُبھری تھیں۔ حورین اندر ہی اندر اُن کی باتوں سے بچ و تاب کھا رہی تھی مگر ساتھ ہی اس کی نگاہ ارد گرد کے ماحول پر بھی تھی جہاں لوگ خاصے قاصطے پر تھے، اگر وہ مشتعل ہو کر انہیں کھری کھری سناٹی، ان کی بکواس کا منہ توڑ جواب دیتی تو ان کا رد عمل ناقابل برداشت ہوتا۔ اس نے ان کے چہرے نہیں دیکھے تھے مگر لہجہ و انداز بھی انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے وہ ناپسندیدہ کردار کے مالک لگ رہے تھے اور ایسے لوگوں کے منہ لگ کر وہ تماشہ بننا نہیں چاہتی تھی، سامنے سے آتے ہوئے اونٹوں کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ اسی دم کچھ لوگ اونٹوں پر بیٹھنے کے لیے اس طرف آئے تھے، خاصی چہل پہل سی ہو گئی تھی، وہ تینوں بھی ایک طرف ہو گئے، مگر گئے نہیں تھے۔

”تھیک گاڈا تم لوگ آگئیں“۔ حورین نے بے ساختہ کہا تھا۔

”وہ تینوں تم سے کیا کہہ رہے تھے؟“ موئل نے قریب آتے ہی پوچھا۔

”میں دیر سے ان میں سے ایک کو نوٹ کر رہی ہوں جو حورین کو گھوڑے جا رہا تھا۔ اب ہمارے جاتے ہی وہ یہاں آیا اور اس کے دونوں ساتھی پیچھے، اسی لیے ہم نے اونٹ والوں کو آگے جانے نہیں دیا تھا“۔

”تم نے محسوس کر کے سمجھی کیوں نہیں بتایا کہ ہم حور کو تنہا چھوڑ کر جاتے ہی کیوں“۔ روانے کہا۔

”مجھ یہ تھوڑی معلوم تھا کہ وہ مجھوں کی اولاد فالو کرے گا“۔

”وہ ابھی بھی پیچھے آ رہے ہیں“۔ معا چلتے چلتے زویا کو احساس ہوا۔

”میں ابھی ڈوالٹون بھائی کو کال کرتی ہوں، وہ ابھی تمام عاشقی جھماڑ دیں گے، ان مجھوں کے بچوں کی“۔ شرین نے پرس سے سیل فون نکالتے ہوئے غصے بھرے انداز میں کہا۔

”یہ کیا بے وقوفی کر رہی ہو“۔ حورین اس کا سیل فون آف کرتے ہوئے رسائیت بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

”اُن کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے، میں تماشہ بننا نہیں چاہتی“۔

”حورین ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اُن کو بلانے سے معاملہ بگڑ سکتا ہے، بلا کے ایسی باتوں کو فوراً ہی غیرت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں پھر جو کچھ بھی ہو، وہ کم ہے۔“

”واپس پلٹ چلتے ہیں، ہم نے اتنی دور آ کر لٹھی کی ہے۔“

مول وشرین کی بات درست تھی۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھیں، وہ تینوں نوجوان بھی پیچھے آئے تھے مگر ہٹ کے قریب زیادہ لوگوں کو دیکھ کر وہ وہیں سے پلٹ گئے تھے۔

”ٹھیک گاڈاؤس کم جہاں پاک۔“ اُن کے جانے کے بعد روانے کہا۔

”سمندر کا دور دور سے ہی نظارہ کرنے کا ارادہ ہے؟“

حیدر ذوالنون کے ہمراہ اس طرف آتا ہوا گویا ہوا۔

”سمندر سے دور کی دوستی ہی بھلی ہے۔“ زویانے سامنے پانی میں بلند لہروں کو دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”ڈرنے کے باوجود آپ یہاں چلی آئیں۔“

”بلیو جینز اور دہانٹ ٹی شرٹ میں اس کے چہرے پر وحشی مسکراہٹ چاندکی کرنوں کی طرح روشن تھی۔ سحرانگیز آنکھوں میں ہر وقت رہنے والا حزن جو سرخی کی صورت میں ظہر سا گیا تھا جس نے اس کی شخصیت میں ایک باوقار جاڈیت پیدا کر دی تھی۔

اس سے ان تضادات نے اُس کی وجاہت میں کشش پیدا کر دی تھی۔ ہر وقت چہرے پر چھائی کھٹکی دیر ہی جب سے اس کے انداز سے عائب ہوئی تھی تب سے اس کی ہر دل عزیز ی از حد بڑھ گئی تھی۔

”ذرا اور شوق زندگی کا حصہ رہا ہے، ذوالنون بھائی! اور پھر ہم کراچی میں رہ کر سمندر سے دور ہیں تو بد نصیبی ہے یہ۔“

”اچھا اگر سمندر پر آ کر بھی اس میں دو تین ڈبکیاں لگانے سے محروم رہیں، وہ بیڈنگ ہے چلو پانی میں۔“

شرین نے کہا اور ساتھ ہی قریب کھڑی حورین کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی تو وہ بھی چل پڑی تھی۔

”آپ لوگ بھی آ جائیں نا۔“ روانے ان سے کہا جو وہیں کھڑے رہے تھے۔

”پھر یہ شکایت مت کیجئے گا کہ ہماری قوم کو عادت ہے، آپ کی قوم کے پیچھے آنے کی۔“ حیدر شوخ انداز میں گویا ہوا۔

”ہا..... ہا..... ہا، یہ بات تو سوا سولہ آنے کی ہے۔“

”ہم چائے پینے جا رہے ہیں، ابھی پانی میں جانے کا موڈ نہیں ہے۔“

ذوالنون نے حیدر کو شہزادت کے موڈ میں دیکھ کر تو جیہہ پیش کی پھر مول سے مخاطب ہوا۔

”آپ لوگوں کا چائے پینے کا ارادہ ہے؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ مول کی بجائے شرین نے جواب دیا۔

”ارے دماغ چل گیا ہے کیا تمہارا کوئی نہیں جا رہا ہے چائے پیئے۔“ حورین نے ثمرین کو گھورتے ہوئے کہا۔  
 ”چائے پیئے سے دماغ کیوں خراب ہونے لگا۔“  
 ”اوکے، مجھے نہیں پتہ چینی چائے تم جاسکتی ہو۔“  
 ”آپ کو لڈو رک لے لیجئے گا۔“

ذوالنون اس سے براہ راست مخاطب ہوا تھا، اُن لوگوں کے لبوں پر ایک معنی خیز جزم پھیلا تھا، حورین نے شانگلی سے انکار کر دیا تھا اور سر حیدر کی گیدرنگ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ لوگ گیلی ریت پر ہی چیخیز ڈالے بیٹھے تھے۔ ان کے پاؤں ریت پر تھے جہاں دم توڑتی لہروں کا پانی پاؤں سے ٹکراتا تو بڑی ٹھنڈک و سکون کا احساس ہوتا تھا، وہ سب بڑے زور و شور سے گفتگو کر رہے تھے۔ موضوع سیاست تھا۔ سر حیدر آج سے ساٹھ سال قبل کی سیاست کا موازنہ آج کی سیاست کر رہے تھے، وہ بغور ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ تب ہی اسے احساس ہوا کسی کی گھورتی نگاہوں کا، اس نے بے ساختہ لگا ہیں اٹھائیں تو اگلے لمحے اس کے چہرے پر ناگواری پھیلتی چلی گئی۔ وہی لڑکا کچھ قاصیلے پر ریت پر اوندھا لینا سے دیکھ رہا تھا۔  
 اُف..... اس کے لبوں کی مکروہ مسکراہٹ، آنکھوں میں استعزازی غلاطت۔

حورین کی بے ساختہ اٹھ جانے والی نگاہوں نے لمحہ بھر میں یہ سب محسوس کیا اور غم و غصے سے اس کے اندر شرارے دوڑنے لگے۔ دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کی وہ غلیظ آنکھیں نوح لے اور چہرے پر اتنی زور کا ٹھہر لگائے کہ وہ تاحیات مسکراتا بھول جائے مگر..... مصلحتاً اسے یہ کڑواہٹ اندر ہی اندر اٹھ بیٹھی تھی، اگر یہ کڑواہٹ باہر پھیل جاتی تو بہت برا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اسے یاد تھا کچھ عرصہ قبل جب وہ ایک ویک اینڈ پر پاپا، ماما اور سدا نکل کی فیملی کے ہمراہ ڈنر پر گئی تھی۔ ڈنر کے بعد وہ واک کی خاطر ایک پارک میں گئے تھے، وہاں اسی طرح کے چھچھورے لڑکوں کا گروپ انہیں فالو کرنے لگا تھا۔ اس نے ہریرہ کو بتایا تو دوسرے لمحے وہاں زبردست ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر دم ہنستے مسکراتے شوخیاں نکھیرتے ہریرہ کا فصد و جنون اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ تنہا ہی ان پانچ چھ لڑکوں سے بھڑ گیا تھا۔ پپا اور سدا نکل کی مداخلت کے باوجود بھی وہ ان کو لہو لہان کر چکا تھا، اگر پپا اور نکل اسے قابو نہ کرتے تو نامعلوم ان کا کیا حشر ہوتا۔ ممانے سمجھایا تھا کہ ایسی باتیں مردوں کو نہیں بتانی چاہئیں۔

تب سے وہ ایسے موقعوں پر بہت احتیاط کرنے لگی تھی، پھر ماما کی بات بھی بالکل درست تھی۔ عموماً ایسی جگہوں پر ایسے نوجوانوں سے سابقہ پڑتا رہا تھا اور اس کی بے نیازی اور لائقیت نے سب کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا، لیکن نامعلوم کیا بات تھی اس شخص کے انداز میں کچھ انہونی تھی۔ اپنے رکھ رکھاؤ ظاہری شخصیت سے وہ کسی برگر فیملی کا فرد لگ رہا تھا مگر اس کی عامیاناہ و گھٹیا حرکات و سکنات سے اس کی وہنی تڑنی عیاں تھی جو اس کے کردار کے جمول کوئی طرح عیاں کر رہی تھی۔

”حورین! کیا ہوا؟ آپ بور ہو رہی ہیں؟“ سر آفتاب نے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے کہا۔

”نوسر.....!“ وہ جبراً اسکا کر گیا ہوتی تھی۔

”ہمیں لگ رہا ہے آپ سخت بور ہو رہی ہیں، آپ کی فرینڈز کہاں گئی ہیں؟“ پروفیسر فیضان نے پوچھا۔

”وہ حیدر کے ساتھ چائے پیتے گئی ہیں، میرا موڈ نہیں تھا سو چائے کی دوائی تک آپ لوگوں کی کبھی جوائن کی جائے۔“

”اوہ.....! کیا نام لے ڈالا جائے، واہ کیا بات ہے آسمان سرنگی ہادلوں سے ڈھکا ہو، نم ہوا دھیرے دھیرے چل رہی ہو،

نگاہوں کے سامنے سمندر کے نیلگوں پانی میں کسی البرٹاگن کی طرح لہراتی، بل کھاتی لہریں چل رہی ہوں اور جوتوں سے آزاد پیروں کے

مچھے بیگی ہوتی نرم ریت ہوتا ویسے میں چائے سے انکار کرنا تو سخت بڑبڑتی ہے۔ کہاں ہیں یہ حیدر اور ڈوالنون ہم سے چائے کا نہیں پوچھا جو

ایسے آفت موسم میں ایک کے بجائے دس کپ چائے پنی جائیں۔“

”اوگاڈ! چائے کے لیے کیسی تڑپ اٹھی ہے آپ کے دل میں۔“ پروفیسر نادر نے ہنستے ہوئے فقرہ کساکھا۔

”تڑپ کا لفظ بھی خوب کہا تم نے، حقیقت تو یہی ہے کہ میرا پہلا مشق ”چائے“ ہی ہے۔“ وہ خوش دلی سے بولے۔

”گلے ہاتھوں یہ بھی بتا دیجئے کہ آخری مشق کس سے ہے؟“ سر آفتاب نے شوخ انداز میں کہا۔

”بھئی! آخری مشق بھی چائے ہی ہے۔“

وہ سب ہنس پڑے تھے، اسی اثناء میں وہ سب بھی وہاں آگئے تھے، ساتھ ان کے دو وینر تھے۔ ایک نے ٹرے میں کپ پکڑے

ہوئے تھے، دوسرے نے کنگ سا نر قمر موس پکڑا ہوا تھا۔

”وہاں جا کر ڈوالنون کو یاد آیا کہ آپ لوگوں سے دریافت نہیں کیا ہے۔ سب کے لیے چائے بنا کر یہاں لے آیا کہ ساتھ بیٹیں گے۔“

حیدر نے آتے ہی وضاحت پیش کی تھی۔ سر نادر نے ڈوالنون کو شاباش دی، پھر ان سب نے ہی چائے پی۔ حورین نے انکار

نہیں کیا۔

پوری دو پہ ان کی پانی سے کھیتے یا چمیل قدمی کرتے گزری تھی۔ اس دوران وہ نوجوان کسی آسیب کی طرح اس کے پیچھے لگا رہا تھا

اور اب جبکہ دو پہ اپنے پرسیمٹ رہی تھی۔ گہرے آبر آلود موسم میں گلابی شام اپنے آٹھل میں سرنگی اندھیرے لار رہی تھی۔ ہر نوا ایک خبار آلود

سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایسے میں اسے بے نام سی آداسی جکڑنے لگی۔

”مجھے معلوم تھا میری موجودگی میں آپ انجوائے نہ کر سکیں گی، اسی لیے میں یہاں نہیں آنا چاہتا تھا، لیکن سر آفتاب کب سنتے

ہیں۔“ اس کی پریشانی و بدحواسی سے بے خبر ڈوالنون اس سے مخاطب ہوا تھا جو اس لڑکی کی بیوہ تھی ہوئی بے تکلفی محسوس کر کے ہٹ میں ردا

وغیرہ سے سرورد کا بہانہ کر کے چلی آئی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اسے پہلے سے ہٹ میں موجود دیکھ کر وہ گڑ بڑا کر ڈک گئی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے مقابل کھڑا تھا۔

”ایسی ہی بات ہے، سارے دن میں نے آپ کے چہرے پر ناگواری دیکھی ہے، ہر چیز آپ کے لیے غیر دلچسپ و بورنگ تھی۔“

”وہ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔ حورین سر جھکا کر رہ گئی۔“

”اب میں تمہیں کیا بتاؤں؟ یہاں آتے ہی جو بلا میرے پیچھے لگی ہے۔ اس کے خوف نے میری تمام سرسٹیں ہڑپ کر لی ہیں۔“

”ضروری نہیں ہے جس کو آپ درست سمجھ رہے ہو، وہ درست رہی ہو۔“ وہ کہہ کر رُک کر نہیں تھی، اندر چلی آئی جہاں ماسیاں سامان

سمیٹ رہی تھیں۔ وہ اسے اندر جاتا ہوا دیکھا رہا، پھر باہر نکل آیا جہاں حیدر کھڑا چنڈت کے فاصلے پر موجود لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔

”خیریت تو ہے نا ایسے ادھر کیوں دیکھ رہے ہو؟“

اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نگاہیں دوڑاتا استفسار کرنے لگا۔

”خیریت نہیں لگ رہی ہے۔“

”کیوں؟..... کیا بات ہوئی ہے؟“ حیدر کو سنجیدہ دیکھ کر وہ حیرانگی سے گویا ہوا۔

”اُن چار لڑکوں کو دیکھ رہے ہو تم؟“

”ہاں..... ان کو یہاں آنے کے بعد کئی بار دیکھ چکا ہوں۔“

”یہ ہمارے ساتھ آئی کر لڑکوں کا لو کر رہے ہیں۔“

”وہاٹ! کیا کہہ رہے ہو، اس بات کا احساس ہے تمہیں؟“

یک دم ہی اس کے چہرے پر سرفی جھاگئی، آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔

”میں اب سے نہیں کافی وقت سے نوٹ کر رہا ہوں، پہلے مجھے صرف شک تھا مگر اب یقین ہو گیا، یہ لوگ سب کے نہیں صرف

ایک لڑکی کے پیچھے ہیں اور سب تو پانی میں ہیں، اندر ابھی حورین گئی ہے اور یہ لوگ بھی یہیں آ کر رُک گئے ہیں۔ بار بار دیکھ رہے ہیں۔“

حورین کے نام پر گویا اس کے رگ و پے میں شرارے دوڑنے لگے۔ آنکھوں میں شعلے دہکنے لگے، اسے ادراک ہوا، حورین کے

جس رویے کو وہ خود سے گریز و اجتناب سمجھ رہا تھا، دراصل ٹینشن یہ تھی۔

”اسٹوڈنٹ! مجھے پہلے انعام کیوں نہیں کیا تم نے، ان کی سانس میں بہت پہلے روک چکا ہوتا، وقت ابھی بھی نہیں گزرا میں ان

کو.....“ وہ بھڑے ہوئے طوفان کی طرح آگے بڑھا تھا۔ حیدر سائے کی طرح اس سے لپٹ گیا تھا۔

”ہوش سے کام لو پارا!“

”تم مجھے بے غیرتی کا سبق پڑھا رہے ہو، چھوڑو مجھے۔“ وہ اس کے بازو جھٹکا ہوا شدید غصے سے بولا۔

”بات بے غیرتی کی نہیں، خود کی ہے پارا! اس طرح ان سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے پاس پروف ہے، دیکھتے ہیں

اب انہوں نے کوئی حرکت کی تو میں خود تمہارے ساتھ ہوں۔“

حیدر سے سمجھائی رہا تھا کہ اندر سے آنے والی ماسی کی طرف بڑھتے ان چاروں کو دیکھ کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”ہیلو ادوہ اندر جو لڑکی گئی ہے، اس کا نام کیا ہے؟“

”کون سی لڑکی؟“ ادوہ نے ماسی اس لڑکے سے بولی۔

”وہی لڑکی جس کا چہرہ چاند کی طرح روشن اور پھولوں سے زیادہ حسین ہے۔ اس لڑکی نے ہمارے دوست معید کو پاگل بنا دیا ہے، تم سے جو بھی پوچھیں وہ بتا دو، ہمارا یاد تمہیں مالا مال کر دے گا، یہاں کے بہت بڑے مل اور کابینا ہے معید۔“

اس لڑکے کے انداز میں خوشامد و چالپوی نمایاں تھی۔

”مجھے نہیں معلوم، تم لوگ جاؤ یہاں سے۔“

”تمہیں معلوم ہے، تم اندر سے آ رہی ہو تاؤ ورنہ.....“ معید نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے پینٹ کی جیب سے پستول نکال کر ماسی کے پہلو سے لگاتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ سب سنتے ہوئے ذوالنون اور حیدر اس کی طرف بڑھ گئے تھے۔

”بتا..... ورنہ کوئی مار دوں گا۔“ اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔

”ماسی! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ حیدر وہاں آ کر مخاطب ہوا۔

”اے! تم دونوں جاؤ یہاں سے۔“ تین ساتھیوں میں سے ایک چیخا۔

”کیوں یہ تمہاری اسٹیٹ ہے؟“ ذوالنون کے تہرہ مگرے ہوئے تھے۔

”بیٹا! یہ لوگ حورین بی بی کا پوچھ رہے ہیں۔“

ماسی نے جو پستول سے بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی، روتے ہوئے کہا۔ ان دونوں کو دیکھ معید نے پستول واپس جیب میں رکھ

لیا تھا۔

”آپ اندر جائیں۔“ ذوالنون نے معید کو خون خوار نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ماسی تو ایسی بھاگی گویا پھانسی کے پھندے

سے رہائی ملی ہو۔

”کیا پرابلم ہے، کیا کرے گا، نام جان کر؟“ وہ معید سے بولا۔

”تجھے جرات کیسے ہوئی اس کی طرف دیکھنے کی بھی؟“ حیدر نے کہا اور دوسرے لمحے وہاں ایک جنگ چھڑ گئی تھی۔

”حورین بی بی! حورین بی بی! ماسی ہانچتی ہانچتی اس کے پاس پہنچی اور ساری بات سنا ڈالی وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بہت خطرناک ہیں وہ لوگ، بندوق ہے ان کے پاس۔“

ماسی کے انکشاف نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی، وہ بدحواسی کھلے در پیچے کی طرف بڑھی تھی اور سامنے دل دہلا دینے والا

منظر تھا۔ سیدھی نگاہ ذوالنون پر پڑی تھی وہ بڑے جنونی انداز میں اسی خبیث شخص کی کون اور لاتوں سے بری طرح توابع کر رہا تھا۔ اس

وقت اس کے وجہ چہرے پر ایسی وحشت تھی کہ وہ شاکڈ رہ گئی تھی۔



حیدر بھی انہیں بری طرح پیٹ رہا تھا، حالانکہ وہ چار تھے مگر وہ ان دونوں کے حصے و جثوں کا مقابلہ نہیں کر پارہے تھے، دراصل جو لوگ فلفلا کام کرتے ہیں، خراب کردار کے مالک ہوتے ہیں وہ اندر سے بد دل، کم حوصلہ و کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ان میں اچھائی سے لڑنے کی طاقت نہیں ہوتی ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ چاروں جسمانی لحاظ سے ان سے طاقتور ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو زیادہ بچانہ پارہے تھے۔ اس نے سر آفتاب کو کال کر کے انفارم کیا، کیونکہ وہ لوگ ہٹ سے کافی دور تھے اور یہاں لوگ بھی موجود نہ تھے، وہ کال کرنے کے بعد باہر آ رہی تھی جب اس نے دیکھا وہ چاروں زخمی ہو کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ذوالنون ان کے پیچھے بھاگا تھا اور حیدر اس کے پیچھے بھی اچانک معید نامی وہ نوجوان پلٹا تھا اور اس نے بڑی سرعت سے دایاں ہاتھ آگے کر کے ریوالور سے یکے بعد دیگرے کئی فائر کیے۔ نشانہ ذوالنون اور حیدر ہی تھے مگر گولیاں ذوالنون کی طرف بڑھی تھیں۔ خاموش ماحول قازنگ کی کرپہ آواز سے گونج اٹھا حیدر نے ذوالنون کو گولیاں لگنے کے بعد گرتے دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے تیز چیخ نکلی تھی۔ وہ میزبیاں اتر رہی تھی۔ اس کی نظریں ذوالنون پر تھیں جو ریت پر گر ا ہوا تھا۔ اس کی وہاٹ ٹی شرٹ تیزی سے خون میں سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ حیدر نے کونکا نفا میں ہرنو اندھیرے کی سبب سیاہ چادر تھی جا رہی ہے، اسے اسی اندھیرے کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ دل کی دھڑکن جیسے زکے لگی تھی۔ وہ بری طرح لڑکھرائی تھی اور تو ازن بگڑنے کے بعد لڑھکتی ہوئی نیچے چلی گئی، اسے پھر ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

”تو بہ خدا یا! کیا وقت آ گیا ہے پہلے منشی بھرو پے لے کر جاتے تھے اور تھیلا بھر سامان لاتے تھے، اب تھیلا بھرو پے لے کر جاؤ اور منشی بھر سامان آتا ہے۔ کوئی شے سستی نہیں ہے۔ گوشت تو تھا ہی مہنگا۔ اب دال سبزی بھی مہنگی ہو گئی ہے۔“ بی بی جان جو ماہانہ گھریلو خریداری کرنے نکلی تھیں، مگر آ کر مہنگائی سے از حد خائف دکھائی دے رہی تھیں۔

”بی بی جان! ہم پر اللہ کی بے حد مہربانی ہے جو ہم انورڈ کر سکتے ہیں۔ ڈکھ تو ان غریب و سفید پوش لوگوں کا سوچ کر ہوتا ہے جو نامعلوم کس طرح زندگی کی گاڑی کو کھینٹے پر مجبور ہیں۔“

سیرا بیگم کے لہجے میں افسوس تھا۔

”ایسے لوگوں کے لیے زندگی سزا بن کر رہ گئی ہے، ہر روز اب بھرنے والا سورج پریشانیوں و ٹکرات کی تپش لے کر طلوع ہوتا ہے، تنگ دستی کی مار بڑی زبردست ہوتی ہے، یہ وہی جانتا ہے جو سہتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

نظروں سے تیرا چہرہ بتای نہیں

دل سے تیرا عکس نکھای نہیں

تیری یاد ہے بس میری زندگی

اور یادوں کا سبز کتھای نہیں

”دادو! گھر میں ڈاکٹروں کی فوج ہونے کے باوجود آپ بیمار رہنا کیوں پسند کرتی ہیں؟ کب سے دیکھ رہی ہوں، آپ کی صحت ڈاؤن ہوتی جا رہی ہے۔“ خضرئی نے حال ہی میں ایسی ہیٹھی را حیلہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

”میڈیسن سے ہا کس بھرے ہوئے ہیں۔ رات دن چپک آپ ہوتے ہیں، جسمانی بیماری ہوتی تو کب کی بھاگ گئی ہوتی، جسم بیمار ہو تو علاج ممکن ہے۔ روح کی بیماری دور کرنا تم لوگوں کا کام نہیں ہے۔ میری روح بیمار ہے اور اس کی بیماری کا ایک ہی علاج ہے، معافی۔“ را حیلہ بیگم کی آنکھوں کے گوشوں سے قطرہ قطرہ کرتے آنسوؤں میں عداوت و چھتاؤں کے رنگ تھے جو عرصے سے وہ بہا رہی تھی مگر دل کو سکون و چین ملنے کے بجائے نزلتے وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کو حمزہ کی جدائی نے ناقابل فراموش بنا دیا تھا۔

”میرا حمزہ لوٹ آئے، مجھے کرن مل جائے، میں ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگوں گی اور اس وقت تک مانگوں گی جب تک وہ مجھے معاف نہیں کریں گے۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”دادو! جب بندے صدق دل سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیتے ہیں اور ساتھ ہی پھر کبھی ایسی غلطی نہ کرنے کا عہد بھی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی معاف کر دیتے ہیں، آپ کو معاف مل گئی ہوگی۔“ خضرئی نے بہت نرمی سے کہتے ہوئے ان کے آنسو صاف کیے تھے۔

”جس دن حمزہ مل جائے گا اور کرن مجھے معاف کر دے گی، اس دن سمجھوں گی کہ میری نجات کی کچھ تکلیف پیدا ہو گئی ہے، اگر ان سے ملے بغیر مر گئی تو میری روح بے چین رہے گی۔“

”دادو! ایسی باتیں مت کریں، انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا جیسا آپ چاہتی ہیں۔ آپ خوش رہا کریں۔“ خضرئی نے ان کا گال چومتے ہوئے کہا، پھر ادھر ادھر کی باتوں میں انہیں کسی حد تک بہلا چکی تھی۔

”بی بی حضور! اشفا اشفا حمزہ دار جیکو ہیک۔“ اریہ بڑے میں تین گلاس جیکو ہیک کے رکھ کر لاتے ہوئے بولی۔

”کیا بات ہے بی بی! آج کل بہت کچن میں پائی جاتی ہو، شیف تو بہت خوش ہے، آج کل آدھے سے زیادہ کام نمٹا دیتی ہو اس کے۔“ خضرئی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ آپ تو براہ راست کوئین بھائی کے دل میں جا تھیں ہیں، اس لیے آپ کو کسی محنت و ترس کی ضرورت نہیں ہے، میں اس لیے کوکنگ ایکسپرٹ بن رہی ہوں کہ سنا ہے مرد کے دل کو فتح کرنے سے قبل معدے کو قابو کرنا پڑتا ہے، پھر مہران تو کھانے پینے کے بے حد شوقین ہیں، ان کو قابو میں رکھنا اسی طرح سہل ہوگا۔“

وہ جیکو ہیک سب کرتی ہوئی آرام سے کہہ رہی تھی۔

”اریہ! میری بیٹی، ایک بات بالکل سچ بتائیں۔“ دادو گلاس سائیز پر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔

”جی پوچھیں، میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”تم مہران کے رشتے سے خوش ہو؟“ دادو کی نگاہیں بہت سنجیدگی سے اس کے چہرے کو تک رہی تھیں۔

”بالکل دادو! آپس کی بات ہے، پہلی بار جب میں نے مہران کو دیکھا تھا تو نامعلوم کیوں مجھے احساس ہوا، یہ شخص میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ہے اور ایسا ہی مہران بھی کہتے ہیں۔“ ہنستے مسکراتے چہرے پر بلا کی مسرت تھی، وہ دونوں بھی خوش ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

نامعلوم کتنا وقت گزرا تھا، جب اس کا سویا ہوا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا تھا۔ بیداری کے بعد پہلا احساس اسے شدید تکلیف کا ہوا تھا، سر سے جو تک درد ہی درد محسوس ہو رہا تھا۔ سر میں درد کے باعث از حد بھاری پن تھا۔

اس کی ساتھوں میں سسکیا، ابھری قمیص کسی کی..... کھٹی کھٹی، وجہی وجہی..... دہلی دہلی سسکیاں۔ ایک دم ہی اس کے خوابیدہ ذہن کو جھٹکا لگا تھا اور نگاہوں میں وہ منظر محسوس ہوا، جب اس نے ذوالنون کو گولیاں لگنے کے بعد گرتے دیکھا تھا، اس کی وہاٹ شرت خون سے سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

”آؤ! وہ مر گیا..... وہ مر گیا۔“ وہ آنکھیں بند کیے ہذیبانی کیفیت میں چیخ رہی تھی، تب ہی وہاں موجود کرن نے اس پر ہاتھ رکھا تھا۔

”حورین! حور میری جان! آنکھیں کھولیں بیٹا۔“ ماں کی شیریں آواز پر اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور اپنے ارد گرد سب کے ہنکرتے چہرے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

”مما.....!“ اس کی آواز رندھ گئی۔

”مما کی جان! رو مت، سب ٹھیک ہے۔“ انہوں نے پیشانی چومی۔

”سب اس طرح منہ لٹکا کر کیوں کھڑے ہوئے ہیں، بچی کو ہوش آ گیا ہے، حالت خطرے سے باہر ہے۔“ میرا، حیرا، کرن کو لے کر گھر جاؤ، وہاں جا کر نہاد جو کفر فزیش ہوگی، آرام کرے گی تو سکون ملے گا، پچھلے دو دنوں سے پل بھر کو بھی آرام نہیں کیا ہے اس نے، نہ ڈھنگ سے کچھ کھایا پیا ہے میں ہوں یہاں۔“

ڈاکٹر حورین کے ہوش میں آنے کے بعد چیک آپ کر کے اوکے کی رپورٹ دے کر گیا تھا۔ بی بی جان ڈاکٹر کے جانے کے بعد ان سے مخاطب ہوئیں۔

”بی بی جان! آپ بھی تو ہمارے ساتھ پریشان رہی ہیں، ایسا کریں آپ آرام کریں گھر جا کر میں حور کے پاس رُک جاؤں گی۔“

”حورین کوئی ڈیڑھ دو ماہ کی بچی نہیں ہے جو پریشان کرے گی، پھر لمبے لمبے پرزس آتی جاتی رہتی ہیں، مجھے کوئی بے آرامی نہیں ہوگی، تم جاؤ بلکہ قاریہ کو بھی ساتھ لے جاؤ اور یہ ساری دھما چوکڑی کو بھی اور انس کو ابھی نہیں بتانا۔“

بی بی جان کاٹھوس و مضبوط انداز کرن کو بھی مزید اصرار نہ کرنے پر پابند کر گیا تھا۔ ان کا دل تو نہ مان رہا تھا، حورین کو چھوڑ کر جانے کو مگر ان کا ظہر تابی بی بی جان کے خلوص و محبت پر اعتبار نہ کرنے کے معافی ہوتا جو انہیں گوارا نہ تھا، سو وہ دل پر پتھر رکھ کر وہاں سے جانے کو تیار تھیں۔ حورین کی طبیعت بہتر تھی۔ کرن کے بعد حیرا، میرا اور قاریہ نے اسے پیار کیا تھا، تمنا کرنز اس سے ہاتھ ملا کر چلے گئے تھے۔

بی بی جان نے مول کو روک لیا تھا۔

سب کے جانے کے بعد پرائیویٹ روم میں سناٹے اُتر آئے تھے۔ بی بی جان نے کینٹین سے چائے اور بسکٹ منگوا کر اپنے ہاتھ سے اسے کھلائے تھے۔

”تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی تھی۔ دو دن بعد ہوش میں آئی ہو۔“ بی بی جان نماز عصر ادا کرنے باہر گئیں تو مول اس کے قریب بیٹھتے ہوئے صحبت بھرے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

”مول! وہ..... کیسا ہے؟“

تمہائی پاتے ہی اس کے دل کی صدا لہوں پر آگئی تھی مگر جواب میں مول نے اسے چند لمبے خاموشی سے دیکھا پھر لگا ہی جھکا لیں۔

”مول! بتاؤ! کیسا ہے وہ؟ ٹھیک تو ہے نا؟“

مول کی خاموشی اسے دوسوں میں جھکا کرنے لگی، وہ گھبرا کر گویا ہوئی تھی۔

”وہ..... ٹھیک ہیں..... بالکل تندرست۔“

”تم..... تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو؟ اسے..... اسے ٹالس لگ کر گرتے میں نے خود دیکھا تھا، اس کا خون بہت تیزی سے بہ رہا تھا، وہ ریت پر ہی گر گیا تھا۔“

”ریٹیکس یا راتہاری پیٹھانی پر گہرا زخم آیا ہے جسم پر بھی گہری چوٹیں آئی ہیں، تم اس طرح مودت کرو۔“

وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھتی ہوئی حورین کو ہاتھ کے سہارے سے روک کر بولی۔

”ذوالنون بھائی بالکل ٹھیک ہے، ان کو صرف ایک بلٹ چھوٹی ہوئی گزری تھی۔ ڈاکٹر نے ان کی ڈریسنگ کر کے اسی وقت ڈسچارج کر دیا تھا۔ اصل پریشانی تمہاری طرف سے تھی، تم سیزجیوں سے بہت خطرناک انداز میں گری تھیں، پھر تمہیں ہوش بھی نہیں آ رہا تھا۔“

مول اسے تفصیل بتا رہی تھی کہ کس طرح اسے ہسپتال لایا گیا، مگر واہوں کو اطلاع، اس دوران کیا کیا ہوا۔

مگر وہ کہاں سن رہی تھی۔ اس کے اندر یہ لفظ گونج رہے تھے۔ وہ ٹھیک ہے۔

بس..... وہ یہی تو سنتا چاہتی تھی، اس کی سلامتی کی خبر، اس کی زندگی کی خبر، اس کی موجودگی کی خبر۔ دل دو ماخ پر چھایا ہوا جاکسل

کھر چھٹنے لگا تھا۔ ہر سو بڑی ستوالی ہی روشنی تھی۔ فضا میں مصلحتیں، ماحول کیف آور، جہاں ہر طرف پھول ہی پھول تھے، خوشبوئیں ہی

خوشبوئیں مہک رہی تھی۔ سبز گھاس پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے اور وہ ان شبنمے موتیوں پر ننگے پاؤں کسی کے ہاتھوں

میں ہاتھ ڈالے دھبے دھبے چل رہی تھی، کس کے سنگ تھی وہ؟ کون تھا اس کے ہمراہ؟ اس نے لگا ہی اٹھا کر اسے دیکھا تھا، اسی دم مول کی

آواز حواسوں میں لے آئی۔

”ہریرہ۔“ مول نے کہا۔

”ہریرہ؟ کیا ہوا ہریرہ کو؟“

”کیا ہوا نہیں، کیا ہوگا ہریرہ بھائی کا؟“

”جو کہتا ہے وہ کھل کر کہو۔“ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی بولی۔

”تم سمجھ رہی ہو جو میں کہتا چاہ رہی ہوں۔“

”اچھا..... سنو۔ کچھ دنوں سے میں ذوالنون بھائی کے چہرے پر بڑے خوب صورت سے رنگ دیکھ رہی ہوں، ان کا انداز لب و لہجے میں آئی تہدیلی کسی نے اس انداز میں محسوس نہیں کی، جس طرح میں محسوس کرتی رہی ہوں۔“ مول کے انداز میں ایسی بات تھی جو اسے بزدل کر گئی۔

”ان کی آنکھوں میں نہیں نے تمہارا عکس دیکھا ہے۔“ وہ حورین کو دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں گویا ہوئی۔

”مول!“ وہ حواس باختہ سی بولی۔

”تم..... تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”نہیں..... میں یقین سے کہہ رہی ہوں، ذوالنون بھائی تمہیں پسند کرنے لگے ہیں اور شاید تم بھی ان کو پسند کرنے لگی ہو۔“

”یہ..... یہ تم کس بنا پر کہہ سکتی ہو؟“ اس سے اپنی آواز خود اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

”بے ہوشی کے دوران تم نے انہیں بار بار پکارا تھا۔“

”کسی کو پکارنا محبت نہیں ہوتی۔“

”محبت ہی ہوتی ہے، بے خیالی میں بھی کسی کا خیال مدہوش ہو کر بھی کسی کا ہوش ہونا محبت ہی ہے۔“

مول کا انداز ایسا تھا، گویا کوئی نیچر کسی کند ذہن بچے کو سمجھا رہا ہو اور حورین نے بہت چاہا، بے حد کوشش کی کہ وہ مول کی احمادو یقین سے کہی گئی باتوں کو رد کر دے، جھٹکا دے، کہہ دے کہ وہ جو سمجھتی ہے، وہ سب جھوٹ بکواس ہے مگر اپنے اندر کی بدلتی کیفیت و جذبات کا کیا کرتی جو مول کی تمام باتوں کی تصدیق کر رہے تھے۔

اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ کب دل نے آنکھیں بدلیں اور کب جذبے مندور ہوئے؟ احساسات نے کب ڈنیا ہی بدل ڈالی۔

خبر ہونے تک وہ ہر بازی ہارتی چلی گئی تھی۔

”آنکھیں مت چراؤ، سچائی کو فیس کرو، اگر میں غلط کہہ رہی ہوں تو مجھے بتاؤ، میں غلط ہوں، یہ میرا دم و خوش فہمی ہے، ورنہ

اعتراف کر لو جو میں کہہ رہی ہوں، وہ سچ ہے۔“

”پلیز..... مجھے ڈسٹرب مت کرو، میں بے حد فیس ہوں۔“ وہ رو دینے کو تھی۔

”تمہاری ٹینشن سمجھ رہی ہوں میں، تب ہی کہہ رہی ہوں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لو، میں کسی کو بتانے والی نہیں ہوں۔“

جواباً وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

”درد زیادہ تو نہیں ہو رہا میرے بیٹے؟“

کمرے میں وہ چاروں تھے ذوالنون بیڈ پر نیم دراز تھا۔ قریب ہی اس کے چیئر پر حیدر بیٹھا تھا۔ منال اور فائقہ بیگم بیڈ پر بیٹھی تھیں۔  
”نو ماما! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”کہاں ٹھیک ہیں، چہرہ دیکھا ہے کس طرح زرد ہو رہا ہے، دو دن ہو گئے ہیں میں نے آپ کو سکون سے سوتے نہیں دیکھا ہے۔“  
”آج سکون سے سو جائے گا آئی! آپ فکر مت کریں۔“ حیدر نے اسے دیکھتے ہوئے ذومعنی لہجے میں بولا۔

”اچھا..... کیا آج ڈاکٹرز نے میڈیسن بھیج کی ہیں؟“

”جی..... کچھ ایسا ہی سمجھ لیجئے۔“

”نانو! اسے عادت ہے بک بک کرنے کی۔“ ذوالنون اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے فائقہ بیگم سے مخاطب ہوا۔

”ارے نہیں، حیدر بہت پیارا بچہ ہے۔“ فائقہ حیدر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے بولیں۔

”جیسے نکس نانو! میرے کی قدر جو ہری ہی جانتا ہے برسی توڑی۔“

”اچھا بھئی! آپ لوگوں کی ٹوک جھونک تو چلتی رہے گی، یہ بتائیں کہ اس لڑکی کا کیا حال ہے جو بیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہو

گئی تھی؟“

”ہم پرنس بابا کی طرف سے اسٹے پریشان تھے کہ اس لڑکی کا یا ادی نہ رہا، معلوم کرتا۔“ منال بیگم نے کہا۔

”آج ہوش میں آئی ہیں وہ۔“

”اوہ..... اب کنڈیشن کسی ہے؟“

”بہت بہتر ہے میں نے کچھ دیر قبل کال کی تھی۔“

”اس کے پیرٹس کتنے پریشان ہوں گے۔“

”اس کے چا تو ملک سے باہر گئے ہیں، پرنس وزٹ پر، اس کی ماما بے حد پریشان تھیں، بہت رو رہی تھیں کیونکہ ڈاکٹرز نے خطرہ

ظاہر کر دیا تھا کہ اگر وہ 48 گھنٹے سے قبل ہوش میں نہ آئی تو اس کی زندگی کو خطرہ تھا اور یہ اللہ کا بہت احسان ہے، وہ اب بالکل بخیریت ہے،

ورنہ لوگوں کا کیا ہوتا؟“

آخری الفاظ اس نے بہت آہستگی سے کہتے ہوئے ذوالنون کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر شوق مسکراہٹ تھی، جبکہ

ذوالنون کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اس کے انداز پر وہ ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔

”ماما! ہم بھی چلتے ہیں اس لڑکی کی عیادت کو..... کیا نام ہے لڑکی کا؟“

”چھوڑیں ماما! کیا کریں گی آپ جاکر۔“ وہ دل کی زبردہ برہوتی کیفیت سے گھبرا کر سپاٹ لہجے میں بولا۔

”نہیں نہیں ضرور جائیں آئی! ایک تو اس طرح آپس میں دوستیاں بڑھتی ہیں، دوسرے ثواب بھی حاصل ہوتا ہے اور تیسرے.....“  
 ”شٹ پور ماؤتھ!“ اسے ہنسی سے اترتے دیکھ کر وہ غرایا۔

”ارے کیوں خصے ہو رہے ہو، حیدر درست کہہ رہا ہے۔“

حیدر کی شوخیاں اسے پریشانی میں مبتلا کر رہی تھیں، وہ نہیں چاہتا تھا کہ بے دھیانی میں ایسا کوئی لفظ اس منہ سے نکل جائے جو اس کے جذبات کو عیاں کر دے جن کو وہ خود سے بھی پوشیدہ رکھتا آیا ہے جن کی تشہیر اس کے دل کو گوارا نہیں۔

”آپ اس کو چھوڑیں، یہ آدم بے زار ہے، دوسروں کو بھی اپنی طرح بنانا چاہتا ہے، حورین سے اور اس کی می سے ملیں گی تو آپ کو بے حد خوشی ہوگی..... بلکہ اس کی پوری فیملی بہت ناکس ہے۔“

”حورین؟ نام تو کچھ سنا لگ رہا ہے۔“

منال چونک کر گویا ہوئی تھی پھر سوچتے ہوئے بولیں۔

”پرنس! کہیں وہ لڑکی تو نہیں جو ایک بار اپنی کزن کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں ملی تھی؟“ وہ ذوالنون سے مخاطب ہوئیں۔

”جی ماما، وہ ہی ہے۔“ وہ آنکھیں بند کر کے دھیسے لہجے میں گویا ہوا۔

”ارے یعنی آپ مل چکی ہیں حورین سے؟“ حیدر کی ایکسٹینٹ ذوالنون کو ڈرانا نہ بھائی۔

”جی..... اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی وہ۔“

”پھر بھی آپ کو یاد ہیں وہ۔“

”ہاں..... میں بہت کم ہی کسی سے متاثر ہوتی ہوں، مگر اس لڑکی کی پر سنائی میں گفتگو کے انداز میں ایسی تاثیر تھی کہ میں آج تک

اسے بھول نہ پائی ہوں، پرنس سے کئی بار کہا میں نے اسے گمراہے عمر ہر بار یہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا کرتے تھے۔“

”اب کہیے یہ ہمیشہ کے لیے اسے گمراہے آئے گا۔“ حیدر نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”آپ دونوں میں یہ کھسر پھسر کیا چل رہی ہے..... کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔“ منال مسکرائی تھی۔

”میں کہہ رہا تھا آئی اتنی دیر سے میں آپ کو کوئی بات بتانا چاہ رہا ہوں مگر کوئی نہ کوئی بات نکل رہی ہے اور میں بھول رہا ہوں۔“

حیدر نے بہت چالاکی سے انہیں موضوع سے ہٹایا۔

”اسکی کیا بات ہے بیٹا؟“ وہ تجسس ہوئیں۔

”حورین کی ماما اور آپ کا فیس ایک جیسا ہے۔“

”یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، دنیا میں ایسے لوگ اکثر ہوتے ہیں جو کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے

سے بہت ملتے ہیں، میں نے بھی ایسے لوگوں کو دیکھا ہے۔“

”لیکن اتنی مہممت تو کسی قریبی رشتے میں ہی پائی جاتی ہے آئی! وہ آپ کی لڑیلی کیٹ ہیں، معمولی سے فرق کے ساتھ۔“

”اچھا..... یاد آیا حورین کے ساتھ لڑکی تھی وہ بھی یہی کہہ رہی تھی اور آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں، اب تو مجھے دلچسپی ہوگئی ہے۔“

میں بھی ملوں گی، کیا نام ہیں ان کا؟“ وہ مسکراتی ہوئی پُراشتیاق انداز میں گویا ہوئیں اور اگلا لمحہ ان کے لیے دھماکہ خیز ثابت ہوا تھا، جب حیدر نے کہا تھا۔

”حورین کی ماما کا نام کرن ہے، کرن آئی۔“

”اوہ..... کیا کہا؟ کر..... ان؟“ وہ مسرا سمہ تھیں۔

”جی.....“ حیدران ماں بیٹی کی بدلتی کیفیت دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

”اس کے قادر کا نام؟“ فائزہ بیگم نے دریافت کیا۔

”اُس.....“ حیدر کی آوازان کی سماعتوں میں دھماکوں کی مانند گونج رہی تھی۔

”اُس.....!“

اُس! کی صدائیں درود دیور سے گونج رہی تھیں۔ ان کے رنگ بدلنے چہروں پر ذوالنون کی حجب نگاہیں مرکوز تھیں۔ اس کے اندر بھی بے چینی و استغراب کروٹیں لینے لگا تھا۔ حورین کے والدین کا نام سن کر ماں اور نانو کے چہرے و آنکھوں سے ہویدا ہوتے ہوئے تاثرات اسے احساس دلار ہے تھے کہ وہ ان ناموں سے آشنا ہیں مگر ساتھ ہی ان کے انداز میں موجود نفرت و سرد مہری اسے لمبے میں باور کرا گئی کہ یہ شناسائی کسی ”قریب“ کا نہیں ”شدید صداوت“ کا باعث ہے، اس کی حالت اتر ہونے لگی۔

حیدر ملازمہ کے لائے ہوئے لوازمات سے انصاف کرنے میں مگن ہو گیا تھا۔ اس خوف ناک امر سے بے خبر کہ انجانے میں وہ بیٹروں میں آگ چھڑک چکا ہے جو نہایت ہی جاہ کن ثابت ہوگی۔

منال و فائزہ اتنی آسانی سے اپنے فنکارل جانے پر حیرت و بے چینی کی کیفیت میں مبتلا تھیں، ساتھ ہی آنکھوں سے ان کی نفرت و انتقام کے شرارے نکل رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”کیسی ہے میری بیٹی؟ پچا کے جاتے ہی چوٹ لگالی؟“ اُس صاحب اس کی پیشانی چومتے ہوئے گویا ہوئے۔ وہ پچھلے ہفتے بزنس ٹور پر بچاک گئے تھے۔ کرن نے انہیں حورین کے حادثے کا نہیں بتایا تھا۔ اول تو وہ خود ہی جانتی تھیں کہ اگر انہیں حورین کے متعلق ذرا بھی بھگ مل گئی تو وہ سب چھوڑ کر پاکستان واپس آجائیں گے۔ خواہ کتنا بھی نقصان ہو، دوئم بی بی جی کی اُس صاحب کی آنے والی ہر کال پر یہی تاکید ہوتی تھی کہ کچھ نہ بتایا جائے کہ وہ پردیس میں تنہا پریشان ہوں گے مگر اُس تو وہ باپ تھے جو بچوں کی آواز سے ہی ان کی حالت کا پتہ چلا لیتے ہیں اور وہ بھی بتاتا ہے اس کی کیفیت سے بات کے دوران آگاہ ہو گئے تھے۔



پھر پہلی فلائٹ سے ہی وہ پاکستان آگئے تھے اور آتے ہی حورین کو کسی کم عمر بچی کی طرح ٹریٹ کیا تھا۔  
 ”میرا پاؤں سلب ہو گیا تھا بچا!“ وہ ان کے سینے سے سر نکالتے ہوئے بولی۔

”یہ ملازمین میں بانٹ دیں۔“ انہوں نے کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی گندی نکال کر قریب کمزری کرن کی طرف بڑھائی۔  
 ”صدقہ خیرات میں بھی بہت کر چکی ہوں، بی بی جان نے بھی غریبوں میں رقم بانٹی ہے، صدقے کے بکرے دیئے ہیں۔“  
 کرن ملازمہ کو رقم تھا کر آئی تھی کہ وہ دوسروں کو بھی تقسیم کر دے، اب وہ ان کے قریب بیٹھی گھنگو کر رہی تھیں۔ حورین انس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ حادثہ ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ دن گزر چکے تھے، وہ ٹھیک ہو چکی تھی۔ پیشانی کا زخم بھر گیا تھا، صرف کمزوری باقی تھی، مگر اس کے بدلتے احساسات نے جس کشمکش میں اسے مبتلا کیا تھا، دراصل اسی نے اسے ادھ موا کر ڈالا تھا اور وہ سندرست ہو جانے کے باوجود برسوں کی پیارو لاغر دکھائی دے رہی تھی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا نا..... یہاں مت آئیں، نہ سمجھیں اسے جب سے یہ یہاں آئی ہے، کسی نہ کسی پریشانی و تکلیف میں مبتلا ہو رہی ہے اس شہر نے جب اس کی ماں کو پناہ دی تو بیٹی کو کیسے عافیت دے سکتا ہے۔ آپ ہیں کہ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔“  
 کرن اس وہم کو اپنے دل سے نکال نہ پائی تھیں۔

”ڈیڑر! میں ایسی کسی لاجک کو نہیں مانتا، زندگی کی اس کشمکش و دوڑ میں کامیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جو بار بار گر کر اٹھتے ہیں، اگر اس طرح سب تو ہمت کا شکار ہو جائیں تو زندگی مفلوج ہو جائے۔“

”آپ نے کبھی میری بات کو اس معاملے میں اہمیت نہیں دی ہے۔“

”نہ آئندہ کبھی دوں گا۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔

”جی! میں آپ کے لیے کافی بخوا کر لاتی ہوں۔“ حورین بیڈ سے اترتے ہوئے بولی۔

”آپ ریٹ کریں بیٹا! ابھی سو ڈنہیں ہے۔“ وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے تھے، کرن بھی ساتھ تھیں، وہ اٹھ کر روم سے باہر نکل

آئی۔ باہر ٹیئرس پر ہریرہ اس سے گرا گیا۔

”دشمنوں کے مزاج کیسے ہیں؟“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”مجھے تو اچھے نظر آرہے ہی۔“ وہ اسے دیکھ کر بولی۔

”میں دشمن نہیں ہوں، چاہنے والوں میں سے ہوں۔“ وہ سینے پر ہاتھ باندھے اس کے قریب کھڑے ہو کر بولا۔

”میں نے بی بی جی کو راضی کر لیا ہے۔“

”کیوں؟ کس بات کے لیے؟“

”میں نے ان سے کہا، میں ایک لڑکی کا ساتھ چاہتا ہوں، اسے شریک سفر بنانے کے لیے آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔“

”اچھا..... پھر وہ کیا بولیں؟“

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے گویا ہوئی۔

”وہ کہنے لگیں کہ پہلے اپنے قدموں پر کھڑے ہو، پھر کسی دوسرے بوجھ کو اٹھانے کی بات کرنا، میں نے کہا بی بی جان، آپ پاؤں پر کھڑا ہونے کی بات کر رہی ہیں، میں آپ کو بھاگ کر دکھا سکتا ہوں، بلکہ رنگ میں تو میں اکثر فرسٹ پرائز لیتا رہا ہوں اور رہی بات بوجھ کی تو پھولوں کا بھی کوئی بوجھ ہوا کرتا ہے۔“

”وہ جہتے ہوئے کہہ رہا تھا اور نامعلوم کیوں حورین کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ لمبے بھر میں وہ پسینے میں شرار پور ہو گئی۔“

”حورین! کیا ہوا؟ یہ تمہیں اسے پسینے کیوں آ رہے ہیں؟“

ہریرہ کے مسکراتے چہرے پر یک دم پریشانی پھیل گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھامتے ہوئے چیخ پر بٹھایا تھا۔

”آئی ایم رائٹ، تم پریشان مت ہو۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر آہستگی سے کہنے لگی۔ ہریرہ خاموشی سے سامنے چیخ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ توقف کے بعد اس نے کہا۔

”دیکھ رہا ہوں، تم کچھ دنوں سے بہت اجنبی اجنبی سی لگ رہی ہو، ایسا لگ رہا ہے کہ ہمارے درمیان بہت سارا فاصلہ سمٹ آیا ہے۔ تم مجھے خود سے بہت دور محسوس ہو رہی ہو۔“ ہریرہ نے حقیقت بیان کی تھی۔

حورین اسے کیا بتاتی کہ وہ تو خود کو فضاؤں میں مطلق محسوس کر رہی ہے۔ دل نے چلن ہی ایسا بدل لاکہ وہ خود کی نہ رہی، کسی اور کی کیا ہوتی، اسی جذباتی کشش نے اسے ہر اسماں کیا ہوا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے، نہ معلوم تمہیں کیوں لگ رہا ہے۔“

”کاش! ایسا ہی ہو، میں تمہیں کھو کر مٹی نہ پاؤں گا یا راکوئی کچھ بھی کہے مگر تم بھی بے وفائی مت کرنا۔“

”تم مجھے آخری سانس تک باوقار پاؤں گے ہریرہ۔“

ہریرہ جہتے مسکراتے ہریرہ کا یہ روپ اسے مضطرب کر گیا تھا۔

”کس کی آخری سانس تک؟ تمہارے یا میرے؟“

وہ اپنے موڈ میں آتے ہوئے ہنس کر بولا تو حورین نے بھی مسکراتے ہوئے اس کے مکامارا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مئی! ڈیڑی تو یہاں آنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ کتنے ماہ ہو گئے ہیں انہیں گئے ہوئے، جب بھی کال کرو، کسی دوسرے

کنٹری میں پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔“ منال راکنگ چیخ پر جھولتے ہوئے ان سے مخاطب تھیں جو تھڑے سے کیوکس صاف کر رہی تھیں۔

”پھنسنے ہوئے ہوں گے، کسی سنہری بالوں والی چیز میں کی زلفوں میں۔“

”اوگاڈ..... ماما! آپ بھی اس ایجنٹ میں ڈیڑی پر شک کرتی ہیں۔“

”یہ عمری زیادہ خراب ہوتی ہے جس طرح بھٹتا ہوا چراغ زیادہ پھڑ پھڑاتا ہے، اسی طرح جاتی جوانی بھی.....“

فاائقہ بیگم کی زبان ہمیشہ سے بے ہاک تھی۔ منال قبیلہ لگا کر ہنس پڑیں۔

”مئی! آپ بھی جوڑ میں آتا ہے، بول دیتی ہیں۔“

”لیکن سچ بولتی ہوں۔“ دو بیٹی کے ہشاش بشاش چہرے کی جانب محبت سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

”پھر کب پلاننگ اسٹارٹ کر رہی ہیں۔ دو ہفتے ہو چکے ہیں، تمام معلومات حاصل کیے ہوئے۔ مجھ سے مزید صبر نہ ہو سکے گا۔“

”آپ کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا، بہت جلد میں اپنی سوچی ہوئی پلاننگ شروع کرنے والی ہوں، اب تو پرنس پوری طرح سے

میری مٹھی میں ہے کیونکہ میں نے اس کی دادو، چچا وغیرہ کی فیملی کو ڈنر پر انوائٹ کر کے اور ان سے اچھا برتاؤ کر کے جو کچھ کسروہ کی تھی، وہ

بھی پوری کر دی ہے اور تو اور اس کی دادو سے اپنے رویے کی معافی مانگ کر اس کے دل سے ہر گروہ کھول دی ہے۔ کل کے ڈنر کے بعد سے

وہ بے حد خوش ہے، اب میرے لیے تمام راستے کھلے ہیں۔“

منال اپنی پلاننگ کے مطابق کام کا آغاز کر چکی تھیں۔ ایک ہفتہ ان کا شادی مرگ جیسی کیفیت میں گزارا تھا۔

انہیں یقین ہی نہ تھا کہ وہ اس طرح گھر بیٹھے اپنے دشمنوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں گی۔

ڈوائون کا زخم ان کے لیے مرہم ثابت ہوا تھا، برسوں سے جھلنے من کو اب ملتانیت نصیب ہونے والی تھی۔

”مئی! آپ سے زیادہ مجھے ان لوگوں کا انتظار ہے، جب اپنے دشمنوں کو میں اپنی نظروں کے سامنے ذلیل و خوار دیکھوں گی۔“

”میں کہتی ہوں وقت ضائع کیے بغیر کام شروع کر دیں، مجھے وقت پر بھروسہ نہیں رہا ہے، یہ کبھی بھی کبھی پھجلی کی طرح ہاتھوں سے

پھسل سکتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

بلیوکلر کے شلوار سوٹ میں اس کی شفاف رنگت دکھ رہی تھی۔ شرٹ پروہائٹ لیس سے ڈیزائننگ کی گئی تھی جس میں موتی لٹک

رہے تھے، ساتھ وہ ہائٹ دوپٹہ تھا جس پر بلیو موتیوں کی لیس لگی ہوئی تھی، کانوں میں میپنگ کی جیولری تھی، ہائیں ہاتھ میں رسٹ واچ اور

دائیں ہاتھ میں بریلست تھی، چہرہ سادہ تھا، گولڈن براؤن بال آبشار کی طرح پشت پر پھیلے تھے۔ وہ پرس ہاتھ میں پکڑے حیدر کے ہمراہ ہال

میں داخل ہوئی تھی۔ معطر ہال میں تمام ٹیبلو بک تھیں۔ کارنر کی ٹیبل پر بڑی دروڑ کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی، وہ اس کی جانب بڑھ گئے تھے۔

”حیدر! یہاں تو صرف دو چیز ز ہیں، تم نے کہا تھا، سرنے سب کو انوائٹ کیا ہے، یہاں نہ چیز ز ہیں، نہ باقی لوگ؟“ وہ حیرانگی

سے حیدر سے مخاطب ہوئی تھی۔

”آپ کیا نہیں گی..... کیا منگواؤں؟“ حیدر نے اس طرح پوچھا جیسے ایک لفظ نہ سنا ہو۔

”آپ خاموش کیوں ہیں؟ کیا لیس گی؟ کولڈ ڈرنک؟ لیسن جوس؟ اور نچ جوس؟ یا کافی؟“

”کچھ بھی نہیں“۔ حیدر کے انداز پر اس کی حس بیدار ہونے لگی تھی، آج اس کا فون آیا تھا کہ سر آفتاب انہیں پارٹی دے رہے ہیں جس میں بہت کم افراد مدعو ہیں۔ ان پانچوں کے گروپ میں صرف حورین کو انوائٹ کیا ہے۔ اتفاق ہی تھا کہ مول، زویا اپنی خالہ کے ہاں چند دنوں کے لیے رکنے گئی ہوئی تھیں، ورنہ وہ تنہا کبھی نہ آتی، حیدر نے بھی ماما سے اجازت لی تھی اور اپنے ہمراہ لایا تھا۔

”کچھ بھی نہیں..... یہ کس ڈرنک کا نام ہے؟“

”اور لوگ کہاں ہیں؟“ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی بیک سائٹرز سے ڈالٹون آتا ہوا دکھائی دیا تھا اور چند لمحوں میں وہ قریب پہنچ گیا تھا۔

”لہجے آگئے باقی لوگ!“ ڈالٹون کو دیکھ کر وہ اطمینان سے بولا، جبکہ وہ اس لمحے بالکل ہی شاکڈ رہ گئی تھی۔

”السلام علیکم!“ وہ آکر اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”تھینکس یارا تم نے بڑی پرائیلم سولو کر دی ہے“۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے حیدر سے مہنیت سے گویا ہوا۔

”یہ میری دوستی کا تقاضہ تھا جو میں نے پورا کیا مگر یاد رکھنا تمہاری خاطر میں نے حورین سے چیکنگ کی ہے ضرور مگر..... تم سے قبل یہ میری بہن ہیں تم ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے ان کی دل آزاری ہو، ورنہ میں خود کو معاف نہ کر سکوں گا“۔

حیدر اس سے کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ حورین نے بھی اٹھنا چاہا تھا، اسی لمحے اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ کر کہا۔

”پلیز میں زیادہ وقت نہیں لوں گا آپ کا..... آتم سووری“۔

”سووری! سووری! سووری! سووری!“

اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالتی وہ غصے سے بولی۔

”آپ سے سر کے نام پر جھوٹ کہلوا لیا..... یہ غلط حرکت ہے نا“۔

”جب آپ غلط کو غلط سمجھتے ہیں تو پھر اس حرکت کا مطلب؟“

جواب میں وہ خاموش رہا تھا۔ حورین نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ بلیک جینز و گرے ٹی شرٹ میں اس کے وجیہ چہرے پر بڑی گھمبیری اُداسی تھی، ایک بے کل کردینے والی سنجیدگی۔

اُداسی کے بجائے گہرے رنگ اسے آج کل اپنی ذات کا حصار کیے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اس کی نگاہیں جھکتی چلی گئیں، دل بے ہنگم دھڑک رہا تھا۔ احساسات کی عجیب سی پورش تھی جو اس پر ہوئی تھی۔

”میں آپ کو دیکھنا چاہتا تھا، حیدر کہہ رہا تھا بہت زخمی ہو گئی تھیں آپ، ہسپتال تو میں نہیں آسکا تھا، ماما نے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی

تھی، کئی بار سوچا آپ کو کال کروں، خیریت معلوم کروں، مگر پھر مجھے مناسب فیمل نہیں ہوا۔“

بہت دھیمے لہجے میں وہ بات کر رہا تھا، گویا جیسے اس کے سامنے کوئی بہت معزز ہستی بیٹھی ہو، جس کو نگاہ اٹھا کر دیکھنا جرم ہو۔ اس کی نگاہوں کا احترام، اس کے لہجے کی نرمی و مہاشاس، اس کے انداز کی گفتگلی۔ محبت چنانوں کو بھی موم کر دیتی ہے۔

”مناسب تو مجھے اس طرح بلانا بھی نہیں ہے، لڑکیاں ماں باپ کا فخر دان ہوتی ہیں، ہم لڑکیاں جب گھر سے قدم باہر نکالتی ہیں تو ہمارے ساتھ ہر قدم پر ان کی احتیاد کی زمین ہوتی ہے، جہاں معمولی سی بھی لغزش قدم تو ڈگمگائے گی ہی، ساتھ ہی ان کے یقین و احتیاد کو بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار بنا دے گی۔“

”رہنمائی سوری، مجھے معلوم نہ تھا آپ اتنا برٹ ہوں گی، دراصل حیدر نے مجھے کہا کہ میں اس طرح.....“

ذوالنون نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر حیدر کی بات مان توئی تھی مگر اب حورین کی فحش اور اس کا خمیر بھی اسے ملامت کر رہے تھے کہ یہ حرکت اس کی بالکل غیر مناسب ہے۔

”آپ کی چوٹ کیسی ہے؟ بہت بلینڈنگ ہوئی تھی۔“

اسے مسلسل سخت و پشیمانی میں جتا دیکھ کر اس نے اپنا رویہ کچھ نرم کیا تھا۔ اس کا رویہ ذوالنون کو کچھ ریلیکس کر گیا تھا۔

”میں ایک بیٹے میں ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ فکر تو مجھے آپ کی تھی، آپ بہت بلندی سے گری تھیں۔“

”یہ معلوم کس طرح میرا پاؤں سلپ ہو گیا تھا۔“

”وہ میری لائف کا بہت بُرا دن ہے جسے میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا۔“ اس کے چہرے پر غصے کی سرخی چھانے لگی تھی۔

”آپ زخمی ہوئے تھے اس لیے؟“

”نہیں..... وہ مردار میرے ہاتھوں سے زندہ چلے گئے اس لیے۔“ اس کے لہجے میں وحشت اُتر آئی تھی۔

”ایسے لوگ تو ہماری سوسائٹی میں بھرے پڑے ہیں، آپ کس کس کو ماریں گے؟ آپ کی سوچ غلط ہے۔“

”آپ کچھ بھی کہیں، میں اپنے موقف پر قائم رہوں گا، اپنی دے، کیا لیس گی آپ؟“ وہ ویٹر کو اشارہ کرتا ہوا اس سے بولا۔

”میں جا رہی ہوں۔“

”حیدر کو میں نے آدھے گھنٹے کا وقت دیا ہے، وہ آپ کو پک کرے گا، کافی منگوا لیتا ہوں۔“ اس کی دلکش ہماری آواز میں اصرار کا

عجیب رنگ تھا، وہ مزید اٹکار نہ کر سکی۔

کافی آنے تک ان کے درمیان خاموشی رہی تھی۔ ایسی خاموشی جہاں زبانیں خاموش رہتی ہیں، دھڑکنیں گنگو کرتی ہیں۔ نگاہیں

بڑتی ہیں۔ احساسات گنگتاتے ہیں۔ کافی بھی اسی خاموشی میں ہی پٹی گئی تھی۔

دونوں کے پاس نظروں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔

”میں اپنی ماما کو آپ کی ماما کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔“

توقف کے بعد وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا گیا ہوا۔

پہلے سے ہی بے ترتیب دھڑکنیں مزید بے قابو ہونے لگی تھیں۔ اس کی بڑھتی نظروں کی حدت وہ اپنے چہرے پر ہی محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ بے حد گہری نگاہوں سے شخصہ سے موسم میں بھی وہ چہرے پر پینہ محسوس کرنے لگی تھی۔

”آپ سمجھ رہی ہیں نا میں ماما کو کیوں بھیجنا چاہتا ہوں۔“

وہ اس کی گھبراہٹ سے پورا لطف اٹھا رہا تھا۔

”اب یہ مت کہہ دیجئے گا کہ آئی ڈونٹ نو۔“

”پلیز..... حیدر کو کال کریں، میں جانا چاہتی ہوں۔“

لمحے کے ہزاروں حصے میں وہ خود کی دنیا میں لوثی تھی۔

”یہ بات کا جواب نہیں ہے۔“ وہ بولا

”میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔“

قل اس کے کڑواہٹوں کوئی جواب دیتا، منال بیگم اور فاطمہ بیگم ہال میں داخل ہوئیں، پھر مسکراتی ہوئی اس طرف آئی تھیں۔

”ماما، انو! وہ انہیں دیکھ کر یوں کھلا کر کھڑا ہوا تھا، جبکہ ان دونوں کی نگاہیں پزل ہوتی حورین پر جمی تھیں۔“



دھک، دھک، دھک..... دھک.....

اس کے دل کی دھڑکنیں معمول سے بڑھ گئی تھیں۔ لمحے بھر کو اس کو پورا ہال گھومتا محسوس ہوا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

اس نے چوری نہیں کی تھی مگر خود کو کسی چور کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس کی بے ساختہ نگاہیں منال کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں۔

”افی.....“

وہ نگاہیں تھیں یاد و شعلوں سے دہکتے ہوئے الاؤ..... یا کسی زہریلی ناگن کے زہر میں ڈوبے ہوئے دو بچن..... عجیب و وحشت و

دہشت اس کی رگ و پے میں مراعت کرتی چلی گئی اور اس لمحے اس کے دل نے انہونی خواہش کی کہ..... کاش! کچھ ایسا ہو جائے کہ وہ ان کی

نگاہوں سے اوجھل ہو جائے..... یہ ایک خواب ہو..... ایک ناخوشگوار خواب، جو بیداری کے بعد اسے شانت کر دے لیکن جس طرح خواب

حقیقت کا روپ اختیار نہیں کر سکتے، اسی طرح حقیقت بھی خواب کی کینچی نہیں بدل سکتی، پھر سوچیں کب کمل ہوتی ہیں۔

”نالو، ماما پلیز! آپ لوگ بیٹھیں ناں۔“ پل بھر میں اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا کر کہا۔

”نو ٹھیکس۔ سیکنڈ فلور پر ہال میں ہماری پارٹی ہے، ٹریک جام ہونے کی وجہ سے ہم پہلے ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔“ منال نے کہہ

کر سکتا ہے ہوئے بری طرح پزل ہوتی حورین کی طرف ہاتھ بڑھایا، مصافحہ کے لیے۔ ان دونوں کو کھڑے دیکھ کر احتراماً آدھ دونوں بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ منال نے نہ صرف اس سے مصافحہ کیا بلکہ آگے بڑھ کر سینے سے لگا کر اس کی پیشانی بھی چومی تھی۔

”آئی ایم سوری، میں آپ کے پاس ہسپتال نہ آسکی، کچھ ٹکلی ان دنوں پرنس بھی کافی اشجڑ تھے۔ اس کے باعث نہ دل کہیں آنے جانے کو چاہ رہا تھا، نہ میں نے پرنس کو گھر سے نکلنے دیا، پھر ایسی سچویشن میں ریلٹیو زکا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ایسے میں اچھا ٹیکل نہیں ہوتا، مگر سے نکلتا۔“ وہ بہت اپنائیت سے اس کا سرد پڑنا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دہائے گفتگو کر رہی تھیں۔ اس وقت ذوالنون کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔

وہ از حد دلکش انداز سے اس کی جانب کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا جو مہما کی محبت سے خاصی نروس ہو رہی تھی اور اس سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑی فائقہ بیگم کی جہان دیدہ نگاہیں بڑے ذریعہ انداز میں اس کا جائزہ لے رہی تھیں اور ان کے اندر انتقام و نفرت کے الاؤ کے مزید شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ذوالنون کے بدلتے مزاج و انداز نرمی و لطافت کا سبب یہ ”لڑکی ہوگی؟“ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں یہ لڑکی جو ان کے دشمنوں کی بیٹی تھی۔

بھلا کس طرح اسے وہ مقام..... وہ عزت دے سکتی تھیں جو پرنس کی لائف پارٹنر کے لیے ان کے دل میں تھا۔

منال کے بعد وہ خود بڑے تپاک و ظلوں سے حورین سے ملی تھیں۔ منافقت و سفاکیت ان کے اندر اس حد تک پھیل چکی تھی کہ وہ سادہ مزاج ایک حد تک اکھڑ و صاف گو ذوالنون بھی ان کی اندرونی تباہ کن خواہشات کی پرچھائیاں بھی محسوس نہ کر سکتا تھا کہ وہ تو اس وقت دل کی آؤ لین سرت آمیز دھڑکنوں کی صدا سنیں سن رہا تھا۔ محبت کی بھرپور روشنیاں اس کی گرے آنکھوں میں جگمگا رہی تھیں۔

حورین منال اور فائقہ کے اس والہانہ محبت بھرے انداز و ظلوں سے بے حد متاثر ہوئی۔ چند لمبے قلم آنے والے خیالات کو اس نے رد کر دیا تھا۔

”ارے آپ لوگ بیٹھیں، ہم لیٹ ہونے کی وجہ سے جا رہے ہیں۔ اب تو ویسے بھی ملاقات ہوتی رہے گی۔“ منال نے شوخ نظروں سے بیٹے کے وجہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر طوار ہے ہیں جلد..... حورین کے پیرش سے؟“ فائقہ بیگم کے انداز میں بھی ذومعنی شرارت سی تھی۔

”آپ لوگوں کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ اس کا انداز بھی شوخ تھا۔

”ہماری ساری دعائیں آپ کے لیے ہی ہیں..... بلکہ اس لڑکی کو دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔“ آخری القاط وہ دل میں کہہ اٹھی تھیں۔ چند منٹ مزید وہ پیار و محبت کے پھول نچھاور کر کے وہاں سے آگے بڑھ گئی تھیں۔ ان کے جاتے ہی حورین نے بھی قدم آگے بڑھائے تھے۔

”جاری ہیں؟“ وہ دھیمے انداز میں گویا ہوا۔

”جی۔ اس نے اسی طرح زرخ پھیرے پھیرے ہی جواب دیا تھا۔

”جو میرا سوال تھا وہ ماما اور نانا کو کا بھی، کیا جواب ہے آپ کا.....؟“ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ ان کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ واپسی کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے ذوالنون نے کہا مگر وہ جوابا خاموش رہی تھی۔ پارکنگ لاٹ تک جاتے جاتے اس کی خاموشی برقرار ہی تھی۔ کار میں بیٹھنے سے قبل وہ ہنسی لگا ہوں سے بولی۔

”آپ کے اس سوال کا جواب نہ ہے اور نہ کبھی میرے پاس ہوگا۔“

☆.....☆.....☆

اس قدر لفظ کے یاد ہیں

ذمہ گی، ذمہ سہارا اور تم

تم، وقت، خواب، پریشانی، فراق

یاں، مجھوری، تمنا اور تم

بھوک، ٹٹ، پاتھ، سڑک، کپے رستے

اس قدر لفظ کے یاد ہیں

بس جنہیں یاد رکھا ہے دل نے

غیر واضح ہے سفر

پھر بھی ضروری ہے رکھے جائیں قدم صاف شگاف

کوئی تو راہ سلامت ہوگی

جو تیری یاد سے ہوتی ہوئی آبادی تنگ جائے گی

ایسی آبادی تنگ جس میں کسی لفظ کا مفہوم

کسی خوف، کسی دھوکے

کسی جہر سے وابستہ نہیں ہوگا کہیں

ایسی آبادی تنگ

حافظہ جس میں کسی لفظ سے کتنا نہیں چاہے گا

منال بیگم اور فاطمہ بیگم محض وقت گزاری کے لیے پارٹی میں شریک ہونے آئی تھیں اور یہ اتفاق تھا یا ان کی خوش قسمتی کہ وہ ان سے ٹکرائی تھیں۔ پہلی نظر میں تو انہیں اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہوا تھا، جب انہوں نے ذوالنون کو کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا پھر



قرب تک پہنچے پرتو انہیں ایسا سر پرانز ملا تھا جو ان کی زندگی کی تمام تلخیاں دھرو میاں بھلانے میں معاون تھا۔

پارٹی میں دونوں ماں بیٹی بے دلی سے شریک رہیں۔ چھوڑ کر اس لیے نہ آئیں کہ پارٹی کے اوزر ملک کی مایہ ناز شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں ویسے بھی خبا تھا ایسے لوگوں سے تعلقات استوار رکھنے کا، سو پارٹی سے واپسی پر راستہ ڈرائیور کی موجودگی کے خیال سے خاموشی سے طے کیا۔ گھر آ کر بھی کپڑے بدلنے، جیولری دیکھ آپ وغیرہ سے نجات پانے میں بہت کم وقت صرف کیا۔

”اوہ۔ ماما اسی ازویری کو نیک۔ اتنی جلدی آپ نے پہنچ کر لیا..... زندگی میں فرسٹ ٹائم آپ کو اتنا قاسٹ دیکھا ہے۔“ مثال بالوں میں برش کرتی ہوئی فائفہ بیگم کو چھیڑتے ہوئے گویا ہوئی جو ڈھیلے ڈھالے نائٹ ڈریس میں کافی غلط بھرے انداز میں اندر داخل ہوئی تھیں۔

”ڈیرا کنڈیشن جو اندر ہے وہ بتائی نہیں جاسکتی“۔ وہ گیٹ لاک کر کے صوفے پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھی تھیں اور کئی کشتی پست کی جانب لگانے کے بعد ایک گود میں رکھ کر آرام وہ حالت میں چلنے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

”کیسی بھور پارٹی گزری ہے آج.....؟ لگ رہا تھا، وقت ٹک گیا ہے یا زندگی گزر جائے گی اور یہ پارٹی ختم نہیں ہوگی۔“

”سبز رنگوں والا کا وہ جیولری سیٹ بھی اچھی طرح نہ دیکھا جو وہ کہہ رہی تھی کہ بلیک ڈائننگ کی بہت ڈیماٹر ہے۔“

”دفع کریں وہ بھی کوئی عورت ہے اس قدر فالتو بولتی ہے کہ کوئی پکڑ ہی نہیں سکتا۔ تم یہ بتاؤ یہ کیا اٹلا چکر چل رہا ہے۔ مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ ہمارا پرس کسی لڑکی کے ساتھ ہونگے کر سکتا ہے۔“

”مجھے بھی شاک لگا تھا آپ کی طرح اور یہی دیکھنے کے لیے تو میں آگے بڑھی تھی۔ وہ پرس ہی تھا۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

”تب ہی سے میرے پیٹ میں سروڈ اٹھ رہی ہے۔ مجھے ٹیبل ہو رہا ہے جو ہم چاہتے ہیں وہ شاید نہ ہو کہ۔“

”دہاٹ..... ماما.....؟“ وہ برش رکھ کر ان کے مقابل بیٹھ گئیں۔

”پرس کی آنکھوں میں جو میں نے عشق کی سلقی ہوئی چنگاریاں دیکھی ہیں، وہ ہمارے انتقام کے لیے رکاوٹ ثابت ہوں گی۔“

پرس اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے اور محبت تو جہل میں لگی آگ کی طرح ہوتی ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ سب کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔“

”اس کی محبت اور میری نفرت دونوں مل کر کیا رنگ بنائیں گی..... یہ دیکھئے گا آپ۔“ ان کی آنکھوں میں جیسا ہی وحشت تھی۔

فائفہ بیگم نے ان کی جانب استہزائیہ انداز میں دیکھا اور گویا ہوئیں۔

”مجھے یہ بازی مات ہوتی صاف دکھائی دے رہی ہے۔“

”کیوں ماما.....؟ آپ نیم اشارت ہونے سے قہقہہ سر ہنڈر کر رہی ہیں۔ پرس تو میرا وہ ہتھیار ہے جس سے مجھے یہ بازی

جیتی ہے۔“

”اس ہتھیار کو استعمال سے قہقہہ ہی ”محبت کی دیکھ“ لگی ہے۔“

”نہیں ماما میری نظرت میں اس قدر طاقت ہے کہ اس کی نوزائیدہ محبت کو اس طرح قابض کرے گی کہ ڈھونڈے سے بھی اس کا پھندہ ملے گا۔ میری ایک عمر کی حسرت اس طرح روتی ہوئی آرزو میں نہیں بدل سکتی، خواہ کچھ بھی ہو، کامیابی میری ہے۔“

☆.....☆.....☆

”بی بی جان! آپ کچھ کہہ رہی تھیں، میں جلدی جلدی نماز پڑھ کر آئی ہوں۔“ بیلا کچھ پریشان ہی اعدا آ کر گویا ہوئی۔

”موسم اچھا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا چائے کے ساتھ پکڑے بھی کھائیں گے اور اٹلی کی چٹنی بھی ہوتو لطف آ جائے گا۔“

خلاف توقع آج بی بی جان کا موڈ بہت بہتر تھا۔ بیلا کی منتشر سانسیں اعتدال پر آنے لگی تھیں۔ کچھ دیر قبل جب وہ نماز پڑھنے کھڑی ہوئی تھی تو یہ دیکھ نہ سکی کہ بی بی جان بھی وہاں موجود ہیں اور وہ بھی اپنی جانب متوجہ پا کر اس کی سٹی کم ہو گئی تھی اور چورہی سکی کسر باقی تھی وہ ان کے حکم نے پوری کر دی کہ نماز پڑھ کر میرے کمرے میں آؤ۔ اب ان کا اچھا موڈ اسے حیران کر گیا۔ شام کی چائے پر موسم کی مناسبت سے انتظام تھا۔ وہ سب ہی سیاہ بادلوں سے گھرے خوب صورت موسم کا مزہ لے رہی تھیں۔ ہوائیں ٹھنڈی تھیں۔ ماحول پر چھایا خواب ناک اندھیرا بڑا سحر انگیز لگ رہا تھا۔

”حورین! کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں..... کچھ لے کیوں نہیں رہیں؟“ بی بی جان خاموشی سے چائے چینی حورین سے گویا ہوئیں۔

”طبیعت ٹھیک ہے بی بی جان، یہ سب کچھ کھایا ہے میں نے۔“

”آپ نے سوسہ بھی پورا نہیں کھایا ہے اور کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ آپ روز بروز اپنی ڈائٹ کے معاملے میں لاپرواہ ہوتی جا رہی ہیں۔“ قاریہ نے نرمی سے کہا۔

”اگر بھی آپ کی ڈائٹ رہی تو لگتا ہے چند دنوں بعد آپ کو خوردبین سے دیکھنا پڑے گا۔“ میرا بیگم کے کہنے پر سب کے لب مسکرائے تھے۔ حورین بھی ہنس پڑی تھی۔

”ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا آئی۔“

”کرن نے جس دن آپ کی کیئر کرنی چھوڑ دی تو اسی دن آئے گا، بالکل بے بیڑ کی طرح کیئر کرتی ہیں آپ کی۔“ حورین بیگم نے کرن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو بیٹی کو محبت آمیز لگا ہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

”اب تو میں چھوڑ رہی ہوں مگر رات کو کھانے پر آپ میرے ساتھ ہوں گی۔ میرے ساتھ والی چیز پر بیٹھیں گی۔ اپنی نگرانی میں نہیں آپ کو کھانا کھانے دوں گی۔ نہ معلوم کیا ہو گیا ہے ہماری اس نئی پود کو ہر کام میں شارٹ کٹ کی عادی ہو گئی ہیں اور ہاں سب بچیاں نماز میرے ساتھ پڑھیں گی۔“

بی بی جان کے اعزاز میں موجود مخصوص سختی و کمر دراپن مفقود تھا۔

”مجھے بچپن سے آج تک ایسے لوگوں سے بڑی اجنبیت و گھٹن محسوس ہوتی ہے جو مذہب کا پرچار تو کرتے ہیں مگر ان کے اعزاز میں حلاوت و شیرینی کی جگہ ایک ایسی سخت مہری و بے زنجی ہوتی ہے جو کم از کم ایک سچے مسلمان کے لیے میں نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہمارا دین تو عاجزی اخوت کا درس دیتا ہے۔ اخلاق و عروت کو مربوط کرتا ہے مگر انہیں ہوتا ہے جب ہم ایسے لوگوں کو شہد کی جگہ چتر کی زبان بولتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ بچپن کو نماز کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ میں دیکھ رہی ہوں نمازوں کو بھی ان لوگوں نے روزمرہ کے عام کاموں کی طرح سمجھ لیا ہے، جو صحت ہٹ رکوع پر رکوع اور کھڑے پر کھڑے کر کے جلد از جلد فارغ ہو جایا جاتا ہے۔“

بات صحیح تھی۔ لڑکیوں کی نگاہیں جھک گئی تھی اور بلا جو موٹل سے چھوٹی اور پنی اے فائل کی اسٹوڈنٹ تھی، شرمندہ ہو گئی۔

نماز تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا ذریعہ ہے، آج ہماری نمازیں روح سے خالی ہیں۔ ہم میں سے کتنے افراد ہیں جو نماز کو نماز کی طرح پڑھتے ہیں؟ اس کے الفاظ و کلمات کے معنی و مفہم سے آشنائیں؟ کتنے نماز کے اہم ترین مقصد سے آگاہ ہیں کہ ان کی نماز انہیں ہدی و بے حیائی سے روکتی ہے۔ درحقیقت آج ہمارے سجدے کوئے کی شوگیوں سے مشابہ ہیں۔ ہماری نمازیں ایسی ہیں جیسے کوئی پھول ہو۔

خوشبو سے محروم.....

کوئی قالب ہو یا غیر روح کے.....

کوئی درخت ہو یا غیر ثمر کے.....

ہمارے پاس قالو کاموں کے لیے وقت ہی وقت ہے۔ شاہجگ سینئرز میں ٹائم کی کمی کا احساس نہیں ہوتا، پارلز میں ہم گھنٹوں یوں ہی وقت صرف کر کے آجاتے ہیں، کبھی ملال نہیں ہوتا پھر عبادت میں کیوں لگس کو حاوی ہونے دیتے ہیں؟

☆.....☆.....☆

”مس حورین اپلیز صرف چند منٹ چاہئیں۔“ حیدر اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ لاجپوری سے نکل رہی تھی۔

”کیوں؟“ وہ خامسے بگڑے اعزاز میں مخاطب ہوئی تھی۔

”اب کس طرح بے وقوف بنانا چاہتے ہیں؟ کوئی نیا پلان لے کر آئے ہوں گے کیونکہ آپ کو اپنی دوستی بہت عزیز ہے۔ آپ اپنے چہیتے فریڈ کی خاطر کوئی بھی غیر اخلاقی حرکت کر سکتے ہیں، جس کا آپ کو ملال تک نہ ہوگا کہ آپ کی اس طیر ڈسٹارازہ حرکت سے کسی کا فوچر کس طرح تباہ ہو سکتا ہے، کسی کی پرنسٹنٹ مٹی میں مل سکتی ہے۔“ وہ سخت اعزاز میں بولتی چلی گئی۔

”میں تمہارے دل سے شرمندہ ہوں آپ ہرٹ ہوئیں۔ آپ نے برا ٹیل کیا مگر بخدا میرا ڈوائون کا ارادہ برا نہیں تھا۔ ہم آپ کو بے عزت کرتے ہیں۔ آپ کا وقار ہمیں پوری طرح سے عزیز ہے۔“ حیدر کے دھمکے لہجے میں اپنا نیت تھی۔

”رہنے دیجئے، سب جانتی ہوں کتنا عزیز ہے اور میں آپ کی اب کوئی بات نہیں سنوں گی، میرا بچھا چھوڑ دیجئے۔“

”آپ کا قصہ بجا ہے۔ ڈوائون کی نانو اور مدر بالکل اتفاقیہ ہی ادھر آ گئی تھیں۔ شاید ان کی وجہ سے آپ زیادہ ہرٹ ہوئی ہیں

اور آپ سمجھ رہی ہیں یہ سب پلاننگ کے تحت ہوا ہے۔" حورین نے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ حیدر بھی اس کے ساتھ ہی چلنے لگا تھا۔ قریب سے گزرتے اسٹوڈنٹس کی وجہ سے ان کی آواز دہیسی تھی۔

"حیدر پلیز! نو آؤر گومینٹس۔"

"میں کوئی وضاحت نہیں دے رہا، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"

"کیوں؟" وہ جھنجھلا کر گویا ہوئی۔

"مجھے والوں کے لیے بہت بڑی بات ہے اور جو جان کر بھی نہ سمجھیں تو ان کے لیے کوئی بات نہیں ہے جیسے آپ بلا ضرورت اجتناب و گریز سے کام لے رہی ہیں، ایک بندے کی جذباتی و قلبی کیفیت سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود بھی آپ کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی۔" وہ دونوں آدھ قیلٹی کی طرف آگئے تھے، یہاں اسٹوڈنٹس ان میں ٹولیاں کی صورت میں دور دور بکھرے ہوئے تھے۔ حورین ذک گئی تھی۔

"تم لوگ مجھے ڈیم ٹول سمجھتے ہو؟ اتنے ڈیروں لوگوں میں، میں ہی ایک ایڈیٹ بنانے کو ملی ہوں؟" وہ اس کی جانب دیکھتی ہوئی طنز یہ لہجے میں گویا ہوئی۔

"اوہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... میں سمجھا نہیں؟"

حورین کے یک دم بدلنے والے لہجے نے حیدر کو بکھلا ڈالا۔

"درست کہہ رہی ہوں، یہ سب آپ کی اور آپ کے دوست کی ٹلی بھگت ہے، مجھ سے بدلہ لینے کی، یہ جو آپ گیم کھیل رہے ہیں میرے ساتھ، ایسی گیمز بہت سن چکی ہوں، بہت اچھی طرح اندازہ ہے۔"

"آپ کو ہم بدنیت لوگ نظر آ رہے ہیں؟ اور بدلہ کس کا لیں گے؟"

"میں نے شروع سے کہا تھا کہ ڈوائون جیسے بددماغ و مشرور شخص کو صعب مخالفت کی عزت کرنا سکھا دوں گی۔ ایک دن ضرور وہ اپنے الیمنٹ ڈرویے پر شرمندگی ٹیل کرے گا اور میری کمی ہوئی باتیں آج روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ انہیں اپنی ظلیوں و ناروا بیوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ کل تک وہ جس صعب مخالفت سے بھاگتے تھے، آج ان ہی کے درمیان زیادہ پائے جاتے ہیں۔"

"آف کورس مگر اس میں بدلہ کہاں سے آگیا؟ وہ تو آپ کا شکر گزار ہے، معترف ہے آپ کا کہ آپ کی بدولت اسے اس صنف سے آشنائی ہوئی، ورنہ نامعلوم کب تک وہ ان اندھیروں میں بھٹکتا رہتا جن میں بھنگ کر وہ اپنی ماسے بھی دور ہو گیا تھا۔" حیدر کسی ٹچے ہوئے وکیل کی طرح اپنے دوست کا دفاع کر رہا تھا۔

"یہی بات مجھے سمجھ نہیں آتی جس لڑکی سے انہوں نے نفرت کی، کوئی موقع، کوئی وقت اس کی جگہ کا صنایع نہیں کیا جس کی پرچمائیں سے بھی وہ نالاں تھے، اب آٹا لانا انہیں اس لڑکی سے اس طرح کیسے محبت ہوگئی کہ اب اس کا حصول ہی حیات مقصد ٹھہرا۔"

حورین کے انداز میں اعتماد کی مضبوطی تھی اس کا ایک ایک لفظ سچائی کی جھک سے لبریز تھا۔ حیدر اسے دیکھتا رہ گیا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ سچ اتنا ہی کڑوا ہوتا ہے کہ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔“ حورین کے لبوں پر طعنے مسکراہٹ تھی۔

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں نے کبھی سنا تھا، عورت کے دماغ پر ہمیشہ جذبات کی حکمرانی رہتی ہے، سو آج دیکھ بھی لیا کہ اس کا بارے

میں کس قدر صداقت ہے۔ اپنی دوسری میزیم آپ کی سوچ، آپ کے جذبات کی ترجمان ہے۔ لہذا خون کی محبت چاند کی طرح پاکیزہ ہے۔“

”آئی ڈونٹ بلینڈ۔ اس نے شانے اچکائے۔

”آجائے گا یقین بھی..... آپ کو یہ اعتراض ہے۔ پہلے وہ بے زنی و لائقیت سے بندھا ہوا تھا اور اب وہ محبت کے ساگر میں ڈوبا

دکھائی دے رہا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں محبت و نفرت، بے زنی و امانت ایک ہی سکنے کے دو رخ ہیں۔ اس کے دونوں اعزاز ہی اپنی پوری

شہادت سے حاوی ہوتے ہیں، پھر میرا یہ تو وہ شخص ہے جس کی نفرت شدتیں سینے سے تھمتی تو اس کی محبت کی تو کوئی اعجاز ہوگی اور ہر ہا سوال

یہ کہ وہ آپ ہی سے کیوں اظہار محبت کرنے لگا تو یہ بھی قدرت کا مذاق ہے اس کے ساتھ۔“ سامنے سے ان چاروں کو آتے دیکھ کر وہ

خاموش ہو گیا۔

”کیسٹین چل رہی ہو..... چائے کا موڈ ہو رہا ہے؟“ روانے کہا۔

”ساتھ گریما گرم سو سے بھی کھا نہیں گئے۔“ ثمرین نے کہا۔

”تم تو سدا کی ہوئی ہو، ابھی یہ شہوچ کھایا ہے، اب سمسوں کی لگ گئی، کھا کھا کر مر جاؤ گی کسی دن۔“

”ارے کیا کریں بھئی، کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ ہیں۔“ ثمرین ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے گویا ہوئی۔

”چڑھاں جواب سے مجھے۔“ زویا چڑچڑے پن سے کہا ٹھی۔

”تم بس یوں ہی چرتی رہو، مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔“

”چکنے گڑے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

”میز فائر..... میز فائر پلیز کر لو۔ آپ لوگوں کو آپس میں لڑنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لوگ کیسٹین چلیں اور جو چاہیں

بڑے اطمینان و بے فکری سے تناول کریں۔ تمام خرچ یہ بندہ اٹھائے گا۔“ حیدر نے مداخلت کرتے ہوئے دعوت بھی دے ڈالی تھی۔

”اوہ، بڑے حاتم طائی کے جانشین بن رہے ہو..... خیریت تو ہے ناں..... کس بات کی رشوت ہے یہ.....؟“ ثمرین تو تھی ہی

منہ پھٹ۔

”رشوت نہیں دھا کروانا چاہ رہا ہوں، کچھ بگڑے کام ہیں۔“

”تو ہم سے کیوں کروا رہے ہیں دعا؟“ زویا نے حیرانی سے کہا تھا۔ حورین کے علاوہ ان لوگوں نے بھی پوچھا جبکہ حورین وہاں

ہوتے ہوئے بھی وہی طور پر موجود تھی۔

”بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھانا دیا جائے تو سنا ہے دعا کس قبول ہوتی ہیں۔“ حیدر نے کہہ تو دیا مگر پھر انہیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ مول نے موقع پاتے ہی حیدرین سے دریافت کیا تھا۔

”کچھ نہیں..... ٹھیک ہوں.....“

”مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

”معمولی سائرس میں درد ہے۔“

”تمہارے سر میں درد کچھ دنوں سے زیادہ ہی رہنے لگا ہے۔“

”ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔“ وہ قصدا مسکرائی۔

”کبھی کبھی نہیں، ہر وقت ہی رہنے لگا ہے۔ تم ایک بار صدق دل سے فیصلہ کر لو..... تمہارا دل ہاں کہتا ہے یا ناں؟“ مات کو ڈنر

کے بعد مول خود اسے بہانے سے لان کے قصبی حصے میں لے آئی تھی، جہاں عمو ناخاموشی رہا کرتی تھی۔ اس طرف گھر والوں کی آمد بہت کم ہوتی تھی، اس لیے وہ یہاں اسے لے آئی تھی کہ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر بات ہو جائے گی۔

”کس بارے میں؟ مول تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“ حیدرین اس کی طرف دیکھتی ہوئی استہمامیہ انداز میں بولی۔

”حیدرین اٹارگا ڈسک خود کو پھیلا مت بناؤ، خود کو تم نے تھما سمجھ لیا ہے۔ ہر ایک پر اعتبار کرنا نہیں چاہیے، یہ میں مانتی ہوں مگر کسی پر

بھی اعتبار مت کرو، یہ سمجھ نہیں ہے۔“ مول نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”آج کل ایسے سوال مجھ سے کیوں ہونے لگے ہیں جن کے جواب نہیں ہیں میرے پاس..... زندگی ایک معرہ بنتی جا رہی ہے۔

سمجھ نہیں آتا کروں تو کیا کروں؟“ آج کل وہ اس قدر زور و زنج و حساس ہو گئی تھی کہ بات بے بات پر آزر رہا ہو جاتی تھی اور آنکھیں بھرے بادلوں کی طرح برسنے کو تیار رہتی تھیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

”رؤ مت حیدرین اردن سے مسائل حل ہونا نہیں کرتے، میں دیکھ رہی ہوں تم کئی دنوں سے گھٹ رہی ہو، اندر ہی اندر کوئی

روگ لگا بیٹھی ہو اور وہ روگ کیا ہے..... مجھے معلوم ہے.....“

ڈوالٹون کی بڑھتی ہوئی وارنٹی، اس کی لگا ہوں کے شوخ پیام، حیدر کی طرف داریاں دور خواہشیں اسے متوجہ کیے ہوئے تھیں۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کس طرح اور کس کا اپنی پریشانی سے آگاہ کرے۔

گو کہ ماما سے وہ ہر بات شیئر کرتی تھی۔ کوئی خاص بات ہی کوئی ایڈوائس لیتی ہو، تو وہ بلا جھجک کہہ دیا کرتی تھی، حالانکہ گاؤں میں

جو حادثہ گزرا، جو وقت اس نے ڈوالٹون کے ہمراہ گزارا..... وہ سب ماما سے کہہ چکی تھی کہ شاید جب اس کے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔

جب جذبے رنگوں سے خالی تھے۔

قلب میں کوئی اچھل پھرا نہیں ہوئی تھی۔

اب وہ چاہتی تھی کسی کو اس کے جذبوں کی، اس کی دل کی چوری معلوم نہ ہو، اس کی چاہت کا راز عیاں نہ ہو ایک ہی وقت میں دو مختلف احساسات کی لپیٹ میں تھی۔ وہ چھپانے اور بچانے کی تنگ و دو میں جھلا تھی پھر مارتا تو ویسے بھی باہر کے لوگوں سے تعلقات استوار کرنے یا دوستی بڑھانے کے حق میں نہ تھیں۔

پھر وہ یہ کس طرح گوارا کرتیں کمان کی اکلوتی و لالائی بیٹی کسی غیر خاندان کے لڑکے سے محبت کرے۔

مولیٰ اس کے لیے بہترین دوست ثابت ہوئی تھی۔ بہت توجہ سے اس نے اس کی باتیں سنی تھیں اور اس سے دل کی ہر بات کہہ کر اس کا دل بھی گویا ہلکا ہو گیا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم، میں اس سے محبت کرتی ہوں یا نہیں لیکن جب میں محسوس کرتی ہوں، اگر وہ میری زندگی میں نہیں رہا تو.....“

پندرہوں کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئی۔

”اسوائے اندھیروں کے مجھے کچھ نظر نہیں آتا ہے۔“

”واہ بھئی واہ۔ دونوں طرف ہے آگ بھرا لگی ہوئی۔“ مولیٰ نے اسے چھینڑا تو وہ ہنسی آنکھوں سے مسکرائی۔

”اب تو بھی پارٹی لیس گے، دونوں طرف سے۔“

”اقرار صرف میں نے تمہارے سامنے کیا ہے مولیٰ.....“ اس کی جانب دیکھتے ہوئے سمجھدگی سے اسے پکارا۔

”مجھ سے وعدہ کرو، میری اس خاموش چاہت کا کسی کے سامنے ذکر نہیں کرو گی۔ اس کے سامنے بھی نہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ جذبے چھپانے کے لیے نہیں ہوتے ہیں۔“

”ان کی خوب صورتی سچا ہے کہ یہ پردے میں ہی رہیں۔ میں ان جذبوں کی اتنی حفاظت کروں گی کہ معمولی سا احساس بھی اس شخص تک نہیں پہنچ سکے گا۔“

”کیوں؟ یہ پاگل پن ہے حورین، محبت تو وہ خوشبو ہے جو سات فٹل میں بھی چھپ نہیں سکتی ہے۔“

”میں چھپالوں گی کہ مجھے اپنی انا، اپنا دکانہ راز حد عزیز ہے۔“

☆.....☆.....☆

میں مانگ لوں گے حساب تم سے

جو اب تم سے

تم کیسے دو گے جواب کوئی

دوے سکو کے حساب کوئی  
 تمہیں خبر کیا  
 کہ تجھوں کا حساب کیا ہے  
 ان آنسوؤں کا حساب کیا ہے  
 یہ جھڑواک سوال ہے، پر جواب کیا ہے

لاگت روم میں وہ سب موجود تھے۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چل رہا تھا۔ منال بیگم، کونین اور ڈو والون کے ہمراہ اپنی ساس کے ہاں موجود تھیں۔ بنگ ساڑھی میں لائٹ میک آپ اور میچنگ جیولری میں بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے وہ ہنستی مسکراتی بڑی بڑو قارنگ رہی تھیں، جب سے انہوں نے ڈو والون کے ذریعے کرنہ انس سے انتقام لینے کی پانچ کی تھی، جب سے اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ ڈو والون کی پسند و ناپسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر وہ کام کرتی تھیں جس سے وہ خوش ہوتا تھا۔ اب بھی اس کی خوشنودی کی خاطر وہ دل میں نظرتوں کے خباہت چھپائے بظاہر مسکراتے چہرے کے ساتھ اس گھر میں، ان لوگوں کے درمیان بیٹھی تھیں جہاں کے چپے چپے سے ان کو نظر تھی۔ ان لوگوں کو وہ خواب میں بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

”بھابی صاحبہ! آپ کی اس فریب خانے پر آمد ہی سب سے بڑا تھوہ ہے۔ ان تکلفات کی قطعی ضرورت نہ تھی۔“ عبد الصمد صاحب ان کے لائے ہوئے ڈیروں تھنے تھانف کی جانب اشارہ کر کے خوش دلی سے بولے۔

”ارے کوئی تکلف نہیں ہے صہ ان نوکروں میں پھل اور مٹائیاں ہیں، کچھ گلش گھر والوں کے لیے ہیں، مہما کے لیے گرم شال ہے، صنوبر اور سونیا کی جیولری اور پرفیومز وغیرہ ہیں اور کچھ کچھ اکوشل گلش ہماری بہو کے لیے ہیں۔“

انہوں نے بہو پر ڈروہیجے ہوئے سامنے بیٹھی حشرئی کو دیکھا تھا جس کے چہرے پر سرشئی سی پھیل گئی تھی۔

”آئی ایہ فاول ہے۔۔۔ میرے لیے کچھ نہیں ہے؟“ نسرہ نے منہ پھلا کر کہا۔

”آپ کے لیے تافیاں اور رسٹ واقع ہے۔“

”اوہ تھینکس آئی اے اس کے اعزاز پر وہ مسکرائیں۔“

”بھو افا تھوہ بیگم کو بھی لے آئیں، ایک مدت ہوگئی ان سے ملاقات ہوئے، کیسی ہیں وہ؟“ راحیلہ بیگم نے کہا۔

”مہما تو خود آپ سے اور بھابی جان سے ملنے کو بے تاب ہیں اور وہ آج میرے ساتھ آئیں مگر چانک ان کی فرینڈ آگئیں۔“

”دادو! آپ ہمارے ساتھ چلیں، کچھ ہمیں بھی موقع دیں اپنی خدمت کا، انکل نے بہت ثواب سمیٹ لیا ہے۔“ کونین ان سے

مخاطب ہوا تھا۔

”تم لوگوں کی محبت ہی میری خدمت ہے بیٹا۔ مجھے اپنے کمرے کے صواکھیں سکون نہیں ملتا، میں نہیں ٹھیک ہوں۔“ راحیلہ بیگم



نے بہت خوب صورتی سے یہ طرز پیش کیا، ورنہ حقیقتاً نہیں ابھی بھی بھوکا بدلتی کیفیت پر اظہارِ مذہم تھا کہ وہ کب اور کس لئے یہ خوش اخلاقی و لمن ساری کا چولہا تار کار بد مزاجی و بد تمیزی کے ہمیں میں آجائیں۔

”میرے خیال میں اب ہمیں اپنی بھائی کو گھر لے جانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ڈوالٹون نے بھائی کی نگاہوں کی چوری پکڑتے ہوئے کہا تو وہ جھینپ گیا، جبکہ حضرتی کی پلکس مزید جھک گئیں۔

”اگلے آپ تائیں، ہم اپنی بھائی صاحبہ کو کب لینے آئیں؟“

”جب چاہیں بیٹا اس گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔“

”خیر تو ہے بھائی۔ بہت پر خوش نظر آرہے ہیں اپنی بھائی کو گھر لے جانے کے لیے کہیں ہماری بھائی کو تو گھر لانے کا ارادہ نہیں ہے؟“

”قریب بیٹھے حضرت نے سرگوشی کی۔

”اگر کہوں..... ایسا ہی ہے تو پھر؟“

وہ حضرت کے اعزاز میں ہی شوخی سے گویا ہوا اور جواباً حضرت تو شاکہ کڈ رہا گیا۔ حیرت، مسرت، استعجاب و اشتیاق کیا کچھ نہ تھا اس کے اعزاز میں۔

”بہت جلد ہم آ رہے ہیں اپنی بھوکا لے جانے کے لیے آپ لوگ ابھی سے ہی جہاں کی عادت ڈالنا شروع کریں، اپنے گھر جا کر حضرتی یہاں بہت کم کم آیا کرے گی۔ میں اپنے گھر کی رونق و روشنی کو زیادہ دیر گھر سے دور نہیں ہونے دوں گی۔“

منال جیکہ اس وقت خوش خوش اخلاقی و خوش مزاجی کے بلند درجے پر پہنچی ہوئی تھیں۔ ریا کاری و منافقت ان کی رگ رگ میں رہی ہوتی تھی۔ کب اور کس سے کیا کام کروانا ہے اور کس طرح کروانا ہے، یہ خبر انہیں اپنی ماں سے ورثے سے میں ملا تھا۔ آج کل وہ جس انتقام کی پلاننگ میں مصروف تھیں، اس کا سب سے حساس و مین پوائنٹ ڈوالٹون تھا جس پر وہ ایک عرصے سے محنت کر رہی تھیں کہ جانتی تھیں اگر کامیابی کی مسرت اس کے وجود سے وابستہ ہے تو ناکامی بھی اس سے جڑی ہوئی ہے اور وہ ایسا کوئی کام ابھی کر کے اس کی ناراضی کا رستہ لینا نہیں چاہتی تھیں، ہوان دونوں تو وہ مزے سے لفظوں کے پھول نچھار کرتی نظر آتی تھیں۔

”کس قدر خوش ہوں میں آج..... میرا خاندان ایک ساتھ ایک چھت تلے بیٹھا ہے کاش..... جزوہ بھی کہیں سے آجائے تو میرا ادھورا خاندان..... ادھورا گھر..... ادھوری خوشیاں مکمل ہو جائیں۔ میری مٹا مکمل ہو جائے۔“

یلکھت ہی راجیلہ جیکہ جوان سب چہروں میں اس ایک چہرے کو کھوج رہی تھیں جو نگاہوں سے دور ہو کر بھی دل سے قریب ہو گیا تھا، جس کی یاد قلب میں کانٹے کی طرح بیوست رہتی تھی، وہ رو پڑی تھیں۔

ان کے رونے سے ایک دم ہی لٹھا پر دبیز آداسی چھا گئی تھی۔ ڈوالٹون نے بڑی محبت سے ان کے آنسو صاف کیے تھے۔ وہ اس کے ہارو کے حصار میں سسک رہی تھیں۔ انہیں نامعلوم کیوں اس کے وجود سے جزوہ کی تہک آتی محسوس ہوتی تھی۔ حالانکہ کونین کی رگوں میں

بھی وہی خنن رواں تھا جو ڈالٹون کی رگوں میں دوڑ رہا تھا مگر پھر بھی انہیں اس کی آغوش میں وہ مہک زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ عادت و اطوار کے لحاظ سے حزرہ سے بہت مشابہ تھا، جبکہ کونین کے چہرے کے نقوش و جسمانی ساخت حزرہ سے مشابہت رکھتے تھے۔ وہاں موجود سب کے چہروں سے انفرادی چھلکنے لگی، اسوائے منال بیگم کے جو چہرہ جھکا کر بیٹھ گئی تھیں۔ مبادا کہ ان کے چہرے پر حزرہ کے ذکر پر چھائی بے ڈاری وہ بے گائی کوئی دیکھ نہ سکے۔

☆.....☆.....☆

وہ سب سفیان کے کمرے میں جمع تھے۔

جہاں ان شیطانوں کا ٹولہ ہو، وہاں دھماکہ چمکڑی یعنی تولازی ہے اور اس وقت تو موضوع بھی بڑا اہم چل رہا تھا۔ سفیان کی سیل فون پر کسی لڑکی سے بات چیت ہو رہی تھی۔ دن کا قارئین وقت اور رات کا بیشتر حصہ وہ اس کے ساتھ چیٹنگ میں گزارتا تھا۔ حسب عادت لڑکی کو اس نے فرضی نام و پتہ بنا رکھا تھا۔ رؤف نے پہلے پہل تو خاموشی لگائی کہ وہ جلد ہی آسنا کر یہ دعویٰ مستحکم کر دے گا مگر جب یہ سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا تو اس نے اس لڑکی کو کال کر کے حقیقت بتادی مگر وہ لڑکی بھی ایک کانیاں تھی کیونکہ اسے گریٹھے خواہش کے مطابق پینٹس غریب مل رہا تھا۔ وہ نہیں مانی تو رؤف نے بھی جھوٹ کہہ دیا کہ سفیان اس سے فلرٹ کر رہا ہے، مگر نہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور جلد ہی ہی شادی ہونے والی ہے۔ لڑکی نے سفیان کو کال کر کے خوب ہاتھیں ستائیں اور دعویٰ توڑ دی۔ جب سے ان کے درمیان ایک محاذ گرم ہو چکا تھا۔

سفیان بھی تیبہ کر چکا تھا، جب تک رؤف کی گرل فرینڈ سے اس کی فرینڈ شپ تڑوائے گا نہیں، سکون سے نہیں بیٹھے گا۔

”ارے یار تم کب تک فیسے میں رہو گے؟ مٹی پاؤ اس فیسے پر، یہ فون فرینڈز تو اور بھی مل جائیں گی۔ وہ ایک ہی تھوڑی تھی۔“

”اس جیسی کوئی نہیں ہوگی۔“

”اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے، کوئی یہ بھی تو بتا دے؟“

”یہ بات بتانے کی نہیں ہوتی ہے۔“

”ہر بات چھپانے کی تیری پرانی عادت ہے۔“

”پھر ان باتوں کا بھانڈا چمدا ہے پر ہی پھوٹتا ہے جو نہ بھی واقف ہوں، وہ بھی واقف ہو جائیں۔“ وہی، سرد، رؤف، سمود اور ہریرہ اسے گھبرے بیٹھے تھے۔

”تم دوستوں کے روپ میں دشمن ہو، یہ میں اب سمجھا ہوں، ایک آگ لگاتا ہے اور تم سب تماشہ دیکھتے ہو مل کر۔“

”روڈ تو نہیں سنے۔ رؤف کے کہنے پر زوردار قہقہہ لگا تھا۔

”نا معلوم کیوں تم لوگ مجھ پر کسی بلا کی طرح نازل ہو گئے ہو۔“ وہ مجھلائے لہجے میں انہیں گھورتا ہوا بولا۔

”جب ہی تو کہتے ہیں، بُرا وقت کہہ کر نہیں آتا۔“

”ٹوٹنے تو میری عزت خراب کرائی، کیا ملا تجھے؟ اور تو خود کہاں کا شریف و نیک انسان ہے، میری ایک گرل فرینڈ تجھ سے برداشت نہیں ہوئی اور تو نے خود تو بیک وقت کئی لڑکیوں سے چکر چار رکھے ہیں۔ وہ کچھ نہیں ہے؟“ سفیان رؤف سے مخاطب ہوا تھا۔

”میں تیری طرح آنسو نہیں بن رہا ہوں، ان سب کو میں جانتا ہوں اچھی طرح سے..... وہ کون ہیں..... کہاں رہتی ہیں.....؟“

حیرتی طرح ہیوی سٹائٹس لوڈ نہیں کروا رہا ہوں اور نہ ہی میری مصروفیات پر ان کا اثر ہوتا ہے۔ رؤف نے اب سنجیدگی سے کہا تو وہ بھی سب متوجہ ہوئے تھے۔

”تو خود کہتا ہے ایسی لڑکیاں جو صرف ٹائم پاسنگ کے لیے ہوتی ہیں پھر ان پر اتنا روپیہ اور وقت برباد کرنے کا قاعدہ؟“

”سب چلتا ہے یا رادہ انور ڈیپل نہیں ہے، اگر اسی بہانے کسی کی مدد ہو جائے تو میری بات کیا ہے.....؟ تو نیکی ہے۔“

”لا حول ولاقوة، یہ تو ہمارا ایمان ہو گیا ہے۔ نیکی بھی اب گناہ کے رپر میں رکھ کر کر رہے ہیں۔“ وحسی نے منہ بنا کر کہا۔

”مگر نیکی ہی کرنے کا شوق ہے تو میں تجھے ایسے ٹھکانے بتا دیتا ہوں جہاں لوگ صحیح معنوں میں ایسی نیکیوں کے حق دار ہیں، جو ملے غیرت و شرم سے ایڑیاں رگڑ کر مر جاتے ہیں مگر ان کی خودداری و شرارت کسی کے آنکھیں ہاتھ پھیلائے نہیں دیتی۔“ سرد نے بھی سمجھایا۔

”تمہاری وہ سیل فون ضرورت مند نہ معلوم کتنوں سے ایسی نیکیاں پہنچی ہوگی؟ تم تمہا نہیں ہو گے.....؟ وحسی نے حسی انداز میں کہا۔

”میں..... اس فرینڈ شپ کو سرے سے پسند ہی نہیں کرتا کہ یہ سراسر بے قوفی و گناہ ہے اور آج ہماری جڑیں اپنے لمبے لمبے سے بے نیاز ہو کر اور اپنے انجام سے لاپرواہ ہو کر ان لڑکیوں میں اُلجھتی جا رہی ہے۔ کبھی سوچا ہے اس بارے میں جو آج ہم ان حرکتوں میں اگلے گن ہو گئے ہیں کہ یہ بھی فراموش کر بیٹھے ہیں کہ ہم جو دوسروں کی بہنوں کے بارے میں کتنے چپ انداز میں گفتگو کرتے ہیں، ان سے فرینڈ شپ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، تمہائیاں ان کے ساتھ شہزادی جاتی ہیں مگر شادی کے لیے ہم ایسی لڑکی کے لیے خواہش مند ہوتے ہیں جو حور شگال ہو، فرشتوں کی طرح مصوم ہو، کلیوں کی طرح آن چھوٹی، پھولوں کی طرح پاکیزہ ہو، آخر یہ منافقت کب ہرے ذہنوں سے جائے گی؟ کب ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ جو لڑکی ہے جس کو ہم فول بنا رہے ہیں، کسی کی بیٹی، کسی کی بہن ہوگی، بالکل ہماری بہنوں کی طرح..... اگر ہماری بہنیں یہ دوش اپنائیں تو..... برداشت کر پاؤ گے.....؟“

ہریرہ بہت نرم لہجے میں انہیں بھرپور تازیانی لگا رہا تھا۔

”کیا بات کر رہے ہو..... بھلا ہماری بہنیں ایسا کیوں کرنے لگیں؟“ سفیان سرخ چہرے سے گویا ہوا۔

”جن لڑکیوں سے تم لوگ فطرت کرتے ہو، وہ اپنے بھائیوں کو بتاتی ہوں گی؟ ان کے بھائیوں کو بھی ان پر اتنا ہی فخر ہوگا، جتنا ہمیں ہے۔“

”سب لڑکیاں خراب نہیں ہوتیں مگر یہ بھی انوار آگے سے ہمیں رسپانس ملتا ہے تو ہم شیر ہوتے ہیں، ورنہ جان لو یہ وہاں کبھی نہ پہنچتی، اگر کچھ لڑکیاں بے راہ روی کا شکار نہ ہوتیں۔“

☆.....☆.....☆

محبت آگ کی صورت مجھے سینوں میں جلتی ہے  
تو دل بیدار ہوتے ہیں

محبت کی تپش میں کچھ جب اسرار ہوتے ہیں  
کہ جتنا بھڑکتی ہے، عروسی جاں نکلتی ہے

محبت خواب کی صورت لگا ہوں میں اترتی ہے  
کسی مہتاب کی صورت

ستارے آرزو کے اس طرح سے جھللاتے ہیں  
کہ پہچانی نہیں جاتی

محبت کے شجر پر خواب کے پتے اترتے ہیں  
عمر میں نا اُمیدی کی ہوا میں سنسناتی ہیں

گلی میں جب کوئی آہٹ کوئی سایہ نہیں رہتا  
غموں کے بوجھ سے جب ٹوٹنے لگتے ہیں شانے تو

بیان پر ہاتھ رکھتی ہے  
کسی ہمدرد کی صورت

محبت درد کی صورت  
محبت اوس کی صورت

محبت فردوس کی صورت  
اس نے دیکھا اسٹاپ پروپی کٹری تھی جس پر پہلی نظر میں دھوکا کا گمان مگر راتھا کہ آج کل ہر سو وہی دکھائی دے رہی تھی۔

آنکھیں کھلی ہوں  
آنکھیں بند ہوں

خواب میں، حقیقت میں  
ہر سو اسی کا راج تھا

کاشن کی ریڈ شرٹ میں لٹی لکڑو دھاگوں کی کڑھائی تھی۔ ساتھ اس کے کلف شدہ وہاٹ شلوار روپہ تھا جن پر آویزاں ہار ایک  
سلوار اشارہ دور سے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ میچنگ پرس لگانے وہ کٹری کسی کوٹن کا انتظار کر رہی تھی۔

تب ہی اچانک اپنے قریب وہ ایٹ شد لیٹ کو دیکھ کر وہ چونکی تھی اور نظر اٹھانے پر جن جذبے لگاتی تھیں ان سے تصادم ہوا تھا اس نے اسے سر تاپا سلگا کر رکھ دیا تھا۔  
”کوٹھینگس، میں ٹیکسی.....“

”شٹ آپ اینڈ ہری آپ“۔ وہ سخت لہجے میں گویا ہوا۔ وہ ارد گرد کھڑے لوگوں کو حیرت سے دیکھ کر غصے پر قابو نہ پاسکا۔ فرنٹ ڈوروہ پہلے ہی کھول چکا تھا، طوہا کر با حورین کو بیٹھنا پڑا۔

”آخر آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اس طرح کی حرکتیں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں کہ کسی کو اس کی مرضی کے بنا مجبور کیا جائے“۔ اس کے بیٹھے ہی وہ کارا اشارت کر چکا تھا۔ حورین بھی غصے سے بولی۔

”میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو اس قدر غصہ آ رہا ہے“۔ کارا ڈرامائی کرتے ہوئے اس نے بھر پور لگاؤ سے اس کی طرف دیکھا جس کا سرخ چہرہ اس کی شرٹ میں بیچ ہو کر اور حسین لگ رہا تھا۔

”میں نے اپنے کزنز سے بیٹ لگائی تھی کہ میں یہاں کی وہین میں ٹریول کر سکتی ہوں، انہوں نے کہا تھا کہ نہیں کر سکتی، میں اسی وجہ سے یہاں کھڑی تھی اور آپ نے پروگرام مٹی کر ڈالا“۔

”اوہ“۔ اس کا خوب صورت تہمتہ وہاں گونج اٹھا۔

”شرٹ لگانے کا بھوت ابھی تک آپ کے سر سے نہیں اترتا ہے“۔

”اتری گیا سمجھیں، بہت عرصے بعد بیٹ لگائی ہے جو آپ کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی“۔ اس کا موڈ بدستور آف تھا۔ وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ غصہ، جھنجھلاہٹ، خشکی کے رنگوں نے اس کے حسین چہرے کے دلکش نقوش نے کچھ ایسی حیرانگیز جاذبیت پیدا کر دی تھی یا یہ اس کے محبت کے جذبوں سے منور دل کی دیوانگی تھی کہ بے اختیار اس کی لگاؤ اس کی جانب اٹھ رہی تھیں اور ہر بار اٹھنے والی نگاہ پہلے سے زیادہ بہتابی لیے ہوئے تھی۔ اسے دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی تمنا سا ہورہی تھی۔

”یہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟“ غصہ اس کی بھارتوں سے نیچے اترتا سے خیال آیا کہ کارا اس کے گھر پر جانے والے راستے کی بجائے کسی اور اجنبی راستے پر گامزن ہے تو وہ گھبرا کر استفسار کرنے لگی تھی۔

”بہت دور“..... اس کے گھمبیر لہجے میں کچھ تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ وہ گھبرا گئی نئی طرح سے۔

”ڈیٹا کے اس طرف..... جہاں ہمیں کوئی ڈھونڈ نہ سکے“۔ اس کی سرخی آنکھوں میں کوئی آگ سی سگنے لگی تھی۔ لہجے میں عجیب سی جذباتیت تھی۔ حورین کے حواس معطل ہونے لگے اس کی آنکھوں میں خوف سا اترنے لگا۔ اسے خوف کے جسم سن ہو گیا۔

”تم نے حیدر سے کہا تھا، میں تم سے محبت نہیں کرتا..... یہ سب بدلہ لینے کے ڈھونڈ کر رہا ہوں“۔

وہ نل اسپینڈ میں کار بھگاتے ہوئے اپنے مخصوص مردو اکڑ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ لمبے لمبے اس کے چہرے پر خشونت ابھری تھی۔  
 ”ہوں، خاصا اٹلی ہیٹ ہوں، جو کچھ لگیں۔ تم نے کئی مواقع پر مجھے ٹھکت دی ہے، چوٹایا ہے، اتنی آسانی سے میں تمہیں صاف کرنے والا نہیں ہوں۔ میں اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ اب دیکھنا میرا بدلہ..... میرا انتقام.....“

حورین کے حواس تو پہلے ہی کم ہو رہے تھے۔ رہی سہی کسر اس کے خوف ناک انداز و زہریلی باتوں نے پوری کر دی۔ اس نے گھومتے دماغ کے ساتھ بند ہوتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ کس قدر بدل گیا تھا اس کا چہرہ..... وہ جوانی و چاہت و اساتیس کے باعث یوسف ثانی کہلاتا تھا، جس کی مردانہ خوب صورتی کی دھم تھی..... جہاں مغرور انداز و مردھری کے باوجود آن گت لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن تھا..... ان کے خوابوں کا ہیرو تھا۔

اس وقت اپنے گناؤں نے عزائم کے باعث کسی عطریت میں بدل گیا تھا جس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دکھ رہی تھیں، زبان ثانی کی مانند سینے تک چلی گئی تھی جس کے لمبے لمبے دانت خون آلود وٹنوں سے باہر کسی ٹخنوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے خوف سے چیخ مارنا چاہی مگر وہ چیخ میں ہی گھٹ کر رہ گئی اور وہ گرتی چلی گئی۔

ذوالنون جو دیکھے، ہاتھ سے ٹک کرنے کی غرض سے سائیکنگ کر رہا تھا، خوف زدہ دیکھ کر اسے مزہ آ رہا تھا اور اسے مطمئن نہ تھا اس کا مذاق یہ رنگ لائے گا کہ مارے خوف کے ہی بے ہوش ہو جائے گی اسے گرتے دیکھ کر اس نے پھرتی سے ہایاں ہاتھ اسٹیزنگ سے ہٹا کر اس کے گرتے وجود کو بازو میں سنبھالا تھا اور سائیز میں کار روک دی تھی۔

”حورین احمدین ا“ اس نے رخسار پر انگلیوں سے آہستہ سے سچ کرتے ہوئے اسے پکارا مگر وہ سس سے مس نہ ہوئی۔  
 ”حورین اہوش میں آؤ پار، میں مذاق کر رہا تھا“ اس منٹ سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود بھی وہ بے ہوش رہی تو وہ پریشان ہوا تھا تھا۔ اس نے بہت احتیاط سے اسے اٹھا کر بیک سیٹ پر لٹایا تھا اور قہر موم سے ٹھٹھا پانی نکال کر اس کے چہرے پر ڈالا، دو تین بار ڈالنے پر اس نے آنکھیں کھول دی تھیں، اسے ہوش میں آتے دیکھ کر اس نے کلمہ شکر ادا کیا تھا۔

چند سیکنڈ وہ خمایدہ لگا ہوں سے قریب موجود ذوالنون کو دیکھتی رہی، پھر لمبے کے ہزاروں جھمکے میں اس کا ذہن بیدار ہوا اور سب یاد آتا چلا گیا۔ وہ ایک زوردار چیخ مارتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

”ٹیک اٹ اپ، یو آر رائٹ“ اس نے تسلی کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا مگر وہ رالہا سے شاکڈ کر گیا۔  
 ”تم..... تم اتنے گھٹیا اور کہینے ہو گئے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی مگر میں اپنی جان دے دوں گی، تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی، میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔“

بے حد پھرے ہوئے انداز میں حورین نے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ ذوالنون کی آنکھوں میں، چہرے پر ڈونیا بھری آگ بھڑک اٹھی تھی۔ حورین کی ٹکاہوں کی بے اعتباری اور لہجے کی بے اعتمادی نے اس کی شرافت و مردانگی پر بڑے بھاری تازیانے لگائے تھے۔ اس کی نس نس چیخنے لگی تھی، پستانا ٹھن آلود ہو گئی تھی۔

”تم حام لڑکی ہو، بہت سچی سوچ رکھنے والی پست ذہنیت والی لڑکی، کیا گھٹیا پن دیکھا تم نے مجھ میں؟ کس موقع پر میں نے کیننگی دکھائی؟“ وہ ایک آتش لکھاں کی طرح پھٹا تھا۔ تم دھسے میں کھولتی حورین کو برف کی طرح سرد ہونے میں لہو لگا تھا۔

”تم سے محبت کرنا گھٹیا پن ہے، تم کو چاہتا کیننگی ہے تو.....“ لمبے بھر کو اس کی گھن گرج میں کمی آئی تھی۔

”مفسوس ہم کہہ سکتی ہو کہ ان جذبیوں کے ہاتھوں انجانے میں ہی میں اسیر ہوا ہوں، یہاں از خود کوئی میری کوشش نہیں ہے“ اس کے وجہ چہرے پر بے یقینت ہی حزن چھا گیا تھا۔ وہ بیک سیٹ سے اٹھ کر ڈرائیونگ ڈور کھول کر بیٹ پر بیٹھ گیا اور کانی وریٹک دونوں ہاتھوں کی مٹھلیاں بچھپا پنے اندر ہوتی اکھاڑ پھار سے نہرو آواز ماہوتار ہا اور پیچھے بیٹھی حورین پل پل بدلتے اس شخص کے مزاج کے ذریعہ مزہ خود بخوشی تھی۔ چند لمحوں قبل وہ شخص اپنے اعزاز سے کسی عفریت کی مانند لگ رہا تھا اور اب وہی شخص کسی کالج کے گلخان کی طرح ٹوٹا، بگھرا دکھائی دے رہا تھا۔ کسی آواز بھری شام کی طرح تمہا وہم ناک۔

”اگر میں ایسا ہی گھٹیا و کمینہ ہوتا تو میرے پاس پہلے ہی بہت مواقع آئے تھے، اگر مجھے بدلہ لینا ہوتا تو..... کون روک سکتا تھا مجھے؟ جواب دو..... تم میرا رستہ روک سکتی تھی؟“ وہ اس کی جانب ہانڈ دیکھے کہہ رہا تھا اور اس کے اعزاز میں کچھ تھا۔ لہجے کی سچائی، محبت کی طاقت، جو یک دم ہی اسے اپنے خیال و سوچ پر شرمساری محسوس ہونے لگی۔

اس کی نگاہیں اور سمر مارے نہ اندامت کے بھٹکا چلا گیا اور اسے لگا اب کبھی بھی وہ اس شخص کے آگے سر نہ اٹھائے گی۔

”تم خود کو بہت خاص لڑکی سمجھتی ہو، مجھ جیسے مرد کے آگے کسی چیز یاں کی طرح کمزور رہے بس ہو، اگر تمہارا ہاتھ پکڑ لوں تو تم چھڑا نہ پاؤ گی، کمزور و لاغر وہ مرد ہوتے ہیں جو حضوروں کی طرح ڈال ڈال منڈلا کر اپنی حیثیت و شرافت کا جنازہ نکال دیتے ہیں..... جو مرد اپنے ایمان کی طرح اپنی حیثیت و کردار کی حفاظت کرتے ہیں، وہ کبھی بھی کسی لڑکی سے شکست نہیں کھا سکتے۔“

اس کے نرم و نر جوڑ لہجے میں سچائی کی تہک تھی۔ خود کو غلط سمجھ جانے کی تک تھی..... شدید اناج دینا ہوا لہجہ تھا۔

حورین خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ یہ راستہ آبادی سے اہر کا تھا، جو سر آفتاب کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ بھی ان کی طرف جانے کا تھا۔ ان سے ملاقات ہوئے خاصے دن ہو گئے تھے مگر اس کے مذاق اور حورین کی بدگمانی نے اس کے جذبات و بری طرح سے ٹھیس لگائی تھی۔ حورین نے اس کے کردار پر ضرب لگائی تھی اس کی نیت پر شک کیا تھا۔

”وہ سب مذاق تھا اور میرا خیال تھا تم بھی اس کو انجانے کر دو گی مگر تم نے تو ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا..... کہ میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں..... کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔“

”میں..... میں ایک سکپوز.....“

”ٹونیور..... مجھے اب جموٹے لفظوں سے نہیں بہلانا ہے جو بات آنکھیں کہہ دیتی ہیں وہ زبان ادا نہیں کر سکتی۔“ حورین کی بات اس نے بہت جیزی سے کاٹ کر جوئی اعزاز میں کہا اور بڑے وحشت بھرے اعزاز میں کارو زانی شروع کی تھی۔ اس کی وحشت، جھون،

اضطراب و اضطراب شروع ہوا۔ کارگو یا چل نہیں اڑ رہی تھی۔ بہت لگیل عرصے میں وہ حورین کی بنگلے سے کچھ دور اُتار کر بنا کچھ کہے اور سنے ہوا ہو چکا تھا۔

حورین کو گھر سے پہلے اُتار کر وہ سیدھا گھر چلا آیا تھا۔ اپنے روم تک جانے کے لیے اس نے بیرونی راستہ استعمال کیا تھا جو لان سے ہو کر اس کے پورشن میں دو گیٹ کھلتے تھے۔ اس کے بیڑ روم میں وہ راستہ کھلتا تھا، اس نے اسی راستے کا انتخاب کیا تھا۔ بیڑ پر آ کر وہ جوتوں سمیت لیٹ گیا تھا۔ انجانے میں حورین اسے آگ میں پھینک چکی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموشی و رینگ لپٹا رہا تھا۔ اسے اپنے روم میں روئیں سے گرم گرم لپٹیں نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”محبت.....“ وہ بیڑ بڑایا۔

”کیا ہے یہ محبت.....؟“

جنت.....؟

راحت.....؟

سکون.....؟

شاید یہ روپ ہیں اس کے.....

ڈک.....

نار سائی.....

چیمانی.....

میں نے کبھی یہ تو نہیں سنا تھا کہ گلاب کے بدلے گلاب لیں گے۔ یہ طر ف محبت کسی عذاب کی مانند نازل ہوتی ہے۔ یہ اس کے حصے میں آتی ہے جو اس سے بھاگتے ہیں، بچتے ہیں..... ناپسند کرتے ہیں..... یہ محبت کا مرض، بہت موڑی ہے۔ یہ ٹھنڈے زہر کی مانند آپ کو اندر ہی اندر بہت ست رہتا رہتا ہے۔ بے حد آہنگی سے ہلاک کرنا رہتا ہے اور محسوس بھی نہیں ہونے دیتا۔

مجھے کیوں لگا یہ محبت کا روگ، مجھے پہلے ہی تم کیا کم تھے؟ دروازہ ناک ہوا پھر کونین کا مسکرا تا چہرہ نظر آیا۔

”میں کب سے انتظار کر رہا ہوں اور تم یہاں.....“ کونین قریب آیا تو اس پر نگاہ پڑتے ہی ٹھک گیا ہوا۔

”تمہاری آنکھیں اس قدر سرخ کیوں ہو رہی ہیں.....؟ چہرہ بھی لال ہو رہا ہے..... کیا ہوا.....؟ کس سے لڑ کر آئے ہو؟“

”کسی سے بھی نہیں۔“ وہ سلطندی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”جھوٹ مت بولو، میں جانتا ہوں، کسی سے لڑتے ہو تو تمہاری یہی حالت ہوتی ہے، بتاؤ کس سے لڑائی ہوئی ہے اور کیوں ہوئی ہے؟“ وہ اس سے بڑھ کر بیٹھ گیا۔



”میں کس سے لڑوں گا؟ آپ کو وہم ہوا ہے۔“ وہ جبراً مسکراتا ہوا گویا ہوا۔ کونین نے زبردستی اس کے موزے جوڑے اُتارے

تھے، اسے اپنا موڈ درست کرنا پڑا تھا۔

”مما اور نانا تو تاری تھیں، انہوں نے تمہیں کسی لڑکی کے ساتھ کافی پیٹے دیکھا تھا۔ وہ تاری ہی تھیں، تم سیریس ہو اس لڑکی کے ساتھ..... لڑکی کا نام تو بہت پیارا سا ہے حورین۔ یقیناً وہ لڑکی بھی بہت کیوٹ اور سویٹ ہوگی۔ جب ہی ہمارے اس پتھر کو اس نے موم بنا ڈالا جو لڑکی میرے بھائی کو پسند آئی وہ کوئی عام لڑکی تو نہیں ہو سکتی ہے۔“

کونین کے انداز میں بڑے بھائی والی خوشی تھی اور وہ بے حد خوش تھا کہ وہ لٹون جیسے آدم بیزار و تہائی پسند شخص کی زندگی میں بھی کوئی لڑکی بہا رہی صورت آئی ہے۔

”بھائی! یہ گرتا کتنا بھی خود کو پوز کریں، خطرناک، سب اعدا سے عام سی لڑکیاں ہوتی ہیں، بے حد عام سی۔“

کونین کے لٹکوں نے حورین کے لفظ یا دو لاد دیے تھے۔ وہ متنا کر بولا۔ کونین ہنس پڑا تھا۔

”ہوں..... ہکڑی گئی چوری..... اس لڑکی سے ہی لڑ کر آرہے ہو..... ہے ناں یہ بات؟ یہ کیا بات تمہیں پیار کیے ابھی جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور تم نے لڑائیاں بھی شروع کر دیں..... شیم آن یو، مجھ جیسے سچے عاشق کے بھائی ہو کے ایسی حرکت ہوتے ہوئے شرم نہیں آتی ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے بھائی۔“ وہ جھینپ سا گیا۔

”ایسی ہی بات ہے، چلو کٹافٹ ہاتھ لو، علیہ درست کرو، پھر اسے کال کر کے ایک سکیم ذکر کرو، اسے کسی شان دار سے ہوٹل میں ڈنر پر بلاؤ اور سرخ پھولوں کا کیک لوانس کے لیے اور ساتھ اس کی پسند کا کوئی گنٹ بھی خرید لیتا۔ یہ ہوتے ہیں مٹانے کے طریقے۔ میری اور نصرتی کی ایک بار بھی لڑائی نہیں ہوئی ہے مگر میں پھر بھی اس کی پسندنا پسند کا خیال رکھتا ہوں۔“

”بات ایسی کوئی ہے نہیں۔“ وہ اسے موضوع سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔

”نہیں ہے تو ہو جائے گی۔ لڑکی تو آگئی ہے تمہاری زندگی میں۔“

”آپ بھی کہاں نانا اور ماما کی باتوں میں آگئے ہیں۔“ وہ کہتا ہوا ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مما! یہ کیا بے وقوفی کی ہے آپ نے؟“

کونین کے جاتے ہی منال بیگم بڑے لہجے میں قانقہ سے مخاطب ہوئیں۔

”ارے ایسا کیا کر دیا میں نے جو مجھ پر آنکھیں نکال رہی ہو؟“

”آپ میں بھی تو برائی ہے، سب کام بگاڑ کر بیوی بن جاتی ہیں، کیا ضرورت پڑ گئی تھی آپ کو پرنس کے اٹھنے کی خبر دینے کی۔“

اب وہ سیدھا اس کے پاس جائے گا اور اسے عشق کا سستی پڑھائے گا۔ آپ نے میری ساری محنت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔“

”تو سدا حار لو، ویسے بھی آج کل بڑے تعلقات سدھارنے والی بن رہی ہو۔ بھاگ بھاگ کر اسی دلہن پر جا رہی ہو جو کبھی تم کو

آتی تھی، پھر کون سا تم مجھے اپنے منسوبوں سے آگاہ رکھتی ہو جو میں ایسے کام نہ کروں..... خود سوچتی ہو، خود ہی عمل کرتی ہو۔“

فائدہ بیگم بھی کئی دنوں کی دل میں بھری بھڑاس نکال رہی تھیں۔

”میرا وہاں جانا ہی آپ کو کھٹتا ہے، حالانکہ سب جانتی ہیں کہ میں وہاں کس دل سے جاتی ہوں۔ منزل کے حصول کے لیے

تا معلوم کون کون سے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے، ہر راستہ پھولوں بھرائیں ہوتا۔ کہیں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور کہیں کانچ بھی۔“

”میرے کانٹے پر چڑھ کر میرے کانٹے کھاؤ، خود کو اب مجھ سے بھی زیادہ مشکل مند اور ہوشیار سمجھنے لگی ہو جو کسی بات کی بھنگ

تک نہیں لگنے دیتی۔ بس یہی کہتی رہتی ہو..... انتقام لوں گی..... انتقام لوں گی..... کب آئے گا وہ دن؟“

”بہت جلد..... بہت ہی جلدی..... بازاری پوری طرح میرے ہاتھ میں آچکی ہے۔ کامیابی ہم سے اب اتنی ہی دور ہے جتنی دور

وہ لڑکی ہے لیکن ابھی جو آپ نے کیا ہے، وہ اچھا نہیں ہے۔ اب مجھے کوئی پیکر دکھا کر کوئی نئے کو یہاں سے باہر بھیجنا پڑے گا..... ورنہ بازاری

اٹھ جائے گی۔“

ان کا شاطر ذہن کاروباری محاطوں میں کوئی ایسی کمزوری تلاش کر رہا تھا جو کوئین کے کسی بیرون ملک جانے کا سبب بن سکے۔

”بعض دفعہ میری شکل پر پتھر پڑ جاتے ہیں، اگر ہماری باتوں کے دوران کوئین آگیا تھا تو میں کوئی دوسری بات بنا بھی سکتی تھی مگر

اس وقت میں اس قدر شپٹائی کہ سب سچ سچ اسے بتاتی چلی گئی۔ تمہاری طرح یہ بات میں نے بھی اسی لیے چھپائی کہ وہ بھائی کو اور حوصلہ

دے گا جو ہمارے لیے مصیبت نہیں گے۔“

☆.....☆.....☆

خود بین اور ذوالنون کے درمیان ایک آن دیکھی سی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ اس نے پہلے کی طرح بھرپور طریقے سے اسے انکور کرنا

شروع کر دیا تھا، حالانکہ وہ سب سے پہلے کی طرح ملتا تھا۔ چاند میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ کبھی سب کی موجودگی میں اسے خود بین کو

مخاطب بھی کرنا پڑتا تو اس کا انداز بے حد سرسری سا ہوتا تھا۔ اس کا یہ بدلا بدلا انداز خود بین کی دنیا ہی بدل چکا تھا۔ اس کی محبت و وارفتگی نے

اسے پتھر بنائے رکھا تھا لیکن..... یہ بے گانگی و اجنبیت اسے احساس دلانے لگی۔ وہ محبت کی آگ میں یک طرفہ نہیں جل رہا۔ وہ آگ اس

کے دل تک پہنچ چکی ہے۔

ذوالنون نے جو کچھ اس سے کہا تھا وہ سو فیصد درست تھا۔ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی، بلند کرداری تھی۔ بے حد نازک مقام پر بھی اس

کے نفس نے کہیں دھوکہ نہیں دیا تھا۔ وہ ثابت قدم رہا تھا اس نے سوچ لیا تھا وہ ذوالنون سے معافی مانگ لے گی مگر وہ موقع کہاں دے رہا

تھا آج بھی سارا دن وہ اس کے پیچھے غوار ہوئی تھی۔ کئی بیرون بھی بس کیے تھے مگر وہ اس کی پرچھائیں دیکھتے ہی قابض ہو جاتا تھا۔ تھک کر

اس نے حیدر سے رابطہ کیا تھا۔

”زہے نصیب کہ آج آپ کو اہماری ہی کیا۔ آپ بے فکر ہیں۔ اس کوکان سے پکڑ کر میں آپ کے پاس لاؤں گا، ابھی تو چھٹی کا ٹائم ہے۔ کل میں لے کر آتا ہوں اس کو۔“

حیدر نے ساری بات سن کر مطمئن اعزاز میں کہا، وہ وہاں سے چلی آئی۔

”آج نامعلوم تم کہاں کہاں تھا گھومتی پھر رہی ہو، چلو اٹھل آئے ہیں کار لے کر۔“ مول اور زویا اس سے آ کر بولیں۔

”اوہ ڈیڑی آگئے؟“ وہ مسرت سے گلزار چہرہ لیے اس صاحب سے لپٹ گئی جو ایک ماہ بعد ملا بیٹھا سے لوٹے تھے۔

”پر..... نس..... یہ..... حورین ہے نا؟“ پیچھے کی سائیز کار میں بیٹھی ہوئی مثال بیگم نے ذوقی ہوئی آواز میں کہا۔

”جی ماما آپ کو کیا ہو رہا ہے؟“ وہ ہنستی مسکراتی ماں کے چہرے پر یکلفت اُبھرنے والے تکلیف دہ تاثرات سے پریشان ہو گیا۔

”وہ..... وہ..... کون ہے؟“ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں مگر ان کی نگاہیں اس صاحب کے سینے سے لگی حورین پر تھیں۔

”وہ اس کے قادر ہیں۔“ ڈو الون اُلجھے اُلجھے لہجے میں بتا رہا تھا۔

”اوگا ڈا! اوو یہ نہیں ہو سکتا۔“ دوو ہیں بے ہوش ہو گئیں۔



کئی کھینے گزرنے کے بعد مثال بیگم کو ہوش آیا تھا۔

”پلیز، آپ لوگ ان سے ابھی کوئی ایسی بات نہ کیجئے گا جس سے ان کی برین ہارٹ کنڈیشن پر پشتر اثر ہو۔“

ان کے ہوش میں آنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے انہیں سمجھایا تھا اور ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئی تھی، وہ تینوں

ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ مثال بیگم کی خالی خالی نگاہیں بیٹے کے چہرے پر تھیں جس پر ماں کی بالکل اچانک بگڑتی طبیعت کی وجہ سے

پریشانی، بگڑتی اور اضطراب شدت سے پھیلا ہوا تھا۔

”ماما آپ بالکل ٹھیک ہیں۔“ کونین نے ان کی پریشانی چوتھے ہوئے اپنا ہیبت بھرے لہجے میں کہا۔

”اتنی بڑی رہنے لگی ہو، گھری، بزنس کی ہر ٹیشن میں گھری رہتی ہو، یہ تو ہونا ہی تھا۔ ہر وقت کی سوچ و پریشانی نے یہ دن دکھایا

ہے۔“ قائد گھوم کر لہجے میں ان کے ٹکے پر بکھرے بال اٹھیوں سے سنوارتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

”نانو..... اپرنس کی کیا ٹیشن ہے؟“ کونین نے چونک کر کہا۔

”کوئی نہ کوئی تو ہوگی، یہ اب ہر بات تو تمہیں بتاتی نہیں کہ سچے ہی ہوا آخر..... یہ کام تو تمہارے ڈیڑی کے کرنے کے تھے..... مگر

وہ بد خصلت انسان بیوی کے ساتھ ساتھ بچوں کی بھی زندگی بھری خوشیاں سمیٹ کر لے گیا ہے، اگر وہ ہوتا تو.....“

”پلیز نانو..... اسٹاپ دس ٹاپک۔“ ڈو الون بیگم کی سے گویا ہوا، نہ معلوم یہ کون سا احساس تھا، باپ کے خون کی گرمی تھی یا اس

کے سینے میں ہر دم چلتی ہوئی محبت کہ اس احساسِ درد کے باوجود کہ بابا نے اس طرح راہ فرار اختیار کر کے کوئی مستحرب احساس نہیں بخشنا تھا مگر پھر بھی کوئی اس کے بابا کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا تو اس کے لیے قابلِ برداشت ہو جاتا تھا، خواہ مثالِ بیگم ہی ہوں۔

”آپ باپ کی حمایت لینا مت چھوڑنا، نہ معلوم کسی محبت ہے یہ، جس باپ نے اتنے سالوں میں پلٹ کر نہیں دیکھا، اس کی یاد ابھی تک آپ کے دل میں موجود ہے۔“

”فائدہ والوں کی جانب دیکھتی ہوئیں استہزائیہ انداز میں بولیں۔“

”آفرآل وہ میرے بابا ہیں، وہ میری ذات کی اساس ہیں، میری پہچان ہیں، میں انہیں کس طرح ادا نیک کر سکتا ہوں، ابھی ایسی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے، مہا ایسی باتوں سے ریلیکس نہیں ہوں گی۔“ وہ کہتا ہوا مثالِ بیگم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”کیا ٹھیک کر رہی ہیں مہا آپ؟“ وہ جھک کر پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ نجف و نزار لہجے میں گویا ہوئیں۔ لٹا ہیں ذوالنون کے چہرے پر تھیں جوان کے نزدیک ہر جھکائے کھڑائی بیمار بھری لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا مگر اس کی خوبصورت گہرے آنکھوں کی گہرائیوں میں بہت سارے اضطراب آگیز، تجسس زدہ سوالات موجزن تھے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ حورین اور اس کے قادرانس صاحب کو دیکھ کر پہلے تو بے چین ہوئی تھیں پھر اس سے یہ تصدیق ہونے کے بعد کہ وہ حورین کے قادر ہیں تو یقیناً بے چین و پریشان نظر آئی تھیں، پھر بے ہوش ہو گئی تھیں۔

ذوالنون سیدھا انہیں ہسپتال لے آیا جہاں ان کی فیملی ڈاکٹر نیلا فریڈا نے فوری طبی امداد دی تھی، وہ اب ہوش میں تھیں، وہ انداز ہی اس جیسے بے انتہا احساسِ وجہ بانی بندے کو اضطراب میں مبتلا کرنے کا کافی تھا، وہ کسی حالت میں خاموش رہنے کی عادی نہ تھیں، اس وقت ان کے لبوں کی جامد خاموشی اسے مسحوش کر رہی تھیں اور وہ خود کو آن دیکھی اُلجھنوں میں محسوس کر رہا تھا۔

”پرنس.....!“ انہوں نے اس کے چہرے پر کانپا ہوا ہاتھ پھیرا، ان کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو نکل نکل کر نکلے میں جذب ہونے لگے۔

”مہا..... مہا! آپ روئیں مت پلیز۔“ ذوالنون کے ساتھ کونین بھی تڑپ اٹھا تھا۔ اس نے بھی پہلی بار ماں کو اتنا کمزور دیکھا تو اس دیکھا تھا۔

”میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں، تم دونوں میں میری جان ہے، مجھ سے کوئی انجانے میں زیادتی ہوگی، ہو تو معاف کر دینا۔“

”ایسی بات مت کریں مہا! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“

کونین جو اجد کزور حوصلے و ہمت کا مالک تھا، وہ رو پڑا تھا، جبکہ دل کی دنیا تو ذوالنون کی زیرِ زبر ہوئی تھی مگر وہ کب کسی کے سامنے اپنا آپ ظاہر کرنے والا تھا، وہ اپنے آنسو اپنے آپ سے بھی چھپانے کا قائل تھا، موضوعِ بحث کرنا ہوا مہا کے ساتھ نا تو اور کونین کو بھی تسلی دینے لگا، کونین کو اس کے اسی حوصلے و ہمت پر فخر تھا۔

”تو بہ..... منال احوصلہ کرو، بچوں کا دل بھی کمزور کر رہی ہو، اب تم آرام کرو، بزنس کے جو بھی معاملات ہیں، میں اور کوشین دیکھ لیں گے، بلکہ تم بیٹا جا کر ایک ٹورقارن آفسو کا کراؤ، بہت عرصہ ہوا ہے کبھی مگر منال کو زیادہ ڈسٹرب کیے ہوئے ہے۔“

”او کے نانو.....! میں اسی پلٹنے میں چلا جاؤں گا، ویسے وہاں ضرورت تو نہیں ہے، چند دنوں قبل ہی وہاں سے آئے ڈیلی گیٹن سے مینٹنز ہو چکی ہے مگر ماما کی خاطر میں وزٹ کراؤں گا۔“

”خوش رہو۔“ انہوں نے طمانیت بھری سانس لے کر منال کو دیکھا۔

”ماما.....! یہاں سے ڈسٹرب کب ہوں گی؟ مجھے یہاں ٹھہرنے سے منع ہے۔“

”کچھ دن آپ ریٹ کر لیں ماما یہاں اچھی ٹریٹمنٹ ہوگی۔“

”نہیں پرنس! میں جانتی ہوں منال! اگر یہاں رہی تو اور پتار ہو جائے گی۔ ڈاکٹر نیلور، ڈاکٹر گہرا کر ٹریٹمنٹ دیں گی۔ چلو چل کر ان سے بات کرتے ہیں جو محبت و توجہ ہم سے ملے گی، وہ یہاں کہاں مل سکتی ہے منال کو۔ بہت محبت کی ضرورت ہے اب، اگر میں کہوں کچھ تو تمہیں برا لگے گا مگر حقیقت یہی ہے عزہ نے میری پھول جیسی بیٹی کی رتی بھر قدر نہیں کی۔“

وہ کمرے سے نکل کر راہ داری سے گزر رہے تھے۔ ڈاکٹر نیلور کے پاس جانے کے لیے، قاتلہ جگم کے لہجے میں نرمی و تاسف تھا۔

”آپ ہر بار بابا کو ہی کیوں موردِ اعتراض ٹھہراتی ہیں..... اس میں کہیں نہ کہیں غلطی ماما کی بھی ہوگی۔“

اس بار اس کے انداز میں سختی و تڑپ کے بجائے سچائی جاننے کی تڑپ تھی، قاتلہ نے مزہ کر بڑی گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... مگر تائمن، سختی اسے سزا ملی اور مل رہی ہے۔“

”ماما اور بابا کے درمیان کیا ہوا تھا؟“

یہ معلوم کس طرح اس کے منہ سے یہ سوال نکل گیا اور قاتلہ جگم تو اندر ہی اندر فرط مسرت سے جھوم اٹھی تھیں، یکلفت ہی انہیں لگا بدلتوں بعد ان کے نصیب جاگ اٹھے ہیں۔ ہر کام، ہر بات ان کے حق میں ہو رہی تھی۔ کامیابیاں ان کے مقدر میں لکھی جا چکی تھیں۔

”برداشت کر سکو گے اس سچائی کو؟ اس حقیقت کو؟“

”جی..... ایک عمر کا سزا ہی شے پر سوار ہو کر کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے آئی پراسیو، میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی، جو ہم پر گزری، تمہاری نانو اور ماما کے ساتھ جو ہوا سب بتاؤں گی۔“

نانو کے غم زدہ انداز پر لڑا والٹون کے ماتھے پر ہلکتوں کے جال بن گئے۔

☆.....☆.....☆

پھولوں میں حسین گلاب ہے  
 پڑھنے کے لیے ضروری کتاب ہے  
 دنیا میں ہر سوال کا جواب ہے  
 گر کوئی مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھے  
 تو کہوں گا..... لا جواب ہے

بہت عرصے بعد ہریرہ اپنے مولیٰ میں آیا تھا۔ کمرے سے نکلتی حدیرین کو دیکھ کر وہ اپنے مخصوص اسٹائل میں منگنا آیا تھا۔  
 ”بڑے فریٹ دکھائی دے رہے ہو، بڑی خوشی ہے، ایگزاسٹ سے فری ہوئے کی؟“ وہ جو مولیٰ کے پاس جانے کے لیے کمرے سے نکلی تھی، اسے اپنی راہ میں بڑے استحقاق سے حائل دیکھ کر سنجیدگی سے گویا ہوئی۔  
 ”آف کورس..... کسے خوشی نہیں ہوتی اس جھنجھٹ سے آزاد ہونے کی۔“  
 ”اوہ..... اب کیا ارادے ہیں؟“ وہ قصداً مسکرائی۔  
 ”ارادے..... تو بڑے نیک ہیں اگر تم ساتھ دو تو حریز اور نیکیاں سینٹ سکتا ہوں“ وہ قدرے اس کی آنکھوں میں جھانکتا گیا تھا۔  
 ”خاموش؟“ اس نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔

”شادی سے بڑھ کر نیک کام کیا ہو سکتا ہے، ایک ہار یہ نیکی ہو جائے تو یہ ٹھیک سوچو۔“ وہ قصداً اس سے دور ہٹا تھا۔  
 ”ہر سال نیکی..... سال کے سال نیکیاں..... بلکہ کبھی جڑواں بھی نیکیاں آجاتی ہیں بلکہ..... بلکہ کبھی کبھی تو تیرا بھی.....“  
 ”اوہ شٹ یور ماؤتھ ایڈیٹ!“ وہ چیختی ہوئی وہاں کوئی ایسا چیز ڈھونڈنے لگی جو باسانی اسے سمجھ کر ماری جاسکے مگر وہاں مٹی پلائٹ ہماری نگلوں میں آویزاں تھے جنہیں اٹھانا اس کے بس کی بات تھی۔  
 ”میں..... تمہیں جان سے مار دوں گی۔“ وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی مگر وہ اس کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا، لمحوں میں ہوا ہو گیا تھا۔  
 ”کیا ہوا؟ اس قدر ہانپ کیوں رہی ہو؟“

مولیٰ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استعجابیہ لہجے میں پوچھا۔  
 ”وہ ہریرہ ہی ہے..... بعض اوقات اس قدر چپ مذاق کرتا ہے، برداشت کرنا امپاٹیل ہو جاتا ہے۔“  
 وہ قریب بیٹھتے ہوئے منہ بنا کر گویا ہوئیں، مولیٰ مسکرا دی تھی۔  
 ”وہ مذاق کرتے ہیں تم سے اور تم میری ہو جاتی ہو۔“

”ہوں..... شاید میرے انڈر سٹنس آف جو مگر کمزور پڑتا جا رہا ہے۔“ اس کے اعتماد سے عاری لہجے پر مولیٰ نے اس کی طرف خلوس بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ آف وحاسٹ پر ملٹی ایمر ایڈری والے سوٹ میں اس کی شگاف اسکن میں اندرونی ٹوٹ پھوٹ،

جذبول کی ہلکت و ریخت کی ادا سیاں بھری اس کے کلوٹی خُسن کو کھرا انگیزہ ملا بخش رہی تھیں۔ وہ اس وقت لان کے قطعی حصے میں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔

اکتوبر کے اوائل دن اپنے بہروں میں خشکی لیے ہوئے نمودار ہوئے تھے۔ آسمان صاف تھا، چاند بھی اپنے جمرٹ میں مدغم مدغم ٹھناتے ہوئے ستارے لیے نمودار تھا، وہاں ترتیب سے لگائے گئے پھولوں کے پودوں سے ٹھنڈی ہوائیں مغلطھیں، دھیرے دھیرے پلتی ہوئی ہوا احساسات کو گدگداتی تھی، دل و دماغ کو تر دنازہ کر دیتی تھی۔

”میں تم سے بار بار کہتی ہوں اور اب بھی کہہ رہی ہوں، سر بیچڑ کر دو، ہم دوسروں سے جیت سکتے ہیں مگر خود سے، اپنے آپ سے جیتنا ناممکن ہے، مان لو، کچھ جاؤ اپنے دل کی بات کہ..... تم ڈوالٹون بھائی سے پیار کرنے لگی ہو“۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر گویا ہوئی۔

”مول..... ا“ مول کے ہاتھ میں دبا اس کا ہاتھ کانپ اٹھا، اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ پھینکا تھا۔ ہوش کانپ کر رہ گئے۔

”زبان کے اقرار سے زیادہ طاقت ہمارے اندر کے اقرار کی ہوتی ہے، کبھی اقرار کی۔ جب دل نے بہت خاموشی سے اقرار و اثبات کے مرحلے طے کر لیے تو جذبات و احساسات کے آگے میں شکستہ پا ہوتی چلی گئی“۔

”پھر اس قدر چمردو، مشغول و اداس کیوں رہنے لگی ہو؟ سنا ہے محبت تو وہ خوش رنگ بہا رہے جو خزاؤں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے، دیرانوں کو گلستاں بنا دیتی ہے، جس کی لگن سے چہروں میں پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ بہت عام سا چہرہ بھی حسین ہو جاتا ہے مگر..... تمہارے ساتھ تو معاملہ ہی طیغہ ہے“۔

مول اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی، چاند کا کس ان لحوں میں اس کے صبحی چہرے پر پڑ رہا تھا۔ چاندنی کے مدغم خبار میں اس کے چہرے کے نقوش سے عجیب سی مفہوم کیفیت عیاں تھی۔

”ہاں..... بالکل درست تجزیہ کیا تم نے“۔

خود رین نے گہری سانس لے کر سرکری کی بیک سے لگا دیا۔

”اس کا مطلب ہے تم ابھی تک دو کشتیوں کی سوار ہو؟“

”نہیں..... ایسا تو..... نہیں ہے“۔

”پھر کیا، لہجمن بھری بے باقتاری؟ بے سکون اعتبار کے معنی؟“

”یہی لہجمن، یہی کیفیت مجھے نہیں کیے ہوئے ہے“۔ وہ مضطرب سے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، اس کی خوب صورت آنکھوں میں اضطراب ہلکورے لیتا تھا۔

”میں جب بھی اُس کے بارے میں سوچتی ہوں..... کوئی نا دید شے رکاوٹ بن جاتی ہے، گویا کوئی مجھے اس کی طرف بڑھنے سے روک رہا ہو، میں جتنا اس کی طرف بڑھتا چاہتی ہوں، سوچتا چاہتی ہوں، اتنی شدت سے اس سے دور رہنے کی، اس سے چھپ جانے

کی تڑپ بھی میرے اندر سے محترک ہونے لگتی ہے، بتاؤ اب میں کیا کروں؟ میرا دل ہی جب ڈبل کر اس کرنے لگے تو۔

”ڈونٹ وری یار.....! پریشان مت ہو، یہ کوئی ایسی پریشان ہونے والی بات نہیں ہے۔ اچھے نکلے تمہارے اور ڈونٹون بھائی کے درمیان جو لاگ ٹائم رسکشی ہوتی ہے، یہ اسی کا رزلٹ ہے، کل جو تم نے ان سے براہ رویہ اختیار کیا ہے، اس کی ایک سیو ڈکرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آج سارا دن لڑائی کرتی رہی ہوں مگر وہ صاحب تو اکڑ رہے ہیں۔“

”ان کا رائٹ ہے تم نے زیادتی بھی بہت کی ہے۔“

☆.....☆.....☆

خوابشیں کیا ہیں.....؟

ایک کبھی سمجھ میں نہ آنے والا سوال اب کبھی حل نہ ہونے والا مسما

خوابشیں!

آرزوئیں!

تمنائیں!

جن کے حصول کے لیے حیات کے طویل دن و رات بھی کم لگتے ہیں تو کبھی یہ زبردست آ کر بھی اپنے معنی کو پہنچتی ہیں۔

خوابشیں درحقیقت اس خوش رنگ، خوب صورت تخیلیوں کی طرح ہیں جو آپ سے آگے آگے، اوپر ہی اوپر پرواز کرتی ہیں تو دسترس سے باہر ہونے کے باعث پُرکشش دکھائی دیتی ہیں اور آپ ان کے حصول کے لیے دیوانہ وار دوڑ لگا دیتے ہیں، جب بے حد جدوجہد، بے انتہا مشکلات اٹھانے کے بعد تلی کو پکلا لیتے ہیں تو اس کے تمام کپے رنگ آپ کے ہاتھوں میں سمٹ آتے ہیں پھر وہ..... خوب صورتی، کشش و دلکشی لہجوں میں زائل ہو جاتی ہے اور آپ سوچتے ہیں ماس تلی کا ہاتھ نہ آتا ہی بہتر تھا۔

کرن ٹیرس پر کھڑی بیٹھے بہت خوب صورتی سے سنوارے گئے لان کو دیکھ رہی تھیں۔ بہترین ترین و آرائش نے اس گھر کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اُس صاحب نے فل ڈیکور ٹیڈ بھی کروا دیا تھا۔ چند دنوں میں وہ یہاں شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ بڑے سرور سے انداز میں ٹیرس کی چائپ آئے تھے مگر اُس چہرہ بیٹگی ہوئی آنکھیں کرن کی انہیں سجدہ کر گئی تھیں۔

”کیا سوچا چار ہا ہے؟“ وہ ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوئے۔

”کچھ نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر وہیں چہیز پر بیٹھ گئیں۔

”کچھ نہیں..... بہت خاص سوچا چار ہا تھا، اتنا خاص کہ تمہیں یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ تم دو گھنٹے سے ایک ہی جگہ کھڑی تھیں۔“

”اچھا..... آپ دور دور سے جا کر لے رہے تھے؟“ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں۔



”آف کورس، کچھ عرصے بعد ہم لوگ یہاں شفٹ ہو جائیں گے، کیا تب بھی تمہاری سبھی ٹیمنگو، سبھی رویہ ہے گا؟“

اس صاحب از حد سنجیدہ تھے، کرن نے چائٹچی لگا ہوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں نگلی آمیز سنجیدگی تھی۔ محبت بھری رفاقت کے دوران بہت ہی کم انہوں نے ان کے چہرے پر ایسی سنجیدگی دیکھی تھی، ورنہ وہ انہیں ہر دم ہی ہشاش بشاش، خوش و خرم دکھائی دیتے تھے، خود بھی زندگی انجوائے کرتے تھے اور انہیں بھی حتی المقدور خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ ماضی میں انہوں نے محبت کی تھی، ایک ناکام محبت یا محبت کے نام پر دھوکا کھایا تھا مگر کرن سے شادی کے بعد انہوں نے بلند ظرفی و وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اتنی محبت، چاہت و اپنائیت دی تھی کہ چھوڑتوں و چاہتوں پر سے اظہار رکھو بیٹھی تھی۔ از سر نو اظہار و احسان ان کی محبتوں کی بدولت حاصل کر پائی تھیں۔

ایسے بے غلوس و بے لوث حسین ساتھی کی ناراضی کی وہ تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے اور ان کے درمیان کوئی رنجش نہیں چاہتی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا، یہ تو وقت کی گرد ہے، جب آڑتی ہے تو لگا ہوں کو نمناک کر دیتی ہے۔ ماضی اور حال کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ حال کے ہر موڈ پر ماضی مجسم ہوتا ہے ہم اس سے دامن چھڑانا بھی چاہیں تو نہ چھڑا پائیں گے۔“

”دامن چھڑانا طلعہ بات ہے، دامن بھگونا طلعہ۔ ماضی یاد رکھنا اچھی بات ہے مگر ماضی پرستی اس حد تک ہو کہ وہ حال پر حاوی

ہو کر تمام خوشیوں و مسرتوں کو بدلتا کر دے، یہ کہاں کی دانش مندی ہے یا؟“

اس صاحب کے چہرے سے شکل جھلکتی تھی، مگر لہجہ نرم ہی تھا۔

”ہرٹ ہو رہے ہیں آپ! آئی ایم سوری، میں کوشش کروں گی، ایسا پھر کبھی نہیں ہوگا۔“

کرن نے ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو بے ساختہ ان کے لبوں پر تبسم پھیل گیا تھا۔

”اوکے، میں نے اعتبار کیا۔“

انہوں نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

”آپ کبھی مجھ سے ناراض مت ہوئیے گا۔“

”ہوں..... آپ کبھی رنجیدہ مت ہونا۔“

وہ شوخ لگا ہوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

”میں سوچتی ہوں، وقت آ گیا ہے کہ ہمیں حورین کو وہ سب بتا دینا چاہیے جو اب تک ہم اس سے چھپاتے آئے ہیں۔“

”ہاں..... میں بھی سبھی چاہتا ہوں، یہاں شفٹ ہونے سے قبل حورین ہر بات سے واقف ہو۔“

☆.....☆.....☆

جامعہ میں دو گروہس کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے باعث یونیورسٹی بند کر دی گئی تھی۔ حورین جو ڈوائون سے معذرت

کرنا چاہ رہی تھی، یونیورسٹی بند ہونے کی وجہ سے بدول ہو کر رہ گئی۔ ایسے میں پروفیسر آفتاب کی جانب سے ٹی پارٹی کی دعوت اسے بے حد

مسرور کر گئی کہ جانتی تھی وہاں وہ کشمور شخص ضرور آئے گا۔ پھر حیدر کی جانب سے ملنے والی حوصلہ افزائی بھی اسے حاصل تھی۔ سر کی طرف سے دی جانے والی پارٹی کی دعوت سے قبل ہی موٹل اور زویا اپنی کزن کی برتھ ڈے پارٹی میں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ سر سے انہوں نے معذرت کر لی تھی۔

جبکہ وہ خوشی خوشی تیار ہونے لگی تھی۔ سرخ ودھانی کٹر کے کنٹراسٹ سوٹ پر سنہری ستارے و موتیوں کا فینسی ورک تھا جو اس کی شگاف رنگت پر بے حد مکمل رہا تھا، روپی کے نازک سے جیولری سیٹ کی تمام جگہ گاہٹ اس کے حسین چہرے پر در آئی تھی۔ اس کی ڈارک براؤن خوب صورت آنکھوں میں آکاش کے ستاروں کی روشنیاں مست آئی تھی، کچھ سنگلی بالوں کو اس نے یونہی پشت پر کھلا چھوڑ دیا تھا۔

”آج سے قبل تو کبھی اس طرح تم نے خود کو نہیں سنوارا، بار بار آئینہ نہیں دیکھا..... یہ لباس ایسے جیولری ایسکی بیچنگ آج سے پہلے تو نہیں کی..... کیا یہ سب اس شخص کے لیے ہے؟ جس کو تم ابھی تک کوئی ایسی حیثیت نہ دے پائی ہو کہ جس کے حوالے سے اس طرح تیار ہو سکو۔“

لب اسٹک کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ یک دم زک گیا، اپنے اندر سے آئی اس طہریہ آواز سے وہ سراسیمہ ہو گئی تھی۔

”مم..... میں اسی طرح تیار ہوتی ہوں اور..... اور میری شاپنگ مارتی ہیں، وہ ہمیشہ سے ہر چیز بیچنگ کی لانے کی عادی ہیں، آج کوئی امیژنگ بات نہیں ہے۔“ اس نے خود کو جھٹلایا۔

”تم..... اپنے آپ سے جھوٹ بول رہی ہو؟ جانتی ہو انسان سب سے جھوٹ بول سکتا ہے مگر خود سے نہیں۔“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پڑے گی؟ میں کیوں جھوٹ بولوں؟“

”اچھا..... اچھا اقرار کرو، تم ڈوٹلون کے لیے تیار ہوئی ہو تم اسے امپریس کرنا چاہتی ہو تم چاہتی ہو، وہ تمہیں دیکھے اور۔“

”شٹ آپ، ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ ڈرینگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے خود کے عکس کو دیکھ کر چینی تھی، جواہا اس کے اندر کسی گوشے میں استہوا سیہ لمبی کی جھنکاریں دور دور تک گونجتی چلی گئی تھیں، وہ تھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

ور آئینہ نظر آتے اپنے عکس سے وہ نکالیں لانے کے قابل کہاں رہی تھی۔ یہ سچ تھا آج سے قبل اس کی ڈرینگ میں اس طرح جذبوں کی رعنائی، احساسات کی اُمتگ، نئی ٹوبلی اُمیدوں کی ترنگ کیا کچھ شامل نہ تھا، پہلی بار خود کو چانے سنوارنے کی خواہش بے ساختہ ہی پیدا ہوئی تھی، اگر اس کے اندر کی وہ آواز طرز کرتی تو وہ ان کا سٹیکس کا بھی استعمال کر لیتی جن کو کسی چھوٹا بھی نہ تھا، جڑ زیادہ تر زویا، موٹل وغیرہ کے استعمال میں رہتی تھیں۔

”واپسی کب تک ہوگی حورا؟“ کرن اندر آ کر گویا ہوئیں۔

”معلوم نہیں ماما شاید زیادہ دیر نہ ہو، ٹی پارٹی ہے، جلد ہی ختم ہو جائے گی، آپ کو کوئی کام ہے کیا؟“

”کام تو نہیں، بس ایسے ہی دل چاہ رہا ہے ہم ماں بیٹی بہت ساری باتیں کریں۔ ٹی پرانی بالکل بیسٹ فرینڈز کی طرح، ہم دوست ہو سکتے ہیں نا بہت اچھی فرینڈز؟“ کرن اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھمکے لہجے میں کہہ رہی تھیں، اس سے ان کی نگاہوں میں، لہجے

میں، اعزاز میں، نامعلوم کیا تھا کہ حورین کو وہ بہت بڑا سرا اور ابھی ابھی ہی محسوس ہوئی تھی۔ بہت تھا۔  
بہت ڈکی۔

بہت غم زدہ۔

”شیور..... آف کورس ماما ہم ہیٹ فرینڈز ہیں۔“ وہ بڑی محبت سے ان سے لپٹے ہوئے بولی تھی۔

”جھینکس مائی گاڈ ایچ جھینکس مائی ڈیٹرا“ انہوں نے فرط محبت سے اس کی بیٹھائی چومتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتی ماما سر سے ایک سکیج ذکر لوں گی۔“ اس نے محسوس کیا سو بر، کم گو، ڈوری ابھی ہی رہنے والی اس کی ماما کو اس کی کہنی کی ضرورت ہے، وہ بے حد مضطرب و افسردہ نظر آ رہی تھیں۔ ان کے اعزاز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو وہ دل کی سرخوشی کو نظر انداز کر کے پارٹی میں نہ جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

”ارے نہیں بیٹا! باتیں تو ہوتی رہیں گی، آپ پارٹی میں نہ کریں، بہت کیوٹ لگ رہی ہو۔“

انہوں نے اس کی جانب پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ گھبرا سی گئی۔ اسے محسوس ہوا ماما نے اس کی چھری پکڑ لیا ہے۔

”میں..... جلدی آ جاؤں گی۔“ وہ زور سے تھی۔

”نہیں..... پارٹی کے ختم ہونے پر ہی آئیے گا۔“

اس کے دل کی دگرگوں حالت سے بے خبر وہ محبت سے کہہ رہی تھی۔ لمبے بھر کو اسے خود پر حیرت ہوئی کہ وہ کس طرح خانک تھی کہ کہیں ماما اس کے دل کا حال سمجھ تو نہ گئیں؟

محبت بھی کیسے کیسے تر بے کھاتی ہے، چالاک دھماکا بنا دیتی ہے۔ انسان خود ہی وہ کام کرنے لگتا ہے جس سے ناواقف ہوتا ہے۔ ان دنوں وہ اپنے احساسات کا موازنہ کر رہی تھی۔

حسب عادت پرو فیسر آفتاب نے ہر تپاک استقبال کیا تھا۔ سب لوگ آپکے شے جن میں کچھ دوسرے ڈپارٹمنٹس کے طلباء کے علاوہ ان کے قریبی دوست و کونیکٹڈز شامل تھے۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اس کی ساتھیوں میں موٹل، زوڈیا پیلے ہی دوسری پارٹی میں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں روادار مہرین کو بھی موجود نہ دیکھ کر اسے تنہائی کا احساس ہوا تھا اور یہ احساس چند لمبے ہی رہا تھا کیونکہ سر آفتاب نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔ وسیع حال میں کہا گئی تھی۔ زیادہ تر مردوں کے ساتھ ان کی بیگمات بھی شریک تھیں۔ سو اس محفل میں خوشگوار سی رنگینی اچھی لگ رہی تھی۔ سر آفتاب کسی مہمان کے بلانے پر اس جانب بڑھے تو وہ ایک طرف کھڑی ہو گئی اور اس کی حلاشی نگاہیں ان لوگوں سے ملنے ملاتے ڈواٹون پر تھیں۔

لائٹ جینز و آف وہائٹ شرٹ میں اس کی دراز پر سٹائلی نمایاں تھی۔ وہ کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی، اس کی اثر بیکٹیو پر سٹائلی میں عجیب و گاروشا ہانہ پن تھا۔ لاپرواہی و بے نیازی اس کے ہر اعزاز سے میاں تھی، وجہ یہ چہرے پر سنجیدہ و دھیمی سی مسکراہٹ تھی جو اس کے

چہرے کو روشن کیے ہوئے تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے میں ہمدردی رہنے والے حزن و ملال کی سرخی اس کے کسی المناک ڈکھ کو ظاہر کرتی تھی۔

”ایسا کیا ڈکھ ہو سکتا ہے اس شخص کو؟ بھلا اس شخص کو بھی کوئی ڈکھ، کوئی غم چھو سکتا ہے جو دوسروں کے ڈکھ سمیٹ لیتا ہے، جو ہر طرح سے مکمل و آسودہ دکھائی دیتا ہے۔“ وہ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کی موجودگی سے پوری طرح باخبر تھا اور کی بار بار اپنی نگاہ اس پر ڈال کر انجان بن گیا تھا، اس کے ہر انداز سے شکل و ناراضی ظاہر تھی۔

”السلام علیکم“ حیدر نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔

”آپ کی وہ کرانا کاتین نہیں آئیں؟“

”ہاں، تمہارے پارٹی میں لگی ہیں۔“

”اچھی بات ہے، آپ یہاں آگئیں اور نہ پارٹی بے رونق رہتی، ذوالنون سے ملی ہیں آپ؟“ وہ شوخ انداز میں گویا ہوا۔ حورین نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کی خاموشی سے وہ سمجھ گیا اور کچھ کہے بنا وہاں سے چلا گیا۔ چند لمحوں بعد آیا تو ذوالنون ساتھ تھا۔

”کچھ لایا ہوں آپ کے محرم کو، اب کوئی سخت مزاجیجے گا۔“ حورین اسے سامنے دیکھ کر بری طرح کٹھنوز ہو گئی تھی۔

”تمہاری گردن میں تو کلف لگا رہتا ہے براہ کرم اب اس سے نجات پا لو تو بہت اچھا ہے، کیونکہ اب تم..... تم تنہا نہیں ہو۔“

”اوکے، فاروا ٹھیکس ایڈوائز یو کیمن گو۔“

”وہاٹ؟ ذرا پھر سے کہنا۔“

”یہاں سے جانے کا کیا لوگے؟“

ذوالنون کے انداز میں سمجھتی تھی لیکن آنکھیں مسکراتی تھیں۔

”اچھا..... بیٹا یہ بات ہے، وقت نکلتے ہی دوست کہاں میں ہڈی لگنے لگا..... یاد رکھنا ابھی بہت سے کام پڑیں گے۔“

حیدر معصومی غصہ جماڑتا ہوا چلا گیا۔ ذوالنون کے سرخی مائل لبوں پر پھر پور مسکراہٹ تھی وہ حیدر کو جانتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔

وہ میز کے قریب کھڑے تھے، مہمان ان سے خاصے قافلے پر تھے، یہاں آنے والے مہمانوں کی اکثریت باہر سے تعلق رکھتی

تھی اور جامد سے آنے والے طلباء سے اس کی صرف ملکہ ملکہ تھی، اس لیے وہ اطمینان سے اس کے روبرو کھڑا تھا کہ ابھی ماسوائے حیدر

کے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ ان دو مخالفت مست میں چلنے والوں کی راہ ایک ہو گئی ہے، جو اب اسے معلوم تھا کھنچائی بھی صحیح ہوگی، جب انہیں

معلوم ہوگا ابھی اتفاقاً ہی ان میں سے کوئی بھی نہ تھا، سو وہ بے فکر تھا۔

”آپ نے حیدر کو ناراض کر دیا۔“

”ابھی آجائے گا، میرے ہنیر سے رہنے کی عادت نہیں ہے۔ اپنی بات کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ حورین اضطراری انداز میں اپنی

خزوشی انگلیوں کو حرکت دے رہی تھی، اسے کچھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس دن کے اپنے ناروا رویے کی معافی مانگے۔ ذہن انگلیوں کو ترتیب دیتا پھر اسی لمحے انہیں رو کر دیتا۔

ذوالنون بڑی گہری لگا ہوں سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا، گلابی رخساروں پر اٹھتی مگر تیزی سے سیاہ دراز پلوں کی جھلریں، ستواں ناک، گلابی دل کش ہونٹ، متناسب سراپا، وہ حسنِ رعنائی کا مرقع تھی۔

”کیا اسی حسن سے تمہارے چنانوں جیسے جذبوں نے چوٹ کھائی ہے؟ کیا یہ شباب ایسا ہی عمر انگیز ہے جو تمہیں عقل و خرد سے بیگانہ کر گیا ہے؟“ اس کے اندر کسی نے چوٹ کی تھی۔

”حسن و شباب ان کی کمزوری ہوتا ہے جو محبت میں نہیں، ہوس میں جھلا ہوتے ہیں جن کے تعلقات چاہت و احترام کے جذبوں سے مرہوم نہیں ہوتے، بلکہ ان گھلیا جذبوں میں انسانی خواہشات کی آرائش شامل ہوتی ہے۔ حسن کبھی محبت کی بنیاد نہیں ہوتا۔“ یہ تعلق تو دل سے ہوتا ہے۔ دل کی آنکھوں سے اپنی چاہت کا چہرہ بد صورت ہو کر بھی سب سے حسین نظر آتا ہے۔“ خمیر کے چرے کے پر اس نے سرو سانس بھر کر حورین کے چہرے سے لگا ہی ہٹاتے ہوئے اندر سے اٹھنے والے سوالوں کو جواب دیے تھے۔

”حیدر کہہ رہا تھا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔“

خاموشی کو محیط دیکھ کر بالآخر اسے ہی مکمل کرنا پڑی۔

”میں..... میں ا“ وہ سخت پزل تھی۔

”ٹیک۔ اٹ ایزی، ایسی کیا بات ہے جو آپ کئی روز ہو رہی ہیں۔“ ذوالنون نے قصداً لہجے میں اپنائیت و نرمی سموتے ہوئے کہا۔

”میں..... دراصل آپ سے ایک سکیورز کرنا چاہتی ہوں..... اس دن میں نے آپ کی انسلٹ کی، آپ کو شیز کیا، ہرٹ کیا، میں بہت ناام ہوں، میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ معلوم اس وقت مجھے کیا ہوا تھا، بلا سوچے سمجھے میں وہ پیلوڈ زیورڈ کرٹھی، کیا آپ مجھے معاف کر سکیں گے؟“

اس کا دھیمالہ شرمندگی، تاسف، ندامت سے بوجھل تھا۔ ذوالنون چند لمحے توقف کے بعد گویا ہوا۔

”گو کہ آپ کی بے اعتمادی و بے اہتباری نے میری غیرت، انا، کردار پر بہت کاری ضرر میں لگائی تھی کہ اگر کوئی اور ہوتا تو میں اسے ہرگز معاف نہیں کرتا..... لیکن.....“

”لیکن؟“ حورین نے اس کی سنجیدگی سے گہرا کر کہا۔

”ہوں..... آپ کی بات دوسری ہے اس دن میں نے اسی دن آپ کو معاف کر دیا تھا۔“ اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

حورین کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ اُبھری تھی۔

”پھر دوسرے دن یونیورسٹی میں کیوں ناراض ناراض محسوس ہوا ہے تھے، اس دن کتنی کوشش کی تھی، بات کرنے کی۔“

پہلی بار حورین نے اس سے بے تکلفی سے بات کی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے گا بگا ہے اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔  
 ”آپ نے اتنا ہرٹ کیا تھا تو میزڈ بہت تو میرا بھی رائٹ ہے آپ کو ستانے کا۔“ سرت و شادمانی اس کے آنکھوں سے عیاں تھی۔  
 ”اس کا مطلب ہے آپ نے بدلہ لے لیا ہے۔“

”بدلہ نہیں، تہذیب کی تھی۔“

”تہذیب.....! کیسی تہذیب؟“ وہ متحجب ہوئی۔

”اس طرح ملاقات کی۔“

دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

کوئین آج پرنس ٹور پر روانہ ہو چکا تھا۔

حالانکہ اس کی ضرورت تو نہ تھی مگر ماں کی ٹینشن کے خیال سے وہ جانے پر مجبور ہوا تھا۔ مثال جیکم پچھلے کئی ہفتوں سے میڈریسٹ پر تھی، وہ جو کیمیل کہلاتا چاہتی تھی، اس کا آقا زائیں نے اسی دن سے کر دیا تھا، جب انہوں نے اس کو حورین کے ہمراہ یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ اس حقیقت سے وہ پہلے سے ہی واقف تھی۔ بخوبی جانتی تھی وہ اس وکرن کی اکلوتی بیٹی ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد انہوں نے انتقام کی آگ میں جلنے و جود کو راحت پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ کرن و انس کی بیٹی کو ایسی دک پہنچائیں گی کہ وہ کبھی بھول نہ پائیں گے، اس بار نصیب ان کے ساتھ تھا، ان کا ہر راستہ کامیابی و کامرانی کی جانب جارہا تھا جس سے وہ بے حد خوش تھی۔

”حریہ کب تک پیار بننے کا ارادہ ہے؟“

فائلڈ جیکم مسکراتی ہوئی غائب ہوئی تھی۔

”اوہ ماما.....! میں سخت بوری ہو گئی ہوں، میڈ پر پڑے پڑے رنگی ایبٹیل ہونے لگا ہے جیسے میں جگ جگ پیار ہوں۔“

وہ منہ بنا کر گویا ہوئی تھی۔

”بس.....! اب اوپننگ کر دو ڈیر! آپ کو کوئین سے خطرہ تھا، وہ چاچکا ہے، اس کی آمد سے قبل ہمیں اپنا مشن کمپلیٹ کرنا ہے۔“

”آف کورس ماما مجھے معلوم ہے، وہ ایک ایک اینڈ بھی مشکل ر کے گا۔“

”میں کہتی ہوں، آج سے ہی آپ شروع ہو جائیں۔“

وہ ہال سمیٹی ہوئی بڑے بڑے خوش انداز میں اٹھ کر بیٹھی تھی۔ فائلڈ بھی اسی انداز میں ان کے قریب بیڈ پر چڑھ بیٹھی تھی۔

سر جوڑے وہ بڑے بڑے امرار انداز میں گٹھ جوڑ کرنے لگی تھی، جب شیطان منسوبے بنتے ہیں، انسان خمیر و احساس کی پرواہ کرنا چھوڑ دیتا ہے تو جی سے بڑی برائی اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ خمیر و نیک شعور کی روشنیوں سے وہ نابلدہ نفس و مٹا ہونے کے

اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھیں، پھر مزید اچھا یہ تھی کہ انتقام، بے مزتی، حسد و کینہ و طبیعت نے انہیں بے حس و کالم بنا ڈالا تھا۔ انہیں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے کافی وقت گزر گیا تھا وہ پوری پلاننگ کر چکی تھیں۔ انہیں یہ بھی ایک کھیل اب اسٹارٹ کرنا تھا۔ انہیں انتظار تھا۔ ذوالنون کے آنے کا، ان کی بساط کا اہم مہرہ وہی تو تھا۔ وہ بے حد مسرور، ازخوش کی رنگ انگلی پر گھماتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ گرے آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔ اس کے ایک ایک سے سرت پھوٹ رہی تھی وہ خوش ہوتا کیوں نہیں؟ حیات کے سفر میں اس نے جھلپتے، پتے محرومیوں و ناامیدیوں کے درمیان میں وقت گزارا تھا۔ بہت انتظار کے بعد وہ ریگستان سے نکلستان میں آیا تھا۔

حورین کی محبت نکلستان کی مانند ہی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں والی، ٹھنڈے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے جھٹے کی طرح۔ پروفیسر آفتاب کی ٹی پارٹی اس کے لیے بڑی نگی ثابت ہوئی تھی۔ دنیا جہاں کی دولت گویا حورین کے ساتھ کی صورت میں اسے مل گئی تھی پہلی بار آج انہوں نے وہ برہنہ کر محبت ساری باتیں کی تھیں گو کہ وہ باتیں ان کے اپنے مطالبات نہیں تھیں۔

مگر اسے حورین کو سنا اچھا لگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جتنی خوبصورت وہ خود ہے اتنی شیریں اس کی آواز بھی ہے۔

مدد بھری۔

رس بھری۔

چادو بھری۔

ذہن و قلب کا نوکھاسرور بخششی دلآویز آواز۔

اقرار محبت دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا تھا مگر آگہ تھے کچھ لفظ ایسے ہوتے ہیں جو زبان سے نہیں جزیوں سے مہاں ہوتے ہیں۔ احساسات سے مہاں ہوتے ہیں، یہ وہ زبان ہے جو نکلنا ہوں سے بولی جاتی ہے دل اس کو پا آسانی سنتے ہیں۔ اس کے دل نے بھی سن لیا تھا اس کے دل کا اقرار..... اس کی جھلکی جھلکی لگا ہیں۔ شرمایا لجا یا انماز۔

اس کے جذبوں کو دیر پائی کی حد تک شدید عطا کر گیا تھا اور اسے لگ رہا تھا حورین کا حصول ہی پہلی اور آخری تمنا ہے۔ وہ راتے بھر سوچتا آیا تھا۔ کل ہی نا تو اور ماما کو لے کر وہ حورین کے ہاں جائے گا ساتھ پروفیسر آفتاب کو بھی لے گا۔ اسے یقین و اٹن تھا حورین کے بغیر جس اسے انکار نہیں کریں گے۔

بچی سوچتا ہوا وہ کوریڈور عبور کر کے ماما کے کمرے کی طرف بڑھا ہاتھ بڑھا کر دروازہ ناک کرنا چاہا۔ دروازہ تھوڑا کھلا تھا ناک کرنے کے لیے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ اندر سے آتی ماما کی آواز نے اسے وہیں چادو ساکت کر ڈالا تھا۔

”میں نہیں چاہتی ماما..... امیری وجہ سے پرس کی خوشیاں برباد ہوں، پہلی بار میں نے اسے خوش دیکھا ہے اس کی خوشیوں کے لیے میں بیڈلت بھی اٹھانے کو تیار ہوں، آپ پرس کو کچھ مت بتائیے گا۔“

منال کے گلوگیر لہجے میں ایک ایسی التجا تھی جو اسے حوصلہ کر گئی تھی۔ ”پاکل مت بومثال اچ کبھی نہیں چھپتا آج نہیں توکل پرس کو یہ حقیقت ضرور معلوم ہوگی کہ حورین کے باپ نے کسی وقت میں اپنی عیاشی غلٹ کے باعث کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ آہ..... وہ یہ کیا سن رہا تھا؟ نالونے یہ کیا کہا تھا؟ اسے ایسا لگا جیسے اس کی سماعت میں دھماکے ہونے لگے ہوں۔

پلیز..... ماما او کانتوں بھرا وقت یاد مت دلائیں۔“

منال سسکیوں سے رونے لگی تھی۔ ڈوائٹون کی ڈاٹ زلے کی زد میں تھی اس کی نگاہوں میں وہ مٹ کر گوم گیا جب یونیورسٹی میں حورین کے چاٹس صاحب کو دیکھ کر ماما بے ہوش ہو گئی تھی اور جب سے آج تک وہ بیڈ پر ہی تھی۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ اسے قائم کرے کہ وہ حورین کے چاٹس کو دیکھ کر بے ہوش کیوں ہوئی تھی۔ اس وقت انہوں نے اسے بہلا دیا تھا اور وہ بھی بھول بیٹھا تھا۔ اب اس انکشاف نے اس کے دل و دماغ ہلا ڈالے تھے۔

”آپ ابھی تک بھول نہیں سکی ہیں بھلا کوئی ٹیک، پارما، پاک باز، عزت دار عورت اس بے عزتی کو کیسے بھول سکتی ہے جو اس ہوس زدہ شخص کی ہوس کا شکار ہو گئی ہو اس کے باوجود تم چاہتی ہو اس شخص کی بیٹی کو اس گھر میں راج کرنے کے لیے لانا چاہتی ہو۔“

”ماما.....! بات چیری نہیں ہے میں پرس کی خاطر سب برداشت کرنے کو تیار ہوں، جڑو مجھے چھوڑ کر چلے گئے میں نے برداشت کیا مگر پرس مجھے چھوڑ دے میں یہ برداشت نہیں کر پاؤں گی، مری جاؤں گی۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔

ڈوائٹون کی قوت برداشت جواب دے گی۔ سخت محوش انداز میں وہ بتانا کہ کیے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر منال ہکا بکا سی رہ گئیں جبکہ فائدہ بیگم کا اعزاز ساٹ تھا۔

”جو..... میں نے سنا وہ کیا ہے ماما؟“

وہ ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے گویا ہوا۔

”کچھ نہیں..... پرس، ہم..... ہم ایسے ہی بات کر رہے تھے۔“ انہوں نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر جتنی تکلیف نے وحشت سی پیدا کر دی تھی وہ دیکھنے اور نہ کہنے کی اذیت میں جھلا پریشان و بے یقین لگ رہا تھا۔

”پلیز..... میں سب سن چکا ہوں، غلط بیانی سے کام مت لیں۔“

”بھول جاؤ اپنی خوشیوں کے لیے بھول جاؤ حورین کی خاطر بھول جاؤ اسے پانے کے لیے آپ کو یہ باتیں بھولنی ہوں گی۔“

”وہ باتیں بھلانے کے لیے نہیں ہیں منال!“

فائدہ بیگم ہنسے سے گویا ہوئیں۔

”مئی اقرار گاڈسک، آپ خاموش رہیں، میں نے کہا تاں میں اپنے بیٹے کی خاطر سب بھلانے کو برداشت کرنے کو تیار ہوں۔“ ان کے دند سے ہونے لہجے میں شفقت ہی شفقت تھی۔



”پرنس! میں نے کہا تھا میں آپ سے ایک دن میں آپ کو بتاؤں گی، آج وہ وعدہ ایسا کرنے کا وقت آ گیا ہے جن لوگوں نے آپ کی اور ہماری زندگیوں کو برباد کر دیا ہے، وہ لوگوں نے ادا کیا ہے وہ جو عین کے پیرش ہیں۔“

”مہی..... مہی اسٹاپ اسٹاپ پلیز!“ مثال نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”نومانا! ان کو کہنے دیں، ورنہ میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی، میرا دل بند ہو جائے گا میں ایک ایک ورڈ سننا چاہتا ہوں۔“ ڈوائون وحشت و روحشت کا شکار تھا۔

”دل تمام کرن لو، کل کو مجھ پر انعام نہ آئے کہ میں نے حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود آپ کو لاپم رکھا کیونکہ سچائی ایک نہ ایک دن ظاہر ہو کر رہتی ہے اور اس سچائی کی روشنی میں اس کو فیصلہ کرنا ہے۔ جو عین کو اپنانے یا نہ اپنانے کا۔“

فائلنگیم کی شعلہ جانی شروع ہو گئی تھی۔ مثال بیگم گفتگوں میں چہرہ چمپا کر بیٹھ گئیں۔ گویا یہ سننا ان کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہے۔ فائلنگیم نے شروع سے آخر تک ساری کہانی اس کو سنائی۔ بہت چابکدستی سے انہوں نے کرداروں کا ہیر پھیر کر ڈالا تھا۔ نوشاہ بیگم کی ٹیک چلتی اپنے کھاتے میں ڈالی، کرن کی ساؤگی مثال کے روپ میں بھری، برہان صاحب کی بے راہ روی اور گلین حزامی انس صاحب کے اعزاز میں سو کر گفتگوں کے ایسے ایسے وار کیے تھے وہ جو زندگی سے زیادہ اہمیت سمیت وغیرت کو دیتا تھا ہر نقصان، ہر زیادتی سے بڑا احساس اسے اپنی ماں کی پامالی کا ہوا تھا جس سے اسے اپنے اندر ایک شدید آگ بھڑکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رگوں میں گویا انگارے سے دوڑنے لگے تھے۔ اس کی نگاہوں میں انس صاحب کا اسمارٹ ڈوسر برہا پاتا تھا۔ چہرے سے مہذب و پروقار شخص کا باطن، اصل چہرہ کس قدر غلیظ و بھیا تک تھا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”انس نے ہی ہماری حرمت پر دماغ نہیں لگا یا ہماری عزت کو پوری طرح داغدار کرنے کے لیے کرن نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ کرن میری اسٹیپ ڈائریز جس کو میں نے کبھی سونپا نہیں سمجھا مگر وہ اور اس کی لوز کیریکٹر ماں نے کبھی نہیں سکون سے نہیں رہنے دیا۔ ظاہر ہے ایک ایسی ماں کی بیٹی ٹیک ہو بھی کیسے سکتی تھی جو اپنی آوارگی و بد چلتی کے باعث کبھی اپنے مہذب کے ساتھ نہ رہ سکی۔ ساری عمر اس نے ان سے دور رہ کر گزاری کہ اس کی آزادانہ زندگی میں برہان مداخلت نہ کر سکیں وہی اعزاز بیٹی نے اپنائے، جڑ کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا کر ایسا پاگل بنا دیا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایسا گیا کہ پلٹ کر نہیں آیا اب فیصلہ کر لو بیٹا جو چاہو جو عین سے شادی کرنا۔“

”انس! اسپاٹل ایہ کبھی نہیں ہو سکتا، میں انہیں شوٹ کر دوں گا..... شوٹ کر دوں گا۔“

وہ کسی پھرے ہوئے سمندر کی طرح بے قابو ہو رہا تھا کیسی محبت؟ کہاں کی محبت؟ وہ سب بھول گیا کہ کچھ وقت قبل وہ کن سہانے سہنوں میں کھویا ہوا اس کرے کے دروازے تک آیا تھا، وہ ساری محبت سارے چہرے، تمام جنون دروازے کی اس طرف کھو گیا تھا یہاں اب ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا جو ماں کی تہاہ حال زندگی پر توجہ کتنا تھا۔ اپنے جذبوں پر اسے شرمندگی تھی، اپنے دل پر ندامت کہ وہ ایک ایسی عورت کی بیٹی سے محبت کرنے لگا تھا..... جس عورت سے بچپن سے نفرت کرتا آیا تھا۔ پہلے نہ اس کے نام سے واقف تھا، نہ چہرے



”ایسا باتیں مت سوچا کرو کرن! سونا آگ میں چب کر ہی کندہ بنتا ہے پھر اس جیسا میرا آدمی تمہارا نصیب بنا ہے۔ حرین جیسی لائق و خوب صورت بیٹی ہے۔ کیا یہ بکریم کا کم احسان ہے، لوگ تو تمنا کرتے ہیں ایسی بہترین زندگی کی..... کیا اس سے تمہیں کوئی شکایت ہے؟ اس کی چاہت میں کوئی کھوٹ پایا ہے؟“ ان کی طرف دیکھتے ہوئے پریشان کن لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں بی بی جان! اس بہت اچھے ہیں ان جیسا جیون ساتھی مجھے ملے گا، اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شاید وہ میری ماں کی ماگی لگی دعاؤں کا ثمر ہیں، ورنہ میں ان کے قائل نہیں تھی۔“ کرن کے لہجے میں اس کے لیے اتنی چاہت و احترام تھا جو ان کو مطمئن کر گیا تھا، وہ اطمینان سے گویا ہوئیں۔

”پھر کس بات کا ذکر ہے، یہاں یہی میں دینی ہم آہنگی، محبت و احترام کا رشتہ قائم رہے، زندگی جنت بن جاتی ہے۔ ایک چھت تلے رہنے سے رشتے مضبوط نہیں ہوتے، رشتوں کو مرہم کرنے کے لیے محبت، عزت، خلوص و حوصلے و استحصال کی ضرورت ہوتی ہے پھر عورت کا تو دوسرا نام ہی ایسا روقا قربانی ہے، ہنسی زیادہ ہم میں قوت ہوگی، اپنے فرائض کی ادائیگی و تحمل برداشت کی، اس قدر ہی گھر کے چمن کی چھلوری پھلتی پھولتی ہے۔“

”بی بی جان! میری بچی کوشش رہی ہے کہ فرائض کی ادائیگی میں مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہو، اس کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو اور ج تو یہ ہے کہ اس کو شکوے، شکایت کی عادت ہے بھی نہیں، وہ بے حد صابر و بلند ظرف ہیں۔“

”باشا! اللہ مرد کو ایسے ہی وصف بلند مرتبہ عطا کرتے ہیں۔ اس صورت و سیرت، ہر لحاظ سے عام مردوں سے مختلف ہیں۔“

”ان کی ہی فرمائش ہے، آپ ہمارے ساتھ رہیں گی۔“

”ارے خوش رہو، میں یہاں سے چلی گئی تو یہاں جو شیطانوں کا ٹولہ ہے، انہیں تو بچی آزاد مل جائے گی، شرارتوں کے لیے۔ میرا ان کے سر پر موجود رہنا ضروری ہے۔“ وہ پوری سچائی سے گویا ہوئی تھیں۔

”نہیں کوئی عذر نہیں چلے گا، آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہی ہوگا۔“

”اچھا اچھا..... دل برداشت کرو، ابھی تمہیں جانے میں وقت لگے گا۔ میں آتی جاتی رہوں گی۔“ وہ مخصوص انداز میں گویا ہوئیں۔

☆.....☆.....☆

یہ پیارا کارشتہ ٹوٹے نہ کبھی

اے میرے دوست جو مجھ سے زوٹھے نہ کبھی

کرتے ہیں رب سے ہر پہلے یہ دعا

دور رہ کر بھی اپنا یہ ساتھ

چھوٹے نہ کبھی.....

”اتنی دور تو نہیں جا رہے ہم، جو تمہیں ساتھ چھینے کا ڈکوسٹانے لگا ہے۔ کچھ دور ہی کا تو فاصلہ ہے تم مجھے فحش کے لیے یہ فاصلہ کچھ بھی نہیں ہے جو کار کو پلین سمجھ کر ڈرائیو کرتا ہے۔“

حورین ہریرہ کی جانب دیکھتی ہوئی ہنس کر بولی۔

”ہاں یہ نہیں ہے“۔ وہ اُداس تھا۔

”پھر کیا بات ہے؟“

”تمہارے بلنیر میری صبح کیسے ہوگی؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

”وہاٹ؟“

”میں صبح سے پہلے تمہارا حسین کھڑا دیکھنے کا عادی ہوں، جس دن یہ مبارک صورت صبح نہ دیکھوں، دن اچھا نہیں گزرتا۔“

”اوہ..... جو نے کہیں کے، کچھ دن قبل یہی لفظ آئی سے کہہ رہے تھے، شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔“

”میں نے جھوٹ تو نہیں بولا۔“

”اچھا..... یہ جھوٹ نہیں ہے، تم نے آئی سے یہ لفظ نہیں کہے تھے؟“

”ہاں ہاں کہے تھے، میں نے کب انکار کیا ہے؟“

”پھر بھی کہتے ہو، جھوٹ نہیں کہا۔“

”مئی کا مقام اپنی جگہ ہے، تمہاری دلچسپی جگہ، اکتھار دونوں طرف ایک جیسا تھا مگر جذبے مختلف تھے۔“ ہریرہ بھی ایک کانیاں

تھا، اس سے جیتنا آسان کام نہ تھا۔

”سب سے الگ رہنے کو دل تو نہیں کر رہا مگر یہ بات خوشی آتی ہے کہ کم از کم تمہاری ہجو اس سے جان چھوٹ جائے گی۔“

”اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والی چیز نہیں ہوں میں۔ اگلے کہہ رہے تھے، ہم برسوں سے ساتھ رہ رہے تھے، فحش بھی تیار

تھی، وہ تو میں نے ہی منج کیا کیا کہ..... یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔“

”وہ کیوں؟“

خاہرات ہے اس گھر میں ہارات لے کر جانا ہے، کیا اچھا لگے گا؟ شادی کے بعد بھی تم اسی گھر میں رہو گی، تمہارے لیے میں.....“

”شٹ آپ، مجھے معلوم ہے اگلے بھی ہمارے برابر میں ہی بنگلہ خرید چکے ہیں، بہت جلد ہی وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔“ وہ اس

کی بات قطع کر کے فحش سے بولی۔

”ہوں..... دراصل ان سب کو بھی میری طرح تم سے دوری گوارا نہیں۔“

”ہریرہ وہاں پلینز کبھی سیریس بھی ہو جایا کرو۔“

”میں تو میر لیس ہوں، جسم سے ہانکل میر لیس ہوں، تم نہ معلوم کب میر لیس ہوگی۔“

”مرو کہیں، تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ غصے سے کہتی ہوئی اٹھ گئی۔

”ارے..... تم ناراض ہو گئیں، میری بات تو سنو؟“ ہر رہہ کہتا ہوا اس کے پیچھے لپکا تھا مگر وہ زکی نہیں۔

”حدرین! بات سنو۔“

بی بی جان کے کمرے کے آگے سے گزری تو انہوں نے لپکا را تھا۔

”جی.....“ وہ ان کے قریب پہنچ کر گویا ہوئی۔

”بیٹھو، تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

بی بی جان بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔ لمبے کے ہزاروں حصے میں اس کو گمان گزرا کہ مبادا انہیں اس کے اور ذوالنون کے بارے

میں معلوم ہو گیا ہے۔ اس خیال نے اسے پریشان کر ڈالا تھا، وہ کچھ کبھی سی بیٹھی تھی، حالانکہ وہ جانتی تھی ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں

ہوئے تھے۔ نہ ہی محبت میں وہ اس حد تک بڑھے تھے کہ ان کی محبت کے چرچہ زبان زد عام ہوتے اور ان کی سماعتوں تک پہنچ جاتے۔

ابھی تو ان دونوں نے ہی ایک دوسرے سے اقرار محبت نہیں تھا، صرف ان مہکتے احساسات کی تھپک سے ہی ان کے جذبات

معلوظ ہوئے تھے۔ پارٹی میں بھی وہ خاصے وقت تک ساتھ رہے تھے، بہت سارے موضوعات پر ڈیوٹیوں باتیں ہوئی تھیں، اس دوران

ٹکا ہیں وہ دل کی باتیں کرتی رہی تھیں، جو لب نہ کہہ سکے تھے اور حیدر بھی درمیان میں ریمارکس دینے سے باز نہیں آیا تھا۔

”حدرین! کہاں کھوئی ہوئی ہو؟“

بی بی جان کی آواز پر چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

”جی..... بی بی جان! آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟“ وہ سوچوں سے نکل کر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

”حیدر! کیا لڑکا ہے؟“ ان کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

”حیدر؟..... اچھا لڑکا ہے..... کیوں بی بی جی، کیا ہوا؟“

”اس کے والدین آئے تھے زودیا کا رشتے لے کر۔“

”اوہ..... اکب آئے تھے؟“ مسرت و حیرت اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔

”کل جب تم اپنے سر کے ہاں پارٹی میں گئی تھیں۔ کل اتفاق ہی تھا کہ جو میرے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا، تب وہ لوگ آئے

تھے۔ بہت اصرار کر رہے تھے کہ میں انہیں خوش خبری کے ساتھ رخصت کروں مگر میں اس طرح کیسے ہاں کر سکتی تھی، بیٹی کا معاملہ ہے، لاکھ

بھائی بھادج مجھے ہر اختیار دے بیٹھے ہیں مگر اولاد کے لیے بہت دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر فیصلے کیے جاتے ہیں، میں نے ان سے ایک ہفتے

کا وقت مانگا ہے، ابھی میں نے کسی سے بھی ذکر نہیں کیا۔ یہی سوچا پہلے تم سے معلوم کر لوں، کیونکہ تم گاؤں گئی تھیں، وہاں ان کے گھر

ماحول و رہن بہن سے واقف ہو۔ بعض اوقات کسی کو جاننے کے لیے پوری زندگی بھی ناکافی ہوتی ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے ہم چند گھنٹوں کی ملاقات میں ہی ساری زندگی کی شناسائی حاصل کر لیتے ہیں۔“

اب وہ ان کو کس طرح بتاتی کہ گاؤں میں وہ وقت اس نے کس طرح اور کس کے ساتھ گزارا تھا مگر انہیں مطمئن کرنا بھی تھا۔  
”لوگ تو وہ بہت اچھے ہیں، وضع دار و خوش اخلاق، زمین دار ہونے کے باوجود ان میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو ایسے لوگوں میں ہوتی ہے اور حیدر تو بہت ہی نائس ہے، زویا کے لیے پرنکٹ۔“

”ٹھیک ہے، ویسے مجھے بھی وہ لوگ اس قابل لگے تھے کہ ہم ان سے رشتہ جوڑ سکیں، اب تمہاری بات نے مجھے مطمئن کر دیا ہے۔“ بی بی جان مطمئن ہو کر بھائی، بھائیوں کی طرف گئیں، وہ زویا کی تلاش میں لاؤنج میں آگئی جہاں مول، زویا، شرح، بیلا بیٹی میگزین میں ڈرہ سرو کچر ہی تھیں۔

”آج کی تازہ خیرا آج کی تازہ خیرا“ وہ چبھتی ہوئی آئی تھی۔

”کیا خبر ہے بتاؤ تو سہی“ وہ چاروں پر تجسس انداز میں بولیں۔

”اتنی آسانی سے تمہوڑی بتانے والی خبر ہے۔“

”کتنی مشکل سے بتاؤ گی؟“ زویا نے ٹھٹھا لگایا۔

”تمہارے ہی متعلق خبر ہے۔“ حیدرین نے تجسس کو ہوا دی۔

”میرے متعلق اکیا خبر ہے؟ پلیز بتاؤ نا۔“

زویا کے ساتھ ساتھ وہ بیٹوں بھی بے قراری ہو گئی تھیں۔

”میں نے کہا نا اتنی آسانی سے نہیں بتاؤں گی۔“

”یارا پلیز تمہیں معلوم ہے، مجھ سے سسٹنس بالکل برداشت نہیں ہوتا، رحم کرو، بتا دو..... اچھا ایسا کرقل ٹیڈو شدو، ہیڈ لائن ہی سادو کہ کچھ بے قراری کو قرار آئے۔“ شرح تڑپ کر بولی۔

”پر اس کرتی ہو، کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر کروانے کا؟“

”پہلے خبر معلوم ہو پھر۔“

”زویا انہ معلوم کتنے تجوس مرے ہوں گے جو تم پیدا ہوئی ہو۔“ مول اس کو ڈپٹے ہوئے ملامت کرنے لگی۔

”ہاں..... ہاں کر لو پر اس، اب ضروری نہیں دھرو بھایا بھی جائے۔“

”پھر میں نہیں بتاتی۔“

”میں نے کب منع کیا ہے، میں کراؤں گی ڈر، اب بتا بھی دو۔“

”تمہارے لیے پروپوزل آیا ہے۔“

”کس کا؟“ بے اختیار زویا کے منہ سے نکلا۔

”کسی مرد کا ہی ہوگا۔“ حورین کی وضاحت پر وہ تینوں کی کھی کھی کرنے لگیں۔

”اللہ کرے تمہیں دانٹ ٹوٹ جائیں جو تم کبھی ہنس نہ سکو، یہاں میری زندگی کا سوال ہے اور تمہیں ہنسی آرہی ہے۔“

”حورین! کون ہے وہ عقل کا دشمن جو اسے پسند کر بیٹھا ہے؟“

”ارے ذکا کرو، کچھ اس کی آنکھیں بھی کترور ہوں کیونکہ ہماری کزن کو ہر اس کام سے نفرت ہے جو گھریلو کھلاتے ہیں۔“ وہ زویا

کو برا بھلا بول کر رہی تھی۔

”چپ ہو جاؤ بی بی جان! وہ غصے سے چلائی تھی۔

اس کے بی بی جان کو کہنے پر حورین بھی بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

”اوکے، یہ سب تو مذاق تھا خیر یہ ہے کہ حیدر نے زویا کو پروپوز کیا ہے اور بی بی جان کے ارادے ٹیک لگ رہے ہیں۔“

”حیدر.....!“ زویا کے ساتھ مول بھی جیرا لگی سے گویا ہوئی۔

”سرا ننگ ننگ ننگ!“ زویا کے ساتھ مول بھی جیرا لگی سے گویا ہوئی۔

”سرا ننگ ننگ ننگ! اس نے کبھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ زویا پر ”گاہ“ رکھے ہوئے ہے، بڑا گھرو شخص ہے۔“ مول نے کہا۔

”میں بھی حیران ہوں، اچھے عرصے میں نہیں نے بھی کبھی فیمل نہیں کیا۔“

”ہوسکتا ہے اسے خود بھی اچانک ہی فیمل ہوا ہو۔“ بلا شرارت سے بولی۔

دل مٹی تھا، آنکھوں میں سوچات کہاں سے آئی

سادن بیت چلا تھا یہ برسات کہاں سے آئی

چاند بھی نکلا ہی تھا، کیسے ڈوب گیا؟

میرے آنکھ میں یہ کالی رات کہاں سے آئی

☆.....☆.....☆

ماحول میں خشکی تھی، رات کے سیاہ گیسو کائنات کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ رات اندھیری تھی یا نہ معلوم ان کے اندر

ہی وحشت و جنوں کی سیاہ آندھی نے اس قدر اندھیرا تاریکی پھیلا دی تھی کہ آج سے قبل اس کو رات اتنی گھور سیاہ نہ لگی تھی۔ اس کے اندر

ملاں و جنوں کسی آسیب کی طرح قبضہ بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے افسوس تھا اس نے اس شخص کی بیٹی سے محبت کی جو اخلاقی کردار سے محروم تھا۔

اگر ماما اور نانا اسے سمجھاتی نہیں تو وہ اس کو شوٹ کر چکا ہوتا اور حورین کی ماں وہ عورت تھی جس سے وہ بچپن سے نفرت کرتا آیا تھا۔ بہت

شدید نفرت کی تھی اس سے۔ نالو نے بتایا تھا۔ ان لوگوں نے ہر طرح سے ان سب کو اذیت دی تھی، ان کی بدنامی و رسوائی کا باعث بنے تھے۔ ان کے کروڑوں کے کاروبار پر وہ قابض ہوئے تھے پھر اس کے باپ کی جدائی میں اس عورت کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ سب تو کسی طرح سے برداشت کر سکتا تھا، معاف کر سکتا تھا مگر جس احساس نے اسے اس شخص سے موسم میں بھی جلتے ہوئے انگاروں پر لاپیچہ کا تھا وہ احساس اپنی محسوس و بے خطا ماں کی پامالی کا تھا۔

یہ ایسا ناقابل معافی جرم تھا جوہ کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک جوان و باحیثیت بیٹا کس طرح یہ بات برداشت کر سکتا ہے۔ جو رین کے لیے جو اس کے دل میں محبت و پسند کے جذبات پیدا ہوئے تھے وہ پانی کے بلبلے کی طرح قابو ہو چکے تھے۔ اب وہ اس کی محبت و چاہت نہیں..... دشمن کی بیٹی تھی اس کے باپ نے ایسا جرم کیا تھا جو ناقابل معافی تھا وہ کبھی معاف کرنے والا بھی نہ تھا۔

نینو، بھوک، پیاس، سکون قابو تھا۔ وہ مضطرب، بے چین سال اپنے بیٹروم میں چکر لگا رہا تھا معادرو، اذہ کلا اور آنے والی ہستی کو وہ دیکھ کر فوراً آگے بڑھا تھا۔

دروازے میں مثال جگمگایا تو وہ تھیں۔

کھڑے ہال..... حکن آلود لباس..... محروم آنکھیں.....

یہ وہ مثال جگمگاتی تھیں جن کے ماتھے پر شکنیں جگمگاتی تھیں اور عورت کے احساس سے بھر پور طاری رہتی تھیں مگر لباس ان کا ہمیشہ بے حکن رہا تھا۔ کبھی اس نے ماں کو اس طبع میں نہیں دیکھا تھا وہ بھولوں کی طرح تو دن از دن خوب صورت نظر آتی تھیں کہ ایک تو ان کا حسن اب بھی اتنا مانع نہیں پڑا تھا پھر وہ اپنا اذہ خیال رکھتی تھیں پارٹیز کے علاوہ گھر پر بھی بڑے مطہرات و تک تک سے تیار رہنے کی عادی تھیں۔

ان کے ہر انداز سے حکمت و شہانہ پن چمکتا تھا کسی ملکہ کی مانند اب وہی خوش لباس و خوش رومثال جگمگاتی کایا اجڑا، کھرا، ٹوٹا ہوا روپ ان کی شخصیت سے بالکل جدا تھا۔ بالکل متضاد و طبعی۔ کل تک وہ بہاروں کا چمن تھیں اور آج بہاروں پر خزاں نے ڈیرے بٹالے تھے وہ کسی اجنبی عورت میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

”پرنس..... مجھے معاف کر دیں بیٹا۔“

اپنی جانب بڑھنے والے ڈوالون کے وہ قدموں میں بیٹھ گئیں اور اس کے پاؤں پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ ماں کو اس حرکت سے روکنے کے لیے وہ پھرتی سے پیچھے ہٹے ہوئے گویا ہوا۔

”مم..... ماما یہ کیا کر رہی ہیں؟“ دکھ و حسد سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔

”بہت دکھ ملا آپ کو میری وجہ سے..... میں اس قابل ہی نہیں.....“ ڈوالون نے انہیں اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔

”دکھ تو مجھے ملا ہے مگر آپ کی وجہ سے نہیں..... خود مجھے اپنے دل کی وجہ سے..... اپنی پسند کی وجہ سے..... یہ..... احساس مجھے



مرنے دم تک عمامت میں جھٹار کئے گا کہ میں نے پہلی بار کسی کو لاک کیا..... اور جس کو پسند کیا وہ اس قابل ہی نہیں تھی۔" اس کے لہجے میں نظروں کے اوڑھے پھنکار رہے تھے۔ گرے سرخی مائل آنکھوں میں نوزائیدہ محبت کی موت کی نمی تھی۔

"یہ میری وجہ سے ہوا ہے میری ذات ہی آپ کی خوشیوں کی قابل بنی ہے۔ مجھے مرجانا چاہیے۔ مجھے جینے کا حق نہیں ہے۔" وہ اس کے سینے سے چہرہ نکا کر رونے لگی تھیں۔ ان کی آنکھ سے نلکے والا ہر آنسو اس کے دل میں گھاؤ ڈال رہا تھا اور اس ڈھم سے اس کے اندر الاؤ سنگ رہا تھا۔

بڑا ہمایا تک الاؤ..... اس الاؤ میں بھڑکنے والی آگ حمل، شعور، فہم سب بھسم کر دینے والی ایسی سیاہ آگ تھی جہاں کی رگ رگ میں پھیلنے لگی تھی۔

"پلیز..... ماما ریلیکس ریلیکس..... آپ کو ہمارے لیے زندہ رہنا ہے۔"

"میں کیسے زندہ رہ سکتی ہوں.....؟ ایک عورت تو شاید اس احساس سے مرمر کر جی سکتی ہے کہ وہ لٹ چکی ہے..... مگر ایک ماں کیسے زندہ رہ سکتی ہے جب اس کی اولاد کو معلوم ہو جائے اس کی بربادی کا....." وہ اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے آنکھوں کے درمیان کہہ رہی تھیں۔ ذوالنون نے حیرتی سے قطع کر کے کہا۔

"پلیز..... ماما! آپ کل بھی میری لیے اسی ہی معبرہ و قابل احترام تھیں اور آج اس سے بڑھ کر ہیں۔" وہ ان کے ہاتھوں کو چومتا ہوا پر عقیدت لہجے میں بولا۔

"نہیں..... نہیں تم آج نہیں توکل مجھ سے لڑتے کرو گے۔ تقاریر سے دیکھو گے شاید..... شاید میرے چہرے پر تھوکو گے۔" ان پر نکلنے والی ہذیبانی کیفیت طاری ہو گئی۔

ذوالنون نے ان سے کچھ کہنا چاہا مگر وہ ڈھم کے شدید احساس سے اس کی زبان مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ ماں کی بگڑتی ہوئی ذہنی حالت کا اسے پوری طرح احساس تھا۔ وہ خود بھی تو ان چند گھنٹوں میں ذہنی و جذباتی شدید تر ہوئی جنگ سے خبردار تھا اور محسوس کر رہا تھا لہجہ کو کھلا ہوتا چارہ تھا یا کہ کھونے کا دکھ ہر دکھ سے بڑھ کر لگ رہا تھا۔

منال بیگم ہاتھوں میں چہرہ چمپا کر رونے جا رہی تھیں۔

"آپ کا ہر آنسو میرے دل کا ڈھم ہے پلیز آپ روئیں مت۔ آپ میری ماں ہیں۔ کائنات کی سب سے بڑی ہستی..... دنیا کی سب سے بڑی دولت..... ماضی میں، میں نے آپ سے بہت زیادتی کی کہ آپ کو سمجھ نہ سکا تھا مگر ماما اب آپ کو شکایت نہیں ہوگی آپ کو..... بلکہ ہمارے دشمنوں سے میں بدلہ لوں گا ضرور لوں گا....."

☆.....☆.....☆

”ہیلو..... چلو ارے کیا ہوا بھئی..... آپ لوگ کچھ سن کیوں نہیں رہی ہیں؟ میں کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔“

وہ پانچوں حیدر کے پر پوزل کے بارے میں ہی ڈکس کرتی آ رہی تھیں۔ حیدر کی آواز وہ نہیں سن سکی تھیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے ان کے قریب آ کر گویا ہوا۔

”سوری ہم میں سے کسی نے بھی نہیں سنا۔“ نٹ کٹ ٹرین اس کی جانب دیکھتی ہوئی شوخی سے بولی۔

”بھئی حد ہوتی ہے بہرے پن کی بھی آدمی جامو نے سن لیا۔“

”اچھا ہوا ہم میں اور آپ میں رشتہ داری ہو سکتی ہے کیونکہ کچھ عادات کی بنا پر مماثلت تو پائی جاتی ہے۔“

مول کے کہنے پر ان چاروں کے لبوں پر گہری مسکراہٹ ابھری تھی جب کہ روایا کی اسے سامنے دیکھ کر بولتی بند ہو گئی تھی۔ وہ چہرہ جھکائے قریب کھڑی حورین اور دا کے پیچھے تقریباً خود کو روپوش کر چکی تھی۔ طے رشتے کا احساس سے وہ گنا تھی۔

”کیسی مماثلت.....؟“ حیدر سینے پر ہاتھ باندھ کر شوخی سے گویا ہوا۔ اس نے ترچھی نگاہ مٹی سٹائی زویا پر بھی ڈالی تھی۔

”آپ میں کہنے پن کی کواٹھی ہے اور ہم میں بہرے پن کی.....“

”کواٹھی.....“ حیدر بے ساختہ ہنس پڑا۔

”بائی دادے..... یہ گھٹا پن کیا ہوتا ہے.....؟“

”بہت جلد معلوم ہو جائے گا آپ کو۔“ روالے اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔

”او کے آئی ول ویٹ۔“

اس کے ہر انداز سے سرشاری ٹپک رہی تھی۔

”آج آپ ہمارے نظر آرہے ہیں آپ کے جوڑی دار کہاں ہیں؟“

”خوب! کیا پرفیکٹ ٹائٹل دیا ہے جوڑی دار..... چند دنوں سے اس کی اور میری ملاقات نہیں ہو رہی ہے۔“ حیدر انہیں ٹی شاپ لے آیا تھا جہاں چائے اور برگر کے ساتھ ساتھ ان کی گفتگو بھی چل رہی تھی۔

”حیرت انگیز بات ہے۔ آپ جو ایک دوسرے کا سایہ تصور کیے جاتے ہیں، ایک دوسرے سے جدا بھی رہ سکتے ہیں.....“ مول

نے ڈھیر سارا کچھ برگر پڑا ل کر کھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ہم جو ایک دوسرے کی پرچھائیں ہیں، ہر جگہ..... ہر وقت ساتھ دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ہماری

دوستی و محبت دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر ہے مگر اس محبت و دوستی میں بھی کبھی کبھی ایسا مقام آ جاتا ہے کہ ہم چند دنوں کے لیے عارضی جدائی

اختیار کر لیتے ہیں۔“

”ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ حورین نے آہستگی سے کہا۔

”اس کی کچھ پرسل ہاتھ میں ہیں..... کچھ ناکامیاں ہیں۔“

”ناکامیاں وہ تو ہر طرح ایک کامیاب انسان نظر آتے ہیں۔“ ثمرین نے چائے کلاپ لیتے ہوئے استہمامیہ انداز میں کہا۔  
 ”کامیاب انسانوں کو بھی زندگی کہیں نہ کہیں ناکامی سے دوچار ضرور کرتی ہے۔ بہت زیادہ کامیاب انسان کہیں نہ کہیں ناکام

بھی ہوا کرتے ہیں۔ اپنی دین مجھے حورین سے کچھ کام ہے اگر آپ لوگ مایکینڈ نہ کریں تو میں.....“  
 ”نہیں..... نہیں..... یہ قافل ہے ریکل قافل.....“ ان تینوں نے احتجاج کیا۔

”زویا! آپ کیا کہتی ہیں یہ قافل ہے؟“ وہ ڈائریکٹ دویا سے مخاطب ہوا۔ زویا جو پہلے کافی گھبرائی، لہائی سی تھی۔ اس کے اس طرح پکارنے پر ہاتھ میں پکڑا ٹشو گرما۔ جواب دینے کی گفتگو میں ہوتی سی نظر آنے لگی تھی۔ بوللا زویا کا یہ روپ انہیں ہنسا گیا تھا۔  
 ”تھیک گاڈا زویا کے ہاتھ میں چائے کا گنگ نہیں تھا۔“

”بھر پارٹی کب دے رہے ہیں کسی شاندار ہوٹل میں؟“ ثمرین روالا سے بچنے کو تیار نہیں تھیں۔

”آپ لیڈیز سب جانتی ہیں تو یہ بھی جانتی ہوں گی کہ..... ابھی گڈ ٹائم نہیں ہے ادھر اچھی خبر آئی ادھر آپ کی پارٹی اریج ہو جائے گی۔“ اس نے بھر پور نگاہ زویا پر ڈالتے ہوئے معنی لہجے میں کہا۔

”گڈ ٹائم۔“ ثمرین نے اس انداز میں کہا کہ حیدر کا مسرتوں وانگلوں سے کھلا روشن چہرہ تاریک سا ہو گیا تھا۔

”کیا مطلب؟ کوئی..... کوئی پرالم ہے؟“ خوشیوں سے کلکھلائے دل میں ایک دم ہی دوسوں وانڈیٹوں کے ساتھ کلبلائے لگے تھے۔ صیوٹی کے جانے کے بعد گھر میں ساتوں، دیرانوں کا راج ہو گیا تھا۔ ان میں مزید اضافہ یہاں کراچی میں رہائش پذیر ہونے کے بعد ہوا۔ گاؤں میں اس کی والدہ کے پاس وہاں عورتوں کی آمدورفت صبح سے رات تک رہتی تھی جن کے مسئلے مسائل سلجھانے، ہاتوں دھونے، کھانوں میں وقت اچھا گزار جاتا تھا۔ گاؤں کی سادہ زندگی میں ابھی بھی پرانی روایتی محبت و ظلموں کی فردانی تھی۔ شہر کے لوگ ان خوب صورت نعمتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہاں قریب رہنے والے گھر رشتے داروں سے ملنے کا نام نہیں ہوتا لوگوں کے پاس بھر بھلا ایسے مراسم کس طرح نبھائے جاسکتے ہیں۔ وقت کی الجھن میں سب الجھ چکے ہیں۔ اس کے والدین نے گھر کی اداسی و سناٹے کو توڑنے کا بھی حل نکالا کہ بہو کے وجود سے گھر کو رونق بخشی جائے۔ حیدر جو پہلے دن سے ہی زویا کے شوخ و خشک مزاج پر فدا ہو چکا تھا۔ چپکے چپکے جانے والی محبت میں وہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ والدہ کے سامنے اقرار کر بیٹھا اور وہ زویا سے مل چکی تھیں۔ نورانی دامن پھیلائے ان کی دلہیز پر جا پہنچیں گویا اقرار نہیں ہوا تھا مگر انہیں یقین واثق تھا کہ انکار بھی نہیں ہوگا۔ یہ یقین اس کے دل کو بھی تھا اور ابھی کچھ دیر قبل زویا کا حیا آمیز انداز ان کی گفتگو یہ بھید کھول رہی تھی کہ ان کو خوشخبری ملنے والی ہے مگر.....

”آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ کیا انکار ہو گیا ہے؟“ محبت اس کشتی کی مانند ہے جو خوف، دوسوں، امید و ناامید خوش گمانی و بدگمانی کے سمندر میں کبھی ڈوبتی کبھی ابھرتی ہے۔ اسے اپنی کشتی محبت بھی تہہ در تہہ ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے کوئی جواب

نہیں دیا تھا۔ کہانی کے سجدہ ہی شکل بناتی وہاں سے چلی گئیں۔ حورین اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ وہ اسے استونہ لے کر چلا آیا منہ کرنے کے باوجود۔

”تم..... اس قدر پریشان کیوں ہو گئے ہو؟“ وہ مقابل بیٹھے حیدر سے مخاطب ہوئی تھی۔

”پر پوزل رچیکٹ کر دیا گیا ہے میرا؟“ حیدر نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پریشان کن لہجے میں کہا۔ ”کیا وہ کہیں انگیڈ ہے؟“ حورین خاموشی سے بنا کچھ کہے کر بیچ آؤس کریم میں جھج پھرتی رہی اس کی خاموشی نے اسے متوصل کر ڈالا تھا۔

”اگر ایسا تھا تو پہلے کیوں نہیں بتایا گیا؟“ حیدر کے لہجے میں دکھ درد کی ایسی شدید تڑپ تھی کہ حورین مزید اسے پریشان نہ کر سکی اور مسکرا کر گویا ہوئی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے نہ یا کہیں انگیڈ نہیں ہے۔“

”اوہ..... تھمکس گاڈ، مجھے مرنے سے بچالیا آپ نے..... لیکن..... آپ کے ہاں سے ابھی تک جواب نہیں آیا ہے۔ میں یہ جانتا چاہ رہا تھا آپ لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟ ہمیں مایوسی تو نہیں ہوگی.....؟“ اس کا لہجہ امید و ہم سے لبریز تھا۔

”تم..... کئی بات کرنا چاہ رہے تھے؟“

”ہاں مجھے اس معاملے میں آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آیا۔“

”ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ بہت پریشان..... بہت تنگ کرنے کے بعد تمہیں بتائیں گے کہ بی بی جان سمیت سب کی مرضی کچھ ہے۔“

”ہر..... دیش ٹھکانک نیوز“۔ وہ خوشی سے جموم کر بولا۔

”تم نے اچھے دنوں تک ہم سے یہ سب چھپایا تھا، اس لیے ہم نے تمہیں کچھ مزادینے کی ٹھانی تھی۔“

”اس حیات آمیز خوش خبری کے بعد جو مزاملے منظور ہے۔“

”حیدر..... تم ذکر کر رہے تھے ناکامی کا..... انہیں..... میرا مطلب ہے..... ڈوائون..... کو کس ناکامی نے جکڑا ہوا ہے۔ اس

قدر کو وہ تم سے بھی رابطہ توڑ بیٹھے ہیں.....“ از حد ہنگامے ہوئے اس نے ڈوائون کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ پچھلے تین دنوں سے وہ یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا اور یہ بات اس کے لیے خاصی حیران کن ہونے کے علاوہ پریشان کن بھی تھی۔ اس سے قبل اسے کبھی یونیورسٹی سے غیر حاضر نہیں دیکھا گیا تھا، مستر اس پر حیدر کے منہ سے ناکامی کا سن کر وہ مضطرب تھی۔

”حورین اڈوائون سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ دوستی کے اس طویل عرصے میں ہم ایک دوسرے کے نزدیک رہے ہیں۔

ڈکھ ٹکھ شیر کیے ہیں، ان میں میری ذات پوری طرح الوالورہی اس نے اچھے انسان کی طرح پُر خلوص و سچے دوست کی طرح ہر پریشانی و آرزائش میں میرا ساتھ دیا اور آج بھی وہ ایسا ہی ہے۔ دوستوں کے پسپے کی جگہ اپنا خون بہانے والا..... بگمراہی پریشانی، اپنا ڈکھ محرومیاں

کسی سے شیئر کرنے والا نہیں ہے۔"

"ڈکھ، محرومی، ناکامی، کوئی سبب تو ہوگا ان کا؟" حورین کہہ رہی تھی اور اس کے ذہن میں وہ خوب صورت گرے آنکھیں چھانے لگی تھیں جن میں رنج و الم، محرومی و تڑپ کی گہری سرخی انہیں سب میں نمایاں کرتی تھی۔ اکثر لڑکیاں ان حزن آمیز لفظوں پر ہی سرختی تھیں۔

"سبب..... اس کے قادر ہیں۔" حیدر آہستگی سے گویا ہوا۔

"قادر..... کیا اس کے اسٹیپ قادر ہیں؟" کالج کی پیالہوں میں آئس کریم کھل چکی تھی۔ وہ ڈوالٹون کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ارد گرد سے بیگانہ ہو گئے تھے۔

"نہیں..... نہیں گئے بابا ہیں اس کے..... وہ انہیں چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں..... کیوں گئے؟ کہاں گئے؟ یہ ڈوالٹون کو بھی نہیں معلوم..... اس کی ممانور بھائی نے ان کی جدائی کو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیا اور وہ نہ کر سکا۔ اسی لیے میں نے کامیابی اور ناکامی کا ذکر کیا تھا۔ دولت..... شہرت..... عیش و آرام یہ سب حاصل کرنے میں وہ کامیاب رہا ہے تو والد سے جدائی کی ناکامی نے ان تمام کامیابیوں پر اپنی مہر ثبت کر دی ہے۔ وہ اپنے بابا سے بے حد محبت کرتا تھا..... بلکہ کرتا ہے....."

"سوئیڈ..... یہ تو بہت ڈکھ کی بات ہے۔"

ڈوالٹون کے لیے اس کے دل میں لہلہا چماتے جذبات میں محبت کے ساتھ ہمدردی بھی بیدار ہو گئی تھی۔

"عموماً وہ ایسے جذبات کا شکار ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے، ایسے میں، میں بھی اس کی تنہائی میں غل نہیں ہوتا، وہ خود ہی نارمل ہوتا ہے تو آ جاتا ہے..... لیکن اس بار وہ کچھ زیادہ ہی سیریس ہو گیا ہے جو کال بھی انیڈ نہیں کر رہا ہے، نہ معلوم کب اس کے قادر آئیں گے اور وہ بھی زندگی کے خوب صورت معنی سے رُخسٹاس ہوگا؟" حیدر کے لہجے میں ڈوالٹون کے لیے تڑپ تھا۔

"حورین! آپ میرے دوست کو کبھی مت چھوڑیے گا، وہ ہا ہر سے جس قدر اسٹرونگ دکھائی دیتا ہے، اعر سے اتنا ہی نرم و تنہا ہے۔ اس کی یہی روح کو آپ کی محبت ہی سیراب کر سکے گی۔"

☆.....☆.....☆

راجیلہ بیگم نے بوے اسٹراب انگریز اعزاز میں خطرئی کی جانب دیکھا تھا جو سیل فون ہاتھ میں پکڑے نمبر پل کر رہی تھی اور اس کے چہرے پر ہویا تاثرات پتا دے رہے تھے، دوسری جانب سے رابطہ قائم نہیں ہو رہا ہے۔

"کیا ہوائی اور فون نہیں اٹھا رہا؟"

"دادو! اس کا موبائل ہی آف جا رہا ہے۔" خطرئی سیل فون لہلہا پر رکھتی ہوئی گویا ہوئی۔

"دوسرے نمبر پر فرائی کرو، اس کے پاس ایک تھوڑی ہے۔" ان کا اعزاز سے یاد دلانے جیسا تھا۔

"تمام پر کر چکی ہوں، سب ہی آف ہیں۔"

”الٹی خیر! کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے، یا اللہ میرے بیٹے کو اپنی حفاظت و امان میں رکھنا۔“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتی چلی گئیں۔

”دادو! پلیز سب ٹھیک ہے، خواب تو خواب ہوتے ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ آپ وہم کا شکار ہو رہی ہیں۔ ذوالنون ٹھیک ہیں، مثال آئی نے بھی یہی کہا ہے۔“ حضرتنی کے لہجے میں خاصی اپنائیت و محبت تھی۔

”مجھے چند دنوں سے بڑے پریشان کن خواب نظر آرہے ہیں، جب سے میں مدتے، خیرات برابر کر رہی ہوں، مگر دل کو سکون نہیں مل رہا، ایسا لگ رہا ہے جیسے..... جیسے کوئی انہونی ہوگی۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سہے ہوئے لہجے میں گویا ہوئیں۔

”کچھ نہیں ہوگا دادو! خوابوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ہماری روٹین ورک کے حصے ہی روپ بدل کر خوابوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہمیں پریشان کر دیتے ہیں۔“ حضرتنی نے اپنی بساط کے مطابق انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر کے باقی افراد لاہور گئے ہوئے تھے، شادی ایشیز کرنے۔ راجیلہ بیگم بہت عرصہ قبل ایسی نگار ب سے کنارہ کشی اختیار کر چکی تھیں۔ حضرتنی ان کے پاس ڈک گئی تھی۔ وہ بھی تقریبات کم کم ہی ایشیز کرتی تھی۔ عزیز اور حضرت بھی نہیں گئے تھے۔ دو تین راتوں سے راجیلہ بیگم کو پریشان کن خواب نظر آرہے تھے جن میں زیادہ تر وہ ذوالنون کو ہی دیکھ رہی تھیں اور ہر بار ان کی پریشانی و فکرات میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”میں اس بات کو نہیں مانتی۔ خواب کا حقیقت سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ پوری بے شک نہ ہو مگر آدمی حقیقت، ایک حصہ سچائی ان خوابوں کا آنے والے وقت سے ضرور مربوط ہوتا ہے، مجھے معلوم نہیں تھا مزہ اور مثال میں اندر ہی اندر چھپتلاں چل رہی ہے مگر ان دنوں بھی مجھے ایسے ہی خواب آنے لگے تھے اور مزہ..... مجھ سے جدا ہو گیا تھا..... اور اب بھی ایسے ہی خواب دیکھتی ہوں..... مزہ کی جگہ اب ذوالنون نے لے لی ہے۔“ ان کے جمبروں زدہ چہرے پر آنسو بے آواز بہنے لگے تھے۔ دبیز شیشوں کی ٹینک کے پیچھے بصارت کھوتی سمجھتی آنکھوں میں ڈکھونا رسائی کا سمندر موجزن تھا۔

”انشاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ مثال آئی کے ہاں چلی جائیں، وہاں ملاقات ہو جائے گی ذوالنون سے آپ کی۔“

”کیسے چلی جاؤں؟ مثال سیدھے منہ ہات کرے تو کچھ بہت بھی ہو۔ دو بار فون کر چکی ہوں۔ میری بات سن کر کہتی ہے، اٹنے سیدھے خواب دیکھ کر میرے بیٹے کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا، میں ایک نظر اسے دیکھنا چاہتی ہوں تو بولی کہ ابھی وہ گھر میں نہیں ہے اور فون بند کر دیا۔“

”اس دن تو وہ بہت مہربان و بدلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ آپ سے بہت عزت و احترام سے پیش آ رہی تھیں، پھر انہیں کیا ہوا؟“ حضرتنی کے انداز میں تاسف و بے چینی ہی تھی۔

”ہونہوہ سب دکھا داتا تھا۔ مجھے پہلے ہی یقین نہیں آیا تھا کہ مثال اپنی فطرت سے باز آ سکتی ہے۔ وہ ملن ساری و خوش اعلاتی کے مظاہرے صرف بیٹوں کو دکھانے کے لیے تھے۔“ راجیلہ بیگم سخت بد ملن انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”میرا ماتھاب ہی ٹھکا تھا، وہ چال باز عورت نہ معلوم کیا کیا چال بازیاں کرنا چاہتی ہے۔ مجھے اس پر اٹھنا نہیں ہے۔“

”وہ ماں ہیں اور کوئی ماں اپنے بچوں سے فراڈ نہیں کر سکتی“۔ ان کی بے احتیاری نے مختصری کو گدگدا ڈالا تھا۔  
 ”وہ خود پرست دہلا دمست عورت ہے، اس سے کوئی بھید نہیں۔“  
 ”دادو! میں کھانا لگواتی ہوں۔“

”رہنے دو، دودھ کے ساتھ سلاکس لے لوں گی، بھوک نہیں ہے۔ کونین بھی باہر جا کر بیٹھ گیا ہے۔ اسے کس طرح اپنے دل کی حالت بتاؤں کہ دیار غیر میں بیٹھا ہے وہ۔“

☆.....☆.....☆

اوائل نومبر کی راتیں بڑی بے کیف و خوشگوار ہوتی ہیں مگر اسے لگا موسم میں جون جولائی والا جس بھر گیا ہو۔ نسا کھٹن آلود ہو گئی ہو۔ آف وہاٹ، پنک ٹانگی میں وہ کسی بے قرار روح کی مانند کمرے میں چکراری تھی۔ گل ممانے اپنا حال دل اسے سنا ڈالا تھا۔ مانی کی ڈائری کا ایک ایک ورق، ہر ورق کا ایک ایک لفظ اسے سنا ڈالا تھا۔ کچھ بھی نہ چھپایا تھا۔  
 مانی اسے کراچی نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ وہ بھند تھی آنے کے لیے جدوجہد کے بعد اسے اجازت ملی تھی۔ وہ بھی مشروط اجازت، اس وعدے کے ساتھ کہ وہ کراچی میں کسی کو بھی اپنی فیملی کے بارے میں نہیں بتائے گی کہ وہاں ان کے دشمن موجود ہیں اور اسے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ اس کے سولٹ، سویٹ، نیچر کے پاپا کے کوئی دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔

جب ہی سے اس کے اندر یہ تجسس کسی سانپ کی مانند کنڈلی مار کے بیٹھ گیا تھا کہ معلوم ہو، وہ کون دشمن ہیں؟ کیوں دشمن بنے ہیں..... اس کے بے حد اصرار کے باوجود ماما پاپا نے وعدہ کیا تھا کہ وقت آنے پر وہ اسے سب بتائیں گے۔ انہوں نے اب وہ وعدہ اٹھا کر ڈالا تھا۔ چند دنوں بعد جس گھر میں انکس شفٹ ہونا تھا، مانی نے بتایا وہ گھر وہی تھا جس میں وہ اپنا بچپن گزار چکی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک وہ ماں کی گود کی بجائے منگھدستی و مٹلسی کی خاردار گود میں پل کر بچی تھیں۔ اپنوں کے درمیان بھی اجنبیت و غیریت محسوس کرنا کس قدر تکلیف دہ عمل ہے وہ چوتھوئوں و چاہتوں کی رجم میں بھیگتی آئی تھی اس کے لیے ایسا تصور ہی سوہان روح تھا۔

اسے ناز تھا اپنی نانی کی نیک چلتی، راست بازی و صبر پر..... اسے فخر تھا اپنی ماں کی ثابت قدمی، استقامت و استقلال پر، اپنے پاپا سے وہ بے انتہا محبت کرتی تھی لیکن اب ان کی عزت و احترام اس کے دل میں کلی گنا بڑھ چکا تھا جس نے حیثیت و مرتبے کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک ایسی لڑکی کو اپنایا تھا جو اس کی کسی طرح بھی ہم پلہ نہ تھی۔

تھا.....

لاوارث.....

بے سہارا.....

اس کو اپنے پاپا ایک فرشتے کی مانند محسوس ہو رہے تھے جو صرف اور صرف اس کی ماما کے لیے دنیا میں آئے تھے۔ اتنی محبت و اہمیت ماما

کے وہ کزن بھی شاید ماما کو نہیں دیتے جنہوں نے گمراہوں کی مخالفت کے باوجود ماما اور نانی کا خیال رکھا تھا جو ماما کو پسند کرتے تھے..... چاہتے تھے مگر جلدی اظہار نہ کر پائے تھے اور اگر اظہار وہ کر بھی دیتے تو میاں کی بھی ان کی محبت کو تسلیم نہیں کرتیں۔ میاں نے انہیں بھائی کی طرح سمجھا تھا۔ سوچیں ہوا کے جھونکوں کی طرح یکے بعد دیگرے وارد ہو رہی تھیں۔ وہ ماں کی داستانِ حیات کے ایک ایک منظر کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ کرن نے یہ داستانِ دل سے گرتے لہو سے سنائی تھی۔ وہ لہو جو قطرہ قطرہ ان کی آنکھوں سے بہتا رہا تھا۔

ان کے لہجے کا سوز گداز.....

چہرے پر چھایا تزن و طلال.....

وہ خود بھی کئی بار رو پڑی تھی۔ ان کے اٹک صاف کرتے ہوئے، اس کے لیے یہ احساس ہی کس قدر تکلیف دہ تھا۔ میاں کے والد نے کبھی ان کا ہونے کا احساس نہیں بخشتا تھا۔ کوئی خوشی نہ دیتی تھی۔

کیسے باپ تھے وہ.....؟

محبت سے عاری.....

ذمے داری سے بے نیاز.....

پداری شفقت سے محروم کسی پتھر کی طرح سخت و بے احساس..... سوتلی ماں اور سوتلی بہن نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا وہ ناقابلِ فراموش تھا۔ انہوں نے رشتوں کے نام پر کلنگ لگا دی تھی۔ میاں کے ماضی نے اسے مغموم کر ڈالا تھا۔

کرن بیٹی کے آگے اپنا ماضی بیان کر کے کچھ ہلکی پھلکی ہو گئی تھیں۔ دل سے کچھ بوجھ سرک سا گیا۔ وہ اس سے بڑے سکون گہری نیند سو رہی تھیں اور وہ جاگ رہی تھی۔ نہ مظلوم کیوں ایک عجیب سی اداسی اس کے وجود پر چھا گئی تھی۔ سارا دن وہ اسی کیفیت میں جھلا رہی تھی۔ حالانکہ آج بی بی جان نے حیدر کے والدین کی دعوت کی تھی۔ وہ آئے تھے..... ساتھ حیدر بھی تھا۔ مشائخ، فرانس اور میڈوز کے نوکرے تھے۔ زویا کے لیے پھولوں، گجروں کے علاوہ گولڈ کا ہماری سائٹ تھا۔ منگنی کرنے سے بی بی جان نے منع کر دیا تھا کیونکہ ابھی صرف گھر کے افراد موجود تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ منگنی کریں گی تو قریب دو در کے رشتوں کو بھی دعوت دیں گی۔ وہ سامان حیدر کے والدین اپنی خوشی سے لائے تھے۔ ان کا بھی کہنا تھا کہ منگنی دھوم دھام سے کریں گے۔ ان کے آنے کے بعد سے خاصا ہلہ گلہ رہا تھا۔ وہ ہر جگہ موجود ہونے کے باوجود اپنی طور پر قابض رہی تھی۔

حیدر نے کئی بار اسے نوکا تھا اور وہ کوشش کے باوجود خود کو سنبھال نہ سکی تھی پھر حیدر بھی زندگی کی اس اولین خوشی کے موقع پر بھرپور انداز میں خوش نہ ہو سکا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بے جان تھی۔ اس اہم موقع پر وہ ڈولٹون کی کمی کو محسوس کر رہا تھا۔ جس نے اس کے ساتھ یہاں آنے پر معذرت کر لی تھی۔

حیدر کے ہمراہ ڈولٹون کو نہ دیکھ کر حورین کو بھی دچکا سا لگا تھا۔ یہ کی پیاسی لگا ہوں کو یقین تھا کہ وہ حیدر کے ساتھ ضرور آئے گا۔



مضبوط دوستی کا تقاضا بھی تھا اور..... دل کی طلب کا معاملہ بھی۔ اس کی لٹا ہیں اس کی دید کو بے چین نہیں تو کیا اسے دیکھنے کی چاہ نہ تھی؟ ان کے جذبے کی نظر نہیں تھے۔ پھر موقع کے باوجود وہ کیوں نہیں آیا تھا؟

ان سوالوں نے اسے حیرت رنجیدہ کر دیا تھا اور وہ وہاں سے بہانے سے اٹھ آئی تھی۔ دل می کی ماضی کی داستان سے پہلے ہی ڈکی تھا۔ اس پر حیرت دکھ کا بوجھ ڈالو تو دل کی بے بسی نے لاڈالا تھا۔ حیدر کی خوشی میں شریک نہ ہو کر اس نے بہت غیر لڑمہ دارانہ طبیعت کا ثبوت دیا تھا۔

”مسٹر ڈالون مرد ہو کر تم نے صرف ایک اپنے باپ کی جدائی کو ایسی ناکامی تصور کر لیا جو تمہاری ساری زندگی پر حاوی ہو گئی ہے، اس خود ساختہ ناکامی نے تمہیں آج ایک سچے اور نکلے دوست کی خوشیوں سے بھی محروم کر دیا ہے۔ تم ایک مشکل انسان ہو۔ کبھی نہ سمجھ آئے والے..... کسی پرل کی طرح..... تم اتنے مضبوط و توانا ہو کہ فقط ایک رشتے سے محرومی برداشت نہ کر سکتے اور می جو ایک کمزور عورت ہیں۔ نازک سے احساسات و جذبات رکھنے والی، انہوں نے سبک رشتوں کی کس قدر ناکامیاں و نظریں دیکھی ہیں مگر بڑے حوصلے و عزم سے ان ناکامیوں کو زندگی پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ میں جانتی ہوں، تمہارا اور می کا کوئی تعلق..... کوئی رشتہ نہیں ہے مگر پھر بھی تمہاری اور می کی کہانی میں کچھ سی یکسانیت لگتی ہے یا شاید ڈکھ..... محرومی و جدائیوں کی داستانوں میں اسی طرح کی یکسانیت و مماثلت پائی جاتی ہوگی۔ جدائی کے فخر سے محرومی کے دارا اسی طرح کیے جاتے ہوں گے۔“ ڈالون کا خیال آتے ہی سوچوں کا دھارا اس طرف بہہ نکلا تھا۔ وہ تصور میں اس سے گلے شکوے کرتی کرتی نیند کی سمور کن واہیوں میں اتر گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

جنہیں ساتھ چلنے کی خواہش ہو  
انہیں چھوڑا نہیں کرتے  
جو ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیں  
انہیں جھٹکا نہیں کرتے  
جنہیں ساتھ چلنے کی تمنا ہو  
انہیں موت کی دھمک سنایا نہیں کرتے  
جو کچھ لمبے مانگ کر لائے ہوں  
انہیں ضائع نہیں کرتے  
جو پہلے ہی تمہا ہوں  
انہیں اور تمہا نہیں کرتے

چلو اس شام کو امر کر لیں  
 اس طرح کی شامیں دوبارہ آیا نہیں کرتیں  
 جو وقت گزر جائے  
 زندگی میں دوبارہ آیا نہیں کرتے  
 جنہیں آس ہوتی ہے  
 ان کی آس کی سانس توڑا نہیں کرتے  
 جو پہلے ہی ٹوٹے ہوں  
 انہیں اور توڑا نہیں کرتے

ایک ہفتہ..... پورے ساتھ دن وہ اندھروں میں گم رہا تھا۔ رات دن سیاہ و لیل میں گم رہا تھا۔ بحرِ مہر دار میں گویا اس کی اپنی ذات غرق ہو کر رہ گئی تھی اور اسے اپنے آس پاس ارد گرد اندھیرے ہی اندھیرے نظر آ رہے تھے۔  
 مہر کی ہڈیاں اور ٹکڑی ہوئی حالت.....  
 نانو کی ہر وقت انتقام لینے کی ترغیب  
 روشنی کے تمام روز ان اس کے لیے بند کر دیئے گئے تھے۔

وہ گھر تک سمجھ رہا ہو کر رہ گیا تھا۔ بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ بالکل نہ رہا تھا۔ اس نے اپنے تمام نمبر آف کر دیئے تھے۔ دنیا اور دنیا والوں سے اس کا دل اس بری طرح اچاٹ ہوا تھا کہ وہ سب سے ناراض و تالاں تھا۔ سب لوگ اسے اپنی ماں کی بربادی کے ڈرے دار لگ رہے تھے۔ تمام مردوں کے چہرے اسے اس جیسے نظر آتے تھے اور عورتوں کی شکلوں میں کرن کا چہرہ نظر آتا جیسا کہ واضح تو نہ ہوتا مگر اسے بتایا گیا تھا وہ ہو بہو اس کی جی جیسی ہے۔

”پرنس امیری جان کب تک خود کو روم میں بند رکھیں گے؟ اس طرح تو آپ بیمار ہو جائیں گے۔“ کا کتبہ پیگم کرے میں آ کر بڑی محبت سے اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”باہر نکلنے کا موڈ نہیں ہوتا۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”موڈ بنانا پڑتا ہے بیٹا، آپ جامعہ بھی نہیں جا رہے ہیں۔ گئی ہار حیدر بھی فون کر چکا ہے۔ وہ آپ سے ملنے کو بے چین ہے۔“

”میرا موڈ نہیں ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔

”پھر وہی موڈ۔“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ ”میں سوچ رہی تھی آپ اس مردود انسان سے بدلہ لینے کی ترکیبیں سوچ رہے ہیں مگر محسوس ہوتا ہے آپ کا ایسا کوئی بھی ارادہ نہیں ہے۔ آپ انتقام لینے کی بجائے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔“ وہ

تہدیاں چڑھا کر ہسپتال انگیز لہجے میں بولیں۔

”نانو پلیزا آپ زیادتی کر رہی ہیں“ اس کی فراخ پیشانی پر فلتیں ابھرنی لگیں۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، اگر آپ کو انتقام لینا ہوتا اس بھیزے سے تو اب تک لے چکے ہوتے۔ تمام ماہیں آپ کو بتائی جا چکی ہیں، ویسے آپ کو کسی پلاننگ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سب کچھ آپ کے سامنے ہے ناں..... یہ اور بات ہے آپ اگر از خود لگا ہیں چمائیں۔ شاید محبت انتقام پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔“ فائدہ بیگم جہ کے پہ چر کے لگائے جا رہی تھیں۔ ان کا ہر لفظ اس کی محبت پر تاربانے کی طرح لگ رہا تھا۔

”نانو..... نانو پلیزا اسٹاپ اٹ۔“

وہ بالوں کو ٹھپوں میں جکڑتا ہوا کہنے لگا۔

”خود کو اذیت مت دیں۔ تکلیف و اذیت کا حق دار وہ شخص ہے جو بڑی شان سے لوگوں میں عزت دار بنا ہے۔ کسی مظلوم کی عزت خراب کر کے اب اسے اپنے کیے کی سزا پانا چاہیے۔ بہت عیش و راحت انجوائے کی۔ اب وہ تکلیف و ازار اس کا مقدر بننا چاہیے جو ہماری روحوں کا عذاب بنا ہوا ہے۔“

اس پورے پختے میں فائدہ بیگم کا یہی کام رہا تھا کہ وہ دو قلعے دو قلعے سے آ کر اس کے ذہن کو انتقام کی بجلی میں بھڑکاتی رہتی تھیں۔ مثال بیگم نے دوسرا حربہ اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ ہذیبانی انداز میں یہ ہرانی رہتیں کہ میرا بدلہ کوئی نہیں لے سکتا..... کبھی وہ کہتیں وہ اپنے بیٹے کی نظروں میں گر گئی ہیں، اپنی پامالی کے باعث وغیرہ وغیرہ۔

”ٹیک اٹ ایزی نانو جان۔ مجھ پر اعتبار نہیں ہے آپ کو؟ میں آپ کا بدلہ لوں گا۔ آپ کا انتقام پورا کروں گا۔“

وہ مضبوط و ہڈ عزم لہجے میں غائب ہوا تھا اس بار اس کے لہجے میں یقین و آنکھوں میں وحشی چمک تھی، دردنگی کی جھلک تھی۔

”آپ پر اعتبار ہے سکران پر نہیں، ہر بار وہ چکنی مچھلی کی مانند ہاتھوں سے پھسل کر نکل جاتے ہیں۔“

”اس بار ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ ہڈ یقین لہجے میں گویا ہوا۔

”بڑی خوش خوش آرہی ہیں، کوئی اچھی خبر ہے کیا؟“ مثال بیگم نے سگریٹ کا گھراس لے کر کہا۔

”ہاں، سمجھو آج میں نے پتھر پر ایسی ضرب لگائی ہے کہ نہ صرف اس میں دراڑ پڑی بلکہ..... وہ اپنی جگہ بھی چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے۔“ فائدہ بیگم سے بے حال تھیں۔

”مما! مجھ سے صاف صاف بات کیا کریں۔“

”تم، ان چیزوں سے باہر نکل کر دیکھو تو عقل کام کرنے“ وہ سگریٹ کی طرف اشارہ کر کے گویا ہوئیں۔

”ڈرنک پر تو پابندی ہے اب اس کو لگ پر نہیں نہ کریں۔“ عجاہا وہ بھی منہ ہکا کر گویا ہوتی تھیں۔

”اس بچے پر بس گھر سے باہر نہیں نکلا۔ شاک پر شاک لگے ہیں اس کو..... اس وجہ سے میں نے بھی احتیاط برتی اور تمہیں بھی منع کیا۔“  
 ”اؤوہ ماما اب تو وہ گھر پر نہیں ہے۔“ ہونٹوں سے دھواں خارج کرتے ہوئے ان کا لہجہ بیزار کن تھا۔  
 ”او کے ہم تو ہمیشہ سے اپنی ہی منوانے کی عادی ہو۔“

”آپ جاننے کے باوجود بحث کرتی ہیں۔“ منال کے بد لحاظ اعزاز نے فائدہ پیگم کا موڈ بری طرح آفی کر دیا تھا۔ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔ منال مزے سے کس کس پیش آذاتی رہیں۔

”ماما آپ چپ کیوں ہو گئی ہیں؟“ مسگریٹ قسم کر کے وہ گویا ہوئیں۔

”جب سننے والے دلچسپی نہ لیں تو سنانے والے کا خاموش ہونا بہتر ہے۔“

منال مسکراتی ہوئی ان سے لپٹ کر بیٹھیں۔

”آپ مانتے کر گئیں ماما تم سوری میرا آپ کو ہرٹ کرنے کا بالکل بھی ارادہ نہ تھا، پلیز..... آپ بتائیں پرنس کے کیا ارادے ہیں؟“

”بہت جلد ہماری مراد پوری ہونے والی ہے۔“

”ہمارے پاس ٹائم بھی نہیں ہے ماما۔ کوئین کی واپسی میں زیادہ دن نہیں ہیں پھر اس اولاد و من نے الگ دماغ خراب کر رکھا

ہے۔ نہ معلوم کون کون سے خواب دیکھ رہی ہے، آج کل اور پریشان ہمیں کر رہی ہے۔ کبھی ہے ذوالنون کی حفاظت کرو، وہ اسے بلاؤں

میں گھرا دیکھ رہی ہیں۔“ اپنی ساس کے لیے ان کے لہجے میں مردہری تھی۔

”اور جاؤ بھاگ کر، یہ سب پرنس پر قبضہ کرنے، اور قبضہ بھانے کی سازشیں ہیں۔ پہلے کوئین کو خستہ کرنے کے ذریعے مٹھی میں کیا

اب پرنس پر نظر ہے۔ ایسی ہی باتوں سے یہ اپنا بناتی ہیں۔“

”اگر میں وہاں بچوں کے ساتھ نہ جاتی تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور میں نے کون سا ان کو کاپیٹ لفٹ دی ہے۔ پرنس کے

لپے بار بار فون کر رہی ہیں، ان کے لہجے سے لگ رہا ہے، وہ آنا چاہتی ہیں مگر ہمت نہیں پڑ رہی ان کی..... میں نے بھی کہہ دیا، اُلٹے

سیدھے خواب دیکھ کر میرے بیٹے کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہی کیا، یہ لوگ من لگانے کے قائل نہیں ہوتے۔“ حسب عادت انہوں نے اسے سسرال والوں کے خلاف اُکسایا تھا۔

”آئی کو رس، کبھی لگایا ہے جواب لگاؤں گی، پرنس کہاں گیا ہے؟“

”حیدر کی کٹی کالز میرے پاس آتی ہیں، اس کی آنکھ منٹ ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ پارٹی دے رہا ہے، پرنس کے بغیر وہ کہتا

ہے پارٹی نہیں دے گا۔ میں نے پراس کر لیا کہ وہ پارٹی دے اور پرنس کو میں سمجھوں گی اور میرے کہنے پر وہ گیا ہے، بڑی بے دلی سے۔“

”جلد از جلد وہ ہمارا کام کر دے تو ہم بھی اس قید سے آزاد ہوں، کتنے دن ہو گئے ہیں گھر سے باہر نکلے، کوئی پارٹی انٹینڈ کیے

ہوئے۔ لائف ایک دم ڈل اینڈ بور ہو کر رہ گئی ہے۔“

☆.....☆.....☆

”لب پآتی ہے دُعا بن کے تنامیری

زعمگی تیری زلفوں کی چھاؤں میں کٹ جائے خدایا میری“

ہریرہ بڑی ترنگ میں گنگناٹا ہوا اور داخل ہوا تھا مگر اسی لمحے دوسرے دروازے سے داخل ہوئیں بی بی جان کو دیکھ کر گھبرا کر

خاموش ہو گیا۔ حورین کے لمبوں پر گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”کیا کہہ رہے تھے بہن سے.....؟“ ان کا لہجہ نرم تھا۔

”بہن سے..... لا حول والا قوتہ..... منہ کالا اقدہ ہی کڑوا ہوا گیا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بدبدا کر رہ گیا۔

”کیا کہہ رہے ہو، ذرا حیر لہجے میں کہو، ایک تو نہ معلوم اس نسل کو کیا عادت ہے، خود یولتے ہیں اور خود ہی سنتے ہیں۔ ہماری سمجھ

نہیں آئے۔“

”بی بی جان! میں اور مول ہریرہ کے ساتھ جا رہے ہیں گفٹ لینے۔“ حورین نے موقع دیکھ کر کہا، جبکہ ہریرہ حیران ہو کے بولا۔

”کس نے کہا، میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں؟ نہ بابائتم لوگوں کے ساتھ شاپنگ پر جانے سے بچ رہے، بندہ موت کے کونین

میں بائیک چلائے۔ خریدنی ایک پن کلب ہوتی ہے اور پورے شاپنگ سینٹر کو ایسے کھنگالا جاتا ہے جیسے کوئی نیا امریکہ دریافت کرنے کا ارادہ

ہو۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا تا ہوا گویا ہوا۔

”ارے اللہ نہ کرے جو دوسرا امریکہ ہماری جانوں پر نازل ہو..... ایک امریکہ کم ہے کیا.....؟“ بی بی جان تشبیہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

”سوری بی بی جان۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔“

”بی بی جان اس کو کہیں ناں، ہمیں شاپنگ سینٹر لے جائے۔“ حورین ہریرہ کی جانب سے انکار کے بعد ان سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں..... ہاں لے جائے گا، اس نے کب منع کیا ہے.....؟“ وہ کاؤچ پر آرام دہ انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا تھیں۔

”بی بی جان اپلیز.....“

”خاموش رہو، گھر میں مرد ہوتے ہوئے لڑکیاں اکیلی جائیں، یہ کوئی اچھی بات ہے.....؟ تمہارے علاوہ گھر میں کوئی اور نہیں

ہے ورنہ بھیج دیتی ساتھ..... ایک تو اس گھر میں لڑکوں کو بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔ ان میں صرف وہی تھا جو گھر میں نکلا نظر آتا تھا۔ اب تو اس

کے بھی پر کھل آئے ہیں۔ مجال ہے جو کام کے وقت گھر پر مل جائیں۔“ وہ ہریرہ کو تھڑکتی ہوئی گویا ہوئی تھیں۔

”وہی کی شادی ہو جاتی تو اس کی کیا مجال کہیں جانے کی.....“

”اچھا..... یعنی مردوں کو گھر میں نظر آنے کے لیے بیویوں کا ہونا ضروری ہے؟“ وہ اسے گھورتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

”نہ..... نہ..... نہیں، یہ میں نے کب کہا؟“

”مطلب تو تمہارا سیدھا اور صاف ہے، اگر وہی کی شادی ہو جاتی تو وہ بیوی کے پلو سے بندھ کر بیٹھ جاتا..... نہ معلوم کیا ہو گیا

ہے آج کل کی نسل کو.....؟ شادی سے قبل ہی غلامی کے لیے تیار رہتے ہیں، جو رو کے غلام۔“

پہلی بار ہریرہ وان کے ہاتھ لگا تھا اور وہ چھوڑنے والی نہ تھی۔

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں بی بی جان! میں ان میں سے نہیں ہوں جو بیوی کا آٹھل پکڑ کر چلتے ہیں۔ میں اپنے اشاروں پر چلانے والا ہوں۔ بیوی، بیوی ہوتی ہے، ماں تھوڑی کر جس کی خدمت کر کے جنت حاصل کرنے کی خواہش ہو۔“ اس سے جیتنا آسان نہ تھا۔

”ہوں..... کہہ تو ٹھیک رہے ہو مگر وقت آنے پر دیکھیں گے تم ان بچیوں کو لے کر جاؤ۔“ ان کا انداز حکمیت تھا۔

”آگے آؤ، میں کوئی تمہارا ڈراما تو نہیں ہوں۔“ ہریرہ حورین کو موٹل کے ساتھ بیک سیٹ پر بیٹھتے دیکھ کر بولا۔

”تو کیا ہوا، کبھی کبھی ایسا بھی سہی۔“

”نہیں، آگے بیٹھو گی تو میں ڈراما تو تک کروں گا ورنہ.....“ وہ اسٹیرنگ چھوڑ کر آرام سے بیٹھ گیا۔

”اورہ..... کبھی کبھی تم حد ہی کر دیتے ہو۔“ موٹل کے اشارہ کرنے پر وہ بڑبڑاتی ہوئی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تو اس نے کار اشارت کر دی تھی۔

”یہ تم کار کس اسپیل میں چلا رہے ہو؟ سائیکل والے بھی ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں۔“ وہ از حد سلو ڈراما تو تک کر رہا تھا۔

”جسہیں کسی طرح سکون ہے بھی کہ نہیں.....؟“

”میں نے کیا کیا ہے.....؟“ حورین نے کہا۔

”ٹاسٹ ڈراما تو تک کروں تو کبھی ہو پٹھین چلا رہا ہوں..... سلو ڈراما تو تک کروں تو سائیکل سے بھی کم کہتی ہو، پہلے فیصلہ کر لو تم

چاہتی کیا ہو؟“

”پلیز ہریرہ بھائی! آپ حورین سے بھر کبھی بحث کر لیجئے گا۔ پہلے میں شاپنگ کروادیں۔ دیر ہو رہی ہے۔“ انہیں نچے جھاڑتے

دیکھ کر موٹل نے مداخلت ضروری سمجھی۔

”اچھا..... جیوتی کے بھی ہر لٹکے تمہارے منہ میں بھی زبان آگئی اور مجھے زبان دراز لڑکیاں اچھی نہیں لگتی ہیں۔“ وہ بیک مرر

سے موٹل کو گھور کر بولا۔ موٹل شرمندہ ہو گئی۔

”ہونہر یوں کو جو تمہیں اپنی تعریف کے علاوہ اچھا کیا لگتا ہے؟“

”تم نے کبھی میری تعریف کی ہے؟“

”اس قابل ہوتو کروں۔“

”کرو گی کبھی نہ کبھی ضرور، مجھے یقین ہے اور یقین پر تو نیا قائم ہے۔“

”یہاں خوش فہم لوگوں کی کمی کہاں ہے۔“ اسی طرح کی بحث کرتے وہ شاپنگ سینٹر پہنچے تھے۔

”اترنے سے پہلے صف دے کر جاؤ کہ صرف گنٹ خریدو گی، گنٹ کے سوا کچھ نہیں“ اس نے کار روکتے ہی کسی وکیل کی طرح کہا تھا۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

”رنگی ہم صرف گفٹس خریدیں گے اور کچھ نہیں“۔ حورین غصے سے اسے گھورنے لگی تھی۔ مول مسکراتے ہوئے بولی۔  
 ”کیسے پگھلیں بچکانے بنا گھورے جا رہی ہو، بہت پنڈم لگ رہا ہوں“۔  
 وہ کوئی جواب دیے بنا اتر گئی تھی۔

مول نے رسٹ واقع لی تھی۔ حورین نے پرنسوز اور پرنسز کی بکس لی تھیں۔ حیدر کو گفٹس کرنے کے لیے دو تمام چیزیں بیگ میں رکھ رہی تھی۔

معا سے مخصوص سی جانی بیچنی خوشبو کا احساس ہوا۔ دل ایک خاص انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔

اس نے بے ساختہ نگاہیں اٹھائی تھیں۔ دل کی صداقت رنگ لائی تھی..... وہ سامنے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ شاب کبیر کوئی گفٹ پیک کر رہا تھا۔ حورین کی طرف اس کی پشت تھی مگر پھر بھی اس کی شناخت ہو رہی تھی۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ احساسات میں خوشگواریت کھل سی گئی تھی۔

”دل سے دل کو راہ ہوتی ہے“ کے صداق اس جانب بھی دل نے دل کی تھک بیچان لی تھی۔ جب ہی وہ گفٹس کا شاہراہ لے کر پلٹا تھا۔ نگاہوں کا تصادم ہوا تھا۔

لیکن ایک طرف مسرت و طلوس کے رنگ جھلملا رہے تھے تو دوسری طرف برٹلی سردھری و سنگتی ہوئی بے گامگی تھی۔ اس نے ایک لمحہ سے دیکھا تھا۔ دوسرے لمحے وہاں سے اس طرح گزر گیا جیسے ایک انجان و بے خبر انسان گزر جاتا ہے۔ اس کے لبوں پر پھیلی جان دار مسکراہٹ نے ایک دم ہی دم توڑ دیا۔ ذوالنون کا اس طرح انجینی بن کر گزر جانا اسے سشدر کر گیا تھا۔ سرد موسم کے باوجود اس کے اس توپن آ میرو پیے سے وہ پینہ پینہ ہو گئی تھی۔

اس نے کن آنکھوں سے کچھ فاصلے پر کھڑی مول کی طرف دیکھا جو ہریرہ کے ساتھ کاؤنٹر پر تھی اور اسے اس کو اس جانب متوجہ نہ دیکھ کر کچھ ڈھارس ہوئی کہ اس رنگ دل کے بیگانگی بھرے رویے سے وہ اس کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ گئی تھی۔  
 ”اوائے یہ تمہیں کیا ہوا؟“ مول قریب آ کر حیرانگی سے بولی۔

”ایسے موسم میں پینہ..... تم کچھ پریشان لگ رہی ہو.....“ مول گفٹس پیک کر رہا اس کے پاس آئی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی اس نے حیرانگی سے دریافت کیا تھا۔

”ارے بھئی..... کچھ نہیں ہوا“ اس نے جبراً مسکراتے ہوئے خود کو ہشاش بشاش ٹھاہر کیا۔  
 ”بچ کہہ رہی ہو؟“ ہریرہ نے قریب آ کر سنجیدگی سے کہا۔  
 ”ہاں، چلو دیر ہو رہی ہے“ اس نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆



”ایک وہ دور تھا جب ماکیں بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی ان کے حمیز مع کرنا شروع کر دیا کرتی تھیں اور جب تک لڑکیاں شادی کی عمروں کو پہنچتی، تب تک حمیز بھی مکمل ہو چکا ہوتا تھا۔ ایک دور یہ ہے کہ ایک ہفتہ قبل کوئی برتن لاکر رکھو تو معلوم ہوتا ہے، اگلے نئے اس سے خوب صورت و بہترین برتن آئے ہیں۔ ان کے آگے محض ایک ہفتہ پہلے کی چیز پرانی ہو جاتی ہے۔ بندہ کیا خرید کر رکھے۔ اب تو ہر سامان ہی وقت پر خریدو۔“

زویا کی بات سنی ہوئے کے بعد سے بی بی جان کو عام بزرگ خواتین کی طرح اس سیت لڑکیوں کی مگر ستانے لگی تھی۔ اس وقت بھی میرا، جمیرا، فاریہ اور کرن کے درمیان بیٹی اسی موضوع پر گفتگو کر رہی تھیں۔

”آپ درست کہتی ہیں بی بی جان! اب تو ہر کام ہاتھوں ہاتھ ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود بھی سرالیوں کا اعتراضات کے مواقع مل جاتے ہیں، نہ معلوم کیوں ان رشتوں میں داخل کرنا ان اپنا مزاج و خوش اخلاقی فراموش کر بیٹھتا ہے؟“

”میرا! تمام لوگ نہ تو تھے ہوتے ہیں اور نہ ابھی۔ بڑے اچھے لوگوں سے دنیا بھری ہوئی ہے مگر مجھے امید ہے زویا کے سرال والے اچھے لوگ ہیں۔ وضع داری و اعلیٰ حسب و نسب ان کے ہر اعزاز سے ظاہر ہوتا ہے۔ انشاء اللہ زویا بڑی خوش رہے گی، بڑے قدر دان لوگ ملے ہیں اس کو۔“ ان کے لہجے سے طمانیت ظاہر تھی۔

”آپ کی فہم و فراست پر ہمیں ناز ہے بی بی جان۔ ہماری دعا ہے ان بچیوں کے نصیب بھی آپ کی طرح ہوں۔“ میرا پر عقیدت لہجے میں گویا ہوتی۔

ان کی بات پر بی بی جان کے چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔

”کیوں بددعا نہیں دیتی ہو بچیوں کو؟ رب العالمین میرے سائے سے بھی ان بچوں، بچیوں کو محفوظ رکھے۔“ ان کی دکھ و کرب سے بوجھل آواز میں کچکپاہٹ سی تھی۔

”ایسے کیوں کہہ رہی ہیں بی بی جان! آپ تو ہم سب کا آیلرل ہیں۔ جتنی عقل و شعور، دانشمندی، محبت، عزت، چاہت آپ کو ملی ہے ایسی ہی بچوں کو ملے۔“

”وقت انسان کو ہر ہنر، ہر چلن سے بہرہ مند کر دیتا ہے اور محبت، عزت، خلوص مجھے تم لوگوں نے دیا۔ یہ تم لوگوں کی خدا ترسی و بڑا پن ہے جو مجھ جیسی اجڑ کر آنے والی بد نصیب کو اتنی عزت و وقار دیا کہ باہر والے لے بھی میری عزت کرنے لگے۔“

حکیمہ انداز میں بات کرنے والی بی بی جان کے لہجے میں اس وقت چاشنی بھری اکساری و سروت پنہاں تھی۔

”بی بی جان! خود کی عزت اور خود سے نظرت ہمارے اخلاق و انحال پر منحصر ہوتا ہے۔ آپ میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو آپ کو سب میں منفرد و ہر دلعزیز بنائے ہوئے ہیں۔“ کرن نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”باہر والے بھی آپ کی عزت تب ہی کرتے ہیں جب گھروالے کریں ورنہ میں نے بڑے بڑے لوگوں کو اس عمر میں خوار ہوتے

دیکھا ہے۔ یہ ان لوگوں کی محبت ہی کا اعزاز ہے جو میں اپنی اور غیروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہوں، ورنہ گھر سے رخصت ہونے والی بیٹیاں اجڑ کر گھر پر آ جائیں تو ماں اور باپ کے علاوہ سب انہیں ناقابل برداشت بوجھ دیکھتے ہیں جب اپنے ہی گھر میں جگہ تنگ ہو جائے تو پھر کہیں باہر بھی جگہ نہیں ملتی۔“

بی بی جان جو شادی کے چھ ماہ بعد ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ آپ حادثے میں ان کے شریک حیات کی ڈیوٹی دیکھ رہی تھی۔ ان کے والدین انہیں گھر لے آئے تھے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ وہ دوسری شادی کر کے پھر سے گھر گرجا سکیں لیکن وہ کسی طور راضی نہیں ہوئیں۔ انہوں نے کہا وہ اس گھر سے اب سر کر نکلیں گی۔ زندگی انہوں نے بھائی، بہاوجوں اور ان کے بچوں میں ہی گزار دی تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ بھابھیاں دونوں ٹیک وقت رکھنے والی تھیں اور بھائیوں نے بھی ان سے روپیہ نہیں بدلا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ عزت و احترام کرتے تھے۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ بی بی جان! جو زخم اپنیوں سے ملتے ہیں وہ کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ گزرا وقت ان پر کھر ط ڈال دیتا ہے جو کسی نوکیلی یاد سے پھر نئے لگتا ہے۔ اگر اپنیوں میں اپنائیت رہے تو ہمارے معاشرے میں پھیلے آدھے دکھوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔“  
کرن کے لہجے میں ماضی کے دکھوں کی نمی تھی جو اکثر ان کے دل کے ایک حصہ پر موجود رہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

میں کہ پڑ شور سمندر میرے پاؤں میں  
اب کے ڈوبا ہوں تو سوکھے ہوئے دریاؤں میں  
بے قراری کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں  
تُو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں

”وہ آئے محفل میں ہماری، کبھی ہم ان کو کسی محفل کو دیکھتے ہیں۔“

بلیک تھری نہیں سوٹ میں وہ اپنے مخصوص سٹیج پر اور دلآویز انداز میں وہاں داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے فقرہ چست کیا تھا جب کہ حیدر تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔

”بہت بہت مبارک ہو۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا گنٹا اسے پکڑا ہوا گویا ہوا۔ حیدر پوری شدت سے اس سے پکڑا تھا۔

”یہ کیا حال بنا رکھا ہے یار..... ہوا کیا ہے.....؟“ حیدر نے اس کے چہرے پر پھیلی ذہنی اذیت و بے اطمینانی پوری طرح محسوس کی تھی۔

”مجھے کیا ہوگا؟ آئم فٹ اینڈ فائن۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کس سے جموٹ بول رہے ہو؟ اس سے جو تمہارا مزاج شناس ہے.....؟“

”ابھی صرف رشتے کی ابتدا ہوئی ہے اور تم میں خواتین کی حادثی آگئی ہیں۔ یقین نہ کرنے والی..... تنگ کرنے والی۔“

ذوالنون کو معلوم تھا حیدر کی زیرک نگاہوں سے وہ بمشکل خود کو چھپا پائے گا۔ حیدر ان دوستوں میں سے تھا جو دوستی کا اصل مفہوم جانتے ہیں۔ دوستی ایسے دوستوں پر فخر کرتی ہے۔ وہ بھی حیدر کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس کی ہر مشکل میں وہ آگے آگے رہتا تھا مگر..... اب اس پر جو مشکل پڑی تھی..... ایسی کرناک تھی جو چھپانا اس کے اپنے اختیار میں ہوتا تو وہ اپنے آپ سے بھی پوشیدہ رکھتا پھر کسی دوسرے فریق سے شہر کرنے کی تو بات ہی ناممکن تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنا طبع درست کر کے آیا تھا۔ ایک ہفتہ بعد شیوہ بھی اس نے آج ہی کی تھی مگر اتنی کوششوں کے باوجود بھی وہ حیدر کی حساس طبیعت سے نہ بچ سکا تھا۔

”تم باتوں سے مجھے بہلانا چاہو وہ الگ بات ہے لیکن اس بات پر میں مانگتا نہیں کروں گا کہ دوستی کا پہلا اصول یہی ہے۔“ حیدر نے رنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ ذوالنون پہلو بدل کر رہ گیا۔ وہ بھی ایک خوب صورت و حساس دل کا مالک تھا۔ حیدر کی جذباتی کیفیت وہ کبھی گیا تھا مگر..... خود پر گزری قیامت وہ کس طرح تاتا.....؟

”بھئی اب آپ لوگ یہ راز و نیاز چھوڑ دیں کہ ان کے ساتھ اصل راز و نیاز کرنے والی مخصوص ہو چکی ہیں۔“ ان کے درمیان پہلی تھمبیر خاموشی کو طویل ہونے سے اسد کی آواز نے پھرایا جو حیدر کا کزن تھا اور ان کی دوستی سے واقف بھی۔ ”وہ راز و نیاز ان کو ہی مبارک ہوں۔ ہماری دوستی میں ان کی ذات رکاوٹ نہیں بن سکتی۔“ ذوالنون نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی ہاں..... آپ کا یہ دعویٰ اس وقت سنا میں گے جب آپ کو یہ صاحب اپنی نصف بہتر کی دلفوں کی اسیری میں پڑ کر بچانے سے بھی انکار کر دیں گے۔“

اس کے کلاس فلور ضوان کے کہنے پر زور دار تہہ گونجا تھا۔ حیدر نے اپنے گھر کے ہال میں پارٹی دی تھی جہاں اس نے کچھ دوست، کلاس فلور کو اس نے انوائٹ کیا تھا۔ ہال بہت خوب صورت طریقے سے ڈیکورڈ تھا۔ ہارڈی ویلز ڈیکورڈنگس سب کو سرو کر رہے تھے۔ ماحول میں امپورٹڈ خوشبوؤں کے ساتھ مہمانوں کی سرگوشیاں بھی گونج رہی تھیں۔ حیدر کے والدین نے سب مہمانوں کا استقبال کیا پھر کچھ دیر بعد بیٹے کو وہ اس خیال سے چلے گئے تھے کہ وہ لوگ اپنی مرضی سے پارٹی سلبرٹ کر سکیں۔ ان کے جاتے ہی میزک آن کر دیا گیا تھا اور دوستوں کے بلند گانے گونجنے لگے تھے۔

”حیدرین اکیا ہوا ہے تم ہانگل خاموش کیوں بیٹھی ہو؟“

حیدر اور اس کے والدین کے اصرار پر بی بی جان نے زویا کے علاوہ تمام لڑکیوں کو بھیجا تھا۔ لڑکے اپنی فنی مصروفیات کے باعث نہ آسکے تھے۔ وہ سب لڑکیاں اب ایک نمبل کے گروہ تھیں۔

”تم لوگ بول رہی ہو، میں سن رہی ہوں۔“ بیلا کے استفسار پر اسے اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی اس کا دل چاہ رہا تھا یہاں سے اٹھ کر چلی جائے اور کسی تھا گوشے میں اس قدر روئے کر دل میں لگنے والی آگ جو کہ ذوالنون کی بے رخی و بے گامگی نے لگائی تھی آنسوؤں کے ذریعے بہ لگے۔ شاپنگ سینٹر میں جو اس نے اسے نظر انداز کیا تھا جب بھی وہ جذباتی طور پر بری طرح مجروح ہو کر رہ گئی

تھی مگر پھر یہ سوچ کر خود کو تسلیم دیتی رہی کہ وہ اس کی نگاہوں کا وہم ہو۔ ذوالنون نے اسے دیکھا ہی نہ ہو اور دل برابر اس کی بات کی نفی کرتا رہا تھا۔ بہت تکلف میں وہ تیار ہوئی تھی۔ دھاتی کلر کے سوٹ میں بالوں کو کھلپ کیا تھا۔ دھاتی سوٹ پر میرون فینسی کام تھا۔ اس کی میچنگ کی اسٹون کی جیولری پہنی تھی۔ ان کے اصرار کے باوجود اس نے لپ اسٹیک تک نہ لگائی تھی۔ اس سے قبل سراسر آداب کی پارٹی میں وہ دل و جان سے تیار ہو کر گئی تھی اور اس کا روپ تازہ کھلے گلاب جیسا تھا۔ اب وہ موسم سرما کی حسین مگر اس شام جیسی لگ رہی تھی جس حقیقت کی نفی اس کا دل کرتا آیا تھا اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔ ذوالنون کو وہ دیکھ رہی تھی۔ ہنستا مسکراتا، سب سے ملے جلے کرنا وہ موجود تھا۔ اسے مکمل طور پر انکور کیے گویا اس کی طرف نگاہ کی تو پتھر کا بین جائے گا۔

”تم دن بدن بہت بدلتی جا رہی ہو۔ جب تم یہاں آئی تھیں کس قدر زندگی سے بھرپور تھیں۔ بات بے بات ہنستا، شرمیں لگاتا، ہریرہ بھائی سے لڑتا جھگڑتا..... تمہارے ساتھ رہ کر زندگی انجام دے کر ہم نے سیکھی ہے۔ اب ایسا لگتا ہے جیسے تم بھول گئی ہو۔“

ماہ نور گویا اس کی ایک ایک کیفیت ٹوٹ کر رہی تھی۔

”میں اب بھی ویسی ہوں البتہ بیٹھس لگتا میں نے اس لیے چھوڑ دی ہیں کہ ماما کو یہ پسند نہیں ہیں۔“

”تم لوگ ذویا کو بھی لے آتے تو کتنا مزہ آتا۔ اسی کی پارٹی ہے اور وہ فریب ہی محروم کر دی گئی۔“ شرمین نے لب کشائی کی۔

”ہمارا تو ارادہ تھا مگر بی بی جان نے اجازت نہیں دی۔“

”ابھی بات ہے مول ایزرگ جو کہتے ہیں اس میں ہر پہلو ہماری بہتری اور ہمنائی کا ہوتا ہے۔“

”ممانے مجھے کتنا صبح کیا تھا کراچی آنے سے۔ اگر میں تب ہی ان کی بات مان لیتی تو آج یوں درد دل لے کر نہ بیٹھی ہوتی۔“

مول سے بات کرنے کے بعد وہ خود سے مخاطب ہوئی تھی۔

اسی وقت حیدر کے ہمراہ ذوالنون کو اس طرف آتے دیکھ کر غم و غصے سے اس کے اعصاب تن سے گئے تھے۔ چہرے پر گہری سمجیدگی چھائی چلی گئی۔ وہ نگاہیں جھکا کر بیٹھ گئی۔

”ذوالنون بھائی آپ اسکی پارٹی کب دے رہے ہیں؟“

ردانے اسے دیکھ کر شوخی سے کہا۔

”اسکی پارٹی یہ جب ہی ایں گے جب انہیں کوئی لڑکی پسند آئے گی۔“

شرمین کیوں خاموش رہتی فوراً بول اٹھی۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے اب ان ہی کا نمبر ہے۔ بہت جلد آپ لوگوں کو اس سے بھی اچھی پارٹی ملے گی۔“

حیدر نے سر جھکائے بیٹھی حورین کی جانب اپنی نگاہ ڈالنے ہوئے کہا۔

”تیرے اکون ہے وہ کئی گرل؟“

وہ دونوں ہی استعجابیہ انداز میں گویا ہوئی تھیں۔ حورین کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا تھا۔ اسے ڈر تھا حیدر جذبات میں اس کا نام نہ لے بیٹھے۔ ان سے جان چھڑانا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ جیلا، بشریح، ماہور کی موجودگی میں یہ سب نامناسب تھا۔

”کلی گرل کا نام بعد میں بتایا جائے گا۔“

حیدر کے کہنے پر اس کی جان میں جان آئی۔ حیدر وہاں کھڑا ان سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ اس دوران ڈوالون ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اپنے مخصوص لاپرواہ بے نیاز انداز کھڑا رہا تھا۔

پارٹی کا اختتام پر جب وہ اسٹریپ کھل جانے کے باعث ان لوگوں سے پیچھے رہ گئی تھی جب ڈوالون چلا آیا تھا۔

”ہیلو۔“ وہ میٹشل کا اسٹریپ باندھ کر کھڑی ہوئی تو وہ قریب آ کر گویا ہوا تھا۔ گریے آنکھوں میں بڑی بڑا سرا ریت تھی۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ کل کسی بھی وقت میں منتظر ہوں گا۔“



”یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ بلائیں گے اور میں آ جاؤں گی؟“ حورین نے فنگل بھرے انداز میں اس سے کہا۔

”یہ میری سوچ نہیں۔۔۔۔۔ یقین ہے، میرے جذبوں کی صداقت ہے جو ہر جگہ محل کبھی ہے کہ تم آؤ گی۔۔۔۔۔ ضرور آؤ گی۔“ اس کا طرز خطاب آج عجیب انداز لیے ہوئے تھا۔ حورین کو اس کے قرب سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔

”نہ معلوم آپ کن جذبوں کی صداقت کی بات کر رہے ہیں؟ مجھے ان جذبوں کی صداقت پر یقین نہیں رہا ہے جو لوگوں میں کسی کو آکاش کی بلندیوں پر چڑھا دیتے ہیں تو کبھی آپ ان واحد میں زمین پر ٹیکہ دیتے ہیں۔ خوش فہمیاں صرف دھوکا دیتی ہیں یقین نہیں۔“

”اوہ تو آپ خاصی ناراض دکھائی دے رہی ہیں، کیا غلطی ہو گئی بندے سے بتائیں تو ذرا؟“

وہ اسے کبھی آپ اور کبھی تم سے مخاطب کر رہا تھا۔ مستزاد اس کا انداز بھی بدلا بدلا لگ رہا تھا جو اس کی ذہنی پراگندگی و انتھاکاری نکال دیتی کر رہا تھا۔

”غلط آپ نہیں، میں ہوں جو آپ پر اعتبار کر بیٹھی۔“

”اعتبار.....؟ میں نے کیا غلط کیا ہے؟“ اسے لگا وہ سب جان گئی ہو۔ دل کے چور نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔

”دوستیاش لوگ مجھے کبھی پسند نہیں رہے، ڈوالون صاحب امیں انسان ہوں کوئی ڈمی نہیں، جس پر آپ اپنی مرضی کے تجربے کریں کہ دل چاہا تو بات کر لی اور نہ چاہا تو قریب سے بھی اس طرح گزر گئے جیسے کوئی شناسائی ہی نہیں ہے۔“

”کبھی پتھر کبھی پھول والی دوہری پر سنائی رکھنے والے شخص کو معاف کرنے والی نہ تھی۔ خوب کھری کھری ستا رہی تھی۔“

”آٹم سواری، میں نے ایسا از خود کیا تھا اور اس لیے کہ آپ کی کزنز موجود تھیں۔ ان کے خیال سے ہی میں نے ایسا کیا تھا۔“ وہ

بڑے ایسے انداز میں وضاحتیں دے رہا تھا۔

”میں کل دسٹ کروں گا حریہ ہاتھیں وہیں ہوں گی۔“

”ذوالنون موٹل کو اس طرف آتے دیکھ کر اسے کل آنے کی تاکید کرتا ہوا واپس مڑ گیا۔“

☆.....☆.....☆

کرن محسوس کر رہی تھیں۔ کل سے بی بی جان بہت خاموش خاموش اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی ہیں۔ شاید ماضی کی یادوں نے انہیں اپنی گرفت میں جکڑ سالیا تھا۔ رات میں کھانا بھی انہوں نے برائے نام کھایا تھا۔ صبح ناخستے اور دوپہر کے کھانے پر بھی وہ چند تھپتھے لے سکیں، حالانکہ گھر کا کوئی بھی فرد ان کو نوٹ نہ کر سکا تھا۔ اس وجہ سے وہ ٹیبل پر خاصی متحرک رہتی تھیں۔ کبھی کسی کو ڈش دے رہی ہیں تو کبھی کسی کی پلیٹ میں کچھ ڈال رہی ہیں یا کسی کو ڈپٹ کر ڈانگ کے نقصانات پر لچھوڑے کر ڈانگ سے کھانے پر مجبور کر رہی ہیں۔ اس دوران کوئی یہ محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

کرن نے دروازہ ٹاک کیا، اجازت ملنے پر اندر چلی آئیں۔

”کرن! آؤ..... آؤ بھی! تمہیں اجازت لے کر اندر آنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟“ وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ان سے

قاطب ہوئی تھیں۔

”میں نے سوچا آپ کچھ کام نہ کر رہی ہوں۔“ وہ قریب رکھی جیسے بیٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”ارے میں کیا کام کروں گی.....؟ آرام ہی کرتی ہوں۔“

”بی بی جان! آتم سوسری، کل آپ میری وجہ سے ڈکھی ہوئیں، دراصل مجھے معلوم نہ تھا آپ سے ہونے والی ٹری پیڈی کا، نہ معلوم

ایسا کیوں ہو جاتا ہے، بعض اوقات کسی کے ساتھ قریب ہو کر بھی ہم بہت دور ہوتے ہیں۔“ کرن کے لہجے میں غامت و شرمندگی تھی۔

”معافی کی بات کر کے غیریت کا احساس مت دلاؤ، تم نے کچھ ایسا نہیں کیا جو مجھے ڈکھ دے۔ بیوٹی میرے نصیب میں لکھی ہوئی

تھی۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے پھر جس وقت یہ حادثہ ہوا اس وقت کو طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ لوگ بھول بھی گئے ہیں کہ میں کبھی اس

دلیز سے رخصت بھی ہوئی تھی۔“

”آپ بھولی ہیں اس کو؟“ کرن نے ان کے چہرے کی طرف دیکھے ہوئے کہا، جہاں جدائی کی تحریر ابھی بھی اسی طرح رقم تھی،

گویا ابھی ابھی وہ کرب ناک گھڑی گزری ہو۔

”ارے چھوڑو کیا ہاتھیں لے کر بیٹھ گئیں..... کوئی اچھی بات کرو۔“ مسکرانے کے باوجود ان کے لہجے کی پائیت جھپکی نہ رہ سکی۔

”بی بی جان! آج آپ اپنے دل کی بات کریں، خود پر چڑھے خول کو توڑ دیں۔ اپنے آپ کو بھی اہمیت دیں۔“

”اب یہ ممکن نہیں رہا کرن! یہ خول، یہ حصا راب میرے ساتھ قبر تک جائے گا۔ یہ میری ذات کا حصہ بن چکا ہے۔“ ان کی دیکھی

آواز میں ایک آرزو جھکن نمایاں تھی۔

”اس طرح زندگی نہیں گزرتی بی بی جان۔“

”تین تہائی تو گزری گئی ہے، ایک تہائی رہ گئی ہے، وہ بھی اسی طرح گزری جائے گی پھر میں تمہا کہاں رہتی ہوں..... واصف ہمیشہ میری یادوں میں زندہ رہے ہیں۔ میری تمہائیاں ان کے تصور سے آباد رہتی ہیں۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ضرور ہوئے ہیں۔ دل سے اتنے ہی قریب ہیں جتنے شادی کے پہلے چھ ماہ رہے تھے۔“

بے حد رعب و دہد بے والی بی بی جان کا یہ کھرا کھرا روپ ان کی ظاہری شخصیت سے بے حد مختلف تھا۔ خود کو سنبھالنے کی سعی میں ناکام ہو کر کرن کے سامنے اپنا آپ عیاں کر بیٹھی تھیں کہ عورت ظاہری طور پر خود پر کتنے ہی سر دھری وہ بے اہتنائی کے خول چڑھائے مگر اندر سے وہ کسی گیلی مشی کی طرح نرم ہوتی ہے۔ موسم کی طرح ملائم رہتی ہے۔ ذرا محبت و اپنائیت کی آنچ ملی اور وہ پھلنا شروع ہو جاتی ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ مگر کے تمام لوگ ان کے رعب و کمرے مزاج کے باعث خاصے فاصلے پر رہتے تھے۔ دونوں بھادرجوں و بہن قاریہ کو بھی انہوں نے حد ادب میں رکھا تھا۔ بیٹوں ان سے عمروں میں بھی چھوٹی تھیں، اس لیے انہیں حوصلہ بھی نہیں ہوا۔

کرن قاریہ کی ہی ہم عمر تھی مگر یہاں آ کر اس کا وقت زیادہ تر ان کے ساتھ گزرا تھا اور ان کے درمیان دوستانہ بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی ماسی دوستی نے انہیں حوصلہ فراہم کیا تھا۔

”چھ ماہ میں ایسی محبت جو آپ کی پوری زندگی پر اس طرح سے حاوی ہوئی کہ آپ نے عمر اسی میں وقف کر دی۔“

”ہاں کرن! وہ چھ ماہ میری زندگی کا حاصل ہیں..... ان چھ ماہ میں، میں نے زندگی گزار لی تھی اور جب سے اب تک زندگی مجھے گزار رہی ہے۔“ گہری سانس لیتے ہوئے ان کے چہرے پر سہیدگی تھی۔

”چھ ماہ میں اتنی محبت قابل رشک ہے۔“

”محبت کا چلن بھی محب ہے کرن! کبھی انسان اس کو پانے کی چاہ میں زندگی گزار دیتا ہے اور یہ حاصل نہیں ہوتی اور کبھی ایک لمحے میں سٹ کر حاصل زیت بن جاتی ہے۔“

”جیسے میرا بچپن اس کی جستجو میں گزرا تھا۔ اسی نازیت ہی اس سراب کے پیچھے دوڑتی رہی تھیں اور انہیں چاہت تو کیا محبت کے نام کی بھیک تک نصیب نہ ہوئی تھی۔ از روایتی زندگی کا خسن ہی کبھی محبت ہے۔“

”تم بھی بہت خوش نصیب ہو کرن! اس دل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتے ہیں، تم ان کی محبت کی قدر کرو۔“

☆.....☆.....☆

محبت سوز ہے

محبت ساز ہے

محبت وصل ہے

محبت فراق ہے

محبت وہ آگ ہے جس میں تپ کر سونا کنکن بن جاتا ہے۔ دیرانوں میں بہا آ جاتی ہے۔

صراؤں میں پھول کھل اُٹھتے ہیں اور ہر سو پھولاری ہلک اُٹھتی ہے، اس کے دل میں بھی ذوالنون کی محبت گلاب کی طرح ہر سو ہنسی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کے تصور میں گم تھی۔ کل اور آج میں کتنا فرق تھا اس کے..... کل جس شخص کی پرچائیں سے بھی وہ بغض رکھتی تھی، آج اسی کے تصور سے اس کے دن و رات روشن تھے۔

”کس کے خیالوں میں گم ہو؟“ مولیٰ قریب پہنچتی ہوئی بولی۔

”کس کے خیالوں میں گم ہو سکتی ہوں؟“ خواہا مسکرا کر بولی۔

”ہوں..... ایک ہی بندہ ہے، کل حیدر کے ہاں سے وہ ایسی پردہ کیا کہہ رہے تھے؟“

”وہ..... مجھ سے ملنا چاہتا ہے، محبت اصرار کر رہا تھا۔“ حیرین نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ، اب تم ڈیٹ پر جاؤ گی؟“ مولیٰ نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”ایڈیٹ، بگڑا اس مت کرو۔“ اس نے سُٹکار سید کیا۔

”بکواس نہیں، سچ کہہ رہی ہوں۔“

”میں نہیں جا رہی ہوں، اظہارِ رائے۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”واٹ؟ آریو سیریس.....؟“

”ہاں، میں نہیں جاؤں گی، میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔“

”کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ میں تو مذاق کر رہی تھی، انہوں نے بلایا ہے تو چلی جاؤ۔“ مولیٰ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”میں اچھا فیصلہ نہیں کر رہی، میرا دل نہیں مان رہا پھر میں ماسے کیا کہوں گی؟ انہیں یہ سب معلوم نہیں ہے اور وہ اس بات کی

اجازت دیں گی بھی نہیں۔“

اس کے دھبے لہجے میں اضطراب و اضطراب پنہاں تھا۔ وہ دل و دماغ کی کشش میں جٹلائی جہاں اس میں ایک شدید جگ چھری

ہوئی تھی۔ دل کہتا تھا یار کی راہ پر آنکھیں بند کر کے دوڑتی چلی جا۔ پہلی دفعہ اس نے دعوت دی ہے شاید محبت کے اظہار کے لیے وہ بہ عین

ہو، کیونکہ ابھی تک اتر صرف آنکھیں کرتی آئی ہیں، لب و لہجوں کے خاموش رہے ہیں۔

دل صدا لگا رہا تھا مت جا، یہ اجنبی راستے ہیں ان پر بھگنا آسان ہوتا ہے، پھر وہ اپنے موڑ سے چلنے والا شخص اس قابل ہے کہ

اس کی محبت پر بھروسہ کیا جائے؟ اس کی چاہت پر یقین رکھا جائے؟

”تم آئی کو مت تاؤ۔“ مولیٰ نے مشورہ دیا۔

”یہ کس طرح ممکن ہے؟ میں..... میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ وہ دائروں میں ہونٹ دباتے ہوئے کہا غصی۔



”بعد میں بتا دیا یا راسخ تو خیال ہے تمہیں ذوالنون بھائی سے ملنے کے لیے جانا چاہیے۔ وہ ایسے ویسے شخص نہیں ہیں۔ ان کا کردار، ان کا اخلاق روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ تم ان سے بلا خوف و خطر مل سکتی ہو اور میرا خیال ہے وہ کسی وجہ سے ہی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ کوئی ضروری بات ہوگی، ورنہ وہ ان تھرڈ کلاس حاشیوں میں سے نہیں ہیں جو موقع بے موقع اپنے جذبوں کی تشہیر ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ تم سے محبت کرتے ہیں مگر ان کے جذبوں میں اس قدر احترام و پاکیزگی ہے جو کسی کو بھی محسوس ہی نہ ہو سکا کہ وہ تم کو چاہتے ہیں۔“ مولیٰ کی ہر بات پر دل صداقت کی مہر لگا رہا تھا، اسے افسوس ہوا اور پھر وہ دل کی دکھائی گئی راہ پر آگئیں بند کر کے چلنے پر تیار ہو گئی تھی۔

مٹی سے وہ جھوٹ بولانا نہیں چاہتی تھی۔ وقت نے اسے جھوٹ بولنے سے محفوظ رکھا تھا۔ کرن، انس کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔ لائٹ پر پلے گرم سوٹ پر اس نے پر پلے و بلیک شال لی تھی جس پر خوب صورت لٹنی شوخ کلر کی کڑھائی تھی۔ میچنگ کی نازک سی جیولری میں اس کا سادہ چہرہ بے حد حسین و جاذب نگ رہا تھا۔ بالوں کو کلاپ میں جکڑا تھا، وہ تیار تھی۔

”اب کیا سوچ رہی ہو، جاؤ اس سے قتل کہ کوئی آئے اور ہزار جھوٹ گھڑنا پڑیں۔“

تیار ہونے کے بعد اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر مولیٰ نے کہا۔

”مولیٰ! میں اپنی بہنوئی سمجھ نہیں پا رہی ہوں، کبھی دل کہتا ہے نہیں جاؤں۔ یہ ماما اور ڈیڈی کے اعتماد کو کچھ کچھ کھینچ کر لے لیا۔ کبھی دل کہتا ہے چلی جاؤں، سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں؟“ وہ گویا رو دینے لگی تھی۔

”تم جاؤ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذوالنون بھائی کو متع کر دینا کہ ہمارے ہاں اس طرح کا دستور نہیں ہے۔ یہ پہلی ملاقات ہی آخری ہے۔ وہ سیدھے طریقے سے اپنی ماما کو بھیج دیں۔“ مولیٰ اسے لہر پر طریقے سے دلا سے دے رہی تھی اور چاہ رہی تھی کہ وہ ذوالنون سے ملنے جائے کیونکہ ذوالنون نے نکل سے اب تک اسے کئی کالز کر کے مجبور کیا تھا کہ وہ اس کی بہن بن کر حورین کو ملاقات پر راضی کرے۔

☆.....☆.....☆

”کرن اماشاء اللہ یہ گھر تو آپ کے خوابوں کی تعبیر ہے، بہت خوب صورت ہے۔ روشن، ہوا دار تمام آسائشوں سے مزین۔“ قاریہ اور سہان کے ہمراہ نئے گھر کی سینگ اینڈ ڈیکوریشن دیکھ کر وہ تھوٹھی لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

”خوابوں کی جب تعبیر ملتی ہے تو دیر ہو چکی ہوتی ہے اور جب دیر ہو جائے تو دل کرتا ہے کاش یہ خواب خواب ہی رہتے۔“ کرن کے امداد ایک ہو کر ہی اٹھتی تھی۔

”بیگم اس گھر کا ابھی تک آپ نے کوئی نام نہیں بتایا، کیا نام رکھیں ہم اپنے اس گھر کا؟“ انس صاحب نے کئی دفعہ کا پوچھا سوال ڈہرایا۔

”کرن! تم نے ابھی تک اس گھر کا نام ہی نہیں سوچا ہے؟ یہ کام تو تمہیں سب سے پہلے کرنا چاہیے تھا، مجھے دیکھو ابھی وہاں کسٹمرکشن کا کام جاری ہے اور میں نے نام بھی سوچ لیا ہے۔“

”اچھا..... کیا نام سوچا ہے؟“ کرن مسکرا کر گویا ہوئیں۔

”پنک ہاؤس“۔ وہ شوق انداز میں بولیں۔

”پنک ہاؤس..... بھابی اداویٹ ہاؤس کی ٹگر پر نام رکھ ہی ہیں کیا؟“

”نہیں افس بھائی اچھے پنک گلرا حد پسند ہے، وہاں تمام کام پنک اسٹون کا کراؤں گی، گلرا اسکیم اور ڈیکوریشن بھی پنک اور

واہیٹ کی کمی نیشن کراؤں گی۔“

”تھیک گاڈا انہیں کھی یہ خیال نہیں آیا ہم پر پنک پینٹ کروانے کا۔“ سعد بے ساختہ بول اٹھے۔ افس کے ساتھ وہ بھی مسکرا اٹھیں۔

”آپ کو تو موقع ملنا چاہیے ہونگے گا۔“ فار یہ کھسیا کر گویا ہوئیں۔

”بھئی افس نے کوئی ہونگے نہیں کی، بس یوں ہی خیال آ گیا جو میں بول اٹھا۔ بات ہو رہی تھی کرن سے اور درمیان میں آپ

تاگ اپنی پھنسا بیٹھی، بتاؤ کرن۔“ سعد کے لہجے میں بھائیوں والا لانا تھا۔

”نام میں نے اکثر سوچا ہے، ایک ہی نام عموماً میرے ذہن میں گونجتا ہے۔“

”ہاں تو یار! بتاؤ ناں کیا نام ہے وہ؟“ افس صاحب کے لہجے میں چاہت بھرا اشتیاق تھا۔

”آشیانہ۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں اور ذہن میں بائیس کا وہ منظر پوری طرح زندہ ہو گیا، جب معمولی سا دودھ گر جانے پر ما

نے بڑی ممانی سے خوب بائیس سنی تھیں اور تنہائی میں جائے نماز پر وہ روتے ہوئے اپنے رب سے دعا گو تھیں کہ انہیں بھی ایک چھوٹا سا

آشیانہ عطا کرے جہاں وہ اپنی بیٹی کو لے کر چین و سکون سے رہیں۔ اس رات اس نے بھی ان کے ساتھ خاموشی سے آسو بہائے تھے اور

انہیں خبر بھی نہ ہوئی تھی۔

”آشیانہ، یہ تو بہت خوب صورت نام ہے۔ میں کل ہی نم پلیٹ کا آرڈر دیتا ہوں۔“ افس بڑے مسرت انداز میں گویا ہوئے۔

”افس! آپ میری بہتوں سے میری خواہشوں سے اختلاف کیوں نہیں کرتے؟ کبھی تو کہا کریں میں غلط ہوں۔“

”ارے یہ کیا بات کر رہی ہو؟ شکر کرو افس بھائی تمہارا اتنا خیال رکھتے ہیں، اس قدر محبت کرتے ہیں۔ اتنے سیدھے شوہر ہیں

جس کی تنہا بیوی کرتی ہے۔ ایک یہ ہیں جن کو میری ہر بات سے اختلاف ہوتا ہے، ہر خواہش پر اعتراض..... مجال ہے میری بات بلا بحث

وگھرا مان لیں۔“

”مجھ جیسے سیدھے بندے پر محبت لگا رہی ہو، اللہ پوچھے گا۔“ سعد نے کسی صورت بنا کر کہا۔

”میں جانتی ہوں آپ بالکل جلیبی کی طرح سیدھے ہیں۔“ ان کے جلے بننے انداز پر دونوں مردوں نے ہنس پڑے تھے۔

”ٹو بہت لگی ہے یار جو تیری آج تک کرن سے لڑائی نہیں ہوئی ہے، بانی واو سے لڑا کیا ہے؟“

”دیری سپیل، میں نے آج تک کرن کو یہی نہیں سمجھا۔“ وہ محبت آمیز لٹکا ہوں سے کرن کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

کرن حیا سے جھینپ رہی تھیں۔

”محبوبہ سجھا ہے، ہندہ بیوی سے پورے ہو سکتا ہے ہلائی جھڑے کر سکتا ہے مگر محبوبہ سے نہیں۔ بھورے ہونا، آج سے تم بھی یہاں کی کو بیوی نہیں محبوبہ بھٹا شروع کر دو۔“

☆.....☆.....☆

”مئی آپ کو یقین ہے پرس ہماری تو قحاحات پر پورا اترے گا؟“ منال بیگم خوشی و بے یقینی کی کیفیت میں جھٹلا تھیں۔

”آف کورس، ہنڈرڈ پورسٹ پرسٹ۔ میں نے وہ آگ دکھائی ہے جو انتقام لیے بغیر بجھنے والی نہیں ہے۔“ فائزہ بیگم کے چہرے پر مکاری کی کربہ چمک تھی۔

”پھر بھی میں آخری لمبے تک بے یقین رہوں گی، اس لیے کہ پرس کی نچر جانتی ہوں اس کا کریکٹر ہمیشہ سے براعت رہا ہے، وہ کسی کو نظر بھر کر دیکھنے کا روادار نہیں ہوتا۔“

”آپ مجھے یہ سب اس طرح بتا رہی ہو گویا میں کوئی انجینی ہوں، تمہاری طرح میں بھی اس گھر میں رہتی ہوں اور پرس کی نچر جانتی ہوں۔“ حسب عادت وہ برامان لگی تھیں۔

”اوہ مئی! آپ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مانڈ کر جاتی ہیں۔“

”آپ بات ہی ایسی کرتی ہیں۔ گویا مجھ میں کوئی عقل ہی نہیں ہے۔ آپ تو بیمار بن کر بیڈ ریٹ کر رہی ہیں اور میں نے آرام چھوڑ کر پرس کی مکمل نگرانی کی ہے۔ سایہ بنی رہی ہوں۔ پل پل کی خبر رکھی ہے تب جا کر آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔“

”یو آر گرین ماما آتم پراؤڈ آف یو۔ اگر آپ نہ ہوتیں تو میں کچھ نہ کر پاتی۔“ انہوں نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ فائزہ نے بھی حصہ بھلا کر ان کی پیشانی چوم لی تھی۔

”برہان کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ کال آنے کی بہت تاخیر ہو گیا ہے۔“

”ہم خود چلیں گے ان کے پاس، کچھ دن اور ڈیڑی کو خوش ہونے دیں۔“ منال نے شوخی سے کہا۔ معاکال تپل بھی تھی۔

”اس وقت کون آ گیا؟“ دونوں ماں بیٹی چونک اٹھی تھیں۔

”پرس تو نہیں آئے؟“

”اتنی جلدی ان کی واپسی ممکن نہیں ہے۔“

”پھر کون ہو سکتا ہے؟“

وہ پریشان ڈسکس کر رہی تھیں اور کال تپل مسلسل اس دوران پرس کی جارہی تھی۔ فائزہ بیگم کو میٹ کھولنا پڑا تھا۔ سامنے کڑی ہستی کو دیکھ کر دونوں ماں بیٹی کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔

”السلام علیکم ناوا ایڈمی! آپ لوگ مجھے دیکھ کر اتنے شاکڈ کیوں ہیں؟ کیا میرا آنا آپ لوگ ایسی کٹ نہیں کر رہے تھے؟“  
 لاؤنج میں قدم رکھتے ہوئے آنے والے کونین نے ان کے حیران پریشان رویے نوٹ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”ارے نہیں۔ ہم شاکڈ کیوں ہوں گے۔ دراصل آپ کو بنا اطلاع آئے دیکھ کر خوشی سے لگ رو گئے تھے۔“  
 ”میں نے سوچا اس بار آپ کو سر پرائز دیا جائے۔“  
 ”ہم ریکٹی سر پرائز ہو گئے ہیں۔“ دلوں میں ان کے پڑیش و شویشاک لہلہ بھیل رہی تھی مگر ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ سمائے  
 اس سے ملی تھیں۔

”مما! پرس کہاں ہے؟“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

”لگ..... کیوں کیا ہوا؟“ اس کے سوال پر دونوں کے دل دھڑک اٹھے تھے۔ گویا وہ چوری کرتے وقت رکتے ہاتھوں پکڑی  
 گئی ہوں۔

”ابنی پراہلم؟ آپ تکیوڑ کیوں ہو رہی ہیں؟“ ان کے اعجاز پر وہ حیرانگی سے دریافت کرنے لگا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پرس گھر نہیں ہے۔“ منال چوستانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”وہ دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا ہوا ہے۔“

”شکار پر..... مگر اسے شکار کبھی پسند ہی نہیں رہا۔ نہ اس نے کبھی کیا ہے۔“ کونین متحجب تھا۔

”ارے یہ کیا بحث لے کر بیٹھ گئے چٹا۔ ستر کر کے آئے ہو۔ ہاتھ لے کر فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔“

”تھیکس ناوا میں فریش ہوں۔ بھوک نہیں ہے مجھے۔ آپ کار میں سے سامان لگوا لیں۔ میں آفس چارہا ہوں۔“ وہ درست

واج دیکھتا ہوا کھڑا ہو کر گویا ہوا۔

”اٹا ستر کیا ہے کچھ ریٹ تو کر لیں۔“

”پلیں میں نیند بھری ہے میں نے خوب۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ فائدہ بیگم نے منال کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر ٹھکرات تھے۔

”ڈونٹ وری۔ آفس میں کافی کام پینڈنگ ہے ان میں الجھ کر یہ پرس کو بھول جائیں گے۔“ انہوں نے منال بیگم کو تسلی دی تھی۔

کونین کو آفس آئے زیادہ دیر نہیں ہوئیں تھی کہ اس کی سیکرٹری نے آکر کسی کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا آج کوئی اپائنٹمنٹ نہیں لینا ہے پھر بھی آپ کہہ رہی ہیں مجھ سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔“ اس کے آگے

گلابی بھیل پر فائیں بھری ہوئی تھیں وہ ایک فائل پر جھکا ہوا تھا سیکرٹری کی اطلاع پر گویا ہوا۔

”سرا میں نے کوئی اپائنٹمنٹ نہیں لیا ہے۔ یہ صاحب بغیر اطلاع کے آئے ہیں۔ میں نے کہا بھی سر بے حد بڑی ہیں۔ نہیں

مل سکتے کہنے لگے ہمیشی تک تو فارغ ہو جائیں گے۔ میں جب تک انتظار کروں گا۔“



”آتم ایکسٹریملی سوری ہا۔ میں نے آپ کو وٹ کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا آپ اس طرح آئیں گے۔ آپ کو ڈائریکٹ یہاں آ جانا چاہیے تھا۔ یہ سب آپ ہی کا تو ہے۔“

”مگر رات مجھے پوری طرح بدل گیا ہے بیٹے۔ مجھے اعتماد نہیں تھا کہ آپ مجھے اتنی جلدی پہچان لیں گے۔“ حمزہ کے لہجے میں لڑش ہی تھی وہ بڑی شفقت سے اسے دیکھ رہے تھے جو ان کی کافی شبہت لے ہوئے تھا۔

”آپ دور رہ کر بھی ہمارے قریب رہے ہیں پھر بھلا میں آپ کو کیسے نہ پہچانتا۔ وقت نے کچھ تبدیلی ضرور کر دی ہے۔ مگر ایسی بھی نہیں جو آپ کی شناخت ہی مٹا دے بابا۔ آپ چلے کہاں گئے تھے۔ آپ کو ہر جگہ محو حظا پر آپ نہ ملے۔“ وہ ان کا ہاتھ آنکھوں سے لگاتا ہوا گویا ہوا۔

”یہ طویل داستان ہے بیٹا! ضرور سناؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ۔ وہ النون کیسا ہے؟ اس نے مجھے کس تو نہیں کیا؟“ وہ النون کے نام پر ان کی نگاہوں میں دلہانہ چمک ابھری تھی۔

”آپ سے دوری نے اسے بالکل بدل کر رکھ دیا ہے بابا جان۔ پرنس وہ پرنس نہیں رہا جو آپ کے سامنے تھا۔ آپ کی جہاں نے اس کی پرستاشی بری طرح ڈسٹرب کر کے رکھ دی ہے۔“

”اوہ..... کہاں ہے وہ؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ عزیز اذ جان بیٹے کو دیکھنے کے لیے اس لئے وہ مرغ بہل کی طرح تڑپ اٹھے تھے۔ جس سال کا حوصلہ صبر اب بالکل ہی اختیار سے نکل رہا تھا۔ تاب برداشت دم توڑ رہی تھی۔

”وہ یہاں نہیں ہے۔“

”کہاں ہے؟ وہ انتظار جھیلنے کے قابل نہ تھا۔“

”رات تک واہسی ہوگی۔ وہ فرینڈز کے ساتھ شکار پر گیا ہے۔“

”بیس سال جب صبر و ضبط کی لگا میں تھا سے میں گزار دیے۔ اب محسوس ہوتا ہے کسی بھی آن کسی بھی پہلے یہ لگا میں مجھ سے چھوٹ جائیں گی۔ انتظار کی صلیب مزید اٹھائی نہیں جائے گی۔“ ان کے لہجے میں بھرا کرب تھا۔ تہائی کا سوز تھا۔

”بابا جان اپلیز آپ ہرٹ نہ ہوں وہ جلدی آئے گا۔“

”ہاں لیکن مجھے تو یہ کھٹے صدموں کے برابر ہی لگیں گے۔“

”بابا جان اگھر چلیں۔ ماما آپ کو کچھ کر خوش ہوں گی۔“

”نہیں..... پہلے میں آپ کی نہیں اپنی ماں سے ملنا پسند کروں گا۔ امی جان..... حیات تو ہیں؟“ انہوں نے دھڑکتے دل سے راجہ بیگم کے متعلق پوچھا۔

”جی..... دادو! بفضل تعالیٰ ہم میں موجود ہیں اور رات دن آپ کو یاد کرتی ہیں اور آپ کی واہسی کی دعائیں کرتی ہیں۔“ باب

کے انکار پر اسے برا نہیں لگا تھا اس لیے شاید کراہتے عرصے میں اس کی ممانے بھی کبھی یاد نہیں کیا تھا اگر کبھی بھولا بسر اخیال بھی آیا تو ماما اور نانا کو برے واقعات سے ہی باپ کو نوازتے ہوئے دیکھا تھا۔  
 ”چلیں بابا! آج دادو کس قدر خوش ہوگی۔ اس خوشی سے ہی مجھے خوشی ہو رہی ہے صراحتاً کی نہیں بھی خوش ہوگی۔“ وہ مزہ کر لے کر روانہ ہو گیا تھا۔

کارخانے راستوں پر دوڑ رہی تھی۔ کونین ڈرائیونگ کرتے ہوئے ان سے گفتگو بھی کر رہا تھا۔ وہ سنتے ہوئے کھڑکی سے دیکھ رہے تھے جہاں ہر جگہ جہدِ طریاں بڑے پیمانے پر تھیں۔ ان کا ذہن ادا لٹون کی تڑپ میں پھلنے لگا تھا۔

☆-----☆-----☆

وقت کے اس کھیل میں  
 غمِ خوشی کے میل میں  
 رشتے ناطے کچھ نہیں  
 اپنے ارادے کچھ نہیں  
 بورد ہے ہیں لڑتوں کو  
 کھور ہے ہیں چاہتوں کو  
 جی رہی ہیں سادشیں  
 کہہ رہی ہیں رنجشیں  
 یہی انسان کیا  
 یقین کیا گمان کیا  
 کیسی ہے یہ تقدیر  
 یہی کیوں تعبیر ہے  
 یہی کیسی میل تال ہے  
 کہ زندگی وہاں ہے  
 ہر خواب تو بکھر گیا  
 گلستان اجڑ گیا  
 مل گیا آدمی  
 انسان تو چھڑ گیا

لائٹ بلو جینز، بلڈ ریڈ شرٹ میں وہ وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ اس کے وجہ چہرے پر کوئی جذبہ، کوئی امنگ نہ تھی۔ عجیب ساٹ پن تھا جیسے وہ سانس لیتا ہوا کوئی روبوٹ ہو۔ اس کے چہرے پر صرف سرخی میں ڈوبی ہوئی دو گہرے آنکھیں تھیں جن میں پل پل مچلتا اضطراب و وحشت اس کے انسان ہونے کا ثبوت تھا۔ کئی راتوں سے وہ سکون سے سو نہیں پایا تھا۔ گزشتہ دو راتوں سے تو وہ ایک لمحے کو پاک نہ چھپکا پایا تھا۔

تیندا آتی بھی کیونکر..... اپنی خواہشوں و آرزوؤں کو اپنے ہاتھوں سے خاک کر کے جین کس طرح میسر آ سکتا ہے؟

وہ دہری آگ میں جل رہا تھا۔

ایک ناکام عشق کی.....

دوسری پامال عزت کی.....

چاہت پر حمیت غالب آ گئی تھی۔ ہاں کی حالت، نانو کے طعنوں و جواب جلی نے اسے وہ کام کرنے پر مجبور کر ڈالا تھا جس کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا۔

حورین نے ڈرامہ کو بھیج دیا تھا۔ خود جھجکتی ہوئی سرخ اسٹون والے کالج کی طرف بڑھی تھی۔ چھوٹا سا لان عبور کر کے تین میز حیاں تھیں۔ میز حیوں سے اوپر چھیں ماربل کا چھوٹا سا برآمدہ تھا جس پر بڑے بڑے گولوں میں مٹی پلائٹ لہلہا رہے تھے۔ سامنے ہی بلاسٹنگ گلاسز والا گیٹ تھا جہاں کی روشنی میں بھی اندھیروں کا پیام دے رہا تھا۔ ہوا کا سرد جھونکا آ کر گزر گیا تھا۔ کال بیل کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ نہ معلوم کس جذبے کے تحت رک گیا۔ دل سے صدا ابھر رہی تھی۔

وہ واپس چلی جائے۔ یہاں نہر کے آوازیں تھیں کہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں اور ممکن تھا کہ وہ واپس پلٹ جاتی۔ گیٹ کھلا تھا۔ "ہیلو۔ ہا رہی سے واپس جانے کا ارادہ ہے؟" دروازے کے درمیان وہ ایسا وہ تھا۔ لیلوں پر دلچسپ مکان سجائے۔ بڑے والہانہ انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں پائی۔ اس کی والہانہ نظروں کی چٹس نے اس کی نگاہیں جھکا دی تھیں۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"نہیں کڑے رہنا ہے؟ سردی لگ گئی تو مجھ پر نام آئے گا۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے ہمراہ اندر چلی آئی۔ لاؤنج میں بیٹران تھا۔ لائٹ اینڈ ڈارک ہلو کٹر کیمپیشن سے کمرے کا ماحول خواب ناک سا تھا۔ پنک فرنیچر، پنک پردے و کارپٹ سے وہاں بڑی خوب صورتی سے ڈیکوریشن کی گئی تھی۔ دیواروں پر بڑے فریموں میں دو بیزیز تھیں جن میں برف سے ڈھکے پہاڑوں، گرتی آبشار اور ہنرے میں کھلے جنگلی گلابوں کی بہتا بڑی خوب صورتی سے محفوظ کیا گیا تھا۔

"تکلفات چھوڑ دینے جاؤ۔" وہ اسے کڑے دیکھ کر بولا۔

"بہت خاموشی ہے آپ کی ماما اور نانا تو کہاں ہیں؟" وہاں پھیلی ہوئی خاموشی اسے عجیب لگی تھی۔



”تم مجھ سے ملنے آئی ہو یا ان سے؟“ وہ اس کے مقابلہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”جو گھر میں موجود ہوں، سب سے ہی ملا جاتا ہے۔“

”گھر میں صرف میں ہی ہوں۔ مجھ سے ہی ملو۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بھاری لہجے میں گویا ہوا۔ نہ معلوم کیا تھا اس کی لہورنگ آنکھوں میں کیا تھا کہ اس کے بدن پر ہزاروں کی تعداد میں جھوٹیاں سی ریچکے لگیں وہ گھبرا گئی۔

”کیا مطلب؟ یہاں کوئی اور نہیں ہے۔؟“

ماحول میں چھائی خاموشی و وحشت اس کی رگ رگ میں سرایت کرنے لگی اور پریشان سی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”اور سے کیا مراد؟ میں..... اور..... تم ہیں نا؟“ وہ قریب آتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ اس کے لباس سے اٹھتی ہوئی تیز جھک،

اس کا ہڈی لانا اندازہ لگا ہوں کی تپش حورین کے ہاتھ پیروں میں سنسنات سی دوڑنے لگی تھی۔

”میں جاری ہوں۔“ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”اتنی جلدی۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی آئے وہ یہی کتنی ہوئی ہے۔“

”میں ماما کو بتا کر نہیں آئی ہوں۔ فرسٹ ٹائم ایسا ہوا ہے مجھے اچھا لگیں نہیں ہو رہا۔“ وہ یہاں سے فوراً جانا چاہتی تھی۔

”لیکن..... مجھے بہت اچھا لگیں ہو رہا ہے۔ میں جانے نہیں دوں گا۔“

”میں جاؤں گی۔ اگر آپ مجھے بتا دیجئے کہ آپ کے فیملی ممبرز یہاں نہیں ہیں تو کبھی نہیں آتی اور نہ میں اب رکوں گی۔“ وہ خود کو

سنبھالتی ہوئی مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

”کرن اور انس جیسے کربے لوگوں کی بیٹی کے منہ سے یہ ہارسائی کی مائیں بالکل نہیں سوٹ کر رہی ہیں۔“ وہ استہزاء سے انداز اور

کاٹ دار لہجے میں گویا ہوا۔ حورین کو اپنی ساتھیوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔

”کیا..... کیا کہا.....؟ پھر سے کہنا؟“

”میں ان گھٹیا لوگوں کے ناموں کو زبان پر لانا بھی اپنی تو جین بھکتا ہوں۔ یہ لوگ ہیں جہاں انسانیت پر شرمناک دھبہ ہیں۔“

”اسٹاپ! اٹ۔ تمہیں معلوم ہے تم کہہ کیا رہے ہو اور کس کو کہہ رہے ہو؟“ اس کے مہیا کے لیے اس کے لہجے میں اس قدر نفرت

واتنی تھارت تھی۔ وہ ایک دم خج کر گویا ہوئی تھی۔

”جو موت۔“ وہ بری طرح فرمایا تھا۔

”جوڑوں گی، چلاؤں گی۔ یہ سب کیا ہے؟ تم نے مجھے اس لیے یہاں بلا یا ہے کہ بلا وجہ میرے پیرٹس کو اتنے برے نظروں سے

یاد کرو اور میں چپ چاپ سنوں؟ پھر انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ پچا سے تمہاری صرف ایک بار سرسری سی ملاقات ہوئی ہے اور ماما تو

تمہیں جانتی تک نہیں ہیں۔“

بیہ ذوالنون تو نہیں تھا جس کی محبت میں وہ بلا سوچے کبھی یہاں تک چلی آئی تھی۔ وہ سامنے کھڑا شخص کوئی اور ہی تھا جس کے ہر انداز سے نلرت ہی نلرت عیاں تھی جس کی لہریں آنکھوں میں وحشی چمک تھی، جس کی زبان سے الفاظ انکارے بن کر نکل رہے تھے۔

”جان جائے گی وہ عورت بھی، وہ ریل مرد بھی جب تم اس کے قرض کا سودا کر کے جاؤ گی“۔ وہ اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ حورین کو لگا چھت ساری اس کے وجود پر گر گئی ہو اس کے بولنے کی صلاحیت گم ہو کر رہ گئی۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا یہ ہو کیا رہا ہے؟

پہلی بار اس نے ماں کے اہتیار کو..... باپ کے اہتیار کو دیکھا اور تبتجنا غلط راہ پر بھٹ گئی تھی۔

”اپنے باپ کو فون کر دو اور بتاؤ اسے۔ اس کے لیے گئے گناہوں کے حساب کا وقت آ گیا ہے، کل جو رسوائی اس نے میری ماما کی جموںی میں ڈالی تھی آج وہ اس کی طرف لوٹنے والی ہے۔“

اس نے کارنر پر رکھے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں ڈالی۔ انٹر سے سٹاکر اس کی جانب بڑھا تھا۔

”اچھی حیران کیوں ہو رہی ہو؟“

”یہ کیسا مذاق ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مجھے بتائیں تو سہی؟“۔ منبٹ کی مٹائیں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی تھیں۔ وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ وہ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا اس قدر بے حس و بے رحم ہو گیا تھا کہ اس کی سرسبز حالت موتیوں کی طرح گرتے آنسو بھی کوئی اثر نہ کر سکتے تھے۔

”رود نہیں، مجھ پر تمہارے ان آنسوؤں کا کوئی اثر نہ ہوگا“۔ اس نے جھک کر اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

”شت آپ، ہاتھ نہیں لگاؤ مجھے“۔ اس نے چیخنے ہوئے نلرت سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

”اوکے، کوئی اور وقت ہوتا تو میں ایسی کسی جسارت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ تب مجھے معلوم ہی نہ تھا جس کو میں عزت دے رہا ہوں، جس کا چہرہ میرے دل کے آئینے پر چاند کی طرح روشن رہتا ہے، وہ قدموں کے نیچے روندے جانے والے ذروں سے بھی زیادہ کتر ہے۔“

اس کا لفظ لفظ حورین کی روح پر چر کے لگا رہا تھا۔ اس کی سسکیاں وہاں گونجنے لگی تھیں۔ وہ اتنا کٹھور ہوتا جا رہا تھا۔

”میں جانا چاہتی ہوں، راستہ چھوڑ دو میرا۔“

”تم میری خواہش پوری کیے بنا نہیں جا سکتیں“۔ وہ سگریٹ لہوں سے نکال کر دھواں اس کی جانب اڑا کر بولا۔

”تمہاری خواہش، ہونہم تم سر کر بھی پوری نہ کر سکو گے۔ میں عزت دار ماں باپ کی بیٹی ہوں“۔ اس نے کہتے ہی بھرتی سے سینٹر ٹیبل پر رکھی فروٹ باسکٹ میں سے مٹھری نکال کر خود کو مارنا چاہی تھی مگر وہ اس سے قائل نہ تھا۔ اس کے ارادے کو فوری ہماچتے ہوئے ایک حسرت میں اس تک پہنچا تھا۔ مٹھری اس کے ہاتھ سے لے کر وہ اچھالی تھی۔ اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

”اتنی آسانی سے تمہیں مارنا ہوتا تو یہاں تک بلانے کی اتنی اسٹرنگ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کہیں بھی تمہیں مار سکتا تھا۔“ اس کی گرفت میں وہ کسی کمزور چڑیا کی مانند پھڑپھڑا رہی تھی۔

”بہت ناز ہے تمہیں اپنے حسن پر، اپنے حسین چہرے پر۔“

”چھوڑ مجھے۔“ اس کی جنونی حالت دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔

”تمہارا وہ حال کروں گا کہ تم اپنا یہ حسین چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ زندہ رہو گی موت کے انتظار میں اور موت نہیں آئے گی، روز جیو گی، روز مرگی اور تمہارے ساتھ تمہارے بچرٹس بھی۔“ اس کے وجود میں گویا کوئی درد نہ طول کر گیا تھا۔ لہجہ آگہوں سے درد کی جھلکنے لگی تھی۔ وجیہ چہرے پر وحشی پن تھا۔

”بہت سچا میں نے، بہت چاہا، تمہارے باپ کے انداز اپنانے کا۔۔۔۔۔ مگر نہ معلوم کیا شے ہے؟ کون سا احساس ہے جو مجھے اخلاقی طور پر پست نہیں ہونے دیتا۔۔۔۔۔ شاید یہ میری باحیاماں کے دودھ کی تاثیر ہے یا میرے شریف و عزت دار باپ کے لہجہ کا اثر جو میری رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔ وہ مجھے کسی بھی پستی میں کرنے کی اجازت نہیں دیتا مگر میں اپنے دشمنوں کو سبق ضرور سکھاؤں گا۔ وہ تمہاری صورت دیکھ کر آخری سانس تک کرب و اذیت میں جھٹار ہیں گے۔“ حورین کی رنگت خوف سے زرد پڑ چکی تھی۔

”کوئی مرد صحبت کے نام پر کبھی کسی عورت کو لوٹ نہ سکے گا۔ کوئی بہن، دوسری بہن کو زندہ درگور نہ کر سکے گی۔“ اس نے بڑی سفاکی سے جلتا ہوا سگریٹ اس کے رخسار پر لگانا چاہا تھا جو اس کے چپٹے پر گردن پر چمک گیا تھا۔ درد بھری آہ حورین کے لبوں سے بے ساختہ نکل گئی تھی۔

اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ دوسری ہار بھی سگریٹ اس کی گردن پر چمکی تھی۔ درد کی شدت سے وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اسی لمحے اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تھی۔ وہ اس کے بازو جھٹک کر دوڑ ہوئی تھی۔

انسان جب عقل و شعور سے عادی ہو کر بے حسی و بے مروتی کی ردا اوڑھ لیتا ہے تو پھر حیوانوں سے زیادہ درد کی وسفاکیت اس میں آ جاتی ہے۔ ڈوائنوں بھی اس وقت درد لگ رہا تھا۔ زہریلی باتوں سے اس کا ذہن ماؤف کر دیا گیا تھا۔ آگہوں پر انتقام کی پٹی اس قدر مضبوطی سے باندھی گئی تھی کہ اسے ایسا وحشیانہ فعل کرتے ہوئے ذرا بھی انوس نہیں ہو رہا تھا۔ حورین کی سسکیوں پر ماں کی جھپٹیں غالب آ گئی تھیں۔ نالو کی آہیں سبقت لے گئی تھیں۔

”دور مت جاؤ، میں اپنا مقصد پورا کیے بغیر نہیں ہوں گا۔“

”پہلیاں مت بھجاؤ، مسٹر! مجھے تو تم پر اکتفا کرنے کی سزا مل رہی ہے، مجھ جیسی لڑکی کو کونسی بھی چاہیے جو آگہیں بند کر کے سب پر اکتفا کر لیتی ہے مگر میرے بچرٹس کا قصور بتاؤ۔ انہوں نے کیا کیا ہے؟“ گردن پر لگے ان سرخ نشانوں سے زیادہ اذیت ناک تکلیف اسے مایا پاپا کے خلاف لٹکوں سے ہو رہی تھی۔ بچہ نہیں آ رہا تھا وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے؟ اس کا تعلق کیا ہے؟

”تمہاری ماں میری مہی کی اسٹیپ سز ہیں۔ تمہارے باپ نے میری مہی کو محبت کے نام پر جیٹ کیا، دونوں نے.....“

اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ چند دن قبل ماما کی ماضی کی کہانی اس کے ذہن میں گونجنے لگی جس کا ہر لفظ اسے ازبر تھا۔

”اوہ منال بیگم ہی وہ عورت ہے، میں کبھی پہلے نہ سمجھ سکی۔ ماما سے ان کی شباهت اکثر گفتگو کا حصہ بنی اور میں نہ سمجھ سکی۔“

”سستی تم نے نفرت کی وجہ..... معلوم ہوا کتنے کرپٹ ہیں وہ دونوں.....“ وہ اپنی بات کھل کر کے زہر آلود لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

”جی، جی..... ترس آ رہا ہے مجھے تم پر۔ کس اعلیٰ طریقے سے تم کو بے وقوف بنایا گیا ہے۔ بڑی پلاننگ سے بس گا بیڑ کیا گیا ہے۔“

چند لمبے لمبے ڈری سکھی پریشان و مضطرب دکھائی دینے والے حورین کے اعزاز میں یک دم ہی بڑی تہدیلی آئی تھی۔

اس کے بڑے اعتماد لہجے..... لفظوں کی کاٹ..... جھگی آنکھوں میں مستی خیز چمک.....

وہ گنگ سا رہ گیا۔

”یہ فضول بکواس یقیناً آپ کی ماما بیگم نے سنا ہی ہوگی؟“

”شٹ اپ اور اوتھو۔“ وہ شدت منبہ سے چیخ اٹھا۔

”میرا منہ بند نہیں ہوگا.....“

”میں ہمیشہ کے لیے تمہارا منہ بند کروں گا۔“

”پہلے میری بات مبروہ صلی سے سنیں پھر شاید اپنا منہ ہی ہمیشہ کے لیے بند کر لیں، اگر سچی ہی غیرت مند بنتے ہیں تو.....“

اس کے لہجے کی چھائی اپنی مکمل زور آوری کے ساتھ کچھ اس اعزاز میں میاں تھی کہ وہ بہت کچھ بولنے کی خواہش کے باوجود اسے سننے پر رضامند ہو گیا تھا۔ حورین کے رویے و اعزاز اس کو چونکا گئے تھے۔

”پہلے جا کر اپنی ماما سے پوچھو، ان کے شوہر نے ان کو ڈائیرس کیوں دی تھی؟“ حورین نے طعنے لہجے میں کہا۔

”واٹ.....؟ یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم؟“ اس کے لہجے میں قہر و غضب کی بجلیاں سی کرنے لگیں۔

”جی ہمیشہ ہی کڑوا ہوتا ہے مسٹر، لیکن تمہیں اسے لگنا ہوگا۔“

”یہ جی نہیں بکواس ہے، بلکہ بہتان ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ ہڈیانی اعزاز میں چھا تھا۔

”میری بات پر تمہیں یقین نہیں آئے گا، اپنی ماں کی زبان پر تو یقین کرو گے؟ اپنی نانو سے دریافت کرو، وہ کیوں میری بیوی بنے ہوئے اپنے ایک ایچ پی کے ساتھ فرار ہوئی تھیں؟ اور اپنے گریڈ پڑا سے دریافت کرو جنہوں نے اپنے ڈاؤن بولس کو آپ کرنے کے لیے اپنی بیٹی کو چارو بنا کر پیش کیا اور اس.....“

”کیپ کواٹ میں..... میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا۔“ غم و غصے سے اس کی حالت بری تھی۔

”اپنی بکواس بند کرو، شاطر ماں کی شاطر بیٹی ہو آؤ۔“

”میں کیسی ماں کی بیٹی ہوں، یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔ ایک کال کر کے اپنی ماں سے پوچھو کہ سرور شاہ کون ہے؟ اپنی نانو سے معلوم کرو زمان گل کون تھا؟“ وہ بلا خوف و خطر کہہ رہی تھی۔

”منہ بند کرو اپنا، ابھی کنفرم ہو جاتا ہے۔“ اس نے ایئر ٹرے میں سکرےٹ پھینکتے ہوئے اس کو خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے فون جیب سے نکالا تھا اور منال بیگم کا نمبر پیش کر ڈالا تھا۔

”پرنس ایمائی سن وکٹری.....“ دوسری جانب سے فرسٹ ٹیل پر ہی کال اینڈ کی گئی اور منال بیگم کی چمکتی ہوئی آواز اور مسرت سے بھرپور لہجہ ابھر اٹھا۔ ابھی وہ کہنا ہی چاہ رہی تھی کہ وہ بنا کسی تمہید کے گویا ہوا۔

”مما! سرور شاہ کون ہے؟“

سپاٹ لہجے میں اس نے منال بیگم سے اتنا غیر متوقع و پیچیدہ سوال کیا تھا کہ دوسری جانب جو مسرتوں، کامرانوں کے شادیانے بج رہے تھے، وہاں ایک دم ہی موت کا سانس اٹھا چھا گیا تھا۔

”مما..... ماما بیگز؟ عجب دین مجھے، سرور شاہ کون ہے؟“

اس کے اصرار پر ٹوٹ پھوٹ کا شمار ہونے لگے۔ ماں کی خاموشی بھرمانی ہی گئی تھی۔ گویا وہ اس نام سے واقف ہیں۔

”کیا حورین نے جو کہا، وہ سچ ہے؟ کیا ماما نے مجھے مس گا بیڑ کیا ہے؟ کیا ماما ایسی کر سکتی ہیں؟ مگر..... کیوں.....؟“ خاموشی کے طویل ہوتے لہجے سے متحوش کرنے لگے تھے۔

”ماما بیگز! آپ خاموش کیوں ہیں؟“

”یہ..... یہ کیا اسٹوڈنٹ کونجمن ہے؟“

وہ اپنی لہر زئی ہوئی آواز پرستی کے باوجود کا پوندہ پاسکیں۔

”ماما! اس آلٹر..... میں اور لو؟“

ڈوائفون کی کیفیت میں اضطراب و جنون بڑھ گیا تھا۔

”پرنس جان اہم یہاں ابھی ہاتوں کے پتھر بیٹھے ہیں۔ ایک ایک لہجہ ہم پر پہاڑ کی طرح بھاری ہے۔ ابھی خبروں کے لیے کان ترس گئے ہیں۔ آپ سب بھول کر منال سے کسی باتیں کر رہے ہیں؟ جانتے ہیں وہ کتنے عرصے سے بیمار پڑی ہے؟“

مما کے بجائے نانو کی آواز ابھری تھی۔ اعداد ایسا جیسے ایک مجرم اپنے دوسرے مجرم ساتھی کو بچانے کے لیے چھوٹی وکھو کلی صفائیاں پیش کرتا ہے۔ سرور تین موسم میں بھی وہ بیٹے میں بھیک گیا۔

”نانو! زمان گل سے آپ کی کیا ریلیشن تھی؟“ اسے اپنی آواز اجنبی وکھو کلی گئی۔

”یہ بھی افس کی طرح ہی ہماری زندگی کے ایسے بد صورت کردار ہیں جن کو ہم ماشی کے قبرستان میں دفن کر چکے ہیں اور آپ.....“

اس کی رگوں میں یکخت ہی خون سیال مادے کی طرح دوڑنے لگا۔ آپن واحد میں وہ فلک کی لامحدود بلندیوں سے گرا تھا۔  
شودہ کندہ بن گیا تھا..... مذہبی نا بھج.....

شدید ترین اشتعال انگیز انداز میں اس نے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کو (جس سے قاتلہ بیگم کے جیلو..... ہیلو کی آوازیں آرہی تھیں) پوری طاقت سے سامنے دیکھا اور پردے مارا تھا۔ ایک چمٹا کے سے سیل فون اٹا اور دو دو روٹنگ بکھر گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ہال چکر کر کارپٹ پر بیٹھا چلا گیا۔ اس کے چہرے پر اس قدر سختی و وحشت تھی، سرخ تھی کہ حدین لمبے بھر کو کاپ اٹھی تھی۔ آہستہ آہستہ بچتے ہوئے دور چلی گئی تھی۔

تو این، دولت اینوں کے ہاتھوں خوار ہونے کا ناقابل فہم احساس.....

اپنا وحشی پن!

اپنا جنون و طعنا!

اپنا اورنگی بھرا رویا!

وہ بھی اپنی محبت کے ساتھ!

وہ کون تھا.....؟ کیا تھا.....؟ کس ماں کا بیٹا تھا.....؟ سب کچھ ہی تو عیاں ہو گیا تھا۔ وہ اس کی نظروں سے گرا سو گرا مگر انہوں سے اس بری طرح گرا تھا کہ اس کا جھکا چہرہ اب اٹھ نہیں رہا تھا۔ ماما اور نانا نے اقرار نہیں کیا تھا تو انکار بھی نہیں کیا تھا۔

بعض موقعوں پر فیصلوں میں اقرار و اصرار کرنے میں وقت لینا باعث افکار و شان گردانا جاتا ہے اور بعض فیصلے فوراً ہی اقرار و انکار کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ان کی عزت و توقیر کا سا بننا چاہی و حقیقت کے ستونوں پر تعمیر ہوتا ہے کہ ان میں معمولی سی بھی لغزش و کارو ناموس کو ملیا میٹ کر دیتی ہے، وہ عذبتی ہے۔

مما کی چنگچا پٹ اور نانو کی باتوں سے اسے جواب مل گیا تھا کہ اسے بے وقوف بنا دیا گیا ہے۔ اس کی حساسیت، جلد بازی، غصے و جنون کی کیفیت میں مغل مندی سے دست برداری اس کے تمام حواج کو مد نظر رکھ کر یہ کام کروایا گیا تھا اور کروانے والے بھی غیر نہیں اپنے تھے۔ کئی بوجھل لمبے ست روی سے گزر گئے تھے۔

ماحول میں ہولناک خاموشی اس کے دل کو دھڑکا رہی تھی۔ گردن پر لگے سرخ نئے نئے دائروں میں چلن کے ساتھ ٹیسوں کا بھی اضافہ ہو گیا تھا جو رخم میں مزید تکلیف اُجاگر کر رہی تھیں۔

وہ آہستگی سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے گویا ہوا۔

”آؤ“۔ خود دروازے سے کھل گیا۔ حدین بھی قید یافتہ ہرندے کی طرح تقریباً اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ اس سے آگے چل رہا تھا۔ چال میں کھٹکی دے جان پن نمایاں تھا۔

وقت کی چال بھی کیا شے ہے۔ بدلنے میں آئے تو زیادہ وقت نہیں درکار ہوتا۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو وہ اس کے ہمراہ یہاں سے بڑے تقاضا میزاعدا اور اکڑی چال سے گزرا تھا اور محض تیس منٹ میں عرش سے فرش پر گر کر جتنے والے کیڑوں کی چال تھی اس کی۔

شکتہ..... ٹھہری..... غیر متوازن

”رمضان ابلی پی صاحبہ کو ڈراپ کر کے آؤ۔“

ڈرا نیوہرا سے دیکھتے ہی مستعدی سے کھڑا ہوا اور اس نے حکم دیا تھا ڈرا نیوہرہ مود بانا انداز میں پور ٹیکو کی طرف بڑھ گیا۔  
”تو ٹھیکس..... میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“ وہ کڑوے لہجے میں فرمائی۔

”یہ علاقہ آبادی سے دور ہے، شام ڈھلنے والی ہے، بہتر ہوگا شوہر کے ہمراہ ہی جانا۔“ اس نے آہستگی سے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ وہ بھی پھر انکار نہ کر سکی کہ شربیں اتنی کڑی لگی تھیں کہ وہ اندر سے ریزہ ریزہ خود کو ہوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔

کہیں نزدیک ہی رکھی ہے پھرنے کی گھڑی

اس سے ملنے کے سبب ہم ہو گئے ہیں

اس تو اتار سے رہی ہے شب ہم اپنا نصیب

ہم کہ اب خود ہی نصیب شب ہم ہو گئے ہیں

اس نے کاریگٹ سے لٹکنے کے بعد نکلیں آٹھا کر اس جگہ کو دیکھا تھا جہاں کچھ لمبے قیل وہ کھڑی تھی۔

”یہ کیا ہو گیا ہے مجھ سے؟ اپنی حیات کے پھولوں کو خود ہی اپنے ہاتھوں سے پتی پتی کر کے مسل ڈالا ہے۔ کیا محبت اسی کو کہتے ہیں؟ کس قدر وحشی ہوں میں..... حیوانوں سے بڑھ کر دروغی ہے میرے اندر..... کتنی سفاکی و بے دردی سے میں نے اس کی کول جلد کو جلا یا..... کتنا درد مند ہوں..... کتنا ظالم ہوں میں..... مجھے انسان کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

وہ خود کو سرزنش کرتا ہوا اندر گیا تھا اور سگریٹ جلا کر اپنی گردن پر لگی جبکہ چپکانی تھی۔ درد تکلیف سے ہر حال تھا مگر اس نے ایک بھی سسکی منہ سے لٹکنے نہ دی۔ ہر زخم پر اس کو جو رین کی تکلیف کا احساس شدید سے شدید تر محسوس ہوتا اور وہ خود کو مزادینے کے لیے اس وقت تک خود کو سگریٹ سے داغدار ہا جب تک سگریٹ از خود ہی نہ بجھ گئی۔

اس سے فارغ ہو کر وہ ماما کی طرف روانہ ہوا تھا۔ ماما اور نانوں نے اتنی بڑی غلط بیانی کر کے اسے خود سے ہی نگاہ ملانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ اندھی طوفان کی رفتار سے وہ کارڈرائیج کے کنارے پہنچا تھا۔ اندر داخل ہوا تو ممانا کو کے کمرے سے آتی آوازیں سن کر ڈک گیا۔

”ماما آپ ہر بات کو اتنا ایزی لیتی ہیں کہ مجھے کنفیوزن ہونے لگتی ہے۔ پرنس نے سرور شاہ اور زمان خان کا نام کیوں لیا ہے؟ وہ کیوں معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ میرا ان سے کیا تعلق ہے؟ مجھے ٹیلی ہو رہا ہے ہماری اسٹوری ٹیل ہو گئی ہے۔“ منال کی غصیلی آواز و سرور شاہ کے ذکر نے اسے زکے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ہونٹ بچھنے گیٹ کی آڑ میں ان کی منگھٹوں رہا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ پرنس کے دماغ میں کوئی ایسے ہی خیال آ گیا ہوگا، پھر اس لڑکی کو کون بتائے گا یہ سب بتائیں؟“

”کرن کو آپ بدحوذہ سمجھیں۔ وہ اس ماں کی بیٹی ہے جس نے تمام حیات چھوٹک چھوٹک کر قدم رکھے ہیں۔ شوہر اور ساس کی

لاہلاقی و بے مروتی کے باوجود ان سے رشتہ نہیں توڑا تھا۔“

”اوپر تم کہتا کیا چاہ رہی ہو؟ صاف کچھ بیز چھیر سے بات مت کرو۔“ مرحوم سوتن کا نام سننا انہیں اب بھی گوارا نہ تھا۔

”اگر آپ گل زمان کے ساتھ آئیے فرار نہ ہوتیں تو آج میں بھی کرن کی طرح خوش حال و قابل رنگ زندگی گزار رہی ہوتی۔“

”تمہاری نانو اپنے ایسپلائی کے ساتھ فرار ہو گئی تھیں، میرا ڈھونڈنے کے باوجود۔“ اس کی ساتھیوں میں حدرین کی آواز گونجی تھی۔

”مجھے علم مت کرو، میں گل زمان کی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی لیکن تمہاری خاطر وہیں بھی آگئی تھی۔“

”میری خاطر نہیں..... دولت کی خاطر..... کمزور سہیل لائف کی خاطر۔ جب لو کرنے آپ یہ وہاں کی بھڑکوتہ جیج و بی شروع

کی تو آپ خالی ہاتھ واپس آئی ہی اس نیت سے تھیں، سزیر ہاں نظری پھر بننے۔“

”پھر تم کیوں سرور شاہ کو چھوڑ کر آئیں؟ وہ تو زمان کی طرح دولت کا لالچی نہ تھا اور نہ ہی عورتوں سے تعلقات رکھنے کا خواہاں؟“

”حسب عادت، ناقہ بیگم بھی اسے دوہدو جواب دینے لگی تھیں۔“ اتنی محبت و چاہت سرور شاہ نے تمہیں دی پھر بھی تم اپنے دل سے اس کی

محبت نکال کر بھول نہ سکیں۔ جواب اس نے تمہیں ڈانڈیں دی پھر مزہ جیسا فرشتہ صفت انسان تمہاری زندگی میں آیا، تم اس کی محبت میں بھی

اس بد بخت انس کو نہ بھول سکیں۔ کتنا سمجھا یا، کتنا کہا اب تم ماں بن چکی ہو، دو بھول سے بیٹوں کی، اب اسے بھول جاؤ، جو کبھی نہ تمہارا تھا اور

نہ ہوگا، پھر مزہ میں کوئی کمی نہ تھی۔ اگر وہ چاہت میں انس کے برابر نہیں تھا تو اس سے کم بھی نہ تھا لیکن تم جب بھی اس کے رخسار سے نہ جا سکیں

اور آخر کار وہ ایک روز تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔“ ان کی زبان بے قابو تھی۔

”ہو جب مائی فٹ، چلا گیا تو چلا گیا، آئی ڈونٹ کیئر۔“

”اچھا..... اچھا بس بول چکیں، اب خاموش ہو جاؤ۔ اب تو تم نے مجھے بھی ٹھکر مٹا کر رکھا ہے، نہ معلوم اس لڑکی کو کہاں بلا لیا ہے

اور کال بھی انیڈ نہیں کر رہا ہے.....؟“

”مما..... جہاں کہیں کوئین سے تو اس کی ملاقات نہیں ہوگی ہے؟“ یہ خیال بجلی کے کومرے کی طرح ان کے ذہن میں لہرایا۔

”نہیں، میں نے کچھ دیر قبل کال کی تو وہ آفس میں ہی تھا اور مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ پرنس سے کنٹیکٹ نہیں ہو رہا ہے۔“

کچھ دیر قبل زور و شور سے لڑنے جھگڑنے والی اب پھر حڑے سے باتیں کرنے میں معروف تھیں۔ دوسری جانب ڈوائٹون وہاں

سے ہٹ کر کار میں دو بارہ آ بیٹھا تھا۔ ممدانالو کی گفتگو نے امیدو آس کی وہ کرن بھی چھین لی تھی جس کے سہارے چل کر وہ یہاں تک آیا تھا

کہ شاید حدرین کی کمی ہوئی باتیں غلط ثابت ہو جائیں اور وہ سرخرو ہو جائے مگر امیدو آس دامن چھڑا کر بھاگ گئی تھیں۔ حقیقت نے اسے

شاک دینے تھے کہ ہر شے سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ ہشتوں کا اعتبار، مجبوں کا انبساط سب محو ہو گیا تھا۔ ذہن میں طولانی جھگڑا چل



رہے تھے۔ ماضی کی کچھ پرچمائیاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔

”بابا! ماما بھی عورت نہیں ہیں۔“

اپنی ہی آواز سے اب اچھی محسوس ہوئی تھی، ساتھ بابا کی پرچمائیں بھی۔

”ماما گندی ہیں، جھوٹ بولتی ہیں، نانو بھی گندی ہیں اور گرینڈ پابھی۔ ہم ان سے بات نہیں کریں گے، وہ سب گندے ہیں۔“

”اوہ میں کیوں بھول گیا؟ کیوں ان کی باتوں میں آیا؟ ماما تو کبھی اس لائق نہ تھیں کہ ان کی بات پر یقین کیا جائے پھر میں کیوں

بے وقوفوں کی طرح وہ کرتا چلا گیا جو انہوں نے کہا..... جو انہوں نے چاہا.....؟ زندگی کے ہنگاموں میں مصروف رہنے والی ممانے کب

ہمارا خیال کیا تھا؟ کب ایک ماں کا احساس دیا تھا؟“

ماضی نے گویا اس کے ذہن کے تمام درے بچے کھول دیئے تھے، وہ سب یاد کر رہا تھا۔ ماما اور نانو کی باتوں میں ذرا بھی چھائی نہ تھی۔

حورین کا تصور اس کی نگاہوں سے اب مچھل نہ ہو رہا تھا۔ اپنی حد سے بڑی سفاکیت، اس کی حد سے سوا منقولہ سیت، اس کی سحر انگیز

نگاہوں میں موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی نمی اور اس نمی میں حیرتا حد اعتبار کا کرب..... وہ درود..... وہ کرب اس کے اندر ہر کی طرح پھیلتا

جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا ایک ایک شریان پھٹ رہی ہو۔ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس نے کارڈسٹارٹ کی اور قفل اسپینڈ میں لے

گیا۔ دل و دماغ پر ایسی نامرادی چھائی تھی کہ کارڈسٹارٹ کے سے ایک بیڑے نکلانی تھی۔



یہاں تک کیسی اتلا دان پڑی تھی۔

پھولوں کے بہرہ وپ میں وہ انگاروں سے دامن خاک کر بیٹھی تھی۔ سارا راستہ ڈراما تیر کے خیال سے اس نے خود پر صبر و ضبط کے

پہرے بٹھا رکھے تھے۔ مگر میں داخل ہوتے وقت اس نے بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ سب کی نگاہوں سے بچتی چھائی وہ لا بھری رم میں

گھس گئی۔ اس وقت بھی بہترین ٹھکانہ تھا، آنکھوں میں چھلچھلے آنسوؤں سے دل کی آگ بجھانے کا۔ اس نے جگت میں شوڑ اور وینڈر پرس

سے جان چھڑائی۔ انہیں ایک طرف اچھالا اور خود صوفے کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ آنسوؤں کا سیلاب پوی شوریدہ مری کے ساتھ

آنکھوں سے گرنے لگا۔

”کتنی ہستی میں مر گئی میں، کس قدر غیر اہم، بے انا و بے توقیر کر ڈالا خود کو۔ اس نے بلایا اور میں چلی گئی؟ اپنی عزت، نفس و وقار کو

اس وحشی کے ہاتھوں داغ دار کروانے کے لیے۔“

بے تحاشہ آنسوؤں کے درمیان وہ خود سے مخاطب تھی۔

”خود کو بے حد استغش، بولڈ، جینس سمجھنے والی حورین بھی ایک عام اور بے وقوف لڑکی تھی، جو صوبہ مخالف کی صرف ایک مسکراہٹ

پر دل دے دیتی ہے، پانگل بن جاتی ہے، پھر ماسوائے رسوائی و ہرجائی پن کے ان کے حصے میں کیا آتا ہے.....“

مگر تم میں اور ان لڑکیوں میں بہت فرق ہے جو میں ادوہ مل اور لوڑ کلاس لڑکیاں جو ڈھیروں مصائب و مشکلات میں گھری ہوئی ہیں۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے پیار و محبت کو ترسی ہوئی ہوتی ہیں، جن کی گھریلو پرالہم انہیں موقع نہیں دیتی کہ وہ آپس میں کچھ وقت پیار و محبت میں گزاریں۔ ایسی مظلوم لڑکیاں ان جھانسون میں آجاتی ہیں، حالانکہ لڑکیاں کسی بھی کلاس سے تعلق رکھیں، کسی کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ صعب مخالف کی چکنی چڑی باتوں میں آکر اپنی اور خاندان کی عزت و ناموس کو بد لگائیں اور تم کو تو یہ بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا، کیونکہ تم نے آنکھ کھولتے ہی جھٹوں و چاچوں کو سمیٹا ہے، جس قدر تمہیں چاہا گیا ہے، اتنی تو شاید ہی کسی کو محبت ملی ہو، پھر تم کیوں اس کی محبت میں جھٹا ہوئیں؟ وہ شخص جس کا چہرہ، جس قدر خوب صورت تھا، باطن اتنا ہی بد صورت۔

”وہ لائقوں میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ مرتے دم تک تم میری بددعاؤں میں شامل رہو گے۔ تم نے میری نوزائیدہ محبت کا ہی خون نہیں کیا، میری اتنا، نسوانی، حقار، خودداری اور اعتماد کو بھی قتل کیا ہے۔ میں تمہاری ادا اس اور ہر آنکھوں میں محبت کی روشنیاں دیکھنا چاہتی تھی۔ تمہارے دکھاؤں کو غم بانٹنا چاہتی تھی اور تم نے ہمیشہ کے لیے میری جمولی میں غم بھردیئے۔“ اس کی دہلی دہلی سسکیاں گونجنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

چوکیدار نے کوئین کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔

”آئیے بابا جان! اندر چلیں۔“ کوئین کار سے نکل کر بنگلے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے حزرہ سے مخاطب ہوا۔

”کوئین بیٹا اس گھر سے بھر پورا جنیٹ کی بوا رہی ہے، یہ وہ بنگلہ تو نہیں جو ہماری رہائش تھا، جہاں ہماری ایک عمر گزری تھی۔“ حزرہ خلاؤں میں گھومتے ہوئے گویا ہوئے۔

”جی بابا جان! یہ بیٹہ کیسی پرانی ہے۔“

”اس جگہ کا کیا ہوا؟“

دادو نے وہ گوشی، دادا جان کے بھائیوں کو دے دی تھی اور صحرا نکل کے ساتھ یہاں آگئی تھیں۔

”تو چچا وہاں رہتے ہیں؟“

”نہیں، وہ گوشی لینے کے کچھ عرصے بعد ہی اسے فروخت کر کے چلے گئے تھے۔ اب تو عرصہ ہو گیا دادو سے بھی ملنے نہیں آئے ہیں۔“

”پہچو کو نانا چائز گھر سے بے گھر کیا تھا اور پھر خود بھی اس گھر سے چلے گئے۔ کاش کسی کا آشیانہ تیار کرنے والے یہ سوچ لیں کہ

ہمارا آشیانہ بھی اس طرح بھٹکا بھٹکا ہو کر بکھر سکتا ہے تو ایسی غلطی ہرگز نہ کریں۔ ظلم کا بدلہ ظلم ہی ہوتا ہے۔“

”بابا جان! کیا سوچ رہے ہیں؟ آئیں اندر چلیں۔“ کوئین نے بے حد محبت سے حزرہ کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

مارٹل کے چپکتے برآمدے و راہ داری کو عبور کرنے کے بعد وہ لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے، جب حزرہ ایک دم ہی ڈک گئے۔

لاؤنج سے آتی آواز میں بتا رہی تھیں کہ تمام افراد اندر موجود ہیں۔

”پہلے آپ جائیں بیٹا شاید امی جان مجھے یوں اچانک دیکھ کر خوشی برداشت نہ کر سکیں اور میں بھی اتنی دیر میں اپنے حواسوں کو قابو کر لوں۔“

ایک عرصہ تک جس دل کو وہ پتھر بنانے میں کامیاب ہوئے تھے، وہ لمحوں میں موم کی مانند پگھل رہا تھا۔ محبت و اپنائیت کے خشک خشکے پھر سے تر ہو گئے تھے۔

”ارے کونین بیٹا! آئیں، آئیں۔“ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے صدر صاحب خوش دلی سے اس کی جانب بڑھے اور گلے سے لگایا۔ باقی سب لوگوں کی نگاہیں اس کے چہرے پر سے رشتے کے حوالے سے آجانے والی جھینپ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ سامنے بیٹھی حضرت کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

”یہاں آؤ کونین، میرے پاس بیٹھو۔ کتنا یاد کیا ہے میں نے ان دنوں تمہیں اور تم دیار غیر میں جا کر رہی بیٹھ گئے؟“ راجہ حکیم کے لہجے میں شکایت تھی۔۔۔۔۔

”دادو! آپ خفا نہ ہوں، میں اب آپ کو چھوڑ کر کہیں جانے والا نہیں ہوں۔ پہلے اٹکل آپ باہر جا کر دیکھیں آپ کے دوست، آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ کونین کے اعزاز میں بڑا خوب صورت سٹینس تھا، سب چمک گئے۔

”میرا ایسا کون سا دوست آ گیا؟“ وہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے ہارٹس شخص کو دیکھ کر لمبے پھر کو وہ خشکے پھر دو سرے لمبے ہی حیرت و مسرت نے گویا ان کو انجموز ڈالا۔

”حزرو۔۔۔۔۔! حزرو۔۔۔۔۔! امرے۔۔۔۔۔ بھائی۔“

استقباب و خوشی سے ان کی جج نکل گئی اور وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ حزرو نے بھی بازو پھیلا کر انہیں سینے سے لگا لیا۔ آنسو زار و قطاران کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

”کہاں چلے گئے تھے؟ کوئی اس طرح بھی جاتا ہے اپنے نقش پامٹا کر کہڑوٹھنے والے گرد بھی نہ پائیں۔“

”جانے والے کو خود ہی آتا تھا پھر وہ کیوں نقش پامٹتا جاتا؟“ جذبات کا طوفان اتنی جلدی تھمے والا نہ تھا اگر وہ سب ہی صدر صاحب کی آواز سن کر باہر نہ آجاتے۔ صنوبر بیگم، ہریرہ اور اس کی بہن سونیا، حمیرا، حزل، حضرتی، اریبہ سب وہاں موجود تھے۔ بے شمار مرتبہ دیکھی گئی حزرہ کی تصویروں سے وہ انہیں پہچان گئے تھے۔ بے شک گزرے ماہ و سال نے حزرہ کی شخصیت میں تبدیلیاں کر دی تھیں۔ جسمانی صحت ان کی کمزوری پر مائل تھی۔ رنگت جو کبھی سرخ و سفید تھی، اب سرجماسی گئی تھی مگر چہرے پر ایک ہارعب سا وقار تھا، جوان کے ہارٹس چہرے کو بڑے جلال بنا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ آسانی سے پہچانے جا رہے تھے۔

وہ ہکا بکا ان کے گرد کھڑے تھے۔ سب کی آنکھیں اس ملاپ پر بڑھ تھیں۔

”السلام علیکم بھائی صاحب!“ صنوبر بیگم ساڑھی کا آنچل سر پر ڈالتی ہوئی ان سے مخاطب ہوئیں تو انہوں نے آگے بڑھ کر بڑی

شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا میں دیں۔

بظاہر بے حد ہار عیب و ذمہ جلال دکھائی دینے والے عزیزہ جتنے شفیق و مہربان تھے کہ ایک ایک کر کے وہ سب ان سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ سوئیلا، نصرئی اور اسیب نے بھی سلام کے بعد خوب دعائیں کہیں۔ ان کے جلو میں وہ لاؤنج کی طرف بڑھے، جہاں راحیلہ بیگم دم بے خودی بیٹھی دروازے کی طرف ایک ننگ دیکھ رہی تھیں۔ کونین نے سرسری طور پر انہیں بتا دیا تھا کہ وہ شا کڈ نہ ہو جائیں مگر احساسات کبھی بھی مصلحت کے تحت کام نہیں کرتے، یہ ہمیشہ اپنی اجارہ داری پر قائم رہتے ہیں۔ راحیلہ بیگم جس گمشدہ بیٹے کو دیکھنے کی آس میں زندہ رہنے کی دعائیں مانگا کرتی تھیں، وہ آس آج رنگ لے آئی تھی۔ وہ امید بڑھ آئی تھی۔ خزاؤں نے اپنے بے رنگ بھراہن سمیٹ لیے تھے۔ بہاروں کے قافلے مسرتوں کی سوغاتیں لیے آتر رہے تھے۔

”السلام علیکم ہا می جان! آپ کا گناہ گار حاضر ہے، آپ جو مزلا دینا چاہیں اس عاقبت نااندیش بیٹے کے لیے قابل غم و راحت ہوگی۔“  
 راحیلہ بیگم جو انہیں سینے سے لگائے آنسوؤں کے ساغر نلکا رہی تھیں، ان کے گلو کیر عداوت سے لبریز لہجے پر تڑپ گئیں۔  
 ”میرے چاند عاقبت نااندیش و گناہ گار تو میں ہوں، تم مجھے معاف کر دو، تمہیں جیتے جی جہنم میں دھکیلتے والی میں ہوں۔“  
 ”آپ میری ماں ہیں، میری جنت ہیں، آپ اس طرح خود کو اڑا کر کے مجھ گناہ گار کو مزید گناہ گار مت کیجئے۔“ وہ ان کے صحیفہ و نزار ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر پھر رو دیئے۔

ماحول پر فوج و مسرت کی عجیب متضاد گھمبیر کیفیت طاری تھی۔ جدائی کا اخبار آنسوؤں کے ذریعے نکلا تو ماحول کی تمام تر کثافت کٹانگلی دوشبیدوں کی کھلکھلاہٹوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

طویل عرصے بعد اپنوں کے درمیان بیٹھے حزرہ کو اپنے اندر حیات افروز ازسرنو دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور ان کی نگاہوں کی بے چینی میں دل کے ایک گوشے میں کمی تھی۔ وہ سب سے مل لیے تھے۔ سب نے ہی ان کو اتنی محبت و اپنائیت دی تھی کہ وہ ان سے اتنا عرصہ جدا رہنے پر شرمندہ ہو رہے تھے پھر حزرہ کی بیوی کے روپ میں نیچلی میں اضافے سے وہ خوش تھے تو اس سے بھی بڑھ کر انہیں خوشی یہ جان کر ہوئی تھی کہ کونین کے لیے نصرئی کا انتخاب کر کے امی حضور نے بہت وائٹ منڈی کا ثبوت دیا ہے۔ جھگی جھگی آنکھوں والی باحیا سی وہ لڑکی ان کی بہو بننے کے لائق تھی۔ انہیں شدت سے انتظار اب اس کا تھا جس میں ان کی روح تھی۔ سب کو بھولنے کے باوجود وہ اس کو نہ بھول پائے تھے جس کی محبت ہی انہیں کشاں کشاں سمجھ لاتی تھی۔

جلدی جلدی گھر کی خواتین نے مل کر ان کی پسند کا کھانا بنا لیا۔ ڈاننگ روم کی وسیع و عریض نیچل مختلف کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوؤں سے جھک رہی تھی۔ کانٹے، چھری و چھوٹی کی کھک سے لٹخائیں ایک ساڑھا پیدا ہو گیا تھا۔ بہت پیار بھرے سمرار سے انہیں کھلایا جا رہا تھا۔ ہر ڈش بہت محبت سے انہیں پیش کی جا رہی تھی۔ وہ کھا تو رہے تھے مگر نہ معلوم دل کو یہ سب ایک بوجھ سا لگ رہا تھا۔ ہر قسم ان کے حلق میں ریت کے گولے کی طرح اکھ رہا تھا۔ کھانے کے بعد گرین بی کا دور چلا۔

”کونین اذوالنون کی واپسی کب تک ہوگی؟“ مزہ کی بے قراری مردِ جگر پر تھی۔ بہت گھمبیر احساسات لیے انہوں نے جدائیوں کا صحرا عبور کیا تھا۔ جدائی کا ایک ایک لمحہ ان پر بھاری گز رہا تھا۔

”بابا جان! کئی بار ڈرائی کر چکا ہوں مگر اس کا سٹیل فون آف جا رہا ہے۔ آج تو ممکن نہیں لگ رہا شاید کل تک اس کی واپسی ہو اب تو رات بھی ہو چکی ہے۔“

”کہاں گیا ہے میرا بچہ؟“ راحیلہ بیگم کے ہاتھ میں گرین ٹی کی چائنی کا پل کر رہ گئی۔ کئی اندیشے انہیں بے کل کر گئے۔

”صبح تک!..... ابھی تو صبح ہونے میں بہت دیر باقی ہے۔ کیا مجھ سے اتنا صبر ہو سکے گا؟“ مزہ کو اب حسوس ہوا، جدائیوں کی کٹھن گھڑیوں کی نارستانی کسی کرب ناک ہوتی ہے۔ وہ یک دم ہی بکھر سے گئے تھے، جس محبوب بیٹے کی لگن میں وہ تڑپتے ہوئے آئے تھے۔ وہ بھی اب ان کی جدائیوں کا حجاب جدائی سے ہی دے رہا تھا۔

”بی بی ایزی بابا جان! صبح آپ اس سے مل لیجیے گا۔“ کونین نے انہیں مضموم دیکھ کر تسل دی۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر گرین ٹی کا سپ لینے لگے۔

”مزہ! اب آرام کرو بیٹا! تمہارے لیے اپنے برابر والا دم کھلوادوں یا..... مگر جاؤ گے؟“ راحیلہ بیگم ان کے آرام کے خیال سے کہتے کہتے رک گئیں۔

”امی جان! ابھی مجھ اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیں، مگر میں ضرور جاؤں گا، مگر جانے کے لیے ہی آیا ہوں مگر ابھی نہیں.....“

راحیلہ بیگم نے چند ساعت ان کی طرف چاغی لگا ہوں سے دیکھا پھر بنا کچھ کہے وہاں سے چلی گئیں۔

مزہ اہمالی سے ابھی بھی ناراض ہوا، ”سب کے جانے کے بعد صبر صاحب ان کی جانب دیکھ کر لوٹے۔“

”نہیں، میں اب کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔“

”پھر بھابی کو تم نے انعام کرنے سے بھی منع کر دیا۔ میں کال کر رہا تھا کہ کونین نے بتایا کہ تم نے منع کیا ہے۔“

”میں مثال کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔“

”یہ فطہ ہے..... تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ صبر نے صاف گوئی سے سچائی بیان کی تھی۔

”ہاں..... شاید..... میں نے زندگی بھر فطہ فیطے کیے ہیں۔ آقا زجرانی کی راہ بڑی خوب صورت، بڑی بڑ کوشش ہوتی ہے۔ یہاں آپ کو اندھیروں میں بھی جگنو چمکتے نظر آئیں گے۔ دراصل ہمیں سے آپ کو اپنی حیات کا وہ راستہ چننا ہوتا ہے جس کا تمام تر وارو مدار آپ کی آنے والی زندگی اور شروع ہونے والے لمحہ پر ہوتا ہے، جہاں آپ کو ہر قدم بہت سنبھل کر، بہت سوچ و بچار کے بعد اٹھنا پڑتا ہے، ڈراما سا لگا چوکی، معمولی سے قدم ڈگمگائے اور آج واحد میں آپ پھولوں بھرے چمن سے خارزار صحراؤں میں پہنچ جائیں گے۔ جیسے

ایک لفظ نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ پہلے میں کئی برسوں تک بدحواسوں کی طرح ملک ملک، قریہ قریہ گھومتا رہا لیکن وہی سکون، میرا اپنا آپ، میری شخصیت مجھ سے چھن گئی۔ جن کو حاصل کرنے کی جستجو میں کہاں کہاں نہ گھوما۔ جنگل، ویرانے، شہر اور گاؤں میں، بھاریوں کی طرح بھٹکتا رہا۔

تہاں پاتے ہی صدمہ کے از حد اصرار پر وہ آپ جتنی سنا رہے تھے۔ ان کے لہجے میں اتنا گناہ، ایسی حلاوت اور دکھ تھا کہ صدمہ بخود رو گئے تھے۔

”پھر کئی سال گزرنے کے بعد میرے رب کو مجھ گناہ گار و سیاہ کار پر رحم آ گیا۔ میرے رب نے مجھے منزل دکھانے کے لیے اپنے نیک بندے کو وسیلہ بنایا۔ سید عبدالرزاق چشتی میرے لیے فرشتہ رحمت بن کر آئے اور میرے اندھیروں سے بوسیدہ ذہن و ایمان کو حق و ایمان کی روشنی سے منور کر ڈالا۔“ وہ چند لمبے خاموشی کے بعد گویا ان کے قصہ میں جو ہو گئے تھے۔

”آپ سے ان کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

”کینیا کے ایک جنگل میں، جہاں خون خوار جانوروں کے درمیان ان کو بے نیازی سے نماز ادا کرتے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ وہ نماز میں اس قدر محو تھے کہ انہیں اپنے ارد گرد دیکھتے زہریلے کیڑوں کا خوف ہوتا نہ دھاڑتے سناک جانوروں کا اور تعجب کی بات تو یہ تھی کہ کوئی بھی انہیں نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ پہلے پہل تو میری لیے یہ ہالٹی تھی۔ میں دور سے انہیں دیکھا کرتا تھا کہ کب کوئی جانور وہ زہریلا کیڑا انہیں نقصان پہنچاتا ہے مگر ایسا نہیں ہوا۔ دو ماہ گزر گئے پھر مجھے لگا کہ میں ذہنی طور پر ان سے متاثر ہونے لگا ہوں، ان کی عبادت کے خشوع و خضوع نے میری دنیا بدل کر رکھ دی۔ دنیا سے میری بے رغبتی بڑھنے لگی۔ ایک روز جب وہ عبادت سے فارغ ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر ان کے قدم پکڑ کر کہا کہ وہ مجھے بھی عبادت سکھائیں، اپنا شاگرد بنالیں، میں ساری زندگی ان کی خدمت کروں گا۔ وہ مجھے بھی ایسی عبادت سکھادیں کہ جس کو ادا کرتے وقت ہر خوف دل سے دور ہو جائے، ہر سوچ و غم بھاگ جائے، انہوں نے بڑی محبت و شفقت سے مجھے سینے سے لگا یا اور کہا۔۔۔۔۔

”علم سیکھنا اور سکھانا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔ ماں کی گود سے قبر کی آغوش تک علم حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔“

”تو آپ سکھائیں گے نا مجھے ایسی عبادت جو ہر خوف سے، ہر غم و فکر سے بے نیاز کر دے۔“ میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

”عہدہ واعظی علم، بہتر عبادت کی ترقیب دیتا ہے، نوجوان اور حقیقی محبت ہر شے سے عبادت کو بے نیاز کر کے بہتر بن کر دیتی ہے۔“

جب بھی اللہ کو پکارو تو یہ یقین رکھو وہ تمہاری شہد رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ ہر پکار کا فوری جواب دیتا ہے۔ اس کی ہر عبادت کے وقت یہ یقین واثق رکھو کہ تم اسے نہیں دیکھ رہے، وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ یہی سچ ہے۔ ہمارا کوئی بھی عمل اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے، جس قدر بھی ہو سکے اپنے قلب میں اس کی محبت اور قربت کی آگ جلاو۔ اپنی ہستی کو مٹا دو۔ ہر خوف، پریشانی، غم و دکھ اس آگ میں اتار پھینکو اور پوری صداقت سے اس کے بندے بن جاؤ، جس طرح ایک میاں میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح اللہ کے خوف کے

ساتھ کسی اور کا خوف بھی جمیں اللہ سے محبت نہیں سکھا سکتا، جہاں اللہ کا خوف ہوتا ہے وہاں ہر خوف ڈم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ اللہ سے محبت، کامل یقین اور اللہ ہی سے سب کچھ ملنے کی امید ہر شے سے بے نیاز کر دیتی ہے پھر دل میں خشوع و خضوع کی ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے کہ بندہ اس دنیا کی حد سے نکل کر اس کی نوازشوں کی سیر کرتا ہے۔ کائنات کا ہر سر بستہ راز اس کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ وہ نوازنے والوں میں سب سے بڑا نوازنے والا ہے۔“

”اوہ اوہ عظیم ہے آپ مجھے بھی ان سے ملوانیں گے، سنا ہے اللہ والے، اللہ سے ملانے کا سبب بن جاتے ہیں۔“ مصداق صاحب کی آواز میں ان بزرگ کے لیے بے پناہ عقیدت تھی۔

”انہوں! وہ دنیا سے پردہ کر گئے ہیں۔“ ایک ڈکھ بھری آہ جزوہ کے ہونٹوں سے خارج ہوئی۔

”اوہ! بہت افسوس ہوا، کب ہو ان کا انتقال؟“

”بہت قلیل عرصہ ہمارا ساتھ رہا تھا، محض ڈیڑھ سال۔ وہ مجھے اپنی شفقت بھری آغوش میں لے کر کئی ملکوں میں تبلیغ کی روشنی پھیلانے گئے۔ اس دوران میں نے بہت کچھ ان سے سیکھا پھر وہی پرچ بیت اللہ کی سعادت سے بہر مند ہو کر ہم یہاں پاکستان آ گئے۔ وہ سجدہ کے ایک دور دراز علاقے سے تعلق رکھتے تھے، وہاں ان کے بہت عقیدت مند پائے جاتے تھے، ان کے ساتھ مجھے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ انہوں نے سب کو یہ کہہ کر حصارف کروایا تھا کہ میں ان کا بیٹا ہوں پھر قلیل عرصہ بیمار رہ کر وہ رحلت فرما گئے اور ان کی ذمے داریاں از خود ہی میرے کندھوں پر آ گئیں اور پھر میں وہیں کا ہو کر رہ گیا۔“

”اسی ملک میں، اچھے قریب رہ کر بھی اتنا دور رہے۔ کبھی کسی کی یاد نہیں آئی؟ کسی سے ملنے کے لیے دل نہیں بڑپا؟“

”نہیں، میں نے سب کی یاد دل سے ہٹا کر مالکِ حقیقی کی یاد سے ٹوٹ گئی تھی پھر کسی کی یاد بھنگی تک نہیں۔“

”پھر اب کس محبت نے آپ کو ہم میں لایا موجود کیا؟“

”میرے پیر و مرشد کے قول نے.....“

”کیا کہا تھا انہوں نے؟“

”یہی کہ آج رشتوں کو تم بھلا کے صحرا نشین بن گئے ہو، کل تم اس گیند کی طرح ان رشتوں کی طرف پلٹو گے جس طرح پوری قوت سے اوپر اچھالی گئی گیند ڈگنی رہتا رہے واپس زمین کی طرف پلٹی ہے اور جب یہ وقت آئے گا تم ہرزنجیر توڑ کر بھاگ جاؤ گے اور دیکھ لو آج میں ہرزنجیر توڑ کر بھاگ نکلا اور جس کی خاطر آیا ہوں، وہ چاند سا چہرہ ہدایتیوں کے افاق میں چھپا مجھے سزا دے رہا ہے۔“

”فیک! اٹ ایزی۔“ ڈوالٹون سے آپ کی محبت ہم جانتے ہیں، یہ اتفاق ہی کہہ لیجئے کہ وہ شکار پر گیا ہوا ہے، حالانکہ وہ ایسی ہانڈ کو پسند نہیں کرتا مگر بعض اوقات انسان دوستوں کے اصرار پر ناپسندیدہ کام کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ آرام کریں، بہت تھکن ہو گئی ہوگی۔“

صدمہ کی کر کے گرد ہاڑھائل کر کے بیڑوم تک چھوڑ کر گئے آج عرصے بعد ان کے چہرے پر اطمینان کے احساسات آئے تھے آج گویا ان کا ادھر وہاں پہنچ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اے بس! بڑی مفرور رہی ہیں، اپنے سر کے آنے پر جو ہم کو ذرا بھی لٹ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی ہیں“ کوئین نے جگن سے لٹکی مختصری کا راستہ روکتے ہوئے شوخی سے کہا۔  
”یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ انگل ہیں میرے۔“

”جی نہیں..... وہ چچا تھے پہلے اب صرف سر ہیں آپ کے۔“  
”اوکے، یو آر رائٹ۔ میں کبھی آپ سے جیت نہیں سکتی“ اس کی محبت بھری شمار آلودنگا ہوں نے اسے ہنس کر دیا تھا۔ وہ شرمیلیں مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔

”سب کچھ ہی تو جیت چکی ہو..... اب کیا جیتنا پاتی ہے؟“ اس کی دھیمی آواز جذبات سے بوجھل تھی اس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”آج میری زندگی کا اہم ترین دن ہے، ہا ہا طویل عرصے بعد ہماری دنیا میں لوٹ کر آئے ہیں، اب میری طرح وہ بھی تم سے دوری برداشت نہیں کر پائیں گے۔“

”پلیز ہاتھ چھوڑیں کوئی آجائے گا۔“ مختصری اس کی قربت سے گھبرائی تھی۔  
”کر دیا ناسارے رومانس کا مزہ کر کر۔ تم لڑکیوں کو اتنا خوف کیوں ہوتا ہے، کوئی آجائے گا، کوئی دیکھ لے گا، سو واٹ؟“ کوئین اس کے ہاتھ چھوڑ کر معنوی ناراضی سے کہہ رہا تھا۔

”اوہ..... پہلے یہ تو بتائیے کہ کتنی گرتے سے آپ کے لطفات ہیں؟“  
”ارے! یہ میں نے کب کہا؟“

”ابھی آپ نے کہا کہ لڑکیوں کو اتنا خوف کیوں ہوتا ہے؟“ مختصری کے منہ بنا کر کہنے پر وہ بے ساختہ تہہ لگا بیٹھا۔  
”مان گیا بھئی! تم بھی کمال کی جینکس ہو، ویسے تو شرم و حیا کی پڑ بونی راتھی ہو کہ بندہ ایک لفظ محبت کا سننے کے انتظار میں بہرہ ہو جائے اور جہاں اپنے ساتھ کسی اپنی ہی صنف کا ذکر سنا تو کفن پھاڑ کر چیخ اٹھتی ہو۔“

”یہ..... اس لیے کہ لڑکی جس سے محبت کرتی ہے اس کے لبوں سے صرف اپنا ہی نام سنتا پسند کرتی ہے۔“ مختصری نے جلد بازی میں کہہ تو دیا مگر حیا سے دامنوں میں زبان و باہلی اور ادھر وہ پوری طرح سے جموم اٹھا۔  
”اوہ..... ادیری دیری لگی ڈے لڑائی۔“

☆.....☆.....☆



جیسے جیسے وہ وقت کی گزرتی ساتوں کو شمار کر رہی تھی ان کی پریشانوں و بولکلاہوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

سہ پہر شام میں اور شام رات میں ڈھلنے لگی تھی۔ ذوالنون کی طرف سے انہیں نہ کوئی خبر تھی، نہ کوئی پیغام۔ وہ کال اینڈ نہیں کر رہا تھا۔ ان کے درمیان ایک خاموشی تھی۔ ایسی ہیما تک خاموشی جو اپنے اندر ہولناک طوفان لیے ہوئے ہوتی ہے۔

”مئی انا تم دیکھ رہی ہیں آپ۔ رات گہری ہونے لگی ہے پرس کا ابھی تک کوئی پتہ لھکا نہ نہیں ہے۔“ منال کے لہجے میں بے چینی نمایاں تھی۔

”ڈارلنگ! سمجھا کرو حسن و جوانی مل جائیں تو وقت گزرنے کا احساس کس کو رہتا ہے، ڈونٹ وری۔ وہ آ جائے گا۔“ قاتلہ کے لہجے کی بے باکی اس لمحہ نہ معلوم کیوں منال بیگم کو اذہد بری لگی۔ وہ تیوریاں چڑھا کر بولیں۔

”ماہینڈاٹ مئی! مجھے مل نہیں دیتا کہ پرس..... وہ اپنا بیچ خراب نہیں کر سکتا۔ میرا دل نہیں مانتا ایسا ہوگا۔“

”آف کورس۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا اگر میں اسکاٹھی اس کی برین واشنگ نہ کرتی۔ کیا کیا پاؤں نہ پیلے میں نے اسے منجج کرنے کے لیے۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے مگر ہوگا وہی جو ہم نے چاہا ہے۔“

”پھر بھی مئی اس وقت تک پرس کو آ جانا چاہیے تھا۔“ اس لمبے ملازمہ ٹرائی مھیٹے اندر داخل ہوئی۔

”بیگم صاحبہ! چھوٹے صاحب کو تو بہت وقت پہلے میں نے یہاں آتے دیکھا تھا اور واپس جاتے ہوئے بھی۔“ ملازمہ نے اندر آتے ہوئے ان کی بات سن کر کہا۔

”کیا..... کیا بک رہی ہے؟ کس کو دیکھا تھا تو نے؟“ ملازمہ کی اطلاع ان پر برق کی مانند گری تھی۔

”پرس صاحب کو دیکھا تھا بیگم صاحبہ!“ ملازمہ قاتلہ بیگم کی جلا وطنی آواز سے کانپ کر بولی۔

”تجھے یقین ہے وہ پرس ہی تھا۔“ منال اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”جی بیگم صاحبہ! مجھے یقین ہے وہ پرس صاحب ہی تھے۔“

”وہ یہاں آیا تو روم میں کیوں نہیں آیا؟“ وہ ہکا بکا ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

”کتنی دیر بعد تو نے اسے واپس جاتے دیکھا تھا؟“

ملازمہ بری طرح گھبرا گئی تھی وہ ان کی شطہ مزاجی سے ویسے ہی خائف تھی۔

”وہ جی، میں..... کیا ڈنڈہ میں مالی کو کھانا دینے گئی تھی تو چھوٹے صاحب اس طرف آرہے تھے، جب میں مالی کے کھانا کھانے کے بعد برتن واپس لے کر آ رہی تھی تو صاحب کو واپس جاتے دیکھا تھا۔“

”جاؤ..... دفع ہو جاؤ یہاں سے اور خبردار جو یہ باتیں یاد رکھیں تو۔“ ملازمہ ماسی لمبے وہاں سے بدحواسی سے بھاگی۔

”یہ کیا ہو مئی! یقیناً پرس نے ہماری تمام گنگدوں لی ہے تب ہی اندر آنے کے بجائے واپس چلا گیا..... نہ معلوم کہاں گیا ہے؟“

منال بیگم نے حال ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے پوچھی۔

”ٹیک ایٹ ایزی، ایسی معمولی معمولی باتوں سے پریشر انڈسٹری ہوا کرو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے اس نے کچھ نہ سنا ہو۔“ وہ خود کو سنبھال کر منال کو تکی دے رہی تھیں۔

”پھر وہ اندر آئے بنا کیوں چلا گیا؟ وہ ہمیں گڈ نیوز سنانے آیا تھا۔ پھر خاموشی سے کیوں چلا گیا؟ مجھے محسوس ہو رہا ہے گی، اس نے سب سن لیا ہے۔ وہ سب جان گیا ہے.....“

”ریلیکس..... ریلیکس ڈائرا“ قاتقہ نے پیار سے کہا۔

”میں سب کچھ برداشت کر لوں گی..... مگر پرس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت و عداوت برداشت نہ کر پاؤں گی۔“ وہ زور و شور سے رونے لگی۔

”اوہ منال، منال، کیا ہوا ہے ڈیئر اس قدر اہم و فاضل کیوں ہو رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے آج تمہیں؟“ قاتقہ بیگم ان کی اچانک اٹھتی جذباتیت سے سخت حیران تھیں۔

”زندگی میں پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کے چراغ روشن دیکھے ہیں، میں اب ان آنکھوں میں نفرت کا دھواں کس طرح برداشت کر پاؤں گی۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوا ہے وہ ابھی آجائے گا۔“

”وہ نہیں آئے گا، میرا دل کہتا ہے وہ نہیں آئے گا۔“ اب منال بیگم نے زار قطار اور باوا ڈیپنڈرنا شروع کر دیا تھا۔

”فارگا ڈیک منال! کیا پانگل پن ہے یہ؟ یہ ملازموں کے کان بڑے لمبے ہوتے ہیں وہ کیا سوچیں گے؟ کچھ عمل استعمال کرو۔“ قاتقہ بیگم غصے سے مخاطب ہوئیں۔

☆.....☆.....☆

”کوئین بڑا مسرور سا دہاں سے پلٹا تھا۔ اللہ جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس معقولے پر اسے آج کا یقین آ گیا تھا۔ قدرت نے اس کی جمولی مسرتوں سے بھر دی تھی، برسوں سے چھڑی ہوئی دولت، باپ کی واپسی کی شہل میں ملی تو آج غصہ نے بھی اقرار محبت کر لیا۔

دیکھا سکرین پر گرنے والے موٹے موٹے ہارٹ کے قطروں نے اسے سوچوں کے سمندر سے کھینچ نکالا تھا۔

”اوہ..... یہ کراچی کا موسم بھی بجانے کب محبوبہ کے مزاج کی طرح بدل جائے۔ خبر نہیں ہوتی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بو بڑایا۔

کار میں بیٹھ اور دھیمسا میوزک چل رہا تھا۔ وہ بہت خوشگوار موڈ میں ڈراما بیگم کر رہا تھا۔ طویل عرصے بعد خوشیوں نے اس کے دل پر دستک دی تھی۔ اس نے پوری طرح بائیس وا کر دی تھیں۔ انہی سوچوں میں گم اس نے گاڑی ٹرن کی۔ سامنے کچھ قافلے پر بھوم دیکھ کر چٹکا پھر

اس کی نگاہ لوگوں سے ہوتی ہوئی اس آف وائٹ مر سٹڈیز پر پڑی۔ دوسری لمحے وہ بیکھلا کر باہر نکلا اور لوگوں کے درمیان جگہ بنا کر کار تک پہنچا۔ سو فیصد یہ کار ڈالٹون کی تھی جو اس وقت بری حالت میں کھڑی ہوئی اپنی تباہ حالی کا ثبوت تھی۔ کار بری طرح درخت سے ٹکرائی تھی۔ ٹکرائی شدہ تھی کہ اس کا گلا حصہ بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ وٹراسکرین کا گلاس ٹوٹ کر درخت کی کئی شاخیں اندر گھسی ہوئی تھیں۔ کئی ہاڈی پر گری ہوئی تھیں۔ خون کی سرخی اگلے حصے میں جگہ جگہ دیکھ کر اس پر قیامت بیت گئی۔ دل کٹیٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

”یا الہی! خیر۔ میرے بھائی کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔“ اس نے دھواں دھواں ہونے احساسات کے ساتھ دعا کی۔

”بہت خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“

”کار اتنی شدت سے پڑے ٹکرائی ہے کہ بیڑ کا بڑا حصہ ٹوٹ کر اس پر گر گیا ہے۔“

”نو جان نسل کو گاڑی بھگالے کی پڑی ہوئی ہے پھر جلدی جلدی کے چکر میں آگے نہیں دیکھتے کہ کیا آرہا ہے۔“ وہاں کھڑے لوگ تہرہ کر رہے تھے۔

”کیسا خوبصورت جہاز ہے..... مشکل ہی بچے۔“

”نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا مت کہو، میرے بھائی نے عروسی اور دکھ ہی دکھ دیکھے ہیں۔ اسے تو ابھی جینا ہے، ذمہ داری سرفوں کی نوید لے کر ابھی آئی ہے وہ اس طرح نہیں جاسکتا۔ میں اسے جانے نہیں دوں گا۔“ کونین بڑبڑایا۔ وہاں کھڑے لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ ان کے منہ سے نکلنے والے لفظوں سے کون کس طرح گھائل ہو رہا ہے۔

”بھائی صاحب! ایکسیڈنٹ کس کا ہوا ہے؟“ ڈیروڈز برہوتی ہوئی دلی کیفیت میں جھلا اندیشوں سے کانپتے لہجے میں کونین نے وہاں سے جاتے ہوئے ادب و احترام سے دریافت کیا۔

”کوئی نو عمر لڑکا ہے، بہت خطرناک حادثہ ہے۔“

”کسی نے ایسی پولیس بلاوائی تھی، منہ معلوم کس ہاسپتال لے کر گئے ہوں گے؟“

بارش تیز ہو گئی تھی۔

تیز ہواؤں نے ماحول کو بالکل ہی سرد کر کے رکھ دیا تھا۔ لوگوں کا جھوم وہاں سے غائب تھا۔ سخت سردی و بارش میں وہ ڈالٹون کی کار کی بیک کو بیٹھ کر کھڑا تھا گویا جسم میں جان باقی نہ ہو۔ حواس یک دم ہی ٹھل ہو کر رہ گئے تھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کرے تو کیا کرے؟ جو ہوا ہے وہ خواب ہے یا حقیقت؟

پھر وہ بھاگتا ہوا کار کی طرف بڑھا۔ ڈیٹس بورڈ پر رکھا اس کا سیل فون بکل دے رہا تھا۔ اس نے اسکرین پر چپکتے صدائل کے نام کو دیکھا۔ اس کا دل بری طرح سے پھر دھڑکنے لگا۔

”ہیلو..... اس کی چنسی چنسی آواز نکلی۔“

”کوئین انورا ہاسپل آئیں۔“ صد صاحب نے سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے سیل بند کر دیا۔

”اوہ!“ کاچتے ہاتھوں سے کاراٹارٹ ہوئے اس غضب کی سردی میں بھی اس نے اپنے ہاتھ پر پچھے محسوس کیے تھے۔

”خوشی کی عمر اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے؟ یا ہماری خوشیاں ہی اتنی چھوٹی عمر کی ہوتی ہیں جن سے آشنائی پوری طرح ہو بھی نہیں پاتی

کہ وہ دامن بچا کر بھاگ بھی جاتی ہیں۔“

☆.....☆.....☆

”کرن! ہم اپنے نئے گھر یعنی ”آشیانہ“ کی گریڈ پارٹی دیں گے۔ گیٹ لسٹ اور منیج کی سلیکشن بھی کر لو۔“ اس صاحب

ایزی انداز میں لیتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئے۔

”ہوں ٹھیک ہے..... میرے خیال میں یہ کام ہم بی بی جان اور بھائیوں کی موجودگی میں کریں تو بہتر ہے؟“ شال کا اندھوں پر

ڈالتے ہوئے کرن نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ وہ بھی پیار بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”وائے ناٹ۔“

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”سوچ رہا ہوں، کیا میں اتنا خود پسند ہوں جو آپ معمولی سا کام بھی میری اجازت کے بغیر نہیں کر سکتی ہیں۔“

”ارے نہیں، یہ میں نے کب کہا؟ آپ تو گریٹ ہیں، یہ ہر کام پوچھ کر کرنے والی عادت کو آپ محبت کہہ سکتے ہیں۔“ وہ یہ کہتی

ہوئی ان کے پاس سے اٹھنے لگیں تو انہوں نے ہاتھ پکڑتے ہوئے دھمکے اور پیار بھرے انداز میں کہا۔

”محبت کی انتہاؤں کو مات دے دی ہے تم نے یا اسی لیے میں نے تمہیں کبھی بیوی نہیں سمجھا۔“

”دہاٹ؟“ گویا وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے نہیں۔ ”معلوم ہے آپ کو..... کیا کہہ رہے ہیں؟“

”آف کورس۔“ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”آپ کے ایسے مذاق مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔“

”آئی ایم سیر لیس۔“

”میں جا رہی ہوں۔“

”ہاہاہاہا.....“ وہ ساختہ تہقیر لگا کر گویا ہوئے۔ ”میں ہر دفعہ کہتا ہوں یا رام میں بیوی نہیں چاہتا ہوں، پھر بھی تم مانیڈ کر جاتی

ہو..... یہ کوئی بات ہوئی؟“

”بٹ..... ہر بار ایسے درڈرا مجھے نہیں لگتے۔“

”او کے، ہماری جان سے پیاری بیٹی کدھر ہوتی ہیں آج کل؟ بہت کم کم اس کا پیرا چہرہ ہماری آنکھیں دیکھ پاتی ہیں۔“

”آفس جاتے وقت آپ مل کر گئے ہیں پھر آکر شاپنگ سینٹر چلے گئے تھے۔ دراصل آج کل آشیانہ کی تیاریوں کی وجہ سے مصروفیات اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ ساتھ بیٹھنا بہت کم ہو رہا ہے۔“

”اس کو میرے پاس بھینچتی ہوئی جائیں، گرین ٹی کے مراہ۔“

”جی اچھا۔“

وہ کچن میں ملازمہ کو گرین ٹی کا کہہ کر لاؤنج میں چلی آئیں جہاں تمام بیک جینزیشن جمع تھی۔ ڈرائی فروٹس کے ساتھ باتوں کا دور چل رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ سب شوخی سے گویا ہوئے۔۔۔۔۔

”وہیلکم..... ویلکم آئی!“ وہی نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ اسکے کس لیے لگایا جا رہا ہے؟“ وہ ہنستی ہوئی گویا ہوئیں۔

”اسکے نہیں آئی آپ تو ہمیں ویسے بھی اتنی اچھی لگتی ہیں۔ آپ کی اور اس اکل کی جوڑی آئیٹیل ہے۔ رنگی، آپ جو گرین کی ممانہیں، سسر لگتی ہیں۔“

”او کے، او کے، پلیز اتنی تفریحیں مٹور کر دیں گی۔“ ان کے انداز پر وہ ٹھنکنا کر ہنس پڑیں۔

”آئی اہائی دی وے، آپ کیا ہریہ کو اپنی سرپرستی میں لے رہی ہیں؟“ وہی نے استفسار کیا۔

”ہریہ تو ہے ہی میرا بیٹا، سرپرستی سمجھنے سے لی ہوئی ہے۔“ وہ ہریہ کی طرف دیکھتی ہوئی شفقت سے گویا ہوئیں۔ ہریہ کے خوب صورت چہرے پر مسرت و انبساط کے رنگ بکھر گئے۔

”آئی آپ سمجھ نہیں رہیں، ہمارا مطلب دوسرے رشتے سے ہے۔“ رؤف جھپٹکا ہوا بولا۔ انہوں نے سر ہلا کر تائید کی۔

”اچھا..... اچھا..... یہ بات ہے۔“ وہ شوخ لہجے میں ہریہ کی جانب دیکھتی ہوئی گویا ہوئیں تو ہریہ جھینپ گیا۔

”ارے آئی آپ کو پہلے سے معلوم نہ تھا کیا؟“ سرد نے استغناء سے لہجے میں کہا۔

”نہیں، مجھے ابھی معلوم ہوا ہے۔“

”کسی نے انکار نہیں کیا آپ کو؟“ سفیان کو تجسس ہوا۔

”اوہ..... ہو..... ہو.....“ کئی مہتی خیر لگا ہیں اور آواز میں ہریہ کی جانب اطمینان تو وہ مسکرایا۔ لڑکیوں میں سے ولانے لب کشائی کی۔

”میری تو مرضی ہی مرضی ہے لیکن فیصلہ تو بی بی جان کو کرنا ہے۔ آشیانہ شفٹ ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہی ہے۔ بی بی جان کو وہاں جا کر پوچھ لیں گی۔“

ہریہ کے چہرے پر مسرتوں کے پھول کھل اٹھے۔ وہ اس سے چمیل چماڑ میں مصروف ہو گئے۔

”ارے ہاں، میں تو حورین کو بلانے آئی تھی، وہ یہاں نظر نہیں آ رہی، نہ مول ہے۔ کہاں ہے دونوں؟“ ان کو یاد آیا تو وہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آئی اہم لوگ آج ماموں کے ہاں گئے ہوئے تھے، کچھ دیر قبل ہی واپسی ہوئی ہے، حورین اور مول سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ زویا کے کہنے پر وہ باہر نکل آئیں۔

انہوں نے ادھر ادھر حورین کو دیکھا، وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ سیدھی مول کے بیٹروم کی طرف بڑھ گئیں کہ وہ یہی بتا دے گی۔ مول سے اس کی گاڑھی چھٹی تھی، اکثر دونوں ساتھ ہی رہتی تھی۔ نثر کے بعد وہ مول کے قریب آ گئی تھیں۔

”مول! کیا ہوا؟ تم اس قدر پریشان اور گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی ہو؟ خیریت تو ہے ناں بیٹا؟“ مول کرے سے باہر آئی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اس کے قریب آ کر بولکھلائے ہوئے لہجے میں گویا ہوئیں۔

”آپ پریشان مت ہوں آئی! آئی ایم رائٹ۔“ کنزور اصاب و بے حوصلہ کرن بیگم اس کے متوصل چہرے کو دیکھ کر دل پر ہاتھ رکھ چکی تھیں۔ مول نے چیزی سے آگے بڑھ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر خود کو سنبالا۔

درحقیقت وہ کئی گھنٹوں سے حورین کو کال کر رہی تھی، وہاں سے جواب نہیں مل رہا تھا کیونکہ وہ کہہ کر گئی تھی کہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رُکے گی اور اب اسے گئے ہوئے سات گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

کیا ہوا ہے؟

مجھ سے باہر تھا، حورین پر جتنا اصرار تھا، اتنا ہی اعتبارا سے ذوالنون کی شرافت پر بھی تھا۔ وہ ہر طریقے سے کاٹلی بھروسہ تھا۔ لیکن..... پھر نہ معلوم کیا بات تھی کہ وہ کال رہے بیٹو نہیں کر رہا تھا۔ وقت تھا کہ سرعت سے گزرے جا رہا تھا۔ ہرگز رتا لہرا سے ٹکرو پریشانی سے پاگل کر رہا تھا۔ وہ بڑی طرح خوف زدہ ہو رہی تھی۔ اس کے کہنے پر ہی وہ گئی تھی، اور نہ وہ خود گھبرار ہی تھی۔ نہ معلوم کیا حادثہ پیش آیا ہے؟ ڈرائیور بھی حورین کو چھوڑ کر گاؤں چلا گیا تھا، اور نہ وہ اس کے ساتھ چلی جاتی جہاں حورین کو اس نے ڈراپ کیا تھا۔ دوسرا ڈرائیور اس جگہ سے لاعلم تھا۔ لاعلم تو وہ خود بھی تھی۔

گزرتے وقت نے اسے بہت بے سکون کر دیا تھا۔ بڑھتی ہوئی سردی اور بدستور حورین کی گمشدگی نے اسے بالکل ہی خوف زدہ کر دیا تھا۔

وہ ہریرہ کو سب سچ سچ بتا کر مدینے کی نیت سے کرے سے باہر نکلی تھی جو کرن اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

”پھر تمہارا چہرہ اس قدر زرد کیوں ہو رہا ہے؟“ کرن اس کے چہرے کو ہاتھ لگاتی ہوئی بولیں۔

”سر میں درد ہو رہا ہے۔“ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان بچھری۔

”کوئی میڈیسن لی؟ ڈاکٹر کو کال کرو؟“ دوسوں، اندیشوں میں دل اس حد تک پریشان تھا کہ اب کوئی معمولی یا غیر معمولی

بات پر دھڑکنیں رکھنے لگی تھیں۔

”میں نے دوائی لے لی ہے آپ نگرمت کریں آنتی“۔ موزل کا دل ٹمک کی ڈلی بننے لگا تھا۔ لگا ہوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ یہ سوچ کر کا بھی کچھ دیر بعد جب حورین کی کشمکش کا معلوم ہوگا تو پھر کیا یہ خود کو سنبھال پائیں گی؟

”چلو اندر چلو، درد بہت زیادہ ہو رہا ہے، میں دباؤں کی تو لٹھوں میں آرام آجائے گا۔ حورین سے سردیوں لٹھیں تو آرام آجاتا۔ بلاتی ہوں اسے تمہارے روم میں ہی ہے وہ، سب جگہ تلاش کر کے آگئی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تمہارے روم میں ہوگی“۔ وہ نہ احماد لہجے میں کہتی ہوئی آگے بڑھیں۔

قل اس کے کہ وہ دروازہ کھول کر اندر جائیں، ملازمہ بدحواس سی وہاں بھاگتی ہوئی آئی۔

”جنگ صاحبہ! جنگ صاحبہ!“ بے تھا شا پھولی ہوئی سانسوں کی وجہ سے اس سے بات نہ کی جا رہی تھی۔

”یا اللہ! خیر، کیا ہوا مہرودا؟“ ان کے علاوہ اس کا دل بھی خوف کے مارے کانپ اٹھا۔

”وہ..... جی احمدین بی بی..... اسٹیڈی روم میں بے ہوش پڑی ہیں“۔ ملازمہ کی بات سنتے ہی وہ دونوں ادھر بھاگیں۔ ان کی چیخ و پکار نے لٹھوں میں سب لوگوں کو ادھر جمع کر ڈالا۔

”حورین! حورین!“ سب سے آگے انس صاحب تھے۔

کارپٹ پر اس کا وجود شاخ سے گرے پھول کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ آگے بڑھ کر انہوں نے اسے چھوا، اس کا وجود صرف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا، انہوں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ کرن پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے لے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ہریرہ نے ڈرامائی ٹیک سیٹ سنبھالی۔ کچھلی لشت پر بی بی جان حورین کا بے جان جسم سنبھالے آجوں کا درد کر رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

یکے بعد دیگرے کئی کارپس ہاسپٹل کے کپاؤٹرز میں رکھیں۔ سب سے پہلے کونین کار سے اتر اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا O-T کی جانب بڑھ گیا۔ باہری آپریشن تھیٹر کے پاس صمد صاحب مل گئے، وہ ان کے گلے لگ کر خود پر قابو نہ رہ سکا۔

”انکل! یہ کیا ہوا؟“ یہ کیسے ہو گیا؟“ کونین بھائی کی محبت میں بچوں کی مانند رونے لگا۔

”بی بی بی مائی سن! ایک کیر، اسے اس وقت دھاؤں کی اشد ضرورت ہے، دھاؤں سے زیادہ دھائیں اس کے لیے اہم ہیں پلیز دھائیں کرو اس کے لیے۔“

صمد صاحب ڈاکٹر ہونے کے باوجود اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پانے میں مشکل محسوس کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تھیٹر سے باہر تھے۔

”انکل! وہ چیخ تو جائے گا؟ ۱۲ سے زندہ رہتا ہوگا انکل! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ اس نے دیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی تو اسے پلا سے

بھی ملتا ہے، زندگی کو جھلی رنگ میں دیکھنا ہے۔“ کونین جیسا قابل و صابر بندہ حوصلہ چھوڑ بیٹھا تھا۔ یہ ڈکھ ہر ڈکھ سے ہماری اور ناقابل برداشت تھا۔

”لیک کیتھار انشا اللہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ تم خود کو سنبالو پانیز۔“ آگے پیچھے وہ سب ہی چلے آئے تھے، مگر میں راحیلہ بیگم کے پاس اریبہ کو چھوڑ کر، کیونکہ ان کو اس حادثے کا بتایا نہیں تھا۔ معیونے اسے گلے لگا کر تسلی دی، حالانکہ ان سب کے چہرے تنکرتے۔ ہریرہ اور محترمی پہلے ہی آپریشن تھیٹر میں جا چکے تھے۔

صنوبر بیگم اور سونیا چپکے چپکے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ شوخ و کھلتے رے خضر کے چہرے پر بھی بے چینی کی سرخی تھی۔ معیون سب کو تسلی دولا سے دے رہا تھا۔

ان سب سے آخر میں آنے والے حمزہ تھے، جن کی وحشی چال سے فکسنگی و بے رہنگی ظاہر ہو رہی تھی مگر نہ نور بارائش چہرے پر دکار و سکون کی بااثر کیفیت ظاہر تھی۔ کونین جو خود کو سنبال نہ پارہا تھا، بڑے جذباتی انداز میں ان سے لپٹ گیا۔

”بابا.....! بابا! پرنس؟“ وہ پھر شدت سے رو پڑا۔

”صبر میرے بیٹے! صبر سے ہمیں یہ سب نہیں دینا کہ اس کی دی ہوئی خوشیاں ہمیں خوشی نہیں اور دکھوں پر وا دیا جا کر ناشہری کا اظہار کریں۔ بہت غلط اعزاز ہے یہ۔“ وہ اسے سینے سے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

”خوشیاں! خوشیاں ہمیں ملی ہی کہاں ہیں بابا! ہمیں ڈکھ ہی ڈکھ لے ہیں۔ آج پہل بار خوشی کا چہرہ دیکھا تھا کہ دکھوں نے پھر اپنے حصار میں لے لیا۔“

”اللہ سے شکایت کرنے کا بندے کو کوئی حق نہیں ہے، ہمیں جو بخشا جاتا ہے، ہمارے اعمالوں کے سبب سے بخشا جاتا ہے۔ جا کر وضو کرو اور اللہ سے مانگو جو وہ نواز دے تو شکر سے لے لو۔“

کونین خاموشی سے آنسو صاف کرتا ہوا معیون کے ساتھ وضو کرنے چلا گیا۔ صنوبر و سونیا پہلے ہی کوریڈور سے آگے بنے کٹہرے میں بنی نماز کی جگہ پر بیٹھیں قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف تھیں۔

”کیسا..... ہے..... وہ؟“ تنہائی پاتے ہی صمد صاحب ان کے سینے سے لگے تو وہ بولے۔

”ڈعا کریں بھائی اور موت و زینت کے درمیان ہے، اس کی کنڈیشن دیک ہے، بلڈنگ بہت ہو چکی ہے۔ ابھی بھی ہو رہی ہے اگر یہی کنڈیشن رہی تو.....“ شدت جذبات سے ان کی آواز رندہ گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکے۔

”جو اس کی رضا ہے، وہ میری رضا ہے۔ ہم سب اس کی امانت ہیں اور ہم سب کو لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے، وہ جس حال میں بھی رکے صرف اور صرف اپنا ہا کر رکے، سب منگور ہے۔“

حمزہ نے سامنے برستے آسمان کی طرف دیکھا اور وہیں سبک مرمر سے بنی منیٹھا پر بیٹھ گئے، جو عرف کی طرح سر تھی۔



”بھائی جان! آپ اندر چلیں، یہاں بہت سردی ہے۔“ صاحب نے بہت احترام سے ان سے کہا۔

”نہیں، جو آگ میرے اندر بھڑک رہی ہے اگر باہر نکل گئی تو اس سارے ماحول میں لگ جائے گی، یہ سردی کچھ نہیں۔“

”بھائی جان! پھر بھی..... میں یا بچے آپ کو اس طرح یہاں نہیں دیکھ سکتے۔“ صاحب شکر تھے۔

”صدا جس حزرہ کو تم جانتے تھے، جو کالج کا دل، موتی جیسے جذبات رکھتا تھا، وہ بیس سال قبل جذباتی موت مر چکا ہے۔ اب

تمہارے سامنے وہ حزرہ ہے جو بالکل بدل چکا ہے۔ یہ بیدلے موسم و وقت کے تیرا اس کے لیے کچھ نہیں ہیں۔“ حزرہ کے نرم لہجے میں وہ جلالی

پن تھا جو عام بندوں پر ایک آن دکھی نسبت طاری کر دیتا ہے۔ صمد نے پھر کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے وہاں سے ڈاکٹرز روم میں چلا گیا،

جہاں اس کی کال تھی۔

حزرہ وہاں بیٹھ کر سبحان و ذکر میں مشغول تھے۔ صاحب بھی کئی چکراہٹی کے لگا چکے تھے۔ ہر بار ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ نگر

مند و کھائی دیتا تھا اور سب کے دل دھڑک اٹھتے تھے، وہاں کوئے کوئے میں گویا آداسیاں بکھری پڑی تھیں۔ عام حالات میں سرعٹ بھاگنے

والی گھڑی کی سوئیاں جھوٹی سے بھی کم رفتار میں سرک رہی تھیں۔ وقت کی جبکہ دل کی دھڑکنوں نے لے لی تھی۔

”کوئین! بھائی! تم آ رہی ہیں پلیز، انہیں سنبھالنا وہ شاکڈ ہیں، میں نے انہیں اخبارم کر دیا ہے۔“

”اوکے، وہ کب باہر آئے گا؟ بہت تاخیر ہو گیا ہے اندر گئے ہوئے۔ کیا کنڈیشن بہت زیادہ سیریس ہے؟“ کوئین جو خود کو

سنبھال چکا تھا، اسے اپنے جذبات سے شدید جنگ لڑنی پڑی تھی، پھر سب سے زیادہ حوصلہ حزرہ کی موجودگی نے دیا تھا۔

”مجراہ طور پر خطرناک چٹوں سے وہ بچ گیا ہے جہاں یہ حادثات میں عموماً لگا کرتی ہیں لیکن خون بہت خالص ہوا ہے اور ابھی کم

ہوا ہے، ڈک نہیں رہا جیسے ہی بلیڈنگ انڈر کنٹرول ہوتی ہے ہم اسے روم میں شفٹ کر دیں گے۔“

صدا نکل سے تفصیلی بات کر کے اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ اسی وقت منال، قائدہ بیگم کے ہمراہ اندر داخل ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا؟ میرا پرنس کہاں ہے؟“ وہ دہرایا گی کے عالم میں آ کر کوئین کو گھنٹاتی ہوئی بولیں۔

”وہ ٹھیک ہے ماما! آپ..... آپ پریشان مت ہوں۔“

”وہ ٹھیک ہے تو کہاں ہے؟ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے؟“

”منال! اوٹس میں آؤ، پرنس آپریشن تھیٹر میں ہے۔“ قائدہ بیگم سارے راستے انہیں بمشکل سنبھالتی لاتی تھیں۔ اب بھی ان کی نیم

دیوانگی کی حالت دیکھ کر گویا ہوئیں۔

”تم چپ کرو، تم عورت نہیں ڈائن ہو، یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے، ایسا ہمیشہ تم جیسی عورتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔“ وہ آنکھیں

نکال کر ان کی طرف بدھیں، اگر کوئین بروقت ان کے ہاتھ نہ پکڑ لیتا تو لیکن تھا وہ ہاتھوں سے ان کا چہرہ لہلہا کر دیتیں یا گلا ہی بادی دیتیں۔

”ماما! دعا کریں، یہ دعا کا وقت ہے۔“

”صدمہ بڑا امثال بہت زیادہ ڈپرےڈ ہے پلیز، اسے کوئی انجکشن دے دیں، جس سے یہ ریٹیکس ہو جائے۔“ قائلہ بیگم بیٹی کے ہاتھوں تماشا بننے کے خوف سے صدمہ کو بلا کر لے آئی تھیں۔ مثال ہوش و خرد سے بیگانہ نہیں بن سکتا تھا۔ صدمہ کی ہدایت پر کونین انہیں وہاں سے روم میں لے آیا، جہاں نرس نے انہیں انجکشن دے دیا۔

”کونین اپنی حالت کی ذمہ دار یہ عورت ہے، اس کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ اے معاف.....“ انجکشن نے فوری اثر دکھایا۔ وہ کہتے کہتے سو گئی تھیں۔

”ایک دم ہی صدمہ لے لیا اور دیکھو ڈرا..... ماں دشمن نظر آنے لگی۔ اپنی دے اٹھے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ تم بتاؤ، پرنس کی حالت کیسی ہے؟“

”ڈاکٹر! کوئین کا دل اس وقت ماں اور نانو سے بہت غراب تھا۔ وہ ان پر نگاہ ڈالے بنا باہر نکل آیا۔“ کوئین امبارک ہو، ذوالنون نے موت کو کھست دے دی۔“ ہریرہ بڑی گرم جوشی سے اس سے آکر پلٹ گیا۔

”اوہ.....! اللہ حیرالاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں بابا جان سے مل کر آتا ہوں۔“ کوئین کی مسرتوں کا کوئی لمحہ نہ جھپٹ گیا تھا۔

”چچا جان شکر لانے کے لواقل ادا کرنے لگے ہیں۔“

”میں بھی جا رہا ہوں۔“

جہاں کچھ دیر ٹھل ستانے، ویرانیاں اور سسکیاں تھیں، وہاں اب ذوالنون کی حیات نوکی خبر طمانیت و مسکراہٹ میں کرہونٹوں پر کھلی ہوئی تھی۔ روشنی میں کرچروں کو منور کر رہی تھی۔

ذوالنون روم میں شفٹ ہو چکا تھا۔ اس کا سر، بازو اور سینہ بیچوں میں جکڑا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی کافی خراشیں تھیں۔ صبح صادق کے وقت اسے کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تھا۔ وہ اب ڈاکٹر زکی ٹرینٹ کے بعد سکون اور انجکشن کے باعث سو رہا تھا۔ صدمہ صاحب نے سب کو ذوالنون کی طبیعت بہتر ہوتے ہی گھر بھیج دیا۔ اب وہ خود اور مزہ تھے، جو دل کی کیفیت سے مغلوب اس کا چہرہ یک نگ دکھ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

شعبہ انتہائی عمدہ داشت میں حورین کو فوری طور پر ایڈمٹ کیا گیا تھا۔ اس کا نرس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر زکی سر توڑوشش کے بعد وہ ہوش میں آئی تھی مگر دواؤں کے باعث اس پر ابھی خودگی طاری تھی۔ رات بھر سب لوگ ہسپتال میں جمع رہے تھے۔ بے شمار دعائیں، نٹیس، صمدتے اور خیرات کی رقم چھڑائی میں دی گئی تھی۔

صبح بی بی جان نے سب کو گھر بھیج دیا تھا۔ کرن اور انس صاحب وہاں سے ملنے کو تیار نہیں تھے۔ مول بھی بی بی جان کی منت سماجت کر کے ڈک گئی تھی۔ بی بی جان بھی محسوس کر رہی تھیں اس کی محبت کو کہ کل سے اب تک حورین کی محبت میں وہ نچر کر رہ گئی تھی، سو وہ کچھ نہ بول سکیں۔ مول کے لیے اس کا اسٹیڈی روم سے اس حالت میں ملنا بہت بڑا اسمہ تھا۔ اب جب تک وہ یہ معلوم نہ کر لیتی کہ اصل قصہ

کیا ہوا؟ اسے جھنڈا ہاتھ، کیونکہ اس بات نے اسے بے سکون کر رکھا تھا، اس کے اصرار پر جو عین گئی تھی، زندہ اصرار کرتی، زندہ جاتی اور نہ ہی اس کی یہ حالت ہوتی۔

”سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ محمد نے ایسی کس بات کی ٹینشن لی ہے جو اس حالت کو پہنچ گئی۔ ڈاکٹر زکیر ہے ہیں اگر معمولی سالیٹ ہو جاتے تو ہماری بیٹی؟.....“

کرن رات سے یہی بات کہہ کہہ کر رو رہی تھیں۔

”شکر ہے اس مالک کا..... کہ اس نے جان بخش دی، حساس بھی بہت زیادہ ہے۔ کوئی بات دل کو لگ گئی ہوگی، بلکہ کل صبح ہی تو بی بی کا ایک نوزائیدہ بچہ سردی سے مر گیا تھا۔ اس کے قدم میں ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بس وہی سوچا ہوا۔“ بی بی جان کو اچانک ہی کل صبح کی بات یاد آ گئی۔

”ایسی حساسیت بھی کیا جو جان پر بین جائے۔ آج کل تو انسان ہی انسان کو مار کر پیچک رہا ہے اور ملال تک نہیں کرتا۔“

”آئی! اٹکل! آپ لوگ کچھ کھالیں ناں۔ رات سے صبح ہو چکی ہے۔“ مول ان دونوں سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں بھئی! جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اب کھاؤ، پیو، ڈرا چروں پر بھی رونق آئے۔ بی بی جاگے گی تو مزید پریشان ہو جائے گی اور کرن! خبردار جواب بی بی کے سامنے آنسو بہائے۔ ایک تو وہ پیار ہے پھر رو کر اور ڈراؤ۔“

بی بی جان نے از خود لہجہ تنکھی بنایا۔

”بی بی جان! میں بے بس ہو جاتی ہوں۔“ کرن چھلک جانے والے آنسو صاف کر کے یولی۔

”ہمت پکڑو بیچے! مضبوط بنو، اولاد ہی ماں باپ کی سب سے بڑی کمزوری ہے تو طاقت بھی ہے۔“

”میں اس کو اس طرح نہیں دیکھ سکتی۔“

”غلط بات بی بی ذات کو آگے چل کر سو طرح کے سسٹے ہوتے ہیں جو بی بی کے لیے ماں کو ہی حال کرنے پڑتے ہیں اگر تم اس طرح آنسو بہانے بیٹھ جاؤ گی تو خود بھی تباہ ہو گی۔ بی بی کو بھی بتا دو گی۔ کل رات یہاں کچھ لوگ اور بھی آئے تھے۔“

”حورین کے علاوہ؟“ انس صاحب نے دریافت کیا۔

”ہاں، کوئی نوجوان ہے، کارورخت سے ٹکرا گئی ہے۔“

”کیا ہوا اس کا؟“

”میں فجر کی نماز پڑھنے گئی تھی جب لڑکے کی بیٹی سے پتا چلا تھا، آدھ مسطورم کرنے چلتے ہیں وہ لڑکا کس حال میں ہے؟“

”بی بی جان! پہلے ناشتہ کر لیں پھر ملی جائیے گا۔“

مول نے ہریرہ کے لائے ہوئے نقن باکس میں سلائم، اٹھے، جیم اور بٹر نکالتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر قبل ہی ہریرہ نقن باکس اور فلاسک میں چائے دے کر گیا تھا۔ مول نے صوفے کے درمیان پڑی سینئر ٹیبل پر پائینوں میں ناشتہ لگا دیا۔

گھر جا کر فاریاد میرا بیگم نے ناشہ بیچ لوازمات بھیج دیا تھا۔ انہوں نے برائے نام ہی کہا یا تھا۔

حورین شام تک نہ صرف مکمل طور پر ہوش میں آچکی تھی بلکہ اس کی طبیعت بھی خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ بی بی جان کے خیال سے کسی نے بھی اس سے زیادہ بات کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔

حورین کو ہوش میں آنے دیکھ کر کرن اور انس کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اس نے وہ دن زیادہ تر دو اؤس کے زیر اثر سوتے ہوئے گزارا اور جاگنے پر بہت کم بات چیت کی تھی۔ ڈاکٹرز نے اسے ابھی چند دن تک ڈسپانچ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ آج رات بی بی جان نے زبردستی انس صاحب اور کرن کو بھی گھر بھیج دیا تھا۔



چوبیس گھنٹے گزار چکے تھے، وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ آتی جاتی سانسوں کا زیرو ہم اس کی حیات کا یقین دے رہا تھا، ورنہ اس نے ایک بار بھی آنکھیں نہ کھولی تھیں۔ صبر صاحب نے گہرا کرملکی وغیر ملکی ڈاکٹرز کا پورڈ طلب کر لیا، جہاں اس کی تمام رپورٹس کا ازسرنو جائزہ لیا گیا۔ رپورٹس تمام کی تمام ہی تسلی بخش تھیں، معمولی زخموں کے علاوہ کوئی سیریس گھاؤ نہیں تھا۔ خون زیادہ بہنے کی وجہ سے اس پر جو حفاظت طاری ہوئی تھی اس کا سبب باب بھی اسے خون کی کٹی بوتلیں چڑھا کر کیا گیا تھا لیکن اب وہ بہر تھا۔ زخم اس کے بے شک شدید زخمیت کے تھے مگر وہ زخم کے فریکچر سے محفوظ رہا تھا۔ یہ احساس ان سب کے لیے باعثِ تعویب تھا۔ ویسے بھی ان دنوں وہ بڑی شدتوں سے ماگی گئی داد و جان کی دعاؤں کے حصار میں رہا تھا۔

جہاں بزرگوں کی دعائیں حصار قائم رکھتی ہیں وہاں بڑی بڑی مشکلات ٹل جایا کرتی ہیں اگر وہ بھیانک و خطرناک بلاؤں سے بچ سکا تھا تو وہ دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا جنہوں نے نہ صرف اسے ہسپتال میں کرنے سے بچایا بلکہ مجراؤں طور پر زندگی بھی محفوظ رکھی تھی۔ چوٹ جب ضمیر پر لگتی ہے تو بے حس کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں، اہلن کی سیاہی چہرے پر چھانے لگتی ہیں، انس دم توڑنے لگتا ہے اور خود پرستی اذیت بننے لگتی ہے۔ وہ بھی ایک طویل عرصے سے خود پرستی و خود پسندی کی گمراہ روش پر قائم رہی تھی۔ ان میں اچھی بننے کی آمنگ نہ تھی یا انہیں بننے نہیں دیا گیا تھا۔ ان کی تربیت ایک ایسی عورت نے کی تھی جو آزاد منش، حریص طبیعت، رشتوں اور ناطوں کو ٹھوکروں میں اڑانے والی تھی جس کے نزدیک سب کچھ ”دولت“ تھی۔

فاقہ بیگم کی اٹلی پکڑ کر وہ چلتی رہی تھیں، ان کی آنکھوں سے دیکھتیں، ان کے کانوں سے سنتیں اور ان کے دماغ سے سوچتیں، خواہشوں کے حصول کی تک وہ وہیں دیوانہ وار بھاگتی بھاگتی اتنی دور جا چکی تھیں کہ اب واپسی کا راستہ یاد نہ آ رہا تھا۔ کل سے رورو کر ان کی آنکھیں سوچ گئی تھیں۔ آنسو اب بھی ان کی آنکھوں سے بہ رہے تھے۔ ماضی کے روزوں سے کرپید و فریب حرکتوں اور یادوں کے سیاہ ناگ خوب ڈستے رہے تھے پھر سب سے زیادہ جو ج کے لگ رہے تھے وہ ڈالٹون کے ساتھ کی گئی غلط بیانی تھی اور جو اب اس کی حالت مستزاد حقیقت و سچائی سے اس کا واقف ہو جانا..... وہ جانتی تھیں کہ اب وہ تاحیات اس سے آنکھ نہ ملا پائیں گی۔ بلندی سے گر کر اٹھا جاسکتا مگر

لگا ہوں سے گر کر نہیں۔ جزہ کی وانہی کی خبر نے انہیں حریہ متحمل کر ڈالا تھا۔ ضمیر پر بڑھتا ہوا بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ ان کے درمیان اختلاف اور جدائی کی وجہ بھی ذہنی بے راہ روی وغیر حقا فطرت تھی۔ وہ برسوں سے جن خواہشوں و حسرتوں کے شیش محل میں آرزوؤں کے سنگھاسن پر براجمان اس انتظار میں تھیں کہ آنے والا وقت ان کا ہے، ہر کام ان کے فضا کے مطابق ہوگا..... سو جس تو سدا ہی لا حاصل رہی ہیں۔ یہ وہ جگنو ہیں جو دور دور سے جھلک دکھا کر آپ کو اسیر کر لیتے ہیں۔ جب آپ ان کے حصول کے لیے دیوانہ وار ان کی طرف دوڑتے ہیں تو یہ آگے ہی آگے بھاگتے ہیں اور بھاگتے ہی چلے جاتے ہیں، کبھی ہاتھ نہ آنے کے لیے۔

منال بیگم نے بھی ایک عمر گنوائی تھی، ان جگنوؤں کو پکڑنے کی خاطر اور پھر اپنی خوشیاں، گریہ سستی، شخصیت، خودداری، انا، عزت اور آخر میں اپنی کائنات..... اور اولاد بھی..... حاصل کچھ نہ ہوا۔

حسرتیں، حسرتیں رہیں۔

خواہشیں اٹکارے بن گئے۔

آرزوئیں ضمیر میں چبے والے نوکیلے کانٹے بن گئیں۔

ایک لا حاصل چاہت کی جستجو نے انہیں بے توقیر کر ڈالا تھا۔ اعمال نامہ ان کے ہاتھ میں تھا مگر کیا تھا جو ان کی بد اعمالیوں سے سیاہ تھا۔ وہ کل تک مختار کل بنی ہوئی تھیں، ہر شے کو شوکر پر رکھتی ہوئیں..... قدرت کی طرف سے صرف ایک معمولی سی ضرب لگائی گئی تھی۔ مگر نہیں لگا تھا انہیں عرش سے فرش پر ادھے منہ گرنے میں۔ انسان خود کو کتنا ہی مضبوط سمجھے لیکن قدرت کی سمت سے لگائی گئی ہلکی سی چھت سے ہی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے، وہ بھی بکھر گئی تھیں۔ جزہ ان کے سامنے بیٹھے تھے، ایک نئے روپ میں، ایک نئے انداز میں، وہ خاموش بیٹھیں گردن جھکائے آنسو بہا رہی تھیں۔ انہیں سامنے دیکھ کر پہلی بار احساس ہوا کہ ان کے بغیر وہ ادھوری اور تنہا تھیں، ایک ادھورے مکان اور ناچھت کے گھر کی طرح۔

”میں شرمندہ ہوں منال اتم سے، بچوں سے اور تادم مرگ رہوں گا کہ میں نہا چھا باپ ثابت ہوا، نہ شوہر، نہ ہی بہترین بیٹا اور بھائی۔ رشتوں کے ساتھ میں نے بڑی بے رحمی برتی۔“ ان کی گھمبیر آواز تاسف، ملامت، شرمندگی اور عنایت سے لرزاں تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے لیکن بعض اوقات جذبات کے اظہار کے لیے لفظ اپنا وجود کو بیٹھے ہیں، ان میں تاثر نہیں رہتی پھر جہاں سارے حساب، زباں ہی زباں پر مشتمل ہوں وہاں بچھتاؤں اور ملال کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

”تمہیں چھوڑ کر گیا تھا اور آج سامنے ہوں، گلنا ہے کل کی بات ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

”اس کل میں گویا ہوا جیون بیت گیا۔“ منال کے دل سے ایک درو بھری آہ نکلی۔

”مجھے معاف کرو منال! میں تمہارا مجرم ہوں۔“

”معافی؟ ہماری زندگی سے اس لفظ کی وقعت نفا ہو چکی ہے۔ قصور وار آپ تھے، لغزشیں مجھ سے بھی ہوئیں، آپ نہ پھیر کر چلے

گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بھئی کے جذبات میرے اندر پہلے ہی سرد پڑ چکے تھے۔ آپ کے جانے کے بعد مٹا کے احساسات بھی بے حسی و مردہ مہری کی قبر میں دفن ہو گئے، خطا کار ہم تھے، مزا میرے بچے کو ملی۔ وہ میرے گناہوں کا عذاب بھگت رہا ہے۔ آپ اسے کسی بھی طرح چھپائیں۔ وہ واپس آ جائے میں اس کی خاطر ہر مزا کے لیے تیار ہوں۔“ منال بیگم حنزہ کے شانے سے سرٹکا کر رونے لگیں۔

”کیوں چلے گئے تھے آپ اس طرح چھوڑ کر؟ میں نادان اور بھکی ہوئی تھی، آپ کی محبت و سہارے کی ضرورت تھی مجھے۔ عورت کتنی ہی بہادری و مشیوٹی کے دعوے کرے، کتنی ہی آزاد و خود مختار بن جائے..... مگر ایک حد تک ہی وہ ان پر قائم رہ سکتی ہے۔ عورت و مرد ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ حقیقت ایک دن کبھی میں آجاتی ہے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے..... بہت دیر.....“ شدت جذبات سے ان کی آواز رندہ لگتی تھی۔

”میں..... از حد شرمسار ہوں۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہا۔ تقدیر کے فیصلے شاید اسی طرح تھے۔ ہمیں اسی طرح جدائی کے پلے گزارنے تھے۔ لوگ کہتے ہیں بزدل تقدیر کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ تقدیر کچھ نہیں ہوتی مگر میں کہتا ہوں تقدیر کا بھی ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ تقدیر جو چاہتی ہے وہ ہم از خود کرتے چلے جاتے ہیں۔“

☆.....☆.....☆

کرن اور انس ابھی کچھ دیر قبل دوسرے گھر والوں کے ساتھ یہاں سے گئے تھے۔ حورین کو دوسرا دن گزرنے کے بعد بھی ڈسپارچ کرنے کو راضی نہ تھے۔ اس کا بی بی پوری طرح ناراض نہیں ہو رہا تھا۔ وہ زیادہ تر نیندا اور دو آؤں کے زبردست اثر سوتی رہتی تھی اور جب جاگتی تو بھی زیادہ تر خاموش رہتی۔ انس، کرن کے علاوہ کوئی بھی اس کی حیرت کو اتنا وہ مسکرا کر لیتی۔ ایسا ظاہر کرتی جیسے بہتر ہے اور تنہا ہوتے ہی اس کے لبوں پر چپ کی مہر لگ جاتی، خصوصاً سونل سے وہ لگا ہی چہرے ہی تھی، اس سے بچ رہی تھی۔ وہ اسے کوئی سوال پوچھنے کا کوئی موقع دینا نہیں چاہتی تھی جس کو پوچھنے کے لیے وہ مضطرب تھی۔

وہ بھلاں کس طرح اس داستان کو دہرا سکتی تھی؟ جس میں اس کے جذبیوں کا لہو شامل تھا، جس میں اس کی محبت کو بڑی زندگی سے نقل کیا گیا تھا جس میں اس کے احساس اور اعتبار اور وفا کی وجوہاں آزادی گئی تھیں۔ وہ وقت اسے کسی بھی لمحے نہیں بھولتا تھا۔ اس کا وہ لہجہ جو اس کا دل گھائل کرتا، برپا کرتا اور اندر ہی اندر لڑاتا تھا۔ بی بی جان نماز پڑھنے لگیں تو وہ بھاگ کر اس کے بیڈ کے پاس چلی آئی تھی۔ قبل اس کے بولنے کے ہنس چلی آئی ڈرپ لگانے کے لیے۔

”بیو، آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“ نرس نے پہلی ڈرپ نکال کر دوسری لگاتے ہوئے دریافت کیا۔

”کائن“۔ مختصر جواب ملا۔

”یہ نشان کیسے ہیں؟“ نیڈل درست کرتے ہوئے نرس کی نگاہ اس کی گردن پر پڑی تو چونک کر گویا ہوئی۔ حورین نے بے ہوشی میں گردن کے گرد لپٹا ہوا دوپٹہ جو سرک گیا تھا، گھبرا کر درست کیا۔

”ایسے ہی ہیں۔“

”دکھاؤ، کیسے نشان ہیں؟“

مول پھرتی سے اس کی طرف آئی، اس کے پیچھے نرس تھی۔ مول نے دوپٹہ اس کی گروں سے ہٹایا اور دوسرے لمحے اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی گئیں۔ حورین کی صاف و شفاف جلد پر وہ چھوٹے چھوٹے سرخی مائل نشانات بڑے بدنما لگ رہے تھے۔

”یہ..... یہ کیا ہوا ہے؟ یہ نشان کیسے ہیں؟“

حورین خاموشی رہی۔

”یہ سگریٹ کے نشان ہیں۔“ نرس نے آہستگی سے نشانات پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا، اس عمل پر وہ دود سے بے چین ہو گئی تھی۔

”آر پشور؟“ مول بدحاس ہو گئی۔

”آف کورس، یہ سگریٹ سے دانے گئے نشان ہیں، ہمارے پاس ایسے کیسے آتے رہتے ہیں۔“ نرس کے لہجے میں یقین تھا۔

اس نے شرابی پر کے سامان سے ایک ٹوب نکالی اور اس کو لگائے گی۔ حورین نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

مول تو گویا انگاروں پر جا کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک اڑدھام پریشانی و فکرات کا۔ پہلے ہی کیا کم بے چینی اس پر سوار تھی، جو اب اس

سے انکشاف لے اسے زبردست طریقے سے خمیر کر ڈالا تھا۔

”حورین!..... حورین! یہ کیا اسرار ہے؟ تمہارا نروس بریک ڈاؤن، اور اب یہ سگریٹ کے چھلے ہوئے نشان.....؟ او گا لانا میں

پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟“ وہ اس کی ہمت میں رو پڑی۔

”مول! کچھ توقف کے بعد وہ سپاٹ اعزاز میں گویا ہوئی۔“ تم مجھے زعمہ دیکھنا چاہتی ہو؟“

”واٹ ایہ کیا سوال ہے؟“ مول نے روتے ہوئے حورانی سے دریافت کیا۔

بحث مت کرو، صرف جواب دو۔“

”آف کورس، یقیناً بلکہ میری عمر بھی تم کو لگ جائے۔“

”تمہاری یہ دعا کسی ”بدوھا“ سے کم نہیں ہے، کیونکہ مجھے اپنی زندگی اب سزا لگ رہی ہے اور سزا کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر محیط

ہوتا ہے۔“ مول کی جذباتیت پر اس نے تڑپ کر سوچا۔

”پلیز، حورین! تم کیا کہنا چاہ رہی ہو، جلدی کہو۔“

”تم چاہتی ہو کہ میں زعمہ رہوں..... تم کبھی مجھ سے کوئی سوال مت کرنا، کچھ مت پوچھنا، کبھی بھولے سے بھی نہیں۔“

مول نے پٹی پٹی لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا جو حتی اعزاز میں کہتے ہوئے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اس سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

”ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ تم اتنی کسور کیوں بن رہی ہو؟ میں کس طرح اس سے کوئل کروں؟ ذوالعون بھائی ایسی کوئی حرکت کر

سکتے ہیں جو ان کے کردار کو پاش پاش کر دے؟ نہیں..... نہیں..... میرا دل نہیں مانتا، جس کی نگاہیں صوبہ مخالف کو دیکھ کر جھک جاتی ہوں، جوڑ کیوں کو دیکھ کر احتراماً راستہ بدل لیتا ہوں، وہ ایسی کوئی حرکت کر ہی نہیں سکتا پھر حورین کو تو انہوں نے ہمیشہ بہت عزت و وقار دیا تھا۔“

حورین نے خاموشی اختیار کر کے چہرے پر بازو رکھ لیا تھا۔ موٹل کچھ دیر اس کی جانب سرا سیدہ انداز میں دیکھتی رہی اور اس کا سپاٹ و سر دیکھا گی پھر اندازاً سے باور کروا گیا کہ وہ اب کچھ نہیں بولے گی۔ اس کے اندر سوال در سوال کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ وہ خود سے الجھتی باہر گیلری میں آ کر تیزی سے سیل پر ایک نمبر پیش کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

حیدر بے حد پریشان انداز میں ہسپتال پہنچا، اسے کونین نے کال کر کے بلایا تھا اور کوریڈور میں ہی وہ اسے مل گیا تھا۔

”کونین بھائی! سب ٹھیک ہے نا؟ ایک سیڈنٹ کس طرح ہوا؟ کیا ہے؟“ کونین کے گلے لگ کر پریشانی سے استفسار کرنے لگا۔

”ہی! ذرا سٹے، ڈاکٹر کہتے ہیں اس کی کنڈیشن اچھرو ہو رہی ہے مگر وہ خود زخمی سے دور ہونا چاہ رہا ہے۔ وہ اپنی دل پاؤر استعمال نہیں کر رہا۔ پرسوں رات سے آج تک اس نے آنکھیں نہیں کھولی ہیں..... جیسے..... جیسے وہ کبھی آنکھیں کھولے گا ہی نہیں۔“ حساس و نرم دل، بھائی سے ٹوٹ کر محبت کرنے والا کونین رو ہانا ہو گیا۔

”بھائی! آپ ہرٹ مت ہوں، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ حیدر نے ان کے شانے پر بازو رکھ کر تسلی دی۔

”وہ ٹھیک ہونا ہی تو نہیں چاہ رہا۔“

”اگر آپ ہی ہمت ہا دیں گے تو پھر آئی اور نا تو کو حوصلہ کون دے گا، پلیز..... ان کی خاطر خود کو سنبھالیے۔“

”میرا حوصلہ، میری ہمت تو وہی ہے جو روشنیوں کو چھوڑ کر اندھیروں کا باسی بنا چاہتا ہے۔ چلو شاید تمہاری محبت ہی اسے دوبارہ ہمارے درمیان لے آئے، وہ آنکھیں کھول کر جینے کی راہ پر چل پڑے۔“

کونین آنکھیں صاف کرتا ہوا حیدر کو اس کے روم میں لے آیا، جہاں موجود ایک باؤکا رومبند نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر وہ بے اختیار سلام کر بیٹھا۔ جناب بہت شفقت سے ملا تھا۔

”بابا! پرنس کا دوست ہے حیدر۔ حیدر! یہ ہمارے بابا ہیں۔“

سرت و استہباب کا زبردست جھٹکا حیدر کو لگا تھا۔ اس نے، اس ہار ان کو بغور دیکھا۔ بارعب شخصیت، خوب صورت چہرہ، شفقت و حلاوت آمیز لہجے والے بابا میں اسے وہ بے رحمی و سنگ دلی ذرا نہ نظر آئی جو ایسے شخص میں نظر آنی چاہیے تھی جو ایسے وقت میں اپنے بچوں سے لاطعلق ہو گیا جب انہیں اس کی ضرورت تھی۔

”آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی اگل اڈو والنون نے ہر گھڑی، ہر پہل آپ کی کی محسوس کی۔ آپ کو بے حد مس کیا ہے۔“ وہ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حورہ نے ڈکھ کے کچھ اور سناتے حوروں کو اپنے قلب میں بچھست ہوتے محسوس کیا۔



”بیٹا! میرے وظائف کا وقت ہو رہا ہے، میں ابھی اجازت چاہوں گا۔ انشاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی۔“

حزہ کرے سے نکل گئے تھے۔ کونین بھی وہاں سے چلا گیا۔ وہ خود انہیں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ حیدر اسے دیکھ رہا تھا۔ سفید ٹیوں میں جکڑ اس کا جسم بہت کمزور لگ رہا تھا۔ اس کے وجہ چہرے پر جو ہر وقت ایک دلکش سرخی چھائی رہتی تھی۔ وہ اب زروی میں بدل گئی تھی۔ وہ بیڈ پر اسی طرح لیٹا تھا گویا زندگی سے ہار گیا ہو، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ لمبے بھر کو حیدر کانپ اٹھا۔ آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ جلد ہی اس نے خود پر قابو پایا اور اس کے بیڈ کے قریب چیر گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”ڈوالٹون ڈوالٹون میں جانتا ہوں، تم جاگ رہے ہو، آنکھیں کھولو، میری بات سنو، کیوں پریشان کر رہے ہو سب کو؟“

حیدر کے بار بار اسرار پر بھی اس کی کنڈیشن جنور وہی تھی۔

”محبت انسان کو وہ گی بنا دیتی ہے، جوگی بنا دیتی ہے لیکن..... تم پر تھینو پریش ہے جو ”اصوگی“ بن گئے، ایک ٹرین گئے ہو۔“ حیدر

اس کی بعد آنکھوں کی جانب جھکا ہوا ہر لفظ چبا کر اور کاٹ ڈالا راز میں کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بڑی ذمہ داری تھی۔

”اپنی محبت کو قائل کر کے، کسی کی عزت و احترام کو روند کر، تم اس طرح دنیا سے فرار نہیں ہو سکتے ہو، تمہاری وحشتوں و سفاکیت کا

حساب دیے بغیر تمہاری روح جسم سے آزاد نہیں ہو سکتی۔“ حیدر کے طعنے اعزاز نے اس کے بے حس و حرکت جسم میں کچھ پلچل پیدا کی۔

”تم نے حورین کے ساتھ کیا کیا کیا کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے وہ۔۔۔۔۔“

اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی میکا کی اعزاز میں اس کی آنکھیں وا ہوئی تھیں جو سیدھی خود پر جھکے ہوئے حیدر کی لگا ہوں سے

کھرائیں۔

”آف! وہ سر تا پا لرز اٹھا تھا۔“

زندگی کی چمک سے عاری کیسی بے جان آنکھیں تھیں۔ جذبیوں کی پامالی کے لہو کی سرخی ان خوب صورت آنکھوں میں جم کر رہ گئی تھی۔

”کیا ہوا ہے یا راتم حورین کو اتنی پرستش، اتنی دلچسپی دیتے تھے کہ اس سے رو بردار کھار محبت کرنا بھی، محبت و شرافت کی تو ہیں سمجھتے

تھے، پھر..... اچانک یہ سب کیا ہے؟“

چند لمبے قبل بہت روڈ لہجے میں بات کرنے والے حیدر کے لہجے میں اس ٹولے، بکھرے صحراؤں کی طرح بے رونق چہرے کو دیکھ

کر رہی ورا آئی تھی۔

”یہ مجھے زندگی کی جانب سے ملنے والے گفتس میں سب سے مہنگا تھا ہے۔“ اس کی آواز میں درد تھا، ٹپ تھی اور ہر لفظ گھاس لگا تھا۔

”یہ سب کیا ہے برادر؟“ حیدر دونوں ہاتھ سے سر جکڑ کر کرسی پر بیٹھا تھا۔

”یقین، احسان، بھروسہ، سچ، مجھے نفرت ہے ان الفاظ سے۔“ دنیا بھر کی نفرت و کراہیت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ اس کے

لہجے، چہرے، آنکھوں سے جنونیت اور وحشت چھپنے لگی تھی۔

”ذوالنون ایک گڈ نیوز ہے تمہارے لیے۔“ حیدر نے گہرا کرباں بدلتے ہوئے کہا۔

”تمہارے بابا..... آگے ہیں، تمہاری بڑی آرزو تھی کہ وہ آجائیں۔“

”میری اب کوئی آرزو، کوئی خواہش نہیں ہے۔ یہ فیملی گورنڈہ لوگوں کی ہوتی ہیں۔ تمہارے سامنے ذوالنون سانس لے رہا ہے،

باتیں کر رہا ہے لیکن زندہ نہیں ہے۔ وہ مر چکا ہے، مر گیا ہے۔“

وہ ہڈیانی انداز میں کہہ رہا تھا۔

”وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جو مرنے کے بعد دفن کر دیئے جاتے ہیں، دُنیا کے تمام دکھوں، مصائب و مشکلات سے آزاد ہو

جاتے ہیں مگر کچھ لوگ میری طرح بھی مرتے ہیں جو دفن نہیں کیے جاتے، اپنی لاش کا نعروں پر ڈالے نامعلوم کب تک مجھے یہ سانس لینی

ہوں گی؟ نامعلوم کب تک موت کی اذیت محسوس کروں گا؟ جاؤ چپے جاؤ، میں سب سے تعلق توڑ چکا ہوں۔“

حیدر حیرت و صدمے سے منگ اسے ہڈیانی حالت میں پیچھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت ہوش و حواس سے عاری کوئی دیوانہ لگ رہا

تھا۔ اکثر اس کی آواز سن کر چیزی سے کمرے میں آگئے۔

☆.....☆.....☆

مثال کو مذاکات عمل کی اذیت نے ادھ موا کر دیا تھا۔ مستزاد جو ذلت و رسوائی انہیں اپنے کمروں کے سبب ملی تھی اس نے ان کا

ذہنی سکون محسوس کر ڈالا تھا۔ وہ تمام طعناں اور بد بھول کر کسی پارے ہوئے شکستہ حال جواری کی طرح ٹھہرا گیا تھا۔ اندھیرے کمرے میں

لٹی وہ اندھیرے کا ہی حصہ لگ رہی تھی۔ کل تک وہ جموٹ و بہکاوے سراب کی مانند نظر آنے والے خوش گمانوں میں گم تھی اور آج

حقیقت کی دُنیا میں داخل ہوئیں تو معلوم ہوا وہ اس راستے پر گامزن تھی جس کی منزل نہیں ہوتی۔ اس پر چلنے والا جب تھک ہار کر بیٹھ جاتا

ہے تو پھر کسی سے شکوہ ملانے کے قابل نہیں رہتا۔ کونین نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ذوالنون اور حیدر کی تمام گفتگو سن لی تھی۔

معلوم کرنے پر حیدر نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ حتیٰ کہ موبل نے فون پر اسے حورین کے متعلق پوری تفصیل بتا دی تھی تاکہ وہ ذوالنون سے معلوم

کرے کہ معاملہ کیا ہے؟ اس نے کونین کو حورین سے ہونے والی پہلی ملاقات سے آخری تک ہر بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ کونین جو خود محبت

کے کڑے امتحان سے گزر چکا تھا، اس کا دل بھائی کے ڈکھ کو محسوس کر کے نم ہو گیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ کچھ عرصہ قبل اس نے کم کو اور تہائی پیند،

بے حد پرور رہنے والے ذوالنون کے چہرے پر بڑی خوب صورت روشنی دیکھی تھی۔ وہ بدل گیا تھا اور محبت جذبہ ہی ایسا جو پتھر میں بھی

پھول کھلا دیتی ہے، صحراؤں کو گلزار بنا دیتی ہے، ویرانے سجا ڈالتی ہے۔ اسے یاد آیا وہ ابھی اس سے پوری طرح یہ معلوم ہی نہ کر سکا تھا کہ اس

کے پتھر دل کو کس پری دوش نے، کس اپہرانے موم کر ڈالا تھا۔

مما اور نانو نے پرنس میں کچھ اس طرح انوار لوڈ کیا کہ وہ بھول بیٹھا تھا۔ مما اور نانو کی جانب سے وہ پہلے ہی کچھ مشکوک تھا، حیدر

کی باتیں، مما کا اسپتال میں نانو سے جھگڑنا اور پھر نانو کا ناراض ہو کر لندن جانا اسے الجھا سا گیا تھا۔ اسپتال سے وہ سیدھا صحرا نکل کے ہاں

آیا جہاں آج کل مما عظیم تھیں۔ ان کی اتر حالت کے باعث دادو نے انہیں وہاں روک لیا تھا۔

”مما پرئس کے ساتھ کیا ہوا ہے، آپ شاید جانتی ہیں پلیز..... پلیز بتادیں۔ آج پرئس نے حیدر سے بات کی ہے۔ اس کی کنڈیشن نارمل نہیں ہے، وہ اب نارمل ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے۔“

کوئین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ منال بھی ضبط نہ کر سکی۔

”کاش! ہمیں یہاں وقت معلوم ہو جائے جب ہم شرفیاد کے بیچ پورے ہوتے ہیں۔ تمہائی میں لگائی جانے والی اس سچ کی فصل ہمیں تمہا نہیں جھوم بھکراں میں کاشی ہوگی۔“

”مما یہ کلاسی کا وقت نہیں ہے، ہمیں پرئس کو بچانا ہے، اسے نارمل لائف کی طرف لانا ہے اگر کسی طرح وہ نارمل ہو بھی گیا تو..... سوسائٹی کی کوشش کر سکتا ہے..... بلکہ ڈرائی کیا وہ ڈائریکٹ.....“

”بس..... بس چپ ہو جاؤ، میں سب بتاتی ہوں، سب بتاتی ہوں۔“

”کیا ہوا بہہ، شہرے تو ہے نا؟“ ان کے رونے بیچنے کی آواز سن کر راحیلہ بیگم ہانچی کا ہنسی اندر آئی تھیں۔ ان کے بعد صنوبر بیگم، نضرئی، اریبہ، سونیا اور آخر میں حنزہ داخل ہوئے۔ منال بیگم ہاتھوں میں چہرہ چھپائے انک انک کر دوستانہ ڈلت درسوئی بتاتی چلی گئیں۔

کمرے کی فضا بھیانک سکون سے بوجھل تھی۔ اشکوں میں ڈوبی عمامتوں سے لرزتی منال بیگم کی آواز وہاں گونج رہی تھی۔ کوئین نے لغزت سے ان سے منہ پھیر لیا۔ راحیلہ بیگم کے علاوہ سب ہکا بکا تھے۔ حنزہ صاحبہ سوچ رہے تھے کہ عورت جب قرآنی دیتی ہے تو عقلمت کی بلندیوں کو چھو لیتی ہے اور قرآنی لیتی ہے تو پاتال کی پستیوں میں جا گرتی ہے۔

☆.....☆.....☆

حیدر نے کوئین کے جانے کے بعد کڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ دیر قبل ہاتھوں کی طرح بیچ چلا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے دشت اور لگا ہوں سے جنون جھلک رہا تھا جیسے ہوش و حواس سے بالکل عاری ہو۔ ڈاکٹر زکی دی جانے والی ٹریٹمنٹ کے باعث وہ اب بے سدھ پڑا تھا۔ ہمہ وقت کسی چٹان کی طرح مضبوط اور دیواروں کی طرح رواں دواں رہنے والا شخص ریڑیوں کی طرح بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں اور چہرے پر ابھی بھی گڑے جذبات اور مضطرب احساسات کی زروئی تھی، کل وہ کیا تھا.....؟ آج کیا ہو گیا؟

حیدر سے ضبط نہ ہو سکا، اس کا دل دوست کے ڈکھ سے پھل کر آنکھوں سے پہنے لگا۔ وہ کڑکی سے ہٹ کر رز پر مبنی اسٹون بیچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے آسودوں کی آزادی کو سلب کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ وہ روانی سے بچتے رہے۔ اس پر دوست کی محبت کی شدتیں کچھ اس طرح حاوی تھیں کہ وہاں سے گزرنے والے لوگوں کی بھی اسے پروا نہ رہی تھی۔ خاصی دیر بعد جذباتی خباہت تمام کا تمام بہہ گیا تو اس نے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ موسم میں خشکی بدستور موجود تھی۔ اس کے قدم ایک بار پھر وہ العون کے کمرے کی جانب

تھے۔ گلاس وینڈو سے اس نے جھانکا، دوواؤں کے زیر اثر وہ اسی طرح بے سادہ پڑا تھا۔ بیڈ کے قریب تخت پر اس کے ہا ہا بھانپتے تھے ان کی انگلیاں سرعت سے تسلی کے چکنے و چمک دار دانے کیے بعد دنگے گر رہی تھیں۔ ان کے ہارعب و نہ نور چہرے پر ایک جہاں کا ڈکھو کرب عیاں تھا۔ وہ نم آنکھوں سے ڈوا لٹون کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ حیدر گہری سانس لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

محبت کسی بھی جذباتی تعلق سے وابستہ ہو کر اس کی طلب، اس کی شدت صحرا میں گم ہونے یا سے کی مانند ہوتی ہے، بروقت اگر پیاس سیراب نہ ہو تو محبت کی تیل کے سبز پتے زرد ہو کر تھڑ جاتے ہیں۔ پھول پھر کبھی نہ کھلنے کے لیے مرجھا جاتے ہیں اور پتی پتی ہو کر نغذاؤں میں کھر جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ تمام طلب.....؟ شدت، احساس صحرائن جاتے ہیں۔

اس شخص نے بھی بچپن سے محبت کی پیاس میں زندگی گزار دی تھی اور جب اس کی پیاس صحرائن مٹی تو چھتوں و شفقتوں کا سا گراؤ آیا، نامعلوم کب، وہ سیراب کرتا..... یا نہیں؟

☆.....☆.....☆

معاذ سے یاد آیا کہ مول نے اسی ہسپتال کا تھایا تھا۔ وہ ذہن میں اس کا تھایا کیا روم نمبر یاد کرتا آگے بڑھا تو اگلی روم میں اسے کرہل گیا، باہر ہی ریٹنگ کے قریب مول گم مہم سی کھڑی تھی۔

”مولو..... مول!“ اس نے قریب جا کر دھیرے سے کہا۔

”اوہ..... تھینکس گاڈ..... حیدر بھائی آپ آگئے؟“

”کوئی سیریس میٹر تو نہیں ہے؟ حورین کیسی ہے؟“

”بس..... ٹھیک ہی ہے۔“ وہ ذہن دنگی سے گویا ہوئی۔

”مطلب؟“ وہ اس کے اشارہ کرنے پر تخت پر بیٹھ گیا۔ اس سے کچھ قافلے پر مول بھی بیٹھ گئی۔ وہ سخت معطل اور غمگین تھی۔

شام اپنے سرستی آنچل کو سمیٹ رہی تھی، ہسپتال کے لان میں بے شمار درختوں پر موجود پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی جانب

چکار رہے تھے۔ ان کی آوازیں اس خاموش فضا میں بڑ شور تھیں۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ڈوا لٹون بھائی..... ہمارے احساہ و اہتہار کو اس طرح چاہ کریں گے محبت کو اس طرح رسوا کریں

گے؟ آئندہ ہم کبھی ان پر ہی کیا، کسی پر بھی احساہ نہ کر سکیں گے۔ آپ ان کا گریبان پکڑ کر معلوم کریں، کیا کیا ہے انہوں نے حورین کے

ساتھ؟“ مول کی دھیمی آواز میں ڈوا لٹون کے لیے نفرت و ناپسندیدگی تھی۔

”حورین بے حد ڈسٹرب ہے۔ میرے اصرار کے باوجود وہ کچھ تانے کو تیار نہیں کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ زیادہ اصرار کیا تو وہ دھکی

دیتی ہوئی گویا ہوئی کہ اگر اس کی زندگی چاہیے تو اس سے کچھ معلوم نہ کیا جائے۔“

”تو ابھی خاموشی اختیار کرنا ہی بھرا ہے۔“

”واٹ ایپ آپ کہہ رہے ہیں؟ آخر کہیں کے کیوں نہیں؟ دوست ہیں آپ کے وہ۔ ایک بہترین دوست وہی ہوتا ہے جو دوسرے دوست کے عیب کی پردہ پوشی ایمان داری سے کرے۔“

”پلیز مول ابدگمانی وہ بھی اس طرح اچھی نہیں ہوتی۔“

”بدگمانی نہیں، حقیقت یہی ہے، آپ ایسے نظریں کے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس وحشی نے اسے سگریٹ سے واقف ہے اور بھی نہ معلوم.....“ مول شدت جذبات سے خاموش ہو گئی جب کہ حیدر نے ہی طرح چٹکا تھا۔ حیدرین کی گردن اور گردن سے نیچے سینے تک اس نے بھی وہ چھوٹے چھوٹے سرخ دائرے دیکھے تھے جو اس کی سفید رنگت پر نمایاں تھے۔

”اسٹاپ اٹ، مول اپلیز آگے کچھ مت کہو، سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے، زمین و آسمان ایک ہو سکتے ہیں مگر..... مجھے یقین واثق ہے کہ ذوالنون کے کردار میں کبھی لغزش نہیں آسکتی۔ تمہاری دوست پہلی حسین لڑکی نہیں ہے، لاقصد حسین و طرح وار لڑکیاں اس کے جنون میں جھل رہی ہیں۔ یہ تمہاری دوست کی خوش نصیبی ہے کہ ذوالنون کو اس کی نامعلوم کون سی کواٹھی شراکت کر گئی جو وہ اس کا اسیر ہو بیٹھا، ورنہ وہ حسن و خوب صورتی کے فسون میں گرفتار ہونے والا بندہ نہیں ہے، ناں ہی اس کی محبت میں کوئی کھوٹ ہے، اگر یقین نہیں ہے تو آؤ میرے ساتھ۔“ مول کے لہجے میں جو نظرت و بے جا احتیاری تھی وہ حیدر قلمی برداشت نہ کر سکا۔ مول کو وہ دوسرے کو ریڈور میں لے آیا جہاں اشارے سے اس نے، اسے گلاس و نظرو سے جھانکنے کو کہا۔

مول جو ہکا بکا اس کے ساتھ آئی تھی، گلاس و نظرو کی دوسری طرف والے شخص پر نگاہ پڑتے ہی حیدرانی سے ساکت و صامت رہ گئی۔

”یہ..... یہ..... یہ سب کیا ہے.....؟ کیسے؟“

مول کا خسر جھاگ کی مانند پیشہ گیا، مارے وحشت کے وہ مزید کچھ کہ نہ پائی۔

”ہے..... یہ محبت کی مثال، بے لوث چاہت اور بے غرض اُلقت ہے۔ اس سے بلاہ کر عشق کی سچائی کیا ہوگی کہ اگر..... اس

کو ریڈور کے اس طرف حیدرین بے سکون ہے تو اس طرف ذوالنون بے سمدہ پڑا ہے۔

اپنی دوست کے جھلے ہوئے چند نشان تھیں بڑ پار ہے ہیں تو اس کا زخموں سے بچ کر جسم کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ شخص اب ذمہ دہ بنے

کی تنہا نہیں رکھتا جس نے اپنی زندگی باپ کی دانسی کی دعائیں مانگتے ہوئے گزاری، اب برسوں سے ماگی گئی دعا پوری ہوئی بھی تو اس کے

لیے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی حالت کا ذمے دار کس کو ٹھہراؤں؟“

”مائی گاڈ ایہ کیا سہنس ہے؟“

”دونوں میں سے کوئی بھی بتانے کو تیار نہیں۔“

حیدر اس کے ساتھ حیدرین کے کمرے میں آ گیا۔ حیدرین نے چہرے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، نامعلوم سوری تھی یا بین رہی تھی۔ بی بی

جان جو مغرب کی نماز سے فارغ ہوئیں تھیں، اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

تیزی سے بھاگتا ہوا وقت اپنے دامن میں بہت سے دل خراش واذیت ناک حادثات دروتی، بسورتی، سکتی کرب ناک یادیں سمیٹ کر لے گیا تھا۔ ان بدلے ہمتوں اور دنوں نے بہت کچھ بدل دیا تھا۔ وہ دونوں ڈسپارچ ہو کر گھر جا چکے تھے۔ ڈوائون نے زندگی سے سمجھوتہ کیا تو تجائی و خاموشی کو اپنا مسکن بنا ڈالا۔ ایک عرصے بعد لوٹ کر آنے والے ہاپ کی واپسی بھی اس کے مردہ احساسات کو سرت کی جلا نہیں بخش سکی تھی۔ منال بیگم نے اپنے رویے کی معافی مانگنے کے لیے اس کے آگے ہاتھ جوڑے ہی تھے کہ اس نے بیڑہ کر ہاتھ کھول دیے مگر ان کے قریب نہ گئیں۔

منال سرال میں ہی رہ رہی تھیں۔ قافلہ بیگم بیٹی کی بدلتی نظروں سے کم بدحواس تھیں کہ اس پر ان سب کا حصہ ہو جانا انہیں بری طرح خوف زدہ کر گیا۔ وہ خاموشی سے ملک چھوڑ کر برہان صاحب کے پاس جا چکی تھیں۔

اپنائیت و غیریت میں صرف اتنا ہی فاصلہ تھا جہاں رشتے لالچ و طمع، غرض و مفاد سے بندھ جائیں، دولت و آسائش سمجھتوں پر حاوی ہو جائے تو وہاں اپنی کو غیر بننے میں کوئی وقت نہیں لگتا ہے۔ بے حس و بے دلفالوگوں کا یہی وطن ہے جو قافلہ بیگم کی سرشت تھی۔ آسمان کی نیلگوں و سستوں میں اس کی لٹکیں گم تھیں۔ وہ اور گرد سے بے خبر سوچوں میں گم تھا۔ بدن پر لگے تمام زخم مندل ہو گئے تھے۔ جسم پر لگے زخم رفتہ رفتہ بھر جاتے ہیں، ٹھیک ہو جاتے ہیں، دوراصل زخم تو وہ ہوتے ہیں جو روح پر لگ جاتے ہیں جن سے ضمیر داغ دار ہو جاتا ہے جن سے عزت نفس و حیثیت بمرح ہوتی ہے جو انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ اندرونی طور پر لگنے والے زخموں کی ٹیسوں نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ وہ جس قدر اس دشمن جاں کے تصور سے بھاگ رہا تھا، وہ اسی قدر ہی اس پر حاوی تھی۔ وہ اس سے پیچھا پھرانے چاہتا تھا، بھول جانا چاہتا تھا، گردہ آنسوؤں سے بھیگا گلاب چہرہ۔

خوف سے بھری سمرانگیز لٹکی ہیں۔

ڈکھ سے کپکپاتے یا توئی لب۔

اس کا ہر آنسو، ہر سسکی اس کے اندرونی زخموں پر ٹھک پاشی کرتی تھی اور وہ ڈکھ و درد سے تڑپ اٹھتا تھا۔ اپنی وحشت بھری حرکتیں یاد آتیں تو وہ بے خود سا ہو کر تڑپ اٹھتا اور خود کو اذیتیں دینے لگتا اس کے باوجود سکون سے کوسوں دور تھا۔

حدرین..... اس کی پہلی و آخری محبت، شوق، چاہت، محبت کی تمام شدتیں جس سے منسوب تھیں۔ جس نے محبت کی دل کشیوں سے جذبات و احساسات کو رنگین کیا تھا، جس نے دل و جاں کی تمام تر سچائیوں سے اسے چاہا تھا، پانے کی طلب تھی..... اور وہ طلب وقت کے بدردم بیٹوں میں پھنس کر ہمیشہ کے لیے "تڑپ"، "جدائی" اور "حسرت" بن گئی تھی۔

"ڈوائون! ایک ٹھک سا ہاتھ اس کے شانے پر آ کر ٹھہر گیا۔

"جی..... بابا جان!" وہ ڈرغ بدل کر سپاٹ لہجے میں گویا تھا۔

"طویل مدت بعد ہم اس طرح ملے ہیں جیسے دو اجنبی ملتے ہیں۔ میں ہزار بار یہاں آ کر چکا ہوں اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا

جو میں نے غلطو جذبہ پائی قدم اٹھا کر کیا۔ تم لوگوں کے حقوق و فرائض، ذمے داریوں سے مجھ سے جو پہلو تہی ہوئی ہے وہ مجھے تاحیات شرمسار رکھیں گی کہ....."

"پلیز بابا جان! آپ اتنے سیٹھی میٹل کیوں ہو رہے ہیں جو ہمارے مقدر میں تھا، مل گیا۔ گزرا وقت لوٹ نہیں سکتا پھر اب ان بچھتاؤں سے کیا حاصل، یہ سب لا حاصل اور انتہائی فضول ہے۔"

اس کے وجہ چہرے پر صدیوں کی حکمن و اداسی رقم تھی۔ سرسئی آنکھوں کی شفاف سطح پر اڑتوں کا کالا ڈسک رہا تھا۔

"تم لوگوں کو چھوڑ کر جانے کے بعد کوئی ایسا دن نہیں گزرا جو میں نے یاد نہ کیا ہو، ہر پل، ہر ساعت میں نے تم سب لوگوں کو یاد کیا ہے، پھر سوچا کہ سب بھول کر تم لوگوں کے پاس آ جاؤں لیکن ذمے داریوں نے جکڑے رکھا اور نامعلوم کب تک میں تم سبوں کی یاد کو سینے سے لگائے خود پر جبر کرتا۔ تمہاری اچانک گاؤں آمد میری محبت کی دیا کو میرا ب کر گئی تھی۔"

"آپ نے پہچان لیا تھا مجھے؟" اس کا انداز ہنوز تھا۔

"ہاں، اسی لئے۔"

"کس طرح؟ اتنی طویل مدت کے بعد بھی....."

"میں نے تمہیں اور کونین کو کبھی دل سے دور نہیں ہونے دیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے نغوش میرے شعور میں بنتے رہے، آگئی مجھے کس فراہم کرتی رہی جب تمہیں دیکھا تو مجھے ذرا دقت نہیں ہوئی شناخت کرنے میں۔ یہ فرق صرف یہ تھا کہ تم بہت سویرا اور کم گو ہو گئے تھے"

"یہ کیسی محبت ہے؟ شفقت کا یہ کون سا روپ ہے؟ جس نے آپ کو اس وقت بھی بیٹے کو بیٹا کہہ کر سینے سے لگانے پر مجبور نہیں کیا..... اب بھی آپ کہتے ہیں کہ آپ نے ہمیں پل پل بس کیا ہے؟" اس کا لہجہ نرم تھا مگر لفظ بڑے سخت دلو کیلئے تھے۔

"دل تو بہت بے قرار تھا، بے حد مضطرب اور بے یقین مگر میں حوصلہ نہ کر سکا۔ بزدل تھا، بے ہمت و کمزور۔ مجھے خوف تھا اگر تم نے پہچاننے سے انکار کر دیا تو وہ سارا مان اور یقین ٹوٹ جائے گا جس کے بھروسے پر اتنا وقت گزارتا رہا ہوں اور دیکھ لو تمہاری محبت و لگن نے وہاں سے ایسا دل اچاٹ کیا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ سوچا تھا جاتے ہی اپنے لہجہ جگر کو سینے سے لگاؤں گا۔ سالوں سے اسی خواہش میں جیتا رہا ہوں۔"

حزہ کے چہرے پر جدائی کی مسافت ابھر آئی۔ وہ شفقت بھری نگاہوں سے روٹھے روٹھے سخت بدعقل ہوئے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میری غلطی کبھی معاف نہیں ہوگی بیٹا! اپنے بابا کے سینے سے نہیں لگو گے؟ ساری زندگی ترسنے والا یہ بد نصیب باپ اب بھی ترستار ہے گا؟" حزرہ کے ہیکے لہجے میں جدائی کی اذیتیں سکھیاں بھر رہی تھیں، وہی سکھیاں جو اس کے اندر گونجا کرتی تھیں، وہی مانوس سا

ورد، شکاری الیت آج وہ وجود پوری شفقت سے ہازووا کیے اس کے سامنے تھا جس کو اس اعزاز میں بارہا اس نے خوابوں میں دیکھا تھا۔  
 ”آجاؤ میرے بیچے اب مزید انتظار کی تاب نہیں ہے، قتل اس کے کہ یہ وجود بھر بھری مٹی کی طرح ڈھے جائے، سیٹ لوانے  
 مضبوط ہازوواں میں۔“

بیچے گئی ونگل کی برف لازوال و صادق جذبوں کی آنچ سے پگھل کر اپنا وجود لمبے بھر میں کھو بیٹھی تھی۔ وہ خود پر زیادہ جبر نہ کر سکا۔ وہ  
 اسی اعزاز میں ان کے سینے سے لگا جیسے بچپن میں لگتا تھا۔ مزہ کی آنکھیں فرط مسرت سے جمر جمر بہ رہی تھیں، وہ بار بار اسے چوم رہے تھے،  
 بے تحاشا چار کر رہے تھے۔

”بہت دیر کو دیبا با جان! آپ نے آنے میں۔“ اس کے اندر دور تک صدا بھری۔

”وعدہ کریں آپ اب کبھی روٹھیں گے نہیں؟“

”جس سے ذمہ کی روٹھ گئی ہو وہ بھر کسی سے روٹھنے کا حق نہیں رکھ سکتا۔“

”پرنس میری روح اب بھی بھی بھگی برقرار ہے۔ کیا بابا کو معافی نہیں ملے گی؟“ اس کی خاموشی سے گھبرا کر وہ استفسار کر بیٹھے۔

”ڈونٹ کیئر بابا جان! وقت گزر گیا ہے، شکوے شکایات کا، ناں میں آپ سے پہلے تھا اور ناں اب ناراض ہوں۔“ بے حد

عام سے لہجے میں وہ کہہ رہا تھا۔ محبت کی وہ دلولہ بخیری و احساسات کی روانی سے محروم سپاٹ و غیر جذباتی لہجہ۔ مزہ دم بخور رہ گئے۔

”ذوالنون! محبت پانا مشکل ہے اور پا کر کھوٹا اس سے زیادہ مشکل۔ اس پانے اور کھونے کے درمیان اگر سچائی و صداقت سے

بھر پور ”چاہ“ کے جذبے نہ ہوں تو محبت و رفاقت کے تمام احساسات خجالت میں جاتے ہیں۔“ ”محبت“ نام ایک ہے مگر اس کے وجود سے

بہت سے احساسات و جذبات چٹے ہوئے ہیں۔ اس کے بہت رنگ، بہت روپ ہیں، ضرورت ہوتی ہے ان کو پہچاننے کی، سمجھنے کی، اگر

ان کو شناخت کرنے میں معمولی سی بھی لغزش ہوگی تو کئی زندگیوں چاہ ہو جاتی ہیں، خاندان ٹکڑے جاتے ہیں جیسے ہمارے ساتھ ہوا۔ کرن جو

میری پھوپھو زاد تھی، عمر کی جولانی میں مدھوش ہو کر، میں اس کی پاکیزہ محبت کو کوئی اور ہی رنگ دے بیٹھا تھا۔ جب حقیقت کا اوراک ہوا تو

شرمندگی و شرمندگی کے بحر میں غرق ہو گیا تھا۔ گناہ دانستہ کیا گیا ہو یا نادانستہ، انسان کو اس وقت تک بے سکون رکھتا ہے جب تک اسے

معافی نہیں مل جائے کر ان کی محبت کو میں نے لفظ سمجھا۔ اس احساس نے مجھے بے گل کیا ہوا ہے۔“

وہ اس کے قریب بیٹھے ہوئے گویا ہوئے۔

”مثال نے جو کچھ بھی کیا وہ سراسر فطرت اور ناجائز تھا، انسان جب عقل و شعور کے در بند کر کے گھٹیا جذباتی پن اور دل کے کہنے پر

چلتا ہے تو اسی طرح ذلت و رسوائی کے گڑھے میں گرتا ہے، اسی طرح اس عاقبت نااندیش عورت کی یہ حالت ہے کہ وہ خود سے نگاہ لانے

کے قائل نہیں ہے۔“

”بابا جان انگریز میں اس ٹاپک کو کلوز ڈرکھنا چاہتا ہوں۔“



”ضروری نہیں ہے بیٹا! جو غلطیاں ہم سے سرزد ہوئیں۔ وہ تم سے بھی ہوں۔ اپنی ماں کو معاف کر دو، ماں صرف ماں ہوتی ہے۔“  
اس نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆.....☆.....☆

ایک بار پھر صوفی کے سسرال کے بڑوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ بی بی جان کی خواہش تھی کہ جلد از جلد وہ ان فرانسس سے سبکدوش ہو جائیں، اس دوران انہوں نے سب کے رخصتے ان کی رضا و رغبت سے آپس میں ہی طے کر دیے تھے۔ حیدر کے گھر والوں کے اصرار پر وہ زویا کی شادی کی تیاریاں بھی کر رہی تھیں۔ پڑھائی سے ویسے بھی اس کی خاص دلچسپی نہ تھی۔

گھر میں کہا گئی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر کوئی خوش و مطمئن نظر آتا تھا۔ ماسوائے اس کے جو اس اعزاز میں برباد ہوئی تھی کہ کئی ہفتے گزرنے کے باوجود وہ خود کو سنبھال نہ پائی تھی۔ ہلا ہر وہ نارمل تھی مگر ایک عجیب سی خاموشی و سکوت اس پر مسلط ہو گیا تھا۔ وہ جو پہلا گھر کی شوقین اور ایڈیو لٹر کی شیدائی تھی، تبجا اور خاموش رہتا جس کی سرشت نہ تھی وہ اب گھر کے ویران گوشوں میں گھنٹوں تنہا بیٹھی دکھائی دیتی۔

”گھر! کب تک دل پر یو جھ برداشت کرتی رہو گی؟ جو کہتا ہے کہ دو۔ خمیر کی تکلیف ہر تکلیف سے بڑی ہوتی ہے اگر بروقت اس سے گلو خلاصی نہ کی جائے تو بہت پیچیدہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔“

جذبات آج پھر بری طرح مضطرب تھے دل کی وحشتوں سے گھبرا کر وہ لان کے سنان حصے میں گھنٹوں میں منہ چھپا کے بیٹھی تھی۔

”بی بی جان! آپ یہاں؟“ انہیں قریب دیکھ کر وہ گویا ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ تم ہمہ وقت میری نظروں میں ہوتی ہو۔“

”آپ کیوں بے سکون ہوتی ہیں میری خاطر؟“

”جس گھر کے بچے بے سکون ہوں وہاں کے بڑے کس طرح سکون سے رہ سکتے ہیں۔“ وہ اپنا عیت بھرے اعزاز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”اگر میں کہوں کہ مول کے علاوہ میں بھی تمام باتوں سے واقف ہوں تو.....؟“

ان کے اعزاز پر وہ بی بی جان سے لرز اٹھی، لب پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

”خوفزدہ مت ہو، ہسپتال میں تمہاری اور مول کی اور مول و حیدر کی گفتگو سب سن چکی ہوں۔ تمہاری اور مول کی ہونے والی گفتگو نے مجھے درد پر وہ تمہاری گفتگو سننے پر مجبور کیا کیونکہ جب گھر میں جو ان بچے ہوں خصوصاً لڑکیاں تو بڑوں کو گفتگو کی نیند نہیں سونا چاہیے۔“

”بی بی جان! مجھ سے غلطی ہو گئی..... مجھے معلوم نہ تھا کہ ایہ ہوگا۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”غلطی تم سے نہیں ہم سے بھی ہوئی ہے، تا معلوم کس طرح چوک ہو گئی جو اس طرح ہوا..... لیکن اللہ کا شکر ہے اس نے لاج رکھ لی۔“

”مجھ جیسی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے بی بی جان۔ پھلی بار میں نے ماما اور سہا کے اہبار کو مجروح کیا اور جو اب اس اعزاز

سے دھکاری گئی کہ جذبیوں و چاہتوں کے وجود پر یقین کھو بیٹھی ہوں۔“

”مجھے خوشی ہے حورین اتم کو اپنی غلطی کا احساس ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ بیٹیاں فقط والدین کی عزت کا تاج ہی نہیں بلکہ خاندانوں کی حرمت ہوتی ہیں۔ شجاعت و بہادری سے لبریز آنے والی نسلوں کی امین ہوتی ہیں۔ ہمارے نازک شانوں پر بڑی بھاری ذمے داریاں ہوتی ہیں اگر خدا نخواستہ ہمارا ایک قدم بھی ڈگمگائے، بہک جائے تو نسلیں جاہ ہو جاتی ہیں۔ عزت بنانے میں عمریں رائیگاں ہو جاتی ہیں۔ عزت ملنے میں لمحہ بھی بہت ہے۔“ بی بی جان رمانیت سے سبھا رہی تھیں۔ اس کے آنسو خاموشی سے بہ رہے تھے۔

”اٹھو، آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولیں۔

”کہاں؟“

”کرن اور انس کے پاس، تادوان کو حقیقت تاکہ احساہ بھرم بھی پارہ پارہ نہ ہو اور تمہاری سعادت مندی دہراں برداری بھی قائم رہے۔“

”نہیں..... نہیں بی بی جان! مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں نے بہت کوشش کی ماما..... بچا کو بتانے کی مگر حمت نہیں ہوئی۔ وہ کیا سوچیں گے؟ ان کے بیار اور اتحاد کا یہ صلہ ہے؟ مئی نے کتنا سمجھایا تھا۔ سستی ٹگر کرتی تھیں۔ مگر نامعلوم کیا ہوا..... میں دھاگے کی طرح کھینچتی چلی گئی۔“ عداوت اور پشیمانی سے اس کی نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ان کے کمرے میں لے آئیں۔ وہ آتے ہی انس کے سینے سے لگ کر معافی مانگنے لگی۔ ہسپتال سے آنے کے بعد سے وہ ان سے دور دور رہنے لگی تھی۔ اسے یہ احساس شرمندگی ان کے قریب نہیں آنے دیتا تھا کہ وہ ان کے اتحاد کو بھروح کر کے ڈواٹھون سے ملنے لگی تھی۔

بی بی جان نے حورین کے پاس جانے سے قبل انس صاحب اور کرن کو بتا دیا تھا جسے سن کر کرن خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ اسی ڈر کی وجہ سے حورین کو کراچی بھیجنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے ہونے وقت نہیں لگتا۔ کسی نجیبی طاقت نے ان کی عزت کی حفاظت کی تھی۔ وہ سب کچھ ہلا کر رب کا شکر ادا کر رہے تھے۔ حورین سے انہیں کوئی شکایت نہیں تھی۔ پہلی بار اس نے نامناسب قدم اٹھایا تھا جس پر وہ دل سے تادم اور شرمندہ تھی۔ کرن نے بھی اسے معاف کر دیا تھا۔

”جھینکس بی بی جان! آپ کی وجہ سے مجھے یہ سرخروئی حاصل ہوئی ہے اگر آپ مدد نہ کرتیں تو میں اندر ہی اندر گھٹ کر مر گئی ہوتی۔“ وہ بی بی جان کا ہاتھ چومتے ہوئے گویا ہوئی۔

☆.....☆.....☆

”یارب! حاضر ہوں۔ تیرے روبرو، تیری یہ بھنگی ہوئی گناہ گار، خطا کار، ظالم و عاصی بندی، جو کل تک خود کو بہت اعلیٰ و برتر سمجھتی تھی اٹلیس کے بہکاوے میں آ کر خود کو غبارِ کل سمجھنے لگی تھی۔ اس جھوٹی اور سٹٹی خوش فہمی نے میرا گلشن خزاں بربود کر دیا۔ آج بھی تمی دست و تھی دامان، بے سکون اور بے قرار ہوں۔ ایک ماں اپنے بچوں کی نگاہوں سے گر کر ہلا کیسے خوش رہ سکتی ہے؟“

”اے غفور الرحیم تعریف کے لائق صرف تیری ذات ہے۔ تمام بڑائیاں تجھی کو زب و تی ہیں۔ بے شک تو معافی کو پسند کرتا اور معاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اے آدم کو معاف کرنے والے، مجھے بھی معاف کر دے۔ میں تمام خطاؤں کی معافی مانگتی ہوں۔“

رات کے ستارے میں سسکیاں بھرنے والی آواز کسی مجبور بے بس عورت کی تھی۔ غرور و طغیان، تقا و برتری، ساحل کی ریت کی طرح بیٹھ چکی تھی۔ اندر داخل ہونے والی راحیلہ بیگم نے افسردگی سے سجدے میں گری ڈارو نظر اورو تھی ہوئی مثال بیگم کی طرف دیکھا۔

”وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو دوسرے کو ٹھوکر کھاتے دیکھ کر سنبھل جاتے ہیں، تمہاری اور میری بد نصیبی یہ رہی کہ ہم نے کبھی اپنے کیے پر نظر ثانی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر کبھی سوچا کہ اختیارات کا چابک کبھی ہمارے ہاتھ سے نہیں گرے گا۔ ظلم و بالادستی کی سکرانی سدا قائم و دائم رہے گی۔ ظلم کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ظلم کی رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو ایک شایک دن حق و سچائی کا سوریا اسے نکل لیتا ہے، مٹا دیتا ہے۔ باطل مٹنے کے لیے ہی ہے جو اس کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس کا بھی کبھی عبرت ناک انجام ہوتا ہے جو میرا اور تمہارا ہے۔“

سلام پھیرنے کے بعد مثال بیگم نے ساس کو قریب بیٹھ دیکھا تو بولیں

”یہ معلوم کتنے عرصے بعد میں نے اپنے رب کو سجدہ کیا ہے، بڑی انوکھی لذت و طمانیت محسوس کی ہے۔ نماز کا تو سرور ہی الگ ہے۔“

”ہاں بہادو ذات اپنے بندوں کو ہر طرح نوازنے والی ہے۔“

”آئی ا“ مثال نے ان کے شانے پر سر رکھتے ہوئے ہنسنے لگے۔ ”میں دعا مانگتی ہوں، آپ بھی دعا مانگیں کہ اللہ مجھے معاف کر دے جب وہ معاف کر دے گا تو سب کر دیں گے۔ میرے بچے بھی کر دیں گے۔ ان کی نگاہوں میں اپنے لیے بیگانگی دوسرہ میری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کونین تو میری طرف دیکھتا ہی نہیں اور ذوالنون تو سب سے ہی بیگانہ رہنے لگا ہے۔ اس نے تو اپنی طرف بھی دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس سب کی ذمہ دار میں ہوں۔“

”رو نہیں، انا کی قید سے ہم آزاد ہو چکے ہیں۔ کل جن اینڈ کو ہم نے چھوڑا تھا، آج ان کو ہم اپنا نہیں گے۔ کل جن چرخوں کو ہم نے پھونکوں سے بھجایا تھا۔ ان کو اگر اپنے لہو سے روشن کرنا پڑا تو ہم بچے نہیں بنیں گے۔ کرن اور اس کے پاس چلیں گے۔ ان سے معافی مانگیں گے، ان کو متنائیں گے۔“ راحیلہ بیگم ہل کی خواہش زبان پر لے آئی تھی۔

”آئی ا کیا یہ ممکن ہے؟ وہ مان جائیں گے؟“ ساس کی بات نے جہاں ایک نئی روح پھوکی تھی وہاں دوسرے بھی تھے۔

”جب کوئی عمل نیک نیتی و بھلائی کے لیے کیا جائے تو رائیگاں نہیں جاتا۔ بند دروازوں پر جب ہار ہار اور مسلسل دستک دی جائے تو وہ کھل ہی جاتے ہیں۔ ہمارے لیے بھی یہ عمل مشکل ضرور ہے مگر تاہم نہیں پھر کرن جس صاحب رو یک ماں کی بیٹی ہے، مجھے معلوم ہے وہ زیادہ وقت ہم سے تھا نہیں رہ سکتی، ماں کی خصلت اس میں بھی ہے۔“

راحیلہ بیگم کی حوصلہ افزائیوں نے گویا ڈوچے کو جھکے کا سہارا دیا تھا۔

☆-----☆-----☆

عمر کا طویل حصہ کرن نے پہلے عمر ویوں دیکھوں میں بسر کیا تھا پھر قسمت نے کرٹ لی، وہ جو کرن برہان بن کر پستیلیں میں گری ہوئی تھیں، کرن اس بن کر یکدم ہی بخت کی بلند یوں کو چھوئے لگیں۔ جہاں بخت ان پر مہربان ہوا تھا وہیں خوف و فتنے نے بھی اپنے حصار میں لیے رکھا تھا جس نے کبھی بھی انہیں سچی مسرتوں سے ہمکنار ہونے نہ دیا تھا اور ان کی لاشعور میں کنڈلی مارے بیٹھا وہ خوفِ حورین کے حوالے سے صحت ثابت ہو چکا تھا۔ بی بی جان کے سبھانے کے باوجود وہ یہاں رہنے کو تیار نہ تھیں۔ ان کو یقین تھا مثالِ انتقام لیے بغیر ماننے والی نہیں ہیں۔ وہ پھر وار کریں گی۔ اس صاحب بھی اس بار خاموش تھے۔ وہ گھر جو انہوں نے بڑی محبت سے مرمت کروایا تھا جس کا نام آشیانہ رکھا تھا اس میں انہوں نے پھر قدم نہ رکھا۔ ساتھ ہی حورین کو یونورٹی جانے سے بھی روک دیا تھا۔ وہی اور زویا کی شادیوں کے بعد ان کا یہاں سے جانے کا ارادہ تھا ایسے میں حیدر کے ہمراہ پروفیسر آفتاب حسن کی آمد رفت نے خزاؤں میں بہاروں کے شگونے کھلانے شروع کیے تھے۔

پروفیسر آفتاب جو کچھ عرصہ باہر گزار کر آئے تھے، ان کے یہاں آنے پر خوشیاں اور کچھ پریشان کن حالات ان کے منظر تھے۔ حمزہ صاحب کی آمد سے لے کر مثالِ بیگم کی سیاست اور حورین و ذوالنون کے درمیان ہونے والے ناخوش گوار تعلقات بھی انہیں معلوم ہوئے پھر حیدر کی کوشش کے باعث وہ بی بی جان سے ملے کیونکہ یہاں سب ہی کرن سے ملنے کو بے تاب تھے جن میں راحیلہ بیگم اور مثال پیش پیش تھیں البتہ یہ تمام ہائیں ذوالنون سے پوشیدہ تھیں۔ حیدر نے بھی اسے نہیں بتایا تھا۔ اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی کہ حورین اس کی فرسٹ کزن ہے۔ حیدر اور سر آفتاب کی ہمراہی میں بی بی جان نے ایک ملاقات مثال، راحیلہ بیگم، حمزہ اور صدر صاحب وغیرہ سے کی۔ ان کی جہانگیرہ دہرک ٹکاہوں نے ہانپ لیا کہ ماضی میں جہان سے ہوا ہوا مگر اب وہ سچے دل سے اپنے رویوں پر تاب ہو چکے ہیں۔ ان کے دوستی کے لیے بڑھے ہاتھوں میں غلوں، محبت و اپنائیت کے پھول ہیں جن میں دقا و ایثار کی خوشبوئیں مہک رہی تھیں۔ بی بی جان نے کرن اور اس سے حیدر سے بیان کیا تو پہلے ہلکے تودہ دونوں ہونچکے اور پھر حیرت سے گم مسم ہو گئے۔

”بی بی جان ایہ ان کی نئی چال ہے وہ اپنی ناکامی کو بدلنے کے لیے بہرہ روپ بدل رہے ہیں۔ وہ کبھی معاف کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔“

”کرن ٹھیک کہہ رہی ہے بی بی جان اور وہ جس قسم کی عورت ہے آپ نہیں سمجھتی ہیں وہ بہت چالاک و دیار عورت ہے۔“ اس صاحب نے کرن کی تائید کرتے ہوئے انہیں سمجھانا چاہا۔

”میں سمجھ سکتی ہوں تم لوگوں کی احتیاط دے اعتباری کو جو تم لوگوں کے ساتھ ہوا ایسے اسی طرح کے قاصدے نظر میں پیدا ہوتی ہیں۔ سانپ کا ڈساری سے بھی خوفزدہ رہتا ہے مگر جس طرح موسم کبھی ایک ماٹھیں رہتا۔ وقت بدلتا رہتا ہے اسی طرح انسان بھی تبدیلیوں کی زد میں رہتا ہے۔ کل تک پہاڑوں کی طرح مضبوط نظر آنے والے آج کزور تر دکھائی دیتے ہیں۔ آسمان کی طرف منہ کر کے چلنے والے ویسے بھی جلد زمین میں ہوتے ہیں۔ کیا حرج ہے میرے بچا ہر کام ہم اپنی رضا کے لیے کرتے ہیں اگر ایک کام اپنے رب کی رضا کے لیے کر لیں تو کتنی بڑی سعادت ہے۔“

بی بی جان کی آخری دلیل کے آگے پھر کسی انکار کی گنجائش ہی نہ رہتی تھی۔ ویسے بھی محبت پھول ہے اور نظرت کا تنوں وانگاردوں کا وجود کھتی ہے جب چاہت و محبت کے پھول ہر سو جھک کر دلوں سے نظرت و بغض کی کثافت کو دور کر رہے ہوں تو کون دامن جھک کر ناشکری کرتا ہے۔ وہ شام بڑی خوب صورت و دلکش تھی۔

برسوں کے چمڑے ایک ہو گئے تھے۔ وسیع و عریض لان میں صوفوں پر وہ براجمان تھے۔ بی بی جان خاصی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر قبل وہ خود راجیل بیگم، منال، حمزہ اور صبر کو لے کر آئیں۔ باقی لوگ مصلحتاً ساتھ نہ آئے تھے کہ بعد میں تو آنا جانا رہتا ہی تھا۔ راجیل بیگم اس محبت سے غلی تھیں کہ ان کے آنسوؤں نے ماضی کی تمام زیادتیاں دھو ڈالی تھیں۔ ان کا دل صاف ہو گیا تھا۔ منال سے تو کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ان کا فونو ٹیکمرا، ہلکتا وجود، شرمندگی سے جھکی جھکی آنکھیں مسلسل بہتے اشک اور عمارت کرن کے گدا دل کو مزید موم کر چکے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لیا اور خود بھی رہ پڑیں۔ یہ آنسو خوشی کے تھے۔ حمزہ نے بڑھ کر کرن کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ان کے اعزاز میں بڑے بھائیوں والی شفقت و اپنائیت تھی۔ صبر صاحب نے بھی آگے بڑھ کر کرن کو گلے سے لگا لیا۔ بکھرے موتیوں کی مالا کیجا ہو چکی تھی۔

نظرت، غصے و انتقام کے ہادل چھٹ چکے تھے۔ ہر طرف اب محبت، سکھ، اپنائیت و یکاگت کی خوش رنگ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا، حمیرا، فارہ، ملازماؤں کے ساتھ مل کر بچن میں معروف تھیں۔ چائے اور اسٹیکس کا دور چل رہا تھا۔ وہ سب لان میں خوش گپیوں میں معروف تھے۔ بنگ جزییشن کے لیے یہ حقیقت بڑی دلچسپ و حیرت انگیز تھی کہ ان کی سگی پھوپھو نہ تھی وہ سب ان کے درمیان تھے۔ ماسوائے حمیرا کے جو خود ہی ان کے درمیان نہیں آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”پرنس کافی نا تم ہو گیا ہے تم نے شاپنگ نہیں کی چلا وہ بھی چلتے ہیں۔ تمہارے ساتھ میں بھی شاپنگ کر لوں گا ہم بابا اور ماما کے لیے بھی شاپنگ کریں گے۔“ کونین آکر اس سے مخاطب ہوا۔

”مجھے ضرورت نہیں ہے آپ چلے جائیں۔“

”یہ کب تک چلے گا بار اتم کب تک اس طرح اپنے ساتھ ہم کو بھی سزا دیتے رہو گے؟ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔“ کونین نے نرم لہجے میں سرزنش کی۔

”میں نے کوئی حد کس نہیں کی، نہ ہی میں سزا دیتے کا اختیار رکھتا ہوں۔“

”یہ سزا نہیں تو کیا ہے؟ نہ تم بابا کو کبھی دیتے ہو، نہ ماما سے بات کرتے ہو۔ دادو، اکل، آئی، گھر کے ہر فرد کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں کچھوے کی طرح بیٹھی رہتے ہو۔ بابا خود کو تمہارا گناہ گار سمجھتے ہیں تو ماما مجرم۔“

”سب کی اپنی لپٹاگو ہیں میں نے کسی کو فوس نہیں کیا۔“ اس کے دھمکے لہجے سے ٹھکی اور ہسی جھک رہی تھی۔ کونین نے نظر بھر کر

اسے دیکھا اور اس کا قصہ جھاگ کی طرح چبھ گیا۔

فراخ پیشانی۔

خوب صورت سرنخی آنکھیں جن میں ملال کا رنگ واضح تھا۔

ایک جہاں کا دور دوری بسا تھا ان آنکھوں میں۔

ماپوسی، ماداسی، ہجر، فراق، حزن و ملال۔

”پرنس امیری جان امیرے بھائی؟“ وہ اسے پوری شدت سے سینے سے لگا کر گویا ہوا۔

”مما کو معاف کر دو، تمہاری خاطر وہ بدل گئی ہیں۔ بالکل پہنچ آ گیا ہے ان میں اگر تمہاری بے اہمائی وہ بے رخی اسی طرح قائم رہی تو..... انہیں کچھ ہو جائے گا۔ وہ کرن آئی اور اس اکل سے معافی مانگ چکی ہیں۔“

”ہونہہ جب بھی سب کرنا تھا تو اس ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس کے لہجے میں اڑوٹھے کی سی پہنکار تھی۔

”جذبات انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔“

”میری تو ذمگی ہی اندھی ہو گئی ہے، سب کے لیے بھولنا آسان ہو گا لیکن میرے لیے نہیں کیونکہ میں نے اپنی کشتیاں اپنے ہاتھوں سے جلائی ہیں۔ میرے لیے کوئی راستہ نہیں ہے، مجھے میرے حل پر چھوڑ دیا جائے۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

☆---☆---☆

”بولو ایہ کیا ہر وقت مجھ سے چپنے کی کوشش میں لگی رہتی ہو، عجیب دوستی ہے تمہاری جو تم میری پروا بھی نہیں کرتی۔“ کافی دل بھر ہریرہ کو جو رین ملی تو وہ شکوہ کر بیٹھا۔

”ہم روز ہی تو ملتے ہیں۔“ وہ دھجھے سے بولی۔

”دور دور سے ایک جھلک۔“

”اوہ..... فضول۔“

”بی بی جان نے گھر کے تمام لڑکے لڑکیوں کو ٹھکانے لگا دیا، ہم کو کس خوشی میں چھوڑا ہے، کہیں خدا نخواستہ ہمیں کھوارہ رننے کا ارادہ تو نہیں ہے ان کا؟“

”اوہ مائی گاڈ! تم اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہو؟“

”ججبات ہے وہ کر رہا ہوں۔“

”بکواس تم صرف اپنی فکر کرو، میری فکر کی ضرورت نہیں ہے۔“

”آئی سی، اسے ڈیروں کو نزل گئے اس وجہ سے مجھے ناک آؤٹ کر رہی ہو تم۔“ وہ منہ پھلا کر گویا ہوا۔

”تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا حق۔“ وہ مسکرائی۔

”اوہ، ہاں! آخر آج تم نے اقرار کر ہی لیا کہ میری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔“ ہریرہ خوشی سے گویا ہوا۔ ”وسی، سرور، سفیان، بھلا، زویا وغیرہ سب وہاں جمع ہو چکی تھیں۔“

”آج میرے یاریک دعائیں مستجاب ہوئیں۔“ وسی نے کہا۔

”بڑا مبارک دن ہے۔“

”اب زبردست سی لڑٹ ہونی چاہیے۔“

”وہ بھی کسی قائمہ اشارہ ٹول میں۔“

”پلیز..... پلیز سائینٹ پلیز، آگے بھی سنتے۔“

”ہریرہ میرا..... بھائی ہے..... رضامی بھائی..... یعنی ہم دو دوہ شریک بہن بھائی ہیں..... جب میں چند ماہ کی تھی تو می کسی بیماری کی وجہ سے ہسپتالز ہو گئی تھی، جب فاریہ آنٹی نے مجھے فیڈ کیا تھا۔“

حورین کے انکشاف پر وہ لمبے لمبے ہنسنے لگی تھی۔

”تم دونوں کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی؟“

”آف کورس، ہمیں شروع سے معلوم ہے۔“

”ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ایک عرصے سے آؤ بھاتے رہے۔“

ان دونوں کے مسکراتے چہرے دیکھ کر سرد معنی خیز انداز میں گویا ہوا۔

”بہن بھائی کو مزید بنا کر جو خوشی ملتی ہے وہ.....“ ہریرہ کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ وہ سب اس سے چٹ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

”کرن ایڈیڈی کو کال کر کے میں نے سب کچھ بتا دیا ہے وہ تم سے سخت شرمندہ ہیں، بہت جلد آرہے ہیں۔ وہ خود آ کر تم سے

معدرت کریں گے اور اس سے بھی بہت زیادتیوں ہوئی ہیں ہم سے جن کی تلافی ممکن نہیں ہے۔“ دوسرے دن وہ پھر ان کے درمیان تھیں۔

”یہ معذرتوں کا سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔ اپنے کل کو بھلا کر ہم نے اپنا آج شروع کیا ہے اور ہمارے آج میں صرف محبت

اور مروت ہے۔“ کرن نے کافی بنا لگا ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہمارے رشتے آج سے قائم ہوئے ہیں جو تاحیات جڑے رہیں گے۔ ان سے رشتوں میں ایک نئے رشتے کا اضافہ چاہتی

ہوں۔“ منال کرن کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”کس رشتے کا؟“ کرن مسکرائیں۔

”پرنس اور حورین کے رشتے کا، میں حورین کو اپنی بہونا چاہتی ہوں، انکار نہیں سنوں گی۔“ منال بیگم از حد ماں بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر.....“

”اس کو اعتراض ہوگا؟“

”یہاں میرے پالنس کے اعتراض کا مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ ہے حورین کی مرضی کا۔“

”اسے میں راضی کر لوں گی۔“

”وہ نہیں مانے گی انس زبردستی کے خلاف ہیں۔“

”حورین وہ لڑکی ہے جو پرنس کی زندگی میں روشنی بن کر آئی، کتنا خوش تھا، زندگی میں پہلی بار میں نے اسے اتنا خوش و مطمئن دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں حورین کی محبت جگنوؤں کی طرح چمکنے لگی تھی۔ وہ بے حد خوش، بے حد مسرور تھا۔ دیا جہاں کی خوشیاں جیسے اس کی ٹٹھی میں آگئی تھیں اور مجھ سے ہی برداشت نہیں ہوا۔“

”آپنی! ابھی ہم نے عہد کیا ہے ناں ماضی کو نہیں دہرائیں گے۔“

”اوہ سوری۔ میرے اندر جو آگ سلگ رہی ہے وہ اس وقت تک ٹھٹھی نہیں ہوگی جب تک میں اپنے بچوں کی روشنی خوشیاں واپس نہ کروں۔“ وہ سخت آرزو تھیں۔

”کافی ٹیکس ٹھٹھی ہو رہی ہے۔“

”کرن اتم وعدہ کر رکھیں جب ہمارے بچوں کے دلوں سے یہ تمام باتیں نکل جائیں گی تو تم ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہونے نہیں دو گی؟“

”وعدہ آپنی! میں پالنس کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔“

”تم کتنی اچھی ہو کاش! ہمارے درمیان یہ سب نہ ہوا دوتا یا ہم دونوں ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔“

☆.....☆.....☆

”پرنس! کہاں کی تیاری ہے؟“

”یونیورسٹی چار ہا ہوں بابا جان۔“ وہ جو گرز کے نیتے بانہ ہتا ہوا گویا ہوا۔

”مجھے خوشی ہے بیٹا! تم نے حقیقت سے سمجھوتا کر لیا ہے ورنہ محسوس ہوتا تھا کہ زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے، منال آپ کو زندگی کی طرف لوٹنے دیکر کس قدر خوش ہوگی اس کا تم اعزازہ نہیں لگا سکتے۔“

”آئی نو بابا مجھے احساس ہے۔“



کونین سے ہونے والی گفتگو نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا کہ وہ اپنے فہموں میں ڈوب کر یہ احساس فراموش کر بیٹھا تھا کہ اس کے دکھ کی لپیٹ میں اس کے اپنے بھی تو تھے جو اس سے بے انتہا محبت کرتے تھے، اسے چاہتے تھے۔ چاہنے والوں کو دکھ دینا چاہت کی توہین ہوتی ہے۔ اپنے دکھ میں دھیرے دھیرے جل کر خاک ہونا اسے پسند تھا۔ اس نے تجویز کر لیا تھا کہ وہ اپنیوں کے لیے ہنسے گا، سکرانے گا۔ دل خواہ رو رہا ہو۔

پروفیسر آفتاب نے اس مشکل میں اس کا بھرپور ساتھ دیا مشکل وقت کی اس گھڑی میں وہ اسے تنہا چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ حیدر اور گھر کے دیگر لوگ اس کی سنجیدگی اور ہٹ دھرمی کے آگے ہتھیار ڈال کر اسے، اس کی مرضی پر چھوڑ چکے تھے۔ پروفیسر آفتاب صاحب کو وہ روک نہیں سکا تھا۔ ان کی کوششیں بار آور ثابت ہوئی تھیں۔

یونیورسٹی میں وہ پریذیڈنٹ کرنا رہا۔ حیدر اور دیگر فریڈز کے اصرار کے باوجود وہ ادھر ادھر نہ گیا تھا۔ اس کے دل میں چہرہ تھا جو حورین سے سامنا نہ چاہتا تھا۔ عجیب جذبہ تھی کشش کا وہ دکھار تھا۔ اس سے ہی چھپ رہا تھا جس کو لاکھ کوششوں کے باوجود ہلانہ پایا تھا۔ آج بھی اس کے دل میں دھڑکنوں کی طرح بھتی تھی۔

پریذیڈنٹ سے فارغ ہوا تو سر آفتاب اسے اپنے گھر لے آئے جہاں ملازم نے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے اور اندر ہی اندر لفظوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ اصل موضوع کی طرف آنے کے لیے۔

”ذوالنون! محبت، سماعت و بصارت سے محروم ہوتی ہے۔ اس میں وہ روشنی صرف اپنے محبوب کی ذات کے لیے ہوتی ہے، یہاں بدلہ نہیں چلتا۔ انتقام نہیں لیا جاتا۔ تم سے جو کچھ بھی ہوا وہ نادانگی میں ہوا، لفظ لہجی میں، ابھی بھی وقت ہے تم اپنی روشنی محبت کو متالو۔ کام مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں۔“ لاؤنج میں گرین ٹی کے سب لیتے ہوئے وہ موضوع چھیڑ بیٹھے۔

”سرا جو مجھ سے خطائیں ہوئی ہیں ان کا ازالہ شاید کبھی نہ ہو سکے گا۔ میں انسانیت کی سطح سے گر چکا ہوں۔ وہ کیا مجھ پر اعتبار کرے گی..... اعتبار کو بھی مجھ جیسے کم طرف پر اب اعتبار نہ آئے گا۔“ اس کا وجہ چہرہ نہ سوز تھا۔ لہجے میں گفت آرزوؤں کی خاک تھی۔

”اس قدر ناامیدی و بددلی تم جیسے ہامت بہادر بچے کو سوٹ نہیں کرتی۔ میں حورین سے بات کر چکا ہوں۔“

”واٹ اس کی رگوں پے میں نے عجیب سی سنسنیٹ ووڑ گئی تھی۔“

”ہاں۔ وہ ہرٹ ہے، سخت کبیدہ ہے، اس کے اعتبار و اعتماد کو بہت ٹھیس لگی ہے پھر لڑکیاں تو ہوتی ہی شیشہ دل اور شیشہ جذبہ ہوتی ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے، اس کا چھینا ہوا اعتبار و اعتماد لوٹانا۔“

”ناممکن سر، میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا ہوں۔“ شدید اضطراب و اضطراب اس کے اعزاز سے عیاں تھا وہ کھڑا ہو گیا۔

”ناٹ امپائل۔ جب تم برائی کے راستے پر گامزن ہوئے تو قدم نہیں لڑکھڑائے تھے اب اچھائی و بہتری کی جانب بڑھنے سے قدم کیوں انکاری ہیں؟ پھر چائے ہو وہ خاندان کتنی نکالیف و خوف سے گزر کر ایک ہوئے ہیں اگر تمہارے اور حورین کے درمیان قاسلوں

کی دیواریں اسی طرح حائل رہیں تو ان خانہ خانوں کو ٹوٹنے میں وقت نہیں لگے گا۔ بہت سوچ مجھ کو فیصلہ کرنا..... اور سنو، محبت پانا اور پاک کھو دینا آسان نہیں ہوتا دانشمندی یہی ہے کہ کل کے انتظار میں آج ضائع نہ کرنا۔“

☆.....☆.....☆

آسوروانی سے اس کے صلیح چہرے سے پھسل رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ قریب بیٹھیں مثال بیگم کی آنکھیں بھی میلی تھیں۔ سب سے پہلے ملنے کے باوجود وہ حورین سے ملنے کی ہمت خود میں نہ پا رہی تھیں مگر ضمیر کی جھین انہیں بے سکون کیے ہوئے تھی چھوٹی سی زندگی میں وہ کتنے بڑے بڑے گناہ کر بیٹھی تھیں۔ ہر رخصتے کو نہیں پہنچائی تھی۔ ہر تعلق کی مجرم تھیں۔

کرن اور انس اس کے باعث بے سکون رہے خصوصاً کرن نے خوف میں رہ کر اذیت بھری زندگی گزارنی تھی۔ وہ کون سا سکھ میں رہی تھیں ہر وقت بدلے اور انتقام کے ڈرتے ناگوں کی تکلیف سے وہ بھی بے گل رہی تھی وہی سہی کسروہ النون کو سکھا کر، بہکا کر پوری کر لی تھی۔ یہ چوٹ تاہوت میں آخری کیل ثابت ہوئی تھی اور وہ اپنی دنیا میں لوٹ آئیں۔ جب حقیقت سے روشناس ہوئیں تو معلوم ہوا وہ عورت جو اس کی ماں تھی بیٹھان کی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت نے ان کو کہیں کانہ رکھا تھا۔ تاکہ جو خود غرض و خود پرست عورت تھیں، جنہیں پر تعیش زندگی و دولت سے بے حد پیار تھا۔ رشتے، ناٹے، تعلقات و دوستیاں سب ان کو مفاد و غرض میں لپیٹی پسند تھیں۔ وہ خود تو بے لوث و سچی چاہتوں سے بے بہرہ تھیں، ساتھ انہیں بھی اپنے رنگ میں رنگ چکی تھیں اور نا معلوم وہ کب تک ایسی بے روح زندگی گزارتی رہیں اگر ذوالنون کی حالت ان کے اندر سونے والی عورت کو، ماں کو چکا نہ دیتی۔ اب وہ پوری شدت سے جاگ اٹھی تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے بیڈروم کو ان چروں سے پاک کیا جن کو وہ اپنا دکھ و تنہائی دور کرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں پھر صدق دل سے اپنے رب سے صفائی مانگی۔ تمام نقش و پارٹی چھوڑ کر گھر رستی میں مشغول ہو گئی تھیں۔

برہان لغاری جو ایک لمبے عرصے تک کرن سے لاطعلق و خفا رہے تھے مثال کی زہانی تمام صورت حال سے آگاہ ہونے کے بعد شرمندہ تھے۔ اب ان کے فون بھی گا ہے بگا ہے کرن اور انس کے پاس آتے رہتے تھے۔ وہ کرن کے پاس آچکے ہوتے اگر فاقہ بیگم فاج کے ایک کا شکار نہ ہوتیں۔

”میں جانتی ہوں، آپ جس تکلیف و پریشانی سے گزری ہیں محبت کا درد، فریب و جدائی کتنی جان لیوا ہوتی ہے میں خوب جانتی ہوں۔“ وہ دیرے دیرے حورین سے کہہ رہی تھیں۔

”اس نے جو کچھ بھی کیا میرے کہنے پر کیا۔ پر لست تم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ بہت چاہتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارا عکس دیکھا ہے۔ اس کی زندگی میں جولا کی پہلی اور آخری بار آئی ہے وہ تم ہو حورین مجھے معلوم ہے کہ اب وہ کسی اور لڑکی کو نہ دیکھے گا۔ وہ بچپن سے بہت ضدی ہے ایک بار جو کہا وہ کبھی بدلتا نہیں ہے۔“ دور سائیت سے سمجھا رہی تھیں۔ حورین کے پاس گویا لفظ کھو گئے تھے۔ زبان گویائی سے نا آشنا تھی۔ اس ستم کر کی جانب سے دل کا دروازہ بند تھا اور اس دروازے پر دستک دی جا رہی تھی، مسلسل و بھرپور.....

پروفیسر آفتاب صاحب کئی بار اسے سمجھا چکے تھے۔ ان کے پُر شفقت لہجے، پُر اعزازیمیاں میں ایسی شدید تاثیر ہوتی تھی کہ سٹکارخ ہجر موم ہو جاتے تھے پھر وہ تو ایک نازک و گداز دل رکھتی تھی۔ حیدر ہر وقت اس کی دکالت کرتا دکھائی دیتا۔ مول، زویا، ثمرین، وردا اور اب جو اتنی اس کے سامنے بیٹھی اسے منار ہی تھی، سب کا مقصد ایک ہی تھا۔

”حورین بیٹا تم کو جو مزادینا ہے مجھے دو۔ سزا کی حق دار میں ہوں پرس کو معاف کر دو۔ وہ بے قصور اور بے خطا ہے۔“

”آئی پلیز، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ اس نے ان کے بندھے ہوئے ہاتھ علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے سوچا تھا کبھی اس عورت پر تھوکتا بھی گوارا نہ کرے گی مگر وہ اس اعزاز میں سامنے آئی تھیں کہ وہ تمام کمزورت و نفرت بھلا بیٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ سب جمع تھے خوب خود غفل چاہا تھا۔ ابھی ابھی کرن نے آن کر خوش خبری سنائی تھی۔ مول اور ہریرہ کی نسبت طے ہو گئی تھی اور اس دن روف اور عی وغیرہ سے بات وہ ان دونوں کے حوالے سے ہی کر رہی تھیں جیلا علی کے باعث وہ لوگ حورین اور ہریرہ کی بھندھے تھے۔

”اوہ گاڈ! کس طرح سے ان دونوں نے ہمیں بے وقوف بنا رکھا تھا۔“ جیلا، حورین اور ہریرہ کو گھورتے ہوئے گویا ہوئی۔

”مول! سنبھل کر رہنا بہت چار سو بیس فیض ملا ہے تمہیں۔“ زویا، مول کی جانب دیکھتے ہوئے بولی جس کے چہرے پر مسرت کے رنگوں کی قوس دھڑخ چھائی ہوئی تھی۔ ہریرہ بھی بے حد خوش تھا۔

”چھپرے تم نکلے۔ اب شرافت سے گریڈ پارٹی دے دو۔“ ذمی ہریرہ سے مخاطب ہوا تھا۔

”پارٹی سے یا نا یا شام میں متال، آئی نے گریڈ پارٹی دی ہے، پہلے تو وہ پارٹی اٹینڈ کرنی ہے اس کے بعد ہریرہ کا نمبر آئے گا۔“

سعود کے یاد دلانے پر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے لیکن حورین بیٹھی رہی تو مول اس کے قریب چلی آئی سب کے جانے کے بعد

اس نے پوچھا۔

”تم..... نہیں چلو گی؟“

”نہیں۔ میں نہیں جاؤ گی“ وہ سپاٹ اعزاز میں بولی۔

”آئی بڑی بڑی ہستیاں تمہیں سمجھا چکی ہیں اب تم جھوٹی انا کو چھوڑو۔“

”میں..... اس کا سامنا کس طرح کروں گی؟“

اس کا لہجہ نفرت و ظفر کے غبار سے پاک تھا مول کو اس کے اعزاز پڑھیں اور یہاں آیا گیا گویا دروازہ دل پر دستک شرف قبولیت پانچکی تھی۔

”ڈونٹ وری مائی ڈیز سب مجھ پر چھوڑ دو اور تیار ہو جاؤ۔“ اس نے، اس کا رخسار چم کر چپکتے ہوئے کہا۔ عمر داخل ہو تھیں بی بی جان اور کرن کے چہروں پر بھی ملانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

آسمان کے سیاہ آجمل پر چاند، تارے پوری آب و تاب سے جگمگا رہے تھے۔ ہوائیں سبک، رات کی رانی اور گلاب کی دل آویز خوشبوؤں سے پڑکیں تھیں۔ خوبصورت لمبوسات اور رنگین آجمل کی سرسراہٹیں نضا کو سحر انگیز بنائے ہوئے تھیں، بہت خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیا گیا وہ وسیع و عریض لان بے تحاشہ روشنیوں سے جگمگا اور گلاب کے پھولوں سے مہک رہا تھا۔ حزرہ اور منال نے یہ پارٹی کرن و انس کے اعزاز میں دی تھی اور خاندان کے لوگوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ کچھ خاص دوست و احباب بھی مدعو تھے۔ مہمان سب آچکے تھے۔ گرے کلر کی بتاری ساڑھی میں لمبوس بالکل سادہ انداز میں حزرہ صاحب کے پہلو میں کھڑی منال آج مکمل نظر آ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر پھری غلوس و سادگی نے ان کے اندر وقار اور شانگلی پیدا کر دی تھی۔ آف وائٹ سوٹ میں لمبوس راحیلہ بیگم کرن اور انس کو صنوبر بیگم، بہادر بچوں سے ملوا رہی تھیں۔ حورین بے حد نرمی سے حورین تھی جو آٹو گئی تھی مگر مجیب سے احساسات سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی دل تھا کہ دھڑکے ہی جا رہا تھا۔ منال اور حزرہ نے بہت محبت سے اسے ویکم کہا تھا۔ حزرہ صاحب اور صنوبر بیگم سے ملانے کے بعد منال اس کا ہاتھ پکڑ کر بیگم جزییشن کی طرف لے آئی تھیں۔

”بھئی! آپ لوگ ان سے ملیں یہ ہیں۔۔۔۔۔ ہاری اکلوتی، بے حد لالہ اور جھگڑتی بھانجی، حورین۔“

”اوہ۔۔۔۔۔! سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں۔ بیک جھلملاتی فرائڈ سوٹ میں کنفیوز، کنفیوزی ستارہ آنکھوں اور چاند کی چاندنی کا سحر انگیز حسن لیے وہ لاکھوں کی سب کو ہی پسند آئی۔ سونیا، اریبہ، ہنزہ، معیز اور مزمل جوش و خروش سے ملے پھر وہ اسے لے کر خضرئی اور کوئین کی طرف آگئیں جو وہ بیٹرز کو کچھ ہدایت دے رہے تھے۔

”مما! اسی حورین آئی ایم رائٹ؟“

کوئین کی بے شوق نگاہیں بولکھلائی، گھبرائی سی حورین پر تھیں۔ وہ دل ہی دل میں بھائی کی پسند کو داد دے رہا تھا۔

”اویس۔ تم نے خوب پہچانا۔“ منال تھیں۔

”پہچانا کیسے نہیں، اسٹائل لوگوں کی چوائس اسٹائل ہی ہوتی ہے۔“ مسکراتے ہوئے بہت اپنائیت سے کوئین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کے دوستی لہجے نے حورین کو نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔

”حورین بیٹا یہ خضرئی ہے کوئین کی مگھتیر چند دنوں بعد اس گھر میں بہدین کر آنے والی ہے۔“

خضرئی نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور اسے لے کر آگے بڑھ گئیں جہاں وہ سب ایک ساتھ بیٹھے خوش گپوں میں مشغول تھے جہاں ہریرہ، سمود، رؤف ہوں وہاں صرف حقہ بکھرتے ہیں ان کے ساتھ اب خضر بھی شامل ہو گیا تھا۔

ویٹرز مشروبات سرو کر رہے تھے، ہر نو حقہ اور مسکراہٹیں تھیں۔ کرن اور انس ایک ٹیبل پر جبکہ حزرہ اور منال کی ٹیبل پر پروفیسر ڈی ٹی بیٹھے تھے۔

حیدر لیٹ آیا تھا۔ رویا کی گیت کی طرف اٹھنے والی نگاہوں کو تراز مل گیا۔ حیدر نے بھی پہلی نگاہ اس پر ڈالی۔ حورین کی نگاہوں

نے غیر دانستہ ہی یہ سب نوٹ کیا تھا اور اس کے اندر ستائے سے اترنے لگے تھے۔ دل نے ایک دم ہی کسی کی طلب محسوس کی تھی۔ بے اختیار اس کی نگاہیں ارد گرد کا جائزہ لینے لگیں۔

وہ یہاں کہیں نہیں تھا۔ نگاہیں ناکام لوٹ آئیں تھیں، دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ ماحول میں یکدم ہی اداسی اور دیرپائی چھاتی چلی گئی۔

”اوہ۔“ حیدر کے ہاتھ سے گلاس پھسلا اور سارا مشروب اس پر گر گیا۔

”سو..... سوری“ وہ کھڑی ہوئی تو حیدر بھی کھڑا ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں، میں دھولتی ہوں۔“ حورین دوپٹہ پکڑتے نرمی سے بولی۔ مشروب دوپٹے کے ایک حصے پر گرا تھا۔

”آئیں میں واش روم لے چلتا ہوں۔“

وہ حیدر کے ہمراہ رہا اسی حصے کی سمت چلی آئی۔ کئی کوریڈورز، لاؤنج سے گزر کر وہ واش روم پہنچی۔ واش ٹین میں جلدی جلدی دوپٹہ دھو کر وہ حیدر کے ساتھ چلتی تھی کہ اسی لمحے اندر سے نکلے والے شخص کو دیکھ کر اس کے قدموں میں بڑھنے کی سکت نہ رہی۔ ایک لمحے کو دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ کیا تھا ان آنکھوں میں؟

درد ہی درد۔

کرب ہی کرب۔

خرپ ہی خرپ۔

ہجر کا دکھ، نارمانی کی اذیت دونوں کی ایک ہی اذیت تھی۔

”میں زیادہ نہیں صرف اتنا ہی کہوں گا، اس جہاں میں بچھڑنے والے مشکلوں سے ملا کرتے ہیں یہ تمہارے سچے پیار کی چھائی ہے جو تم دونوں کو ایک بار پھر آمنے سامنے لے آئی ہے۔ خوش قسمتی ہار ہا رہ سکتی نہیں دیتی۔“ یہ کہہ کر حیدر رُکنا نہیں۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ حورین کی جھکی نگاہوں سے قطرہ قطرہ موتی ٹپکتے لگے تھے۔ وہ تمام اذیت، ناک لحات تازہ ہو گئے تھے۔

”پلیز ڈونٹ ویپ، میں نے جو کیا وہ مجھے میری نگاہوں سے گرا گیا ہے۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ تمہاری محبت کا جواب دہشت سے دیتا۔ تمہارے ساتھ میں نے جو کچھ کیا اس کی سزا میں آج تک خود کو دیتا رہا ہوں اور ساری زندگی دیتا رہوں گا، دیکھو.....“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے شرٹ کے بٹن کھولے جہاں سینے کے اوپر ہی حصے پر سیاہ چھوٹے چھوٹے دائرے چھتے ہوئے تھے۔ حورین کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں۔ چھتے ہوئے حصوں پر ڈم بن چکے تھے۔

”روزانہ ان زخموں کو تازہ کرتا ہوں اور اس اذیت کو، تکلیف کو محسوس کرتا ہوں جو میں نے اس لڑکی کو دی جو میری زندگی کی اولین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

وآخرین آرزو تھی۔ جس کی مصمص اور پاکیزہ چاہت کو میں نے دھوکا دیا۔ ”وہ تم سمجھا اس ہاخصہ حورین کے سامنے گھٹنوں کے مل بیٹھتے ہوئے بولا۔

”پلیز، میرا چینی سکون مجھے واپس مل جائے دعا کرو۔ میں بہت بے سکون ہو گیا ہوں۔“

”میں سب بھول چکی ہوں، دل پر ایک بوجھ تھا، روح میں ایک بے کئی تھی وہ اس لیے فنا ہو گئی۔ میرے زخم بھر گئے لیکن۔۔۔۔۔ یہ

..... یہ آپ نے اپنے ساتھ بہت ظلم کیا ہے..... بہت سزا دی ہے۔“ اس کا نگار سینہ دیکھ کر ہلکا ہوا۔

پوری شدت سے رو پڑی۔

ذوالنون نے گہری ناکھوں سے اسے دیکھا سیاہ سوٹ، جس پر اشارہ اور تکیے جگہ گار ہے تھے دھلے دھلے چہرے پر سیاہ پھلکی پھلکی دراز پائلیں، گلابی بھرے بھرے دلکش ہونٹ، پشت پر پھیلے براؤن کئے بالوں کا جنگل اس کے اندر طمانیت بھری آسودگی اتارنے لگی۔ دل نے صرف اور صرف اس کی تمنا کی تھی۔ زندگی اس کی پیار بھری رفاقت کی خواہش مند تھی۔ تنہائیوں میں ہر لمحہ اس کے ہمراہ تھی۔

”بہت دلایا ہے میں نے تمہیں مگر آج کے بعد یہ آنسو گریں گے تو میری لاش پر۔“

حورین نے گھبرا کر جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اتنا چاہتی ہو مجھ جیسے وحشی کو؟“

اس کے بھاری لہجے میں شوخی ابھر آئی۔ اس نے اس کے شانے پر بازو رکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

”ہیلو..... اگر آپ لوگوں کا رومانس سے پیٹ بھر گیا ہو تو اللہ کے واسطے لان میں آ جائیں تاکہ ڈنر اشارت کیا جائے یہاں تو

بھوک کے مارے چہلوں نے توڑ پھوڑ شروع کر دی ہے۔“

خضر وہائی دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”تم ہمیشہ فلفلہ نام پرانتری دیتا۔“

وہ خضر سے بولا۔ حورین کے چہرے پر آسودگی پھیلی ہوئی تھی۔ ذوالنون نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اس نے لجا کر گردن جھکا دی تھی۔



ختم شد